اپنی کہانی

راجندر پرساد

اپنی کہانی

اول بار — [illegible]

۹۲۵
ر ۱۲ اپنی

پرچہ قدیم ہے۔

اپنی کہانی

راجندر پرشاد

مترجمہ

گوپی ناتھ امن

ساہتیہ اکادیمی، نئی دلی کی طرف سے

شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دلی نے شائع کی

Apni Kahani Urdu translation by Gopinath Aman — of Rajendra Prasad's autobiography in Hindi, **ATMAKATHA**. Sahitya Akademi, New Delhi. Price Rs. 12-50 (1961).

پہلی بار   مئی سنہ ۱۹۶۱ء

ساہتیہ اکادیمی، نئی دلی کی طرف سے
شمع بک ڈپو، آصف علی روڈ، نئی دلی کیلئے
حافظ محمد یوسف دہلوی نگرانِ ادارہ نے انڈین پرنٹنگ ورکس ایم ایم روڈ نئی دلی میں طبع کراکر شائع کی
قیمت: ۱۲ روپے ۵۰ نئے پیسے

والد کے برابر ہمیشہ یاد رکھنے کے قابل

بھائی

کی

پاک یاد میں

راجندر پرساد

اُردو ایڈیشن کا پیش لفظ

میں نے اپنی ہندی تصنیف "آتم کتھا" کے دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ ۲۶ نومبر ۱۹۵۶ء کو لکھا تھا۔ ہندی ایڈیشنوں میں تاریخ اور واقعات کی دو چار غلطیاں رہ گئی تھیں جو یہاں درست کر دی گئی ہیں۔ جب سے اب تک چار سال سے زیادہ گذر چکے ہیں۔ اِس مدت میں ہندوستان اور دنیا میں بہت سے واقعات ہوئے۔ مُلک میں ایک اور عام اِنتخاب ہوا، اور میں پھر راشٹرپتی چُن لیا گیا۔ ریاستی پنر گٹھن کمیشن کی رپورٹ کے مطابق جو صوبہ بندیاں ہوئی تھیں اُن میں بھی کئی تبدیلیاں ہو چکی ہیں۔ ہمارے تیس سال کے ساتھی مولانا ابو الکلام آزاد فروری ۱۹۵۸ء میں قلیل علالت کے بعد رحلت فرما گئے۔ جب میں ان کی لاش کے پاس آنسو بہا رہا تھا تو ۱۹۱۸ء سے اب تک کے واقعات کی تصویریں میرے ذہن میں گشت کر رہی تھیں۔ بہار کے ساتھیوں میں سے انوگرہ بابو بھی اب نہیں رہے۔

اس بیچ میں مُلک کے باہر بھی جانے کا مجھے اِتّفاق ہوا۔ نیپال، جاپان، اِنڈونیشیا، ویٹ نام دکھن اور اُتر، کمبودیا، لاؤس، لنکا اور روس کا دورہ کیا۔ جہاں ہندوستان کے اعلیٰ نمائندے ہونے کی حیثیت سے بہت خیر مقدم ہوا۔ جس کی تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں۔ ملک کے مختلف حصّوں کے بھی دورہ کرنے کا اتّفاق ہوا۔

۱۹۶۰ء کی ۲۶ جنوری کا سویرا مجھے کبھی نہیں بھول سکتا۔ ایک طرف میری بڑی بہن بھگوتی دیوی کی لاش میرے گھر میں تھی اور دوسری طرف مجھے جشنِ جمہوریت کے جلوس میں شامل ہونا تھا۔ جیسا میں نے اِس کِتاب کے شروع کے ایک باب میں لکھا ہے۔ وہ ابتدائی عمر میں ہی بیوہ ہو گئی تھیں۔ اور جب سے ہمارے ہی یہاں رہتی تھیں۔ چودہ سال مجھ سے بڑی ہونے کی وجہ سے وہ میرے لئے ماں کی طرح تھیں۔ ایک طرف قومی خوشی کا شاندار تہوار اور دوسری طرف میرے لئے یہ صدمہ۔ میں نے نہیں چاہا کہ قومی جشن میں میرے ذاتی دُکھ سے کچھ خلل پڑ جائے۔ لاش کو گھر پر چھوڑ کر میں جلوس میں شامل ہوا اور فوجوں وغیرہ کی سلامی لے کر گھر واپس آیا تو دوپہر کو واہ کرم کرنے کے لئے شمشان گیا۔ جلوس میں جب میری سواری نکل رہی تھی تو بار بار خیال آتا رہا کہ دُنیا اِس کو کہتے ہیں۔

میں ساہتیہ اِکادمی کا شکر گذار ہوں کہ اُنہوں نے میری آتم کتھا کا اُردو ایڈیشن شائع کرانا مناسب سمجھا۔

یہ سطریں پریس میں تھیں کہ شری بابو اور پنڈت گووند بلبھ پنت کا سورگباش ہو گیا۔ میں نے اِن دونوں کے ساتھ کام کیا تھا اور اُن کی دائمی جدائی سے بہت صدمہ ہوا۔

یکم مئی ۱۹۶۱ء

راجندر پرساد

دیباچہ

اپنی کہانی کا پہلا ایڈیشن جنوری ۱۹۴۷ء میں شائع ہوا تھا۔ اس وقت کے واقعات کا ذکر کتاب کے متن اور ضمیمہ میں ہوگیا۔ اس دوسرے ایڈیشن میں اس کے بعد کے حالات کا شامل ہونا مناسب تھا۔ اس درمیان مُلک میں کئی اہم واقعات ہوئے ہیں جن کے ساتھ میرا خاص تعلق رہا ہے۔ مثال کے طور پر کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی دستور ساز مجلس اور اس کا کام ہندوستان کی آزادی اور اختیارات کا منتقل ہونا، وزیر زراعت و خوراک کے عہدہ پر تعیّن، گاندھی جی کی شہادت، گاندھی سمارک ندھی کا قیام، کانگریس کی تنظیم، دستور ساز اسمبلی کے ذریعے عارضی طور پر راشٹرپتی کے عہدے پر تقرر، ۱۹۵۲ء میں اس کے مطابق عام انتخاب کے بعد راشٹرپتی (صدر جمہوریہ ہند) کا انتخاب، اس حیثیت سے مُلک کا دورہ خدمتِ وطن۔ یہ ایسے معاملے ہیں جن پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے، مگر اس کام کو پورا کرنے کے لئے نہ تو میرے پاس وقت ہے اور نہ جن حالات میں میں ہوں اُن سے مطابقت اِس لئے میں نے اس میں کوئی بھی نیا مواد شامل نہیں کیا ہے۔

یہاں اِتنا کہنا کافی ہے کہ یہ سال دنیا کی تاریخ میں خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کی ہولناکی سے نجات پاکر دنیا کی قوموں نے اِن میں تعمیر کی طرف قدم اُٹھایا ہے یہی نہیں جنگ کی تباہ کاری کو دیکھتے ہوئے سبھی مُلک یہ محسوس کرنے لگے ہیں کہ مستقل امن کے بغیر انسان کی ترقی اور سچی مسرت موجِ سراب سے بڑھ کر اور کچھ نہ ثابت ہوگی۔ اِس لئے اس زمانے کو ہم خود تجزیاتی اور تجرباتی دَور ہی کہہ سکتے ہیں۔ اِس زمانے کی اہمیت کا دوسرا خاص سبب یہ ہے کہ اپنی نو یافتہ آزادی کے بعد انہی دِنوں ہندوستان دنیا میں قیامِ امن کے لئے کچھ کرسکا ہے۔ اِس کے ساتھ ہی حکومت کی باگ ڈور مُلک کے نمائندوں کے ہاتھ میں آنے کے بعد سے اس مُلک میں ایک دورِ نو طلوع ہوا ہے اور اس کی تشکیل میں ہماری ساری طاقت لگ رہی ہے الغرض گذشتہ دس برسوں کا زمانہ ہمارے مُلک کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ جب ایک کل یا مشین چل پڑتی ہے تو وہ اپنی طاقت سے کچھ دیر تک چلتی رہتی ہے مگر ایک غیر متحرک چیز کو حرکت میں لانا آسان کام نہیں۔ اِن برسوں میں ہندوستان کے لیڈروں کو کچھ اِسی قسم کا کام کرنا پڑا ہے۔

۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۶ء تک "اپنی کہانی" کے مصنّف کی زندگی میں کیا کیا واقعات گذرے اور زندگی

کس رو میں بھی۔ اس بارے میں کچھ کہنا غیر مناسب نہیں تو غیر ضروری ضرور معلوم ہوتا ہے۔ میرے لئے یہ سوال ایسا ہے جو انتہائی ذاتی ہوتے ہوئے بھی سبھی پبلک سے تعلق رکھتا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ اِس کے بارے میں مجھے کچھ کہنے کا حق ہے۔ ہماری قومی زندگی میں قوم نے مجھے جو مقام دیا ہے اس کی جواب دہی کو میں کہاں تک نبھا سکا ہوں۔ اس کا فیصلہ تو اس ملک کے عوام کے ہاتھ ہے۔

پہلے ایڈیشن کو دنیائے ادب اور عوام نے اپنا کر جو میری مدارات کی اور عزت افزائی فرمائی ہے، اِس کے لئے میں مرہونِ احسان ہوں۔ اِسی کے نتیجے کے طور پر میری یہ کتاب دوسری زبانوں کے روپ میں بھی ناظرین کے سامنے پیش ہے۔

نئی دِلّی

۲۶ جنوری ۱۹۵۶ء — راجندر پرساد

فہرس

میرے بزرگ

یو۔پی (اُترّ پردیش) میں امروڑھا نام کی ایک جگہ ہے۔ سُنتے ہیں کہ وہاں کائستھوں کی اچھّی بستی ہے۔ بہت دن پہلے وہاں سے ایک خاندان نکل کر پورب چلا اور بلیا جا بسا۔ طویل مدّت تک بلیا میں رہنے کے بعد اس خاندان کی ایک شاخ اُتّر کی طرف چلی گئی اور آج کل کے ضلع سارن (بہار) کے زیرادیئی گاؤں میں جا کر رہنے لگی دوسری شاخ گیا میں جا کر بس گئی۔ زیرادیئی گاؤں کے کچھ لوگ بھی تھوڑی ہی دُور پر ایک دوسرے گاؤں میں جا بسے زیرادیئی والا خاندان ہی میرے بزرگوں کا خاندان ہے۔ شاید زیرادیئی میں آنے والے میرے بزرگ مجھ سے پہلے کی ساتویں یا آٹھویں پشت میں تھے جو لوگ زیرادیئی میں آئے تھے وہ غریب تھے اور روزگار کی تلاش میں ہی اِدھر آگئے تھے اس گاؤں میں کوئی پڑھا لکھا نہیں تھا اور اُن دنوں بھی کائستھ تو تعلیم یافتہ ہوا ہی کرتے تھے۔ اس لئے گاؤں کے لوگوں نے اُن کو وہاں رکھ لیا۔ تقریباً اسی وقت سے ان لوگوں کا تعلّق ہتھوا راج سے ہو گیا جہاں کوئی لکھنے پڑھنے کی چھوٹی سی نوکری ان میں سے کسی کو مل گئی۔ ہتھوا ان دنوں اتنی بڑی ریاست نہیں تھی اور نہ اس کی اتنی آمدنی ہی تھی اس کے رئیس کا مرکزی مقام بھی وہ بعد میں بنا اُن دنوں تو کہیں اور تھا۔

ہتھواراج کے ساتھ میرے بزرگوں کا تعلق کئی پشتوں تک چلتا رہا معلوم نہیں کہ وہ لوگ کس عہدے پر تھے۔ مگر جہاں تک خبر ہے وہ کوئی اونچا عہدہ نہیں تھا۔ گاؤں کے گھر بھی پھوس کے چھپّر کے ہی تھے۔ زیرا دیئی میں وہ لوگ ایک دوسرے کائستھ زمیندار کی جن کی بڑی زمینداری تھی، رعیت تھے اور ہم لوگ آج تک کبھی گاؤں کی زمینداری میں حصّہ دار نہیں ہوئے اگرچہ بعد کو ہمارے بزرگ اور کئی گاؤں کے زمیندار ہو گئے۔

میرے دادا مشری لال دو بھائی تھے۔ اُن کے بڑے بھائی کا نام تھا چودھر لال مشری لال کا انتقال بہت چھوٹی عمر میں ہی ہو گیا۔ ان کے اکلوتے لڑکے تھے مہادیو سہائے جو میرے والد تھے چودھر لال جی کے بھی ایک صاحبزادے تھے جگدیو سہائے۔ مشری لال کی اچانک موت کم عمر میں ہونے کی وجہ سے میرے والد کے ساتھ چودھر لال جی کو بہت اُنس تھا۔ جگدیو سہائے اور مہادیو سہائے دونوں کو انہوں نے اپنے بیٹوں کی طرح پالا پوسا اور پروان چڑھایا۔ جگدیو سہائے بڑے تھے اور ان کے کوئی لڑکا نہیں تھا۔ صرف ایک لڑکی ہوئی جو جاتی رہی۔ مہادیو سہائے جی کے تین لڑکیاں اور دو لڑکے ہوئے، ایک لڑکی تو بچپن میں ہی گذر گئی۔ دو کی شادی ہوئی جن میں بڑی بھگوتی دیوی تھوڑے ہی دنوں بعد بیوہ ہو گئیں اور اس وقت سے آج تک میرے ہی گھر میں بیشتر اپنی زندگی گذار رہی ہیں۔ دوسری بہن بھی جو دونوں بھائیوں سے بڑی تھیں بغیر کسی اولاد کے چل بسیں۔ میرے بڑے بھائی بابو مہندر پرشاد ہوئے اور سب سے چھوٹا لڑکا گھر میں میں ہوا۔

ہتھواراج میں چودھر لال جی نے بڑی شہرت پائی، جہاں وہ دیوان کے عہدے پر پہنچ گئے اور تقریباً پچیس تیس سال تک دیوان رہے ان دنوں مہاراج چھتّر دھاری ساہی گدی پر تھے اُنہوں نے اپنے لڑکے کو راج نہ دے کر پوتے راجیندر پرتاپ ساہی کو وصیّت نامے

کے ذریعے راج دے دیا۔ اُن کو چودھر لال جی پر بڑا بھروسہ تھا اور چھوٹے پوتے کی حفاظت کا بار مرتے وقت اُن پر ڈال دیا۔ مہاراج کی وفات کے بعد چھوٹے کنور پر بڑی آفتیں آئیں۔ خاندان کے لوگوں نے راج پر دعویٰ کر کے مقدمہ دائر کر دیا جو پریوی کونسل تک گیا پریوی کونسل میں فیصلہ ہوا کہ ہتھوا راج ناقابلِ تقسیم ہے اور ناقابلِ تقسیم ریاست کو وصیّت کرنے کا حق راجا کو ہے اس لئے راجیندر پرتاپ ساہی حق دار ریاست ہیں۔ اس مقدّمے کے دَوران راجیندر پرتاپ ساہی کی زندگی پر بھی آفت تھی اور اس کی حفاظت کوئی آسان کام نہ تھا۔ ہم نے سُنا ہے کہ اُن کی حفاظت کے لئے چودھر لال جی ان کی چارپائی کے پاس خود سویا کرتے تھے اور جو کچھ ان کو کھانے کو دیا جاتا تھا وہ زہر کے اندیشے سے پہلے خود کھالیا کرتے تھے۔

چودھر لال جی نے راجا کی صرف حفاظت ہی نہیں کی بلکہ انہوں نے راج کے انتظام کو بھی کافی ترقی دی۔ غیر آباد زمین کو آباد کرا کر اور دوسرے طریقوں سے بھی بڑھاوا دے کر اُنھوں نے راج کی آمدنی تقریباً تین گُنی کر دی۔ مہاراج راجیندر پرتاپ ساہی اِن سب وجہوں سے اُن کو بہت مانتے تھے اور اُن کی بڑی عزّت کیا کرتے تھے۔ سُنا ہے کہ اُن کے سامنے مہاراج کبھی تمباکو نہیں پیتے تھے اور جب سنتے تھے کہ وہ آ رہے ہیں تو حقّہ ہٹوا دیا کرتے تھے۔

اُن دنوں اہلکاروں کی تنخواہ بہت کم ہوا کرتی تھی۔ چودھر لال جی کو شاید دیوان ہونے کے زمانے میں بھی پچاس یا سو روپے مہینہ ملا کرتا تھا۔ ساتھ ہی جتنے لوگ وہاں ڈیرے پر رہتے تھے ان سب کے لئے سیدھا (راتب) چاول، دال، گھی وغیرہ راج بھنڈار سے روزانہ آیا کرتا تھا۔ راج کے کئی گاؤں بھی جن میں زراعت کی زمین تھی اُن کو ٹھیکے میں راجا نے دے رکھے تھے۔

زراعت کی زمین میں دھان کی کھیتی ہوتی تھی اور اس سے کافی آمدنی ہو جایا کرتی تھی۔

چودھر لال جی بڑے منتظم آدمی تھے۔ راج کی آمدنی اُنھوں نے دُگنی تگنی بڑھا دی تو بھی وہاں کی رعایا اُن سے پریم رکھتی اور اُن پر اعتماد کرتی جس کا ثبوت مجھے اپنے تجربے میں بھی ملا جب میں عدم تعاون کے دنوں میں اس علاقے میں دورہ کرنے لگا، جہاں جاتا وہاں کے بوڑھے لوگ میرا خاص خیر مقدم کرتے اس وجہ سے بھی کہ میں چودھر لال کا پوتا ہوں۔ چودھر لال جی نے اپنے خاندان کو بھی بہت ترقی دی۔ انھوں نے سات آٹھ ہزار روپے سالانہ کی آمدنی کی زمینداری اپنی بھی خریدی یہ زمینداری زیادہ تر چاول بیچ کر خریدی گئی تھی۔ کئی گاؤں تو ہماری دونوں دادیوں کے نام سے ہی لئے گئے۔ کیونکہ چاول تو گھر میں وہی تیار کراتیں بیچتیں اور روپے دیتیں۔

جیسا اوپر کہا جا چکا ہے۔ چودھر لال جی نے اپنے لڑکے جگدیو سہائے اور بھتیجے مہادیو سہائے کی تعلیم کا انتظام کیا۔ ابھی انگریزی کا رواج نہیں تھا فارسی کی ہی تعلیم دونوں کو ملی شاید چھپرا بھیج کر انگریزی پڑھانے کا خیال بھی ہوا اور میرے چچا نے دو ایک کتابیں پڑھیں بھی مگر مہاراج نے اس میں حوصلہ افزائی نہیں کی۔ اور دونوں بھائیوں کو فارسی ہی پڑھ کر صبر کرنا پڑا فارسی بھی دونوں بھائی اُنھی مولوی صاحب سے پڑھتے رہے جو مہاراج کے لڑکے کو جو بعد کو مہاراج کرشن پرتاب ساہی ہوئے، پڑھاتے تھے۔

مہاراج راجیندر پرتاب ساہی کی وفات کے بعد راج کا انتظام کچھ دنوں کے لئے کورٹ آف وارڈس کے ہاتھ میں چلا گیا۔ چودھر لال جی انگریزی تو جانتے نہ تھے اس لئے دیوان رہ نہیں سکتے تھے اور اس عہدے پر پچیس تیس برس تک رہ کر اس سے چھوٹا کوئی عہدہ قبول کرنا انھوں نے اپنی شان کے خلاف سمجھا تب سے ہم لوگوں کا کئی پُشتوں کا تعلق ہتھوا راج سے چھوٹ گیا

یہ میری پیدائش سے پہلے کی بات ہے۔

ہتھوا سے چلے آنے کے بعد چودھر لال جی زیرادیئی میں رہنے لگے اور کچھ دنوں کے بعد تھوڑے دنوں کے لئے گورکھپور میں تمکُہی راج کے دیوان ہو گئے لیکن اس وقت اُن کی عمر کچھ زیادہ ہو چکی تھی وہاں کی آب و ہوا موافق نہ ہونے کی وجہ سے وہ جلد ہی وہاں سے جواب دے کر چلے آئے۔ اُن کے آخری دن زیرادیئی میں ہی بیتے۔ مجھے تمکہی کی باتیں کچھ کچھ یاد آتی ہیں میں اِن دنوں بہت چھوٹا تھا۔

بھائی بہن

اُوپر کہہ آیا ہوں کہ میرے باپ کی پانچ اولاد میں سب سے بڑی بھگوتی دیوی ہیں۔ اُن کا بیاہ میری پیدائش سے ہی ایک بڑے مال دار کائستھ خاندان میں ہوا۔ بچپن میں جب شاید چار پانچ برس کا تھا وہاں گیا تھا اور ان لوگوں کی شان و شوکت دیکھی تھی۔ میرے بہنوئی چھ بھائی تھے۔ سب کے لئے الگ الگ نوکر اور سپاہی تھے۔ کئی ہاتھی گھوڑے تھے اور کئی قطعہ کی بڑی حویلی تھی، نہ جانے کس طرح چار پانچ برسوں کے اندر دیکھتے ہی دیکھتے ساری زمینداری جس کی آمدنی سُنتے ہیں ستّر چھتّر ہزار روپئے سالانہ تھی بک گئی۔ میرے بہنوئی کی رحلت بھی انہیں دنوں زیرادیئی میں میرے گھر پر ہو گئی۔ میں چھوٹا تھا۔ پھر بھی اس وقت کا ہیجان اور دادا، چچا، والد اور گھر کی عورتوں کی قابلِ رحم حالت کا نقشہ ابھی تک نہیں بھولتا میں نے اپنے ہوش میں موت کا نظارہ پہلے پہل یہی دیکھا۔

اُن سے چھوٹی بہن کی شادی اُن کے بعد ہوئی۔ بھائی صاحب کی بھی شادی ہوئی۔ اُن دونوں شادیوں کو بھی میں نے دیکھا۔ بھائی کی شادی میں میں برات میں گیا تھا۔ اس وقت شاید میں چار برس کا تھا۔ وہاں جا کر ماں کے لئے رونے بھی لگا تھا۔ اس وقت تک

شاید ہی ایک دو دن کے لئے ماں سے بچھڑ کر کہیں گیا ہوں۔ بھائی صاحب مجھ سے آٹھ برس بڑے تھے۔ اس لئے مجھ کو بہت باتوں کی سہولت ہوئی جو اُن کی تعلیم کا سلسلہ تھا قدرتاً وہی میرے لئے بھی ہو گیا اور میں بغیر کسی خاص دشواری کے اُن کے پیچھے پیچھے چلتا گیا۔

گھر میں چودھر لال جی رہتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں اور میرے چچا کی لڑکی جو مجھ سے پانچ مہینے چھوٹی تھی ان کے بدن پر لوٹ پوٹ کر کھیلا کرتے۔ میرے چچا صاحب زمینداری کا انتظام کرتے اور اکثر چھپرا آیا جایا کرتے۔ وہاں زمینداری کے مقدمے (جو ہمیشہ کچھ نہ کچھ لگے ہی رہتے ہیں) ہوا کرتے تھے۔ میرے بھائی صاحب چھپرا انگریزی پڑھنے کے لئے بھیج دیئے گئے تھے۔ جب تب اُن کو دیکھنے کے لئے بھی وہیں جایا کرتے۔ جب کبھی اُن کے چھپرا میں آنے کی خبر ملتی ہم بچے گھر سے کچھ دور جا کر ہی ان کا خیر مقدم کرتے اِس خیر مقدم کا مطلب تھا مٹھائی پھل وغیرہ کی طلب پیش کرنا اور جو کچھ مل جائے اُسے لے اُن سے پہلے ہی دوڑ کر گھر پہنچ کر ماں کو دکھانا۔

میرے والد گھر پر رہا کرتے تھے۔ زمینداری کے انتظام سے ان کا سروکار رہتا۔ اُن کو باغ لگانے کا شوق تھا۔ وہ بہت وقت باغ باغیچے لگانے ہی میں گذارنے۔ آج بھی اُن کے لگائے ہوئے آم کے دو بڑے بڑے باغیچے ہم لوگوں کے قبضے میں ہیں جن میں اچھے اچھے آم پیدا ہوتے ہیں۔ وہ فارسی کے اچھے عالم تھے۔ کچھ کچھ سنسکرت بھی جانتے تھے آیور وید اور طب میں بھی ان کو دلچسپی تھی۔ ان مضامین کی کتابوں کو انہوں نے جمع کر رکھا تھا اور ان کا مطالعہ بھی کیا کرتے تھے۔ وہ اس طرح بغیر باقاعدہ تعلیم پائے ہوئے ہوشیار وید یا حکیم ہو گئے تھے۔ اُن کے پاس طرح طرح کے مریض آیا کرتے جو دوا خرید سکتے۔ ان کو نسخے لکھ کر دیتے غریبوں کو اپنے پاس سے بھی دوا دیتے۔ اُن کے ساتھ ایک نوکر ہمیشہ دوا تیار کرنے کے

لئے ہی رہتا۔ کبھی کسی کی نبض نہیں دیکھتے تھے اور نہ کسی کے گھر جاکر مریض کو ہی دیکھتے تھے۔ حالت سُن کر دوا دے دیتے اور بہتیروں کو آرام بھی ہو جاتا۔ اُس سے ان کی نیک نامی پھیلی تھی۔ وہ جسم کے بھی توانا تھے، بچپن سے اکھاڑے میں اُنہوں نے کسرت کی تھی۔ مجھے یاد ہے جب میں اسکول یا کالج میں پڑھتا تھا اور چھٹیوں میں گھر آیا کرتا تھا تو وہ خود مُگدر گھمانا دکھاتے تھے اور ساتھ ساتھ مُگدر گھما کر طرح طرح کے کھیل دکھاتے تھے۔ گھوڑے کی سواری اچھی کرتے تھے اور ہمیشہ ایک اچھا گھوڑا رکھا کرتے۔ بچپن میں مجھے اور بھائی صاحب کو گھوڑے کی سواری کرنا انہوں نے ہی سکھایا تھا۔ چھوٹی ہی عمر میں ہم دونوں بھائی دو گھوڑوں پر سوار ہو کر کبھی کبھی چھٹیوں میں زیرادیئی آنے پر گھومنے پھرنے آیا کرتے۔

لڑکپن میں ہم لوگ دیہاتی کھیل بھی کھیلا کرتے۔ خاص کر وہاں کا مروج کھیل کبڈّی اور چِکا تو ہم خوب کھیلتے تقریباً کوئی دن بغیر کھیلے نہیں گذرتا ہوگا یہ سلسلہ اُس وقت تک جاری رہا جب تک کالج کی پڑھائی ختم نہیں ہوئی۔ جب کبھی چھٹیوں میں ہم زیرادیئی جاتے تھے کھیل ضرور کھیلتے جس میں بھائی بھی شریک ہوتے۔ ایک اور کھیل گاؤں میں عام تھا اس کو دولھا پاتی کہتے ہیں اس میں پیڑوں پر چڑھنا ہوتا ہے۔ میں پیڑوں پر چڑھنے سے ڈرتا تھا۔ اس لئے اس کھیل میں کبھی شریک نہیں ہوا، اسی طرح گاؤں میں بہتی ندی نہ ہونے سے تیرنا بھی نہیں سیکھ سکا۔

ماں اور دادی مجھے پیار کرتیں۔ بچپن سے ہی میری عادت تھی کہ میں شام کو بہت جلد سو جاتا تھا اور اِدھر کچھ رات رہتے ہی بہت سویرے جاگ جاتا تھا گھر پکا تھا مگر بنا تھا پُرانے طرز پر بیچ میں آنگن اور چاروں طرف دالان اور کمرے، کمرے میں ایک دروازہ اور چھپر کے نزدیک ہر کمرے میں ایک یا دو چھوٹے چھوٹے روشن دان۔ جاڑوں میں خاص کر لمبی رات ہونے کی وجہ سے رات رہتے ہی نیند ٹوٹ جاتی اور اسی وقت سے ماں کو بھی میں سونے نہ دیتا رضائی

کے اندر ہی اندر اُن کو جگاتا۔ وہ جاگ کر سویرے کے بھجن سناتیں۔ کبھی کبھی رامائن وغیرہ کی کتھائیں بھی سناتیں۔ ان بھجنوں اور کتھاؤں کا اثر میرے دل پر بہت پڑتا۔ اسی طرح جب تک روشندان سے باہر کی روشنی نظر نہ آتی۔ میں پڑا رہتا اور ماں سے بھجن گوا تا رہتا یا کتھا کہلاتا رہتا۔ جب روشنی خوب ہو جاتی تب گھر کے باہر نکلتا۔ شام کو اتنے پہلے سو جاتا کہ شاید ہی کبھی رات کا کھانا جاگتے جاگتے کھایا ہو۔ اُن دنوں رات کا کھانا بھی بہت دیر کے بعد تیار ہوتا۔ بچّے کیا بوڑھے بھی ایک نیند سو کر اُٹھنے کے بعد ہی کھانا کھائے۔ شاید ہی کسی رات کو بارہ ایک بجے سے پہلے کھانا پینا ہوتا ہو۔ پہلے گھر کے مرد کھاتے تب عورتیں کھاتیں اور تب نوکر کھاتے۔ گرمی کے دنوں میں تو نوکروں کو کھاتے کھاتے کبھی سویرا ہو جاتا۔ اس لئے اگر میں شام کو بغیر کھائے سو جاتا تو میں اپنا کوئی قصور ماننے کو تیار نہیں ہوں۔

گھر میں کھانا پکانے کے لئے ایک کائستھ تھے اس لئے رسوئی کا بار میری چچی یا ماں پر نہیں تھا۔ تو بھی اُنہیں ترکاری وغیرہ تو کچھ بنانی ہی پڑتی۔ شام ہوتے ہی میں ماں کو پکڑ لیتا اور ساتھ سونے کے لئے رونے لگتا۔ اگر وہ کسی کام میں لگی ہوتیں تو اُسے چھوڑ میرے ساتھ نہیں سونا پڑتا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ یہ عمل بہت دیر تک نہ چلتا کیونکہ میں بہت جلد سو جاتا اور جب ایک بار سو گیا تو وہ پھر اُٹھ کر چلی جاتیں اور کام کرنے لگتیں۔ مجھے یاد ہے کہ ہمیشہ رات کو مجھے جگا کر کھلایا جاتا۔ آنکھیں کھلتی نہیں مگر بدن ہلا کر ماں طوطا مینا کے نام اور قصّے کہہ کر مُنھ کھلوا دیتی اور اس میں غذا دے دیتی۔ ایک دائی تھی جس کو ہم کاکی کہا کرتے تھے وہ اس طرح کھلانے میں بڑی مشّاق تھی۔ جب کسی دوسرے کی ہزار کوشش پر بھی آنکھ اور مُنھ بند ہی رہتے تو بھی وہ کسی نہ کسی ترکیب سے مُنھ تو ضرور کھلوا دیتی اور بھات (چاول) کھلا دیتی شام کے بعد ہی سونے اور سویرا ہوتے ہی جاگنے کی میری عادت برابر بنی رہی۔ یہاں تک کہ جب میں چھپرا اور پٹنہ

پڑھنے کے لئے گیا تب بھی رات ہوتے ہی بہت جلد سو جاتا اور پانچویں کلاس میں پہنچنے کے وقت تک شاید ہی کبھی رات کو اپنے ہاتھوں کھایا ہو ایک برہمن رسوئی دار تھے جو رات کو مجھے گود میں بٹھا کر اُسی پُرانے معمول سے آنکھیں بند رہنے پر بھی کھُلے مُنھ میں چاول کے گولے رکھ دیا کرتے جن کو میں نگل جایا کرتا تھا۔

جب میں وکالت کرتا تھا تب تک شام کو ہی سو جانے کی عادت جاری رہی شام کے وقت مؤکّلوں سے کاغذ لے کر دیکھنے بیٹھتا اور ان کے سامنے ساڑھے سات آٹھ بجے ہی اونگھنے لگتا تب کام بند کر دیتا۔ ۱۵-۱۹۱۴ء میں جب میں ایم۔ ایل کے امتحان کے لئے تیاری کر رہا تھا ایک واقعہ گذرا۔ ان دنوں کلکتہ ہائی کورٹ میں میں وکالت کرتا تھا۔ لاکالج میں پروفیسری بھی مل گئی تھی۔ کچھ مقدّمے بھی ہاتھ میں رہا کرتے تھے اس لئے سویرے کا وقت مقدّموں کی بحث کی تیاری اور کالج کی پڑھائی کی تیاّری میں چلا جاتا۔ دن کا وقت کچہری میں گذر جاتا صرف رات کا ہی وقت امتحان کی تیاری کے لئے ملتا۔ اِسی لئے شام کو ہی کتابیں پڑھنا اور جب کتابیں ہاتھ میں آتیں نیند بھی آجاتی، ایک دن سوچا کہ اس طرح تو امتحان کی تیاّری میں کامیابی نہیں ملے گی کسی طرح شام کی نیند کو روکنا چاہیئے۔ اور کم سے کم نو بجے رات تک تو پڑھنا ہی چاہیئے۔ جب نیند آنے لگی تو کتاب ہاتھ میں لے کر کھڑا ہو گیا۔ اُس پر بھی جب نیند کا حملہ کم نہ ہوا تو کمرے کے اندر ٹہل ٹہل کر پڑھنے لگا۔ معلوم نہیں کتنی دیر تک یہ عمل چلا۔ یکبارگی ہاتھ سے کتاب نیچے گری اور میں بھی ساتھ ہی ساتھ دھڑام سے کمرے کے فرش پر چت ہو رہا، نہ معلوم سر کیوں نہیں پھوٹا کچھ تو چوٹ ضرور آئی۔ تب سے اس طریقے کو خطرناک سمجھ کر چھوڑ دیا اور جو کچھ وقت بیٹھے بیٹھے پڑھ کر نکال سکتا اتنا ہی پڑھ کر صبر کرتا۔

اِبتدائی تعلیم

پانچویں یا چھٹے سال میں میری تعلیم شروع ہوئی۔ اس وقت میرے بھائی انگریزی پڑھنے کے لئے چھپرا جا چکے تھے۔ اس زمانے کی مروجہ رسم کے مطابق بسم اللہ مولوی صاحب نے کرائی تھی جس دن تعلیم شروع ہوئی حرف شناسی کی ابتدا بسم اللہ سے ہوئی، شیرینی بانٹی گئی اور اُن کو روپئے بھی دئے گئے۔ ہم تین طالب علم ان کے سپرد کئے گئے۔ ایک میں اور دو میرے چچیرے بھائی۔ اُن میں سے ایک جمنا پرشاد جو سب سے بڑے اور مجھ سے دو برس بڑے ہیں دوسرے اب نہیں رہے وہ بھی مجھ سے بڑے تھے۔ جمنا بھائی ہم سب کے لیڈر تھے اور تمام کھیلوں اور لڑکپن کی چہل بازی میں پیش پیش رہا کرتے تھے ان کے ایک چچا جو میرے بھی چچا ہوتے تھے بڑے مذاق پسند تھے۔ وہ میرے والد سے چھوٹے تھے، مگر والد کے کئی وصف انہوں نے بھی حاصل کئے تھے وہ بھی گھوڑے کی اچھی سواری کرتے دوا کرتے اور بانٹتے اور بندوق اور غلیل چلانا خوب جانتے تھے۔ فارسی بھی پڑھتے تھے اور شطرنج بھی خوب کھیلتے تھے مگر ان سب باتوں میں وہ میرے والد کا لوہا مان لیتے تھے بڑے ہی ہنس مکھ اور پُر مذاق آدمی تھے۔

مولوی صاحب جو ہم لوگوں کو پڑھانے آئے عجیب آدمی تھے۔ اُن کا بہت باتوں پر دعویٰ تھا۔ بلدیو چچا کے مذاق کے لئے وہ ایک بہت ہی موزوں وسیلہ بن گئے چچا طرح طرح کی باتیں مولوی صاحب کو سُناتے اور انہیں جوش دلا کر کہلا لیتے کہ کوئی بھی بات یا کام ہو وہ بھی جانتے اور کر سکتے تھے۔ اس طرح مولوی صاحب کا دعویٰ تھا کہ وہ شطرنج کھیلنا جانتے تھے۔ بلدیو چچا شطرنج کھلاتے مگر باوجود دعوے کے مولوی صاحب کبھی جیتتے نہیں تھے۔ ہم چھوٹے چھوٹے بچّے ان سارے مذاقوں کو خوف اور شوق سے دیکھتے۔ ہنسنے کا موقع آجائے تو بھی ہنسنا مشکل ہو جاتا۔ مذاق کی بات دادا صاحب چودھر لال جی تک پہنچ گئی وہ بھی کبھی کبھی اس میں شریک ہو جاتے۔

ایک دن بلدیو چچا نے مولوی صاحب سے کہا کہ باغ میں ہنومان آگئے ہیں، ان کو کسی طرح بھگانا چاہیئے۔ وہ غلیل سے مار کر بھگائے جا سکتے ہیں اتنا کہنا تھا کہ مولوی صاحب نے دعویٰ پیش کر دیا کہ وہ بھی غلیل چلانا خوب جانتے ہیں۔ بلدیو چچا تو سمجھ ہی گئے تھے کہ وہ کچھ نہیں جانتے مگر مذاق انہیں منظور تھا۔ وہ انہیں ساتھ لے کر باغیچہ میں گئے۔ غلیل اور گولی اُن کے سپرد کر کے کہا کہ خوب کھینچ کر ایک بندر کو ماریئے۔ مولوی صاحب نے خوب کھینچ کر گولی چھوڑی اور دیکھنا چاہا کہ بندر کو کیسی چوٹ لگتی ہے کہ اتنے میں ان کے بائیں ہاتھ کے انگوٹھے سے ٹپ ٹپ خون ٹپکنے لگا اور چوٹ کے درد سے سہم کر بیٹھ گئے۔ گولی بندر کے لگنے کے بدلے مولوی صاحب کے اپنے انگوٹھے پر ہی جا بیٹھی تھی۔

ایک دوسرے دن کا ذکر ہے کہ شام کو سب لوگ جن میں ہمارے دادا صاحب بھی شریک تھے ٹہلنے نکلے۔ مولوی صاحب اور بلدیو چچا بھی تھے۔ طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ اتنے میں ایک سانڈ نظر آیا۔ لوگوں نے کہا کہ وہ لوگوں کو مارتا ہے۔ بلدیو چچا کے اشارے

پر مولوی صاحب اس سے کب ڈرنے والے تھے۔ بے خوف آگے بڑھے کہ اتنے میں سانڈ نے اُن کو دے پٹکا۔ اس طرح کے مذاق برابر ہی ہوا کرتے۔

ایک دن بلدیو چچا نے مولوی صاحب کو بندوق چلانے کی صلاح دی۔ مولوی صاحب کسی چیز کو نہ جاننا قبول کرنا اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے اور انھوں نے صاف کہہ دیا کہ وہ اچھا نشانہ لگا سکتے ہیں۔ اُنہیں ساتھ لے کر بلدیو چچا بندوق لے کر گئے۔ مولوی صاحب کے دو لڑکے تھے جو ہم لوگوں کے ساتھ ہی پڑھا کرتے تھے۔ ہم سب اور وہ دونوں لڑکے بھی ساتھ ہو لئے۔ کچھ دُور پر اونچے درخت پر ایک گدھ بیٹھا نظر آیا۔ بلدیو چچا نے اسی پر نشانہ لگانے کو کہا۔ وہ کافی اونچائی پر تھا اور تقریباً کھڑی بندوق کر کے ہی نشانہ لگ سکتا تھا مولوی صاحب کو جو بندوق دی گئی تھی وہ پُرانے قسم کی تھی (جس میں بارود اوپر سے بھری جاتی تھی۔) اور بھاری بھی تھی۔ مولوی صاحب نے شائد پہلے کبھی بندوق نہیں چلائی تھی۔ انھوں نے تقریباً کھڑی بندوق اپنے سینے پر رکھ کر نشانہ لگایا۔ اُدھر بندوق کا گھوڑا اچھکا، اور اِدھر گدھ کے بدلے مولوی صاحب زمین پر چت گرے۔ بلدیو چچا نے جھٹ سے اُنہیں اُٹھایا اور لڑکوں کو پانی لانے کے لئے بھیجا۔ مولوی صاحب کسی طرح گھر پر لائے گئے۔ اس طرح کے مذاقوں کے بیچ ہم لوگ فارسی پڑھتے رہے۔ کوئی چھ آٹھ مہینوں کے بعد مولوی صاحب چلے گئے۔ ہم لوگ شائد حرف سیکھ چکے تھے اور کریما (پند نامہ سعدی) پڑھنے لگے تھے۔ پھر دوسرے مولوی بلائے گئے جو بہت متین تھے اور اچھا پڑھاتے بھی تھے۔ وہی دو برسوں تک رہے اور کریما (پند نامہ سعدی)، مامقیماں، خالق باری، خوش حال سیمیاں، دستور الصبیاں، گلستاں، بوستاں تک ہم لوگوں کو پڑھا سکے۔

اسی زمانے میں ہم لوگوں نے کیتھی لکھنا اور گنتی کرنا سیکھ لیا۔ مگر یہ یاد نہیں کہ یہ کب

اور کیسے سیکھا۔ ہفتہ میں ساڑھے پانچ دن فارسی پڑھتے تھے۔ جمعرات کی دوپہر کے بعد، اور جمعہ کی دوپہر تک فارسی سے چھٹی رہتی تھی اور اسی میں کیتھی اور گنتی وغیرہ سیکھتے۔ اس کے سوا کچھ کھیلنے کودنے کے لئے بھی زیادہ وقت دیا جاتا۔ پڑھنے کا طریقہ تھا کہ خوب سویرے ہم لوگ اُٹھ کر مکتب چلے جاتے۔ مکتب میرے پکے مکان سے الگ ایک دوسرے مکان کی دالان میں تھا۔ ایک کوٹھری تھی جس میں مولوی صاحب رہا کرتے اور سامنے دالان میں تخت پوش پر بیٹھ کر ہم لوگ پڑھا کرتے۔ مولوی صاحب کبھی اپنی چارپائی پر اور کبھی تخت پوش پر بیٹھ کر پڑھایا کرتے۔ سویرے اگر پہلے کا پڑھا ہوا سبق ایک بار پکّا کرنا پڑتا اور جو جتنا جلد پکّا کر لیتا اس کو اتنی ہی جلد نیا سبق پڑھا دیا جاتا میں اکثر اپنے دونوں ساتھیوں سے پہلے مکتب پہنچ جاتا اور سبق پکّا کرتا پہلے ختم کرکے آگے کا سبق لے لیا کرتا۔ یہ کرتے کرتے سورج نکلنے کا وقت ہو جاتا کچھ دن بھی نکل آتا تب نوکر آتا اور ساتھ لے جاکر مونہہ ہاتھ دُھلا دیتا اور گھر ماں کے پاس کُچھ کھانے کے لئے پہنچا دیتا اس کے لئے تقریباً آدھ پون گھنٹے کی چھٹی ملتی ناشتہ کرکے لوٹنے پر سبق یاد کرنا پڑتا اور سبق یاد کرکے سنا دینے کے بعد مولوی صاحب حکم دیتے، کتاب بند کرو۔ کتاب بند کرکے تختی نکالنی پڑتی۔ اِن دونوں عملوں کے درمیان کچھ وقت کھیلنے کودنے کا بھی مل جاتا یا دوبارہ گھر جاکر کچھ کھا لینے کا بھی موقع مل جاتا۔ تختی پر لکھنا ہوتا اور جب تختی بھر جاتی اُسے دھونا پڑتا۔ اس عمل میں بھی کچھ وقت آپس میں ہنسنے کھیلنے کا مل جاتا۔ دوپہر کو نہانے کھانے کے ایک ڈیڑھ گھنٹہ کی چھُٹی ملتی اور کھا کر پھر مکتب میں ہی اسی تخت پوش پر سونا پڑتا۔ مولوی صاحب چارپائی پر سوتے۔ ہم لوگوں کو اکثر نیند نہ آئی اور تخت پوش پر لیٹے لیٹے شطرنج کھیلتے جب مولوی صاحب کے جاگنے کا وقت ہوتا تو اُس سے پہلے ہی مُہرے اُٹھا کر رکھ دیتے اسی زمانے میں کبھی شطرنج کھیلنا آگیا مگر یہ یاد نہیں کہ کب کیسے اور کس سے

سیکھا۔ دوپہر کے بعد دوسرا سبق ملتا اور اس کو کچھ حد تک یاد کر کے سُنانے کے بعد گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ دن رہے کھیلنے کے لئے چُھٹی ملتی، اسی وقت گیند چکا وغیرہ کھیل کھیلتے۔ شام کو پھر چراغ جلے کتاب کھول کر پڑھنے کے لئے بیٹھنا پڑتا۔ دن کے دونوں سبق یاد کر کے پھر سُنانے پڑتے اور تب حکم ہوتا۔ کتاب بند کرو۔ کتاب بند کر کے قاعدہ کے مطابق مولوی صاحب کو آداب عرض کر کے گھر جا کر سو جاتے۔

شام کو نیند جلد آتی، اس سے ہمیشہ ڈر تھا کہ کہیں اونگھتے دیکھ کر مولوی صاحب مار نہ بیٹھیں، جلد چھٹی ملنے کے لئے دو ترکیبیں تھیں۔ کھیل کود میں جمنا بھائی لیڈر تھے اور جلد چُھٹی پانے کے جتن بھی وہی کرتے۔ پڑھنے کے لئے تیل کا چراغ جلایا جاتا تھا۔ جمنا بھائی دن کو ہی کپڑے میں راکھ یا دھول باندھ کر چھوٹی سی پوٹلی بنا کر چھپا کر رکھ دیتے۔ جس دن چراغ میں تیل زیادہ دیکھنے میں آتا، چراغ کی لَو اکسانے کے بہانے چھپا کر پوٹلی چراغ میں رکھ دیتے۔ وہ دیکھتے ہی دیکھتے تیل جذب کر لیتی اور جلد ہی کتاب بند کرنے کا حکم دے دیتے۔ کسی کسی دن جمنا بھائی پیشاب کے لئے چُھٹی مانگ کر باہر جاتے اور پیشاب کرنے کے بدلے دوڑ کر کبھی میری ماں کے پاس، کبھی اپنی ماں کے پاس اور کبھی گنگا بھائی کی ماں کے پاس جا کر کہہ آتے کہ اب نیند لگ رہی ہے جلد دائی کو ہمیں بلانے کے لئے بھیجو، نہیں تو پٹ جائیں گے۔ ان کے پیشاب کر کے واپس ہونے کے تھوڑی ہی دیر بعد دائی پہنچ جاتی اور کہتی کہ اب چُھٹی دیدیجئے۔ مولوی صاحب چُھٹی دیدیتے۔

ایک دن جب اس طرح جمنا بھائی دوڑے جا رہے تھے گاؤں کے ایک صاحب نے جو رشتے میں ہم لوگوں کے چچا ہوتے تھے انہیں دیکھ لیا اور جا کر مولوی صاحب سے کہہ دیا کہ جمنا کہیں دوڑے جا رہے تھے۔ تحقیقات ہوئی۔ جمنا بھائی نے صفائی دی کہ وہ پیشاب

کرنے گئے تھے اور اندھیرے میں ڈر گئے اس لئے بھاگے جارہے تھے۔ اس طرح بچے۔

جو کچھ وہاں فارسی کا علم ہوا، انہی مولوی صاحب نے دیا۔ ہم سب کو بھی ان سے اُنس ہو گیا تھا۔ جب گھر چھوڑ کر چھپرا انگریزی پڑھنے کے لئے جانا پڑا مولوی صاحب کو اور ہم لوگوں کو بھی بہت دُکھ ہوا۔

گاؤں کی زِندگی

ان دنوں گاؤں کی زندگی آج سے کہیں زیادہ سادہ تھی۔ زیرادیئ اور زماں پور دو گاؤں ہیں مگر دونوں کی بستی اس طرح مِلی جُلی ہے کہ یہ کہنا مشکل ہے کہ کہاں زیرادیئ ختم ہے اور کہاں زماں پور شروع ہے۔ اس لئے آبادی کے لحاظ سے دونوں گاؤں کو ساتھ بھی مان لیا جائے تو کوئی ہرج نہیں۔ دونوں گاؤں میں تقریباً سبھی ذاتوں کے لوگ بستے ہیں آبادی دو ہزار سے زیادہ ہوگی۔ ان دنوں میں بھی گاؤں میں ملنے والی تقریباً سبھی چیزیں وہاں ملتی تھیں اب تو کچھ نئی طرح کی دُکانیں بھی ہوگئی ہیں، جن میں پان بیڑی بھی بکتی ہے۔ ان دنوں ایسی چیزیں نہیں ملتی تھیں اگرچہ کالا تمبا کو اور کھانے کا تمباکو بِکا کرتا تھا۔ کپڑے کی دکانیں اچھی تھیں، جہاں سے دوسرے گاؤں کے لوگ اور کچھ باہر کے بیوپاری بھی کپڑا لے جایا کرتے تھے چاول دال، آٹا، مصالحہ، نمک، تیل وغیرہ وہاں سب کچھ بکتا تھا اور چھوٹی موٹی دکانیں دوا کی بھی تھیں جن میں ہڑ، بہیڑا، پیپلی وغیرہ کی قسم کی چیزیں مل سکتی تھیں۔ جہاں تک مجھے یاد ہے صرف مٹھائی کی کوئی دُکان نہیں تھی۔ گاؤں میں کوری لوگوں کی کافی بستی ہے۔ اس لئے ساگ سبزی کافی ملتی تھی۔ اہیر کم تھے مگر آس پاس کے گاؤں میں ان کی کافی آبادی تھی، اِس لئے

دہی دودھ بھی ملتا تھا۔ چرخے کافی چلتے تھے۔ گاؤں میں جولاہوں کی بھی آبادی تھی جو سوت لے کر کپڑا بن دیا کرتے تھے۔ منہار چوڑیاں بنا لیتے۔ بساطی چھوٹی موٹی چیزیں جیسے بندی وغیرہ باہر سے لاکر بیچتے اور کچھ خود بھی بناتے۔ مسلمانوں میں منہار، بساطی، معمار اور جولاہے ہی تھے، کوئی شیخ، سید نہیں رہتا تھا۔ ہندوؤں میں برہمن، راجپوت، بھومی ہار، کائستھ، کوری، کرمی لمکر، تُرہا، گونڈ، ڈوم، چمار، دوسادھ وغیرہ سبھی ذاتوں کے لوگ بستے تھے۔ میرا خیال ہے کہ سب سے زیادہ بستی راجپوتوں کی ہے۔ ان میں کچھ تو زمیندار طبقے کے ہیں جو پُرانے خاندانی سمجھے جاتے ہیں اور کچھ معمولی کسان طبقہ کے ہیں۔ کائستھوں کے زیادہ تر ادیئی ہی میں پانچ گھر تھے جن میں تین تو ہمارے سگے تھے اور دو رشتہ داری کے سبب باہر سے آکر بس گئے تھے۔

سب کچھ تقریباً گاؤں میں ہی مل جاتا تھا اس لئے گاؤں کے باہر جانے کا لوگوں کو بہت کم اِتفاق ہوتا تھا۔ گاؤں میں ہفتہ میں دو بار بازار بھی لگتا تھا جہاں آس پاس کے گاؤں کے کچھ دکان دار بھی اپنا اپنا مال سر پر یا بیل، گھوڑے یا بیل گاڑی پر لاد کر لاتے تھے بازار میں مٹھائی کی دُکان بھی آجاتی تھی اور جو چاہتے انہیں مچھلی اور گوشت بھی خریدنے کو مل جاتا۔ جن کی ضرورتیں اس طرح پوری نہ ہوتیں وہ سیوان جاتے وہیں تھانہ اور مجسٹریٹ ہیں، کچہریاں اور دکانیں بھی ہیں۔ وہ ایک قصبہ ہے جو ان دیہات کے لوگوں کے لئے بہت بڑی جگہ کا رتبہ رکھتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ گاؤں میں باہر سے سگے رشتہ داروں کے سوا بہت کم لوگ آیا کرتے تھے۔ مولوی صاحب کے یہاں دو چار مہینے میں ایک بار ایک آدمی فارسی کی چھوٹی موٹی کتابوں کی ایک چھوٹی گٹھری اور ایک دو بوتلوں میں سیاہی (آج کل کی بلیو بلیک روشنائی نہیں) لئے آجاتا تھا۔ جب یہ آتا تو ہم بچوں کے ذوق شوق کا ٹھکانا نہ رہتا۔ کبھی کبھی جاڑوں میں کوئی

نارنگی لیموں کی ٹوکری لئے بیچنے آجاتا تو ہم بچّے اتنے خوش ہوئے گویا کچھ نایاب مل گیا۔ ایک دن ایسا ہی ایک آدمی آیا اور میں دوڑ کر ماں سے کہنے گیا۔ وہاں سے دوڑ کر باہر آرہا تھا کہ پیر میں زور سے کسی چیز کی ٹھوکر لگی، گر گیا۔ ہونٹ میں چوٹ آئی اور خون بہنے لگا۔ بہت دنوں تک اُس کا نشان رہا۔ ایک بار اور کسی چیز کے لئے دوڑتا ہوا گر گیا تھا اُس کا نشان تو آج کل بھی دائیں آنکھ کے نیچے گال پر موجود ہے گاؤں میں پھل آم کے دنوں میں آم اور کبھی کبھی معمولی طور پر کیلے مل جاتے تھے۔ چچا صاحب جن کو ہم لوگ نونو کہا کرتے تھے۔ چپراسے کبھی کبھی انگور لایا کرتے تھے۔ انگور آج کل کی طرح سرِ عام گچھوں میں نہیں بکا کرتے تھے۔ کاٹھ کی چھوٹی پیٹی میں روئی کے پھاہے کے بیچ میں رکھ کر بیچے جاتے تھے اور دام بھی کافی لگتے تھے گاؤں کے لوگ صرف آم اور کیلے ہی موسم میں پاتے تھے۔

گاؤں میں دو چھوٹے چھوٹے مٹھ ہیں جن میں ایک ایک سادھو رہا کرتے تھے۔ گاؤں کے لوگ اُن کو کھانا دیتے اور وہ صبح شام گھنٹہ گھڑیال بجا کر آرتی کرتے۔ آرتی کے وقت کچھ لوگ جمع بھی ہو جاتے۔ کبھی کبھی ہم لوگ بھی جایا کرتے تھے اور باباجی تلسی دل کا پرشاد بھی دیا کرتے تھے۔ رام نومی اور خاص کر جنم اشٹمی میں مٹھ میں تیاری ہوتی تھی ہم سب بچّے کاغذ اور پنّی کے پھول کاٹ کر ٹھاکر باڑی کے دروازہ اور سنگھاسن پر لگاتے تھے اور تقریب میں شریک ہوتے اور برت رکھتے تھے اور ددھی کاندو کے دن خوب دہی ہلدی ایک دوسرے پر ڈالتے تھے۔ تقریباً ہر سال کارتک میں کوئی نہ کوئی پنڈت آجاتے جو ایک ڈیڑھ مہینہ رامائن بھاگوت یا کسی دوسرے پران کی کتھا سناتے تھے۔ جس دن پورن آہوتی (آخری تقریب) ہوتی تھی۔ اس دن گاؤں کے سب لوگ جمع ہوتے تھے اور کچھ نہ کچھ پوجا چڑھاتے۔ میرے گھر سے زیادہ پوجا چڑھتی۔ کیوں کہ ہم سب سے بڑے سمجھے جاتے تھے اکثر کتھا بھی میرے ہی

دروازے پر ہوا کرتی تھی۔ اس کا سارا خرچ ہم کو ہی دینا پڑتا تھا۔ جب گاؤں میں پنچائتی کتھا ہوتی تو گاؤں بھر کے لوگ باری باری سے پنڈت کے کھانے کا سامان پہنچاتے اس میں میرا بھی گھر شامل رہتا ہم بچے تو شاید ہی کتھا کا کچھ زیادہ حصہ سُن پائے ہوں۔ کیوں کہ میں تو شام کے بعد ہی سو جاتا مگر جب آرتی ہوتی تو لوگ جگا دیتے اور پرشاد کھلا دیتے۔

تفریح اور تعلیم کا ایک دوسرا ذریعہ رام لیلا تھی، وہ کنوار میں ہوا کرتی تھی۔ رام لیلا کرنے والی جماعت کہیں سے آجایا کرتی اور پندرہ بیس دنوں تک خوب چہل پہل رہتی۔ لیلا کبھی زماں پور میں ہوئی، کبھی زیرادیئی میں۔ لیلا بھی عجیب ہوتی اس میں رام لکشمن وغیرہ جو بنتے کچھ پڑھے لکھے نہ ہوتے۔ ایک آدمی تلسی داس کی رامائن ہاتھ میں لے کر کہتا 'رام جی کہو ہے سیتا' وغیرہ اور رام جی وہی دُہرا۔ ۔ اسی طرح جن کو بھی کچھ کہنا ہوتا ان کو بتایا جاتا اور وہ پیچھے پیچھے اُسے دُہراتے جاتے۔ لوگوں کو تفریح اس مکالمہ سے زیادہ نہ ہوتی۔ کیونکہ بھیڑ زیادہ ہوتی اور سب کاروبار تقریباً سود و سوگز میں پھیلا رہتا تفریح تو لیلا والوں کی دَوڑ دھوپ اور خاص طور سے لڑائی وغیرہ کے سین سے ہی ہوتی۔ اُتر کی طرف رام جی کا اور دکھن کی طرف راون کا گڑھ بنتا اور اجودھیا اور جنک پور بنتا جس دِن جو کتھا پڑتی اس کا کچھ نہ کچھ سوانگ تو ہوتا ہی سب سے بڑی تیاری رام چندر کے بیاہ لنکا کانڈ کی لڑائی اور رام کے راج تلک (گدّی پر بیٹھنے) کے دن ہوتی۔ بیاہ میں تو ہاتھی گھوڑے منگوائے جاتے اور برات کی پوری سجاوٹ ہوتی۔ لنکا دہن (جلانے) کے لئے چھوٹے موٹے مکان بنا دیے جاتے جو سچ مچ جلا دیے جاتے ہنومان بانر (بندروں) نشاچروں (دیوؤں) کے الگ الگ چہرے ہوتے جو اُن کو وقت پر پہننے پڑتے اور ہم بچّوں کو وہ سچ مچ ڈراؤنے لگتے۔ بانروں کے کپڑے اکثر لال ہوتے۔ دیووں کے کالے۔ رام لکشمن جانکی کی خاص پوشاک ہوتی، اور ان کے سنگار میں تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے

لگ جاتے۔ لیلا شام کے وقت چار بجے سے چھ بجے تک ہوتی۔ رام لکشمن معمولی لوگوں کی طرح نہ چلتے۔ اُن کے قدم بہت اُونچے اُٹھتے اور لڑائی میں پینترے بدلنے کی تو ان کو خاص تعلیم دی جاتی، جس دن راج گدی ہوتی، اس دن قرب وجوار کے لوگ پوجا چڑھاتے جو نذر کی شکل میں رام جی کے قدموں چڑھائی جاتی۔ لیلا والوں کو کھانے کے علاوہ نقد جو کچھ ملنا ہوتا اُسی دن ملتا۔ دوسرے دن پھر رام لکشمن جانکی سنگار کر کے بڑے بڑے لوگوں کے گھر لے جائے جاتے جہاں کی عورتیں پردے کے باعث بھیڑ بھاڑ میں نہ جایا کرتیں۔ وہاں ان کی پوجا ہوتی اور اُن پر روپیے چڑھائے جاتے۔ ایک بات جس کا اثر مجھ پر بچپن سے ہی پڑا ہے۔ رامائن کا پاٹھ ہے گاؤں میں حرف شناس تو تھوڑے ہی لوگ تھے۔ ان دنوں پرائمری یا کسی دوسرے قسم کا اسکول گاؤں کے آس پاس بھی نہیں تھا مولوی صاحب ہم لوگوں کو تین چار روپیے اور کھانے پر پڑھایا کرتے تھے گاؤں میں ایک دوسرے مسلمان تھے جو ذات کے جولاہے تھے مگر کیتھی لکھنا جانتے تھے۔ منڈیا کا حساب بھی جانتے تھے۔ جس میں پہاڑا، ڈیوڑھے وغیرہ من سیر کی بکری اور کھیت کی پیمائش کا حساب شامل ہے۔ انہوں نے ایک پاٹھ شالہ کھول رکھی تھی جس میں گاؤں کے کچھ لڑکے پڑھتے تھے حرف شناس لوگ تو کم ہی تھے مگر شام کے وقت مٹھ میں یا کسی نہ کسی کے دروازے پر کہیں نہ کہیں کچھ لوگ جمع ہو جاتے اور ایک آدمی رامائن کی پوتھی سے چوپائی بولتا اور دوسرے سب اُسے دُہراتے اور ساتھ ہی جھانجھ اور ڈھولک بھی بجاتے تھے۔ بندنا (دعا) کا حصہ تو جب رامائن کا پاٹھ شروع ہوتا تو ضرور دُہرایا جاتا۔ اس طرح حرف ناشناس ہو کر بھی گاؤں میں بہتیرے ایسے لوگ تھے جو رامائن کی چوپائیاں جانتے اور دہرا سکتے تھے اور بندنا کے کچھ دوہوں کو تو تقریباً سبھی برزبان رکھتے تھے۔

تہواروں میں سب سے مشہور ہولی ہے۔ اس میں امیر غریب سبھی شریک ہوتے تھے

بسنت پنچمی کے دن سے ہی ہولی گانا شروع ہوتا۔ اسے گاؤں کی زبان میں تال اُٹھانا کہتے تھے اس دن سے ہولی کے دن جا بہ جا جھانجھ اور ڈھولک کے ساتھ کچھ آدمی جمع ہوتے اور ہولی گاتے۔ کبھی کبھی زیرا دیئ اور زماں پور کے لوگوں میں مقابلہ ہو جاتا اور ایک گیت ایک گاؤں کے لوگ جیسے ہی ختم کرتے ویسے ہی دوسرے گاؤں کے لوگ دوسرا شروع کر دیتے کبھی کبھی ہمارے آس پاس کے دوسرے گاؤں کے لوگ بھی غول باندھ کر آجاتے اور اس طرح کا مزیدار مقابلہ بڑے جوش سے ہوا کرتا۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار دو گاؤں میں بازی سی لگ گئی اور رات کو گاتے گاتے صبح طلوع آفتاب تک لوگ گاتے ہی رہے اور تب انہیں کہہ کر ہٹایا گیا۔ اس گانے میں جو آدمی ڈھولک بجاتا وہ پسینے پسینے ہو جاتا۔ ایک گاؤں میں ڈھولک بجانے والا ایک ہی آدمی تھا وہ ساری رات بجاتا رہا۔ اس کے ہاتھوں میں چھالے پڑ گئے۔ مگر وہ کہاں رُکنے والا تھا۔ گاؤں کی عزت جو چلی جاتی چھالے پڑے اور پھوٹ گئے اور اس طرح رات بھر میں کئی بار چھالے اُٹھے اور پھوٹے پر اس نے گاؤں کی عزت نہیں جانے دی یہ بات دوسرے دن مقابلہ ختم ہونے پر سویرے معلوم ہوئی اور سب لوگوں نے اس کی ہمت کی تعریف کی۔

ہولی کے دن بہت گندی گالی گلوچ ہوا کرتی۔ اس میں بڈھے جوان اور لڑکے بھی ایک ساتھ شامل ہوتے۔ گاؤں کے ایک گوشے سے ایک جماعت چلتی جو تقریباً ہر دروازے پر کھڑے ہو کر گالیاں گاتی اور گندی مٹی ڈھول اور کیچڑ ایک دوسرے پر ڈالتی ہوئی گاؤں کے دوسرے سرے تک چلی جاتی۔ یہی ایک موقعہ تھا جب بڑے چھوٹے کا لحاظ یکبارگی اُٹھ جاتا تھا۔ بڑے چھوٹے صرف عمر میں ہی نہیں بلکہ ذات اور طبقہ کی بڑائی چھوٹائی بھی اُٹھ جاتی تھی۔ چمار، برہمن اور راجپوت ایک دوسرے کو گالیاں سناتے اور ایک دوسرے پر کیچڑ پھینکتے

جب کوئی نیا آدمی صاف ستھرا مل جاتا تو اس کی بھی خوب گت بنتی۔ یہ مٹّی کا کھیل دوپہر تک جاری رہتا اس کے بعد سبھی نہاتے اور گھر گھر میں پوجا ہوتی۔ اس دن کا خاص کھانا پوری مال پوا تھے۔ غریب لوگ بھی کسی نہ کسی طرح کچھ انتظام کر ہی لیتے تھے۔ کھانے کے بعد تیسرے پہر گلال اور عبیر سے رنگ کھیلا جاتا۔ سب لوگ سفید کپڑے پہنتے۔ اس پر لال پیلے رنگ ڈالے جاتے۔ عبیر اور ابرق کا چورا چھڑکا جاتا۔ گری چھوارا پان اور ڈلی بانٹی جاتی اور خوب ہولی گائی جاتی۔ میں نے سنا ہے کہ اور جگہوں میں لوگ اس دن خوب شراب کباب کا بھی شغل کیا کرتے ہیں۔ مگر خوش قسمتی سے یہ اپنے گاؤں میں کبھی نہیں دیکھا۔ راجپوت برہمن اور بھومی ہار تو ہمارے یہاں شراب پینا گناہ سمجھتے ہیں۔ کہیں کہیں کائستھ لوگ پیتے ہیں۔ مگر میرے گھر میں ایک بہت پرانا رواج چلا آرہا ہے۔ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ ہمارے خاندان میں جو شراب پیئے گا وہ کوڑھی ہو جائے گا۔ اس لئے وہاں کائستھوں کے گھروں میں بھی کبھی شراب نہیں آئی۔ بڑوں کو دیکھ کر چھوٹے بھی اس سے پرہیز کرتے ہیں۔ یہ بات آج تک جاری ہے۔

جنم اشٹمی اور رام نومی کا ذکر کر ہی دیا ہے۔ دیوالی بھی اچھی منائی جاتی تھی۔ کچھ پہلے سے ہی سب لوگ اپنے اپنے گھر صاف کر دیواریں لیپتے اور کاٹھ کے کھمبوں اور دروازوں میں تیل لگاتے۔ اُن دنوں مٹی کا تیل نہیں جلایا جاتا تھا شاید ملتا ہی نہیں تھا۔ سرسوں تلسی دانہ اور رینڈی کا تیل ہی جلایا جاتا۔ دیوالی میں مٹی کے چھوٹے چھوٹے دیئے جلا کر تقریباً امیر غریب سبھی کچھ نہ کچھ روشنی ضرور کرتے۔ بڑے لوگوں کے مکانوں میں بہت دیئے جلائے جاتے۔ کیلے کے کھمبے گاڑے جاتے۔ بانس کی محرابیں بنائی جاتیں۔ رنگ برنگی تصویریں چراغوں سے بنائی جاتیں جو دیکھنے میں بہت حسین لگتیں۔ بڑے لوگ

تو یہ نقشے بناتے اور ہم چھوٹے چھوٹے اُن کے بتائے ہوئے مقامات پر چراغ رکھتے تیل ڈالتے بتی جلاتے۔ بتی جل جانے کے پہلے لکشمی پوجا ہوتی۔ لکشمی جی اور تلسی کے پاس بتی جلانے کے بعد ہی اور سب جگہ چراغ روشن کئے جاتے۔ چراغ جل جانے کے بعد کوڑی کھیلنے کا چلن تھا۔ ہم لوگ تو برائے نام ہی کچھ شغل کر لیتے۔ مگر میں نے دیکھا ہے کہ کچھ لوگ پیسے ہارتے جیتتے بھی تھے۔ دیوالی کے دن خاص چراغاں کی تیاری ہوتی۔ یوں تو کاتک کے مہینہ بھر کچھ لوگ تلسی کے چبوترے پر اور معلق قندیل میں دیئے جلایا کرتے۔

دسہرہ تو خاص کر کے زمینداروں کا تہوار مانا جاتا تھا لیکن نوراتر میں کبھی کبھی کالی جی کی پوجا ہوا کرتی تھی۔ اس کے لئے مورت لائی جاتی اور بڑے دھوم دھام سے پوجا ہوتی۔ میں نے اپنے گاؤں میں کالی کی پوجا نہیں دیکھی مگر قرب و جوار میں کالی پوجا ہوتی۔ اس کی شہرت سننے پر ہم سب بچے وہاں درشن کے لئے بھیجے گئے تھے وہاں جا کر ہم نے کالی کا جو سچ مچ کالی تھی اور ہاتھ میں لال کھپڑا، اور تلوار لئے ہوئے تھی۔ درشن کیا تھا۔ رام لیلا میں راج گدی بھی تقریباً دسہرہ کے دن یا ایک دو دن اس کے آگے پیچھے ہوا کرتی تھی۔ خاص دسہرہ کے دن ہمارے دادا صاحب اپنے ساتھ سب لوگوں کو لے کر ایک چھوٹا سا جلوس بنا کر نکلتے اور نیل کنٹھ کا درشن کرتے۔

اس کے علاوہ ایک اور تہوار تھا جس میں سبھی لوگ شریک ہوتے تھے۔ وہ تھا انت چتردشی کا برت۔ یہ بھادوں سُدی چتردشی کو ہوا کرتا تھا، دوپہر تک کا ہی برت تھا، دوپہر کو کتھا سُننے کے بعد کھیر پوری کھانے کی رسم تھی۔ شام کو کچھ نہیں کھانا ہوتا تھا۔ سورج ڈوب جانے کے بعد پانی بھی نہیں پیا جاتا تھا۔ اس برت میں ہم سب بچے بھی شریک ہوئے تھے۔ کتھا ختم ہونے پر ایک عمل ہوتا جو بچوں کے لئے بہت پر مذاق تھا ایک بڑے تھال میں

ایک یا دو کھیرے رکھ دیے جاتے اور پنڈت اس میں تھوڑا پانی ڈال دیتے سبھی کتھا سننے والے اس تھال میں ہاتھ ڈالتے اور پنڈت پوچھتے کیا ڈھونڈتے ہو، لوگ جواب دیتے 'اننت پھل' تب پھر پنڈت پوچھتے 'پایا'، جواب ملتا 'پایا' پنڈت کہتے سر پر چڑھاؤ اور سب لوگ پانی اپنے سر پر چھڑکتے۔ یہ عمل ختم ہونے پر اننتا جو سوت میں چودہ گانٹھ دے کر بنایا جاتا تھا دیا جاتا اور وہ اسے بازو پر باندھ لیتے۔ ہم بچوں کے لئے خوب صورت رنگین کبھی کبھی ریشم کا اننتا پٹوے کے یہاں سے خرید کر آتا، کوئی کوئی تو سال بھر بازو پر اننتا باندھے رہتے تھے اس لئے وہ اپنا اننتا اپنے ہاتھوں مضبوط اور کافی لمبا بناتے جس سے وہ سہولت سے باندھا جا سکے۔ اس طرح جو اننتا باندھتا وہ گوشت یا مچھلی نہیں کھاتا تھا اسی طرح جو تلسی کی لکڑی کی مالا یا کنٹھی پہنتا وہ بھی گوشت مچھلی نہیں کھاتا تھا۔ کتھا رام لیلا رامائن پاٹھ اور ان برت تہواروں کے ذریعے گاؤں میں دھارمک (مذہبی) زندگی ہمیشہ بیدار رہتی تھی۔ اس کے علاوہ محرم میں تعزیہ رکھنے کا رواج تھا۔ اس میں ہندو مسلمان دونوں شامل ہوتے تھے۔ زیرادیئ اور زمان پور میں چند ہندو ہی باحیثیت تھے اس لئے ان کا تعزیہ غریب مسلمانوں کے تعزیہ سے زیادہ بڑا اور شاندار ہوا کرتا تھا۔ محرم بھر تقریباً روز گدکا، لاٹھی پھری وغیرہ کے کھیل لوگ کرتے اور عشرہ کے دن تو بہت بڑی بھیڑ ہوتی۔ گاؤں گاؤں کے تعزئے کربلا تک پہنچائے جاتے، تمام راستے یا علی یا امام کے نعرے لگائے جاتے، اور گدکا وغیرہ کے کھیل ہوتے بڑا جوش رہتا اور اس میں ہندو مسلمان کا کوئی امتیاز نہ رہتا۔ شیرینی اور چبوری (بھگویا ہوا چاول اور گڑ) تقسیم ہوتے اُسے لیتے اور کھاتے مگر ہندو لوگ مسلمانوں کا چھوا پانی یا شربت نہ پیتے۔ مسلمان بھی اسے بُرا نہ مانتے وہ سمجھتے تھے کہ یہ ہندوؤں کا دھرم ہے۔ اس لئے وہ خود ہٹ جاتے۔

جس طرح ہندو محرم میں شریک ہوتے اُسی طرح مسلمان ہولی کے شور وغل میں شریک ہوتے۔ ہم بچے دسہرہ، دیوالی اور ہولی کے دن مولوی صاحب کی بنائی عیدی اپنے بڑوں کو سُناتے اور ان سے روپے مانگ کر مولوی صاحب کو دیتے۔

عیدی کئی دن پہلے سے ہی ہم یاد کرتے کاغذ پر مولوی صاحب کی مدد سے خوبصورت پھول بنا کر لال، ہرے، پیلے اور بیگنی رنگ سے رنگتے اسی پر مولوی صاحب خوب صورت حرفوں میں عیدی لکھ دیتے، جسے ہم لوگ پڑھ کر سُناتے۔ اس میں جو لکھا جاتا وہ بھی کچھ عجیب چوں چوں کا مربّہ ہوتا جیسے دیوالی کی عیدی میں لکھا ہوتا۔

دیوالی آمدِ ہنگامِ جوّا وغیرہ

دسہرے کی عیدی میں لکھا جاتا

دسہرے کو چلے تھے رام چندر

بنا کر روپ جوگی و قلندر وغیرہ

مشاہرہ کے علاوہ مولوی صاحب کو ہر ایک جمعرات کو کچھ پیسے جمعراتی کے روپ میں اور تہواروں کو عیدی کے بدلے میں مل جایا کرتے تھے۔

ان دنوں گاؤں میں مقدمے بازی کم تھی۔ جو جھگڑے ہوا کرتے گاؤں کے پنچ لوگ انہیں طے کر دیا کرتے تھے اگر کوئی بات پنچوں کے قابو کی نہ ہوتی تو وہ میرے بابا یا چچا صاحب کے سامنے پیش ہوتی وہ لوگ بھی پنچایت میں شریک ہو کر طے کرا دیتے۔ ہاں کبھی کبھی چوری ہو جایا کرتی تھی۔ بنیئے لوگ خوش حال تھے۔ ان کے گھروں میں رات کو نقب لگا کر چور کچھ رقم اُٹھائے جایا کرتے ایک بار کی مجھے یاد ہے کہ دوسرے گاؤں کے بازار سے واپسی کے وقت شام کو راستے میں ڈاکوؤں نے پیسے اور کپڑے لوٹ لئے تھے۔ جب کبھی ایسا واقعہ ہوتا تھانے

سے داروغہ اور سپاہی پہنچتے اور گاؤں میں ایک دو دن ٹھہر جاتے۔ ان کا گاؤں میں آنا ایک بڑا ہنگامہ تھا۔ سارے گاؤں میں سنسنی پھیل جاتی جن لوگوں پر شبہہ ہوتا اُن کے گھروں کی تلاشی لی جاتی۔ دو تین آدمی تھے جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ چور ہیں۔ داروغہ پہنچتے ہی اُن کو پکڑ کر مشکیں کس کر باندھ کر گرا دیتے اور خوب پیٹتے۔ آس پاس کے گاؤں کے بھی ایسے لوگ جو غلط یا صحیح طور پر چور سمجھے جاتے تھے، اسی طرح پکڑ کر منگائے جاتے اور باندھ کر گرا دئے جاتے میں نے دیکھا ہے کہ اسی طرح ایک ساتھ پانچ سات آدمی باندھ کر گرائے جاتے تھے اور گھنٹوں تک پڑے رہتے تھے۔

ہم لوگوں کی چھوٹی سی زمینداری تھی۔ رعیت کے ساتھ مقدّمے تو کم ہوتے شاید ہی کبھی کچہری میں جانے کی ضرورت ہوتی مگر ایک دوسرے زمیندار کے ساتھ جن کا بھی حصّہ گاؤں میں تھا بہت دنوں تک کچھ زمین کے لئے مقدمہ چلتا رہا۔ دادا کے وقت سے شروع ہو کر والد ماجد کے وقت تک چلتا رہا۔ اور ان کی وفات کے بعد بھائی صاحب نے اسے صلح کر کے طے کیا۔ نونو چھپرا جایا کرتے اور بھائی جو چھپرا پڑھنے کے لئے گئے تھے ان کو دیکھتے اور مقدّمے کی بھی پیروی کرتے۔

اِنگریزی تعلیم کی اِبتدا

میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ بھائی کی وجہ سے میرے لئے سب باتوں میں راستہ صاف ہو جاتا تھا۔ میری بہت چھوٹی عمر میں ہی بھائی کو پڑھنے کے پہلے سیوان بھیجا گیا۔ وہاں کچھ دنوں تک رہے مگر وہاں کوئی معقول انتظام نہیں ہوا۔ ایک تو اُن دِنوں سیوان میں کوئی ہائی اسکول نہیں تھا۔ دوسرا کوئی اسکول تھا کہ نہیں مجھے معلوم نہیں مگر ایک سبب یہ بھی ہوا کہ جن کے ساتھ انہیں رکھا گیا وہ انہیں سنبھال نہ سکے۔ ایک اگروال صاحب سیوان میں رہا کرتے جن سے دادا صاحب کی بڑی دوستی تھی اُن کے پاس بھائی بھیجے گئے اور کچھ دنوں تک وہاں رہے ان کے مکان کے پاس ایک نیا کنواں کھودا جا رہا تھا اس میں پانی آچکا تھا مگر اُوپر کی جگہ تک ابھی بندش نہیں ہوئی تھی۔ ایک دن پانی دیکھنے یا کھیلنے کے لئے بھائی وہاں گئے اور کنوئیں میں گر گئے۔ ڈوبتے ڈوبتے مشکل سے بچائے گئے۔ اُنہوں نے لکھ بھیجا کہ ایسے شریر لڑکے کی دیکھ بھال اُن سے نہیں ہو سکے گی۔ اس کے بعد ہی بھائی چھپرا بھیج دئے گئے اور وہاں ضلع اسکول میں نام لکھا کر پڑھنے لگے۔ جب چھٹیوں میں وہ گھر آئے تو ہم لوگوں سے چھپرا اور اسکول کی باتیں کہتے۔ ہم بچے بہت شوق سے سُنتے۔ شاید

اس وقت تک میں اپنے ہوش میں قرب وجوار کے کچھ گاؤں کے سوا جہاں میں رام لیلا یا کوئی دوسرا میلہ دیکھنے گیا ہوں اور کہیں نہیں گیا تھا۔ ہاں سنتا ہوں کہ بہت بچپن میں ماں کے ساتھ ننہال گیا تھا جو بلیا ضلع میں ہمارے گاؤں سے قریباً اٹھارہ بیس کوس کی دوری پر ہے مگر اس کی مجھے کچھ بھی یاد نہیں ہے۔

چھپرا میں میرے پڑھنے کی بات طے ہو جانے کے بعد نونو نے وہاں ایک بار لے جاکر مجھے سب کچھ دکھلا دینا اچھا سمجھا اور ساتھ لے گئے۔ میں چھپرا میں کچھ دِنوں بھائی کے ساتھ ٹھہرا اور پھر واپس چلا آیا۔ مجھے جہاں تک یاد ہے یہی پہلا موقع تھا جب میں ریل پر چڑھا مگر اس سفر کے بعد میں اسکول میں داخل نہیں ہوا۔ زیرا دیئ واپس آکر مولوی صاحب کے پاس پھر پڑھنے لگا۔ اسی درمیان ایک حادثہ ہوا۔ نونو کی وفات ہو گئی۔ ہمارے خاندان سے گہرے تعلقات رکھنے والا ایک خاندان تھا جس میں آج کل بابو پھولن پرشاد ورما ہیں۔ اُن کے والد ننہال میں آکر اپنے ماموں کے پاس رہتے تھے۔ اُن کے نانا سے ہم لوگوں کا کچھ پرانا تعلق بھی تھا۔ مگر اس سے بھی زیادہ آپس کا میل جول تھا جو دونوں خاندانوں کے ہتھوا راج میں نوکری کرنے کے باعث بہت زمانے سے چلا آتا تھا۔ پھولن بابو کے والد کی شادی میں نونو برات میں گئے اور واپسی پر راستے میں ہیضہ ہو گیا۔ وہاں تو اچھے ہو گئے اور گھر آگئے مگر گاؤں میں بھی بہت زوروں سے ہیضہ پھیلا ہوا تھا۔ اچھے ہو جانے کے تقریباً دو تین ہفتہ کے بعد اُن کو دوبارہ ہیضہ ہو گیا۔ وہ دن مجھے آج بھی یاد ہے۔ دوپہر گیارہ بجے کے قریب بیماری شروع ہوئی اور رات کو ہی وہ چل بسے۔ بابو جی نے جو کچھ دوا ہو سکی کی۔ درولی سے جو تقریباً چھ کوس کی دُوری پر ہے ڈاکٹر بلائے گئے۔ پہلی بیماری میں اسی ڈاکٹر سے شفا ہوئی تھی مگر ان دِنوں تیز سواری تو ملتی نہ تھی، ہاتھی پر رات کو بارہ بجے ڈاکٹر پہنچے۔ لیکن اُن کے

پہنچنے سے پہلے ہی موت ہو چکی تھی۔ اُن کی وفات سے گھر میں بہت کہرام مچا۔ دادا کے وہ ایک ہی بیٹے تھے۔ گھر کا تقریباً سب کاروبار اندر باہر وہ ہی سنبھالتے تھے۔ دادا صاحب کی عمر تقریباً ستر برس کی تھی۔ مگر وہ ابھی پینتالیس[۴] سال سے زیادہ کے نہ رہے ہوں گے۔ بابوجی گھر کے کاروبار میں کم ہی دلچسپی لیا کرتے تھے۔ اس لئے اور بھی سب تتر بتر ہو چکا تھا۔ نتیجہ کے طور پر کچھ دنوں کے لئے میرا چھپرا جانا بھی رُک گیا۔

تقریباً ایک ڈیڑھ سال کے بعد میں چھپرا بھیجا گیا۔ چھپرا میں ایک چھوٹا سا مکان تین یا چار روپے مہینے پر لے لیا گیا تھا۔ وہیں بھائی ایک نوکر اور کھانا پکانے والے ایک کائستھ کے ساتھ رہتے تھے۔ کچھ دنوں تک شروع میں انہیں پڑھانے کے لئے ایک ماسٹر بھی رکھے گئے تھے مگر جب میں پہنچا تو دوسرا کوئی نہیں تھا۔ میں بھی اُن کے ساتھ رہنے لگا۔ میرے چھپرا پہنچنے کے کچھ ہی دنوں بعد ضلع اسکول کے آٹھویں درجے میں، جو اُن دنوں سب سے ابتدائی درجہ تھا[۱] میرا نام لکھا دیا گیا۔ میں نے وہیں انگریزی اور ناگری کے حروفِ تہجّی کی تعلیم ایک ساتھ شروع کی۔ بھائی صاحب اس وقت دوسرے درجہ سے ترقی پاکر اول درجہ یعنی انٹرنس کلاس میں پہنچے تھے۔ میرے لئے کوئی ماسٹر نہیں رکھا گیا۔ میں اسکول کی پڑھائی کے علاوہ گر کچھ پوچھنا ہوتا تو بھائی سے پوچھ لیتا۔ گھر پر مجھے پڑھانے کے لئے ماسٹر کا نہ رکھنا بہت اچھا ہوا۔ اسکول کی پڑھائی پر خوب توجہ دینے کی عادت پڑ گئی۔ شروع زمانے سے ہی کچھ خود اعتمادی بھی آگئی سال کے آخر میں بھائی انٹرنس کے امتحان کی تیاری کر رہے تھے، اور میں اپنا سالانہ

---

[۱] ان دنوں اسکول کے درجوں کا شمار نیچے سے اُوپر کی طرف یوں ہوتا تھا کہ آٹھویں سے ترقی کر کے ساتویں پھر چھٹے میں اور بالآخر اول درجہ یعنی انٹرنس میں پہنچتے تھے۔

امتحان دے رہا تھا۔ امتحان میں میرا بہت اچھا نمبر آیا۔ میں اپنے درجہ میں اول رہا اور نمبر بھی اتنے زیادہ آئے کہ ہیڈ ماسٹر نے مجھے ڈبل ترقی دینے کی بات سوچی۔

اُن دنوں اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے شری رودچندر رائے چودھری۔ وہ بہت نامی اور عالم ہید ماسٹر سمجھے جاتے تھے۔ اسکول میں اُن کا رعب بھی بہت تھا۔ صرف لڑکے ہی نہیں ماسٹر لوگ بھی ڈر کے مارے کانپتے تھے۔

امتحان کا نتیجہ سُنایا گیا۔ مجھے آٹھویں سے ساتویں درجے میں ترقی ملی۔ ہم سب لڑکے خوشیاں منا رہے تھے کہ چپراسی نے آکر کلاس ماسٹر سے کہا کہ ہیڈ ماسٹر مجھے بلا رہے ہیں۔ ہیڈ ماسٹر ان لڑکوں کو ہی بُلایا کرتے تھے جن کے خلاف کوئی شکایت ہوتی میں بہت ڈر گیا اور ڈرتے ڈرتے وہاں گیا۔ مگر وہاں جا کر ڈر دُور ہو گیا۔ اُنہوں نے پوچھا کہ کیا تم ڈبل ترقی لے کر ساتویں کے بدلے چھٹے میں جاؤ گے۔ میں اس وقت گھبرا سا گیا۔ کچھ خوشی، کچھ ذہنی کش مکش اور کچھ اس بات کا خوف کہ ایک سال کی پڑھائی پر عبور کیسے ہو گا۔ میں نے جواب دیا کہ بھائی سے پوچھ کر بتاؤں گا۔ انہوں نے پوچھا کہ بھائی کون ہیں۔ میرے نام بتانے پر وہ ہنس پڑے۔ بھائی کو وہ جانتے تھے، کیونکہ بھائی کو بھی تو اُنہوں نے ہی پڑھا کر انٹرنس کا امتحان دینے کی منظوری دی تھی جس کے لئے وہ ڈیرے پر تیاری کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ "وہ کیا اس بات کو مجھ سے زیادہ سمجھ سکتا ہے جو تو اس سے پوچھنا چاہتا ہے۔ خیر جا کر پوچھ آ" میں وہاں سے دوڑتا ہوا بھائی کے پاس گیا۔ وہ بانکے بہاری لال (مرحوم) اور مولوی شفیع داؤدی تینوں ایک ساتھ امتحان کی تیاری کر رہے تھے۔ میں وہیں گیا اور تینوں نے یہ خبر بہت خوش ہو کر سُنی۔ آپس میں کچھ صلاح ہوئی بھائی کا خیال تھا کہ ایک درجہ عبور کرنے پر آیندہ میں کمزور پڑ جاؤں گا اور مستقبل کی پڑھائی ٹھیک نہیں ہو گی۔ وہ

میرے ساتھ ہیڈ ماسٹر کے پاس پہنچے اور اُن سے اپنی رائے کہی۔ ہیڈ ماسٹر نے ہنس کر پھر وہی بات کہی۔ کیا تو مجھ سے اس بات کو زیادہ سمجھتا ہے۔ نتیجے کے طور پر ساتواں درجہ عبور کرا کے اُنہوں نے مجھے چھٹے درجے میں بھیج دیا

تھوڑے ہی دنوں بعد بھائی امتحان دینے پٹنہ گئے اور امتحان دے کر زیرادیئی چلے گئے اور اس وقت تک چھپرا کے ڈیرے میں اکیلے نوکر اور رسوئے کے ساتھ رہتا تھا ہاں میرے مکتب کے ساتھی جمنا بھائی اور گنگا بھائی بھی چھپرا آگئے تھے اور اسکول میں نام لکھا لیا تھا۔ ہم تینوں وہاں بھی ساتھ ہی رہتے اور پڑھتے تھے۔ اس زمانے میں میری عمر شاید دس گیارہ سال کے درمیان ہوگی۔

بھائی انٹرنس پاس ہو گئے۔ پٹنہ میں کالج میں ان کے پڑھنے کی بات ہوئی اور وہ پٹنہ جانے کو ہوئے، رائے ٹھہری کہ میں بھی پٹنہ اُن کے ساتھ ہی چلا جاؤں اور ایسا ہی ہوا۔ ہم تینوں ہم سبق بھائی کے ساتھ پٹنہ گئے اور بھائی نے پٹنہ کالج میں نام لکھایا۔ اور ہم لوگوں کے نام ٹی کے گھوش اکاڈمی میں جو ان دنوں بہت اچھا اسکول سمجھا جاتا اور جس میں زیادہ لڑکے پڑھتے تھے لکھا دیئے گئے۔ اس اسکول میں جاکر میں نے محسوس کیا کہ ڈبل ترقی کے بارے میں بھائی صاحب کی رائے ہیڈ ماسٹر سے زیادہ ٹھیک تھی۔ میں روزانہ محسوس کرتا کہ دوسرے لڑکے کئی مضمون مجھ سے زیادہ جانتے ہیں۔ میں اس کوشش میں لگ گیا کہ اس کمی کو پورا کرلوں وہاں بھی کوئی گھر پر پڑھانے کے لئے ماسٹر نہیں تھا۔ جو کچھ پوچھنا ہوتا وہاں بھائی یا اُن کے دوسرے ساتھیوں سے جو وہاں رہا کرتے پوچھ لیا کرتا۔ چھپرا میں ہی میری عادت پڑ گئی تھی کہ روز شام کو اسکول سے چھٹی ہونے پر ڈیرے آکر کچھ کھا پی کر فٹ بال یا دوسرا کھیل کھیلنے کے لئے اسکول چلا جاتا۔ فٹ بال اور کرکٹ دو کھیل خاص طور پر

کھیلے جاتے۔ اونچے درجے کے کچھ لڑکے اور ماسٹروں میں کچھ لوگ خاص کر ہیڈ ماسٹر ٹینس بھی کھیلا کرتے۔ پٹنہ میں اسکول میں کھیل کا انتظام نہیں تھا۔ ہم اس کمی کو بہت محسوس کرتے۔ اس کا احاطہ بھی بڑا نہیں تھا، مگر جو جگہ تھی اُس میں اپنے لوگ گیند لے کر جاتے اور کچھ دوڑ دھوپ کر چلے آتے بھائی کھیل میں بہت ہوشیار تھے۔ فٹ بال، کرکٹ اور دوسرے کھیلوں میں وہ بہت آگے رہتے تھے۔ پٹنہ کالج میں بھی اُن کا نام تھا۔ ہم لوگ کبھی کبھی کھیل دیکھنے پٹنہ کے لان میں جایا کرتے تھے۔

پٹنہ میں سوموار ی میلہ ساون کے مہینے میں ہر سوموار (پیر) کو دھوم دھام سے ہوا کرتا تھا۔ اس میلے میں ہم لوگ بڑی خوشی سے جاتے اور چھوٹی موٹی چیزیں خریدنے کے لئے بھائی سے ضد کرتے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار ایک مورت جو بہت خوب صورت تھی خریدنے کے لئے میں نے بہت ضد کی تھی اور بھائی کو خریدنی پڑی۔ ایک بار اسی سوموار ی میلہ میں بابو بانکے بہاری کی جیب سے چور نے کچھ پیسے نکال لئے۔ بھائی بھی ساتھ تھے چور پکڑا گیا۔ اس پر مقدمہ بھی چلا جس میں بانکے جی کو اور بھائی کو بیان دینے پڑے۔ اسی مقدمہ کو دیکھنے کے لئے جہاں مجھے یاد ہے۔ میں پہلے پہل کچہری گیا تھا۔

پٹنہ میں میرے گاؤں کے ایک صاحب بھائی سے جن کی دوستی تھی نوکری کی تلاش میں ہم لوگوں کے ساتھ ڈیرے میں ٹھہرے تھے۔ وہاں بھی ایک مکان کرایہ پر لے کر بانکے بابو اور ہم لوگ ساتھ ہی رہا کرتے تھے۔ یہ صاحب چھوٹے موٹے پہلوان تھے کچھ کسرت وغیرہ جانتے تھے۔ اُنہوں نے صحن میں چھوٹا سا اکھاڑہ بنایا اور وہاں سب لوگوں کو کسرت کرانا اور کشتی سکھانا شروع کیا۔ ایک دن بابو بانکے جی کو کشتی سیکھنے میں کچھ چوٹ لگ گئی اور اُن کا پیر کئی دنوں تک تکلیف دیتا رہا۔ اس کے بعد سے کشتی اور اکھاڑے

سے دلچسپی کم ہو گئی۔

ہم لوگ پٹنہ میں تھے اسی زمانے میں ہم لوگوں نے پلیگ کی بیماری کا نام پہلے پہل سنا اس زمانے میں بمبئی سے ہی اس خوفناک بیماری کی خبر سنی گئی۔ مگر تھوڑے ہی دنوں بعد چھپرا ضلع میں بھی اس نے اڈّا جمالیا اور کم و بیش ابھی تک کچھ نہ کچھ رہتا ہی ہے۔ اُنھی دنوں بڑا قحط بھی پڑا تھا۔ چھٹی میں گاؤں جاکر لوگوں نے دیکھا تھا کہ سرکاری افسر لوگوں کی امداد کے لئے آئے تھے اور ہمارے گھر پر ٹھہرے تھے۔

پٹنہ میں تقریباً دو سال گذر گئے اور بھائی نے ایف اے کا امتحان دیا اور میں چھٹے سے پانچویں اور پانچویں سے چوتھے درجے میں پہنچ گیا۔ امتحان دے کر بھائی گھر چلے گئے میں جمنا بھائی اور گنگا بھائی، پٹنہ میں نوکر کے ساتھ اکیلے ہی دو تین مہینہ تک رہے۔ جب گرمی کی چھٹی ہوئی ہم لوگ گھر آئے۔

بیاہ

مجھے ٹھیک یاد نہیں کہ میں پانچویں درجہ میں پڑھتا تھا یا چوتھے میں جا چکا تھا۔ جب میری شادی ہوئی۔ شاید پانچویں ہی میں پڑھتا تھا۔ گرمی کی چھٹی میں شادی ہوئی تھی۔ جب ہم لوگ چھپرا میں پڑھتے تھے تبھی دادا کی اور دادی کی بھی وفات ہو چکی تھی۔ ان لوگوں کی بیماری کا حال پاکر ہم سب لوگ چھپرا سے زیرادیئی آگئے تھے۔ اور ہم سب کے سامنے ہی دونوں تھوڑے دنوں کے وقفہ سے چل بسے تھے۔ اس لئے اب میرے والد ہی زمین کے مالک تھے میری شادی کا انتظام اُنہیں کو کرنا پڑا تھا۔

میرے خُسر آرہ میں مختار تھے اور ان کے ایک چھوٹے بھائی بلیا میں وکالت کرتے تھے دونوں بھائی زیرادیئی آئے تھے۔ مجھے بابو جی نے اندر ماں کے پاس سے بلوایا۔ ان لوگوں نے دیکھا، کچھ سوال بھی کئے اور پسند کر کے چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد تلک آیا جس میں رواج کے مطابق کپڑے برتن کے علاوہ روپئے بھی آئے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے روپیوں کے لئے بابو جی نے کچھ زیادہ زور نہیں دیا تھا۔ تو بھی ان لوگوں نے تقریباً دو ہزار نقد اور سامان ملا کر بھیجا تھا۔ میری عمر بارہ سال سے کچھ زیادہ تھی۔

اُن دنوں دو ہزار کا تلک اچھا تلک سمجھا جاتا تھا۔ آج کل تو پانچ ہزار سات ہزار بھی ہم لوگوں کی اوقات کے لوگ کم مانتے ہیں۔ جتنا زیادہ تلک ہو اتنی ہی زیادہ برات کی تیاری ہونی چاہیئے اور لڑکی کے لیئے اتنا ہی زیادہ زیور جانا چاہیئے۔ میری شادی کے زمانے میں پتاجی کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ ایک تو تین چار برسوں میں یکے بعد دیگرے تین موتیں ہو چکی تھیں اور ان میں سے ہر ایک کی شرادھ (تعزیتی تقریب) میں کافی خرچ ہو چکا تھا۔ اِدھر قحط کی وجہ سے زمینداری سے وصولیابی کم ہو گئی تھی۔ خرچ بڑھ گیا تھا۔ ہم لوگوں کے پڑھنے کے لیئے چھپرا ہر مہینے کچھ نہ کچھ رقم بھیجنی ہی پڑتی تھی۔ ایک مقدمہ تو بہت دنوں سے چلا آتا تھا، اس کی بہت پیشیاں ہوئی تھیں اور ان پر بھی بڑا خرچ آیا تھا۔ ان سب تردّدوں کے رہتے ہوئے بھی شادی میں خرچ کرنا ہی تھا۔ کیونکہ اسی میں گھر کی عزّت تھی۔

جہاں تک زیور وغیرہ کا خرچ تھا وہ تو اُنہوں نے خوب کیا۔ دوسری تیاری میں بھی وہ کمی نہیں کرنا چاہتے تھے، کیونکہ اُن کے زمانے میں یہی پہلی شادی تھی، اور اگر پُرانے حساب سے خرچ نہ ہوا، شان و شوکت نہ ہوئی تو لوگ کہیں گے کہ بھیّاجی (میرے دادا کو سب لوگ اسی نام سے پکارا کرتے تھے) کے مرنے کے بعد ہی گھر کی شان میں کمی آگئی اسی لیئے بابوجی کا خیال تھا کہ کسی طرح یہ شادی پُرانی شان سے کم نہ ہو۔

ہمارے یہاں شادی میں بہت ہاتھی گھوڑے جلوس کے لیئے مانگ کر لائے جاتے ہیں۔ اور بھی جلوس کی چیزیں مانگ کر لائی جاتی ہیں۔ شادی کا دن ایسا پڑا کہ اس دن بہت کڑا لگن تھا۔ گاؤں کی زبان میں کڑا لگن اسے کہتے ہیں جس میں گرہ اچھے ہونے کی وجہ سے ساعت بہت اچھی پڑتی ہے اور بہت لوگ اس دن شادی کرنا نیک شگون مانتے ہیں جس دن کڑا لگن پڑتا ہے اس دن مانگے کا سامان ملنے میں دشواری ہوتی ہے۔ کیونکہ

بہت لوگ عاریتاً مانگتے ہیں۔ میری برات کے لئے بہت ہاتھی گھوڑے مانگے گئے مگر کڑے لگن کی وجہ سے پہنچ نہیں سکے۔ ایک ہی ہاتھی اور دو چار گھوڑے پہنچ سکے۔

میری شادی بلیا ضلع کے دکن میں چھپرا میں زیرادیئی سے اٹھارہ بیس کوس کے فاصلہ پر ہونے والی تھی۔ دو دن کا راستہ تھا۔ بیچ میں سرجو (گھاگرا) ندی تھی۔ جسے کشتیوں میں پار کرنا تھا۔ برات زیرادیئی کی رسموں کو پورا کر کے روانہ ہوئی۔ ہاتھی گھوڑے کم ہونے کی وجہ سے پالکیوں کی سواری زیادہ لینی پڑیں اور بیل گاڑیوں پر سامان رکھا گیا۔ میں خاص قسم کی پالکی پر جس میں دولہا جایا کرتا ہے چلا۔ گھر میں ایک بڑا گھوڑا تھا۔ بھائی اس پر چلے۔ یہ سب کو روانہ کر کے سب کے پیچھے چلے، اور جہاں دوپہر کے کھانے کا مقام مقرر تھا وہاں سب سے پہلے پہنچ گئے۔ انتظام میں وہ بڑا حصہ لے رہے تھے۔ بابوجی پالکی پر تھے۔ خاندان اور رشتہ داری کے دوسرے لوگ پالکیوں اور دوسری سواریوں پر تھے۔

دولہا کی پالکی بہت بے ڈھنگی ہوا کرتی ہے، اس پر اوپر سے سایہ کے لئے چھت نہیں ہوتی۔ مگر کپڑے کی چادریں باندھی جاتی ہیں۔ جیٹھ کے مہینے میں شادی تھی۔ خوب گرمی پڑ رہی تھی۔ گرم ہوا بھی زوروں سے چل رہی تھی۔ اور مجھے اس پالکی پر جانا تھا۔ ہوا سے جھالریں بھی اُڑ جاتیں۔ پالکی چاندی کی تھی، اس لئے وزن کافی تھا۔ کہاروں کو وزن سنبھالنا یونہی کٹھن اور اس پر ہوا کے مارے چادریں غبارے کا کام کرتیں۔ بے چارے مشکل میں تھے۔ میں دھوپ اور ہوا دونوں کا شکار تھا۔

کسی طرح دن کٹا اور رات کو سرجو جی کے کنارے کے گاؤں میں ڈیرا پڑا۔ کچی پکی[۵۱] رسوئی

---

[۵۱] ہندوؤں میں کچی رسوئی روٹی چاول وغیرہ کو کہتے ہیں اور پکی رسوئی پوری کچوری وغیرہ کو۔

بنی۔ سب لوگوں نے کھانا کھایا۔ سویرے سرجو پار کرنے کا مرحلہ شروع ہوا۔ سامان پالکی بیل گاڑی گھوڑے وغیرہ تو کشتیوں پر لادے گئے اور ہاتھی کو یونہی تیرا کر پار کرانے کے جتن ہونے لگے۔ وہ ہاتھی بھی کچھ ویسا ہی تھا۔ وہ ندی پار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کچھ دُور جاتا اور پھر واپس آجاتا۔ پھر کئی کشتیوں کے بیچ میں کر کے پار کرانے کی کوشش کی گئی مگر سب بے کار۔ آخر یہ رائے ہوئی کہ اسے چھوڑ ہی دینا چاہیے اور برات بغیر ہاتھی کے چل دی۔ بابوجی کو اس کا بڑا افسوس تھا کہ برات میں ایک ہاتھی بھی نہیں گیا۔ جہاں میری شادی ہو رہی تھی۔ اسی سے تھوڑی دور پر بابوجی کی بھی شادی ہوئی تھی۔ اس زمانے میں میرے دادا ہتھوا کے دیوان تھے اور اس برات میں پچاسوں ہاتھی گئے تھے، بابوجی کو یہ بات بہت کھٹکتی تھی کہ جہاں اُن کی برات میں پچاسوں ہاتھی گئے وہاں اُن کے لڑکے کی شادی میں ایک بھی ہاتھی نہ پہنچ سکا۔ مگر کیا کیا جاسکتا تھا؟ برات واپس تو ہو نہیں سکتی تھی۔ ہاتھی کے جھمیلے میں اتنا وقت لگ گیا کہ ڈر لگنے لگا کہ برات کے گاؤں میں پہنچنے تک رات ہو جائے گی۔ برات بہت تیزی سے چلی۔ پھر بھی جہاں دوپہر کو پہنچنا تھا وہاں پہنچتے پہنچتے تین چار بج گئے۔ وہاں کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کر برات آگے بڑھی رات ہو گئی۔ اسی درمیان ایک واقعہ ہوا۔ برات جب گاؤں سے ایک دو میل پر تھی دو تین ہاتھی آتے نظر آئے وہ کسی دوسری برات میں گئے تھے اور اس کی رسم پوری کر کے کہیں جا رہے تھے فیل بانوں سے بات ہوئی ان کو کچھ روپے دے گئے اور وہ برات میں شامل ہونے پر راضی ہو گئے۔ اس طرح ہاتھی کا حوصلہ تو ایک طرح پورا ہو گیا مگر برات پہنچتے رات کے دس گیارہ بج گئے۔

وہاں لوگ گھبرا رہے تھے، کڑھ رہے تھے۔ آخر برات پہنچی۔ میری عادت

سرِ شام سے ہی سونے کی تھی اور یہ شادی کے کارن کچھ چھوٹنے والی تھی نہیں۔ میں برات پہنچنے سے پہلے ہی پالکی میں گہری نیند سو گیا تھا۔ پہنچنے کے وقت کسی طرح جگایا گیا اور پرچھاوَن کی رسم ادا ہوئی۔ شادی کی دوسری رسمیں بھی ایک ایک کر کے پوری کی گئیں۔ گرمی میں دو دنوں کا سفر اور وہ بھی پالکی میں۔ شام ہی سے سونے کی عادت اور اس پر اتنی تھکاوٹ۔ میرے لئے جاگتے رہنا ایک مشکل مسئلہ تھا۔ سب رسمیں ہو گئیں اور میرا بیاہ بھی اُسی رات کو ہو گیا مجھے آج بھی وہ رسمیں پوری طرح یاد نہیں اور نہ یہ یاد ہے کہ ان میں میرا کیا حصّہ رہا۔ لڑکپن میں میری بہن گڑیوں کے بیاہ کا کھیل کیا کرتی اور اس میں میں بھی شریک ہوا کرتا تھا۔ یہ بیاہ بھی میرے لئے کچھ ویسا ہی تھا۔ میں نے نہ تو بیاہ کی اہمیت سمجھی اور نہ یہ محسوس کیا کہ میرے اوپر کوئی ذمّہ داری آئی ہے۔ شادی کرنے میں میرا ہاتھ رہا تھا اور نہ اِن رسموں میں جو کچھ پنڈت یا حجّام یا اپنے گھر کی یا سُسرال کی عورتیں بتاتی گئیں۔ میں وہ کرتا گیا، اور آخر لوگوں نے سمجھ لیا کہ میرا بیاہ ہو گیا۔ مجھے تو اتنا بھی علم نہیں ہوا کہ کیا ہوا۔ ہاں اِتنا سمجھ گیا تھا کہ میری بھابی جس طرح گھر میں آگئی تھی اُسی طرح ایک دن کوئی میری بہو بھی آجائے گی۔

ہمارے یہاں یہ بھی چلن تھا کہ کہیں کہیں شادی کے بعد ہی لڑکی کو نہیں لاتے۔ کچھ دن کے بعد ایک چھوٹی موٹی دوسری برات آجاتی ہے اور تب لڑکی لائی جاتی ہے۔ اسے دُراگمن یا گونا کہتے ہیں۔ میری شادی کے بعد بھی وہ ساتھ نہیں لائی گئی۔ ایک برس کے بعد دُراگمن کی برات گئی اور تب وہ لائی گئی۔ برات دو دن ٹھہر کر واپس آئی۔ سُسرال کے لوگ دیر کر کے برات پہنچنے اور ان کی اُمید کے مطابق پوری شان و شوکت نہ ہونے کے باعث رنجیدہ تھے مگر جب انہوں نے زیور کپڑے مٹھائی وغیرہ (جو لڑکی کے لئے اور دوسروں کے لئے دولہا کی طرف سے دیئے جاتے ہیں) دیکھے تب اُن کا رنج دُور ہو گیا اور سب بہت خوش ہو گئے۔

میں سمجھتا ہوں کہ دولہا کو دیکھ کر بھی گھر کی عورتیں اور دوسرے آئے ہوئے لوگ خوش ہوئے ہوں گے ۔ اگرچہ میرے پاس اس کا کوئی ثبوت نہیں ہے ۔

ایک سال کے بعد گونا ہوا ۔ اور بہو گھر میں آئی ۔ گونے یا درالگمن کی برات شادی کی برات سے چھوٹی ہوا کرتی ہے اس بار ایک یا دو ہاتھی مل گئے تھے اور برات میں گئے بھی تھے ۔ ہمارے یہاں پردہ بہت سخت ہوتا ہے ۔ میں نے دیکھا تھا کہ جب میری بھابی آئیں تو اُن کے ساتھ دو دائیاں آئی تھیں اور وہ صرف انہی دونوں سے بات کر سکتی تھیں زیرادیئی میں ایک کمرے میں رہتی تھیں ۔ کبھی دالان میں بھی نکلنے کی اجازت نہیں تھی ۔ اُن دنوں ایسے ہی مرد ملازم گھر کے اندر آسکتے تھے جو عمر میں بہت کم ہوتے تھے اور اُن کی پیدائش ہی ماں اور چچی کے سامنے گاؤں میں ہوئی تھی اور جو بہت بچپن سے اپنی ماں کے ساتھ صحن میں آیا جایا کرتے تھے جو بالغ نوکر تھے وہ اندر نہیں جاتے تھے ایک رسوئی دار تھا جو رسوئی بنانے کے لئے آنگن میں جاتا تھا مگر وہ بھی آنے سے پہلے پکار لیتا اور ہماری ماں اور چچی کمرے میں چلی جاتیں تب وہ جاتا اور رسوئی گھر میں گھوم آتا ، وہاں بھی اگر کسی چیز کی ضرورت ہوتی تو وہ کسی ملازمہ کو پکار کر مانگ لیتا اور باہر آتے وقت پھر اُسی طرح پکار کر سب کو ہٹا دینے کے بعد ہی وہ باہر جاتا ۔

میری بھابی تو کمرے کے باہر نکلتی ہی نہ تھیں ، ہاں حوائجِ ضروری کے جانے کے لئے سب لوگ ہٹا دئے جاتے ۔ لوگوں میں دوسرا کوئی شامل نہیں تھا ۔ صرف زیرادیئی کی دائیاں تھیں مرد تو کوئی صحن میں رہتا ہی نہیں تھا ۔ اگر کوئی چھوٹا لڑکا ہوتا تو وہ بھی ہٹا دیا جاتا ۔ اِتنے میں بھی کافی پردہ نہیں ہوتا اور ان کے میکے کی دائیاں کپڑے کا پردہ لگا کر ان کو لے جاتیں میں بہت چھوٹا تھا اس لئے میں کبھی کھیلتا کودتا اُن کے کمرے میں چلا جاتا اور شاید دو ایک بار

اُن کا مُنھ بھی میں نے دیکھ لیا تھا۔ میری ماں چچی بہن بھی جب ان کے کمرے میں جاتیں تب وہ گھونگھٹ تان کر بیٹھ جاتیں زیرادیئی کی کوئی بھی دائی وہاں جانے نہیں پاتی تھی۔

جب میری بیوی گونے کے بعد آئی تو اس کے ساتھ بھی یہی بکھیڑا رہا۔ یہ بہت دنوں تک چلا اور آہستہ آہستہ کم ہوا۔ میکے کی دائیاں چلی گئیں۔ زیرادیئی کی ایک دائی آنے جانے لگی۔ اُس سے کچھ کچھ باتیں کرنے کی اجازت ہوئی۔ جب تک میری ماں زِندہ رہیں تب تک نہ تو میری بھابی اور نہ میری بیوی اپنے کمرے سے نکل کر آزادی کے ساتھ آنگن میں گھوم پھر سکیں یا بیٹھ سکیں۔ میری حالت یہ تھی کہ جب کبھی چھٹیوں میں جاتا باہر ہی سوتا۔ رات کے وقت جب لوگ سو جاتے تو ماں دائی کو بھیجتی کہ جگا لاؤ، اور وہ جگاکر مجھے لے جاتی اور اس کمرے میں چھوڑ دیتی جس میں میری بیوی رہتی۔ نیند کے مارے مجھے اس وقت رات کو جاگنا دوبھر ہو جاتا۔ اکثر میں کتنی ہی کوشش ہونے پر جاگتا ہی نہیں تھا۔ دوسرے دن ماں یا چچی ڈانٹتیں کہ رات کو جاگتے نہیں ہو اور بلانے پر بھی نہیں آتے۔ سویرے جب سب لوگ سوتے ہی ہوتے اُٹھ کر چلا جاتا ہو اور باہر کی چارپائی پر سو جاتا جس میں کسی کو یہ پتہ نہ چلے کہ رات کو کسی دوسری جگہ گیا تھا۔ یہاں تک کہ ساتھ کے نوکر بھی اس کا پتہ کم ہی لگتا۔

پردے کے سبب اسی طرح میاں بیوی کی ملاقات ہوتی۔ یوں تو لڑکپن سے ہی زیادہ تر گھر کے باہر رہا۔ جب کبھی گھر پر چھٹیوں میں جاتا، تبھی ملاقات کا موقع ہوتا، اور وہ بھی اس طرح سے۔ اس لئے آج اگرچہ شادی ہوئے تقریباً چوالیس پینتالیس برس ہوگئے ہوں گے مگر شاید ہی سب دنوں کو ملانے کے بعد بھی ہم دونوں اتنے مہینے بھی ایک ساتھ رہے ہوں۔ پڑھنے کا وقت پٹنہ، چھپرا یا کلکتہ میں کٹا وکالت کے زمانے میں بھی کلکتہ

میں برابر اکیلا ہی رہا اور پٹنہ جانے پر بھی دو ہی ایک بار گھر کے لوگ تھوڑے ہی دِنوں کے لئے ساتھ رہے۔ ترکِ موالات (نان کوآپریشن) شروع ہونے کے بعد تو گھر جانے کا وقت اور بھی کم مِلا ہے اور گھر کے لوگوں کو ساتھ رکھنے کی نہ تو سہولت ہی رہی اور نہ کام کی جھنجھٹوں میں فرصت ہی۔

ہتھوا اور چھپرا کے اِسکولوں میں

بھائی ایف اے کے امتحان میں کامیاب ہو گئے۔ اُن کی خواہش ہوئی کہ وہ کلکتہ جاکر میڈیکل کالج میں پڑھیں۔ ان دنوں بہاری لوگوں میں شاید ہی کوئی میڈیکل کالج میں پڑھتا تھا ایک تو کلکتہ آنا اور وہاں کا خرچ اُٹھانا ہی کٹھن دوسرے وہاں بہاریوں کے لئے جگہ مِلنا بھی مشکل۔ جب ان کے کلکتہ جانے کی بات طے ہو گئی تو سوال پیدا ہوا کہ میں کہاں پڑھوں؟ میرے لئے کلکتہ جانا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ بھائی کلکتہ گئے۔ میں پٹنہ سے نام کٹا کر ہتھوا اِسکول میں نام لکھانے کے لئے بھیجا گیا۔ وہاں کی حالت کچھ عجیب تھی۔ پڑھانے لکھانے کا طریقہ چھپرا ضلع اسکول اور پٹنہ کے ٹی گھوش اکاڈمی سے کچھ جُدا تھا۔ پہلے تو نام لکھانے میں ہی تھوڑی دقّت ہوئی۔ ماسٹر نے کہا کہ وہ امتحان لے کر نام لکھیں گے۔ خیر کسی طرح نام لکھا گیا۔ پڑھائی کا طریقہ یہ تھا کہ جو کچھ سبق دیا جاتا تھا، خاص کر تاریخ میں، اُسے دوسرے دن برزبان کر کے آنا چاہیئے اور ماسٹر صاحب کہتے، سبق سُناؤ اور سب شروع سے آخر تک کتاب بند کر کے زبانی سُنانا پڑتا۔ میری عادت اس طرح بغیر سمجھے بوجھے کسی چیز کو رٹنے یا سنانے کی نہیں تھی اور لفظوں کو حفظ کرنے کی طاقت بھی کمزور تھی۔ میں تقریباً چھ مہینے تک

اس اسکول میں رہا مگر شاید ایک دن بھی سبق پورا یاد نہ کر سکا۔ کوشش کی کمی مجھ میں نہیں تھی مگر میں کر ہی نہیں سکتا تھا کسی نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ اگر کسی چیز کو ایک سو بیس بار دہرا لیا جائے تو وہ ضرور یاد ہو جاتی ہے۔ میں بہت محنت کر کے ایک سو بیس بار دہرانے کی بھی کوشش کرتا پھر بھی صفحہ کا صفحہ حفظ نہ کر سکتا۔ میری، عادت سرِ شام سو جانے اور سویرے چار بجے کے قریب اُٹھ جانے کی تھی۔ ہتھوا میں ایک سو بیس بار دُہرانے کے لئے میں کبھی کبھی ڈیڑھ دو بجے رات ہی کو اُٹھ جاتا تو بھی سبق پورا نہ کر پاتا۔ اسکول میں ماسٹر حالت دیکھ کر کبھی کبھی کڑھتے اور کہتے کہ یہ چوتھے درجے میں بھرتی کرنے کے لائق تھا ہی نہیں اور دھمکی دیتے کہ پانچویں کلاس میں تم کو واپس کر دیا جائے گا۔ یہ سب میرے لئے کوفت کا سبب ہوتا اور جیسے دُکھ کے دن میرے وہاں کٹے اور کہیں پڑھنے کے دنوں میں نہیں کٹے۔ کبھی کبھی میں سوچتا کہ اگر ایک درجہ کا عبور نہ کیا ہوتا تو شاید یہ حالت نہ ہوتی۔

آخر میں بہت بیمار پڑ گیا اور سالانہ امتحان کے وقت تک بیمار رہا۔ سالانہ امتحان دے دیتا تو شاید کسی طرح پاس بھی ہو جاتا اور ترقی بھی ہو جاتی۔ چھٹیوں میں بھائی گھر آئے اور انہوں نے سب حال دیکھا سُنا تو اُن کی رائے ہوئی کہ سالانہ امتحان دے کر ترقی لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسی اسکول کو چھوڑ کر چھپرا ضلع میں واپس جانا ہی اچھا۔ ایسا ہی طے ہوا اور میں وہاں سے آکر پھر چھپرا اسکول کے چوتھے درجے میں داخل ہو گیا۔

اُدھر بھائی صاحب کی بھی عجیب حالت رہی۔ کسی وجہ سے میڈیکل کالج میں اُن کا نام نہیں لکھا گیا اور وہ پٹنہ واپس آکر بی اے میں پڑھنے لگے۔ چونکہ میرا نام ہتھوا اسکول میں لکھا جا چکا تھا۔ وہاں سے پھر پٹنہ واپس لے آنا مناسب نہیں سمجھا گیا۔ اور چھ مہینے تک میں ہتھوا میں ہی رہا۔

اسکول کی پڑھائی پر ہی میں بھروسہ رکھتا تھا۔ گھر پر پڑھانے کے لئے کبھی کوئی ماسٹر نہیں رکھا گیا۔ ہتھوا اسکول کی پڑھائی کی پریشانی کے سبب میں حیران ہو کر ایک ماسٹر کے گھر جایا کرتا تھا جو ایک طرح سے میرے رشتہ دار بھی ہوتے تھے۔ وہ پڑھا بھی دیا کرتے، مگر سبق ایک دن بھی میں پورا نہیں کر سکا۔ اس اسکول سے چلا جانا میرے لئے ایک بڑی بات ہوئی۔ چھپرا پہنچتے ہی گویا کھوئی ہوئی عقل پھر پلٹ آئی۔

چھپرا اسکول میں چوتھے درجے میں بہت سے لڑکے تھے۔ اس لئے اُس کے تین حصے ہو گئے تھے۔ یہاں ایک بنگالی ماسٹر شری رسک لال رائے تھے۔ وہ ایک سکیشن کے جس میں میں تھا کلاس ماسٹر تھے۔ بڑے شریف تھے۔ پڑھانے کا طریقہ بھی بہت اچھا تھا۔ لڑکوں کے ساتھ بہت محبت رکھتے اور لڑکے بھی اُنہیں بہت مانتے تھے۔ اگرچہ وہ میرے کلاس ماسٹر تھے۔ مگر دوسرے سیکشن میں بھی پڑھایا کرتے اور چوتھے درجے کے تقریباً سبھی طلبار کو جانتے تھے۔ مجھ پر اُن کی بڑی مہربانی ہوئی۔ چوتھے درجے میں طلبار کی صرف تعداد ہی زیادہ نہیں تھی۔ اچھے اچھے طلبار بھی تھے جن سے کئی تو مڈل اسکول سے پاس کر کے وظیفے لے کر آئے تھے۔ ان کو ریاضی، جغرافیہ اور تاریخ کا علم اچھا تھا۔ یہ مضامین وہ ہندی میں پڑھ چکے تھے، اور وہاں کے پڑھے ہوئے مضمونوں کو ہی انگریزی میں دُہرانا تھا۔ لیکن تھوڑے ہی دنوں میں ماسٹر نے محسوس کیا اور میرے ساتھیوں نے بھی سمجھا کہ میں تیز لڑکوں میں ہوں۔

رسک بابو مجھے بہت پیار کرنے لگے۔ میں اتنے لڑکوں میں کسی بھی امتحان میں ابھی اول نہ آسکتا تھا۔ لیکن رسک بابو نے مجھ سے انہی دنوں کہا کہ دیکھو محنت کرو، آخر تمہارا رام الوگرہ کا ہی مقابلہ رہے گا اور دوسرے ساتھی تیز ہونے پر بھی تم سے نیچے ہو جائیں گے۔

نہ معلوم کیوں انھوں نے کیوں ایسا کہا! مگر بات ہوئی ایسی ہی۔ ہاں ان کی پیش گوئی پوری ہونے میں دو تین سال لگ گئے۔ سالانہ امتحان میں میرا مقام چوتھا رہا۔ کچھ انعام ملا مگر دوسروں کو زیادہ ملا۔ تیسرے درجہ میں بھی اُنھوں نے پڑھایا اور ایک دوسرے ماسٹر نے بھی جن کی یاد آج تک ویسی ہی بنی رہتی ہے۔ ان کا نام بابو راجیندر پرشاد ہے۔ وہ تاریخ پڑھایا کرتے تھے اور ان کا طریقہ اتنا خوب تھا کہ سب بات کہانی کی طرح یاد ہو جایا کرتی۔ ہتھوا کے طریقے سے اُن کا بالکل اُلٹا طریقہ تھا۔ اپنی زبان میں جو سب باتیں اچھی طرح بتا دینا وہی اچھا سمجھا جاتا۔ میں یہ آسانی سے کرسکتا تھا۔ ہتھوا میں محنت کر کے رٹنے کی جو کوشش کی تھی اس سے بیچ بیچ میں اچھے لچھے دار لفظ اور فقرے بھی آجاتے۔ اپنی سمجھ داری اور یاد کرنے کی کوشش دونوں مل کر اچھا رنگ باندھ دیتے اور ماسٹر صاحب اُسے بہت پسند کرتے۔

تیسرے سے دوسرے درجہ میں ترقی ہوئی اور سالانہ امتحان میں میں نے تیسرا مقام پایا۔ اسی طرح دوسرے سے اول درجے میں آنے سے پہلے جو امتحان ہوا، اس میں بھی میں اوّل اور انوگرہ دوسرے نمبر پر آئے۔ رسک بابو کی ترقی ہو گئی اور چوتھے سے تیسرے تیسرے سے دوسرے، اور دوسرے سے اوّل درجہ میں وہ پڑھانے لگے۔ ہاں، اسی درمیان بابو راجیندر پرشاد کی بدلی ہو گئی اور رسک بابو بھی کچھ دنوں کے لئے دوسرے اسکول میں چلے گئے۔ راجیندر بابو واپس نہیں آئے۔ مگر رسک بابو واپس آگئے۔ ہم لوگوں کی، خاص کر میری خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔

رسک بابو صرف پڑھانے میں ہی ماہر نہ تھے۔ لڑکوں کے چال چلن پر بھی نظر رکھتے تھے۔ اسکول کے ماسٹروں میں سے میرے اوپر سب سے زیادہ اور سب سے گہری چھاپ انہیں کی پڑی۔ یوں تو بابو راجیندر پرشاد کا اور مولوی صاحب کا بھی، جو فارسی

پڑھاتے تھے، کافی اثر رہا۔ مگر رسک بابو تو جیسے گھر کے آدمی تھے۔ اُن سے ڈر بھی لگتا، اور محبت بھی تھی۔ یہ پڑھاتے بھی اور اچھی باتیں کر کے خیالات کی بھی درستی کرتے۔ اگرچہ میں پٹنہ میں دو برس تک رہ آیا مگر اتنی کم عمر میں رہا کہ مجھے کوئی خاص واقفیت نہ ہوئی تھی۔ رسک بابو کچھ ملک کی بھی باتیں بتاتے تھے۔ کیسے پڑھ کر آدمی اُونچے درجے پر پہنچ سکتا ہے۔ اس طرف بھی توجہ دلاتے۔ جب میں انٹرنس کلاس میں پہنچا تو انہوں نے واضح لفظوں میں کہا "محنت کرو تم یونیورسٹی میں اونچا مقام پا سکتے ہو" میں اس کا مطلب ہی نہیں سمجھا۔ بس اتنا ہی سمجھا کہ شاید وظیفہ مل جائے۔

جس زمانے میں میں دوسرے درجے کا سالانہ امتحان دے رہا تھا چھپرا میں بہت زوروں سے پلیگ کی بیماری جاری تھی۔ دو دن امتحان دینے کے بعد میرے گلے میں ورم آگیا، اور تیز بخار چڑھ گیا۔ میں تیسرے دن سے امتحان میں نہیں بیٹھ سکا گھر پر خبر آگئی۔ بابو جی گھبرا کر آئے اور مجھے زیرادیئی لے گئے۔ وہاں اُنہوں نے خوب علاج کرایا اور میں اچھّا ہو گیا معلوم نہیں کہ مجھے پلیگ ہوا تھا یا صرف گلے کا ورم مگر شبہ پلیگ کا ہی تھا خاصی گھبراہٹ رہی۔ اسی گھبراہٹ میں ٹھیک وقت پر اسکول کی فیس نہیں دی گئی۔ نام کٹ گیا۔ امتحان کا نتیجہ دیکھا گیا تو دونوں مضمونوں میں اوّل آیا تھا۔ نمبر بھی اتنے زیادہ آئے کہ باقی دونوں مضمونوں میں امتحان ہوئے بغیر ہی وہ پاس کرنے کے لئے کافی سمجھے گئے انہیں دنوں نئے ہیڈ ماسٹر بدل کر آگئے تھے۔ اُنہوں نے میری غیر حاضری میں ہی ترقی دیدی تھی مگر ترقی ہونے پر بھی فیس نہ دینے کے باعث نام تو کٹ ہی گیا۔ جب میں اچھّا ہوا تو کچھ دنوں بعد گیا اور پھر سے نام لکھا کر پڑھنے لگا۔

ایک دن رسک بابو نے مجھ سے کہا۔ تمہارا نام کٹ جانا اچھا نہیں ہوا۔ قاعدے

کے مطابق انٹرنس پاس کرنے پر اُسی لڑکے کو وظیفہ مل سکتا ہے جو کم سے کم پورے ایک سال ایک اسکول میں پڑھتا رہا ہو۔ اب تم نمبر پانے پر بھی وظیفہ نہیں پا سکو گے مگر ایک تدبیر کرو کہ ایک درخواست ڈائرکٹر کے پاس اپنے والد سے بھجواؤ کہ وہ تم کو اس قاعدے سے مستثنےٰ کرا دیں۔

ایک درخواست میں نے لکھوا کر دی۔ اس یہ بات لکھی گئی کہ پلیگ ہو جانے کے سبب میں گھر پر رہ گیا اور فیس نہیں جا سکی جس سے نام کٹ گیا۔ اس کے علاوہ امتحان کا نتیجہ وغیرہ دکھا کر یہ کہا گیا تھا کہ اُمید ہوتی ہے کہ وظیفہ مل سکے گا مگر اس میں قاعدہ مانع ہوتا ہے ہیڈ ماسٹر نے درخواست دیکھ کر کہا کہ "یہ فضول ہے۔ قاعدہ بدلنے کا اختیار ڈائرکٹر کو ہی ہے اس لئے میں کیسے درخواست پر سفارش کر سکتا ہوں۔ مجھے کیا معلوم کہ تم کو پلیگ ہوا تھا یا نہیں"۔ علاج تو ڈاکٹر کا ہوا نہیں تھا اسی لئے ڈاکٹری سارٹیفکٹ بھی نہیں دے سکتا تھا۔ خیر انہوں نے بغیر کسی سفارش کے ہی درخواست اوپر بھیج دی۔

رسک بابو کو اس کا افسوس رہا کہ ہیڈ ماسٹر نے سفارش نہیں کی وہ سمجھتے تھے کہ شاید ایسی حالت میں ڈائرکٹر منظور نہ کرے۔ انہوں نے مجھے تسلّی دی کہ درخواست دینے سے کوئی نقصان تو ہوگا ہی نہیں۔ قاعدہ تھا کہ درخواست ڈائرکٹر کے پاس انسپکٹر کی معرفت ہی جا سکتی تھی۔ اس لئے اگرچہ یہ ڈائرکٹر کے لئے تھی پھر بھی پہلے انسپکٹر کے پاس گئی۔ انسپکٹر نے درخواست پڑھ کر اسے ڈائرکٹر کے پاس بھیجنا بھی ضروری نہ سمجھا اور اُسے منظور کر کے خط لکھ بھیجا۔ ہیڈ ماسٹر نے مجھ سے کلاس میں ہی کہا کہ تمہاری درخواست انسپکٹر نے ہی منظور کر کے خط لکھ بھیجا ہیڈ ماسٹر نے مجھ سے کلاس میں کہا کہ تمہاری درخواست انسپکٹر نے ہی منظور کر کے واپس کر دی ہے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں نہیں جانتا کہ انسپکٹر کو اس کے منظور کرنے کا کوئی اختیار ہے مگر تم کو اب فکر نہیں کرنی چاہیئے۔ رسک بابو سُن کر بہت خوش ہوئے اور بھی زیادہ میری حوصلہ افزائی

کرنے لگے۔ یہاں تک کہ وہ بغیر کچھ لئے اپنے گھر پر بلا کر سب مضمونوں میں جہاں کہیں مجھے کوئی دقّت معلوم ہوتی بتا دیتے۔ اور روز روز تاکید کرتے کہ اس طرح پڑھو، یہ پڑھو، وہ پڑھو۔ اُن کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ میں یونیورسٹی میں اونچا درجہ پا سکوں گا۔ مجھے اس کا پتہ تک نہیں تھا کہ یونیورسٹی میں مجھ جیسا آدمی اونچا درجہ پا سکتا ہے۔

اُن دنوں تین طرح کے وظیفے ملا کرتے تھے۔ دو یا تین دس دس روپئے کے ضلع بھر میں اوّل دو تین لڑکوں کے لئے تھے۔ دوسرے دو یا تین وظیفے پندرہ پندرہ روپئے مہینے کے تھے۔ جو ڈویژن بھر میں (جس میں آج کل کے پٹنہ اور ترہٹ ڈویژنوں کے سات ضلعے شامل تھے) اوّل دو یا تین لڑکوں کو، اور تیسرا وظیفہ بیس روپئے مہینے کا جو ساری یونیورسٹی میں اول دس لڑکوں کو ملتا تھا۔ بہار صوبہ بنگال کا حصّہ تھا اور کلکتہ یونیورسٹی کا دائرۂ اختیار بنگال، بہار، اڑیسہ، آسام اور برما تک تھا۔ ایک ہی امتحان ہوتا تھا اور ان سب صوبوں کے لڑکوں میں جو سب سے اوپر آتے۔ ان دس لڑکوں کو بیس روپئے کا وظیفہ ملتا تھا۔ میرا انتہائی حوصلہ زیادہ دس یا پندرہ روپئے کا وظیفہ ملنا تھا۔ میرا انتہائی حوصلہ زیادہ سے زیادہ دس یا پندرہ روپئے کا وظیفہ پانے تک ہو سکتا تھا۔ اس سے زیادہ حوصلہ کبھی ہوا ہی نہیں مگر اس کے لئے بھی میں سمجھتا تھا کہ کافی محنت کی ضرورت ہے۔ اسی لئے میں خوب محنت کرتا تھا۔ یونیورسٹی کے امتحان سے پہلے اسکول کا امتحان ہوا کرتا۔ اس میں جو لوگ پاس ہوتے اُنہیں کو یونیورسٹی کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت ملتی۔ میں اس امتحان میں بہت نمبر پا کر سب سے اوّل آیا۔ یونیورسٹی میں امتحان دینے کی اجازت تو ملی مگر ایک بکھیڑے کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ ایک مضمون تھا ڈرائنگ جو اختیاری تھا مگر وظیفہ کے لئے نتیجہ جانچنے میں اس کے بھی نمبر جوڑے جاتے تھے۔ اگرچہ میں اور مضمونوں میں تو کافی نمبر پا چکا تھا، مگر

ڈرائنگ ماسٹر نے یونیورسٹی میں ڈرائنگ کا امتحان دینے کی اجازت سے انکار کر دیا۔ ڈرائنگ میں بیس یا پچیس نمبر مل سکتے تھے۔ اگر اس میں امتحان نہ دوں تو یہ بیس یا پچیس نمبر ملیں گے ہی یا نہیں اور وظیفہ ملنا دشوار ہو جائے گا۔ بہت کہنے سننے پر ماسٹر نے اس شرط پر اجازت دے دی کہ اس دن سے امتحان کے وقت تک میں کم سے کم ایک گھنٹہ روز ڈرائنگ کی مشق کیا کروں۔ میں نے یہ شرط مان لی اور پوری بھی کی۔ اچھا ہی ہوا کیونکہ شاید ایسا نہ کرتا تو ڈرائنگ میں پچیس نمبر نہ ملتے اور جو مقام مجھے ملا وہ نہ ملتا، آخر امتحان کا زمانہ قریب آیا اور میں کچھ دن پہلے ہی پٹنہ میں امتحان دینے چلا آیا۔

امتحان ہوا اور پٹنہ سے میں گھر آیا۔ بھائی بھی چھٹیوں میں گھر آئے۔ انہوں نے کلکتہ سے واپس آکر پٹنہ میں نام لکھایا۔ مگر بہت بیمار پڑ گئے۔ ڈاکٹروں کی رائے سے وہ پڑھنے کے لئے الہ آباد چلے گئے۔ وہاں کے میور سنٹرل کالج سے اسی سال وہ بی۔اے پاس کر چکے تھے۔ ایم۔اے اور بی۔ایل پڑھنے کے لئے وہ پھر کلکتہ چلے گئے۔ الہ آباد اور کلکتہ میں رہنے کے سبب سے وہاں سے چھٹیوں میں آکر وہ بہت باتیں کیا کرتے۔ میں ان باتوں کو بڑی عقیدت سے سنا کرتا، اور جہاں تک ہو سکتا ان کو مانا بھی کرتا۔ شاید ۱۸۹۹ء میں وہ الہ آباد سے آئے اور انہوں نے سودیشی کی بات کہی تھی۔ سودیشی کپڑے بھی وہاں سے ساتھ لائے تھے۔ میں نے اسی زمانے سے سودیشی کپڑا پہننا شروع کیا۔ جب تک گاندھی جی نے کھدر کی بات نہیں چلائی سودیشی کپڑا ہی برابر پہنتا رہا۔ صرف ایک بار کچھ ولائتی کپڑے خریدے تھے۔ جس کا ذکر آگے آئے گا۔ نہیں تو اسی زمانے سے بھائی نے سودیشی کپڑے کا استعمال خود شروع کیا اور مجھ سے بھی شروع کرایا۔ انہوں نے پھر کبھی کوئی بدیشی کپڑا خریدا ہی نہیں۔ کھدر چل جانے پر کھدر کے علاوہ دوسرے قسم کا سودیشی بھی کبھی

نہیں خریدا۔

سودیشی کا پچار صرف کپڑوں تک ہی محدود نہیں رہا۔ جہاں تک ہو سکتا تھا اور چیزوں کے خریدنے میں بھی اس کا خیال رکھا جاتا تھا۔ یونیورسٹی کا امتحان دینے کے لئے خاص طور پر دیسی قلم اور نب بھی میں نے لی تھی اور ایسی ایسی چیزیں بھائی برابر الہ آباد اور کلکتہ سے لایا کرتے تھے۔ مجھے اب شک ہوتا ہے کہ بہت چیزیں جن کو ہم اپنے بھولے پن سے سودیشی جان کر خرید لاتے تھے، شاید سودیشی نہیں تھیں اور دکان دار ہمیں ٹھگ لیا کرتے تھے۔ مگر ہمارا عقیدہ اٹل تھا اور ہم اپنی دانست میں انہیں سودیشی سمجھ کر ہی لیتے تھے۔

گرمی کی تعطیلات میں ہم سب شام کے وقت ٹہلنے جا رہے تھے کہ کسی نے آکر کہا کہ امتحان کا نتیجہ گزٹ میں نکل گیا۔ ہم لوگ سیوان گئے تو صرف اتنا ہی معلوم ہوا کہ میں پہلے درجہ (فرسٹ ڈویژن) میں پاس ہوا ہوں۔ ابھی وظیفہ کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ کچھ دنوں بعد اس طرح شام کو ٹہلتے وقت کسی نے آکر ایک تار دیا جس میں لکھا تھا کہ میں یونیورسٹی میں اوّل آیا ہوں۔ بھائی نے تار پڑھا اور بہت خوش ہوئے۔ ہم لوگ دوڑتے دوڑتے گھر آئے، اور بابوجی سے کہا۔ بھائی نے ان کو سمجھایا کہ یونیورسٹی میں اوّل آنے کا کیا مطلب ہے۔ بابوجی اور ماں اور سب لوگوں کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ میں نے بھائی کی رائے سے پہلے سے ہی طے کر رکھا تھا کہ پاس کر کے میں کلکتہ کے پریسیڈنسی کالج میں ہی پڑھوں گا۔ انٹرنس کے امتحان کی درخواست بھیجنے کے وقت اس میں لکھ بھی دیا تھا کہ وظیفہ اگر ملے گا تو پریسیڈنسی کالج میں پڑھ کر ہی اس سے فائدہ اٹھاؤں گا۔ اسی فیصلہ کے مطابق میرا کلکتہ جانا جلد ہی طے ہو گیا۔

چھپرا اسکول میں پڑھنے کے زمانے میں میں وہاں ایک پنڈت جی کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ جو ایک بڑے نامی جوتشی تھے۔ اُن کا نام تھا پنڈت وکرما دت مشر۔ وہی میرے سرپرست

کی جگہ تھے وہ خود طلبا کو پڑھایا کرتے تھے۔ ہر روز سرجو میں اشنان کیا کرتے۔ کسی دوسرے کا چھوا ہوا پانی تک قبول نہ کرتے تھے۔ پوجا پاٹ خوب ہوا کرتا وہیں پر ایک چھوٹا ٹھاکر دوارہ بھی ہتھوراج کا تھا۔ ان سب کا اثر ہم چھوٹے لڑکوں پر ویسا ہی پڑا جیسا پڑنا چاہئے۔ ہم لوگ اپنے آپ کو کٹر سناتنی سمجھتے اور اگر کوئی آریہ سماجی آجاتا تو اس سے بحث بھی چھیڑ دیتے۔ اسکول میں مہامہوپادھیائے رگھونندن ترپاٹھی ہیڈ پنڈت تھے۔ اسکول میں میں فارسی پڑھتا تھا مگر اُن کے ذریعے سے گھر پر کچھ سنسکرت پڑھنا بھی شروع کیا۔ لگھوکومدی کے کچھ سوتر حفظ کر لئے مگر اس کو جاری نہ رکھ سکا۔ چھپرا اسکول کی یادگاریں آج بھی دل پر اثر رکھتی ہیں، وہ حسین اور لطیف ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ چھٹیوں کے علاوہ میں کبھی گھر نہیں جاتا تھا۔ چھٹیوں میں گھر جانے پر ماں اکثر کچھ زیادہ دنوں تک روک لینا چاہتی۔ مگر میں اس پر جلد راضی نہ ہوتا۔ چھٹیوں میں تو زیرادیئی میں خوب کھیلنا ہی ایک کام رہتا اور سب وقت تقریباً چکا میں لگتا۔ بھائی بھی گھر آجاتے اور ہم لوگوں کے ساتھ کھیل میں شریک ہوتے۔

چھپرا کی زندگی بہت سادہ تھی۔ پاس تو روپئے شاید ہی کبھی رہتے۔ وہاں ایک مودی سے طے تھا کہ وہ سب چیزیں ہمیں دیا کرے گا یہ رواج چھپرا میں بھائی کی تعلیم کے زمانے سے چلا آتا تھا۔ روزانہ پُرزہ لکھ کر اسی مودی کے یہاں سے چاول، دال، گھی، لکڑی اور ناشتہ کے لئے کچوری، مٹھائی بھی آجاتی، وہ ذات کا حلوائی تھا اس لئے سب چیزیں دے سکتا تھا۔ اسی طرح ایک کنجڑن تھی جو ترکاری پہنچا دیتی۔ مودی زیرادیئی آتا اور پرچوں کو پیش کرتا حساب ہوتا اور اُسے روپئے وہیں مل جاتے۔ کنجڑن کو زیرادیئی نہیں آنا پڑتا تھا۔ اس کا حساب کر کے وہیں ایک کارپرداز دے دیتے تھے جو مقدمے دیکھنے کے لئے چھپرا

آیا جایا کرتے تھے۔ اسکول کی فیس کے لئے روپے بھی وہی دیتے۔ اگر کپڑے کی ضرورت ہوتی تو وہی خرید دیتے۔ اس لئے چھپرا میں پڑھنے کے زمانے میں میرے ہاتھوں میں روپے شاید ہی کبھی آتے۔

گھر کی حالت کچھ اچھی نہیں تھی۔ زمینداری بھی اتنی ہی تھی جتنی دادا صاحب اور نونو کے زمانے میں تھی۔ مگر ان لوگوں کے مرنے کے بعد سے بابوجی کچھ تردد میں پڑ گئے تھے۔ ہم لوگوں کے خرچ کے لئے نقد روپے جمع کرنے میں اُنہیں کچھ پریشانی ہوتی۔ مودی کو ہمیشہ نقد زیرادیئے میں نہ ملتا۔ کبھی کبھی کسی گاؤں کے تحصیل دار کے نام خط ملتا اور وہ زیرادیئے سے اُس گاؤں جاتا اور وہاں سے روپے لیتا۔ چھپرا کا خرچ کم تھا اور اس لئے کسی طرح چل جاتا۔ مجھے کبھی روپے کی کمی کا احساس نہیں ہوا۔ ایک اور سبب یہ تھا کہ بھائی اس پر توجہ رکھتے اور جب چھٹیوں میں آتے تو کچھ نہ کچھ انتظام کرا جاتے مگر بھائی کا خرچ ہر مہینہ الہ آباد بھیجنا پڑتا۔ اس میں بابوجی کو اکثر خلجان ہوتا۔ مگر انہوں نے طے کر لیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو لڑکوں کو پڑھانے کا خرچ کسی نہ کسی طرح فراہم کرنا ہی ہوگا۔

ایک دیوان تھے جو زمینداری کا انتظام کیا کرتے تھے۔ وہ دادا صاحب کے وقت سے ہی تھے اور زمینداری کا پورا حال جانتے تھے۔ بابوجی نے دادا صاحب کے رہتے زمینداری کی دیکھ بھال نہ کی تھی۔ اس لئے انہیں دیوان جی پر بھروسہ کرنا پڑتا۔ مجھے یاد ہے کہ بھائی کو امتحان کی فیس دینی تھی۔ اُن کا خط آیا کہ کسی طے شدہ تاریخ سے پہلے پچاس یا ساٹھ روپے داخل کرنے ہوں گے نہیں تو ایک سال کے لئے امتحان سے محروم رہنا ہوگا۔ روپے بابوجی کے پاس تھے نہیں۔ دیوان جی دیہات سے روپے دے نہیں سکے۔ بابوجی بہت پس و پیش میں پڑ گئے۔ ماں کا سونے کا کنٹھا رہن رکھ کر کہیں سے روپے منگوا کر وقت پر بھیجے۔ سب کچھ

رہتے ہوئے کچھ ایسی حالت ہوگئی تھی کہ کبھی کبھی کھانا پکانے میں بھی دیر ہو جاتی تھی۔ بھائی سمجھتے تھے کہ یہ سب کچھ دیوان جی کی بدانتظامی کی وجہ سے ہے اور بہت کڑھتے تھے مگر کچھ کر نہ سکتے تھے چھٹیوں میں ایک بار انھوں نے کچھ کاروبار سنبھالنا شروع کیا مگر جب تک الہ آباد میں پڑھتے رہے، کچھ زیادہ نہیں کر سکے۔ زمینداری کی آمدنی سالانہ تقریباً سات آٹھ ہزار کی تھی جس میں سرکاری مالگذاری دے کر پانچ سے چھ ہزار تک کی بچت تھی۔ سیکڑوں بیگھے زراعت کے کھیت تھے۔ جن میں کافی، دھان، گیہوں، مکئی ارہر، جو وغیرہ ہوتے اور ایکھ سے گڑ بنا کر کچھ نقد روپئے بھی آجاتے۔ یہی کھیت تھے جو ہمارے بچپن میں ہمیشہ اتنا اناج دیا کرتے تھے کہ گھر بھرا رہتا۔ گائے بھینس کافی دودھ دے دیتیں اور کئی جوڑی بیل بھی تھے۔ مگر اس وقت نہ معلوم کیا ہو گیا تھا کہ گھر کے خرچ کے لئے بھی دھان پورا نہ ہوتا اور غلہ بھی خریدنا پڑتا۔ بابو جی نے نقصان ہی نقصان دیکھ کر کچھ دنوں کے لئے کھیتی کا کام بند کر دیا تھا۔ وہ دن دکھ کے تھے۔ مگر بابو جی صبر سے رہتے اور لوگوں سے کہا کرتے کہ ہمارے دونوں لڑکے ہی ہماری دولت ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک اور واقعہ یہاں قابلِ ذکر ہے۔ نُونو کے مرنے کے بعد دادا صاحب اور والد باجدرہ گئے تھے۔ ہم لوگ بچّے تھے ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ دادا صاحب نے ہی ساری زمینداری خریدی تھی اور سب کچھ انہیں کا جمع کیا ہوا تھا۔ نونو کے صرف ایک لڑکی تھی، کسی نے دادا صاحب کو سمجھایا کہ اُن کے مرنے کے بعد اس لڑکی کو اور ہماری چچی کو دقّت ہو سکتی ہے۔ اس لئے کچھ نہ کچھ انتظام کر دینا چاہیئے۔ دادا صاحب نے ایک وصیّت نامہ لکھنے کا فیصلہ کیا اور وہ سیوان سے مرتب ہو کر آیا اس کے مطابق چچی صاحبہ کو اُن کے خرچ کے لئے تقریباً ایک ہزار روپے سالانہ کی آمدنی والے دو گاؤں اُن کی زندگی تک کے

لئے دیئے گئے۔ بہن کو ساری زمینداری سے سات آنے کا حصّہ دیا گیا اور ہم لوگوں کو باقی نو آنے۔

خاندان برابر بالا جمال رہا تھا، اس لئے یہ تحقیق نہیں تھا کہ دادا صاحب اس قسم کی وصیت کرنے کے حقدار تھے یا نہیں۔ بغیر وصیت کے اُن کے مرنے پر ساری جائداد کے مالک بابوجی ہو جاتے۔ چچی صاحبہ صرف پرورش کی حقدار ہوتیں اور اُن کی لڑکی کو کوئی حصّہ نہ ملتا۔ اس لئے کچھ لوگوں نے صلاح کر کے وصیت کی بات دادا صاحب کو سمجھائی۔ بابوجی کو اس کی خبر نہیں دی گئی۔ سب کچھ تیّار ہو جانے پر ایک روز رجسٹرار رجسٹری کرنے کے لئے زیرادیئی آئے۔ لوگوں نے رائے دے دی کہ بابوجی اگر وصیت نامے پر دستخط کر دیں گے تو پھر اُن کو اُس کے خلاف آواز اُٹھانے کا حق نہ ہوگا اور سب بات پکّی ہو جائے گی۔ رجسٹرار کے زیرادیئی پہنچنے پر ہی بابوجی کو سب باتیں معلوم ہوئیں۔ دادا صاحب نے اُن کو دستخط کر دینے کو کہا۔ کیونکہ دادا صاحب کے دل میں کچھ شُبہ پیدا کر دیا گیا تھا کہ بابوجی شاید اس میں عُذر کریں گے۔ بابوجی نے دادا صاحب سے صاف کہہ دیا کہ آپ تو جو حکم دیں مجھے منظور ہے۔ آپ ہی نے ہم کو پالا پوسا ہے اور آپ ہی نے سب کچھ پیدا کیا ہے۔ آپ اگر سولہ آنے بھی چندر مکھی کو دے دیں تو مجھے کچھ عذر نہیں۔ میرے لئے دھن تو دونوں لڑکے ہیں اُن کو آپ کی دعا چاہیئے۔ ہم لوگ بھی نہیں بلائے گئے۔ دادا صاحب پھوٹ کر روئے اور اُن لوگوں کو گالیاں دینے لگے جنہوں نے باتیں بنا بنا کر اُن کے دل میں اندیشے پیدا کرنے کا جتن کیا تھا۔ بابوجی نے دستخط کر دئے اور وصیت نامے کی رجسٹری کر کے رجسٹرار چلے گئے۔

بدقسمتی سے میں جس زمانے میں ہتھوا اسکول میں پڑھتا تھا اُسی زمانے میں کچھ دنوں تک بیمار رہ کر، ہزار کوشش کے باوجود چندر مکھی کنواری ہی مر گئی۔ چچی بہت دنوں تک جیتی رہیں اور ملی ہوئی آمدنی کو تیرتھ برت میں خرچ کرتی رہیں۔ ان کے مرنے کے بعد ساری زمینداری

ہم بھائیوں کو پوری پوری مل گئی - وہ تقریباً سبھی تیرتھوں میں گئیں۔ اس میں ان کا ساتھ دینے والی میری بیوہ بہن تھیں جو بیوہ ہونے کے بعد سے برابر میرے ہی گھر میں رہی ہیں۔ ان دونوں میں تیرتھ برت میں گویا مقابلہ رہتا تھا۔ اور شاید ہی کوئی اشنان یا پرب ہوتا ہو جس میں یہ شریک نہ ہوتی ہوں - دونوں نے چاروں دھام یعنی جگنا تھ رامیشورم دوارکا اور بدری ناتھ کے درشن کیے۔ بہن تو بدری ناتھ دو بار جا چکی ہیں۔ میری ماں گھر پر ہی رہتیں، کبھی کبھی تیرتھ کو جاتیں۔ مجھے یاد ہے کہ اسکول کی تعلیم کے دوران ہی ایک بار ماں چچی اور بہن کے ساتھ میں اجودھیا جی اور دوسری بار متھرا بندرابن درشن کے لئے گیا تھا۔ اِن یاتراؤں میں خرچ کافی پڑتا تھا اور تکلیف بھی بہت ہوتی تھی اس زمانے میں میں نے محسوس کیا تھا کہ تیرتھوں میں پنڈے لوگ بہت کام کرتے ہیں۔ اُن کے ہی گھر میں ہم لوگ ٹھہرے تھے - وہاں پر وہ لوگ برابر ساتھ ساتھ گھوم پھر کر سب تیرتھوں کے درشن کراتے اور کسی طرح کی تکلیف نہ ہونے دیتے۔ کسی زمانے میں جس کی یاد مجھے نہیں ہے دادا صاحب بابوجی نونو وغیرہ بھی اِن تیرتھوں میں گئے تھے، اور وہاں کے پنڈوں کی بہیوں میں ان کے نام لکھے ہیں۔ پنڈوں کے لئے کچھ رقم سالیانہ کی طرح پر بھی مقرر تھی جو وہ ہر سال زیرادیئی آگر لے جاتے تھے۔ ان وجہوں سے وہ ہم لوگوں کی زیادہ خاطرداری کرتے اور ہماری یاترا میں بھی ان کو دان تو ملنا ہی تھا۔ دان پن پوجا پاٹھ تیرتھ یاترا اشنان وغیرہ میں گھر بھر کی لیڈر بہن تھیں اور آج بھی ہیں۔ گھر میں ایک نہ ایک طرح کی پوجا برابر جاری ہی رہتی تھی۔ آج بھی وہی بات ہے۔

اس طرح اسکولی تعلیم کا زمانہ ختم ہوا۔ گھر کے ساتھ میرا تعلق کم ہی رہتا تھا۔ صرف چھٹیوں میں آنا جانا ہوتا۔ شادی ہوگئی تھی مگر بیوی سے ملاقات کم ہی ہوتی چھٹیوں میں آنے پر رات کے وقت ملاقات ہو جاتی - ایک بار میری بیوی کو ہیضہ ہو گیا۔ میں اُس زمانے میں

گھر پر ہی تھا۔ بابوجی کے دوا علاج کرانے پر وہ اچھی ہوگئی مگر بابوجی بہت فکر مند ہوگئے۔ میری حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی۔ کسی کا اپنی بیوی کے متعلق بہت فکر رکھنا اُن دنوں کے دستور کے مطابق بدسلیقگی سمجھا جاتا تھا۔ میں فکر مند تھا۔ جاننا اور دیکھنا بھی چاہتا تھا۔ مگر کسی سے نہ تو پوچھ سکتا تھا اور نہ دیکھنے کی خواہش ظاہر کرسکتا تھا۔ گھر کے لوگوں کا دھیان شائد اس طرف گیا ہی نہیں کہ اس بیماری میں میرا بھی جی لگا ہے۔ خیر اس کے اچھے ہو جانے پر پھر کوئی بات نہیں رہی اور مجھے شانتی مل گئی۔ اگر کچھ حالت خراب ہوتی تو نہ معلوم بدسلیقگی کی بندش کب تک مجھے باندھے رکھتی۔

اس طرح گھر میں برابر بندر ہتے رہتے میری بھائی اور بیوی دونوں کی صحت خراب ہو جانا قدرتی تھا۔ ایسا ہی ہوا بھی۔ دونوں ہی کچھ دنوں تک ایک کے بعد دوسری تکلیف پاتی رہیں یعنی گھٹیا ہوگئی جو بہت دنوں بعد جب وہ صحن میں خوب گھومنے پھرنے لگیں تبھی دُور ہوئی۔

کالج میں

امتحان کا نتیجہ معلوم ہو جانے کے بعد میں چھپرا آیا اور وہاں یہ پتہ لگا کہ صرف میرا ہی نتیجہ اچھا نہیں رہا ہے۔ بلکہ اسکول بھر کا نتیجہ بہت اچھا رہا۔ میرے ساتھی رام انوگرہ کو بھی بیس روپے کا وظیفہ ملا اور دو لڑکوں کو پندرہ پندرہ روپئے کا اور دو کو دس دس روپئے کا اس کے علاوہ اوّل ڈویژن میں پاس ہونے والوں کی تعداد بھی کافی تھی اور فیل تو شاید ایک ہی دو ہوئے ہوں۔ اس طرح کا نتیجہ چھپرا ضلع اسکول کا کبھی نہیں رہا تھا۔ بہار بھر میں کسی بھی اسکول کا اتنا اچھا نتیجہ کبھی نہیں رہا تھا اِس لئے اسکول کے لوگ بہت خوش تھے اور چھپرا کے اسکول میں بھی بہت خوشی تھی۔ بابو برج کشور پرشاد چھپرا میں وکالت شروع کر چکے تھے ابھی نئے تھے بہت جوش تھا تھوڑے ہی دنوں میں لوگوں پر خاص کر وکالت خانے (بار ایسوسی ایشن) میں ان کا کچھ اثر بھی ہو گیا تھا۔ اگرچہ وہ میرے گاؤں سے تین کوس پر ہی رہنے والے تھے مگر میں انہیں جانتا نہیں تھا۔ جب میں چھپرا آیا تو انہوں نے بھائی سے رائے کر کے ایک چھوٹی موٹی پارٹی کا انتظام کیا۔ جس میں میں بھی بلایا گیا۔ مگر میں ٹھیک اُسی وقت بیمار پڑ گیا، شریک نہیں ہو سکا۔

چھپرا پہنچ کر میں سب سے پہلے رسنک بابو سے ملا۔ وہ بہت ہی خوش تھے۔ انہوں نے فوراً آم اور مٹھائی کھلائی مجھے بہت دیر تک سمجھاتے رہے کہ اس نتیجے سے میری ذمّہ داری بہت بڑھ گئی ہے۔ یہ پہلا موقع ہے کہ کوئی بہاری یونیورسٹی میں اوّل ہوا ہے بنگال کے لڑکے اسے برداشت نہیں کرسکیں گے۔ وہ مجھے ایف۔ اے میں پچھاڑنے کی کوشش کریں گے۔ کچھ بڑے لڑکے اور طرح سے بھی گرانے کی کوشش سے باز نہیں آئیں گے۔ اِس لئے کلکتہ میں مجھے بہت احتیاط سے رہنا ہوگا اور محنت کرکے جو مقام میں نے پایا ہے اُسے قائم رکھنا چاہیئے۔ مجھے سب باتوں کی اطلاع اُن کو دیتے رہنا چاہیئے اور کسی طرح سستی یا غفلت نہیں کرنی چاہیئے۔ کلکتہ بہت بڑا شہر ہے اس میں کھیل تماشے بھی بہت ہیں۔ بُری چیزیں بھی بہت ہیں۔ سب سے بچنا چاہیئے اور کالج میں جہاں تک ہوسکے محنت کرکے اپنا مقام بچائے رکھنا چاہیئے۔ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ میرے لئے اب کسی نہ کسی طرح ایف۔ اے میں بھی اول آنا ضروری ہے۔ اگر میں اس میں چوکا تو بہت بُرا ہوگا۔ اس لئے اس بات پر انہوں نے طرح طرح سے زور دیا اور مجھے سمجھا بجھا کر کلکتہ جانے کے لئے روانہ کیا۔ اپنے ڈیرے پر پہنچتے پہنچتے مجھے بخار ہوگیا اور سفر سے باز رہا۔ کچھ دنوں کے بعد جب اچھّا ہوگیا تو بھائی کے ساتھ کلکتہ پہنچا۔

کلکتہ میں بھائی پہلے سے ہی ایڈن ہندو ہوسٹل میں رہا کرتے تھے اور ڈف کالج میں ایم۔ اے کلاس میں تاریخ اور رپن کالج میں بی۔ ایل کے لئے قانون پڑھا کرتے تھے۔ میں بھی اُن کے ساتھ ہی وہاں گیا۔ یہ پہلا ہی موقعہ تھا کہ میں کلکتہ گیا وہاں کے مکانوں، سڑکوں، اور ٹرام گاڑی وغیرہ کو دیکھ کر حیران رہ گیا اور جب ہوسٹل پہنچا تو وہ مجھے چھپرا کے ڈیرے کے مقابلے میں محل جیسا لگا۔ میں اتنی دیر کرکے پہنچا تھا کہ ہوسٹل میں طلبا کھچا کھچ بھر گئے تھے۔

ایک بھی جگہ نہیں تھی۔ میں تب تک بھائی کے ساتھ اُن کے کمرے میں ٹھیرا۔ جب پریسیڈنسی کالج میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہاں بھی کافی لڑکے آچکے ہیں اور نئے لڑکوں کی بھرتی بند ہو گئی ہے ڈاکٹر بی کے رائے پرنسپل تھے۔ بھائی نے اُن سے ملاقات کی اور انہوں نے مجھے بھرتی کر لینے کا حکم دے دیا۔ کالج میں تو میں داخل ہو گیا۔ مگر ہوسٹل میں تو جگہ ہی نہیں تھی۔ اس کے لئے بھی کوشش کی گئی اور جس کمرے میں بھائی رہتے تھے اُسی میں چار کی جگہ پانچ چوکیاں رکھ دی گئیں اور میں رہنے لگا۔

جب میں کلاس میں گیا تو وہاں کچھ دوسرا ہی عالم تھا۔ میں نے اتنے سر کھُلے بنگالی لڑکے ایک ساتھ کبھی نہیں دیکھے تھے۔ اُن میں کچھ کوٹ پتلون ہیٹ پہننے والے بھی تھے۔ وہ ایسے ہی لوگوں کے لڑکے تھے جن کے والد ولایت سے لوٹ کر بیرسٹری یا ڈاکٹری کر رہے تھے۔ میں نے کسی ہندوستانی لڑکے کو اس دن تک ہیٹ، کوٹ پہنے نہیں دیکھا تھا اس سے میرے دل میں ایک شک ہوا کہ یہ لوگ اینگلو انڈین یا عیسائی ہوں گے مگر جب نام پکارے گئے تو معلوم ہوا کہ وہ سب ہندو ہی ہیں۔ اِن دنوں یہ رواج تھا کہ مسلمان لڑکے نام کے لئے تو مدرسہ میں طالب علم سمجھے جاتے مگر الیف۔ اے کلاس میں پڑھتے تھے پریسیڈنسی کالج میں۔ ان کو فیس بارہ روپے کے بدلے چار روپے مہینہ دینی پڑتی اور ان کا نام الگ رجسٹر میں لکھا رہتا، اور سب باتوں میں پریسیڈنسی کالج کے لڑکوں سے کسی اعتبار سے کم نہیں تھے۔ اُن کا ہوسٹل الگ تھا۔ ٹوپی والے وہی دیکھنے میں آئے اور دو ایک مارواڑی لڑکے بھی۔ کالج میں بھی سب لڑکے ایک کلاس میں نہ سما سکے تھے۔ اس لئے تین حصّے کر دیے گئے تھے۔ پڑھائی ایک ہی تھی۔

میں ان دنوں چپکن پاجامہ اور ٹوپی پہن کر کالج میں جایا کرتا۔ الیف۔ اے میں انگریزی ایک دوسری زبان اور ہسٹری (تاریخ) لاجک (منطق) اور ریاضی کے علاوہ سب لڑکوں کو

فزکس (علم ماہیات) اور کیمسٹری (علم کیمیا) بھی پڑھنا پڑتا تھا۔ ایف۔ اے میں ڈاکٹر جے۔ سی بوس فزکس اور ڈاکٹر پی سی رائے کیمسٹری پڑھایا کرتے تھے۔ میں جب کالج میں پہلے دن نام لکھا کر پہنچا تو پہلا گھنٹہ کیمسٹری کا تھا۔ وہاں ڈاکٹر پی سی رائے آئے ہم انہوں نے حاضری لینی شروع کی۔ میں سب سے پیچھے ایک بنچ پر بیٹھا تھا۔ پریسیڈنسی کالج کے سب لڑکوں کے نمبر پکارے گئے اور سب نے جواب دئے۔ مجھے اپنا نمبر ہی معلوم نہیں تھا۔ آخر تک میں انتظار کرتا رہا۔ جب آخر نمبر والے لڑکے نے بھی جواب دے دیا اور وہ رجسٹر بند کرنے لگے تو میں نے کھڑے ہو کر کہا کہ میں اپنا نمبر نہیں جانتا ہوں۔ انہوں نے میری طرف آنکھ اُٹھا کر دیکھا اور کہا۔ ٹھہرو ابھی میں نے مدرسے کے لڑکوں کی حاضری نہیں لی ہے اور یہ کہہ کر جھٹ سے دوسرا رجسٹر اُٹھایا۔ میں سمجھ گیا کہ پاجامہ ٹوپی کے سبب سے اُنہوں نے مجھے مسلمان مان لیا ہے۔ میں نے کہا کہ میں مدرسے میں نہیں پڑھتا ہوں۔ پریسیڈنسی کالج میں آج ہی نام لکھوایا ہے۔ اس لئے نمبر نہیں جانتا۔ انہوں نے نام پوچھا اور میں نے نام بتایا تب سب لڑکے مڑ کر میری طرف دیکھنے لگے۔ کیونکہ وہ تو جانتے تھے کہ میرے نام کا کوئی لڑکا اس سال یونیورسٹی میں آیا ہے۔ ڈاکٹر رائے نے کہا کہ ابھی نام درج نہیں ہے، جب درج ہو جائے گا تو آج کی بھی حاضری بعد میں بھر دی جائے گی۔ پھر انہوں نے اتنی دیر میں نام لکھانے کا سبب پوچھا اور اس طرح اُن سے میری پہلی ملاقات ہوئی اور دوسرے ساتھیوں نے بھی پہلے پہل مجھے دیکھا۔

ہندی جاننے والے لڑکے تو کلاس میں بہت کم ہی تھے اور قدرتاً میرا ربط ضبط مارواڑی دیبی پرشاد کھیتان سے دو ہی ایک دن میں ہو گیا اس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ میری طرح وہ بھی بہار سے ہی، جہاں ان کے والد جیلر تھے، پاس کر کے آئے تھے۔ بنگالی لڑکوں

سے بھی جان پہچان شروع ہوگئی۔ اُن میں سے کچھ ایسے نکلے جن کے ساتھ جلد ربط ضبط ہوگیا اور آج تک جاری ہے۔ صرف دو تین کے نام یہاں دیتا ہوں۔ یوگیندر نارائن موزمدار جو آج کل بنگال کے اسٹینڈنگ کنسل ہیں۔ گریش چندر سین جو ڈپٹی کلکٹر ہوئے اور اب گورنمنٹ کے سکرٹیری ہیں اور ابناش چندر موز مدار جو سرکاری مترجم رہے ہیں جے ایم سین گپتا تو بدقسمتی سے اب نہیں رہے۔ میرے ساتھ ہی پڑھتے تھے اور اسی ہوسٹل میں رہا کرتے تھے۔

میں ایک ہفتہ سے کم ہی کالج میں حاضری دے سکا تھا کہ پھر سے جاڑا بخار شروع ہوگیا۔ چھپرا میں ہی جو ملیریا کا حملہ ہو چکا تھا وہ پھر اور زوروں سے ہوا۔ میں مہینوں تک وہاں بیمار رہا۔ ہوسٹل میں ڈاکٹر نے ہزار کوشش کی مگر روزانہ جاڑا بخار ہو ہی جاتا۔ کبھی ایک دو دن اچھا ہو جاتا تو پھر تیسرے چوتھے دن زوروں سے بخار ہو جاتا۔ بھائی بہن پریشان رہے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ وہاں ٹاؤن ہال میں بڑا جلسہ ہونے والا تھا۔ لارڈ کرزن کی کسی کارروائی پر رائے عامہ ظاہر کرنے کے لئے بنگال کے بڑے بڑے لیڈر اور مقرر بولنے والے تھے۔ سر یندر ناتھ بنرجی وغیرہ کی تقریریں ہونے والی تھیں۔ دو تین دنوں سے میں چھٹکارا پائے ہوئے تھا۔ سب نے سمجھا کہ اب میں اچھا ہوگیا ہوں۔ بھائی بھی ہوسٹل کے سب لڑکوں کے ساتھ جلسہ میں چلے گئے۔ میرے کمرے میں یا آس پاس کے کمرے میں بھی کوئی نہیں تھا۔ میں اکیلا ہی تھا۔ سردی لگی اور اس کے بعد بخار چڑھنا شروع ہوا۔ میں پڑا پڑا تھرمامیٹر لگا کر دیکھتا رہا۔ بخار بڑھتے بڑھتے ایک سو چھ (۱۰۶) درجے سے بھی زیادہ ہوگیا۔ میں گھبرایا مگر کروں تو کیا کروں۔ کوئی پاس تھا نہیں۔ کبھی کبھی ایسا معلوم ہوتا کہ اب بھائی سے بھی ملاقات نہ ہوگی۔ آہستہ آہستہ بخار اترنے لگا۔

بھائی کے واپس آنے تک بخار بالکل اُتر گیا جیسا بھائی چھوڑ کر گئے تھے ویسا ہی ہو گیا۔ واپس آنے پر سب حال اُن سے کہا اُنہوں نے تہیّہ کر لیا کہ اب میرے اچھے رہنے پر بھی کہیں چھوڑ کر نہ جائیں گے۔ اس طرح بہت دِن گذر گئے اور دسہرے کی چھٹیوں کے دن آ گئے میں اتنے دنوں میں صرف چار پانچ روز ہی کالج میں جا سکا تھا۔

چھُٹیوں میں کسی طرح گھر آیا۔ وہاں اچھّا ہو گیا۔ چھُٹّی تقریباً ایک مہینے کی تھی۔ اس میں صحت مند ہو کر کلکتہ گیا۔ وہاں پہنچتے ہی پھر بخار آ گیا۔ میں بہت گھبرایا بھائی بھی بہت فکر مند ہوئے۔ اِن دنوں یہ قاعدہ تھا کہ کالج میں جتنے لکچر ہوتے ان میں سے ایک مقررہ تناسب میں ضرور حاضر رہنا چاہیئے نہیں تو امتحان دینے کی اجازت یونیورسٹی سے نہ ملتی۔ خوف ہونے لگا کہ اتنی غیر حاضری ہونے کے بعد شاید میں حاضری پوری نہ کر سکوں گا اور امتحان دینے کی اجازت ہی نہ ملے گی۔ اس کے علاوہ پڑھائی تو چھوٹ ہی گئی تھی۔ کبھی کبھی خیال ہوتا کہ کلکتہ چھوڑ کر الہ آباد چلا جاؤں۔ اس میں بھی دقّت تھی۔ بیچ سال میں ایک یونیورسٹی سے دوسری میں جانے کی اجازت ملے گی یا نہیں اور پھر وہاں جا کر بھی وہاں کی بھی حاضری پوری نہیں ہو گی تو ایک سال تو یوں ہی چلا جائے گا۔ رسک بالو نے اپنے مقام کو محفوظ رکھنے کی جو بات کہی تھی وہ بھی یاد آ جاتی اور دل بہت بے قرار ہوتا مگر بے چارگی تھی۔ کچھ بس نہ چلتا تھا۔ آخر میں بھائی ڈاکٹر نیل رتن سرکار کے پاس لے گئے۔ اُنہوں نے نسخہ دیا۔ بخار آنا بند ہوا اور میں اچھّا ہو گیا۔ یہ نسخہ تقریباً ایک برس تک چلتا رہا۔ نہ معلوم اس سال بھر میں کتنی کُنین کھائی ہو گی۔ ہومیوپیتھیک ڈاکٹر نے پچیس چھبیس برس بعد کہا کہ آج کا دمہ اسی کُنین کا نتیجہ ہے۔ معلوم نہیں حقیقت کیا ہے۔

اچھّا ہو جانے پر میں بہت محنت سے پڑھنے لگا۔ تین چار مہینے میں پڑھائی میں

بچھڑ گیا تھا۔ اس کو پورا کرنا تھا اور ساتھ ہی یہ بھی فکر تھی کہ یونیورسٹی میں اپنی جگہ خالی نہیں کھونی چاہیئے۔ ہر ایک مضمون کو میں اس خیال سے پڑھنے لگا کہ میں اُس میں اوّل آؤں۔ میں ہر ایک مضمون میں کتاب کے علاوہ، جو درجہ میں پڑھائی جاتی۔ تقریباً تین چار کتابیں اور پڑھ گیا۔ میں خود کو حساب میں کمزور سمجھتا تھا، اس لئے اس پر خاص دھیان دیا، الجبرا ٹراگنومٹری کانک سکشن کی جتنی کتابیں مل سکیں اور ان میں جتنی مثالیں دی گئی تھیں ایک ایک کرکے سب کا مطالعہ کیا یونیورسٹی میں جتنے سوال اُس وقت تک پوچھے گئے تھے ایک ایک کو اسی طرح حل کر لیا۔

میری خواہش تھی کہ ایف اے پاس کرکے سائنس پڑھوں۔ ڈاکٹر جے۔ سی بوس اور ڈاکٹر پی سی رائے کے پڑھانے کا طریقہ اتنا اچھا تھا کہ اُس وقت رغبت بہت ہوگئی اور ان مضامین کو زیادہ جاننے کا شوق ہوگیا۔ یوں تو تاریخ پڑھانے والے پروفیسر وننیدرناتھ سین بھی بہت اچھے معلّم ہی نہیں بلکہ اعلیٰ درجہ کے شریف انسان بھی تھے۔ جن کی عنایت مجھ پر بہت رہتی تھی اور جو ہوسٹل میں آکر بیماری کی حالت میں مجھے دیکھ بھی گئے تھے مگر زیادہ میلان سائنس کی طرف ہی تھا۔ ان مضامین میں جی لگنے لگا اور جتنی کتابیں میں پا سکا، پڑھ گیا۔ ان دنوں عملی طور پر لیبارٹری میں ایف۔ اے کے طلبار کو کچھ نہیں کرنا پڑتا تھا کتابی علم ہی کافی سمجھا جاتا تھا۔ میں نے تقریباً بی۔ ایس۔ سی تک کا کتابی علم حاصل کر لینے کی کوشش کی تھی۔ ایک ہی دقّت معلوم ہوتی تھی۔ اوپر جاکر زیادہ ریاضی کی ضرورت ہوگی اور اتنی محنت کے بعد بھی ریاضی میں میرا ذہن نہ چلتا تھا۔ اس لئے میں اس پر زیادہ محنت کرتا۔

اسی طرح دو سال گذر گئے۔ امتحان کے دن آئے۔ کچھ بنگالی ساتھیوں سے دوستی ہوگئی۔ رسک بابو نے جو مجھے ڈرا دیا تھا اس کا مجھے کہیں کچھ بھی احساس نہیں ہوا۔

جسے ڈف سکالرشپ کہتے تھے اور منطق میں اوّل آنے کے صلہ میں کتابوں کا انعام ملا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں نے سمجھ لیا کہ میں ریاضی میں کامیاب نہیں ہو سکوں گا اور اس لئے سائنس بھی میرے لئے مشکل ہو گا۔

امتحان کے نتیجے کے بعد میں نے پہلے فیصلے کو بدل دیا اور سائنس کی طرف نہ جاکر بی۔اے کلاس میں نام لکھایا۔ ان دنوں ایف۔اے تک کی پڑھائی سب کے لئے ایک ہوتی تھی۔ سب مضمون پڑھنے پڑھتے اور تب کوئی بی۔ایس سی میں نام لکھا کر سائنس پڑھتا اور کوئی بی۔اے میں نام لکھا کر انگریزی اور فلسفہ پڑھتا۔ بی۔اے میں نام لکھا لینے کے بعد ڈاکٹر پی سی رائے سے ملاقات ہوئی۔ انہوں نے پوچھا کہ تم نے سائنس میں نام کیوں نہیں لکھایا، میں نے جواب دیا کہ ریاضی میں کمزور ہوں۔ اُنہوں نے جواباً کہا کہ تم نے مجھ سے رائے کیوں نہیں لی۔ میں بھی ریاضی کم جانتا ہوں۔ مگر اس لئے تو میں سائنس سے بھاگتا نہیں ہوں اُن کو افسوس رہا مگر اب بہت دیر ہو چکی تھی اور بدلنا مشکل تھا۔

دو برس تک پوری توجہ سے میں نے رسک بابو کی بات یاد کر کے پھر اوّل آنے کے لئے کوشش کی اور میں اس میں کامیاب رہا۔ رسک بابو اس درمیان تبدیل ہو کر کلکتہ چلے آئے ملاقات کرنے پر بہت خوش ہوئے۔ کبھی کبھی اُن سے جاکر ملتا۔ کچھ دنوں بعد اُن کی وفات ہو گئی۔

امتحان سے بے اعتنائی

بی۔اے کلاس میں پہنچ کر میری حالت کچھ بدل گئی۔ امتحان کی طرف سے رغبت کچھ ہٹ گئی۔ خیال کچھ اور باتوں کی طرف بٹ گیا۔ بچپن سے ہی عادت تھی کہ جو کچھ کلاس میں پڑھایا جاتا اُسے حتی الوسع پوری توجہ سے سُنتا، اور درجہ کا وقت کسی طرح برباد نہ ہونے دیتا۔ شروع میں تو اس کا ایک سبب یہ تھا کہ گھر پر کوئی پڑھانے والا یا بتانے والا ماسٹر نہیں تھا اس لئے سب کچھ سکول میں ماسٹر کے بتانے پر ہی منحصر تھا۔ بعد میں عادت ہی ایسی پڑ گئی۔ کالج میں بھی یہی بات رہی۔ نام لکھاتے ہی یہ سوال اُٹھا کہ کس مضمون میں آنرز لیا جائے۔ اِن دنوں بی اے میں تین مضمون پڑھنے ہوتے تھے، جن میں انگریزی اور فلسفہ لازمی تھے اور تیسرا مضمون ایسا تھا جس کو چُن لینے کا حق طلبار کو تھا مگر چن لینے کے بعد اُسے بھی دونوں لازمی مضمونوں کی طرح ہی پڑھنا ہوتا اور اس میں بھی امتحان پاس کرنا ہوتا۔ میں نے تاریخ اور اکونامکس (علم معاشیات) کو چُنا۔ ان دنوں آنرز کے لئے 'پاس' کے سوا کچھ اور کتابیں پڑھنی ہوتی تھیں اور ان کتابوں میں امتحان بھی الگ ہوتا تھا۔ اس طرح آنرز کے مضمون کا امتحان زیادہ سخت ہوتا تھا اور کلاس لیکچر بھی زیادہ ہوا کرتے۔ یہ بھی قاعدہ تھا کہ

ساتھیوں کے ساتھ دن بہت خوشی اور پریم کے ساتھ بیتے۔ نہ تو کہیں کسی کی بُری نظر پڑی اور نہ مجھے کسی کی بدخواہی کا شکار ہونا پڑا سب کے ساتھ نیک دلی بڑھتی گئی اور کچھ کے ساتھ تو بڑا ارتباط ہو گیا جو آج کل بھی ملاقات ہونے پر یاد آجاتا ہے۔ جیسے وہ کل کی بات ہو۔

یونیورسٹی کے امتحان سے پہلے کلاس میں کالج کی طرف سے امتحان ہوتا ہے یہ ہوا اور میرا نمبر ہر ایک مضمون میں سب سے اوّل آیا۔ ایک دو مضمون میں لیکچروں کی حاضری جتنی ہونی چاہیئے تھی نہیں تھی۔ پروفیسر نے مہربانی کر کے کچھ زیادہ لکچر دیئے جس سے یونیورسٹی کے قاعدے میرے امتحان دینے میں مخل نہ ہوں اور تناسب کے مطابق حاضری ہو جائے۔ امتحان کی اجازت دینے سے پہلے ایک دل چسپ واقعہ ہوا۔ میں نے تقریباً ہر ایک مضمون میں سب سے زیادہ نمبر پائے تھے مگر جب کالج کے امتحان کا نتیجہ بتایا گیا تو کہا گیا کہ مجھے یونیورسٹی کے امتحان میں شریک ہونے کی اجازت نہیں دی گئی۔ اُس زمانے میں ایک انگریز پرنسپل آگئے تھے وہ خود امتحان کا نتیجہ سنانے کے لئے آئے۔ سب لڑکے وہاں جمع تھے۔ انہوں نے ایک ایک کر کے نام بتانا شروع کئے۔ میرا نام نہیں بولا۔ جو فہرست تیار کی گئی تھی، اس میں غلطی سے میرا نام ہی چھوٹ گیا تھا، لکھا نہیں گیا تھا۔ جب نام نہیں بولا گیا تو سب لوگوں کو تعجب ہوا۔ میں تو گھبرا گیا۔ میں نے کہا کہ میرا نام نہیں پڑھا گیا۔ پرنسپل نے تو ایف۔ اے میں پڑھایا نہیں تھا۔ اسی لئے کسی لڑکے کو جانتے نہیں تھے۔ پوچھنے پر فوراً جواب دیا تم پاس نہیں ہوئے، اس لئے تمہارا نام نہیں آیا۔

میں نے پھر کہا، ایسا ہو نہیں ہو سکتا میں پاس ہوا ہوں گا۔ جواب ملا ایسا ہو نہیں سکتا۔ اگر پاس ہوئے ہوتے تو نام ضرور رہتا۔ میں نے پھر کہنا چاہا وہ بگڑ گئے اور بولے، خاموش رہو نہیں تو جرمانہ کر دوں گا، میں نے پھر ہمّت کر کے کچھ کہنا چاہا، جواب ملا "تم پر پانچ روپے

جرمانہ کرتا ہوں "۔ میں پھر بولا، جواب ملا" دس روپے جرمانہ " اس طرح پانچ پانچ روپے بڑھ کر جس طرح نیلام میں بولی بڑھتی ہے وہ بیس سے پچیس تک پہنچے۔ ایک تماشا تھا۔ عقل کام نہ کرتی تھی کہ کیا کروں۔ اتنے میں کالج کے ہیڈ کلرک نے جو مجھے جانتا تھا۔ پیچھے سے اشارہ کیا کہ چپ رہو، سب ٹھیک ہو جائے گا، میں خاموش ہو گیا۔

دوسرے دن فارم وغیرہ جو بھرنا ہوتا ہے اُسے بھر کر دے دیا اور فیس داخل کر دی کسی نے کچھ پوچھا ہی نہیں۔ اس کلرک نے غلطی درست کر دی۔ اور پرنسپل سے اُن کی غلطی بتائی یا نہیں اس کا مجھے علم نہیں۔ جرمانہ تو کسی نے پھر مانگا ہی نہیں اور نہ میں نے اپنی طرف سے داخل کرنے کی کوشش کی۔ ہاں اس واقعہ سے وہ بات پھر یاد ہو گئی کہ کس طرح ہیڈ ماسٹر نے چھپرا میں انٹرنس کے امتحان دینے میں رکاوٹ ڈالی تھی۔

ایف۔ اے کے امتحان کے لئے میں نے خوب تیاری کی۔ امتحان کا نتیجہ بھی ایک طریقہ سے ٹھیک نکلا۔ میں ایک طریقہ سے اس لئے کہتا ہوں کہ اگرچہ میں سب سے اوّل آیا مگر میری یہ خواہش پوری نہیں ہوئی کہ میں سائنس اور ریاضی میں سب سے اُوپر آؤں۔ اِن مضمونوں میں زیادہ محنت کی تھی۔ انگریزی، فارسی، منطق وغیرہ میں اُن کے مقابلے میں بہت کم محنت کی تھی، مگر جب امتحان کا نتیجہ نکلا تو معلوم ہوا کہ انگریزی، فارسی اور منطق میں میں نے سب سے زیادہ نمبر پائے ہیں اور دوسرے مضمونوں میں اوروں سے تھوڑے نمبر سے پیچھے رہ گیا ہوں۔ اگرچہ سب ملا کر اوروں سے آگے ہوں۔ انٹرنس کے امتحان کے نتیجہ کے طور پر سب سے زیادہ نمبر پانے کے لئے بیس روپئے مہینے کے وظیفہ کے علاوہ انگریزی میں بھی اوّل ہونے سے دس روپئے مہینے کا الگ وظیفہ ایک برس کے لئے ملا تھا۔ ایف۔ اے میں سب سے اوّل ہونے کے صلہ میں پچیس روپئے مہینے کا دو برسوں تک کے لئے وظیفہ ملا

نوٹ لے لیا کریں۔ دو جِلد بندھے رجسٹر ملتے تھے جن میں دونوں لکچروں کا خلاصہ لکھ کر دینا پڑتا۔ ستیش بابو اِن رجسٹروں کو گھر پر لے جاتے اور پڑھ کر جو کچھ فروگذاشت ہوتی اُسے درست کر دیتے اور الگ الگ ہر لڑکے کو بُلا کر غلطیاں بتا دیتے۔ لکچر کے مضمون بہت اچھّے ہوا کرتے جن سے ملک اور دنیا کی بہت باتوں کی واقفیت بڑھتی اور چال چلن پر بھی اثر پڑتا۔ سُنے ہوئے لکچر کو پھر نوٹوں کی مدد سے اپنی زباں میں مرتب کرنے کی مشق ہر طرح سے اچھّی تھی۔ اس سے یونیورسٹی کے امتحان میں بھی مدد ملتی۔ سال کے آخر میں ستیش بابو سب رجسٹر کسی بڑے آدمی کے پاس بھیجتے اور وہ صاحب اِن رجسٹروں کو دیکھ کر جس کا کام سب سے اچھّا ہوا کرتا اُسے وظیفہ اور انعام دیتے۔ عملی طور پر خدمت کا طریقہ یہ تھا کہ ایک چھوٹی دُکان سودیشی کپڑے اور دوسری چیزوں کی کھولی گئی جس کی دیکھ بھال ممبروں کے ہی ذمّہ تھی۔ یہ دُکان شام کو دو گھنٹے کے لئے کھُلتی اور بیچنے حساب رکھنے کا کام ممبروں کے ہی ذمّہ تھا۔

میں کسی طرح اس سوسائٹی کے ایک لیکچر میں پہنچ گیا۔ سب باتیں بہت اچھّی لگیں۔ میں اس میں شریک ہوگیا۔ ستیش بابو کی مہربانی رہتی تھی وہ یونیورسٹی کے اچھّے طلبار میں تھے۔ اُنہوں نے اُسی سال بی۔ اے کا امتحان پاس کیا تھا جس سال سر آسوتوش مکرجی نے پاس کیا تھا۔ تعلیم کے زمانے میں وہ سوامی وویکانند کے ساتھی تھے انہوں نے وکالت شروع کی تھی۔ مگر تھوڑے ہی دنوں بعد اُسے چھوڑ دیا تھا اور اسی قسم کے پبلک کاموں میں لگ گئے تھے۔ اُنہوں نے کبھی شادی نہیں کی۔ اُن کو خیال ہوا کہ طلبا کی زندگی کی اصلاح ہونی چاہیئے۔ اور اسی لئے انہوں نے ڈان سوسائٹی قائم کی تھی اس میں مسٹر این، این گھوش، مسٹر نویدتا، سر گرو داس بنرجی وغیرہ عظیم ہستیوں کی مدد اور ہمدردی حاصل تھی۔ سوسائٹی میں جانے سے میرا بہت سے ایسے طلبار سے

بھی ربط ضبط ہوگیا جو میرے ہم جماعت نہیں تھے مگر جو یونیورسٹی کے ساتھی طلبا میں تھے جیسے بِنے کمار سرکار جو مشہور عالم اور مصنف ہیں۔ رامندر نارائن گھوش جو رپن کالج کے پرنسپل تھے اور جن کا ابھی کچھ سال پہلے انتقال ہوا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ سال کے آخر میں ڈان سوسائٹی کا وظیفہ اور انعام بھی مجھے ملا جن کو جلسہ میں سر گُرو داس بنرجی نے کچھ حوصلہ افزا الفاظ کے ساتھ مجھے دیا۔ سوسائٹی میں جانے سے طلبا کے خیالات میں چھان بین خوب ہوئی۔ امتحان سے طبیعت ہٹ گئی۔ اور خیال رفاہِ عامہ میں زیادہ لگنے لگا۔ یوں تو میں بچپن سے ہی اس طرح کی باتوں کی طرف زیادہ دھیان دیا کرتا تھا جب اسکول میں پڑھتا تھا تو وہاں پر ایک ڈبیٹنگ سوسائٹی قائم کی تھی، جس میں اتوار کو ہم سب ملتے۔ اپنے اپنے مقالے پڑھتے یا تقریر کرتے۔ اس میں کبھی کبھی اسکول کے ماسٹر بھی مدعو کئے جاتے، مگر یہ ادارہ اسکول کا نہیں تھا، آزاد تھا۔ اسی طرح ہم لوگوں نے کلکتہ میں بھی بہاریوں کا ادارہ بہاری کلب قائم کرلیا تھا جس میں ہم لوگ اتوار کو ملتے، مقالے پڑھتے اور تقریریں کرتے۔ اس کے علاوہ میں کالج کی یونین میں بھی حصہ لیا کرتا تھا اور ایک سال تو اس کا سکریٹری بھی چُنا گیا تھا کالج یونین کی طرف سے ایک ماہنامہ نکالا گیا تھا جس کے اجرا میں میرا ہاتھ رہتا تھا۔

لیکن ان سب رجحانات کے ہوتے ہوئے بھی ڈان سوسائٹی میں شریک ہونے کے پہلے یہ سب ایک طرح بے مقصد تھے۔ ان کی کوئی طے شدہ منزل نہیں تھی، اور نہ ہمارے سامنے کوئی لگا بندھا لائحہ عمل تھا۔ میں اخبار پڑھا کرتا تھا۔ کانگریس کا نام جانتا تھا۔ جب اس کا سالانہ جلسہ ہوتا تو اس کی تقریروں کو توجہ سے پڑھتا۔ یوں تو جب کبھی کوئی جلسۂ عام ہوتا اور بڑے آدمیوں کی تقریریں ہوتیں (جیسے سریندر وناتھ ونرجی) تو

طالب علم چاہے تو ایک سے زیادہ مضمونوں میں بھی آنرز لے لے۔ میرے سامنے سوال یہ تھا کہ میں کس مضمون میں آنرز لوں۔ دو مضمونوں میں یا تینوں میں۔ میں نے پہلے کچھ طے نہیں کیا اور تینوں مضمونوں میں آنرز کلاس میں شریک ہونے لگا۔

میرے ساتھی رام الوگرہ جو ایف اے میں چھپرا سے دوسرے کالج میں چلے گئے تھے بی۔اے کے لئے پریسیڈنسی کالج میں آ گئے تھے۔ اُن کی رائے ہوئی کہ ہم دونوں کو تینوں مضامین میں آنرز لینا چاہیئے۔ انہوں نے خود تینوں مضمونوں میں آنرز بھی لے لیا۔ بی۔اے کے امتحان کے نتیجہ کے طور پر دو وظیفے (ایک پچاس روپئے مہینے کا اور دوسرا چالیس روپئے مہینے کا) مِلا کرتے تھے۔ صرف آنرز میں نمبر جوڑ کر ہی وظیفہ ملا کرتا تھا۔ اس لئے ان کی رائے تھی کہ تینوں مضمونوں میں آنرز لینا چاہیئے۔ لیکن ایسا ہوا کرتا تاکہ ایک یا دو مضمون میں آنرز میں اتنے نمبر آجاتے کہ تین مضمونوں کے نمبروں سے بھی زیادہ ہو جاتے۔ ایسی حالت میں دو ہی مضمونوں کے آنرز والے کو وہ وظیفے مل جاتے۔ مجھے ڈر لگتا کہ تین مضمونوں میں آنرز لینے پر محنت بہت کرنی پڑے گی۔ چند دنوں تک پس و پیش میں رہا۔ تینوں مضمونوں کے کلاس میں جاتا رہا۔ اتفاق سے اُن دنوں فلسفہ کے پروفیسر کچھ ایسے خشک طریقہ سے پڑھاتے تھے کہ اس میں میرا جی نہیں لگا۔ اس کے خلاف انگریزی اور تاریخ کے پروفیسر مسٹر پرسیول اور بنے بابو اپنے مضمون بڑے پُر لطف طریقے سے پڑھاتے تھے اس لئے ان کے کلاس میں جی خوب لگتا تھا۔

میں نے طے کر لیا کہ انگریزی تاریخ اور معاشیات میں ہی آنرز پڑھوں گا۔ رام الوگرہ اور ایک دوسرے طالب علم صرف یہی دو تینوں میں آنرز پڑھتے رہے۔ کچھ دنوں کے بعد ڈاکٹر پی۔ کے رائے فلسفہ پڑھانے لگے۔ ان کا طریقہ اتنا لطیف اور قابلِ قبول تھا کہ میں نے

دیکھا کہ سب سے آسان مضمون فلسفہ تھا۔ ان کے لیکچر اتنے اچھے ہوتے کہ اگر انہیں توجہ سے سُنا جائے تو کتاب پڑھنے کی ضرورت ہی کم ہو جاتی تھی۔ امتحان میں سب مضمونوں میں پاس کرنا تو ضروری تھا مگر پہلے کہہ چکا ہوں کہ وظیفہ کے لئے آنرز کے ہی نمبر جوڑے جاتے اور قدرتاً اِن پر زیادہ دھیان دیا جاتا، اس لئے میں نے فلسفہ پر ڈاکٹر رائے کا لیکچر سُننے کے سوا بہت کم دھیان دیا مگر ان کا پڑھانا اتنا اچھا تھا کہ بغیر کتاب پڑھے ہی میں نے اس مضمون میں اِتنا علم حاصل کر لیا تھا کہ امتحان پاس کر سکوں، پیچھے افسوس بھی ہوا کہ اگر اس مضمون کو لیا ہوتا تو شاید کم محنت سے ہی تیسرے مضمون میں بھی آنرز ہو جاتا۔

اس طرح کچھ دنوں تک تو کالج میں خوب جی لگا کر پڑھتا رہا مگر کچھ ایسے واقعات ہوئے کہ امتحان کے نتیجہ سے دل اُچاٹ ہو گیا اور خیال اور طرف جانے لگا۔ اُنہیں دِنوں شری ستیش چندر مُکر جی نے ایک ادارہ قائم کیا جس کا نام تھا ڈان سوسائٹی، طالب علم اس کے ممبر ہوتے تھے۔ اُن کو کچھ دینا نہیں پڑتا تھا۔ اُن کا مقصد تھا کہ تعلیم میں بھی طلبار کی مدد کی جائے اور اُن کا چال چلن سدھارنے میں اور انہیں دیش کی باتوں کی واقفیت بہم پہنچانے میں بھی مدد کی جائے۔ ان سے کچھ کار خدمت بھی لیا جاتا تھا اور وہاں کی تعلیم کا ایک جزو سمجھا جاتا تھا۔ طریقہ یہ تھا کہ ہر روز شام کے وقت دو کلاس لئے جاتے اور ان میں دو لیکچر دئے جاتے ایک لیکچر تو مختلف موضوعوں پر ہوتا اور ایک گیتا پر۔ گیتا کلاس تو ایک پنڈت لیتے اور بہت آسان طریقے سے گیتا سمجھاتے۔ دوسرے کلاس میں ستیش بابو خود لیکچر دیا کرتے۔ اور دوسرے لوگوں کو بلوا کر بھی لیکچر دلوایا کرتے۔ اس کلاس میں کبھی کبھی ایک کالج کے پرنسپل این۔ این گھوش کبھی سسٹر نِویدتا کبھی اور دوسرے لوگ لیکچر دیا کرتے تھے۔ ٹھیک وقت سے جانا پڑتا۔ حاضری لی جاتی۔ لیکچر سے پہلے ہی پنسل کاغذ سب لڑکوں کو دیا جاتا کہ وہ لیکچر کے

کلاس میں ایک دقّت محسوس ہوتی تھی جو لیکچر ہوتے ان کے نوٹ ضرور لیتا۔ پنسل سے نوٹ مٹ جانے کا خوف رہتا۔ اس لیئے قلم دوات لے جاتا اور لکھتا ایک دن دیکھا کہ اسٹائلو پن نکلا ہے جس میں روشنائی بھر دی جاتی ہے اور آدمی کو دوات ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں پڑتی یہ بدیشی تھا اور وائٹ وے لیڈلا کی دُکان پر اُن دنوں آدھے دام پر ہی بک رہا تھا۔ میں نے ایک خرید لیا۔ ہوسٹل کے ساتھیوں کو یہ معلوم ہوا۔ وہ بہت بگڑے اور مجھ سے جھگڑنے لگے۔ اُن میں ایک آدمی ایسا بھی تھا جس کے بارے میں میں جانتا تھا کہ اس کے پاس خط لکھنے کے لئے بدیشی کاغذ تھا۔ دوسرا ایسا جس کے پاس تھوڑے ہی دن پہلے کا بنا ہوا بدیشی کپڑے کا نیا قیمتی کوٹ تھا۔ طلبا نے طے کیا تھا کہ ایک دن بدیشی کپڑوں کی ہولی جلائی جائے گی اور اسی دن ہوسٹل کے صحن میں ان چیزوں کو بھی جلایا جائے گا۔ سب کے دل میں تھا کہ کچھ کپڑے جلا دئے جائیں مگر شاید ہی کسی کے دل میں ہو کہ سب بدیشی کپڑے جلا دئے جائیں کیونکہ تقریباً سب کے پاس زیادہ سے زیادہ بدیشی کپڑے ہی تھے۔

جب لوگوں نے مجھے بہت دِق کیا تو میں نے کہا، سب اپنے اپنے ٹرنک کھولو۔ جس کے پاس جتنا بدیشی کپڑا ہے ہولی میں آج ہی جلا دے۔ میں بھی اپنا ٹرنک کھولتا ہوں اور میرے پاس جو کچھ بدیشی نکلتا ہے، میں سب ابھی یہیں جلا دوں گا۔ سب چوکنّے ہو گئے وہ یہ تو جانتے نہیں تھے کہ اس قلم کے سوا میرے پاس کوئی بھی دوسری چیز بدیشی نہیں تھی۔ میں نے ٹرنک کھول دیا اور ایک ایک کر کے سب چیزیں کمرے میں بکھیر دیں۔ اس کے بعد مجمع ہٹ گیا اور پھر کسی نے اس طرح کا اعتراض مجھ پر نہیں کیا۔ اُس ساتھی نے اپنے بدیشی کاغذ تو جلا دئے مگر جہاں تک مجھے یاد ہے دوسرے ساتھی نے نئے کوٹ

کو جلدی سے چلانا مناسب نہیں سمجھا۔ ہاں اُسے ان دنوں پھر پہننے کے لئے نہیں نکالا۔ ایسا ہی دوسروں نے بھی کیا۔

۱۹۰۵ء اس طرح ایک نئی تحریک اور بیداری کا سال تھا۔ خاص کر طلبا میں ایک نئی زندگی دوڑ گئی۔ بہتیروں نے تو پڑھنا بھی چھوڑ دیا۔ اسی زمانے میں کلکتہ میں قومی تعلیم کا ایک نیا ادارہ کھلا۔ شری ستیش بابو اس میں چلے گئے اور ڈان سوسائٹی کا کام کچھ دنوں کے بعد ڈھیلا پڑ گیا۔ سوسائٹی کے ممبروں میں سے کئی اس ادارے میں شریک ہو گئے میں ان سب جلسوں میں برابر آیا جایا کرتا اور ان سب تقریروں کو سنتا، مگر میرے سامنے اس کا مقصد صاف نہیں تھا اور نہ اپنا دل ہی اس کے لئے تیار تھا کہ کالج چھوڑ دوں اور مستقبل کو اس طرح یکبارگی بدل دوں۔ میں ایک ڈرپوک آدمی لڑکپن سے ہی رہا ہوں اور کسی معاملہ میں جلدی سے کوئی بڑا قدم اُٹھانا میرے لئے ہمیشہ ایک مشکل مسئلہ رہا کرتا ہے۔ اس زمانے میں تو قدم اُٹھانے کا سوال بھی زوروں سے سامنے نہیں آیا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کہ سودیشی تحریک میں یا تقسیم بنگالہ کے خلاف تحریک میں کبھی تعلیمی اداروں کو چھوڑنے کا پروگرام اس طریقہ سے شامل نہیں تھا۔ جیسے ۲۱-۱۹۲۰ء کے آندولن (تحریک) میں تھا۔ میں اس طرح ان چیزوں کے ساتھ ویسے ایک طرح سے باہر سے ہی ہمدردی رکھتا رہا۔ کبھی ان کے اندر داخل نہیں ہوا۔

بہرحال ان سب تحریکوں کا نتیجہ یہ تو ضرور ہوا کہ کتابوں کے پڑھنے میں وقت کم لگاتا اور امتحان کے نتیجہ کی طرف سے ایک طرح سے بے اعتنائی ہو گئی۔ امتحان مارچ کے مہینے میں ہوا کرتا تھا۔ ستمبر، اکتوبر میں دُرگا پوجا اور دسہرے کے لئے چھٹیاں ہوا کرتیں یہ مدت ایک مہینہ کے قریب یا اس سے بھی زیادہ لمبی ہوا کرتی۔ میں اس بار چھٹیوں

میں اس میں جا کر تقریریں سُنتا مگر ڈان سوسائٹی میں زیادہ دلچسپی تھی۔ سودیشی کا پریم تو بھائی نے اسکول کے زمانے سے ہی پیدا کر دیا تھا لیکن ابھی وہ پوری طرح رنگ نہیں لایا تھا۔ یہ ڈان سوسائٹی اور ستیش بابو کی صحبتِ نیک کا ہی فیض تھا کہ جو خیالات اور رجحانات پہلے سے ہیولانی شکل میں موجود تھے اور جو بغیر کسی مقصد یا سمجھ کے اندھیرے میں کام کر رہے تھے اُجاگر ہو گئے۔ میں کچھ مستقبل کی بھی سوچنے لگا۔

تحریک تقسیم بنگالہ

۱۹۰۴ء میں، میں نے ایف۔ اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۰۵ء میں تحریک تقسیم بنگالہ شروع ہوئی۔ میں سبھی عام جلسوں میں پہلے سے ہی جایا کرتا تھا۔ تقسیم بنگال کی مخالفت کے جلسوں میں بھی خوب جاتا۔ ان دنوں اس بات میں روک ٹوک ابھی نہیں تھی۔ ۷ راگست ۱۹۰۵ء کے بڑے جلسہ میں جس میں بدیشی چیزوں کا بائیکاٹ اور سودیشی کے پرچار کا فیصلہ ہوا میں شریک تھا۔ اس میں بڑا جوش تھا۔ لوگوں نے عہد کیا کہ وہ سودیشی ہی استعمال کریں گے۔ میرے لئے اس میں کوئی دشواری نہ تھی۔ کیونکہ میں بہت پہلے ہی سے صرف سودیشی چیزوں کو ہی استعمال کیا کرتا تھا۔ تحریک خوب زوروں سے چلی۔ تقریباً روزانہ کہیں نہ کہیں عام جلسہ ہوتا ہم سب جاتے۔ کہیں سریندر بابو، کہیں بپن چندر پال۔ کہیں اے چودھری، کہیں آربندو گھوش کی تقریریں ہوتیں۔ ہوسٹل کے لڑکوں میں بڑی ہل چل تھی۔ جو لوگ کبھی سودیشی کا استعمال نہ کرتے تھے انھوں نے بھی شروع کر دیا۔ بڑوں کی تو مجھے خبر نہیں مگر طلبا میں نیا جوش اور نئی اُمنگ پیدا ہو گئی۔

ایک چھوٹے واقعہ کا ذکر کرنا اچھا ہوگا۔ یوں تو میں سودیشی کا ہی استعمال کرتا تھا مگر

ہی تعلق رکھتے۔ مگر ان کی سادگی، فرض شناسی بظاہر خشک مزاجی اور سختی کا اثر ہم سب پر بہت پڑتا۔ ہم ڈرتے بھی خوب تھے۔ شاید ہی کبھی کوئی ان کے گھر گیا ہو۔ ان کا ایک طریقہ تھا کہ جتنے امتحانوں میں وہ ممتحن ہوتے۔ چاہے وہ کالج کے ہوں یا یونیورسٹی کے، امتحان دینے والوں کے ناموں کی فہرست بنا کر جو نمبر دیتے لکھ کر اپنے پاس رکھ لیتے۔ جب کوئی طالب علم اُن سے سارٹیفکٹ، نوکری وغیرہ کے لئے مانگتا تو اس سے ان سب امتحانوں کا وقت پوچھ لیتے جن میں انہوں نے اس کو جانچا تھا۔ اپنے رجسٹر دیکھ کر، امتحان کے نتیجے کی بنیاد پر دوسرے دن سارٹیفکٹ لکھ کر لا دیتے۔ ان کے سارٹیفکٹ کی بڑی قدر ہوتی۔

میں ہمت کر کے ان کے گھر پہنچا۔ ڈرتا تو تھا، مگر کوئی چارہ نہ تھا۔ انہوں نے تقریباً دو برس تک پڑھایا تھا۔ اس لئے مجھے جانتے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی پوچھا کہ کیوں آئے ہو؟ میں نے غرض بتائی۔ ابھی امتحان لئے چند دن ہی گذرے تھے، اُن کو نتیجہ یاد تھا۔ اُنہوں نے کہا کہ مجھے یاد ہے تم سب سے اوپر آئے ہو اور نمبر بھی اچھے ملے ہیں تو بھی ایسا کیونکر ہوا؟ میں نے خود اپنے ہاتھوں سے لکھ کر امتحان کا نتیجہ پرنسپل کو دیا ہے۔ اس میں کوئی غلطی ہے وہاں دفتر میں کوئی بھول ہوئی ہے۔ مجھ سے کالج میں ملو۔

میری جان میں جان آئی۔ میں پہلے سے ہی آ کر کالج کے زینے پر کھڑا ہو گیا۔ وہ وقت سے ایک دو منٹ پہلے ہی پہنچے اور سیدھے پرنسپل کے کمرے میں چلے گئے۔ وہاں دیکھا کہ میرے نمبر دوسرے ساتھی کے نام کے سامنے لکھے گئے ہیں جس نے آنرز میں پورے نمبر نہیں پائے ہیں اور اس لئے فیل ہو گیا ہے۔ اس کے نمبر میرے نام کے سامنے لکھے گئے ہیں۔ پرنسپل نے اپنی غلطی تسلیم کر لی، افسوس ظاہر کیا اور کہا کہ اس لڑکے سے کہہ دیجیے کہ بھول گئی تھی، اب اس کو امتحان دینے کی اجازت ہے۔

میں تو انتظار میں کھڑا تھا ہی۔ وہاں سے نکلتے ہی انہوں نے سب باتیں مجھ سے کہیں اور کہہ کر کلاس میں پڑھانے چلے گئے۔ اس گول مال کا نتیجہ یہ ہوا کہ میرے دو دن بے کار گئے۔ جام تاڑا سے کلکتہ آنے جانے میں کچھ خرچ پڑا اور کچھ دیر تک بڑی فکر رہی۔ دوسرا نتیجہ یہ بھی ہوا کہ میرے دوسرے ساتھی جن کے نام کے سامنے میرے نمبر لکھے گئے تھے آنرز میں امتحان دے پائے۔ غلطی کی درستی سے پہلے ہی ان کی درخواست فارم بھر کر پرنسپل کے دستخط کے ساتھ یونیورسٹی بھیجی جا چکی تھی۔ یہ اجازت واپس لینا اب ممکن نہ تھا۔ انہوں نے محنت سے پڑھا اور یونیورسٹی کا امتحان وہ بھی آنرز کے ساتھ پاس کر گئے۔ جیسا میں اوپر کہہ چکا ہوں۔ انٹرنس، ایف۔اے اور بی۔اے تینوں امتحانوں میں اجازت ملنے میں مجھے دِقّت ہوئی اگرچہ میں تینوں امتحانوں میں پہلے بھی اور یونیورسٹی کے امتحان میں بھی برابر اول رہا۔

جب امتحان کے دن نزدیک آئے تو میں کچھ گھبرا گیا۔ کچھ خیال پیدا ہوا کہ اس بار بھی اوّل نہ آیا تو شکایت ہو گی مگر اس بار کچھ خواہش شدید نہیں تھی اور اب وقت بھی نہیں رہ گیا تھا کہ اس کے لئے ایف۔ اے کے امتحان کی طرح تیاری کی جائے۔ امتحان کے نتیجے میں مقام صرف آنرز سے ہی ملتا تھا، اس لئے میں نے آنرز کے مضمونوں پر ہی دھیان دیا۔ فلسفہ جس میں صرف پاس ہی ہونا تھا۔ ایک طرح سے ترک ہی کر دیا۔ پہلے بھی ڈاکٹر پی، کے رائے کے لیکچروں کو توجہ سے سُنا کرتا تھا۔ کتابیں کم پڑھی تھیں۔ اس میں ایک بار ایک واقعہ سے حوصلہ افزائی بھی ہوئی تھی۔ ایک دن ڈاکٹر رائے بیمار پڑ گئے۔ اُس دن انہوں نے پڑھایا نہیں۔ کچھ سوال دیدئے اور سب سے ان سوالوں کے جواب لکھنے کو کہا سب نے جواب لکھے۔ میں نے کتابیں تو پڑھی نہیں تھیں۔ صرف لیکچر میں جو کچھ انہوں نے

میں کلکتہ میں ہی رہ گیا۔ کیونکہ میں نے سمجھ لیا تھا کہ اب کچھ پڑھنا چاہیئے نہیں تو امتحان پاس کرنا مشکل ہو جائے گا۔

کالج کا امتحان ہوا۔ میرے دل میں یہ خوف تو تھا نہیں کہ میں امتحان میں پاس نہ ہوں گا۔ ہاں یہ ہو سکتا تھا کہ اوروں سے نمبر کم آئیں۔ کچھ ساتھیوں نے مل کر صلاح کی کہ امتحان سے پہلے کے تقریباً پانچ سات ہفتے کہیں باہر جا کر گذارے جائیں جہاں ہم اطمینان سے پڑھ کر امتحان کے لئے تیار ہو سکیں۔ ہم لوگوں نے بہار کے سنتھال پرگنہ ضلع کے جام تاران نامی مقام پر جا کر رہنا طے کیا۔ وہاں ایک دوست نے چھوٹا سا مکان کرائے پر طے کر دیا کالج کے امتحان کے نتیجے کا انتظار نہ کر کے ہم لوگ وہاں چلے گئے۔

میں کہہ چکا ہوں کہ انگریزی اور تاریخ میں جس میں معاشیات اور سیاست بھی شامل تھے، میں نے آنرز لیا تھا۔ تاریخ میں آنرز کے ممتحن تھے مسٹر پرسیول۔ انہوں نے جلدی امتحان لے کر نمبر ہم لوگوں کو بتا دئے۔ میرا مقام سب سے اُوپر تھا اور نمبر بھی بہت اچھے ملے تھے۔ اور مضمونوں کا پتہ نہ تھا۔ اس زمانے کے پرنسپل سائنس پڑھایا کرتے تھے۔ اس لئے ہم لوگوں سے ان کی پڑھائی کا واسطہ نہیں تھا۔ وہ ہم لوگوں کو جانتے ہی نہیں تھے۔ انہوں نے نوٹس نکالا کہ کوئی پروفیسر کسی طالب علم کو امتحان کا نتیجہ نہ بتائے مگر مسٹر پرسیول اس کے پہلے ہی ہم کو نتیجہ بتا چکے تھے۔

ہم لوگوں کے جام تاران چلے جانے کے بعد امتحان کا نتیجہ سُنایا گیا۔ پرنسپل صاحب نے نتیجہ سُناتے وقت میرے نام پر کہا کہ میں انگریزی آنرز میں امتحان دے سکوں گا۔ مگر تاریخ کے آنرز میں نہیں۔ میرے ساتھی جو وہاں موجود تھے حیرت میں رہ گئے۔ ایک نے ہمت کر کے کہا کہ وہ ضرور پاس ہوئے ہوں گے۔ پرنسپل صاحب نے کہا کہ اگر پاس ہو گئے ہوتے

توامتحان دینے کی اجازت ضرور ملتی۔ اس نے پھر کہا کہ انہوں نے سب امتحانوں میں اوّل مقام پایا ہے اور وظیفہ بھی پایا ہے ایسا ہو نہیں سکتا کہ اس میں پاس نہ ہوں۔ پرنسپل نے پھر کہا (اسی کے لفظوں کو دہراتے ہوئے) سب میں اوّل پاس کیا تو اوّل مقام ملا اور وظیفہ ملا۔ اس میں نہیں پاس کیا۔ اس لئے اس بار امتحان دینے کی اجازت نہیں ملے گی۔ ساتھی نے ایک بار اور زور لگا کر کہا کہ ہم لوگوں کو پتہ لگ گیا ہے اور نمبر بھی معلوم ہو گئے ہیں۔ انہوں نے اس مضمون میں بہت نمبر اور اول مقام پایا ہے۔ اس پر پرنسپل چڑھ گیا۔ اور بولا "ایسا ہو نہیں سکتا، میں نے نوٹس نکال دیا ہے کہ کسی کو نمبر نہ بتائے جائیں" ایسا کہہ کر زور سے ڈانٹ دیا کہ مجھے آنرز کے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت نہیں ملے گی، اس نے بار بار یہی کہا کہ بڑے اطمینان سے اس نے سب نمبر دیکھ لئے ہیں، کوئی غلطی نہیں ہے۔

میرا ساتھی گھبرا گیا، اس نے فوراً مجھے جام تارا تار دیا۔ تار پا کر میں اور بھی چکر میں پڑ گیا۔ آپس میں صلاح کر کے کلکتہ آنا ہی ٹھیک تھا، میں کلکتہ پہنچ کر سیدھے پرسیول کے گھر گیا۔ وہ بڑے عالم سمجھے جاتے تھے۔ اُن کے پڑھانے کا طریقہ بھی بہت اچھا تھا۔ اُن کی علمیت اور طریق تعلیم سے لڑکے مسحور رہتے تھے۔ وہ غیر شادی شدہ تھے۔ گھر پر اکیلے رہتے تھے۔ صرف کتابوں کا ہی ساتھ تھا۔ بڑے خوش مزاج تھے۔ کسی سے نہ ملنا نہ جلنا ٹھیک وقت پر کالج آنا۔ کلاس میں پڑھانا اور پھر سیدھے گھر چلے جانا۔ صرف یونیورسٹی کے سینٹ وغیرہ میں، جس کے ممبر تھے۔ جانا اور گھر پر پڑھتے رہنا۔ اپنے کام میں بڑے پکے۔ وہ پریسیڈنسی کالج میں تقریباً پچیس تیس برس تک رہے۔ بعد ازاں کچھ دنوں کے لئے پرنسپل بھی ہوئے تھے فرض شناسی اتنی تھی کہ کبھی ایک منٹ کا وقت نہ کلاس میں نہ اور کہیں برباد کرتے۔ سادے کپڑے پہنتے، اور جو لوگ ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے اُن کو پسند نہ کرتے۔ صرف پڑھانے سے

کہا تھا اسے ہی حتی المقدور لکھ دیا۔

ڈاکٹر صاحب نے سب کے جواب گھر لے جاکر پڑھے اور دوسرے دن اس فوری امتحان کا نتیجہ سنایا کہ میں ہی سب سے اوّل ہوں اور جن لوگوں نے اس مضمون میں آنرز کیا ہے ان سے بھی زیادہ نمبر مجھے ملے ہیں۔ اس کے بعد سے مجھے اور بھی یقین ہو گیا کہ فلسفہ کے لئے بہت پڑھنے کی ضرورت نہیں

یونیورسٹی کے امتحان کے پہلے کالج کے امتحان میں جو مجھے اِن پرچوں میں دوسرے لڑکوں کے مقابلے میں آنرز میں زیادہ نمبر ملے۔ اس لئے جام تارا، میں بھی اس پر توجہ نہ کی۔ امتحان کے دن قریب آگئے۔ انگریزی کا امتحان ہو گیا۔ اُس کے بعد فلسفہ کا امتحان تھا تقریباً دو مہینے سے میں نے شاید ہی کوئی فلسفہ کی کتاب دیکھی تھی۔ اس دن شام کو اچانک خوف پیدا ہو گیا کہ فلسفہ میں میں دوسرے دن کچھ بھی جواب نہ دے سکوں گا۔ اس طرح جب سوچنے لگا تو معلوم ہونے لگا کہ کچھ بھی یاد نہیں۔ میں نے سوچا کہ کتاب پڑھنے کا تو وقت ہے نہیں رات بھر میں جو کچھ نوٹ وغیرہ تھے انہیں ایک بار آموختہ کر لوں تو شاید پاس کرنے کے قابل لکھ سکوں۔ فلسفہ میں علم نفسیات، علم الاخلاق اور منطق تین مضمون پڑھنے تھے۔ علم النفسیات پڑھنا شروع کیا۔ عادت کے مطابق سرِشام ہی نیند آگئی۔ کچھ دیر کے بعد پھر گھبرا کر اُٹھا تو یہی سوچا کہ اچھا ہو گا کہ ابھی سو جاؤں اور رات کو ۲، ۳ بجے سے اُٹھ کر سب کچھ ایک بار دُہرا لوں۔ ایک بوڑھا نوکر تھا۔ اس سے کہہ دیا کہ ٹھیک ۲ بجے جگا دینا۔ دو تین دن سے امتحان میں بڑی محنت کرنی پڑی تھی۔ بہت تھک گیا تھا۔ نیند خوب زور سے آگئی۔ نوکر بیچارہ رات بھر بیٹھا رہا۔ جیسے ہی دو کا گھنٹہ بجا، جگانا شروع کیا، مگر اس کے ہزار کوشش کرنے پر بھی میری نیند نہ ٹوٹی۔ قریب ساڑھے چار بجے آنکھ کھلی اور گھڑی دیکھی۔ بہت گھبرایا

نوکر پر ناراض ہوا۔ مگر اس نے کہا کہ وہ تو برابر جگاتا ہی رہا، میں نہ اُٹھا تو اس کا کیا قصور جلد جلد نوٹ الٹنے لگا۔ نفسیات اور اخلاقیات کو سرسری طور پر دیکھ گیا۔ ان مضمونوں پر ڈاکٹر رائے نے پڑھایا بھی تھا مگر منطق دیکھنے کا وقت نہیں ملا۔ گھبرا کر ایک ساتھی کے پاس گیا۔ سب حال کہا اُس نے منطق کے سبھی ابواب کے عنوانات بتا دئے اور ہر ایک عنوان کے متعلق کچھ باتیں کہہ دیں۔ اس وقت معلوم ہوتا تھا کہ میں ایک نئی چیز پہلے پہل پڑھ رہا ہوں۔ اتنے میں جانے کا وقت ہو گیا۔ دوڑ کر دس پندرہ منٹ میں مُنہ دھو کر نہا کر کچھ چاول نِگل کر دوڑتے ہوئے یونیورسٹی پہنچا۔ پہنچنے کے پہلے ہی گھنٹی بج چکی تھی۔ دوڑ کر اپنے مقام پر بیٹھ گیا۔ اور پرچہ ہاتھ میں آگیا اتنا گھبرایا کہ کچھ پتہ نہ چلتا تھا کہ ایک بھی سوال کا جواب لکھ سکوں گا یا نہیں۔ ڈر یہ تھا کہ اور مضمونوں میں آنرز پا کر بھی کیا ہوگا اگر اس مضمون میں فیل ہو گیا۔ کسی ایک بھی مضمون میں فیل ہونے پر سارے امتحان میں طالب علم فیل ہو جاتا تھا۔

پرچہ ملنے پر کچھ اطمینان لانے کی کوشش کی۔ آہستہ آہستہ سوال پڑھے کچھ ایسا معلوم ہوا کہ پہلے سوال کا جواب دے سکوں گا۔ لکھنا شروع کیا۔ جب ختم کیا تو ایسا معلوم ہوا کہ جواب کچھ بُرا نہیں ہوا۔ اسی طرح دوسرے سوال اور اس کے بعد تیسرے سوال وغیرہ سب کا جواب لکھ گیا۔ اُدھر وقت بھی پورا ہو گیا۔ اب دل میں یقین ہو گیا کہ فیل نہیں ہوں گا۔ ساری گھبراہٹ کم ہو گئی۔ آدھ گھنٹہ کی چھٹی کے بعد دوسرا پرچہ ملا۔ اس میں بھی ویسا ہی ہوا تقریباً سبھی سوالوں کا جواب لکھ دیا، صرف ایک ہی باقی رہ گیا۔ اس کا بھی جواب کچھ تو دے سکتا تھا مگر پورا نہیں، کیونکہ اس کا تعلق اس سبق کے ساتھ تھا جس کا عنوان تو میں نے دیکھا تھا اور ساتھی نے مختصراً کچھ کہنا بھی شروع کیا تھا مگر اُسے وہ پورا نہ کر پایا تھا اور میں گھڑی دیکھ کر جلد ہی ہوسٹل سے چلا آیا تھا۔ میں نے اس کا جواب نہیں دیا اور

وقت سے پہلے ہی چلا آیا۔ مجھے یقین ہوگیا تھا کہ اب فیل ہونے کا کوئی ڈر نہیں ہے۔ جب نتیجہ نکلا تو میں تاریخ میں آنرز میں اوّل آیا۔ انگریزی میں بھی آنرز تو ملا مگر اول مقام نہ ملا۔ فلسفہ میں بہت اچھے نمبر آئے تھے۔ سب مضامین کو ملا کر میں سب کے اوپر تھا۔ اور وہ دونوں وظیفے (ایک پچاس روپیہ اور دوسرا چالیس روپئے مہینے کا) مجھے پھر مل گئے۔ اِس بار کا نتیجہ کسی کوشش کی بنا پر نہیں تھا، کیونکہ میں نے کوئی مساعی نہ کی تھیں۔

سمندر پار سفر کے متعلّق تحریک

جب میں ایف۔اے کا امتحان دے کر ۱۹۰۴ء میں چھٹیوں میں زیرا دیئی آیا تو بھائی گھر پر ہی تھے۔ امتحان کے نتیجے کا انتظار تھا۔ اخباروں میں ہم لوگوں نے دیکھا کہ ولایت سے تعلیم پاکر ڈاکٹر گنیش پرشاد واپس آرہے ہیں وہ بلیا کے جو ہمارے ضلع چھپرا (سارن) سے لگا ہوا ہے رہنے والے تھے۔ اُن کا ننہال چھپرا میں تھا۔ ذات کے وہ بھی کائستھ تھے۔ الہ آباد میں ڈی، ایس، سی کی ڈگری پاس کر کے وہ پڑھنے کے لئے انگلستان گئے اور وہاں سے پھر جرمنی پہنچے علم ریاضی میں انہوں نے بڑی شہرت پائی تھی۔ ملک میں اُن کے واپس آنے کے پہلے ہی ایک تحریک شروع ہو گئی تھی کہ ان کو ذات برادری میں واپس لے لینا چاہیئے۔ چھپرا میں دو پارٹیاں ہو گئی تھیں۔ اصلاح پسند پارٹی کے لیڈر بابو برج کشور پرشاد تھے جو ابھی نوخیز وکیل تھے اور مخالف پارٹی کے لیڈر سب سے معزز اور نامی ایک بزرگ وکیل تھے۔ برج کشور بابو ہمارے گھر آئے بھائی سے صلاح کر کے اُنہوں نے بابو جی سے کہا کہ ڈاکٹر گنیش کو برادری میں لے لینا چاہیئے اور اُن کے یہاں جو برادری کا کھانا ہو اس میں بابو جی کو چلنا چاہیئے۔

اس وقت تک بہار بھر میں صرف مسٹر سچدانند سنہا ہی ولایت سے واپس ہوئے

کائستھ تھے۔ اُن کو واپس آئے گیارہ برس گذر چکے تھے۔ مگر اُنھوں نے کفارہ کر کے پھر پُرانے طریقے سے برادری کی بندشوں کو ماننا گوارا نہیں کیا تھا۔ اس لئے باضابطہ وہ برادری میں نہیں لئے گئے تھے۔ ڈاکٹر گنیش پرشاد کے واپس آنے کے پہلے ہی اُن سے خط وکتابت کر کے طے ہو چکا تھا کہ وہ برادری کی بندش کو مانیں گے۔ اُنھوں نے ولایت میں بھی بہت سادہ زندگی بسر کی تھی اور کبھی گوشت مچھلی یا شراب کا استعمال نہیں کیا تھا ان کا اور اصلاح پسندوں کا خیال تھا کہ اس طرح سے ہی اس زمانے میں سمندر پار کرنے کا راستہ کھُل سکے گا مسٹر سنہا کے واپس آنے کے دس برس بعد تک کسی کو یہ بندش توڑ کر سمندر پار جانے کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔ اِس لئے اب اس شرط کو مان کر ہی راستہ کھولنا چاہیئے۔ بابو برج کشور نے کچھ لوگوں کو تیار کیا تھا کہ ڈاکٹر گنیش کے گھر چل کر کھانے میں شریک ہونا چاہیئے بابوجی سے انھوں نے بہت اصرار کیا کہ وہ بھی چلیں۔ بابوجی نے خود تو جانا منظور نہیں کیا مگر یہ کہہ دیا کہ وہ ہم دونوں بھائیوں کو بھیج دیں گے۔

ڈاکٹر گنیش واپس آئے۔ بلیا میں ضیافت کا دن مقرر ہوا۔ باہر سے بابو برج کشور کے ایما سے ہم بیس اکیس آدمی چھپرا سے بلیا گئے۔ ان میں دو بھائی ہم اور ہمارے دونوں ساتھی جمنا بھائی اور گنگا بھائی بھی تھے۔ گاؤں کے پٹواری بھی تھے۔ ڈاکٹر گنیش سے ملاقات ہوئی، بلیا کے کائستھوں میں بڑی ہل چل تھی۔

میں لکھ چکا ہوں کہ ہم لوگوں کا گھر پہلے بلیا میں ہی تھا۔ وہاں ہمارے خاندان کے لوگ رہتے تھے۔ ہمارے برہمن پروہت آج تک بلیا سے ہی شادی اور شرادھ میں آیا کرتے ہیں۔ میری سُسرال کے لوگ بھی بلیا میں رہتے تھے۔ اس گھر کے کئی آدمی وہاں وکالت کرتے تھے۔ کچھ لوگ دوسرے کاموں میں بھی تھے۔ ہم لوگوں کے پہنچنے کی خبر وہاں پھیل گئی۔

اس کو چھپانا بھی تو منظور نہیں تھا۔ ہمارے ایک ہم خاندان بھی وکیل تھے وہ رشتہ میں ہم لوگوں کے بھائی ہوتے تھے۔ انہوں نے ہم لوگوں سے ملاقات کی اور ہم لوگوں کا اس ضیافت میں شریک ہونا پسند نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ہم لوگ بابوجی کی منظوری کے بغیر ہی چپ چاپ چلے آئے ہیں۔ جب ہم لوگوں نے یقین دلایا کہ ایسی بات نہیں ہے تو اُن کو اور بھی دکھ ہوا انہوں نے کہا کہ جب ہم سب یہیں رہتے نہیں تو چچا صاحب کو ہم سے پوچھ لینا چاہئے تھا۔ اسی طرح میری سسرال کے لوگوں کو بھی یہ بات پسند نہیں تھی مگر ان کی طرف سے کچھ زیادہ زور نہیں ڈالا گیا۔ رات کو ضیافت ہوئی۔ چاول کھا کر ہم سب اپنی جگہ واپس آئے۔ ڈاکٹر گنیش پہلے الہ آباد پھر ہندو یونیورسٹی میں اور بعد ازاں کلکتہ یونیورسٹی میں ریاضی کے سب سے بڑے پروفیسر رہ کر کئی برس کے بعد گذر گئے۔ ہم لوگوں سے اس پہلی ملاقات کو وہ کبھی بھولے نہیں اور مجھ سے بہت پریم رکھتے تھے۔

بلیا سے واپسی پر میں اپنی دوسری بہن کے گھر، جو چھپرا سے کچھ دُور بیاہی تھی، باہر ہی باہر چلا گیا۔ وہاں جانے کا کوئی خاص خیال نہیں تھا۔ پہلے سے ہی اس کی خواہش تھی کہ میں دو چار دن اس کے ساتھ رہوں۔ چھپرا سے ہی وہاں جانے میں سہولت تھی۔ اس لئے گھر واپس نہ آ کر وہاں چلا گیا۔

جو لوگ ضیافت میں شامل ہوئے تھے، اُن کے نام اخباروں میں چھپے اور چھپرا میں بہت شور ہوا۔ وہاں تیاریاں ہونے لگیں کہ وہ لوگ برادری سے خارج کر دئے جائیں۔ کاشی سے مہامہوپادھیائے شوکمار شاستری کے سمندر پار سفر کرنے کے خلاف بیوستھا (فتوا) منگا کر ضلع بھر کے کائستھوں کی ایک بڑی سبھا کرنے کا اہتمام ہونے لگا۔ مجھے اس کی کچھ خبر نہ تھی۔ میں تو بہن کے گاؤں میں تھا۔ اسی درمیان امتحان کا نتیجہ بھی نکل آیا۔ بابو برج کشور

نے گزٹ دیکھ کر زیرادیئی خبر دے دی۔ بھائی کو بات معلوم ہوگئی۔ بابوجی کو بڑی خوشی ہوئی انہوں نے فوراً ستیہ نارائن کی کتھا سنی۔ برہمن بھوجن اور برادری کی ضیافت کا انتظام کیا یہ سب میری غیر حاضری میں ہی ہوا۔

میں اپنے بہنوئی کے گھر سے زیرادیئی کے لئے روانہ ہو کر چھپرا پہنچا۔ بہنوئی بھی چھپرا آئے۔ چھپرا میں تحریک اُٹھ کھڑی ہوئی تھی، اس کی ان کو خبر ہی نہ تھی۔ ہم لوگ رات کو چھپرا پہنچے اور وہاں پہنچ کر سو گئے۔ اس لئے اس رات کو کچھ پتہ نہ ملا میرے امتحان کے نتیجے کی بھی خبر نہ ملی۔ علی الصباح ریل جاتی تھی جس میں ہم زیرادیئی جا سکتے تھے۔ سویرے ہی میں اسٹیشن پہنچ گیا۔ بابو برج کشور کا ڈیرا اسٹیشن کے قریب ہی تھا۔ میں نے نوکر کو بھیجا کہ جا کر پوچھ آؤ امتحان کا نتیجہ ابھی نکلا کہ نہیں۔ انہوں نے خبر بھجوائی کہ امتحان کا نتیجہ نکل چکا ہے اور مجھ کو اُن سے ملاقات کئے بغیر اس گاڑی سے نہیں جانا چاہئے۔ میں اُن کے ڈیرے پر گیا کیونکہ امتحان کا نتیجہ جاننے کا اشتیاق تھا۔ وہاں انہوں نے روک لیا۔ کچہری صبح سات بجے سے ہوا کرتی تھی۔ اُن کے ساتھ میں بھی کچہری گیا۔ اس کی خبر میرے بہنوئی کو نہیں ملی کہ میں وہاں رُک گیا ہوں۔ میں جب بابو برج کشور کے ساتھ بار لائبریری (وکیلوں کی لائبریری) میں پہنچا تو مجھے بہتیرے وکیلوں نے گھیر لیا۔ کچھ تو امتحان کے نتیجے سے خوش ہو کر مبارکباد کہنے لگے اور کچھ ڈاکٹر گنیش کی ضیافت کا حال پوچھنے لگے۔ وہ سب جاننا چاہتے تھے کہ ضیافت میں کون کون شریک تھے اور میں کہاں سے آیا ہوں۔ میں نے سب باتیں کہہ دیں یہ بھی کہہ دیا کہ کئی دنوں سے میں 'بیگا' میں اپنے بہنوئی کے ساتھ تھا اور وہاں سے ہی واپس آیا ہوں۔ مجھے اِس کا پتہ نہیں تھا کہ میں نے جو اس طرح سچی باتیں بتا دیں، اس کا کچھ برا نتیجہ ہونے والا ہے۔

بات یہ تھی کہ کچھ لوگوں نے جو ضیافت میں شریک تھے، اندولن کو دیکھ سہم کر اپنے گھر والوں کے زور دینے سے شرکت کے واقعہ سے انکار کر دیا تھا اور اخبار میں چھپی خبر کو غلط بتا دیا تھا۔ میرے بہنوئی سے بھی جونہی وہ بار لائبریری میں پہنچے سوال ہوئے اُن کو یہ معلوم نہ تھا کہ میں ڈاکٹر گنیش کے بھوج (ضیافت) میں شریک ہوا تھا۔ اُن یہ بھی نہ معلوم تھا کہ میں زیرادیئی نہ جاکر چھپرا میں رُک گیا تھا اور اسی جگہ بار لائبریری میں کہیں اوروں سے باتیں کر رہا تھا۔ بڑے معزز وکیلوں کی بات سُن کر وہ بھی کچھ سہم گئے۔ انہوں نے میری طرف سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ اگر وہ ضیافت میں گیا ہوتا تو مجھے ضرور معلوم ہو گیا ہوتا تب لوگوں نے اُن سے کہا کہ میں وہیں ہوں اور خود میں نے ہی اُن سے ضیافت کا حال کہا ہے اب یہ نوبت آئی کہ مقابلہ کرایا جائے مگر میں وہاں سے بابو برج کشور کے ڈیرے پر چلا گیا اور ٹرین سے زیرادیئی چلا آیا۔ جب میں گاؤں پہنچا تو میں نے سُنا کہ ایک دن پہلے پوجا وغیرہ ہو کر برہمن بھوجن اور برادری کی ضیافت بھی ہو چکی ہے، جس میں صرف گاؤں کے ہی نہیں بلکہ آس پاس کے گاؤں کے کایستھ بھی جو برابر برادری کی ضیافت میں شریک ہوا کرتے تھے، شریک ہو چکے تھے۔ گاؤں میں تو کوئی دقّت تھی ہی نہیں، کیونکہ ہم تین ہی کایستھوں کے گھر تھے، تینوں گھروں کے لوگوں نے بلیا کی ضیافت میں شرکت کی تھی۔ میں نے چھپرا کا حال بھائی صاحب سے کہا۔ بابو برج کشور کا پیغام بھی پہنچا یا کہ چھپرا میں ہونے والی ضیافت میں اپنے ہم خیال لوگوں کو پہنچنا چاہیئے اور اس سبھا میں سمندر پار سفر کرنے کے حق میں تجویز بھی پاس کرانی چاہیئے۔

چھپرا میں جلسہ کی بڑی تیاریاں ہوئیں۔ سارے ضلع کے کایستھ بلائے گئے۔ کاشی سے مہامہوپادھیائے شیو کمار شاستری بیوستھا (فتوے) دینے آئے۔ ایک ساتھ ہی اس

بات کی کوشش ہونے لگی کہ ان لوگوں سے جنہوں نے ضیافت میں کھانا کھایا تھا یا تو انکار کرایا جائے یا کفّارہ۔ ہم لوگ جلسہ کے دن چھپرا نہیں گئے۔ مگر سُنا کہ بہت کائستھ جمع ہوئے ضلع دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ پوربی چھپرا دونوں مخالف وکیل صاحبان کے ساتھ تھا اور پچھمی چھپرا کا جہاں کے ہم لوگ رہنے والے تھے، یہ دعویٰ تھا کہ ہم حق پر ہیں۔ بات یہ ہے کہ برادری کے زیادہ تر لوگ مخالف تھے۔ کچھ تھوڑے لوگ جو حق میں تھے زیادہ تر پچھمی چھپرا کے تھے جن میں ہمارا گھر معزز سمجھا جاتا تھا۔ چھپرا میں پنچ مندر میں، جو ایک کائستھ کا بنایا ہوا سب سے بڑا اور بڑا خوب صورت مندر اس شہر میں ہے، جلسہ ہوا۔ بزرگ اور معزز وکیل صاحب صدر ہونے والے تھے۔ جب لوگ پہنچے تو ہماری پارٹی کے ایک آدمی نے اُٹھ کر تجویز کر دی کہ صدر بابو سرسوتی پرشاد وکیل بنائے جائیں یہ صاحب ضیافت میں شریک ہو چکے تھے۔ پچھمی چھپرا کے رہنے والے تھے مگر گورکھپور میں وکالت کرتے تھے۔ کچھ لوگوں نے تجویز کی تائید کر دی۔ جنہوں نے جلسہ بلایا تھا وہ کچھ حیرت زدہ سے رہ گئے۔ انہوں نے تو بڑے وکیل صاحب کا نام صدر ہونے کے لئے نوٹس میں چھپا دیا تھا اصلاح پسند پارٹی کے جو لوگ موجود تھے انہوں نے شور کیا کہ بابو سرسوتی پرشاد صدر بنائے جائیں۔ دوسرے لوگوں کو اس کا مخالفت کا اندیشہ نہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ سب لوگ انہیں کے ساتھ ہیں۔ حقیقت میں زیادہ تر کیا، زبردست اکثریت، اس جلسہ میں بھی ان کے ساتھ تھی مگر وہ بہت ڈر گئے۔ اِدھر سے شور ہونے لگا کہ صدر کے انتخاب کے بارے میں رائے لی جائے۔ اس سے وہ اور بھی گھبرائے۔ انہوں نے رائے لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ جن کا نام شائع کر دیا گیا ہے وہی صدر ہوں گے، وہ کرسی صدارت پر بیٹھنے کے لئے چلے۔ اِدھر سے بابو سرسوتی پرشاد بھی چلے اور اُنہوں نے کہا۔ وکیل صاحب

جلسے نے تو میرا نام صدارت کے لئے تجویز کیا ہے میں صدر ہوں۔ آپ کیسے وہاں بیٹھ سکتے ہیں، اس سے اور گھبراہٹ پھیلی۔ انہوں نے کہہ دیا کہ یہ لوگ جلسہ نہ ہونے دیں گے، اس لئے جلسہ برخاست کیا جاتا ہے۔

اصلاح پسند طبقہ فوراً اُٹھ کھڑا ہوا اور خوشیاں مناتا اور یہ اعلان کرتا ہوا کہ اُس کی جیت ہوگئی وہاں سے چل پڑا۔ اصلاح پسندوں کو تو یہی کرنا تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ سچ مچ اگر رائے لی جاتی تو وہ ضرور ہار جاتے۔ اس دن کا جلسہ برخاست ہو گیا۔ دوسرے دن پھر جلسہ ہوا وہاں تجویز پاس کی گئی کہ جتنے لوگوں نے ضیافت کھائی تھی وہ برادری سے نکال دئے گئے۔ ان کے ساتھ خورونوش شادی بیاہ سب بند کر دیا گیا۔ ان کے نام بھی تجویز میں دے دئے گئے اس تجویز کو چھپوا کر ضلع بھر میں تقسیم کرنے کا انتظام کیا گیا۔ اصلاح پسند لوگوں کی طرف سے کہا گیا کہ یہ سبھا تو پوری برادری کی تھی نہیں اور ہمارے (اصلاح پسندوں کے) چلے جانے کے بعد دوسرے دن کی گئی تھی۔ اس لئے اس تجویز کو ہم نہیں مانتے اور ضلع بھر کی برادری اسے تسلیم نہیں کرتی اگر ہم سب لوگ سچ مچ اس تجویز کو مانتے ہیں تو پھر جلسہ کر کے ضلع بھر کی برادری بلائی جائے اور قرارداد منظور کرائی جائے اس طرح گڑبڑ مچ گئی اور اخباروں میں دونوں پہلوؤں کے بیان بھی شاید نکلے۔ نتیجہ کے طور پر برادری کا بائیکاٹ بہت مؤثر نہ ہو سکا۔

جہاں تک ہم لوگوں کا سروکار تھا، برادری کے بائیکاٹ کا کوئی سوال اُٹھا ہی نہیں کیونکہ ہمارے آس پاس کے سب لوگ ہمارے ساتھ کھاتے پیتے رہے اور برہمن پروہت نے کبھی کوئی دِقّت نہ ہونے دی۔ ہاں بابو جی کو ایک بار کچھ دُکھ ہوا میں کہہ چکا ہوں کہ ہمارے بہنوئی چھپرا کے نزدیک کے رہنے والے تھے۔ اُن کے یہاں

اس بائیکاٹ کی تحریک کا کچھ زور رہا۔ چھپرا کے لوگوں نے اُن پر بہت زور ڈال کر ایکبار بہت بڑا خط اُن سے بابوجی کے نام لکھوایا۔ ایک آدمی خط لے کر آیا ہم لوگوں سے ملاقات ہوئی اس نے کہا کہ بابوجی کو ہی خط دینے کا حکم ہے۔ ہم لوگوں کو نہیں۔ ہم لوگ سمجھ گئے کہ اس خط میں کچھ اسی کے متعلق باتیں ہوں گی۔ بابوجی نے خط پڑھا اور کچھ سہم گئے ہمارے وہی ایک بہنوئی زندہ تھے۔ دوسری بہن تو بہت پہلے ہی بیوہ ہو چکی تھی۔ اُن کے کبھی کوئی اولاد نہیں تھی۔ اپنے گھر میں اکیلے تھے، نہ کوئی دوسرا بھائی، نہ عزیز رشتہ دار۔ جو کچھ تعلق تھا ہم لوگوں کے ساتھ ہی تھا۔ انہوں نے خط میں لکھا تھا کہ ان کا کوئی دوسرا رشتہ دار تو تھا ہی نہیں، اب ہم لوگوں سے بھی رشتہ منقطع ہو جائے گا اگر ہم رشتہ قائم رکھنا چاہتے ہیں تو یہ اعلان کر دیں کہ ضیافت میں شریک نہیں یا کفّارہ کریں۔

بابوجی گھبرائے مگر اُن کا یہ خیال نہیں ہوا کہ ہم لوگوں نے کوئی غلطی کی ہے۔ انہوں نے اتنا ہی کہا کہ ہم لوگ اگر خود ضیافت میں شریک ہو کر اس قصّہ میں نہ پڑے ہوتے تو شاید دوسروں پر اثر ڈال کر اس کام میں زیادہ معاون ہو سکتے۔ ماں نے جب خبر سُنی کہ خط آیا ہے تو انہوں نے صاف صاف کہا کہ "انکار کی بات تو ہو ہی نہیں سکتی۔ وہ تو بالکل جھوٹی بات ہو گی اور ایسا کرنے سے بھلا نہیں ہو گا ہاں کفّارہ کی بات ہو گی تو وقت آنے پر دیکھا جائے گا۔

اس مضمون کا جواب بھیج دیا گیا۔ ان دنوں میری بہن کے آنے کی بھی کوئی بات نہیں تھی اس لئے یہ بات آگے نہیں بڑھی۔ بابوجی چھپرا گئے۔ ایک مقدمہ چل رہا تھا۔ اس میں ہمارے وکیل وہی بزرگ تھے جو اس تحریک کے لیڈر تھے۔ انہوں نے کفّارہ پر بہت زور دیا۔ بابوجی نے یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ ہم لوگ کلکتہ میں ہیں جب آئیں گے

توصلاح کریں گے۔

ان لوگوں نے اس طرح جہاں تک ہوسکا اخلاقی طریقہ پر زور ڈالا۔ جلسۂ عام کا بھی انتظام کیا گیا۔ سیواں میں، جو ہم لوگوں کے نزدیک کا شہر ہے۔ ایک سبھا کی گئی جس میں چھپرا کی سبھا کے فیصلہ کا اعلان کرنا تھا۔ ایک صاحب چھپرا سے بھیجے گئے کہ سیوان کے جن لوگوں نے ضیافت کھائی تھی اُن کے برادری سے خارج ہونے کا فیصلہ باضابطہ سبھا میں سُنادیں۔ اس جلسہ میں ہم لوگ بھی گئے۔ مگر سیوان کی برادری میں بہت لوگ ہم لوگوں کے ساتھ تھے کیونکہ بابو برج کشور، بابو سرسوتی پرشاد اور ہم لوگ، سب اسی (سیوان) سب ڈویژن کے رہنے والے تھے۔ اس سبھا میں ہم لوگوں نے تجویز پیش کردی کہ چھپرا کی سبھا کو ہم لوگ نہیں مانتے۔ سیوان کی برادری ہم لوگوں کے ساتھ ہے۔

ہمارے گاؤں کے دو آدمی، جمنا پرشاد اور گنگا پرشاد، جو ہم لوگوں کے ساتھ بلیا کی ضیافت میں شریک ہوئے تھے، چھپرا میں پڑھتے تھے۔ وہ لوگ کچھ اور لڑکوں کے ساتھ، ایک مکان میں رہتے تھے۔ ان کو کچھ تکلیف اُٹھانی پڑی میں کے لڑکے اُن کے ہاتھ کا چھوا پانی نہیں لیتے تھے۔ اُن کے ساتھ کھاتے پیتے بھی نہیں تھے۔ برہمن رسوئی کے بعد اُن کے برتن میں الگ سے کھانا دے دیتا۔ انہوں نے اس توہین کو بخوشی برداشت کیا۔ کچھ مہینوں تک یہی سلسلہ چلا۔ مگر آہستہ آہستہ زور کم پڑ گیا۔ سب ایک ساتھ ہو گئے۔ چھپرا میں مخالفوں کے سرغنہ لوگوں کی رشتہ داری بھی ایسے گھروں میں ہو گئی جو سمندر پار کے سفر کے حق میں تھے۔ ان کے اپنے گھر کے بھی کچھ لوگ ان کے خلاف ہو گئے۔ اُن لوگوں نے

اپنی زندگی میں تو اس بات کو نباہ دیا۔ مگر جو بندش ٹوٹ گئی، وہ ٹوٹ ہی گئی۔ سمندر پار کے سفر کے لئے کاکستھوں کا راستہ کھُل گیا۔

طلبار کی کانفرنس اور کانگریس

بی۔اے پاس کرکے میں کلکتہ میں ایم۔اے اور بی۔ایل پڑھنے لگا۔سودیشی تحریک ان دنوں بہت زوروں سے چل رہی تھی۔ہم کچھ بہاری طلبار پر بھی، جو کلکتہ میں پڑھتے تھے، اس کا اثر پڑتا ہی تھا۔ہم لوگ بہاری کلب میں اکثر بیٹھتے، ملتے جلتے اور تبادلۂ خیالات کیا کرتے تھے۔ہم لوگوں کے دل میں جوش آیا کہ بنگال کے طلبار اس طرح سے سودیشی کی تبلیغ کر رہے ہیں اگر ہمارے بہار میں بھی طلبار کی کوئی تنظیم ہوتی تو اس کے ذریعے سودیشی کا پرچار ہو سکتا۔ہم نے ایک گیت بھی بنوایا جس کی کچھ نقلیں چھپوا کر جا بجا تقسیم کیں۔اسی تقسیم میں تنظیم کی کمی اور بھی محسوس ہوئی۔

ہم لوگوں نے سوچا کہ بہار کے طلبار کی ایک کانفرنس کی جائے۔بہاری کلب کے سامنے اس طرح کی تجویز رکھی گئی۔اُسے صرف طلبار نے ہی نہیں، بڑوں نے بھی بہت جوش سے منظور کیا۔میں پٹنہ بھیجا گیا۔وہاں پہلے طلبار سے اور پھر بڑے آدمیوں سے ملا۔ان میں خاص تھے مسٹر سچدانند سنہا اور بابو مہیش نارائن مرحوم جو اُن دِنوں بہار ٹائمز کی ادارت کرتے تھے۔ان سب لوگوں نے ہمدردی دکھائی۔طے ہوا کہ پٹنہ ہی میں پہلا اجلاس کیا جائے

اور نامی بیرسٹر مسٹر شرف الدین صدر بنائے جائیں۔ پٹنہ کے طلبار نے ایک استقبالیہ کمیٹی بناکر سب انتظام بھی کیا۔

پہلا اجلاس پٹنہ کالج کے بڑے ہال میں ہوا۔ بہار کے سبھی کالجوں اور بہت سے اسکولوں کے طالب علم اس اجلاس میں بہت جوش کے ساتھ شریک ہوئے۔ اجلاس کا مقصد بتانے کا کام میرے سپرد ہوا۔ میں نے ایک لمبی تقریر انگریزی میں لکھ کر تیار کی تھی اُسے پڑھ کر سنایا۔ اوروں کی بھی تقریریں اکثر انگریزی میں ہی ہوئیں۔ اس اجلاس میں طے ہوا کہ پہلے اِن شہروں میں جہاں کالج ہیں، اور پھر جہاں جہاں اسکول ہیں۔ اسٹوڈنس کمیٹیاں قائم کی جائیں جو سمیلن (کانفرنس) سے وابستہ رہیں۔ ایک بڑا ضابطہ تیار کیا گیا۔ اس کے مطابق سارے بہار کے طلبار کی نمائندہ حیثیت سے ایک مستقل کمیٹی قائم ہوئی۔ اس میں سبھی جگہوں کے طلبار کے نمائندے لائے گئے۔ یہی سب اسٹوڈنس کمیٹاں تنظیم اور تبلیغ کا کام سال بھر جاری رکھتی تھیں۔

مجھے یاد ہے کہ قواعد وضوابط بنانے کے وقت دو سوالوں پر آپس میں بہت بحث ہوئی۔ ایک سوال تھا کہ سمّیلن سیاست میں حصہ لے یا نہیں۔ اس پر طلبار میں ہی بہت اختلاف رائے تھا۔ بڑے لوگوں میں تو سبھی اس کے خلاف تھے۔ آخر میں یہ طے ہو گیا کہ سمیلن کسی قسم کی سیاسی تحریک میں حصہ نہیں لے گا۔ چاہے وہ قومی نوعیت کی ہو یا وفاداری حکومت کی تبلیغ کی یا اور قسم کی (NATIONALIST LOYALIST, OR ANY OTHER) ہم نے یہ طے کر کے، اب معلوم ہوتا ہے عقل مندی دکھائی۔ بہار کبھی بنگال کا ہی حصّہ تھا۔ بہار تعلیم میں بہت پچھڑا ہوا تھا۔ اجتماعی زندگی تو تقریباً نفی کے برابر تھی۔ خاص کر طلبار، تو کچھ باہر کی بات جانتے ہی نہیں تھے۔ کانگریس کے طرفدار تھوڑے ہی لوگ تھے۔ ابھی تک

بہار کی سیاسی تنظیم بھی الگ نہیں تھی نہ بہار کی الگ کانگریس کمیٹی تھی۔ اور نہ بہار کی سیاسی کانفرنس قائم ہوئی تھی۔ یہ پہلا ہی سنگٹھن تھا جس میں سارے بہار کے لوگ، چاہے وہ نوداخل شدہ طلبار ہی کیوں نہ ہوں، الگ جمع ہو کر اپنے سوالوں پر غور کرنے بیٹھے تھے۔ ایسی حالت میں اگر ہم سنبھل کر نہ چلتے تو شاید یہ تنظیم ہونے ہی نہ پائی۔

اس وقت تک ہندوستان میں کہیں بھی طلبار کی دوسری کانفرنس نہیں ہوئی تھی ایک طرح سے ہم لوگوں کو ایک نئی تنظیم کو جس کا کوئی نمونہ سامنے نہیں تھا، چلانا تھا اور دوسرا سوال جس پر اختلاف رائے تھا یہ تھا کہ اس سمیلن میں صرف بہاری طلبار کی ہی تنظیم رہے یا اس میں بنگالی طلبار بھی شامل کئے جائیں، اس معاملہ میں ہی بہت اختلاف رائے رہا۔ مجھے یاد ہے کہ کئی برسوں تک سالانہ اجلاس میں تجویز آتی رہی کہ بہاری طلبار کے سمّیلن میں بنگالی بھی لئے جائیں، مگر یہ کبھی منظور نہیں ہوا۔ سمّیلن کا نام تو شروع سے ہی تھا، بہاری چھاتر سمّیلن، کئی برسوں کے بعد اس کے دستور میں جوڑ دیا گیا کہ بہاری طلبار سے وہ سب طلبا مراد لئے جائیں جو بہار میں تعلیم پاتے ہیں۔ ہم جو کلکتہ کے طالب علم تھے شروع سے ہی اس کے حق میں تھے۔ مگر دوسرے اس کی مخالفت کرتے تھے۔

طلبار کی تنظیم بہت اچھی ہو گئی۔ تقریباً سبھی شہروں میں اس کی شاخیں ہو گئیں کلکتہ میں تو بہاری کلب اس کی شاخ بن ہی گیا۔ ہندو یونیورسٹی کے قیام کے بعد وہاں کے بہاری طلبار نے بھی ایک شاخ بنالی، سبھی شاخوں میں تقریباً ہر ہفتہ سبھا ہوتی، جس میں طلبار مختلف مضمونوں پر مقالے پڑھتے، تقریریں کرتے اور کھیل کود میں حصّہ لیتے۔ اس کے لئے جا بجا کلب قائم کئے گئے، سالانہ جلسوں میں مقالوں اور تقریروں کا مقابلہ ہوتا۔ سب سے اچھی تحریروں، تقریروں اور کھیل کود کے لئے انعام دئے جاتے۔ کالج کے

لڑکوں کا مقابلہ الگ ہوتا۔ اسکول کے طلبار کی اور لڑکیوں کی الگ ۔ لڑکیوں کو تحریروں تقریروں کے علاوہ سینے پرونے وغیرہ میں حوصلہ افزائی کرنے کے لیۓ الگ انعام دیۓ جاتے ۔ اس طرح سال بھر کام چلتا رہتا۔ سمیلن دسہرے کی ہر چھٹی میں کہیں نہ کہیں بہار کے کسی شہر میں ہوتا۔ اس سالانہ اجلاس کی کرسیِ صدارت کو بہار اور باہر کے بہت بڑے بڑے لوگوں نے رونق بخشی ہے۔ جیسے بہار کے مسٹر شرف الدین، مسٹر حسن امام، ڈاکٹر سچدانند سنہا، بابو پریشر لال، بابو دیپ نرائن سنگھ، بابو برج کشور پرشاد وغیرہ۔ باہر کے لوگوں میں سے ڈاکٹر اینی بسنٹ، مسز سروجنی نائیڈو، مہاتما گاندھی، مسٹر اینڈ ریوز۔ وغیرہ وغیرہ ۔

یہ سمّیلن ۱۹۰۶ء میں قائم ہوا اور ہر سال اپنا سالانہ جلسہ ۱۹۲۰ء تک جب تحریک ترک موالات شروع ہوئی، کرتا رہا۔ اس کے بعد یہ کچھ ٹھنڈا پڑ گیا کیونکہ اس کے سبھی پُر جوش کام کرنے والے اسی بڑی تحریک میں لگ گئے پھر بھی اسے از سر نو زندہ کرنے کی تدبیریں کی گئیں ۔ مگر اس میں وہ پُرانی زندگی اور تیزی پھر نہیں آسکی، اب جو تنظیم ہے وہ ایک طرح سے نئی تنظیم ہے، جس کے کارکن شاید اس کا حال جانتے بھی نہ ہوں گے ۔ جتنے دِنوں تک یہ کام کرتا رہا بڑے جوش اور لگن کے ساتھ سارے صوبہ کے طلبار اس میں شریک ہوتے رہے ۔ اسی کے ذریعے طلبار نے تنظیم کا کام عملی طور سے سیکھا۔ بہتوں نے تقریر کرنا سیکھا۔ ان پندرہ برسوں میں جتنے بھی جاندار جوشیلے نوجوان بہار میں ہوئے ۔ سب اس سے ہی متاثر ہوئے ۔ سب نے اپنی ذاتی غرض کے علاوہ دیش بدیش کی کچھ باتیں سیکھیں اور ان کے لیۓ کچھ قربانی کا مادّہ بھی پیدا کیا۔ جو کچھ انہوں نے سیکھا یا پایا اس سے ملک کو فائدہ بھی پہنچا۔ جب مہاتما گاندھی بہار میں آئے اس وقت سٹوڈنٹس کانگریس کے سابق کارکن ہی

ان کے ساتھ ہوئے اور تحریک ترک موالات میں جتنے آگے بڑھے اُسی کے اُپجائے ہوئے پھل تھے۔ آج تقریباً وہی لوگ صوبہ کی قیادت کا بار لئے ہوئے ہیں جنہوں نے اس سمیلن میں ہی تربیت پائی تھی۔

تحریک ترک موالات نے طلبا سے بہت بڑی قربانی طلب کی۔ انجمن طلبا اس کے لئے تیار نہیں تھی۔ قرارداد تو منظور ہوگئی مگر تھوڑے ہی لڑکے آخر تک اس تحریک میں ٹھہر سکے۔ جو ٹھہرے وہ زیادہ تر انجمن کے ہی کارکن تھے۔ دوسرے جو وکیل طبقہ میں سے آئے اُن میں بھی زیادہ تر انجمن کے ہی کارکنوں میں سے تھے۔ سن ۱۹۲۰ء تک اپنا کام اس طرح پورا کر کے انجمن زندگی اور موت کی کش مکش میں سے گذرتی رہی۔ اس نے ایک طرح پر کام پورا کر دیا تھا۔ نئی بیداری، نئی زندگی سارے صوبہ میں پیدا کر دی تھی اور مستقبل کے لئے کھیت تیار کر کے بیج بھی بو دیا تھا، جس کا پھل ترک موالات کو ملا اور آج تک صوبہ کو مل رہا ہے۔

سن ۱۹۰۶ء کے دسمبر میں کانگریس کا اجلاس کلکتہ میں ہونے والا تھا۔ میں کانگریس کی خبریں تو کچھ پہلے سے ہی پڑھتا رہتا تھا، مگر ابھی تک کانگریس کے دیکھنے کی خوش قسمتی نہیں ملی تھی۔ جب سن ۱۹۰۵ء کے دسمبر میں کانگریس کا اجلاس بنارس میں ہوا، میں بی۔ اے کے امتحان کے چکر میں تھا اور نزدیک ہونے پر بھی وہاں نہیں جا سکا۔ سن ۱۹۰۶ء کی کانگریس میں پہلے پہل والنٹیر کی حیثیت سے میں شریک ہوا۔ کانگریس کا اجلاس بڑے جوش سے ہوا۔ گرم دَل (انتہا پسند) اور نرم دل (اعتدال پسند) کا جنم ہو چکا تھا۔ گرم دَل (انتہا پسند پارٹی) کے لیڈر سمجھے جاتے تھے لوکمانیہ تلک، لالہ لاجپت رائے، بپن چندر پال، اربندو گھوش وغیرہ۔ نرم دَل (اعتدال پسند پارٹی) کے لیڈر تھے سر فیروز شاہ مہتہ اور

گوکھلے وغیرہ۔ جہاں تک میں سمجھ سکتا تھا، سرینددر ناتھ بنرجی اور مدن موہن مالوی بیچ کا درجہ رکھتے تھے۔ آپس کے جھگڑے مٹانے یا کم کرنے کے لئے دادا بھائی نوروجی ولایت سے بُلاکر صدر بنائے گئے تھے۔ خوش قسمتی سے مجھے کانگریس پنڈال میں ڈیوٹی ملی تھی۔ اس لئے میں سبجکٹس کمیٹی میں سب بحثیں سن چکا تھا۔ کانگریس کے پنڈال میں اجلاس کے وقت پہلے دن میں کچھ دور پر رکھا گیا تھا جس سے صدر کی تقریر نہ سُن سکا۔ میں نے دیکھا کہ زیادہ تر والنٹیر اپنی اپنی جگہ چھوڑ کر اندر چلے گئے۔ میں نے ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنے طے شدہ مقام پر ڈٹا رہا۔ سروجنی دیوی، مالوی جی اور مسٹر جناح کی تقریریں پہلے پہل اسی کانگریس میں سنیں کانگریس کے ساتھ نمائش بہت زبردست ہوئی تھی۔ اجلاس دیکھ کر کانگریس سے عقیدت بہت بڑھ گئی۔ مگر کئی برسوں تک مجھے اس میں باضابطہ شریک ہونے کا موقعہ نہیں ملا۔ یہ موقع ملا، پہلے پہل ۱۹۱۱ء میں جب کانگریس پھر کلکتہ میں ہوئی۔ اسی زمانے سے میں آج تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ممبر رہا ہوں، اور تھوڑا بہت کانگریس کا کام کرتا آیا ہوں۔

اُن دنوں کانگریس کا نظام کچھ ڈھیلا ہی تھا۔ بہار میں تو بہت تھوڑے ہی لوگ اس سے تعلق رکھتے تھے۔ وہ بھی زیادہ تر وکیل ہی ہوا کرتے تھے۔ ایک صوبائی کانگریس کمیٹی ۱۹۰۷ء یا ۱۹۰۸ء میں الگ بن گئی تھی جو بنگال کی صوبائی کمیٹی سے جدا تھی۔ صوبہ تو ۱۹۱۲ء میں الگ ہوا مگر یہ صوبائی کمیٹیاں کچھ باقاعدگی سے نہیں بنتی تھیں جو ڈیلی گیٹ ہوتے تھے وہ بھی کسی ضابطہ سے نہیں چُنے جاتے تھے۔ ایک سبھا ہوتی جس میں کچھ لوگ چُن لئے جاتے تھے۔ جلسہ میں پہنچ جاتے تو ٹھیک، اگر نہیں پہنچ پاتے تو جو لوگ پہنچ جاتے اُن کو ہی سکریٹری صاحب نمائندہ مان لیتے تھے اور ان کے نام کے سارٹیفکٹ دے دیتے اس طرح سے بہار کبھی خالی نہ رہتا۔ ہر سال کچھ لوگ اجلاس میں شریک ضرور ہو جاتے

جو نمائندے جاتے وہ اُن دنوں کے ضابطہ کے مطابق آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر چُن لئے جاتے ہیں ۱۹۱۱ء میں آل انڈیا کانگریس کا ممبر اسی طرح چُنا گیا۔ کانگریس کی کوئی خاص خدمت نہیں کی تھی۔ اسی سال میں پہلے پہل ڈیلی گیٹ بنا تھا۔ لیکن انجمن طلبار کی وجہ سے اور یونیورسٹی کے امتحانوں کے اچھا نتیجہ ہونے کی وجہ سے بہار کے سبھی لوگ مجھے جانتے تھے۔ سب نے ایک چھلانگ میں ہی مجھے آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں پہنچا دیا۔ یہ سب باتیں ۱۹۲۰ء کے بعد بہت کچھ بدل گئیں۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

غیر ملکی سیاحت کی ناکام کوشش

ڈان سوسائٹی اور سودیشی تحریک کا اثر میرے اوپر یہ پڑا کہ میرے دل میں آیا کہ دیش کے لئے کسی طرح کچھ کرنا چاہیئے۔ بھائی کے ساتھ کا بھی اثر کچھ ایسا ہی پڑتا رہا تھا مگر ابھی تک یہ واضح نہیں ہوا تھا کہ یہ خواہش کس طرح پوری ہوگی اور نہ یہ ہی صاف نظر آتا کہ کون سی ملکی خدمت انجام دی جائے اور اس کے لئے کیا کرنا چاہیئے۔ یہ ایک خواہش ہی تھی جو کبھی کبھی اُٹھا کرتی اور پھر اِدھر اُدھر کے جھنجھٹوں میں غائب ہو جاتی۔ انجمن طلبا کا نظام گویا ایک راستہ ملا تھا مگر وہ بھی مستقل ہوگا اور اس میں تبدیلی آئے گی کچھ سمجھتا نہ تھا اور نہ کہہ سکتا تھا۔ ہاں، ایک بات دل میں آگئی تھی وہ یہ تھی کہ سرکاری نوکری نہیں کرنی چاہیئے، اس لئے بی اے پاس کرنے کے بعد ڈپٹی مجسٹریٹی کے لئے درخواست نہیں دی۔ بھائی بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ میں یہ کروں۔ بابو جی کا منشا تھا کہ میں وکالت کروں۔ بھائی بد قسمتی سے ایم۔ اے کا امتحان نہیں دے سکے۔ گھر سے زیادہ خرچ لا کر کلکتہ میں یا اور کہیں رہنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ ڈمراؤں راج اسکول میں معلم کا کام کرنے لگے۔ میں ڈپٹی ہونے کا خیال چھوڑ کر کلکتہ میں ایم۔ اے، بی۔ ایل پڑھنے لگا۔

انجمن طلبار کے اجلاس کے بعد مجھ پر ایک دُھن سوار ہوگئی۔ یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ خیال کیسے پیدا ہوا اور کس کی ہمت افزائی سے مگر یہ خیال ہوا کہ اب کسی طرح ولایت جاکر آئی، سی، ایس کا امتحان پاس کرنا چاہیئے۔ سرکاری نوکری کرنے کی خواہش نہیں تھی لیکن توبھی نہ معلوم دل میں کیسے اطمینان ہوگیا کہ یہ کرنے کے قابل ہے۔ اس میں بھائی نے بھی حوصلہ بڑھایا۔ گھر سے اتنے روپئے مل نہیں سکتے تھے کہ ولایت کا خرچ فراہم ہوسکے۔ اس لئے کوئی اور ہی انتظام ہونا چاہیئے۔ مسٹر سچدانند سنہا نے جب یہ سنا کہ میری ایسی خواہش ہے تو خوش ہوئے اور بابو برج کشور تو اس کے لئے ہمیشہ تیار ہی رہتے تھے۔ ڈاکٹر گنیش کی ضیافت کے بعد بابو امبکا چرن کو اُن کے جاپان جانے میں بہت حوصلہ افزائی کی تھی میرا ولایت جانا انہوں نے ایک طرح لازمی سمجھا اور لگ گئے روپئے فراہم کرنے۔ منشی ایشور سرن بھی اس میں دلچسپی لینے لگے۔ آرہ کے رائے بہادر ہری پرشاد نے کچھ روپئے دئے۔ سوچا گیا کہ میرے چلے جانے کے بعد اور روپیہ بھائی اُن لوگوں کی مدد سے گھر سے کسی طرح بھجواتے رہیں گے۔ اس بات کا ڈر ہم لوگوں کو تھا کہ ہمارے والدین اس بات کو پسند نہیں کریں گے اور گھر میں بہت واویلا مچے گا۔ میں اس سلسلہ میں پٹنہ اور الہ آباد بھی گیا بھائی بھی ساتھ تھے۔ بابوجی سے یہ بات چھپا رکھی گئی کیونکہ ان کی منظوری ملنے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ ہم نے جانے کے لئے دن بھی مقرر کرلیا تھا۔ کلکتہ میں کپڑے بنوائے۔

اس زمانے تک انگریزی وضع کا کوئی کپڑا میں نے کبھی نہیں پہنا تھا۔ ولایت میں دوسری پوشاک تو پہنی نہیں جاسکتی یہی خیال تھا۔ اس لئے انگریزی وضع کے کپڑے ایک انگریزی دُکان میں ہی بنوائے گئے، یہی ایک موقع تھا جب میں نے بدیشی کپڑے ۱۸۹۸ء کے بعد آج تک خریدے ہیں۔ پاسپورٹ کے لئے درخواست دی گئی۔ کارروائی ہورہی تھی۔ ہم

لوگ سمجھتے کہ یہ بات پوری ہو جائے گی۔ جانے سے پہلے بابوجی کو خبر نہیں ملے گی اور گھر کی طرف سے کوئی رکاوٹ نہ ہوگی۔ اس سازش میں کالج کے ساتھیوں میں سے تین چار اور تھے جن میں ایک میرے بہاری دوست سکھدیو پرشاد ورما تھے اور باقی بنگالی تھے میرے اپنے لوگوں میں بھائی، بابو برج کشور، مسٹر سنہا، منشی ایشور سرن اور رائے بہادر ہری پرشاد سنگھ تھے۔ بھائی برج کشور کے ساتھ میں الہ آباد گیا۔ منشی ایشور سرن کے ساتھ ٹھہرا۔ وہاں میری سسرال کے لڑکے کالج میں پڑھ رہے تھے۔ ان میں سے کسی سے ملاقات تو ہوئی نہیں مگر اُن کو کسی نہ کسی طرح خبر لگ گئی۔ وہ ڈھونڈھتے ڈھونڈتے منشی ایشور سرن کے یہاں پہنچ گئے۔ وہاں لوگوں نے کہہ دیا کہ میں نہیں ہوں۔ انہوں نے گھر پر تار دے دیا کہ میں ولایت جا رہا ہوں اور اس دن الہ آباد میں ہوں۔ تار پاتے ہی بابوجی اور گھر کے سب لوگ بہت گھبرائے۔ بابوجی بیمار تھے اس لئے وہ نہیں نکل سکتے تھے۔ مگر میری ماں اور بہن سیدھے الہ آباد چلی گئیں۔ ان لوگوں کا غلط خیال تھا کہ میں الہ آباد سے ہی چلا جانے والا تھا۔ میں تو ابھی صلاح مشورہ کرنے اور روپئے کی فراہمی میں ہی لگا ہوا تھا۔ وہاں ایک دن رہ کر وہاں سے پھر سیدھے کلکتہ چلا آیا۔

جب ماں الہ آباد پہنچیں تو میں وہاں نہیں تھا۔ منشی ایشور سرن کے یہاں تلاش کرنے پر اُن کو خبر مل گئی کہ میں کلکتہ واپس چلا گیا۔ مجھے کلکتہ میں ان باتوں کی خبر نہیں تھی وہاں تار پہنچا کہ بابوجی بیمار ہیں۔ میں وہاں سے اُن سے ملنے گھر آیا تو سب باتیں معلوم ہو گئیں، وہ سچ مچ بیمار تھے، مگر ابھی بیماری کچھ سخت نہیں تھی دُکھی ضرور تھے۔ گھر میں رونا پیٹنا ہو رہا تھا بھائی بھی آئے۔ بابوجی اُن سے بہت دکھی تھے کہ مجھے ولایت بھیجنے کی سازش وہی کر رہے تھے۔ میرے پہنچتے ہی سب کی ممتا اُمنڈ پڑی خوب زوروں سے رونا پیٹنا ہونے لگا۔

اُنہوں نے مجھے جانے سے صاف صاف منع کر دیا۔ کہہ دیا کہ اگر میں ولایت گیا تو وہ نہیں بچیں گے۔ جو باتیں ہوئی تھیں میں نے سب صاف صاف کہدیں۔ وعدہ بھی کر لیا کہ نہیں جاؤں گا۔ جب بابوجی کو میری بات پر یقین ہو گیا تو انہوں نے کلکتہ جانے کی اجازت دے دی۔

کلکتہ میں، جب ایک طرح سے سب تیاریاں ہو گئی تھیں۔ ایک چھوٹا سا واقعہ ہوا جس کا ذکر کرنا موزونِ موقع ہوگا۔ اس سفرِ ولایت کے جنون میں ہمارے وہ سب ساتھی شریک تھے جن کو یہ خبر تھی۔ سب کی خواہش تھی کہ وہ بھی جائیں۔ مگر ابھی اُن کا موقع نہیں لگا تھا۔ وہ سب یہ سوچتے تھے کہ میرے جانے کے بعد کسی نہ کسی تدبیر سے کچھ دنوں بعد وہاں پہنچنے کی کوشش کریں گے۔ ایک دن لا کالج سے نکلنے پر ایک ساتھی نے رائے دی کہ چلو ایک جوتشی (منجّم) سے اس بارے میں مشورہ کریں۔ وہ ایک جوتشی کو جانتا بھی تھا۔ وہاں ہم لوگ چلے گئے۔ وہاں ایک بوڑھے برہمن تھے۔ ان کی عمر تقریباً ساٹھ برس کی ہوگی۔ اپنے گھر میں بیٹھے تھے۔ ہم لوگوں کے جاتے ہی تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے کہا بس سمجھ گیا تم لوگ کس کام کے لئے آئے ہو۔ تب ہم میں سے کسی نے سوال پوچھنا شروع کئے۔ سوال تو ایک ہی تھا ولایت کا سفر کامیاب ہوگا؟ سوال ہم نے کیا نہیں اپنے دل ہی رکھا مجھکو اُنہوں نے جواب دیا کہ ابھی نہیں بہت دنوں کے بعد تمہاری خواہش پوری ہوگی۔ سکھ دیو کو انہوں نے جواب دیا کہ تمہاری خواہش ابھی بہت جلد پوری ہوگی۔ تیسرے بھائی سے کہا کہ تمہاری خواہش بھی کچھ دیر بعد پوری ہوگی، چوتھے ساتھی سے کہا تمہاری خواہش پوری نہ ہوگی

ہم لوگوں نے ایک روپیہ دیا۔ پرنام کر کے واپس چلے۔ راستہ بھر اسی کا مذاق اُڑاتے

آئے کہ یہ بڈھا بالکل کچھ نہیں جانتا۔ میری تو سب تیاری ہو چکی ہے اور میں جاؤں گا نہیں؟ سکھ دیو جن کے متعلق ابھی کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔ بہت جلد چند دنوں کے اندر ہی چلے جائیں گے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم لوگ ہنستے مذاق اُڑاتے واپس آئے۔ اس کے بعد ہی گھر سے تار آیا میرا جانا یکبارگی رُک گیا۔ جب میں گھر سے واپس ہوا اور یہ بات طے ہو گئی کہ میں نہیں جاؤں گا تب سکھ دیو کے جانے کی بات اُٹھی۔ میرے کپڑے اور میرے روپئے لے کر ایک دن وہ چلے ہی گئے۔ کپڑے اور روپئے ہوسٹل میں اتنے خفیہ طریقے سے رکھے گئے تھے کہ ہم لوگوں میں سے کسی کو بھی اس کی خبر نہ تھی۔ سکھ دیو کے بارے میں ڈر تھا کہ کہیں اس کے والد بھی اسی طرح روک نہ دیں۔ اس لئے وہ معاملہ بھی خفیہ رکھا گیا۔ ان کو کہیں جانا نہیں تھا۔ کسی سے ملنا نہیں تھا۔ اس لئے اُن کی بات قطعاً خفیہ رہ سکی۔ جانے کے دن ساتھیوں سے کہہ دیا کہ گھر جا رہے ہیں ہم دو تین ساتھی اسٹیشن پر گئے۔ ریل پر چڑھا کر بمبئی کے لئے روانہ کر دیا جب تک بمبئی سے جہاز روانہ ہونے کی خبر نہیں آئی تب تک ہم لوگوں کے دل میں شک بنا ہی رہا کہ شاید وہ بھی کہیں پکڑ کر واپس نہ بلا لئے جائیں مگر جہاز روانہ ہونے کے بعد ہی ان کے گھر والوں کو خبر ملی۔ یہاں تک کہ کلکتہ میں قریبی رشتہ داروں کو بھی جن سے بہت ربط ضبط تھا پتہ نہیں چلا۔

طالب علمی کی زندگی ختم

سکھدیو کو روانہ کر کے میں تو کانگریس کی والنٹیری میں مصروف ہوگیا اور اس کے بعد پھر پڑھنے میں لگ گیا۔ بابوجی کی بیماری بڑھتی گئی۔ کچھ دِنوں میں ان کی حالت خراب ہونے لگی۔ خبر ملنے پر میں کلکتہ سے اور بھائی ڈُمراؤن سے زیرادیئی پہنچے۔ کچھ دنوں میں اُن کی (والد صاحب کی) رحلت ہوگئی۔ مرنے سے پہلے ہم سب سے ملاقات ہوگئی۔ اس وقت تک بھائی کے دو لڑکیاں اور ایک لڑکے جنارد ن کا جنم ہو چکا تھا۔ میرے بھی لڑکے مرتنجے کی پیدائش اسی سال ہوئی تھی۔ پوتا دیکھ کر وہ مطمئن رہتے تھے۔ جب بیماری بڑھ گئی تب سب کو جمع کر کے آشیروادد یا۔

بابو کی وفات سے گھر میں گڑبڑ تو مچی۔ ہم سب دکھی ہوئے مگر مجھے ایک بات کی خوشی بھی رہی وہ یہ کہ اچھا ہی ہوا کہ میں ولایت نہیں گیا اگر گیا ہوتا اور اس زمانے میں اُن کی موت ہو جاتی تو نہ جانے کتنا دُکھی ہوتا۔ میں پھر کلکتہ چلا گیا۔ بھائی ڈُمراؤں چلے گئے۔ گھر کا انتظام تو بھائی پہلے سے ہی دیکھا کرتے تھے اب سارا بار اُن پر ہی آگیا اور وہ ڈمراؤں سے آکر گاہے بگاہے گھر جایا کرتے۔ میرے لئے خرچ وغیرہ کا بھی انتظام وہی کرتے۔ اُن کو

پڑھنے کے زمانے میں کبھی کبھی کچھ پریشانی بھی اُٹھانی پڑی۔ گھر سے روپے جانے میں دیر ہو جایا کرتی مگر انھوں نے بابوجی کی وفات کے پہلے کے زمانے سے اور اس کے بعد بھی خرچ کی فکر میں کبھی پڑنے نہیں دیا ان کی خواہش تھی کہ جب میں پڑھنے میں تیز ہوں اور سب امتحان اس طرح کامیابی سے پاس کرتا ہوں تو مجھے صرف پڑھنے میں ہی دل لگانے کا موقع دینا چاہیئے اور کسی طرح کی دوسری فکر نہ ہونے دینی چاہیئے۔

وظیفہ مجھے برابر کافی ملتا رہا۔ اس کو بابوجی یا بھائی خرچ میں کبھی نہیں جوڑتے تھے خرچ کے روپئے تو ہمیشہ الگ سے ہی بھیجتے رہے۔ ان روپیوں میں سے میں کالج کی فیس دیا کرتا۔ باقی روپیہ کتابیں خریدنے میں ہی لگتا۔ بی۔اے پاس کرنے پر دو وظیفے ملے ایک پچاس روپے کا جو ہر مہینے مل سکتا تھا یہ تو میں ہر مہینے خرچ کرتا گیا، دوسرا چالیس روپے مہینے کا جس کی شرط تھی ایم۔اے پاس کرکے پر ایک ساتھ جمع ہو کر ملے گا۔ جب ایم۔اے پاس کرنے پر ایک ساتھ چار سو اسی روپئے ملے تو ولایت کے سفر کے جنون میں جو کچھ قرض لیا تھا اُسے ادا کر دیا۔ پہلے کہہ چکا ہوں کہ ایف۔اے پاس کرنے کے بعد ہی امتحان کی طرف سے کچھ بے رُخی سی ہوگئی۔ بی۔اے میں نہ معلوم کیسے پھر اوّل آگیا۔ ایم۔اے کے زمانے میں یہ بے رُخی اور بھی بڑھ گئی۔ اس برس ولایت کے سفر کے جنون اور بابوجی کی وفات کے سبب وقت دوسرے کاموں میں لگا۔ دل بھی ڈانواں ڈول رہا۔ بابوجی کی وفات ۱۹۰۷ء کے فروری یا مارچ کے مہینے میں ہوئی۔ امتحان اگلے نومبر یا دسمبر میں ہونے والا تھا۔ گرمی کی چھٹیوں میں کچھ دنوں کے لئے ساتھیوں کے ہمراہ کرسان (کرسیانگ) چلا گیا وہیں امتحان کے لئے تیاری کی۔ ایم۔اے کے امتحان میں میرا مقام اول نہیں رہا۔ کئی ساتھی مجھ سے بہتر مقام پا گئے۔ مجھے اس کا کچھ افسوس نہیں ہوا کیونکہ میں نے اس کی اُمید بھی نہیں باندھی

تھی اور کوئی خاص کوشش بھی نہیں کی تھی۔

اس کے بعد سوال ہوا کہ کیا کیا جائے۔ امتحان دے کر میں بھائی کے پاس ڈمراؤں چلا گیا۔ کچھ دنوں تک وہیں رہا۔ سوچتا رہا کہ وکالت کا امتحان دوں یا نہیں۔ اس طرف طبیعت نہ آتی تھی۔ یہ بھی افسوس ہونے لگا کہ میں وکالت بھی نہیں کر سکوں گا۔ کچھ اپنی طاقت پر بے اعتمادی سی ہو گئی تھی۔ سرکاری نوکری نہ کرنے کی تو پہلے ہی ٹھان لی تھی۔

اسی درمیان ایک دوست بابو ویدنارائن سنگھ نے لکھا کہ میں مظفر پور کالج میں پروفیسر ہو جاؤں تو بہت اچھا ہوگا۔ وہ اس کالج میں پروفیسری کر رہے تھے۔ اُن کے کہنے سے میں نے درخواست بھیج دی، میرا تقرر ہو گیا۔ جولائی ۱۹۰۸ء میں کالج کھلنے پر میں وہاں چلا گیا۔ اس کام میں جی بھی لگتا تھا وہاں کے لوگوں سے جان پہچان بھی ہو گئی مگر بھائی صاحب اس سے مطمئن نہیں تھے۔ آہستہ آہستہ کالج کی مالی حالت خراب ہوتی چلی گئی۔ آخر طے ہوا کہ میں پھر وکالت کی تیاری کروں۔ لا کالج کی پڑھائی تو میں نے ختم ہی کر لی تھی مگر امتحان نہیں دیا تھا۔ بھائی کی رائے ہوئی کہ میں کلکتہ جاؤں اور وہاں امتحان دے کر وکالت شروع کر دوں۔

اس طرح طالب علمی کا زمانہ ختم ہوا۔ روزگار میں داخل ہونے کا وقت آگیا جب اُن دنوں کی یاد آتی ہے تو معلوم ہوتا ہے گویا وہ دورِ عیش تھا۔ کبھی کبھی افسوس ہوتا ہے تو اس کا کہ اُس کا جتنا اچھا استعمال ہو سکتا تھا نہیں کیا گیا مجھے اس بات کی آسانی تھی، کہ بھائی صاحب راہ دکھلاتے رہے۔ جتنے اچھے خیال یا اچھے رجحان دل میں پیدا ہوئے سب کے بیج انہوں نے ہی بوئے تھے۔ وہ برابر یہ اہتمام رکھتے تھے کہ مجھے طالب علمی کے زمانے میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ انہوں نے مجھے کبھی یہ محسوس

نہ ہونے دیا کہ گھر میں کوئی مالی مشکلات ہیں۔ کلکتہ میں اور اس سے پہلے چھپرا میں اپنے ساتھیوں سے میرا برابر پریم رہا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے کسی کے ساتھ کبھی کسی طرح کی ان بن بھی نہیں ہوئی۔ جھگڑے کا تو کوئی سوال ہی نہیں۔ بلکہ سب کے ساتھ محبّت کا ہی سلوک رہا چند لوگوں سے تو بڑا ربط ضبط ہو گیا، جو برابر قائم رہا۔ اگرچہ پڑھنے میں تقابل اور بازی لے جانے کا جذبہ کافی رہا۔ مگر میرے ساتھ کسی نے کبھی نہ تو چالاکی کی اور نہ بے ہودہ پن ہی کیا اور نہ کسی کے ساتھ بد دلی ہی ہوئی۔ جہاں کہیں کسی کو کوئی دقّت یا دشواری ہوتی۔ ہم برابر ایک دوسرے کی مدد کرتے نہ بلکہ جو میرے مدِمقابل ساتھی تھے ان کے ساتھ مل کر امتحان کی تیاری کی گئی۔ جب میں ایف۔ اے کے امتحان کے لئے تیاری کر رہا تھا تو وہ دوست جسے میرے بعد انٹرنس میں دوسرا مقام ملا تھا اور میں دونوں ایک ساتھ ہی امتحان کی تیاری کرتے رہے۔ اسی طرح اور امتحانوں کے لئے بھی سب مِل جُل کر پڑھتے رہے۔

کلکتہ جانا اور ایڈن ہندو ہوسٹل میں رہنا میرے لئے بہت مفید ہوا۔ کلکتہ جانے سے ہی آنکھیں کُھلیں۔ یہ سوچنا بے کار ہے کہ اگر وہاں نہ گیا ہوتا تو کیا ہوتا مگر مجھے یقین ہے کہ مجھے اور کہیں اتنا فائدہ نہ پہنچتا۔ ایڈن ہندو ہوسٹل میں رہنے سے بنگالی ساتھیوں سے گُھل مِل جانے کا جیسا اچھا موقعہ ملا ویسا شاید کہیں دوسری جگہ رہنے سے پہلے نہیں ملا۔ بنگالی ساتھیوں کی یاد نہایت سُہانی ہے۔ مجھے کسی کے بھی خلاف کوئی جذبہ پیدا ہی نہیں ہوا اور نہ اُن میں سے کسی نے میرے ساتھ کبھی کوئی بُرا برتاؤ کیا۔ کبھی کسی نے تلخ الفاظ بھی نہیں کہے۔ میں مانتا ہوں کہ اُن کے ساتھ جو دن گذرے وہ نہایت راحت دہ اور فائدہ مند ہوئے۔ اُن کے ساتھ رہتے رہتے بلا کوشش کے ہی میں نے بنگلہ بولنا سیکھ لیا۔ آج بھی میرے بہتیرے دوست سارے بنگال میں بھرے پڑے ہیں بہت

دنوں کے بعد جب میں ترک موالات کے دنوں میں بنگال میں دورہ کرنے گیا تو جہاں جاتا وہیں کچھ پُرانے جانے پہچانے دوست مل جاتے اور پُرانی یادیں تازہ ہو جاتیں۔

جب میں صدر کانگریس ہوا اور پھر بہار میں ۳۹-۱۹۳۸ء میں جب بنگالی بہاری سوال اُٹھا۔ اس کے بعد کانگریس میں مجھے کچھ ایسے کام کرنے پڑے جو بنگال میں کچھ لوگوں کو ناپسند ہوئے۔ میرے اوپر بہت بوچھاریں ہوئیں۔ سخت تحریریں لکھی گئیں۔ گالی گلوج بھی خاصی ہوئی۔ مگر میں ابھی تک یہ محسوس نہیں کرتا کہ اُن سے میری کوئی مخالفت ہے یا اُن کے خلاف میرے دل میں کبھی کوئی جذبہ پیدا ہوا ہو یہ ہو بھی کیسے سکتا ہے اتنے دنوں کا سُندر سُہانا ساتھ، محبّت کی داد وستد پُرانی لطیف یادیں۔ کیا انسان یہ سب بھول جاتا ہے۔ از روئے فرض اگر کبھی کسی کے ساتھ کوئی ایسا سلوک کرنا بھی پڑا جو اُسے پسند نہ ہوا تو میں اپنے دل سے جب پوچھتا ہوں ہمیشہ یہی جواب ملتا ہے کہ میں نے کبھی کسی کا نقصان جان بوجھ کر کرنے کے خیال سے نہیں کیا۔ جو کچھ ہو، یہ سب باتیں تو بھول جائیں گی مگر میرے صفحۂ دل سے وہ نقش جو لڑکپن میں ہی وہاں کھنچے تھے کبھی نہ مٹیں گے۔ وہ ساری یادیں کبھی محو نہیں ہو سکتیں اور نہ میں اس دین کو کبھی بھول سکتا ہوں جو بنگال نے پندرہ برسوں کی زندگی میں مجھے دی ہے۔

کلکتہ میں میرا ربط ضبط بہت سے بہاریوں سے بھی ہوا۔ جب میں کلکتہ پڑھنے کے لئے گیا تو تھوڑے ہی بہاری طلبا وہاں تھے۔ آہستہ آہستہ اُن کی تعداد بڑھنے لگی، پھر تو یہ خاصی تعداد میں وہاں پہنچ گئے۔ ہم لوگوں نے اپنا بہاری کلب بنا لیا تھا جس میں ہر ہفتہ ہم سب ملا کرتے تھے۔ ذات پات کا جھگڑا اتنا ساتھ لے کر گئے تھے کہ ہندو ہوسٹل میں ہم نے اپنے لئے الگ چوکا رکھا تھا۔ جس میں بہاری برہمن رسوئی بناتا تھا۔ اگرچہ میں

ڈاکٹر گنیش پرشاد کے ساتھ ضیافت میں شریک ہوا تھا۔ مگر ذات کی بندش بہت مانتا تھا۔ وہ تو اپنی ذات (کائستھ) کے آدمی تھے، کسی بھی دوسری ذات کے آدمی کا چھوا ہوا کوئی پکا ہوا اناج جو اپنے دیش (بہار) میں نہیں کھایا جاتا تھا، وہاں نہیں کھایا۔ اتنے دنوں تک وہاں رہا مگر بنگالی میس میں کچی رسوئی ایک دن بھی نہیں کھائی۔

بہاری ساتھیوں میں بہتوں سے میرا گہرا تعلق ہوگیا جو آج کئی ضلعوں میں بکھرے ہوئے اپنی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ کر رہے ہیں۔ اس لئے جہاں جاتا ہوں، کوئی نہ کوئی کلکتہ کا ساتھی مل ہی جاتا ہے۔ دلی دوستوں میں چمپارن ضلع کے شکار پور کے شری اودھیش پرشاد اور جگنّاتھ پرشاد، شاہ آباد کے شری سکھ دیو پرشاد ورما، بھاگلپور کے شری کرشن پرشاد، رانچی کے بدری ناتھ ورما، بل بھدر پرشاد جوتشی، ڈاکٹر سادھو سنگھ، ڈاکٹر راجیشور پرشاد، اور ٹبک دیو پرشاد ورما، بندھ باشی پرشاد ورما وغیرہ تھے۔ ان میں سے کتنے ہی چلے گئے اور کتنے آج بھی موجود ہیں۔ اودھیش بابو کی دوستی بہت بار آور ہوئی اور اس سے فائدہ پہنچا۔ اس کے بعد اُن کے ساتھ ایک شادی کے سلسلہ میں سسرالی رشتہ بھی ہوگیا۔

وکالت کی تیاری

مطفرپور کالج میں نو دس مہینے تک کام کرکے مارچ ۱۹۰۵ء میں کلکتہ پھر واپس چلا گیا۔ ان دنوں بی۔ ایل کے دو امتحان ہونے تھے۔ ایک امتحان تو میں نے فوراً پاس کر لیا اور دوسرے کی تیاری کرتی تھی۔ ہائی کورٹ میں وکالت کرنے کے لئے کسی وکیل کے ساتھ دو برس تک کام کرنا چاہیئے تھا۔ ایک چھوٹا سا امتحان بھی پاس کرنا پڑا تھا جس میں جج لوگ خود ہی کچھ پوچھ تاچھ کر لیا کرتے تھے۔ اگر میں چاہتا تو بی۔ اے پاس کرکے کسی وکیل کے دفتر میں نام لکھا کر ۱۹۰۵ء میں ہی وہ دو سال پورے کر سکتا تھا۔ مگر اُس زمانے میں اس طرف دھیان نہیں گیا اس لئے جب میں ۱۹۰۹ء میں کلکتہ گیا تو اس وقت سے دو سال کی اُمیدواری کرنی تھی۔ خواہش ہوئی کہ کسی اچھے وکیل کے ساتھ کام سیکھوں خان بہادر سیّد شمس الہدےٰ کے پاس میں ایک دوست کے ذریعے پہنچا۔ اس وقت اُن کے پاس دو امیدوار تھے اور قاعدے کے مطابق دو ہی ہو سکتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ جگہ خالی ہوتے ہی تم کو اپنے ساتھ امیدوار (آرٹیکل کلرک) رکھ لوں گا۔ تب تک دوسرے دوست کے ساتھ تمہیں رکھا دیتا ہوں۔ انہوں نے مجھے زاہد الرحیم زاہد کے ساتھ رکھا دیا۔ یہ صاحب

بھی اچھے وکیل تھے۔ کچھ دنوں کے بعد وہ ولایت گئے اور بیرسٹر ہو کر آئے۔ اس کے بعد ہائی کورٹ کے جج بھی ہوئے۔ زاں بعد انہوں نے اپنے نام میں سہروردی جوڑ دیا تھا اس لئے وہ جسٹس سہروردی کے نام سے مشہور ہوئے۔

میرا خیال تھا کہ جب دو برسوں تک کچھ اور کام نہیں ہے تو خود محنت کر کے قانون اچھی طرح پڑھ لوں گا (جس سے پہلے میں بہت ڈرتا تھا) اور وکیل کے یہاں کام بھی سیکھ لوں گا میں بھائی پر خرچ کا بار نہیں ڈالنا چاہتا تھا اس لئے شروع میں وہاں سٹی کالج میں کچھ دنوں کے لئے پروفیسری بھی کی۔ مگر بس تھوڑے ہی دنوں کے لئے۔ بعد میں کچھ طلبا کو اُن کے گھر پر پڑھایا کرتا اور اس سے وہاں کا خرچ نکال لیتا۔ ایک لڑکا جس کو میں پڑھاتا تھا جسٹس دگمبر چیٹرجی کا فرزند تھا۔ اس طریقہ سے، وکالت شروع کرنے سے پہلے ہی، ایک جج سے بھی تعارف ہو گیا۔

جب شمس الہدیٰ صاحب کے یہاں جگہ خالی ہوئی، میں اُن کے ساتھ کام کرنے لگا۔ میں نے اس وقت کا اچھا استعمال کیا۔ معمولی طور پر جو لوگ اس طرح نام لکھا لیتے تھے، بہت تھوڑا ہی کام کیا کرتے تھے۔ اور آخر میں دو سال گذار کر نام نہاد امتحان پاس کر کے وکیل ہو جاتے تھے۔ میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں روز سویرے شمس الہدےٰ صاحب کے گھر پہنچ جاتا۔ وہاں دس بجے تک ان کے ہاتھ کے مقدموں کے کاغذوں کو پڑھتا۔ اُن پر اپنا نوٹ، جیسا اُنہوں نے بتا دیا تھا، تیار کرتا۔ قانون کی نظیریں وغیرہ پڑھ کر اُن کے لئے سب کچھ تیار کر دیتا۔ تھوڑے ہی دنوں میں انہوں نے دیکھ لیا کہ میں ان کے لئے اچھا نوٹ تیار کر دیتا ہوں، جس سے اُن کو پوری مدد مل جاتی ہے اور جونیر وکیل کی بہت ضرورت نہیں ہوتی۔

میں ایک مس میں رہا کرتا تھا جو اُن کے گھر سے بہت دُور تھا۔ وہاں کچھ دور تک ٹرام پر جانا پڑتا۔ ٹرام سے اُتر کر تقریباً ایک میل پیدل جانا ہوتا۔ وہ خود بہت سویرے اُٹھ کر کاغذ وغیرہ پڑھا کرتے تھے۔ میں سات بجے پہنچ جاتا اور دس بجے تک اُن کے ساتھ کام کرتا۔ پھر اسی طرح اپنے میس میں آتا۔ کھانا کھا کر ایک بجے ہائی کورٹ جاتا۔ وہاں مقدّموں کی بحث سنتا۔ خاص کر ان مقدموں میں بہت جی لگتا جن کے لئے میں ان کو نوٹ تیار کر دیتا۔ شام کو ہائی کورٹ سے واپس آکر پھر بھوانی پور، جو ہمارے میس سے تقریباً چار میل پر تھا، جا کر رات کے وقت لڑکوں کو پڑھاتا اور لَوٹ کر نو دس بجے سوتا۔ اس طرح کافی محنت کرتا۔ کام بھی میں اچھی طرح سیکھ گیا۔ بعد ازاں شمس الہدےٰ صاحب نے کہا کہ تم کو آنے جانے میں بہت دقّت ہوتی ہے اور وقت بھی لگتا ہے۔ تم میرے مکان میں آجاؤ۔ تمہارے لئے جو بندوبست ہو کر دوں گا۔ انہوں نے ایک کمرہ رہنے کے لئے اور ایک الگ رسوئی کے لئے مجھے دے دیا۔ میں وہاں رہنے لگا۔ تب وہ رات کو بھی اور سویرے بھی جب چار پانچ بجے اُٹھتے، اور ضرورت سمجھتے، مجھے پکار لیتے۔ اپنے ساتھ ہی روز مجھے اپنی گاڑی میں کچہری لے جاتے۔ اُن سے ربط ضبط اتنا بڑھ گیا کہ گھر کے لڑکے کی طرح مجھے ماننے لگے۔

آج کل جب ہندو مسلم سوال بہت زوروں پر کھڑے ہوتے ہیں۔ ایک چھوٹے سے واقعہ کا ذکر دینا مناسب ہوگا۔ شمس الہدےٰ صاحب نامی وکیل تھے۔ مسلمانوں کے ایک لیڈر سمجھے جاتے تھے۔ مسلم لیگ کے صدر بھی ہوئے تھے۔ یونیورسٹی اسینٹ کے اور لیجسلیٹو کونسل کے ممبر تھے۔ اس کے بعد تو بنگال کے گورنر کی اکزکٹو کمیٹی (مجلس عاملہ) کے ممبر اور ہائی کورٹ کے جج تک ہو گئے۔ لیجسلیٹو کونسل کے صدر بھی ہو گئے تھے۔ "سر" کا خطاب

بھی ملا۔ اس وقت وہ صرف خان بہادر تھے۔ مگر ہائی کورٹ کے مؤکل اور جج دونوں ہی اُن کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اُن کے ہاتھ میں مقدّمے بھی بہت رہا کرتے تھے۔ اُن کا مزاج بھی بہت اچّھا تھا۔ مذہبی رجحان کے آدمی تھے۔ مسلمان طلبار کو کچھ وظیفے بھی دیا کرتے تھے۔ کچھ طلبار صرف کھانے کے وقت آکر وہاں کھا جایا کرتے تھے۔ میں اُن کے مکان میں ٹھہرا تھا۔

بقرعید کا دن آگیا۔ محلّہ بھی مسلمانوں کا تھا۔ یعنی اکثریت مسلمانوں ہی کی تھی۔ میں نے سوچا کہ شاید اس موقع پر اُن کے گھر میں یا آس پاس کے گھروں میں گائے کی قربانی ہو۔ میں ایک سناتنی ہندو تھا۔ میں نے سوچا کہ اچھا ہو کہ میں اس موقع پر دو چار دن کے لئے کہیں ٹل جاؤں۔ میں ان سے بغیر کچھ کہے ہی وہاں سے چلا گیا، مس میں جا کر دوستوں کے ساتھ ٹھہر گیا۔ تین چار دنوں کے بعد واپس آیا۔ انہوں نے پوچھا کہ کہاں چلے گئے تھے۔ میں نے سب باتیں صاف نہیں کہیں اتنا ہی کہا کہ دو تین دن کے لئے کچھ دوستوں کے پاس چلا گیا تھا۔

انہوں نے کہا "میں سمجھ گیا، تم بقرعید کی وجہ سے چلے گئے تھے۔ تم نے سوچا ہوگا کہ یہاں گائے کی قربانی ہوگی۔ اس لئے یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ کیا تم نے میرے ساتھ بے انصافی نہیں کی؟ تم نے سمجھ لیا کہ تمہارے جذبات کا میں کچھ بھی خیال نہیں کروں گا تم تو تم ہو، میرے گھر میں کئی نوکر ہندو ہیں۔ پھلواری کا مالی ہندو ہے۔ گایوں کی داشت کے لئے بھی نوکر ہندو ہے۔ کیا اُن کے جذبات کا میں خیال نہیں رکھتا ہوں؟ کیا اُن کا دل نہیں دُکھتا؟ تم کو مجھ سے پوچھ لینا چاہیئے تھا۔ میرے گھر میں اپنے گھر کے نوکروں کے خیال سے گائے کی قربانی نہیں ہوتی۔"

مجھے بہت شرمندہ ہونا پڑا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ میں نے اُن کے ساتھ بے انصافی کی تھی۔ اس زمانے میں تقسیم بنگال کی تحریک چل رہی تھی۔ بنگالی مسلمان اس تحریک کی مخالفت کر رہے تھے۔ مشرقی بنگال میں جہاں کے رہنے والے شمس الہدیٰ صاحب تھے۔ ہندو مسلم فساد بھی بہت ہوتے تھے۔ وہ خود تقسیم بنگال کے حق میں تھے۔ سب ہوتے ہوئے بھی اُن کے جذبات ایسے تھے اور ہمارے ساتھ اس طرح کا سلوک تھا۔

اسی درمیان میں نے بی ایل کا امتحان بھی پاس کر لیا تھا۔ اس پر میں نے کبھی توجہ نہیں کی، کسی طرح صرف پاس کر لیا۔ جب میری اُمیدواری کے دو سال ختم ہونے کو آئے، اُسی زمانے میں اُن کے بنگال کے گورنر کی اگزکٹو کونسل کے ممبر ہونے کی خبر آنے لگی۔ اُن کو اس کا پتہ چل گیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ اب تو وہ بہت دنوں تک وکالت نہیں کر سکیں گے اور اس لئے مجھ کو وکالت شروع کرنے کے بعد اُن سے مدد نہیں ملے گی۔ مگر میں نے سوچا کافی سیکھ لیا ہے اور میں خود سب کروں گا۔

سنہ ۱۹۱۱ء کے اگست میں میں نے وکالت شروع کی جس دن نام لکھا گیا اُسی دِن ایک مقدمہ انہوں نے مجھے دلوایا۔ خود میرے ساتھ جا کر ججوں کے سامنے بیٹھے اور مُجھے بحث کرنے دی۔ ہائی کورٹ میں وکالت شروع کرنے کے بعد صرف چند دنوں کے لئے ہائی کورٹ کھلا رہا اس کے بعد درگا پوجا کی لمبی چھٹی ہو گئی۔ چھٹیوں کے پہلے ہی میں بہار چلا گیا۔ محترم مالوی جی ہندو یونیورسٹی کے لئے چندہ جمع کرنے کے سلسلہ میں بہار کا دَورہ کر رہے تھے۔ چند دنوں تک اسی کام میں لگا رہا۔ جب ہائی کورٹ کھلا اور میں کلکتہ پہنچا اس زمانے میں شمس الہدیٰ صاحب کے تقرر کی خبر بہت گرم تھی۔ موکل بھی سمجھنے لگے تھے کہ اب وہ وکالت نہیں کریں گے۔ ہائی کورٹ تین مہینے بند رہنے کے بعد

جب کھلتا ہے تو ان تین مہینوں میں جمع ہوئے بہت مقدمے نئے دائر ہوتے ہیں شمس الہدیٰ
کے پاس جو مقدمے آئے اُن میں سے کئی انہوں نے مجھے منتقل کر دیئے۔ روپئے تو صاحب
کم ملے یا نہیں بھی ملے مگر انہوں نے کہا کہ میں تو اب یہاں نہیں رہوں گا۔ یہ مقدمے تمہارے
ہی ہاتھ میں رہیں گے اگر ٹھیک کام کرو گے تو موکل تمہیں سے کام لیتے رہیں گے۔ اس بات
کا ذکر صرف اُن کا جذبۂ محبت دکھانے کے لئے نہیں بلکہ ایک اور مقصد سے بھی
ضروری تھا۔

کچھ دنوں بعد انہیں مقدموں میں سے ایک پیش ہوا۔ موکل نے مجھے باضابطہ
فیس دے کر تو رکھا نہیں تھا مگر چونکہ وکالت نامہ پر میرے ہی دستخط تھے فہرست میں
میرا نام بھی تھا۔ ایک دوسرے وکیل کو اس نے بعد میں اور مقرر کر لیا۔ مگر ایسے مقدمے
جن میں شمس الہدے صاحب نے میرا نام بھی لکھوا دیا تھا جب پیش ہوتے تب اُن کے
کاغذوں کو خوب پڑھ لیتا اور قانون وغیرہ دیکھ کر تیار ہو جاتا۔ اس دن بھی اسی طرح تیار ہو کر
گیا۔ قانونی سوال اس میں بہت اُٹھتے تھے میرے سینیر وکیل صاحب زیادہ گہرائی تک
نہیں اُترے تھے۔ مقدمہ جسٹس سر آسوتوش کے اجلاس میں تھا۔ میں وکیل صاحب کو مدد
دے رہا تھا اور نظیر پر نظیر پیش کرنے کے لئے اُن کے ہاتھ میں دیتا جا رہا تھا۔ سر آسوتوش
سب دیکھ رہے تھے۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ اور کون نظیر ہے وہ بتا دو
تو کتابیں منگا لوں بعد کو ایک اچھا فیصلہ لکھوایا جو رپورٹوں میں شائع ہوا۔

یہ بات تو ہو گئی۔ میں اس مقدمے کی بات بھولنا ہی چاہتا تھا کہ دو دنوں کے بعد
ایک دوسرے وکیل صاحب نے جن کے ساتھ میں اکثر کام کیا کرتا اور جو یونیورسٹی سنڈیکیٹ
کے ممبر تھے، مجھ سے پوچھا کہ تم کو اگر لا کالج میں پروفیسر کی جگہ ملے تو منظور کرو گے۔ مجھے

تعجب ہوا کیونکہ میں نے اس کے لئے کسی سے کہا نہیں تھا۔ سر آسوتوش سے بھی جو وائس چانسلر تھے اور جن کے یہاں وکیلوں کا دربار سا لگا رہتا تھا، میں نے نہ ملاقات کی تھی اور نہ کچھ کہا ہی تھا۔ میں یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ میرے ایسے دو برس کے وکیل کو بھی یہ جگہ مل سکتی ہے میں نے تعجب سے اُن سے پوچھا کہ مجھے یہ جگہ کیسے مل سکتی ہے؟ میں نے نہ کسی سے ملاقات کی ہے اور نہ درخواست ہی دی ہے۔ اس پر اُنہوں نے کہا کہ کسی مقدمہ میں تم نے سر آسوتوش کے اجلاس میں کام کیا ہے اور وہ بہت خوش ہوئے ہیں۔ تم اُن سے جا کر ملو، میں گیا اور چند دنوں کے بعد ہی لا کالج میں جگہ مل گئی۔ کیس میں روپئے تو زیادہ نہیں ملتے تھے مگر تعلیم دینے کے لئے قانون گھر پر خوب پڑھنا پڑھتا تھا، جس سے خوب فائدہ ہوا، اس طرح ایک انجان اور بلا فیس کے مقدمے نے مجھے یہ عزت دی۔

وکالت شروع کرنے کے پہلے کی ایک بات اور لکھ دوں۔ اُوپر کہہ چکا ہوں کہ میں جسٹس دگمبر چٹرجی کے لڑکے کو گھر پر کچھ پڑھایا کرتا تھا، اُن سے جان پہچان ہو گئی تھی مگر کوئی ربط ضبط نہیں تھا۔ وہ جانتے تھے کہ میں نے یونیورسٹی کے امتحان اچھی طرح پاس کئے ہیں اور اسی لئے اُنہوں نے اپنے لڑکے کو پڑھانے کے لئے مجھے رکھا بھی تھا جب اُن کو معلوم ہوا کہ میں اب وکالت شروع کرنے والا ہوں تو ایک دن وہ مجھ سے کچھ باتیں کرنے لگے۔ انہوں نے پوچھا 'تمہارا رشتہ دار کوئی وکیل ہے'، میں نے کہا، کوئی نہیں حقیقت میں میری سسرال کے لوگوں میں تو کئی وکیل تھے مگر وہ لوگ بلیا میں جو اتر پردیش میں ہے وکالت کرتے تھے۔ بہار میں میرا کوئی بھی رشتہ دار اس پیشہ میں نہیں تھا۔ یہ سُن کر اُنہوں نے کہا کہ یہ بہت اچھی بات ہے، مجھے تعجب ہوا کیونکہ میرا خیال تھا کہ اگر کوئی حقیقی رشتہ دار وکیل ہوتا تو شروع میں وہ مدد کرتا اور اس سے

مقدمے ملتے ۔ اس طرح مقدمے ہاتھ آتے ۔

میں نے اپنا مقصد بتایا تو وہ کہنے لگے کہ تم اپنی خوش قسمتی سمجھو کہ تمہارا کوئی رشتہ دار وکیل نہیں اور خاص کر بہت نامی وکیل نہیں ۔ اگر کوئی وکیل ہوتا تو شاید کچھ مقدمے اس کے تعلق سے تم کو ملتے مگر موکل تم کو وکیل نہیں رکھتا وہ تو یہ سمجھتا کہ بڑے وکیل صاحب کی خاطر سے کسی ایک "نکمے" آدمی کو بھی رکھے لیتا ہوں ۔ اُس کا تم پہ نہ کبھی اعتماد ہوتا اور نہ تمہارے لئے اس کے دل میں کوئی وقار ہوتا ۔ اسی لئے وہ دوسرا وکیل بھی ضرور رکھتا ۔ تم بھی یہ سمجھ کر کہ دوسرے کو بحث کرنی ہے اپنی طرف سے زیادہ کوئی تیاری نہ کرتے ، اس طرح تم کام میں ڈھیل دیتے ۔ تم کو بحث کرنے کا بھی کم موقع ملتا ۔ جب تم آگے چل کر اپنی محنت سے اگر اچھے وکیل بھی ہو جاتے اور وہ موکل آتا تو وہ تم کو یاد دلاتا کہ شروع میں اُس نے ہی تم کو وکیل رکھا تھا ۔

اس لئے تم کو بھی لحاظ ہوتا اور تم اُس سے روپے نہ لے سکتے ۔ مال دار موکل تو اسی طرح کے ہوتے ہیں ۔ غریب اگر کوئی تمہارے پاس آجاتا تو تم اپنی عادت سے اس کی طرف زیادہ توجہ نہ کرتے ۔ کیونکہ تمہارے پاس جو مال دار موکل ، چاہے وہ روپے دیتے ہوں یا نہیں ، اور چاہے تمہیں اُن کے مقدمے میں خود جوابدہی لے کر کام کرنے کا موقع ملتا ہو یا نہیں ۔ آہی چکے ہوتے اور تم کو اس کا غرور بھی ہوتا جب کوئی مدد کرنے والے رشتہ دار نہیں ہیں تو اُن کا کوئی موکل تم کو نہیں ملے گا ۔ غریب موکل یہ جان کر کہ تم اچھے پڑھے لکھے ہو ، آئے گا ، روپئے کم دے گا مگر اپنا سب کچھ تم کو ہی سمجھے گا ۔ اس لئے جہاں تک ہو سکے گا تم اپنے کو اچھی طرح تیار کرو گے ۔ اس طرح کام کرنے کا اچھا موقع ملے گا جب مقدمہ جیت جاؤ گے وہ دس اور غریبوں سے تمہاری تعریف کرے گا گویا تمہارے لئے

اشتہار کا کام کرے گا۔ دوسرے غریب موکل آئیں گے اور اس طرح تمہارا نام ہوگا۔ اس میں نہ کسی کی مدد رہے گی نہ احسان۔ جب اس طرح وکالت چل نکلے گی بڑے موکل خود آئیں گے۔ وہ تمہاری خوشامد خود کریں گے۔ پرانا احسان نہیں جتا سکیں گے اور تم اُن سے عزت کے ساتھ روپئے لے سکو گے۔ اس لئے محنت کر کے کام کرنا سیکھو۔ وکالت اچھی چل نکلے گی۔

ان کی باتوں سے میرے دل میں بہت ہمّت بندھی۔ انہوں نے جتنی باتیں کہی تھیں، حرف بہ حرف سچ نکلیں۔ شروع میں صرف غریب موکل ملے۔ مجھے شروع سے ہی بغیر کسی دوسرے وکیل کی مدد کے کام کرنے کا اچھا موقع ملا۔ اس سے محنت بھی کرنی پڑی اور اپنی عقل کی بھی کشادگی ہوئی۔ ایک ہی دو ایسے موکل ملے جو مال دار کہے جا سکتے تھے۔ اُن سے پرانا تعلق نکلا۔ اسی لئے وہ میرے پاس آئے۔ نہیں تو سب غریب ہی تھے۔

جس زمانے میں، میں وکالت کی تیاری کر رہا تھا ایک اور واقعہ گذرا جس کا ذکر کرنا ضروری ہے اگر اس واقعہ کی بات پوری ہو جاتی تو زندگی کا رُخ آج دوسرا ہی ہو گیا ہوتا۔ مگر وہ نہیں ہوئی، شاید اچھا ہی ہوا کہ اس وقت سے نیم پختہ خواب بنا رہا۔ یہ واقعہ تھا، مسٹر گوکھلے سے ملاقات۔

مسٹر گوکھلے سے مُلاقات

۱۹۱۰ء میں میں وکالت کے امتحان کے لئے پڑھ رہا تھا۔ کلکتہ میں ایک مس میں رہتا تھا۔ وہاں دو چار اور بہاری ساتھی بھی تھے۔ میرے بھائی بھی وہاں آئے ہوئے تھے۔ ایک روز ہائی کورٹ میں جہاں میں تقریباً ہر روز جایا کرتا تھا۔ مسٹر پرمیشور لال بیرسٹر نے مجھ سے کہا کہ تم اور سری کرشن جاکر مسٹر گوکھلے سے ملو، انہوں نے تم دونوں کو بلایا ہے۔ مجھے یہ سُن کر بہت تعجب ہوا کیونکہ مجھے جناب گوکھلے سے ملنے کی خوش قسمتی کبھی پہلے حاصل نہ ہوئی تھی اُن کے لئے بھی مجھے جاننے کا کوئی سبب نہیں تھا۔ مسٹر پرمیشور لال نے کہا کہ وہ بہار کے دو چار اچھے ہونہار طلبار سے ملنا چاہتے ہیں اور میں نے تم دونوں کا نام اُن کو بتا دیا ہے۔ بات یہ تھی کہ سری کرشن پرشاد (جو بدقسمتی سے کم عمر میں ہی اس دنیا سے چلے گئے) اور میں دونوں ہی انجمن طلبار میں نمایاں حصّہ لیا کرتے تھے۔ اس لئے ہم لوگوں کو بہت لوگ جانتے تھے۔ مسٹر پرمیشور لال نے بھی اسی سبب ہم دونوں کے نام بتا دئے تھے۔

ہم دونوں مسٹر گوکھلے سے جہاں وہ ٹھہرے تھے جاکر ملے۔ انہوں نے تھوڑے دن پہلے سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی (انجمن خدام ہند) کو قائم کیا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ بہار

کے کچھ اچھّے نوجوان اس میں شریک ہو جائیں۔ انہوں نے ملک کی خدمت پر زور دے کر ہم لوگوں سے اس میں شریک ہونے کو کہا۔ وہ جانتے تھے کہ ہم دونوں نے یونیورسٹی کے امتحان اچھی طرح پاس کئے ہیں۔ اور اب وکالت کی تیاری کر رہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ہو سکتا ہے کہ تمہاری وکالت خوب چلے اور تم بہت روپئے پیدا کر سکو، بہت آرام اور عیش وعشرت میں دِن بتاؤ، بڑی کوٹھی، گھوڑا گاڑی نوکر وغیرہ نمائش کے سامان جو امیروں کے ہوا کرتے ہیں سب میسّر ہوں مگر مُلک کا بھی دعویٰ کچھ لڑکوں پر ہوتا ہے، اور چونکہ تم پڑھنے میں اچھے ہو اس لئے تم پر وہ دعویٰ اور بھی زیادہ ہے۔ اپنے بارے میں انہوں نے کہا۔ میرے سامنے بھی یہی سوال آیا تھا۔ میں غریب گھر کا آدمی تھا۔ میرے گھر کے لوگ بہت اُمیدیں رکھتے کہ جب میں پڑھ کر تیار ہو جاؤں گا تو روپئے کماؤں گا اور سب کو خوش حال بنا سکوں گا۔ جب میں نے اُن کی سب اُمیدوں پر پانی پھیر کر خدمتِ وطن کا عہد کیا تو میرے بھائی اتنے دُکھی ہوئے کہ کچھ دنوں تک وہ مجھ سے بولے تک نہیں مگر کچھ دنوں کے بعد سب باتیں سمجھ گئے۔ اور پھر میرے ساتھ خوب محبّت کرنے لگے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ سب تمہارے ساتھ بھی ہو مگر اس کا یقین رکھو کہ سب لوگ آخر میں تمہاری پوجا کرنے لگیں گے۔ لوگوں کی سب اُمیدیں تم سے بندھی ہیں مگر کون جانتا ہے اگر تم مر گئے تو اُسے تو وہ لوگ برداشت کر ہی لیں گے۔

اسی طرح انہوں نے تقریباً ڈیڑھ دو گھنٹے تک ہم لوگوں سے بات کی۔ بات کرنے کا طریقہ بھی ایسا تھا کہ ہم لوگوں کے دل پر اُس کا بہت گہرا اثر ہوا۔ آخر میں انہوں نے کہا کہ ٹھیک اِسی وقت جواب دینا ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ سوال اہم ہے، سوچ بچار کر ایک دن ہم سے پھر ملو اور تب اپنی رائے دو۔ ہم لوگ وہاں سے ایک طرح کھوئے ہوئے سے

نکلے۔ اپنے میس میں واپس آئے۔ اُن کی باتوں کا اتنا اثر پڑا تھا کہ کوئی دوسری بات سوجھتی ہی نہ تھی۔

ہم دونوں ان کی باتوں پر سوچ بچار کرنے لگے۔ مجھے تو کئی دن تک نیند نہیں آئی کھانا پینا سب کچھ برائے نام رہ گیا۔ سودیشی کے دنوں میں دیش کی باتیں سامنے آتی تھیں۔ دیش سیوا (خدمتِ وطن) کا جذبہ بھی وقتاً فوقتاً بیدار ہوتا تھا مگر اس سے پہلے کبھی اس طرح یہ سوال سامنے نہ آیا تھا، اور نہ کبھی بڑے آدمی سے مل کر اس قسم کے معنی خیز الفاظ سُننے کی ہی خوش قسمتی حاصل ہوئی تھی۔ ایک طرف اُن کی بتائی ہوئی ملکی خدمت کی ہم لوگوں کے لئے ضرورت۔ دوسری طرف بھائی پر گھر کا سارا بوجھ لادنا۔ میرے بھی دو لڑکے ہو چکے تھے اور اُن کے بھی تین لڑکیاں تھیں اور ایک لڑکا۔ ماں اب تک زندہ تھیں۔ وہ کیا کہیں گی۔ گھر کے دوسرے لوگوں کو کتنا دُکھ ہوگا۔ وغیرہ وغیرہ جذبات اتنا ستا رہے کہ جیسا اوپر کہا ہے۔ کھانا پینا تقریباً چھوٹ گیا۔ ہم دونوں کے سوا دوسرا کوئی ان باتوں کو نہیں جانتا تھا بھائی ساتھ ہی تھے مگر اُن سے بھی نہیں کہا۔ کسی دوسرے ساتھی سے بھی نہیں کہا۔ ہائی کورٹ جانا بھی بند رہا۔ ٹہلنا گھومنا چھوٹ گیا کہیں کہیں تنہائی تلاش کر کے بیٹھنا اور فکر کرنا یہی ایک کام رہ گیا۔ تقریباً دس بارہ روز تک یہی مشغلہ رہا۔ بھائی کو کچھ شک ہوا، شاید طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ انہیں کچھ کہہ کر ٹال دیا۔ ابھی اپنا ہی جی نہ بھرتا تھا تو اُن سے کیا کہوں۔

کئی دنوں کی اس قسم کی تشویش کے بعد میں نے طے کیا کہ مجھے مسٹر گوکھلے کی بات مان کر ان کی انجمن میں شریک ہو جانا چاہیئے۔ میری ہمّت نہیں ہوتی تھی کہ بھائی سے بھی کھُل کر کہوں کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ اس سے انہیں بہت رنج پہنچے گا۔ میں نے ایک لمبا خط

لکھا جس میں سب باتیں کھول کر لکھ دیں اور ان سے اجازت مانگی کہ مجھے جانے دیں۔ ایک دن شام کو وہ خط ان کے بستر پر (جب وہ کہیں ٹہلنے گئے تھے) میں نے رکھ دیا۔ میں خود کالج اسکوائر میں جو نزدیک ہی تھا جا کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے خط پڑھا اور میری تلاش کرنے لگے۔ ملاقات نہیں ہوئی، جب میں واپس آیا۔ تو اُن کو بے حال دیکھا۔ وہ اس رات تو کچھ بول ہی نہ سکے۔ میں نے دیکھا کہ جو خیالات مجھے ستا رہے تھے، وہی اُنہیں بھی ستا رہے ہیں۔ اُن کا جی چاہتا ہے کہ مجھے نہ روکیں۔ مگر اپنے کو خاندان کا اتنا بڑا بوجھ اُٹھانے میں طاقت پاتے ہیں۔ وہ مجھ سے مل کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ میں بھی اپنے کو روک نہ سکا، میں بھی رونے لگا۔

میں تو اُن کے اس رونے ہی اُن کے دل کا حال سمجھ گیا۔ کچھ زیادہ کہنے کی میری ہمت ہی نہ ہوئی۔ رائے ہوئی کہ گھر چل کر ماں چچی اور بہن سے بھی صلاح کرنی چاہیئے۔ میں نے مسٹر گوکھلے سے جا کر یہ حال کہہ دیا۔ میں سمجھ گیا تھا کہ میرے لئے اب ان سب کے رشتۂ محبت کو کاٹنا ناممکن ہوگا۔ ایسا ہی ان سے کہہ بھی دیا۔ اُنہوں نے بھی اُمید چھوڑ دی، میرے ساتھی سری کرشن نے آخری فیصلہ کرنے سے پہلے کچھ دنوں تک پونا میں جا کر وہاں کا سب حال چال دیکھنا چاہا۔ جناب گوکھلے نے اس بات کو پسند کیا۔ پونا جا کر سری کرشن کچھ دن تک رہے بھی مگر آخر میں اُن کا بھی فیصلہ یہی ہوا کہ وہ انجمن میں شریک نہ ہو سکیں گے۔

ہم دونوں بھائی زیرادیئی پہنچے۔ وہاں جب گھر کی عورتوں نے سب باتیں سنیں تو سب پریشان ہوگئیں۔ ماں کی مامتا تو اتنی تھی کہ وہ کبھی کچھ بولتی ہی نہ تھیں مگر میری بہن جو ہمیشہ سے کچھ تیز بولنے والی ہیں کہنے لگیں کہ تم نے ولایت جانے کی بات اُٹھا کر بابوجی کو رُلایا اور اب اس عمر میں سادھو بننا چاہ کر بھائی کو رُلاتے ہو۔ بس اتنا کہہ کر وہ خود بھی

رونے لگیں۔ گھر بھر میں کہرام مچ گیا۔ اس کہرام میں میری بچی کھچی ہمت جو کلکتہ میں ہی کمزور پڑ گئی تھی اب بالکل ٹوٹ گئی۔

گھر پر کچھ دنوں تک ٹھہر کر میں پھر کلکتہ چلا گیا۔ گھر کے لوگوں کو یقین ہو گیا کہ میں اِن سب کی مرضی کے خلاف کام نہیں کروں گا۔ اسی پس و پیش میں تقریباً چار پانچ ہفتے گذر گئے میں نے خیال تو چھوڑ دیا مگر دل میں کسک قائم رہی۔ کئی ہفتوں تک کچھ پریشان سا ہی رہا۔ آہستہ آہستہ وہ پریشانی دُور ہوئی۔ ایک نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ بی ایل کا امتحان جو اس کے تھوڑے ہی دنوں بعد ہونے والا تھا میرے لئے مشکل مسئلہ بن گیا۔ پڑھنے میں جی نہ لگتا تھا۔ امتحان کے دن قریب آ گئے کسی طرح امتحان تو پاس کر لیا مگر اونچا مقام ملنے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ کیونکہ پڑھا ہی نہیں تھا۔ پاس کرنے میں بھی دل میں خوف تھا۔ بہر حال کسی طرح پاس ہو گیا۔ اس کے ایک برس کے بعد وکالت شروع کی کیونکہ اُمیدواری کا زمانہ ابھی پورا نہ ہوا تھا۔ شروع وکالت کا حال اُوپر لکھ چکا ہوں۔

تِلک جہیز کی رسم

مندرجۂ بالا واقعہ کے تھوڑے ہی دنوں بعد ماں کی رحلت ہوگی۔ دسہرے کی بڑی تعطیل میں ہیں گھر آیا تھا۔ ان کا معمول تھا کہ کاتِک کے مہینے ہیں شام کے وقت بھی غسل کر کے تلسی کی پوجا کرتیں اور چراغ جلاتیں۔ اِسی میں ایک دن سردی لگ گئی۔ نزلہ بخار کی بیماری ہوگئی۔ ہم دونوں بھائی گھر پر ہی تھے۔ بہت دوا دارو کی مگر وہ نہ بچ سکیں۔ چار پانچ دن کی بیماری کے بعد ہی چل بسیں۔ اُن دنوں بھائی کے پاؤں میں کچھ درد تھا۔ لوگ کچھ ایسا مانتے تھے کہ باپ کی شرادھ بڑے لڑکے کو اور ماں کی شرادھ چھوٹے لڑکے کو کرنی چاہیئے۔ اس لئے کریا کرم میں نے ہی کیا۔

بھائی کی لڑکی اب اتنی بڑی ہوچکی تھی کہ اس کا بیاہ کر دینا ضروری تھا۔ ماں کی زندگی میں ہی بات چل رہی تھی۔ ہمارے سماج میں لڑکی کی شادی ایک بڑا ہنگامہ ہے۔ پہلے تو پسند کا لڑکا ملنا مشکل ہے۔ بات چیت کا بکھیڑا ہوتا ہے پھر یہ بھی دیکھنا ہوتا ہے کہ اس گھر میں کچھ دولت بھی ہو تاکہ لڑکی کو وہاں جاکر تکلیف نہ ہو۔ چھوٹی عمر میں شادی ہونے سے لڑکا خود کفیل نہیں ہوتا۔ اس لئے اس کے گھر والوں پر ہی لڑکی کی داشت پرداخت کا بار

ہوتا ہے اور یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ گھر والے اس قابل ہیں یا نہیں۔ میری اپنی شادی شاید بارہ برس کی عمر میں ہوئی تھی۔ میں پچیس چھبیس برس کا ہو چکا تھا، ابھی تک پڑھتا ہی رہا۔ اِن چند مہینوں کے سوا۔ جب مظفر پور کالج میں پروفیسری کرتا تھا۔ ابھی تک کچھ کمایا نہیں تھا۔ بھائی نے بھی کچھ جمع نہیں تھا۔ اسکول کی ماسٹری میں ان کو جو تھوڑی تنخواہ ملتی تھی، وہ وہیں خرچ ہو جاتی تھی۔ اس لئے گھر میں جو زمینداری تھی۔ اُسی پر سب کام چلتا تھا۔ بھائی نے انتظام اچھا کر لیا تھا۔ اس لئے ایسی تکلیف محسوس نہ ہوئی تھی جیسی بابوجی کے مرنے پر ہوئی تھی۔ پھر بھی لڑکی کی شادی میں تو بہت خرچ ہوتا ہی۔

لڑکی کی شادی میں اگر اچھا گھر اور اچھا بَر مل بھی گیا تو لڑکے کے گھر والوں کو راضی کرنا کچھ آسان کام نہیں ہوتا۔ اُن دنوں لڑکے کے راضی کرنے کا سوال نہ تھا کیونکہ لڑکا اکثر کم عمر کا ہی ہوتا تھا اور ماں باپ کی رضامندی ہی اس کی رضامندی سمجھی جاتی تھی۔ تب سے اب تک بہت فرق ہو گیا ہے۔ اب لڑکوں کی شادی کچھ عمر بڑھ جانے پر ہی ہوتی ہے۔ زیادہ تر اُن کائستھوں میں جو تعلیم یافتہ ہیں۔ ہاں تو لڑکے کے ماں باپ کی رضامندی حاصل کرنا آسان کام نہیں تھا۔ ان کو بھی لڑکے والوں کے گھر اور خاندان کے بارے میں پتہ لگا کر اطمینان کرنا ہوتا تھا کہ اُن کی حیثیت کے لائق لڑکے والے ہیں یا نہیں۔ یہ سب ٹھیک ہو جانے پر تلک جہیز کی بات اُٹھتی تھی۔

لڑکی والے کو بَر لوجا کے وقت جسے ہمارے سماج میں تلک کہتے ہیں، روپئے کپڑے اور برتن وغیرہ دینے پڑتے ہیں۔ شادی کے وقت برات آنے پر سب چیزیں اور نقد روپئے دینے پڑتے ہیں۔ لڑکی کو روپئے دینا باپ کا فرض ہو سکتا ہے۔ مگر ہمارے سماج میں اُس کے اپنے دل سے اور محبت سے دینے کی بات نہیں رہتی۔ شادی کے پہلے ہی

گفتگو کر کے طے کر لیا جاتا ہے کہ تِلک کے وقت اتنا دینا ہوگا اور شادی کے وقت اِتنا دینا ہوگا اور شادی کے وقت برات جانے پر اِتنا جہیز دینا ہوگا۔ یہ رسم ہزار کوشش کرنے پر بھی ابھی تک جاری ہے۔ سبھی برادریوں کی سبھاؤں میں قراردادیں پاس ہوتی ہیں کہ یہ رسم اُٹھا دینی چاہیئے مگر گھٹنے کا کیا ذکر وہ بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ جن ذاتوں میں یہ رسم نہیں تھی اُن میں بھی رائج ہوتی جا رہی ہے۔ جن میں پہلے سے چلتی تھی اُن میں تلک جہیز کی رقم اب بہت بڑھتی جا رہی ہے۔

اگر آج میری شادی ہونے کو ہوتی اور میں اس رواج کے مطابق تِلک جہیز لے کر شادی کرنا چاہتا تو مجھ جیسے یونیورسٹی کے امتحان میں کامیاب طالب علم کے لئے جہاں میری شادی میں ڈیڑھ دو ہزار کے قریب ملے تھے۔ آج کی شرح سے دس پندرہ ہزار کی رقم بھی بڑی رقم نہ سمجھی جاتی۔ اس زمانے کی شرح تو اتنی بڑھ گئی ہے اور بڑھتی جاتی ہے، کہ کچھ ٹھکانا ہی نہیں رہا جس کے گھر میں کچھ نہیں ہے مگر جو پڑھنے میں تیز ہے وہ معمولی طور سے تین چار ہزار کی فرمائش تو کر ہی دیتا ہے۔

ہاں، ایک فرق ہوا ہے۔ میری شادی کے زمانے میں لڑکے کو خوش کرنے کی بات نہیں ہوتی تھی، کیونکہ دس بارہ برس کا لڑکا تو کھلونوں سے بھی خوش کیا جا سکتا تھا اور لڑکے سے شادی کی بات کرنا یا لڑکے کا خود اپنی شادی کے متعلق بات کرنا بہت معیوب سمجھا جاتا تھا اس لئے اگر ماں راضی ہو گئے تو یہی کافی ہوتا تھا مگر آج کل تو پڑھے لکھے لڑکوں کو الگ سے راضی کرنا ہوتا ہے وہ اپنی فرمائش الگ کر دیتے ہیں اور اس طرح مانگ یا قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔

بھائی کی لڑکی کی شادی جانے بوجھے گھر میں ہونے کی بات تھی کیونکہ لڑکے کے بڑے

بھائی ہم لوگوں کے ساتھ کلکتہ میں پڑھتے تھے اور لڑکا بھی وہاں پڑھا کرتا تھا۔ اسی لئے اُمید تھی کہ سب باتیں آسانی سے طے ہو جائیں گی۔ مگر پُرانی علّت کہاں چُھٹتی ہے۔ ہم لوگوں کو بھی دقّت اُٹھانی ہی پڑی۔ بفضلہ رشتہ اچھّا ہو گیا۔

سب کچھ ہونے پر بھی گھر میں روپئے تو تھے نہیں۔ اناج تو کھیتوں میں پیدا ہوتا تھا، اس لئے اس کی بہت فکر نہ تھی۔ مگر نقد خرچ کے لئے ہم دونوں بھائیوں کو قرض لینا پڑا۔

وکالت کی ابتدا

بھتیجی کی شادی کے تھوڑے دنوں بعد میں نے کلکتہ میں وکالت شروع کر دی۔ کچھ ابتدائی حالات تو پہلے لکھ چکا ہوں۔ کام شروع کرتے ہی مجھے مقدمے ملنے لگے۔ میں نے جس دن سے وکالت شروع کی، گھر سے اپنے خرچ کے لئے کبھی کچھ نہیں لیا۔ مجھے اس بات کی فکر تھی کہ گھر سے کچھ منگانا پڑے گا تو بھائی پر بہت بار ہو گا۔ اور خاص کر لڑکی کی شادی کے خرچ کے بعد اُن کی دشواریاں اور بھی زیادہ ہو جائیں گی۔ مگر کچھ اتّفاق ایسا بھی ہوا کہ ہر مہینے تھوڑی بہت آمدنی ہو جاتی اور وہ خرچ کے لئے کافی ہوتی۔ کلکتہ میں خرچ تو چھوٹے شہروں کے مقابلے میں زیادہ پڑتا ہی ہے تو بھی کام چل نکلا۔ جیسا جسٹس چٹیرجی نے کہا تھا میرے پاس مال دار موکل نہیں آئے۔ صرف ایک آدمی (رائے بہادر ہری پرشاد سنگھ) نے، میں نے جس دن سے وکالت شروع کی اُسی دن سے اپنی زمینداری کے سب چھوٹے بڑے مقدمے میرے سپرد کئے۔ وہ مجھے جانتے تھے اور ولائت جانے کے لئے انہوں نے کچھ روپئے بھی دئے تھے۔ ایسا اتفاق ہوا کہ اُن کا ہی مقدمہ میری وکالت کا آخری مقدمہ بھی ہوا۔ کیوں کہ وکالت چھوڑنے کے وقت اُن کے ہی بہت بڑے مقدمہ میں کام

کر رہا تھا۔

غریب موکلوں کے مقدموں میں کوئی دوسرا وکیل بھی نہیں ہوتا تھا اور اکثر مجھے ہی بحث کرنی پڑتی تھی۔ محنت کر کے کام کرنا، اس لئے بہت جلد جج لوگ بھی مجھے پہچاننے لگے بہت لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ ججوں سے بہت ملا کرتے ہیں، میں نے ایسا کبھی نہیں کیا۔ اُن سے میری ملاقات اجلاس کی ہی رہی۔ ان میں بہتیرے جن کے سامنے کام کرنے کا موقع ملا، مجھ سے خوش رہے۔ سر لارنس جنکنس چیف جسٹس تھے۔ میرے وکالت شروع کرنے کے ایک ڈیڑھ سال بعد ہی وہ چلے گئے، مگر اتنے تھوڑے دنوں کی وکالت سے ہی وہ اتنے خوش تھے کہ جاتے وقت اپنے دستخط سے اپنی ایک تصویر مجھے دے گئے۔ سر آسوتوش کی بات اوپر لکھ ہی چکا ہوں کہ انہوں نے ایک مقدمہ میں جونیر وکیل کی حیثیت سے مجھے کام کرتے دیکھ کر لا کالج کی پروفیسری دے دی۔ اس طرح اپنی کامیابی سے میں خوب خوش تھا۔

مظفر پور کالج کے میرے پرانے ساتھی بابو وید ناتھ نارائن سنگھ نے بھی کلکتہ میں آکر ہائی کورٹ میں میرے ساتھ ہی وکالت شروع کر دی تھی۔ ہم دونوں میں گہری دوستی ہوگئی تھی۔ اسی درمیان بہار صوبہ کے بھی، ۱۹۱۱ء کے دسمبر میں شاہی دربار کے وقت بنگال سے الگ ہونے کا اعلان ہوا اور ۱۹۱۲ء کے اپریل سے بہار ایک نیا صوبہ ہوگیا۔ ابھی تک ہائی کورٹ اور یونیورسٹی الگ قائم نہیں ہوئی تھیں۔ بہار کے مقدمے کلکتہ میں ہی فیصل ہوا کرتے تھے اور بہار کے طالب علم کلکتہ یونیورسٹی کے ہی امتحانوں میں بیٹھتے تھے مگر صوبہ الگ ہونے کے تھوڑے ہی دنوں بعد ہائی کورٹ الگ کرنے کی بات ہونے لگی۔ جرمنی کے ساتھ لڑائی شروع ہو جانے سے کچھ دیر ہونے کا امکان ہوگیا۔ مگر ایسا ہوا نہیں اور

معلوم ہوا کہ مکان وغیرہ تیار ہو جانے پر ہائی کورٹ بھی کھل جائے گا۔

ویدناتھ بابو نے مجھ سے کہا کہ ایم ایل کا امتحان دینا چاہیئے میں اُس زمانے میں وکالت میں خوب دل وجان سے لگ گیا تھا اور خوب کامیاب بھی ہونا چاہتا تھا۔ میں نے اُن کی بات مان لی۔ ہم دونوں ایک ساتھ ایم ایل کے امتحان کے لئے تیاریاں کرنے لگے۔ کلکتہ یونیورسٹی کے امتحانوں میں یہ سب سے مشکل امتحان سمجھا جاتا تھا ہم دونوں کا کچہری میں کام بھی کافی رہتا تھا۔ اس لئے پڑھنے کا وقت کم ملتا تھا۔ پھر لا کالج میں پروفیسر ہو جانے کے بعد تو میں اور بھی زیادہ وقت کی کمی محسوس کرنے لگا۔ کبھی کبھی اس امتحان کی جھنجھٹ سے بچ نکلنے کا بھی جی چاہتا تھا، مگر ویدناتھ بابو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ بار بار زور دے کر مجھ سے پڑھنے کے لئے کہتے رہتے۔ کبھی کبھی تو جس طرح ماسٹر لڑکوں کو پڑھاتے ہیں۔ اس طرح مجھے پڑھاتے وہ مجھ سے بار بار کہتے "آپ نے انٹرنس سے بی، اے تک سب امتحانوں میں اوّل مقام پایا ہے۔ ایم۔اے میں کچھ نیچے ہوئے اور بی ایل تو جوں توں پاس کیا۔ اِن آخری امتحانوں کا نتیجہ آپ کی طالب علمی کی زندگی کے لئے کلنک ہے۔ اس کو دھو دینا چاہیئے۔ اور وہ ایم ایل پاس کر کے ہی آپ دھو سکتے ہیں" ان سب دلیلوں کا اور ان کی ماسٹری کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم دونوں خوب محنت کرنے لگے۔ خیال ہوا کہ دسمبر ۱۹۱۵ء میں ہونے والے امتحان میں ہم بیٹھیں گے اور ایسا سوچ کر اس کی تیاری کی گئی۔

جتنی محنت میں نے اس امتحان کے لئے کی، اتنی محنت کبھی کسی امتحان کے لئے نہیں کی تھی۔ انٹرنس میں تو گویا بغیر جانے ہی میں کامیاب ہو گیا تھا۔ ایف اے میں اول ہونے کے لئے جان بوجھ کر کوشش کی، مگر پھر بھی اس میں اتنی محنت تو کبھی کی ہی نہیں۔ بی اے میں تو کچھ محنت کی ہی نہ تھی۔ ایم۔اے اور بی ایل کے زمانے میں دوسرے خیالوں میں پھنس گیا تھا۔

لیکن ایم۔ایل کے امتحان کے وقت میں آخری دو تین مہینے میں پندرہ سولہ گھنٹے تک پڑھا کرتا تھا۔کچہری لا کالج (قانون کا کالج) اور امتحان کی تیاری ملا کر اتنی محنت پڑی کہ ایک بار سخت بیمار پڑ گیا اور ڈر ہوا کہ سب معاملہ اب ختم ہو جائے گا۔

مارچ ۱۹۱۶ء سے پٹنہ میں ہائی کورٹ کھلنے والا تھا۔ہم دونوں سمجھ گئے تھے کہ کلکتہ میں رہتے ہوئے اگر ہم نے پاس نہ کیا تو پٹنہ جا کر ہم سے یہ کام نہیں ہوگا، ۱۹۱۵ء کا امتحان ہی ہم لوگوں کے لئے پہلا اور آخری امتحان تھا اس لئے ہم کو ضرور پاس کرنا چاہئے۔امتحان کے وقت ججوں سے کہہ کر کچھ دنوں کے لئے رخصت لے لی۔اپنے مقدّمے ملتوی کرا دئے ہم لوگوں کے مقدّمے اکثر بہار کے ہی ہوتے تھے۔اس لئے کچھ دنوں سے وہ وہاں بھی انہیں ججوں کے یہاں پیش ہوئے تھے۔جن کے پٹنہ آنے کی خبر تھی۔کہنے سے انہوں نے بہ خوشی مقدّمے ملتوی کر دئے۔

امتحان دے کر ہم لوگ ہائیکورٹ کے ساتھ پٹنہ چلے آئے۔امتحان کا نتیجہ پٹنہ آنے کے بعد معلوم ہوا۔ہمیں دونوں پاس ہوئے۔میں فرسٹ کلاس میں پاس ہوا اور وید ناتھ بابو سکنڈ کلاس میں، ہمیں دو بہاری تھے جنہوں نے پہلے پہل یہ امتحان پاس کیا۔بعد کو معلوم ہوا کہ مجھے بہت زیادہ نمبر ملے تھے۔یونیورسٹی کے قاعدے کے مطابق ایم۔ایل امتحان پاس کرنے کے بعد مقالہ خصوصی (تھیسس) لکھ کر ڈی ایل کی ڈگری مل سکتی ہے اور اس طرح آدمی قانون کا ڈاکٹر ہو سکتا ہے۔ہم دونوں پٹنہ میں سوچ بچار کرنے لگے کہ کسی اچھے موضوع پر مقالہ لکھا جائے۔اس معاملہ میں سر گورو داس بنرجی سے بھی ہم ملے تھے اور رائے لی تھی۔

کلکتہ کی وکالت کے کچھ چٹکلے دلچسپ ہیں۔وکالت شروع ہونے کے تھوڑے ہی دن بعد ایک موکل کے مختار میرے پاس ایک اپیل دائر کرانے کے لئے آئے۔ان کی رائے تھی

کہ ایک سینیر بھی رکھیں۔ انہوں نے ایک سینیر وکیل کا نام لیا۔ جن کی وکالت بہت زوروں سے چل رہی تھی اور جن کے ہاتھ میں بہار کے بہت مقدمے رہا کرتے تھے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ ایک بڑے وکیل کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملے گا۔ اُن سے میری ملاقات نہیں تھی۔

ہم دونوں اُن کے گھر پر گئے۔ میں نے کاغذ پڑھ کر اپنی عقل کے مطابق اپیل کی درخواست لکھ لی تھی۔ شام کے وقت ہم دونوں پہنچے۔ وہ کام کر رہے تھے۔ اُن کی عادت تھی کہ رات میں کام نہیں کرتے تھے۔ شام ہوتے ہی کام بند کر دیتے اور پھر دوسرے دن سویرے کام کرتے۔ وہ کاغذ سمیٹ ہی رہے تھے کہ ہم لوگ پہنچے۔ مختار کو وہ پہلے سے جانتے تھے۔ اُن سے پوچھا کہ کیا کام ہے۔ مختار نے کہا کہ ایک دوئم اپیل دائر کرنی ہے۔ انہوں نے دوسرے دن مختار کو بلایا اور کہا کہ کسی جونیر سے درخواست وغیرہ لکھوائی ہے یا نہیں۔ مختار نے کہا کہ سب کچھ تیّار ہے۔ اس پر انہوں نے جونیر کا نام پوچھا۔ میرا نام مختار نے بتا دیا۔ میں تو وہیں چپ بیٹھا تھا۔ انہوں نے مجھے دیکھا بھی یا نہیں، میں نہیں کہہ سکتا۔ وہ بگڑ کر بولے "نہ معلوم کیسا ازنگ وکیل تم نے رکھا ہے جس کو میں جانتا بھی نہیں ہوں۔ سب کام مجھے ہی کرنے ہوں گے۔ وہ کچھ نہ جانتا ہوگا اور نہ سمجھ سکے گا۔" موکل نے کہا "وہ نئے ہیں مگر بہت تیز ہیں۔" اِس پر انہوں نے پھر ازنگ وغیرہ کہہ دیا۔ میں چپ بیٹھا رہا۔ موکل نے تب میری طرف اشارہ کرکے کہا "یہی تو ہیں" یہ سنتے ہی ان کے بدن پر گویا اس سردی کے زمانے میں ہزاروں گھڑے پانی پڑ گیا اور بہت گھبرا کر مجھ سے کہنے لگے۔

"تم کو آتے ہی مجھ سے جان پہچان کر لینی چاہئے تھی۔ میں تم کو جانتا نہیں ہوں، اس لئے کہا کہ کوئی نیا وکیل کام ٹھیک نہیں جانتا ہوگا۔ اور ایسی باتیں کہتے کہتے وہ معافی مانگنے لگے۔"

میں نے کہا کہ آپ کا کہنا تو قدرتی تھا، آپ مجھے جانتے نہیں، اور میں تو ابھی بالکل نوآموز ہوں۔ تب وہ سب حال پوچھنے لگے، اور دوسرے دن کچہری میں ہی کاغذ دکھانے کو کہہ کر ہم دونوں کو رخصت کیا۔ دوسرے دن جب کچہری میں ہی میں نے اپنی لکھی درخواست اُنہیں دکھائی، تب بہت خوش ہوئے اور موکل و دیگر وکلا کے سامنے میری تعریف کے پُل باندھ دئے۔ اس کے بعد مجھے اُن کے ساتھ بہت کام کرنے کا موقع ملا اور مجھے وہ بہت مانتے رہے۔ مجھ سے اُن کی شکایت ایک بات کی رہتی۔ کپڑے پہننے میں لڑکپن سے ہی کچھ اول جلول رہا ہوں۔ وہ اسے ناپسند کرتے تھے۔ اور کپڑے کے بارے میں شوقین ہونے کی ہدایت گاہے بگاہے دیا کرتے تھے۔

اس کے خلاف ایک دوسرا واقعہ ہوا۔ میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ جس سے کوئی کام نہیں پڑتا، اس سے آگے بڑھ کر جان پہچان کرنے کی میری خصلت نہ تھی اور نہ آج ہی ہے۔ اگرچہ میں ڈیڑھ دو برس سے وکالت کرتا تھا۔ پھر بھی ڈاکٹر راش بہاری گھوش سے میری ملاقات نہیں تھی۔ اُن کے خلاف بحث کر کے ایک بڑا مقدمہ تو میں نے جیت لیا تھا مگر اُن کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا۔ ایک مقدمہ میں ایسا موقع آیا۔ دوسری طرف سے سر ایس۔ پی سنہا تھے۔ ہماری طرف سے سر راش بہاری گھوش اور بابو کلونت سہائے تھے، جو بعد کو پٹنہ ہائی کورٹ کے جج ہوئے۔ گیا کا مقدمہ تھا اور گیا کے ایک وکیل بھی آئے تھے۔

بڑے وکیلوں اور بیرسٹروں کا یہ رویہ تھا کہ جب دوسری جانب سے بحث ہوتی تب وہ کسی دوسرے اجلاس میں بحث کرتے اور جواب دینے کے وقت آجاتے۔ بہت مقدمے ہاتھ میں لے لینے کا یہی نتیجہ ہوتا تھا۔ کبھی کبھی وہ نہیں بھی پہنچ پاتے تھے۔ ایسی

حالت میں جونیر کو ہی کام کرنا ہوتا تھا۔ جو مقدمہ میں نے سر راش بہاری گھوش کے خلاف بحث کر کے جیت لیا تھا اس میں ایسا ہی ہوا تھا۔ میرے سینیر صاحب دوسرے اجلاس میں پھنسے تھے، مجھے ہی بحث کرنی پڑی جب دوسرے جانب کی بحث ہوتی رہی اور سینیر وکیل غیر حاضر رہتے، تو جونیر کو بحث کا نوٹ لکھ کر دکھانا پڑتا۔ اسی نوٹ کو پڑھ کر دوسری طرف کی بحث کو وہ سمجھتے اور جواب دیتے۔ یہ کچھ بڑا مقدمہ تھا، جس میں تین چار دن تک بحث ہوتی رہی۔ سر سنہا کی بحث کے نوٹ کرنے کا کام میرا تھا کیونکہ سب سے جونیر میں ہی تھا۔ سر سنہا آہستہ آہستہ اور بہت اچھی طرح بحث کیا کرتے تھے، اس لئے نوٹ لکھنے میں مجھے کوئی خاص تکلیف نہیں ہوئی۔ میں کچھ تیز لکھنے کا عادی شروع سے ہی رہا ہوں۔ کالج میں مسٹر پرسیول بہت تیزی سے پڑھایا کرتے تھے اور میں اکثر سب کچھ نوٹ کر لیا کرتا تھا، اس طرح یہ عادت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ اس میں کافی حوصلہ افزائی ڈان سوسائٹی کی کلاسوں سے بھی ہوئی تھی۔

میں نے سر سنہا کی بحث کا اچھا نوٹ لکھ لیا۔ دن بھر کی بحث ختم ہوئی۔ شام کو ہم سب سر راش بہاری گھوش کے گھر گئے۔ انہوں نے بحث کا سارا نوٹ بہت توجہ سے پڑھا۔ میں کچھ ڈرتا بھی تھا۔ کچھ اشتیاق بھی تھا کہ دیکھیں کیا کہتے ہیں۔ وہ غصّہ ور تھے اور جونیر سے غلطی ہو جاتی تو بہت بگڑ جاتے تھے۔ جج لوگ بھی یہ خوب جانتے تھے۔ کبھی کبھی اجلاس پر ہی ناراض ہو کر کتاب اور کاغذ پٹک دیا کرتے تھے اس سے جونیر بہت ڈرا کرتے تھے۔ میرا تو پہلا ہی موقع تھا پڑھ کر انہوں نے سر اٹھایا اور پوچھا کہ نوٹ کس نے تیّار کیا ہے۔ میں سمجھا کہ شاید بگڑیں گے۔ ان کی مرضی کے مطابق نوٹ تیّار نہیں ہوا ہے۔ بابو کلونت سہائے کے دل میں بھی شاید کچھ ایسا ہی شبہ گذرا۔ انہوں

نے میری طرف اشارہ کر دیا اس پر سر راش بہاری گھوش نے مجھ سے پوچھا۔ کتنے دنوں سے کام کرتے ہو۔ میں تو تم کو جانتا نہیں ہوں، یہ سب باتیں ہوتی جاتیں اور یہاں دل لرز رہا تھا کہ اب کیا ہوتا ہے۔ بابو کلونت سہائے نے کہا، تھوڑے ہی دِنوں سے۔ غصہ کرنے کے بدلے انہوں نے میری پیٹھ تھپکی اور کہا کہ نوٹ اچھا تیار کیا ہے۔ بابو کلونت سہائے کی ہمت پڑی اور انہوں نے میرے یونیورسٹی کے امتحان کا حال کہہ دیا۔ وہ بہت خوش ہوئے اور مجھ سے کہا، ایسے ہی محنت سے کام کرو تم اچھے نکلوگے۔

مجھے بہت اطمینان ہوا۔ اُس کے بعد جب کبھی اُن کے ساتھ کام کرنے کا موقع ہوتا وہ میرے نوٹ پر پورا بھروسہ کرتے اور اُسے ٹھیک سمجھ کر اُس کا پورا استعمال کرتے، اسی مقدمہ میں میں نے ایک اور نظارہ دیکھا۔ انہوں نے ایک بات پوچھی اور جاننا چاہا کہ اس پر کوئی ثبوت ہے یا نہیں۔ میں تو چُپ رہا مگر گیا کے وکیل نے کہا کہ کوئی ثبوت نہیں ہے۔ اس پر اُنہوں نے کہا کہ جب سہانے کہا ہے کہ ثبوت ہے تو ضرور کچھ ہوگا۔ آج رات کو سارے کاغذ توجہ سے دیکھ لو اور تب کل سویرے مجھے جواب دینا۔ دوسرے دن سویرے انہوں نے پھر سوال کیا اور وکیل نے وہی جواب دیا۔ رات کو کاغذ اُنہوں نے پڑھا تھا اور نشان لگا رکھا تھا۔ وکیل کے جواب پر بگڑ گئے۔ کاغذ اور اُن کے بنائے نوٹ پھینک دئے۔

میں تمہارے نوٹ پر اعتماد کر کے بحث کرتا رہا ہوں اب میں کیسے بھروسہ کر سکتا ہوں اپنا لگایا ہوا نشان دکھا کر اور بھی بہت بُرا بھلا کہتے رہے۔ میں نے ایک مقدمہ میں دونوں نظارے دیکھ لئے اور اپنی قسمت کو سراہا کہ مجھ سے غلطی نہیں ہوئی تھی۔

ایم۔ ایل کا امتحان دے چکا تھا۔ نتیجہ معلوم نہیں ہوا تھا۔ پٹنہ آنے میں چند دن باقی رہ گئے۔ ایک چھوٹا مگر پیچیدہ مقدمہ میرے ہاتھ میں تھا۔ اس کی بحث دو ججوں کے سامنے

کرنی تھی جو دونوں پٹنہ آنے والے تھے ۔ ایک ابھی مستقل نہیں ہوئے تھے ۔ تھوڑے دنوں کے لیئے ہی ہائی کورٹ میں گئے تھے اور پھر چند دنوں کے لئے پٹنہ چلے آئے ۔ یہ بحث دو تین دن تک چلی تھی ۔ ہم جیت گئے تھے اور ان پر میری بحث کا اچھا اثر پڑا تھا ۔ اُن کو معلوم ہو گیا تھا کہ میں نے ایم ایل کا امتحان بھی دیا ہے ۔ پٹنہ آ کر ہائی کورٹ کھلنے سے پہلے ہی انہوں نے دوسروں سے میری تعریف کی کہ کلکتہ ہائی کورٹ سے آنے والے وکیل اچھے ہیں اور یہاں کے سینیر وکیلوں کا مقابلہ کر سکیں گے ۔ جب ہائی کورٹ کھُلا تو مجھے اس کا تجربہ بھی ہوا ۔

دوئم اپیل میں صرف قانونی بحث ہو سکتی ہے ۔ واقعاتی امور پر عدالت ماتحت کا فیصلہ مان لیا جاتا ہے ۔ دوئم اپیل چھوٹے چھوٹے مقدموں میں ہی ہوتی ہے ۔ میرے موکل غریب ہوا کرتے تھے ۔ کلکتہ میں زیادہ تر دوئم اپیلیں ہی میرے ہاتھ میں آئی تھیں ۔ اِس لئے اُن کے معاملے میں قانونی بحث ہی کرنے کے لئے مجھے زیادہ قانون پڑھنا پڑتا تھا ۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ ایسے مقدّمے میں دائر ہی نہیں کروں گا ۔ جن میں اچھّی طرح میں خود یہ نہ سمجھ لوں کہ فیصلہ قانونی طور پر غلط ہے اور میں اُسے بحث میں جیت لوں گا ۔ اس لئے دوئم اپیل کے مقدموں میں اکثر جیتا کرتا تھا ۔ پٹنہ آ کر بھی میں نے یہی معمول رکھا ۔

دوئم اپیل میں منظوری کے لئے بحث ہوتی ہے ۔ جب جج سمجھتے ہیں کہ کچھ غلطی ہے یا کم سے کم بحث کی گنجائش ہے تبھی منظور کرتے ہیں اور دوسرے فریق کو حاضر ہونے کا نوٹس دیتے ہیں ۔ پٹنہ کے رجسٹرار ، جو کچھ کم قانون جانتے تھے سبھی دوئم اپیلوں کو نامنظور کر دیتے تھے ۔ میری اپیل بھی نامنظور کر دیتے ۔ مگر قاعدے کی رو سے اُن کو اختیار اتنا ہی تھا کہ اگر وہ کسی اپیل کو قابل منظوری نہ سمجھیں تو اُسے ججوں کے سامنے بھیج دیں ۔ میری بہت سی اپیلیں انہوں نے اس طرح ججوں کے سامنے بھیجیں اور تقریباً سب کی سب وہاں منظور

ہوگئیں۔ وہ جج تو جس کا میں نے ذکر کیا ہے شاید کاغذ بھی نہ پڑھتا تھا میرے کھڑے ہوتے ہی منظور کر لیتا۔ جب رجسٹرار کو بھی یقین ہو گیا کہ میں روپئے لینے کے لئے اُلٹے سیدھے مقدمے دائر نہیں کرتا تب انھوں نے بھی ویسا ہی کرنا شروع کر دیا۔ مجھے یہ بھی تجربہ ہوا کہ جس مقدمہ کو یہ سمجھ کر کہ اس میں جان نہیں ہے میں نہ دائر کرتا، موکل دوسرے وکیل کی معرفت داخل کراتا اور آخر میں ہار جاتا۔

پٹنہ یونیورسٹی بل

۱۹۱۶ء کے مارچ میں پٹنہ میں ہائی کورٹ کھلا۔ سبھی بہاری وکیل جو کلکتہ میں ہائی کورٹ میں کام کرتے تھے۔ اور بہتیرے بنگالی وکیل بھی جن کو بہار کے مقدمے ملا کرتے تھے، پٹنہ چلے آئے۔ میں بھی پٹنہ چلا آیا۔ ان دنوں پٹنہ میں مکان ملنا دشوار ہوگیا۔ کرایہ کا ایک مکان لے کر میں رہنے لگا۔ کلکتہ میں ہی میرے ہاتھ میں مقدمے بہت رہا کرتے تھے پٹنہ آنے پر وکالت اور بھی چل نکلی۔ میں بھی بہت جی لگاکر کام کرنے لگا۔ مگر یہ حال تھوڑے ہی دنوں تک رہا۔

اسی زمانے میں کچھ مہینے بعد پٹنہ میں یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے دلی کی کونسل میں بل پیش ہوا۔ ہم لوگوں نے اس بل کو بہت خراب سمجھا۔ اس لئے اس کے خلاف احتجاجی تحریک شروع کی گئی۔ اس کے پہلے ہی ایک کمیٹی بنی تھی جس نے اپنی رپورٹ پیش کی تھی۔ اس کی خاص سفارشوں میں ایک یہ بھی تھی کہ شہر سے تین چار میل کی دوری پر پھلواری شریف کے نزدیک یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اُس کی عمارتوں کا خرچ بھی کوئی ایک کروڑ کے قریب بتایا گیا تھا۔ کلکتہ میں ہی میں نے اِس کی مخالفت کی تھی۔ پھر جب میں انجمن طلبا بہار کا

صدر ہوا تو اس حیثیت سے بھی اس کی زبردست مخالفت کی ہم لوگ سمجھتے تھے کہ ایسا ہونے سے غریب لڑکوں کے لئے یونیورسٹی کی تعلیم ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہو جائے گی۔ وہاں خرچ بھی زیادہ پڑے گا اور شہر دور ہونے کے سبب سے سبھی لڑکوں کو زیادہ خرچ دے کر ہوسٹل میں رہنا ہوگا۔ وہاں ان کو کوئی آزادی بھی نہیں رہے گی۔ وغیرہ وغیرہ اس مخالفت میں عوام سے بہت مدد ملی تھی۔ وہ منصوبہ ایک طرح سے ملتوی ہو گیا۔ نئے بل کے متعلق دوسرے قسم کی دقّت تھی۔ ہم سمجھتے تھے کہ سینٹ اور سنڈیکیٹ جیسے بننے جا رہے ہیں۔ ویسے بننے سے تو عوام کے خادموں کو اُن میں جگہ ہی نہ مل سکے گی۔ سب سرکاری آدمی ہی ساری یونیورسٹی کو اپنے ہاتھ میں رکھ کر سرکار کی مرضی کے مطابق من مانے طریقے سے چلائیں گے۔

ہمارے سامنے کلکتہ یونیورسٹی تھی وہاں کے وائس چانسلروں نے تعلیم کی تبلیغ کا کام بڑی بے خوفی سے کیا تھا۔ خاص کر سر آسوتوش ہماری آنکھوں کے سامنے تھے مگر وہاں کے سنڈیکیٹ اور سینیٹ اگر آسوتوش کا ساتھ نہ دیتے تو وہ بہت کچھ نہ کر پاتے۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہمارے یہاں پہلے تو اُن کو ایسا آدمی ہی مشکل سے ملے گا اور اگر ملا بھی تو وہ سینیٹ اور سنڈیکیٹ، کی مخالفت کے پیشِ نظر کچھ نہ کر سکے گا۔ اس لئے ہم چاہتے تھے کہ سینیٹ اور سنڈیکیٹ میں معلّموں کے علاوہ دوسرے لوگوں کو عوام کے نمائندوں کی حیثیت سے کافی جگہیں دی جائیں۔

یونیورسٹی کے خلاف بہت بڑی تحریک ہم نے شروع کی۔ اس آندولن میں میرے دوست بابو وید نارائن سنگھ اور میں نے بہت بڑا حصّہ لیا۔ ایک طرح سے اِس کے ناظم ہمیں دونوں تھے ہر ایک ضلع میں جلسہ کیا گیا۔ ہم دونوں نے اخباروں میں کئی مضمون لکھے۔ چونکہ بل دلّی کی کونسل میں پیش ہوا تھا اس لئے ہم نے ضروری سمجھا کہ اور اور صوبوں کے ممبروں کو بھی بہار کی رائے عامہ سے آگاہ کر دیں۔ سبھی نیشنلسٹ اخباروں نے مخالفت کی۔ ہم نے پانچ چھ چھوٹی چھوٹی کتابیں

اس بارے میں لکھیں اور چھپوائیں۔ آخر میں بہار کی صوبائی کانفرنس کا ایک خاص اجلاس کر کے اس پر غور کیا گیا اور سخت مخالفت ہوئی۔ اس جلسہ کے صدر ہوئے تھے پٹنہ کے نامی وکیل رائے بہادر پورنیندر نارائن سنگھ، انہوں نے بڑی نافدانہ تقریر کی اور اسی کے مطابق قرارداد منظور ہوئی۔

اسی درمیان لکھنؤ میں دسمبر ۱۹۱۶ء میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ وہاں ہم سب بڑی تعداد میں گئے۔ اگرچہ یہ بِل ایک خاص صوبہ (بہار) سے تعلق رکھتا تھا، اور کانگریس ایسے ہی معاملوں پر غور کیا کرتی تھی جن کا تمام ملک پر اثر ہوتا تھا پھر بھی میں نے شری سریندر ناتھ بنرجی شری پرانجپے وغیرہ لیڈروں سے کہہ کر اس بل کے خلاف تجویز پیش کرنے کا اہتمام کیا۔ شری پرانجپے نے تجویز پیش کی اور وہ اتفاق رائے سے پاس ہوئی۔ اس طرح بِل کے خلاف ایک طرح کی کل ہند تحریک ہو گئی۔

بل کے پیش کرنے والے ممبر سر سنکرن نائر تھے۔ انہوں نے بہار کے ممبروں سے صلاح کی۔ بل میں کافی ترمیم کی گئی۔ جن باتوں کی زیادہ مخالفت ہوئی تھی۔ اُن میں تبدیلی کر دی گئی۔ مظہر الحق صاحب بہار کے نمائندے تھے۔ وہ ہم لوگوں سے برابر رائے لیتے گئے۔ آخر میں ہمارا مشورہ لے کر بہت بدلی ہوئی صورت میں بِل منظور ہوا۔

یہ پہلا ہی موقع تھا جب میں نے بہار میں سرکار کے خلاف ایک اتنی بڑی تحریک شروع کر دی اور اس میں کامیابی بھی ہوئی۔ اسی زمانے سے میں کانگریس کے کام میں زیادہ حصہ لینے لگا۔ یوں تو میں ۱۹۱۱ء سے ہی برابر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ممبر ہوتا رہتا تھا مگر جب کلکتہ میں تھا کچھ زیادہ کام نہ کر سکا۔ جب بہار میں آیا تو لوگوں کی توجہ میری طرف ہوئی اور میں نے بھی محسوس کیا کہ عوامی کاموں میں کچھ زیادہ دلچسپی لینا ضروری ہے۔ تھوڑے ہی

دنوں میں بہار صوبہ کانگریس کمیٹی کا جوائنٹ سکریٹری بنا دیا گیا۔ اس عہدے پر بھی کئی برسوں تک رہا۔ جب تحریکِ ترکِ موالات شروع ہوئی اور پرانے کانگریسی الگ ہو گئے تب میں سکریٹری ہو گیا۔ جب یونیورسٹی بنی تو گورنر نے مجھے سینیٹ کا ممبر بنا دیا۔

سنہ ۱۹۱۶ء میں بہار کے متعلق ایک دوسری قرارداد بھی منظور ہوئی تھی۔ چمپارن کے نیل والے گوروں کے خلاف، اس کا مفصل ذکر آگے آئے گا۔

ہندی اور کارِ خدمت

کلکتہ سے پٹنہ آنے کے پہلے ایک دو باتیں اور ہوئیں جن کا ذکر مناسب معلوم ہوتا ہے۔ انجمن طلبار کا ذکر تو آہی چکا ہے۔ طالب علمی کا زمانہ ختم ہونے کے بعد بھی، جب میں وکالت کرتا تھا۔ انجمن کے ساتھ میرا تعلّق رہا۔ طلبار بھی مجھ پر بہت اعتماد کرتے، اور میں بھی اپنے کو اُن میں سے ہی ایک سمجھتا۔

انجمن طلبار کے مُنگیر کے جلسہ کا میں صدر بنایا گیا۔ اسی میں یونیورسٹی کے متعلّق نیتھن کمیٹی کی رپورٹ کی مخالفت کی گئی تھی اس کے علاوہ جہاں جہاں اجلاس ہوتا میں جاتا اور دوسری طرح بھی اُس کی تنظیم کی مدد کرتا۔

انہیں دِنوں ہندی کے ساتھ بھی پریم بڑھا۔ سکول میں ایک سال یا دو سال نیچے کے درجوں میں سنسکرت پڑھی اس کے بعد فارسی پڑھنے لگا۔ سنسکرت چھوڑنے کی خاص وجہ یہ تھی کہ بابو جی چاہتے تھے کہ میں وکیل ہوں۔ اُن کا خیال تھا کہ مقدّمے کے کاغذ فارسی میں لکھے ملتے ہیں اسی لئے فارسی پڑھنے سے وکالت میں مدد ملے گی۔

بعد ازاں میں نے گھر پر کچھ سنسکرت پڑھنے کی کوشش بھی کی تھی مگر وہ بہت دنوں

نہ چل سکی۔ اس لئے اسکول اور کالج میں میں نے برابر فارسی ہی پڑھی۔ فارسی میں نمبر خوب آتے تھے اگر فارسی کے نمبر نہ ہوتے تو میں انٹرنس میں اوّل نہیں ہوتا کیونکہ حساب میں مجھے کم نمبر ملے تھے ہندی پڑھنے کا تو کبھی موقع ہی نہیں آیا۔ ہندی کے حروفِ تہجّی جانتا تھا۔ گھر میں ماں وغیرہ رامائن پڑھا کرتی تھیں۔ اس لئے مجھے بھی رامائن پڑھنے کی چاہ ہو گئی تھی۔ بہت دنوں تک تو سویرے رامائن کا پاٹھ کر کے ہی کچھ کھاتا پیتا۔ یہ کاربندی کچھ دنوں تک چلی۔ ہندی کے دوسرے گرنتھوں (مقدس کتابوں) کے دیکھنے کا بھی کبھی موقع نہیں ملا تھا۔

امتحان میں ایک پرچہ آتا تھا جس میں انگریزی سے کسی دیسی زبان میں اور دیسی زبان سے انگریزی میں کچھ ترجمہ کرنے کو دیا جاتا تھا۔ انٹرنس اور ایف۔ اے کے امتحانوں میں میں نے دیسی زباں کے روپ میں اُردو ہی لی تھی۔ بی۔ اے پہنچ کر خواہش ہوئی کہ ہندی لے لوں۔ بی اے میں ایک مضمون بھی لکھنا پڑھتا تھا۔ میں نے ہندی لے لی۔ ہندی میں پاس بھی ہو گیا۔ ہندی سے تعلق اسی طرح ہوا۔

کلکتہ میں ہندی کے مصنّف، عالم، ادیب اور خادم کئی حضرات تھے۔ ان میں سے پنڈت جگناتھ چترویدی بہار کے رہنے والے تھے۔ بہاری کلب میں وہ اکثر آیا جایا کرتے تھے دِشُدھانند سرسوتی ودیالیہ کے پرنسپل پنڈت اُماپتی دت شرما بھی بہاری تھے۔ اُن سے بھی اسی کلب میں ملاقات ہو گئی۔ ان لوگوں کے ذریعے دوسروں سے بھی تعارف ہو گیا۔ کلکتہ میں ہندی ساہتہ پریشد قائم ہوا۔ اُن کے جنم کا سال تو یاد نہیں مگر اتنا یاد ہے کہ اس کے جلسوں میں میں نے کبھی کبھی مقالے پڑھے تھے جن کو عالموں نے پسند کیا تھا، ہم میں سے کچھ کے دل میں خیال گذرا کہ اکھل بھارت درسنہ ہندی ساہتہ سمیلن بھی ہونا چاہیئے اور اس مضمون کے مقالے لکھے گئے۔ ہندی ادب کے خادموں نے اس تجویز کا خیر مقدم

کیا اور کاشی میں پہلا اجلاس ہوا میں بھی اس میں موجود تھا اور محترم مالوی جی صدر ہوئے تھے اس سمیلن کے ساتھ میرا تعلق اس کی ابتدا سے ہی رہا۔

جب تیسرا سمیلن (اجلاس) کلکتہ میں ہونے والا تھا تو میں استقبالیہ کمیٹی کا جنرل سکریٹری بنایا گیا۔ ابھی وکالت شروع کئے مجھے ایک سال بھی نہیں ہوا تھا بہت لوگوں سے جان پہچان بھی نہیں تھی۔ پھر بھی لوگوں کی یہ خواہش ہوئی اور مجھے یہ بار اُٹھانا پڑا۔ اس سلسلہ میں سمیلن کے خاص لیڈروں سے تعارف ہو گیا۔ کلکتہ کے بڑا بازار کے لوگوں سے تو خاص جان پہچان ہو گئی۔ ۱۹۱۲ء کے دسمبر میں کلکتہ میں سمیلن بڑی کامیابی سے پنڈت بدری نارائن چودھری پریم گھن کی صدارت میں ہو گیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے کسی آل انڈیا جماعت کے اجلاس کے اہتمام کا بار اُٹھانا پڑا۔ سخت محنت کرنی پڑی مگر بفضلہ سب ٹھیک ہو گیا۔

ٹھیک اسی وقت پٹنہ کانگریس کا اجلاس ہونے والا تھا۔ بہاری ہونے کی حیثیت سے مجھے شریک ہونا لازمی معلوم ہوتا تھا اور میں چاہتا بھی تھا۔ سمیلن کی تاریخیں بھی ایسی رکھی گئی تھیں کہ کوئی چاہے تو سمیلن کا کام ختم کر کے پٹنہ کی کانگریس میں شریک ہو سکتا تھا مگر استقبالیہ کمیٹی کا جنرل سکریٹری ہونے کی وجہ سے مجھ پر اتنی جواب دہی تھی کہ میں کلکتہ سے نہ ہٹ سکا۔ اس لئے پٹنہ کی کانگریس میں شریک نہ ہو سکا۔

پٹنہ پہنچ کر ہم چند دوستوں نے غریب طلبار کی امداد کے لئے ایک فنڈ کھولا جس سے کچھ طلبار کو مدد دی جاتی تھی۔ یہ کام انجمن طلبار نے ہی شروع کیا تھا۔ مگر بعد ازاں میں نے اُسے اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔

۱۹۱۴ء میں بنگال اور بہار میں زبردست سیلاب آیا۔ پہلا سیلاب بردوان ضلع

میں تھا۔ کلکتہ میں سیلاب زدوں کی امداد کے لئے روپئے جمع کئے گئے۔ بہت سے والنٹیر وہاں گئے۔ اس کی خبریں اخباروں میں خوب چھپیں۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ویسا ہی خطرناک سیلاب پُن پُن ندی پٹنہ میں بھی آگیا۔ ہم نے سوچا کہ سیلاب زدوں کی کچھ مدد کرنی چاہیئے کلکتہ میں ہی کچھ روپئے جمع کئے۔ ساتھیوں کے ہمراہ پٹنہ پہنچا۔ انجمن طلبا بہار کا دفتر تو پٹنہ میں تھا ہی۔ وہاں سے پرجوش ساتھیوں کی مدد لے کر ایک والنٹیر کور قائم کیا سیلاب زدہ جگہوں میں غلّہ لے کر لوگوں کی امداد کے لئے پہنچا، حالت خطرناک تھی۔ کئی گاؤں ایسے تھے جن میں گھروں کے اندر بھی پانی پہنچ گیا تھا۔ جب ہم لوگ پہنچے تو اُن کے گھروں میں جو اناج تھا وہ سڑ رہا تھا۔ اس لئے ہم لوگ تیّار شُدہ کھانا، ستّو، چوڑا، بھُنے ہوئے چنے وغیرہ زیادہ بانٹتے تھے۔ کشتی پر سوار ہو کر دُور تک نکل جاتے تھے۔ شام تک گاؤں گاؤں میں گھوم کر نزدیک کے ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر جا کر سو رہتے۔ مجھے یاد ہے کہ کئی راتیں ہم نے پلیٹ فارم پر سو کر گذاری ہوں گی۔ بہار میں سیوا سمتی کی پہلی تنظیم شائد یہی تھی۔ یہ کوئی باضابطہ تنظیم نہیں تھی۔ وقتی طور پر خدمتِ عوام کے لئے یہ سنگھٹن کر لیا گیا تھا۔ مگر سیوا سمتی کا جنم تو اسی طرح ہو گیا۔ جب ہم پٹنہ آئے تو سون پور کے میلے میں یاتریوں کی مدد کے لئے اس کی باضابطہ تنظیم کر دی گئی۔ سیوا سمتی میں میرے بھائی بہت دلچسپی لیتے تھے۔ ہر سال سون پور کے میلے میں وہ خود بہت خدمت کرتے تھے مرنے کے وقت تک کئی برسوں سے اس کے صدر وہی تھے۔ سیلاب زدوں کی خدمت کرتے وقت اسٹشن کے پلیٹ فارم کی یاد بہت لطیف ہے۔ میں دن بھر کام کر کے سو گیا تھا۔ کچھ دیر کے بعد نیند ٹوٹی۔ معلوم ہوا کہ کوئی آدمی بڑی محبّت سے میرے پاؤں اور بدن دبا رہا ہے اور میری تھکاوٹ دور کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔ دیکھا تو میرے دوست شمبھو سرن تھے

وہ بھی دِن بھر میرے ساتھ ہی کام کر کے تھکے تھے۔ مگر اُنہوں نے اپنی تھکاوٹ کی پرواہ نہ کر کے مجھے آرام پہنچایا۔

گاندھی جی سے ملاقات

۱۹۱۶ء میں لکھنؤ کی کانگریس بڑی دھوم دھام کے ساتھ ہوئی تھی۔ ۱۹۰۷ء سے جب کانگریس میں دو پارٹیاں ہوگئیں اور گرم پارٹی کانگریس سے الگ ہوگئی تب سے کانگریس کی ہر دلعزیزی کم ہوگئی تھی۔ اس کے سالانہ جلسوں میں بھی لوگ کم آیا کرتے تھے یہاں تک کہ ۱۹۱۲ء میں جب پٹنہ میں کانگریس ہوئی ڈیلیگیٹوں کی تعداد بہت کم تھی۔ محبانِ وطن کی کوشش تھی کہ دونوں دل ملا دئے جائیں جس سے کانگریس میں پھر سے جان آجائے۔ یہ کوشش جاری رہی مگر کامیابی ہوئی ۱۹۱۶ء کی کانگریس میں ہی۔ اِس میں سبھی خیالات کے لوگ موجود تھے۔ ایک طرف لوک مانیہ تلک جماعت کی طاقت کے ساتھ آئے۔ دوسری طرف نرم دل کے ساتھ سمجھوتہ بھی ہوا۔ مسلمان بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔ مہاتما گاندھی بھی اِس کانگریس میں آئے تھے وہ ۱۹۱۵ء میں دکھنی افریقہ سے واپس آکر سارے ملک کا دورہ کر رہے تھے۔ مگر اس کانگریس میں وہ کسی قرارداد پر بولے نہیں۔

بہار کے بھی نمایندے اچھی تعداد میں لکھنؤ پہنچے ہوئے تھے۔ اِن میں کچھ لوگ چمپارن کے تھے جن میں ایک دیہاتی کسان راج کمار شکل تھے۔ وہ تھوڑی ہندی

جانتے تھے۔ مگر کوئی اور زبان نہیں۔ یہ اُن لوگوں میں تھے جنہوں نے خود نیل والے گوروں کے ہاتھوں دُکھ اُٹھایا تھا۔ چمپارن ضلع کی ستائی ہوئی رعیت کی طرف سے یہ کانگریس میں پہنچے تھے۔ اُن سے میری ملاقات کچھ پہلے ہی تھی۔ کیونکہ جب کوئی مقدمہ ہائی کورٹ تک پہنچ جاتا تھا، تو میں فیس کا خیال نہ کر کے اُن لوگوں کے وکیل کی حیثیت سے کام کر دیا کرتا تھا مگر اس کام میں بابو برج کشور پرشاد اُن لوگوں کی بہت مدد کیا کرتے تھے، اس لئے اُن لوگوں کی زیادہ واقفیت اُنہیں سے تھی۔ چمپارن ضلع کے احوال سے وہ بہت زیادہ واقف تھے۔

اس زمانے میں بہار کے نمایندے دو معاملوں میں خاص دلچسپی رکھتے اور اُن پر کانگریس سے تجویزیں پاس کرانا چاہتے تھے۔ ایک پٹنہ یونیورسٹی بل اور دوسرا چمپارن میں نیل کی کاشت کا سوال۔ راج کمار شُکل بابو برج کشور پرشاد وغیرہ بہت چاہتے تھے کہ کانگریس اس سوال پر بھی قرار داد منظور کرے۔ بہار صوبائی کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے بابو برج کشور اس مسئلہ پر سخت نکتہ چینی کر چکے تھے۔ اس کانفرنس میں ایک تجویز بھی پاس ہو چکی تھی۔ وہ کونسل کے ممبر تھے۔ انہوں نے وہاں بھی اس معاملہ پر سوال پوچھے تھے، اور ایک تجویز بھی رکھی تھی۔ کونسل میں اور باہر بھی ایک طرح پر اس سوال کو اپنا مقصد بنا کر آئین کے اندر اس پر جو کام ہو سکتا تھا وہ کر رہے تھے۔ جہاں تک ہو سکتا تھا، مقدموں میں بھی وہاں کی رعایا کی مدد کیا کرتے تھے۔

یہ بات بہار کے لوگوں کو معلوم تھی کہ کرم ویر (مردِ میدانِ عمل) گاندھی دکھنی افریقہ میں بہت کچھ کر کے ہندوستان آئے ہیں، اس لئے اُن سے اِس کام میں مدد ملنی چاہیئے راج کمار شُکل وغیرہ اُن سے ملے اور چمپارن کا کچھ حال کہہ سُنایا۔ انہوں نے کچھ دلچسپی ظاہر کی اِدھر سے کہا گیا کہ وہ کانگریس میں ایک تجویز پیش کریں۔ انہوں نے انکار کر دیا، کہا کہ

جب تک وہاں کی حالت وہ خود دیکھ کر اور جانچ کر اپنے آپ کو مطمئن نہ کرلیں گے تجویز پیش نہیں نہیں کرسکتے۔ زور دینے پر انہوں نے کہا کہ وہاں آکر حالت دیکھنے کو وہ تیار ہیں اور کچھ دنوں کے بعد وہاں آئیں گے۔ کانگریس میں تجویز بابو برج کشور نے پیش کی۔ راج کمار شکل بھی اس پر کچھ بولے۔ یہ شاید پہلا ہی موقع تھا کہ ایک دیہاتی کسان کانگریس کے پلیٹ فارم سے کسی تجویز پر بولا۔ کانگریس نے قرارداد منظور کرلی۔

جب بہار کے نمائندے بابو برج کشور کے ساتھ گاندھی جی کے پاس گئے تھے، تب تک میں اُن کے ساتھ نہیں تھا۔ یہ قصہ میں نے بعد کو سُنا۔ میں گاندھی جی کے بارے میں زیادہ واقفیت نہ رکھتا تھا۔ دکھنی افریقہ میں جو کچھ انہوں نے کہا تھا اس کا بھی کم ہی علم تھا۔ صرف اتنا ہی جانتا تھا کہ وہ ملک کے بڑے لیڈروں کی طرح ایک نامی لیڈر ہیں۔ راجکمار شکل نے نہ معلوم کیوں ان پر اتنا اعتماد کیا اور اُن کے پاس پہنچ کر اُن کو چمپارن آنے پر راضی کرلیا۔

لکھنؤ کانگریس سے کچھ دنوں بعد گاندھی جی کلکتہ آئے۔ انہوں نے راج کمار شکل کو خط لکھا کہ کلکتہ میں مجھ سے ملو۔ وہاں سے ہم دونوں ساتھ ہی چمپارن چلیں گے۔ گاوں میں خط دیر سے پہنچا۔ راج کمار شکل کے پاس خط پہنچنے سے پہلے ہی گاندھی جی کلکتہ سے واپس چلے گئے تھے۔ راج کمار شکل نے پھر خط لکھا۔ گاندھی جی نے جواب دیا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس کلکتہ میں ہوگا، وہ اس اجلاس میں موجود ہوں گے۔ راج کمار شکل کو وہاں اُن سے ملاقات کرنی چاہیئے۔ میں بھی اُس اجلاس میں موجود تھا۔ اتفاق سے میں گاندھی جی کی بغل میں ہی ایک کرسی پر بیٹھا تھا مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ راج کمار شکل سے اُن کی خط وکتابت ہوئی ہے اور وہ وہاں سے بہار آنے والے ہیں۔ اپنی عادت سے مجبور

میں کسی سے زبردستی یا آگے بڑھ کر جان پہچان کرنا نہیں جانتا۔ میں نے گاندھی جی سے کچھ نہ پوچھا اور نہ ایک بھی لفظ بولا۔ اس کمیٹی میں لوگوں نے اور خاص کر صدر کانگریس شری امبکا چرن موزمدار نے بہت زور دیا کہ گاندھی جی کانگریس کے سکریٹری ہو جائیں۔ مگر گاندھی جی نے انکار کر دیا۔ میں بیٹھا سب دیکھتا رہا۔ کبھی کبھی میں یہ سوچتا تھا کہ جب لوگوں کا اتنا اِصرار ہے تو ان کا انکار کرنا مناسب نہیں ہے مگر میں کچھ بول نہیں سکتا تھا۔

کمیٹی کا کام ختم ہونے پر گاندھی جی باہر نکلے۔ راج کمار شُکل اُن کا انتظار کر رہے تھے، اُسی رات کو وہ راج کمار شُکل کے ساتھ سیدھے پٹنہ چلے آئے۔ میں کچھ دیر کر کے باہر آیا۔ اِس لئے ان دونوں سے ملاقات نہیں ہوئی۔ گاندھی جی بھی نہیں جانتے تھے کہ میں بِہار کا ہی رہنے والا ہوں اور راج کمار شُکل پٹنہ میں میرے گھر پر ہی ان کو لے جانے والے ہیں۔ اِس لئے وہ بھی مجھ سے کچھ نہیں بولے۔

یہ اجلاس ایسٹر کی تعطیلات میں ہوا تھا۔ میں کلکتہ سے جگنّاتھ پُری چلا گیا، گاندھی جی پٹنہ آ گئے۔ راج کمار شُکل ان کو میرے گھر پر لے گئے۔ مگر وہاں ایک نوکر کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ نوکر نے سمجھا کہ یہ کوئی دیہاتی موکّل آئے ہیں۔ اس لئے ان کو کسی باہر کے کمرے میں ٹھیرا دیا اور کسی طرح کی خاطر تواضع کرنے کے بدلے کچھ بے رُخی سی ظاہر کی گاندھی جی کچھ دیر ٹھہرے۔ اِتنے میں مظہر الحق صاحب کو خبر لگ گئی۔ وہ خود آ کر اُن کو اپنے گھر لے گئے۔ شام کو گاندھی جی مظفر پور پہنچے۔ وہاں آچاریہ کرپلانی کے پاس ٹھہرے، وہاں کچھ لوگوں سے ملاقات کر کے اُن کا ارادہ تھا کہ چمپارن جائیں۔ بابو برج کشور جو دربھنگہ میں وکالت کیا کرتے تھے، تار دے کر بلائے گئے تھے۔

گاندھی جی کا ارادہ تھا کہ وہ چمپارن میں آ کر وہاں کی رعیت سے ملیں اور اُن کی

غم کی کہانی اُنہیں کی زبانی سُنیں مگر وہاں کی دیہاتی بولی وہ سمجھ نہیں سکتے تھے لہٰذا وہ چاہتے تھے کہ کوئی ترجمان کام کرنے کے لئے اُن کے ساتھ جائے۔ اُن کا خیال تھا کہ دو چار دِن میں سب باتیں معلوم ہو جائیں گی۔ راج کمار شکل نے بھی ایسا ہی کہا تھا اس لئے وہ دو چار دِنوں کے لئے ہی تیار ہو کر آئے تھے۔ بابو برج کشور کو ٹھیک اُسی وقت کلکتہ میں کچھ کام تھا۔ وہ خود گاندھی جی کے ساتھ نہ جا سکے مگر اُنہوں نے دو دوستوں کو گاندھی جی کے ساتھ کر دیا یہ دونوں وکیل تھے۔ اُنہوں نے یہ بھی سوچ لیا تھا کہ کلکتہ سے واپسی پر وہ خود چمپارن جائیں گے اور ضرورت ہو گی تو مجھے بھی ساتھ لے جائیں گے۔

ضلع چمپارن کا صدر شہر موتی ہاری ہے۔ گاندھی جی وہاں پہنچے۔ پہنچنے کے بعد اُنہوں نے دیہات میں جانے کا ارادہ کر لیا۔ ایک گاؤں کے ایک باعزت رعیّت آئے جن کا گھر دو چار دن پہلے ہی ایک نیل در (نیل والے) کی طرف سے لُوٹ لیا گیا تھا۔ اس لُوٹ کھسوٹ کے نشان ابھی تک موجود تھے۔ اُنہوں نے سارا قصّہ کہہ سُنایا۔ گاندھی جی وہاں جانا چاہتے تھے۔ راستہ میں ہی کلکٹر کا حکم پہنچا کہ آپ ضلع چھوڑ کر چلے جائیے۔ اُنہوں نے ضلع چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ وہ حکم عدولی کے مقدّمہ کا انتظام کرنے لگے۔ اُسی دن یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مقدّمہ چلے گا۔ میں اُسی دِن پُری سے پٹنہ واپس آیا تھا۔ کچہری میں میرے پاس اُنہوں نے یہ ساری باتیں بذریعہ تار لکھ بھیجیں۔

یہ پہلا ہی موقع تھا جب گاندھی جی سے میرا کسی طرح کا تعلق ہوا۔ میں نے کلکتہ تار دے کر بابو برج کشور کو بُلا لیا۔ دوسرے دن سویرے کی گاڑی سے مسٹر مظہر الحق اور مسٹر پولک ـــــ جو اس وقت ہندوستان میں ہی تھے ـــــ اُسی رات کو گاندھی جی کا تار پاکر پٹنہ پہنچ گئے۔ بابو برج کشور، انوگرہ نارائن اور شمبھو سرن کے ساتھ میں موتی ہاری کے

لئے روانہ ہوگیا۔ ہم لوگ دن میں تین بجے کے قریب وہاں پہنچے اس وقت تک معاملہ عدالت میں پیش ہو چکا تھا بلکہ سماعت کے بعد حکم سنانے کے لئے تین چار دن کے لئے ملتوی کر دیا گیا تھا۔

بابو گورکھ پرشاد کے مکان پر گاندھی جی ٹھہرے تھے۔ ہم لوگ جب وہاں پہنچے تو گاندھی جی وہاں ایک کُرتا پہنے بیٹھے تھے۔ ہم لوگوں سے اُن کا تعارف پہلے سے نہیں تھا۔ جب تعارف کرایا گیا تو مجھ سے ہنستے ہوئے کہا۔

"آپ آگئے، آپ کے گھر پر تو میں گیا تھا"

میں نے کچھ قصّہ سُن رکھا تھا اس لئے قدرے شرمندہ بھی ہوا۔ اُنھوں نے جو کچھ کچہری میں ہوا تھا سب کہہ سنایا۔

'چمپارن میں مہاتما گاندھی' نام کی کتاب میں جو اس تحریک کے کامیابی سے ختم ہونے کے تھوڑے دنوں بعد لکھی اور شائع کی گئی تھی، میں نے چمپارن کا سارا قصّہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ یہاں صرف اپنے متعلق ہی ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

گاندھی جی کو پہلے پہل دیکھ کر میرے اُوپر کوئی خاص اثر نہیں ہوا۔ میں چمپارن کا حال تھوڑا بہت جانتا تھا مگر زیادہ تر بابو برج کشور کی ہدایت مان کر ہی وہاں گیا تھا سوچا تھا کہ جو کچھ کام ہوگا وہ کر دیا جائے گا۔ خواب میں بھی یہ خیال نہ تھا کہ وہاں پہنچتے ہی جیل جانے کا بکٹ سوال ہمارے سامنے آئے گا۔

گاندھی جی نے سب باتیں کہہ کر ہم سے کہا کہ اپنے ساتھی بابو دھرنی دھر اور بابو رام نومی سے اور سب باتیں سن لیجئے۔ اتنا کہہ کر وہ مسٹر پولک سے باتیں کرنے لگے۔ ہم لوگوں نے اُن دونوں بھائیوں سے سارا حال بالتفصیل سُنا۔ معلوم ہوا کہ گاندھی جی تقریباً

ساری رات جاگ کر وائسرائے اور لیڈروں کے پاس بھیجنے کے لئے خط لکھتے رہے ہیں اور کچہری کے لئے اپنا بیان بھی اُنہوں نے رات میں ہی تیار کر لیا تھا۔ اُن دونوں سے جو ترجمان کا کام کرنے آئے تھے گاندھی جی نے پوچھا تھا کہ میرے قید ہو جانے کے بعد آپ لوگ کیا کریں گے۔ وہ لوگ سوال کی اہمیت کو شاید سمجھ نہ سکے تھے۔ بابو دھرنی دھر نے مذاق میں کہہ دیا کہ آپ کے قید ہو جانے کے بعد ترجمان کا کام نہ رہ جائے گا، ہم لوگ اپنے گھر چلے جائیں گے یہ سُن کر گاندھی جی نے سوال کیا۔

"اور اِس کام کو ایسے ہی چھوڑ دیں گے؟"

اِس پر ان لوگوں کو کچھ سوچنا پڑا۔ بابو دھرنی دھر نے جو بڑے تھے، جواب دیا کہ وہ جانچ کا کام جاری رکھیں گے اور جب سرکار کی طرف سے اُن کو بھی نوٹس ہو جائے گا تو وہ چونکہ جیل جانے کے لئے تیار نہیں ہیں خود تو چلے جائیں گے اور دوسرے وکیل کو بھیجیں گے جو جانچ کا کام کریں گے اور اگر اُن پر بھی نوٹس ہو جائے گا تو وہ بھی چلے جائیں گے اور اُن کے پیچھے تیسری ٹولی آئے گی۔ اس طرح کام جاری رکھا جائے گا۔

یہ سُن کر گاندھی جی کو کچھ اطمینان تو ہوا مگر پوری طرح نہیں۔ اُن لوگوں کو بھی تسلّی نہ ہوئی۔ وہ لوگ رات کو سوچتے رہے کہ یہ آدمی نہ جانے کہاں سے آکر یہاں کی رعایا کا دُکھ دُور کرنے کے لئے جیل جا رہا ہے اور ہم لوگ۔ جو یہاں کے رہنے والے ہو کر رعیّت کی ہمدردی کا دَم بھرا کرتے ہیں اس طرح گھر چلے جائیں —— یہ اچھّا معلوم نہیں ہوتا۔

حقیقتاً جیل کی بات ابھی ہم میں سے کسی نے کبھی سوچی بھی نہ تھی۔ جیل تو ایک خطرناک جگہ سمجھی جاتی تھی جہاں سے بچنے کے لئے گرفتاری کے بعد بھی لوگ ہزاروں روپیہ خرچ کر کے ضمانت پر رہائی حاصل کیا کرتے تھے۔ اگر کوئی مجبوری سے جیل گیا بھی، وہاں روپیے

خرچ کر کے آرام کا انتظام کرنا تھا۔ اور یہاں یہ آدمی جو دکھنی افریقہ میں اتنا کام کر آیا ہے۔ اِن انجان کسانوں کی خاطر سب تکلیفیں برداشت کرنے کو تیار ہے ایسی حالت میں بھی ہم گھر چلے جائیں یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ اِدھر بال بچّوں کی بھی فکر تھی۔

رات بھر سوچ بچار کرنے کے بعد دوسرے دن سویرے یہ لوگ جب گاندھی جی کے ساتھ کچہری جا رہے تھے اُن کے جذبات اُمنڈ پڑے۔ اُنہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ آپ کے جیل جانے کے بعد اگر ضرورت پڑی تو ہم لوگ بھی جیل جائیں گے۔

یہ سنتے ہی گاندھی کا چہرہ کھِل اُٹھا۔ وہ بہت خوش ہو کر بول اُٹھے اب معاملہ فتح ہو جائے گا۔ وہاں پہنچتے ہی یہ ساری باتیں ہم لوگوں نے اِن دونوں بھائیوں سے سُنیں۔ اب تو ہمارے سامنے بھی جیل کا سوال آگیا۔ ہم لوگوں نے طے کر لیا کہ ضرورت پڑنے پر ہم بھی جیل جائیں گے۔ یہ تہیہ ہم نے گاندھی جی کو سنا دیا۔ اُنہوں نے کاغذ قلم لے کر سب کے نام لکھ لئے ہم لوگوں کو کئی ٹولیوں میں بانٹ دیا۔ یہ بھی طے کر دیا کہ یہ ٹولیاں کس ترتیب سے جیل جائیں گی پہلی ٹولی کے سردار مظہر الحق صاحب تھے۔ دوسری کے بابو برج کشور۔ ایک ٹولی کا سردار میں بھی بنایا گیا۔ یہ ساری باتیں وہاں پہنچنے کے تین چار گھنٹوں کے اندر ہی طے ہو گئیں۔

مقدّمے میں تین یا چار دِنوں کے بعد حُکم سُنایا جانے کو تھا۔ اُس دن گاندھی جی جیل جانے والے تھے۔ مظہر الحق کے ہاتھ میں کوئی مقدمہ گورکھپور میں تھا وہ وہاں چلے گئے، تاکہ معاملہ ختم کر کے اُس دن کے پہلے ہی واپس آکر رہنمائی کریں، بابو برج کشور بھی اپنے گھر کا اِنتظام کرنے کے لئے دربھنگہ چلے گئے۔ ہم لوگ موتی ہاری میں ٹھہر کر کسانوں کے بیان سننے اور لکھنے لگے۔ خیال تھا کہ جب یہ دونوں صاحبان واپس آجائیں گے تب ہم لوگ بھی ایک ایک کر کے گھر جائیں گے اور گھر کے لوگوں سے مِل جُل کر جیل جانے کی تیاری کر کے واپس آجائیں گے۔

گاندھی جی نے اپنی "آتم کتھا" میں لکھا ہے کہ اس سے وہ مطمئن ہوئے تھے، اور اُسی دن سے بِہار سے اُن کا بہت پریم ہو گیا اور ہم لوگ اُن کے معتمد بن گئے۔

چمپارن کی جانچ شروع ہو گئی۔ ہزاروں کی تعداد میں کِسانوں نے بیان لکھوائے شاید بیس پچیس ہزار بیان ہم لوگوں نے لکھے ہوں گے۔ تاریخ کے پہلے ہی مجسٹریٹ نے لکھ بھیجا کہ سرکار کے حکم سے گاندھی جی پر سے مقدّمہ اُٹھا دیا گیا اور اُن کو ضلع میں جانچ کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ جانچ سے پتہ چلا کہ جو کچھ ظلم ہم نے سُنا تھا وہاں کی حالت اُس سے کہیں زیادہ بُری تھی۔ اگلے باب میں اس کا حال مختصراً بتاؤں گا۔ یہاں اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ پہلی ملاقات میں ہی ہم لوگ اپنی خواہش سے گاندھی جی کے دام میں پھنس گئے۔ جوں جوں دن گذرتے گئے اُن کے ساتھ پریم ہی نہیں بڑھا بلکہ اُن کے طریقِ کار پر اعتماد بھی بڑھتا گیا۔ چمپارن کا معرکہ ختم ہوتے ہوتے ہم سب کے سب اُن کے پکّے معتقد اور اُن کے ضابطۂ عمل کے حامی بن چکے تھے۔

چمپارن

چمپارن ضلع کے انگریز تقریباً سو سال سے نیل کی کھیتی کرتے اور کراتے تھے۔ تقریباً سارے ضلع میں جہاں جہاں نیل ہو سکتی تھی۔ اُنھوں نے اپنے نیل بنانے کے کارخانے کھول لئے تھے اور بہت زمین بھی اپنے قبضہ میں کر لی تھی جس میں وہ خود اپنے ہل بیلوں سے نیل کی کھیتی کراتے تھے۔ ضلع کا بہت بڑا حصہ بتیا راج کی زمینداری میں ہے۔ انہوں نے بہت سے گاؤں کی زمینداری مالگذاری وصول کرنے کا ٹھیکہ راج سے لے لیا تھا، اور اِس ذریعے سے اُن کے گاؤں پر اُن کا قبضہ ہو گیا تھا۔ اِن گاؤں میں رہنے والی رعیت کو بھی وہ مجبور کرتے کہ وہ اپنی زمین میں ان نیل والوں کے لئے نیل بویا کریں آہستہ آہستہ اُنہوں نے اس کو قانونی جامہ بھی پہنا دیا اور یہ دعویٰ بھی کرنے لگے کہ اُن کو اِس بات کا حق ہے کہ رعیت کو وہ مجبور کر سکتے ہیں کہ اپنے کھیت کے فی بیگھہ پانچ کٹھے یا تین کٹھے زمین میں وہ ضرور نیل بوئیں۔ اِس رواج کو وہ پنج کٹھیا یا تین کٹھیا کہتے تھے۔ کسی رعیت کو ہمت نہیں پڑتی تھی کہ وہ نیل بونے سے اِنکار کرے، اگر کوئی ہمت کرتا تو اُس پر ہزار طرح کے ظلم کر کے اس کو مجبور کر دیا جاتا۔ گھر اور کھیت لوٹ لئے جاتے کھیت مویشیوں

سے چرادیا جاتا۔ جھوٹے مقدّمے لگادئے جاتے جرمانہ وصول کیا جاتا۔ پیٹا بھی جاتا۔ اس ڈر کے مارے تقریباً تین کٹھیا مان کر فی بگیھ تین کٹھے نیل بو دیا کرتے۔ اُن کے کھیتوں میں جو سب سے بہتر کھیت ہوتے نیل والے اُنہیں کو چُن کر نیل بونے کے لئے کہتے۔ نیل بونے کا کام کاشتکاری کے اور سب کاموں سے پہلے پورا کرنا ہوتا۔ جب نیل تیّار ہو جاتی تب اُسے کاٹ کر کوٹھی پر پہنچا دینا ہوتا۔ اِس کے لئے وہ رعیت کو کچھ رقم فی بیگھ دیا کرتے تھے جو کبھی خرچ کے لئے بھی پوری نہیں ہوتی تھی۔ سرکار کے افسر اُن گوروں ہی کی مدد کرتے اگر کوئی افسر ہمت کر کے انصاف کرنا چاہتا تو نیل والوں کا اثر اُوپر کے افسروں پر اتنا ہوتا کہ اس ماتحت افسر پر آفت آجاتی۔ جو افسر سچّے ہوتے نیل والوں کے ظُلم اور تین کٹھیا کے خلاف سرکار کے پاس رپورٹ بھیجا کرتے۔ مگر اس سے کچھ ہوتا جاتا نہ تھا۔ کبھی کبھی گھبرا کر رعیت بلوہ کر دیتی۔ کسی نیل والے کو مار دیتی یا لوگ آپس میں مِل کر کسی دوسرے طریقے کا تہلکہ مچا دیتے۔ پھر بھی وہ نیل والوں کا مقابلہ کیسے کر سکتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ گاؤں کے گاؤں لوٹ لئے جاتے۔ پولیس اور کچہری کے عملہ کی مدد سے بے چاری رعیت ہر طرح زیر کر دی جاتی۔

سرکار پر نیل والے گوروں کا اتنا اثر تھا کہ لگان قانون (TENANCY ACT) میں اُنہوں نے ایک دفعہ بنوادی کہ زمیندار کی مرضی کے مطابق جہاں رعیت کوئی خاص فصل بونے کے لئے مجبور کی جاسکتی ہے۔ وہ اگر اس شرط سے وہ اپنا چھٹکارا چاہے تو زمیندار کو حق ہے کہ اس کے بدلے میں جتنا چاہے لگان بڑھا دے۔ معمولی طور پر زمیندار کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ من مانا لگان بڑھا سکے۔ وہ باضابطہ رجسٹری پٹّہ سے پہلے سے دو آنہ فی روپیہ سے زیادہ لگان نہیں بڑھا سکتا تھا اور ایک بار بڑھا دئے جانے پر ایک لمبی مدّت تک

لگان میں پھر اضافہ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ نیل والوں کے فائدے کے لئے یہ حد ہٹا دی گئی تھی۔

بِتیا راج کو روپئے کی ضرورت پڑی۔ اُس نے کچھ قرض لیا۔ یہ قرض نیل والوں کی مدد سے انگلستان سے ملا۔ سود اور اصل کی وصولیابی کے لئے نیل والوں کو گاؤں پر قبضہ دیا گیا اور بہتیرے گاؤں میں اُنہیں مقرری حق مل گیا۔ اس حق کا مطلب یہ تھا کہ وہ ایک طرح سے گاؤں کے زمیندار ہو گئے۔ صرف ایک مقررہ رقم اُن کو ہر سال مال گذاری کے روپ میں راج کو دینی پڑتی۔ اُس گاؤں سے وہ جو چاہیں جتنا چاہیں پیدا کر سکتے تھے۔ راج کا اُس پر کوئی حق نہیں تھا۔ اُسے صرف یہ مقررہ رقم ہی مل سکتی تھی۔ ایسے مقرری گاؤں میں لگان بڑھایا جائے اور ایک کے بدلے دو کی آمدنی ہو جائے تو مقرری دار کی آمدنی بڑھے گی۔ راج کو جو پہلے ملتا تھا وہی ملے گا جن گاؤں میں اِن نیل والوں کو مقرری حق نہیں تھا اُن گاؤں میں ان کو صرف طے شدہ میعاد کے لئے ٹھیکہ ملتا تھا۔ وہاں بھی ایک طے شدہ رقم راج کو دینی پڑتی مگر میعاد پوری ہو جانے پر راج کو اختیار تھا کہ پھر ٹھیکہ دے یا نہ دے اور اگر دے تو نئی شرطوں پر دے اور ٹھیکہ دار جو مال گذاری راج کو دیتا تھا اُسے چاہے تو بڑھا دے اگرچہ شاید ہی کبھی ہوتا تھا کہ کوئی ٹھیکے کا گاؤں نیل والے کے ہاتھ سے میعاد پوری کرنے پر نکالا جاتا ہو یا اُس کی مال گذاری بڑھائی جاتی ہو پھر بھی راج کو اختیار تو ایسا کرنے کا تھا ہی۔

بِتیا کے مہاراجہ مر گئے۔ مہارانی کو پاگل قرار دے کر سارا راج کورٹ آف وارڈس میں آ گیا۔ کورٹ کا ایک منیجر انہیں نیل والوں میں سے مقرر کیا گیا۔ اِس طرح تقریباً بیس سال راج نیل والوں کے ہی قبضہ میں رہا۔ جس زمانے میں گاندھی جی چمپارن پہنچے تھے

اُس زمانے میں ایک سویلین منیجر تھا۔ اس کے بعد کوئی نیل والا پھر منیجر نہیں ہوا۔ اس طرح اپنے کھیتوں میں اور رعیت سے تین کٹھیا کے ذریعہ نیل کاشت کراکر پودے سے نیل تیار کرائی جاتی تھی۔ یہ نیل بونے کی رسم بہار کے دوسرے ضلعوں میں بھی پھیلی تھی مگر اُس کا جتنا زور چمپارن میں تھا اُتنا اور کہیں نہیں۔ اگر نیل کی کھیتی وہ خود کرتے اور رعیت سے زبردستی نیل نہ بوا تے تو ان کو اس میں کوئی فائدہ نہ ہوتا۔ اس لئے یہ زبردستی کی رسم قائم رکھنا ضروری ہو گیا جو رائج رہی۔

اِسی درمیان جرمنی میں دوسری طرح رنگ بنانے کا طریقہ ایجاد کیا گیا۔ جو نیل کے رنگ سے سستا پڑتا تھا۔ نیل کی قیمت گھٹ گئی۔ ظلم اور زبردستی سے پیدا کرائے جانے کے باوجود نیل میں نفع نہیں رہ گیا۔ نیل والوں نے زبردستی اس نقصان کو غریب رعایا کے سر پر ڈال کر اپنا نفع قائم رکھنا چاہا۔ اِس لئے اُنہوں نے قانون کی اُس دفعہ کا سہارا لیا جس میں رعیت کو نیل کی کھیتی سے چھٹکارا دے کر اُن کے لگان میں من مانا اضافہ کرنے کا حق دِیا گیا تھا۔ رعیت سے اُنہوں نے کہا کہ وہ نیل بونے سے اُسے خلاصی دیں گے اگر وہ اضافے کے پٹّے تکمیل دے۔ رعیت یہ جانتی تھی کہ اب نیل والوں کو نفع نہیں رہا اِس لئے اب وہ اِس کاروبار کو خود چھوڑ دیں گے، اِس لئے لگان کا اضافہ قبول کر کے یہ چھٹکارا لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب تک نیل میں منافع رہا تھا۔ تب تک تو نیل والوں نے ان کی ہزار کوششوں پر بھی چھٹکارا انہیں دیا اب اپنے مطلب سے زبردستی رہائی دینا شروع کر دیا۔ ہزاروں کی تعداد میں انہوں نے اپنے مقرری گاؤں کی رعیت سے، جہاں لگان کے اضافہ کا نفع اُن کو ملتا تھا اور بتیاراج کا اس پر حق نہیں پہنچتا تھا۔ اضافہ کے پٹّے تعمیل کرالئے، یہ پٹّے مارپیٹ، جھوٹ فریب اور زبردستی سے تعمیل کرائے گئے۔ اس طرح ان گاؤں میں انہوں

نے لاکھوں کی آمدنی بڑھالی تھی۔ جہاں اُن کا حق صرف ٹھیکہ دار کا تھا اور میعاد پوری ہونے پر اضافہ کا نفع بتیا راج کو ملتا تھا، وہاں لگان میں اضافہ نہ کراکر انہوں نے روپئے وصول کئے جس رعیت کے پاس روپئے نہیں تھے اُن سے ہینڈ نوٹ (پرونوٹ) لکھاکر اور دوسرے طریقوں سے روپئے وصول کئے۔ اس طریقے پر تقریباً بیس پچیس لاکھ روپے وصول کئے۔

چمپارن کا کچھ حصہ ایسا بھی تھا جہاں نیل کی کھیتی ہو ہی نہ سکتی تھی۔ وہاں کے گاؤں میں نیل والے نیل کی کھیتی ہو ہی نہ سکتی تھی۔ وہاں کے گاؤں میں نیل والے نیل کی کھیتی نہ کراکر کسی دوسرے طریقے سے ہی روپئے لیا کرتے تھے۔ اُن گاؤں میں پچاس قسم کے ابواب جو قانون کی رو سے منع تھے، وصول کیا کرتے تھے۔ جب ضلع کے نیل والے حصّہ میں اضافہ یا نقد سلامی وصول ہونے لگی، تب غیر نیل حصّہ میں بھی اُنہوں نے کچھ وصول کرنا چاہا اور وہاں بھی ایک نہ ایک بہانہ لگاکر یا تو لگان بڑھا دیا یا نقد وصول کیا۔

ایک طریقہ لگان بڑھانے کا یہ تھا کہ کسی رعیّت کو پٹّہ دے دیا جاتا تھا جس میں ایسی زمین اس کے ہاتھ بندوبست کی جاتی تھی جو وجود میں ہی نہ تھی۔ یوں ہی نام نہاد چوہدری زمین دے دی جاتی اور اِس کے لئے جتنا اضافہ کرنا چاہتے تھے اتنا لگان رکھ دیا جاتا تھا قانون کے مطابق لگان بڑھانے کی حد روپئے میں دو آنے مقرر تھی۔ مگر نئی زمین کی مال گذاری زمیندار جو چاہے لے سکتا تھا۔ اِس لئے اضافہ کی حدبندی سے نام نہاد نئی زمین بندوبست کرکے وہ اپنے کو بچانا چاہتے تھے اور اُنہوں نے اُمید کی تھی کہ کچھ دنوں میں پُرانی زمین اور نام نہاد زمین دونوں کے لگان اکٹھا کر لئے جائیں گے۔ اس طرح نیل چاہے کوئی بوتا ہو یا نہ بوتا ہوتا، گاؤں مقرّری ہو یا صرف میعادی ٹھیکے میں سب گاؤں سے انہوں نے یا تو لگان بڑھاکر اپنی آمدنی بڑھالی، یا نقد روپئے وصول کرلئے۔ سرکار نے اُن کی پوری مدد کی جب

اضافہ کے پٹّے لکھوائے جا رہے تھے، سرکار نے ان پٹّوں کی رجسٹری کرنے کے لئے خاص رجسٹرار مقرر کر دئے تاکہ رجسٹری میں سہولت ہو جائے۔

یہ سب ابھی پورا ہوا ہی تھا کہ ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء کی جرمن جنگ چھڑ گئی۔ غیر ملکی رنگ آنا بند ہو گیا۔ نیل کی کھیتی میں منافع کی پھر اُمید معلوم ہوئی۔ نیل والوں نے اپنی دی ہوئی خلاصی کی پرواہ نہ کر کے پھر زبردستی تین کٹھیا نیل بونے پر رعایا کو مجبور کیا۔ بہت جگہوں پر اس میں وہ کامیاب بھی ہونے لگے۔ اُس زمانے میں سرکار نے اِس ضلع کو دوبارہ سروے (پیمائش) کرنا شروع کیا۔ یہ کام تقریباً پورا ہونے پر تھا۔ جب گاندھی جی چمپارن میں پہنچے۔ سروے میں رعیت نے شرح بیشی کے پٹّوں کے بارے میں بیان کیا کہ زبردستی اُن سے پٹّے لکھوائے۔ سروے سٹلمنٹ افسر نے فیصلہ دیا کہ پٹّے زبردستی نہیں لکھائے گئے ہیں اس لئے سب اضافے قانون کی رُو سے جائز ہیں۔ رعیت میں بڑی کھلبلی تھی۔ اُدھر جرمن لڑائی چل رہی تھی۔ رعیت کی شنوائی یوں بھی نہ ہوا کرتی۔ اس زمانے میں جب لڑائی میں نیل والے شریک ہو رہے تھے۔ شنوائی کا اور بھی کم موقع تھا۔ رعایا اُکتائی ہوئی تھی اُس کو کہیں کوئی تدبیر نظر نہ آتی تھی تب وہ لوگ گاندھی جی کے پاس پہنچے تھے۔ ایسے موقع پر گاندھی جی وہاں آ گئے۔

گاندھی جی سے جب راج کمار شکل نے چمپارن میں ہو رہے ظلموں کا بیان کیا تو گاندھی جی کو یقین نہ ہوا تھا کہ یہ سب سچ ہے۔ اس لئے وہ جانچ کرنے کے لئے چمپارن آئے تھے۔ اُن کے چمپارن پہنچنے سے پہلے ہی لوگوں میں ایک عجیب بیداری پیدا ہو گئی، وہاں کی رعیّت اس طریقے پر دبائی گئی تھی کہ اُس کی یہ بھی ہمّت نہ ہوتی تھی کہ وہ کچہری میں جا کر نالش کرے اگر وہ کوئی بہت ہمّت کر کے ایسا کرتا بھی تو کوٹھی کا سپاہی اجلاس سے پکڑ کر

اُس کو کھینچ لاتا اور خوب پیٹتا۔ جب گاندھی جی چمپارن کے راستے میں مظفر پور پہنچے، بہتیرے لوگ مظفر پور تک آگئے۔ اُن لوگوں نے اپنا دکھڑا کہہ سُنایا وہاں نیل والوں کی انجمن پلانٹرس ایسوسی ایشن کے سکریٹری اور ترہت ڈویزن کے کمشنر نے گاندھی جی کو چمپارن جانے سے منع کیا اور کہا کہ سرکار خود رعیت کی شکایتوں پر غور کر رہی ہے۔ وہ سروے سٹلمنٹ کی رپورٹ کا انتظار کر رہی ہے۔ انہوں نے اس پر بھی زور دیا کہ اس لڑائی کے زمانے میں آپ وہاں جاکر ہل چل شروع کریں گے تو اچھا نہ ہوگا۔ ہمارے ہم وطنوں نے بھی بتایا کہ جنگ کا نازک زمانہ ہے فساد پیدا ہونا کسی طرح اچھا نہیں مگر جو کچھ گاندھی نے سنا اُن کی خواہش اور بھی تیز ہوگئی۔ انہوں نے تہیہ کر لیا کہ چمپارن جانا ہی چاہیئے۔ گاندھی جی کے چمپارن پہنچتے ہی رعیت کے دل سے ڈر نہ جانے کہاں بھاگ گیا۔ جو عدالت میں بھی جانے سے ڈرتے تھے وہ گاندھی جی کے پاس آکر بہت بڑی تعداد میں اپنا دُکھ بتانے لگے۔ اُن لوگوں کے سیدھے سادے دل پر نہ جانے کہاں سے یہ نقش مسلط ہوگیا کہ اُن کا نجات دہندہ آگیا، اب اُن کا دکھ دُور ہو جائے گا۔

جس دن گاندھی جی پر مقدمہ چلا اور وہ عدالت میں گئے گاؤں سے ہزاروں کی تعداد میں رعیت وہاں آگئی۔ اِتنی بھیڑ ہوگئی کہ عدالت کے دروازے ٹوٹ گئے۔ عدالت میں گاندھی جی نے بیان دے دیا۔ مقدمہ ختم ہوگیا۔ تین چار دن کے بعد گاندھی جی کی رہائی ہوگئی اُن کو یہ اجازت ہوگئی کہ وہ جانچ کر سکتے ہیں۔ اب ہزاروں کی تعداد میں رعیت آگئی۔ سب نے اپنا اپنا بیان لکھایا۔ ہم لوگ بیان لکھنے میں لگ گئے۔ گاندھی جی نے ہم لوگوں کو ہدایت کی تھی کہ تم لوگ وکیل ہو خوب جانچ پرکھ کر اور جرح کر کے بیان لکھنا تاکہ جو باتیں لکھی جائیں وہ سچی ہوں۔ ہم سب کو گاندھی جی کا حکم تھا کہ کہیں کوئی جلسہ کر کے تقریر نہ کرے ہم لوگوں

میں سے کسی نے اِن دنوں چمپارن میں ایک بھی تقریر نہیں کی اور نہ خود گاندھی جی نے ایسا کیا۔

اُن دِنوں مُلک میں ہوم رول کی تحریک خوب چل رہی تھی۔ گاندھی جی ہم لوگوں سے کہا کرتے، تم لوگ ہوم رول کا سب سے بڑا کام کر رہے ہو۔ اگر تم لوگ اس تحریک میں شریک نہ ہوگے تو کوئی حرج نہیں۔

ہم لوگوں کی جانچ کا یہ نتیجہ ہوا کہ چمپارن کے مقامی افسر بہت گھبرانے لگے۔ اُن میں سے کتنوں کے ہی دلوں پر یہ اثر ہوا کہ چمپارن سے انگریزی راج اُٹھا جا رہا ہے۔ لوگ یہ سمجھنے لگے کہ گاندھی جی سب سے بڑے افسر ہیں جس کے سامنے ضلع کے کلکٹر اور مجسٹریٹ کے خلاف بھی شکایت کی جا سکتی ہے۔ نیل والوں کا رعب تو اُٹھ ہی گیا اب ہم افسروں کا بھی رعب اُٹھا جا رہا ہے۔ اس لئے گھبرا کر انہوں نے صوبائی حکومت کے پاس رپورٹ بھیجی۔ صوبائی حکومت نے گاندھی جی کو اپنے ایک ممبر سے ملاقات کرنے کو لکھا۔ وہ پٹنہ آکر اُن سے ملے۔ اُس وقت تک جتنی شکائتیں آگئی تھیں سب کا ایک خلاصہ تیار کر اُن کو دیا سرکاری ممبر نے اُسے سرکار کے پاس پیش کیا۔ اُس پر غور ہونے لگا۔ اِدھر ہمارا جانچ کا کام چلتا رہا۔

ہم لوگ کئی حلقوں میں بٹ کر بیان لکھا کرتے تھے۔ پولیس کے آدمی آس پاس لگے رہتے تھے۔ وہ رعیت کے نام وغیرہ نوٹ کر لیا کرتے تھے۔ اِسی طرح نیل والوں کے آدمی بھی رعایا کے نام وغیرہ جان کر اپنے ملک کے پاس سب باتوں کی رپورٹ پہنچا دیتے۔

جس زمانے میں گاندھی جی پر مقدمہ چل کر فیصلہ کے لئے ملتوی ہو چکا تھا۔ اُسی زمانے میں دین بندھو اینڈریوز آئے۔ وہ اسٹیشن سے ایک یکہ پر آئے۔ اُن کو یکّہ پر چڑھنے کا طریقہ نہیں معلوم تھا اس لئے اُن کے جوتے پہیّے میں لگ کر گھس گئے۔ اِس طرح کا انگریز

جو اول جلول کپڑے پہنے ہو، جو یکّہ پر چڑھتا ہو، اور جو ہندوستانیوں سے کھُل کر مِلتا جُلتا ہو، ہم نے اپنے ہوش میں نہیں دیکھا تھا۔ یہ بھی سُنا کہ وہ ایک بہت معزز آدمی ہیں، جن کی رسائی وائسرائے تک ہے اور جب اُن سے ملاقات ہوئی، اُن کی سادگی اور سچائی کی جو چھاپ پڑی وہ دن پر دن گہری ہوتی گئی۔ میرے ساتھ تو اُن کا گویا ایک طرح کا بھائی چارہ قائم ہو گیا جو اُن کے مرتے دم تک بنا رہا۔

دوسرے دن اینڈریوز جانے سے پہلے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ سے ملنے گئے اُس نے کہا "سرکار کا حکم آگیا ہے کہ مقدمہ اُٹھا لیا جائے میں کچھ دیر کے بعد باضابطہ اطلاع بھیج دوں گا" اینڈریوز نے روانہ ہونے سے پہلے یہ خبر ہم لوگوں کو سنا دی۔ ہم لوگوں کا جوش اور بھی بڑھ گیا۔

نیل والے گورے رعیت کو ہر طرح سے حیران کر رہے تھے۔ مہاتما جی نے سب باتیں سرکار کے پاس بھیجیں۔ اِدھر مجسٹریٹ نے بھی ایک لمبی رپورٹ بھیجی۔ اُس میں لکھا کہ لاقانونی پھیل رہی ہے۔ معلوم ہوتا ہے گویا برطانوی راج اُٹھ جائے گا۔ اِس طرح کے واقعات اکثر ہوتے رہے۔

سرکار نے رپورٹ پر کارروائی کی۔ بہار کے گورنر نے گاندھی جی کو رانچی بلایا گاندھی جی کے رانچی جانے سے ہم لوگوں نے سوچ لیا کہ اب یا تو گرفتار کر لئے جائیں گے یا صوبے سے باہر نکال دیے جائیں گے اور شاید ہم لوگ بھی اب باہر رہنے نہ پائیں گے۔ مہاتما جی نے ہم لوگوں کو بیتیا اور موتی ہاری میں دو ٹولیوں میں رکھ چھوڑا اگر گرفتاری ہونے پر کس طرح سے کیا ہو گا۔ اِس بارے میں اُنہوں نے پورا ضابطہ مرتب کر دیا۔ اپنے اپنے مقام پر ہم لوگ خبر کا انتظار کرنے لگے۔ بیتیا کا دفتر میرے چارج میں رکھا گیا تھا۔ بہت انتظار کے بعد

رانچی سے تار آیا کہ گورنر سے باتیں ابھی چل رہی ہیں۔ دو تین دنوں تک باتیں ہوتی رہیں۔ آخر میں گورنر نے ایک کمیشن مقرر کیا۔ گاندھی جی کو بھی اس کا ممبر بنایا۔ رعیت کی شکائتوں کی جانچ کرنے کا کام اُسی کے سپرد کیا۔ کمیشن نے سرکاری افسروں نیل والوں اور رعیت کے اظہار لئے دوسرے جو کاغذ پیش کئے گئے اُنہیں دیکھا۔ بہتیری کوٹھیوں میں جاکر اُن کے کاغذات دیکھے۔ رعیتوں سے بھی ملے۔

کمیشن کے مقرر ہو جانے پر مہاتماجی کی مرضی کے مطابق رعیت کی طرف سے جو کاغذ پیش ہوئے تھے۔ اُن کو خوب دیکھ کر اور دوسرے ثبوت اکٹھے کر کے ہم لوگوں نے کمیشن کے لئے ایک بیان تیار کیا۔ کمیشن میں سرکاری افسر تھے، نیل والوں کا بھی نمائندہ تھا زمینداروں کا نمائندہ بھی تھا۔ رعیت کی طرف سے نمائندہ خود گاندھی جی تھے۔ جب رپورٹ لکھنے کا وقت آیا، تب ایک زبردست رُکاوٹ آپڑی۔ گاندھی جی کی اور کمیشن کے صدر سر فرینک سلائی کی بہت خواہش تھی کہ رپورٹ اِتفاق رائے سے دی جائے۔ گورنر نے بھی کہا کہ متفقہ رپورٹ ہوگی تبھی اس پر کچھ کرسکیں گے ورنہ کچھ کرنے میں دشواری ہوگی۔

کسانوں کی شکایتوں کا کچھ ذکر اُوپر دیا گیا ہے۔ آخر میں مہاتماجی اور نیل والوں کے درمیان بہت بات چیت کے بعد یہ طے ہوا کہ جو لگان بڑھا دیا گیا ہے اُس کا تھوڑا سا حصّہ چھوڑ دیا جائے جو ایک چوتھائی سے کچھ کم تھا۔ باقی تین چوتھائی اضافہ جوں کا توں رہ جائے۔ جو نقد روپے وصول کئے گئے تھے۔ ان میں سے بھی فی صدی پچیس روپے واپس کئے جائیں اور باقی کو رعیت چھوڑ دے۔ خاص شکائتیں یہی دو کٹھیا اور تین کٹھیا کی رسمیں تھیں۔ دوسری شکائتیں ایسی تھیں جن کا دور کرنا سرکاری افسروں کے ٹھیک کام اور انصاف کرنے پر ہی منحصر تھا۔ یہ ایسی سفارشیں تھیں جو رپورٹ میں اتفاق رائے سے مان لی گئیں۔

پچھلی شکائتوں کے متعلق رپورٹ میں زیادہ نہیں لکھا گیا صرف شکایتوں کا ذکر کر کے، اور نقد تاوان کے روپئے پچیس فی صدی واپس کرنے کے علاوہ تین کٹھیا رسم کے ختم کرنے کی بھی سفارش کی گئی۔

مہاتما گاندھی کے چمپارن جانے کے پہلے ایک جگہ کی گیارہ رعیتوں نے مقدمے بھی دائر کئے تھے۔ نیل والوں نے اپنی طرف سے بہت بڑا بیرسٹر رکھا تھا۔ مقدمہ مہینوں تک پیشی میں رہا تھا۔ آخر میں پانچ میں وہ جیتے تھے اور چھ میں نیل والے۔ اپیل میں تھوڑا بہت ردّو بدل بھی ہوا تھا۔ وہ لاکھوں نہیں تو ہزاروں پٹّوں کے بارے میں اس قسم کے مقدمے کرتے ہوں گے۔ یہ ناممکن تھا۔ اِن دِقّتوں کو خیال میں رکھ کر صلح سے ہی کچھ طے کرنا مناسب سمجھا گیا۔ اس لئے اتّفاق رائے سے رپورٹ تیار ہوئی۔ سرکار نے رپورٹ کی سفارشوں کو منظور کر لیا۔ ایک قانون بنا کر تین کٹھیا کا رواج اُٹھا دیا۔ سب رعیتوں پر اضافہ بھی گھٹا دیا۔ بتیا راج (کورٹ آف وارڈس) کے نیل والوں سے روپئے وصول کر کے فیصلہ کے مطابق رعیت کو تاوان کے روپئے واپس کر دئے۔

چمپارن کی فتح کا اثر

چمپارن کے اس معرکہ میں ہم نے گاندھی جی کے کام کے طرز کو پہلے پہل دیکھا۔ ہم لوگوں کو قومی زندگی کا ایک طرح سے ایک انوکھا سبق پڑھنے کا موقع ملا۔ ہوم رول کی تحریک میں حصہ نہ لینا کبھی کبھی ہم میں سے کچھ کو بہت گراں گذرتا تھا، مگر ہم نے بڑے اطمینان اور پابندی کے ساتھ گاندھی جی کی ہدایت پر کاربندی کی جس کام میں لگے تھے لگے رہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ گاندھی جی کس طرح نیل والوں کو بڑا نقصان پہنچا کر بھی اُن کے دوست بنے رہے۔ اُن میں سے کتنوں ہی کے ساتھ گاندھی جی کا سلوک بہت اچھا رہا۔ وہ لوگ اُن کو اپنے بنگلے پر بلایا بھی کرتے تھے۔ ہاں کچھ ایسے ضرور تھے جنہوں نے اُن کی زبردست مخالفت کی۔ مگر یہ کہنا مبالغہ نہیں کہ آخر میں گاندھی جی سے اُن کا رویہ تلخ نہیں رہا جب کمیشن کا کام پورا ہو گیا، گاندھی جی نے جگہ جگہ اسکول کھولنے کا خیال کیا۔ نیل والوں سے مدد بھی مانگی۔ نیل والوں نے ایک کے سوا۔ کسی قسم کی مزاحمت نہیں کی۔

کمیشن میں جو بات صلح سے طے ہوئی وہ رعیت کی مانگ سے بہت کم تھی مگر اِس ساری تحریک کا یہ نتیجہ نکلا کہ چمپارن سے نیل والوں کا رعب اُٹھ گیا۔ اب اُن میں یہ

طاقت نہیں رہ گئی کہ ظلم کر سکیں۔ رعیت میں ہمت اور جان آگئی۔ اب وہ چُپ چاپ ظلم برداشت کرنے کو تیار نہیں تھے اور بغیر ظُلم کے چمپارن کا کاروبار منافع نہیں دے سکتا تھا۔ وہ ظُلم اب بند ہو گیا۔ نیل والوں نے یہ بات جلد سمجھ لی۔ تین چار برسوں کے اندر سب نے اپنی زمین اور کوٹھیاں بیچ ڈالیں، جو کچھ ملا لے کر چلے گئے۔ اُن کی زمین رعیت کے ہاتھ آگئی۔ اب وہ اُن کو آباد کر رہے ہیں۔ جہاں نیل والوں کے خوب صورت بنگلے اور باغیچے تھے۔ وہاں آج رعیت کے مویشی باندھے جا رہے ہیں۔ اُن ستّر کھپتّر کوٹھیوں میں اکّی دُکّی آج بھی کھڑی ہیں وہاں اب ظلم نہیں ہو سکتا۔ وہ اُس سانپ کی طرح اپنے دن گذار رہے ہیں جس کے دانت توڑ دئے گئے ہیں، جو اَب بھی پھنکار تو سکتا ہے مگر کسی کو کاٹ نہیں سکتا۔

چمپارن میں ہماری زندگی پر بھی بہت بڑا اثر پڑا۔ وہیں ہم لوگوں نے ذات پات کا امتیاز چھوڑا۔ اس زمانے تک میں ذات پات کو بہت مانتا اور اس پر عمل کرتا تھا۔ برہمن کے سوا کسی دوسرے آدمی کے ہاتھ کا چھُوا ہوا دال بھات (چاول) وغیرہ جسے وہ کچّی رسوئی کہتے ہیں، کبھی نہیں کھایا تھا۔ گاندھی جی نے کہا کہ وہاں اگر الگ الگ چوکا کرتے رہو گے تو کیسے کام چلے گا —— جو لوگ ایک ہی کام سے لگے ہیں ماں لو کہ سب ایک ہی ذات کے ہیں۔ پس ہم سب لوگ ایک دوسرے کا پکایا کھانا کھانے لگے، اگرچہ ہم میں کئی ذاتوں کے لوگ تھے۔ زندگی میں سادگی بہت آگئی۔ ہم لوگوں کے ساتھ نوکر تھے۔ وہ سب ایک ایک کر کے ہٹا دئے گئے۔ صرف برتن صاف کرنے کے لئے ایک نوکر رہ گیا اپنے ہاتھوں کنوئیں سے پانی بھر لینا، نہانا، کپڑے صاف کر لینا۔ اپنے جھوٹے برتن دھو لینا رسوئی گھر میں سبزی پکا لینا، چاول دھونا وغیرہ سب کام ہم خود کیا کرتے۔

جہاں کہیں جانا ہوتا تو تیسرے درجہ میں ریل میں سفر کرنا اور جہاں تک ہو سکے پیدل ہی چلنا۔ سب کچھ وہاں ہم نے گاندھی جی سے سیکھا۔ آرام کی زندگی چھوڑ دینی پڑی۔ جب تک ہم چمپارن میں رہے اِسی طرح رہے۔

یہ کام پورا ہونے پر گاندھی جی نے چمپارن کے تین حصّوں میں تین اِسکول کھولے۔ میں اُن اِسکولوں میں سے کسی میں نہ رہ سکا۔ پٹنہ واپس آکر میں پھر اپنی وکالت میں لگ گیا مگر اُن اسکولوں کو دیکھنے کے لئے سال میں ایک دو بار جایا کرتا۔

چمپارن میں دوسرے صوبوں کے کچھ اچھے بے لوث کارکنوں سے بھی ہم لوگوں کی جان پہچان ہو گئی۔ کچھ تو ایسے آئے جو آج تک مُلکی کام میں جوش کے ساتھ لگے ہوئے ہیں اور زمانے کی مُلاقاتیں اور سب تجربے بہت قیمتی نکلے، جن سے آج بھی ہم بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔

چمپارن میں جو فتح ہوئی اس کا اثر بِہار پر بہت پڑا۔ بہار ایک پچھڑا ہوا صوبہ تھا جہاں عوامی زندگی کا سوت بہت پتلا بہا کرتا تھا۔ تعلیم بھی بالکل مفقود تھی۔ سبھی باتوں میں بہار کے لوگ اور صوبے کے لوگوں کے مقابلے میں بہت پچھڑے سمجھے جاتے تھے بہار انگریزی حکومت کی ابتدا سے ہی بنگال کے ساتھ تھا۔ وہ برسوں بنگال کا ایک حِصّہ بنا رہا۔ حتّٰی کہ بِہار کا الگ نام تک لوگ بھول گئے تھے۔ بنگال ترقی یافتہ صوبہ تھا مگر اِس ترقی کا اثر بہار تک نہیں پہنچ پایا تھا۔ انگریز تعلیم میں بھی بِہار اتنا پچھڑا ہوا تھا کہ بِہاری لوگ سرکاری ملازمت میں نہیں پہنچ پاتے تھے، اونچے عہدوں کا تو ذکر ہی کیا۔

بلسویں صدی کی اِبتدا میں ہی کچھ بِہاریوں کے دل میں بِہار کی قابلِ افسوس حالت دیکھ کر درد پیدا ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بِہار کو بنگال سے الگ کرنے کی تحریک شروع ہو گئی۔ اِس

تحریک کے خاص لیڈر بابو مہیش نارائن اور ڈاکٹر سچدانند سنہا مرحومین تھے۔ ڈاکٹر سنہا کی ہی کوششوں سے بہار کانگریس کا ایک الگ صوبہ مانا گیا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں جب شہنشاہ جارج پنجم دلّی میں دربار کے لئے آئے تو بہار کے ایک الگ صوبہ بننے کا اعلان کر گئے۔ یہ اعلان تقسیم بنگال کی تحریک کے نتیجہ کے طور پر ہوا تھا۔ مشرقی اور مغربی بنگال کو پھر ایک کر دیا گیا۔ بہار اور اڑیسہ کو ملا کر ایک الگ صوبہ قائم کر دیا گیا۔ الگ صوبہ کی بات اُٹھتے ہی کچھ نئی زندگی کی نشوونما ہوئی تھی۔ اس کے آثار دیکھنے میں آرہے تھے۔ انجمن طلبا کا ذکر اوپر آچکا ہے۔ بہار صوبائی سیاسی کانفرنس بھی ہر سال ہونے لگی تھی۔ اعلیٰ تعلیم کے خواہش مند طلبا زیادہ سے زیادہ تعداد میں کلکتہ جانے لگے تھے۔ نیا صوبہ بننے کے بعد ہر طرح پر صوبہ بہار آگے بڑھنے لگا تھا مگر یہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی سنہ ۱۹۱۷ء تک خدمتِ وطن کا کوئی منظّم کام باضابطہ طور پر نہیں چلتا تھا۔ اُن دنوں کی کانگریس کمیٹی آج کی کمیٹی کے مقابلے میں ایک کھیل تماشے کی چیز تھی۔ میں اُن دِنوں صوبہ کانگریس کمیٹی کا سکرٹیری تھا۔ نمایندے چُنے جاتے تھے، خاص کر جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر چُنے جاتے تھے، وہی کچھ چندہ دیتے تھے، جس سے صوبہ کانگریس کمیٹی کا کام چلا کرتا تھا اور آل انڈیا کانگریس کا سالانہ چندہ ہمیشہ باقی پڑا رہتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ ان دنون کانگریس کے سکرٹیری شری سُبّاراؤ کبھی کبھی پٹنہ آیا کرتے تھے۔ اُن کے آنے پر خاص خاص لوگ آپس میں مل کر کچھ جمع کرکے دیدیا کرتے۔ نواب سرفراز حسین خاں بہت دنوں تک صوبہ کانگریس کمیٹی کے سکرٹیری رہے۔ میں بھی اُن کے ساتھ سکرٹیری تھا۔ دفتر کا خرچ بسا اوقات ہم دونوں اپنے پاس سے ہی چلا لیتے تھے۔ اِس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ دفتر کا خرچ کچھ بڑی رقم کا تھا۔ صرف ڈاک تار کا ہی خرچ پڑتا تھا جو ہم لوگ آسانی سے کرسکتے تھے۔

ایسی ہی عوامی تنظیم بہار میں اس زمانے میں تھی جب مہاتما گاندھی چمپارن پہنچے۔ اُس زمانے میں شاید ایک بھی ایسا آدمی نہ تھا جو اپنا سارا وقت دے کر وطن کا کام کرتا ہو۔ جو لوگ کانگریس کے ممبر تھے یا دوسرے قسم کے سیاسی لیڈر تھے۔ وہ اپنا اپنا کام کرتے ہوئے ہی خدمتِ وطن کا کام کرتے تھے۔ زیادہ تر ایسی ہی کیفیت دوسرے صوبوں کی بھی رہی ہوگی مگر دوسرے صوبوں میں کچھ کارکن ایسے ضرور تھے جو خدمتِ ملک میں اپنا سارا وقت دیتے رہے۔ مہاتما گاندھی کے ساتھ جتنے لوگ یہاں پہنچے تقریباً سبھی وکالت پیشہ تھے۔ اُن میں سے ایک نے بھی پیشہ چھوڑنے کا ارادہ کر کے اُن کے ساتھ کام شروع نہیں کیا تھا۔ ہم تو یہ سوچ کر گئے تھے کہ چند دنوں میں فرصت ہو جائے گی مگر وہاں پہنچنے پر دیکھا کہ کام بڑھتا ہی جاتا ہے۔ اُس کو پورا کئے بغیر وہاں سے ہٹنا بھی مشکل تھا اس لئے دس پانچ دن کے ارادے سے گئے ہوئے لوگ تقریباً دس مہینے تک چمپارن میں رہ گئے۔ کام پورا ہونے پر جب ہم لوگ اپنے اپنے مقام پر واپس گئے تو اپنے ساتھ نئے خیالات، نیا جوش اور نئے پروگرام لیتے گئے۔ سارے صوبے میں ایک نئی زندگی آ گئی جس کا اثر تھوڑے ہی دنوں میں نظر آ گیا۔ ہم لوگوں میں سے بیشتر کی آنکھیں کُھل گئیں۔ اب ہم سمجھنے لگے کہ جب تک ہم میں سے کچھ لوگ ایسے نہ نکلیں گے جو اپنا سارا وقت دیش کے کام میں لگائیں تب تک بہار کی عوامی زندگی ڈھیلی ہی رہے گی۔

ایک دن گاندھی جی کے ساتھ میں ایک گاؤں سے واپس آ رہا تھا۔ راستے میں باتیں ہونے لگیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ سارے ملک میں گھومتے پھرتے رہتے ہیں۔ کس جگہ کو خدمتِ ملک کے خیال سے آپ سب سے اوپر جگہ دیتے ہیں۔ انہوں نے تقریباً سبھی صوبوں کی باتیں کہیں۔ آخر میں کہا کہ "دیش سیوک کے لئے پونہ تیرتھ استھان ہے" وہاں

ایک شہر کے اندر اتنے بے لوث لوگ ہیں جتنے اور کسی جگہ نہیں۔ وہاں کے ادارے بے لوثی کی نظر سے دیش کے لئے آدرش پیش کرتے ہیں۔ نئے ادارے بھی برابر قائم ہوتے جارہے ہیں۔

ہم نے پہلے بھی فرگوسن کالج کا نام سُنا تھا۔ مہاتما جی سے باتیں کرنے کے بعد اشتیاق اور بھی بڑھ گیا کہ پونا جانا چاہیئے۔ ہم لوگ چمپارن میں ہی بیٹھ کر سوچنے لگے کہ یہاں کا کام ختم کر کے ایک ایسا اِدارہ قائم کرنا چاہیئے جس میں بے لوث اشخاص صرف گذارے کی رقم لے کر دیش سیوا (خدمتِ وطن) میں لگے رہیں۔ خیال ہوا کہ فرگوسن کالج کی قسم کا ایک کالج قائم کیا جائے۔ بابو برج کشور ہی ہم سب کے لیڈر اور جوش دلانے والے تھے۔ انہوں نے اس بات کو اتنی دُور تک بڑھایا کہ ہم لوگوں نے اپنے اپنے نام بھی لکھ دیئے کہ اگر ایسا اِدارہ قائم ہوگا تو ہم بھی گذارے کے قابل رقم لے کر اُسی میں شریک ہو جائیں گے۔ کالج کے لئے روپیہ جمع کرنے کی بھی بات ہوئی۔ کچھ لوگوں سے وعدہ بھی لیا گیا۔

مہاتما جی سے باتیں کرنے پر انہوں نے اِدارے کی بات تو پسند کی مگر اُس کو کالج کا روپ دینا اتنا پسند نہیں کیا۔ ہم لوگ اس موضوع پر سوچ بچار کرتے رہے۔ جب ۱۹۱۸ء میں کانگریس کا خاص اجلاس بمبئی میں ہوا میں وہاں گیا۔ وہاں سے میں پونہ بھی چلا گیا۔ وہاں کے سب اِداروں کو اچھی طرح دیکھا۔ اُن کے متعلق کافی واقفیت بھی حاصل کی۔

کلکتّہ کانگریس سے دِلّی کانگریس تک

۱۹۱۷ء میں جب ہم لوگ چمپارن میں کام کر رہے تھے ملک میں ہوم رول کی تحریک زوروں سے چل رہی تھی۔ میں اُوپر کہہ چکا ہوں کہ مہاتما جی نے ہم لوگوں کو کسی بھی تحریک میں حصہ لینے سے روک رکھا تھا اور کہا تھا کہ چمپارن کا کام ہی ہوم رُول کا سب سے بڑا کام ہے۔ اسی درمیان مسز اینی بیسنٹ نظر بند کی گئیں۔ اِس سے تحریک کو زیادہ طاقت ملی۔ ہم لوگ یہ باتیں اخباروں میں پڑھتے مگر دل چمپارن میں ہی تھا۔ کسی اور بات کی طرف ہم دھیان نہ بٹنے دیتے تھے۔ چمپارن چھوڑ کر بہار کے اور ضلعوں میں ہوم رول کی تحریک چلی۔ میں سمجھتا ہوں کہ بہار میں یہ پہلا ہی موقع تھا جب پڑھے لکھے لوگ گاؤں میں جا کر جلسے کرنے لگے اور عوام سے سیاسیات کی باتیں کہنے لگے۔ اس کا اثر اچھا پڑا۔

اِسی سال بہار کے شاہ آباد ضلع میں ایک بہت بڑا حادثہ ہو گیا۔ بقر عید کے موقع پر گائے کی قربانی کے سبب ہندوؤں اور مسلمانوں میں جھگڑا ہوا اور بات بہت بڑھ گئی۔ ضلع کے بہت بڑے حصّہ میں، آس پاس کے گیا اور پلامو ضلع میں بھی بہت بڑا فساد ہو گیا۔ کچھ دنوں تک تو ایسا معلوم ہوتا رہا کہ گویا انگریز راج ہے ہی نہیں۔ کچھ ہندو پِٹے مگر مسلمانوں کے ساتھ بہت ظلم ہوا۔ بہتیرے مارے گئے۔ بہتیروں کے گھر لُٹے۔ آخر میں جب فوج پہنچی تو ہزاروں ہندو گرفتار ہوئے۔ ان لوگوں پر مقدّمے چلائے گئے جو بہت دنوں تک

چلتے رہے۔ ہزاروں کو سخت سزائیں ہوئیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ پہلے تو مسلمان تباہ ہوئے اور بعد کو ہندو بھی تباہ ہوئے۔ اُس زمانے کے اِس حادثہ کی یاد آج تک دونوں فرقوں کو ہے۔ اُن دنوں پبلک لائف اتنی ترقی پر نہیں تھی کہ دونوں کے درمیان میل کرانے یا فساد روکنے کا کوئی جتن کیا جائے۔ جب مقدمے چلنے لگے تو وکیلوں نے ملزموں کی تھوڑی بہت مدد کی مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں ہوا میرا اس واقعہ سے کوئی براہِ راست تعلق نہ تھا مگر وہاں کی باتوں کا دل پر اثر ضرور پڑا۔

کلکتہ کی کانگریس میں بہار سے خاص کر چمپارن سے۔ ڈیلیگیٹوں کی ایک بڑی ٹولی گئی۔ میں بھی اس ٹولی کے ساتھ وہاں پہنچا۔ سیٹھ جمنالال بجاج نے مہاتما جی کے ٹھہرنے کا انتظام کیا تھا۔ چمپارن کی ٹولی بھی وہیں جا گزیں ہوئی۔ سیٹھ جی سے پہلی ملاقات شائد وہیں ہوئی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے مہاتما جی نے اُس کانگریس میں کوئی خاص حصّہ نہیں لیا۔

جب ہم چمپارن میں تھے تبھی وزیر ہند ماسٹر فانٹیگو کا وہ بیان شائع ہوا جس میں برٹش سرکار کی طرف سے انہوں۔ نے آہستہ آہستہ جمہوری حکومت قائم کرنے کا وعدہ کیا تھا اس کے بعد وہ ہندوستان آئے۔ کچھ دنوں کے بعد ان کی اور لارڈ چمسفورڈ کی ہندوستان کی سیاسی اِصلاحات کی رپورٹ نکلی۔ اس رپورٹ کے نکلنے پر سارے ملک میں غور ہونے لگا۔ سبھی سیاسی ہستیاں اور جماعتیں اپنی اپنی رائے شائع کرنے لگیں۔ بہار میں بھی اس کا چرچا ہونے لگا ہم لوگ چمپارن کے کام سے عہدہ برآ ہو چکے تھے، اِس لئے اُس پر توجہ دینے کا موقع تھا میری اپنی خصلت شروع سے ہی نرم ہے۔ تیز خیالات جلد دل میں پیدا ہی نہیں ہوتے، اِس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے میں اعتدال پسند (ماڈریٹ) پارٹی کا ہی حامی تھا۔ بہار میں اس پر غور کرنے کے لئے صوبائی کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ اُس میں میں نے حصہ لیا مگر میں ہمیشہ تیز خیالات کا مخالف رہا۔ میں سمجھتا تھا کہ ابھی اتنی طاقت نہیں آئی ہے کہ سرکار پر

زور دے کر ہم کچھ کرا سکیں۔ اس بات کا بھی مجھے پورا یقین نہ تھا کہ ملکی حکومت کا اگر سارا بار ہم پر آجائے تو ہم اسے معقول طریقہ پر برداشت کر سکیں گے۔ اس لئے میں اس رپورٹ کو مناسب مانتا تھا۔ میں یہ پسند نہیں کرتا تھا کہ اس پر ایسی تنقید یا حاشیہ آرائی ہو کہ جس سے ہماری بیدلی یا نامنظوری سمجھی جائے۔ صوبائی کانفرنس میں اختلافِ رائے رہا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے یہی رائے منظور بھی ہوئی۔ ہاں جا بجا کچھ اصلاح پیش کی گئی۔

اِسی رپورٹ پر غور کرنے کے لئے بمبئی میں کانگریس کا خاص اجلاس ہوا میں وہاں بھی گیا۔ اپنی عادت اور فطرت کے مطابق میں نے وہاں بھی بحث میں کوئی خاص حصہ نہیں لیا مگر سبجکٹس کمیٹی اور کھُلے اجلاس کی بحثوں کو خوب غور سے سنتا رہا۔ پٹنہ کے مشہور بیرسٹر سیّد حسن امام ہی صدر تھے۔ اُن کی تقریر بہت زبرست ہوئی۔ کانگریس کی کارروائی اُنھوں نے بڑی قابلیت سے چلائی۔ بمبئی میں اُن کا استقبال بھی بہت شاندار ہوا۔ میں نے سبجکٹس کمیٹی میں دیکھا کہ کئی بار ایسا موقع آیا جب دونوں پارٹیوں کے درمیان جھگڑا ہوتے دکھائی۔ ایک طرف سے لوکمانیہ تِلک گرم خیالات کے حامی تھے، دوسری طرف سے اور لیڈر بحث کیا کرتے تھے۔ اِن بڑوں کے جھگڑوں کا نپٹارا بیچ بیچ میں اپنے دو چار لفظوں سے یا بذلہ سنجی سے صاحب صدر کرتے رہے۔

۱۹۱۸ء میں ایک اور اہم واقعہ ہوا۔ جب مہاتما جی چمپارن میں تھے تبھی گجرات کے کھیڑا ضلع کے کسانوں میں لگان کے متعلق تحریک شروع ہوئی۔ مہاتما جی چمپارن آنے سے پہلے ہی سابرمتی میں جھونپڑوں میں ستیاگرہ آشرم ایک طریقہ پر قائم کر چکے تھے، اُن کا خیال تھا کہ چمپارن سے دس پانچ دنوں میں واپس آکر اس کا باضابطہ افتتاح کریں گے۔ مگر جب چمپارن میں رُک جانا پڑا تو انھوں نے وہیں سے خبر دیدی کہ آشرم کے لوگ وہاں کا

کام شروع کردیں۔ مجھے اشتیاق تھا کہ میں بھی جا کر آشرم دیکھوں۔

اپریل ۱۹۱۸ء میں آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمّیلن کا اجلاس اندور میں ہوا۔ مہاتما گاندھی اُس کے صدر ہوئے۔ ہم لوگ بہار سے کچھ نمایندے گئے۔ چمپارن کے بعد ہم یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ مہاتما جی پر ہمارا خاص حق ہو گیا ہے۔ اِس خیال سے ہم لوگ اندور میں صدر کے ساتھ ہی ٹھہرے۔ اس اجلاس میں بڑے موقع کی بات یہ ہوئی کہ دکھنی ہندستان میں ہندی کے پرچار (تبلیغ) کا کام شروع کرنے کا فیصلہ ہوا۔ مہاتما جی کے لئے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ اُنہوں نے چمپارن سے ہی اس کام کو شروع کر دیا تھا۔ ایک بار سوامی ستیہ دیوجی وہیں اُن سے ملنے آ گئے۔ مہاتما جی نے اُن کو رائے دی کہ کچھ دِنوں سابرمتی آشرم میں ٹھہرنے کے بعد وہ دکھنی ہندوستان میں ہندی کے پرچار کا کام اپنے ہاتھ میں لے لیں۔ اندور کے سمیلن سے کچھ پہلے ہی یہ کام دکھنی ہندوستان میں شروع ہو گیا تھا۔ سوامی ستیہ دیو کے ساتھ اُنہوں نے اپنے سب سے چھوٹے لڑکے دیوداس گاندھی کو اس کام کے لئے بھیج دیا۔ اندور کے سمّیلن میں جو کام شروع ہوا وہ آج سارے ہندوستان میں پھیل گیا ہے۔ وہاں لاکھوں مردوں عورتوں نے ہندی سیکھ لی ہے۔

سمّیلن (اجلاس) سے میں مہاتما جی کے ساتھ سیدھے سابرمتی چلا گیا۔ ابھی آشرم کے مکان نہیں بنے تھے۔ بانس کی چٹائیوں کی جھونپڑیاں تھیں اُنہیں میں آشرم والے رہا کرتے تھے۔ مجھے آشرم میں زیادہ ٹھہرنے کا موقع نہیں ملا۔ مہاتما جی جلد ہی کھیڑا کے گاؤں میں چلے گئے۔ وہاں لگان بند کرنے کا کام شروع ہو گیا تھا۔ سردار ولبھ بھائی، شری شنکر لال بینکر، شریمتی انسویا بائی سارابھائی اور دوسرے کارکُن گاندھی جی کی رہنمائی میں وہاں پرچار کا کام کر رہے تھے۔ مجھے مہاتما جی کے ساتھ دو تین دِن تک وہاں کے

گاؤں میں سفر کرنے کا اچھا موقع ملا۔ گجرات کے لوگوں کے ساتھ وہ گہرا تعلق شروع ہوا جس کی بنیاد چمپارن میں گاندھی جی کے ساتھ گئے ہوئے اور اُن کے بھیجے ہوئے لوگوں سے ملاقات ہونے پر پڑ گئی تھی۔ مہاتما جی پیدل ہی سفر کرتے تھے۔ مجھے بھی ویسا ہی کرنا پڑا۔ اِن دنوں وہ جوتے نہیں پہنتے تھے۔ اپریل کے آخر میں گرمی کافی بڑھ گئی تھی۔ ایک دن تقریباً دوپہر ہو چکی تھی۔ ہم لوگوں کو ریتیلے راستے سے جانا تھا۔ ہم لوگ چلے ہی گئے۔ کھیڑا کا ستیہ گرہ کامیاب ہوا۔ چمپارن اور کھیڑا دونوں کا کام تقریباً ایک برس کے اندر ہی ختم ہو گیا۔

میں پھر اپنے وکالت کے کام میں لگ گیا۔ بیچ بیچ میں کانفرنس اور کانگریس میں شریک ہونا وکیل اُن دِنوں اپنا فرض سمجھتے تھے۔ میں بھی اُنہیں میں ایک تھا۔ چمپارن کے بعد خیالات میں بڑی تبدیلی آ گئی تھی۔ اس قسم کے کام کو چھٹیوں کے دِنوں میں صرف تفریح نہ مان کر اس میں زیادہ وقت دینے کی ضرورت محسوس کرنے لگا تھا مگر ابھی کوئی راہ طے نہیں تھی۔ اس لئے پُرانے ڈھرّے پر ہی کام ہوتا رہا۔ اندور کے ساہتیہ سمّیلن بمبئی کانگریس کے خاص اجلاس اور پھر دلّی میں اُس کے دِسمبر والے عام اجلاس میں شریک ہوا۔ بس اتنے ہی میں اپنا فرض پورا سمجھ لیا۔

گاندھی جی کے چمپارن جانے کے بعد بہار کا نام جا بجا سُنا جانے لگا۔ مگر ابھی اُسے کوئی خاص مقام نہیں ملا تھا۔ اسی لئے کلکتہ کی کانگریس میں کوئی الگ جگہ نہ ہونے کے سبب ہم لوگوں کو زیادہ تر گاندھی جی کی ہی چھاؤنی میں ٹھہرنا پڑا۔

دلی کانگریس میں ایک بڑا پُر مذاق واقعہ ہوا۔ ہم لوگ وہاں پہنچے۔ اسٹیشن پر والنٹیر ملے مگر اُن میں سے کوئی یہ نہ بتا سکا کہ بہار کے ڈیلیگیٹوں کے ٹھہرنے کی جگہ کہاں ہے۔ اُن کے سالار نے کہا کہ آپ لوگ پٹودی ہاؤس چلے جائیے۔ ہم لوگ وہاں پہنچے۔ ابھی

تقریباً سویرے کے پانچ بجے تھے۔ کچھ رات تھی، سردی کافی تھی۔ ایک چھوٹے کمرے میں جاکر ہم پندرہ بیس آدمی بیٹھے رہے۔ جب سویرا ہو گیا اور دریافت کیا تو وہاں بھی ہم لوگوں کے لئے کوئی جگہ نہ بتا سکا۔ ہم لوگوں نے سوچا کہ بس اب یہیں ٹھہرنا چاہیئے۔ دو منزلے پر ایک اچھا کمرہ تھا۔ اُسی میں ہم لوگوں نے دخل کر لیا۔ کچھ دیر کے بعد استقبالیہ کمیٹی کے کوئی صاحب آئے انہوں نے حکم دیا کہ ہم لوگوں کو مکان خالی کر دینا چاہیئے۔ یہ پوچھنے پر کہ ہم لوگ کہاں ٹھہریں انہوں نے یہی جواب دینا مناسب سمجھا کہ یہ مکان بنگال کے ڈیلیگیٹوں کے لئے ہے اوپر کا کمرہ شری یُت بی چکرورتی اور شری سی آر داس کے لئے ہے۔ اس لئے ہم کسی دوسری جگہ جاکر ٹھہریں۔ بہت کہنے پر بھی انہوں نے ہمارے لئے کوئی دوسری جگہ ٹھیک کر دینے کا بار اپنے اوپر لینا یا کسی دوسرے کو سُپرد کرنا ضروری نہیں سمجھا۔ ہم لوگوں نے بھی طے کر لیا کہ جب تک کوئی دوسری جگہ ٹھیک نہ ہو جائے ہم بھی ہٹیں گے نہیں۔ کچھ دیر بعد ہم لوگوں کو پھر حکم ملا کہ یہاں سے چلے جائیے، ہم نے صاف انکار کر دیا۔ غصّہ میں آکر اُن صاحب نے حکم دیا کہ اگر ہم اُن کی بات نہیں مانیں گے، تو ہم لوگوں کے لئے استقبالیہ کمیٹی کے چوکے میں کھانے کا انتظام نہیں کیا جائے گا۔ یہ دھمکی ہم لوگوں کو پسند آئی۔ استقبالیہ کمیٹی کو تقریباً دو روپیے روزانہ دینا ہوتا تھا۔ ہم نے فوراً کچھ ہانڈیاں منگالیں اور اینٹوں کے چولھے بناکر کھچڑی پکالی۔ جس میں خرچ شاید چار، چھ آنے سے زیادہ نہ پڑا بس وہیں ہم لوگ جم گئے۔ بہت زور لگایا گیا، مگر جب اپنا خاص چولھا جل چکا تو ہٹتا کون۔ آخر میں لوگ عاجز آکر ہم لوگوں کو چھوڑ کر چلے گئے۔

شری سی آر داس مجھے کلکتہ کی وکالت کے زمانے سے ہی جانتے تھے۔ کچھ مقدّموں میں ہمیں ایک ساتھ کام کرنے کا موقع بھی ملا تھا۔ اُن سے کانگریس میں ملاقات ہوئی۔

ہنستے ہنستے اُنہوں نے کہا "سُنا ہے کہ میرے لئے جو کمرہ تھا، اُس کو تم لوگوں نے زبردستی اپنے قبضہ میں کرلیا ہے"۔ مجھے بہت شرم محسوس ہوئی۔ میں نے سب باتیں کہیں، یہ بھی کہا کہ آپ اگر چاہیں تو ہم لوگ فوراً کمرہ خالی کردیں۔ اُنہوں نے کہا کہ تم نے ٹھیک ہی کیا۔ جب تمہارے لئے کوئی جگہ نہیں تھی تو تم اور کر ہی کیا سکتے تھے؟ اپنے بارے میں اُنہوں نے کہا کہ میرے لئے فکر مت کرو۔ میں بہت آرام سے ہوٹل میں ٹھہر گیا ہوں۔ اِس طرح ۱۹۱۸ء ختم ہوا۔ پھر ہم پٹنہ آکر وکالت کرنے لگے۔

عزیز دوست کی موت

رائے بہادر ہری پرشاد سنگھ تعلیم کے زمانے سے ہی مجھے جانتے تھے جب وکالت شروع کی تو اُنہوں نے مجھے اپنا وکیل بنالیا۔ ہائی کورٹ میں اُن کے جتنے مقدمے جاتے تھے ان میں میں ہی وکیل ہوا کرتا تھا۔ اُن کی بہت بڑی جائداد برما میں بھی تھی۔ اِس جائداد کے متعلق ڈمراؤں کے مہاراجہ بہادر نے عدالت میں دعویٰ کر دیا۔ ان کی جو کچھ جائداد بہار میں تھی اُسے بھی اس دعوے میں شامل کر لیا۔ دونوں طرف سے کئی بڑے بڑے اور نامی وکیل رکھے گئے۔ مجھے بھی بابو ہری جی نے کام کرنے کے لئے کہا۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں درگاپوجا کی تعطیلات میں وہیں کاغذات پڑھتا رہا۔ میرے دوست بابو وید ناتھ نارائن سنگھ بھی تعطیلات میں الہ آباد ہی میں دارا گنج میں کرایہ پر ایک مکان لے کر اپنے خاندان کے ساتھ دن گذار رہے تھے۔ ہم دونوں اکثر صبح و شام ٹہلنے کے وقت ملا کرتے تھے۔

ایک دن دوپہر کو ہی وہ میرے یہاں چلے آئے۔ بہت طرح کی باتیں کرنے لگے تقریباً شام تک میں مقدمے کا کچھ کام نہ کر سکا چلنے کے وقت پھر دوسرے دن آنے کو کہہ گئے۔ دوسرے دن پہلے دن سے بھی جلد چلے آئے۔ پھر بہت سی بے تُکی باتیں کرتے رہے مجھے شبہ

گذرا کہ اِن کا مزاج درست نہیں ہے۔ میں نے ایک دوست کے خبط کے مرض کی ابتدا دیکھی تھی۔ ایسی ہی علامتیں اِن میں بھی دکھائی دینے لگیں۔ جاتے وقت میں بھی اُن کے ساتھ ہولیا۔ اُن کے گھر تک ساتھ گیا۔ وہاں پوچھنے سے معلوم ہوا کہ کئی دنوں سے رات کو وہ سوتے بہت کم ہیں اور اِسی طرح دن رات کچھ بولتے رہتے ہیں میرا خوف اور بھی بڑھ گیا تیسرے دن تو یہ دیکھا کہ وہ بالکل پاگل ہو گئے ہیں۔ میں اُن کے ہی ساتھ رہنے لگا اور اُن کے بھائی کو تار دے کر بلا لیا۔ دن پر دن اُن کی حالت بگڑتی گئی۔

ایک دِن انہوں نے اپنا بکس کھول کر وکالت کا گاؤن (چُغہ) نکالا اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر کے پھاڑ ڈالا۔ یونیورسٹی کے کسی امتحان میں انہیں سونے کا ایک تمغہ ملا تھا۔ اُسے انہوں نے اِسی طرح نکال کر پھینک دیا۔ اپنی چھوٹی بچّی کو جو اُن کی سب سے چھوٹی اولاد تھی ایک دن مار ڈالنے پر اُتر آئے۔

ہم لوگ بہت گھبرائے۔ وہاں جو کچھ علاج ہو سکا کیا گیا۔ مگر رائے قرار پائی کہ انہیں پٹنہ لے چلنا ہی اچھا ہوگا۔ دو چار دِنوں میں کچھ اچھے ہوتے معلوم ہوئے۔ ایک دن یہ طے ہوا کہ میں اُن کے ساتھ پٹنہ چلا جاؤں اور اُن کے چھوٹے بھائی جگنا تھ جی اہلِ خاندان کو لے کر دوسرے دن پٹنہ پہنچیں۔

ہائی کورٹ کی تعطیلات ختم ہو گئی تھیں۔ پٹنہ پہنچنا ہم دونوں کے لئے ضروری ہو گیا تھا۔ چُھٹیوں میں برابر الہ آباد میں رہنے کے باعث گھر کے لوگوں سے میں ملا بھی نہ تھا۔ کیونکہ میرے خاندان کے لوگ چھپرا میں یا میرے گاؤں زیرا دیئی میں بھی رہا کرتے تھے۔ میرے ساتھ پٹنہ میں نہیں۔ میں سوچتا تھا کہ دو چار دنوں کے لئے چھٹّی کے آخر میں گھر جا کر اُن سے مِل آؤں مگر وید ناتھ بابو کی خرابی صحت کے باعث یہ خیال چھوڑ دینا پڑا۔

جب ہم دونوں الٰہ آباد سے پٹنہ کے لئے روانہ ہوئے تب ویدناتھ بابو بالکل صحت مند سے معلوم ہوتے تھے۔ کپڑے وغیرہ ٹھیک سے پہن کر ہوش کی باتیں کرتے کرتے میرے ساتھ ریل پر سوار ہوئے۔ راستہ میں انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں گھر جانا چاہتا تھا تو اس خیال کو کیوں چھوڑ دیا اور کہا کہ اب طبیعت بالکل ٹھیک ہو گئی ہے۔ کوئی فکر کی بات نہیں ہے۔ جو کچھ ہوا تھا اُسے یاد کر کے انہوں نے افسوس اور شرم کے جذبات ظاہر کئے اور مجھ سے کہا کہ میں سیدھے گھر چلا جاؤں اور وہ پٹنہ چلے جائیں گے۔ اِس میں کوئی ہرج نہیں ہے۔

میں اُن کی باتیں سُن کر بہت خوش ہوا اور یقین ہوا کہ اُن کی طبیعت بالکل ٹھیک ہو گئی ہے۔ میں اس وقت تک پاگل پن کے سنبھالے کا مطلب نہیں جانتا تھا۔ کاشی کے اسٹیشن پر اُن کو پٹنہ کی گاڑی میں سوار کرا کر میں چھپرا کی گاڑی سے چھپرا چلا گیا۔ وہ دوسرے دن سویرے جب پٹنہ پہنچے تو ان کی حالت پہلے کی طرح بالکل ایک پاگل جیسی ہو گئی تھی۔ اسٹیشن کے کارکنوں نے انہیں پہچانا۔ ایسی حالت میں ان کو اکیلا دیکھ کر کچھ دوستوں کو خبر دی کہ وہ لوگ آئے اور ان کو کسی طرح گھر لے گئے۔ دوسرے دن جب میں پٹنہ واپس آیا تو میں نے ان کو بُری حالت میں پایا۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ میں نے بڑی غلطی کی۔ اُن سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بڑی ہنسی اُڑائی اور کہا کہ آپ اپنے کو بڑا ہوشیار سمجھتے ہیں۔ مجھے پہرے میں رکھنے کے لئے جگن ناتھ جی کے ساتھ سازش کر کے میرے ساتھ آئے تھے۔ کیسا چکمہ دے کر بے وقوف بنایا۔ اتنا کہہ کر ہنسنے لگے۔ پھر وہی بے تُکی بک جھک شروع کر دی۔

پٹنہ میں بھی ہم لوگ برابر دیکھ بھال کرتے رہے مگر وہ کبھی پوری طرح صحت یاب

نہیں ہوئے۔ کبھی کبھی اچھے ہو جاتے۔ یہاں تک کہ وہ ہائی کورٹ میں بھی جانے لگے پٹنہ لاء کلی جسے میں اور وہ دونوں ساتھ مل کر نکالا کرتے تھے۔ نکال بھی دیتے مگر بیماری جوں کی توں بنی رہتی۔ کچھ دنوں کے بعد یکایک اُن کی موت ہو گئی۔ اُن کی موت کا صدمہ میرے دل پر بہت پڑا مگر وہ جس حالت میں تھے اُس حالت میں رہنے سے کہیں اچھا مرجانا ہی تھا۔ اُن کے لئے یہ موت ایک طرح کی نجات ہی تھی۔ اُن کو جتنا میرے ساتھ پریم تھا اور اُنہوں نے جتنا مجھ پر کرم کیا تھا جب وہ یاد آتا ہے تو آج بھی دُکھ ہوتا ہے، اور اس بات کا پچھتاوا ہوتا رہتا ہے کہ اُن کے لئے یا اُن کے خاندان کے لئے میں کچھ بھی نہ کر سکا۔

پہلی جنگِ عظیم کے بعد

۱۹۱۸ء کے نومبر میں یوروپ کی پہلی جنگ عظیم ختم ہوگئی۔ ۱۹۱۷ء سے ہی ہندوستان میں سیاسی بیداری کی لہر دوڑنے لگی تھی۔ چمپارن میں گاندھی جی کی تشریف آوری اور رعیت کی خدمت کرنے کا اثر چاروں طرف پڑ رہا تھا اگرچہ اخباروں میں چھپنے کے لئے بہت کم خبریں بھیجی جاتی تھیں اور کہیں بھی لکچر دینے کی ہم لوگوں کو ممانعت تھی۔ ڈاکٹر اینی بیسنٹ نے ہوم رول لیگ قائم کرکے سارے ملک میں ۱۹۱۷ء میں ہی بڑی ہل چل مچادی تھی۔ تقریباً سبھی صوبوں میں اس کی شاخیں قائم ہوگئی تھیں۔ لوگ خوب زوروں سے تبلیغی کام میں لگ گئے تھے سرکار اِس سے کچھ گھبرا سی گئی۔ اُس نے ڈاکٹر اینی بیسنٹ کو اُن کے دو ساتھیوں کے ساتھ نظربند کر دیا تھا۔ اس پر تحریک نے اور زور پکڑا۔ برٹش سرکار اپنی دو دھاری پالیسی ۱۹۱۷ء میں بھی چلا رہی تھی۔ ایک طرف تو اُس نے اِس طرح تحریک کی خاص رہنما کو نظربند کیا دوسری طرف پارلیمنٹ میں نئے مقرر شدہ وزیر ہند مسٹر مانٹیگو نے ایک اعلان کیا جس میں وعدہ کیا گیا کہ ہندوستان کو آہستہ آہستہ حکومت کا حق دیا جائے گا مگر کیسا اور کتنا حق ہندوستانیوں کے ہاتھ آئے گا۔ اس کا فیصلہ پارلیمنٹ ہی کر سکے گی۔ اِس کے بعد مسٹر مانٹیگو ہندوستان آئے۔ یہاں کے وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ کے ساتھ ہندوستان

کے لیڈروں سے ملے۔ دونوں نے مل کر ایک رپورٹ تیار کی جس کی بنیاد پر پارلیمنٹ نے ۱۹۲۰ء میں ایک قانون پاس کیا۔ مسز اینی بیسنٹ بھی کچھ دنوں کے بعد رہا کر دی گئیں۔ وہ ۱۹۱۷ء میں کلکتہ میں ہونے والے کانگریس کے اجلاس کی صدر چُنی گئیں۔ جوش بہت تھا۔ ہم لوگ بھی چمپارن سے گاندھی جی کے ساتھ ہی کلکتہ گئے تھے۔ سیٹھ جمنالال جی سے یہاں پہلا تعارف ہوا۔ اُنہوں نے ہی گاندھی جی کے رہنے وغیرہ کا انتظام کیا تھا۔ اسی مکان میں گاندھی جی کے ساتھ کام کرنے والے ہم بہتیرے بہاری لوگ سیٹھ جی کے مہمان بنے۔ بہت سے دوسرے بہاری بھی ہم لوگوں کے ساتھ ہی آکر ٹھہرے، اور وہ ہم مہمانوں کے بھی مہمان ہو گئے۔ جمنالال جی کی میزبانی قبول کرنے کا پہلا موقع وہیں ملا۔

جرمن جنگ کے زمانے میں ہندوستان نے حکومت کی اِمداد کی تھی۔ اس کی تعریف سبھی سرکاری کارکن بہت زوروں سے کیا کرتے تھے۔ مگر کچھ امداد لوگوں نے یا اُن دنوں کی کونسل نے اپنی خوشی سے کی تھی۔ اس کے علاوہ اور زبردستی بھی بہت مدد لی گئی تھی جس کی وجہ سے ملک میں بہت بے چینی بھی پھیلی تھی۔ پنجاب میں اُن دنوں لفٹنٹ گورنر تھے سر مائیکل اوڈوائر۔ وہ ایک بڑے زبردست سویلین تھے۔ انہوں نے رنگروٹ بھرتی کرانے میں اور چندہ جمع کرنے میں بڑی سختی سے کام لیا تھا۔ اِس کا اثر پنجاب پر بہت بُرا پڑا۔ وہاں کے لوگ۔ ہندو مسلمان اور سکھ بہت ہی دکھی تھے۔ سرکار بھی جانتی تھی کہ پنجاب کے علاوہ اور جگہوں میں بھی بے اطمینانی بہت ہے۔ لڑائی شروع ہوتے ہی کچھ ہندوستانی جو غیر ملکوں میں تھے اس کوشش میں لگ گئے تھے کہ ہندوستان میں اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر انقلاب کیا جائے۔ اُنہوں نے اِس کے لئے کچھ کام کیا بھی تھا۔ مسلمانوں میں اِس بات سے بہت کھل بلی مچی تھی کہ اُن کے خلیفہ، ترکی کے بادشاہ لڑائی میں جرمنی کی طرف

ہو گئے تھے اور ترکی فوج سے مقابلہ کرنے کے لئے ہندوستانی فوج بھیجی گئی تھی جس میں مسلمان بھی اچھی تعداد میں تھے۔ برٹش سرکار ان سب وجہوں سے متاثر ہو کر اپنی دُہری پالیسی پر چلتی رہی۔ مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لئے انہوں نے کئی وعدے کئے، جن میں اُن کے مذہبی مقاموں کے محفوظ رکھنے اور ترکی کی طاقت اور اس کی حکومت کو زیادہ نقصان نہ پہنچانے کی بھی باتیں تھیں۔ دوسری طرف سرکار یہ سوچ رہی تھی کہ ڈیفنس آف انڈیا ایکٹ (قانون تحفظ ہند) کو جو لڑائی کے ختم ہونے کے چھ مہینے بعد تک ہی جاری رہ سکتا تھا۔ اُس کی ضرورت بعد میں بھی پڑے گی، کیونکہ اگر وہ نہ رہا تو جتنے لوگ نظر بند ہیں اُن کو چھوڑنا پڑے گا اور اگر بے اطمینانی نے کوئی بھیانک صورت اختیار کی تو اُسے سنبھالنے کے لئے کچھ ایسا انتظام کرنا ہوگا جس سے عدالت میں پیشی ہونے پر گواہی فراہم کرنے کے جھنجھٹ سے وہ بچی رہے۔ اِس لئے ایک کمیٹی مقرر کی گئی تھی جس کے پردھان تھے۔ سر سِڈنی رولٹ جو لندن کے ہائی کورٹ میں جج تھے۔ اِس کمیٹی نے ایک رپورٹ مرتب کی جس میں ہندوستان کی سازشوں کی تاریخ دیتے ہوئے اِس بات کی سفارش کی گئی کہ ایک ایسے قانون کی ضرورت ہے جس کے ذریعے سرکار کے ہاتھ میں سازشی لوگوں کو بلوہ کرنے سے روکنے اور انقلاب سے ہندوستان کو محفوظ رکھنے کے لئے پورا قانونی اختیار رہے یعنی تقریباً وہ سب اختیار قائم رہیں جو لڑائی کی نازک حالت سنبھالنے کے لئے قانون تحفظ ہند کے ماتحت دئے گئے تھے۔ اِس طرح ایک طرف مانٹیگو چمسفورڈ ریفارم اسکیم (منصوبہ اصلاحات) ۱۹۱۸ء کے بیچ میں اور دوسری طرف رولٹ رپورٹ بھی ۱۹۱۸ء کے آخر میں شائع ہوئی:

رولٹ بِل کے خِلاف تحریک

رولٹ رپورٹ کے شائع ہوتے ہی سارے ملک میں بڑی بے چینی پھیلی جس نے پہلے سے سلگتی ہوئی بے چینی کی آگ میں گھی کا کام کرکے اُسے زوروں سے مشتعل کردیا۔ چمپارن سے واپس آنے کے بعد میں وکالت میں لگ گیا تھا۔ چھ سات آٹھ مہینے کی غیرحاضری کے بعد بھی اس میں کسی طرح کی کمی نہیں آئی تھی۔ سنہ ۱۹۱۸ء اور سنہ ۱۹۱۹ء میں زوروں سے ہائیکورٹ میں کام کرتا رہا۔ مقدمے اور روپئے بھی خوب ملتے رہے۔ گاندھی جی نے چمپارن میں ہی ہم لوگوں سے ایک بار کہا تھا کہ ہم لوگ اگر چمپارن میں سچائی کے ساتھ کام کریں گے تو ایک طرح کی پونجی کما لیں گے جِس سے آگے بہت فائدہ اُٹھا سکیں گے۔ وہاں پوری سچائی کے ساتھ کام ہوا۔ آج بھی جب میں پچھلے پچیس برسوں کی اپنی زندگی پر غور کرتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں کی کمائی ہوئی پونجی روز بروز بڑھتی گئی ہے۔ کبھی کبھی یہ جان کر بڑا اطمینان ہوتا ہے کہ وہاں گاندھی جی نے جو سچائی کا سبق پڑھایا تھا اُسی کا یہ ایک نتیجہ ہے کہ اپنی زندگی میں بہ ادائے فرض جس کی سختی سے سخت مخالفت کرتا ہوں وہ بھی میرے کہنے پر یقین رکھتا ہے۔ مگر اِس طرح قومی زندگی میں سچائی سے جو فائدہ ہوا ہے اُس کے علاوہ وکالت کے

کام میں بھی ہمیشہ فائدہ ہی ہوا ہے۔ کچھ فائدہ اپنے پیشہ میں کامیابی کی صورت میں اور اس کے نتیجہ کے طور پر روپئے کمانے کی شکل میں ہوا ہے مجھے اس بات پر فخر رہتا ہے کہ وکالت کے زمانے میں ججوں نے مجھ پر اعتماد کیا۔ ایک انگریز جج تو کبھی کبھی ایسا مذاق کیا کرتا تھا کہ مخالف وکیل اگر کم زور ہوتا تو وہ مجھ سے ہی کہتا کہ تمہیں اپنے خلاف جو سب سے خراب نظیر ہو وہ بتا دو میں اس کے لئے تیار بھی رہا کرتا تھا۔ اس نظیر کو پیش کر کے اس کی تردید میں جو نظیر پیش کرنی ہوتی تو وہ بھی پیش کر دیتا تھا۔ میں کبھی لچر دلیل پیش نہیں کرتا تھا۔ جس مقدمے میں بحث کی گنجائش نہ رہتی اسے کبھی لیتا ہی نہ تھا۔ موکل سے صاف صاف کہہ دیتا تھا کہ اس میں کچھ ہونے والا نہیں ہے اس لئے اسے داخل کر کے رقم برباد نہ کرو۔ کوئی کوئی موکّل دوسرے کے پاس جا کر اپیل دائر کراتا اور رقم خرچ کر کے ہار جاتا۔ میں نے ایسے لوگوں کو، جن کو میں نے اپیل دائر کرنے سے منع کر کے اُن کے کاغذ اور روپئے واپس کر دئے تھے دوسروں کی معرفت اپیل دائر کرتے اور ہارتے بھی دیکھا ہے۔ ایک ایسا بھی مقدمہ میں نے دیکھا جسے میں نے واپس کر دیا تھا اور دوسرے وکیل سے اُسے دائر کیا اور ہائی کورٹ میں جیت بھی لیا۔ ایسا ہونا تعجب کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ مقدمہ بازی ایک طرح کا جوا تو ہے ہی۔ ہو سکتا ہے کہ میں اس مقدمہ کی باریک باتیں نہ سمجھ سکا ہوں یا جج کسی دھوکے میں آگیا ہو اور اس نے غلط فیصلہ دے دیا ہو۔ واللہ اعلم بالصواب۔

میں وکالت تو زوروں سے کرتا رہا مگر اب گاندھی جی سے بھی تعلّق چھُٹنے والا نہیں تھا رولٹ رپورٹ کے شائع ہونے کے بعد مُلک میں ایک بڑی تحریک جاری ہو گئی گاندھی جی نے اس کی رہنمائی اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ بہار سے واپسی کے بعد گاندھی جی رہنمائی کر کے کھیڑا کے کسانوں کا جن پر مال گذاری کا اضافہ ہو رہا تھا اضافہ چھڑا یا۔ اس کے لئے

وہاں ستیہ گرہ کا اہتمام کرنا پڑا تھا مگر آخر میں بات طے ہو گئی۔ جب گاندھی جی ۱۹۱۸ء میں کھیڑا کا دورہ کر رہے تھے۔ میں بھی اُن کے ساتھ گجرات کے کسانوں کے اس ضلع میں دو تین دن تک گھوما پھرا تھا۔ اپریل کا مہینہ تھا۔ گرمی کافی پڑ رہی تھی۔ دھوپ خوب سخت ہوا کرتی تھی۔ اس گرمی میں بھی گاندھی جی گاؤں میں گھومتے رہتے۔ اُن دنوں وہ جوتا نہیں پہنا کرتے تھے۔ اس لئے ریت کے تپ جانے سے ننگے پاؤں چلنے میں انہیں تکلیف ہوا کرتی تھی۔ ایک دن ایسا منظر مجھے دیکھنے کو ملا۔ گرمی کے مارے پاؤں جلے جاتے تھے ریت کچھ دُور تک تھی۔ میں تو جوتا پہنے ہوئے تھا۔ مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی مگر گاندھی جی کو بہت اذیت ہوئی۔ ایک جگہ میں نے چادر بچھا دینا چاہی جس میں اُن کو تھوڑا آرام مل جائے مگر اُنہوں نے ایسا نہیں کرنے دیا۔ اُسی مسافت میں سردار ولبھ بھائی پٹیل کے گاؤں کرم سد جانے کا بھی ایک اچھا موقع ملا۔ میں نے اُن کا آبائی مکان دیکھا تھا اِس ستیہ گرہ کے لیڈر ایک طرح ولبھ بھائی پٹیل ہی تھے۔ اِسی ستیہ گرہ کے باعث ان کا گاندھی جی سے یہ تعلق قائم ہوا، جو آج تک اٹوٹ بنا ہوا ہے اور جو روز بروز اِن دنوں طاقتوں کے سنگم کا اچھا پھل دیش کو دیتا جا رہا ہے۔

کھیڑا ستیہ گرہ کے بعد گاندھی جی سرکار کی مدد کے لئے کھیڑا ضلع کے لوگوں کو فوج میں بھرتی ہونے کا مشورہ دیتے ہوئے دورہ کرنے لگے۔ اس زمانے تک برٹش سرکار پر اُن کا پورا اعتماد تھا۔ وہ مانتے تھے کہ سرکار اکثر بھول کر دیا کرتی ہے اور کہیں کہیں اُس نے ظلم بھی کیا ہے مگر سب پہلوؤں پر غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ برٹش پالیسی منصفانہ ہے، اس سے انصاف کی امید رکھی جانی چاہیئے۔ اس لئے وہ سرکار کی امداد کے لئے لوگوں کو فوج میں بھرتی ہونے کا مشورہ دینے لگے۔ اپنی عادت کے مُطابق

اِس کام میں بھی وہ زوروں سے لگ گئے۔ کھیڑا کے دورہ کی وجہ سے اُن کی صحت کو بہت بڑا دھکا پہنچا۔ وہ سخت بیمار پڑ گئے۔ اُنہیں کی پالیسی کے مطابق میں بھی بہار میں اُس سرکاری بورڈ کا ممبر بن گیا جو فوجی رنگروٹوں کی بھرتی میں مدد کرنے کے لئے تھا۔ اس کے سکریٹری اُن دِنوں مسٹر رسل تھے جو آج کل بہار کے گورنر کے صلاح کار (ایڈوائزر) ہیں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں گاندھی جی کی اَن تھک کوششوں کے بعد بھی بھرتی میں بہت کامیابی نہیں ہوئی۔ بہار میں بھی میں کچھ زیادہ نہ کرسکا۔

گاندھی جی کی بیماری اتنی بڑھ گئی کہ وہ بمبئی میں کانگریس کے اُس خاص اجلاس میں جو مانٹیگو چمسفورڈ پر رپورٹ سوچ بچار کرنے کے لئے سید حسن امام کی صدارت میں ہوا تھا شریک نہ ہو سکے، مگر میں اس میں شریک ہوا تھا۔ وہاں سے واپسی پر احمد آباد اور سابرمتی میں میں کئی روز تک گاندھی جی کے ساتھ ٹھہرا بھی تھا۔ جہاں تک میں اُن کے خیالات کو سمجھ سکا تھا میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ وہ اگر کانگریس میں آتے تو اعتدال پسند طبقہ کا ہی ساتھ دیتے۔ کانگریس کا کام تو ختم ہو گیا۔ مگر دونوں پارٹیوں میں اِختلاف رائے نمایاں ہو گیا۔ کچھ لوگوں کے کانگریس سے ہٹنے اور لبرل لیگ کو الگ مُنظّم کرنے کی بنیاد وہیں پڑ گئی تھی۔ تین مہینے بعد دلّی میں اپنے سالانہ اجلاس میں تقریباً بمبئی کے فیصلہ کو ہی کانگریس نے قائم رکھا تھا۔

جب میں بمبئی سے احمد آباد پہنچا تو دیکھا کہ گاندھی جی احمد آباد شہر کے مرزاپور محلّہ میں سیٹھ امبالال سارا بھائی کے بہت بڑے محل میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ سیٹھ جی اُن دنوں اپنے ایک دوسرے نئے مکان میں رہا کرتے تھے اور یہ مکان خالی تھا۔ گاندھی جی کی طبیعت بہت خراب تھی۔ ڈاکٹر لوگ دیکھا تو کرتے تھے مگر گاندھی جی کوئی دوا نہیں کھاتے تھے۔ بلغم

کی زیادتی تھی ۔ بخار کا بھی زور تھا ۔ سابرمتی میں آشرم قائم ہو چکا تھا ۔ مگر ابھی تک مکان کم بنے تھے ۔ ہاں وہاں رہنے والوں کی تعداد بڑھتی جا رہی تھی ۔ ایک دن گاندھی جی کا بخار بہت بڑھ گیا مگر اس کا خیال نہ کر کے اُنھوں نے کہا کہ اب یہاں نہ ٹھہرنا چاہیئے ۔ فوراً سابرمتی آشرم میں چلو ۔ ساتھیوں نے بہت روکا ۔ مگر اُنھوں نے کسی کی ایک نہ سُنی ۔ اُسی حالت میں آشرم چلے گئے جس وقت ایسا ہوا میں احمد آباد کی مشہور چیزیں دیکھنے گیا تھا جب میں واپس آیا تو میں نے دیکھا کہ سب لوگ آشرم چلے گئے ۔ پھر میں بھی شام کو وہاں چلا گیا ۔

دوسرے دن جب میں سویرے گاندھی جی کے پاس بیٹھا ہوا تھا ، مجھے وہ منظر دیکھنے کو ملا اور وہ بات سُننے میں آئی جس کو میں کبھی نہیں بھول سکتا ۔ گاندھی جی کا بخار کچھ کم ہو گیا تھا ، مگر وہ بہت کم زور تھے ۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے ۔ میں نیچے بچھی ہوئی چارپائی پر بیٹھا تھا وہ شری چھگن لال گاندھی کو بُلوا کر اُن سے باتیں کرنے لگے ۔ اُنھوں نے اتنے جذبے کے ساتھ باتیں کیں کہ اُس کا اثر پڑے بغیر نہ رہ سکا ۔ اگرچہ میں گجراتی کم سمجھ پاتا تھا ۔ پھر بھی میں نے مطلب تو پا ہی لیا ۔ اُنھوں نے کہا کہ کل جب بخار کا زور تھا میں نے ضد کر کے یہاں آنے کو کہا ۔ میں سمجھتا تھا کہ یہاں آنے پر ہی بخار کا زور کم ہوگا ۔ وہ بخار تو جسم کا تھا مگر وہاں اس بڑے محل میں پڑے پڑے میرے اندر بڑے شعلے بھڑک رہے تھے ، میں سوچ رہا تھا " گاندھی ۔ تجھے اتنے بڑے محل سے کیا کام ؟ تو یہاں کیوں ٹھہرا ہوا ہے ۔ تیری جگہ تو غریبوں کے جھونپڑوں میں ہے ـــــ آشرم میں ہے ۔ یہاں سے فوراً چلا جا ۔ تو جب تک ایسا نہیں کرتا تجھے چین نہیں مل سکتا ۔" اسی وجہ سے میں نے اتنی ضد کی جو تم میں سے کچھ کو بُری بھی لگی ہوگی ۔ وہاں سے یہاں آنے پر بھی میں رات کو سویا نہیں ہوں ۔ برابر سوچتا ہی رہا ہوں ۔ میں اپنے آپ سے پوچھتا رہا ہوں کہ

کیا تیری زندگی اسی طرح بغیر کچھ کامیابی حاصل کئے ہی ختم ہو جائے گی۔ جب میں دکھنی افریقہ سے ہندوستان آیا۔ ایک پر ایک کام میں نے ہاتھ میں لئے مگر کسی کو بھی پورا نہ کر سکا سب کو ادھورا ہی چھوڑتا گیا۔ مِل مزدوروں میں ہڑتال کا کام شروع ہوا۔ ہڑتال اس معنی میں تو کامیابی سے ختم ہوئی کہ اُن کے مطالبے منظور ہو گئے۔ مگر منظوری میں ابھی ایسی بہت سی خامیاں ہیں جن کو دُور کرنا چاہیئے۔ میری خواہش تھی کہ اُن کے درمیان کام کر کے اِن خامیوں کو دُور کرنے کی کوشش کروں مگر وہ نہ کر سکا، چمپارن چلا گیا۔ چمپارن میں بھی، جہاں تک نیل والوں کا سوال ہے، وہ تو ایک طرح سے ختم ہو گیا، مگر وہاں کے کسانوں میں بہت کام کرنے کی ضرورت ہے، اسی لئے وہاں کچھ اسکول کھولے گئے۔ میری خواہش تھی کہ میں اس قسم کے کام میں تعاون کرتا رہوں گا اور اس ضلع میں اس قسم کے کام کی داغ بیل ڈال کر اسے خوب زوروں سے چلاؤں۔ اس کام کے لئے "سچی لگن والے بے لوث آدمی بھی مل گئے تھے اور دوسرے بھی ملنے والے تھے مگر اسے بھی اَدھورا ہی چھوڑ کر کھیڑا کے ستیہ گرہ میں لگ جانا پڑا پھر کھیڑا کے کسانوں کا کام پورا ہوتے ہی فوج کی بھرتی کے کام میں لگ گیا۔ کھیڑا میں بھی عوام کے کام کرنے کی ضرورت ہے، مگر وہ بھی پورا نہ ہو سکا۔ اتنے میں میں بیمار پڑ گیا۔ معلوم نہیں اِس بیماری سے بچ کر پھر کھڑا ہوں گا یا نہیں۔ اگر ہو بھی سکوں گا تو معلوم نہیں کب تک۔ تم لوگ جو دکھنی افریقہ سے ہی میرے ساتھ کام کرتے آ رہے ہو، میری اِس حالت کی وجہ سے کسی کام کو جم کر نہیں کر پاتے۔ تمہاری صحت بھی خراب ہی ہے۔ اِس آشرم کو بھی میں نے بہت اُمیدیں اور منصوبے باندھ کر قائم کیا تھا مگر اس کو بھی میں اب تک وقت نہیں دے سکا۔ چمپارن سے ہی مجھے اس کے افتتاح کا پیغام بھیجنا پڑا۔ میں خود اس موقع پر بھی نہ جا سکا۔ تب سے اب تک کسی نہ کسی کام میں بندھ کر باہر رہا۔ اب میری یہ حالت ہے۔ نہ معلوم ایشور کو کیا منظور

ہے۔" اس طرح باتیں کرتے کرتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ کچھ دیر تک روتے رہے ہیں دونوں وہاں تھے، انہیں کوئی خاموش کرے تو کیسے۔ ہم جانتے تھے کہ اُن کے دل کی آگ اب آنسوؤں کے روپ میں بھاپ کا پانی بن کر نکل رہی ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ خود چُپ ہوگئے۔ انہوں نے کہا کہ یہ آگ بہت جلا رہی تھی، رات بھر سویا نہیں۔ کچھ آنسو بہہ جانے کے بعد اب کچھ تسلّی ہوئی ہے۔ اس کے بعد کچھ دیر تک چُپ رہے۔ میں بھی چُپ بیٹھا رہا۔ اور سوچتا رہا کہ خُدا نے ہمیں بڑی نیک بختی دی ہے کہ ایسی عظیم ہستی سے رابطہ ہوا۔ رخصت لے کر دو ایک دن کے بعد میں اپنے کام پر واپس آیا۔

اِس بیماری سے اُٹھنے کے بعد جس میں شاید کبھی کبھی موت بھی اُن کے پیشِ نظر رہتی تھی انہوں نے رولٹ رپورٹ کے خلاف تحریک کی رہنمائی اختیار کی۔ رپورٹ شائع ہونے کے کچھ ہی دنوں بعد، سرکار نے اُس کی سفارش کے مطابق دو بِل دہلی کی امپیریل کونسل میں پیش کیے۔ جن کے مطابق سرکار کو بہت جامع اور جابرانہ اختیارات ملنے تھے۔ وہ جس کو چاہے بغیر عدالت میں گئے ہی نظر بند کر سکتی تھی۔ عوام نے یہ دیکھا کہ لڑائی کے دِنوں میں سوراج کے متعلق جو وعدے برٹش سرکار کی طرف سے کیے گئے تھے اُن کے ایفا کا تو کوئی قرینہ نظر نہیں آتا، مگر یہ کالے قانون، ہمارے سر پر لادے جا رہے ہیں۔ سارے مُلک میں بڑی ناراضی پیدا ہوئی۔ سبھی جگہ مخالفانہ جلسے ہونے لگے۔ کونسل میں غیر سرکاری ممبروں نے اِن بلوں کی زبردست مخالفت کی، مگر اُن کی سُنتا کون تھا۔ آخر ایک بل پاس ہوگیا۔ سبھی منتخب شدہ ہندوستانیوں نے اُس کی مخالفت کی تھی۔ مگر سرکاری افسروں اور کچھ سرکار کے مقرر کردہ ممبروں کی رائے سے وہ اکثریت سے پاس ہوگیا۔ گاندھی جی نے پہلے ہی اعلان کر دیا تھا کہ یہ قانون اگر پاس ہوگئے تو ہم لوگ اِنہیں نہیں مانیں گے۔ ستیہ گرہ کریں گے۔

اُس زمانے کے یہ مخالفانہ جلسے جو ملک میں کے گوشے گوشے میں ہوئے ایک نئی بیداری اور نئی زندگی کی علامت تھے۔ اِتنے بڑے بڑے جلسے جن میں ہر طبقے ہر ذات اور ہر مذہب کے لوگ اِتنی زیادہ تعداد میں شامل ہوتے ہوں۔ شاید ہی پہلے کبھی ہوئے ہوں۔ اپنے وعدے کے مطابق گاندھی جی نے اِس بل کے پاس ہوتے ہی ستیہ گرہ کا سوال اُٹھایا۔ ملک کی ہوا کا رُخ دیکھ کر سرکار نے دوسرے بِل کو آگے نہیں بڑھایا۔ اُسے واپس بھی نہیں لیا۔ وہ بِل اسی طرح لٹکتا رہا۔ نہ پاس ہوا نہ منظور۔ شائد قاعدہ کے مطابق کچھ دنوں کے بعد کالعدم ہوگیا ہوگا مگر جو بل پاس ہوچکا تھا وہ بھی کچھ کم نہ تھا۔ اس سے سرکار کا کام نکل جاتا تھا۔ جو تحریک عام ہوگئی تھی اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ قانون پاس تو ہوگیا مگر کبھی کام میں نہیں لایا گیا۔ کچھ برسوں کے وہ رد بھی کر دیا گیا۔

۶؍ اپریل اور جنگی قانون

گاندھی جی نے اُسی زمانے میں ینگ انڈیا کی اِدارت اپنے ہاتھ میں لے لی۔ ہر ہفتہ اُس میں اُن کے مضمون نکلنے لگے جو سارے ملک میں سنسنی پیدا کرنے والے تھے۔ اُنھوں نے پُرامن ستیاگرہ کا اعلان کر دیا ایک دن بھی طے کر دیا کہ اُس دن لوگ سارے ملک میں برت (روزہ) رکھیں۔ اپنے اپنے مذہبی معبدوں، مندروں، مسجدوں میں دعائیں کریں جلوس نکال کر شام کے وقت جلسہ کریں۔ جس میں سب لوگ 'کالے قانون' کی مخالفت کریں۔ مخالفانہ جلسے تو برابر ہو ہی رہے تھے مگر اس دن کی بہت اہمیت تھی۔ سابقہ تحریک سے زمین خوب تیار ہو گئی تھی۔ اس دن کی ہڑتال اتنی زبردست ہوئی کہ شاید ہی کبھی پہلے ویسی ہڑتال دیکھی گئی ہو۔ شہروں میں سبھی دکانیں بند تھیں۔ سواریوں کا چلنا بند ہو گیا تھا۔ گاؤں میں لوگوں نے اس دن بیل گاڑی اور ہل چلانا تک بند کر دیا تھا۔ نہ معلوم یہ پیغام کس طرح ہر جگہ پہنچ گیا۔ ابھی کانگریس کی تنظیم نہ تو اتنی وسیع تھی اور نہ اتنی مضبوط ہی تھی کہ وہ اس پیغام کو سبھی نزدیک و دُور کے گاؤں تک پہنچا سکتی۔ مگر تب بھی یہ عجیب واقعہ ہوا۔

پٹنہ میں جو مخالفانہ جلسوں کی تنظیم کا کام میں لگن سے کرتا رہا۔ گاندھی جی کے خط بھی گاہے بگاہے مل جایا کرتے تھے مگر خاص کر سب باتیں ینگ انڈیا سے ملتی تھیں جناب مظہر الحق صاحب اور مسٹر سید حسن امام کافی دلچسپی لیتے تھے۔ مظہر الحق صاحب تو ان دنوں دلی کونسل میں گئے ہوئے تھے مگر حسن امام صاحب جلسوں میں جاتے تھے۔ اس دن کی ہڑتال کے متعلق پہلے سے ہی سبھی دوکانداروں سے کہا گیا تھا، سبھی راضی ہو گئے تھے۔ مگر ایک بڑی دوکان والے راضی نہیں ہوتے تھے۔ یہ بات حسن امام صاحب تک پہنچائی گئی۔ میرے ساتھ ہی وہ دکان دار کی دکان تک گئے۔ وہاں پہنچتے ہی بوڑھے دکان دار کے پیروں پر انھوں نے اپنی ٹوپی اتار کر رکھ دی۔ وہ تو حیرت زدہ سا ہو گیا۔ کہنے لگا "آپ نے یہ کیا کیا، آپ کا حکم ہی ہمارے لئے کافی ہوتا"۔

نتیجہ یہ ہوا کہ سارے شہر میں ایک بھی دکان نہ کھلی، چاہے وہ ہندو کی ہو یا مسلمان کی۔ شہر کی تمام دکانیں چاہے وہ سونے چاندی کی ہوں یا ساگ سبزی کی، بند رہیں۔ اس دن جو جلوس نکلا وہ بھی نرالی شان کا تھا۔ گلزار باغ سے لے کر تقریباً شہر کے قلعہ تک جہاں جلسہ ہونے والا تھا۔ لمبا جلوس پھیلا ہوا تھا جس میں سب سے آگے ننگے پیر حسن امام صاحب تھے اور پیچھے پیچھے ہم سب لوگ۔ جو جلسہ قلعہ کے چھوٹے میدان میں ہونے والا تھا وہاں نہ ہو سکا، کیونکہ جگہ کم تھی۔ گنگا کے کنارے ریت میں جلسہ کرنا پڑا۔ ہم سب ڈرتے تھے کہ کہیں اتنے بڑے مجمع کی پولیس سے مڈبھیڑ نہ ہو جائے مگر ایسا کچھ نہ ہوا۔ بڑے اطمینان اور ولولے مگر امن کے ساتھ اس دن کا کام ختم ہوا۔ گاندھی جی نے کچھ دن پہلے ہی لکھ بھیجا تھا کہ ایسے ستیہ گرہیوں سے ایک عہد نامہ پر دستخط لئے جائیں جو اس بات کے لئے تیار ہوں کہ وہ اہنسا (عدم تشدد) اختیار کرتے ہوئے سرکار کے ایسے قوانین کو نہ

مانیں گے جنہیں توڑنے کی اجازت ایک مقررہ کمیٹی دے گی، اور اس کے لئے جو سزا ہوگی وہ بھی اُسے خوشی کے ساتھ بھگتنے کے لئے تیار ہوں گے۔ ابھی تک کمیٹی نے قانون نہیں بنائے تھے اِس پر ملک میں کچھ نرم جماعت کے لوگوں اور اخباروں کی طرف سے بڑی حاشیہ آرائی ہوئی مگر گاندھی جی اٹل رہے بہار میں وہ عہدنامہ میرے پاس ہی آیا۔ اس پر حسن امام صاحب نے دستخط کئے، میں نے نیز اور لوگوں نے بھی کئے۔

۶ اپریل کی ہڑتال اور جلسے سارے ملک میں بڑی کامیابی اور جوش کے ساتھ ہوئے دلّی میں ۳۰ مارچ کو جو جلسہ ہوا تھا وہ بھی بڑے معرکے کا تھا۔ ہندو مسلمان اِتحاد اِس قدر بڑھ گیا کہ دونوں نے ساتھ ہی ساتھ سرکاری گولیاں کھائیں۔ جلوس کے لیڈر سوامی شردھانند جی نے اپنا سینہ کھول دیا تھا کہ سرکار اگر چاہے تو ان کو گولی مار دے۔ مسلمانوں پر اتنا اثر پڑا کہ انہوں نے سوامی شردھانند جی کو لے جاکر جامع مسجد میں ان کی تقریر کرائی۔ وہاں جو چھوٹا موٹا بلوہ ہوگیا، اُسے فرو کرنے کے لئے گاندھی جی دلّی کو روانہ ہوئے۔ مگر راستے میں ہی دلّی کے نزدیک پلول اسٹیشن پر سرکاری حکم سے اُتار لئے گئے اور نامعلوم مقام پر بھیج دئے گئے۔ شری مہادیو بھائی دیسائی اُن کے ساتھ تھے جو وہاں سے اکیلے بمبئی کی طرف واپس گئے۔ راستے سے انہوں نے میرے پاس تار بھیجا کہ گاندھی جی گرفتار کرکے نامعلوم مقام کو بھیج دئے گئے ہیں اور مجھے فوراً بمبئی پہنچ کر اُن سے (مہادیو بھائی دیسائی) سے ملنا چاہیئے۔ تار پاتے ہی میں بمبئی کے لئے روانہ ہوگیا۔ راستہ میں ہی جو اخبار ملے اُن سے معلوم ہوا کہ کئی جگہوں میں اس خبر کے پہنچتے ہی بلوہ شروع ہوگیا ہے۔ جن میں پنجاب کے کئی شہر، احمد آباد اور بمبئی بھی تھے۔ میں جب دو دنوں کے بعد بمبئی پہنچا تو وہاں اس وقت تک امن ہوگیا تھا۔ گاندھی جی پلول سے بمبئی لے جائے گئے۔ وہاں لے جاکر

چھوڑ دئے گئے۔ گاندھی جی کے بمبئی پہنچنے سے بلوہ زور نہ پکڑ سکا۔ جلد ہی فرو ہو گیا۔ مگر احمد آباد سے خراب خبر ملی تھی۔ گاندھی جی وہاں کے لئے روانہ ہو چکے تھے۔ مہادیو بھائی بمبئی پہنچ کر اُن کے ساتھ ہو لئے تھے۔ جب میں پہنچا تو میں نے سُنا کہ وہ دونوں احمد آباد چلے گئے ہیں۔ میں بھی اُسی دن شام کی گاڑی سے احمد آباد کے لئے روانہ ہوا۔ جب دوسرے دن سویرے اسٹیشن سے باہر نکلا تو دیکھا کہ گورے سپاہیوں کا پہرہ لگ رہا ہے اور شہر میں جنگی قانون نافذ ہے۔ کسی طرح سابرمتی آشرم میں ایک تانگہ پر پہنچا۔ وہاں بھی گاندھی جی کے پہنچنے سے لوگوں میں امن ہو گیا تھا۔ جنگی قانون بھی میرے پہنچنے کے کچھ ہی گھنٹوں کے اندر ہٹا لیا گیا۔ شاید پہلے ہی ہٹایا جا چکا تھا۔ وہاں امن برقرار رکھنے کا انتظام کر کے گاندھی جی اُس دن یا دوسرے دن بمبئی کے روانہ ہو گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔

اِسی درمیان پنجاب سے بلوہ ہو جانے کی خبریں آتی رہیں جس سے گاندھی جی بہت سوچ میں پڑ گئے۔ جلیانوالہ باغ کا خونیں حادثہ اسی درمیان ہو چکا تھا۔ کچھ تھوڑی بہت خبر ملی تھی مگر پورا حال کچھ مہینوں تک ٹھیک ٹھیک نہ ملا۔ اِتنا ضرور معلوم ہو گیا کہ پنجاب کی حالت بہت خطرناک ہو گئی ہے۔ گاندھی جی سوچنے لگے کہ ایسی حالت میں ستیہ گرہ چلانا ٹھیک نہ ہوگا۔ انہوں نے اس رات کو احمد آباد اور بمبئی کے راستے میں ریل گاڑی میں ہی اپنا وہ بیان لکھا۔ جس میں انہوں نے لوگوں میں عدم تشدّد کے فقدان کی وجہ سے ستیہ گرہ کو ملتوی کرنے کا خیال ظاہر کیا تھا۔ ہم لوگوں نے اُسے ریل میں ہی پڑھ لیا تھا۔ بمبئی پہنچنے پر وہ اخباروں میں اِشاعت کے لئے دیدیا گیا۔ بمبئی میں میں کچھ دنوں کے لئے ٹھہر گیا۔ وہاں آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمّیلن کے اجلاس میں جو انہیں دِنوں وہاں ہو رہا تھا، شامل ہوا۔ اس کے بعد میں پٹنہ چلا آیا۔ ستیہ گرہ مُلتوی ہو جانے پر پھر میں وکالت کے کام میں لگ گیا۔

پنجاب کا خونیں باب
خِلافت اور ترکِ موالات

ستیہ گرہ بند تو ہوگیا مگر ملک میں بے چینی بڑھتی ہی گئی۔ اُدھر پنجاب میں جنگی قانون کے نام پر ظلم زیادتیاں ہوئیں۔ عوام کی بے عزتیاں کی گئیں۔ ہزاروں آدمیوں کو سخت سزائیں ملیں۔ سب کی خبر کچھ کچھ باہر آتی گئی مگر پوری خبر کسی کو نہ ملتی تھی۔ آپس کا میل اتنا تھا کہ ہندو مسلمان اور سکھ سب باتوں میں پوری طرح شریک ہوتے تھے۔ ساتھ ہی ساتھ گولیاں کھاتے لاٹھیاں سہتے، پانی پیتے، زمین پر رینگتے یا ہوائی جہاز کے گولوں کے شکار بنتے۔ اس خونیں واقعہ کا پورا ذکر یہاں نہیں کیا جا سکتا اس کو تو کانگریس کی طرف سے مقرر کی ہوئی کمیٹی کی رپورٹ میں پڑھنا چاہیئے۔ بہادر پنجابیوں پر ہونے والے ظلموں کی خبریں پنجاب کے باہر نہیں جا پاتی تھیں۔ جب جنگی قانون اُٹھا لیا گیا تب سب باتیں معلوم ہوئیں ملک میں زبردست آتشِ غضب مشتعل ہوئی۔

اِس سال کانگریس کا اجلاس امرتسر میں ہونے والا تھا۔ جہاں جلیانوالہ باغ کا

خونیں حادثہ ہو چکا تھا۔ سارا پنجاب جنگی قانون سے بہت پریشان کیا جا چکا تھا۔ خوف تھا کہ شاید وہاں کے عوام کانگریس کا اہتمام نہ کر سکیں مگر طے ہوا کہ کچھ بھی ہو کانگریس کا اجلاس امرتسر میں ہی ہونا چاہیئے۔ اور ایسا ہی ہوا۔ پنڈت موتی لال نہرو صدر کانگریس منتخب ہوئے۔ میں اس اجلاس میں شریک نہیں ہوا۔ کانگریس دسمبر کے آخری ہفتہ میں ہوا کرتی تھی اور دوسری جنوری سے بابو ہری جی کا مقدمہ شروع ہونے والا تھا۔ اُنہوں نے مجھے روک لیا۔ پنڈت جی بھی اس مقدمہ میں کام کرنے والے تھے مگر وہ کچھ دیر کر کے کئی دنوں کے بعد پہنچے۔ تب تک شری نرسینیدر ناتھ سرکار (سر این این سرکار) نے ہی کئی دوسرے وکیلوں اور بیرسٹروں کے ساتھ کام شروع کر دیا تھا۔ ۱۹۲۰ء کی جنوری سے اکتوبر تک میں آرہ میں اِسی مقدمہ کے لئے رہا۔ کبھی کبھی ایک دو دِنوں کے لئے چھٹّی ملنے پر پٹنہ آجایا کرتا تھا۔ خاص کر اپنے بڑے لڑکے مرتنجے کے دیکھنے کے لئے کیونکہ اس کو اس زمانے میں کالا آزار کا مرض ہو گیا تھا۔ اُس کا علاج پٹنہ ہو رہا تھا۔ کبھی کبھی کسی مؤکل کے کام سے بھی آجاتا مگر تقریباً ان دس مہینوں کا وقت برما کے مقدّمے میں ہی گُذر ہو گا۔

سرکار نے پنجاب میں جنگی قانون ہٹا دئے جانے کے بعد ایک کمیٹی مقرر کر دی تھی جس کے ذمّہ وہاں کے واقعات کے متعلّق جانچ کرنے کا کام دیا گیا تھا۔ لارڈ ہنٹر جو ولایت کے جج تھے اس کے صدر بنائے گئے تھے۔ کانگریس کی طرف سے پہلے اس کمیٹی کے سامنے مظالم کے متعلق شہادت پیش کرنے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ کچھ دنوں تک یہ کام جاری بھی رہا مگر کچھ اختلاف ہونے پر کانگریس اس جانچ سے ہٹ گئی۔ اس نے اپنی ایک الگ کمیٹی بنا لی جس کے سپرد وہی کام ہوا جو سرکار کی طرف سے ہنٹر کمیٹی کر رہی تھی۔ ہنٹر کمیٹی کے سامنے جب باتیں آنے لگیں اور سب اخباروں میں چھپنے لگیں تب پہلے پہل اِس کا پتہ چلا کہ پنجاب

یں کتنا ظلم ہوا ہے۔ پنجاب کے مظالم کی خبریں باہر جس تناسب سے پھیلیں اس کے مطابق برہمی بھی پھیلتی گئی۔ کانگریس کمیٹی بھی اس زمانے میں جانچ کر رہی تھی۔ اس کے لئے گاندھی جی دیش بندھو داس، مسٹر جیکر، جناب عباس طیّب جی وغیرہ پنجاب کے گاؤں اور ضلعوں میں خوب دَورے کرتے رہے۔ دونوں کمیٹیوں کی رپورٹیں ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئیں۔

اُدھر ترکی کے ساتھ انگریزوں کے سلوک سے مسلمانوں میں بھی بہت کھلبلی مچی ہوئی تھی امرتسر کانگریس کے اِجلاس کے زمانے میں ہی مولانا شوکت علی، مولانا محمد علی، مولانا ابوالکلام آزاد وغیرہ مسلمان لیڈر ــــــ جو لڑائی کی وجہ سے نظر بند تھے، رہا کر دئے گئے۔ اِن حضرات نے خلافت کے متعلّق تنظیم اور تحریک کے لئے خلافت کمیٹیاں سارے ملک میں قائم کیں مسلمان اِتنے ناراض تھے کہ وہ چاہتے تھے کہ سرکار کے خلاف کوئی قدم اُٹھایا جائے، مگر یہ طے نہ کر پائے تھے کہ کیا کیا جائے اور کس طرح۔ اِدھر پنجاب کے خونیں باب سے دوسروں میں بھی ناراضی تھی۔ رولٹ قانون کو بھی لوگ بھولے نہیں تھے۔ اِن سبھی کے مل جانے سے ملک میں ایک خطرناک صورتِ حالات پیدا ہو گئی۔ خلافت کمیٹیاں اور کانگریس کمیٹیاں ایک دوسرے کے قریب تر ہوتی جا رہی تھیں۔ بہت سے ہندوؤں نے بھی خلافت کمیٹیوں کی ممبری منظور کی اور چندے سے بھی مدد کی۔ اُدھر مسلمان بھی بڑی تعداد میں کانگریس میں شریک ہونے لگے۔ جب ہنٹر کمیٹی اور کانگریس کمیٹی کی رپورٹیں شائع ہوئیں۔ تو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ایک نشست بنارس میں اُن پر غور کرنے کے لئے ہوئی۔ میں بھی ممبر کی حیثیت سے اس میں شریک ہوا۔

گاندھی جی کا علی برادران سے بہت گہرا تعلّق ہو گیا۔ خلافت کمیٹی میں وہ شریک ہوا کرتے تھے۔ بنارس کے اجلاس سے تھوڑے ہی پہلے الہ آباد میں خلافت کمیٹی کی نشست

میں انھوں نے پُرامن ترکِ موالات کا پروگرام پہلے پہل ۱۹۲۰ء میں اپریل میں پیش کیا۔ خلافت کمیٹی نے اُسے منظور کیا اور طے کیا کہ اُسے عملی شکل دے دی جائے گی ساتھ ہی مولوی صاحبان نے بھی ازروئے مذہب زوروں سے اس کی تائید کی اور ایک فتویٰ نکالا جس کے ذریعے سرکار کے ساتھ کسی قسم کے تعاون کو حرام قرار دیا۔ بنارس میں کانگریس کمیٹی نے طے کیا کہ سب باتوں پر غور کر کے ملک کو کیا کرنا چاہیئے۔ اس کا فیصلہ کرنے کے لئے کانگریس کا ایک اِجلاس طلب کیا جائے۔ یہ طے ہوا کہ اجلاس کلکتہ میں ہو۔ لالہ لاجپت رائے جو بہت دنوں کے بعد حال ہی میں ہندوستان واپس آئے تھے صدر منتخب ہوئے۔ سارے ملک میں ترکِ موالات کا ذکر ہونے لگا۔ گاندھی جی کچھ دَورہ بھی کرتے اور کچھ لکھتے بھی۔ یہ تیاری ہو رہی تھی کہ پہلی اگست ۱۹۲۰ء کو لوک مانیہ تلک کی رحلت ہوگئی۔

مولانا شوکت علی اپریل ۱۹۲۰ء میں ہی پٹنہ آئے تھے جلسہ ہوا تھا۔ اُس دن پٹنہ میں رہنے کی وجہ سے میں بھی اس جلسہ میں شریک ہوگیا۔ گاندھی جی کی رائے اور طریقِ کار سے پہلے ہی واقف تھا۔ آرہ میں پنڈت موتی لال نہرو اور دیش بندھو داس دونوں ہی ڈمراؤں راج اور ہری جی کے برما والے مقدّمے میں دونوں جانب سے کام کر رہے تھے میں پنڈت جی کا شریکِ کار تھا۔ اُن سے سیاست کے بارے میں بھی باتیں ہوا کرتیں۔ وہ کبھی کبھی دیش بندھو داس سے بھی باتیں کیا کرتے۔ اس لئے میں سب باتوں سے واقف تھا۔ جب پٹنہ میں مولانا شوکت علی نے ترکِ موالات میں شریک ہونے کا قول دے دیا۔ ابھی تک کانگریس نے کچھ فیصلہ نہیں کیا تھا اور نہ پروگرام ہی پوری طے شدہ تھا، مگر میں نے کہہ دیا کہ ملک اگر ترکِ موالات کرنے کا فیصلہ کرے گا اور اس فیصلہ کے مطابق یہ تحریک جاری کی جائے گی تو میں بھی پیچھے نہیں رہوں گا۔ اُس وقت یہ ظاہر ہو چکا تھا کہ ترک موالات میں وکالت چھوڑنی پڑے گی اور کونسلوں

میں بھی نہیں جانا ہوگا۔ میں وکیل تو تھا ہی، میری یہ خواہش تھی کہ نومبر ۱۹۲۰ء میں نئے مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات کے مطابق ہونے والے انتخاب میں چمپارن سے صوبائی کونسل کے لئے امیدوار کھڑا ہوں۔ اِس خیال کے تحت میں چمپارن میں ایک دو بار کچھ جگہوں کا دورہ بھی کر چکا تھا۔ ایک جگہ تو مظہر الحق صاحب میری اُمیدواری کی تائید میں جا بھی چکے تھے ترکِ موالات شروع ہونے پر یہ دونوں ہی چیزیں چھوڑنی تھیں۔ میں نے اُس سبھا میں یہ اعلان کر دیا کہ میں دونوں کو چھوڑوں گا۔ مولانا شوکت علی کی میری پہلے کی ملاقات نہیں تھی۔ مگر شاید گاندھی جی نے اُن سے میرے متعلق کچھ کہا تھا۔ جلسہ کے ختم ہوتے ہی میں چلا آیا۔ وہاں اُن سے ملاقات نہیں ہوئی۔ مگر اُنہوں نے میری تلاش کی تھی۔ جب وہ روانہ ہونے والے تھے میں اسٹیشن پر گیا۔ وہاں اُن سے پہلے پہل باتیں ہوئیں۔ جلسہ کی بات اور گاندھی جی کی کئی باتیں انہیں یاد تھیں۔ اِس لئے انہوں نے بہت اختلاط سے باتیں کیں۔ میرا جوش بھی بڑھا یا۔ اس لئے میرے لئے ترکِ موالات کی بنا اس جلسہ میں اچانک پڑی جہاں میں پٹنہ میں اتفاق سے جانے کے سبب سے اُس دن آسکا تھا۔

کانگریس کا خاص اجلاس ستمبر میں ہونے والا تھا۔ بہار کی صوبائی سیاسی کانفرنس بھی اگست میں ہونے والی تھی۔ ترکِ موالات کا تذکرہ زوروں سے جاری تھا۔ بہار میں یہ سوال اُٹھا کہ صوبائی اجلاس کا صدر کون بنایا جائے۔ لوگوں نے مجھی کو منتخب کیا۔ میں ترکِ موالات کے حق میں تھا مگر یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ صوبہ کے لوگ اسے منظور کریں گے یا نہیں اور اگر منظور بھی کر لیں گے تو وقت آنے پر اتنے اس میں شریک ہوں گے۔ اس لئے میں نے مسٹر سچدانند سنہا سے پوچھا کہ کیا میرے لئے یہ مناسب ہوگا کہ میں اپنی رائے صدارتی ایڈریس میں واضح طور پر بیان کر دوں اور اگر اجلاس میری رائے نہ مانے تو

ایک دِقّت لا کھڑی کر دوں۔ اُنہوں نے بتایا کہ مجھے اپنی رائے دینے کا پورا حق ہے، اور اِجلاس کو بھی یہ حق ہے کہ اُسے منظور کرے یا نہ کرے اِس لئے صدارت قبول کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔

میں آرہ میں ایک مقدمہ میں مصروف تھا۔ وہاں میں نے اپنی تقریر ہندی میں لکھنا شروع کی۔ صوبائی کانفرنس جیسے اجلاس یا ادارہ میں اُن دنوں ہندی میں تقریریں نہیں ہوا کرتی تھیں۔ تقریباً انگریزی میں ہی سب کارروائی ہوا کرتی تھی۔ ایک طرف مقدمہ کا ھنگامہ دوسری طرف صدارتی تقریر لکھنا اور پھر حالات سے تشویش۔ مجموعی نتیجہ یہ نکلا کہ میں بخار میں مبتلا ہو گیا۔ خوف تھا کہ صوبائی کانفرنس کے لئے میں بھاگل پور نہ جاسکوں گا۔ مگر وقت آتے آتے اِتنا اچھا ہو گیا کہ کسی طرح اپنا تحریری ایڈریس لے کر بر وقت بھاگل پور پہنچ گیا اور وہاں اجلاس میں حصہ لے سکا۔ مگر اجلاس کے سامنے ایسا مشکل مسئلہ پیش تھا کہ وہ کسی بھی کام کرنے والے کو ڈرا سکتا تھا۔ میرا اپنا خیال صاف اور مضبوط تھا کہ ترکِ موالات ضروری ہو گیا ہے مگر میں جانتا تھا کہ صوبے کے سبھی پُرانے اور تجربہ کار لیڈر اِس کے خلاف ہیں۔ اگرچہ رولٹ بل کی مخالفت کے زمانے سے ہی عوام جلسوں میں بہت بڑی تعداد میں آجایا کرتے تھے۔ مگر یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ ترک موالات میں کہاں تک ساتھ دیں گے۔ اجلاس میں بڑے بڑے لیڈروں میں سے تو بہت گئے بھی نہیں۔ اِس لئے اجلاس اگر میرے کہنے سے ترکِ موالات کی تحریک کو اپنائے تو اُس کے یہ معنی ہوتے تھے کہ اُس کو بروئے کار لانے کا بار زیادہ تر ہم لوگوں کے ہی اوپر پڑے گا۔ ہم کہاں تک اسے سنبھال لیں گے؟ اِس طرح کے بے شمار سوالات دل کو دہلا دیتے تھے۔ مگر میں اِتنا جانتا تھا کہ نئے لوگ میرے ساتھ ہیں۔

بابو برج کشور پرشاد، بابو دھرنی دھر وغیرہ وغیرہ زوروں سے ترک موالات کے حامی تھے۔ اِن کے علاوہ مسلمان تو بیشتر بڑی اُمنگ سے اس میں آنے والے تھے۔ مظہرالحق صاحب کے سوا شاہ محمد زبیر، مولوی محمد شفیع، مولانا نورالحسن وغیرہ تو ساتھ دینے والے تھے ہی مگر مسلمانوں میں بھی حسن امام صاحب، نواب سرفراز حسین خاں وغیرہ —— جو برابر عوامی کاموں میں حصّہ لیا کرتے تھے۔ مخالفوں میں ہی تھے۔ ایک طرف زیادہ تجربہ اور بہت دنوں کی خدمتِ عامہ تھی اور دوسری طرف جوش، ملکی حالات سے پیدا شدہ ناقابلِ برداشت بے چینی اور آگ میں کودنے کا تہیّہ تھا۔ خدا کا نام لے کر میں نے اس خدمت کا بار لیا اور کھُل کر ترک موالات کی حمایت کی۔

جلسہ میں میری بات مان لی گئی، بہت بڑی اکثریت سے ترک موالات کے اُصول کی تائید کی گئی، اور بہار کے حالات پر نظر رکھتے ہوئے پروگرام مرتب کرنے کو ایک کمیٹی بنا دی گئی۔ وہاں بابو برج کشور پرشاد جی لیڈر تھے۔ اُن کی یہ زبردست رائے تھی کہ یہ ترکِ موالات خلافت کے متعلق بے انصافی دور کرانے اور پنجاب کے مظالم کے متعلق کانگرس کے مطالبوں کو پورا کرانے کے علاوہ سوراج کے لئے بھی کیا جائے۔ اُس وقت تک جتنے جلسے ہوئے تھے یا جو مضمون اخباروں میں لکھے جاتے تھے اُن میں خلافت اور پنجاب کے خونیں باب ہی ترکِ موالات کے سبب بتائے جاتے تھے۔ بابو برج کشور اس میں سوراج کو شامل کر کے (یعنی یہ فقرہ کہ جب تک سوراج حاصل نہ ہو) تحریک کو ایک طرح کا استقلال دینا چاہتے تھے۔ ایسا ہی ہوا بھی۔ گجرات میں صوبائی سیاسی کانفرنس ہوئی اور وہاں بھاگل پور کے اِجلاس سے دو چار دن پہلے ہی ترکِ موالات کی حمایت ہوئی جہاں تک مجھے یاد ہے، بِہار اور گجرات ہی دو صوبے تھے جن کے صوبائی اجلاسوں نے

کلکتہ کانگریس کے اجلاس سے پہلے ترکِ موالات کی تائید کی تھی۔ بھاگلپور کے اجلاس کے موقع پر گاندھی جی نے تار دیا تھا کہ اس اجلاس میں ترکِ موالات کی حمایت کرنی چاہیے۔

کلکتہ کانگریس میں میں نہیں جا سکا۔ دیش بندھو داس اور موتی لال جی گئے تھے۔ مگر ٹھیک اُسی زمانے میں شری این این سرکار ہم لوگوں کی طرف سے مقدمہ میں بحث کر رہے تھے اور اُن کی امداد کے لئے میرا آرہ میں رہنا ضروری تھا۔ کانگریس بڑی دھوم دھام سے ہوئی۔ پنڈت جی نے آخر میں ترکِ موالات کی حمایت کی تھی اور وہ بہت بڑی اکثریت سے منظور ہوا۔ وہاں خلافت اور پنجاب کے خونیں حادثہ کے علاوہ سوراج کے مطالبے کو بھی ترک موالات کا سبب بتایا گیا۔

اُنہیں دنوں بیتیا میں بہار پرادیشک (صوبائی) ہندی ساہتیہ سمیلن کا اجلاس ہوا۔ میں اس میں شریک ہوا۔ سورج پورہ (سوریہ پورا) کے راجا رادھکا رمن پرشاد سنگھ جی جو اُن دنوں ہندی کے ایک ہونہار با اثر نثّار تھے صدر ہوئے۔ اُنھوں نے جو وہاں تقریر کی وہ اتنی دل کش اور حسین تھی اور اُس میں زبان و بیان دونوں کا ایسا اچھا امتزاج تھا کہ اس کا اثر میرے دل پر اب تک ہے۔ بیتیا میں ہی میں ملیریا کی گرفت میں آگیا۔ چھپرا پہنچ کر میں بہت بیمار پڑ گیا۔

کلکتہ کانگریس کے کچھ ہی دنوں کے بعد بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک اجلاس ہوا جس میں تحریکِ ترکِ موالات کو عملی شکل دینے کے بارے میں غور ہوا۔ ترکِ موالات کے متعلق تحریک پاس ہو جانے کے بعد میرے سامنے وکالت چھوڑ دینے کا سوال اب حقیقی صورت میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں اور پنڈت جی جس مقدمے میں کام کر رہے تھے وہ بھی تقریباً ختم ہو رہا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ختم بھی ہو گیا۔ وقتی طور پر تو اُس سے فرصت

مل گئی مگر وہ مقدمہ وہیں تک رہنے والا نہیں تھا۔ اس کی اپیل ہائی کورٹ اور پریوی کونسل تک ضرور جانے والی تھی۔ چاہے کوئی ہارے۔ بابو ہری جی چاہتے تھے کہ میں کم سے کم اُن کے اس مقدّمے میں جب ضرورت پڑے اُن کا کام کر دیا کروں۔ اس میں میں نے کافی دنوں تک کام کیا تھا اور اس کے روپئے بھی ملے تھے۔ بہر حال میں اُن کے اصرار کو ٹال نہ سکا مگر اسی زمانے میں طے کر لیا کہ اس کے علاوہ نئے مقدّمے نہ لوں گا، ہاں جو پُرانے مقدمے ہاتھ میں تھے —— خاص کر جن کے لئے کچھ روپئے لے لئے تھے —— اُن کے متعلق کچھ فیصلہ نہیں کر پایا تھا۔

بھائی سے میں نے کوئی رائے نہیں لی مگر وہ سمجھ گئے تھے کہ اب میں وکالت چھوڑ دوں گا۔ پہلے اُنہیں اُمید تھی کہ میں کچھ رقم پیدا کر کے گھر کی حالت کو، جو بہت اچھی نہیں تھی، کچھ ترقی دوں گا مگر انہوں نے میرے فیصلہ کے متعلق اس وقت کچھ نہیں کہا۔ بہت سے دوسرے لوگوں نے بھی وکالت چھوڑی۔ عام طور پر لوگ سمجھتے تھے کہ ایک سال کے بعد سب اپنے اپنے کام پر واپس آسکیں گے۔ اس خیال سے لوگوں میں اور بھی ایک طرح کا ڈھارس بندھا رہا۔ جب سے بھاگل پور کانفرنس میں اور اس کے بعد کلکتہ کانگریس میں ترکِ موالات کی وجوہ میں سوراج کی بات بھی جوڑ دی گئی تھی۔ تب سے میں نے سمجھ لیا تھا کہ اب ترکِ موالات کا سلسلہ لمبا چلے گا۔ کیونکہ برٹش سرکار سوراج پر جلد رضامند ہونے والی نہیں۔ مہاتما جی کہا کرتے تھے کہ اگر سرکار خلافت اور پنجاب کے متعلق ہمارے مطالبے ماننے پر مجبور کی جاسکے گی تو وہی سوراج کا پیش خیمہ ہوگا اور اس لئے اُنہوں نے پہلے سوراج کی بات تجویز میں نہیں رکھی تھی۔ اس لئے اُن کی نظر میں تحریک کی مدّتِ حیات یا تیزی سوراج جوڑ دینے سے بڑھی نہیں۔

بمبئی سے واپس آنے پر میرے ہی گھر پر پٹنہ میں کچھ ایسے دوستوں کی نشست ہوئی جو ترکِ موالات کر رہے تھے وہاں وکالت چھوڑنے کی بات ہوئی ۔ میں نے کہا جو مقدّمے ہاتھ میں ہیں اُن کے متعلق دقّت ہو سکتی ہے کیونکہ ہم مؤکّلوں سے قول و قرار کر چکے ہیں اور خاص کر یہ کہ محنتانہ لے چکے ہیں ۔ وہاں تو ہم چھوڑ ہی نہیں سکتے ۔ کچھ بھائیوں نے اسے ایک طریقہ پر وکالت جاری رکھنے کا بہانہ سمجھا ۔ میں نے یہ صرف اپنے لئے نہیں کہا تھا ۔ مگر انہوں نے سمجھا کہ میں اپنے ہی بارے میں یہ سہولت دوسروں کے نام پر لینا چاہتا ہوں ۔ بات تو یہ تھی کہ ایک سال سے آرہ چلے جانے کی وجہ سے میں ہائی کورٹ سے تقریباً غیر حاضر رہا تھا ۔ اس لئے ان دنوں میرے بہت سے سابقہ مقدّمے ختم ہو چکے تھے اور نئے ہاتھ میں آئے ہی نہیں تھے ۔ پس میرے ہاتھ میں جتنے مقدّمے رہا کرتے تھے اُن کی تعداد بہت کم ہو گئی تھی ۔ پھر بھی چونکہ یہ تعداد پہلے بہت رہا کرتی تھی اس لئے گھٹنے پر بھی کافی تھی ۔ میں اپنی بات پر اڑا رہا مگر حقیقت میں اس برما والے مقدمہ کے سوا اور کسی مقدمہ میں میرے جانے کی نوبت نہیں آئی یا تو مؤکل نے مجھے چھوڑ دیا یا میں نے اگر روپئے لئے تھے تو واپس کر کے چھٹّی لے لی یا کسی دوسرے دوست سے اپنی جگہ کام کرنے کو کہہ دیا جس پر مؤکل بھی راضی ہو گیا ۔

دوسری بات سرکاری اور سرکار سے وابستہ اسکولوں اور کالجوں کے بائیکاٹ کی تھی میرا تجربہ بتاتا تھا کہ ہمیں اس سے زیادہ کامیابی نہ ملے گی ۔ میں نے تقسیمِ بنگال کے زمانے میں کلکتہ میں اس تحریک کو اچھی طرح دیکھا تھا کیونکہ سرکاری اسکولوں کی مخالفت چلی تھی وہاں بھی یہ کوشش ہوئی تھی کہ قومی اسکول کھولا جائے ۔ اس نیشنل کونسل آف ایجوکیشن (تعلیم کی قومی انجمن) کو ایسی ایسی ہستیوں کی امداد اور ہمدردی حاصل تھی جو صرف سیاسی آدمی ہی نہیں تھے ۔ سر گرو داس بنرجی جو ہائی کورٹ کی ججی سے پنشن پا چکے تھے اور جو پہلے کلکتہ یونیورسٹی

کے وائس چانسلر رہ چکے تھے۔ اس کے بڑے حامی اور مددگار تھے اس لئے اُسے سرکاری مخالفت کا بھی زیادہ خوف نہیں تھا۔ کانگریس یا تحریک کے پروگرام میں بھی بائیکاٹ کی بات نہیں تھی۔ اس میں کچھ اچھے اچھے پُرجوش نوجوان جنہوں نے یونیورسٹی میں بڑا نام پایا تھا، شریک ہوئے تھے۔ اُن میں سے ایک مشہور مصنّف شری بنے کمار سرکار ہیں جنہوں نے ایم۔ اے کے امتحان میں طلائی تمغہ اور سب سے اول مقام پایا تھا۔ اتنے پر بھی اُن میں چنداں حوصلہ نہیں دیکھا گیا، کیونکہ وہاں سے تعلیم پائے ہوئے کو کسی طرح گذر اوقات کا راستہ نہیں ملتا تھا اس سے میں ڈرتا تھا کہ اگر یہاں بھی ہم اس پر زور دیں گے تو طلبا ر میں اور خاص کر اُن کے سرپرستوں میں بہت جوش نہ آئے گا۔ لہذا یہ پروگرام زوروں سے نہ چل سکے گا۔ میں نے اس نشست میں اپنا یہ خیال پیش بھی کیا۔ مگر کچھ بھائیوں کو میری بات نہیں جچی، کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ میں بہت بزدل ہوں اور یوں ہی اپنے سامنے غیر ضروری خوف کھڑا کر لیتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ ہمارے مُلک میں تعلیم اَدھوری ہے۔ جو پڑھتا ہے اُسے کچھ کمانا چاہیئے۔ اُس کی زندگی ایسی بن جاتی ہے کہ وہ پُرانے طریقہ سے رہ نہیں سکتا۔ اس کے اپنے رہن سہن میں بھی زیادہ خرچ ہوتا ہے گھر والے جدید تعلیم دلانے میں کافی خرچ کرتے ہیں اور اُمید کرتے ہیں کہ اس تعلیم سے وہ اس سرمایہ کو اگر بڑھا نہ سکے گا تو کم سے کم قائم رکھ سکے گا۔ تعلیم بھی ایسی ہوا کرتی ہے کہ تعلیم ختم ہونے کے بعد سرکاری نوکری یا وکالت کی طرح کے پیشے کو چھوڑ کر دوسرا کوئی کام بھی نہیں ملتا۔ شروع میں جب ایسی تعلیم حاصل کئے ہوئے لوگوں کی تعلیم کم تھی، لوگوں نے آمدنی بھی خوب کی تھی مگر جوں جوں انگریزی تعلیم عام ہوتی گئی۔ آمدنی کا موقع کم ہونے لگا، کیوں کہ ان پیشوں اور نوکریوں میں جانے والوں کی تعداد بڑھنے لگی اور اس کے نتیجے کے طور پر باہمی رقابت میں دشواریاں بھی بڑھنے لگیں اس لئے اگرچہ سرکاری انگریزی تعلیم سے بھی اتنی امید نہیں کی جاسکتی تھی

پھر بھی قومی تعلیم کے مقابلے میں مالی اعتبار سے مفید ہونے میں۔ وہ اب بھی بہت بڑھی چڑھی تھی۔ اس لئے میرا خیال تھا کہ پروگرام کے مطابق ہم پہلے لڑکوں سے اسکول کالج چھوڑنے کو کہیں اور جب دیکھیں کہ ان کی تعداد کافی ہوتی جارہی ہے تب اپنی طرف سے تعلیم گاہ وغیرہ کا انتظام کریں میں یہ بھی سوچتا تھا کہ تعلیم گاہ کھولنے کے بعد اس کو چلاتے رہنا چاہیئے اگر ہم ایسا نہ کرسکے تو اس کا اثر اچھا نہ ہوگا۔ اس لئے میں تعلیم گاہ کھولنے یا اس میں امتحان لینے کے حق میں شروع سے نہیں تھا۔

میں نے جو کچھ اُوپر لکھا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ میں جدید تعلیم کی خامیوں سے ناواقف ہوں۔ میں سمجھ گیا تھا کہ جدید تعلیم بالکل نکمّی ہے۔ غیر ملکی زبان ہونے کی وجہ سے اس میں بہت دقت اور طاقت خرچ ہوتی ہے۔ اس میں وہ قدرتی کشادگیِ ذہن نہیں ہو پاتی جو اپنی زبان میں دی ہوئی تعلیم میں ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ جہاں لفظوں کے معنی سمجھنے میں ہی سارا وقت لگ جاتا ہو وہاں اس کے سوچنے سمجھنے کے لئے کیسے وقت نکل سکتا ہے۔ اس لئے اگر کچھ اور نہیں تو صرف اسی ایک نقص کی بنا پر یہ تعلیم سراسر ناقص ہے۔ بدیشی زبان سیکھنے اور جاننے میں کوئی عیب نہیں ہے۔ علم شے بہ از جہل شے۔ آج کی دنیا میں کم سے کم کسی ایک غیر ملکی زبان کی واقفیت ایک طرح سے ناگزیر ہوگئی ہے۔ پھر بھی زبان جان لینا اور اس سے اپنا کام نکالنا ایک بات ہے اور غیر ملکی زبان کو تمام تعلیم کا ذریعہ بنانا دوسری بات ہے۔ ہم اسے ذریعہ تعلیم بنانے کے مخالف ہیں سیکھنے کے نہیں۔ میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ اس تعلیم کی بنیاد پڑی تھی انگریز حاکموں کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے۔ یہ ضرورت تھی انگریزی پڑھے لکھے ہندوستانی کی۔ جن کا تعاون وہ اپنا کاروبار چلانے کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ وہ کچھ ایسے ہندوستانیوں کو جانتے تھے جو روپ رنگ میں ہندوستانی ہوں۔ مگر خیال اور ذہنی رجحان

میں انگریزی ہوں۔ انہوں نے یہ بھی چاہا تھا کہ اُن کے دفتروں کے کام چلانے کے لئے ایسے سستے ہندوستانی پیدا کئے جائیں جو انگریزی سیکھ کر اُن کا سب کام انگریزی میں ہی کریں۔ اس طرح انگریزوں کو ہندوستان میں دورہ کرنے اور ہندوستانیوں پر راج کرنے کے لئے بھی ہندوستانی زبان سے واقف ہونے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اس لئے نصاب تعلیم بھی کچھ ایسا بنا تھا کہ بیشتر اُسی ضرورت کے مطابق لوگ تیار کئے جا سکیں۔ ہاں ایسے تیار ہونے والوں میں کچھ تو ایسے ضرور نکل آئیں گے جو آزادانہ طور پر کچھ سوچ بچار کرنے کی طاقت بھی حاصل کر لیں گے اور جو بالکل سرکار پر ہی بھروسہ نہ رکھیں گے۔ ایسے اگر کچھ نکلیں تو نکلیں۔ مگر طرزِ تعلیم کا خاص مقصد دفتری لوگوں کو تیار کرنا ہی تھا۔ ایسا ہی اس کا نتیجہ بھی ہوا۔ اس لئے میں تعلیم کا حامی کسی طرح بھی نہ تھا۔ مگر قومی تعلیم کی جو دقّتیں میں دیکھتا اُن سے کچھ ڈر کر آہستہ آہستہ قدم بڑھانا چاہتا تھا۔ سب سے زیادہ مجھے اس بات کی فکر تھی کہ شروع ہو کر کسی کام کا جلد ہی بند ہو جانا اور کسی نتیجہ تک نہ پہنچنا لوگوں کی حوصلہ شکنی کرے گا۔ اس لئے اگر ہم کام تھوڑا بھی کریں تو مضائقہ نہیں مگر جو کام کریں وہ ٹھوس ہونا چاہیئے۔

پہلے لکھ چکا ہوں کہ ہم لوگ بہار میں پونہ کے فرگوسن کالج کے ڈھنگ کا ایک کالج کھولنے پر چمپارن میں ہی غور کر رہے تھے۔ کچھ روپے بھی جمع کر لئے تھے۔ مگر یہ خیال ملتوی کر دیا گیا تھا، کیونکہ گاندھی جی نے کہا تھا کہ سرکار سے رابطہ رکھنے والی تعلیم گاہ کھولنے سے فائدہ نہیں ہے۔ اگر ایسا کرنا ہی چاہتے ہو تو بالکل نئے انداز سے تعلیم دینے والی قومی درس گاہ کھولو۔ اُن کی یہ بات بھی ہم لوگ بھولے نہیں تھے۔ اس لئے دل میں ایک طرف قومی تعلیم کے حق میں خیالات کی لہریں اُٹھ رہی تھیں، دوسری طرف دشواریوں کی چٹانوں کو دیکھ کر دل میں شبہات بھی پیدا ہو رہے تھے اسی لئے میں کچھ ٹھہر کر یہ دیکھ لینا مناسب سمجھتا تھا کہ ملک اور خاص کر

طلبار کی جماعت ترکِ موالات کے میدان میں کس طرح آتی ہے۔ کچھ بھائیوں کا خیال تھا کہ ترک موالات کو کامیاب بنانے کے لئے جب تک ہم طلبار کے سامنے دوسری کوئی درس گاہ پیش نہ کر دیں گے وہ سرکاری تعلیم گاہوں کو چھوڑ کر نہیں آئیں گے۔ اس لئے طلبار کو سرکاری درس گاہوں سے ہٹانے ـــــ ترک موالات کرانے ـــ کے لئے قومی درس گاہ کا ہونا ضروری ہے۔ میں اس طرح لالچ دے کر ترک موالات کرانا پسند نہیں کرتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ طلبار کو ملک کے نام پر اور سرکاری تعلیم کی خامیوں کو بتا کر ہٹانا اچھا ہوگا۔ جب وہ اِس طرح سب کچھ سمجھ بوجھ کر ترکِ موالات کریں گے تبھی ان کا عدم تعاون مستقل ہو سکے گا۔ اگر وہ یہ سمجھ کر ترکِ موالات کریں گے کہ وہاں بھی اُن کو نوکری ملنے والی تعلیم ملے گی اور اس طرح اُن کو کوئی نقصان نہیں اُٹھانا پڑے گا تو اُن کا فیصلہ مستقل نہ ہوگا۔

ہماری درس گاہ میں آکر جب وہ دیکھیں گے کہ ان کو اتنی سہولتیں نہیں ہیں، جتنی سرکاری درس گاہوں میں تھیں تو وہ مایوس ہو کر پھر واپس چلے جائیں گے۔ میں چاہتا تھا کہ صرف ایسے ہی لوگ آئیں جو یہ سمجھ لیں کہ یہ راہ پُر خار ہے۔ اِس میں مصیبتیں ہیں اور انہیں جھیلنے کے لئے ہم جا رہے ہیں نہ کہ اُن کچھ سہولتوں کے لئے جو تعاون کرنے والوں کو حاصل ہیں۔

یہ سب بحث ہو رہی تھی، اور ہم سب لوگ سوچ ہی رہے تھے کہ مظہر الحق صاحب نے ایک قومی درس گاہ کھول دی جس کے مدرس اعلیٰ ہوئے لاٹ بابو (شری کشور لال نند کیولیار) جو حال ہی میں ولایت سے ایم۔ اے اور بیرسٹری پاس کر کے آئے تھے۔ دسمبر کے شروع میں گاندھی جی، مولانا محمد علی اور مولانا آزاد کے ساتھ دورے پر نکلے۔ وہ بہار میں بھی آئے۔ اُنہوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی اور علی گڑھ مسلم یونیورسٹی پر بھی چڑھائی کی تھی۔ کچھ کامیابی بھی ملی تھی مگر پوری نہیں۔ اِسی

چڑھائی کا نتیجہ تھا کہ کاشی ودیا پیٹھ اور جامعہ ملیہ اِسلامیہ (دہلی) کا جنم ہوا۔ بِہار میں اُن لوگوں کے آنے سے بڑا جوش اُمڈا۔ بہار کے طلبا بھی اس لہر میں بہہ نکلے۔

پٹنہ یونیورسٹی سے ترکِ موالات

سرکاری تعلیم سے ترکِ موالات کا مطلب تھا کسی بھی تعلیمی ادارے سے تعلق نہ رکھنا میں پٹنہ یونیورسٹی کے سینیٹ اور سنڈیکیٹ کا ممبر تھا۔ یونیورسٹی کے کاموں میں کافی دلچسپی بھی لیا کرتا تھا یونیورسٹی نے ایک کمیٹی مقرر کی تھی۔ کلکتہ یونیورسٹی کی حالت پر غور کرنے کے لئے مقرر شدہ سیڈلر کمیٹی کی رپورٹ پر غور کر کے پٹنہ یونیورسٹی میں ضروری اصلاحات کرنے کا بار اسی کمیٹی پر تھا۔ میں بھی اِس کمیٹی کا ایک ممبر تھا۔ اِس میں میں نے کافی محنت کی تھی۔ میری خاص کوشش یہ تھی کہ یونیورسٹی کم سے کم میٹریکولیشن کے امتحان تک کے لئے مادری زبان ہی کو ذریعۂ تعلیم مان لے۔ اِس پر کمیٹی کے اندر بہت بحث و تمحیص رہی۔ یہ سوال سینیٹ کے سامنے آنے والا تھا۔ سینیٹ کا اجلاس نومبر کے مہینے میں ہونے والا تھا۔ میں نے یہ سوچا کہ اس تجویز کو اگر میں سینیٹ سے منظور کرا سکوں تو یہ بھی قومی تعلیم کا ہی ایک کام ہوگا۔ اِس لئے میں نے دل ہی دل میں طے کر لیا کہ اگرچہ میں نے تارکِ موالات ہونے کا تہیہ کر لیا ہے تاہم میں سینیٹ کی نشست تک سینیٹ اور سنڈیکیٹ سے مستعفی نہیں ہوں گا۔ میں جانتا تھا کہ سینیٹ میں اس کے خلاف صوبے کے بڑے بڑے لوگ ہیں۔ ابھی تک لوگوں کے دل میں انگریزی زبان کے لئے

یہ چاؤ تھا کہ بچپن میں ہی اگر یہ نہیں پڑھی جائے گی تو اس کا پورا علم نہیں ہو سکے گا، اور ہمارے نوجوان دُنیا کی دوڑ میں پیچھے رہ جائیں گے۔ اگرچہ سیڈلر کمیٹی نے بھی مادری زبان میں تعلیم دینے پر زور دیا تھا۔ پھر بھی ہمارے اپنے ملک میں لوگ اس کے مخالف تھے۔

سینیٹ کے سامنے تجویز کی حمایت میں میں نے ایک بہت زبردست تقریر کی جس میں دلیلوں کے ماسوا جذبات کا عنصر بھی کافی تھا۔ جہاں تک میں سمجھ سکا اس کا اثر لوگوں پر خاطر خواہ پڑا۔ ہمارے مخالفوں میں مسٹر سلطان احمد، مسٹر خواجہ احمد نور، جسٹس جوالا پرشاد پروفیسر جدو ناتھ سرکار وغیرہ تھے۔ کچھ نے اپنی تقریروں میں مخالفت کی، کچھ خاموش رہے مگر رائے خلاف دی۔ ہمارے مؤید دو انگریز نکلے ــــ پروفیسر ہملٹن اور پروفیسر ڈیوک ــــ اِن سے میں نے کچھ کہا نہیں تھا اور نہ ان سے اِس معاملہ میں کبھی تبادلۂ خیالات ہی ہوا تھا۔ مگر دونوں نے صرف تعلیم کی افادیت کی نظر سے میری تجویز کی زوروں سے تائید کی۔ تجویز کثرتِ رائے سے منظور ہو گئی۔ سینیٹ کی یہ سفارش ہوئی کہ یونیورسٹی کے قاعدوں میں ایسی تبدیلی کی جائے جس سے میٹرک کے امتحان تک کی تعلیم صرف مادری زبان میں ہی دی جا سکے۔ اس تجویز کو پاس کرا کر میں بہت خوش ہوا مگر سینیٹ کا اجلاس ختم ہوتے ہی میں نے سینیٹ اور سنڈیکیٹ سے استعفیٰ دے دیا۔

اُن دنوں سر ہیو بلینڈ لیجر کونسل کے ایک ممبر تھے۔ یہ سینیٹ کے بھی ممبر تھے سُنا کہ اُن کو میرے استعفیٰ دینے سے رنج ہوا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ میں یونیورسٹی میں اچھا کام کر رہا تھا۔ مجھے کسی طرح یونیورسٹی سے ترکِ موالات نہ کر دینے کے لئے ہی اُنہیں کے ایما پر بہت سے سرکاری لوگوں نے میری اس تجویز کے حق میں رائے دے کر اُسے پاس کرایا تھا۔ یہ بات مجھے استعفیٰ بھیجنے کے بعد معلوم ہوئی۔ مجھ پر زور بھی ڈالا گیا کہ میں استعفیٰ واپس

لے لوں مگر میں نے ایسا نہیں کیا۔ میں نے سوچا کہ ایک طرف قومی تعلیم کی تبلیغ کرنا ــــــ سرکاری تعلیم کو ناقص بتانا اور طلبا کو سرکاری درس گاہوں سے نکل جانے کا حوصلہ دینا، اور دوسری طرف سرکاری تعلیم سے تعلق رکھنے والی بلند ترین ادارہ (یونیورسٹی) میں قائم رہنا اجتماعِ ضدین ہے۔ یہ بالکل غلط راستہ ہوگا۔ اس لئے میں استعفےٰ واپس لینے پر رضامند نہیں ہوا۔

اگر میں یونیورسٹی میں رہ گیا ہوتا تو جس تجویز کو اتنی محنت سے میں نے سینیٹ سے پاس کرایا تھا اُس کو عملی جامہ پہنانے میں بھی شاید کامیاب ہوتا۔ یقینی صورت سے آج بھی یہ کہنا ممکن نہیں مگر یہ دکھ کی بات ہے کہ سینیٹ کے فیصلہ کے بعد بھی اس کے مطابق کام نہیں کیا گیا۔ انگریزی کے ذریعہ تعلیم تقریباً بیس سال تک ہوتی رہی۔ حال ہی میں انگریزی اور حساب کو چھوڑ کر میٹرک تک کے لئے اور مضمونوں کی تعلیم اور امتحان کا ذریعہ مادری زبان بنی ہے۔ اِن بیس برسوں میں ملک کی حالت میں کتنا فرق ہو گیا ہے، یہ وہی جانتا ہے جس نے بیس سال پہلے رفاہِ عام کے کاموں میں حصّہ لیا ہو اور جو آج بھی لیتا ہو۔ یونیورسٹی بھی آخر ضروری اصلاح کو زیادہ دِن نہ روک سکی۔ بیس برس بعد اُس نے بھی آخر منظور کر ہی لیا۔

بہار وِدیا پیٹھ اور صداقت آشرم

کلکتہ میں ترکِ موالات کی قرار داد پاس ہونے کے بعد ہی میں کونسل کی اُمیدواری سے ہٹ گیا۔ انتخاب نومبر کے مہینہ میں ہی ہونے والا تھا۔ اس لئے سب سے پہلے اسی پروگرام پر زور دینا ضروری سمجھا گیا۔ ہم لوگوں نے بہار میں بہت پرچے چھپوائے جن میں عوام سے اپیل کی گئی کہ جو لوگ اس انتخاب میں کھڑے ہو رہے ہیں ان کو ووٹ نہ دیں۔ کچھ لوگ دَورے پر بھی نکلے جا بجا جلسے کر کے بھی لوگوں کو یہی بات بتائی گئی۔ میں نے بھی کچھ دورہ کیا۔ یاد آتا ہے کہ کاتک کی پورنماشی کے میلہ کے موقع پر میں درولی (ضلع سارن) گیا تھا۔ وہاں جلسہ ہوا تھا جس میں میں نے تقریر کی تھی۔ ہم لوگوں کی خواہش اور کوشش تھی کہ کوئی اُمیدوار ہی نہ کھڑا ہو مگر اس میں کامیاب نہیں ہوئے۔ سبھی نشستوں کے لئے اُمیدوار کھڑے ہو گئے۔ کچھ تو بلا مقابلہ چُنے گئے مگر جہاں ووٹ دینے کا موقع ملا وہاں عوام نے بہت کم تعداد میں ووٹ دئے۔ میرا خیال ہے کہ بہار میں شاید بیس پچیس فی صدی سے زیادہ ووٹروں نے ووٹ نہیں دئے تھے۔

جب مہاتما جی دسمبر میں بہار کے دَورے پر آئے تقریباً اُس سے تھوڑے ہی دِن

پہلے ایک واقعہ بہار میں ہوا تھا جس کا ذکر ضروری ہے۔ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ چمپارن میں نیل کے متعلق جانچ ختم ہو جانے پر گاندھی جی نے کئی جگہ درس گاہیں کھولی تھیں اس کے علاوہ اس بیداری کا نتیجہ صوبہ کے کئی جگہوں میں کسی نہ کسی روپ میں دیکھنے میں آیا۔ اس بیداری میں ہوم رول کی تحریک نے بھی مدد پہنچائی تھی۔ ایک نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ جا بجا کسان سبھائیں قائم ہوئیں۔ جو زمینداروں کے خلاف کسانوں کی شکایتوں کو ظاہر کرنے لگیں۔ چمپارن میں بھی ایک کسان سبھا بن گئی۔ جو کسانوں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ ادھر نئے آئین کے باعث یہ بھی واضح ہونے لگا کہ عوام کو کسی حد تک حق رائے دہی ملے گا۔ اور کونسل کے انتخاب میں کسانوں کو بھی حصہ لینا ہوگا۔ کسان سبھاؤں کو بھی اس سے حوصلہ ملا اور زمیندار بھی کچھ گھبرائے۔ وہ سوچنے لگے کہ ہم اپنی ایسی تنظیم کریں کہ نئے آئین کے انتخاب میں کامیابی سے حصہ لے سکیں۔ انہوں نے نیل والوں کے ساتھ سمجھوتہ کیا اور ایک نیل در زمیندار انجمن قائم کی۔ اِس سے کسانوں اور پڑھے لکھے لوگوں میں کچھ کھلبلی مچی اور غصّہ پیدا ہوا۔ اس زمانے کے اخباروں کے دیکھنے سے پتہ چلے گا کہ اس تنظیم کی مخالفت میں پڑھے لکھے طبقے نے بھی آواز اُٹھائی۔ بہار صوبائی سیاسی کانفرنس میں کھل کر مقابلہ کرنے کی بات کی گئی۔ اِس ادارے کا جنم مظفر پور میں ہوا تھا۔ اس کی شاخیں اور اور جگہوں میں بھی بنتی گئیں۔ دربھنگہ کے مہاراجہ صاحب اس کے صدر تھے۔

اُنہیں دنوں شری رام کشن برہمچاری نے چمپارن ضلع کے بتیا نامی علاقہ کے مجّھر گاواں گاؤں میں جا کر کام شروع کیا۔ وہ کسی مستقل صورت سے گاؤں کی تنظیم کا کام کرنا چاہتے تھے۔ وہاں کے لوگوں نے بھی جوش سے ساتھ دیا تھا۔ بہت سے رضاکار کام کرنے کے لئے تیار تھے۔ وہاں وہ جو کچھ کر رہے تھے۔ جب ایک بار میں وہاں گیا تو وہاں کی تنظیم دیکھ کر مجھے بہت خوشی ہوئی۔ لوگوں میں ایسی پنچائتیں قائم کرنا جو آپس کے جھگڑے مٹا دیں۔ بچوں

کی تعلیم کے لئے پاٹھ شالائیں کھولنا۔ گاؤں کی صفائی کسانوں کی شکائتیں دُور کرانے کی کوشش کرنا یہی خاص پروگرام تھے۔ وہاں ایک آشرم بنا جس کا خرچ عوام مُٹھیا (گھر گھر سے ایک ایک مُٹھی اناج) کے ذریعے چلتا تھا۔ تنظیم کا کام اچھّا چل رہا تھا۔ لوگوں میں جوش بھی بہت تھا۔ پولیس اور نیل والے گورے ایسی تنظیم کو پسند نہیں کرتے تھے۔ (خاص کر پولیس والے) کیونکہ اُن کی دھاندلی وہاں نہیں چل سکتی تھی۔ اس علاقے میں پولیس نے ایک بڑا حادثہ کر ڈالا۔

ایک آدمی نے کسی کے خلاف پولیس داروغہ کے پاس نالش کر دی۔ جہاں یہ واقعہ ہوا تھا اس کے پاس کے ہی گاؤں میں داروغہ کسی دوسرے مقدّمہ کی تحقیقات کر رہے تھے۔ اُنہوں نے پولیس کے سپاہیوں اور گاؤں کے دفعدار کو بھیجا کہ جس کے خلاف نالش کی گئی تھی اسے اور کچھ دوسرے لوگوں کو بھی پکڑ لاؤ۔ اُنہوں نے اس طرح جانے سے انکار کر دیا اور زور لگانے پر بھی وہ نہیں گئے۔ داروغہ جی کو غصّہ آیا۔ تفصیل کی سب باتیں یہاں دینا ضروری ہیں داروغہ نے ضلع کے صدر مقام سے ملٹری پولیس بلوائی۔ کئی گاؤں کو پُرانی رسم کے مطابق لٹوایا۔ لوگوں کے ساتھ بڑی سختیاں ہوئیں۔ یہاں تک کہ عورتیں بھی محفوظ نہ رہنے پائیں۔ برہمچاری رام رکش کے ساتھی شری دھوجا پرشاد، شری ونود سنگھ اور شری منورنجن پرشاد نے وہاں کی دھاندلی کی خبریں اخباروں میں چھپوا دیں۔ رام رکش گرفتار کر لئے گئے۔ بہار صوبائی کانگریس کمیٹی نے جانچ کے لئے جناب مظہر الحق صاحب کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی۔ اِس کمیٹی نے عوام کی شکایتوں کو ٹھیک بتایا اور سرکار کی خس پوشی کو غلط ٹھہرایا۔

یہ تحریک زوروں سے چل رہی تھی، جب گاندھی جی بہار پہنچے چمپارن پہنچنے پر جائے وقوعہ پر بھی گئے۔ اُن گاؤں کے لوگوں سے بھی اُن کی ملاقات ہوئی۔ اِس سفر میں گاندھی جی نے اہنسا (عدم تشدّد) کی ایک ایسی تشریح کی جو ابھی تک لوگوں کو جا بجا سمجھانی پڑتی ہے۔ اُنہوں

نے کہا کہ مردوں نے عورتوں اور گھر بار کو چھوڑ کر بڑی بزدلی دکھائی تھی۔ اُن کا دھرم تھا کہ اپنی جان دے کر اُن کی حفاظت کرتے اگر ان میں اس طرح بغیر ہاتھ اُٹھائے مرنے کی طاقت نہیں تھی تو چاہیے جس طرح ہو سکتا مقابلہ کرنا چاہیئے تھا۔ اپنے دھرم میں قائم رہ کر بغیر ہاتھ اُٹھائے مرجانا ہی سچی اَہنسا ہے۔ مگر ڈر سے بھاگ جانا بہت بڑی ہِنسا (تشدّد) ہے بھلگنے سے بہتر ہے کہ جو کچھ ملے اُسے ہاتھ میں لے کر مقابلہ کیا جائے۔ میں نے یہ مہاتما جی کے لفظوں میں نہیں کہا ہے یہ تو گویا خلاصہ ہے۔ برمھ چاری رام رکش اور دوسروں پر جو مقدمے چلے اُن کی پیشیاں کئی مہینوں تک ہوتی رہیں۔ آخر میں وہ مقدّمے جھوٹے ثابت ہوئے۔ سب لوگ رہا ہوگئے۔

مہاتما جی کے دورہ سے تحریک نے زیادہ زور پکڑا۔ کونسل کا انتخاب ختم ہو چکا تھا۔ اب زیادہ زور اِسکول کالجوں کے خالی کرنے پر تھا۔ ہم لوگوں نے یہ طے کیا کہ ایک قومی کالج کھولا جائے۔ پٹنہ گیا روڈ پر کرایہ پر ایک مکان لے کر کالج کھولا گیا۔ جس مکان میں رہا کرتا تھا اس کے پاس ہی یہ مکان بھی تھا۔ اب میں نے سوچ لیا کہ جب وکالت چھوڑ دی ہے تو اپنے لئے کرائے پر مکان کھنا بے کار ہے۔ ڈیڑھ سو روپئے مہینے کا یہ خرچ بند کر دینا چاہیئے۔ اِسی لئے میں نے اپنا مکان چھوڑ دیا۔ مہاودیالیہ (کالج) میں ہی جاکر رہنے لگا اور قانون کی کتابیں اپنے دوست شمبھو سرن ورما کے پاس رکھ دیں۔ وہ کتابیں اُن کی زندگی بھر اُنہیں کے ساتھ رہیں۔ اُن کی بے وقت وفات کے بعد پھر دوسرے دوست کے پاس چلی گئیں۔ جہاں وہ آج تک اُن کے کام آرہی ہیں۔

پٹنہ میں انجینیرنگ اسکول کے طلبار کا وہاں کے پرنسپل سے کسی معاملہ میں اختلاف رائے ہو گیا۔ طلبار نے ہڑتال کر دی۔ ایک ساتھ جلوس کی شکل میں جناب مظہرالحق صاحب کے پاس گئے جو اِن دنوں سکندر منزل فریزر روڈ میں رہا کرتے تھے۔ اُن سے کہا کہ ہم لوگوں نے اسکول چھوڑ دیا ہے۔ ہم کو جگہ دیجیئے۔ مظہرالحق صاحب بڑے جذباتی اور بے خوف انسان

تھے۔ ان میں قوتِ ترک بھی بے مثل تھی۔ اُس زمانے میں وہ بہت ہی عیش و آرام سے اُس بڑی کوٹھی میں رہا کرتے تھے۔ اپنے لئے ایک بڑی کوٹھی اور بھی بنوا رہے تھے۔ سب کچھ چھوڑ کر اُن لڑکوں کو ساتھ لے کر پٹنہ داناپور سڑک پر ایک باغیچہ میں چلے گئے۔ وہاں اُن کے ایک شناسا کا چھوٹا سا مکان تھا۔ وہاں رہنے لگے۔ جاڑے کے دن تھے۔ خوب سردی پڑ رہی تھی وہ جگہ گنگا کے کنارے ہونے کی وجہ سے کچھ اور بھی زیادہ سرد تھی گھنے باغیچے سے گھرے ہونے کی وجہ سے وہاں کی زمین میں کچھ نمی بھی تھی۔ تب بھی مظہر الحق صاحب کچھ دنوں تک وہاں اس چھوٹے سے بنگلے میں رہے۔ رفتہ رفتہ وہاں تاڑ کی چٹائیوں کے کچھ جھونپڑے بھی بن گئے۔ لڑکے بھی بڑے باحوصلہ تھے، تکلیف کا خیال نہ کرکے اُن کے ساتھ خوشی سے رہنے لگے۔ اُسی جگہ کا نام اُنہوں نے صداقت آشرم رکھا۔ کچھ دنوں میں وہی سُنسان جگہ جہاں سے رات کے نو بجے کے بعد کسی راہی کا گذرنا خطرناک سمجھا جاتا تھا گلزار ہوگئی۔ وہاں چرخوں کا ایک کارخانہ کھول دیا گیا۔ سبھی لڑکے چرخے بنانے کے کام میں لگ گئے۔ آہستہ آہستہ حق صاحب نے اپنی رقم سے ہی مکان بنوانا شروع کر دیا۔ کچھ دوسرے لڑکے بھی آکر اُن کے ساتھ رہنے لگے وہ خود وہیں رہتے، لڑکوں کو پڑھاتے اور وہی موٹا جھوٹا کھانا کھاتے جو لڑکے کھاتے تھے لڑکے زیادہ تر ہندو ہی تھے۔ حق صاحب کا خیال تھا کہ کوئی لڑکا یہ نہ سمجھے کہ وہ اپنے دل میں ہندو مسلمان کا کسی طرح کا بھی امتیاز رکھتے ہیں۔ اس لئے وہ سب کو ایک طرح مانتے تھے۔ لڑکے بھی اُنہیں باپ کی طرح قابلِ احترام سمجھتے تھے ویسا ہی اُن پر بھروسہ بھی رکھتے تھے۔

اِس سلسلہ میں یہاں ایک بات کا ذکر دینا ضروری ہے جس سے اس عظیم ہستی کے جذبۂ صادق کا پتہ چلے گا۔ حق صاحب کے ساتھ ایک بہت غریب گھر کا مسلمان لڑکا رہتا تھا۔ اُنہوں نے دیکھا کہ لڑکا پڑھنے میں تیز ہے۔ اُن کے دل پر اِس کا بھی اثر پڑا تھا کہ مسلمان ہو کر بھی اُس نے

ہندی اور سنسکرت پڑھی تھی۔ وہ کالج کے فرسٹ یا سکنڈ ایر (پہلے یا دوسرے سال) میں پڑھتا تھا۔ نام تھا محمد خلیل۔ حق صاحب اُسے بہت مانتے تھے۔ ترکِ موالات کی تحریک شروع ہونے پر اُس نے بھی کالج چھوڑ دیا۔ حق صاحب کے ساتھ ہی اُن کی کوٹھی چھوڑ کر صداقت آشرم میں رہنے لگا۔ ایک ڈیڑھ سال کے بعد میں نے سُنا کہ حق صاحب نے اس کو آشرم سے نکال دیا۔ محمد خلیل نے بھی مجھ سے آکر کہا کہ وہ (مظہر الحق صاحب) ناراض ہو گئے ہیں۔ آپ سفارش کر کے اُن کو منا لیجئے۔ حق صاحب کی مہربانی مجھ پر برابر رہا کرتی تھی۔ وہ دل سے مجھے پیار کرتے تھے۔ اس لئے میں نے محمد خلیل کے بارے میں اُن سے کہا۔ اس وقت تک محمد خلیل سارے بہار میں مشہور ہو چکے تھے۔ انھوں نے ترکِ موالات کے شروع ہوتے ہی ایک قومی گیت بنایا تھا جو ان دنوں بہت رائج ہو گیا تھا۔ وہ حقیقتاً بہت عمدہ دل کش اور پُر از داخلیت گیت تھا۔ اس کا رجع یہ تھا۔

بھارت جننی تیری جے تیری جے ہو

اُن دنوں شاید ہی کوئی ایسا جلسہ ہوتا ہوگا جس میں یہ گیت بڑے جوش سے نہ گایا جاتا ہو۔ جب میں نے حق صاحب سے کہا کہ محمد خلیل سے کوئی غلطی ہو گئی ہو تو اُسے معاف کر دیجئے، تو اُنھوں نے بہت دردناک لہجے میں مجھ سے کہا۔

"میں تمہاری بات کبھی نہیں ٹالتا مگر اِس وقت مجبور ہوں، تم نہیں جانتے کہ خلیل نے کتنا بُرا کام کیا ہے، اِسی لئے سفارش کر رہے ہو۔ میں نے جس چیز کو اپنی زندگی کا مقصد بنا لیا ہے جس کے لئے آج تک سب کچھ کرتا آیا ہوں اور آج فقیر بن گیا ہوں اِس پر اُس نے اتنی ٹھیس لگائی ہے۔ میں نے اب تک کی ساری زندگی میں ہندو مسلم اتحاد کے لئے کام کیا ہے۔ اِسی میں آج لگا ہوا ہوں۔ آشرم میں رہ کر اُس نے ہندو لڑکوں کے ساتھ ایسا سلوک

کیا ہے جس سے وہ لڑکے جو مجھ پر یقین کر کے بہ تقاضائے محبّت میرے پاس آگئے ہیں ہندو مسلم امتیاز سمجھنے لگے۔ اس نے میری ساری زندگی کے بنے بنائے کام کے بگاڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ لڑکوں کو مسلمان بنائے۔ میں سب کچھ معاف کر سکتا ہوں مگر اس طرح اسلام کے نام پر اُن لڑکوں کے ساتھ جو مجھ پر اعتماد کرتے ہیں اعتقاد شکنی کرنا برداشت نہیں کر سکتا۔ اب میں جان گیا ہوں کہ ہندی اور سنسکرت بھی اس نے ڈھونگ کے لئے پڑھی ہے۔ ایک دن یہ ہندو مسلم فساد بھی کرا دے گا۔ میں اُسے آشرم میں ہرگز نہ رہنے دوں گا۔"

یہ وہی محمد خلیل تھے، جو کچھ دنوں بعد 'خلیل داس' کے نام سے مشہور ہوئے۔ اُن کے متعلق عوام سمجھتے ہیں کہ انھوں نے کئی جگہ ہندو مسلم نااتفاقی منظم کی۔ اس کے بہت بُرے نتیجے دنگے فساد کے روپ میں دیکھنے میں آئے۔ ان دنوں بہت ہندوؤں اور مسلمانوں نے اپنی جانیں گنوائیں۔ جب میں نے کئی برس بعد اُن کے متعلق اس طرح کی شکایتیں سُنیں تب مجھے حق صاحب کی پیش گوئی یاد آئی۔ اُن کے وہ جذبات، وہ معنی خیز الفاظ ایک بار پھر گونج اُٹھے۔

قومی کالج کھول دیا گیا۔ میں اس کا پرنسپل بنایا گیا۔ اس کے پڑھانے والوں میں شری بدری ناتھ ورما، جو اس زمانے میں بہار نیشنل (بی این کالج (پٹنہ) میں انگریزی کے پروفیسر تھے، شری جگناتھ پرشاد ایم، اے کا ویہ تیرتھ جو پٹنہ کالج میں سنسکرت کے پروفیسر تھے، شری پریم سندر بوس جو بھاگل پور کے ٹی۔ این جوبلی کالج میں فلسفہ کے پروفیسر تھے اپنے اپنے عہدوں سے استعفیٰ دے کر آشامل ہوئے۔ ان کے سوا شری جگت نارائن لال شری رام چرتر سنگھ، جناب عبدالباری وغیرہ بھی آگئے۔ ہم نے کالجوں کے ان لڑکوں کو، جو پڑھنا چاہتے تھے، پڑھانا شروع کر دیا۔ ابھی تقریباً وہی مضامین پڑھائے جاتے، جو

سرکاری کالجوں میں پڑھائے جاتے تھے۔ جو روپیہ چمپارن کے دورہ کے وقت کالج کے لئے جمع کیا گیا تھا، اسی میں سے خرچ کیا جانے لگا۔

اُدھر یونیورسٹی کے امتحانوں کا وقت قریب آ رہا تھا۔ کچھ بھائیوں کا خاص کر مولوی شفیع داؤدی کا، خیال تھا کہ ہم لوگوں کو اُن لڑکوں کا امتحان بھی لینا چاہیے جو سرکاری امتحانات میں شریک ہونا نہیں چاہتے تھے۔ اِس لئے یہ بھی ضروری ہو گیا کہ امتحان منظم کئے جائیں۔ مہاتما گاندھی نے بھی بہار سے جانے کے وقت کہا تھا کہ بہار میں بھی ودیا پیٹھ (قومی یونیورسٹی) ہونی چاہیے۔ میرے یہ کہنے پر کہ ہمارے پاس روپئے نہیں ہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ فکر نہ کرو۔ اگر کام ٹھیک طرح سے ہوگا تو روپیوں کی کمی نہ رہے گی۔ جب ناگپور کانگریس کے بعد دوبارہ وہ بہار کے دورے پر آئے تو جھریا میں پچاس ساٹھ ہزار روپئے جمع کر کے مجھے تار دیا کہ میں پٹنہ آ رہا ہوں۔ یونیورسٹی کے افتتاح کا انتظام کرو۔ اُسی مکان میں جہاں ہم نے کالج کھول رکھا تھا۔ اُنہوں نے آکر یونیورسٹی کا افتتاح کیا۔ جناب مظہر الحق صاحب اس کے چانسلر مقرر کئے گئے۔ ہم نے باضابطہ سینیٹ وغیرہ بھی بنا لیا۔ ہم لوگ نصاب مرتب کرنے کے کام میں لگ گئے۔

یہ سب دیکھ کر سرکاری کالجوں میں پڑھنے والے لڑکوں میں بھی بہت جوش اُبھرا۔ ایک دن پچاس ساٹھ لڑکے جلوس بنا کر، پٹنہ کالج اور سائنس کالج چھوڑ کر، سیدھے پٹنہ۔ گیا روڈ پر ہمارے کالج میں آ گئے۔ اِن میں پٹنہ یونیورسٹی کے اچھے سے اچھے طالب علم بھی تھے۔ کچھ رہ گئے جو سارے صوبے میں پھیلے ہوئے ہیں اور آج بھی صوبے کے خاص لوگوں میں ہیں۔ کچھ نے کچھ دنوں تک تو کام کیا، مگر جب تحریک کچھ ڈھیلی پڑی تو پھر سرکاری کالج میں واپس چلے گئے۔ وہاں سے وہ اچھی طرح پاس کر کے سرکاری نوکری میں چلے گئے۔ آج وہ اونچے عہدوں تک پہنچ کر سرکاری کام کر رہے ہیں۔ کچھ جلد ہی واپس گئے اور اپنے پرانے ڈھنگ سے کام کرنے لگے۔

کلیتاً ترکِ موالات میں

ترکِ موالات کے خاص اجزا ءچار بائیکاٹ تھے۔ (۱) سرکاری خطابوں اور سندوں کو چھوڑ دینا۔ (۲) سرکاری تعلیمی اداروں سے قطع تعلّق یعنی نہ اُن میں خود تعلیم پانا نہ اپنے بال بچّوں کو وہاں تعلیم پانے دینا۔ (۳) کونسل میں نہ جانا اور نہ اُن سے کسی طرح کا فائدہ اُٹھانا۔ (۴) سرکاری عدالتوں سے قطع تعلّق یعنی نہ اُن میں مقدّمے دائر کرنا اور نہ اُن میں وکالت یا مختاری یا نوکری کرنا۔ اُمید کی جاتی تھی کہ ہم میں سے ہر ایک اِن چاروں مقاطعوں کو جہاں تک جو اُس سے تعلّق رکھتا ہو، پورا کرے گا۔ مجھے تو کوئی خطاب یا سند نہیں ملی تھی مگر میرے بھائی صاحب کو کوآپریٹو قائم کرنے اور ان میں دلچسپی رکھنے کے لئے رائے صاحب کا خطاب ملا تھا۔ میں نے اُن سے کبھی خطاب چھوڑنے کے لئے نہیں کہا مگر اُنہوں نے خود ہی ناگپور کانگریس کے کچھ دنوں بعد اُسے واپس کر دیا۔ یہ واقعہ یوں ہوا کہ جب تحریکِ ترکِ موالات زور پکڑنے لگی تو بہار اُڑیسہ کی حکومت کے وزیر مسٹر ہیلٹ نے (جنہوں نے ابھی یوپی کے گورنر کے عہدے سے پنشن لی ہے) ایک گشتی چٹھی نکالی جس میں اُنہوں نے کہا تھا کہ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ بھی ایک طرح سرکار کے اجزا ہیں۔

اِس لئے اُن کے ممبر یا کارکُن کسی طرح ترکِ موالات میں حصّہ نہیں لے سکتے اس سے لوگوں میں اور بھی برہمی پھیلی۔ میرے بھائی اُس زمانے میں چھپرا میونسپلٹی کے وائس چیرمین اور آنریری مجسٹریٹ تھے۔ اُنھوں نے اپنا خطاب واپس کر دیا۔ مجسٹریٹی سے استعفیٰ دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی صاف کہہ دیا کہ میں عوام کا چُنا ہوا ہوں اس لئے میں عہدے سے نہیں ہٹوں گا۔ اپنا کام کرتا رہوں گا۔

بھائی صاحب کے لڑکے جناردن نے حال ہی میں میٹرک پاس کر کے ہندو یونیورسٹی کے انجینیرنگ کالج میں نام لکھایا تھا۔ میرے دو لڑکے تھے، مرتنجے جو حال ہی میں کالا آزار سے بچ کر اب اچھا ہو گیا تھا میٹرک میں پڑھتا تھا مگر کم عمر ہونے کی وجہ سے یونیورسٹی کے قاعدہ کی روسے امتحان میں بیٹھنے سے روک دیا گیا تھا۔ دوسرا دھننجے اسکول کے کسی نچلے درجے میں پڑھتا تھا۔

تینوں لڑکے کالج اور اسکول سے ہٹا لئے گئے۔ تینوں میں سے کوئی بھی پھر سرکاری اسکول یا کالج میں نہیں گیا۔ جناردن کرتبانند آئرن سٹیل ورکس (لوہے کے کارخانے) میں کچھ دنوں کے بعد کام سیکھنے لگا۔ وہاں ایک ڈیڑھ سال کام سیکھنے کے بعد وہ ولایت چلا گیا۔ اُس کو بدیش میں لوہے کا کام سیکھنے کے لئے ایک وظیفہ مل گیا۔ اُسی سے وہ اپنا سب کام چلا لیتا۔ گھر سے بھائی صاحب کو تھوڑا بہت ہی خرچ کرنا پڑا۔ مرتنجے بہار کی قومی یونیورسٹی (ودیاپیٹھ) میں پڑھنے لگا اور وہاں سے فارغ التعلیم ہوا۔ چھپرا میں قومی اسکول جب تک چلتا رہا دھننجے پڑھتا رہا۔ اس کے بعد اس نے گھر ہی پر جو کچھ تعلیم مل سکی حاصل کی۔ میں اوپر لکھ چکا ہوں کہ میں نے کس طرح یونیورسٹی سے قطعِ تعلق کر لیا تھا۔ وکالت میں نے چھوڑ ہی دی تھی۔ اِس طرح بفضلہٖ ہم لوگوں نے عملاً انفرادی طریقے سے ترکِ موالات کا پروگرام حتّی الوسع

پورا کیا۔

اُس وقت تک بہار میں کانگریس کی تنظیم نہیں کے برابر تھی۔ صوبائی کانگریس کمیٹی تھی اس کے سکریٹری نواب سرفراز حسین خاں تھے۔ میں بھی جوائنٹ سکریٹری تھا۔ اِسی طرح ضلعوں میں بھی کہیں کہیں ضلع کمیٹی کا کوئی سکریٹری تھا۔ مگر اُن دنوں باضابطہ ممبر بنانے کا رواج نہ تھا۔ جو چاہتا تھا اپنے آپ کو ممبر سمجھ لیتا تھا۔ ڈیلیگیٹوں کا انتخاب بھی باضابطہ نہیں ہوا کرتا جو کانگریس کے جلسہ کے وقت پہنچ جاتے تھے۔ ڈیلی گیٹ بن جاتے تھے۔ ضلع یا صوبائی کمیٹی کے نام نہاد سکریٹری اُن کو سند دیتے تھے۔ وہ دس روپے فیس داخل کر کے نمائندے ہو جاتے تھے۔ ایسے ہی نمائندے کانگریس کے سالانہ جلسہ کے وقت آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ممبر چن لیتے۔ اس انتخاب میں بہت مقابلہ نہیں ہوتا تھا۔ اکثر صوبے کے کچھ لوگ جو کانگریس میں دلچسپی لیا کرتے تھے، چُن لئے جاتے تھے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے قاعدے کی رو سے صوبہ بہار کو اُسے پندرہ سو روپیہ سالانہ چندہ دینا پڑتا تھا۔ ایک طرح پر یہ بات مان لی گئی تھی کہ جو لوگ سو روپیے دیں گے وہی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر چنے جائیں گے۔ اسی لئے بہتیرے ایسے لوگ جو یہ شرط پوری نہیں کر سکتے تھے کبھی اُمیدوار ہونے کی ہمّت نہیں کرتے تھے۔ اِس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ سبھی چُنے ہوئے ممبر ایک سو روپیئے ادا کر دیتے تھے۔ اُن دنوں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سکریٹری تھے راج مہندری کے مشہور کانگریسی کارکن شری ٹیبارا ؤ پنتولو۔ مجھے یاد ہے کہ وہ اکثر پٹنہ میں یہ چندہ جمع کرنے آتے تو بھی یہ ہر سال ادا نہیں ہوتا۔ ۱۹۲۰ء میں کئی ہزار روپیئے بہار کے نام پر باقی نکلتے تھے۔

ناگپور کانگریس نے کانگریس کا ضابطہ بدل دیا۔ اس نے سبھی جگہوں میں کانگریس کا ممبر بنانا لازمی کر دیا تھا۔ ہر صوبے کو اُس کی آبادی کے ہر لاکھ پر ایک آدمی چُننے کا حق دیا۔

اس طرح نمایندوں کی تعداد محدود ہو گئی۔ اُس نے یہ بھی لابدی کر دیا کہ نمائندوں کا انتخاب صرف کانگریس کے ممبر ہی کر سکتے ہیں۔ وہ بھی کسی کانگریس کمیٹی کی باضابطہ نشست میں ہی منتخب شدہ نمائندوں کی فہرست اجلاس سے کئی روز پہلے ہی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر میں پہنچ جانی چاہیے۔ اِس فہرست میں جن کے نام دیے گئے ہوئے تھے اُنہیں چھوڑ کر بغیر کسی خاص سبب کے کوئی دوسرا نمائندہ نہ ہو سکتا تھا۔ فہرست کے ناموں میں ردّوبدل تبھی ہو سکتا تھا جب کوئی چُنا ہوا ڈیلیگیٹ استعفیٰ دے دیتا اور اس کی خالی جگہ پر کوئی نیا انتخاب ہو جاتا۔ اس کی سند صوبائی سکریٹری کو دے دینی ہوتی۔

اِن قاعدوں کی وجہ سے اب کانگریس کے انتخاب میں کافی طاقت آ جانے والی تھی اب پُرانی حکمتِ عملی چلنے والی نہ تھی۔ اِس لئے نئے سرے سے تنظیم کر کے باضابطہ چُناؤ کر لینا ضروری ہو گیا تھا۔ کانگریس نے اِس کے لئے وقت بھی مقرر کر دیا تھا۔ صوبائی کمیٹی کو نئے قواعد بھی بنا دینے کا حق دیا گیا تھا۔ اِسی لئے سوچا گیا تھا کہ جب تک نئی تنظیم نہ ہو جائے ایک چھوٹی کمیٹی بنا دی جائے جو سب کام کرے۔ بہت سے پُرانے کانگریسی لیڈر اب کانگریس سے الگ ہو گئے تھے۔ کچھ تو کانگریس کے اُصول بدلنے کی وجہ سے اور کچھ وہ جن کو اُصول اگر منظور بھی تھا تو ترکِ موالات کے پروگرام سے مخالفت تھی۔ اِس لئے بھی نئی تنظیم ضروری تھی۔ میں اس کمیٹی کا سکریٹری بنایا گیا۔ صدر ہوئے مولانا مظہر الحق صاحب۔ اس کو نوتنظیمی کمیٹی کا نام دیا گیا۔ کمیٹی نے اپنا کام بڑے جوش کے ساتھ شروع کیا۔ ہم جہاں جاتے کانگریس کے ممبر بنانے کی بات کرتے اور ترکِ موالات کی تبلیغ تو کرتے ہی۔

بہت سے وکیل مختار اور طلبا جنہوں نے اپنے اپنے کام چھوڑ دئے تھے۔ سارے صوبے میں پھیل گئے۔ وہ سبھی جگہوں میں کانگریس کا پیغام پہنچانے لگے تقریباً سبھی ضلعوں

میں قومی درس گاہیں کھُل گئیں۔ کچھ تو میٹرک تک کی تعلیم کے لئے اور کچھ نیچے کے درجے تک سب کا تعلق بہار ودیا پیٹھ (قومی یونیورسٹی) کے ساتھ ہو گیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ میٹرک کی درس گاہوں کی تعداد پچاس کے لگ بھگ ہو گی اور پرائمری ابتدائی مدارس تقریباً دو ڈھائی سو سب مدرسوں میں جو بہار ودیا پیٹھ سے وابستہ تھے۔ مجموعی طور پر بیس سے پچیس ہزار تک طلبا تعلیم پانے لگے۔ بہتیرے لوگ جنہوں نے دوسرا کام چھوڑا تھا اِن درس گاہوں میں معلّم بن گئے۔

اُن دنوں ملک بھر میں بے شمار جلسے ہوئے ہوں گے۔ کسی بھی ضلع کا شاید ہی کوئی حصّہ بچا ہو گا جہاں کارکن نہ پہنچے ہوں اور جہاں جلسہ کر کے کانگریس کا پیغام اور پروگرام لوگوں کو نہ بتایا گیا ہو۔ میں نے سارے صوبے کا دورہ کیا۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں ہی پہلے پہل سارے صوبے سے تعارف ہوا لاتعداد کارکنوں سے جان پہچان ہو گئی۔

میں نے وکالت تو کی تھی مگر بڑے جلسوں میں بہت بولنے کی مشق نہ تھی۔ اگرچہ میں لڑکپن سے ہی جلسوں میں حصہ لیا کرتا تھا۔ ترکِ موالات کی تبلیغ میں اَن گنت جلسوں میں تقریریں کرنی پڑیں نتیجہ یہ ہوا کہ سبھاؤں میں بولتے وقت جو بھاری جھجک ہوتی تھی وہ نکل گئی میں اب برجستہ تقریر کر سکتا تھا۔ جن ضلعوں میں لوگ بھوج پُری بولا کرتے تھے، اُن میں بھوج پُری میں ہی تقریر کرتا۔ اور جگہوں میں خالص ہندی میں۔ مجھے یاد نہیں کہ پُرلیا میں میں نے کبھی بنگلہ زبان میں تقریر کی ہے۔ جلسے بھی کچھ چھوٹے موٹے نہیں ہوتے تھے دس پانچ ہزار کا مجمع ہونا تو کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ دس ہزار کے جلسے میں آسانی سے میں اپنی آواز سب لوگوں تک پہنچا سکتا تھا۔ اس سے زیادہ تعداد ہونے پر زور پڑتا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ پندرہ ہزار تک کے جلسہ میں اگر مجمع پرسکون ہو تو میں اپنی آواز پہنچا سکتا تھا لیکن بہت زیادہ زور پڑتا اور پیٹ میں درد ہو جاتا۔ مجھے یہ بھی یاد ہے کہ بیس پچیس ہزار کے مجمعوں میں بھی میں

نے اس سال تقریریں کی تھیں - ایک جلسہ چھپرا ضلع میں ہتھوا میں ہوا تھا۔ وہاں نہ جانے کس طرح خبر اڑ گئی تھی کہ جلسہ میں مہاتما گاندھی آنے والے ہیں - اس لئے وہاں تقریباً پچاس ہزار کا مجمع ہو گیا۔ ہزار کوشش کرنے پر بھی جلسہ ٹھیک نہ جم سکا - اگرچہ اپنی پوری طاقت اور زور لگا کر ایک چھوٹی سی تقریر کی پھر بھی مجھے شبہ ہے کہ تھوڑے ہی لوگوں نے اُسے سُنا یا سمجھا۔

میں تقریر کرتے وقت دیکھا کرتا تھا کہ جلسہ میں حاضرین پر اُس کا کیا اثر پڑ رہا ہے۔ جہاں اچھا اثر پڑتا نظر آتا اور عوام سننے کے لئے مشتاق اور سمجھ دار معلوم ہوتے، وہاں کی تقریر کا اثر بھی میری پوری دانست میں اچھا ہو جایا کرتا تھا - جہاں یہ باتیں نہیں ہوتیں وہاں تقریر بھی ایسی ویسی ہی ہوا کرتی تھی - تقریریں بھی کچھ چھوٹی نہ ہوتیں کانگریس کی تاریخ، خلافت کی تحریک، پنجاب کے مظالم اور سوراج کی ضرورت کے ماسوا ترکِ موالات کا پروگرام بھی سبھی جلسوں میں بہت وضاحت سے بتاتا - اس میں تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹہ لگ جاتا، جہاں دس ہزار کا مجمع ہوتا وہاں تو پوری وضاحت کے ساتھ ڈیڑھ گھنٹہ یا اس سے زیادہ دیر تک بھی بول لیتا جہاں اس سے زیادہ لوگ ہوتے وہاں کچھ اختصار کرنا پڑتا۔ بیس ہزار سے زیادہ لوگوں کے مجمع میں آدھ گھنٹہ سے زیادہ نہیں بول سکتا تھا - اس طرح میں سارے صوبے میں دورہ کرتا رہا۔ دوسرے ساتھی بھی یہی کر رہے تھے۔

'دیش' اور 'سرچ لائٹ' کی اِشاعت

ترکِ موالات کی تحریک میں سبھی لیڈر شریک نہیں ہوئے۔ کانگریس کے پُرانے، اور بزرگ لیڈروں نے جو ترکِ موالات میں شریک نہیں ہوئے۔ ایک دوسری انجمن بہار پراونشل لیگ کے نام سے قائم کی۔ ملک کے اعتدال پسند اخباروں میں اس کا ذکر بہت چلا مگر یہ انجمن کچھ کر نہ سکی۔ اِس کے متعلق بعد کو بھی کچھ سُننے میں نہیں آیا۔ ہمارے صوبے میں ایک بات کی خوبی تھی۔ اختلاف رائے ہوتے ہوئے بھی آپس میں ٹکراؤ نہیں ہوا۔ ہم لوگوں کا آپس میں سلوک بھی جیسا تھا ویسا ہی قائم رہا۔ مگر اتنے لوگوں کے الگ ہو جانے کے سبب سے، خاص کر ناگپور میں کانگریس کے قواعد و ضوابط اور اُس کے آئین میں بہت ردّ و بدل ہو جانے سے کانگریس کمیٹیوں کی ازسرِ نو تنظیم ضروری ہو گئی۔ یہ تنظیم کئی مہینوں میں جاکر پوری ہوئی۔ جون کے آخر تک ضلع کمیٹیاں باضابطہ بن کر صوبائی کمیٹی کا انتخاب کر سکیں۔ تب پھر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے نئے ممبر چُنے گئے۔

کانگریس کی نو تنظیم کے سوال کے ساتھ ساتھ کچھ اور بھی سوال اُٹھے۔ اخباروں کے لئے بہار اچھا صوبہ نہیں ہے۔ پہلے بہت کاوش اور بے لوثی سے 'بہار ٹائمز' اور 'بہاری'

نکالے گئے تھے۔ مگر مالی دشواریاں بہت آئیں اور دونوں بند ہو گئے 'بہار ٹائمز' کے بانی اور کارکن خصوصی بابو مہیش نارائن مرحوم تھے۔ انہوں نے اُسے اپنی زندگی تک چلایا۔ ڈاکٹر سچدانند سنہا کو بھی اخبار نویسی سے بہت دلچسپی رہی ہے۔ انہوں نے اپنے نجی "ہندوستان ریو" کے ماسوا ان اخباروں کی بھی روپئے اور قلم سے پوری مدد کی تھی۔ 'بہاری' کو بنیلی راج سے بہت مدد ملی تھی۔ ایک طرح سے یہی اُس کے بند ہونے کا باعث بھی ہوا۔ دوسرا اخبار مہاراجہ ہتھوا کی طرف سے اکسپریس کے نام سے نکلتا تھا۔ بہت دنوں تک خسارے پر چل کر وہ بھی بند ہو گیا۔ سنہ ۱۹۱۸ء میں پٹنہ میں سبھی لیڈروں نے، خاص کر ڈاکٹر سچدانند سنہا اور جناب حسن امام نے ایک اخبار کی اشد ضرورت محسوس کر کے طے کیا کہ اس کا اجرا کیا جائے۔ اس کا نام سنہا صاحب کے کہنے کے مطابق 'سرچ لائٹ'، رکھ دیا گیا۔ یہ ہفتہ میں دو بار شائع ہوتا تھا۔ اُس کے ڈائرکٹروں میں ڈاکٹر سنہا اور حسن امام صاحب وغیرہ تھے۔ نئے لوگوں میں بابو برج کشور پرشاد تھے اور میں بھی تھا۔ تحریک شروع ہونے پر "سرچ لائٹ" کے سامنے یہ سوال آیا کہ ترکِ موالات کی حمایت کرے یا نہیں رقم خرچ کرنے والوں میں خاص افراد ڈاکٹر سنہا اور حسن امام صاحب تھے۔ وہ ترک موالات کے حامی نہ تھے۔ اِدھر سارے صوبے میں ترکِ موالات کی لہر اس طرح دوڑ رہی تھی کہ اُس کے خلاف جانے کے معنی تھے سرچ لائٹ کا ہمیشہ کے لئے ہر دل عزیزی کا کھو دینا۔ علاوہ ازیں ڈائرکٹروں میں ہم لوگ بھی تھے جو ترک موالات میں شریک تھے اس کے ایڈیٹر شری مُرلی منوہر بھی ترکِ موالات کے پورے حامی تھے۔ اِس حالت میں آپس کے اِس اختلاف رائے کی وجہ سے پالیسی طے کر دینا ضروری ہو گیا۔

سنہ ۱۹۲۰ء سے سرچ لائٹ پریس سے ہی ہندی ہفتہ وار دیش بھی نکلا کرتا تھا۔ میں

جس کا نام نہا دایڈیٹر سمجھا جاتا تھا۔ ترکِ موالات نے سیاست کو انگریزی پڑھے کچھ وکیل بیرسٹروں اور بڑے بڑے بیوپاریوں کے انگریزی طریقے سے سجے کمروں سے باہر نکال کر گاؤں کے برگدوں کے سایہ کے نیچے اور گاؤں کے کھیت کھلیانوں تک پہنچا دیا تھا۔ وہاں انگریزی کا گذر نہ تھا۔ جو عوام تک پہنچنا چاہتا تھا اُسے دیسی زبان کا سہارا لینا پڑتا تھا۔ اس لئے ہم لوگوں نے سوچا کہ سرچ لائٹ سے زیادہ مفید 'دیش' ہوگا۔ ہم نے جناب حسن امام اور ڈاکٹر سچدا انند سنہا سے 'سرچ لائٹ' اور 'دیش' کے متعلق یہ سمجھوتہ کر لیا کہ 'سرچ لائٹ' اپنے ایڈیٹوریل میں ترک موالات کی نہ تو مخالفت کرے گا اور نہ حمایت مگر دوسروں کی تحریریں راقم کے نام کے ساتھ چاہے وہ حق میں ہوں یا خلاف چھاپ سکے گا۔ 'دیش' ہم لوگوں کا اخبار ہو جائے گا۔ اب سے اُس کا نفع نقصان ہم لوگوں کا ہوگا۔ اُس کی پالیسی ہم جیسی چاہیں گے ویسی ہوگی مگر وہ سرچ لائٹ کے پریس میں طبع ہو کر شائع ہوا کرے گا۔

اِس طرح ایک ہندی ہفتہ وار ہمارے ہاتھ میں آگیا۔ انگریزی سرچ لائٹ بھی اگر حامی نہیں تو مخالف بھی نہ رہا۔ ہم یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہم لوگ اس میں مضمون لکھا کریں گے مگر یہ اُمید پوری نہیں ہوئی، کیونکہ تحریک نے اتنا کام بڑھا دیا کہ مضمون لکھنے کا وقت ہی نہ ملتا تھا۔ دیش نے تبلیغی کام میں بہت مدد دی۔ خریداروں کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی۔ اشتہار بھی بہت ملنے لگے۔ ہم لوگ تو تحریک میں لگے تھے۔ 'دیش' کے انتظام پر توجہ نہ دے سکے۔ جیسے جیسے گاہکوں کی تعداد بڑھتی گئی منتظموں کی غلطی سے خسارہ کی تعداد برابر بڑھتی گئی۔ کچھ دنوں کے بعد جب ہم نے حساب دیکھا تو معلوم ہوا اشتہار کی شرح اتنی کم کر دی گئی تھی کہ اُس میں جتنا خرچ پڑتا تھا اُتنا بھی اشتہاروں سے نہیں ملتا تھا۔ اس لئے جتنے بکنے والے شماروں کی تعداد بڑھی اتنا ہی نقصان بھی بڑھتا گیا۔ ہم نے یہ دیکھا کہ بہتیروں کے

مال کی تشہیر ہم اپنے خرچ سے سارے صوبے میں زوروں سے کر رہے تھے۔ مگر یہ علم بہت نقصان اُٹھا لینے کے بعد ہوا۔ اِس طرح اُس وقت 'دیش' پر جو بوجھ پڑا وہ اُس کے گلے میں ہمیشہ کے لئے ایک بھاری پتھر سا بندھ گیا۔

عوامی تحریک کچھ دنوں کے بعد ڈھیلی پڑی۔ 'دیش' کی فروخت بھی کچھ کم ہوگئی۔ آخر مالی مشکلات کی وجہ سے اُسے بند کر دینا پڑا۔ جتنے دنوں تک تحریک کا زور رہا وہ خوب کام کرتا رہا۔ اور بہت مقبولِ عوام بھی ہوگیا تھا۔ سرچ لائٹ طے شدہ پالیسی پر چل رہا تھا۔ کچھ دنوں کے بعد حسن امام صاحب اور ڈاکٹر سنہا اُس سے الگ ہوگئے۔ وہ پوری طرح ہم لوگوں کے اختیار میں آگیا۔ یہاں ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اُن دونوں نے اگرچہ مالی امداد اور محنت سے اُسے بہت تقویت پہنچائی تھی۔ پھر بھی بڑی فیاضی سے اُسے ہم لوگوں کے ہاتھوں میں آنے دیا۔ جب سے یہ حالت ہوئی سرچ لائٹ پورا کانگریسی پرچہ ہو گیا۔ اُس کے ایڈیٹر شری مُرلی منوہر پرشاد کے مزاج کے موافق یہی تھا۔

جب ۱۹۳۰ء۔ ۱۹۳۲ء کا ستیہ گرہ چلا اور کانگریس کی ہدایت ہوئی کہ جو اخبار آزادی سے سچّی باتیں نہ چھاپ سکیں اور اپنے خیالات آزادانہ طور پر ظاہر نہ کرسکیں وہ سرکاری حکم ماننے کی بجائے اپنی اشاعت ہی بند کر دیں تو سرچ لائٹ، اُن بہت ہی قلیل تعداد کے اخباروں میں سے ایک تھا۔ جنہوں نے کانگریس کی ہدایت پر پوری طرح عمل کیا۔ یہ سب ہوتے ہوئے بھی سرچ لائٹ کبھی مالی مشکلات سے مبّرا نہیں ہوا۔ آخر میں ہم لوگوں کو اُس کی ملکیت برلا برادرز کو اس شرط پر دے دینی پڑی کہ اُس کا مالی اہتمام وہ کریں مگر اس کی پالیسی ہم لوگوں کے ہی ہاتھ میں رہے گی۔ یہ فیصلہ ۱۹۴۱ء کے آخر میں ہوا۔ تب سے برلا برادرز بہت کچھ خرچ کر چکے ہیں ابھی وہ مالی مشکلات سے نکل ہی رہا تھا کہ ۱۹۴۲ء کی تحریک

کے زمانے میں سرکار نے اُسے بند کر دینے کا حکم نکال دیا۔ ایڈیٹر بھی ہم لوگوں کے ساتھ نظر بند کر دیے گئے۔ جہاں میں آج یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں، وہ بھی ساتھ ہیں۔

تحریک کازور اور حکومت کا جور

پہلے کہا جا چکا ہے کہ کانگریس کا سالانہ جلسہ دسمبر ۱۹۲۰ء میں ناگپور میں ہوا تھا۔ میں اس اجلاس میں بھی خرابی صحت کی وجہ سے شریک نہ ہو سکا تھا۔ مگر سُنا کہ اس اِجلاس میں اِتنے نمائندے آئے جتنے شاید پہلے کبھی نہیں آئے تھے۔ اُس کا ایک سبب یہ تھا کہ کچھ لوگ سمجھتے تھے کہ ترکِ موالات کے متعلق تجویز پر ناگپور میں پھر غور کیا جائے گا۔ اِسی لئے دونوں طرف کے لوگ اپنی اپنی پارٹی کو تقویت پہنچانے کے لئے زیادہ سے زیادہ تعداد میں وہاں آئے تھے مگر جانبیَن میں سمجھوتہ ہو گیا۔ آخر کچھ ردّوبدل کے ساتھ ترکِ موالات کا فیصلہ قائم رہ گیا۔ اِس قرارداد کی رو سے ملک کو تدریجی ترکِ موالات کی ہدایت کی گئی۔ سرکاری خطابوں کو چھوڑنا، کونسل سے الگ رہنا جو کانگریس کے فیصلہ کے خلاف کونسل میں گئے ہیں اُن سے کسی قسم کی خدمت نہ لینا، سرکار سے وابستہ درس گاہوں سے الگ رہنا اور عدالتوں کا بائیکاٹ۔ شروع میں یہی پروگرام تھا۔ پھر تدریجی طور پر سرکاری نوکری چھوڑنے اور لگان بندی کی ہدایت ملنے پر اُسے بھی کرنے کا فیصلہ ہوا۔ ساتھ ہی تعلیم کے لئے غیر سرکاری تعلیمی اداروں کا قیام، آپس میں جھگڑوں کے نبٹانے کے لئے پنچائتوں کی تشکیل، چرخے کا پرچار اور بدیشی

کپڑوں کا بائیکاٹ یہ ضروری بتائے گئے تھے۔ ہندو مُسلم اِتحاد اور عدم تشدّد پر بھی زور دیا گیا تھا۔

ناگپور کے فیصلہ کے بعد وہ سبھی لوگ جو پہلے کچھ چہ می کنم کے عالم میں تھے اب مستقل مزاجی سے ترکِ موالات میں لگ گئے۔ مہاتما جی نے یہ بھی کہہ دیا کہ کانگریس کے پروگرام کو اگر لوگ پورا کر دیں تو سوراج ایک سال کے اندر ہی قائم ہو جائے گا۔ لوگوں نے ایک سال کی بات دل میں رکھ لی شرطوں کو پورا کرنے کے جتن میں سب جی جان سے لگ لئے۔ مُندرجہ بالا جلسوں میں تبلیغ کا یہی خاص مقصد تھا۔

اوپر کہا جا چکا ہے کہ سارے صوبۂ بہار میں بے شمار کارکن کام کرنے لگے اور سوراج اور ترک موالات کا پیغام گاؤں گاؤں میں پہنچانے لگے۔ تھوڑے ہی دنوں میں حیرت انگیز بیداری نظر آنے لگی۔ سرکار بھی اپنی طرف سے خاموش نہ رہی۔ وہ دیکھتی تھی کہ اس تبلیغ کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ عوام میں اُس کا رُعب یکبارگی اُٹھتا جا رہا ہے۔ لوگ بے خوف ہوتے جا رہے ہیں۔ ہم بھی کانگریس کی طرف سے اِس بات کا پورا خیال رکھتے تھے کہ جوش میں عوام کی جانب سے کہیں زیادتی نہ ہو جائے۔ اسی لئے ناگپور کانگریس کے بعد صوبائی کمیٹی نے جو ہدایت نکالی اُس میں امن اور عدم تشدّد پر پورا زور دیا گیا ــــــ صاف صاف کہا گیا کہ کسی کے ساتھ کسی قسم کی زبردستی نہ کی جائے۔ ہم سمجھتے تھے اور کارکنوں کو بھی یہی سمجھانے کی کوشش کی گئی ــــــ کہ ہم تشدّد کے استعمال میں سرکار سے ہار جائیں گے کیونکہ اِس کے لئے اِس کے بہت وسائل ہیں ہمارے پاس نہیں۔ اس کے علاوہ ترکِ موالات کی خاص شرط عدم تشدّد ہے اُس کے ذریعہ عوام کو بھی ہم اپنی طرف کھینچ سکتے ہیں اگر ہماری طرف سے زور زبردستی ہوئی تو اس کا نتیجہ برعکس ہو گا ہمیں ایک دن پچھتانا پڑے گا۔ اس لئے جہاں کہیں تقریر کی جاتی اِس

بات پر زور دیا جاتا جو پرچہ نکالا جاتا اس میں بھی اسی بات پر زور دیا جاتا۔

سرکار اس تلاش میں رہتی کہ کہیں بھی کچھ بدامنی ہو تو اُسے دھر دیا جائے مگر اُسے اِس کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔

مظفر پور ضلع میں گرانی کے سبب کئی بازار لُوٹ لیئے گئے۔ دربھنگہ اور چمپارن کے ضلعوں میں بھی ایک آدھ جگہ یہی ہوا۔ سرکار کو وہ بہانہ مل گیا جس کی اُسے تلاش تھی۔ ہم لوگ شراب بندی کی بھی تبلیغ کیا کرتے تھے۔ اس کا اثر بھی کافی پڑ رہا تھا۔ آبکاری کی دکانوں کا ٹھیکہ مارچ کے مہینے میں دیا جاتا ہے۔ فروخت کم ہوتی جا رہی تھی۔ سرکار کو خوف ہو گیا کہ آمدنی کا بڑا ذریعہ خطرے میں پڑ رہا ہے۔ اِن دونوں باتوں کو لے کر جفا جاری ہوئی۔ اس کی ابتدا مظفر پور ضلع سے ہی ہوئی اور دوسرے ضلعوں میں بھی جلد ہی دورِ ستم عام ہو گیا۔ چمپارن میں لوریا کے واقعہ کے زمانے سے دور جور جاری تھا وہاں اب اور بھی زور لگایا جانے لگا۔

اِس کی اِبتدائی صورت یہ تھی کہ کارکنوں پر دفعہ ۱۰۷ ضابطہ فوجداری کے مطابق مچلکہ دینے کے مقدمے چلنے لگے۔ دفعہ ۱۴۴ ضابطہ فوجداری کے مطابق کارکنوں کو جلسوں میں تقریریں کرنے اور جلوس وغیرہ میں شریک ہونے سے منع کیا گیا۔ اِتنے دنوں کے بعد یہ کہنا تو مشکل ہے کہ کتنے آدمیوں پر اِس طرح کے مقدمے چلائے گئے۔ مگر اتنا وثوق سے کہا جا سکتا ہے، کہ لوگوں نے ضمانت نہیں دی۔ جن پر مقدمہ چلایا جاتا وہ جیل چلے جاتے۔ ہاں جا بجا لوگوں نے مقدمے کی پیروی کی۔ کہیں کہیں مقدمہ آخر خارج کرنا پڑا۔ کیونکہ ثبوت نہ ملا۔ بات تو یہ تھی کہ جلسہ کرنے کے سوا جس میں ترکِ موالات کا پروگرام سمجھایا جاتا تھا، ہمارے آدمی کوئی دوسرا کام کر بھی نہیں رہے تھے۔ جو بازار لوٹنے کی رَو چلی تھی اِس کو روکنے میں ہمارے آدمیوں نے بہت مدد کی تھی۔ جہاں کہیں سے خبر آگئی وہیں دوڑ کر پہنچ جاتے اور عوام کو سمجھا بجھا کر سنبھال

لیتے۔ لٹیروں سے مقابلہ کرنے کے لئے عوام کو تیار بھی کر دیتے۔ مگر سرکار کا مقصد تو تحریک کو دبانا تھا اس لئے اس نے لٹیروں کے مقابلے میں کانگریسی کارکنوں کی گرفتاری کو ہی زیادہ ضروری اور مناسب سمجھا۔ تھوڑے ہی دنوں میں سیکڑوں کارکن اس قسم کے مقدموں کے شکار ہو گئے۔ صوبائی حکومت کے چیف سکریٹری مسٹر رینی نے ایک سرکلر نکالا جس میں ضلع کے حکام کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ تحریک کو دبائیں۔ لوکل سلف گورنمنٹ کے سکریٹری مسٹر ہیلٹ نے دوسرا سرکلر نکالا جس میں بتایا گیا کہ مینوسپلٹیاں اور ڈسٹرکٹ بورڈ سرکار کے اجزا ہیں، لہذا اُن کے ممبروں اور ملازموں کو ترکِ موالات میں حصہ نہ لینا چاہیئے۔ اونگھتے کو ٹھیلتے کا بہانہ ضلع کے افسر تو یہ چاہتے ہی تھے۔ اُنہوں نے دفعات ۱۰۷، ۱۴۴ کی جھڑی لگا دی سیکڑوں گرفتار کر کے جیل بھیج دئے گئے۔

میں مظہر الحق صاحب کے ساتھ آرہ جانے والا تھا۔ حق صاحب کسی وجہ سے وہاں نہ جا سکے۔ میں اکیلا ہی گیا۔ آرہ اسٹیشن پر اُترتے ہی مجھے دفعہ ۱۴۴ کا نوٹس ملا کہ نو بجے سے پانچ بجے تک شہر کے اندر کسی جلسہ یا جلوس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ میرے سامنے ایک دشواری آکھڑی ہوئی۔ نوٹس بھی پُر مذاق تھا۔ اُن دنوں میٹرک کا امتحان ہو رہا تھا۔ آرہ بھی اُس کا ایک مرکز تھا۔ نوٹس میں ممانعت کا یہ سبب بتایا گیا کہ جلوس اور جلسہ سے امتحان دینے والوں کے کام میں ہرج ہوگا اور وہ خفا ہوں گے۔

ناگپور کانگریس نے طے کیا تھا کہ جب تک آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی اجازت نہ ہو تب تک ستیہ گرہ نہ کیا جائے۔ جب اس طرح کی کارروائی سرکار کی طرف سے ہونے لگی یا اُس کا امکان معلوم ہوا تو ہم نے صوبائی کانگریس کی طرف سے ہدایت کر دی تھی، کہ اِس طرح کے احکام مان لینے چاہئیں، کیونکہ کانگریس نے ابھی ستیہ گرہ کا فرمان نہیں دیا ہے۔

ہاں جہاں کہیں خودداری کی بات آجائے وہاں دوسری بات ہے۔

میں نے نوٹس پاکر طے کیا کہ مجھے اسے مان لینا چاہیئے۔ اِس لئے اسٹیشن سے میونسپلٹی کے باہر نزدیک کے ہی ایک گاؤں میں چلا گیا۔ وہاں دوپہر کے وقت ٹھہر گیا۔ وہیں ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں دیہات کے سوا شہر کے بھی کافی آدمی آگئے۔ پھر شام کو پانچ بجے کے بعد شہر میں گیا۔ وہاں بھی ایک بہت بڑا جلسہ ہوگیا جہاں میں نے اپنا پروگرام پورا کیا۔ اس طرح اِس نوٹس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایک جلسہ کے عوض دو جلسے ہو گئے۔ عوام کا جوش بھی بہت بڑھ گیا۔ میں وہاں گیا تو ضرور تھا مگر یاد نہیں کہ نوٹس کا کیا ہوا۔

اُس زمانے میں صوبائی کونسل کا اجلاس ہو رہا تھا۔ جو لوگ کونسل میں شریک ہوئے تھے وہ کانگریس کی ہدائت کے خلاف وہاں تھے۔ سرکاری سرکلروں کو لے کر اور مجھ پر جو نوٹس نکلا تھا، اُسے لے کر اُنہوں نے وہاں بحث چھیڑ دی ساتھ ہی عام طور پر جو تشدّد ہو رہا تھا اس کی بھی سخت تنقید ہوئی۔ اخباروں میں اِن سب باتوں کے چھپنے پر صوبے کے باہر کے جریدوں نے بھی بہار سرکار کی کارروائیوں۔ خاص کر اس کے سرکلروں اور تشدّد کی پالیسی ــــــ پر سخت نکتہ چینی کی بات بہت بڑھ گئی۔ مظفر پور ضلع کے سیتا مڑھی سب ڈویژن کے افسر مسٹر لی، جنہوں نے اس قسم کی کارروائیوں سے بڑی شہرت حاصل کی تھی کچھ دنوں کے بعد وہاں سے بدل دئے گئے۔ معلوم نہیں کہ اِس ملک گیر تحریک کی وجہ سے اُن کا تبادلہ ہوا یا کسی اور سبب سے مگر لوگوں کا یہی خیال تھا کہ اُن کے تبادلے کا سبب یہ تحریک ہی تھی۔

شراب بندی کی وجہ سے کہیں کہیں سرکاری افسروں نے دھاندلی مچائی۔ ہزاری باغ کے ضلع کے چترا میں کھیتوں میں شراب بکنے لگی۔ عوام میں شراب کی تبلیغ تو بہت سے سرکاری افسر کر ہی رہے تھے۔ کہیں کہیں کارکنوں اور والنٹیروں پر شراب بندی میں حصہ لینے کے

سبب سے مقدمے بھی چلائے گئے۔

ہمارے پروگرام میں پنچایت قائم کرنا بھی ایک خاص کام تھا۔ بہت جگہوں پر پنچائتیں قائم ہوئیں۔ بہتیرے مقدمے فیصل ہونے لگے۔ کہیں کہیں لوگوں نے پنچائتی فیصلوں کو منوانے کے لئے قومی بائیکاٹ کا سہارا لیا۔ ہم نے اسے صوبائی کمیٹی کی طرف سے روکا۔ تب بھی جا بجا کچھ ہو ہی گیا۔ ایک جگہ تو پنچایت کا اتنا رعب ہو گیا تھا کہ وہ سرکاری عدالتوں کی طرح کام کر رہی تھی۔ لوگ باضابطہ مقدمے دائر کرنے لگے اور اُنہیں فیصل کرانے کے لئے فیس دیتے تھے۔ زیادہ تر فیصلہ لوگ مان لیتے مگر کہیں کہیں دقّت پیدا ہوتی۔ ایک کمزوری یہ ہوئی کہ پُرانے پُرانے سڑے گلے مقدمے بھی کچھ لوگ پنچایت میں لانے لگے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ پنچایت اگر بہت پرانا کہہ کر اسے نہ سنے تو اس کی شکایت ہوتی کہ یہ بھی سرکاری عدالت کی طرح انصاف نہ دے کر تمادی کی بات کرتی ہے اور اگر فیصلہ کرنا چاہے تو اِس فیصلے کو منوانے کا وسیلہ نہیں تھا۔

پنچایت کو ہی لے کر گریڈیہہ میں ایک بڑا واقعہ ہو گیا۔ وہاں پنچایت کا فیصلہ نہ ماننے کے سبب سے ایک آدمی کا بائیکاٹ کیا گیا۔ اُس کو کنوئیں سے پانی تک نہیں بھرنے دیا گیا۔ اس کا گھڑا توڑ دیا گیا۔ پولیس نے گھڑا توڑنے والے کو گرفتار کیا۔ اُس کے ساتھ بہت لوگ تھانے تک گئے وہاں اور جیل کے سامنے حادثہ ہو گیا۔ پولیس کا کہنا تھا کہ عوام نے ڈھیلے پھینکے اور پولیس پر حملہ کیا۔ داروغہ نے اپنے پستول سے گولی چلائی بہت لوگ گھائل ہوئے۔ جیل اور تھانے کو بھی نقصان پہنچا۔ کچھ لوگوں پر مقدمے چلائے گئے مقدمے میں شہر کے بہت سے مال دار لوگ پھانس لئے گئے۔ اِن میں کچھ نے تو معافی مانگ لی اور کچھ پر مقدمے چلے، آخر میں کیا ہوا مجھے یاد نہیں۔

ایک دلچسپ واقعہ

تھوڑے ہی دنوں بعد مارچ ۱۹۲۱ء میں بیج واڑہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا وہاں طے ہوا کہ لوک مانیہ تلک کی یادگار میں سوراج کے کام کے لئے تلک سوراج فنڈ کے نام سے ایک کروڑ روپئے ۳۰ جون تک جمع کرلئے جائیں۔ بیس لاکھ چرخے جاری ہوجائیں اور کانگریس کے ایک کروڑ ممبر بنالئے جائیں۔ بیج واڑہ پہنچنے کے پہلے مہاتماجی دورہ کر رہے تھے۔ میں کلکتہ سے ہی مہاتماجی کے ساتھ اُڑیسہ گیا۔ وہاں اُن دنوں قحط پڑا تھا۔ مہاتماجی کو اس کی خبر پہلے ہی سے تھی۔ اُنھوں نے کچھ مدد بھی دلائی تھی۔ قحط زدہ لوگوں کو مہاتماجی کی آمد کی خبر ملی۔ بہتیرے لوگ دُور دُور سے آئے تھے۔ مہاتماجی نے ان کے جسمانی ڈھانچوں کو دیکھا وہ بہت ہی دُکھی ہوئے۔ اُنھوں نے ایک مضمون میں اُڑیسہ کے ننگے بھوکے کنگالوں کا پُرزور ذکر کیا۔ میں نے کئی بار ان غریبوں کی یاد میں اُنہیں آہ بھرتے بھی دیکھا۔ ایک بڑے مکان میں وہ ٹھہرائے گئے تھے۔ ایک طرف تھا شری جگناتھ جی کا عالی شان مندر، پنڈوں اور مال دار لوگوں کی خوش حال زندگی۔ مہاتماجی کے خیر مقدم کی دھوم دھام اور دوسری طرف یہ ننگے بھوکے کنگال۔

اڑیسہ کے ہی کسی جلسہ میں مہاتماجی نے بہت معرکے کی تقریر کی جس کا اثر آج تک میرے دل پر ہے۔ جلسے میں کسی نے گاندھی جی سے سوال کیا کہ آپ انگریزی تعلیم کے مخالف کیوں ہیں۔ انگریزی تعلیم نے ہی تو راجہ رام موہن رائے لوکمانیہ تلک اور آپ کو پیدا کیا ہے۔ مہاتماجی نے جواب میں کہا۔

"میں تو کچھ بھی نہیں ہوں لیکن لوکمانیہ تلک بھی جو کچھ ہوئے اس سے کہیں زیادہ بڑے ہوتے اگر انہیں انگریزی تعلیم کا بار نہ اٹھانا پڑا ہوتا۔ راجہ رام موہن رائے اور لوکمانیہ تلک بھی شنکر آچاریہ گرونانک گرو گوبند سنگھ اور کبیر داس کے مقابلہ میں کیا ہیں؟ آج تو سفر اور تبلیغ کے اتنے ذریعے موجود ہیں۔ اُن لوگوں کے زمانے میں تو کچھ نہیں تھا۔ تب بھی اُن لوگوں نے خیالات کی دنیا میں کتنا انقلاب برپا کر دیا تھا۔"

انگریزی راج کے متعلق بھی اُنہوں نے کہا کہ مغل راج میں اکبر کے زمانے میں رانا پرتاب اور شواجی جیسے بہادروں کے لئے جو حالات درپیش تھے وہ آج کہاں ہیں۔ اِس طرح ایک بڑی موثر تقریر میں اُنہوں نے یہ دکھا دیا کہ یہ ہم لوگوں کا لوث ہے جو انگریزی تعلیم کو ہی ملکی ترقی کا سبب بتاتے ہیں۔ ہاں انگریزی جاننا بُرا نہیں۔ اُسے ہم میں سے بہتوں کو جاننا ہوگا۔ ہم اسے سیکھیں گے بھی مگر آج کل کی طرح وہ تعلیم کا ذریعہ یا وسیلہ نہ رہ سکے گی۔

اڑیسہ سے مہاتماجی کے ساتھ میں بیج واڑہ گیا۔ راستہ کے مناظر ناقابلِ بیان ہیں جیسا جوش اپنے صوبہ میں دیکھا تھا ویسا ہی آندھر دیش میں بھی دیکھنے میں آیا۔ وہی مجمعِ عوام وہی ہر چہار طرف گونجنے والے نعرے۔ اسٹیشنوں پر وہی بھیڑ بھاڑ۔ چلتی ٹرین کی لائن کے کنارے لوگوں کا وہی جگھٹ اور وہی عظیم الشان جلسے۔ مجھے یاد ہے کہ وِجے نگر میں ہم لوگ رات

کو تقریباً ۳ بجے ریل سے اُترے سارے شہر کے لوگوں نے دیوالی منائی تھی۔

ہم بہار کے نمائندے، بیج واڑہ سے واپس آتے وقت ریل میں آپس میں باتیں کرنے لگے کہ پروگرام کیسے پورا کرنا ہے۔ پٹنہ پہنچتے پہنچتے عارضی طور پر یہ طے کر لیا گیا کہ پروگرام کیسے پورا کیا جائے گا۔ روپئے جمع کرنے اور چرخے چلوانے کی طرف خاص طور پر لوگوں کی توجہ گئی۔ میں بھی دن رات سارے صوبے میں دوڑ دھوپ کرتا اور روپیہ جمع کرتا رہا۔ سب ضلعوں کے کارکن اس کام میں دل وجان سے لگ گئے۔ روپئے جیسے جیسے وصول ہوتے گئے بینک میں جمع کرادئے گئے۔ ہم لوگوں نے کئی طرح کی رسیدیں چھپوالی تھیں۔ جس سے یہ آسانی ہوگئی تھی کہ ہر شخص کو رسید لکھ کر دینے کی ضرورت نہ رہی۔ کم از کم چار آنے کی رسید تھی بڑی رقموں کے لئے رسید لکھ کر دے دی جاتی۔ اِس سے پہلے بہار میں عوامی کاموں کے لئے اس طرح کبھی عام چندہ نہ کیا گیا تھا۔ ہم بھی نہ جانتے تھے کہ ہم کہاں تک کامیاب ہوں گے۔ مگر لوگوں کا جوش دیکھ کر اُمید بڑھتی جاتی تھی۔ ہم کو بہت بڑے اور مال دار لوگوں سے بہت زیادہ نہیں ملا۔ مگر ہر ضلع میں اوسط درجے کے لوگوں نے بڑی فراخ دِلی سے چندہ دیا آخر میں ۳۰ رجون تک ہم نے تقریباً سات آٹھ لاکھ روپیہ جمع کر لیا۔ ۳۰ رجون کو گاندھی کو تار کے ذریعے اِس کی خبر دے دی گئی۔ اس کام میں سب سے زیادہ جوش ترہٹ ڈویزن کے ضلعوں نے دکھایا اگرچہ اور ضلعے بھی کچھ بہت پیچھے نہیں تھے۔ بہار کے ضلعوں میں گھومتے پھرتے کافی تجربہ ہوا۔ کہیں کہیں دل چسپ واقعے بھی ہوئے۔ ضیافتِ طبع کے لئے ایک واقعہ کا ذکر کئے دیتا ہوں۔

جون کا مہینہ تھا۔ میں تلک سوراج فنڈ کے لئے رانچی ضلع میں روپیہ جمع کرنے گیا۔ وہاں کے کارکنوں نے میرے لئے دو دن کا پروگرام ضلع کے مختلف مقاموں میں جانے

کے لئے بنالیا۔ پہلے دن رات میں موٹر پر چل کر دس بجے تک رُنڈو پہنچ کر وہاں کا کام ختم کرنا تھا۔ دوپہر کو رانچی میں واپس آکر کھانا کھانا تھا۔ دوپہر بعد کھُنٹی جانا تھا۔ رات تک پھر رانچی واپس آنا تھا۔ دوسرے دن سویرے لوہر دگّا جانا تھا وہاں سے دوپہر تک واپس آکر تیسرے پہر کی گاڑی سے پٹنہ کے لئے روانہ ہونا تھا۔

ہم لوگ رانچی میں سویرے ہی نہا دھو کر تیار ہو گئے۔ ٹیکسی آنے میں میں کچھ دیر ہو گئی ہم سات آدمی جن میں ایک ڈرائیور اور ایک کلینر تھا۔ اُس پر سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ یہ خیال تھا کہ دوپہر کو رانچی میں واپس آکر ہی کھانا کھانا ہو گا۔ اِس لئے ہم نے ساتھ میں کچھ بھی نہ لیا جو کُرتے پہنے اور چادریں لئے ہوئے تھے وہی سارا سامان تھا۔ ڈاکٹر پورن متر نے جو مقامی لیڈر تھے ساتھ میں ایک چھوٹا سا بیگ رکھ لیا تھا جس کی خبر ہم لوگوں کو اُس وقت تک نہیں تھی ہم لوگ تھوڑی ہی دُور گئے تھے کہ ایک جنگل میں پہنچنے پر موٹر میں کچھ خرابی ہو گئی۔ ڈرائیور نے مرمّت شروع کی اور کہا کہ بس دس پانچ منٹ میں تیار کر لوں گا۔ مرمّت میں دیر ہونے لگی۔ جوں جوں ہم گھبراتے وہ تسلّی دیتا جاتا۔ آخر دو تین گھنٹوں کے بعد اُس نے کہا کہ لوہار کی ضرورت ہو گی۔ تلاش کرنے پر ایک گاؤں ملا جہاں لوہار کے گھر جا کر اُس نے کچھ پیٹ پاٹ کر درست کرایا۔ جنگل میں کچھ بھی کھانے پینے کا سامان نظر نہیں آتا تھا۔ اِملی کے درخت تھے ان میں اِملی کے پھلوں کے گُچھے لٹک رہے تھے۔ ہم لوگ اُنہیں توڑ توڑ کر زبان اور دانت کھٹّے کرتے رہے۔ دوپہر کے بعد پیاس نے زور کیا۔ پھر گاؤں تلاش کرکے لوٹا بالٹی عاریتاً حاصل کی گئی۔ بہت دُور سے پانی لا کر پیاس بجھائی گئی۔

جب مرمّت کا کام جاری تھا، ایک دوسری موٹر پر سوار پولیس والے جاتے نظر آئے۔ ہم لوگوں کو دیکھ کر اُنہوں نے اپنی گاڑی روک لی۔ ہم نے اُن سے کہا کہ ہمیں رُنڈو

جلد ہی پہنچنا ہے۔ آپ وہاں کہہ دیں کہ موٹر بگڑنے کے سبب سے ہم لوگوں کے آنے میں تاخیر ہو رہی ہے۔ انہوں نے موٹر روک کر ہم لوگوں کا حال جان لینے کی شرافت تو کی تھی مگر یہ پیغام وہاں پہنچانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ وہاں جو لوگ دُور دُور کے گاؤں سے آئے تھے ہم لوگوں کا تین چار گھنٹے تک انتظار کرنے کے بعد تتّر بتّر ہو گئے۔

آخر موٹر کی مرمّت ہو گئی۔ ہم لوگ پانچ چھ بجے شام تک ٹنڈو پہنچے۔ جو لوگ اور گاؤں سے آئے تھے وہ تو چلے گئے تھے مگر خاص ٹنڈو کے لوگوں میں ہمارے پہنچنے کی خبر بات کی بات میں پہنچ گئی۔ جلسہ مرتب ہو گیا۔ حسبِ معمول وہاں بھی تقریر ہوئی۔ روپے جمع کئے گئے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہاں سات آٹھ سو روپے کے لگ بھگ رقم جمع ہوئی۔

کام ختم کر کے ہم لوگ فوراً چلنے کے لئے تیار ہوئے۔ مگر دِن بھر صرف اِملیوں پر ہی گذرا تھا۔ اِس لئے وہاں کے لوگوں نے کھانا کھلانے پر اصرار کیا اور ہم نے بھی مان لیا۔ کھانا تیار ہوتے ہوتے ۹۔۱۰ بج گئے۔ آخر کھانا کھانے کے بعد یہ سوچ بچار ہوا کہ اب کیا کیا جائے۔ اُس دِن گھُنٹی کا پروگرام چھوٹ چُکا تھا۔ دُوسرے دِن لوہر دگا کا پروگرام کسی طرح چھوٹنا نہیں چاہئے۔ تیسرے پہر کی گاڑی سے پٹنہ کے لئے روانہ ہونا بھی انتہائی ضروری تھا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہوا، خاص کر موٹر والا اس پر زور دینے لگا کہ رات کو چلنا ٹھیک نہیں ہے۔ راستہ میں جنگل ہے خطرہ ہے۔ موٹر بھی کہیں راہ میں بگڑ گئی تو رات کا وقت بڑا بھیانک ہو گا۔ میں سمجھتا تھا کہ وہ بہانہ کر رہا ہے۔ اتنی دیر تک موٹر کی مرمّت کی گئی تھی اور وہ ٹھیک چلی بھی تھی، اب کیا بگڑے گی خاص طور پر دوسرے دن کے پروگرام کی فکر تھی، میں نے بہت زور لگایا کہ نہیں، ضرور چلا ہی جائے۔

آخر کار تقریباً گیارہ بجے رات کو اسی شکستہ موٹر پر ہم سات آدمی سوار ہو کر روانہ ہوئے۔ بیچ میں تھوڑی ہی دور پر ایک گھاٹ ہے جہاں کچھ اُونچی چڑھائی ہے۔ اُس چڑھائی پر چڑھتے وقت موٹر پھر ٹوٹ گئی۔ جہاں موٹر ٹوٹی۔ وہاں تقریباً دو ڈھائی سو گز اور اُوپر چڑھنا تھا۔ اس کے بعد اُتار تھا۔ اُتار میں اگر انجن نہ بھی کام کرے تو موٹر آسانی سے چلی جائے گی، ایسا ڈرائیور نے کہا۔ ہم لوگوں نے بھی یہی فرض کیا۔ گھاٹ سے اُتر کر ہی ایک ڈاک بنگلہ تھا۔ ہم نے سوچا کہ ڈاک بنگلہ تک اگر ہم کسی طرح پہنچ جائیں تو وہاں رات آرام سے کٹے گی، ہم سو سکیں گے۔ اپنی بے وقوفی سے اور جوش کے عالم میں ہم نے طے کیا جو تھوڑی چڑھائی ہے اسے ہم لوگ موٹر ڈھکیل کر ہی پار کر لیں گے۔ اسی لئے ہم نے موٹر کو آگے ڈھکیلنا شروع کیا۔ بیس تیس گز تک موٹر ڈھکیل لے گئے۔ وہاں نشیب بہت کم تھا اور چڑھائی زیادہ۔ موٹر کا اوپر چڑھنا مشکل تھا مگر ہم لوگوں نے زور لگایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ چند گز اُوپر ڈھکیلنے کے بعد موٹر اُلٹے پیچھے کی طرف جُھکی۔ ہم اپنی جسمانی طاقت لگا کر اُسے روکنے لگے۔ کسی نہ کسی طرح اُسے ایک گڑھے میں گرنے سے ہم بچا سکے۔ اس کے بعد اب پھر ہمّت نہ ہوئی کہ موٹر ڈھکیلنے کی کوشش کی جائے۔

رات کے شاید بارہ ایک بجے ہوں گے۔ بیچ جنگل میں ہم سات آدمی اسی طرح موٹر میں بیٹھ کر آئے تھے۔ دن بھر کی تھکاوٹ کے بعد رات کو سونا بھی ضروری تھا۔ ڈرائیور اُس سُنسان جگہ کی بھیانک باتیں کہہ کر ہم لوگوں کو ڈرائے بھی جاتا تھا۔ اس نے کہا کہ یہاں یہاں درندوں اور چور ڈاکو دونوں کا ڈر ہے۔ ہم نے کہا کہ چور ڈاکو ہم سے لیں گے ہی کیا۔ ہمارے پاس تو کچھ نہیں ہے۔ ہاں اگر جنگلی جانور آ جائے تو اس کا خوف ضرور ہے۔ میں نے یہ تو کہہ دیا مگر مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ ڈاکٹر نے بُنڈو کے لِئے روپیوں کو اپنے بیگ میں

رکھ لیا تھا۔ وہ بیگ ساتھ ہی تھا۔ اُس وقت میری بات سُن کر بھی ڈاکٹر کچھ نہ بولے۔ میں بھی دوسرے دِن صُبح تک اِسی بھول میں تھا کہ ہمارے ہاتھ بالکل خالی ہیں۔

ہم صلاح کر ہی رہے تھے کہ جنگل کے اندر سے گھڑ گھڑاہٹ سُن پڑی۔ ڈرائیور تو بہت ڈر گیا۔ کہنے لگا کہ یہ بھیانک آواز بنڈ ریلے جانور کی ہے۔ کچھ ہی دیر میں آواز بند ہو گئی ہم سب تسلّی کے ساتھ اُسی طرح موٹر میں بیٹھ گئے۔ کچُھ دیر بعد جب اطمینان زیادہ ہوا تو ہم نے سوچا کہ موٹر وہیں چھوڑ دی جائے اور ہم لوگ ڈاک بنگلہ تک پیدل چل کر وہیں سوئیں۔ پھر سویرے موٹر کا کچھ انتظام کیا جائے گا۔ مگر ڈرائیور تو اس پر راضی نہ ہوا۔ جب ہم نے کہا کہ ہم لوگ چلے جاتے ہیں، تم موٹر کے پاس یہاں ٹھہرو تو رونے چلانے لگا۔

آخر یہ طے ہوا کہ تین آدمی موٹر کے پاس ٹھہر جائیں۔ باقی چار آدمی ڈاک بنگلہ پر چلے جائیں۔ رات چاندنی تھی، یہی ایک چیز تھی جس سے ہمّت بندھی تھی۔ ڈاک بنگلہ پہنچتے پہنچتے ہم لوگ پیاس کے مارے پریشان ہو گئے تھے۔ ڈاک بنگلہ میں کوئی تھا نہیں۔ دروازے بند تھے۔ ہم نے سوچا کہ دروازہ کسی طرح کھولا جائے۔ اس میں ہم کامیاب بھی ہو گئے۔ اندر سے ٹٹول کر ایک بالٹی نکالی گئی۔ دو چار پائیاں اور دو میزیں تھیں۔ وہ بھی باہر نکالی گئیں۔ مگر بالٹی سے تو پیاس بجھتی نہ تھی۔ کنوئیں اور ڈوری کی ضرورت پھر بھی رہی۔ ہم لوگ پھر ایک بار ڈاک بنگلہ کے آس پاس چوکی دار کی تلاش میں نکلے کچھ دُور پر دیکھا کہ ایک آدمی ایک بچّہ کو بغل میں لئے گہری نیند میں سویا ہوا ہے۔ اِس صحرائے لق ودق میں بچّے کے ساتھ اُس آدمی کو اِس طرح بے فکری سے سوتے دیکھ کر ہم لوگ حیرت میں رہ گئے۔ وہ بہت پکارنے پر جاگا۔ اونگھتے اونگھتے ہی اس نے کہا کہ ڈوری تو نہیں ہے مگر کنواں جنگل میں تھوڑی ہی دور پر ملے گا۔

پیاس سے ہم لوگ پریشان تھے۔ اِس لئے پھر کنوئیں کی تلاش میں نکلے۔ کنواں ملا بھی۔ اپنی چادروں کو جوڑ کر ڈوری بنائی گئی۔ اِسی سے بالٹی میں پانی نکالا گیا۔ پانی پی کر ہم لوگوں میں سے کچھ تو چارپائی پر اور کچھ میز پر سو رہے۔ سونے کا وقت تھوڑا ہی ملا۔ سویرے اُٹھ کر مُنھ ہاتھ دھو کر ہم لوگوں نے سوچا کہ یہاں تو کوئی سواری ملنے والی نہیں ہے۔ اسی لئے رانچی کی طرف ہم لوگ پیدل ہی بڑھیں۔ کوئی گاؤں مل جائے گا تو وہاں کچھ کھانے کا بھی انتظام ہو سکے گا۔

سب لوگ چلنے پر رضامند نہیں تھے اِس لئے میں اور ایک اور آدمی ہم دونوں چل دئے۔ وہاں سے تین چار میل جانے پر ایک گاؤں ملا۔ جہاں کچھ چنے مِلے۔ تقریباً نو بجے چلے تھے۔ چنے چبا کر ہم لوگ کچھ آرام کرنے لگے۔ دھوپ سخت ہو گئی تھی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ فوراً نیند آ گئی۔ تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹے کے بعد کسی نے آ کر جگایا۔ معلوم ہوا کہ رانچی کے بھائیوں نے کل دوپہر تک ہماری راہ دیکھی۔ جب ہم نہیں پہنچے تو دوسری ٹیکسی کر کے ہماری تلاش میں کچھ لوگوں کو بھیجا۔ اُنھوں نے بھول یہ کی کہ اُس ٹیکسی پر بھی تقریباً پورا بوجھ لے کر تین چار آدمی آئے۔ ہم لوگ پانچ آدمی تو موٹر والوں کو چھوڑ کر ایک گاڑی کا بوجھ پہلے سے تھے ہی۔ ہم نے کہا کہ ہم میں سے جو لوگ ابھی پیچھے چھوٹے ہیں اُن کو پہلے رانچی پہنچاؤ۔ پھر دوبارہ موٹر لے آؤ تو ہم دونوں چلیں گے۔ اُنہوں نے بھی اِسے پسند کیا۔ ہم لوگ تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ اور آرام سے سوئے۔ پھر جب موٹر تقریباً ایک بجے آئی تو رانچی گئی وہاں کچھ کھانا کھا کر دوپہر کی گاڑی سے پٹنہ روانہ ہو گئے۔

اِتنے دلچسپ تو نہیں مگر اِس طرح کے واقعات اُس زمانے میں ہوتے رہے۔

ہندو مُسلم اِتّحاد اور کھدّر کی تبلیغ

جولائی ۱۹۲۱ء میں بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کا اجلاس ہوا۔ وہاں بہار کے اور لوگوں کے ساتھ میں بھی گیا، جلسہ میں کافی جوش تھا چنانچہ فوراً ایک کروڑ روپئے جمع کرنے کا پروگرام کامیابی کے ساتھ مُلک نے پورا کرلیا۔ چرخے کے متعلّق بھی خاصا پرچار ہوا تھا ہندو مسلم اتحاد تو گویا پوری طرح قائم ہوگیا تھا۔ ہم لوگ یہ نہ سمجھتے تھے کہ یہ کبھی پھر ٹوٹے گا۔ اِن وجہوں سے اُس اجلاس میں کچھ لوگوں نے اِس بات پر بہت زور دیا کہ ستیہ گرہ شروع کرنا چاہیئے۔ اُدھر سرکار کی طرف سے بھی کچھ کارروائیاں ہورہی تھیں۔ جن سے بہت لوگ ناراض تھے۔ ہم نے اگرچہ بہت بڑی تحریک سارے مُلک میں چلا رکھی تھی۔ مگر وہ منظّم تھی۔ قانون توڑا نہیں گیا تھا۔ اگرچہ تقریروں میں کافی آزادی برتی جاتی تھی۔ کانگریسی لوگوں کے رہن سہن اور چال ڈھال میں استقلال، جوش اور سب سے بڑھ کر بے خوفی ٹپکا کرتی تھی۔ سرکار جابجا کارکنوں کو گرفتار کرلیا کرتی تھی۔ ملک کے کئی سو آدمی اس سلسلے میں جیل خانے میں تھے۔ بہار میں ہوئی گرفتاریوں اور جارحیت کا ذکر اوپر کیا جاچکا ہے۔ اِن وجہوں سے بھی لوگوں نے بہت زور دیا کہ ستیہ گرہ شروع کردینا چاہیئے۔

مہاتما گاندھی نے ابھی صبر رکھنے کی صلاح دی۔ چرخے کے پرچار اور اس کے ذریعے بدیشی کپڑوں کا بائیکاٹ ۳۰ ستمبر تک پورا کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اُنہوں نے کہا کہ جو پروگرام کانگریس نے طے کر دیا ہے اُس کو پورا کرنا چاہیئے تبھی ستیہ گرہ میں کامیابی کی اُمید کی جا سکے گی۔ اِس لئے ابھی تیاری پر زور دیتے ہوئے ستیاگرہ کا فیصلہ ملتوی رہا۔ مگر ایک دوسری چیز ایسی بھی آ گئی جس نے ستیہ گرہ کا بیج بو دیا۔ سرکار کی طرف سے اعلان کیا گیا کہ جاڑوں میں پرنس آف ویلز (ولی عہد انگلستان) سفر ہندوستان کریں گے۔ اُنہوں نے شاید سوچا تھا کہ عوام میں برٹش سرکار کے خلاف اتنا پرچار ہو رہا ہے اس کے رد کرنے میں یہ دورہ معاون ثابت ہوگا۔ وائسرائے لارڈ چیمسفورڈ نے ایک تحریر کے متعلق کہا تھا کہ اس سے میں گھبرا گیا ہوں، چکّر میں پڑ گیا ہوں۔ I am puzzled and perplexed.

اب اُن کی جگہ لارڈ ریڈنگ یہاں وائسرائے بن کر آ گئے تھے۔ یہ ہندوستان کے فرزانہ ترین مدبروں میں سمجھے جاتے تھے۔ اُنہوں نے کچھ ہی دنوں پہلے امریکہ میں سفیر کے عہدے پر رہ کر امریکہ کو انگلستان کے حق میں شریکِ جنگ کر لینے کی فراست دکھائی تھی، اور اب انگلستان کے چیف جسٹس کے عہدے پر مامور تھے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ ولی عہد انگلستان کا دورہ اِنہیں کی ذکاوت کا کرشمہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ انگریز مدبّر یہ سمجھتے ہوں کہ جیسے تقسیم بنگال کے بعد بنگال میں بہت بے چینی پھیل گئی تھی اور جب اُسے جبر و تشدد کی پالیسی سے دبایا نہیں جا سکا تو شہنشاہ جارج پنجم ہندوستان میں اپنی تاج پوشی کرانے آئے اور یہاں کے عوام و خواص نے بڑے جوش کے ساتھ اُن کا خیر مقدم کیا۔ ویسے ہی اس بار ولی عہد انگلستان کی آمد سے جذبۂ وفاداری اُمڈ پڑے گا اور تحریک خود بخود کم زور پڑ جائے گی۔ ولی عہد کے اُس وقت ہندوستان آنے کا کوئی دوسرا سبب نظر نہ آتا تھا۔

آخر آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ایک تجویز منظور کی جس میں یہ اصرار کیا گیا کہ سرکار میاں شہزادے کو لانے کا ارادہ چھوڑ دے۔ اُس میں صاف صاف کہا گیا کہ سرکار کے لئے اپنی گرتی ہوئی مقبولیت کو پھر سے قائم کرانے کے لئے ولی عہد یعنی آیندہ ہونے والے شہنشاہ کا استعمال کرنا مناسب نہیں ہے۔ یہ بھی بتا دیا گیا کہ ملک کی یہ بات اگر سرکار منظور نہ کرے گی تو مجبوراً ہم کو اِس دَورے کا بائیکاٹ کرنا پڑے گا۔ اگرچہ ولی عہدِ انگلستان کے ساتھ ہماری کوئی ذاتی مخاصمت نہیں ہے۔ بلکہ اُن کے لئے ہم لوگوں کے دلوں میں عزّت ہی ہے پھر بھی اُن کا بائیکاٹ ناگزیر ہو جائے گا۔ اِس قرار داد میں صاف صاف تنبیہہ کر دی گئی کہ سرکار کی اس چال بازی کا نتیجہ اچّھا نہ ہوگا اور مُلک میں ستیہ گرہ کرنے کی ہدایت جاری کی جائے گی۔

بقر عید کا زمانہ بھی قریب آگیا تھا۔ بہار اور اُتر پردیش میں یہ وقت ہمیشہ نازک سمجھا جاتا تھا۔ کیونکہ جا بجا گائے کی قربانی کے سلسلے میں جھگڑا فساد ہو جایا کرتا تھا۔ اِس بار سوچا گیا کہ اِس ہندو مسلم اتحاد کے زمانے میں بھی اگر بلوہ فساد ہوا تو اس کا بہت برا اثر پڑے گا۔ خیال ہوا کہ اِس موقع کا استعمال ہندو مسلم اتحاد کے بڑھانے میں کرنا چاہیئے اس کی بہت تبلیغ ہوئی۔ مہاتما جی کا نظریہ یہ تھا کہ ہم مسلمانوں سے لڑکر اُن سے گائے کی حفاظت نہیں کرا سکتے اور اُن کو مار کر ہم گئو رکشا (گائے کی حفاظت) کا اچّھا پھل بھی نہیں پا سکتے۔ اِس لئے یہ بات انہیں پر چھوڑنی چاہیئے کہ اپنے ہندو بھائیوں کے جذبات کو ٹھیس نہ پہنچا کر بھائی چارہ کے سلوک سے خود ذبیحہ گاؤ بند کر دیں۔ ہندوؤں کی زور زبردستی سے نہیں بلکہ اپنے جذبۂ محبّت اور فراخ دِلی سے۔

اِس سلسلہ میں علی برادران کے ساتھ مہاتما گاندھی نے کچھ مقامات کا دورہ بھی کیا۔

اُسی دَورے کے سِلسلے میں وہ بِہار بھی آئے۔ اِس دَورہ میں مہاتما جی شاہ آباد گئے اور پٹنہ ضلع میں بھی گئے۔ جہاں بقر عید کے موقع پر کچھ گڑبڑ کا اندیشہ تھا۔ مولانا محمد علی اور مولانا آزاد سُبحانی اُن کے ساتھ تھے۔ مہاتما جی کا پروگرام بہت ہی مصروف تھا۔ ایک دِن میں کئی جگہوں پر جلسے اور موٹر پر سفر۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دِن شام کو وہ کھانا بھی نہیں کھا سکے۔ کیونکہ غُروبِ آفتاب کے بعد وہ کھانا نہیں کھاتے تھے اور اس سے پہلے اس کے لئے وقت نہیں ملا۔ میں سفر میں ساتھ رہا۔ سب جگہوں میں آپس کے میل جول کی باتیں کہی گئیں۔ ساتھ ہی ساتھ کھدر اور چرخہ کے پرچار کی باتیں کی گئیں۔ بڑے اطمینان اور فخر کی بات تھی کہ مسلمان لیڈروں نے اگرچہ وہ قربانی دینے کا اپنا حق نہیں چھوڑنا چاہتے تھے عوام میں یہ تبلیغ کی کہ آدمی اپنا حق رکھ کر بھی اِس کے اِستعمال کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ خود کر سکتا ہے۔ اِس لئے مُسلمانوں کو چاہیئے کہ بھائی چارہ اور رواداری کے خیال سے جہاں تک ہو سکے کچھ ایسا نہ کریں جس سے ہندوؤں کا دِل دُکھے۔

اُسی زمانے میں حکیم اجمل خاں اور دوسرے لیڈروں نے بھی بڑی کرامات دکھائی نتیجہ یہ ہوا کہ اِس سال کی بقر عید صرف سُکون سے ہی نہیں گُذری بلکہ گایوں کی قُربانی اتنی کم ہوئی جتنی شاید پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ اِس بار ہندو اور مُسلمان دونوں نے ایک دوسرے کے جذبات کا احترام کیا۔ کسی طرف سے زور آزمائی کی کوشش نہیں ہوئی۔ دونوں نے ایک دوسرے کی رَواداری اور بھائی چارہ پر بھروسہ کیا۔ اُن کا یہ باہمی اعتماد ضائع نہ کیا۔

بِہار کے کچھ حصّوں میں، خاص کر شمالی بِہار کے ضلعوں میں چرخہ کا چلنا کبھی یکبارگی بند نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ بہت کم ہو گیا تھا۔ اِس تحریک سے اُسے نئی زندگی ملی۔ چرخے کی ترویج کے لئے تلک سوراج فنڈ کے روپئے بھی مِلے۔ ہمارے صوبے میں بھی کام شروع

کیا گیا۔ کام تو ہم کے شروع کیا مگر ہمیں اصطلاحی (ٹیکنیکل) واقفیت کچھ بھی نہ تھی۔ جوش تھا، مگر کاروباری صلاحیت نہیں تھی۔ اِس لئے جو کام اُس زمانے میں ہوا اس کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ کھدّر کا پرچار تو ہوا مگر رقم کا خاصا نقصان ہوا۔ جب میں گاندھی جی کی اِس بات پر غور کرتا ہوں، جو اُنہوں نے تحریک کے آغاز میں کہی تھی تو مجھے اُن کی دُور اندیشی اور صلاحِ کار کی اور بھی روشن مثال مل جاتی ہے۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ ہمارے قومی اسکولوں کو چرخہ گھر ہونا چاہیئے۔ اور اسی کا علم حاصل کرنے اور بڑھانے میں قومی اِداروں کو لگ جانا چاہیئے۔ چرخے کے ذریعے ہی ہم نوجوانوں کو ہزاروں کی تعداد میں کام دے سکیں گے اور مُلک کی افزائشِ دولت میں معاون ہو سکیں گے اُنہوں نے سابرمتی آشرم میں صنعت گھر کھول کر چرخہ کے متعلق ریسرچ کا کام بھی جاری کرا دیا مگر قومی تعلیم کے ماہر اس راز کو پوری طرح نہیں سمجھ سکے۔ اُنہوں نے ودیاپیٹھوں (قومی یونیورسٹیوں) اور اُن سے وابستہ درس گاہوں کو چرخہ گھر نہیں بنایا۔ اگرچہ سبھی جگہوں میں چرخہ چلانا ایک لازمی سبق قرار دیا گیا تھا۔

چرخے چلنے لگے مگر اصلاحی واقفیّت تو معلّموں کو تھی ہی نہیں بچّوں کو وہ کیا سکھاتے اِس طرح اندھوں کی رہنمائی اندھے کرنے لگے۔ اِسی لئے کچھ دنوں تک چرخہ ٹھیک راستہ پر نہیں آسکا۔ آج ہم اس کوتاہ بینی کے لئے کسی کو قصوروار قرار نہیں دے سکتے۔ کیونکہ ایسا ہونا قدرتی سا تھا۔ سب لوگوں کی آنکھیں آنے والے سوراج کی طرف لگی تھیں، جسے ایک سیاسی انقلاب تک محدود سمجھا جاتا تھا۔ کانگریس کے اندر بھی کچھ لوگ، خاص کر مہاراشٹر والے۔ کھدّر اور چرخے کی مخالفت کرتے ہی رہے مگر اِن خامیوں کے رہتے ہوئے بھی کھدّر کا پرچار ہوا۔ ابھی خالص اور غیر خالص کھدّر کا فرق لوگ اتنا نہیں سمجھتے تھے۔ جو موٹا کپڑا ہاتھ کرگھے کا بنا ہوا ہوتا اُسے ہی کھدّر سمجھ کر خریدتے۔ مہاتما جی نے کہا تھا کہ ستیہ گرہ کے لئے کھدّر کی تبلیغ

انتہائی ضروری ہے اور اس تبلیغ کا ثبوت آنکھوں کے سامنے آنا چاہیئے۔ یعنی جب چاروں طرف ہم لوگوں کو کھدّر پہنے دیکھیں گے تو سمجھ لیں گے کہ اب اس کی ترویج ہو گئی۔ اِس کے لئے کتابوں، مضمونوں اور اخباروں میں چھپے اعداد و شمار میں یا کسی سے پوچھ کر ثبوت ڈھونڈھنے کی ضرورت نہ ہو گی۔

بہار کے اس دورے میں گاندھی جی نے کھدّر پر بہت زور دیا۔ کوکٹی نام کا کپڑا جو دربھنگہ ضلع میں مدھوبنی علاقے میں بنتا تھا۔ کافی مہین، خوب صورت ملائم ہوتا ہے اُسے دیکھ کر لوگ حیرت میں رہ جاتے تھے۔ اس کا بیوپار ابھی تک ختم نہیں ہوا تھا۔ اِس کا خاص سبب یہ تھا کہ اس کپڑے کا خرچ نیپال دربار میں اور وہاں کے رئیسوں میں کافی تھا۔ وہاں کے لئے ہی یہ کپڑا خاص کر اُس علاقے میں جو نیپال کی سرحد پر ہی ہے بہت بنا کرتا تھا۔ اس علاقے کی بنی ہوئی کچھ دھوتیاں بھی پیش کی گئیں جنھیں دیکھ کر مجھے یہ یاد ہے کہ مولانا محمد علی مطمئن ہوئے تھے، بہار شریف جیسے مومنوں کے ایک خاص بڑے مقام پر گاندھی جی گئے اور اُن لوگوں نے مدد کرنے کا وعدہ بھی کیا۔

بہار کا دَورہ ختم کرنے کے پہلے گاندھی جی اپنے ساتھیوں کے ہمراہ پٹنہ آئے صداقت آشرم میں ٹھہرے۔ آل انڈیا کانگریس کی نو ساختہ ورکنگ کمیٹی کا چناؤ ہوا تھا۔ میں بھی ممبر منتخب ہوا تھا۔ اِس لئے میں بھی اس اجلاس میں شریک ہوا۔ اِس نشست میں خاص کر اِسی بات پر زور دیا گیا کہ بدیشی کپڑے کے پروگرام کی تکمیل ہونی چاہیئے اور اِس کے لئے چرخے کا پرچار ضروری ہے۔

بہار سے گاندھی جی کلکتہ ہوتے ہوئے آسام چلے گئے۔ میں بہار میں کھدّر کی تنظیم اور کھدّر کا پرچار کرنے کے لئے پھرنے لگا۔ صوبائی کانگریس کمیٹی نے اس کام کے لئے کچھ لوگوں

کی ایک کمیٹی بنادی۔ سبھی ضلعوں میں اِس کام کے لئے کچھ لوگ مقرر کر دئے گئے۔ کام خوب زوروں سے چلنے لگا۔ سرکار بھی اپنی طرف سے چُپ نہیں رہی۔ اُس کو خطرہ ہوگیا کہ بدیشی کپڑوں کی دُکان پر دھرنا دیا جائے گا۔ کانگریس نے کپڑے کے تاجروں سے یہ اصرار کیا کہ وہ بدیشی کپڑا بیچنا بند کر دیں اور اُن کے پاس جو بدیشی کپڑے ہیں انہیں غیر ملکوں میں جاکر فروخت کریں۔ ہندوستان میں یہیں کے بنے ہوئے کپڑے بیچیں۔ اِسی فیصلہ سے ڈر کر بہار گورنمنٹ کے چیف سکریٹری مسٹر سفٹن نے ایک نیا اعلان شائع کیا جس میں ضلع کے افسروں کو حوصلہ دلایا کہ وہ بدیشی کپڑے کے حق میں تبلیغ کریں۔ اور عوام کو یہ بتائیں کہ بدیشی کے بغیر لوگوں کو بہت تکلیف ہوگی۔ کپڑا بہت مہنگا ہو جائے گا۔ جہاں کہیں کانگریسی لوگ زور لگائیں گرفتار کئے جائیں۔ اِس قسم کا اعلان چیف سکریٹری رینی نے ترکِ موالات کے متعلق نکالا تھا۔ اب بدیشی کپڑے کو لے کر اور بھی زور دار پالیسی کا اعلان حکومت نے کر دیا۔ معلوم ہونے لگا کہ ایک نہ ایک دن مڈبھیڑ ہونی ہے۔ مگر ہم اپنا کام استقلال مگر صبر سے کرتے گئے۔ کام بہت زوروں سے بڑھتا گیا۔

گاندھی جی آسام کا دورہ ختم کرکے کلکتہ واپس آئے۔ وہاں پھر ورکنگ کمیٹی کی نشست ہوئی جس میں شریک ہونے کے لئے میں وہاں گیا۔

موپلہ بغاوت اور ہندو مسلم سوال

گاندھی جی کلکتہ سے مدراس کی طرف چلے گئے۔ اُسی دورے میں کہیں انھوں نے لنگوٹی پہننے کا اعلان کر دیا۔ مولانا محمد علی جو دورہ میں ساتھ تھے۔ والٹیر اسٹیشن پر گرفتار کر لئے گئے۔ وہ دوسرے کئی لیڈروں کے ساتھ جن میں مولانا شوکت علی، ڈاکٹر کچلو، مولانا حسین احمد مدنی مولانا نثار احمد، پیر غلام مجدّد اور شری بھارتی کرشن تیرتھ، شنکر آچاریہ بھی تھے کراچی میں خلافت کانگریس کی تقریر اور فتوے کی تبلیغ کے لئے عدالت پیش کئے۔ اِس مقدمے نے بھی مُلک میں بڑی کھلبلی پیدا کر دی۔ مولانا محمد علی نے اپنی صفائی میں جو بیان دیا اُس کی وجہ سے اور ان صاحبان کے بیان کے سبب سے جو اِس میں ملزم تھے، یہ ایک بڑا اہم مقدمہ ہوگیا۔ آخر شری شنکر آچاریہ کو چھوڑ کر سب کو سزا ہوئی۔

اِس پر ورکنگ کمیٹی کی نشست بمبئی میں ہوئی اور اُس نے اجازت دے دی کہ جس فتوے کے لئے ان لیڈروں کو سزا ملی ہے وہ سبھی جگہوں پر بڑے بڑے جلسوں میں دُہرایا جائے۔ بمبئی میں ورکنگ کمیٹی کے جو ممبر جمع ہوئے تھے اور دوسرے ممبروں نے اپنے دستخط سے ایک اعلان نکالا جس میں وہی باتیں دُہرائی گئی تھیں جن کی بِنا پر کراچی کا مقدمہ چلا تھا۔ اس اعلان پر دستخط کرنے والوں میں میں بھی تھا۔ سارے ملک میں بے شمار

جلسے ہوئے اور اَن گنت لوگوں نے اس فتوے کو دُہرایا۔ سرکار نے کچھ نہیں کیا بلکہ ہکّا بکّا ہو کر رہ گئی۔ جس فتوے کو صرف مسلمان مانتے تھے اُسی فتوے کو اِس طرح نہ جانے کتنے ہندوؤں نے دُہرایا اور یہ دکھا دیا کہ وہی کام جسے اگر تھوڑے لوگ کریں تو قانوناً جُرم ہو جاتا ہے اگر سارا ملک منظّم طور پر کرے تو جرم نہیں رہ جاتا ستیہ گرہ کا یہ ایک عمدہ نمونہ مُلک کے سامنے پیش ہو گیا۔

عین اُسی زمانے میں بہار صوبائی سیاسی کانفرنس کا اجلاس بہت دھوم دھام سے آرہ میں مولانا محمد شفیع کی صدارت میں ہوا۔ میں اُس میں ایک ہی دن شامل ہو سکا۔ کیونکہ مجھے ورکنگ کمیٹی میں حصّہ لینے کے لئے بمبئی جانا پڑا۔ پھر بھی آرہ میں جوش بہت تھا۔ ساتھ ہی وہاں صوبائی خلافت کانفرنس بھی ہوئی جس میں بہت سے ہندوؤں نے خلافت فنڈ اور سمرنا فنڈ کے لئے روپئے جمع کرنے کا قول و قرار کیا اور روپئے جمع بھی ہوئے۔

جب مہاتما جی اسی سفر میں تھے خبر ملی کہ ملابار میں موپلوں نے سرکار کے خلاف بغاوت کر دی ہے۔ شروع میں اس طرف پوری خبر پہنچ نہ پائی مگر رفتہ رفتہ خبر ملنے لگی۔ مولانا محمد علی کا وہاں جانے کا ارادہ تھا مگر وہ گرفتار کر لئے گئے۔ مہاتما جی بھی جانا چاہتے تھے مگر اُنہیں بھی اجازت نہیں ملی اور وہ روک دئے گئے۔ اگر یہ حضرات وہاں جانے پاتے تو شاید اس تحریک کی وہ صورت نہ ہوتی جو اُس نے اختیار کر لی اور جس کی اتنی اشاعت کی گئی۔ پہلے تو موپلوں نے سرکاری عہدہ داروں اور ریل اور کچہریوں وغیرہ پر حملہ کیا مگر کچھ دنوں بعد خبر پھیلنے لگی کہ انہوں نے ہندوؤں پر بھی حملے شروع کر دئے ہیں اور اُنہیں مارنے اور زبردستی مسلمان بنانے لگے ہیں اس خبر سے ہندوؤں میں بڑی کھلبلی مچ گئی ایک طرح سے تو آپس میں بددلی کا بیج بو گیا جو ہندو مسلم اتّحاد ایک طریقہ پر قائم ہو گیا تھا وہ اِس ایک واقعہ

سے لرزاں سا نظر آنے لگا۔ کچھ ہندوؤں پر خاص کر جو سرکار نے اشاعت دی اس کی وجہ سے اس کا کافی اثر پڑنے لگا۔ مگر ابھی تک بات بہت بگڑی نہیں تھی۔ اگر چند مہینوں کے بعد دوسرے واقعات جنہوں نے ہندو مسلم فساد کی صورت اختیار کر لی نہ ہوئے ہوتے تو ۱۹۲۰ء کے اتّحاد کا نظارہ ہمارے سامنے آتا ہی رہتا۔ مگر شُدنی تو کچھ اور ہی تھی۔

گاندھی جی کا خیال ہے کہ اُنہوں نے خلافت کے متعلق، مسلمانوں کی جو کچھ مدد کی وہ ٹھیک ہی کیا اس کے لئے اُنہیں آج تک ذرا بھی پچھتاوا نہیں ہے۔ اُنہوں نے جو کچھ کہا یا ہندوؤں نے اُن کے ایما پر کیا وہ مناسب اور منصفانہ تھا۔ جب ایک گھر میں دو بھائی رہتے ہوں تو ایک پر اگر کسی طرح کی مصیبت آجائے تو دوسرے کا فرض ہے کہ اُس کی مدد کرے۔ اِس میں یہ خیال نہیں کرنا چاہیئے کہ اِس امداد کے بدلے میں مصیبت زدہ بھائی امداد دینے والے کے ساتھ کیا سلوک کرے گا یا اِس سلوک کو بھول جائے گا۔ اپنا فرض پورا کرنا ہی انسان کے لئے کافی ہونا چاہیئے۔ اُس کی تکمیل یا بدلے کی اُمید بے کار ہے۔ اِس کے علاوہ میں سمجھتا ہوں کہ اُنہوں نے مسلمانوں کی مدد اِس ملک کے مفاد کو پیشِ نظر رکھ کر بھی کی تھی کیونکہ وہ مانتے تھے کہ ہندو مسلم اِتحاد ملک کی فلاح کے لئے ضروری ہے اور اِس خدمت کے ذریعے وہ ہندوؤں کی خاطر مسلمانوں سے حفاظتِ گاؤ کی بھی اُمّید رکھتے تھے۔

دوسری طرف لوگوں کا یہ خیال تھا کہ خلافت کی تحریک کو جو ایک مذہبی تحریک تھی اِس طرح مدد دے کر مذہبی کٹّر پن کو ہی مدد پہنچائی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلم عوام میں کٹّر پن بڑھ گیا جو وقت گذرنے پر اتنا خطرناک ہو گیا کہ تمام ملک میں — جیسے ہی یہ تحریک کچھ کمزور پڑی — ہندو مسلم بلوے، فساد شروع ہو گئے۔ اِتنا ہی نہیں مسلمانوں میں اِتنی اور

بیداری آگئی کہ وہ مذہبی معاملوں کے علاوہ سیاسیات میں بھی کٹّرپن دکھانے لگے اور جب کچھ دنوں بعد ترکی نے ہی خلیفہ کو نکال دیا اور اِس طرح سے خلافت کی جڑ کٹ گئی، تو یہ بیداری ہندوستان کی سیاست میں پوری طرح مسلمانوں کو کٹّر بنانے میں معاون ہوئی۔ اگر اتنا ہی ہوتا تو کوئی ہرج نہیں تھا۔ مگر یہ کٹّرپن مذہبی ہونے کے سبب سے مسلمانوں میں سیاسی غلبہ قائم کرنے کا جذبہ پیدا کرنے لگا۔

کوئی بھی عمل اپنے ردِّعمل کے بغیر نہیں رہتا۔ کٹّرپن ہندوؤں میں بھی آنے لگا۔ ایک طرف مسلمانوں نے تبلیغ یعنی ہندوؤں کے تبدیلِ مذہب کے لئے عوام میں پرچار کرنا شروع کیا اور دوسری طرف ہندوؤں نے شدھی اور سنگھٹن کا بگل بجایا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آہستہ آہستہ بددلی بڑھتی گئی۔ آج دونوں کے درمیان بہت وسیع اور گہری خلیج سی پیدا ہو گئی ہے جس کا اس وقت پُر ہونا یا پار کرنا کسی طرح پر بھی مشکل ہی نظر آتا ہے۔ برٹش سرکار اِس موقع پر کیسے چوک سکتی تھی۔ وہ وقت وقت پر اپنے چھل بل سے کام لینے سے باز نہیں آئی۔ وہ چھوٹی سی چنگاری کو بڑی عقل مندی سے ہوا دیتی گئی۔ اب وہ ایک شعلہ کی صورت اختیار کر چکی ہے اور وہ (برٹش سرکار) اس میں گھی ڈالنے سے باز نہیں آتی۔

یہاں میں نے تھوڑے سے لفظوں میں ایک طویل داستان کہہ ڈالی۔ ایسا نہ سمجھنا چاہئے کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ سب کچھ ۱۹۲۱ء میں ہی ہو گیا تھا۔ اس زمانے میں تو کسی طرح زمین پر بیج پڑ گیا جس کو شاید بہتوں نے گرتے دیکھا بھی نہیں اور اگر دیکھا بھی تو اسے چنداں اہمیت نہیں دی کیونکہ باوجود موپلہ بغاوت کے ابھی تک سارے ملک میں اتّحاد ہی اتّحاد دیکھنے میں آتا تھا جس کا سب سے نمایاں ثبوت ان جلسوں سے ملا جو فتوے دُہرانے کے لئے سارے ملک میں کئے گئے اور جس کا مزید ثبوت ولی عہدِ انگلستان کے آنے پر ملک بھر میں

بائیکاٹ سے ملا۔

یہاں اِن دونوں طبقات خیال کے بارے میں اتنا ہی کہہ دینا چاہتا ہوں کہ دونوں کے نقطۂ نظر میں بڑا فرق ہے۔ مسلمان چاہے جس طرح ہندوستان میں آئے ہوں اور چاہے جیسے اُن کی تعداد بڑھی ہو آج وہ ہندوستان کے ویسے ہی باشندے ہیں جیسے ہندو۔ اُن کے لئے بھی کوئی دوسرا ملک نہیں ہے۔ اُن کی ہمدردی دوسرے ملک کے مسلمانوں کے ساتھ خواہ کتنی ہو اور بحث کے لئے یہ بھی مان لیا جائے کہ اُن کو اگر اِس بات پر انتخاب کا موقع ملے تو وہ کسی پُر آشوب زمانے میں اپنے ہمسایہ غیر مُسلموں کو چھوڑ کر دور دراز کے غیر ملکی مسلمانوں کے ساتھ ہی اپنی ہمدردی رکھیں گے اور زیادہ سے زیادہ اس کا اظہار کریں گے تب بھی اِس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اِسی مُلک کے اندر اُن کا بھی مرنا جینا۔ سُکھ دُکھ اور زندگی کے سبھی ارمان پورے کرنا اور مصیبتیں جھیلنا ہے۔ مرنے کے بعد بھی وہ مُلک کے کچھ حصّہ پر قبضہ جمائے رکھتے ہیں۔ ہندو مرنے کے بعد جلا دیا جاتا ہے اور اس کے پنج عناصر[1] کے جسم کا وجود کہیں نہیں رہ جاتا جو تھوڑی بہت راکھ کی صورت میں رہ جاتا ہے اُسے بھی ہوا اُڑا لے جاتی ہے یا پانی بہالے جاتا ہے مگر مسلمان تین چار ہاتھ زمین لے کر مستقل طور پر یہیں کی زمین پر پڑا رہتا ہے یہ بات کون نہیں جانتا کہ اِن قبروں کی وجہ سے کتنے جھگڑے اُٹھا کرتے ہیں اس لئے ہم کو یہ مان ہی لینا پڑے گا کہ مسلمانوں کو اِس مُلک میں غیر نہیں سمجھ سکتے۔

اب سوال یہ ہوتا ہے کہ مسلمان اگر غیر نہیں ہیں تو اِن کا بھی اس مُلک کے ساتھ وہی تعلق ہے جو اور کسی کا اِس لئے اِن کو بھی یہاں کی سبھی چیزوں میں حِصّہ مِلنا چاہیے۔ سیاسی اختیارات

---

[1] ہندوؤں میں یہ پنج عناصر پانی، مٹّی، ہوا، آگ اور آکاش (خلا) مانے جاتے ہیں۔

کی تقسیم میں بھی ان کا حصّہ مسلّم ہے۔ اِس سے انکار کرنے کا ایک ہی مطلب ہے جو ممکن ہو سکتا ہے وہ یہ کہ ان کو دبا کر اِن حقوق سے محروم رکھا جائے۔

جو باتیں مسلمانوں کے متعلق کہی گئی ہیں۔ وہ باتیں سبھی مذہبوں، فرقوں اور طبقات خیال پر عائد ہوتی ہیں۔ جس مُلک میں اتنی ذاتیں، اتنے مذہب، اتنی زبانیں اتنے مختلف عقیدے ہوں وہاں آپس کے اتّحاد میں اگر استقلال نہ ہو تو باہمی اعتماد اور محبّت کی بنیاد پر امن و امان کبھی مستقل نہیں ہو سکتا۔ جو جب چاہے گا دوسروں کو دبا سکے گا۔ اپنا غلبہ قائم کرے گا۔ مگر دبے ہوئے لوگ پھر اُٹھ کھڑے ہونے کی کوشش میں ہی لگے رہیں گے نہ خود چین سے رہیں گے نہ دوسروں کو رہنے دیں گے۔ آج جو منظر اس عالم گیر جنگ میں ہم ٹکرتی ہوئی قوتوں کا دیکھ رہے ہیں وہی منظر کچھ چھوٹے پیمانے پر ہندوستان میں برابر ہی بنا رہے گا۔ یہ کوئی دُور اندیشی یا عقل مندی کا ثبوت نہیں ہے۔ ہم آج کی اس خطرناک مارکاٹ کو دیکھتے ہوئے بھی اگر اس راز کو نہ سمجھیں اور اس ملک کو اِس طریقے کی تباہی سے بچانے کی تدبیر نہ سوچیں تو ہمارے لئے یہ شرم اور دُکھ نیز ہنسی کی بات ہو گی۔ گاندھی جی نے اس مطمحِ نظر کے مطابق شروع سے ہی اہنسا (عدمِ تشدّد) پر زور دیا ہے۔ جس کی ضرورت ہندوستان جیسے ملک کے لئے سب سے زیادہ ہے۔

عدمِ تشدّد کا عُنصر

عدم تشدد کا عنصر بہت لطیف ہے۔ اس کو زندگی میں اُتارنا بہت مشکل ہے۔ اس کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے ہی کچھ لوگ اس کی طاقت اور ارتسام کا مضحکہ اُڑاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کی وجہ سے آدمی بزدل ہو جاتا ہے۔ آج تک دنیا کے کسی مُلک نے اِسے اپنے قومی پروگرام میں منظور نہیں کیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اِس کے ذریعے آزادیِ وطن کی حفاظت نہیں ہو سکتی معمولی عوام کی کون کہے۔ بڑے بڑے سمجھ دار اور ضابط آدمی بھی غصّہ کو نہیں روک سکتے۔ غصّہ ہی تو تشدّد کا خالق بلکہ دوسری شکل ہے۔ اس لیے اس کا چلن کبھی رائج نہیں ہو سکتا۔ یہ ناقابلِ عمل ہے —— وغیرہ

اِس موضوع پر غور کرتے وقت پہلی بات یہ مان لینی چاہیئے کہ تشدّد میں بزدلی ہے عدم تشدّد میں نہیں جہاں بزدلی آگئی وہاں عدم تشدّد رہ نہیں سکتا۔ ہم اگر اپنے مخالف سے ڈرتے ہیں اور اِس ڈر سے اُس کا نقصان نہیں کرنا چاہتے تو اِس میں عدم تشدّد کیسے ہو سکتا ہے۔ مخالف کو نقصان نہ پہنچانے کا رجحان خوف کی وجہ سے ہے نہ کہ نقصان پہنچانا ہی بُرا ہے۔ جو انسان اِس طرح ڈر کے مارے نقصان نہیں پہنچاتا اُس کو اگر آج یا کل موقع

مل جائے، کسی طرح دوسرے کی طاقت کا سہارا بھی مل جائے اور اس کا خوف دُور ہو جائے تو وہ بلا تامل اور بلا تکلف مخالف پر وار کر دے گا۔ اُس سے جہاں تک ہو سکے گا اس کا ستیاناس کرے گا۔ یہ عدمِ تشدّد ہرگز نہیں۔ عدمِ تشدّد اُسی میں ہو سکتا ہے جو یہ محسوس کرتا ہے کہ نقصان پہنچانا ہی بُرا ہے۔ دوسرے کو دکھ دینا غیر منصفانہ ہے۔ اِسی یقین سے وہ دکھ پہنچانے سے ہچکتا ہے۔ اُس کا یہ رجحان کسی کو نقصان پہنچانے کی طاقت پر منحصر نہیں رہتا۔ اُس میں اگر طاقت نہ بھی ہو اور وہ اس جذبہ سے متاثّر ہو کر نقصان پہنچانے کا خیال تک نہ کرے تو بھی اس کا رجحان غیر متشدّدانہ ہو گا۔ اور اگر طاقت ہونے پر بھی وہ نقصان پہنچانے پر راغب نہیں ہوتا تو اُس کے غیر متشدّد ہونے میں کسی کو شک ہی نہیں ہو سکتا۔ جب آدمی اِس طرح اس جذبے سے متاثّر ہو کر دوسرے کو تکلیف نہیں دینا چاہتا تو اُس کے ساتھ اگر اُس کا مخالف اس پر کچھ زیادتی اور ظُلم بھی کرتا ہے تو اُسے برداشت کرنے کی طاقت اُس میں ہونی ہی چاہیئے۔ اگر کوئی کسی بے انصافی کو اِس لئے سر کر لیتا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو شرارت پسند اور بھی ایذا پہنچا سکتا ہے اور اِس لئے من مار کر اُسے سہہ لینا ہی ٹھیک ہے تو یہ غیر متشدّدانہ رجحان نہیں ہے، یہ بُزدلی ہے۔ غیر متشدّدانہ رجحان یہ ہے کہ ہم جو درست اور منصفانہ سمجھتے ہیں اُسے کرتے ہی جائیں گے۔ بے خوف ہو کر اپنے فرض پر ڈٹے رہیں گے اور انصاف شکن چاہے کتنا ہی ظلم کرنا چاہے، کرے مگر ہم اپنے فرض سے نہیں گریں گے۔ اور انصاف شکن سے بدلہ لینے کے جذبے سے مشتعل ہو کر اُس کے ساتھ کوئی طاقت آزمائی نہ کریں گے۔ جہاں اس طرح اپنے طے شدہ راستے سے ہم نہیں ہٹتے اور اپنی راہ پر ڈٹے رہنے کے سبب سے جو بھی ظلم انصاف شکن کرتا ہے اُسے سہہ لیتے ہیں اور ساتھ ہی اُسے ایذا نہیں پہنچاتے تو سچّے غیر متشدّد انسان کا سہارا ہمارا

سلوک ہوتا ہے ۔اِس سے واضح ہے کہ عدم تشدد کے عمل میں بزدلی نہیں ہے ۔اِس میں تکلیف سہنے میں ڈر نہیں ہے ۔ یہ تبھی ہو سکتا ہے جب اپنے حق میں منصفانہ عمل ہونے میں پورا الیقین ہو اس کی تائید کے لئے مصمم ارادہ ہو اور مخالف کا ایذا نہ پہنچانے کا پختہ خیال ہو۔آخر میں غیر متشدد انسان کی ہی فتح ہوتی ہے ۔

اگر یہ کہا جائے کہ اِس طرح کی قوتِ برداشت تو انسان میں اور خاص کر عوام میں پیدا کرنا مشکل ہے تو اتنا ہی کہنا کافی ہو گا کہ جو لوگ لڑائی میں ہتھیاروں سے لڑتے ہیں ،اُن میں بھی تو عام طبقہ کے لوگ ہی رہتے ہیں جن کو اگر یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو اتنی بہادری نہیں دکھا سکتے جتنی وہ میدانِ جنگ میں دکھاتے ہیں صرف مشق اور عملی مطالعہ کی ضرورت ہے فوج کے سپاہی میں بھی بہادری مشق کے ذریعے ہی پیدا کی جاتی ہے ۔مگر وہ بہادری خوف پر منحصر ہے ۔مخالف کو مارنا ہی چاہیئے نہیں تو وہ مار ڈالے گا۔ مخالف کے ذریعے مارے جانے کا خوف ہی ایک نہایت زبردست سبب بہادری کا ہوتا ہے اور اس کے ماسوا سبھی منظم فوجوں میں ضابطہ کی کارروائی کا خوف بھی تو رہتا ہی ہے ۔جو بات تلسی داس جی نے ماریچ کے متعلق کہی ہے وہ یہاں بھی صادق آتی ہے

اُبھے بھانت دیکھا نج مرنا۔

(دونوں طرح اپنا مرنا دیکھا۔)

جب انسان ایک طرح سے قدرتاً بہادری کرنے لگتا ہے ۔یہ بہادری بہت مشق سے آتی ہے ۔غیر متشددانہ بہادری بھی اِسی طرح مشق چاہتی ہے

غیر متشددانہ مشق دوسری طرح کی ہوتی ہے ۔ فوج میں روز روز قواعد کثرت بیدردانہ شکار کرائے جاتے ہیں ۔غیر متشددانہ مشق اس سے بالکل مختلف ہوتی ہے ۔اُس کا ذریعہ

اگر ایک لفظ میں کہنا چاہیں تو وہ خود ضبطی ہے۔یہی خود ضبطی وسیع معنی میں اُن تمام ضابطوں کے لئے رائج کی گئی ہے جس کا ذکر ہندوؤں کے اور دوسرے مذہبوں کے مقدس صحیفوں میں پایا جاتا ہے۔یہ معمولی اخلاق کے ضابطے سختی سے بروئے کار لاکر سیکھے جاتے ہیں۔ان سب ضابطوں کا رُخ عدمِ تشدد اور سچائی کی طرف ہی ہوتا ہے۔گاندھی جی نے بار بار لکھا ہے کہ خدا پر اعتقاد اس میں بہت معاون ہوتا ہے اگر اس غیر متشدّدانہ رجحان کو بیدار اور مضبوط کرنے میں وقت لگایا جائے، بچپن سے ہی مطالعہ کرایا جائے، اور اس پر پوری توجہ کی جائے تو بے خوفی وغیرہ جو اس کے خاص بیرونی روپ دیکھنے میں آتے ہیں فردی حاصل کئے جاسکتے ہیں۔یہ کہنا کہ یہ انسان کے لئے ممکن نہیں ہے، بے بنیاد بات ہے۔

ایک وقت تھا جب سبھی ملکوں میں عوام میں سے تھوڑے ہی لوگ لڑنے کا پیشہ اختیار کرتے تھے یا اُسے اپنا دھرم (فرض) سمجھا کرتے تھے اور عوام کا معمولی طبقہ فوج اور لڑائی سے الگ رہا کرتا تھا۔ہندوستان میں لڑائی کشتریوں کا ہی دھرم سمجھا جاتا تھا۔برٹش سرکار بھی ہندوستان میں کچھ خاص ذاتوں یا صوبوں کے لوگوں کو ہی جنگ جویوں میں شمار کرتی تھی۔اور اُن میں سے ہی فوج کے لوگ بھرتی ہوا کرتے تھے مگر آج کل کی تباہ کُن جنگِ عظیم نے یہ ثابت کر دیا کہ لڑائی کے لئے سبھی تیار کئے جاسکتے ہیں۔اور جس ملک نے اس راز کو جتنی جلد سمجھا اور لوگوں کو جنگی تعلیم دینے کا جتنا اچھّا انتظام کیا وہ اُتنی ہی جلد اور زیادہ تیار ہو گیا۔ہندوستان میں بھی اس جنگِ عظیم میں وہ پابندیاں نہیں رہیں جو پہلے رہا کرتی تھیں اور اِن ذاتوں اور صوبوں میں کافی بھرتی ہوئی ہے جنہیں پہلے جنگ جو نہیں مانا جاتا تھا۔یہ ظاہر ہے کہ جس طرح آج کی فوج تمام طبقوں اور خطّوں کے لوگوں سے بنی ہے اور بہادری کے ساتھ لڑی ہے اسی طرح غیر متشدّد فوج بھی عوام سے تیار کی جاسکتی ہے بلکہ ایسی غیر متشدّد فوج کی بھرتی کے لئے

میدان اور بھی زیادہ وسیع ہو سکتا ہے۔ مسلح فوج کے لیے جسمانی طاقت ضروری ہوتی ہے۔ اس لئے بوڑھے، کم عمر بچّے، اور بڑی حد تک عورتیں اس کے لئے موزوں نہیں سمجھی جاتیں۔ غیر متشدّد فوج میں بوڑھے، بچّے، عورتیں اور یہاں تک کہ اندھے، لولے، لنگڑے بھی شریک ہو سکتے ہیں کیونکہ اس میں وہ جسمانی طاقت اِتنی ضروری نہیں ہے۔ دل کی مضبوطی اور روحانی قوت ہی کافی ہے۔

غیر متشدّدانہ عمل کا ایک بہت اہم نتیجہ یہ ہے کہ اِس میں جو شریک ہوتا ہے، وہی اپنے لئے مُصیبت کو دعوت دیتا ہے۔ دوسرے ایذا اور مُصیبت کے حِصّہ دار نہیں ہوتے کیونکہ دوسروں کو ایذا پہنچانا مخالف کو بھی مرغوب نہیں ہوتا اور نہ اس ایذا کے ذریعے وہ اپنا حصولِ مطلب ہی کرنا چاہتا ہے۔ اُس کا مطلب تو مخالف کو بھی اپنے حق میں کر لینا ہوتا ہے اور وہ طاقت کے استعمال سے نہیں، محبّت کے استعمال سے اور مخالف بھی اس قسم کے جذبات کو بیدار کر کے۔ اِس لئے غیر متشدّد عمل میں کم سے کم ایذا ہوتی ہے۔ جہاں طاقت کا استعمال ہے وہاں فریقین پر مُصیبت ہوتی ہے۔ اِس میں صرف ایک ہی فریق اپنے اوپر مُصیبت لیتا ہے۔ مُصیبت کی مقدار اس طرح یوں ہی آدھی رہ جاتی ہے مگر یہ مقدار آدھی سے بھی بہت کم ہوتی ہے۔ کیونکہ ایک فریق طاقت کے استعمال سے ایذا نہیں پہنچاتا وہاں دوسرے کے بھی ہاتھ کم زور پڑ جاتے ہیں اور ہتھیار کُند پڑ جاتے ہیں۔ بازوؤں میں زور آزمائی کی طاقت اندرونی غصّہ سے بڑھتی ہے اور وہ غصّہ قوت کے استعمال کے مخالفانہ ردِّعمل سے جتنا بڑھتا ہے اُتنا غیر متشدّدانہ ردِ عمل سے نہیں بڑھتا۔ اِس لئے اگر دونوں فریقوں میں ایذاؤں، اور مُصیبتوں کا جائزہ لیا جائے تو اِس میں شک نہیں کہ غیر متشدّدانہ عمل میں مصیبت کی مقدار بہت ہی کم ہو جاتی ہے۔

غیر متشدّدانہ عمل میں کسی خاص وسیلے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ آج کی لڑائی میں نت نئے ہتھیاروں کی ایجاد اور اُن کا استعمال ہوتا رہتا ہے۔ آج جتنی دولت خرچ ہو رہی ہے اُس کے اعداد عقل کو چکرا دیتے ہیں۔ امریکہ نے اِس لڑائی میں تقریباً پچپن کروڑ روپئے روزانہ خرچ کئے ہیں اور اِنگلستان نے تقریباً پندرہ سولہ کروڑ روپئے۔ غریب ہندوستان نے ایک کروڑ روپیہ روزانہ خرچ کیا ہے۔ دوسرے ملکوں کا تو پتہ نہیں مگر روس اور چین کے خرچ کا بھی کچھ انہیں اعداد سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اِن راجوں کے مخالف، جرمنی، اٹلی اور جاپان روزانہ کتنا خرچ کرتے رہے۔ اِس کا بھی ہم اِسی سے اندازہ کر سکتے ہیں۔ اِن اعداد میں جو خرچ ہوا ہے وُہی بتایا گیا ہے۔ دشمن کی کارروائیوں سے روزانہ جو نقصان پہنچایا گیا ہے۔ اُس کا حساب شاید اِس میں نہیں ہے۔ اِسی طرح انسانوں کا قتل بھی بے حساب ہوا ہے اور لڑائی سے پیدا ہوئی اِن مصیبتوں اور ایذاؤں کا تو کوئی حساب ہی اعداد کی صورت میں پیش نہیں کیا جا سکتا جو اِن ملکوں کے عوام کو برداشت کرنے پڑے ہیں جو لڑائی میں شریک تھے اور کچھ حد تک اُن ملکوں کو بھی جو لڑائی میں شریک نہیں تھے۔ اُن کے خلاف غیر متشدّدانہ عمل میں بیرونی سامان کی کوئی ضرورت نہیں ہے اور عوام کے معمولاتِ زندگی میں کوئی گڑبڑ بھی ضروری نہیں۔ اِس طرح سے آفت روپئے کا خرچ اور عوام کی مصیبتیں سبھی باتیں غیر متشدّدانہ عمل میں بہت ہی کم، نہیں کے برابر ہو جاتی ہیں۔ جب کہ زور آزمائی میں وہ اتنی زیادہ ہوتی ہیں کہ اُن کا حساب ہی نہیں لگایا جا سکتا ہے۔ اِس لئے غریب مُلک بھی اِس کا اِستعمال آسانی سے کر سکتا ہے اور بڑے سے بڑے طاقتور مُلک کا مقابلہ کر سکتا ہے۔

یہ تو ہوئی بین الاقوامی کاموں میں اہنسا (عدم تشدّد) کی اہمیت۔ جہاں ایک ہی مُلک میں الگ الگ مذاہب کے ماننے والے اور الگ الگ عقیدے رکھنے والے بستے ہیں وہاں تو

اگر تشدّد کا سہارا ابھی لیا گیا تو وہاں کے عوام ایک دن بھی چین سے نہیں رہ سکتے۔ اگر ہندوستان کے عوام آپس میں بھائی چارہ کا سلوک نہ کریں، ایک دوسرے کی جانب رواداری نہ برتیں اور اپنے حقوق کو ہی خاص سمجھ کر دوسروں سے اُن کے منوانے میں لگے رہیں اور دوسروں کی جانب اپنے فرائض کو ثانوی قرار دے کر اُن کی ادائیگی میں مسلسل کوشش سے نہ لگے رہیں تو اِس کا نتیجہ روز بروز خون خرابہ بڑھنے کے سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا۔ جہاں تک ایک مرد کی غیر متشدّدانہ فطرت یا رجحان کا تعلق دوسرے ایک فرد سے ہوتا ہے۔ وہاں تک تو مُلک میں قائم راج کی طاقت اپنی پولیس اور عدالتوں کے ذریعے اُن کا انتظام کر سکتی ہے۔ مگر جب یہ رجحان عوام تک پہنچ جاتا ہے اور مُلک کے مختلف طبقے ایک دوسرے سے ٹکرانے لگتے ہیں تو پولیس اور کچہریاں بے کار ہو جاتی ہیں اور اِس جھگڑے کی صورت خانہ جنگی کی ہو جاتی ہے۔ اِس سے بچنے کے لئے غیر متشدد عمل پر بھروسہ کرنے کے سوا دوسرا کوئی راستہ ہندوستان جیسے ملک کے لئے نہیں ہو سکتا۔

اِس سلسلہ میں ایک بات اور یاد رکھنے کے قابل ہے۔ جب ہم تشدّد یا عدمِ تشدّد کی بات کرنے لگتے ہیں اور یہ کہہ بیٹھتے ہیں کہ تشدّد تو ہماری رگ رگ میں داخل ہے، اور ہم کیسے اُمید کریں کہ اشتعال کی صورت میں عام آدمی اور خاص کر عوام کے مجمعے غیر متشدد رہ سکیں گے تو ایسا کہتے وقت یہ بھول جاتے ہیں کہ اگر کسی فرد یا جماعت کی زندگی کی روزانہ کارروائیوں کو دیکھا جائے تو ہم پائیں گے اُن سب میں شاید ہی ایک دو کام ایسے ہوتے ہوں گے جن میں تشدّد کا استعمال کیا جاتا ہو گا۔ ننانوے فی صدی کام تقریباً ایسے ہی بغیر زور آزمائی اور متشددانہ عمل کے ہوتے ہیں اور اِن میں ایک یا دو فی صدی حالات پر بھی قابو کر لینا اور ہمیشہ غیر متشددانہ سلوک ہی کرنا کچھ ناممکن نہیں ہونا چاہئے۔ ہاں بغیر جتن کئے ہماری

زندگی جنگلی جانوروں سے بھی بُری ہوسکتی ہے۔ چمپارن میں گاندھی جی نے کہا تھا کہ میں نیل والوں کا بُرا نہیں چاہتا۔ مگر ساتھ ہی اُن کے جو ظلم زیادتی اور شرارت رعیت کے خلاف ہوتی ہے وہ سب بند کراؤں گا اور دونوں کا دوست بنا رہوں گا۔ کچھ ایسا ہی ہوا بھی یعنی سب کچھ ہو جانے کے بعد انہیں نیل والوں نے گاندھی جی کو درس گاہیں کھولنے اور رعیت کے دوسرے قسموں کے ترقی کے کاموں میں مدد دینے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ تھوڑے دنوں تک تین درس گاہیں چلیں۔ ایک کو چھوڑ کر دو درس گاہوں کا نیل والوں کے ساتھ اچھا اور خوش گوار تجربہ رہا۔

یہی بات انگریزی سلطنت کے ساتھ بھی بڑے پیمانے پر ہوسکتی ہے۔ بشرطیکہ ملک عدمِ تشدد کی راہ پر مضبوطی سے قائم رہے۔ مگر آج دُنیا میں قیامت خیز جنگ کے بعد بھی جس نے طاقت کے استعمال کو آخری حد تک پہنچا دیا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ نسلِ انسانی کو اگر زندہ رہنا ہے اور تہذیب کو قائم رہنا ہے تو کوئی نہ کوئی ایسا راستہ نکالنا چاہیئے جس میں ریاستوں کو ہر بیس تیس برس بعد اپنے نوجوانوں کو کٹوانا نہ پڑے۔ ماؤں کو صرف مارے جانے کے لئے بچّوں کو جننا نہ پڑے اور سرمایہ صرف آگ کے ذریعے جلائے جانے یا محیطِ بحر میں ڈبوئے جانے کے لئے ہی پیدا نہ کیا جائے۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہمارے مُلک کا، کانگریسیوں کا اور اُن کارکنوں کا بھی، جنہوں نے اہنسا (عدمِ تشدّد) کے سہارے ہی آج تک کام کیا ہے اور قومی کام میں کامیابی بھی حاصل کی ہے۔ اُس عدمِ تشدّد پر اعتقاد کم ہوتا جا رہا ہے۔

ہندو مسلم اتّحاد کے بارے میں بھی بہتیرے کہہ بیٹھے ہیں کہ یہ صرف طاقت سے ہی قائم ہوسکتا ہے، بھائی چارہ سے نہیں یعنی زور آزمائی کر کے ایک کو دبا رکھنا ضروری ہے۔

کچھ مسلمان سوچتے ہیں کہ آج سے کہیں کم تعداد میں رہتے ہوئے بھی ہم نے تقریباً سارے ہندوستان پر سینکڑوں برس تک راج کیا ہے تو پھر آج بھی کر سکتے ہیں۔ اِسی طرح ہندو بھی کچھ ایسے ضرور ہیں جو کہتے ہیں کہ ہماری تعداد اتنی زیادہ ہے، ہم علم دولت اور طاقت میں کسی طرح مسلمانوں سے کم نہیں بلکہ بڑھے ہوئے ہیں اور اب وہ زمانہ ہوا ہُوا جب تھوڑے سے مُسلمانوں نے ہندوؤں کے بیدار نہ ہونے کے سبب سے راج کیا تھا، اب ہندو بیدار ہیں اور منظم ہوتے جارہے ہیں، ملک ہندوؤں کا تھا، دوسرے لوگ صرف ایک اقلیتی فرقہ کی حیثیت سے ہیں۔ اِس لئے یہاں حق ہندوؤں کا ہی ہونا چاہیئے۔ ہاں مُسلمانوں اور سبھی اقلیتی فرقوں کے ساتھ پورا پورا انصاف ہونا چاہیئے۔

یہ دونوں طبقے اپنی طاقت پر ہی اعتماد رکھتے ہیں۔ عدمِ تشدد کی بات جو اس مشکل مسئلہ کو سُلجھانے کا واحد ذریعہ ہے، وہ بالکل بھول جاتے ہیں عمل اور ردِ عمل عام قانونِ قدرت ہے متشدّد عمل کا ردِ عمل بھی متشدد ہوتا ہے اور غیر متشدد عمل کا ردِ عمل بھی غیر متشدّد۔ اِس لئے اِس ہندو مسلم مسئلہ کے سُلجھانے میں اگر ہم متشدّدانہ جذبے سے کام لے کر متشدّدانہ عمل پر اُتریں تو پھر یہ ہوتا ہے کہ

اور اُلجھ جاتے ہیں جب بیٹھتے ہیں سُلجھانے کو

ہاں ہمارا عمل صحیح معنی میں غیر متشدّد ہونا چاہیئے۔ اِس میں نہ غصہ ہونا چاہیئے، نہ زور آزمائی۔ نہ ڈر ہونا چاہیئے، نہ بُزدلی۔ سچّائی اور انصاف پر بھروسہ اور اعتقاد اور سچّے غیر متشدّد عمل کا ہی استعمال۔ ہوسکتا ہے کہ اِس طرح کے غیر متشدّد عمل کا نتیجہ چاہے جلد اور سبھی جگہوں پر دیکھنے میں نہ آئے لیکن اگر ہمارا عمل خود اعتمادی اور سچّائی اور بہادری پر مبنی ہوگا نہ کہ تنگ دلی اور ڈر یا بُزدلی پر تو اُس کی فتح لازمی ہے۔

چھپرا میں خوفناک سیلاب

اُس سال کنوار کے مہینے میں چھپرا ضلع میں ایک دن بہت پانی برسا۔ ۲۴ گھنٹے میں تقریباً ۳۶ انچ بارش ہوئی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا ضلع جَل تھل ہوگیا اور خوفناک سیلاب آگیا۔ میرے بھائی صاحب خدمتِ خلق میں برابر لگے رہتے تھے۔ اس موقع پر اُنہوں نے لوگوں کی اِمداد کے لئے بہت محنت سے کام کیا ——— شہر چھپرا میں اِس سیلاب سے لوگوں کو بہت دُکھ اُٹھانا پڑا تھا۔ مگر اِس کے ساتھ ہی ساتھ ایک بات اور دیکھنے میں آئی جس کا ذکر کرنا مناسب نہ ہوگا۔ مقامی سرکاری کارکنوں نے عوام کی مُصیبت میں بڑی بے دِلی اور بے رُخی سے کام لیا جس سے لوگوں میں بڑا غصّہ پیدا ہوا۔ اخباروں میں خبر چھپی کہ جب لوگ بارش کے مارے آنسو بہا رہے تھے کچھ افسر کشتیوں میں سوار ہوکر جَل بہار کر رہے تھے۔ ڈوبتے اور پریشان لوگوں کو، یہاں تک کہ عورتوں اور بچّوں کو بھی بچانے میں ان سے بہتیروں نے کچھ بھی مدد نہیں کی، بلکہ وہاں کے انگریز جج اور بنگالی سب جج نے مدد کی، مگر کلکٹر اور پولیس کے افسر اور ڈپٹی مجسٹریٹس سے مَس نہیں ہوئے۔ اس بات کو لے کر چھپرا میں ایک عام جلسہ ہوا جس میں سرِ عام اُن کی مذمّت کی گئی

اور مدد کرنے والوں کی۔ خاص کر بابو مہندر پرشاد اور کانگریسی کارکنوں کی بڑی تعریف کی گئی، اور جذبۂ احسان مندی ظاہر کیا گیا۔

دیہات کا بھی حال یہی تھا۔ ایک جگہ ایک بات مذاق کی بھی ہوگئی۔ چھپرا کے پورب میں جو ریل کی لائن آتی ہے اُسے کاٹنے کے لئے لوگوں نے کلکٹر سے بہت کہا مگر انہوں نے ایک نہ سُنی۔ بعد ازاں یہ لائن ٹوٹ گئی یا جیسا میں نے سُنا کسی نے اُسے تھوڑا سا کاٹ ڈالا، اور آخر پانی کے زور نے کاٹ کر ایک لمبا چوڑا خندق بنا دیا۔ اِسی سِلسلے میں دو واقعے قابلِ ذکر ہیں۔ سیوان کے پچھم میں ایک جگہ پانی بہت جمع ہوگیا تھا۔ گاؤں والوں نے ریلوے لائن کو کاٹ ڈالنا چاہا، مگر مسلح پولیس کا پہرہ تھا، پہلے اُن کی ہمت نہیں پڑی، مصیبت سہتے گئے مگر جب معاملہ برداشت کے باہر ہوگیا تو ایک گاؤں کے دو چار آدمی کندھے پر کُدال رکھ کر پانی میں تیرتے ہوئے لائن کی طرف آئے۔ پولیس والوں نے دیکھا اور اُن کو دھمکایا۔ اُنہوں نے جواب دیا۔

"ہم پانی میں ڈوب کر مر رہے ہیں اور تم لائن نہیں کٹنے دیتے۔ اب تک ہم نے برداشت کیا اب برداشت نہیں کر سکتے۔ مرنا دونوں حالت میں ہے، ڈوب کر مریں، یا گولی کھا کر مریں۔ ہم نے طے کر لیا ہے کہ گولی کھا کر مرنا بہتر ہے۔ اس لئے ہم لائن کاٹیں گے تم گولی مارو۔"

یہ کہہ کر وہ لائن کاٹنے لگے۔ پولیس کی ہمت نہیں پڑی کہ گولی چلائے، لائن کٹ گئی پانی بہہ نکلا اور کتنے ہی گاؤں بچ گئے۔ سُنا کہ پولیس والوں نے رپورٹ کر دی کہ پانی سے لائن بہہ گئی —— کسی نے کاٹا نہیں۔ وہاں اب ایک بڑا پُل بن گیا ہے تب سے لائن کے اُتّر کی طرف گاؤں میں پانی رُک جانے کے سبب سے جو سیلاب آجایا کرتا تھا۔ اب

نہیں آتا۔

دوسرا واقعہ دُروَلی تھانے کے اندر کسی گاؤں کا ہے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ کی سڑک اُونچی ہے اِس لئے سڑک پانی کو روک دیتی ہے۔ جیسے ریلوے لائن روک دیتی ہے۔ گاؤں والوں نے تھانے کے داروغہ سے جاکر کہا کہ سڑک کٹوا دیجئے تو بہت سے گاؤں بچ جائیں گے۔ اُن دِنوں گاؤں گاؤں میں کمیٹیاں بن گئی تھیں۔ تھانے بھر کے سب گاؤں کو ملاکر تھانہ کمیٹی بنی تھی۔ تھانہ کمیٹی کے خاص کارکُن چاہے وہ تھانہ کمیٹی کے صدر ہوں یا سکریٹری "سوراجی داروغہ کہلایا کرتے تھے۔ لوگوں نے یہ نام نہ جانے کیسے رَکھ لیا تھا۔ مگر یہ بہت جگہوں میں رائج ہو گیا۔ سرکاری داروغہ نے مذاق میں کہا۔

"میرے پاس کیوں آئے ہو سوراجی داروغہ کے پاس کیوں نہیں جاتے۔"

چھپرا میں بھی کسی اُونچے عہدہ دار نے ایسا ہی کہا تھا کہ مدد کے لئے میرے پاس کیوں آتے ہو، گاندھی جی کے پاس جاؤ۔ چھپرا والوں نے بھی گاندھی جی یعنی کانگریس والوں سے مدد پائی تھی۔ دَرولی تھانے کے دیہاتی لوگ بھی تھانہ منتری (سکریٹری) کے پاس گئے اور داروغہ کے ساتھ جو بات ہوئی تھی وہ کہہ سُنائی۔ اُنہوں نے سُن کر کہا۔

"اچھا اگر داروغہ نے ایسا کہا ہے اور میرے پاس بھیجا ہے تو میں کہتا ہوں جہاں تم ضروری سمجھو سڑک کاٹ ڈالو جس سے پانی بہہ جائے مگر اس کا خیال رکھنا کہ بلا ضرورت سڑک نہ بگاڑنا۔"

لوگوں نے ایسا ہی کیا، سڑک کاٹ کر پانی بہا دیا۔

میں بھی اِمدادی کام میں لگ گیا مگر جب میں پہنچا تو چھپرا شہر سے پانی نِکل چکا تھا کاشتکاروں کے کھتیوں میں جو اناج پانی پڑنے سے سڑ گیا تھا اُس کی بدبو سے اُن محلّوں

میں چلنا مشکل ہو رہا تھا۔ میں نے چندہ جمع کرنے میں اور دوسری قسم کی امداد میں کچھ حصہ لیا۔ یہ رجحان تو پہلے ہی سے تھا ۱۹۱۴ء کے سیلاب میں میں نے کلکتہ سے ہی امدادی کام منظم طریقہ پر شروع کر دیا تھا۔ یہ رجحان گاندھی جی کی صحبت سے کچھ اور پختہ ہو گیا تھا۔ جب کہیں اپنے صوبے میں کسی جگہ بھی سیلاب آیا تو میں کچھ نہ کچھ امداد کے اہتمام کی سعی کرتا تھا ۱۹۲۳ء میں شاہ آباد میں دریائے سون میں خوفناک سیلاب آیا۔ میں اُس زمانے میں جھنڈا ستیہ گرہ کے کام سے ناگپور گیا ہوا تھا۔ خبر پاتے ہی وہاں سے چلا آیا۔ اِسی طرح دربھنگہ ضلع میں مدھوبنی سب ڈویژن میں بھی ہولناک سیلاب آیا۔ وہاں بھی امداد کے لئے جانا پڑا تھا۔ اِن سب جگہوں بڑی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ آرہ بہت مشکل سے پہنچ پایا تھا کیونکہ کوبلور اور آرہ کے بیچ میں ریل کی لائن جو بہت اُونچی بنی ہے۔ بالکل ٹوٹ گئی تھی۔ اِس کے بند میں ایک ایک جگہ ڈیڑھ ڈیڑھ دو دو سو فٹ چوڑی کئی خندقیں سی بن گئی تھیں نیچے کا راستہ تو بالکل زیرِ آب تھا ہی، ریل کی پٹری کے نیچے کا بند تو کٹ ہی گیا تھا مگر اُوپر لوہے کی پٹری اور کہیں کہیں کاٹھ کے سلیپر بھی جن پر لوہے کی پٹری جڑی رہتی ہے لٹک رہے تھے نیچے کہیں زوروں سے پانی بہہ رہا تھا تو کہیں حوض بن گیا تھا۔ جس میں بہت گہرا پانی جمع تھا، اِن لائنوں کو پار کرنے کا ایک ہی ذریعہ تھا یعنی اِن پٹریوں پر چل کر یا لٹک کر کسی طرح پار کرنا۔ میرے ساتھ پروفیسر عبدالباری تھے۔ ہم دونوں اِن پٹریوں پر کہیں لمبے. ہو کر چوپائے کی طرح، کہیں ہاتھوں سے اِنہیں پکڑ کر بندروں کی طرح نیچے لٹکتے ہوئے اِن کھائیوں کو پار کر کے آرہ پہنچے۔ وہاں جا کر اِمداد کا کام منظم کیا۔ ان موقعوں پر روپے کی کمی نہیں ہوتی تھی۔ اپیل کرنے پر لوگ رقم بھیج دیتے۔ خاص کر گاندھی جی سے تعلق ہونے کی وجہ سے گجراتی بھائیوں کی مہربانی رہتی تھی۔ بمبئی اور گجرات سے رقمیں آجایا

کرتی تھیں۔ سیٹھ جمنالال بجاج بھی ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ تقریباً سبھی جگہوں میں کشتیوں میں سوار ہو کر دُور دُور جانا پڑتا تھا۔ کیونکہ دوسری کوئی سواری جا نہیں سکتی تھی۔ مدھوبنی کے علاقے میں ایک جگہ کملاندی کو ناؤ پر پار کرنا پڑا تھا۔ دھار کی رفتار بہت تیز تھی بہت مشکل سے ناؤ اُس پار لگی۔

سبھی جگہوں میں چھپرا ہو بادشاہ آباد یا دربھنگہ، ایک ہی منظر ہمیشہ دیکھنے کو ملتا تھا، دیہات میں گھر زیادہ تر مٹّی کے ہی ہوتے ہیں جو گرے ہوئے نظر آتے تھے۔ گھروں میں جو کچھ اناج ہوتا وہ سڑا ہوا ملتا۔ مال تباہ، مویشی بہہ کر مرتے ہوئے اور لوگ بھوک سے پریشان نظر آتے۔ گاؤں کے کُتّے بھوک کے مارے بے طرح بھو۔نکتے ہوئے۔ جو مویشی رہ گئے تھے وہ بھوکے خاموش کھڑے ہوئے، سیلاب کے اُتر جانے کے بعد بیماری، خاص کر ملیریا کا زور بڑھا کچھ دنوں بعد ربیع بونے کے وقت، بیج کی کمی اور چاروں طرف سے اُس کی مانگ۔ مجھے یاد ہے کہ چھپرا کے سیلاب کے وقت زور ہوا تو ہم نے چھپرا کے ڈاکٹروں کو جمع کیا۔ سب مل کر ایک نسخہ تیار کیا، جس میں ملیریا کے عِلاج کے علاوہ کچھ پیٹ صاف رکھنے اور کھانسی روکنے کی بھی دوا تھی۔ اُسی کو ہم نے بہت بڑے پیمانے پر یکجائی تیّار کرایا۔ اور بوتلوں میں بھر بھر کر سارے ضلع میں بٹوایا۔ اس کا نتیجہ بہت اچھا ہوا۔ بغیر ڈاکٹر کے ہی ہم نے اپنے کانگریسی کارکنوں کے ذریعے دوا تقسیم کر کے بہت سے بیماروں کو اچھا کیا۔ دوا بہت مؤثر ثابت ہوئی۔ اس کے بعد جہاں کہیں ملیریا کا زور ہوتا اِسی نسخہ کو ہم لوگ بہت دنوں تک کام میں لاتے رہے۔

شاہ آباد میں گنگا کے کچھار کے علاقے میں جہاں سیلاب کا بہت زور تھا، ربیع کی فصل ہی ہوتی ہے، وہاں بیج کی بہت ضرورت تھی، مجھے یاد ہے کہ میں ہفتوں گاؤں میں

میں گھوم پھر کر بیج کے لئے روپئے بانٹتا رہا۔ کارکُن پہلے سے ایسے لوگوں کی فہرست بنا رکھتے تھے جو بیج چاہتے تھے۔ ہم دو تین آدمی روپئے لے کر ایک دن گاؤں میں پہنچتے تھے سب لوگ وہیں جمع ہو جاتے۔ فہرست کی جانچ اور جلسۂ عام کر کے روپیہ بانٹ دیتے تھے۔ جس زمانے میں آرہ میں سیلاب آیا تھا اُس کا اثر چھپرا ضلع پر بھی پڑا۔ کیونکہ گنگا میں بھی باڑھ تھی اور سون کا پانی گنگا کھینچ نہیں سکتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سنگم کے نزدیک کئی کوسوں تک دونوں دریاؤں کا پانی جمع ہو گیا اور گنگا پار بھی خطرناک صورتِ حال پیدا ہو گئی۔ وہاں بھی امداد کا انتظام کیا گیا۔ جو روپئے جمع ہوئے تھے۔ اُن کا ایک حصّہ چھپرا میں بھی خرچ ہوا مگر میں آرہ میں مشغولِ کار رہنے کی وجہ سے وہاں خود جا کر کام نہیں کر سکا۔ وہاں کے مقامی کارکنوں نے ہی جن میں میرے خاص بھائی صاحب تھے، مقامی کام سنبھال لیا۔

اُوپر کہا جا چکا ہے کہ ریلوے لائن کی وجہ سے سیلاب کی ہولناکی بڑھ جاتی ہے اپنے صوبے میں پچھلے تیس برسوں میں جتنے بڑے اور ہولناک سیلاب آئے ہیں سب کا مجھے کافی تجربہ ہے۔ میرا یہ پختہ خیال ہے کہ ریلوے لائن اور ڈسٹرکٹ بورڈ کی اُونچی سڑکیں سیلاب کے سب سے خاص اسباب ہیں۔ اگر اُن میں جگہ جگہ کافی چوڑے پُل بنے ہوتے تو ایسی حالت نہ ہوتی میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ لائن کے ایک طرف سات، آٹھ فٹ گہرا پانی ہے اور دوسری طرف ایک دو فٹ بھی مشکل سے ہے۔ پانی کو اگر دُور تک پھیل جانے کا موقع ملے تو اِس کی گہرائی کم ہو جاتی ہے اور رَو بھی کم زور پڑ جاتی ہے۔ مگر جب اُسی پانی کو تنگ راستہ سے نکلنا پڑتا ہے اور وہ سامنے کے بند کو توڑ کر نہیں نکل سکتا تو قدرتاً وہ جمع ہو جاتا ہے، اور جب کہیں نکل پاتا ہے تو بہاؤ بہت زور کا ہوتا ہے۔ اِس لئے یہ ایک اہم سوال ہے جس پر حکومت کو توجہ دینا مناسب ہے۔ مگر یہاں تو ریل کی کمپنیوں کے منافع پر ہی زیادہ خیال

رکھا جاتا ہے۔ اُن کو پُل بنوانے کے لئے مجبور نہیں کیا جاتا، لائن کاٹنا تو دُور کی بات ہے کئی بار سیلاب میں عوام کو ہولناک مصیبتوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ ایسٹ انڈین ریلوے نے تو شاہ آباد کے بڑے سیلاب کے بعد کوئلور سے آرہ کے بیچ میں بہت سے بڑے پُل بنوادئے۔ اِس لئے وہاں کے لوگوں کا خوف بہت حد تک دُور ہو گیا۔ سرکاری سڑک میں بھی جو اَب بن گئی ہے۔ اسی طرح پانی بہنے کے لئے کئی پُل اور دہانے بنادئے گئے ہیں۔ مگر بی، این، ڈبلیو ریلوے نے اس معاملہ میں بہت کنجوسی دکھائی ہے ہاں اب اس میں کئی جگہ پُل بنے ہیں۔ پھر بھی ابھی بہت ایسی جگہیں ہیں جہاں پُل کی ضرورت ہے۔ اس نے جو پُل بنوائے ہیں وہ عوام کی مصیبت دُور کرنے کے خیال سے نہیں اپنے منافع کے خیال سے کیونکہ جب تک عوام کی مصیبت کی بات رہی ایک نہ سُنی گئی مگر جب قدرت نے لائن کو اِس طرح توڑا کہ مہینوں ریل چلنی بند ہو گئی تو اُس نے مجبوراً نئے پُل بنوادئے۔ اَب جب وہ لائن سرکاری ہو گئی ہے اُمید کی جا سکتی ہے کہ شاید اس پر زیادہ توجہ دی جائے۔ ہم نے سُنا ہے کہ سرکاری کارکُن بھی کہا کرتے تھے کہ اس لائن کے مالک زبردست ہیں اُن کی ایک نہیں سنتے۔ ڈسٹرکٹ بورڈ اور پی ڈبلیو، ڈی کو بھی اِس بات پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

ان سب واقعات کا میں نے ایک ہی جگہ ذکر کر دیا اگرچہ یہ کئی برسوں کے واقعات تھے۔

ستیّہ گرہ کی تیّاری

ایک طرف ملک میں زوروں سے ترکِ موالات کی تحریک چل رہی تھی دوسری طرف سرکار اور اُس کے حامی ولی عہدِ انگلستان کے استقبال کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اِس موقع پر مڈبھیڑ ہوئے بغیر نہ رہے گی۔

بمبئی میں شروع اکتوبر میں ورکنگ کمیٹی کی نشست ہوئی، اُسی میں طے ہوا کہ نومبر کے شروع میں دِلّی میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کا اِجلاس ہوگا۔ یہ نشست خاص کر ستیہ گرہ شروع کرنے کے سوال پر غور کرنے کے لئے ہونے والی تھی۔ کانگرس کے صدر شری وجے راگھو اچاریہ اور سکرٹیری پنڈت موتی لال نہرو میں کچھ اختلافِ رائے ہوگیا۔ صدر نے اعلان کر دیا کہ دِلّی میں ہونے والا اِجلاس نہیں ہوگا اور سکرٹیری نے اعلان کیا کہ ورکنگ کمیٹی کے فیصلہ کو رَد کرنے کا حق صدر کو نہیں ہے اور چونکہ یہ اِجلاس ایک اہم مسئلہ پر غور کرنے کے لئے ہونے والا ہے اِسی لئے ملتوی نہیں ہو سکتا۔ مہاتما جی پنڈت جی سے متّفق الرّائے تھے آخر اِجلاس دلّی میں ہوا۔ شری وجے راگھو اچاریہ نہیں آئے۔ اُن کی غیر حاضری میں لالہ لاجپت رائے نے صدر کی جگہ لی۔ میں چھپرا میں بیمار پڑ گیا تھا اِس لئے نہیں جا سکا۔

بمبئی میں جمع ہوئے لوگوں نے ایک طرح سے فتوے کے متعلق اعلان نکال کر شخصی صورت سے ستیہ گرہ کر ہی دیا تھا۔ وہ بہت جگہوں پر بڑے بڑے جلسوں میں جیسا کہ کہا جا چکا ہے دُہرایا جا چکا تھا۔ ورکنگ کمیٹی نے یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ جہاں کہیں بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ اور کھدّر کے پرچار کے کام میں سرکار کی طرف سے رکاوٹ ڈالی جائے، کانگریسی کارکن اگر وہ چرخہ چلاتے ہوں اور کھدّر پہنتے ہوں اپنے صوبے کی صوبائی کمیٹی کی اجازت سے سرکاری پابندی کی خلاف ورزی کر سکتے ہیں۔ دلّی کی آل انڈیا کمیٹی نے طے کیا کہ صوبہ کمیٹیاں اپنے اپنے صوبے میں جہاں اور جس کو وہ مناسب سمجھیں ستیہ گرہ کی (جس میں لگان بندی بھی شامل تھی) اِجازت دے سکتی ہیں۔ اِجازت کی شرطیں افراد کے لئے تھیں۔ ترکِ موالات کی سبھی باتوں کو اس فرد کے ذریعے پورا ہونا چاہیئے۔ یعنی اُسے کھدّر پہننا چاہیئے۔ ہندو مسلم اتحاد ماننا چاہیئے۔ اَچھوت پن چھوڑنا چاہیئے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اسی طرح کسی علاقے کو اجازت ملنے کی شرطیں تھیں۔ اس علاقہ میں بدیشی کپڑے کا پورا بائیکاٹ، وہاں کے عوام میں سودیشی کپڑے اور کھدّر کا اِستعمال اچھوت پن کا دُور ہونا، قومی تعلیم کی تبلیغ وغیرہ۔ اِن شرطوں میں سے کسی کو چھوڑ دینے کا اِختیار ورکنگ کمیٹی کو دیا گیا۔ یہ اِعلان کر دیا گیا کہ کسی ستّیہ گرہی کے خاندان کی داشت پرداخت کا بار کانگریس پر نہیں ہوگا اور عدم تشدّد میں یقین سب کے لئے لازمی ہے، اور جب تک اِس بات کا پورا اہتمام نہ ہو جائے کہ ستیہ گرہ ہونے پر بلوہ فساد نہ ہوگا، تب تک ستّیہ گرہ کی اجازت نہ دی جائے۔ اِس طرح صوبائی کمیٹیوں کو حق تو ملا مگر ستیہ گرہ کی شرطیں اِتنی کڑی تھیں کہ کسی بھی فرد یا علاقہ کے لئے اُن کو پورا کرنا بہت کٹھن تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی سمجھا گیا تھا کہ ستیہ گرہ شروع کرنے میں جلد بازی نہیں کی جائے گی اور اگرچہ سب

صوبے تیاری میں لگ جائیں گے مگر وہ گجرات کا انتظار کریں گے جہاں بہت تیاری ہو رہی تھی۔ اُس کے مطابق بہار میں بھی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ چھپرا ضلع کے لوگ چاہتے تھے، کہ بسنت پور تھانے کو ستیہ گرہ کی اجازت ملے۔ کھدّر کا پرچار اور دوسرے وسیلوں کے ذریعے لوگوں کی تیاری بھی بتائی جاتی تھی۔ صوبائی کانگریس کمیٹی نے کچھ لوگوں کو جن میں خاص مولوی محمد شفیع صاحب تھے، جانچ کے لئے بھیجا بھی۔ اُنہوں نے علاقے کو تیار پایا۔

اِس طرح کی باتیں چل رہی تھیں کہ نومبر مہینے کے وسط میں ولی عہدِ انگلستان بمبئی پہنچ گئے۔ سرکار کی طرف سے بھی استقبال کی تیاری تھی اور عوام کی طرف سے بائیکاٹ کی ہندو اور مسلمان تو یکرائے تھے۔ وہ مل کر بائیکاٹ میں لگے تھے مگر کچھ پارسی استقبال میں شریک ہوئے۔ بائیکاٹ بہت کامیاب رہا مگر جب کچھ پارسی استقبال سے واپس آرہے تھے کانگریسیوں سے اُن کا جھگڑا ہو گیا۔ کانگریسیوں میں خاص حصّہ مسلمانوں نے ہی لیا تھا۔ بڑا بلوہ شروع ہو گیا۔ شروع تو کیا ہندو مسلمانوں نے بعد ازاں عیسائیوں اور پارسیوں نے اُسے جاری رکھا۔ خوش قسمتی سے گاندھی جی اِن دِنوں بمبئی میں ہی تھے۔ اُنہوں نے پہلے شریمتی سروجنی نائیڈو، سیٹھ عمر سُبحانی، سیٹھ چھوٹانی اور شنکر لال بینکر وغیرہ کو بلوہ فرو کرنے کے لئے بھیجا۔ بعد کو جہاں مار پیٹ ہو رہی تھی خود پہنچ گئے۔ بلوہ کئی دِنوں کے بعد کسی طرح فرو ہوا۔ اِس کے لئے گاندھی جی کو برت بھی کرنا پڑا تھا۔ اِس بلوہ میں تقریباً پچاس ساٹھ آدمی مارے گئے اور تین سو سے زیادہ گھائل ہوئے۔ مُردوں اور زخمیوں میں تین چوتھائی سے زیادہ کانگریسی تھے۔ اِس بلوہ کا اثر اُن کے دل پر پڑا۔ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں ہوا وہاں پر اُنہوں نے زور دیا کہ سبھی جگہوں پر ستیہ گرہ کرنا خطرناک ہوگا۔ کیونکہ ابھی تک لوگوں نے غیر متشدّد جنگ اور پالیسی کو پوری طرح نہیں سمجھا ہے۔ اِس کے

لئے ورکنگ کمیٹی نے طے کیا اور صوبائی کمیٹیوں کو حکم دیا کہ تحفظِ امن کے لئے اور عوام کے مجمعوں کو سنبھالنے کے لئے منظّم تدبیروں کی ضرورت ہے۔ اِس لئے سبھی کمیٹیاں سیوک دَل (رضاکار جتھے) قائم کریں وہی لوگ سیوک (رضاکار) ہو سکیں گے جو عہد کریں کہ وہ دل، زبان اور عمل سے غیر متشدّد رہیں گے اور کانگریس کی ہدایتوں کو مانیں گے۔ خیال تھا کہ اگر ایسے منظّم رضاکار جتھے تیار رہیں گے تو بمبئی جیسے بدنُما واقعات نہیں ہوں گے۔ بمبئی میں گاندھی جی کے برت کا پھل صرف یہی نہیں ہوا کہ بلوہ فرو ہو گیا وہاں کے سبھی فرقوں کے لوگوں نے آپس میں میل بڑھانے کا ایک طرح سے حلف بھی لیا۔ اس طرح مُلک بھر میں امن وامان کے حق میں جذبہ پھیلا۔

ڈاکٹر اینی بیسنٹ شروع سے ہی ترکِ موالات کی تحریک کی زوروں سے مخالفت کر رہی تھیں۔ اُنہوں نے ایک بار یہاں تک لکھ دیا تھا کہ گاندھی جی تاریکی کی قوتوں کے نمائندے ہیں۔ 'REPRESENTS THE FORCES OF DARKNESS'

بمبئی کے فساد کے بعد اُنہوں نے بہت سخت مضامین لکھے۔ کسی بلوے کے متعلق تو اُنہوں نے یہ بھی لکھا تھا کہ سرکار اینٹ پتھروں کا جواب گولی سے ہی دے سکتی ہے ورکنگ کمیٹی کے زمانے میں بھی اُن کی ایک تحریر کچھ ایسی ہی نکلی۔ مجھے یاد ہے کہ دلیش بندھو داس اخبار کے اس پرچے کو اپنے ہاتھ میں لے کر آئے۔ مہاتما جی سے وہ بولے "ہم اُمید کرتے ہیں کہ ینگ انڈیا کی آئندہ اِشاعت میں اِس کی گونجتی ہوئی سخت تنقید ہم کو پڑھنے کو ملے گی۔" مہاتما جی جواب دیا 'ایسی اُمید آپ نہ رکھیں' ہم نے دیکھا ہے کہ گاندھی جی اِس طرح کی تُو تُو مَیں مَیں نہیں پڑتے۔ اِس طرح کی تحریروں کو شاید وہ پڑھتے بھی نہیں۔ اِس لئے اُن کی تحریروں میں تلخی نہیں آتی تھی۔ سخت سے سخت بات

بھی وہ چُست مگر سنجیدہ زبان میں کہہ ڈالتے ہیں۔ اُن کے تعلق کی مہربانی سے ہی میں اپنی اُس عادت کو جو بچپن سے ہی جھگڑے سے بچنے کی ہے زیادہ مضبوط کر سکا ہوں۔ اپنی تحریروں اور تقریروں میں حتیّ الوسع تلخی نہ آنے دینے کا جتن کرتا ہوں۔

گرفتاریاں اور مفاہمت کی کوشش

بمبئی میں ولی عہد انگلستان کے اُترنے کے وقت جو واقعات ہوئے اُن سے سارے مُلک میں کھلبلی مچ گئی۔ سرکار نے بھی فیصلہ کر لیا کہ تشدد کی پالیسی سے کام لینا چاہیئے۔ اس لئے اب جا بجا گرفتاریاں ہونے لگیں۔ چند دنوں کے اندر ہی دسمبر میں تقریباً سبھی جگہوں میں ایک ساتھ ہی بہت سے کانگریسی لوگوں کو۔ خاص کر بڑے بڑے لیڈروں کی ___ گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔ اِن گرفتاریوں کا خاص سبب یہ ہوا کہ سرکار نے والنٹیر کوروں (رضاکاروں کی ٹولیوں) کو غیر قانونی قرار دے۔

۱۹۰۸ء میں دو قانون بنے تھے۔ اِس وقت کئی جگہوں میں، خاص کر بنگال میں، انقلابی پارٹیاں کام کر رہی تھیں۔ جن کے متعلق سرکار کہا کرتی تھی کہ وہ بم بنایا کرتی ہیں۔ سرکاری کارکنوں کو بموں اور گولوں سے مارا کرتی ہیں۔ وغیرہ۔ اُنہیں کو دبانے کے لئے کرمنل لا امنڈمنٹ ایکٹ (قانون ترمیم ضابطہ فوجداری) پاس ہوا تھا۔ ایک دوسرا قانون SEDITIOUS MEETING ACT (باغیانہ جلسوں کا قانون) باغیانہ جلسوں پر قابو پانے اور ان کی روک تھام کے لئے بنا ہوا تھا۔ سرکار کے کہنے کے مطابق دونوں قانون

کا سبب تشدد پسند پارٹیوں کی سرگرمیاں تھیں مگر اُس وقت اگرچہ کانگریس مکمل طور پر غیر متشدد پارٹی تھی اور اس کا سیوا دَل (رضاکار جتھہ) بھی ویسا ہی غیر متشدد تھا۔ پھر بھی سرکار نے اِن پُرانے قانونوں کو سبھی صوبوں میں جہاں پہلے سے جاری نہیں تھے، جاری کر دیا۔ ایک ایک کر کے پنجاب، دلّی، بنگال، بہار، یوپی وغیرہ صوبوں کی حکومتوں نے سیوک دلوں کو جو الگ الگ صوبوں میں الگ الگ ناموں سے قائم تھے، غیر قانونی قرار دے دیا۔ اِس طرح انجمنِ خدّام خلافت اور کانگریس سیوک دَل میں شریک ہونا ہی جرم ہو گیا۔ جلسے کرنا بھی مشکل ہو گیا۔

کانگریس کمیٹیوں نے طے کیا کہ ہم اِن جابرانہ قانونوں کو نہیں مانیں گے۔ وہ سیوک دلوں کو منظّم کرنے کے لئے زیادہ زور لگا کر کام کرنے لگیں۔ اِس لئے جو بھی سیوک دَل میں شریک ہوتا یا اُسے منظّم کرنے کا کام کرتا وہ گرفتار کر لیا جاتا۔ مُلک کے سامنے سرکار نے ایک نیا سوال پیش کر دیا۔ اب ہمارے سامنے اس وقت خلافت کے متعلق، پنجاب کے متعلق یا حصولِ سوراج کی بھی بات نہ رہی۔ اب سوال یہ ہو گیا کہ ہمیں اپنے مُلک کے منظّم کرنے کا آپس میں مِل جُل کر کام کرنے کا بھی حق رہے گا یا نہیں۔ سرکار نے اِس حق کو بھی قانون کے ذریعے غصب کر لیا۔ اب کانگریس کو سب سے پہلے اُن کے لئے لڑنا ضروری ہو گیا۔ گاندھی جی نے کہا تھا کہ اس لڑائی میں ہم وہ ستیہ گرہ نہیں کر رہے ہیں جو کرنا چاہتے ہیں۔ اِس وقت ہم صرف آزادی تقریر اور آزادیِ اجتماع کے لئے ہی لڑ رہے ہیں۔ یہ آزادی ہم صرف کانگریس کمیٹیوں اور خلافت کمیٹیوں کے لئے ہی نہیں چاہتے ہیں۔ ہم سبھی جماعتوں اور افراد کے لئے یہ حق چاہتے ہیں۔ اِس لئے یہ لڑائی سب کے لئے اور سب کی طرف سے ہے مگر حکومت کب سُننے والی تھی۔ اُس نے تو دبانے کا ارادہ ہی کر لیا تھا۔

علی برادران وغیرہ کراچی کے مقدّمے کے زمانے سے ہی گرفتار ہوکر سزا پا چکے تھے، چند دنوں میں ہی دیش بندھو داس، پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو، لالہ لاجپت رائے مولانا آزاد، چکرورتی، راج گوپال آچاری وغیرہ مُلک کے سربرآوردہ لیڈر گرفتار ہو گئے ہزاروں کی تعداد میں دوسرے کانگریسی بھی گرفتار کر لئے گئے مگر جہاں جہاں شہزادہ ایڈورڈ گئے بائیکاٹ اور بھی منظّم ہوتا گیا۔ اُن کے کلکتّہ جانے کے دن نزدیک آ رہے تھے لارڈ ریڈنگ فکرمند تو تھے ہی۔ اُن کے لا ممبر (رُکن قانونی) تھے سر تیج بہادر سپرو۔ اِس بات کی کوشش ہونے لگی کہ کسی طرح سمجھوتہ ہو جائے جس سے کلکتہ میں شہزادہ کا صحیح طور پر خیر مقدم ہو سکے۔ اِس کوشش میں خاص حِصّہ لینے والے پنڈت مدن موہن مالوی جی تھے۔ اُنھوں نے کلکتہ جاکر وہاں کے گورنر لارڈ رونالڈشے سے ملاقات کی۔ دیش بندھو داس سے بھی ملے۔ ملک کے کتنے ہی کانگریسی اور خلافتی لیڈروں سے بھی، جو باہر تھے بات چیت کی۔ وائسرائے لارڈ ریڈنگ کے پاس ایک ڈیپوٹیشن (وفد) لے جانے کی بات ہوئی۔ دیش بندھو داس کلکتہ جیل میں تھے۔ اُن سے گفت گو شروع ہوئی۔ کچھ ایسا معلوم ہونے لگا کہ بات طے ہو جائے گی۔

بِہار میں بھی گرفتاریاں ہونے لگیں۔ صوبائی کانگریس کمیٹی کا اجلاس بہار میں ہوا۔ اجلاس کے وقت ہی پولیس نے وہاں کی کمیٹی کے دفتر کی تلاشی لی۔ جب ہم لوگ ایک عام جلسہ میں حِصّہ لے رہے تھے تو پولیس کی تیاریوں سے معلوم ہوتا تھا کہ ہم لوگ وہیں گرفتار کر لئے جائیں گے مگر ایسا ہوا نہیں۔ ایک آدمی نے جلسہ میں پولیس سپرنٹنڈنٹ کی طرف ہاتھوں سے اشارہ کر کے تُلسی داس جی کی ایک چوپائی کو زوروں سے بار بار دُہرانا شروع کیا تو بھی پولیس نے کچھ نہیں کیا۔

گادھِ سُون مَن چنتا بیاپی کب مرہین یہ نسِچر پاپی
(وشوامتر کے دل میں اس بات کی فکر تھی کہ یہ دیوِ لعین کب مریں گے۔)

سب لوگ اِس اِجلاس اور جلسہ کے بعد اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔ سبھی ضلعوں میں کانگریس کمیٹیوں کی تلاشی ہونے لگی۔ لوگ گرفتار کیے جانے لگے۔ میں بھی پٹنہ آیا۔ ہم سب گرفتاری کا انتظار کر رہے تھے سبھی ضلعوں میں اَن گنت خاص خاص کانگریسی گرفتار کر لئے گئے۔ پٹنہ میں مولوی خورشید حسنین، بابو جگت نارائن لال اور کرشن پرشاد سین سنگھ گرفتار ہو گئے، اور جگہوں میں مولوی محمد شفیع، بابو سری کرشن سنہا، بابو بندھیشوری پرشاد ورما، بابو رام نارائن سنگھ وغیرہ کئی کانگریسی جیل بھیج دیے گئے۔ میں گرفتار نہیں کیا گیا۔ مظہر الحق صاحب۔ برج کشور بابو اور میں نے کئی ساتھیوں کے ہمراہ ایک بیان چھپوایا جس میں ہم نے عوام سے سیوک دَل میں شریک ہونے کے لئے حوصلہ دلایا۔ سرکار کی پالیسی کی مذمّت کی، اور اپنے آپ کو سیوک دَل کا ممبر بتایا پھر بھی ہم گرفتار نہیں کئے گئے۔ اِس طرح سبھی جگہوں میں ضلع مجسٹریٹوں اور دوسرے حاکموں کے پاس لوگ اپنے اپنے دستخط کر کے لمبی لمبی فہرستیں بھیجنے لگے جن میں والنٹیروں کے نام رہتے۔ پٹنہ میں میں اِس کا انتظار کر ہی رہا تھا کہ معلوم ہوا صلح ہونے جا رہی ہے۔

گرفتاریاں بند ہو گئیں۔ لارڈ سنہا نے بہار کی گورنری سے اِستعفےٰ دے دیا تھا، اُن کی جگہ مسٹر لیمبجر گورنر ہو گئے۔ بہار کونسل کے کچھ خاص ممبروں نے جن میں خاص الخاص مسٹر حسن امام، رائے بہادر دوار کا ناتھ وغیرہ تھے، گورنر کے پاس ڈیپوٹیشن (وفد) لے جا کر کہا کہ بہار میں مکمّل امن و امان ہے۔ یہاں سیوک دَل کو غیر قانونی قرار دینے سے ہی زیادہ گڑبڑ کا امکان ہے۔ اِس لئے گرفتاریاں بند کی جانی چاہئیں۔ گورنر نے اُن سے کچھ

ایسی باتیں کیں جن سے معلوم ہوا کہ سرکار کی ساری کارروائی غلط بنیاد پر ہوئی ہے ہم لوگوں نے اِس کی نقل شائع کر دی۔ مگر اِس کے شائع ہونے سے پہلے ہی گرفتاریاں ہونے کا حکم اُنہوں نے نکال دیا۔ اگرچہ سیوادَل کے خلاف مُبینہ حکم رد نہیں کیا گیا پھر بھی ضلع مجسٹریٹوں کو گرفتاریاں بند کرنے کا حکم ہو گیا۔

سر تیج بہادر سپرو لارڈ ریڈنگ کے پاس وائسرائے کی کونسل کے اجلاس کے لئے کلکتہ جا رہے تھے۔ وہ پٹنہ ہوتے ہوئے گُذرے۔ کچھ لوگوں سے اُن کی مُلاقات ہوئی جس سے یہ بات پھیل گئی کہ اب صلح ہو جائے گی۔ بہار میں گرفتاریوں کے رُک جانے سے اِس کی اور بھی تائید ہوئی۔ اُدھر سرکار نے جو باتیں دیش بندھو داس سے جیل خانے میں کیں، اُن سے معلوم ہوا کہ دیش بندھو داس اِن شرطوں پر رضامند ہو گئے ہیں، جو سرکار کی طرف سے پیش کی گئی تھیں۔ مہاتما جی کی رائے لی گئی اور اُنہوں نے کچھ شرطیں پیش کیں۔ اِس بارے میں سب باتیں اُس وقت ظاہر نہیں ہوئیں۔ اتنا ہی معلوم ہوا کہ گاندھی جی نے دیش بندھو داس کی یہ سفارش کہ شرطیں مان لی جائیں، نامنظور کر دی ہے۔ سب باتوں کو وضاحت سے جاننے کے لئے شری کرشن داس کی کتاب 'مہاتما گاندھی کے ساتھ سات مہینے'، دیکھنی چاہیے۔

شرطیں کچھ اس طرح کی تھیں۔ کانگریس ولی عہد کے بائیکاٹ کو بند کر دے سرکار ایک کانفرنس کرے گی جس میں سب باتوں پر غور کیا جائے گا۔ سیاسی قیدی چھوڑ دیئے جائیں گے۔ مگر کراچی کے فتوے والے قیدی، جن میں علی برادران بھی تھے، نہیں چھوڑے جائیں گے۔

گاندھی جی چاہتے تھے کہ کانفرنس کی تاریخ اور پروگرام معیّن ہو جائے اور کراچی

کے قیدیوں کو بھی ضرور چھٹنا چاہیئے۔ اگر دو ایک دن کا اور وقت ملتا تو ممکن تھا کہ اِن معاملوں پر غور کر کے کچھ طے ہو جاتا۔ مگر اُدھر ولی عہد کے کلکتّہ پہنچنے کا دِن آگیا اور بات طے نہ ہوسکی۔ سرکار نے دیکھا کہ اِس خیر مقدم کے کام میں جب اُسے کامیابی نہیں ہوئی تو پھر یہ صلح کی باتیں بھی بے کار تھیں۔ اِس نے تشدّد کی پالیسی کو اور زوروں سے چلانے کا فیصلہ کرلیا۔ جو وفد گیا تھا اُسے بھی کورا جواب دے دیا۔ ساتھ ہی کچھ ایسی گول مول باتیں کیں جن سے کچھ لوگوں پر، خاص کر پنڈت مدن موہن مالوی پر، یہ اثر پڑا کہ اگرچہ ابھی کچھ نہیں ہوا پھر بھی گول میز کانفرنس کرنے کی کوشش جاری رکھنا مناسب ہوگا۔ اور جو شرطیں وائسرائے نے پیش کی ہیں وہ ایسی ہیں جو پوری کی جاسکتی ہیں۔

دیش بندھو داس، مہاتما جی کے اس تہیّہ سے بہت ناراض ہوئے۔ اُن کے نزدیک اس وقت برٹش سرکار کا اتنا جھکنا ہی بڑی بات تھی اور اُسے مان لینا چاہیئے تھا اگر کانگریس مان لیتی تو کانگریس کی طاقت بڑھتی اور کام زیادہ زوروں سے چلتا۔ سرکار اُسے دبا نہ سکتی۔ مہاتما جی نے سوچا کہ لارڈ ریڈنگ کی خواہش تھی کہ کلکتہ جیسے شہر میں ولی عہد کا اچھّا استقبال ہو جائے تو بمبئی وغیرہ کے واقعات کچھ اہمیت نہ رکھیں گے اور وہ ہندوستان کی وفاداری کا اعلان کرسکیں گے۔ کانفرنس کی شرائطِ اِستصواب اور تاریخ دونوں ہی غیر طے شدہ تھیں۔ نہ معلوم وہ کب ہوگی اور کیا کرے گی۔ اُس پر بھروسہ کرنا بے کار ہے اور کانگریس کی طاقت بڑھنے کے بدلے گھٹے گی تب مُلک یہ دیکھے گا کہ ہم اِس طرح ٹھگ لئے گئے۔ اِس کے علاوہ علی برادران کو ہم جیل میں کیسے چھوڑ سکتے ہیں؟ جن لوگوں نے سب باتوں میں ساتھ دیا ہے جن کا عوام پر اِتنا اثر ہے اور جو ہمارے ساتھی ہیں اُن کو جیل میں چھوڑ دینا اُن کے ساتھ بے انصافی ہوگی۔ اِس لئے لارڈ ریڈنگ کی شرطیں ہمیں صرف فریب میں ڈالیں گی،

کوئی کام نہیں نکلے گا۔

اِس میں کوئی شک نہیں کہ دیش بندھو داس بہت ناراض ہو گئے۔ جب میعاد پوری ہونے پر وہ رہا ہوئے تو انہوں نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ مہاتما جی نے بہت بڑی بھاری اور بھدی غلطی کی ہے۔ اِس معاملے پر تو غیر جانب داری کے ساتھ مستقبل کا کوئی مؤرّخ ہی رائے زنی کر سکے گا۔ میں اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ اُس وقت سے آج تک ہمیں جو تجربے برٹش سرکار کے ساتھ سمجھوتے کے ہوئے ہیں وہ بہت تلخ ہیں۔ لفظوں کے جال میں اصلی باتیں اکثر چھپ جاتی ہیں۔ مصالحت نامے اکثر انگریزی زبان میں ہی لکھے جاتے ہیں اور اُس کے معنی میں غلط تاویل، کی کافی گنجائش رہتی ہے۔ مارچ ۱۹۳۱ء میں لارڈ اِروِن کے ساتھ جو مصالحت ہوئی اُس کی شرطوں کو پورا کرنے میں لارڈ ولنگڈن کی سرکار نے اور سول سروس نے جو جو دِقّتیں پیش کیں، اُنہیں وہی جان سکتا ہے جس کو اِس بارے میں اِن سے باتیں یا خط کتابت کرنے کا موقع ملا ہو۔ مہاتما جی اپنے تجربے سے جانتے تھے کہ کسی شرط کو گول مول چھوڑ دینا یا اس میں کسی قسم کا ابہام رہنے دینا آخر میں بُری گھات ہو گی۔ ان کو برٹش سرکار کی نیک نیتی پر بھی یقین نہیں تھا۔ اِس لئے اُنہوں نے ایسی شرطوں کو ماننا ٹھیک نہیں سمجھا اور کانگریس کی طے شدہ پالیسی کو اور اپنے ساتھیوں کو اِن غیر طے شدہ شرطوں کے بھروسے جیل خانے میں چھوڑنے سے انکار کر دیا۔ کسی بھی ملک کی آزادی اگر سستی شرن سے مل جائے تو اُس کی اتنی قدر نہیں رہ جاتی۔ خاص کر ہندوستان کو تو اسے واجب قیمت ہی دے کر لینا چاہیئے۔ کیونکہ ہم اِتنے دِنوں کی غلامی کی وجہ سے اُس کی مناسب قیمت لگانا بھی بھول گئے ہیں۔

احمد آباد کانگریس اور ستیہ گرہ

اِدھر یہ باتیں چل رہی تھیں اور اُدھر کانگریس کے سالانہ جلسہ کے دِن بھی آ گئے دیش بندھو داس ہی صدر منتخب ہوئے تھے ۔ وہ تھے جیل خانے میں ۔ کانگریس کا اجلاس احمد آباد میں ہونے والا تھا ۔ وہاں سردار ولبھ بھائی صدر استقبالیہ تھے ۔ بڑے پیمانے پر تیاریاں کی گئی تھیں ۔ حسب بہار کے لئے گرفتاریاں بند ہوئیں ، ہم لوگ جو باہر تھے احمد آباد کے لیے روانہ ہو گئے ۔

احمد آباد کی کانگریس بہت باتوں میں انوکھی تھی ۔ پہلے پہل کانگریس سے کرسیاں اُٹھا دی گئیں ۔ ڈیلی گیٹوں کو فرش پر بٹھانے کا انتظام کیا گیا تھا ۔ اِس طرح اتنی ہی جگہ میں بہت سے ڈیلی گیٹ اور ناظرین بیٹھ سکتے تھے ۔ ڈیلی گیٹوں کا انتخاب پہلی بار کانگریس کے تبدیل شدہ ضابطہ کے مطابق ہوا ۔ اب ہم کہہ سکتے تھے کہ کانگریس چُنے ہوئے نمائندوں کی انجمن ہے ۔ بہت سے منتخب شدہ نمائندے جیل خانے میں تھے جن میں خاص الخاص صدر منتخب دیش بندھو داس تو تھے ہی ۔ بہت سے لیڈر جنہوں نے سال بھر بڑی محنت ، لگن اور جوش سے مُلک کو جگایا اور منظم کیا تھا ، اِس اجلاس میں سرکار کی پالیسی

کی وجہ سے شامل ہونے سے محروم رہے۔ جو لوگ آئے تھے اُن میں اور سارے مُلک میں جوش اُمڈا پڑ رہا تھا۔ گویا بھری ندی کے کناروں کو پار کر کے سیلاب چاروں طرف پھیل رہا تھا اتنی گرفتاریاں ہونے پر بھی کہیں بھی مُردنی نہیں چھائی۔ جبر و تشدد کی پالیسی نے لوگوں کو دبانے کے عوض زیادہ تر اُبھارنے کا ہی کام کیا تھا۔ گاندھی جی اُمید اور حوصلے سے پُر تھے۔ سب لوگ ستیہ گرہ کا خواب دیکھ رہے تھے۔ لوگ اس اُمید میں تھے کہ کانگریس ستیہ گرہ کی ہدایت دے گی اور اہتمام کرے گی۔ کانگریس کے ساتھ ایک بڑی اہم نمائش بھی ہوئی تھی۔ جس میں کھدر کے وجودِ نو بلکہ احیار کی بڑی اہمیت تھی، ڈیلی گیٹوں کے رہنے کے لئے کانگریس پنڈال کے نزدیک ایک چھوٹا موٹا نگر کھادی نگر کے نام سے بس گیا تھا۔ جہاں وہ سب ٹھہرائے گئے تھے۔ یہ سب باتیں کانگریس کے لئے نئی تھیں۔ پاس ہی اُسی طرح خلافت کانفرنس کے لئے پنڈال وغیرہ بنے تھے۔

کانگریس کا اِجلاس بھی نرالا ہی تھا۔ پُرانے رواج کے خلاف صدرِ استقبالیہ کی تقریر بہت مختصر تھی۔ اُس میں ملک کی حالت اور کانگریس کے پروگرام پر غور نہیں کیا گیا تھا۔ صرف آئے ہوئے ڈیلی گیٹوں کا استقبال ہی تھا اور کچھ گجرات میں ہوئے کام کا تھوڑا سا ذکر۔ صدرِ منتخب غیر حاضر تھے۔ اِس لئے اُن کی جگہ حکیم اجمل خاں صدر چُن لئے گئے صدرِ استقبالیہ اور صدر کانگریس دونوں ہی کی تقریریں قومی زبان ہندی یا اُردو میں ہی ہوئیں۔

سب سے اہم سوال ستیہ گرہ کا تھا۔ اِجلاس میں ایک ہی تجویز منظور ہوئی۔ جس میں حالت پر نظر واپسیں ڈالتے ہوئے ستیہ گرہ کا فیصلہ کیا گیا۔ اِس کام کے لئے گاندھی جی کُلی اختیارات کے ساتھ ڈکٹیٹر بنائے گئے۔ اِس بات کا اندیشہ تھا کہ جیسے اور لیڈر گرفتار کئے گئے ہیں گاندھی جی بھی گرفتار کر لئے جائیں گے۔ اِس لئے قرارداد میں اُن کو اسی حق کے

ساتھ اپنا قائم مقام کرنے کا بھی حق دیا گیا مگر یہ صاف کہہ دیا گیا کہ کانگریس کو بدلنے کا حق اُن کو نہیں ہوگا۔ ہاں اگر سرکار سے کچھ صُلح ہو تو اُس کی منظوری کانگریس سے لینی پڑے گی سیوک دَلوں کی تنظیم پر زور دیا گیا اور جس عہد نامے پر اُن کے دستخط ہونے والے تھے وہ اور بھی کچھ سخت بنایا گیا۔

اس اجلاس میں ایک خاص بات یہ ہوئی کہ مولانا حسرت موہانی نے یہ تجویز پیش کی کہ کانگریس کا نصب العین سوراج کے بدلے آزادیِ کامل INDEPENDENCE قرار دیا جائے۔ گاندھی جی نے اِس کی مخالفت کی اور تجویز منظور نہیں ہوئی۔ اس کے بعد تقریباً ہر اجلاس میں اِس قسم کی تجویز آتی رہی۔ مگر گاندھی جی کی مخالفت سے تب تک نامنظور ہوتی رہی۔ جب تک یہ کئی برسوں کے بعد گاندھی جی کے مخالفت اُٹھا لینے پر منظور نہ ہوگئی۔

دوسری بات یہ ہوئی کہ گول میز کانفرنس کے متعلق مالوی جی کی تجویز نامنظور کردی گئی پنڈت جی کلکتہ سے سیدھے احمد آباد آئے تھے وہاں اُن کی کوشش بے کار گئی۔ مگر وہ بڑے صاحبِ اُمید ہیں۔ اُنہوں نے کانگریس کو صلاح دی اور تجویز پیش کی کہ اگر سرکار گول میز کانفرنس کرے تو کانگریس اُس میں شریک ہو۔ اُوپر کہا جا چکا ہے کہ اُس وقت اِس کا کوئی موقع نہیں تھا اِس لئے کانگریس نے اس بات کو نہیں مانا بعد کو یہ معلوم ہوا کہ پنڈت موتی لال جی بھی کسی قسم کی مصالحت کے خلاف تھے۔

کانگریس کے اجلاس کے بعد سبھی لوگ اپنے یہاں واپس چلے گئے۔ وہیں پر معلوم ہوگیا کہ مہاتما گاندھی ایک جگہ ستیہ گرہ کریں گے اور وہ مقام ہوگا باردولی۔ اوروں کو بھی ہدایت ہوئی کہ اپنے اپنے مقام پر عوام میں تبلیغ اور تنظیم کریں۔ سب سے زیادہ کانگریس کے پروگرام کی تکمیل کے لئے خاص کر سیوک دَل کی تنظیم کے لئے جی توڑ کر محنت کرنے کی

کوشش کریں۔

پنڈت مالوی جی اور کچھ دوسرے لیڈروں نے طے کیا کہ ایک ایسی کانفرنس کی جائے جس میں کانگریس اور سرکار کے درمیان کا جھگڑا مٹانے کی کوشش کی جائے۔ اُنہوں نے احمد آباد کانگریس کے اِجلاس کے ختم ہوتے ہی اِس کا اِعلان کیا۔ مُلک کے خاص خاص آدمی جن میں خاص خاص کانگریسی اور خلافتی بھی شامل تھے، بمبئی میں مدعو ہوئے۔ یہ جلسہ وسطِ جنوری میں بمبئی میں ہوا۔ سر سنکرن نائر اس کے صدر ہوئے۔ میں بھی اور کانگریسیوں کی طرح وہاں گیا۔ گاندھی جی ہی ہماری طرف سے مقرّر تھے۔ ہم لوگوں نے طے کر لیا تھا کہ سب کی طرف سے جو کچھ کہنا ہوگا وہی کہیں گے۔ مہاتما جی نے صاف صاف بتا دیا کہ ہم کانگریسیوں کو اس گول میز کانفرنس سے جس کے انعقاد کی تجویز سرکار کی طرف سے کی جا رہی تھی، کوئی اُمید نہیں۔ تب بھی اگر وہ ہو اور گاندھی جی بلائے جائیں تو وہ غیر مشروط طور پر اُس میں شریک ہوں گے مگر انفرادی حیثیت سے۔ ہاں اگر کانگریس کو بلایا جائے تو وہ تبھی شریک ہو سکتے ہیں جب کانگریس کا پروگرام اور تاریخ طے کر لی جائے۔ ساتھ ہی وہ اِعلان واپس لے لیا جائے جس کے ذریعے سیوک دَل غیر قانونی قرار دیے گئے ہیں، اور اُسے نہ ماننے کی وجہ سے جن لوگوں کو سزا دی گئی ہے وہ چھوڑ دیے جائیں فتوے والے قیدیوں کو ضرور چھوڑنا چاہیئے۔ خلافت پنجاب اور سوراج والی کانگریس کی مانگیں ظاہر تھیں۔ کانگریس اُنہیں کو وہاں پیش کر کے اُنہیں منوانے کی کوشش کرے گی۔ اپنی طرف سے ہم ستیہ گرہ ملتوی کر دیں گے۔

کانفرنس کرنے والوں کی طرف سے ایک تجویز پیش کی گئی، مگر گاندھی جی کو یہ منظور نہ ہوا۔ اِس لئے اُس پر غور کر کے اس میں ردّ و بدل کرے۔ پھر پیش کرنے کے لئے ایک

سب کمیٹی بنادی گئی ۔ اُس روز جو لوگ موجود تھے اُن کی تقریریں ہوئیں ۔ میرے دل پر ایک تقریر کا بہت اثر پڑا تھا ۔ وہ تھا سر ہرمزجی واڈیا کا لیکچر ۔ یہ تھے ایک بزرگ بڑے تاجر اعتدال پسند طبقہ (لبرل پارٹی) سے تعلّق رکھنے والے پارسی ۔ اُنہوں نے سرکار کی ساری پالیسی کی سخت الفاظ میں مذمّت کی ۔ یہ اگرچہ ستیہ گرہ کے خلاف تھے مگر انہوں نے صاف صاف بتا دیا کہ اِن حالات کی ساری جواب دہی سرکار پر آتی ہے ۔

دوسرے دِن سب کمیٹی کی نشست ہوئی ۔ اُس میں گاندھی جی شریک رہے سب کی رائے سے ایک تجویز تیار ہوئی ۔ مگر سر سنکرن نائر بہت بگڑ گئے ۔ دوپہر کے بعد وہ کانفرنس سے چلے گئے ۔ اُن ساتھ کوئی دوسرا نہیں گیا ۔ تب کانفرنس کے صدر سر وشیشور یہ ہوئے ۔ اُنہوں نے یہ تجویز منظور کر لی ۔ گاندھی جی نے پھر اپنی باتیں دُہرادیں یہ بھی اُنہوں نے کہہ دیا کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ذریعے وہ ۳۱ جنوری تک کے لئے ستیہ گرہ ملتوی کرا دینے کی کوشش کریں گے ۔

بمبئی میں ورکنگ کمیٹی کے تقریباً سبھی لوگ تھے ۔ اِجلاس میں طے ہوا ۳۱ جنوری تک اور اگر گول میز کانفرنس کی بات اور تجویز کی دوسری شرطیں سرکار نے منظور نہ کر لیں تو جب تک اُس کا کچھ فیصلہ نہ ہو جائے تب تک اجتماعی ستیہ گرہ بند رہے گا ، اور انفرادی ستیہ گرہ ، صرف خود حفاظتی کے لئے ، جہاں مجبوری ہو گی وہیں کیا جائے گا ، مگر سیوک دَل کی تنظیم کا کام جاری رہے گا ۔ کانفرنس کی تجویز کو تار کے ذریعے کانگریس کمیٹی نے وائسرائے کے پاس بھیجا ۔ ایک طویل تار کے ذریعے سے یہ بھی اِعلان کیا گیا ، کہ کلکتہ والے ڈیپوٹیشن کے جواب میں جو شرطیں لارڈ ریڈنگ نے دی تھیں تقریباً وہ سبھی منظور کر لی گئی ہیں ۔ اور اب سرکار کو گول میز کانفرنس منظور کر لینی چاہیئے ۔ اُدھر سے نامنظوری کا

جواب آگیا۔ اِس پر پھر تار کے ذریعے مراسلت کی جارہی تھی کہ ۳۱ر جنوری کی تاریخ آگئی۔ اب کانگریس کے لئے کچھ طے کرنا ناگزیر ہوگیا۔

کانگریس سے واپسی کے بعد میں نے اپنے صوبے میں دَورہ شروع کیا۔ ۳۱ر جنوری کی میعاد گُذر جانے کے بعد باردولی کے ایک عام جلسہ میں جس میں مہاتماجی اور حکیم اجمل خاں شریک تھے۔ باردولی میں ستیہ گرہ شروع کرنے کا فیصلہ ہوا۔ اِس بات کا اعلان بھی کردیا گیا۔ شری وِٹھّل بھائی پٹیل اور سردار ولبھ بھائی پٹیل اب وہیں رہنے لگے تھے۔ مہاتما جی بھی پہنچ ہی گئے تھے۔ وہاں عوام کے جلسہ میں ستیہ گرہ کے معنی اور اُس میں ہونے والی مصیبتوں کی وضاحت کی۔ اُن سے حلف بھی لی کہ وہ سچّائی اور عدم تشدّد پر ڈٹے رہ کر سارے مُلک کے لئے آزادی حاصل کرنے میں اپنے آپ کو خاک میں مِلائیں گے۔ سورت میں ورکنگ کمیٹی کا اِجلاس ہوا اس نے وہاں ستیہ گرہ کرنے کی منظوری دے دی۔ اِس کے بعد ہی گاندھی جی نے وائسرائے کو خط لکھا جس میں اُنھوں نے ستّیہ گرہ کے فیصلہ کی اِطلاع دیتے ہوئے ستّیہ گرہ کی تاریخ بھی طے کردی۔

چوری چورا کا باب

میں صوبے کے دورے میں مظفرپور ضلع کے گاؤں میں گھومتا پھرتا پپری گاؤں کے جلسے میں تقریر کر رہا تھا۔ اُسی وقت تار ملا کہ ورکنگ کمیٹی اِجلاس باردولی میں ہونے والا ہے اور مجھے وہاں فوراً پہنچنا چاہیئے۔ میں وہاں سے فوراً روانہ ہوا۔ پہلی گاڑی جو مِلی اُس سے پٹنہ ہوتا ہوا وہاں چلا گیا۔

اِس دوران میں ایک بڑا تکلیف دہ اور اہم واقعہ ہو گیا۔ گورکھ پور ضلع کے چوری چورا گاؤں میں عوام اور پولیس میں مڈبھیڑ ہو گئی۔ عوام نے جوش میں آکر پولیس تھانے کو جلا دیا کتنے ہی پولیس والوں کو بھی مار ڈالا۔

مہاتما جی کے دل پر اس کا بہت گہرا اثر پڑا۔ اُنھوں نے دیکھ لیا کہ ملک نے ابھی تک عدمِ تشدّد کے راز اور اہمیت کو نہیں سمجھا ہے۔ اس لئے اگر ستیہ گرہ شروع ہوا تو اس طرح کے واقعات جا بجا ہونے لگیں گے۔ اس کے نتیجہ کے طور پر سرکار کی طرف سے بھی جابرانہ پالیسی زوروں سے جاری ہو گی اور عوام اُسے برداشت نہیں کر سکیں گے۔ اِس لئے اگرچہ وائسرائے کو ستیہ گرہ کرنے کی اطلاع دے دی گئی ہے۔ پھر بھی ستیہ گرہ کو

ملتوی ہی کر دینا چاہیئے۔ مُلک کی نبض پہچان کر مہاتما جی اِس فیصلہ پر پہنچ گئے۔ اِسی پر غور کرنے کے لیئے اُنہوں نے کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ طلب کی۔

اگرچہ میں جلد سے جلد روانہ ہوا تھا، پھر بھی جب میں باردولی اسٹیشن پر پہنچا تو اُسی ٹرین سے واپسی کے لیئے روانہ ہوتے ہوئے پنڈت مدن موہن مالوی سے ملاقات ہو گئی۔ اُنہوں نے بتا دیا کہ ورکنگ کمیٹی کا کام ختم ہو چکا ہے۔ اور ستیہ گرہ ملتوی کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا ہے۔ جب میں نے یہ سُنا تو میرے دل پر بھی ایک دھکّا سا لگا۔ میں وہاں پہنچا جہاں گاندھی جی ٹھہرے تھے۔ اُنہوں نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا۔

"فیصلہ سُن لیا ہے"

میں نے ہاں کہہ کر جواب دیا۔ اِس پر اُنہوں نے پوچھا "اِس بارے میں تمہاری رائے کیا ہے" میں ابھی کچھ جواب نہیں دے سکا تھا کہ وہ سمجھ گئے کہ میرے دل میں کچھ شبہ ہے۔ اُنہوں نے اسی وقت سب باتیں سمجھا دیں۔ میں سُنتا گیا، مگر ابھی کسی فیصلہ پر نہیں پہنچا تھا کہ اُنہوں نے کہا۔

"جو کچھ میں نے کہا ہے اُس پر غور کرو"

شام ہو گئی تھی۔ میں نے رات کو سب باتون پر اور سب پہلوؤں پر مہاتما جی کی بتائی باتوں کی روشنی میں غور کیا۔ میری بھی پختہ رائے ہو گئی کہ فیصلہ ٹھیک ہی ہوا ہے دوسرے دن گاندھی جی نے پھر پوچھا کہ 'کیا بچار کیا۔

میں نے جواب دیا۔

"میں سب باتیں سمجھ گیا ہوں، فیصلہ ٹھیک ہی ہوا ہے"

اِس پر وہ کچھ خوش معلوم ہوئے۔

اِس فیصلہ کے شائع ہوتے ہی تمام مُلک میں ایک عجیب حالت پیدا ہو گئی۔ معمولی کارکنوں کی بات کون کہے بڑے بڑے جیّد لیڈر۔ پنڈت موتی لال نہرو، لالہ لاجپت رائے وغیرہ، جو سبھی جیل میں تھے اس سے بہت جز بز ہوئے۔ اخباروں میں بھی مخالفت کی آواز اُٹھی۔ ہاں حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر انصاری بھی باردولی کے اِس اِجلاس میں نہیں پہنچ سکے تھے۔ اُن دونوں نے ستّیہ گرہ کو ملتوی کرنے کی رائے وہاں بھیج دی تھی۔ عوام میں ایک طرح کی مُردنی سی چھا گئی جیسے دَوڑتا ہوا آدمی ٹھیس لگ جانے سے گر پڑا ہو۔

باردولی میں ہی گاندھی جی نے پہلے پہل اس تعمیری پروگرام بیّن اور واضح تصویر دی جو آج تک کانگریس کا خاص پروگرام ہے۔ وہ تجویز اِتنی اہم ہے کہ اُس کی نقل ضروری ہے ذیل میں اس کا ترجمہ دیا جاتا ہے۔

چونکہ گورکھپور (چوری چورا) کا ہولناک باب اس بات کا بیّن ثبوت ہے کہ ملک کے عوام یہ بات اچھّی طرح نہیں سمجھ سکے ہیں کہ عدم تشدّد، سول نافرمانی یا ستّیہ گرہ کا ایک ضروری علی اور خاص جزو ہے اور چونکہ والنٹیروں کی بھرتی میں بغیر چھان بین کئے ہی ـــــ اور کانگریس کی بتائی ہوئی باتوں کے خلاف بھی۔ لوگ لے لئے گئے ہیں، جس سے لوگوں میں ستیہ گرہ کے خاص عنصر کی سمجھ کی کمی ظاہر ہوتی ہے، اور چونکہ اس ورکنگ کمیٹی کی رائے میں قومیت تک پہنچنے میں دیر ہونے کا ایک خاص سبب کانگریس کی اِنضباتی تنظیم کو بروئے کار لانے میں نقص اور کم زوری ہی ہے۔ اس لئے کانگریس کے اندرونی نظام کو مضبوط بنانے کے خیال سے یہ ورکنگ کمیٹی کانگریس کے سبھی منظم اجزار کو صلاح دیتی ہے کہ وہ حسب ذیل پروگرام کو انجام دینے میں لگ جائیں۔

۱۔ "کم سے کم ایک کروڑ کانگریس کے ممبروں کی بھرتی۔ چونکہ آمن و آمان

(عدمِ تشدّد و خود ضبطی) اور سچّائی کانگریس کی پالیسی کے خاص عناصر یا خلاصہ ہیں۔ اس لئے کسی ایسے شخص کی بھرتی نہ کی جائے جو حصولِ سوراج کے لئے سچائی اور عدم تشدد کو ناگزیر نہ سمجھتا ہو اس خیال سے کانگریس کی پالیسی کو ہر ایسے شخص یا فرد کو سمجھا دینا چاہیئے جس سے کانگریس کے ممبر بننے کا اِصرار کیا جائے۔ ممبر بنانے والے کارکن کو خیال رکھنا چاہیئے کہ سالانہ چندہ نہ ادا کرنے والا کانگریس کا صحیح ممبر نہیں سمجھا جائے گا۔ اس لئے پُرانے ممبروں کو پھر نئے سال کے لئے اپنا اپنا نام درج کرالینا چاہیئے۔"

۲۔ " چرخے کو مقبول عام بنانے اور ہاتھ سے کتے ہوئے سوت سے ہاتھ کے بنے ہوئے کھدّر تیار کرنے کا انتظام (یعنی اہتمام) کرنا۔ اس کام کی کامیابی کے لئے کل کارکنوں اور کانگریس کے عہدہ داروں کو کھدّر کی ہی پوشاک پہننی چاہیئے۔ اور یہ بھی اچھّا رہے گا کہ دوسروں کا حوصلہ بڑھانے کے لئے اُنہیں خود چرخے پر سوت کاتنا سیکھنا چاہیئے"

۳۔ " نیشنل اسکول یعنی قومی درس گاہیں قائم کرنا۔ سرکاری اسکولوں پر دھرنا نہیں دینا چاہیئے۔ قومی درس گاہوں کی تعداد روز بروز بڑھانے میں اِن اسکولوں کی اچھّی تعلیم پر ہی بھروسہ کرنا چاہیئے۔

۴۔ " گری ہوئی دِلت ذاتوں کے رہن سہن کو بہتر بنانے کے لئے اور اُن کی سماجی، ذہنی، اور اخلاقی حالت کو سدھارنے کے لئے اُن کی تنظیم کرنا۔ اُن کو سمجھا بجھا کر اُن کے بچّوں کو اسکولوں میں پڑھنے کے لئے بھیجنا اور جو سہولتیں سب کو ملتی ہیں اُن لوگوں کو بھی دِلوانا۔ جہاں کہیں اَچھوت ذاتوں کے لوگ زیادہ الگ رہتے ہوں۔ اور چھوت چھات کا جذبہ زبردست ہو، وہاں پر اُن کے بچّوں کے لئے کانگریس کی رقم سے الگ اسکول اور درس گاہیں چلائی جانی چاہئیں اور اُن لوگوں کو سمجھا بجھا کر اچھوتوں کو بھی عام کنوؤں

سے پانی بھرنے دینے کا اہتمام کرانا چاہیئے۔

۵۔ نشہ بندی کے لئے شرابیوں کی بستی میں گھر گھر جاکر اُن لوگوں کو سمجھا بجھا کر نشہ خوری بند کرنے کا منظم کام کرنا۔ اِس کام کے لئے دھرنا نہ لگایا جائے بلکہ سمجھا بجھا کر منّت سماجت سے ہی کام نکالنا چاہیئے۔

۶۔ آپس کے جھگڑوں اور مُقدّموں کو خانگی طور پر ہی طے تصفیہ کرا دینے کی غرض سے شہروں اور گاؤں میں پنچائتیں قائم کرنا۔ پنچائتی فیصلوں کو لوگوں سے منگوانے کی طاقت پنچائت کی سچّائی اور ایمان داری اِنصاف اور ہر دل عزیزی سے ہی ہونی چاہیئے۔ کسی طرح کی زور زبردستی کی پرچھائیں بھی نہ پڑنے پائے۔ اِس لئے ایسا نہ ہونا چاہیئے کہ جو کوئی پنچائتی فیصلہ نہ مانے وہ ذات برادری سے یا سماج سے خارج کر دیا جائے۔

۷۔ ہر ذات یا طبقے کے لوگوں میں میل جول بڑھانے اور آپس کے ایسے ربط ضبط کی ضرورت پر سب کی توجہ کھینچنے کی غرض رشتۂ اتّحاد مضبوط کرنا تحریک کا ایک مقصد ہے۔ ایسے سماجی خدمت کے شعبہ کو منظّم کرنا جو بغیر کسی تفریق کے سب کی خِدمت بیماری دُکھی یا کسی اور آفت مصیبت میں ایک طرح سے ایک جذبے سے کریں، تارکِ موالات کو اپنی پالیسی پر مضبوطی سے قائم رہتے ہوئے بھی، بیماری میں یا کسی مصیبت کے وقت، انگریزوں، یا ہندوستانیوں کو، یعنی سب کی برابر، خدمت کرنا ہی بڑائی یا خوش قسمتی کی بات سمجھنا چاہیئے۔

۸۔ تلک سوراج فنڈ کو جمع کرنے کا کام جاری رکھنا، اور ہر ایک کانگریسی یا کانگریس سے ہمدردی رکھنے والے سے مطالبہ پیش کرنا کہ وہ اپنی ۱۹۲۱ء کی آمدنی کا سواں حِصّہ تک سوراج فنڈ میں دیدیں۔ ہر ایک صوبہ کانگریس کمیٹی اپنی اِس جمع کی ہوئی رقم کا چوتھائی حصّہ ہر مہینہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے پاس بھیج دیا کرے۔

۹۔"اگر ضروری سمجھا جائے تو ورکنگ کمیٹی کی یہ تجویز ترمیم کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی آیندہ کے اجلاس میں پیش کی جائے گی۔"

۱۰۔"ورکنگ کمیٹی کی رائے میں کسی ایسے انتظام کی ضرورت معلوم ہوتی ہے جس کے ذریعے سرکاری نوکری چھوڑ کر آئے ہوئے لوگوں کے لئے کچھ کام دھندا دیا جاسکے۔ اِس غرض سے یہ کمیٹی میاں محمد حاجی جان، محمد چھوٹانی، سیٹھ جمنالال بجاج اور شری وی۔ جے پٹیل کو مقرر کرتی ہے کہ یہ لوگ ایک پلان اِس طرح کا تیار کر کے آیندہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے خاص اِجلاس میں غور وخوض کے لئے پیش کریں۔"

باردولی میں ہی یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس جلد ہی کیا جائے تاریخ طے کر کے دِلّی میں اِجلاس ہونے کا اعلان کر دیا گیا۔ اسی اجلاس میں باردولی کے فیصلوں پر اِعلان ہونا تھا۔

گاندھی جی نے پانچ دِنوں کا برت رکھا۔ وہاں کے عوام کے جلسہ میں اُنہوں نے اپنا تہیّہ بتایا۔ میں بھی اس جلسہ میں موجود تھا۔ لوگوں نے بات تو مان لی مگر وہ بھی مایوس نظر آتے تھے۔

دِلّی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس سے پہلے ہوئی، لالہ جی اور پنڈت موتی لال جی اور دوسروں کی ناراضی کی رائیں ملیں۔ یہ فیصلہ مُلک کے لئے بہت مُضر ہوا ہے۔ اس سے صرف عوام کی ہی حوصلہ شکنی نہیں ہوگی بلکہ ملک کے وقار کو بھی ٹھیس لگے گی۔

کچھ لیڈروں کے خط بھی جو اِسی مضمون کے تھے گاندھی جی کے پاس جیل سے آگئے تھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سبھی لیڈر اگر وہ جیل کے باہر ہوتے تو گاندھی جی کو اپنے عہدے

سے گرا دیتے اور ستیہ گرہ جاری کر دیتے۔ مگر گاندھی جی ٹس سے مس نہیں ہوئے۔ اُنہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ جو لوگ جیل میں بند ہیں اُنہیں حالات کا پورا علم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اُن کو رائے دینے کا کوئی حق نہیں ہے اور اگر وہ رائے دیتے ہیں تو اُس کا بہت وزن نہیں ہو سکتا۔ ورکنگ کمیٹی میں ہی میں نے دیکھا کہ گاندھی جی جب ایک فیصلہ پر پہنچ جاتے ہیں تو کس طرح اٹل رہتے ہیں اور رہ سکتے ہیں۔ سخت سے سخت مخالفت کے باوجود۔

حکیم اجمل خاں کانگریس کے صدر تھے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اِجلاس شروع ہوا۔ گاندھی جی نے باردولی کے فیصلہ کی تائید اور منظوری کی تجویز پیش کی۔ اس پر ڈاکٹر منجے نے اس کی ترمیم کی صورت میں ایک تجویز پیش کی جس میں کہا گیا کہ ایک کمیٹی بنائی جائے جو ترکِ موالات کے پروگرام اور اس کے مطابق ہر کام کی جانچ کرے اور مُلک کو مناسب مشورہ دے۔ اِس تجویز نے اور اِس پر اُن کی تقریر نے گاندھی جی پر عدم اعتماد یا ملامت کی صورت پیدا کر دی۔ گرما گرم بحث شروع ہوئی۔ اُسی وقت حکیم صاحب کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ وہ اجلاس میں بیٹھنے سے مجبور ہو گئے۔ اُنہوں نے گاندھی جی کو اپنی جگہ صدر بنا دیا۔ یہ کہہ کر وہ چلے گئے کہ درد کم ہوتے ہی میں حاضر ہو جاؤں گا، تب تک مہاتما جی جلسہ کا کام چلائیں گے۔ ہم لوگوں کی نظر میں یہ ٹھیک نہیں تھا کہ جس پر عدم اعتماد کی تجویز پیش ہے اور زیرِ بحث ہے وہ صدر کے عہدہ پر بیٹھا رہے۔ مگر گاندھی جی نے بے تکلّفی سے کام شروع کر دیا۔ اُن کے چہرے مُہرے سے کُچھ بھی تردّد نہیں جھلکا۔ ہمارا خیال تھا کہ صدر کا کام اتنا ہی ہے کہ سبھی ممبروں کا وہ معتمد بنا رہے اور اپنی کسی کارروائی سے مخالفوں کے دل میں یہ خیال نہ آنے دے کہ وہ اپنے حامیوں کا طرفدار ہے۔ گاندھی جی کی پالیسی

بھی وہاں عجیب بدلی ہوئی نظر آئی۔ جب کوئی بولنے اُٹھتا تو اس سے آپ پوچھتے کہ آپ ڈاکٹر منجے کے حق میں بولیں گے یا مخالفت میں اگر وہ کہتا کہ مخالفت میں تو گاندھی جی کہتے کہ آپ ٹھہریں، اور اگر وہ کہتا کہ حق میں بولوں گا تو گاندھی جی کہتے کہ آپ کو جو کچھ کہنا ہے کہیے۔ اس طرح پر کتنی ہی تقریریں ڈاکٹر منجے کے حق میں ہوئیں اور گاندھی جی نے ایک بھی تقریر اپنے حق میں نہیں ہونے دی۔ ہم لوگ کچھ فکر مند بھی ہونے لگے۔ سوچنے لگے کہ گاندھی جی اس طرح کیوں اپنے حق میں بولنے والوں کو کچھ کہنے کا موقع ہی نہیں دے رہے ہیں۔ آخر اُنھوں نے تجویز رائے شماری کے لئے اجلاس کے سامنے پیش کر دی۔ ہاتھ اُٹھنے پر معلوم ہوا کہ تقریباً اتنے ہی ہاتھ ڈاکٹر مُنجے کے حق میں اُٹھے جتنے لیکچر اُن کے حق میں ہوئے تھے عدمِ اعتماد کی تجویز زبردست اکثریت سے نامنظور ہوگئی۔ باردولی کا فیصلہ حسبِ ذیل طریقہ پر پیش کیا گیا۔

۱۔ "آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا یہ اجلاس باردولی کے ۱۱ر و ۱۲ر فروری ۱۹۲۲ء کی ورکنگ کمیٹی کی نشست میں پاس ہوئے تعمیری پروگرام کو پوری طرح غور کر لینے کے بعد منظور کرتی ہے۔ اور ساتھ ہی یہ طے کرتی ہے کہ شخصی سول نافرمانی چاہے وہ مدافعانہ ہو یا جارحانہ، خاص خاص جگہوں میں خاص خاص قانونوں کی بابت، مقامی صوبہ کانگریس کمیٹی کی اِجازت لے کر کی جا سکتی ہے۔ مگر یہ خیال رہے کہ یہ اُسی حالت میں کی جا سکتی ہے جب آل انڈیا کانگریس کمیٹی یا اُس کی ورکنگ کمیٹی کی بتائی ہوئی سول نافرمانی جاری کرنے کے پہلے کی کچھ شرطیں ٹھیک پوری ہو چکی ہوں۔"

۲۔ "کئی جگہوں سے رپورٹ آئی ہے کہ شراب کی دکانوں پر جس طرح سے دھرنا یا پکٹنگ ہوتا ہے اُسی طرح کپڑے کی دکانوں پر بھی کرنے کی ضرورت ہے اس لئے یہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی ایسے پکٹنگ کی اجازت کپڑوں کی دُکانوں کے لئے بھی دیتی ہے جو

نیک نیتی سے اور باردولی کی تجویزوں میں بناتے ہوئے طریقوں سے یا اِنہیں شرطوں کے ساتھ کی جائے گی۔"

۳۔ "آل انڈیا کانگریس کمیٹی اپنی یہ رائے ظاہر کر دینا چاہتی ہے کہ ورکنگ کمیٹی کی تجویز کے یہ معنی نہیں کہ وہ اپنے پہلے کے ترکِ موالات یا اجتماعی سول نافرمانی کی تجویز چھوڑ دیتی ہے۔ اِس کا مطلب صرف یہ ہے کہ باردولی میں بتائے ہوئے تعمیری پروگرام پر کارکنوں کے پورے دل سے لگ جانے سے اور کامیاب بنانے سے ہی اجتماعی سول نافرمانی کے لئے ضروری یا موافق فضا تیّار کی جاسکتی ہے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی یہ تجویز ہے کہ عوام کو ایسی ہی حالت میں سول نافرمانی[1] کو کام میں لانے کا پورا حق اور فرض ہے جب کہ حکمراں یا عمّالِ حکومت عوام کی طے کی ہوئی باتوں کی مخالفت کرنے پر آمادہ ہو جائیں۔

---

[1] شخصی یا انفرادی سول نافرمانی اُسے کہتے ہیں جو ایک شخص یا ایک محدود تعداد کے لوگوں کے جتھے یا جماعت کے ذریعہ قانون کے خلاف یا سرکار کے حکم کو نہ مان کر کی جائے۔ اِس لئے ایسی میٹنگ یا جلسہ کہ جس میں ٹکٹ کے ذریعے ہی لوگ جانے پاتے ہوں اور جس میں کوئی غیر مستحق تماشائی نہ جا سکتا ہو اگر سرکار اُسے منعقد کرنے سے منع کر دے تو اُسے کر لینا شخصی یا انفرادی سول نافرمانی ہے اور اگر جلسہ عوام کا ہے جس میں چاہے جو بھی بلا روک ٹوک شریک ہو سکتا ہے اور ایسا جلسہ اگر سرکار کی منظوری کے خلاف کیا جائے تو یہ اجتماعی سول نافرمانی ہے۔ MASSCIVIL DISOBEDIENCE سول نافرمانی کو بچاؤ کے لئے یا حفاظت کی غرض سے اس حالت میں کہیں گے جب میٹنگ یا جلسہ کسی پروگرام کو انجام دینے کے لئے منعقد ہو۔ جارح یا حملہ آور اس حالت میں کہیں گے۔ جب جلسہ کسی کام کے کرنے کے لئے نہیں بلکہ سرکاری مخالفت کی منادی کو توڑنے کے لئے کیا جائے اور گرفتاری یا جیل یا دوسری طرح کے تشدّد کو اپنے اُوپر لینے کے لئے کیا جائے۔

یہ کمیٹی باردولی کے فیصلوں کو منظور کرنے کے ساتھ ساتھ صرف اجتماعی سول نافرمانی کو چھوڑ کر لوگوں کو سبھی ضروری پروگرام پورا کرنے کی ہدایت کرتی ہے جو اس وقت ملتوی ہو گئے ہیں۔ گاندھی جی نے تجویز پیش کرنے کے وقت ہی ایسی تقریر کر دی تھی کہ اس کا اثر لوگ نہیں مٹا سکے، ستیہ گرہ ملتوی رہ گیا۔ اِس اجلاس کے متعلق دو باتیں اگرچہ وہ چھوٹی ہیں کہہ دینا بیجا نہ ہوگا۔ دِلّی کے اجلاس طے کرنے کے وقت جنتری نہیں دیکھی گئی تھی۔ اِتفاق سے جو دن مقرر کیا گیا، اُسی دن پھاگن کے مہینے میں شیوراتری تہوار تھا، ہندوؤں کی طرف سے تار پہنچنے لگے کہ دِن بدل دیا جائے مگر گاندھی جی اس پر رضامند نہیں ہوئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ شیوراتری بڑا بھاری پرب مانا جاتا ہے۔ بہتیرے لوگ برت اور پوجا وغیرہ کرتے ہیں۔ اس لئے دن کیوں نہ بدل دیا جائے، اس پر اُنہوں نے کہا۔

"برت اور کمیٹی کی نشست میں کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ لوگ برت رکھ کر بھی جلسہ میں شریک ہو سکتے ہیں اور کہاں اور کس شاستر میں لکھا ہے کہ برت کے دن کوئی اچھا کام نہیں کرنا چاہیئے۔ مُلک کی خدمت کا یہ ایک اہم کام ہے۔ اگر ہندو اس میں اس مذہبی جذبے کے ساتھ شریک ہوں گے جو ایسے پاک تہوار کے دن اُن سے متوقع ہے تو اِس سے بڑھ کر دوسری بات اور کیا ہو سکتی ہے۔ تاریخ اُنہوں نے نہیں بدلی۔ ایسوشی ایٹڈ پریس کے بانیوں میں ایک صاحب شری کیشو چندر رائے (کے۔ سی رائے) تھے جن کو میں کلکتہ میں تعلیم کے زمانے سے ہی جانتا تھا۔ وہ اِن دِنوں کلکتہ کے ایک روزانہ اخبار (ڈیلی نیوز) کے ادارتی صیغہ میں کام کیا کرتے تھے۔ اُن دِنوں وہ مشہور ہستی نہیں ہوئے تھے۔ اِس لئے مجھ جیسے طالب علم کے ساتھ بھی اُن کی جان پہچان اچھی طرح ہو گئی تھی۔ ایسوشی ایٹڈ پریس کے قائم ہونے کے بعد اخباری دنیا میں اُن کا بڑا نام ہو گیا تھا۔ اُونچے سے اُونچے

درجہ کے لوگوں تک وہ آسانی سے پہنچ جاتے تھے۔ سرکاری حلقوں میں اُن کی دھاک اور رسائی تو تھی ہی۔ اُن سے دِلّی میں ملاقات ہوگئی۔ بہت محبت سے اُنھوں نے مجھ سے تنہائی میں کہا کہ سرکار تم لوگوں کے ساتھ سختی کرے گی۔ وہ جان گئی ہے کہ تم لوگ اب کمزور ہوگئے ہو۔ تم لوگوں میں آپس میں تفرقہ پڑ گیا ہے۔ ایک رائے نہیں رہی۔ اس لئے اب گاندھی جی بھی جلد گرفتار کر لئے جائیں گے۔ اُن کے کہنے سے مجھے کچھ ایسا معلوم نہ ہوا کہ یہ باتیں اُنھوں نے کسی ملی ہوئی خبر کی بنیاد پر کہی ہیں۔ میں سمجھا کہ حالات کو دیکھتے ہوئے اُن کا یہ پیش اندازہ ہے۔ جو کچھ بھی ہو، دِلّی کے اجلاس کے بعد ہم لوگ اپنی اپنی جگہوں پر پہنچے ہی تھے کہ خبر آگئی، کہ گاندھی جی گرفتار کر کے سابرمتی جیل میں لے جائے گئے ہیں۔ میں فوراً سابرمتی کے لئے روانہ ہو گیا وہاں جس دِن مقدمہ دورہ جج کے یہاں پیش ہونے والا تھا، میں پہنچ گیا۔ کچہری کے اِس منظر کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ گاندھی جی کا بیان تو ایک تاریخی بیان ہے ہی۔ جج کا طور طریقہ اِس اہم موقعہ کے مطابق ہی تھا۔ گاندھی جی پر ینگ اِنڈیا میں لِکھے ہوئے مضمونوں کے متعلق الزام تھا۔ گاندھی جی نے اِلزاموں کو تو اپنے بیان میں ہی منظور کر لیا تھا۔ یہ بھی کہہ دیا تھا کہ اگر وہ آزاد رہیں گے تو ویسے ہی آگ کے ساتھ کھیلتے رہیں گے جیسے اب تک کھیلتے رہے ہیں۔ جج کے لئے بھی دو راستوں میں سے ایک کو منظور کرنے کے سوا تیسرا راستہ نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ وہ گاندھی جی کے خیالات سے متّفق ہوں تو، اُن کو استعفیٰ دے دینا چاہیئے اور اگر متفق نہ ہوں تو جتنی سخت سزا وہ دے سکتے ہوں اُن کو دینا چاہیئے کیونکہ گاندھی جی نے جو کچھ کیا ہے وہ جان بوجھ کر کیا ہے اور موقع ملنے پر پھر کریں گے۔

جج نے ایک مختصر سی تقریر میں جس سے جذبات ٹپک رہے تھے کہا کہ ملزم کے

اِلزام منظور کر لینے سے اُن کا کام ایک طرح سے ہلکا پڑ گیا مگر دوسری طرح پر جو کام باقی رہ گیا ہے یعنی سزا دینے کا وہ بھی کٹھن ہے۔ گاندھی جی کو اُن کے بے شمار اہلِ ملک قابلِ پرستش مانتے ہیں۔ جج کو کسی ایسے شخص کے مقدمے کو دیکھنے یا سُننے کا موقع پہلے کبھی نہیں مِلا ہے اور شاید مِلے گا بھی نہیں۔ جج کو صرف قانون کے مطابق کام کرنے کا ہی حق ہے، قانون ایک انسان اور دوسرے انسان میں، شخصیت کی بنا پر فرق نہیں کرتا۔ اس لئے اِنہیں سزا دینی پڑے گی ہی۔ گاندھی جی کا مقام لوکمانیہ تلک جیسا ہی ہے۔ جو سزا اُن کو ایسی ہی حالت میں ملی تھی وہی یعنی چھ سال قید کی سزا، گاندھی جی کو دینا نامناسب نہ ہوگا۔

یہی حکم جج نے سنا دیا۔ گاندھی جی نے اُن کا اس بات کے لئے شکریہ اَدا کیا کہ اُنہوں نے اُن کو لوک مانیہ تلک کا ہم پلّہ مانا۔ جج کے اُٹھ جانے کے بعد ہم جتنے تھے سب ایک ایک کر کے گاندھی جی سے مل کر پرنام کر کے رخصت ہوئے، وہ منظر انتہائی رقّت خیز تھا۔ میں دل کا کمزور ہوں۔ بچّوں کا رونا بھی میں برداشت نہیں کر سکتا۔ رقّت کے موقع پر میں خود کو بھی روک نہیں سکتا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ شری کیلکر بھی وہاں موجود تھے۔ اُنہوں نے مجھے روتے ہوئے دیکھ کر بہت سمجھایا اور کہا کہ جب لوکمانیہ کو سزا ملی تھی تو اُن لوگوں کی بھی یہی حالت ہوئی تھی، کچھ دیر کے بعد میں بھی سنبھل گیا اور گاندھی جی سے رخصت ہوا۔

اِسی مقدمہ میں شری شنکر لال بینکر بھی ملزم تھے وہی ینگ انڈیا کے پرنٹر اور پبلشر تھے اُن کو بھی ایک سال کی سزا ملی، اُن کی خوش قسمتی تھی کہ وہ گاندھی جی کے ساتھ ہی سزا پا کر جیل گئے اور اپنی میعاد پوری ہونے تک اُن کے ساتھ ہی رہے۔

تعمیری کام شروع

جیل جاتے وقت مہاتما گاندھی جی نے ہدایت کی تھی کہ کانگریس کو تعمیری کام میں لگ جانا چاہیئے اُسی کے ذریعے مُلک ستیہ گرہ کے لئے تیار ہو سکے گا۔ اس تعمیری پروگرام میں کھدر کے پرچار کے ذریعے بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ، قومی تعلیم، اچھوت اُدھار، ہندو مسلم اتحاد کا قیام وغیرہ خاص تھے۔

حوصلہ اور جوش میں بھرے ہوئے لوگ چاہتے تھے کہ ستیہ گرہ شروع کر ہی دیا جائے کچھ لوگ یہ کہنے کو بھی تیار ہو گئے تھے کہ گاندھی جی نے ستّیہ گرہ روک کر مُلک کا ستیاناس کر دیا ہے اور اب وہ ساری تحریک ختم ہو گئی۔ کچھ لوگ سوچنے لگے کہ اب ستیہ گرہ نہیں کرنا ہے، تو کونسلوں کا بائیکاٹ بے کار ہے۔ وہاں جانے میں جو پابندی ہے، اُسے ہٹا دینا چاہیئے۔ کچھ لوگ گاندھی جی کے بتائے تعمیری پروگرام پر زور دے رہے تھے، اور اِس کے لئے زوروں سے کام کرنا چاہتے تھے۔ پھوٹ کا جو بیج دسمبر کے مہینے میں لارڈ ریڈنگ کے ساتھ مصالحت نہ ہونے کی وجہ سے بویا گیا تھا اور جو باردولی کے فیصلوں کے وقت کافی پھوٹ نکلا تھا وہ تیزی کے ساتھ نشوونما پانے لگا۔ بڑے بڑے لیڈر بھی جیل میں تھے

باردولی اور دِلّی کے فیصلے اُوپر لکھے جا چکے ہیں۔ اُن سے ظاہر ہے کہ اِجتماعی سِول نافرمانی کو ملتوی کر دیا گیا تھا۔ جارحانہ انفرادی ستیہ گرہ بھی بند ہی تھا، مگر حفاظتی ستیہ گرہ کی اجازت تھی۔

کچھ لوگ، خاص کر مہاراشٹر کے چند اشخاص ترکِ موالات اور ستیہ گرہ کے پروگرام سے شروع سے ہی غیر مطمئن تھے۔ ملک کی حالت کے اثر سے جو فیصلہ کانگریس نے کر دیا، اس کے مطابق وہ کام تو ضرور کرنے لگے تھے۔ مگر اُن کا دِل کبھی اس سارے پروگرام میں نہیں لگا۔ اِس لئے جب جب اُنہیں موقع مِلتا وہ اُس کے کسی نہ کسی جزو کے خلاف آواز اُٹھاتے۔ ۱۹۲۱ء کی جولائی والی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بمبئی کے اجلاس میں ہی اُنہوں نے آواز اُٹھائی تھی، پھر وہی بات احمد آباد کانگریس کے اجلاس کے وقت بھی کہی جانے لگی۔ جب باردولی میں کانگریس ورکنگ کمیٹی نے ستیہ گرہ ملتوی کرنے کا فیصلہ کر دیا تو اُن کو اور بھی بہت اچھا موقع مِل گیا۔ دِلّی کی آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں ڈاکٹر مُنجے نے، اِسی سبب سے ایک تجویز پیش کی تھی، جس کا ذکر اُوپر کیا جا چکا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ سارے پروگرام کے بارے میں جانچ کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے۔ وہاں تو یہ تجویز نامنظور ہو گئی مگر مہٹی سی، پی کانگریس کمیٹی میں ڈاکٹر مُنجے کی خواہش پوری ہوئی۔ وہاں ایک کمیٹی بنی۔ اُس نے ایک رپورٹ تیار کی جس میں تقریباً سارے پروگرام کو توڑ مروڑ کر ایک نیا پروگرام بنایا گیا۔ وہاں کی صوبائی کانگریس کمیٹی نے اُسے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے پاس غور کرنے کے لئے بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ مگر وہاں کے عوام اس سے مطمئن نہیں تھے۔ ناگپور میں ایک بڑا جلسہ ہوا۔ اُس میں صوبائی کمیٹی پر عدم اعتماد ظاہر کیا گیا۔ اُس جلسہ میں آٹھ نو ہزار آدمی تھے۔ شری جمنالال بجاج اُس کے

صدر تھے۔ ڈاکٹر مُنجے کے ہم خیال لوگ بھی اس میں شامل تھے۔ رپورٹ کی تائید میں جو کچھ کہا جاسکتا تھا اُنہوں نے کہا بھی، مگر سات گھنٹوں کی بحث کے بعد جلسے نے رپورٹ کی مذمّت کردی۔ چند ہاتھ ہی اس کے حق میں اُٹھے۔ باقی سب کے سب رپورٹ کی مخالفت میں ہی رہے۔

اس کے برعکس بہار نے باردولی اور دِلّی کے فیصلوں کا خیر مقدم کیا۔ صوبائی کمیٹی نے تعمیری کام کے متعلّق ایک طویل قرارداد منظور کی۔ اگرچہ یہاں بھی سرکاری جبر جاری تھا پھر بھی ستیہ گرہ بند کر دیا گیا، اور کانگریس کمیٹیوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ تعمیری پروگرام زوروں سے چلائیں۔ گجرات نے بھی ایسا ہی کیا۔ بِہار میں اس کا یہ اثر ہوا کہ دوسرے خیال کے لوگ جو ترکِ موالات اور ستیہ گرہ کے سبب سے کانگریس سے الگ ہو گئے تھے، تعمیری کام میں مدد دینے کو تیار ہو گئے اِن میں سے خاص تھے، بابو گنیش دت سنگھ۔ پٹنہ میں ایسے لوگوں ایک عام جلسہ ہوا جس میں میں دوسرے تارکینِ موالات کے ساتھ شریک ہوا تھا۔ وہاں پر اُنہوں نے طے کیا کہ وہ بھی اس میں پوری دلچسپی لیں گے اور حتی الامکان مدد کریں گے۔

ہم نے کھدّر کا کام زوروں سے ہاتھ میں لیا۔ ساتھ ہی قومی تعلیم کے متعلّق ایک کانفرنس کی گئی جس میں اس کے ضابطے اور نصاب وغیرہ پر غور کیا گیا۔ اُس زمانے میں جتنی درس گاہیں چل رہی تھیں۔ اُن کو زیادہ مدد دینے کی تدبیریں سوچی گئیں۔ ہم سبھی لوگ اِنہیں خیالوں کو لے کر جابجا سفر بھی کرنے لگے۔

سرکار کی دورُخی پالیسی چلتی رہی۔ ایک طرف گرفتاریاں بھی ہو رہی تھیں دوسری طرف جو جیل میں گئے تھے اُن کے مقدّمے کے کاغذوں کو سرکار نے ہائی کورٹ کے ایک جج سر بسنت کُمار مَلِک کے پاس بھیجا۔ اُن سے کہا گیا کہ وہ کاغذوں کو دیکھ کر اپنی

رائے دیں کہ سزا ٹھیک اور موزوں ہے یا نہیں۔ اُن کی سفارش سے کچھ لوگ چھوڑ دئے گئے اور کچھ کی سزا کم ہوگئی مگر زیادہ تر جوں کے توں جیلوں میں پڑے رہے۔

ڈاکٹر سچد انند سنہا ۱۹۲۱ء میں ہی رائے کرشن داس بہادر کی رحلت کے بعد بہار کے گورنر کی کونسل کے ممبر مقرر ہو چکے تھے۔ جیل کا محکمہ اُن کے چارج میں تھا۔ اُنہوں نے سیاسی قیدیوں کے متعلق کچھ قاعدے بنائے جن سے عوام کو کچھ تسلّی ہوئی مگر جیل کے حکّام اِس سے بالکل مطمئن نہیں تھے۔ کچھ دِنوں کے بعد ایک آدمی (سر ہُر مُزجی بنات والا) جیلوں کا انسپکٹر جنرل بن کر کسی دوسرے صوبے سے آیا۔ وہ بڑا سخت سلوک کرنے لگا۔ نیئے قاعدے کے باوجود بِہار کی جیلوں میں سیاسی قیدیوں کے ساتھ کافی سختی ہوتی رہی جس کا ذکر اُن دِنوں اخباروں میں اکثر ہوتا رہتا تھا۔ اُن سے چکّی چلوانا اور کولھو پلوانا تو معمولی بات تھی۔ اگر حکم کے مطابق پورا کام نہ ہو تو اس کے لئے سزا ہوتی۔ پاؤں میں بیڑی یا ڈنڈا بیڑی، کھڑی ہتھکڑی، ٹاٹ وردی جو جیل کی سخت سزائیں ہیں۔ بہتیروں کو بھگتنی پڑیں کہیں کہیں بیدزنی بھی ہوئی۔ مسلمانوں کی تعداد جیلوں میں کافی تھی، اِس لئے اُن کی سرکار سے اذان کے معاملے پر مڈبھیڑ ہوگئی۔ حاکموں نے اُسے بند کرنے کا حکم دیا۔ اُنہوں نے نہیں مانا اس کے لئے بہتوں کو سزا ہوئی۔

مولانا مظہر الحق صاحب نے ۱۹۲۱ء میں ہی ایک ہفتہ وار اخبار مدرلینڈ کے نام سے نکالنا شروع کیا تھا۔ اُس میں زیادہ تر وہ خود لکھا کرتے تھے۔ یہ اخبار پٹنہ سے شائع ہوتا تھا۔ اس میں جیل کے متعلق ایک مضمون چھاپنے پر اُن پر سر ہُر مزجی بنات والا نے ایک مقدمہ چلایا جس میں اُن کو سزا بھی ہوگئی۔ مجھے بھی ایک بہت بڑا شذرہ ڈاکٹر سچد انند سنہا کے جیل کے متعلق نظم و نسق کے خلاف لکھنا پڑا تھا۔

مہاتما جی کے قید ہو جانے کے بعد ورکنگ کمیٹی کا اجلاس مختلف مقامات پر ہوتا رہا۔ اِن اِجلاسوں میں تعمیری کاموں پر زور دیا جاتا رہا۔ ایک اِجلاس میں کھدر کے پرچار کے لئے کام کو منظّم طریقہ پر چلانے کی غرض سے ایک بورڈ بنانا طے ہوا۔ اِس کام کے لئے تِلک سوراج فنڈ میں روپئے دینے کی بھی اجازت دی گئی۔ شری وٹھل بھائی پٹیل جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سکریٹری تھے۔ تقریروں اور اخباری تحریروں کے ذریعے عوام کو اور کانگریسی کارکنوں کو برابر حوصلہ دیتے رہے کہ کانگریس کے زیادہ سے زیادہ ممبر بنانے میں، تِلک سوراج فنڈ کے لئے رقم جمع کرنے میں کھدّر کا پرچار، اچھوت اُدھار اور قومی کاموں میں زور لگاتے رہے پھر بھی سستی آتی رہی۔ لکھنؤ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اِجلاس کیا گیا۔ شری وٹھل بھائی پٹیل اُس زمانے کی حالت سے بہت غیر مطمئن تھے۔ میں لکھنؤ پہنچا تو سہی، مگر پہنچ کر بخار میں مبتلا ہو گیا۔ اِس لئے وہاں کی نشستوں میں صرف دیکھنے والے کی حیثیت سے ہی حصہ لے سکا بحث مباحثہ میں بہت حصہ نہ لے سکا۔ خوش قسمتی سے پنڈت موتی لال نہرو اُسی زمانے میں رہا ہوئے اور دوسرے دن کے اجلاس میں شرکت کی۔ پنڈت جی کے پہنچنے کے پہلے ہی اُس اجلاس میں شری وٹھل بھائی پٹیل اور متعدد دوسرے لیڈروں کے ایما سے ایک کمیٹی مقرر کرنے کی بات چلی جس کے ذمہ یہ کام دیا گیا کہ وہ ملک کی حالت پر غور کر کے اور جہاں جاکر جانچ کرنے کی ضرورت سمجھے وہاں جاکر جائزہ لے کر اِس بات کی رپورٹ کرے کہ مُلک ستیہ گرہ کے لئے تیار ہے یا نہیں۔ پنڈت جی نے بھی آنے کے بعد اُسے منظور کر لیا اور صدر سے اصرار کیا گیا کہ وہ ایک کمیٹی بنائیں۔ گاندھی جی بغیر کسی کمیٹی کی جانچ کے ہی مُلک کی نبض پہچان لیا کرتے تھے۔ جب سے وہ ہندوستان واپس آئے تھے اور پبلک کاموں میں کھلے طور پر حصّہ لینے لگے تھے۔ اُنہوں نے اپنی اُسی طاقت سے کام لیا تھا۔

اُن کے ہٹتے ہی کمیٹی کو اس کی ضرورت محسوس ہوئی مگر اس کا نتیجہ اچھّا نہیں ہوا، جیسے ہندوستان کی برٹش سرکار جب کسی معاملے کو ٹال دینا چاہتی ہے تو ایک جانچ کمیٹی مقرّر کر دیتی ہے۔ ویسا ہی ہم نے بھی کیا۔ اِس سے ایک طریقہ پر ستیہ گرہ ملتوی ہو گیا۔ تعمیری کام کی جو رفتار ہونی چاہئے تھی اور جس پر گاندھی جی زور دیتے رہے تھے، اُس کی قیمت بھی ایک طرح پر ثانوی ہو گئی۔

اِسی اِجلاس میں ایک دوسرا کام بھی کیا گیا جس کا نتیجہ کچھ دنوں کے بعد بہت اچھّا نکلا۔ ملک میں بڑھتے ہوئے کھدّر کے کام کی دیکھ بھال کے لئے ورکنگ کمیٹی نے جو بورڈ بنایا تھا اُسے آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے منظور کر لیا۔ ۱۹۲۱ء میں جب سوراج فنڈ جمع ہو چکا، کھدّر کے کام پر زور دیا گیا تو اسی فنڈ سے سبھی لوگوں کو کھدّر کے پرچار کے لئے روپے دئے گئے۔ ابھی کسی کو کھدّر کے بارے میں نہ تو بہت واقفیت تھی اور نہ تجربہ اس لئے محسوس کیا گیا کہ روپے بہت خرچ ہوں گے اور کام ٹھیک طریقے سے نہیں بڑھے گا۔ اس بورڈ کے ذمّہ سبھی صوبوں میں منظّم طریقے پر کام کی دیکھ بھال کا بار دیا گیا۔ سیٹھ جمنالال بجاج اس کے صدر منتخب ہوئے۔ سیٹھ جی کو تعمیری کام پر بہت عقیدہ تھا۔ اُنہوں نے کھدر کے پرچار اور اچھوت اُدھار کے کام کو بہت محنت اور دلچسپی سے شروع کر دیا۔

بہار میں کانگریس کی تیاری

احمد آباد کانگریس میں بہار کے جو نمایندے موجود تھے، اُن سب کی رائے ہوئی کہ اِس بار کانگریس کا اجلاس بہار میں کرنے کی دعوت دی جائے۔ بہار میں اِس کے پہلے صرف ایک ہی بار کانگریس ہوئی تھی۔ ۱۹۱۲ء میں جب آپس کے اختلاف رائے کی وجہ سے کانگریس بہت کم زور ہو چکی تھی اور اس میں حاضری بہت کم ہوا کرتی تھی۔ اُس بار کے اجلاس کے منتظموں کا تجربہ کچھ اچھا نہیں بلکہ تلخ ہی تھا۔ یہاں تک کہ کانگریس کے وقت جو خرچ ہوا اس کے کچھ روپئے خسارہ میں پڑ گئے۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر مظہر الحق صاحب سکریٹری ڈاکٹر سچد انند سنہا اور دوسرے ممبروں پر اُن باقی روپیوں کے لئے عدالت میں نالش ہوئی مگر بہار میں چمپارن میں مہاتما جی کی آمد کے بعد اور خاص کر ۱۹۲۱ء کی تحریک کے سبب سے کافی بیداری ہو گئی تھی۔ ہم لوگوں نے محسوس کیا کہ اس بار ویسے تلخ تجربے نہیں ہوں گے حوصلہ کر کے ہم نے دعوت تو دے دی مگر وہاں یہ طے نہ کر سکے کہ بہار کے کس شہر میں اجلاس کیا جائے۔ یہ بہار کی صوبائی کمیٹی کی نشست میں طے کرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ کانگریس نے بھی احمد آباد میں طے نہیں کیا کہ کس صوبے میں آیندہ اجلاس ہوگا۔ یہ فیصلہ کچھ دِنوں

کے بعد ورکنگ کمیٹی نے کیا کہ بہار کا دعوت نامہ منظور کیا جائے۔

بہار میں صوبہ کانگریس کمیٹی کی نشست ہوئی۔ وہاں پر طے ہوا کہ گیا میں کانگریس کا اِجلاس کیا جائے۔ اس ضلع میں روپئے جمع کرنے کے لئے میں شری کرشن پرکاش سین سنگھ کے ساتھ دورہ کرنے لگا۔ کچھ کامیابی بھی ہوئی سارے ضلع میں جہاں میں پہلے نہیں گیا تھا۔ جانے کا اچھا موقعہ ملا۔ اس ضلع میں برسات میں گھومنا پھرنا بہت مشکل ہے۔ مٹی چکنی اور سخت ہے۔ جہاں پکّی سڑک نہیں ہے وہاں کسی بھی سواری کا گذر نہیں ہے۔ اِس لئے برسات کے پہلے ہی میں نے بہتیری جگہوں میں جہاں کچھ جمع ہو سکتا تھا، وہاں جاکر کام کر لیا۔

پٹنہ میں ۱۹۱۲ء کی کانگریس کے استقبالیہ سکریٹری پر مقدّمے کی بات مجھے یاد ہے۔ اس لئے طے کیا گیا کہ ابھی صدر استقبالیہ اور دوسرے عہدہ داروں کا پکّا چناؤ نہ کیا جائے۔ جب کافی تعداد میں استقبالیہ کمیٹی کے ممبر بن جائیں گے تبھی عہدہ داروں کا انتخاب کرنا ٹھیک ہو گا۔ تب تک کام چلانے کے لئے میں عارضی سکریٹری بنا دیا گیا۔ کچھ لوگوں کی ایک چھوٹی انتظامیہ کمیٹی میری مدد کے لئے بنا دی گئی جس میں انوگرہ بابو بھی تھے۔ میں نے طے کر لیا اور کمیٹی سے کہہ بھی دیا تھا کہ میں ایک پیسہ بھی قرض لے کر خرچ نہیں کروں گا۔ اتنا ہی نہیں کسی کام کو تب تک شروع بھی نہیں کروں گا۔ جب تک اُس کے لئے پورے روپئے پاس نہ آجائیں گے۔ یہی ایک واحد تدبیر تھی جس سے اپنے اُوپر کی اقتصادی ذمّہ داری سے میں اور کمیٹی کے ممبر اپنے کو بچا سکتے تھے۔ سبھی ضلعوں کو خط لکھے گئے کہ سب اِستقبالیہ کمیٹی کے ممبر بنائیں اور چندہ جمع کریں مگر کارکنوں میں کچھ سُستی سی نظر آنے لگی۔ روپئے کی فراہمی کی بھی کمی ہونے لگی۔ احمد آباد کے بعد کانگریس کا روپ ہی

بدل گیا تھا۔ ہم کو ایک نیا شہر سا بسانا تھا جو گیا شہر کے باہر ہو اور جہاں لوگوں کے رہنے کے جھونپڑے روشنی اور پانی کا پورا انتظام ہو۔ اِس کے سوا کانگریس کا پنڈال تیار کرانا تھا۔ کچھ دشواری زمین ملنے میں ہوئی مگر مقامی لوگوں کی مہربانی سے گیا شہر سے تقریباً ڈیڑھ دو میل دکھن میں تنبوئی گاؤں میں پکّی سڑک کے پورب میں آم کا باغیچہ اور دکھن میں خالی کھیت مل گئے۔ خالی کھیت میں پنڈال اور باغیچے میں رہنے کے لئے جھونپڑے بنانے کا فیصلہ ہوا۔ کچھ دُور پر ایک دوسری پھلواڑی مل گئی جس میں چھوٹا سا بنگلہ بھی تھا۔ اسی میں کھدّر کی نمائش کرنے کا فیصلہ ہوا۔ کچھ وقت تو نقشہ بنانے میں اور جا بجا روپئے اور بانس بلّی جمع کرنے میں لگا۔ برسات میں کام ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اِس لئے برسات کے بعد ہی کام شروع کرنے کا فیصلہ ہوا۔

اجلاس دسمبر کے آخری ہفتہ میں ہوا کرتا تھا۔ اس لئے برسات کے بعد تقریباً تین مہینے ملتے تھے۔ اگر روپئے اور سامان تیار ہوں تو سب کچھ کر لینا زیادہ مشکل نہ تھا۔ مگر بدقسمتی سے ابھی روپئے کافی نہیں آئے تھے۔ میں نے اخباروں کے ذریعے اور آدمی بھیج کر سبھی ضلعوں کو تاکید کی۔ مگر روپئے کافی نہیں آئے۔ میری فکر بڑھنے لگی میں نے تو طے کر ہی لیا تھا کہ تب تک کسی کے ساتھ کوئی ٹھیکہ نہیں کروں گا جب تک ٹھیکے کے لئے پورے روپئے بنک میں جمع نہ ہو چکے ہوں۔ جوں جوں وقت نزدیک آنے لگا فکر بڑھتی گئی۔ ہم اس وقت کے نزدیک پہنچتے گئے جب کوئی ٹھیکے دار اس وقت کی کمی کی وجہ سے ضروری جھونپڑے پنڈال وغیرہ تیار کر دینے والا نہ ملتا۔ کمیٹی کی نشست ہوئی سب باتوں پر غور کیا گیا۔ میں اپنے فیصلہ پر ڈٹا رہا کہ جب تک کسی کام کے پورے روپئے بنک میں جمع نہ ہو جائیں گے تب تک میں سکریٹری کی حیثیت سے کسی ٹھیکے پر دستخط نہیں

کروں گا۔ سب ضلعوں کے کارکنوں کی سُستی سے ہم گھبرا رہے تھے۔ آخر میں یہ طے کیا گیا کہ کمیٹی کے ممبروں کی ذاتی ذمّہ داری پر بینک سے روپیئے قرض لیئے جائیں۔ یہ روپیئے بینک میں جمع کر دیئے جائیں اور اس عارضی شہر بسانے کا ٹھیکہ دیا جائے۔

اس طرح پچاس ہزار روپیئے قرض لینے کی بات ہوئی۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ یہ بات خفیہ رکھی جائے۔ کیونکہ اِس کا شائع ہونا سارے صوبے کے لئے بے عزّتی کی بات ہوگی اور سرکار کے کارکُن اور دوسرے لوگ یہ دیکھ کر خوشیاں منائیں گے۔ میں نے کہا کہ صوبے کے عوام پر میرا بھروسہ ہے۔ لوگوں کو جب یہ معلوم ہو جائے گا کہ کانگریس کو مدعو کر کے ہم اِس بے بسی میں ہیں تو وہ یقیناً ضروری رقم دے دیں گے۔ ساتھ ہی کانگریسی کارکُن بھی حالت ڈانواڈول سمجھیں گے اور روپیئے جمع کرنے میں دل سے لگ جائیں گے۔

تجویز اخباروں میں شائع کر دی گئی میں روپیئے جمع کرنے کے لئے دَورہ پر نکل گیا جیسے ہی لوگوں نے اِس تجویز کو اخباروں میں پڑھا۔ سارے صوبے کے کانگریسی کارکنوں کے دِل میں آگ سی لگ گئی۔ سبھی خوب زوروں سے استقبالیہ کمیٹی کے ممبر بنانے اور روپیہ جمع کرنے کے کام میں لگ گئے۔ میں جہاں گیا وہاں کافی روپیئے ملنے لگے۔ سبھی لوگ صوبے کی بے عزّتی کا خطرہ محسوس کرنے لگے۔ میں تقریباً ایک ہفتہ کے دَورہ کے بعد کئی ہزار روپیئے جمع کر کے واپس آیا۔ روپیئے ساتھ تھے ہم لوگ ٹھہرا کرتے تھے اُسی چھوٹے بنگلہ میں جو شہر سے تقریباً ڈیڑھ میل دُور تھا اور جس میں کھدّر کی نمائش کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ وہاں اتنے روپئے ساتھ رکھنا ٹھیک نہیں تھا۔ ریل سے میں پچھلے پہر چار بجے کے قریب اُترا۔ گیا اِسٹیشن پر مجھے پولیس کا ایک داروغہ مِلا۔ اُس نے اخباروں میں ہماری تجویز پڑھی تھی وہ یہ خواب دیکھ رہا تھا کہ شاید گیا میں کانگریس ہو ہی نہیں سکے گی۔ اُس نے ٹرین سے اُترتے مجھ سے

سوال کیا۔ بینک سے روپئے قرض لے لئے گئے؟ شاید وہ سمجھتا تھا کہ کوئی بینک بھی اِتنی بڑی رقم ذاتی ذمہ داری پر نہ دے گا۔ میں نے جواب دیا نہیں۔ تب اُس نے پوچھا "کہ کانگریس کیسے ہو سکے گی"؟

میں نے جواب دیا کہ قرض لینے کی اب ضرورت نہیں رہ گئی۔ یہ سُن کر وہ بہت حیرت میں پڑ گیا۔ میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ اب کام کے لئے کافی روپئے آ گئے ہیں اور میں خود اپنے ساتھ ایک اچھی رقم جمع کر کے لا رہا ہوں۔ اِس کو میری باتوں پر پورا یقین تو نہیں ہوا۔ میں تو روپیوں کے بوجھ کو بینک میں ڈال دینا چاہتا ہی تھا۔ اِس لئے گاڑی کرائے پر کر کے سیدھے بینک کی طرف چلا۔ وہ سائیکل پر گاڑی کے پیچھے چلا۔ جب اس نے دیکھا کہ بینک میں ایک بڑی رقم سچ مچ میں جمع کر رہا ہوں۔ تب اس کو میری بات پر یقین ہوا۔ وہ ہمارا ساتھ چھوڑ کر اپنے دوسرے کام پر چلا گیا۔ میں جو کچھ جمع کر کے لایا تھا۔ اُس کے علاوہ سبھی ضلعوں سے روزانہ روپئے پہنچنے لگے۔ ہم لوگ بھی اِدھر اُدھر چکّر لگاتے ہی رہے ادھر تعمیر کا کام بھی تیزی سے چلنے لگا۔

بھلا غریب بہار امیر احمد آباد کے ٹھاٹھ باٹھ کی کہاں تک نقل یا مقابلہ کر سکتا تھا۔ مگر میرا خیال ہے کہ ہم نے بھی اچھا ہی انتظام کر لیا اور خرچ بھی گجرات سے بہت کم ہی کیا۔

نمائش کے متعلّق ہم نے طے کر لیا تھا کہ کھدّر بنانے کے ہر عمل کی نمائش کی جائے۔ کھدّر میں ہم نے صرف کپاس کے کپڑے ہی نہیں بلکہ ریشم، اُون، ٹسر وغیرہ اُن سبھی چیزوں کو شامل کر لیا تھا، جن سے سوت یا رسّی بٹ کر کوئی بھی چیز بنائی جا سکتی ہے۔ اِن میں سے ہر ایک کی ابتدا سے لے کر جب تک چیز قابلِ اِستعمال نہ بن جاتی تھی

تب تک کے سبھی عمل دکھانے کا انتظام کیا گیا۔ مثال کے طور پر کپاس کو لیجیے۔ کپاس کے پودے سے لے کر کپاس کی اوٹائی، دُھنائی، کتائی، تانا کرنا، پائی کرنا، اور بُننا۔ کپڑے کی دُھلائی، چھپائی وغیرہ تک سبھی عمل دِکھلائے جاتے تھے۔ اسی طرح سے اُون ریشم، ٹسر وغیرہ بھی۔ ابھی چرخہ سنگھ قائم نہیں ہوا تھا۔ اِس کا کام کھدر بورڈ کرتا تھا، مگر وہ ابھی ایک سال کا بھی نہیں ہوا تھا اِس لئے کھدّر کے کام کی تنظیم اور تجربہ و واقفیت نفی کے برابر تھی۔ اِن سب چیزوں کو اور سب کے لئے کاریگروں کو جمع کرنا کُچھ آسان کام نہ تھا۔ مگر یہ سب انتظام ہو گیا۔ کھدّر کی نمائش اپنے ڈھنگ کی اچھی ہوئی۔ دیکھنے والوں کے ٹکٹ سے جو رقم آئی وہ نمائش کے خرچ کے لئے تقریباً کافی ثابت ہوئی

آسام اور سنتھال پرگنہ میں ظلم

کانگریس کے سالانہ اِجلاس اور کارروائی کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے ۱۹۲۲ء کی کانگریس کے متعلق کچھ کہہ دینا ضروری ہے۔

مہاتما گاندھی کی گرفتاری کے بعد بھی سرکاری جبر و تشدد کسی کسی صوبے میں زوروں سے جاری رہا۔ ویسے لیڈروں میں پنڈت مدن موہن مالوی اور شری وٹھل بھائی پٹیل کو چھوڑ کر باقی سبھی جیل میں تھے۔ جبر و تشدد کی وجہ سے عوام کچھ گھبرا سے گئے تھے۔ کانگریس کو زندہ رکھنا ضروری تھا، جو تھوڑے لوگ باہر رہ گئے تھے، اُن کی ذمّہ داری اور بھی بڑھ گئی تھی۔ پنڈت مالوی جی کا خیال ہوا کہ آسام میں جہاں سے ظلم و ستم کی لرزہ خیز خبریں آ رہی تھیں، ضرور جانا چاہیئے۔ میں بھی اُن کے ساتھ گیا، وہاں تقریباً سبھی ضلعوں میں کانگریس کمیٹیاں صرف شہروں میں ہی نہیں بلکہ گاؤں میں بھی قائم ہو گئی تھیں۔ آسام میں گھر اکثر پھوس کے ہی ہوا کرتے ہیں، کانگریس کے مکان بھی پھوس کے ہی تھے۔ سرکاری کارکنوں نے تقریباً سبھی جگہوں کے کانگریس کے دفتروں کو جلا دیا تھا۔ سبھی اچھے اچھے کارکن گرفتار ہو چکے تھے۔ کانگریس کے سیوک دَل کے

ممبر جہاں کہیں ملتے گرفتار کر لئے جاتے تھے۔ وہاں کی سرکار کے ناراض ہونے کا خاص سبب یہ تھا کہ آسام میں افیون کی فروخت سے سرکار کی آمدنی ہوتی تھی۔ وہاں کے لوگ افیون کھاتے تھے جس کے نتیجہ کے طور پر اُن کی جسمانی اور دماغی قوتیں کمزور پڑ رہی تھیں۔ تھوڑی عمر میں ہی وہ بوڑھے سے نظر آنے لگتے تھے۔ دِل اور دِماغ کی کمزوری کی وجہ سے وہ نکمے ہو جاتے تھے یہ حال سُن کر گاندھی جی نے وہاں کے کارکنوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ بندشِ افیون کی تحریک چلائیں۔ اس تحریک کی وجہ سے افیون کی فروخت بہت کم ہو گئی تھی اور اس کے ساتھ ساتھ سرکاری آمدنی بھی۔ اِس لئے سرکاری کارکنوں کی کوشش تھی کہ کانگریس کو دبایا جائے جیسا اُوپر کہا گیا ہے۔ بڑی سختی اور دھونس سے کام لیا جا رہا تھا۔

وہاں پہنچ کر ہم نے سب حال دیکھا اور طے کیا کہ صوبے کا دَورہ کیا جائے۔ میرے لئے بھی اور محترم مالوی جی کے لئے بھی آسام کے دیکھنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ انتہائی ہرا بھرا پھلا پھولا خطّہ جس میں دریائے اعظم برہم پتر اور پہاڑوں کی فضا میں شانِ دلربائی تھی۔ گھنے تناور درختوں والے اور چھوٹی جھاڑیوں والے جنگل جہاں صوبے کی رونق بڑھاتے تھے وہیں جنگلی جانوروں خاص کر ہاتھی اور شیر کی وجہ سے اُسے کھیتی اور سفر کے لئے خطرناک بنا دیا تھا۔ سبزہ زار سہانا تو ہے مگر زمین کے ہمیشہ تر رہنے کی وجہ سے بہت حصّہ ملیریا میں مبتلا رہتا ہے۔

گوہاٹی میں محترم مالوی جی نے بہت ہی جوشیلا اور حوصلہ افزا لیکچر دیا۔ بندشِ افیون کے کام کو جاری رکھنے کے لئے سب لوگوں سے اپیل بھی کی تھی۔ میں نے بھی کچھ کہا۔ مگر محترم مالوی جی کے جلسے میں ہوتے ہوئے دوسرا کوئی کیا بول سکتا، جتنا وقت دَورہ آسام کے لئے ہم دے سکتے تھے۔ اُتنے میں بہت جگہوں تک ہم دونوں پہنچ نہ سکتے تھے۔ اس

لئے ہم دو ٹولیوں میں بٹ گئے۔ کچھ والنٹیر محترم مالوی جی کے ساتھ اُن مقامات پر گئے جہاں ریل یا اسٹیمر سے جایا جاسکتا تھا۔ کچھ والنٹیروں کے ساتھ میرا کچھ ایسی ہی جگہوں پر جانا طے ہوا۔ جہاں بیل گاڑی پر جاتا تھا۔ یہ فیصلہ ٹھیک اور میرے حسبِ دِل خواہ تھا، کیونکہ اِس طرح میں گاؤں کی حالت زیادہ دیکھ سکتا تھا۔ ساتھ ہی مالوی جی اپنی پیرانہ سالی میں (کیونکہ اس وقت وہ ساٹھ سال سے زیادہ کے تھے) بیل گاڑی کے سفر سے بچ جاتے تھے۔ جگہیں ایسی ہی منتخب کی گئی تھیں جہاں دَورِ تشدّد زوروں سے چلا تھا۔

مجھے ایک بہتر مقام پر جانا تھا، جہاں کچھ دُور تک گھنے جنگل میں سے ہوکر جانا پڑتا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجّب ہوا کہ آسام کے گاؤں میں بِہار کے مزدور کام کرتے ہیں۔ بِہار کی بیل گاڑیاں بوجھ ڈھونے کا کام کرتی ہیں۔ گوہاٹی میں برہم پتر میں نہانے گیا وہاں اِتّفاق سے دو کشتیاں لگی ہوئی تھیں۔ اُن کے ملّاحوں کو آپس میں بات چیت کرتے سُنا تو سمجھ گیا کہ وہ چھپرا کی بولی بول رہے ہیں۔ پوچھنے سے معلوم ہوا کہ وہ چھپرا کے کسی ضلع کے رہنے والے مانجھی ہیں اور برابر ناؤ لے آیا لے جایا کرتے ہیں۔ سٹیمر پر جو حلوائی دُکان کرتا تھا وہ بھی چھپرا کا ہی رہنے والا تھا۔

ہم لوگ گوہاٹی میں پندرہ سولہ میل تک لاری پر گئے۔ وہاں سے بیل گاڑی پر تقریباً بیس میل اور جانا تھا۔ راستہ جنگل سے ہوکر جاتا تھا۔ جگہوں کا نام آج یاد نہیں رہا اس جگہ تو ہم غالباً بارہ بجے دِن کو ہی پہنچ گئے۔ میں نے سوچا تھا کہ جنگل کا راستہ بھی تیزی سے چلنے پر دِن میں ہی زیادہ تر کٹ جائے گا۔ دو بیل گاڑیاں کرایے پر لی گئیں، مگر گاڑی والے کسی نہ کسی بہانے سے ٹال مٹول کر کے تقریباً ۵ بجے تک روانہ نہیں ہوئے دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ سخت دھوپ ہونے کے سبب سے بیل گاڑیاں زیادہ تر

رات کو ہی چلتی ہیں ۔ ایک گاڑی پر میں اور ایک والنٹیر بیٹھا ۔ دوسری پر دو یا تین دوسرے والنٹیر، پاس میں کھانے کے لئے کچھ نہ تھا ۔ ۸ بجے رات کو کسی جگہ پہنچے جو چٹّی سا معلوم ہوتا تھا ۔ بہت سی گاڑیاں وہاں لگی تھیں ۔ تلاش کرنے پر کچھ بُھنے چنے ملے جن کو ہم لوگوں نے لے لیا اور گاڑی کو روانہ کیا ۔ چنے چبا کر میں سو گیا ۔ کچھ گھنٹوں بعد بہت شور وغل سُن کر میری نیند اُچٹی ۔ میں نے دیکھا کہ والنٹیر مٹّی کے تیل کے دو پیپوں کو بہت زور سے پیٹ پیٹ کر اور زوروں سے گا گا کر شور مچا رہے ہیں ساتھ ہی گاڑی والے بھی بہت چلّا چلّا کر بیلوں کو ہانک رہے ہیں ۔ دونوں گاڑیوں کے ساتھ جلتی ہوئی لالٹینیں تھیں ۔ سڑک بہت تنگ ہوگئی تھی ۔ دونوں طرف بڑے بڑے درختوں کا بہت گھنا جنگل تھا ۔ وہ گھاٹی تھی ، جہاں دونوں طرف پہاڑ بھی تھے ۔ مگر وہ رات کو گاڑی پر سے نظر نہیں آتے تھے ۔ ان کو میں نے واپسی پر ہی دیکھا ۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اس مقام پر جنگلی جانور خاص کر شیر، اکثر آجایا کرتے ہیں ۔ اُنہیں کے بھگانے کے لئے والنٹیر اور گاڑی بان شور مچا رہے تھے ۔ اُنہوں نے کہا کہ جانور اس آواز سے نزدیک نہیں آتے ۔ اگر سڑک پر بھی ہوتے ہیں ، تو ہٹ جاتے ہیں مگر کوئی کوئی جانور اِتنا شوخ ہوتا ہے کہ بیل گاڑی کے جُتے ہوئے بیلوں کو بھی کھینچ لے جاتا ہے ، کہ حال ہی میں ایک ایسا واقعہ ہو چکا تھا ۔ اِس کے بعد میں سو نہ سکا ۔

جب ہم گھنے جنگل کے باہر نکل آئے اور جانوروں کا خوف کم ہو گیا ۔ تب شور مچانے کا عمل بھی بند ہو گیا ۔ ہم اپنے مقام پر علی الصّباح پہنچ گئے ۔ وہاں کے عوام بہت خوف زدہ تھے ۔ کانگریس کے کام سے بے رُخی کر رہے تھے ۔ ہم لوگوں کے پہنچنے سے ان میں حوصلہ آیا سب جمع ہو گئے ۔ آس پاس کے گاؤں میں خبر دی گئی کہ جلسہ ہوگا ۔ اِس درمیان

گاؤں کے لوگوں سے وہاں کی تشدّد آمیز پالیسی کا حال ہم سنتے رہے۔ افیون بندی کے متعلّق واقفیت بھی حاصل کرتے رہے۔ تیسرے پہر تک لوگ جمع ہو گئے۔ دو تین سو آدمیوں کا اچھا جلسہ ہو گیا۔ دیکھا کہ لوگوں کی ہمّت بڑھ گئی۔ پھر کانگریس بھون بنا لینے، اور افیون بندی کے کام کا لوگوں نے وعدہ کیا۔ پولیس کے موجود رہتے بھی لوگوں نے جلسہ میں کھلّم کھُلّا حصہ لیا

ہم لوگ تین بجے کے قریب وہاں سے واپس ہوئے۔ ارادہ تھا کہ اس جادۂ سخت کو جہاں رات کو ٹین پیٹنا پڑتا تھا روشنی رہتے ہی پار کر جائیں۔ ایسا ہی ہوا بھی۔ اِس مقام پر پہنچتے پہنچتے سورج ڈوب چکا تھا مگر ابھی اندھیرا نہیں ہوا تھا۔ میں ساتھیوں کے ہمراہ پیدل ہی چل رہا تھا۔ دونوں گاڑیاں بھی ساتھ ہی ساتھ چل رہی تھیں۔ اِسی درمیان پہاڑیوں کی طرف سے شیروں کی دھاڑ سننے میں آنے لگی۔ یہ آواز دونوں طرف سے معلوم ہوتی تھی مگر ہو سکتا ہے کہ ایک ہی طرف سے آتی رہی ہو اور ایک ہی شیر کی ہو اور وہ اِس سُنسان جنگل اور پہاڑوں میں گونج کر کئی شیروں کی آواز سی معلوم ہو رہی ہو۔ مگر شیر کہیں دیکھنے کو نہ ملا۔ آواز بھی بہت نزدیک نہیں تھی۔ شاید دو تین فرلانگ کی دُوری سے آ رہی تھی۔ میں نے زندہ عجائب گھر کے سِوا شیروں کی ایسی دھاڑ اور کہیں نہیں سُنی ہے۔

رات بھر گاڑی پر چل کر کچھ رات رہے ہم لوگ اس مقام پر پہنچے جہاں سے موٹر لاری جاتی تھی۔ تقریباً دس بجے پھر گوہاٹی پہنچے۔ محترم مالوی جی کے ساتھ اور جگہوں کا دَورہ ختم کر کے ہم لوگ واپس چلے۔ لکھنؤ میں ہونے والی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی نشست میں شریک ہوئے۔ ہم نے دیکھا کہ ایسی گری ہوئی حالت میں بھی محترم مالوی جی لوگوں کو

جگانے، ہمت دلانے میں کتنے کامیاب ہوئے۔ اُن کی زبان میں طاقت تو ہے ہی۔ وہاں کی حالت دیکھ کر اُن میں اور بھی جلال آگیا۔ اُن کا یہ دورہ ایسے سخت وقت میں بھی کامیاب رہا۔

ہمارے اپنے صوبہ بہار میں سنتھال پرگنہ سے جبر و تشدد کی خراب خبر آئی خاص کر پاکُڑ سے۔ میں وہاں بھی گیا وہاں لوگ اتنے خوف زدہ تھے کہ اسٹیشن پر ہم لوگوں سے ملنے کوئی نہیں آیا۔ ہم رات بھر اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر سوتے رہے۔ سویرے اُٹھے تو دیکھا کہ ایک جوتا کُتا اُٹھا کر لے گیا ہے۔ وہیں مُنھ ہاتھ دھو کر شہر میں جانے کا خیال کیا۔ کچھ ہی دُور گئے تھے جب وکالت کے دِنوں کے ایک واقف کار موکل ملے۔ انہوں نے سُنا تھا کہ میں اسٹیشن پر پڑا ہوں کوئی پوچھنے والا نہیں، اور یہ سُن کر وہ ہم کو اپنے گھر جانے کے لئے آرہے تھے۔ ہم اُن کے گھر گئے۔ حوائجِ ضروری سے فارغ ہو کر جیل خانے گئے۔ وہاں ہمارے پہنچنے سے ایک دو دِن پہلے پانچ چھ کام کرنے والے گرفتار کر کے رکھے گئے تھے۔ تقریباً بارہ بجے دِن کو اِن سے ملاقات ہوئی جوتا تو تھا ہی نہیں۔ دھوپ شدّت کی تھی۔ وہاں کی سڑک کی موٹی بجری بہت گرم ہوگئی تھی۔ وہاں سے ننگے پاؤں واپس ہوتے، پاؤں اِتنا جلے کہ سارے تلوے میں پھپھولے اُٹھ آئے۔ کسی طرح اس مکان پر پہنچ کر ایک رسّی کے تلے والا جوتا منگوایا۔ تیسرے پہر ایک سڑک کی بغل میں ہی جلسہ ہوا۔ جس میں کچھ لوگ آئے مگر دہشت بہت تھی۔ وہاں بھی ہمارے جانے سے لوگوں میں کچھ حوصلہ آیا۔ گرفتار کارکنوں کے گھر جا کر اُن کے گھر والوں کا ڈھارس بندھایا۔

ہم لوگ دُمکا بھی گئے۔ مگر وہاں بھی کوئی ٹھیرانے والا نہیں ملا۔ ہم لوگ ایک دھرم شالہ میں جا کر ٹھہرے۔ وہاں اور کچھ لوگ آکر ملے۔ اُن میں وہاں کی پولیس کے

داروغہ بھی تھے جو بھوج پوری بولتے تھے اور ہر منٹ جے شِو یا بم بم کہا کرتے تھے۔ اُنھوں نے بہت شرافت کی باتیں کیں مگر اُن کی صلاح یہ ہوئی کہ ہمارا وہاں کا کام تو ختم ہو گیا، اب وہاں بہت ٹھہرنے کی ضرورت نہیں رہ گئی تھی۔ اُنھوں نے آخر میں یہ بھی کہا کہ ہم لوگوں کو وہاں سے چلے جانے کا حکم ہے۔ ہمارے طلب کرنے پر وہ حکم دکھا نہیں سکے۔ اُسے لانے چلے گئے مگر واپس نہیں آئے۔ ہم وہاں اُن کا انتظار ہی کرتے رہ گئے۔ میں نے اپنے پروگرام کے مطابق وہاں زیادہ ٹھہرنے کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ چنانچہ رات کو گاڑی سے واپس چلا آیا۔

اُسی ضلع دُمکا میں ایک دوسرے مقام پر کچھ لیڈر گئے تھے۔ وہاں کے لوگوں میں سے ایک آدمی نے اچھّا استقبال کیا تھا۔ جہاں وہ لوگ ٹھہرے تھے ایک آدمی اُن لوگوں پر پنکھا جھل رہا تھا۔ لوگوں میں بہت دہشت تھی، مگر وہ شخص نڈر تھا۔ سُنا کہ اُن لوگوں کے چلے جانے کے بعد اس غریب پنکھا جھلنے والے کی زمین اُچھید کر لی گئی۔ وہاں کی زمین سرکاری سمجھی جاتی تھی۔ کسی کسان کو اپنی زمین سے نکال دینے کو وہاں 'اُچھید' کہا جاتا تھا بعد کو ہم نے بہت کوشش کی کہ اس کی زمین واپس ہو جائے مگر ناکام رہے۔

سنتھال پرگنے میں جو ظُلم ہوئے تھے اُن کے متعلق میں نے ایک لمبی رپورٹ تیار کی۔ وہ اس وقت کے اخباروں میں خاص کر 'سرچ لائٹ' میں چھاپ دی گئی۔

داخلۂ کونسل کے متعلّق بحث و تمحیص

اُوپر ستیہ گرہ جانچ کمیٹی کا ذکر آچکا ہے۔ اِس کمیٹی نے ایک سوال نامہ تیار کیا اور سبھی کانگریس کمیٹیوں سے جواب مانگا۔ اِس کے بعد سبھی صوبوں میں جاکر وہاں کے کارکنوں سے مل کر بات چیت کرنے اور بیان لینے کا فیصلہ کیا۔ مجھے یہ اچھّا نہ لگتا تھا، کیونکہ یہ تو سرکاری کمیٹیوں کا طریقہ ہے جو عام طور پر رپورٹ دینے کے سوا (اور وہ بھی وقت گذار کر) اور کچھ کرنا نہیں چاہتیں۔ کمیٹی کا کام جوں توں آگے بڑھا یہ ظاہر ہونے لگا کہ اس میں دو رائیں ہیں۔ ایک تھوک تو گاندھی جی کے بنائے ہوئے تعمیری کام پر زور دے کر مُلک کو ستیہ گرہ کے لئے تیار کرنا چاہتا تھا اور دوسرا تھوک یہ دیکھ کر کہ مُلک کو ستیہ گرہ کے لئے تیار نہیں ہے، یہ رائے رکھتا تھا کہ کونسلوں میں جانا چاہیئے، اور داخلہ کونسل کی جو تجویز کلکتہ میں ۱۹۲۰ء میں خصوصی اجلاس میں پاس ہوئی تھی، اُسے بدل دینا چاہیئے کانگریس کے کارکنوں میں بھی بہت اِختلافِ رائے دیکھنے میں آیا۔ اگرچہ گاندھی جی کے نصابِ عمل کو جوں کا توں رکھنے کے حق میں زیادہ لوگ معلوم ہوتے تھے۔ کمیٹی نے سبھی صوبوں کے جوانوں اور خود جاکر کارکنوں کے بیانوں کو قلم بند کر لیا۔ اِسی سلسلہ میں

کمیٹی کے ممبر پٹنہ بھی آئے۔ اور کانگریسیوں کے علاوہ مجھے بھی اظہار دینا پڑا۔ میں گاندھی جی کے پروگرام کا پکا مؤیّد تھا۔ میں نے اپنے اظہار میں زوروں سے اُس کی تائید کی۔

آخر جب کمیٹی کی رپورٹ نکلی تو معلوم ہوا کہ چھ ممبروں میں سے تین ایک رائے کے ہیں اور تین دوسری رائے کے۔ اس لئے کونسلوں کے متعلّق کمیٹی کوئی رپورٹ نہ کر سکی۔ سب ممبروں کی رائے ہی دے کر کمیٹی مطمئن رہی۔ رپورٹ شائع ہونے سے پہلے ہی زبردست اختلاف دیکھنے میں آ رہا تھا۔ رپورٹ کے بعد تو وہ اور بھی شدید ہو گیا۔ اخباروں میں اور کانگریسی حلقوں میں کونسلوں میں جانے یا نہ جانے پر بحث ہونے لگی۔ جو لوگ داخلۂ کونسل کے حق میں تھے وہ پرو چینجرز (تبدیلی پسند) کہلانے لگے، اور جو پہلے کے پروگرام میں تبدیلی نہیں چاہتے تھے یعنی جو داخلہ کونسل کے خلاف تھے، وہ نو چینجرز (غیر تبدیلی پسند) کہلاتے تھے۔

رفتہ رفتہ بڑے بڑے لیڈر بھی میعاد پوری ہونے پر رہا ہونے لگے۔ ان میں دیش بندھو داس کا مقام سب سے اُونچا تھا۔ لالہ لاجپت رائے کی میعاد لمبی تھی اُن کی رہائی کا ابھی امکان نہیں تھا۔ شروع میں پنڈت موتی لال نہرو کے خیالات کا صحیح اندازہ نہ ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ گاندھی جی کے ہی پروگرام کو مانتے ہیں۔ مگر دیش بندھو داس کی رہائی کے بعد واضح ہو گیا کہ پنڈت جی کا خیال بھی کونسلوں میں جانے کے حق میں ہی تھا۔ پہلے کے پروگرام کے مؤیّد لیڈروں میں شری راجگوپال آچاری ڈاکٹر انصاری، شری ولبھ بھائی پٹیل، سیٹھ جمنالال بجاج وغیرہ تھے۔ دیش بندھو داس نے کمیٹی کی رپورٹ کے بعد اپنی رائے ظاہر کر دی۔ وہ بھی داخلہ کونسل کے حق میں تھے احمد آباد کانگریس کے لئے صدر وہی منتخب کئے گئے تھے، جب وہ رہا ہوئے تو

کانگریس کے ضابطہ کے مطابق آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے صدر ہو گئے۔ منتخب ہونے پر بھی وہ احمد آباد میں صدارت نہ کر سکے تھے ملک نے اُن کو پھر گیا کے اجلاس کے لئے صدر چُنا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک اجلاس کلکتہ میں ہوا ستیہ گرہ کمیٹی کی رپورٹ اس میں غور کرنے کے لئے پیش ہوئی۔ تین چار دنوں تک بحث چلتی رہی۔ شری راجگوپال آچاری نے ہی ہم سب غیر تبدیلی پسندوں کی رہنمائی کی۔ مجھے بھی وہاں کی بحث و تمحیص میں حصّہ لینا پڑا تھا۔ ہم لوگوں کی کوشش تھی کہ کچھ ردّو بدل کر کے اور کونسل کے سوا اور معاملوں پر جن کا ذکر رپورٹ میں تھا اگر کچھ مصالحت ہو جائے اچھّا ہو گا۔ مگر ایسا نہ ہو سکا۔ بہت بحث کے بعد یہ معاملہ گیا کانگریس کے لئے ملتوی کر دیا گیا۔

گُرو کا باغ اور مُلتان

جہاں تک مجھے یاد ہے۔ اِس سال اگست، ستمبر میں دو بڑے واقعے ہوئے جن کا اثر سارے ہندوستان کی سیاست کی فضا پر پڑا۔ پہلا واقعہ وہ تھا جو گُرو کے باغ سے تعلق رکھتا تھا۔ کچُھ پہلے سے سِکھوں میں اُن کے اپنے گُردواروں کی اصلاح کے لئے تحریک چل رہی تھی۔ اُن کے گُردوارے مذہبی مقامات ہیں جن کا تعلّق مذہبی واقعات سے ہی ہوتا ہے۔ خاص گُردواروں کا تعلّق کسی نہ کسی گُرو کی زندگی یا کسی خاص واقعہ سے ہوتا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ سِکھّوں نے اپنے مذہب کے لئے بہت ایذائیں سہی ہیں۔ بہت ظُلم برداشت کئے ہیں۔ اِس لئے گُردواروں سے اُن کو بہت محبّت اور عقیدت ہے۔ اِن گُردواروں کے پاس عوام کی دی ہوئی کافی جائداد ہے۔ پنتھ کی خِدمت کے لئے وہ دی گئی تھی۔ گُردواروں کے انتظام کے لئے جو سیوک مقرر کئے گئے تھے وہی اس جائداد کا انتظام وغیرہ بھی کیا کرتے تھے۔ جیسا اکثر ہوا کرتا ہے۔ گُردوارے مہنتوں کے قبضہ میں تھے۔ بہتیرے مہنت نکمّے اور بدچلن تھے۔ اِس لئے سِکھّوں میں ایک دَل جسے اکالی دَل کہتے ہیں اس بات پر زور دینے لگا کہ گُردواروں کی اصلاح کے

لئے مہنتوں پر ضابطہ بندی ہو۔

آہستہ آہستہ وہ تحریک زور پکڑنے لگی۔ گردواروں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے کے لئے انہوں نے شرومنی گُردوارہ پربندھک کمیٹی قائم کی۔ کہیں کہیں تو مہنتوں نے شرومنی کمیٹی کی بات مان لی اور اپنا انتظام ان کے ہاتھ میں سونپ دیا۔ سرکار بھی اِس بات پر غور کرنے لگی کہ یہ کام قانوناً کیا جائے۔ اور قانون بنا کر گردواروں کا انتظام کمیٹیوں کے سپرد کیا جائے مگر کوئی بات ابھی تک طے نہیں ہوئی تھی۔ سرکار پس و پیش میں تھی۔ اکالیوں سے ناراض ہو کر کچھ مہنت زور زبردستی کرنے لگے۔ ایک گُردوارے میں وہاں کے مہنت نے بہت سے اکالیوں کو مروا اور جلوا ڈالا تھا۔ یہ واقعہ کچھ پہلے ننکانہ صاحب کے گُردوارے میں ہو چکا تھا۔ اس سے اکالیوں میں غم و غصّہ کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اُنہوں نے گاندھی جی کی بتائی ہوئی عدمِ تشدّد کی پالیسی کو اختیار کیا۔ اُنہوں نے یہی فیصلہ کیا کہ گُردواروں کو اہنسا کے طریقوں سے وہ اپنے قبضہ میں کریں گے۔ یہ اہنسا کا طریقہ سکھوں کے لئے نیا نہیں تھا مسلمانوں کے دور میں بھی اُنہوں نے یہ مسلک اختیار کیا تھا اور بہت دکھ سہے تھے۔

گُرو کا باغ، نام سے ایک مقام امرتسر سے کچھ دور پر ہے، وہاں ایک گُردوارہ ہے جو ایک مہنت کے قبضہ میں تھا۔ اکالیوں نے اس گُردوارے کو اپنے قبضے میں لینا چاہا۔ پہلے تو مہنت نے اُن کی بات مان لی اور آپس میں یہ طے ہوا کہ گُردوارہ اکالیوں کے ہاتھ میں رہے اور مٹھ مہنت کے قبضہ میں۔ وہاں کچھ زمین بھی تھی جس میں ببول کا جنگل سا تھا۔ آگے چل کر آپس میں پھر جھگڑا اچھڑ گیا۔ شرومنی کمیٹی کی طرف سے گُردوارے کا انتظام ہو رہا تھا۔ گرنتھ صاحب کی سیوا کے لئے کچھ سیوک مقرر تھے۔ گُردواروں میں اور سکھ سنگتوں میں اکثر لنگر (بھنڈارا) ہوا کرتا ہے یہاں بھی لنگر جاری تھے۔ اس میں

جلانے کے لئے وہ کچھ ببول کے درخت کاٹ لائے۔ مہنت نے اسے روکا اور پولیس کی سرکاری طور پر اکالیوں کو وہاں جانے کی ممانعت کی گئی۔ اکالیوں نے ستیہ گرہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ اِس جنگل سے لکڑی کاٹنے جاتے، پولیس اُن کو نہ رُکنے پر پہلے تو اُنہیں گرفتار کرتی تھی، مگر بعد کو مار پیٹ کر ہٹانے لگی۔ جو اکالی وہاں جاتا بُری طرح پیٹا جاتا بعد کو سرکار نے وہاں جانے کے راستے پر کچھ دور سے ہی روک لگا دی۔ اکالیوں میں بہت جوش تھا۔ وہ دربار صاحب کے گردوارے میں جا کر عدم تشدد کے پابند رہتے ہوئے وہاں پہنچنے کی سوگند لیتے۔ جب تک راستہ کھلا تھا گُردوارہ میں جا کر ٹھہرتے۔ وہاں سے جنگل میں جاتے اور پیٹے جاتے۔ جب راستہ روک دیا گیا تو اُن کے جتھے راستہ میں ہی روکے اور پیٹے جاتے۔ اتنی بُری طرح سے پیٹے جانے سے بے ہوش ہو جاتے۔ اس حالت میں لوگ اُن کو وہاں سے اُٹھا کر اُن ہسپتالوں میں لے جاتے جو قائم کئے گئے تھے۔

اِس کا شور سارے مُلک میں پھیل گیا۔ دُور دُور سے لوگ وہاں ستیہ گرہ دیکھنے آنے لگے۔ پنڈت، مولوی، حکیم صاحب اور دوسرے لوگ بھی گئے۔ میں بھی گیا۔ امرتسر میں ورکنگ کمیٹی کی نشست ہوئی۔ وہاں سے ہم لوگ گُرو کا باغ دیکھنے گئے۔ ہم نے جو منظر دیکھا اُسے کبھی بھول نہیں سکتے۔ کچھ لمبے ترڑنگے جوان ہوئے آگے بڑھے۔ اُدھر لوہے اور پیتل سے منڈھی ہوئی لاٹھیاں لئے، پولیس کے سپاہی ایک انگریز افسر کے ساتھ آگے آئے۔ اِن سکھوں کو اُنھوں نے روکا۔ وہ سکھ بیٹھ گئے۔ اس پر اُنہیں لاٹھیوں سے خوب پیٹا گیا۔ وہ پھر اُٹھ کر کھڑے ہونا چاہتے اور پھر مار کر گرا دئے جاتے۔ یہ عمل اس وقت تک جاری رہتا جب وہ بے ہوش نہ ہو جاتے۔ بے ہوش ہو جانے پر ایمبولنس پر لاد کر اُن کو دوسرے لوگ اُٹھا لاتے۔ کبھی کبھی اُن کے کیش (بال) پکڑ کر اُنہیں گھسیٹا بھی جاتا۔

لوگ یہ منظر دیکھنے کے لئے جمع ہوتے مگر ایک آدمی بھی کبھی ہاتھ نہ اُٹھاتا۔ جو پیٹے جاتے وہ بے چارے بھی کبھی ہاتھ نہ اُٹھاتے۔ یہ بلاتشدد کے ستیہ گرہ کی ایک نہایت روشن مثال ملک کے سامنے آ گئی۔ سارے دیش میں گرو کا باغ کی خبریں بڑے اشتیاق کے ساتھ پڑھی جانے لگیں۔ ہزاروں آدمی گرفتار ہوئے۔ بہتیرے لوگ تو یوں ہی پیٹے گئے۔ جو اکالی ستیہ گرہ میں شریک ہوتے، اُن میں سے بہتیرے ایسے تھے۔ جو جنگِ جرمن میں برٹش سرکار کی طرف سے بہادری سے لڑے تھے۔ سرکار کا کہنا تھا کہ مہنت کی زمین کو (جس پر اس کا قانوناً حق تھا) وہ کیسے چھین لے اور جب مہنت اپنا قبضہ قائم رکھنے میں سرکار کی مدد چاہتا ہے تو وہ کیسے انکار کر سکتی ہے۔ ایسی قانونی اُدھیڑ بُن میں بہت سے لوگ جیل گئے۔ اِسی وجہ سے بہت سے لوگ بُری طرح سے پیٹے جا رہے تھے۔ پولیس کے ایک سپرنٹنڈنٹ نے لاٹھی چلانے کے فن کو بھی وہ رُوپ دے دیا تھا جو فوج میں اور ہتھیاروں کے چلانے کو دیا جاتا ہے۔ اُس نے اِس کے لئے قواعد کے ضابطے بنا دئے تھے۔ کسی نائک یا سردار کے حکم کے مطابق سبھی سپاہی لاٹھیوں سے پیٹھ پر یا سر پر وار کرتے تھے۔ یا دونوں رانوں کے بیچ لاٹھی لگا کر فوطوں پر چوٹ کرتے یا پیٹ میں مارتے تھے۔ اس طرح افسروں کے حکم کے مطابق ہی چوٹ پہنچائی جاتی۔ سکھوں کی ہمت اور برداشت کی طاقت بھی حیرت انگیز تھی۔

ہم لوگ وہاں گئے اور اپنی آنکھوں سارا منظر دیکھ کر ہمیں یقین ہو گیا کہ سچا ستیہ گرہ بھی کیا جا سکتا ہے۔ اس کے لئے بہادری، ہمت اور دُکھ سہنے کی طاقت ہونی چاہئے وہ طاقت اگر ہٹے کٹے جواں مرد بھی بغیر ہاتھ اُٹھائے دکھا سکیں تو کوئی طاقت بھی انہیں دبا نہیں سکتی۔ سرکار کی طرف سے کوشش ہوئی کہ کوئی راہ نکالی جائے۔ ایک راستہ نکل بھی

آیا۔سر گنگارام نے جو ایک معزز ہستی تھے، مہنت سے زمین کا بندوبست لے کر اکالیوں کو دے دیا۔سرکار کو اب زبردستی روکنے کی ضرورت نہیں رہ گئی۔کچھ دنوں کے بعد ایک قانون بھی بنا جس کے مطابق اب گردواروں کا انتظام ہوتا ہے۔مگر یہ سب جلد نہیں ہوا۔اس میں وقت لگا۔بہتوں کو بہت اذیت بھی برداشت کرنی پڑی۔ستیہ گرہ کی افادیت اور اس میں مضمر امکانات ثابت ہو گئے۔اس کا سہرا سکھوں کے سر ہے۔انہوں نے اُسے اپنی حق پرستی اور طاقت سے دکھا دیا۔

دوسرا واقعہ بھی پنجاب میں ہی ہوا۔ہم لوگ امرتسر سے ہی ملتان گئے۔وہاں ایک دوسری قسم کا واقعہ ہوا تھا۔ملتان میں تعزیے کا جلوس نکلا۔اسی جلوس کی بنا پر زبردست ہندو مسلم فساد ہو گیا۔مسلمانوں کا کہنا تھا کہ ہندوؤں میں سے کسی نے تعزیہ پر ڈھیلا پھینکا۔ہندوؤں کا کہنا تھا کہ اُن کی طرف سے کچھ نہیں کیا گیا۔مسلمانوں کی طرف سے ہندوؤں کے لوٹنے کی تیاری پہلے سے تھی۔تعزیہ تو صرف بہانہ تھا۔وجہ کچھ بھی ہو مگر فساد جو ہوا۔اس میں بہت ہی لرزہ خیز واقعات ہوئے۔خبر پا کر حکیم اجمل خاں (جو کانگریس صدر کے فرائض انجام دے رہے تھے) پنڈت مدن موہن مالوی جی، سیٹھ جمنا لال جی، شری ٹی پرکاشم اور میں وہاں گئے۔آپس کی کش مکش اتنی زبردست تھی کہ ہم لوگوں کے ٹھہرنے ٹھہرانے کے متعلق ہی دونوں فریقوں میں کوئی بات طے نہ ہو سکی۔اس لئے جب ہم لوگ اسٹیشن پر اُترے پہلا سوال ٹھہرنے کی جگہ کا سامنے آیا۔ہم دو ٹکڑیوں میں بٹ گئے۔کچھ لوگ مسلمانوں کے مہمان ہو کر وہاں کے ایک نواب کے یہاں ٹھہرے۔کچھ لوگ ہندوؤں کے مہمان ہو کر دوسری جگہ ٹھہرے میں حکیم صاحب کے ساتھ نواب کے یہاں ٹھہرا۔ہم لوگوں نے بلوے کا مقام جا کر دیکھا۔کتنے ہی ہندوؤں کے گھر لوٹے اور

جلائے گئے تھے۔ ان گھروں کا سارا سامان لُوٹا یا جلا دیا گیا تھا۔ کتنے ہی آدمی مارے بھی گئے تھے۔ جو لوگ بچے تھے ان میں سے خاص کر عورتوں نے حالات کا بہت ہی دردناک ذکر کیا۔ جس کا اثر ہم لوگوں کے دل پر بہت پڑا۔ ایک جگہ میں نے دیکھا کہ حکیم صاحب نمایاں طور پر نہایت متاثر نظر آرہے تھے۔ ایک عورت نے کہا کہ سب کچھ لوٹ لینے اور جلا دینے کے بعد لٹیروں نے اور کچھ نہیں پایا تو ایک پنجرے کو جس میں اس نے طوطا پال رکھا تھا۔ آگ میں ڈال دیا۔ راکھ کا ڈھیر ابھی جوں کا توں تھا۔ اس میں لوہے کا پنجرہ بھی پڑا تھا مگر طوطا جل کر خاک ہو گیا تھا۔ کئی مندروں اور شوالوں کی بھی یہی حالت ہوئی تھی۔

ہم لوگ وہاں کے ڈپٹی کمشنر مسٹر ایمرسن سے بھی ملے۔ وہی بعد میں گاندھی اِروِن سمجھوتے کے وقت حکومت ہند کے ہوم سکریٹری تھے۔ اس کے بعد یہ پنجاب کے گورنر ہوئے۔ اُن کا رُخ ہم نے کچھ ایسا نہیں پایا کہ آپس میں میل محبّت قائم ہو۔ وہ قانون کی دُہائی دے کر بلوائیوں کی سزا کی بات ہی زوروں سے کہتے رہے۔ ہم چاہتے تھے کہ اس کے علاوہ آپس میں میل جول قائم کرنے کا بھی جتن کیا جائے۔ وہاں دونوں فریقوں کے خاص خاص لوگوں کا ایک چھوٹا سا جلسہ ہوا۔ اُن سے باتیں کرنے کے بعد ہم نے دیکھا کہ اگرچہ لوگوں میں رنجش بہت ہے تو بھی دونوں مِل جُل کر رہنے کے لئے تیار سے معلوم ہوتے تھے۔ مسلمانوں کو بہت فکر اس بات کی تھی کہ اُنہیں کے آدمی گرفتار ہوئے تھے اور ہو رہے تھے۔ سب مقدّمے اُنہیں لوگوں پر چلیں گے اور ہو سکتا ہے کہ اُن کو لوٹ کا معاوضہ بھی دینا پڑے، چھٹے دِن ایک جلسہ ہوا۔ جس میں حکیم صاحب اور پنڈت مالوی جی کی تقریریں ہوئیں۔ آپس کے میل جول بڑھانے کے لئے ہم لوگوں نے ایک غیر سرکاری کمیٹی قائم کر دی، اور وہاں سے چلے آئے۔

وہاں کے سارے منظر کا مجھ پر بہت اثر پڑا۔ میں نے دیکھا کہ پنڈت مالوی جی بھی بہت ہی متاثر تھے۔ تمہیں اپنی جان مال اور عزت پر حملہ کرنے والے کا مقابلہ کرنا چاہیئے سرکار سے بھی انہوں نے اصرار کیا کہ بلوائیوں کو سزا دینی چاہیئے۔

ہمارے وہاں جانے کا اتنا اثر ہوا کہ کشمکش کم ہو گئی۔ جہاں کے لوگ ایک ساتھ بیٹھ کر آپس میں یہ طے نہیں کر پاتے تھے کہ ہم لوگ کہاں ٹھہرائے جائیں گے، وہاں وہ ایک ساتھ کمیٹی کے ممبر بننے کو تیار ہو گئے۔ سب لوگ میل جول بڑھانے کی کوشش میں لگ گئے۔ حکیم صاحب نے ایک بیان شائع کیا جس میں اُنہوں نے مسلمانوں کی کارروائی کی مذمت کی اور ہندوؤں کو تسلّی دی۔

گیا کانگریس کے زمانے میں کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہوا کہ جیسے وہاں خلافت کانفرنس ہو گی ویسے ہندو سبھا بھی ہونی چاہیئے۔ منتظموں نے پنڈت مالوی جی کو صدر بنانے پر اصرار کیا۔ مجھ پر بہت زور ڈالا گیا کہ میں بھی اگر اصرار کروں تو پنڈت مالوی جی منظور کریں گے۔ مجھ سے یہ بھی اصرار کیا گیا کہ میں صدر استقبالیہ بن جاؤں۔ اس وقت تک ہندو سبھا نے، اگر اس کا وجود ہو بھی تو کوئی ایسی شہرت نہیں پائی تھی جیسی اب حاصل ہے۔ اور نہ اس کی پالیسی ہی کانگریس کے خلاف تھی۔ ساتھ ہی خلافت کمیٹی بھی کانگریس کے ساتھ ساتھ ہوا کرتی تھی۔ اس لئے کانگریس کے ساتھ ہندو مہا سبھا کی کوئی مخالفت نہیں تھی اور نہ ہونے کا کوئی امکان نظر آتا تھا۔ میں نے صدرِ استقبالیہ ہونا منظور کر لیا محترم مالوی جی صدر بن گئے۔ گیا میں کوئی ایسی کارروائی بھی نہیں جس پر کسی کو اعتراض ہو سکے۔ مگر پنڈت مالوی جی نے اپنی تقریر میں ملتان کے واقعات کا ذکر کیا۔ انہوں نے ہندوؤں کو بھی حفاظتِ خود اختیاری کے لئے تیار ہونے کی ہدایت کی۔ یہاں اتنا ہی

کہنا موزونِ موقع ہے کہ اگر چہ وہاں کوئی بڑی بات نہیں ہوئی پھر بھی مستقبل میں ہندو مہاسبھا کے الگ ہو جانے کی بنیاد پڑ گئی۔ اِس میں میرا بھی حصہ رہا۔ اس کے بعد جب ہندو سبھا اور کانگریس میں اختلاف رائے نمایاں ہو گیا تو پنڈت مالوی جی نے مجھ سے کہا بھی کہ میں نے تمہارے کہنے سے ہی گیا کے جلسے کی صدارت منظور کی تھی اور سبھا کی مستقل بنیاد ڈالی تھی۔ میں اِس سے انکار نہیں کر سکا اور نہ آج بھی کر سکتا ہوں۔ اُس وقت جہاں تک میں سمجھ سکا گیا کے مسلمانوں نے بھی مہاسبھا کے سنگٹھن میں کوئی خاص برائی نہیں دیکھی اور اگر دیکھی بھی ہو تو ہم لوگوں کو بتایا نہیں۔

جیسا میں اوپر کہہ چکا ہوں ملتان کے فساد کے بعد سے ہندو مسلمانوں کے درمیان کشیدگی بڑھتی گئی۔ بہت سے مقاموں سے ہندو مسلم فسادوں کی خبریں آنے لگیں۔ کانگریسی ہندو اور مسلمان حالات پر قابو کرنے کی کوشش میں لگے رہتے۔ مگر کسی نہ کسی بنا پر بلوے ہو ہی جاتے۔ ان فسادوں میں بیشتر مقامات پر اکثر ہندو ہی زیادہ پٹتے۔ اسی سبب سے ہندو سنگٹھن کا جنم ہوا۔ شُدھی کا جنم تو مذہبی جذبے سے ہوا تھا۔ اگر شُدھی بھی کٹرپن اختیار نہ کرتی تو شاید اس سے زیادہ بھی پیدا نہ ہوتی۔ مگر ۱۹۲۳ء سے لگاتار تین چار برسوں تک ہندوؤں میں شُدھی اور سنگٹھن کا اور مسلمانوں میں تبلیغ اور تنظیم کا ہی شور رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ کانگریس سے بہتیرے مسلمان اور بہت سے ہندو بھی الگ ہونے لگے۔

گیا کانگریس

گیا کانگریس کے اجلاس سے کچھ پہلے استقبالیہ کمیٹی میں ایک واقعہ ہوا جس کا ذکر کردینا ضروری ہے۔ ایک صاحب نے استقبالیہ کمیٹی کو پانچ ہزار روپئے دینے کا وعدہ کچھ مہینہ پہلے کیا تھا۔ جب روپے کی ضرورت محسوس ہونے لگی تو اُن سے تقاضا کیا گیا، مگر وہ ٹال مٹول کرتے رہے۔ جب استقبالیہ کمیٹی کے صدر کے انتخاب کا دن طے ہو گیا اور کمیٹی کی نشست ہوئی تو اُسی دن اُنھوں نے استقبالیہ کمیٹی کی ممبری کے لئے دو سو۲۰۰ درخواستوں پر دستخط کرا کے پچیس روپئے فی کس کے حساب سے پانچ ہزار روپئے بھیجے۔ اِن کی خواہش تھی کہ وہ اِس طرح صدر استقبالیہ کمیٹی چن لئے جائیں۔ کیونکہ اور کسی کی طرف سے چنے جانے کی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ اگرچہ ممبروں کی تعداد کافی تھی مگر تمام ممبر اِس میٹنگ میں جو کانگریس سے چند روز پہلے ہوئی تھی، آئے نہیں تھے۔ ہم کو یہ بات بہت بُری معلوم ہوئی۔ ہم نے سمجھا کہ یہ ایک طرح کی چال ہے۔ اور وہ حضرت سارے صوبے کی آنکھوں میں دھول ڈال کر سارے صوبے کے نمائندے کی حیثیت سے آنے والے لیڈروں کے استقبال کا فخر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ اگر

انہوں نے کانگریس کی کچھ لمبی چوڑی خدمت کی ہوتی تو مجھے اتنا غصّہ نہ آتا۔ مگر ایسی کوئی خدمت تو اُن کی تھی نہیں۔ اُنہوں نے اِس کوشش کو سب لوگوں سے خفیہ رکھا تھا۔ اِس لئے مجھے اور زیادہ غصّہ تھا۔ ہم نے وجہ بیان کر کے اُن کے روپئے واپس کر دئے اگرچہ روپیوں کی ضرورت تھی پھر بھی ہم نے یہی ٹھیک سمجھا کہ اِس طرح کے فریب کو روکنا ہی مناسب ہے۔ سب کی خواہش تھی کہ صدر استقبالیہ کا عہدہ شہری برج کشور پرشاد کو دیا جائے۔ استقبالیہ کمیٹی نے اتفاقِ رائے سے اُن کو ہی صدر منتخب کیا۔

کانگریس کے اجلاس کے دن قریب آگئے مگر ابھی کافی جھونپڑے تیار نہیں ہوئے تھے اور نہ پنڈال ہی تیار ہوا تھا۔ گیا میں سردی کافی پڑتی ہے۔ اِس سال سردی اور بھی زیادہ تھی۔ جھونپڑوں کے لئے کچھ اور بھی نئے ٹھیکہ دار مقرر کئے گئے مگر پنڈال کا کام پورا ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔ اُن دنوں کانگریس ایک بڑے شامیانے کے اندر ہی ہوا کرتی تھی۔ آج کل کی طرح کھُلے میدان میں نہیں۔ لوگوں کے بیٹھنے کے لئے زمین اونچی نیچی ڈھلوان بنانی پڑتی تھی اُمید تھی کہ اور سب کام تو پورا ہو جائے گا مگر مٹّی بھرنے کا کام پورا ہوتا نظر نہ آتا تھا۔

کانگریس کے اجلاس کے دو دن پہلے رانچی ضلع اور اُس کے آس پاس کے آدمی باسی (قدیم قبائلی باشندے) تقریباً تین چار سو کی تعداد میں پیدل چل کر گیا پہنچ گئے۔ یہ لوگ اپنے ساتھ ہانڈی اور لکڑی بھی بہنگیوں میں لاد کر لائے تھے۔ تقریباً ڈیڑھ دو سو میل کی دُوری سے لگاتار کئی دن چل کر گیا پہنچے تھے۔ کانگریس سے ان لوگوں کی عقیدت اتنی بڑھ گئی تھی کہ اُس کے نام پر سب کچھ کرنے کو تیار رہتے تھے۔ کبھی کبھی نادانی کے کام بھی کر جاتے تھے۔ جب ترکِ موالات کی تحریک زوروں سے چل رہی تھی۔ اُن کو اہنسا (عدم تشدد) کا مطلب کسی نے یہ بتا دیا کہ بکریاں گوشت کے لئے ہی پالی جاتی ہیں اس

لئے ان کا پالنا بھی ٹھیک نہیں۔ معلوم نہیں یہ پرچار (تبلیغ) کرنے والا کون تھا مگر نتیجہ یہ ہوا کہ ہزاروں بکریوں کو یوں ہی انہوں نے جنگلوں میں چھوڑ دیا۔ میں جب ایک بار سفر میں اُدھر گیا تو وہاں اِن بکریوں کو دیکھا بھی تھا اور وہیں مجھے یہ بات معلوم ہوئی تھی۔ اُنہیں لوگوں کی ایک جماعت اِسی عقیدے کے ساتھ گیا پہنچی۔ اُنہوں نے استقبالیہ کمیٹی سے صرف اِتنا ہی مطالبہ کیا کہ ہم لوگوں کے لئے کسی باغیچہ میں کچھ خالی زمین بتا دی جائے، ہم وہیں ٹھہریں گے اور کھانا پکا کر کھائیں گے۔ یہ لوگ کام کرنے میں خوب محنتی تھے، اُن سے کسی نے کہا کہ کانگریس کے پنڈال میں مٹی بھرنے کا کام پورا نہیں ہو رہا ہے جس کی وجہ سے ہم لوگ بہت فکرمند ہو رہے ہیں۔ اُنہوں نے ہم سے کدال اور ٹوکریاں طلب کیں۔ اِن کو سب سامان دئے گئے۔ بس وہ سبھی اِس کام میں لگ گئے۔ دِن رات لگ کر دو دِنوں کے اندر سب کام پورا کر دیا ہم لوگ اُن کے جوش اور محنت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ استقبالیہ کمیٹی کی طرف سے اُن میں سے ہر ایک کو ایک گاندھی ٹوپی اور استقبالیہ کمیٹی کی ممبری کا ایک پھول دیا گیا۔ وہ پھول ٹوپی پر جڑ دیا گیا۔ اِس سے وہ بہت خوش ہوئے۔ کئی برسوں کے بعد بھی جب میں اس علاقے میں دَورہ پر گیا، اُنہوں نے بڑے فخر کے ساتھ وہ پھول ٹنکی ہوئی ٹوپیاں دِکھائیں اور اِس طرح مجھے یاد دلایا کہ وہ گیا کانگریس میں گئے تھے۔

اجلاس سے چند روز پہلے مجھے دمہ کا دَورہ پڑ گیا۔ مُلتان کے دَورے میں میں نے پہلے پہل محسوس کیا تھا کہ سانس کی کچھ دِقّت ہو رہی ہے۔ اِس سے پہلے جاڑے میں کھانسی ہو جایا کرتی تھی۔ مگر سانس کی تکلیف میں نے کبھی محسوس نہیں کی تھی۔ کھانسی ہی کی وجہ سے میں ناگپور کانگریس کے اجلاس میں شریک نہ ہو سکا تھا۔ ملتان کے سفر میں

میں حکیم اجمل خاں کے ساتھ ہی تھا۔ اُنہوں نے دیکھا اور کہا کہ دمہ ہو گیا ہے۔ اُنہوں نے ایک دوا بھی دی جس سے اس وقت میں اچھا ہو گیا۔ جب دسمبر کی سردی بڑھی تو گیا میں پھر دَورہ پڑ گیا۔ مگر وہیں کے ایک حکیم کی دوا سے جلد ہی اچھا ہو گیا۔ جس دن دیش بندھو داس صدر کانگریس ہو کر گیا پہنچے اور جلوس نکلا، میں نہ تو اسٹیشن پر استقبال کے لئے جا سکا اور نہ جلوس ہی دیکھ سکا مگر کمزوری کی حالت میں ہی سبجکٹس کمیٹی میں شریک ہوا۔ کچھ انتظام کے کام کی دیکھ بھال بھی کرتا رہا۔ انتظامی کمیٹی کا بار زیادہ تر شری انوگرہ نرائن سنگھ پر پڑا۔ غذائی صیغہ کی ذمّہ داری میرے بھائی صاحب نے لی۔ اُنہوں نے بڑی خوبی سے اُسے نباہا۔ پنڈال تیار کرانے اور سجانے کا کام گورکھ بابو، متھرا بابو اور مظفر پور کے زمیندار، شری ویدیہ ناتھ پرشاد سنگھ نے کیا۔ والنٹیروں کی جماعت کے صدر شری بدری ناتھ ورما تھے۔ نمائش کا بار شری بنارسی پرشاد جھنجھنوالا نے سنبھالا۔

استقبالیہ کمیٹی کا انتظام اچھا ہو گیا۔ مگر میرا خیال ہے کہ اگر کچھ اور تجربہ ہوتا تو جتنا خرچ پڑا اتنا نہ پڑتا۔ جب اِجلاس ہو رہا تھا تو مجھے خوف تھا کہ آخر میں کچھ خسارہ رہے گا۔ اِس لئے سبھی صیغوں کے خرچ کم کرنے پر میں بہت زور دیتا رہا۔ گیا اسٹیشن سے اِجلاس کا مقام تقریباً تین میل کے فاصلہ پر یا اِس بھی زیادہ دُور تھا، وہاں سے لوگوں کو لانے کے لئے ہم نے بہت سی لاریاں کرائے پر منگالی تھیں۔ خیال تھا کہ سبھی لوگوں سے لاری کا کرایہ لیا جائے گا۔ اِس کے لئے ہر ایک لاری پر ایک آدمی ٹکٹوں کے ساتھ رکھا گیا تھا مگر وہ انتظام نہیں چل سکا۔ ہم کرائے میں بہت کم وصول کر سکے۔ مگر سب لاریوں کا کرایہ تو دینا ہی پڑا۔ اِس میں کئی ہزار روپیوں کا نقصان ہوا۔ اسی سے اور خوف ہو گیا تھا کہ خسارہ ہو گا مگر آخر میں حساب لگانے پر کچھ بچ ہی گیا

گھاٹا نہیں ہوا۔

گیا میں کانگریس کا اجلاس بڑے معرکے کا ہوا۔ پہلے سے ہی ملک میں داخلۂ کونسل کا ذکر چھڑا ہوا تھا۔ ستیہ گرہ کمیٹی کی رپورٹ نے ایک ہو حق مچا رکھی تھی۔ اُس پر غور کرنے کی بات کانگریس کے اجلاس کے لئے اُٹھا رکھی گئی تھی۔ پنڈت موتی لال نہرو، حکیم اجمل خاں اور دیش بندھو داس — ان تین بڑے لیڈروں کی پختہ رائے تھی کہ جب ستیہ گرہ نہیں ہو سکتا تو کونسلوں میں جانے کی اجازت ہونی چاہیئے مگر زیادہ تر کانگریس والوں کا یہ خیال معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی جی کے دیئے ہوئے پروگرام میں تبدیلی نہیں کرنی چاہیئے۔ اِس لئے دونوں پارٹیوں کے لوگ اپنے اپنے ہم خیالوں کو ہی نمائندہ منتخب کر کے گیا میں بھیجنے کی حتی الوسع کوشش کرنے لگے۔ اسی وجہ سے شری جیکر اور شری نٹراجن جیسے خاص لوگ بھی اپنے صوبے سے منتخب نہیں ہو سکے۔ انتخاب میں یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ ہم جانتے ہیں کہ انگلستان میں مسٹر بالفور کئی برسوں تک وزیر اعظم رہنے کے بعد بھی عام انتخاب میں معمولی ممبر بھی نہیں چُنے جا سکے اُن کی پارٹی بُری طرح شکست کھا کر اپنے لیڈر کو بھی کچھ دنوں تک پارلیمنٹ میں نہیں دیکھ سکی۔ ہمارے یہاں یہ بات ابھی نئی تھی۔ اِس لئے ایسے افراد کی شکست سے کچھ لوگوں کے دل پر چوٹ بھی لگی۔ اُن لوگوں میں ایک میں بھی تھا۔

اگرچہ شری جیکر کا خیال داخلۂ کونسل کے حق میں تھا اور میں اُس کے خلاف، پھر بھی میرا خیال تھا کہ خلاف رائے ہونے پر بھی ایسی ممتاز ہستی کا کانگریس میں نہ جانا ٹھیک نہ ہوگا۔ کانگریس چاہے جو فیصلہ کرے ایسے قابل آدمی کی رائے اُس کے اپنے لفظوں میں سُن لینا کانگریس کے لئے مناسب ہوگا۔ اُن دنوں کانگریس کے دستور کے مطابق کوئی

آدمی اگر وہ کانگریس کا ممبر ہے تو کسی بھی صوبے سے کسی بھی حلقہ سے نمایندہ چنا جاسکتا تھا، اِس لئے میں نے کوشش کرکے شری جیکر اور شری نٹراجن کو بہار سے نمایندہ منتخب کرالیا۔ اِس کی اطلاع دونوں کو دے دی۔ اِس سے وہ بہت مطمئن ہوئے کانگریس میں وہ آئے بھی۔

اِس چھوٹی سی بات کو یہاں میں نے تفصیل سے اِس لئے لکھا کہ ان دنوں کی بحث و تمحیص کے جوش میں پڑھ کر کچھ لوگوں نے یہ تک کہہ دیا کہ (نوچینجر) غیر تبدیلی پسند طبقہ نے بے انصافی کے ساتھ گاندھی جی کے نام کا سہارا لے کر پروپگنڈا کیا اور کانگریس میں ووٹ حاصل کئے۔ کچھ نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ دیش بندھو داس کے تبدیلی پسند (پروچینجر) ہونے کی وجہ سے صدر کانگریس ہونے پر بھی ویسی تواضع نہیں کی گئی جیسی ہونی چاہیے تھی۔ اُن کے اِستقبال اور خدمت میں بھی کوتاہی کی گئی۔ کیونکہ صوبۂ بہار گاندھی، بھگت اور غیر تبدیلی پسند صوبہ تھا۔ یہ سب باتیں دل کو چوٹ پہنچانے والی تھیں۔ جہاں تک ہوسکا ہم نے خاطر تواضع کا انتظام کیا تھا۔ اُن کے ٹھہرنے کے انتظام کا بار شری دیپ نرائن سنگھ پر ڈالا گیا تھا۔ اُنھوں نے اَن تھک محنت اور حوصلہ کے ساتھ کام کیا تھا۔ یہ ٹھیک ہے اپنی خرابی صحت کی وجہ سے میں بہت دوڑ دھوپ نہیں کرسکا۔ مگر دوسرے سبھی لوگ دن رات کام کرتے رہے۔ صدرِ اجلاس اور اُن کی پارٹی کی پوری خاطر داری ہوئی۔ کسی طرح خامی نہ ہونے پائی۔

دیش بندھو داس کا ایڈریس بہت بڑا اور معرکہ کا تھا مگر اس میں داخلۂ کونسل پر بہت زور دیا گیا تھا۔ سبجکٹس کمیٹی میں داخلۂ کونسل پر بحث کرنے کی تجویز پیش ہوئی۔ صدرِ اجلاس نے کہا کہ میں نے اس خطبۂ صدارت میں اپنے خیالات پیش کئے ہیں اس لئے اِس خطبہ کے بعد ہی اِس مسئلہ پر غور کیا جائے تاکہ نمائندوں کو اِن خیالات کے جان لینے کا موقع مل جائے۔ اور تب وہ اپنی رائے دیں۔ اِس لئے شروع میں صدرِ اجلاس نے

بحث کی اجازت نہیں دی۔ بعد میں تو کئی روز تک بحث ہوتی رہی جس میں دونوں پارٹیوں کے لوگوں نے زوروں سے حصّہ لیا۔ رات یا صبح کے وقت جب سبجکٹس کمیٹی کے اجلاس سے فرصت رہتی۔ نمائندوں کے الگ الگ جلسے ہوا کرتے۔ جن میں لوگ اپنے اپنے خیالات پر زور دیتے۔ بحث بہت گرما گرم ہوتی۔

سبجکٹس کمیٹی نے داخلۂ کونسل کی بات کو اکثریت سے نامنظور کر دیا۔ اِس لئے یہ بات ایک ترمیم کی صورت میں ہی کانگریس کے کھُلے اجلاس کے سامنے آئی۔ کانگریس میں بھی ایسی گرما گرم بحث کئی دنوں تک چلتی رہی۔ کانگریس کے لئے جو وقت طے تھا اُس سے دو یا تین دن زیادہ لگے۔ میں نے بھی کھُلے اجلاس میں داخلۂ کونسل کی زوروں سے مخالفت کی۔ ہمارے طبقۂ خیال کے لیڈر تھے شری راج گوپال آچاری وہ بھی اِن دنوں دمے کے مرض میں مبتلا تھے، مگر سبجکٹس کمیٹی اور کھُلے اجلاس میں اُنہوں نے حیرت انگیز محنت اور کرامات سے اپنے پہلو کی تائید کی۔ جناب سری نواس آئینگر نے مصالحت کے لئے ایک ترمیم پیش کی، وہ نامنظور ہوگئی۔ آخر میں جب خاص تجویز پر رائے لی گئی تو زبردست اکثریت سے داخلۂ کونسل کی تجویز نامنظور ہوگئی۔ شاندار داخلۂ کونسل کے حق میں ایک تہائی اور مخالفت میں دو تہائی نمائندوں کے ووٹ آئے۔

یہ سمجھنا غلط ہوگا کہ سِول نافرمانی کی تحقیقاتی کمیٹی نے گیا کانگریس میں صرف ایک ہی موضوع پر غور کیا یا تجویز پاس کی تھی کمیٹی کی رپورٹ میں ترکِ موالات کے پورے پروگرام پر جس میں ستیہ گرہ اور بندشِ لگان بھی شامل تھی، غور کیا تھا۔ سبھی درپیش مسائل پر اُس نے رائے دی تھی مگر ان معاملوں پر اتنا اختلافِ رائے نہیں تھا اِس لئے وہ ماند پڑ گئے۔ گیا کانگریس نے بھی اُن پر ریزولیوشن منظور کیا۔ سرکاری اسکولوں اور عدالتوں کے بائیکاٹ کو

قائم رکھا۔ سودیشی اور کھدر کی تبلیغ پر زور دیا گیا۔ ایک تجویز اس مضمون کی بھی پیش کی گئی کہ سبھی قسموں کے انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا جائے اور اِس خیال سے بائیکاٹ کئے جانے والے مالوں کی فہرست بنانے کے لئے اور بائیکاٹ کی تدبیریں طے کرنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے۔ یہ تجویز سبجکٹس کمیٹی میں پاس ہوگئی۔ مگر کانگریس کے کھُلے اجلاس نے اُسے کثرتِ رائے سے نامنظور کر دیا، کیونکہ یہ ناقابلِ عمل بتایا گیا اور اِس میں تشدّد کا رجحان بیدار ہونے کا خوف تھا۔

ایک بڑی اہمیت کی دوسری تجویز یہ منظور ہوئی کہ اس دن کے بعد برٹش سرکار خود، یا ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کی منظوری سے جو کچھ قرض لے گی، اُس کی ادائیگی کا ذمہ دار آزاد ہندوستان نہ ہوگا، کیونکہ برٹش سرکار من مانا خرچ کرکے ہندوستان کے نام پر قرض لیتی ہے، اور اسمبلیاں اور کونسلیں ہندوستان کی نمائندگی نہیں کرتیں۔ اس تجویز میں اس تاریخ سے پہلے کے قرضوں کو منظور کر لیا گیا۔ اِس تجویز کے متعلق بھی اختلافِ رائے تھا مگر یہ بھی اکثریت سے پاس ہوگئی۔ اگرچہ یہ مضمون نیا تھا اور تجویز پیش ہونے سے پہلے اِس پر مُلک میں کوئی چرچا نہیں ہوا تھا۔

گیا کانگریس میں ستیہ گرہ تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ پر ایک تجویز اور بھی منظور کی گئی کہ ہر فرد کو اپنی حفاظت کے لئے وہ سبھی اختیار حاصل ہیں جو اس کو قانون کی رُو سے ملے ہیں۔ یعنی قانوناً تشدّد آمیز حفاظت جہاں تک جائز ہے کانگریس بھی اُسے منظور کرتی ہے۔ ایک دوسری تجویز اس مضمون کی بھی منظور ہوئی کہ مُلک کو ستیہ گرہ کے لئے تیار کیا جائے اور اِس کے لئے پچیس لاکھ روپئے اور پچاس ہزار والنٹیر جمع کئے جائیں۔ اس طرح گیا کانگریس میں کئی تجویزیں پاس ہوئیں، جہاں تک میں جانتا ہوں، کانگریس کا اتنا لمبا اجلاس دوسرا نہیں ہوا۔ مگر داخلۂ کونسل پر اختلافِ رائے کی وجہ سے اور سب باتوں کی حیثیت ثانوی ہوگئی۔

کانگریس کے اجلاس کے ساتھ ساتھ گیا میں خلافت کانفرنس اور جمعیۃ العلماء کے اجلاس بھی بڑی دھوم دھام اور جوش کے ساتھ ہوئے۔ خلافت کمیٹی نے بھی کانگریس کمیٹی کے ساتھ ہی ایک ستیہ گرہ تحقیقاتی خلافت کمیٹی بنائی تھی۔ اس نے بھی ملک کا دورہ کر کے اپنی رپورٹ دی تھی۔ وہاں بھی وہی اختلاف رائے تھا۔ جو کانگریس میں خاص کر داخلۂ کونسل کے معاملے میں۔ ان دونوں جماعتوں نے بھی کونسل کا بائیکاٹ جاری رکھا۔ مگر اُس وقت تک خلیفہ اور تُرکی کی حالت میں بہت تبدیلی ہو چکی تھی۔ تُرکی نے یونان کو شکست دے کر بڑی فتح حاصل کر لی تھی۔ اُنہوں نے یہ بھی فیصلہ کر لیا تھا کہ اُن کے سُلطان جو خلیفہ بھی تھے، تخت سے اُتار دئے جائیں اس بارے میں ہندوستان کے مسلمانوں میں بڑی سنسنی تھی، مگر جہاں تک میں سمجھتا ہوں اُنہوں نے تُرکی کی اس کارروائی کی تائید ہی کی۔ کیونکہ اُمید یہ کی جاتی تھی کہ ایسے سُلطان کا معزول ہونا ہی ٹھیک ہے، جو دوسروں کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر مُلک اور اسلام کو نقصان پہنچاتا تھا اور اُن کی جگہ نئے اور زبردست خلیفہ چُنے جانے کو تھے جو اسلام کی زیارت گاہوں اور مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہوں اور طاقت بھی۔ تُرکی نے اپنی طاقت بتادی تھی، اِس سے یہ اُمید ہوتی تھی کہ نئے خلیفہ اپنے فرائض ادا کریں گے مگر بعد میں کچھ زمانہ گذرنے پر ترکی نے خلیفہ کا عہدہ ہی اپنے یہاں سے ہٹا دیا اور جمہور ترکیہ قائم کر لیا جس میں صدر جمہوریہ کا انتخاب ہوتا تھا اور بدستور اب تک جاری ہے۔

مسلمانوں کی دوسری بات عرب کی آزادی سے تعلق رکھتی تھی۔ عرب اور تُرکی دونوں ہی مذہباً مسلمان ہیں مگر دونوں نسلاً الگ ہیں۔ تُرکی نے عرب پر اپنی حکومت جمالی تھی۔ چونکہ وہ بھی مسلمان تھے اِس لئے مسلمان اُن کے سلطان کو ہی خلیفہ مان لیتے تھے۔ جنگ جرمن میں جب جرمنی سے مل کر ترکی لڑنے لگا تو انگریزوں نے تُرکی کے خلاف عربوں کو اُبھارا اور

عرب ملکوں کے لوگوں کو ترکی کی حکومت سے آزاد کرا دیا۔ مگر وہ یکبارگی آزاد نہیں ہوئے، مسلمان چاہتے تھے کہ اہلِ عرب آزاد ہو کر رہیں۔ مگر خلیفہ کا انتخاب سب کی رائے سے ہو۔ ایسا نہیں ہو سکا۔ بعد میں تو ترکی سے خلیفہ کا عہدہ ہی ختم کر دیا گیا۔ عرب کی دیکھ بھال کا بار انگلستان اور فرانس کو مل گیا۔ اِس طرح اہلِ عرب ابھی تک پورے آزاد نہیں ہوئے ہیں۔ اگرچہ دکھلانے کے لئے کچھ اختیارات ان کے امیروں کے ہاتھوں میں ہیں۔

اِنھیں وجہوں سے کچھ دنوں کے بعد ہندوستان میں خلافت کی تحریک سرد پڑ گئی۔ اگرچہ خلافت کمیٹی بہت دنوں تک قائم رہی مگر برائے نام رہ گئی تھی۔ گیا میں ہونے والے اِجلاس کے وقت تک یہ سوال ابھی اِس طرح صاف نہیں ہوئے تھے اس لئے وہاں بھی بڑے جوش سے خلافت کانفرنس ہوئی اور اُس نے کانگریس کا ساتھ دیا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اُس نے کانگریس سے بہت زیادہ جوش خروش دکھایا تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔ اِس کا خاص سبب تھا، اس زمانے میں ترکی کی جانب برٹش سرکار کا رُخ اور اُس کی کارروائیاں۔

سوراج پارٹی کا جنم

پہلے سے ہی دونوں پارٹیوں (تبدیلی پسندوں اور غیر تبدیلی پسندوں) میں خاصی کش مکش ہو گئی تھی۔ کانگریس کا اجلاس ختم ہوتے ہی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی صدارت سے دیش بندھو داس نے استعفٰے دے دیا۔ جو لوگ داخلۂ کونسل کے حق میں تھے اُنھوں نے مل کر سوراج پارٹی کے قیام کا اعلان کر دیا۔ اُس کے خاص لیڈروں میں دیش بندھو داس، پنڈت موتی لال نہرو، حکیم صاحب، شری وٹھل بھائی پٹیل، شری کیلکر وغیرہ تھے۔ دیش بندھو داس اس کے خاص سالار اور پنڈت موتی لال نہرو سکریٹری بنے جو غیر تبدیلی پسند تھے۔ اُنھوں نے بہت اِصرار کیا کہ دیش بندھو داس اِس کانگریس کے صدر بنے رہیں۔ مگر اُنھوں نے یہ قبول نہیں کیا۔ اِن کا کہنا تھا کہ اکثریت میرے ساتھ نہیں ہے۔ اِس لئے میں صدر نہیں رہ سکتا سوراج پارٹی کے ذریعے وہ کانگریس کی اکثریت کو اپنا ہم خیال بنانے کی کوشش کریں گے اِس لئے اُن کا صدر رہنا مناسب نہیں۔ اُن کے کام میں بھی رُکاوٹ پڑے گی۔

جو ورکنگ کمیٹی بنائی گئی وہ زیادہ تر غیر تبدیلی پسندوں کی ہی تھی۔ میں جنرل سکریٹری منتخب ہوا۔ یہ بار میرے لئے بہت گراں تھا مگر اِسے برداشت کرنا ہی پڑا۔ کیونکہ ہم سبھوں

نے مل کر صدر کی رائے نہیں مانی تھی۔ اور اب ہمارا فرض تھا کہ جمہوریت کے دستور کے مطابق اِس کے چلانے کا بار سنبھالیں۔ جو بھی ہو، گیا میں دیش بندھو داس کا استعفٰی منظور نہیں ہوا۔ اُس پر دوبارہ غور کرنے کے لئے اُن سے اِصرار کرنے کی ایک تجویز پاس ہوئی۔ مگر اُنہوں نے وہیں صاف کہہ دیا کہ میں دوبارہ غور کرنے کو تیار نہیں ہوں۔ نئی کونسلوں کے انتخاب نومبر ۱۹۲۳ء میں ہونے والے تھے اس لئے سوراج پارٹی کا فیصلہ ہوا کہ اِس کے پہلے کانگریس کی اکثریت حاصل کر کے تب الیکشن لڑنا چاہئے۔ ہم جو غیر تبدیلی پسند تھے، سوچتے تھے کہ کانگریس نے اِس بات کو تو فیصل کر ہی دیا ہے۔ اب صرف تعمیری پروگرام پر ہی زور دینا چاہئے۔ مگر ایسا ہوتا نظر نہیں آتا تھا کیونکہ داخلۂ کونسل کی بحث تو چلتی ہی رہی آخر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی جو نشست ہوئی اُس میں طے ہوا کہ تعمیری پروگرام پر ہی زور لگایا جائے کانگریس کے فیصلے کے مطابق ستیہ گرہ کے لئے پچیس لاکھ روپئے جمع کئے جائیں اور پچاس ہزار والنٹیر بھرتی کئے جائیں تاکہ ستیہ گرہ شروع کیا جاسکے۔ مگر یہ کام تسلّی سے ہونے والا کہاں تھا۔ کانگریس کے اجلاس کے بعد ہی کچھ خاص کانگریسی جیل سے رہا ہوئے جن میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی تھے۔ بہار کے لیڈروں میں مولوی محمد شفیع اور بابو سری کرشن سنہا بھی اسی زمانے میں جیل سے نکلے۔ مولانا آزاد جیل سے نکلتے ہی اِس فکر میں لگ گئے کہ دونوں پارٹیوں میں کسی طرح مصالحت کرائی جائے۔ گیا کانگریس کے بعد وہ ورکنگ کمیٹی کے ممبر چُنے گئے ورکنگ کمیٹی کے اجلاس میں اُنہوں نے مفاہمت کی بات پیش کی۔ ورکنگ کمیٹی نے اُسے منظور کر لیا۔ سوراج پارٹی کے سبھی لیڈروں سے ابھی اُن کی پوری باتیں نہیں ہو پائی تھیں۔ مگر جہاں تک اُن کو معلوم ہو سکا تھا، پارٹی والوں کو بھی وہ باتیں منظور تھیں۔ اِس لئے طے ہوا کہ فروری کے آخری ہفتہ میں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس الہ آباد میں کر کے اِس پر

غور کیا جائے۔ مولانا صاحب چونکہ اس سمجھوتے کو پورا کرانا چاہتے تھے ورکنگ کمیٹی سے الگ ہو گئے، جس سے وہ غیر جانب دارانہ طور پر اس کے لئے کام کر سکیں۔

فروری کے آخر میں الہ آباد میں جلسہ ہوا۔ دیش بندھو داس نے صدر کی گدّی سنبھالی اس اجلاس میں مصالحتی تجویز منظور ہو گئی۔ اس کی شرطیں یہ تھیں:

(۱) کونسل کے متعلق پروپیگنڈا ۳۰ر اپریل تک بند رہے۔

(۲) دونوں پارٹیاں اپنے پروگرام کی دوسری مدوں کے متعلق جو کام کرنا چاہیں کریں اور ایک دوسرے کے کام میں خلل انداز نہ ہوں۔

(۳) غیر تبدیلی پسند گیا کانگریس کے فیصلہ کے مطابق ستیہ گرہ کے لئے روپئے اور والنٹیئر جمع کریں۔

(۴) تبدیلی پسند غیر تبدیلی پسندوں کے ساتھ تعمیری پروگرام اور دوسرے ایسے کاموں کے لئے جنہیں دونوں مانتے ہیں روپئے جمع کرنے اور کارکن فراہم کرنے میں تعاون کریں۔

(۵) ۳۰ر اپریل کے بعد پھر دونوں پارٹیاں جیسا مناسب سمجھیں اپنے اپنے پروگرام کے مطابق کام کریں۔

اِسی فیصلہ کے مطابق شری راج گوپال آچاری کے ساتھ میں نے الگ الگ صوبوں کا دَورہ کیا۔ اس کے پہلے میں نے اپنے صوبے میں ہی دَورہ کیا تھا۔ دوسرے صوبوں سے زیادہ واقفیت نہ تھی۔ اس دَورے سے بہت سی جگہوں میں آنے جانے اور وہاں کے کارکنوں سے زیادہ واقف ہونے کا موقع بھی ملا۔ روپئے بھی جمع کئے گئے۔

تعمیری پروگرام پر خاص طور سے زور دیا گیا۔ راجہ جی (شری راج گوپال آچاری) ہی تقریر کیا کرتے تھے۔ راجا جی جیسے ذکی صاحبِ اثر اور خوش کلام مُقرِر کم ہی ہیں۔ وہ اپنے لیکچروں

میں شور وغل نہیں مچاتے اور نہ ہاتھ پاؤں ہی چلاتے ہیں۔ آہستہ آہستہ نرم لفظوں میں اپنی دلیلوں کو انوکھے طریقے سے سامعین کے سامنے رکھتے ہیں۔ اور اُن کے دلوں پر قبضہ کر لیتے ہیں۔ میں نے سوچا کہ میں اُن کے بعد کیا تقریر کر سکوں گا۔ چُپ رہنا ہی اچھا ہوگا۔ اُن کی تقریروں کے اثر کو میری تقریر کم کر دیتی۔ مگر لوگ چاہتے تھے کہ میں بھی کچھ کہوں۔ اس سے بچنے کی ایک اچھی ترکیب بھی نکل آئی۔ راجہ جی انگریزی میں ہی تقریر کرتے۔ کیونکہ وہ ہندی نہ بول سکتے تھے۔ میں نے اُن کی تقریروں کے ترجمہ کرنے کا کام لے لیا۔ ایسا نہ کرتا تو ہر جلسے میں مترجم کی تلاش کرنی پڑتی اور وہ بھی نہ جانے صحیح ترجمہ کرتا یا نہیں۔ میں اُن کے خیالات کی رَو سے خوب واقف ہو گیا تھا۔ اُن کے بولنے کے طریقہ کو بھی خوب سمجھ گیا تھا اس لئے میں نے دیکھا کہ یہ ایک کرشمہ دو کار ہو جاتا ہے۔ اِن لیکچروں کا ترجمہ بھی ہو جاتا ہے اور میں تقریر کرنے سے بھی بچ جاتا ہوں۔ وہ ایک جُملہ کہتے اور میں اس کا ترجمہ کر دیتا۔ اس طرح میرے کام میں بھی آسانی ہوتی اور لوگ سب باتیں ٹھیک ٹھیک سمجھ لیتے۔ تقریباً سبھی جلسوں میں جہاں ہندی میں ترجمہ کی ضرورت پڑتی میں نے یہی کیا۔ ترجمہ کا کام مشکل ہے، خاص کر بر محل ترجمہ اور بھی مشکل ہے جب کوئی مقرر برجستہ تقریر کر رہا ہو مگر اِس میں میں ماہر ہو گیا۔ میں نے کلکتہ ہائی کورٹ میں دیکھا تھا کہ ایک مترجم گواہوں کے اظہار میں بیرسٹروں کے سوالوں اور گواہوں کے جوابوں کا ایسا با کمال ترجمہ کرتا تھا کہ صرف لفظی ترجمہ ہی نہیں بلکہ سوالات کے لہجہ کو بھی ترجمہ میں لا دیتا تھا۔

کئی برسوں کے بعد جب میں یوروپ گیا اور وہاں جنگ کے خلاف ایک بین الاقوامی کانفرنس میں شریک ہوا تو وہاں بھی ایک کراماتی مترجم دیکھا وہ جرمن تھا۔ ابھی اس کی عمر ۲۴، ۲۵ سال سے زیادہ نہ تھی مگر وہ انگریزی فرنچ، جرمن اور اسپرنٹو خوب جانتا تھا۔

اس سے واقفیت ہو جانے پر میں نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ سنسکرت بھی جانتا تھا، اور کسی سنسکرت کتاب کا جرمن ترجمہ کرنے میں اس زمانے میں لگا تھا۔ میں یہاں ترجمہ کے پھیر میں بہت بہک گیا۔

اِس دَورے سے تعمیری پروگرام کی طرف لوگوں کا رجحان تو ہوا مگر کام بہت آگے نہ بڑھا۔ دو تین مہینوں میں اس کا نتیجہ کچھ دکھایا بھی نہیں جا سکتا تھا۔ روپئے بھی قریب ۱۳ لاکھ جمع ہو گئے مگر پوری ۲۵ لاکھ کی رقم جمع نہ ہو سکی۔ سوراج پارٹی کو موقع ملا اُس نے ہم سے ہار ماننے کی بات پیش کی۔ اپنے پروگرام کو منظور کرانے کی بھی کوشش کی۔

سوراج پارٹی کے ساتھ مصالحت کی کوشش

ایک طرف تو ہم متذکرۂ بالا دَورے میں مصروف تھے، دوسری طرف ہندو مسلم جھگڑے بڑھتے جارہے تھے۔ ملتان کا ذکر اُوپر کیا جاچکا ہے۔ وہاں ابھی تک کچھ نہ کچھ اَن بن جاری تھی۔ اس لئے اسی ورکنگ کمیٹی میں جس میں مولانا صاحب جیل سے چُھٹ کر شریک ہوئے تھے طے کیا گیا کہ پنڈت مالوی جی کے ساتھ مولانا صاحب ملتان جائیں اور وہاں کے جھگڑے کو نپٹانے کی کوشش کریں۔ بلوہ زدہ لوگوں کی اِمداد کے لئے کانگریس کی طرف سے دس ہزار روپیے بھی منظور کئے گئے تھے مگر اب جھگڑا صِرف مُلتان میں ہی نہ رہ گیا تھا، امرتسر میں بھی حالت خراب ہوگئی تھی۔ ہم اپنے دَورے میں پنجاب میں کئی جگہوں میں گئے۔ دیش بندھو داس پنڈت موتی لال نہرو اور حکیم اجمل خاں بھی برابر کوشش کرتے رہے۔ اُنہوں نے ڈاکٹر انصاری وغیرہ سے مل کر اس بات کی کوشش کی کہ کوئی ہندو مسلم سمجھوتہ ہو جائے جو سارے مُلک کی بگڑتی فضا کو درست کر سکے۔ مگر اس میں وہ کامیاب نہیں ہوئے۔

پنجاب کے دَورے کے درمیان لاہور میں دیش بندھو داس سے راجا جی کی اور میری ملاقات ہوئی۔ وہاں دیش بندھو داس نے مستقل مصالحت کے لئے یہ تجویز پیش کی کہ

کانگریس کے کام کئی صیغوں میں تقسیم کر دیے جائیں، اور ہر صیغہ کو چلانے کا بار ایسے افراد کو دیا جائے جو اس میں خاص دلچسپی رکھتے ہوں جیسے قومی تعلیم، کھدر کی تبلیغ، کونسل کا صیغہ، غیر ملکی پروپیگنڈا، مزدوروں کی تنظیم، اچھوت اُدھار، ستیہ گرہ وغیرہ۔ اس کے لئے پانچ کروڑ روپئے کی رقم بھی جمع کی جائے۔

پنجاب سے ہم لوگ دورے میں پونہ گئے۔ وہاں ورکنگ کمیٹی کی نشست ہوئی۔ اُسے یہ تجویز ناقابلِ عمل معلوم ہوئی اور اُسے نامنظور کر دیا اُسی زمانے میں دیش بندھو داس وغیرہ کا تار آیا کہ پنجاب کی حالت پر غور کرنے کے لئے ورکنگ کمیٹی کا اجلاس الہ آباد میں فوراً کیا جائے۔ ہم نے ۳۰ اپریل تک کا پروگرام بنا لیا تھا۔ اس لئے اس کام کو ملتوی کرکے ورکنگ کمیٹی کا اجلاس اتنی جلد کرنا ممکن نہ ہوا۔ مگر راجہ جی وہاں بھیج دیے گئے کہ جو کچھ مناسب ہو کریں۔ اور اگر ضروری سمجھیں تو ورکنگ کمیٹی کا اجلاس بھی طلب کر لیں۔ راجہ جی وہاں گئے۔ دیش بندھو داس وغیرہ سے ان کی باتیں ہوئیں، مگر یہ باتیں پوری نہیں ہو پائیں، اِس لئے کچھ باتیں دلّی میں حکیم اجمل خاں کے ساتھ ہوئیں۔ اس طریقے پر جتنی باتیں ہوئیں اُن کا نوٹ بنا کر راجہ جی نے حکیم صاحب کو دے دیا کہ وہ دیش بندھو داس اور پنڈت موتی لال نہرو کی رائے لیں۔ راجہ جی اس نوٹ کی ایک نقل لے کر بمبئی میں ورکنگ کمیٹی کے دوسرے لوگوں سے خود ملنے آ گئے۔ یہ تجویز نہ تو پنڈت موتی لال نہرو کو منظور ہوئی، نہ سردار ولبھ بھائی پٹیل اور سیٹھ جمنا لال بجاج کو مگر اس کے متعلق کچھ ایسے بیان نکلے اور ایسا پروپگنڈا کیا گیا گویا غیر تبدیلی پسند لوگوں نے ہی اسے نامنظور کر دیا۔ مسز سروجنی نائیڈو بھی اسی وجہ سے غیر تبدیلی پسندوں سے جن میں وہ خود بھی شامل تھیں کچھ ناراض ہو گئیں۔ اس زمانے کے اخباروں میں بھی سخت تنقیدیں نکلیں۔ پنڈت موتی لال نہرو نے تو سوراج پارٹی کی طرف سے پروپگینڈا کا کام

شروع کر دیا۔ مئی کے آخر میں ہونے والی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں جہاں مصالحت کی بات پر غور ہونے والا تھا۔ اپنے نہ جانے کا اعلان کر دیا اور اپنے پیرووں کو بھی جانے سے منع کر دیا۔

ملک میں آپس کے اس جھگڑے سے لوگ ملول ہو رہے تھے کئی صوبائی کمیٹیوں نے بھی رائے دی کہ کوئی سمجھوتہ ہو جانا ہی اچھا ہوگا۔ غیر تبدیلی پسندوں میں ڈاکٹر انصاری اور مسز سروجنی نائیڈو اس کے حامی تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو جو گیا کانگریس کے زمانے میں جیل میں تھے۔ مگر اب رہا ہو چکے تھے، مصالحت چاہتے تھے۔ اس لئے ایک طرح پر سمجھوتہ کے حق میں موافق فضا تیار ہو گئی۔ اس کے بعد سوراج پارٹی کے لوگوں نے بھی بمبئی میں ہونے والی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں شریک ہونے کا خیال ظاہر کر دیا اور شریک ہوئے بھی۔ یہ بیٹھک مئی کے مہینے کے آخر میں ہوئی۔ ورکنگ کمیٹی کی طرف سے یہ تجویز پیش کی گئی کہ کانگریس کا خاص اجلاس کیا جائے۔ بشرطیکہ سوراج پارٹی کے لوگ اس کے فیصلہ کے مطابق ہی کام کریں گے۔ اس پر ورکنگ کمیٹی نے اپنی تجویز واپس لے لی۔ جو لوگ موجود تھے ان کی طرف سے کئی اور ریزولیوشن پیش کئے گئے جن میں سے ایک کے مجوز شری پرشوتم داس ٹنڈن اور مؤید پنڈت جواہر لال نہرو تھے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ چونکہ ملک میں ایسے لوگ بھی ہیں جو چاہتے ہیں کہ کونسلوں کے انتخاب میں حصّہ لیا جائے۔ اس لئے آپس کے جھگڑے کے مٹانے کے لئے گیا کانگریس کی ہدایت کے بموجب الکشن کے خلاف پروپگنڈا نہ کیا جائے۔ کچھ لوگوں نے یہ سوال اٹھایا کہ گیا کانگریس کے فیصلہ کے خلاف ہونے کی وجہ سے یہ تجویز خلاف آئین ہے مگر صدرِ اجلاس دیش بندھو داس نے اسے نہیں مانا اور تجویز کو جائز قرار دیا۔ یہ تجویز قلیل اکثریت سے منظور ہو گئی۔ ہم لوگ جو گیا میں ورکنگ کمیٹی کے ممبر چنے گئے

تھے۔ استعفےٰ دے کر اپنے عہدے سے ہٹ گئے۔ دیش بندھو داس کی رائے کے مطابق ایک نئی ورکنگ کمیٹی منتخب ہوئی۔ اس میں ایسے لوگ تھے جو نہ تو کٹّر غیر تبدیلی پسند تھے اور نہ بہت تبدیلی پسند یعنی جو مصالحت چاہتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری صدر بنے۔ پنڈت جواہر لال نہرو سکریٹری مقرر ہوئے۔

راجہ جی اس تجویز سے بہت غیر مطمئن تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اس طرح کانگریس خودکشی کرے گی۔ اِسے یا تو سیدھے سیدھے کونسلوں میں جانے کی اجازت دینی چاہیئے اور الکشن لڑنا چاہیئے، نہیں تو الکشن کا بائیکاٹ کرنا چاہیئے اور اس بائیکاٹ کے لئے عوام میں بھرپور پرپیگنڈا کرنا چاہیئے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی ان دونوں میں سے ایک بھی نہیں کرتی تھی وہ سوراج پارٹی کو تبلیغ کا حق دیتی، چُنے جانے کا بھی موقع دیتی۔ اس پر کسی طرح سے کانگریس کا کنٹرول بھی نہیں رکھتی اور دوسری طرف الکشن کے خلاف مخالفوں کا مونہہ کھولنا بھی روک دیتی ہے۔ اس لئے یہ تجویز قابلِ قبول نہیں ہے۔ خاص طور پر جب گیا کانگریس کونسل کے داخلہ کے خلاف پروپگنڈا کی ہدایت کر چکی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ زیادہ تر اخبارات داخلۂ کونسل کے حق میں تھے کانگریس میں بھی بہتیرے لوگ اس بحث سے اُکتا گئے تھے۔ بہتوں کو یہ سمجھوتہ اچھا لگا۔ نئی ورکنگ کمیٹی نے اعلان شائع کیا کہ گیا کانگریس کی تجویز جس کے ذریعے کونسل کا بائیکاٹ کیا گیا تھا، قائم ہے۔ صرف اس کی تبلیغ ہی اس تجویز کے ذریعے روکی گئی ہے۔ یہ رائے ہم نے بہار صوبہ کانگریس کمیٹی کی طرف سے بھی دی۔ مگر دوسرے صوبوں کی کئی کمیٹیوں نے اس کے خلاف تجویز منظور کی۔ انہوں نے اس تجویز کو گیا کے فیصلے کے خلاف سمجھ کر نہیں مانا۔

بمبئی کے متذکرہ اجلاس کے بعد مُلک میں پھر اس مسئلہ پر زوروں سے بحث چلنے لگی

جس بحث وتمحیص کو روکنے کے لئے بمبئی کا ریزولیوشن پاس ہوا تھا وہ اسی تیزی کے ساتھ جاری رہی، دیش بندھو داس بمبئی سے مدراس کا دورہ کرنے کے لئے گئے، کئی مقامات پر اُنہوں نے نہایت ہی تلخ اور اشتعال انگیز تقریریں کیں۔ اِنہیں تقریروں میں سے ایک میں اُنہوں نے لارڈ ریڈنگ کے ساتھ مصالحت کی گفتگو کا اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ اِس زمانے کے ستیہ گرہ سے سرکار دب گئی تھی۔ اُس نے جُھک کر صُلح کرنی چاہی تھی۔ میرے پاس شرطیں بھیجی تھیں۔ جو میں نے ہیڈ کوارٹر یعنی گاندھی جی کے پاس بھیج دی تھیں۔ مگر اُنہوں نے سب باتیں گڑبڑا دیں اور ہم سے صرف چرخہ چلانے کو کہتے ہیں۔ اس مضمون کو لے کر پھر پُرانی باتیں اُبھریں۔ شری کرشن داس نے اس وقت کے ان تاروں کو جو گاندھی جی، پنڈت مالوی جی اور دیش بندھو داس نے ایک دوسرے کو بھیجے تھے چھاپ دیا۔ پنڈت شیام سُندر چکرورتی، پنڈت مالوی جی اور مولانا آزاد نے جنہوں نے اِس گفتگو میں حِصّہ لیا تھا۔ اپنے اپنے بیان اخباروں میں دئے۔

سارے ملک میں تلخ اور زور دار بحث نئے سِرے سے چِھڑ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ورکنگ کمیٹی کو کچھ لوگوں نے پھر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس کرنے کے لئے مجبور کیا۔ ایک نشست ناگپور میں جون کے آخر میں ہوئی۔ وہاں یہ فیصلہ ہوا کہ کانگریس کا ایک خاص اجلاس کیا جائے جہاں داخلۂ کونسل کے سوال کا نپٹارہ کیا جا سکے۔ وہاں ایک تجویز ورکنگ کمیٹی کی طرف سے پیش کی گئی، جس کا مطلب یہ تھا کہ جن کمیٹیوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے فیصلے کے خلاف آواز اُٹھائی ہے اور کانگریس کی ہدایت کی خلاف ورزی کی اُن کے خلاف ضابطہ کی کارروائی کی جائے۔ اِن کمیٹیوں میں سب سے خاص مقام تامل ناڈ کمیٹی کا تھا۔ اور اس تجویز کا مرکز خاص شری راج گوپال آچاری تھے۔ اس پر بہت گرما گرم بحث ہوئی۔

کہا جاتا تھا کہ اُنہوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی تجویز کے خلاف کام کیا ہے۔ ہم لوگ خود آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے فیصلے کو ہی کانگریس کے اجلاس کے فیصلے کے خلاف مانتے تھے اِس لئے ہمارا کہنا تھا کہ اُنہوں نے کانگریس کی ہدایت پر ہی عمل کیا ہے اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بے لگام ہو کر کام کیا ہے۔ بحث رات تک جاری رہی۔ مجھے راجہ جی کی صفائی میں تقریر کرنی پڑی۔ اگرچہ میں ۱۹۱۱ء سے برابر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ممبر رہتا آیا تھا، پھر بھی میں بہت کم موقعوں پر وہاں بولا کرتا تھا۔ ستیہ گرہ جانچ کمیٹی پر بحث چھڑنے اور گیا کانگریس کے زمانے کو چھوڑ کر مجھے یاد نہیں کہ اس کے پہلے اور کہیں کانگریس میں یا آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں کبھی بولا ہوں۔ گیا میں میری تقریریں ہندی میں ہی ہوئی تھیں۔ ناگپور میں انگریزی میں بولنا مفید معلوم ہوا کیونکہ جنوبی ہندوستان اور دوسرے غیر ہندی بولی کے نمائندوں کو ہی زیادہ تر سمجھانے کی ضرورت تھی۔ راجہ جی خود بہت بولنا نہیں چاہتے تھے۔ میں نے شاید وہاں پہلی بار انگریزی میں تقریر کی۔ لوگوں پر اثر اچھا پڑا۔ شری ستیہ مورتی جو سوراج پارٹی کے بڑے حمائتی اور راجہ جی کے نقطۂ نظر کے خلاف تھے۔ میرے پاس آئے اور میری تقریر پر مبارک باد کہتے ہوئے فرمایا کہ میں نہیں جانتا تھا کہ آپ انگریزی میں اتنا اچھا بول سکتے ہیں نتیجہ یہ ہوا کہ تجویز نامنظور ہوگئی۔ مذمت کی تجویز گر جانے پر ورکنگ کمیٹی نے استعفیٰ دے دیا۔ نئی کمیٹی بنی۔ ہم لوگ پھر ورکنگ کمیٹی میں آگئے۔ شری کونڈا ونکپٹیا صدر ہوئے۔ شری گوپال کرشنیاّ سکریٹری بنے۔ ورکنگ کمیٹی کے ذمّہ خاص اجلاس کے لئے مقام منتخب کرنے کا کام بھی دیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے طے کیا کہ یہ دلی میں ہو۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے مولانا ابوالکلام آزاد کو خاص اجلاس کے لئے صدر منتخب کر لیا۔

جھنڈا ستیہ گرہ، گاندھی سیوا سنگھ

دِلّی کے خاص اِجلاس کے متعلق کچھ کہنے سے پہلے ناگپور کے جھنڈا ستیہ گرہ کا ذکر ضروری ہے۔ قومی ہفتہ کی تقریب میں ۱۹۲۳ء کی تیرھویں اپریل کو قومی جھنڈے کے ساتھ یہاں جلوس نکالا گیا۔ اُسے مدّھیہ پردیش کی سرکار نے جبل پور اور ناگپور کی سول لائنز میں جانے سے روک دیا۔ حکم نہ ماننے پر پنڈت سندر لال وغیرہ کو جبل پور میں گرفتار بھی کر لیا گیا۔ اس سے عوام میں بہت برہمی پیدا ہوئی۔ ستیہ گرہ کرنے کا خیال ہونے لگا۔

سبھی بڑے لیڈر ستیہ گرہ کے خلاف تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ داخلہء کونسل کے حامیوں کو نیچا دکھانے کے لئے غیر تبدیلی پسندوں کا ڈھونگ ہے۔ جو کچھ بھی ہو پہلی مئی کو ناگپور ستیہ گرہ شروع ہو گیا۔ سیٹھ جمنالال جی نے اس کی رہنمائی شروع کر دی۔ ستیہ گرہ کی صورت یہ ہوئی کہ کچھ ستیہ گرہی قومی جھنڈے لے کر جلوس بنا کر سول لائنز کی طرف جانا چاہتے تھے ایک جگہ تھی جہاں سرکار کی طرف سے اِنھیں روک دیا جاتا۔ اور اُن کے نہ ماننے پر اُنھیں گرفتار کر لیا جاتا۔ روزانہ یہی عمل چلتا۔ بہتیرے لوگ اس طرح گرفتار ہو کر جیل چلے گئے۔ ستیہ گرہ کی شہرت سارے ملک میں پھیلی۔ سبھی جگہوں سے ستیہ گرہ کرنے کے لئے والنٹیر

ناگپور پہنچنے لگے۔ کچھ دنوں کے بعد سیٹھ جمنالال جی بھی گرفتار کر لئے گئے۔ تب سردار ولبھ بھائی پٹیل ناگپور آ گئے۔ اُنہوں نے رہنمائی اختیار کی۔ میں نے بہار میں والنٹیروں کی تنظیم شروع کر کے انہیں ناگپور بھیجنا آغاز کیا۔ میں بھی اُن کے ساتھ کئی بار ناگپور گیا۔ ستیہ گرہ کی وجہ سے مُلک میں ہل چل مچ گئی۔ اب اندیشہ ہونے لگا کہ سردار ولبھ بھائی پٹیل بھی گرفتار کر لئے جائیں گے، اس لئے میرا وہاں جانا اور بھی ضروری ہو گیا۔

اس طرح سارے ملک سے ہزاروں ستیہ گرہی وہاں جا کر گرفتار ہوئے صورتِ حالات سنگین ہوتی گئی۔ شری وٹھل بھائی پٹیل جو سوراجی تھے وہاں آ کر سردار پٹیل کی مدد کرنے لگے۔ سرکار نے بھی سوچا کہ اس ستیہ گرہ کو طول دینا مُناسب نہیں۔ اس لئے شری وٹھل بھائی پٹیل سے کچھ باتیں ہوئیں۔ ایک دن جھنڈے کے ساتھ ساتھ جُلوس کو سِول لائنز لے جانے دے کر ستیہ گرہ بند کر دیا گیا۔ میں اس وقت ناگپور میں تھا۔ آخری دِن کا جُلوس بڑی شان سے نکلا۔ بہت لوگ جھنڈے لے کر اُس میں شریک ہوئے۔ شری وٹھل بھائی پٹیل اور سردار پٹیل کے ساتھ میں بھی تھا۔ جلوس پُر امن طریقے سے سول لائنز ہو کر چلا آیا۔ ستیہ گرہ ختم کر دیا گیا۔ اس کے بعد قیدی بھی چھوڑ دیئے گئے۔ اِس ستیہ گرہ کا اثر اور جگہوں میں بھی اچّھا پڑا۔

بہار سے بہت سے ستیہ گرہی گئے تھے۔ جن میں سے ایک ہردیو سنگھ ناگپور جیل میں ہی مر گئے۔ اُس دن میں وہیں تھا۔ جیل سے لاش ہم لوگوں کو مل گئی۔ اُس کے آخری مراسم ہم لوگوں نے وہیں مل کر کئے۔ یوں تو سردار پٹیل سے ملاقات تھی ہی، مگر ناگپور میں ہی اُن سے وہ ربط ضبط ہوا جو میری زندگی کی خوش گوار یادگاروں میں ہمیشہ بنا رہے گا۔ وہیں میرے دل میں ان کی خوش اسلوبی متانت اور قوت رہنمائی کے لئے

بہت وقار پیدا ہوا۔ اُن سے ایسی عقیدت ہوگئی جو روز بروز بڑھتی رہی۔ وہیں میں نے اُن کی محبّت اور اعتماد حاصل کیا جو انہوں نے اُسی طرح برابر میرے اور صوبۂ بہار کے لئے ظاہر کیا ہے۔

اُنہیں دنوں سیٹھ جمنالال جی کی رائے ہوئی کہ تبدیلی پسندوں اور غیر تبدیلی پسندوں کی بحث اگر آپس میں چلتی رہی تو تعمیری کام ڈھیلا ہی رہے گا۔ اس لئے ایک ایسا اِدارہ قائم کیا جائے جو تعمیری کام پر ہی زیادہ توجّہ دے اور اس میں زیادہ تر ایسے ہی آدمی رہیں جو زیادہ تر گاندھی جی کے اصولوں کو مانتے ہوں۔ اِس اِدارے کا نام رکھا گیا گاندھی سیوا سنگھ۔

شری راج گوپال آچاری، سردار ولبھ بھائی پٹیل، شری گنگا دھر راؤ دیش پانڈے سیٹھ جمنالال بجاج وغیرہ اس کے عملی صیغہ کے ممبر ہوئے۔ میں بھی ان میں داخل ہوا۔ جب تک وہ ادارہ اِس صورت میں رہا میں اس کا ممبر بنا رہا۔ ہم لوگوں کی برابر یہی کوشش رہی کہ اُسے سیاسی جھگڑوں سے الگ رکھیں۔ ایسا ہی کیا بھی گیا۔ اس کے کارکن خاص کر تعمیری کام میں (کھدّر کے پرچار اور ہریجنوں کی خدمت وغیرہ میں لگے رہتے مگر پھر بھی گاندھی ازم (گاندھی واد) کے مخالف اِس بات کی وقتاً فوقتاً شکایت کیا کرتے کہ یہ ایک سیاسی ادارہ ہے اور سوراج پارٹی والے انتہا پسند سوسائٹی (فارورڈ بلاک) کے ساتھ اس کا بھی نام شامل کر دیتے۔

خیر، گاندھی سیوا سنگھ نے تعمیری کام میں بہت دل چسپی لی۔ خاص کر اُسی کے ممبر اس کو آگے بڑھانے کے کام میں لگے رہے ہیں۔ اس کی شاخیں جا بجا کئی صوبوں میں قائم ہوئیں۔ جن میں سے ایک بہار بھی تھا۔ کئی ممبروں کو جن کی تعداد گھٹتی بڑھتی گئی اور تبدیلی

بھی ہوتی رہی، کچھ گذارہ بھی ملتا رہا۔ مگر یہاں اس کا کوئی ایک مرکز قائم کر کے کام نہیں ہوا اس کی کچھ کوشش کئی برسوں کے بعد سارن ضلع کے اندر میروا گاؤں میں آشرم قائم کر کے کی گئی مگر وہ بھی ٹھیک نہ چلا۔ اِس لئے اِس صوبہ بہار میں اس کا کوئی قابلِ دید کام ہم نہیں بتا سکتے مگر اس کے کچھ ممبروں نے تعمیری کام کیا اور کچھ سیاسی میدان سے الگ نہ ہو سکے۔

دِلّی سے کوکناڈا کانگریس تک

دلّی کے خاص اجلاس سے پہلے مولانا محمد علی جیل سے چھوٹ کر آ گئے۔ ہمارا قیاس تھا کہ وہ بھی داخلۂ کونسل کے خلاف ہوں گے۔ راجہ جی اس بحث سے اتنے اُکتا گئے تھے کہ وہ دِلّی کے اِجلاس میں آئے ہی نہیں۔

ہم نے مولانا محمد علی کو ہی اپنا لیڈر مان لیا۔ سب باتیں انہیں پر چھوڑ دی گئیں۔ انہوں نے طے کیا کہ دونوں پارٹیوں میں سمجھوتہ ہو جائے۔ اس فیصلہ کی شرط یہ تھی کہ کانگریس کی طرف سے اور کانگریس کے نام پر الکشن نہ لڑا جائے لیکن اگر کوئی کانگریس کا آدمی الکشن کے لئے کھڑا ہونا چاہے تو اس پر سے روک ہٹا دی جائے۔ اس طرح سوراج پارٹی کو ایسے بل بوتے پر کانگریسیوں کو کھڑا کر کے چناؤ لڑنے کا اچھا موقع مل گیا اور اس جھگڑے سے کانگریس الگ رہ گئی۔

ہم لوگ اس جھگڑے سے اُکتا گئے تھے۔ ہم دیکھتے تھے کہ اس سے تعمیری کام میں بھی خلل پڑتا ہے کیونکہ کچھ لوگ جو داخلۂ کونسل کے حق میں ہیں۔ داخلۂ کونسل کی حمایت کے ساتھ ساتھ تعمیری کام کی چاہے براہِ راست یا بالواسطہ طور پر مخالفت نہ کریں مگر تحقیر

ضرور کرتے تھے۔ ہم اُمید کرتے تھے کہ اس مصالحت کے بعد دونوں پارٹیاں اپنے اپنے کام میں لگ جائیں گی اور ہم تعمیری کام کو آگے بڑھا سکیں گے۔

مولانا محمد علی نے اس پر زور دیا مگر اُنہوں نے اس سلسلہ میں ایک بات اور کہی تھی جس کا راز ہم لوگوں کو بعد میں معلوم ہوا۔ انہوں نے کہا تھا کہ مصالحت کے حق میں اُن کو بے تار کے تار سے بھی خبر ملی ہے جس کا مطلب ہم لوگوں نے یہ سمجھا کہ اُن کو کسی نہ کسی طرح گاندھی جی کی رائے بھی معلوم ہو گئی ہے۔ ہم جانتے تھے کہ گاندھی جی جیل سے کوئی پیغام نہ بھیجیں گے کیونکہ وہ اصولاً اُسے غلط سمجھتے تھے۔ ہم لوگ یہ بھی جانتے تھے کہ شری شنکر لال بینکر جو گیا کانگریس کے جھگڑے کے بعد جیل سے چھوٹے تھے اور جو جیل میں گاندھی جی کے ساتھ ہی تھے، ہم سے کہہ چکے تھے کہ گاندھی جی کی رائے میں کوئی فرق نہیں آیا ہے پھر بھی ہم نے یہ سوچا کہ ہو سکتا ہے کہ جیل سے کوئی قیدی چھٹ کر آیا ہو اور وہاں بات چیت میں گاندھی جی کی رائے اس کو معلوم ہو گئی ہو اور اس نے مولانا سے یہ بات کہہ دی ہو۔ ان دنوں کانگریسی اکثر اپنی سزا کی میعاد پوری کر کے رہا ہوتے تھے۔ اس لئے یہ غیر ممکن بھی نہیں تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ گاندھی جی سے شری دیوداس گاندھی (اُن کے صاحبزادے) ملے تھے۔ دیوداس جی سے مہاتما گاندھی جی نے کہا تھا کہ مولانا محمد علی جو مناسب سمجھیں کریں مگر مجھ پر جو اُن کو اعتماد ہے یا جو محبّت ہے اُس سے اثر نہ لیں۔ بلکہ جس میں مُلک کا بھلا سمجھیں، وہی کریں۔ اِسی بات کو مولانا نے اپنے طریقے سے بے تار کا تار کہہ کر بتایا تھا۔ اِس کا اثر بہتوں پر کافی پڑا تھا۔ ایسے لوگوں میں سردار ولبھ بھائی پٹیل، سیٹھ جمنا لال بجاج، ڈاکٹر انصاری اور میں جو داخلہ کونسل کے مخالف تھے، خاص سمجھے جاتے تھے۔ ہم نے کوئی چارہ نہ دیکھ کر سمجھوتہ قبول کر لیا۔

ہندو مسلم جھگڑے بہت پھیل رہے تھے۔ اس سے اندیشہ تھا کہ سوراج کے کام میں بڑی رکاوٹ پیش آئے گی۔ سبھی لوگ فکر مند تھے۔ اس لئے دلّی کانگریس نے اس معاملہ میں بھی بہت سوچ بچار کیا۔ سبھی جگہوں میں ہوئے فساد کی جانچ کے لئے اُس نے ایک کمیٹی بنا دی ایک اور کمیٹی مقرر کی۔ ہندو مسلم سمجھوتہ کا مسوّدہ تیار کرنے کے لئے یہ بھی طے ہوا کہ کانگریس کی طرف سے سبھی مذہب والوں کو شامل کر کے رکشا دل (حفاظتی دستے) قائم کئے جائیں۔ سبھی جگہوں میں آپس کی ایسی پنچائتیں بنائی جائیں جو جھگڑے کو روکیں اور جھگڑا ہو جانے کی صورت میں اس کے اثر کو حتی الوسع کم اور محدود کریں۔

ایک اور سوال تھا جو اس وقت سارے ملک میں بڑی کھلبلی مچا رہا تھا۔ یہ تھا ہندوستانیوں کا مقام نوآبادیوں میں خاص کر کینیا (افریقہ) میں۔ وہاں ہندوستانیوں نے ہی جا کر اِس مُلک کو بسنے کے قابل بنایا تھا۔ اُنھوں نے ہی وہاں تجارتی کاروبار شروع کیا تھا۔ وہاں ریلیں نکالنے میں بھی اُنہیں کی محنت تھی۔ اب وہاں گورے لوگ ہندوستانیوں کو اِن مقاموں میں جو صحت بخش اچھّے زرخیز اور بلندی پر تھے رہنے نہیں دینا چاہتے تھے۔ برٹش سرکار نے بھی گوروں کی ہی بات مان لی تھی۔ کینیا کے گوروں کو جنوبی افریقہ کے گوروں کی بھی حمائت اور مدد حاصل تھی۔ اسی طرح فیجی میں بھی ہندوستانیوں کے ساتھ کی گئی بدسلوکی سے ظاہر ہو گیا ہے کہ برٹش سامراج میں ہندوستانیوں کے لئے جگہ نہیں ہے۔ لہٰذا اب ہندوستانیوں کو اس سامراج سے باہر آنے کی بات پر غور کرنا چاہیئے۔ بات ٹھیک تھی، اُس زمانے سے آج تک جتنی کارروائی ہوئی ہے اس سے یہ بات اور بھی واضح ہوتی گئی ہے۔ مگر اُس زمانے میں کانگریس نے خاص کر مولانا محمد علی کے زور لگانے پر نامنظور کر دیا۔ میں اس تجویز کا حامی تھا۔ مگر ہم لوگوں نے اتنی بڑی تبدیلی کے لئے

جب ہم کمزور پڑ گئے تھے اور ہماری تحریک بھی کمزور پڑ گئی تھی۔ وہ وقت موزوں نہیں سمجھا ایک اور ریزولیوشن منظور ہو گیا جس میں برٹش سامراج سے الگ ہونے کی بات نہیں تھی۔

دلّی کے اجلاس کے بعد میں وہاں سے ہی لالہ لاجپت رائے کو دیکھنے کے لئے سولن چلا گیا۔ وہ جیل سے بیمار نکلے تھے اور وہاں صحت یابی کے لئے ٹھہرے تھے۔ اُنہوں نے بھی سمجھوتے کو پسند کیا۔ وہ خوش تھے۔ کیونکہ ان کا خیال بھی سوراج پارٹی کے حق میں تھا سولن سے واپسی پر میں لکھنؤ اُترا۔ وہاں میڈیکل کالج کے پرنسپل کرنل سپراسن سے جو پھیپھڑے کی بیماریوں کے ماہر خصوصی مانے جاتے تھے، اپنی تشخیص کرائی۔ اُنہوں نے بھی میری بیماری کو دمہ قرار دیا۔ اس کے لئے سوامن کا انجکشن بتایا۔ پٹنہ واپس آنے پر اُن کی ہدایت کے مطابق میں نے اس کا انجکشن لیا۔ کچھ خاص فائدہ نہیں ہوا۔

دلّی کے اجلاس کے بعد سوراج پارٹی نے انتخاب میں حصہ لیا۔ مدّھیہ پردیش میں سوراج پارٹی کو بیشتر مقامات پر کامیابی حاصل ہوئی۔ وہاں کی کونسل میں اُس کی اکثریت ہو گئی۔ بنگال میں بھی خاصی کامیابی ہوئی مگر اکثریت نہیں ملی۔ کسی اور صوبے میں زیادہ کامیابی نہیں ہوئی، مگر سبھی جگہوں میں کچھ اچھے آدمی کونسلوں میں آسکے۔ بہار میں بھی سوراج پارٹی بنی جس کے خاص حمائتیوں میں مولوی محمد شفیع، پروفیسر عبد الباری، شری کرشن، بلبھ سہائے اور بابو میشور پرشاد تھے۔ یہاں ہم میں سے کسی نے بھی الیکشن میں حصہ نہیں لیا۔ درپردہ بھی ہم نے مدد نہیں کی۔ پھر بھی دس یا بارہ آدمی منتخب ہوئے۔ اُنہوں نے کونسل میں اچھا ہی کام کیا۔ میشور بابو ہی پارٹی کے لیڈر رہے۔ اُتّر پردیش میں پنڈت گووند بلبھ پنت پارٹی کے لیڈر ہوئے اور بنگال میں خود دیش بندھو داس۔ اکثریت ہونے کی وجہ سے سوراج پارٹی نے مدّھیہ پردیش میں وزارت نہیں بننے دی کچھ دنوں تک یہ سلسلہ چلا مگر کچھ خاص

حضرات پھوٹ کر الگ ہی وزارت میں شریک ہو گئے۔ بنگال میں دیش بندھو داس نے کچھ دوسروں کے ساتھ مل کر وہاں کی وزارت کو بھی کچھ مدت کے لئے توڑ ڈالنے میں کامیابی حاصل کی۔

۱۹۲۳ء اسی طرح ختم ہوا۔ دسمبر میں کانگریس کا سالانہ اجلاس کوکناڈا میں ہوا عین اجلاس کے زمانے میں میں بیمار پڑ گیا اس لئے کوکناڈا نہ جا سکا۔ وہاں قومی زبان کی تبلیغ کے لئے جو کانفرنس ہونے والی تھی اُس کا میں ہی صدر منتخب تھا۔ میں نے ایک طویل تقریر بھی تیّار کی تھی، جو کتابی صورت میں شائع ہوئی تھی۔ جب میں عین روانہ ہونے کے دن ہی بیمار پڑ گیا۔ تو صرف چھپی ہوئی کتاب ہی جا سکی۔ میری جگہ سیٹھ جمنالال بجاج صدر ہوئے۔ میں نے سُنا کہ اُنہوں نے ہی میری تقریر کو پڑھ کر سُنایا تھا۔

کوکناڈا کانگریس کے صدر مولانا محمد علی تھے۔ اُن کا خُطبۂ صدارت بڑا طویل اور اہم ہے۔ ہندوستان کی سیاست میں مسلمانوں کے مقام پر اُنہوں نے تاریخی نقطۂ نظر سے تبصرہ کیا۔ آیندہ کے لئے بھی انہوں نے بہتیری باتیں کہیں۔ جن کو شاید سبھی لوگ نہیں مانتے خیر اکوکناڈا نے دلّی کے خاص اجلاس کے فیصلہ کی ہی تائید کی۔ جو اجازت سوراج پارٹی کو داخلۂ کونسل کے لئے ملی تھی، اُسے پھر منظور کر لیا۔ اِس کے علاوہ کانگریس نے ہندو مسلم سمجھوتے کے سودے کو عوام اور کمیٹیوں کے خیالات کے ساتھ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے پیش کرنے کی ہدایت کی کھدّر کی تبلیغ کے لئے کھدّر بورڈ قائم کیا گیا۔ جوش بہت تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عوام میں پھر جان آ گئی ہے۔ عین کانگریس کے اِجلاس کے زمانے میں ہی شری پرکاش سین سنگھ کی افسوس ناک وفات ہو گئی۔ ہم میں سے ایک ہونہار بے لوث کارکن چل بسا۔

ہائی کورٹ میں برما کا مقدمہ

میں پٹنہ میں ٹھہر گیا۔ سنہ ۱۹۲۴ء کی ۲ جنوری سے بابو جی ہری والا مقدمہ اپیل میں ہائیکورٹ میں شروع ہونے والا تھا۔ میں بیمار رہ کر بھی اُس کے لئے تیاری کرتا رہا۔ اُس میں مجھے کام کرنا تھا۔ جنوری کے شروع سے مئی کے آخر تک اُس کی پیشی رہی۔ میرا تقریباً سب وقت اُسی میں لگتا رہا۔ ہائی کورٹ میں ہم لوگوں کی طرف سے مسٹر حسن امام اور مسٹر مانک نے بحث کی۔ ڈمراؤں کے مہاراجہ کی طرف سے سر آسوتوش مُکرجی نے بحث کی۔ وہ ہائی کورٹ کی ججی سے پنشن پا کر حال ہی میں نکلے تھے۔ مجھے بہت محنت کرنی پڑی۔ سویرے ہی حوائجِ ضروری سے فارغ ہو کر جناب حسن امام کے یہاں سات بجے پہنچ جاتا تھا۔ جب تک وہ کچہری جانے کے لئے تیار ہونے کو اُٹھ نہ جاتے تب اُن کے ساتھ کام کرتا پھر دن بھر کچہری میں کام کرتا۔ شام کو پھر اُن کے ساتھ (خاص کر سنیچر اور اتوار کو اور کبھی کبھی دوسرے دن بھی) اکیلے لائبریری میں کام کرتا۔ قانونی نظیریں ڈھونڈھ نکالنے کا کام میرے ہی سپرد تھا۔ یہی کام میں نے آرہ میں بھی کیا تھا اور یہاں بھی کیا۔ ایک معاملہ پر آرہ میں کوئی نظیر نہیں ملی تھی۔ یہ بہت ضروری معاملہ تھا۔ سوچنے سے خیال ہوتا تھا کہ اِس قسم کے

مقدمے ضرور ہوئے ہوں گے اور ہمارے حق میں نظیر ضرور ملنی چاہئے۔ مگر آرہ میں پٹنہ کی طرح کتابوں کی فراہمی کی چنداں سہولت نہ تھی۔ اِس لیئے وہاں وہ نظیر نہیں ملی۔ پٹنہ میں شری حسن امام صاحب کی لائبریری بہت اچھی تھی۔ میں نے اس قسم کی نظیر تلاش کرنے میں بہت وقت لگایا۔ آخر کامیابی ہوئی۔ ایک نظیر مل جانے پر اُس کے پہلے اور بعد کی بہت سی نظیریں مل گئیں۔ میں نے جب یہ نظیر حسن اِمام صاحب کو دکھائی تو وہ بہت خوش ہوئے میرے ساتھ وہ مسٹر مانک کے گھر گئے اور اُن کو بھی فوراً وہ نظیر دکھائی۔ دونوں کو پورا یقین ہوگیا کہ اِس معاملے میں وہ ضرور جیتیں گے اور ہوا بھی ایسا ہی۔

اِس مقدمے کی سماعت کے درمیان ہی سر آسوتوش کی بے وقت وفات پٹنہ میں ہی ہوگئی۔ وہ اپنی بحث ختم کر چکے تھے۔ ججوں کے لئے جب وہ کچھ نوٹ تیار کر رہے تھے ایک ہی دن کی بیماری میں اچانک چل بسے۔ وفات کے وقت میں اُن کے پاس ہی تھا۔ پٹنہ میں کئی مہینوں تک روزانہ اُن سے ملاقات ہو جانا بھی میرے لئے بڑی بات تھی۔ کلکتہ میں تو وہ جج تھے اور میں ایک نیا وکیل۔ پٹنہ میں دونوں ایک ہی مقدمہ میں کام کرتے تھے۔ اگرچہ ہم مخالف فریقوں کی طرف سے تھے تب بھی دوپہر اور اِجلاس برخاست ہونے کے بعد تقریباً روزانہ دو چار باتیں آپس میں ہو ہی جایا کرتی تھیں۔ ایک چھوٹا سا واقعہ بتا دینا بُرا نہ ہوگا۔ جناب حسن اِمام اُن کو گروجی کہا کرتے تھے۔ جب حسن اِمام صاحب کلکتہ ہائی کورٹ کے جج ہوئے تب سر آسوتوش اُن سے سینیر تھے۔ شاید وہیں یہ رشتہ قائم ہوا تھا۔ اپنی بحالی کے تھوڑے ہی دن بعد حسن اِمام صاحب فوجداری بنچ پر بیٹھے وہاں کے سینیر جج سے یکے بعد دیگرے تین مقدموں میں اُن کا اختلاف رائے ہوگیا تینوں مقدمے سر آسوتوش کے پاس تیسرے جج کی حیثیت سے بھیجے گئے۔ تینوں میں اُنھوں نے

حسن اِمام صاحب کے ہی فیصلہ کی تائید کی تھی۔ اس سے کلکتہ ہائی کورٹ میں جلد ہی حسن اِمام صاحب کا بڑا نام ہو گیا تھا۔ جناب حسن اِمام نے پٹنہ میں اِنہیں ایک دن چائے پینے کے لئے مدعو کیا۔ ہائی کورٹ میں ہی انہوں نے کہا۔

"گرو جی آپ میرے یہاں چائے پئیں گے؟"

سر آسوتوش نے کہا۔

"میں کٹّر سناتنی ضرور ہوں اور آج تک اِسی سبب سے گورنمنٹ ہاؤس میں چائے نہیں پی ہے۔ مگر اِس کا یہ مطلب نہیں کہ حسن اِمام کے یہاں میں چائے نہ پیوں گا۔"

چائے پارٹی میں ہم سب بلائے گئے اور شریک ہوئے۔

بتیا کا مینا بازار

مہاتما گاندھی یروداجیل میں تھے، وہاں وہ بہت بیمار پڑ گئے۔ اپنڈ سائیٹس کا زور ایسا ہوا کہ ایک دِن ڈاکٹروں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اگر فوراً آپریشن نہ کیا گیا تو اُن کی جان نہیں بچے گی۔ یہ فیصلہ رات کے وقت ہوا وہ پونا کے ہسپتال میں لے جائے گئے۔ وہاں کے انگریز ڈاکٹر کرنل میڈوک کو آپریشن کرنا پڑا۔ مہاتما جی سے پوچھا گیا تھا کہ آپ کا ڈاکٹر کون ہے۔ اُنھوں نے بمبئی کے ڈاکٹر دیال اور ڈاکٹر جیوراج مہتہ کے نام بتلائے مگر اب اِتنا وقت نہیں تھا کہ وہ بلائے جا سکتے۔ گاندھی جی نے صاف صاف کہہ دیا کہ مُجھے اِس انگریز ڈاکٹر پر پورا اعتماد اور اعتبار ہے۔ یہ نچنت ہو کر جو مناسب سمجھے کرے۔ اس وقت مسٹر شری نواس شاستری ہسپتال میں بلائے گئے تھے۔ یہ تب تک وہاں ٹھہرے جب تک نشتر کا کام ختم نہ ہوا۔ آدھی رات کے وقت نشتر لگایا گیا۔ اِس میں وہ انگریز ڈاکٹر بہت کامیاب رہا۔ عین نشتر لگاتے وقت ایک چھوٹا سا حادثہ ہوا۔ ٹھیک اُسی وقت جب نشتر چل رہا تھا بجلی کی بتّی اچانک بُجھ گئی۔ خیریت گُذری کہ وہ جلد پھر جل گئی۔ نشتر کے کام میں کوئی خاص دقت نہیں ہوئی۔

میں اُن دِنوں برما کے مقدّمے میں پٹنہ ہائی کورٹ میں کام کر رہا تھا۔ اخباروں میں بیماری اور نشتر لگائے جانے کی خبر چھپی، اُسے پڑھ کر سارے مُلک میں تشویش پھیل گئی۔ میں نے تین چار دن کی چھٹی لی، سیدھا پونا چلا گیا۔ ابھی مہاتما جی ہسپتال میں ہی تھے، اور بہت کم زور تھے میں نے جا کر اُسی حالت میں اُن کے درشن کیے۔ حالت دیکھ کر پٹنہ واپس چلا آیا۔ اُس وقت یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اب جان کا کوئی خطرہ نہیں ہے مگر کم زوری اتنی زیادہ تھی کہ کچھ دنوں تک آرام کرنا ضروری تھا۔ میرے پٹنہ واپس آنے کے بعد جلد ہی خبر ملی کہ سرکار نے گاندھی جی کو رہا کر دیا۔ خبر پہنچتے ہی پٹنہ میں ایک جلسہ ہوا جس میں میں نے بھی تقریر کی۔ گاندھی جی سے میری جو باتیں پونہ ہسپتال میں ہوئی تھیں وہ اِس جلسہ میں بتائیں۔ مختصراً یہ کہا کہ مہاتما جی بیماری کے سبب سے رہائی پر خوش نہ ہوں گے۔ یہ تو مُلک کے لئے بھی شرم کی بات ہے کہ ہم اپنی طاقت سے نہیں بلکہ حکومت کے رحم و کرم سے اُن کی رہائی حاصل کر سکے۔ رہائی کے بعد اپنے بیان میں گاندھی جی نے بھی یہی کہا تھا۔

کچھ دِنوں ہسپتال میں رہ کر اچھّے ہونے پر مہاتما جی باہر نکلے۔ طے یہ ہوا کہ آرام کرنے کے لئے وہ سمندر کے کنارے بمبئی کے پاس جوہو میں جا کر کچھ دنوں تک ٹھہریں۔ اِسی فیصلے کے مطابق وہ وہاں جا کر کچھ دنوں ٹھہرے رہے۔

اُسی زمانے میں ایک واقعہ بیتیا ضلع چمپارن میں ہوا جس کا ذکر یہاں ضروری معلوم ہوتا ہے۔ بیتیا راج بہت دنوں سے کورٹ آف وارڈس کے قبضہ میں تھا۔ اُن دِنوں اُس کے منیجر مسٹر رور فورڈ تھے، وہ پہلے نیل والے صاحب رہے تھے۔ سرکار کی پالیسی اُن دنوں میں اکثر یہی ہوتی کہ جہاں کہیں کوئی زمینداری کورٹ ہو جاتی اور منیجر کی ضرورت پڑتی اُس

کے لئے کوئی نہ کوئی نیل والا صاحب ہی مقرر کیا جاتا۔ اسی پالسی کے مطابق مسٹر رور فورڈ کا تقرر کئی سال پہلے ہوا تھا۔ اِن سے پہلے بھی اِس راج کے لئے جو منیجر مقرر کئے گئے تھے نیل والے صاحب ہی تھے خیر ۱۹۲۲ء میں بیتیا مینوسپلٹی کے ممبروں کا چناؤ ہوا اس میں کچھ کانگریسی بھی منتخب ہوئے۔ چیرمین اور وائس چیرمین کے انتخاب کے لئے اُمیدوار کھڑے ہوئے اُن چیرمینی کے ایک اُمیدوار خود رور فورڈ تھے۔ ان کے ساتھ وائس چیرمینی کے لئے وہاں کے رجسٹرار کھڑے کئے گئے۔ کانگریس کی طرف سے شری بپن بہاری ورما اور شری پرجاپتی مشر کھڑے ہوئے۔ راج کے لئے خاص کر مسٹر رور فورڈ کے لئے کسی کا اُن کے مقابلے میں کھڑا ہونا ہی بڑی بات تھی۔ اُن کو ہرا کر کانگریسی چیرمین اور وائس چیرمین کا چُنا جانا تو ناقابلِ برداشت تھا۔ ۱۹۲۴ء میں نیا الکشن ہوا۔ اِس بار کانگریسی ممبروں کی بڑی اکثریت ہو گئی۔ اِس لئے راج کی طرف سے چیرمینی کے لئے کوئی نہیں کھڑا کیا گیا وہی شری بپن بہاری ورما اور شری پرجاپتی مشر چُنے گئے۔ اگرچہ راج کے اُمیدوار نہیں کھڑے ہوئے پھر بھی راج کے لوگ مسٹر رور فورڈ کی ہار کو نہیں بھولے تھے۔ یہ افواہ اکثر گشت کرتی رہتی تھی کہ راج کی طرف سے کچھ نہ کچھ کر کے دکھایا جائے گا۔

مہاتما جی کی بیماری کی وجہ سے مُلک بھر میں کھلبلی مچی تھی۔ مولانا محمد علی نے کانگریس کے صدر کی حیثیت سے ہدایت کی، مُلک میں سب جگہ جلسے کر کے مہاتما جی کی صحت یابی کے لئے دُعائیں کی جائیں۔ بیتیا میں جلسہ ہونے والا تھا۔ وہاں راج کی طرف سے ایک مینا بازار بنایا گیا تھا جس میں شہر کے بیوپاری اپنی اپنی دُکانیں کرائے پر لیتے تھے۔ اُس دِن پنڈت پرجاپتی مشر اور ایک دوسرے کانگریسی بابو جے نارائن بازار والوں سے جلسہ میں آنے کے لئے کہنے کو گئے۔ راج کے ایک کارکن نے بابو جے نرائن کو دو چپت لگا کر

دونوں کو بازار کے باہر نکال دیا۔ دُکانداروں میں بڑی سنسنی پھیلی۔ اگر مشرجی لوگوں کو نہ روکتے تو جھگڑا بڑھ جاتا۔ اِس کے بعد جلسہ ہوا، اور بازار کے لوگ کافی تعداد میں اُس میں شریک ہوئے۔ اِتنا ہی نہیں، دکانداروں نے فیصلہ کیا کہ وہ مینا بازار سے اپنی دُکانیں ہٹالیں گے اور میونسپلٹی سے زمین مانگ کر اور کہیں دُکانیں لگائیں گے۔ دوسرے ہی دِن بازار خالی ہونے لگا۔ ایک طرف کچھ ہٹ کر دُکانیں لگ گئیں۔ دو چار دنوں میں ہی ایک نیا بازار بس گیا۔ مینا بازار تقریباً خالی ہوگیا۔ اِس سے راج کو اور بھی دھکا لگا۔ اَب خبر اُڑنے لگی کہ کانگریس والے پیٹے جائیں گے مگر کانگریسیوں نے اِس طرح کی خبروں کی پرواہ نہیں کی۔

ایک روز شام کو پنڈت پرجاپتی مشر ایک ٹمٹم پر کہیں جا رہے تھے۔ کسی نے اُن کے سر پر بڑے زور کی لاٹھی ماری اور وہ بے ہوش ہو گئے۔ وہ آدمی مینجر کی کوٹھی کی طرف بھاگ گیا۔ سُنا گیا کہ اُس کو لے کر راج کے کارکن مجسٹریٹ کے پاس بھی گئے اور کچھ کارروائی کرکے اُس کو وہاں سے ہٹا دیا۔ اِس سے سارے شہر میں غم و غصّہ کی لہر دوڑ گئی۔ میرے پاس تار آیا میں فوراً وہاں گیا۔ سب حال معلوم کیا۔ مینا بازار میں اِس واقعہ سے پہلے کچھ بڑی بڑی دُکانیں رہ گئی تھیں۔ اب وہ دُکان دار بھی نکل آئے ایک خوب صورت بازار بن گیا میونسپلٹی کو تو آمدنی بڑھنے کی اُمید ہو گئی۔ مگر راج کو تقریباً پچاس ہزار روپیے سالانہ کا اندیشہ ہوا پنڈت پرجاپتی مشر نے بہت ہی ہمّت اور صبر سے کام لیا۔ اُنھوں نے چارپائی پر پڑے پڑے ہی لوگوں کو پُر سکون رہنے کا پیغام بھیجا۔ اِس حملہ آور پر کسی قسم کی کارروائی نہ کرنے کا بھی تہیّہ کیا۔ یہ معلوم ہو گیا کہ سب کچھ راج کے اعلیٰ کارکنوں کے اشارے پر ہی ہوا ہے۔ یہ بھی اندازہ ہو گیا کہ کانگریس سے عوام کو کتنی عقیدت ہے جو چھوٹے بڑے دُکاندار مینا بازار

کی پکّی عمارتوں میں دُکان رکھتے تھے ۔ وہ سب کے سب کھُلے میدان میں یا ٹاٹ کے چھپر کے نیچے دکانیں اُٹھا لائے ۔ نئے بازار میں مٹّی کے برتنوں سے لے کر سونے چاندی کی دُکانیں تک اسی طرح آ گئیں ۔ خوف یہ تھا کہ اِس طرح کے بازار میں چوری ڈکیتی نہ ہو جائے پولیس سے اِمداد کی کوئی اُمید نہ تھی ۔ اس لئے بازار کی حفاظت کی خاطر شہر میں والنٹیر کور (رضاکاروں کا دستہ) قائم ہو گیا ۔ یہ دن رات پہرہ دیتا ۔ لوگوں میں بڑا جوش تھا ۔ یہ جھگڑا بہت دِنوں تک چلتا رہا ۔ بہت دنوں کے بعد اگرچہ مینا بازار میں دُکانیں کھُل گئیں مگر نیا بازار بھی چلتا رہا ۔

اِس واقعہ کی خبر پا کر میں بیتیا گیا ۔ وہاں کی تحقیقات سے واپس آنے پر میں نے اخباروں میں ایک بیان شائع کرایا ۔ اُس میں سب باتیں وضاحت سے بیان کی گئی تھیں کچھ دنوں کے بعد بیتیا میں بہار صوبہ کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا ۔ صوبائی کمیٹی کے صدر مولانا مظہر الحق صاحب اور دوسرے لیڈر بھی تشریف لائے ۔ وہاں یہ طے کیا گیا کہ اگر بیتیا کی حالت میں بہتری نہ ہو اور جیسی افواہ پھیل رہی تھی دوسرے کانگریسی بھی جن میں بپن بابو خاص تھے ، پنڈت پرجاپتی مشر کی طرح لاٹھیوں کے شکار بنائے جائیں تو صوبائی کانگریس کمیٹی کو مجبور ہو کر بیتیا کی رعیت سے لگان دینا بند کرنے کو کہنا پڑے گا اور اس کے لئے بھی قربانی کرنی پڑے گی اِس کے لئے عوام کو تیّار رہنا ہو گا ۔ ایک جلسہ عام ہوا جس میں اس فیصلہ کا اعلان کر دیا گیا ۔ بہار کونسل میں بھی یہ سوال اُٹھا ، اِس پر سوراجی لوگوں نے بہت زوردار بحث کی ، میشور بابو اُن کے لیڈر تھے ۔ انہوں نے خود اس معاملہ کی جانچ کی تھی ۔ خود حملہ کرنے والے نے ہی اِنہیں سچ مچ سب کچّا چٹھا بتا دیا تھا اِسی بُنیاد پر اُنہوں نے وضاحت کے ساتھ ساری باتیں کونسل کے اجلاس میں کہہ سنائی تھیں ۔

جوہو کی بات چیت اور اُس کے بعد

مہاتما جی آرام بھی کر رہے تھے اور کام بھی۔ جونہی وہ اِس قابل ہوئے کہ کچھ بات چیت کر سکیں لوگ اُن سے ملنے کے لئے وہاں پہنچنے لگے۔ اُن کی غیر حاضری میں جو کچھ ہوا تھا خاص کر داخلۂ کونسل کی تحریک، اُس کی سب باتیں لوگوں نے اُنہیں بتائیں، دیش بندھو داس اور پنڈت موتی لال نہرو بھی وہاں گئے اور کچھ دنوں تک ٹھہرے، وہاں اِس بارے میں باتیں ہوئیں اور اِس بات کی کوشش کی گئی کہ آپس میں سمجھوتے کی کوئی راہ نکلے۔ کونسلوں میں سوراج پارٹی کی طرف سے کچھ کانگریسی لوگ جا چکے تھے، اِس لئے اِس سوال کی اب اتنی اہمیّت نہیں تھی جتنی گیا اور دلّی کے کانگریس کے اِجلاس کے زمانے میں۔ مگر یہ جان کر مجھ جیسے لوگوں کو تسلّی ہوئی کہ گاندھی جی نے ہماری کونسل کی مخالفت کی کارروائی کو پسند کیا۔ تسلّی کی وجہ یہ تھی کہ ہم سے برابر کہا جاتا تھا کہ گاندھی جی اگر باہر ہوتے تو وہ اِس بارے میں اِسی ضد نہ کرتے اور کوئی نہ کوئی سمجھوتہ کر لیتے مگر وہ اب بھی اُس کے اتنے ہی سخت مخالف تھے جتنے اُس وقت جب اُنہوں نے اِس پروگرام کو مُلک کے سامنے رکھا تھا۔

جوہو میں بات چیت کے بعد گاندھی جی نے ایک بیان نکالا جس میں اُنہوں نے

صاف کہا کہ وہ اب بھی پانچوں بائیکاٹوں کے حق میں ہیں۔ اور اُن کی رائے میں کونسلوں میں جانا ترک موالات کی پالسی کے خلاف ہے۔ مگر وہ اِس رائے پر پنڈت موتی لال نہرو دیش بندھو داس اور سوراج پارٹی کے دوسرے لوگوں کو نہیں لا سکے۔ وہ لوگ کونسلوں میں چلے بھی گئے تھے اِس لئے اب اِس بحث و تمحیص سے کچھ فائدہ بھی نہیں تھا۔ غیر تبدیلی پسندوں کے لئے یہ راستہ تھا کہ وہ اِس بحث کو چھوڑ کر تعمیری کام میں لگ جائیں۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ کانگریس کی تنظیم کے متعلق اُن کے خیالات بہت سخت ہیں جن کو وہ بعد میں لکھیں گے۔ اِس زمانے میں مُلک میں ہندو مسلم جھگڑے بہت ہو رہے تھے اور عداوت بہت پھیل رہی تھی۔ اُس کا بھی بہت واضح تجزیہ اُنہوں نے ایک طویل مضمون میں کیا۔ اسی مضمون میں انہوں نے آریہ سماج پر رائے زنی کی تھی جس سے بہت لوگ ناخوش ہو گئے تھے۔ اسی میں انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ مسلمان جہاد پسند ہوتے ہیں اور ہندو ڈرپوک۔ کانگریس کی تنظیم کے سلسلے میں اُنہوں نے یہ رائے ظاہر کی کہ کانگریس کی سبھی انتخابی نشستوں پر ایسے لوگوں کو چُنا جائے جو پانچوں بائیکاٹوں کو اصولاً مانتے ہیں اور خود اپنی زندگی میں اُن پر عمل کرتے ہیں۔ یعنی کچہریوں کا بائیکاٹ کر کے نہ تو اُن کو مقدمے لڑنے چاہئیں اور نہ وکالت کرنی چاہیئے۔ اپنے نابالغ بچّوں کو سرکار سے وابستہ اِسکولوں میں نہیں بھیجنا چاہیئے۔ سرکاری خطاب نہیں رکھنا چاہیئے۔ کونسلوں میں نہیں جانا چاہیئے۔ بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ کے لئے کھدّر پہننا اور چرخہ چلانا چاہیئے۔ اِنھی دنوں کلکتہ میں ڈے نام کے ایک انگریز کو ایک نوجوان شری گوپی ناتھ ساہ نے شارع عام پر دِن دہاڑے پستول سے مار ڈالا۔ وہ پکڑے بھی گئے تھے اور اُن کو پھانسی کی سزا بھی ہوتی تھی۔ بنگال صوبائی سیاسی کانفرنس نے جو اُس سال سراج گنج میں ہوئی تھی۔ اِس بارے میں ایک تجویز پاس کی

جس میں اُن کی دیش بھگتی (حبِ وطن) کی تعریف کی گئی تھی۔ اگرچہ اُن کے اِس کام کو بُرا کہا گیا تھا۔ مہاتما جی کو یہ ریزولیوشن اچھا نہیں لگا۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اِس قسم کا قتل کانگریس کے اُصولوں کے بالکل خلاف ہے، اِس سے مُلک کو بڑا نقصان ہے اور سوراج کی راہ میں روڑے اُگتے ہیں۔ اُنہوں نے اِس تجویز پر سخت نکتہ چینی کی۔ کانگریس کی تنظیم کو درست کرنے کے لئے اُنہوں نے کئی تجویزوں کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے رکھنے کی خواہش ظاہر کی اور مسٹر ڈے کے قتل کے بارے میں بھی ایک تجویز پیش کرنے کی بات کہی۔ تجویزوں کے مسودے بھی اُنہوں نے چھاپ دئے۔ اُن کا مطلب یہ تھا کہ کانگریس کے چُنے ہوئے ممبروں کو سب بائیکاٹ ماننے چاہئیں اور ایسے ہی لوگوں کو کانگریس کا عہدہ دار ہونا چاہیے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جو لوگ کونسلوں میں گئے تھے وہ نہ چنے جائیں اور جو چُنے گئے ہیں وہ ہٹ جائیں۔ اِسی طرح ایسے سب لوگوں کے لئے کم سے کم آدھ گھنٹہ روزانہ چرخہ چلانا اور ہر مہینہ ایک ہزار گز سوت کھدّر بورڈ کو دینا لازمی کر دینا چاہیئے۔ جو سوت نہ دیں اُن کی جگہ خالی سمجھی جانی چاہیئے۔ اور ایسی خالی شدہ نشست پر دوسروں کو منتخب کر لیا جائے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپس کے جھگڑے مٹا دینے کی جو اُمید پہلے بیان سے ہوئی تھی وہ بالکل جاتی رہی۔ سارے مُلک میں اِن تجویزوں اور خیالات کے متعلّق بہت زوروں سے بحث وتمحیص ہونے لگی۔ گاندھی جی نے اپنے خیالات کو حسبِ معمول بہت جچی تُلی زبان میں مگر مضبوطی کے ساتھ مُلک کے سامنے رکھا۔

جون کے آخر ہفتہ میں احمد آباد میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ وہاں اِن تجویزوں کی جن میں بائیکاٹوں کو نہ ماننے اور چرخہ نہ چلانے کی بنیاد پر عہدہ دار بننے سے لوگوں کو روکنے کی بات تھی، اِس بنیاد پر مخالفت ہونے لگی کہ تجویزیں کانگریس کے ضابطہ کے

خلاف ہیں۔ کیونکہ کانگریس کا دستور کانگریس کے ذریعے بنایا گیا ہے اور اس میں ردّوبدل کرنے کا حق کانگریس کو ہی ہے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو نہیں اور اِن تجویزوں کا نتیجہ اِن ضابطوں میں تبدیلی کرنا ہوتا ہے مہاتماجی کا کہنا تھا کہ کانگریس کا ایک قاعدہ ہے کہ جب کانگریس کا اجلاس نہ ہو رہا ہو تو اُس کے سارے اِختیارات آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو حاصل ہوتے ہیں اور اگر اِن تجویزوں کے ذریعے ضابطہ میں کوئی ترمیم ہوتی ہے تو وہ خلافِ آئین نہ ہوگی، خاص کر اُس وقت جب کہ اِن تجویزوں کا اثر کانگریس کے اِن فیصلوں کو بروئے کار لانا ہی ہوتا ہے جو بائیکاٹ کے متعلق ہوں۔ مولٰینا محمد علی صدارت کر رہے تھے۔ اُنہوں نے یہ دریافت کیے جانے پر کہ یہ تجویزیں ضابطہ کے خلاف ہیں یا نہیں۔ اپنی رائے نہ دے کر ممبروں کی رائے لی اور معلوم ہوا کہ اکثریت اِنہیں آئین کے مُطابق مانتی ہے۔ اگرچہ اکثریت اور اقلیّت میں تھوڑی ہی رایوں کا فرق تھا۔ اِس پر دیش بندھو داس پنڈت موتی لال وغیرہ اپنی ناراضی ظاہر کرنے کے لئے اجلاس چھوڑ کر چلے گئے۔ مہاتماجی نے اُن کے چلے جانے پر بھی ایک تجویز پیش کی جو قلیل اکثریت سے منظور ہوئی۔ اِس پر مہاتماجی نے فوراً ایک دوسری تجویز بھی پیش کر دی کہ اِس مانی ہوئی تجویز میں سے وہ حصّہ حذف کر دیا جائے جس میں بائیکاٹ کو نہ ماننے کی سزا عہدوں سے ہٹا دیا جانا بتائی گئی ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ اگرچہ حاضرین کی اکثریت تجویز کے حق میں ہے مگر یہ اکثریت حقیقتاً اکثریت نہیں کیونکہ غیر حاضر اصحاب اگر رائے دیتے تو اُن کی اکثریت ہو جاتی اور اِس کے علاوہ اگر تجویز کے حق میں اکثریت رہ بھی جاتی تو بھی وہ اتنی کم ہوتی جیسے نہیں کے برابر۔ اِس طرح منظور شُدہ تجویز بدل دی گئی، اور سوراج پارٹی کے لوگوں کو پھر موقع مِلا کہ واپس آجائیں۔

اُسی رات کو مہاتما جی اور اُن لوگوں کے درمیان پھر بات چیت ہوئی، جس کے نتیجے کے طور پر کانگریس کی تنظیم کے متعلق تجویزوں کی صورت ایسی کردی گئی، کہ دونوں پارٹیوں کو قابلِ قبول ہو۔ دوسرے دن وہ سبھی تجویزیں اسی سمجھوتہ کی شکل میں پاس ہوئیں۔ ڈے کے قتل کے متعلق تجویز مہاتما جی نے پیش کی۔ دیش بندھو داس نے سراج گنج کی تجویز کو ہی ترمیم کی صورت میں پیش کیا۔ آخر مہاتما جی کی ہی تجویز منظور ہوگئی۔ مگر اس میں بھی جو اکثریت حاصل ہوئی وہ بہت قلیل تھی۔ اِس کا ایک خاص سبب یہ تھا کہ سراج گنج کی تجویز پر انگریزوں اور انگریزی اخباروں نے بہت ہو حق مچایا تھا۔ یہ بات بھی عام ہی سُنی جاتی تھی کہ اِس کے لئے دیش بندھو داس اور دوسرے لوگ بھی گرفتار کرلئے جائیں گے۔ دیش بندھو داس نے اسے ترمیم کی صورت میں پیش کرنے کا سبب بھی یہی بتایا کہ وہ اگر ایسا نہ کریں تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ اُنہوں نے گرفتاری کے خوف سے سراج گنج کی تجویز کو چھوڑ دیا۔ اب کانگریس کی تنظیم کے متعلق تجویزوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تو بائیکاٹوں کو کچھ سخت کردیا گیا اور دوسری طرف کونسل کے بائیکاٹ کو اور بھی ڈھیلا کردیا گیا۔

مہاتما جی سے کچھ لوگوں نے کہا تھا کہ کچہریوں کے بائیکاٹ سے فائدہ اُٹھا کر چند بے ایمان آدمیوں نے کانگریسیوں پر بڑا ستم کیا ہے۔ کیونکہ کانگریسی نہ تو کچہریوں میں اپنا دعویٰ پیش کرسکتے تھے اور نہ اپنے اوپر کئے گئے دعوے کا اپنے بیان کے سوا کوئی اور جواب دے سکتے تھے۔ اس لئے اُن لوگوں کا خیال تھا کہ اِس بارے میں ایسے کانگریسیوں کے دعوے کو محفوظ رکھنے کی کوئی تدبیر کرنی چاہئے۔ مہاتما جی رضامند بھی ہو گئے تھے کہ ایسے لوگوں کو عدالتوں میں اپنا بچاؤ کرنے کی چھوٹ دی جائے۔ خاص کر شری گنگا دھر راؤ دیش پانڈے کی بات پیش کی تھی جو ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ ایسے لوگوں کو مستثنیٰ کرنے کے لئے

مہاتما جی نے ایک تجویز پیش کی - اس پر ڈاکٹر چوئتھ رام گڈوانی نے سوال کر دیا کہ یہ تجویز کیا اصول کے خلاف نہیں ہے - مولانا محمد علی نے مہاتما جی کی رائے دریافت کی ، مہاتما جی نے بھی کہا کہ بائیکاٹ کے متعلق تجویزوں کے خلاف ضرور ہے - اِس پر مولانا محمد علی نے اُس کو خلاف ضابطہ قرار دے دیا اس کے بعد اجلاس کی کارروائی ختم ہوگئی - مگر جو کچھ اِس اِجلاس میں ہوا تھا اس سے مہاتما جی کے دِل پر بڑی چوٹ لگی - اُنہوں نے ایک بہت ہی پُر مغز تقریر کی - بولتے بولتے وہ یکایک رُک گئے - جلسہ پر سناٹا چھا گیا - گاندھی جی کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے - کچھ دیر میں اُنہوں نے خود کو سنبھال کر تقریر ختم کی - بڑی اُداسی اور مایوسی کی فضا چھا گئی - حاضرین نے اپنی تقریروں میں مہاتما جی کو تسلی دی اُنہوں نے یقین بھی دلایا کہ وہ اُن کے پیچھے پیچھے چلنے کو تیار ہیں - بہتیرے تو سرِ عام مہاتما جی کے ساتھ اور ان کے بعد بھی روتے رہے - اِس اُداس فضا میں جلسہ ختم ہوا -

مہاتما جی نے اِس جلسہ کے بارے میں بہت ہی پُرسوز مضامین لکھے - اکثریت ہونے پر بھی مہاتما جی نے جو اپنی تجویز کو بدلوا ڈالا تھا ، مُلک کے اخباروں نے اِس کی بہت تعریف کی - یہ سب ہوتے ہوئے بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کانگریس میں اختلاف رائے زیادہ اور سخت ہو جائے گا - یہ کوئی نئی بات نہیں تھی کیونکہ اِس کا کچھ پتہ تو چوری چورا کے حادثہ کے بعد ہی لگ گیا تھا - جب تقریباً سبھی لیڈروں نے جیل سے ہی گاندھی جی کے ستیہ گرہ ملتوی کر دینے کی بہت مخالفت کی تھی - یہی مظاہرہ ڈے کے قتل کے باب میں بھی ہوا - سرکار تو ہمیشہ ہی ایسے موقعوں کی ٹٹول میں رہتی تھی - اُس نے آپس کی اس پھوٹ سے فائدہ اُٹھانا چاہا - کچھ دنوں کے بعد بنگال میں بہت سے بھائی ، جن میں شری سبھاش چندر بوس بھی تھے گرفتار کر کے نظر بند کر دئے گئے - گاندھی جی اپنی طرف سے

جھگڑا نپٹانے کی کوشش میں برابر لگے ہوئے تھے۔ اِن واقعات کے بعد اُنہوں نے طے کر لیا کہ اب کسی نہ کسی طرح اس کو سلجھانا چاہیئے۔ اُنہوں نے احمد آباد میں ہی کہا تھا کہ اگرچہ مجھے اکثریت مل گئی ہے پھر بھی میں اِسے اپنی ہار سمجھتا ہوں۔ دونوں پارٹیوں کے ووٹوں میں اِتنا کم فرق کوئی چیز نہیں ہے اور میں مانتا ہوں کہ میں ہار گیا۔ اُسی وقت سے وہ راستہ ڈھونڈھنے لگ گئے۔ وہ صرف سوراج پارٹی کے ساتھ ہی مصالحت کرنا نہیں چاہتے تھے بلکہ اُن کی خواہش تھی کہ دوسرے طبقۂ خیال کے لوگ بھی جو ترکِ موالات کی وجہ سے کانگریس سے الگ ہو گئے ہیں پھر کانگریس میں آ جائیں۔

ڈاکٹر اینی بسنٹ اِن دِنوں سوراج کا مسودہ تیار کرا کے برٹش پارلیمنٹ کے سامنے پیش کرانے کی فکر میں تھیں ٹھیک اُسی زمانے میں مزدور پارٹی کے لوگ انگلستان کی پارلیمنٹ میں اکثریت حاصل کر کے وزارت بنا پائے تھے۔ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم ہوئے اُمید کی جاتی تھی کہ کرنل ویجوڈ جو کہ ہندوستان کے حمائتی سمجھے جاتے تھے وزیر ہند بنیں گے مگر ہندوستان میں انگریزوں (خاص کر سول سروس والوں) کی مخالفت کی وجہ سے وہ وزیر ہند نہیں بنائے گئے۔ لارڈ آلویر وزیر ہند ہوئے۔ پھر بھی کچھ لوگ مزدور دَل (لیبر پارٹی) کے لوگوں سے ہندوستان کے لئے کچھ سیاسی حقوق حاصل کرنے کی اُمید رکھتے تھے۔ مُلک کی حالت دیکھ کر خاص کر ہندو مسلم جھگڑوں کو نظر میں رکھتے ہوئے اور کانگریس کے اندر نیز مُلک میں باہمی اختلافات کی وجہ سے بڑھتی ہوئی بددلی کو دور کرنے کی شدید ضرورت کو محسوس کر کے گاندھی جی نے یہ رائے ظاہر کی کہ کانگریس کو چاہیئے کہ ترکِ موالات کو ملتوی کر دے تاکہ سب لوگوں کو اس میں آنے کا موقع مل جائے۔

مہاتما جی کی تجویزیں حسب ذیل تھیں

(۱) کانگریس بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ کو چھوڑ کر اور بائیکاٹوں کو ملتوی کر دے۔

(۲) کانگریس کپڑے کے بائیکاٹ کے علاوہ اور برٹش مال کے بائیکاٹ کو چھوڑ دے۔

(۳) کانگریس کھدر اور چرخے کی تبلیغ، ہندو مسلم اتحاد اور ہندوؤں میں اچھوت پن دُور کرنے کا ہی کام کرے۔

(۴) کانگریس موجودہ قومی درس گاہوں کو چلائے اور ضروریات کے مطابق نئے بھی کھولے۔

(۵) چار آنہ سال کی کانگریس ممبری اُٹھا دی جائے اور اس کی جگہ ایسا ضابطہ کر دیا جائے کہ وہی ممبر ہو سکے جو کم سے کم آدھ گھنٹہ روز چرخہ چلائے اور دو ہزار گز اپنے ہاتھ سے کتا ہوا سوت ہر مہینے کانگریس کو دیا کرے اور غریبی کی وجہ سے جو اس کے روئی نہ خرید سکتا ہو اُسے کانگریس کی طرف سے روئی دی جائے۔

اِس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ

(۱) کانگریس اور خاص کر غیر تبدیلی پسندوں کی طرف سے سوراج پارٹی کی مخالفت نہ کی جائے اور اُن کو اپنی تنظیم کا پورا موقع دیا جائے۔

(۲) دوسری پارٹیوں کے لوگ کانگریس میں شریک ہونے کے لئے مدعو کئے جائیں۔

(۳) غیر تبدیلی پسند لوگ داخلۂ کونسل کی مخالفت میں براہِ راست یا بالواسطہ طور پر پروپیگنڈا چھوڑ دیں۔ جو لوگ بائیکاٹ میں یقین نہیں کرتے اُنہیں آزادی دی

جائے کہ وہ چاہیں تو بائیکاٹ چھوڑ دیں۔ یعنی وکیل اگر چاہے تو وکالت کرے اور بائیکاٹ کو نہ ماننے والے بھی کانگریس میں شریک ہو سکیں اور عہدہ دار بھی ہو سکیں۔

مہاتما جی کی ان تجویزوں پر سب لوگ غور کرنے لگے۔ ڈاکٹر اینی بسنٹ نے تو ان کو ایک طرح پر منظور کر لیا۔ اُن کو کانگریس میں شریک ہونے کا راستہ کھلتا نظر آنے لگا۔

گاندھی جی کا اُپواس، اِتّحاد کانفرنس

یہ ذکر ایک طرف چل رہا تھا اور دوسری طرف سارے مُلک میں جا بجا ہندو مُسلم فساد ہو رہے تھے۔ بہار میں بھی بھاگل پور میں فساد ہو گیا۔ وہاں مجھے دوسرے بھائیوں کے ساتھ جانا پڑا۔ کئی دنوں تک وہاں رہ کر آپس میں میل جول کرانے کی کوشش میں لگا رہنا پڑا۔ اور جگہوں میں بھی فساد ہوئے۔ اِن باتوں کا اثر گاندھی جی کے دل پر بہت ہوا۔ دِلّی میں بھی زبردست فساد ہو گیا۔ خود گاندھی جی دِلّی آئے۔ کئی روز دِلّی میں ٹھہر کر گاندھی جی کسی اور کام سے بمبئی کی طرف چلے گئے۔ مملکتِ نظام میں گلبرگہ میں بھی زبردست فساد ہو گیا۔ گاندھی جی پھر دِلّی آئے۔ عین اسی زمانے میں سرحد کے شہر کوہاٹ میں بڑا بھاری بلوہ ہوا۔ بہت سے لوگ وہاں مارے گئے۔ بہت سا مال لوٹا گیا۔ بہتیرے مکان جلا دئے گئے۔ گاندھی جی ان واقعات سے بہت متفکّر اور پریشان تھے۔ آخر اُکتا کر انہوں نے

لہ اُپواس ترکِ غذا کو کہتے ہیں، جو تزکیہ نفس کے لئے ہو اس لئے یہ بھوک ہڑتال سے مختلف ہے۔ روزہ اور اُپواس میں یہ فرق ہے کہ روزہ صرف دن بھر کے لئے ہوتا ہے اور اُپواس مُسلسل بھی ہو سکتا ہے۔

ہندو مسلم ایکتا کے لئے اکیس[21] دن کا برت کرنے کا تہیہ کر لیا۔ انہوں نے دلّی میں یہ طے کیا جہاں وہ مولانا محمد علی کے یہاں ٹھہرے تھے۔ وہیں اُپواس بھی شروع کر دیا۔

مہاتما جی کے برت کی خبر چھپتے ہی سارے ملک میں بڑی تشویش پیدا ہو گئی۔ حال ہی میں وہ بڑی خطرناک بیماری سے اُٹھے تھے۔ سب لوگوں کو۔ خاص کر ڈاکٹر انصاری کو۔ جو اُن کی صحت کی حالت سے اچھّی طرح واقف تھے۔ بڑی فکر تھی۔ انہوں نے گاندھی جی کو اس ارادے سے باز رکھنے کی بڑی کوشش کی۔ اپنی محبّت اور اپنے ڈاکٹری فن دونوں کا مظاہرہ کیا۔ مگر گاندھی جی اپنے ارادہ پر قائم رہے۔ آخر وہ اتنے کامیاب ہوئے کہ انہوں نے گاندھی جی سے یہ منوا لیا کہ اگر اس برت کا نتیجہ اُن کی موت ہونا ہو تو وہ یہ اُپواس توڑ دیں گے۔ برت شروع ہوا۔ خبر پاتے ہی میں بھی دلّی پہنچ گیا۔ گاندھی جی کچھ دنوں کے بعد مولانا محمد علی کے گھر سے ہٹا کر شہر کے باہر رائے بہادر سلطان سنگھ کے ایک بنگلہ میں لے جا کر ٹھہرائے گئے۔ مسٹر اینڈریوز ان کی خدمت کے لئے آ گئے۔ ڈاکٹر انصاری بھی دن رات دیکھ بھال کرتے ہی رہتے

اِدھر لوگوں پر اس کا اثر پڑے بغیر نہ رہ سکا۔ مولانا محمد علی کی تحریک پر ایک سب فرقوں کی کانفرنس دلّی میں کی گئی، اُس میں ہندو مسلمان اور سکھ لیڈروں کے علاوہ عیسائی بھی شریک ہوئے۔ کلکتہ کے لارڈ بشپ ڈاکٹر ویسٹ کوٹ بھی آئے۔ کئی دنوں تک برابر بحث ہوتی رہی۔ جن جن باتوں کو لے کر جھگڑے ہو جایا کرتے تھے، اُن کے متعلّق تجویزیں منظور کی گئیں، خاص خاص تجویزیں یہ تھیں۔

(۱) مُلک میں پھیلے ہوئے جھگڑے فسادوں پر، جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہو رہے ہیں اور جن میں جان و مال کا بڑا نقصان ہوا ہے اور عبادت گاہوں کی بے حرمتی

ہوئی ہے، یہ کانفرنس افسوس ظاہر کرتی ہے اور انہیں بربریت سے پُر اور مذہب کے
خلاف سمجھتی ہے۔ اِس کانفرنس کی رائے میں کسی کا اپنے ہاتھوں میں بدلہ لینے اور سزا دینے کا
اختیار لے لینا صرف غیر قانونی ہی نہیں خلافِ مذہب بھی ہے۔ سب قسم کے جھگڑوں کا فیصلہ
پنچایت کے ذریعے کیا جانا چاہیئے۔ جہاں یہ ممکن نہ ہو وہاں کچہریوں کے ذریعے کرانا چاہیے۔

(۲) مندرجۂ بالا تجویز کو عمل میں لانے کے لئے اور آپس میں رواداری کا سلوک قائم رکھنے
کے لئے کانفرنس کی رائے میں یہ ضروری ہے کہ ہر شخص کو یہ پورا حق رہے کہ وہ جیسا چاہے
اپنا عقیدہ رکھے اور اُسے ظاہر کر سکے اور دوسروں کے جذبات کا لحاظ رکھتے ہوئے اور
اُن کے حقوق پر وار نہ کرتے ہوئے اپنے اپنے مذہبی کاموں کو ادا کر سکے، کوئی فرد یا جماعت
کسی دوسرے مذہب یا قابلِ احترام ہستیوں کو گالیاں نہ دے اور اصولوں کی تحقیر نہ
کرے۔ سبھی مذہبوں کی عبادت گاہیں پاک اور ناقابلِ دست اندازی سمجھی جائیں گی کسی
بھی حالت میں خواہ کتنا ہی اِشتعال کیوں نہ دیا گیا ہو بدلہ لینے کے لئے بھی کبھی اُن پر حملہ
نہ کیا جائے اور نہ انہیں ناپاک ہی کیا جائے۔ اگر کہیں اس قسم کا کام ہو تو اُس کی مذمّت
کی جائے اور سبھی لوگوں کا یہ فرض ہوگا کہ حتی المقدور وہ اس طرح کی کارروائی نہ ہونے دیں۔

(۳) ہندوؤں کو ایسی اُمید نہ کرنی چاہیئے کہ مسلمانوں سے ذبیحہ گاؤ کا حق زبردستی
یا کسی بورڈ کی تجویز سے یا قانون ساز انجمن کے ذریعے قانون بنا کر یا عدالت کے حکم سے
چھڑوایا جائے مگر اُسے اپنی رائے سے چھوڑ سکتے ہیں۔ اس لئے اِسے انہیں کی نیک فہمی
پر چھوڑ دے کر آپس میں میل جول بڑھانا چاہیئے۔ جس سے ایک دوسرے کی طرف نیک خیالی
بڑھے۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی مقامی رواج یا دونوں فرقوں کے درمیان کیا ہوا
باہمی سمجھوتہ بدل دیا جائے اور نہ اس کا یہی مطلب ہے کہ جہاں ذبیحۂ گاؤ نہیں ہوتا ہے

وہاں ہونے لگے۔ جہاں صورتِ حالات کے متعلق اختلاف رائے ہو۔ وہاں اس کی تحقیقات قومی پنچایت کرے گی۔ ذبیحہ بھی اِس طرح کیا جائے گا کہ ہندوؤں کے دل پر چوٹ نہ لگے۔

(۴) اِس کانفرنس کے مسلمان ممبر اپنے ہم مذہبوں سے اِصرار کرتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے ذبیحہ گاؤ کم کریں۔ مسلمانوں کو ایسی اُمید نہ کرنی چاہیئے کہ وہ مسجد کے نزدیک ہندوؤں کے باجے کو زور و زبردستی یا بورڈ کی تجویز سے یا قانون ساز انجمن کے ذریعے قانون بنوا کر یا عدالتوں کے حکم سے رُکوا سکیں گے۔ یہ ہندوؤں کی رائے سے ہی ہو سکتا ہے۔ یہ ہندوؤں کی نیک فہمی پر ہی چھوڑ دینا چاہیئے کہ وہ مسلمانوں کے جذبات کا احترام کریں۔ اِس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے گا کہ جہاں کہیں رواج ہو یا آپس کا سمجھوتہ ہو۔ وہ اِس تجویز سے رد ہو گیا اور نہ اِس کا یہ مطلب ہے کہ جہاں کسی مسجد کے سامنے باجہ نہ بجتا ہو، وہاں بجنے لگے گا صورتِ حالات کے بارے میں اگر اختلاف ہو تو اُس کی تحقیقات قومی پنچایت کرے گی۔ اِس کانفرنس کے ہندو ممبر ہندوؤں سے اصرار کرتے ہیں کہ وہ مسجدوں کے سامنے اِس انداز سے باجہ بجائیں گے وہاں جماعتی نماز میں خلل نہ پڑے۔

(۵) اِسی قسم کی تجویزیں آرتی اور نماز کے بارے میں بھی منظور کی گئیں۔

(۶) جہاں گوشت کی فروخت اور جانوروں کے مارے جانے کی اجازت ہے وہاں مارنے کے طریقے جھٹکے یا ذبیحے کی مخالفت نہیں کی جائے گی۔

(۷) ہر شخص کو اختیار ہے کہ وہ چاہے جس مذہب کو مانے اور جب چاہے تب اُسے بدل سکے، دھرم بدلنے کی وجہ سے وہ قابلِ تعزیر نہ سمجھا جائے گا، اور نہ اُس کو کسی قسم کی اذیّت پہنچائی جائے گی۔

(۸) ہر ایک فرد یا جماعت کا حق ہے کہ بحث کر کے وہ سمجھا بجھا کر دوسرے مذہب میں

چلا گیا ہو اُسے واپس لا سکے مگر زبردستی یا دھوکا دے کر یا کسی ناجائز طریقے سے مثلاً کسی چیز کا لالچ دے کر۔ کوئی کسی کا مذہب تبدیل نہ کرائے۔

(۹) تبدیلِ مذہب کے متعلّق کوئی پوشیدہ بات نہ ہونی چاہیئے۔ کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ دوسرے مذہب والوں کو اپنی جگہ میں عبادت گاہ بنانے سے روکے یا اس میں خلل ڈالے نئی عبادت گاہ دوسرے مذہب کی عبادت گاہ سے کچھ دُور بنائی جائے۔

(۱۰) پندرہ آدمیوں کی ایک مرکزی قومی پنچایت بنائی جائے اور اُسے حق دے جائیں کہ مختلف مذہبوں کے مقامی نمائندوں کی رائے سے وہاں کے لئے مقامی پنچائت قائم کرے جو اِس قسم کے سبھی جھگڑوں کو نبٹا دیا کرے۔ پنچائت کو اپنے قواعد و ضوابط بنانے کا بھی حق ہوگا۔ اِس پنچائت کے صدر مہاتما گاندھی جی اور ممبر ہوں گے:۔

حکیم اجمل خاں، مسٹر سی کے نریمان (پارسی) ڈاکٹر ایس۔ کے دَت (عیسائی) ماسٹر سندر سنگھ لائل پوری (سکھ)

باقی ممبروں کو وہی چُن لیں گے۔

اِس تجویز سے ملک کی فضا بہتر ہوتی نظر آئی۔ سبھی مذہبوں کے لوگ آپس میں خوش اخلاقی اور بھائی چارے کا سلوک کرنے کا فیصلہ کرتے نظر آنے لگے۔ اِتّحاد کانفرنس کا اثر بھی بہت اچھّا ہوا۔ اگر وہ مستقل ہو جاتا تو بڑی بات ہو جاتی مگر وہ مستقل نہ ہو سکا۔ اُس وقت کی اُمیدیں آگے چل کر پوری نہ ہوئیں۔ میں بھی کانفرنس میں شریک ہوتا رہا۔ میں ہر طرح سے اس کی کامیابی چاہتا تھا۔ مگر بہتر فضا اور نیک خواہشات کے باوجود، میرے دل میں ہمیشہ شک رہا۔ کیونکہ ساری باتوں کے پسِ پشت اتنا زبردست جذبۂ اتحاد نہیں تھا جتنا اِس نیک کوشش کے نتیجے کو مستقل بنانے کے لئے ضروری تھا۔ سبھی مذہب والے اپنے حق اور مطالبوں پر ہی

زیادہ زور دیتے رہے، اپنے فرائض پر اُتنا زور نہیں دیتے تھے۔ میں تو یہی مانتا ہوں، کہ اِس قسم کے جھگڑے اپنے اپنے فرائض پر ہی زور دینے سے سلجھ سکتے ہیں، مطالبوں اور حقوق پر زور دینے سے نہیں۔ مگر اُس وقت جو کچھ ہوا بظاہر اچھا ہی لگا اِس لئے یہ دِل کی بات دِل میں ہی رہی۔

اُدھر گاندھی جی کے برت کے دن گذرتے ہی چلے جاتے تھے۔ ڈاکٹر انصاری دن میں دو بار اُن کا قارورہ دیکھتے۔ ایک دن ایک حیرت انگیز واقعہ ہوا جو میں نے ڈاکٹر انصاری سے ہی سُنا۔ ایک دن پیشاب کی جانچ کرنے میں اُنہوں نے دیکھا کہ اِس میں اسٹیون کی مِقدار زیادہ ہے۔ یہ اچھی علامت نہیں۔ اگر اس کی مقدار اور بڑھ جائے تو آدمی بے ہوش ہو جاتا ہے اور پھر اُسے بچانا مشکل ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر انصاری فکر میں پڑ گئے۔ اُنہوں نے مہاتما گاندھی جی سے کہا کہ اب آپ خطرے کے قریب آ گئے ہیں اور ہو سکتا ہے کہ اکیس [21] دن پورے ہونے سے پہلے ہی آپ کو اپنے وعدے کے مطابق اُپواس توڑنا پڑے۔

اسٹیون کی مقدار اور بڑھتی گئی۔ ڈاکٹر انصاری نے طے کیا کہ اب زیادہ ٹھہرنا بہت خطرناک ہو گا۔ اُنہوں نے یہ بات مہاتما جی سے کہی۔ اِصرار بھی کیا کہ اب برت توڑ دینا چاہیئے۔ وہ ڈرتے تھے کہ چند گھنٹوں کے بعد بے ہوشی آ سکتی ہے۔ اُنہوں نے یہ سب کہہ کر کھانا کھلانے پر ضد کی۔ مہاتما جی نے کہا کہ آپ نے اپنے علم سے سب کچھ دیکھ لیا ہے، اور سب حساب لگا لیا ہے مگر رات بھر مجھے چھوڑ دیجئے۔ اِس پر ڈاکٹر صاحب راضی نہیں ہوتے تھے تب گاندھی جی نے کہا کہ "آپ نے اور سب حساب تو لگایا ہے مگر پرارتھنا (دُعا) کے اثر کا حساب تو لگایا ہی نہیں۔ آج مجھے چھوڑ دیجئے۔" ڈاکٹر صاحب مان گئے دوسرے دن پیشاب کی جانچ کر کے اُنہوں نے کہا کہ اسٹیون کا خطرہ اب نہیں ہے اور

کھلانے کا اِصرار چھوڑ دیا۔ اِس کے بعد اُپواس کی مدّت میں پھر کبھی اسٹیون کی شکایت نہیں ہوئی، ڈاکٹر انصاری کی فکر جاتی رہی، انہوں نے ہم لوگوں سے کہا کہ اس کرامات کا کوئی سبب ہماری ڈاکٹری نہیں بتاتی، ہم نہیں سمجھ سکتے یہ کیسے ہوا۔

مہاتما جی اُپواس کی پوری مدّت میں ہر روز اپنے معمول کے مطابق چرخہ چلاتے رہے۔ اُن کو کسی طرح چاروں طرف تکیہ رکھ کر بٹھا دیا جاتا، اُسی طرح بیٹھے بیٹھے وہ چرخہ کات لیتے۔ آخر میں جب اُپواس ختم کرنے کا وقت آیا تو پرارتھنا کر کے چرخہ چلا کر بھجن گا کر اور نارنگی کا رس پی کر اُنہوں نے اُپواس توڑا۔ مولانا محمد علی نے اِس موقعہ پر بوچڑ خانے سے ایک گائے خرید کر مہاتما جی کو نذر کی اس میں کتنی محبّت اور کتنی سعادت تھی۔

پٹنہ مینوسپلٹی میں

جس زمانے میں میں بابو ہری جی کے مقدمے میں پٹنہ میں کام کر رہا تھا اُسی زمانے میں پٹنہ مینوسپلٹی کے ممبروں کا چناؤ ہوا۔ کانگریس نے اگرچہ کونسلوں میں جانے کی ممانعت کی تھی پھر بھی مینوسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ میں جانا منع نہیں تھا۔ اِسی پالیسی کے مطابق سردار ولبھ بھائی پٹیل احمد آباد مینوسپلٹی میں منتخب ہو کر وہاں کے پریذیڈنٹ ہوئے پنڈت جواہر لال نہرو الہ آباد مینوسپلٹی کے چیرمین ہوئے۔ پٹنہ میں بھی رائے ہوئی کہ مینوسپلٹی کے انتخاب میں کانگریس کی طرف سے حصہ لیا جائے۔ پٹنہ کے خاص خاص کانگریسی کھڑے بھی ہوئے جیسے مولوی خورشید حسنین، شری انوگرہ نارائن سنگھ، شری جگت نارائن لال، شری بدری ناتھ ورما جناب عبد الباری اور میں۔ ہم لوگوں کی رائے تھی کہ مولوی خورشید حسنین چیرمین اور انوگرہ بابو وائس چیرمین بنائے جائیں۔ الیکشن میں دشواریاں بہت تھیں کیونکہ پٹنہ میں کچھ لوگ بہت دنوں سے مینوسپل کمشنر ہوتے چلے آئے تھے اُن کو ہٹانا کٹھن تھا۔ پھر بھی کانگریس کے بہت سے ممبر چُنے گئے اگرچہ اکثریت نہیں ہوئی۔ ساتھ ہی کانگریسی لوگ منظم تھے اور ایک پروگرام رکھتے تھے۔ دوسرے لوگ اِنفرادی حیثیت سے ہی چُنے گئے تھے۔ مولوی حسنین کے چُنے جانے

میں کافی دِقّت ہوئی کیونکہ اُن کے مقابلے میں ایک ہندو کھڑے تھے۔ اُنہوں نے ہندو مسلم سوال پیدا کر دیا۔ اپنے ووٹ کے بکس پر اُنہوں نے گائے کی تصویر بنا دی۔ یہاں تک سُنا گیا کہ ایک بچھیا لے کر دروازے دروازے جاتے اور ہندوؤں سے بچھیا کے نام پر ووٹ مانگتے۔ ہم لوگ فکرمند تھے کہ مولوی خورشید حسنین جیسا چست کانگریسی اگر نہ چُنا جائے گا تو ہمارے لئے بڑے شرم کی بات ہوگی۔ ہم لوگوں نے بھی کافی زور لگایا۔ آخر وہ خاصی اکثریت سے چُنے گئے۔

یہ سب جھگڑا دیکھ کر مولانا خورشید حسنین نے طے کیا کہ وہ چیرمینی کے لئے اُمیدوار نہیں ہوں گے۔ مجھے ہی چیرمین ہونا چاہیئے۔ میری خواہش بالکل نہیں تھی۔ میرے پاس وقت بھی نہیں تھا۔ کیونکہ اُن دِنوں میں ایک بڑے مقدّمے میں کام کر رہا تھا۔ مگر وہ کسی طرح رضامند نہ ہوئے۔ مجھے چیرمینی منظور کرنی پڑی۔ انوگرہ بابو بھی اُسی بڑے مقدّمے میں دوسری طرف سے کام کر رہے تھے۔ وہ وائس چیرمین ہوئے۔ اِس انتخاب کا نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ بھائی جو کانگریس کے حامی سمجھے جاتے تھے اور جن سے ہم مدد کی اُمید رکھتے تھے ہمارے کٹر مخالف ہو گئے اُن لوگوں نے مینوسپلٹی کے اندر ایک مخالف پارٹی بنا لی کوئی بھی بات پیش ہو اس کی مخالفت اس پارٹی کا۔ خاص کر دو تین بھائیوں کا۔ خاص کام تھا۔ مینوسپلٹی کے اجلاس میں بہت وقت لگتا۔ اور کام کچھ بھی آگے نہ بڑھتا یہاں تک کہ کسی دن پچھلی نشست کی کارروائی کی رپورٹ منظور کرنے میں ہی تین چار گھنٹے لگ جاتے۔

خیر، ہم لوگوں نے کام شروع کیا۔ مقدّمے سے فرصت ہو جانے کے بعد ہم دونوں نے پورا وقت دینا شروع کیا۔ ہم دونوں مینوسپلٹی کے کام سے ناواقف تھے۔ ہم دونوں کو یہ کام کرنے کا پہلا ہی موقع ملا تھا مگر ہم نے جلد ہی سب باتوں کو جان لینے کی کوشش کی اور

کام چلنے لگا۔ اسی زمانے میں گیا کے ڈسٹرکٹ بورڈ کا بھی انتخاب ہوا۔ وہاں کے لوگوں نے انوگرہ بابو کو صرف بورڈ کا ممبر ہی نہیں بلکہ چیرمین بھی چُن لیا۔ دونوں جگہوں کا کام سنبھالنا مشکل تھا۔ اِس لئے کچھ دنوں کے بعد انوگرہ بابو نے پٹنہ کی مینوسپلٹی کی وائس چیرمینی سے استعفیٰ دے دیا۔ اب وہ گیا کا کام ہی سنبھالنے لگے۔ پٹنہ میں میرے ساتھ وائس چیرمین ہوئے مسٹر سید محمد جو کانگریس کے ٹکٹ پر تو نہیں چُنے گئے تھے۔ مگر ہم لوگوں کو بہت ہی مستعد اور اچھے ممبر معلوم ہوئے اُنہوں نے مینوسپلٹی میں کام بھی اچھا کیا۔

مینوسپلٹی کی دِقتیں بہت تھیں۔ آمدنی کم تھی، خرچ زیادہ تھا، کوئی بھی کام بغیر خرچ کے نہیں ہو سکتا۔ نئے ٹیکس کے بغیر آمدنی بڑھ نہیں سکتی تھی۔ اِس زمانے میں سر گنیش دت سنگھ حکومتِ بہار کے وزیر تھے۔ اُنہوں نے بھی ہم لوگوں کو وہاں اچھا انتظام کرنے کا حوصلہ دلایا۔ رانچی جا کر میں نے اُن سے مینوسپلٹی کے بارے میں رائے لی۔ جب میں رانچی میں اُن کے ساتھ ٹھہرا تھا اسی وقت تار ملا کہ بابو ہری جی ہائی کورٹ میں اپیل کا مقدمہ جیت گئے۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ اِس طرح مینوسپلٹی کا کام میں جی لگا کر کرتا رہا۔ روزانہ تقریباً تین چار گھنٹے دفتر میں کام کرتا۔ دو تین گھنٹے شہر میں گھوم پھر کر محلوں کی حالت دیکھتا اور کام کی نگرانی بھی ہو جاتی۔

شہر کی لمبائی کی وجہ سے نگرانی کے علاوہ اور کاموں میں بھی رکاوٹ آتی جس کا اندازہ آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ پٹنہ کوئی نیا بسا ہوا شہر نہیں ہے۔ وہاں بیوپار خاص کر مقامی کام کے لئے ہی ہے۔ پہلے جب دریاؤں کے ذریعے ہی مال کی درآمد برآمد ہوا کرتی تھی، پٹنہ خاص اہمیت رکھتا تھا، کیونکہ یہاں گنگا بہتی ہے۔ گنگا، گنڈک سنگم تو یہاں ہے ہی، سون، بھدّر اور سرجو کا بھی سنگم یہاں سے بیس پچیس میل کے اندر ہی ہے۔ ریل آ جانے سے اب یہ بات

نہ رہی۔ اِس لئے اب یہ تجارت کا مرکز بھی نہیں رہا اور نئے کل کارخانے بھی کم ہی ہیں۔ ابھی تک اُن میں کوئی خاص اضافہ نہیں ہوا ہے بلکہ ۱۹۲۶ء میں تو وہ اور بھی کم تھے۔ یہاں صوبائی سیاسی مرکز ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ سرکاری دفتروں میں اور کچھ وکیل بیرسٹر ہائی کورٹ سے تعلق رکھنے والے۔ ضرور رہتے ہیں۔ اس لئے جہاں یہ سب رہتے ہیں، وہاں مغربی حصہ میں کچھ رونق ہے۔ مشرقی حصہ پرانا محلّہ ہے جو اپنی رونق اب بہت کچھ کھو چکا ہے۔ اِس لئے شہر کی مینوسپلٹی کی آمدنی کچھ زیادہ نہیں ہے۔

نئے زمانے کے وسیلوں کا بھی یہاں تقریباً فقدان ہی تھا۔ کُھلے پرنالے ہونے کی وجہ سے مچھروں کی بھرمار ہے۔ نالے بھی صاف نہیں رکھے جا سکتے، کیونکہ پانی کا کوئی اچھا نکاس نہیں ہے۔ پہلے یہاں ہر گھر میں کنوئیں کی شکل میں پاخانے ہوا کرتے تھے جو کبھی صاف نہیں کئے جاتے تھے۔ جب وہ بہت دنوں کے بعد کبھی پَٹ جاتے ہوں گے تو اُن کی بغل میں دوسرے کنوئیں بنا لئے جاتے ہوں گے۔ اِس وجہ سے شہر کی صحت بہت خراب رہا کرتی تھی۔ ہم لوگوں کے وقت سے پہلے ہی مینوسپلٹی نے اِن چاہ نما پاخانوں کو بند کرا دیا تھا پھر بھی وہ جا بجا رہ گئے تھے۔ اِن کو ہم نے بند کرایا۔ تقریباً ایسے کنوئیں کے پاس ہی ہر گھر میں پانی کے کنوئیں بھی ہوا کرتے تھے۔ پانی تقریباً سبھی جگہوں میں کھاری ہوا کرتا تھا۔ کہیں کہیں میٹھا پانی بھی مل جاتا تھا۔ اِس لئے لوگ پینے کے لئے زیادہ تر گنگا جل ہی کام میں لیا کرتے تھے۔ برسات میں گنگا جل بھی گدلا ہو جایا کرتا ہے۔ سب لوگوں کی دِقّت بڑھ جاتی تھی۔ اِس لئے لوگ یہاں واٹر ورکس کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ ہمارے یہاں بھی واٹر ورکس اور بند نالوں کی بات چلی تھی۔ خرچ کا بجٹ بھی بنا تھا۔ مگر معاملہ روپئے کی کمی وجہ سے جہاں کا تہاں پڑا رہ گیا۔

ہم نے اِن سب چیزوں کی طرف توجہ دی اور خرچ کا اندازہ لگانے لگے۔ یکبارگی اِن سارے کاموں کے لئے صوبائی حکومت کی مدد مانگی جا سکتی تھی۔ شاید کچھ مل بھی جاتی۔ مگر ان کے چلانے اور قائم رکھنے کے لئے تو مینوسپلٹی کو ہی خرچ دینا پڑتا۔ اُس کے پاس اِس کے لئے بغیر نیا ٹیکس لگائے رقم نہیں ہو سکتی تھی۔ لوگوں کو خالص اور اچھا دُودھ مِلنا بھی دشوار تھا۔ ہم نے اس پر بھی غور کیا کہ مینوسپلٹی کی طرف سے گئو شالہ قائم کی جائے جو مناسب قیمت پر لوگوں کو خالص دودھ دے سکے۔ مگر یہ سب کچھ روپیوں پر ہی منحصر تھا۔ اِس لئے ہم نے آمدنی بڑھانے کی راہیں تلاش کرنی شروع کیں۔ اُتر پردیش میں مینوسپلٹیوں، کو شہر میں آنے والے مال پر چنگی لگانے سے بڑی آمدنی ہوتی ہے۔ ہم نے پٹنہ شہر میں بھی چنگی لگانے کی بات سوچی، ہم نے یہ بھی اندازہ لگایا کہ چنگی سے کتنی آمدنی بڑھے گی۔ اِس طرح کی تجویز کو پہلے مینوسپلٹی سے منظور کرانا ہوتا اور پھر صوبائی حکومت سے جب مینوسپلٹی منظور کر لیتی تب، بات آگے بڑھتی۔

مینوسپلٹی میں رشوت خوری بھی خوب چلتی تھی۔ جو خرچ ہوتا تھا اُس کا بھی پورا فائدہ عوام کو حاصل نہیں ہوتا تھا۔ ہم نے اس کو روکنے کی کوشش کی نتیجہ یہ ہوا کہ مینوسپل ملازمین ہم سے دل ہی دل میں بگڑ گئے۔ اگرچہ وہ بظاہر کچھ نہیں کر سکتے تھے۔ کچھ مینوسپل کمشنر بھی اِس معاملہ میں ملازمین کے ساتھ تھے اور ان سے ہمدردی رکھتے تھے، ہماری کوششیں انہیں بھی ناپسند تھیں۔ وہ اِس پارٹی میں بڑے جوش سے شریک ہو گئے جو ہماری مخالفت کے لئے بنی تھی۔ وہ ہر موقع پر مخالفت ہی مخالفت کیا کرتے تھے۔ پھر بھی سب پہلو سوچ بچار کر ہم نے چُنگی کی بات اُٹھالی اور اُسے پیش کیا۔ مینوسپلٹی کے بیشتر ممبروں نے مخالفت کی۔ تجویز نامنظور ہو گئی۔ اِن لوگوں کا کہنا تھا کہ وہ ان سبھی سہولتوں سے جو ہم انہیں دینا چاہتے تھے اور جن کا ذکر اُوپر کیا گیا ہے، چاہے محروم رہ جائیں مگر کسی طرح کے نئے ٹیکس کو منظور

نہیں کریں گے۔ ہم نے دیکھا کہ شہر کی صفائی، سڑک کی درستی اور تعلیم کے متعلق کوئی بھی اصلاح ہمارے لئے نہ ہو پائے گی۔ بہت وقت لگا کر اور کافی محنت کر کے ہم کوئی بھی بات پیش کرتے تو مخالف پارٹی اُس کی مخالفت کرتی۔ اِس طرح کوئی بھی اچھا کام کرنا دشوار ہو گیا۔ اِس لئے بارہ، چودہ مہینے تک ہم نے وہاں رہ کر استعفیٰ دے دیا۔

ہمارے زمانے میں ایک بات ہو گئی۔ بجلی گھر قائم ہو گیا۔ میونسپلٹی کو اُس میں کچھ اور نہیں کرنا تھا۔ صرف پرانی بتیوں کی جگہ سڑکوں پر بجلی کی بتی لگا دینے کی بات تھی۔ کسی طرح لوگوں نے منظور کر لیا۔ ہمارے زمانے میں ہی بجلی کی کمپنی سے بات طے ہو گئی۔ ہمارے ہٹنے کے کچھ ہی دنوں بعد بجلی کی بتیاں جلنے لگیں۔ دوسری بات یہ ہوئی ہم نے میونسپلٹی کے مہتروں کی حالت سُدھارنے کی تھوڑی کوشش کی۔ ایک آدمی اُن کے محلے میں جا کر اُن سے ملتا۔ اُن کے گھروں اور بچّوں کو صاف رکھنے کی باتیں اُن سے کرتا۔ ہفتہ میں ایک دن کیرتن کا بھی انتظام کرتا۔ اِس موقع پر کچھ مٹھائی پرشاد کے طور پر بانٹی جاتی۔

ایک تیسرا کام اور بھی کیا گیا ہم نے دیکھا کہ اُن لوگوں کے پاس روپئے تو آتے ہی ہیں، مگر صرف بے جا ہوتا ہے۔ اِس لئے اُن کی حالت بہت بُری تھی۔ مہتر کی تنخواہ دس بارہ روپئے مہینہ تھی۔ عورتوں کی تنخواہ مردوں سے دو روپئے کم۔ چھوٹے لڑکوں کو پانچ روپئے مہینہ ملتا، اس طرح ایک گھر میں اگر ایک مرد ایک عورت اور دس بارہ برس کے دو بچّے ہوتے تو اُن کی ماہانہ آمدنی مجموعی طور پر تقریباً تیس روپئے ہو جائی جو کسی بھی سرکاری دفتر کے کلرک کی تنخواہ تھی، مگر جب ہم دیکھتے کہ اُن کو تو صاف سُتھرے کپڑے اور جوتے پہن کر کچہری یا دفتر جانا پڑتا اور گھر کی عورتیں یا بچّے کچھ نہیں کما سکتے بلکہ کلرک کی آمدنی پر ہی انحصار کرتے تو ظاہر تھا کہ مہتر کا خاندان اس آمدنی کے لحاظ سے زیادہ کماؤ تھا۔ ساتھ ہی مہتر کو اُن

گھروں میں جہاں وہ کام کرتا ہے مینوسپلٹی کی تنخواہ کے علاوہ کچھ نہ کچھ مل ہی جاتا ہے تقریب، تیوہار کے موقع پر بھی کچھ نہ کچھ آمدنی ہو ہی جاتی ہے۔ پھر بھی اُن کی حالت اتنی خراب کیوں رہتی ہے۔ ہم نے اس کی دو وجہیں دیکھیں، ایک تو شراب خوری اور دوسرے قرض پر سود۔ جس دن تنخواہ بٹتی، اُس دن اُن کا مہاجن وہاں حاضر رہتا۔ جو تنخواہ اُنہیں ملتی مہاجن ہی لے لیتا۔ اُسی روپئے کو وہ اپنے پُرانے قرض اور سود میں لگا لیتا۔ اُسی دن سے پھر قرض لے کر ہی مہتر اپنا کام چلا سکتا۔ قرض کا سود بھی بہت دینا پڑتا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ کبھی قرض سے بری نہ ہو پاتا۔ ہر مہینے میں ایک اچھی رقم سود میں چلی جاتی۔

ہم نے اِس مالی عذاب سے اُن کو بچانا چاہا۔ دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ تنخواہ تو مہینے میں ایک بار ملتی ہے اور وہ مہینے میں کئی بار کر کے قرض لیتے ہیں جسے مہینے کے آخر میں سود کے ساتھ ادا کرنا پڑتا ہے۔ ہم نے چاہا کہ وہ قرض لینا بند کریں۔ مگر وہ اِس پر رضامند نہیں ہوئے۔ ہم نے تقسیم تنخواہ کی جگہ مہاجنوں کو آنے سے روکنا چاہا تو مہتر بگڑ کر ہڑتال کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ ہم نے سارے قرض ادا کرنے کا وعدہ کیا اور سمجھایا کہ مہاجن سے قرض نہ لینے سے اُن کی بہت بچت ہو گی۔ مگر وہ یہ بھی جلد سمجھنے کو تیار نہ تھے۔ ہم نے مہینے کے آخر کے بدلے بیچ میں پندرھویں دن تنخواہ بانٹنے کا انتظام کر دیا یہ بھی کہہ دیا کہ جب ضرورت ہو گی اس شرط پر پیشگی تنخواہ مل سکے گی اور تنخواہ ملنے کے دن پیشگی دی ہوئی رقم کاٹ لی جائے گی۔ بہت محنت کرنے پر یہ بات اُن کی سمجھ میں آئی اور وہ رضامند ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ کچھ دنوں کے بعد جب اُنہوں نے اِس انتظام میں فائدہ دیکھا تو بہت خوش ہوئے۔ معلوم نہیں ہم لوگوں کے ہٹ جانے کے بعد یہ طریقہ جاری رہا یا نہیں، مینوسپلٹی سے ہٹنے کے بعد اسی ایک بات کا افسوس رہا کہ ہریجنوں کی تھوڑی بہت خدمت شاید

کی جاسکتی جو نہ کی جاسکی۔

جس زمانے میں ہم لوگ پٹنہ میونسپلٹی میں کام کر رہے تھے تقریباً اُسی زمانے میں کئی اور ضلعوں کے ڈسٹرکٹ بورڈ اور میونسپلٹی میں بھی کانگریسی لوگ منتخب ہوئے۔ پہلے کہا جاچکا ہے کہ گیا کے ڈسٹرکٹ بورڈ میں انوگرہ بابو چیرمین ہوئے تھے۔ مُنگیر ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین شاہ محمد زبیر اور وائس چیرمین شری شری کرشن سنہا۔ چھپرا ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین جناب مظہرالحق صاحب چمپارن میں پہلے بیتیا میونسپلٹی اور بعد میں چمپارن ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین شری بپن بہاری ورما۔ مظفرپور میونسپلٹی کے چیرمین شری بندیشوری پرشاد ورما، اور وہاں کے ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین شری رام دیال سنگھ ہوئے۔ بھاگل پور ڈسٹرک بورڈ کے چیرمین شری کیلاش بہاری لال ہوئے۔ دربھنگہ کے چیرمین بابو ہری نندن داس اور وائس چیرمین مسٹر محمد شفیع بیرسٹر ہوئے۔ چھوٹا ناگپور کے ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین وہاں کے ڈپٹی کمشنر ہوسکتے تھے اور وائس چیرمین غیر سرکاری آدمی۔ اس لئے وہاں مان بھوم میں شری جی۔بی۔سین اور ہزاری باغ میں شری رام نرائن سنگھ وائس چیرمین ہوئے۔ اِس طرح ہمارے صوبے میں مختلف مقامات پر مقامی بورڈوں میں کانگرِیسی لوگوں کے ہاتھوں میں اختیارات آئے۔ اور وہ کام کرنے لگے۔ جس طرح کی دِقّت پٹنہ میں تھی، ویسی اور جگہوں میں نہیں تھی صرف چھوٹا ناگپور میں چیرمین اور وائس چیرمین کے درمیان معرکہ آرائی ہوتی رہتی تھی۔ ہمارے آدمیوں نے تقریباً سبھی جگہوں میں کام اچھّا کیا۔ لوگوں پر بھی اثر اچھّا ہی پڑا، مگر میں اس کام سے مطمئن نہیں تھا۔

الکشن ہونے سے پہلے ہی کانگریسی لوگوں میں اُمیدوار بننے کے بارے میں آپس میں بڑی رقابت ہونے لگی۔ کچھ لوگ اُمیدوار نہ بنائے جانے پر ملول ہوتے، کچھ لوگ سمجھنے لگے

ہم نے ملک کی خدمت کی ہے، اِن بورڈوں میں جگہ ملنا ایک طرح پر اِسی خدمت کا صلہ ہے اپنا دعویٰ مضبوط کرنے کے لیے وہ اپنی خدمات کی فہرست پیش کرتے۔ اِس سے میرے دل پر یہ اثر پڑا، کہ ابھی تو ایک بہت چھوٹی بات ہمارے سامنے آئی ہے اور اِتنے میں ہی لوگ اُمیدوار بننے کے لیے اپنی اپنی خدمات کی فہرست تیار کر رہے ہیں تو آگے چل کر نہ معلوم کیا ہوگا۔ میں نے کچھ دِنوں کے تجربے کے بعد ایک مضمون ماڈرن ریویو کلکتہ میں لکھا، اُس میں اپنا نام نہیں دیا تھا مگر اس میں اُس زمانے کے اپنے خیالات کو ظاہر کر دیا تھا۔ بہت جگہوں میں اچھا کام ہونے پر بھی آپس میں کچھ اَن بَن ہوگئی۔ اِس بارے میں منگیر کا ضلع بورڈ بالکل اچھوتا رہا۔ وہاں کبھی آپس میں ایسی رقابت دیکھنے میں نہ آئی جیسی اور جگہوں میں تھی۔ اِس کا سہرا وہاں کے کارکنوں اور لیڈروں کے سر رہا۔ اگرچہ میرا اپنا خیال اِن بورڈوں میں شریک ہونے کے خلاف ہوگیا، پھر بھی سبھی اور ساتھیوں کے خیالات مختلف تھے۔ لہٰذا میں نے اپنے خیالات کو دبا رکھا۔ میں ہمیشہ کانگریسی لوگوں کو الکشن میں حصّہ لینے دیتا رہا حتی الوسع اُن کی مدد بھی کرتا رہا۔

جس زمانے میں ہم لوگ میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈ میں کام کر رہے تھے حکومتِ بہار نے ایک بل پیش کیا۔ اُس کا مقصد یہ تھا کہ اُن بورڈوں کے حساب کی جانچ کرنے والے سرکاری آڈیٹر کو اختیار ہوگا کہ وہ اِس بات کا فیصلہ کر سکے کہ کوئی خرچ جو بورڈ نے یا بورڈ کے کسی عہدہ دار نے کیا ہے غیر قانونی ہے اور اگر وہ مناسب سمجھے تو ایسے خرچ کی رقم اِس عہدے دار سے یا اُن ممبروں سے جنہوں نے اس خرچ کی منظوری دی ہو وصول کرنے کا فیصلہ کرے۔ ۱۹۲۳ء میں میونسپلٹی اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کے قانون ترمیم ہوئے تھے۔ اور بدلے گئے تھے۔ اِن بورڈوں کو اپنا چیرمین منتخب کرنے کا اختیار ملا تھا۔ اور دوسرے

طریقوں سے بھی عوام کے نمائندوں کو کچھ اور اختیار ملے تھے۔ اِس نئے بِل کا مقصد یہ تھا کہ جو نئے اختیار دئے گئے ہیں وہ دوسرے طریقے پر کم کر دئے جائیں، سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اڈیٹر کو قانونی باتوں پر فیصلہ دینے کا حق دے دیا گیا۔ لہٰذا ہمارے صوبے کے بورڈوں کے نئے چُنے ہوئے ممبروں کو یہ باتیں بہت کھٹکیں۔ دوسرے لوگوں کو بھی پسند نہ آئیں۔ بورڈوں اور عوام کی طرف سے اس کی زوردار مخالفت ہونے لگی۔

اِسی سلسلہ میں اس پر اور بورڈ کے متعلّق اور معاملوں پر غور کرنے کے لئے بورڈوں کے نمایندوں کی ایک کانفرنس کرنے کی رائے ٹھہری۔ کانفرنس پٹنہ میں کی گئی۔ مولانا مظہر الحق صاحب جو سارن کے ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین تھے اس کے صدر ہونے کو تھے۔ مُنگیر ڈسٹرکٹ بورڈ کے چیرمین شارہ زبیر نے اِس کا اِفتتاح کیا۔ مظہر الحق صاحب کے یکایک بیمار ہو جانے کے سبب سے مجھے ہی اِس کا صدر بننا پڑا۔ سارے صوبے کے تقریباً سبھی خاص خاص ڈسٹرکٹ بورڈوں اور میونسپلٹیوں کے نمایندے اِس میں شریک ہوئے۔ اتفاق رائے سے اِس آڈٹ بل کی مذمّت کی گئی۔ بورڈوں کے متعلق دوسرے معاملوں پر بھی غور کیا گیا۔ ایک معاملہ جو اُن دِنوں بڑی اہمیت کا ہو گیا تھا، یہ تھا ڈسٹرکٹ بورڈوں کے انجینیر اِن بورڈوں کے نوکر نہ رہ کر صوبائی حکومت کے نوکر ہوں۔ اِس کی بھی مخالفت کی گئی۔ تعلیم کے مسئلہ پر بھی غور ہوا۔ کہا گیا کہ درسی کتابوں کے انتخاب کے لئے جو کمیٹی ہے اس کی نئی تنظیم ہو اور اُس میں بورڈوں کے نمایندوں کو بھی جگہ ،، نئے، کانفرنس کنے ایک چھوٹی سٹینڈنگ کمیٹی قائم کر دی اور اِس قسم کی کانفرنس کی ضر ورت محسوس کر کے آیندہ ملنے کا بھی فیصلہ کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ بورڈوں سے ہمارے ہٹ جانے کے بعد بھی یہ کانفرنس وقتاً فوقتاً ہوتی رہی اور بورڈوں کے متعلّق اُمور پر غور کرتی رہی۔

ایک افسوس ناک واقعہ اِن بورڈوں کے الکشن کے سلسلہ میں اور بھی ہوا جس کا اثر بہت بُرا پڑا۔ ۱۹۲۲ء میں ہی ہندو مسلم فساد جا بجا شروع ہو گئے تھے۔ اکثر بلوے کی خبر کسی نہ کسی جگہ سے آتی ہی رہتی تھی۔ ہم لوگ بہت بے چین رہا کرتے تھے۔ اپنے صوبے میں جھگڑا فساد نہ ہونے دینے کی کوشش میں ہم برابر لگے رہتے تھے۔ مگر یہاں بھی کئی جگہوں میں فسادات ہو ہی گئے۔ یہ بلوے اِتنے بڑھ گئے تھے اور اِتنے مقامات پر ہوتے رہے کہ اُن کا اثر پڑے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ شدھی اور تبلیغ سنگٹھن اور تنظیم کے پرچار نے لوگوں میں اِس ہندو مسلم کش مکش کو اور بھی بڑھا دیا۔ آپس کی اَن بن بڑھتی ہی گئی۔ جہاں بلوہ نہیں بھی ہوا وہاں بھی بد قسمتی سے باہمی اعتماد نہ رہا۔ اُدھر خلافت کا معاملہ جب ترکی سے خلیفہ ہٹا دیے گئے تو ایک طریقہ سے قدرتاً کچھ ڈھیلا پڑ گیا۔ بہت سے مسلمان جو کانگریس میں خلافت کی وجہ سے ہی شریک ہوئے تھے رفتہ رفتہ الگ ہونے لگے۔ یہ صاف نظر آنے لگا کہ ۲۲-۱۹۲۱ء کی طرح سبھی باتوں میں وہ ایک رائے کے نہیں رہ سکتے عوام پر بلووں کا خاص اثر پڑتا تھا۔ بہار جیسے ہندو اکثریت کے صوبے میں مسلمانوں کے انتخاب میں دِقّت پڑنے لگی۔

پٹنہ مینوسپلٹی میں مولوی خورشید حسنین کے چناؤ کی دِقّتوں کا ذکر اوپر کر چکا ہوں ہم لوگوں نے خوب زور لگایا مولوی صاحب کو کچھ کرنے نہ دیا۔ وہ زبردست اکثریت سے چُنے گئے۔ اِسی طرح چھپرا میں مظہر الحق صاحب کی خدمت قربانی اور شخصیت کا بہت اثر تھا۔ پھر بھی کچھ لوگوں نے دِقّت پیدا کرنے کے جتن کئے۔ مگر وہاں میرے بھائی صاحب کی بہت دھاک تھی۔ اُنھوں نے وہاں جو دِقّتیں پیش آئیں اُنہیں دبا لیا۔ حق صاحب آسانی سے منتخب ہو گئے۔ منگیر کے زبیر صاحب کو لوگ بہت مانتے تھے۔ وہاں کوئی دِقّت پیش

نہ آئی۔ مظفرپور میں مولوی محمد شفیع کی خدمات اور قربانیاں کسی سے کم نہ تھیں، مگر کانگریسی لوگوں میں اتنا اتحاد نہیں تھا، عوام پر وہ اپنا اتنا اچھا اثر نہ ڈال سکے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی شفیع ہار گئے۔ ہم سب کو اِس کا بہت افسوس ہوا۔ مگر ہم لاچار ہو گئے۔ مولوی شفیع صاحب کے دِل پر اس کا اثر پڑا، مگر اُس وقت اُنھوں نے اپنے جذبات کو دبا رکھا اور کام کرتے رہے مگر اِس کا بڑا اثر بعد میں نظر آیا جب اُنھوں نے کانگریس چھوڑ کر ایک مسلم انجمن قائم کرنے میں اپنا وقت لگانا شروع کیا۔ یہ کچھ دِنوں کے بعد ہوا، مگر اس کی بنیاد ڈسٹرکٹ بورڈ کے انتخاب میں ہار سے ہی پڑ گئی تھی۔

اگرچہ اِن چناؤوں میں حتی الوسع مسلمانوں کو منتخب کرانے کی کوشش کی گئی اور وہ اچھی تعداد میں منتخب بھی ہوئے پھر بھی بہار کے مسلمانوں نے محسوس کیا کہ وہ کافی تعداد میں نہیں چُنے گئے ہیں۔ ایسے معاملوں میں اِعتماد بڑی چیز ہوتی ہے۔ اعتماد بلاوجہ بھی کم زور پڑ سکتا ہے۔ اِن سطروں کے لکھتے وقت میرے سامنے اِن چناؤں کے نتیجوں کے اعداد تو نہیں ہیں، مگر میں سمجھتا ہوں کہ مسلمانوں کے ساتھ کوئی بے انصافی نہیں ہوئی تھی۔ ہاں جابجا کہیں کم بیش چُنے گئے ہوں یا خاص افراد نہ چُنے گئے ہوں۔ مگر سارے صوبے پر نظر ڈالنے سے معلوم ہو گا کہ اُس وقت کانگریسی لوگوں نے اُن کو منتخب کرانے میں حتی المقدور خوب محنت کی اور وہ کامیاب بھی ہوئے مگر بہتیرے مسلمانوں کا اعتماد کم ہو گیا۔ جس کا بُرا اثر بعد میں کچھ زمانہ گذرنے پر دیکھنے میں آیا۔

بنگال میں جبر حکومت، بلگاؤں کانگریس

گاندھی جی کا برت ختم ہونے کے بعد اُن کا کچھ وقت حصولِ صحت میں لگا۔ وہ کوہاٹ جانے کے لئے بے چین تھے۔ مگر حکومت نے وہاں جانے کی اجازت نہیں دی، اِسی زمانے میں حکومت نے ایک اور چکر چلایا، اُس نے ایک نیا آرڈیننس یہ کہہ کر جاری کیا کہ بنگال میں دہشت انگیز لوگ پھر مصروفِ سازش ہیں اور جابجا اُن کے ذریعے قتل ہو رہے ہیں ڈے کے قتل اور چند دوسرے واقعات کا حوالہ دیتے ہوئے اِس کی ضرورت بتائی گئی۔ ساتھ ہی شری سبھاش چندر بوس اور بہت سے دوسرے کارکن ایک دن بنگال میں گرفتار کر لئے گئے۔ اگرچہ اس کی افواہ پہلے سے تھی کہ دیش بندھو داس بھی گرفتار کئے جائیں گے پھر بھی وہ پکڑے نہیں گئے۔ اِس آرڈیننس اور اِن گرفتاریوں سے سارے مُلک میں سنسنی پھیل گئی سب لوگ برہم ہو اُٹھے۔ نرم دل والے (اِعتدال پسند یا ماڈریٹ) بھی کافی ناراض ہوئے۔ سوراج پارٹی کے لوگوں کے خیال میں تو یہ آرڈیننس خاص کر اُن پر ہی نافذ کرنے کے لئے بنایا گیا تھا۔ کیونکہ اُنھوں نے بنگال اور مدھیہ پردیش میں وزارت توڑ ڈالی تھی اور وہاں نئی اصلاحات ایک طرح پر بے عمل ہو کر رہ گئی تھیں۔ مہاتما جی بھی اس سے بہت آزُردہ

ہوئے۔ اُنہوں نے دیش بندھو داس اور پنڈت موتی لال نہرو کے ساتھ فوراً سمجھوتہ کرلیا۔ سارے ملک میں جلسے ہوئے۔ سبھی بڑے بڑے لیڈروں نے اخباروں میں اپنے بیان نکلوائے جن میں حکومت کی اِس کارروائی کی سخت مذمت کی گئی۔ پٹنہ میں بھی ایک بڑا جلسہ ہوا۔ اِس میں سبھی خیالات اور سبھی پارٹیوں کے لوگ شریک ہوئے۔ بنگال میں پُرتشدّد پالیسی چلانے پر وہاں بھی سخت نکتہ چینی کی گئی۔ میں نے اِس جلسہ میں پرجوش تقریر کی۔

گاندھی جی نے جو سمجھوتہ کیا اُس کا مقصد یہ تھا کہ کانگریس بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ کے سوا اور سب ترک موالات ملتوی کردے، اور الگ الگ قسم کے کام کانگریس کے اندر الگ الگ جماعتیں کریں۔ مگر چرخہ اور کھدّر کی تبلیغ، آپس میں خاص کر ہندو مسلم اِتّحاد بڑھانا اور ہندوؤں میں چھوا چھوت دُور کرنے کے کام سب کے لئے لازمی سمجھے جائیں۔ صوبائی اور مرکزی قانون ساز انجمنوں میں، سوراج پارٹی کانگریس کا جزو ہوکر کانگریس کی طرف سے کام کرے، چونکہ یہ دیکھا گیا ہے کہ جب تک سوت کی کتائی عام نہ ہوجائے۔ ہندوستان کپڑے کے معاملے میں خود کفیل نہیں ہوسکتا اور چونکہ چرخہ کاتنا ایک جیتا جاگتا اور صاف نظر آتا ہوا عمل ہے جو کانگریسی لوگوں، اور ہندوستان کے عوام کے درمیان تعلق پیدا کرنے والا ہے، اِس لئے چرخہ اور کھدّر کی تبلیغ کے لئے کانگریس کے قواعد و ضوابط میں یہ ترمیم کردی جائے کہ کوئی آدمی تب تک کانگریس کا ممبر نہیں ہوسکتا جب تک اُس کی عمر اٹھارہ برس کی نہ ہو، جو سیاسی تقریبوں، کانگریس کے موقعوں پر یا کانگریس کا کام کرتے ہوئے، ہاتھ کا کتا اور ہاتھ کا بُنا ہوا کھدّر نہ پہنتا ہو جو ہر مہینے ہاتھ کا کتا دو ہزار گز اچھا ہموار سوت اور بیماری یا ایسے حالات میں جن پر اس کا قابو نہ ہو اُتنا ہی دوسرے کے ہاتھ کا کاتا ہوا سوت کانگریس کو نہ دے۔ اِس کا

نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ سوراج پارٹی کو کانگریس کے نام پر کانگریس کا کام کرنے کا حق مل جاتا تھا مگر کانگریس کا ممبر بننے کے لئے اب چار آنے پیسے کی جگہ دو ہزار گز سوت اپنے ہاتھ سے کات کر یا بیماری یا مجبوری کی حالت میں دوسرے سے خرید کر دینا پڑتا تھا۔ یہ سمجھوتہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور بلگاؤں کانگریس کی منظوری کے لئے پیش ہونے کو تھا۔

بنگال کے دورِ تشدّد اور اِس سمجھوتے پر غور کرنے کے لئے مولانا محمد علی نے بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس طلب کیا۔ اُسی وقت اُنہوں نے مُلک کی اور سیاسی پارٹیوں کو بھی دعوت دی کہ بنگال کی حالت پر سب مل کر غور کریں۔ گاندھی جی پہلے سے ہی اس کوشش میں تھے کہ سب پارٹیوں کو پھر سے کانگریس میں شریک ہونے کے لئے حوصلہ دلایا جائے اور بلایا جائے۔ سرکار کی کارروائی سے اِس کوشش کو بہت تقویت پہنچی۔ بمبئی میں ایک بڑی کانفرنس ہوئی جس میں سبھی پارٹیوں کے لوگ شریک ہوئے۔ بمبئی میں سرونیشا پٹ اِس کے صدر رہے۔ اس کی پہلی تجویز میں حکومت کی پرتشدد پالسی کی مذمّت کرتے ہوئے سوراج پارٹی کا مطالبہ پیش کیا گیا۔ دوسری تجویز کی رو سے ایک کمیٹی مقرر ہوئی، جس کو ہدایت کی گئی کہ وہ اِس بات پر غور کرے کہ کس طرح مختلف سیاسی پارٹیوں کو کانگریس کے اندر شامل کیا جا سکتا ہے اور سوراج کا ایک مسودہ تیار کریں جس میں ہندو مسلم مسئلے کے اور اِسی طرح کے دوسرے مسئلوں کے۔ سیاسی نظریے سے حل رکھے جائیں اور اس کمیٹی کی رپورٹ ۳۱ مارچ تک تیار کر کے اپریل میں پھر کانفرنس کا اجلاس ہو۔ اِس آل پارٹیز کانفرنس کی اہمیت یہ تھی کہ اِس میں کانگریس کے ماسوا (جس میں سوراج پارٹی بھی شامل تھی) اور بھی جتنی سیاسی پارٹیاں تھیں، حتیٰ کہ مسلم لیگ کے لوگ بھی شریک ہوئے تھے، اِس کی کارروائی سے سارے مُلک میں ایک نئی لہر دَوڑ گئی۔ اُمید ہونے لگی کہ اب سب لوگ پھر مل کر

اگر ایک ساتھ نہیں تو اپنے اپنے خیال کے مطابق ایک مقصد یعنی سوراج حاصل کرنے کے لئے لگ جائیں گے۔

اِسی زمانے میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا بھی اجلاس ہوا اس میں گاندھی جی اور سوراج پارٹی کے درمیان جو سمجھوتہ ہوا تھا منظور کر لیا گیا۔ غیر تبدیلی پسندوں (نوچینجروں) میں بہتیرے ایسے بھی تھے جو اِس سمجھوتے کو نامنظور کرتے تھے۔ زیادہ تر اُن کی مخالفت اِس وجہ سے تھی کہ سوراج پارٹی کو کونسلوں میں کانگریس کے نمائندے ہونے کی حیثیت سے بولنے کا حق دے دیا گیا تھا۔ لوگ چاہتے تھے کہ اگر انہیں یہ حق دیا جائے تو اُن پر کنٹرول بھی کانگریس کا رہے۔ گاندھی جی یہ بار نہیں لینا چاہتے تھے۔ بہت بحث و تمحیص کے بعد یہ سمجھوتہ منظور ہو گیا۔

اِن دونوں اِجلاسوں نے مہاتما جی کے لئے راستہ صاف کر دیا۔ وہ آپس کی جس پھوٹ سے دُکھی تھے وہ بڑی حد تک دُور ہو گئی۔ جو کچھ اَن بَن رہ گئی تھی۔ اُسے بھی دُور کرنے کا دروازہ کھُل گیا۔ بلگاؤں میں ہونے والے کانگریس کے وہ صدر چُنے جا چکے تھے مگر اُنہوں نے ابھی اسے منظور نہیں کیا تھا۔ اِن اجلاسوں کے بعد اُنہوں نے اِسے منظور کر لیا۔ یہ بھی اُمید کی جاتی تھی کہ کانگریس کے اجلاس کے موقع پر دوسری پارٹیوں والے بھی اپنے سالانہ اجلاس بلگاؤں میں ہی کریں گے جس میں پھر سب لوگوں کو ایک بار آپس میں مِل کر بات چیت کرنے کا موقع ملے۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ صرف ڈاکٹر اینی بسنٹ نے کانگریس میں شریک ہونے کا تہیّہ کر لیا۔ وہ اپنے پیرووں کے ساتھ بلگاؤں میں شریک بھی ہوئیں۔

دسمبر کے آخر ہفتہ میں قاعدہ کے مطابق بلگاؤں میں اجلاس ہوا۔ وہاں کے لوگوں

میں کانگریس کی وجہ سے بہت جوش تھا۔ شری گنگا دھر راؤ دیش پانڈے بوڑھے ہونے پر بھی جوان کی طرح گھوڑے پر سوار اِدھر اُدھر آتے جاتے اور انتظام کی نگرانی کرتے دکھائی دیتے تھے۔ اجلاس کے ساتھ ساتھ نمائش تو برابر ہوا ہی کرتی ہے۔ بلگاؤں میں موسیقی کانفرنس بھی ہوئی جس میں کرناٹک کے خاص خاص ماہرینِ فن شریک ہوئے میسور دربار سے اس میں پوری مدد ملی تھی۔ وہاں کے ماہرینِ فن دربار کی طرف سے بھیجے گئے تھے۔ اِن میں سب سے نامی شری شیشاجی تھے جو وینا (بین) کے اُستاد مانے جاتے تھے۔ جب کانگریسی نمائندوں کو وقت مِلا تو اُن کو بہت اعلیٰ درجہ کا دکھنی موسیقی (کرناٹک سنگیت) سُنایا گیا۔ ایک دن گاندھی جی کی کٹی میں بھی اُنھوں نے اپنی بین کاری کا فن دکھایا۔

بودھ گیا کا مندر

ایک خاص بات یہ ہوئی کہ کانگریس کے پاس سنگل دیپ (سیلون) سے ڈاکٹر کیسیس پریرا کی سرکردگی میں بودھوں کی طرف سے ایک ڈیپوٹیشن (وفد) آیا۔ اُس نے یہ بات پیش کی کہ بودھ گیا کا بُدھ مندر بودھوں کے اختیار میں دینا چاہئے۔ گیا کانگریس کے زمانے میں ہی برما سے بھکشو اُتما کی قیادت میں تقریباً ایک سو بھکشوؤں کی ایک بڑی جماعت آئی تھی۔ برما اُس زمانے میں ہندوستان میں ہی شامل تھا۔ وہاں بھی کانگریس کمیٹی تھی، یہ لوگ اُسی کے نمائندے ہو کر آئے تھے اُن کے لئے بہ یک کرشمہ دو کار کی بات تھی۔ کانگریس کا اجلاس دیکھنا اور بدھ گیا اور بدھ دیو کا درشن۔ کانگریس کے اجلاس کا مقام بھی بودھ گیا کے راستے میں ہی تھا۔ اُس وقت بھی اور کوکناڈا کانگریس کے بعد بھی کچھ اِس طرح کی بات چلی تھی اور مجھے بودھ گیا کے متعلق معاملے کی جانچ کرنے کی ہدایت کی گئی۔ مگر میں یہ کام کر نہیں پایا۔ بلگاؤں میں ڈیپوٹیشن نے کانگریس میں اِس سوال کو پیش کرنا چاہا۔ گاندھی جی نے مجھے اِس اختیار کے ساتھ کام سپرد کیا کہ میں اور جس کو چاہوں اپنے ساتھ شریک کر لوں اِس سے وہ لوگ مطمئن ہو گئے۔ لالہ لاجپت رائے بہت ڈرتے تھے کہ غیر مُلکی بودھوں کو اگر

مندر پر حق دے دیا گیا تو ہو سکتا ہے کہ وہ غیر مُلکی سازش کا مرکز بن جائے اور بین الاقوامی اُلجھن پیش آئے۔

میں نے کانگریس کے اجلاس سے واپس آکر جانچ کا کام شروع کر دیا۔ ایک چھوٹی کمیٹی بن گیا۔ اس میں شری برج کشور پرشاد، ڈاکٹر کاشی پرشاد جیسوال اور شری دامودر داس (جو بعد ازاں بھکشو راہل سانکر تائن ہوئے) ممبر تھے جب تحقیقات شروع ہوئی تو سنگل دیپ سے پھر وہاں کے رہنے والے شری گنی سنگھ آئے کچھ دن تک بہار میں رہ کر ایک کمیٹی کے کام کو اُنہوں نے بودھوں کی طرف سے مدد دی میں نے سب سے پہلے ہندوؤں کا خیال معلوم کرنے کی کوشش کی۔ اس لئے پٹنہ میں دو جلسے کئے گئے مگر اُن میں حاضری قابلِ اطمینان نہیں تھی۔ لہٰذا اِن کے فیصلے کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی۔ اتّفاق سے اُسی زمانے میں مظفر پور میں ہندو مہاسبھا کا اجلاس ہونے والا تھا۔ جس کے صدر لالہ لاجپت رائے تھے۔ وہاں میں گیا بودھ گیا کے مہنت کی طرف سے بھی کچھ لوگ سبھا میں گئے تھے۔ سبھا میں ایک ریزولیوشن منظور کیا گیا۔ جس میں ہندوؤں اور بودھوں کی مشترکہ کمیٹی کے ہاتھوں مندر کے انتظام کا بار سپرد کرنے کی رائے دی گئی۔ مگر ساتھ ہی یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ اِس بات پر پوری طرح غور کرنے (اور ہو سکے تو مہنت کو بھی راضی کرنے) کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے۔ اس کے ممبر بھی مندرجہ بالا چاروں اصحاب تھے۔ اِن کے علاوہ ایک اور صاحب اور بودھ گیا کے مہنت بھی ممبر بنائے گئے۔ مگر جب کمیٹی کا کام شروع ہوا تو یہ دونوں صاحبان اُس میں شریک نہ ہوئے اس طرح ہندو مہاسبھا اور کانگریس کی طرف سے ہم چاروں آدمیوں نے ہی رپورٹ تیار کی۔ کمیٹی نے سبھی باتوں پر غور کر کے ایک طویل اور اہم رپورٹ تیار کی۔ ساتھ ہی اپنی سفارش یہ کی کہ بودھ گیا کے مندر کا انتظام ہندوؤں اور بودھوں

ایک مشترکہ کمیٹی کے ہاتھوں میں دیا جائے۔ وہاں کی عبادت اور زیارت کا انتظام بودھوں کے رسم کے مطابق کیا جائے۔ مگر ہندوؤں کو بھی درشن اور پوجا کا حق رہے۔

اگرچہ یہ بودھوں کی خاص عبادت گاہ ہے، پھر بھی اِس مندر کا انتظام بودھ گیا کے مہنت کے ہاتھ میں ہے جو مذہباً شیو ہے۔ ہندو بھی بدھ دیو کو اپنے خاص دس اوتاروں میں سے مانتے ہیں پھر بھی اُن کی پوجا ہندوؤں میں رائج نہیں ہے۔ کہیں کہیں تو اِن کی تحقیر بھی کی گئی ہے۔ اِس لئے وہاں اگرچہ پوجا کا کچھ انتظام تھا پھر بھی اہم زیارت گاہ کے شایانِ شان نہیں تھا۔ ہمارے نزدیک بودھوں کی یہ شکایت ٹھیک تھی کہ پوجا کا موزوں اِنتظام بودھ ہی کر سکتے ہیں۔ اِس لئے کمیٹی نے اپنی طرف سے ایسی سفارش کی ہم نے مہنت سے بھی ملاقات کر کے اِس بات کی کوشش کی کہ وہ اِس بات پر رضامند ہو جائیں کہ مندر کا انتظام کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے۔ ہم نے اِس کمیٹی کی ممبری اُن کو بھی دینی چاہی۔ اُن کو مندر کی جو آمدنی چڑھاوے (نذر و نیاز) کی صورت میں آتی ہو اُس کا معاوضہ بھی دینے کی بات کی مگر وہ کسی طرح راضی نہ ہوئے۔ وہ یہ مانتے تھے کہ مندر پر اختیار رہنے کی وجہ سے اُن کا بڑا وقار ہے جو غیر مُلکوں تک ہے۔ اُسے وہ نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔ ہم نے اُن کو بہت سمجھایا کہ ہماری بات مان لینے سے اُن کی عزت گھٹنے کے عوض بہت بڑھ جائے گی مگر یہ بات اُن کی سمجھ میں نہ آئی۔ ہماری سعی ناکام رہی۔ ہم نے اپنی سفارش کر کے ہی معاملہ کو موزوں وقت کے انتظار میں اُٹھا رکھا۔

یہ رپورٹ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے پیش ہوئی اور منظور بھی کر لی گئی۔ مگر آج تک یہ کام پورا نہیں ہوا۔ جب کئی برس بعد کانگریس کی وزارت بنی تو پھر ایک ڈیپوٹیشن لنکا سے آیا۔ اُس نے بھی یہی مطالبہ پیش کیا، میں اُن دنوں بیمار تھا اور اپنے گاؤں زیرادیئی میں رہتا تھا۔

اس لئے وہ لوگ زیرا دیئے گئے۔ چیف منسٹر سے بھی ملے۔ مہنت جی کسی طرح رضامند نہ ہوتے تھے۔ اس لئے قانون کے ذریعے ہی کچھ ہو سکتا تھا۔ میں نے چیف منسٹر کو لکھا کہ وہ اِس معاملے میں قانون بنانے کا انتظام کریں۔ وہ اِس بارے میں غور بھی کرنے لگے مگر اور جھنجھٹوں میں پھنسے رہنے کی وجہ سے وہ بات آگے نہ بڑھ سکی۔ جب وزارت نے استعفیٰ دیا۔ اُس وقت بھی یہ بات جہاں تھی وہیں رہ گئی۔ میں آج بھی مانتا ہوں کہ انصاف کا تقاضا ہے کہ اِس مندر کے انتظام کاروبار اور اختیار بودھوں کے ہاتھ میں دینا چاہیئے اور چونکہ ہندو بھی بدھ دیو کو اوتار مانتے ہیں اِس لئے انتظامیہ کمیٹی میں ہندوؤں کو بھی رہنا چاہیئے۔ اِس سلسلہ میں ایک بات اور قابلِ تحریر ہے سنگل دیپ میں ایک مشہور مندر ہے جس کا نام کترگاما ہے۔ وہاں کے ہندو کہتے ہیں کہ وہ ہندوؤں کا مندر ہے اور بودھوں نے اِس پر قبضہ جما لیا ہے۔ جب یہاں بحث چل رہی تھی تو لنکا کے ہندوؤں کی طرف سے میرے پاس خط اور تار آتے رہے کہ ہم ہرگز بودھ گیا کے مندر پر اُس وقت تک بودھوں کو اختیار نہ دیں جب تک کترگاما مندر پر وہ ہندوؤں کا حق نہ مان لیں۔ اگر بات آگے بڑھتی تو شاید اس سلسلہ میں کچھ گفتگو اور چلتی مگر وہ وقت آیا ہی نہیں بات جہاں تھی وہیں رہ گئی۔

یہاں ۱۹۲۵ء کی بات لکھتے لکھتے میں اس بارے میں ۱۹۳۹ء تک چلا آیا۔ کیونکہ اِسے ایک جگہ کہہ دینا ہی ٹھیک تھا۔

بِلگاؤں کانگریس کے بعد کے کچھ واقعات

بِلگاؤں کانگریس میں سوراج پارٹی کے ساتھ سمجھوتہ منظور ہو گیا۔ گاندھی جی اس پر رضامند سے ہو گئے کہ جہاں تک سیاسی سوالوں کا تعلق ہے اُن پر سوراج پارٹی کا ہی غلبہ رہے اور اگر وہ چاہے تو ورکنگ کمیٹی بھی حسبِ دل خواہ بنالے۔ مگر کھدّر کے پرچار اور تعمیری کاموں میں پوری مدد کرے اور اُن کا چلانا گاندھی جی پر چھوڑ دے۔ اِسی پالسی کے مطابق کانگریس کے آئین میں تبدیلی ہوئی۔ کانگریس کا ممبر بننے کے لئے چار آنے چندہ دینے کے بدلے اپنے ہاتھ کا کتا ہوا سوت دینا منظور کیا گیا۔

جب سے گاندھی جی جیل سے نکلے تھے۔ اُنہوں نے کھدّر کے پرچار پر بہت زور دیا تھا۔ میں بھی اپنے صوبے میں تعمیری کام میں ہی خاص کر قومی تعلیم اور کھدّر کے پرچار میں لگا رہا۔ ۱۹۲۴ء میں دسمبر میں پٹنہ میں ایک نمائش کی گئی جس میں چرخہ اور اُس سے تیار کئے ہوئے ہر طرح کے کھدّر کے نمونے دکھائے گئے۔ میں نے اِس نمائش کو سیاست سے الگ رکھا۔ سب لوگوں کو بلایا کہ وہ آکر دیکھیں کہ ہاتھ سے کس طرح اور کیسے سوت بن سکتا ہے اور کھدّر کے پرچار سے غریبوں کو کتنا فائدہ ہو سکتا ہے۔ اعلیٰ سرکاری افسر بھی خوب آئے۔

اُنھوں نے کھدر کی ترقی دیکھی۔ ایسے لوگوں میں پٹنہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر ڈاسن ملر خاص تھے۔ دوسرے ہندوستانی اور انگریز جج، بہار کے گورنر کی کونسل کے ممبر سر ہیو میکفرسن اور جوق در جوق اعلیٰ افسر بھی آئے۔ چرخہ چلانے کا جو مقابلہ ہوا، اس میں ملکھا چک گاندھی کیٹر (سارن) کے دو لڑکوں نے اوّل انعام پایا وہ شری رام بنود سنگھ کے چھوٹے بھائی تھے، اِن کی رفتار ایک گھنٹہ میں تقریباً چھ سو گز تھی۔ اِن دونوں نوجوانوں میں سے ایک اب ڈاکٹر ستیہ نارائن سنہا ہیں جو بعد میں یوروپ سے تعلیم حاصل کر کے اور ڈاکٹر کی ڈگری لے کر واپس آئے اور ہندی کی بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ باریک سوت کاتنے والوں نے تقریباً تین سو نمبر کا مہین سوت کات کر دیکھا۔ اُس زمانے تک جو ترقی ہوئی تھی میں نے اپنی تقریر میں اُس کی رپورٹ لوگوں کے سامنے پیش کر دی۔ جہاں تک میرا اندازہ ہے لوگ بہت مطمئن ہوئے۔ انعامات چیف جسٹس کی اہلیہ لیڈی ملر نے تقسیم کئے۔

جو نمائش بلگاؤں میں ہوئی، اُس کے افتتاح کا فخر مجھے حاصل ہوا شائد مجھے اِس لئے یہ اعزاز دیا گیا کہ ہمارے صوبے میں کھدّر کا کام اچھا چل رہا تھا۔ اگر نمائش میں اور صنعتوں کے نمونے بھی دکھلائے گئے۔ پھر بھی میں نے اپنی تقریر میں خاص کر کھدّر کے بارے میں ہی کچھ کہا۔ میں نے اس بات پر زور دیا کہ اگر مُبلّغوں کی اور رقم کی کمی نہ ہو اور لوگ کھدّر خریدیں تو سارے مُلک میں تھوڑے ہی وقت میں کافی کھدّر تیار کیا جا سکتا ہے۔

اِسی سال ایک اور چھوٹا سا واقعہ ہوا۔ جو میرے لئے ایک پاکیزہ یاد ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی کے کنووکیشن کے موقع پر سر جگدیش چندر بوس صدارتی ایڈریس پڑھنے آئے۔ میں نے اُن کو بہار ودیاپیٹھ میں بلایا۔ جب میں پریسی ڈنسی کالج کلکتہ میں پڑھتا تھا تب ڈاکٹر بوس نے مجھے پڑھایا تھا۔ مگر یہ بہت دِن پہلے کی بات تھی۔ وہ بھی اُوپر کے

درجوں میں جیسے بی، ایس، سی یا ایم، اے میں نہیں۔ ایف، اے میں ہی مجھے اِن سے پڑھنے کی خوش قسمتی حاصل ہوئی تھی۔ اس لئے میں نہیں سمجھتا تھا کہ اُنہیں میرے متعلق کچھ یاد ہوگا، یا وہ مجھے خاص طور پر جانتے ہوں گے۔ مگر یہ جان کر میری خوشی کا ٹھکانا نہ رہا کہ وہ مجھے اچھی طرح یاد ہی نہیں رکھتے تھے بلکہ مجھ پر مہربان بھی تھے۔ وہ خوشی سے ودیا پیٹھ آئے وہاں ایک انتہائی عمدہ حوصلہ افزا اور پُر مغز تقریر بھی کی۔ میں نے اپنے کو بابرکت سمجھا، اُسی محبت اور اعتماد کا ثبوت اُنہوں نے اپنی وفات سے کچھ پہلے دیا۔ بہار میں نقشہ بندی کے لئے ایک بڑی رقم دی، اور اُس کے سُود کی آمدنی کو خرچ کرنے کا بار مجھے دیا۔ وہ جیسے سائنس دانوں کے سرتاج تھے۔ ویسے ہی سچے مُحبِّ وطن اور بے لوث بھی تھے۔ نقشہ بندی کا کام ۱۹۳۲ء میں میرے جیل جانے تک میری نگرانی میں جھریا میں ہوتا رہا۔ لیڈی ابلا بوس میرے پاس روپئے بھیجتی رہیں۔ جب میں جیل چلا گیا اور کام کرنے والے بھی ازروئے سخت گیری گرفتار کر لئے گئے، تو روپئے میرے پاس بچے تھے، میں نے لیڈی بوس اور ٹرسٹیوں کے پاس واپس کر دئے۔ افسوس صرف اِتنا رہا کہ میں سر جگدیش چندر بوس مرحوم کی آرزو پوری نہ کر سکا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب پھر اس کا وقت ملے گا اُن کی تمنّا پوری کی جائے گی۔

یہاں ایک اور واقعہ کا ذکر کر دینا بھی نامناسب نہ ہوگا۔ کھدّر کے کام کرنے والوں میں ایک نوجوان تھے، شری بن سنگھ۔ سارن ضلع کے گوپال گنج سب ڈویزن کے کیتھولیہ گاؤں میں رہتے تھے۔ بڑے پُرجوش تھے۔ مختاری کے امتحان کے لئے تیاری کر رہے تھے مگر مُلک کی آواز سُن کر وہ خیال چھوڑ کر کھدّر کے کام میں لگ گئے۔ گھر کے چنداں مال دار نہ تھے، آمدنی بہت قلیل تھی۔ اپنے پیسے سے کھدّر اور چرخے کی تبلیغ انہوں نے شروع کر دی۔ اپنی زمین اور بیوی کے زیور تک بیچ ڈالے۔ اِتنا کچھ کرنے کے بعد انہوں

نے کھادی بورڈ سے اپنی حالت کہی۔ بورڈ کی طرف سے اُنہیں مدد دینے کا فیصلہ ہوا۔ اِسی موقع پر وہ بیمار پڑ گئے۔ جُنون کی کیفیت اُن میں نظر آنے لگی۔ وہ بار بار کہتے تھے کہ مجھے سانپ کاٹ کھائے گا۔ ہمیشہ چرخے اور کھدّر کے گیت گاتے رہتے۔ کبھی کبھی بگڑ بھی جاتے اِس لئے لوگوں نے اُن کو ایک گھر میں بند کر رکھا تھا۔ ایک روز رات کے وقت چِلّا کر کہنے لگے کہ سانپ آ گیا اور میں اس سے لڑ رہا ہوں۔ پہلے تو لوگوں نے اُسے خبطی کی بات سمجھا مگر جب لوگوں نے جا کر دیکھا تو سچ مچ ایک گینہودن سانپ کو وہ ہاتھ میں پکڑے ہوئے تھے۔ اس نے اُن کو کئی جگہ کاٹ لیا تھا۔ اُنھوں نے سانپ کو تو مار ڈالا۔ مگر خود بھی کچھ دیر میں اس کے زہر سے مر گئے۔

شری بتن سنگھ کی بیوی نے، اُن کی بیماری کی ابتدا کے دِن سے ہی غلّہ کھانا چھوڑ دیا تھا۔ جب چوبیسویں دن اُن کی موت ہوگئی تو اُس نے نہا دھو کر ستی ہونے کی خواہش ظاہر کی، لوگوں نے ایسا نہیں کرنے دیا۔ جب لاش کو جلانے کے لئے لے گئے۔ اُس نے بہت زور لگایا مگر لوگوں نے اُسے زبردستی بند کر رکھا۔ اُس وقت وہ پُر سکون ہو گئی چُپ رہنے لگی۔ اپنے گھر میں، جس کا ایک گوشہ بہت اندھیرا تھا، رہا کرتی۔ اُسی کونے میں کچھ روئی اور کھدّر رکھا ہوا تھا۔ تین چار دِنوں کے بعد ایک رات وہ اپنے گھر میں سونے گئی۔ بتن سنگھ کے دو بھائی گھر میں سوئے۔ کسی نے کوئی اندیشہ نہیں کیا۔ سویرے وہ نہیں اُٹھی، تب لوگوں کو شبہ ہوا۔ جب لوگوں نے اس کوٹھری کو جا کر دیکھا تو پایا کہ رام سُرت (جو اس عورت کا نام تھا) ایک ہاتھ میں گیتا لئے اور دوسرے ہاتھ کو ٹیکے بیٹھی ہے بدن چھونے سے معلوم ہوا کہ پاوں کے انگوٹھے سے لے کر چھاتی تک جسم جل کر خاک ہو گیا ہے اور باقی حصّہ جوں کا توں ہے۔ پیٹھ پر لٹکے ہوئے سر کے لمبے بال کچھ جل گئے تھے

مگر آنکھوں کے پپوٹوں پر جلنے کا کچھ نشان نہ تھا۔ وہیں پر کھدّر اور روئی بھی یوں ہی پڑی تھی اُس کے بدن سے تین چار فٹ کے اندر دو طرف گھر میں جلانے کی کچھ لکڑی رکھی ہوئی تھی وہ غائب تھی۔ مگر وہ اِتنی نہیں تھی کہ اِس کے جسم کو خاک کر سکے۔ اس طرح اس دیوی نے اپنے ستی پن کا ثبوت دے کر جسمِ خاکی کو خاک کر دیا۔ اِس واقعہ کی خبر پا کر میں وہاں گیا۔ گھر والوں کو تسلی دینے کے ماسوا اِس سادھوی کے مقام کو دیکھ کر میں نے اپنے کو بابرکت محسوس کیا۔

دیش بندھوداس کی موت

دیش بندھوداس کی صحت بلگاؤں کانگریس کے زمانے سے ہی خراب ہونے لگی تھی وہ کچھ دنوں تک پٹنہ میں ہی اپنے بھائی شری پرپھل رنجن داس (پی، آر، داس) کے ساتھ آکر ٹھہرے تھے۔ اُس زمانے میں اکثر میں اُن سے جاکر ملتا رہتا۔ اُنہوں نے چرخہ چلانا سیکھنا شروع کیا۔ مجھ سے کہا کہ تم خود سکھاؤ یا سکھانے کے لئے کسی آدمی کو تعینات کردو۔ اِس بارے میں باتیں کرتے کرتے اُنہوں نے کہا کہ اِس طرح کے کام میں ہمارا ہاتھ نہیں چلتا اور نہ عقل ہی ٹھیک چلتی ہے۔ اگر مجھ پر چھوڑ دیا جائے تو میں شاید اپنے ٹرنک کا قفل بھی ٹھیک نہیں لگا سکتا۔ میں نے کئی دنوں تک اُنہیں سوت کاتنا سکھایا۔ پھر جب مجھے کسی ضرورت سے باہر جانا پڑا تو ایک دوسرے دوست اِس کام کے لئے اُن کے پاس جایا کرتے تھے۔ پٹنہ میں اُن سے سیاسی باتیں بھی ہوا کرتی تھیں۔ اُنہیں دنوں لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند مقرر ہوئے تھے۔ یوں تو وہ بڑے کٹّر کنسرویٹو (رجعت پسند پارٹی کے) اور پکّے اِستعماریت پرست (سامراج وادی یا امپیریلسٹ) تھے۔ مگر دیش بندھوداس کا

خیال تھا کہ وہ پُرشکوہ اور یک رُخ مزاج کے بھی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ہندوستان کے متعلق وہ کچھ کر جانا چاہیں۔ اِس لئے اندر اندر شاید کچھ بات بھی چلی۔ اُن بہت اُمید تھی کہ کچھ نہ کچھ لارڈ برکن ہیڈ کے زمانے میں ہو جائے گا جس سے ہندوستان اور انگلستان کے درمیان صلح صفائی ہو سکے گی۔ وہ یہاں تک کہا کرتے تھے کہ برکن ہیڈ سے اگر میری اُمید پوری نہ ہوئی تو مُلک کو ہمارے سامنے اُٹھنے کے لئے گاندھی جی کے چرخے کے سوا اور کچھ نہ رہ جائے گا۔

جیسا پہلے کہا جا چکا ہے ۱۹۲۳ء کے انتخابات میں سوراج پارٹی نے حِصّہ لیا۔ دِلّی میں کانگریس کے خاص اجلاس میں اِس کی اجازت دی گئی تھی۔ مگر کونسل کے پروگرام کو اپنے ہاتھ میں نہیں لینا تھا۔ اِس لئے سوراج پارٹی کو اِس الکشن میں اتنی کامیابی نہیں ملی تھی جتنی کانگریس کی مدد سے ملتی۔ پھر بھی بنگال اور مدھیہ پردیش میں اُن کی ایک اچھی تعداد کونسل میں پہنچی۔ اِسی طرح مرکزی اسمبلی میں دلّی میں بھی ایک اچھی تعداد میں سوراجی لوگ چُنے گئے۔ اگرچہ کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر بھی کچھ اچھّے لوگ کونسلوں میں پہنچ ہی گئے۔ اُنہوں نے وہاں کی کارروائی میں ایک نئے انداز نئے نظرئے کو داخل کر دیا۔ مدھیہ پردیش میں تو سوراجیوں، کی اکثریت تھی، وہاں اُنہوں نے بجٹ اور وزیروں کی تنخواہ کو نامنظور کر دیا۔ گورنر کو مجبور ہو کر وزیروں کو ہٹانا اور سارا اِختیار اپنے ہاتھوں میں لے لینا پڑا۔ اگرچہ بنگال میں اِس طرح کی اُن کی اکثریت نہیں تھی۔ مگر دیش بندھو داس کی شخصیت اور کوشش کی وجہ سے وہاں ایک وزارت بھی ٹوٹ گئی۔ بنگال کے گورنر کو بھی سارے اختیارات اپنے ہاتھوں میں لینے پڑے۔ مرکزی اسمبلی میں پنڈت موتی لال جی سوراج پارٹی کے لیڈر تھے۔ دوسری پارٹیوں اور خیالات والوں کے ساتھ مل کر وہاں

بھی بجٹ نامنظور کر دیا گیا۔ وائسرائے کو اپنے اختیاراتِ خصوصی سے اُسے نامنظور کرنا پڑا۔ یہ سلسلہ دو برسوں تک چلتا رہا۔ بنگال میں دیش بندھو داس نے اُس بل کو بھی نامنظور کرا دیا جو تحریک کو سختی سے دبانے کے متعلق تھا۔ اِن سب باتوں کا اثر مُلک کے لوگوں پر بہت اچھّا پڑا تھا۔ مگر اربابِ حکومت اِتنے ہی ناراض بھی ہو گئے تھے۔ مہاتماجی کے سمجھونے کے سبب سے سوراج پارٹی کی یہ کامیابی بھی ایک خاص سبب تھی، مگر یہ ظاہر تھا کہ اِس طرح کی کارروائی بہت دنوں تک نہیں چل سکتی تھی۔ مرکزی اسمبلی میں دوسرے لوگوں کے ساتھ بات چیت کر کے جو ایک پارٹی بنائی گئی تھی وہ رفتہ رفتہ کم زور پڑ کر ٹوٹ گئی۔ سوراج پارٹی دوسری پارٹیوں سے الگ ہو گئی۔ مدّھیہ پردیش میں بھی اندر ہی اندر سوراجیوں میں ہی وزارت بنانے کی کچھ سرگوشیاں ہونے لگیں۔ جس میں خاص کر صوبۂ بہار کے کچھ ممبر اس کے خاص حامی تھے۔ اِن سب باتوں کو دیکھ کر ہی دیش بندھو داس۔ جو تجربہ کار بھی تھے اور دور اندیش بھی۔ غور کر رہے تھے کہ اِس موقع پر اگر خودداری کے ساتھ کوئی سمجھوتہ برطانوی سرکار سے ہو جائے تو بہت اچھا ہو گا۔

حکومت نے نئے آرڈیننس اور ۱۹۱۸ء کے ریگولیشن کے مطابق گرفتاریاں کر کے دکھا دیا کہ وہ کسی طرح بھی انقلاب پسندوں کو پنپنے نہیں دینا چاہتی۔ یہ نیا آرڈیننس اور یہ گرفتاریاں لیبر پارٹی کی منظوری سے ہی ہوئی تھیں، جس کے وزیرِ اعظم مسٹر ریمزے میکڈانلڈ تھے۔ لیبر پارٹی کے الکشن ہار جانے پر کنزرویٹو پارٹی کی وزارت بن گئی۔ اسی میں لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند بنے تھے۔ اِنہی سے دیس بندھو داس کچھ اُمیدیں رکھتے تھے۔ اِس کے لئے اُنہوں نے اپنے نزدیک راستہ بھی صاف کر لیا تھا۔ وہ جانتے تھے کہ انگریزوں کو یہ شبہ ہے کہ بنگال کی سوراج پارٹی اور وہ خود اندر ہی اندر انقلاب پسندوں کی مدد کرتے ہیں انگریزوں

کے دل میں یہ اندیشہ گوپی ناتھ ساہ کے متعلق اُن کے سراج گنج والے ریزولیوشن سے اور بھی پختہ ہوگیا۔ دیش بندھو داس نے سوچا کہ انگریز کسی قسم کی مصالحت اُس وقت نہیں کر سکتے جب تک اُن کے دل میں یہ اندیشہ رہے گا۔ یہ بات اُن کو انگریزوں سے بات چیت کر کے معلوم ہوگئی تھی۔ اِس لئے اِسے دُور کرنا اُنہوں نے ضروری سمجھا۔ ایک بیان شائع کر کے اُنہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ کانگریس یا سوراج پارٹی نے بھی اِس پالسی کی تائید نہیں کی ہے جس میں قتل جائز سمجھا جاتا ہے اور سوراج پارٹی کے خیال میں اِس قسم کی جانستانی سے حصولِ سوراج کی راہ میں روڑے اٹکتے ہیں۔ اس لئے نہ کبھی پہلے وہ اس کے حامی تھے اور نہ اب کسی طرح اس کی حمائت کر سکتے ہیں۔ ساتھ ہی اُنہوں نے سوراج پارٹی کی رخنہ انداز پالسی کو ناجائز ٹھہرایا، اور یہ بھی کہا کہ جب تک سمجھوتہ ہو کر کچھ طے نہ ہو جائے اور کچھ اختیارات ہاتھ میں نہ آجائیں یہ پالسی جاری رہے گی۔ اِس بیان کے پہلے حِصّے سے تو انگریز مطمئن ہوئے یہاں تک کہ لارڈ برکن ہیڈ نے بھی اِس پر اپنی خوشی کا اظہار کیا۔ مگر ساتھ ہی اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ ہندوستانیوں کو آئین چلانے میں ساتھ دینا چاہیے۔ جب وہ ایسا کریں گے تبھی سیاسی ترقی ہو سکے گی۔ دیش بندھو داس اِتنے پر بھی بالکل نراس نہیں ہوئے اُنہیں دنوں فرید پور میں بنگال کی سیاسی کانفرنس ہونے والی تھی۔ دیش بندھو داس اُس کے صدر چنے گئے۔

گاندھی جی نے اُنھیں دِنوں بنگال کا دَورہ کیا۔ وہ فرید پور کی صوبائی کانفرنس میں بھی شریک ہوئے۔ دیش بندھو داس نے اپنی تقریر میں اِنھی خیالات اور اِنھی اُمیدوں کا اِظہار کیا۔ مگر اُن کی اُمید پوری نہ ہوئی۔ اُن کی صحت روز بروز خراب ہوتی گئی وہ دارجلنگ چلے گئے۔ مہاتما جی بھی وہاں گئے۔ جب وہ دونوں دارجلنگ میں تھے

میں بھی جلپائی گوری تک گیا میرا مقصد تھا گاندھی جی کو بنگال سے بہار لانا۔ اس لئے میں وہاں تک گیا بھی، مگر خرابی صحت کی وجہ سے میں پہاڑ پر نہیں جا سکا۔ شری متھرا پرشاد جی کو ہی گاندھی جی کے پاس بھیجا۔ مہاتما جی رضامند بھی ہو گئے۔ مگر اسی درمیان اچانک دیش بندھو داس کی رحلت ہو گئی۔ سارے ملک پر اُن کی بے وقت وفات سے مُردنی چھا گئی اُن کی لاش کلکتہ لائی گئی۔ یہاں بے مثال نظارہ دیکھنے میں آیا۔ اِتنے زیادہ لوگ جلوس میں شریک ہوئے کہ شاید ہی کبھی کسی دوسرے جلوس میں شریک ہوئے ہوں۔ مہاتما جی بھی کلکتہ آ گئے۔ وہ دیش بندھو داس کی یادگار کے لئے روپئے جمع کرنے اور بنگال کے لیڈروں سے وہاں کی حالت سمجھنے کے لئے باتیں کرنے لگ گئے اِس لئے کچھ دِنوں تک بہار میں اُن کا آنا نہ ہو سکا۔

سماجی اِصلاح

انہیں دِنوں میرے گھر میں دو شادیاں تھیں۔ ایک میری چھوٹی بھتیجی رما کی لکھنؤ کے
شری ودیاوت رام کے ساتھ اور دوسری میرے بڑے لڑکے مرتنجے کی شری برجکشور پرشاد
کی چھوٹی لڑکی ودیاوتی کے ساتھ۔ لکھنؤ کی برات بہت تزک کے ساتھ آئی تھی۔ آدمی کچھ
زیادہ نہیں تھے مگر بہت باوقار گھرانے کے ہونے کے سبب سے اُن لوگوں کی شان بہت
تھی۔ سب انتظام ہم لوگوں کو ہی کرنا پڑا تھا۔ بھائی صاحب نے بہت انتظام کیا تھا۔
بابو ہری جی نے اِس شادی کے طے کرنے میں بڑی مدد کی تھی۔ وہ لوگ اُن کے قریبی
رشتہ دار تھے۔ ہم لوگ یہ نہیں چاہتے تھے کہ کسی کو کوئی شکایت ہو۔ اِس لئے ٹھہرنے
کو خیموں اور کھانے پینے کے لئے بہت ہی نفاست کا انتظام تھا۔ اِس کے برخلاف
مرتنجے کی شادی بہت سادہ طریقے سے ہوئی۔ ہم نے تو اپنے گھر کے تینوں لڑکوں
کی شادی میں سے کسی میں بھی تِلک یا جہیز نہیں لیا۔ مگر تینوں لڑکیوں کی شادی میں تلک جہیز
کافی دینا پڑا تھا۔ کہیں کہیں تو زبردستی خواہش سے زیادہ دینا پڑا تھا۔ اِس بارے میں
میرے تجربے ہمیشہ تلخ رہے ہیں۔ ہمارے سماج میں خرابیاں بہت ہیں۔ جب تک

وہ دُور نہیں ہوتیں، لڑکی کا ہونا اور اُس کی شادی کی جھنجھٹ ہمارے لئے تکلیف دہ ثابت ہوتی رہے گی، کائستھوں میں خاص کر سریواستووں اور امشٹوں میں بہت اِصلاح کی ضرورت ہے۔

کائستھ کانفرنس (آل انڈیا جماعت) کا جنم تقریباً کانگریس کے ساتھ ہی ہوا تھا۔ میرا خیال ہے کہ شاید پہلے اجلاس میں ہی اِس بات پر زور دیا گیا لڑکی کے والد سے شادی میں تلک جہیز لینے کی رسم بہت بُری ہے۔ اُس کو روکنا چاہیئے۔ تقریباً ہر کانفرنس میں اِس مضمون کے ریزولیوشن پاس کئے گئے ہیں، اور جو کانفرنس کے کارکُن ہوتے اُن میں سے بہت سے خود ہی اِس تجویز کی خلاف ورزی کرتے۔ بے شمار ایسے بھی ہوئے ہیں، جنہوں نے کانگریس کے ذریعے حاصل کی ہوئی عزّت کو زیادہ تلک جہیز لینے کا وسیلہ بنا لیا۔ چونکہ کانفرنس کے صدر یا اور اُونچے عہدہ دار ہونے کے سبب سے کائستھوں میں اُن کا بڑا وقار ہو گیا۔ اِس لئے اُنہوں نے زیادہ رقم حاصل کی۔ لہٰذا اِس کانفرنس کو اور ذاتوں کی کانفرنس کے مقابلے میں پُرانی ہونے پر بھی اپنے مقاصد میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئی ہے۔

جب میں ۱۹۱۶ء میں کلکتہ سے پٹنہ میں وکالت کرنے کے لئے آیا تو اِس کے تھوڑے ہی دِنوں کے بعد کچھ کائستھ دوستوں نے مجھ سے ایک عہد نامے پر دستخط کرائے اس کا مطلب یہ تھا کہ لڑکے کی شادی میں بلاواسطہ یا بالواسطہ کسی طریقے پر لڑکی کے والد یا دوسرے رشتہ داروں سے ایکیاون روپئے سے زیادہ ہم نہیں لیں گے۔ میرا خیال پہلے ہی سے اِس حق میں تھا۔ اِس لئے میں نے خوشی سے عہد نامے پر دستخط کر دیئے۔ بھائی صاحب اِس معاملے میں بڑے کٹر خیالات کے تھے۔ وہ تو یہ بھی مانتے تھے کہ کوئی تِلک جہیز

زیادہ لیتا ہے یا شادی میں ناچ رنگ میں زیادہ خرچ کرتا ہے تو اس کی برات میں جانا ہی نہ چاہیئے۔ اس لئے ہمارے گھر میں اِن شرطوں کے ماننے میں کوئی دشواری نہیں تھی تین میں سے میری دو بھتیجیوں کی شادی اِس سے پہلے ہی ہو چکی تھی۔ اِن میں ہم کو تلک جہیز دینے پڑتے تھے۔ اب صرف ایک لڑکی بیاہنے کو تھی اور تین لڑکے تھے، جن میں سے کسی کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اِس لئے جہاں دینے کا سوال تھا وہاں تو ہم نقصان میں رہے، اور جہاں کچھ پانے کی اُمید کی جاسکتی تھی وہاں بھی ہم نے عہد کر کے اِس کا راستہ ہی بند کر دیا تھا۔ مگر یہ کیا ہم نے جان بوجھ کر۔

اِس کے بعد اُسی سال کے آخر میں (دسمبر ۱۹۲۵ء میں) جب میں کائستھ کانفرنس کے جبل پور اجلاس کا صدر چُنا گیا تو میں نے اِسے اِس لئے منظور کر لیا کہ شاید وہاں جا کر کم سے کم اِس قبیح رسم کے روکنے میں کچھ عمل درآمد ہو سکے۔ وہاں اس کانفرنس میں دو تجویزیں پرانی ہونے پر بھی بڑے معرکہ کی ہوئیں۔ ایک تو تلک جہیز کے متعلق جس میں ہم نے عہد نامے کو اور بھی سخت بنا دیا۔ اِسی تجویز میں ایسی شادی میں جہاں اس کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ شریک نہ ہونے کا بھی عہد جوڑ دیا گیا۔ دوسرے میں کائستھوں کے مختلف طبقوں اور فرقوں میں روٹی بیٹی کا بیوہار جاری کرنے پر زور دیا گیا۔ جہاں تک میں جانتا ہوں تلک جہیز کا رواج تو اس کے بعد بھی جاری رہا۔ مگر یہ اطمینان کی بات ہے کہ کائستھوں میں ایک فرقہ کی شادیاں دوسرے سے ہونے لگی ہیں۔ اب تو کم عمر کی بیواؤں کی بھی شادی ہو جاتی ہے اِس وقت تک اِس بارے میں میرے خیالات صاف نہیں ہوئے تھے۔ مگر اِس کے بعد ہی میں نے بھی مان لیا کہ بیوہ کی شادی، خاص کر چھوٹی چھوٹی عمر کی لڑکیوں کی ہونی ہی چاہیئے۔ ایسی کچھ شادیوں میں اپنی منظوری دے کر میں نے حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔

گاندھی جی کا دورہ اور کونسل کا الکشن

پہلے کہا جاچکا ہے کہ بلگاؤں کانگریس نے اُس سمجھوتے کو منظور کر لیا تھا جس کے مطابق کانگریس کے آئین میں تبدیلی کر کے کانگریس ممبر بننے کے لئے پیسے کے بدلے میں دو ہزار گز سوت دینا اور کانگریس کے متعلق موقعوں پر کھدر پہننا لازمی کر دیا گیا تھا، کچھ لوگ اس کے سخت مخالف تھے۔ کانگریس کے باہر کے لوگ جن سے کانگریس میں شریک ہونے کی اُمید کی جاسکتی تھی، اِس کے خلاف تھے ہی۔ کانگریس کے اندر بھی ایک جماعت تھی، جو اِس کی پوری مخالفت کرتی تھی، سوراج پارٹی نے اِسے منظور کر لیا تھا مگر اس کے کچھ خاص ممبر ایسے تھے جنہوں نے اسے کبھی دل سے منظور نہیں کیا تھا۔ بلگاؤں کانگریس کے بعد بھی یہ کہا جاتا رہا کہ سوت اور کھدر کی شرطیں لگا کر کانگریس نے اپنے میدان کو اور بھی محدود کر لیا ہے۔ اب اِس کے ممبروں کی تعداد بہت کم ہو کر رہے گی۔ گاندھی جی کو اُمید تھی کہ یہ لوگ اگر مل کر زور لگائیں گے تو بہتیرے چرخہ چلانے والے ہو جائیں گے، اور اگر ممبروں کی تعداد کم بھی ہو جائے گی تو جو رہ جائیں گے وہ پکّے اور کام کرنے والے ہوں گے جن پر پورا بھروسہ کیا جاسکے گا۔ مگر یہ امید پوری نہ ہوئی، بڑی کوششوں کے باوجود

کانگریس کے ممبروں کی تعداد بہت کم ہوگئی۔ گاندھی جی اِس سے متاثر ہوئے۔ اُنہوں نے یہ خیال ظاہر کر دیا کہ سوراج پارٹی والے اگر چاہیں تو اُن کو اِس سمجھوتے کی شرطوں سے آزاد کیا جا سکتا ہے اور سوت کی جگہ سوت یا چار آنے پیسے کانگریس کی ممبری کے چندہ کی صورت میں دیا جانا وہ منظور کرلیں گے۔ مگر گاندھی جی اِس بات پر رضامند ہونا نہیں چاہتے تھے کہ سوت کی شرط ایک دم اُڑا دی جائے اور جیسا کچھ چاہتے تھے کہ کھدّر کی شرط بھی ہٹادی جائے۔ اُنہوں نے پنڈت موتی لال نہرو کے ساتھ باتیں کیں۔ یہ طے ہوا کہ کانگریس کے آئین میں پھر تبدیلی ہو۔ ساتھ ہی یہ بھی طے ہو جائے کہ جو روپئے کھادی کے کام میں لگے ہیں وہ اِسی کام میں لگے رہیں اور کھدّر کی تبلیغ کے لیئے ایک الگ جماعت قائم کردی جائے جو کانگریس کا شعبہ ہوتے ہوئے بھی آزاد ہو اور سوراج پارٹی کو کانگریس کے سیاسی پروگرام کو چلانے کا پورا حق دے دیا جائے۔

مہاتما گاندھی کچھ دنوں کے بعد بنگال میں کام پورا کر کے بِہار کا دورہ کرنے کے لیئے آئے بِہار کے دَورے کی ابتدا چھوٹا ناگپور سے ہی کی گئی۔ اس کا خاص سبب یہ تھا کہ بِہار کی صوبائی پولیٹیکل کانفرنس کا اجلاس اِس سال پرُلیا میں شاہ محمد زبیر کی صدارت میں ہونے والا تھا۔ وہاں لوگوں نے بہت جوش کے ساتھ تیاریاں کی تھیں۔ چھوٹا ناگپور میں صوبائی کانفرنس کا یہ پہلا ہی اجلاس ہو رہا تھا۔ اِن لوگوں کی زبردست خواہش تھی کہ مہاتما جی بھی تشریف لائیں۔ گاندھی جی نے اِسے منظور کرلیا۔ ایک طرح سے اُن کا دَورہ وہیں سے شروع ہوا۔ اِس کے کچھ پہلے ہی مہاتما جی ایک بار جمشید پور بھی جاچکے تھے۔ وہاں مزدوروں کی تنظیم میں دیش بندھو داس دلچسپی لے رہے تھے۔ وہاں مزدور یونین بھی قائم ہوئی تھی۔ مگر ابھی تک اُسے ٹاٹا کمپنی نے منظور نہیں کیا تھا۔ دیش بندھو داس

کے بعد دین بندھو (یہ اُن کا لقب ہو گیا تھا) سی، ایف اینڈ ریوز اُس کے صدر چُنے گئے تھے۔ اُن کے اِصرار سے مہاتما جی نے وہاں جانا منظور کر لیا تھا۔ کمپنی کے مینیجنگ ڈائرکٹر مسٹر آر ڈی ٹاٹا وہاں آئے۔ کمپنی کی طرف سے مہاتما جی کا شاندار اِستقبال ہوا۔ میں بھی مہاتما جی کے ساتھ تھا۔ دو دِنوں تک وہاں ٹھہر کر اُنہوں نے کارخانے کو بھی خوب دیکھا ڈائرکٹروں سے باتیں بھی کیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یونین کو ٹاٹا کمپنی نے تسلیم کر لیا۔ مزدور ممبروں نے تنخواہ سے کاٹ کر اس کا چندہ جمع کرنے کا وعدہ بھی کیا، جو دوسری شکائتیں تھیں، اُنہیں بھی دُور کر دیا۔ اِس طرح پر یہ دورہ بہت کامیاب رہا۔

پُرلیا کی کانفرنس بہت دھوم دھام سے ہوئی۔ مہاتما جی بمبئی کی طرف سے آئے اُن کو ہم نے سینی میں ڈاک گاڑی سے اُتارا۔ وقت بچانے کے لئے وہاں سے پُرلیا تک اُنہیں ایک اسپیشل ٹرین میں لے آئے۔ کانفرنس کی خصوصیت یہ تھی کہ ایک اچھّی نمائش اس کے ساتھ ہوئی تھی جس کا افتتاح گاندھی جی نے کیا تھا۔ کانفرنس ختم کر کے گاندھی جی نے چھوٹا ناگپور کا دَورہ شروع کر دیا۔ اُمید تھی کہ وہ سارے صوبے کا دَورہ کر سکیں گے۔ دورہ کا پروگرام بہت کم بنایا گیا تھا۔ مگر وہ بہت ہی سخت ثابت ہوا۔ مہاتما جی کی صحت جو مہینوں کے دَورے کی وجہ سے پہلے ہی گرتی جا رہی تھی اُسے برداشت نہ کر سکی۔ ہم نے اِس دورے کو دو حِصّوں میں تقسیم کیا تھا۔ پہلے میں چھوٹا ناگپور اور دوسرے میں بِہار کے اور سب ضلع۔ چھوٹا ناگپور کا دَورہ ختم کر کے پٹنہ میں آل انڈیا کانگرس کمیٹی کے اِجلاس کے لئے کچھ ٹھہرنا اور پھر دوسرے ضلعوں میں جانا تھا۔ چھوٹا ناگپور کے دَورہ میں ہی مہاتما جی بہت تھک گئے تھے۔ آخری دن ہزاری باغ ضلع کا کام ختم کر کے کوڈرما اسٹیشن پر ریل میں سوار ہوتے ہوتے وہ بے ہوش سے ہو گئے۔ میں بھی ساتھ تھا۔ کسی طرح بھی

مجمع کو روکنا مشکل ہو رہا تھا۔ ہم لوگوں کو بھی اِس کا پورا اندازہ نہ تھا کہ اُن کی طبیعت کتنی زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ جب بات ظاہر ہو گئی تو ہم نے بہار کے باقی پروگرام کو کچھ دِنوں کے لئے ملتوی کر دیا۔ مہاتما جی کو پٹنہ میں گنگا کے کنارے ایک کوٹھی میں کچھ دنوں تک آرام کرنے کے لئے ٹھہرانا طے کیا گیا۔ اِس سے اُن کو بہت فائدہ پہنچا۔ بہار کے لوگ اِدھر اُدھر سے آ کر درشن بھی کرتے رہے۔

اُسی زمانے میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی نشست پٹنہ میں ہوئی۔ جس میں یہ طے ہوا کہ کانگریس کے آئین میں ترمیم اور مندرجہ بالا ترمیم کر دی جائے۔ اِس بات کی بھی اجازت دی گئی کہ کانگریس کا سارا سیاسی پروگرام، جس میں کونسلوں کا انتخاب بھی شامل تھا، سوراج پارٹی ہی پورا کرے۔ کانگریس کی طرف سے اُمیدوار کھڑے کئے جائیں اور اس کے اہتمام کا بار سوراج پارٹی کے لیڈر پنڈت موتی لال نہرو لیں۔ وہاں یہ بھی طے ہوا کہ کانگریس کے جو روپئے کھدر کی تبلیغ کے کام میں لگے ہیں وہ کانگریس سے وابستہ مگر اپنے کام میں آزاد ایک نئے اِدارے کے سپرد کر دئے جائیں۔ اِس طرح آل انڈیا چرخہ سنگھ وجود میں آیا۔ اِس کا دستور گاندھی جی نے بنا لیا۔ اس کے کئی لائف ٹرسٹی اور اکزکٹو کمیٹی کے ممبر ہوئے۔ ان میں سے ایک میں بھی تھا۔ مہاتما جی صدر ہوئے۔ اِس کے علاوہ ہر ایک صوبے میں کام کی دیکھ بھال کرنے کے لئے ایک ایجنٹ مقرر کیا گیا۔ اُس کی امداد کے لئے صوبائی سکریٹری بھی مقرر ہوا۔ بہار کے لئے میں ایجنٹ مقرر ہوا۔ اُتر پردیش کے لئے پنڈت جواہر لال نہرو بنگال کے لئے ستیش چندر داس گپت تامل ناڈ کے لئے شری راج گوپال آچاری وغیرہ۔ اِس طرح پر یہ سنگھ یک گونہ آزاد ہو کر کھدر کے پرچار کا کام کرنے لگا۔ اُس نے پچھلے سترہ اٹھارہ برسوں میں کھدر کے پرچار میں اور اس کے فن کو ترقی دینے میں بہت بڑا کام

کیا ہے۔ اِتنے دنوں میں اس نے کروڑوں روپیہ غریبوں کو خاص کر اُن غریب عورتوں کو جو دوسرا کوئی کام نہیں کر سکتی تھیں، مزدوری کے رُوپ میں بانٹا ہے۔ جب یہ طے کر لیا گیا کہ کانگریس کی طرف سے الکشن لڑا جائے تو پنڈت جی نے مجھ سے کہا کہ بہار کا بارتم کو سنبھالنا ہوگا۔ میں نے پنڈت جی سے وعدہ کر لیا اور یہ طے ہو گیا۔

اِس کے تھوڑے ہی دنوں بعد سب سے پہلے کونسل آف اسٹیٹ کا چناؤ ہوا۔ اِس میں بہار سے ایک مسلمان اور تین غیر مسلم ممبر چُنے جانے تھے۔ مسلم نشست کے لئے شاہ محمد زبیر اور غیر مسلم نشستوں کے لئے شری سری کرشن سنہا، بابو انوگرہ نارائن سنگھ اور میرے بڑے بھائی بابو مہیندر پرشاد کھڑے کئے گئے۔ مخالفوں میں مہاراجہ دربھنگہ اور ڈمراؤں کے مہاراجہ بہادر وغیرہ تھے۔ الیکشن میں کافی محنت کرنی پڑی۔ کیوں کہ رائے دینے والے خاص کر مال دار طبقہ کے زمیندار مہاجن اور تاجر وغیرہ تھے۔ اُن کی تعداد بہت نہیں تھی۔ مگر اُن کو کسی ایک جگہ جا کر رائے نہیں دینی تھی۔ وہ خود ہی کسی اعلیٰ سرکاری افسر کے سامنے کاغذ پر دستخط کر کے اپنا بیلٹ پیپر ڈاک سے بھیج سکتے تھے۔ اس لئے ایک طرح پر بیلٹ پیپر جمع کرنے کی دَوڑ دھوپ شروع ہو گئی۔ رائے دہندوں کے پاس کاغذوں کے پہنچنے کے بعد جتنی جلد اُن سے دستخط کروا کر اپنے حق میں بھجوایا جا سکے اُتنی ہی زیادہ کامیابی کی اُمید ہو سکتی تھی۔ اِس کے سوا اُڑیسہ بھی بہار کے ساتھ تھا۔ وہاں کے ووٹ بھی جمع کرنے تھے۔ ہم لوگوں کی کوششوں سے شاہ زبیر صاحب بابو انوگرہ نارائن سنگھ اور بابو مہیندر پرشاد چُن لئے گئے۔ چوتھی جگہ میں دربھنگہ کے مہاراجہ منتخب ہوئے بابو سری کرشن سنہا کے ہارنے کا ہم لوگوں کو بہت افسوس ہوا مگر مجبوری تھی یہ سب ۱۹۲۵ء کے ختم ہونے سے پہلے ہی ہو چکا تھا۔

سوراج پارٹی میں اختلافِ رائے:
کانپور کانگریس

اُوپر اُس کوشش کا ذکر آیا ہے جو سب پارٹیوں کو کانگریس میں شریک کرنے کے لئے کی گئی تھی۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ بلگاؤں کانگریس کے پہلے ہی آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ترکِ موالات کو ملتوی کر کے صرف بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ کو جاری رکھا تھا۔ ساتھ ہی اُس نے تعمیری پروگرام پر زور دیا تھا۔ کانگریس کی طرف سے کونسلوں میں سیاسی کام کرنے کا اختیار سوراج پارٹی کو دے دیا گیا تھا۔ اِس سے اُمید کی جاتی تھی کہ دوسری پارٹی والے کانگریس میں آجائیں گے جو آل پارٹیز کانفرنس بمبئی میں ہوئی، اِس سے اُمید اور بھی بندھ گئی تھی مگر افسوس یہ اُمید پوری نہ ہوئی۔ آل پارٹیز (سب پارٹیوں کی) کانفرنس نے جو سب کمیٹی مقرر کی تھی وہ کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکی۔ اپنی ناکامی کا اعلان کر کے وہ خاموش بیٹھ گئی۔ مگر اس کے بعد بھی کسی نہ کسی صورت میں اتحاد کا ذکر ہوتا رہا۔ اعتدال پسندوں اور مسٹر جناح جیسے لوگوں کو دو تین باتوں کی شکایت تھی۔ ایک بات تو یہ تھی کہ کانگریس نے اگرچہ اس وقت ترک موالات اور ستیہ گرہ

کو ہمیشہ کے لئے چھوڑ دینے کی بات تو دُور رہی اُن کے لئے تو وہ مُلک کو تیار کرنا چاہتی تھی اور اِس بارے میں غیر تبدیلی پسند اور سوراجی دونوں متفق تھے۔ اِن دونوں میں اِختلافِ رائے اِس بارے میں نہیں تھا۔ جو اختلاف تھا وہ اِس بارے میں کہ کونسلوں کے ذریعے مُلک کو تیار کرنے میں مدد ملے گی یا رُکاوٹ پیش آئے گی۔ غیر تبدیلی پسند کونسل کے کام کو ستیہ گرہ کے راستے میں روڑا سمجھتے۔ سوراجی لوگ کونسلوں کو بھی مُلک کی تیاری میں لگانا چاہتے تھے۔

دوسری بات یہ تھی کہ کانگریس کھدّر اور چرخہ کی تبلیغ پر بہت زور ہی نہیں دیتی تھی بلکہ اس نے بلگاؤں میں کھادی پہننے کو کم سے کم کانگریس کے کام میں لگے رہنے کے وقت — لازمی کر دیا تھا۔ اُس نے ممبری کے لئے سوت کاتنا بھی لازمی کر دیا تھا۔ کانگریس کے باہر کے لوگ نہ تو چرخے میں عقیدت رکھتے تھے اور نہ کھدّر پہننے کی ضرورت ہی محسوس کرتے تھے کانگریس کے اندر بھی کچھ لوگ اس خیال کے تھے جن میں خاص کر مہاراشٹر کے لوگ تھے۔ مگر اُن کی تعداد کم تھی۔ تیسری چیز جس سے باہر کے لوگ گھبراتے تھے یہ تھی کہ کانگریس نے کونسل کے کام کا بار اور اختیار سوراجیوں کے سپرد کر دیا ہے۔ باہر کے لوگوں میں زیادہ تر ایسے ہی لوگ تھے جو اِن کو زیادہ اہمیت دیتے تھے، وہ یہ سمجھنے لگے تھے کہ کانگریس کے اندر آکر بھی وہ اِن کونسلوں میں اپنے لئے جگہ محفوظ نہ رکھ سکیں گے اور نہ وہاں اپنی پالیسی کسی طرح چلا سکیں گے کیونکہ وہاں تو پالسی سوراجیوں کی ہی چلے گی۔ وہ اس رخنہ اندازی کی پالسی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اور مانتے تھے یہ کہ وزارت میں حصہ لے کر سب کو چاہیئے کہ آئین کو کام میں لائیں۔ اِس لئے جو کچھ تھوڑی بہت اُمید کبھی نمودار بھی ہوئی وہ اِن بنیادی اختلافوں کی وجہ سے مُرجھا گئی۔ پٹنہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ستمبر ۱۹۲۵ء میں سوراج پارٹی کو ہی کانگریس کی تنظیم ایک طرح سے سپرد کر دی۔ اب باہر کے لوگوں کا کانگریس میں شریک ہونا اور بھی دشوار ہو گیا۔

اور پھر بھی کہا جا چکا ہے کہ سوراج پارٹی کے اندر - خاص کر مدھیہ پردیش میں - جہاں اسمبلی میں اُن کی اکثریت تھی، دیش بندھو داس کے آخری دِنوں میں ہی وزارت سازی کے بارے میں کچھ سرگوشیاں ہونے لگی تھیں - اِن کی وفات کے کچھ ہی دنوں بعد یہ بات کُھل گئی کہ وہاں کے کچھ لوگ وزارت کا عہدہ لینے کے حق میں تھے - ابھی وزارت تو وہاں نہ بن سکی مگر ایک سر برآوردہ سوراجی مسٹر تامبے نے جو سوراج پارٹی کی طرف سے ممبر اور اسی پارٹی کی طرف سے کھڑے ہو کر اسمبلی کے صدر چُنے گئے تھے - وہاں کے گورنر کی اگزکٹیو کونسل کی ممبری منظور کرلی - اُنہوں نے ایسا کرنے سے پہلے نہ اپنے ساتھیوں کی منظوری لی اور نہ پارٹی کی اور نہ پارٹی سے استعفےٰ ہی دیا - اِس سے پارٹی میں بڑی کھلبلی مچ گئی پنڈت موتی لال نہرو نے سخت رُخ اِختیار کیا - اُدھر مہاراشٹر کے شری نرسنگھ چنتامنی کیلکر نے مسٹر تامبے کی تائید کی - شری جیکر نے بھی اُن کی نہیں مگر ایک طرح پر قبولِ عہدہ کی تائید کی - مدھیہ پردیش میں مسٹر ابھینکر نے زوروں سے اِس کی مذمّت کی - ڈاکٹر منجے اور مسٹر ابھینکر میں بہت اختلافِ رائے ہو گیا - یہ سب لوگ سوراج پارٹی کے خاص افراد میں تھے - اِس لئے یہ خانہ جنگی بہت بڑھ گئی - مہاراشٹر میں شری کیلکر اور مسٹر جیکر نے جوابی تعاون کی تبلیغ شروع کردی - پنڈت موتی لال نہرو پارٹی کی رخنہ اندازی کی پالسی پر قائم رہے اور اِسی کی تبلیغ کرنے لگے -

اِسی اختلاف رائے کے زمانے میں کانپور میں کانگریس کا اِجلاس ہوا - صدرِ اِجلاس مسز سروجنی نائیڈو چُنی گئیں - ایک برس پہلے وہ دکھنی افریقہ سے واپس آئی تھیں - وہاں اُنہوں نے بہت کام کر کے بڑا نام حاصل کیا تھا - اگر گاندھی جی کی بات چلتی تو وہ شاید اُن کو بلگاؤں کانگریس میں ہی صدر بناتے - مگر لوگوں کے اِصرار کو مان کر اُنہوں نے خود صدارت قبول

کرلی تھی۔ ایک طرح سے بلگاؤں کے پہلے سے ہی سب لوگوں کے دل میں کانپور کانگریس کے اُس اونچے عہدے کے لئے سروجنی نائیڈو چُنی جا چکی تھیں۔

کانپور کانگریس کی خصوصیت یہ تھی کہ سوراج پارٹی کو ہی پروگرام دینا تھا۔ اِس لئے پنڈت موتی لال نہرو جی کی رائے سے ہی ورکنگ کمیٹی نے کانگریس کی سبجکٹس کمیٹی کے واسطے تجویز تیار کی تھی۔ دکھنی افریقہ میں ہندوستانیوں کے خلاف جو نیا قانون بن رہا تھا، اُس کی مخالفت کی گئی۔ ایک دوسرے ریزولیوشن میں برما میں بھی جو ہندوستانیوں کے خلاف کارروائی ہو رہی تھی، اُس کی مذمّت کی گئی۔ مگر سب سے اہم تجویز وہ تھی جس کا تعلّق کونسلوں سے تھا۔ اُس میں یہ کہا گیا کہ اسمبلی میں تجویز پاس کر کے مُلک کی طرف سے جو سوراج کا مطالبہ کیا گیا ہے اُسے مان کر برٹش سرکار کو اُسی کے مطابق آئین بنانا چاہیئے۔ اگر وہ ایسا نہ کرنے کی خواہش ظاہر کرے یا فروری کے آخر تک اِس بارے میں کچھ نہ کہے یا جو کچھ کہے یا کرے وہ قابلِ اطمینان نہ ہو تو کونسلوں کے سوراجی ممبر اپنے بیان دے کر وہاں سے چلے جائیں اور جب تک پھر اجازت نہ ہو واپس نہ جائیں، اور تعمیری کام میں لگ جائیں۔ مخالفوں کا کہنا تھا کہ ۱۹۲۶ء کی جنوری سے مارچ تک جو نشست تھی تقریباً وہی آخری نشست تھی جس میں ۱۹۲۶ء میں چناؤ ہونے کے پہلے سوراجی لوگ شریک ہو سکتے تھے۔ اِس لئے وہ اگر نکلتے ہیں تو اُسی نشست کے آخری گئی دونوں کے اِجلاس شریک نہ ہو سکیں گے۔ یہ کوئی خاص اہمیت کی بات نہ ہوگی۔ ہاں اگر نکلنا ہے تو ہمیشہ کے لئے نکل آتے تو ایک بات ہوتی۔

خیر، کانگریس نے یہی طے کیا جس کا مطلب جوابی تعاون پارٹی کے لوگوں نے یہ لگایا کہ پھر ایک بار ترکِ موالات آہستہ آہستہ کانگریس کے پروگرام میں داخل ہونے لگا اور اِس حالت میں ان کا پروگرام چل ہی نہیں سکے گا۔ اِس لئے مسٹر جیکر، مسٹر کیلکر اور

ڈاکٹر منجے وغیرہ کونسل سے استعفٰی دے کر الگ ہو گئے۔ انہوں نے جوابی تعاون والوں کی نئی پارٹی قائم کی۔ میرا ذاتی خیال ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ہم کو اگر کونسلوں میں جانا ہی ہو تو وہاں جاکر آئین کے مطابق جو کچھ ہم کر سکتے ہیں کرنا چاہیئے۔ میں رخنہ اندازی کی پالسی کو کبھی سمجھ نہ سکا۔ اُس وقت بھی میرا خیال یہی تھا کہ سوراجی لوگ وہاں گئے ہیں تو وہاں کام کرنا چاہیئے۔ صرف رخنہ اندازی نہ کرنی چاہیئے۔ مگر ساتھ ہی میں یہ بھی مانتا تھا کہ وہاں جانا ہی بے کار ہے کیونکہ جو اختیارات ۱۹۲۰ء کے آئین کی رُو سے ملے تھے بالکل قابلِ اطمینان نہ تھے۔ وہاں جانے سے مُلک میں پریشان خیالی پھیلنے کے سوا دوسرا نتیجہ نہیں نکل سکتا۔ ترکِ موالات عوام کے خیالات کی زد کو برٹش سرکار اور اُس کے اِداروں کی طرف سے موڑ کر عوام کو اپنے قائم کردہ اِداروں کی طرف کھینچنا چاہتا تھا۔ اِس طرح وہ عوام میں تعمیری کام کی طاقت پیدا کرنا چاہتا تھا۔ داخلۂ کونسل اسی رَو کو پھر سرکاری اداروں کی طرف موڑتا تھا۔ اِس لئے میرے خیال سے وہاں جانا مفید نہیں تھا۔ لیکن اگر وہاں کوئی جانا ہی پسند کرے تو اُسے جو کچھ تھوڑا بہت نفع مُلک کے لئے مِلے لے لینا چاہیئے۔ سوراجی لوگوں کا خیال تھا کہ کونسلوں کے باہر رہ کر ترکِ موالات اُسی صورت میں ممکن ہے جب کوئی کونسلوں میں ہی جانے والا نہ ملے مگر ایسا ہو نہیں سکتا تھا۔ دوسری طرح کا ترکِ موالات اندر سے کیا جا سکتا ہے اور اُس کی شکل یہی ہو سکتی ہے کہ رخنہ اندازی کر کے مُلک کا جھگڑا نہ چلنے دیا جائے۔ ایسا انہوں نے کیا بھی۔ بنگال اور مدھیہ پردیش میں وزارت نہ چل سکی۔ خود گورنر کو ہی وزارت کے اختیارات اپنے ہاتھ میں لینے پڑے تھے۔ مرکزی اسمبلی میں اکثریت نہ ہونے پر بھی دوسری پارٹیوں کو ملا کر اُنہوں نے بجٹ کو نامنظور کرا دیا اور وائسرائے کو اِسے اپنے اختیاراتِ خصوصی سے منظور کرنا پڑا۔ اِس طرح جو کچھ رخنہ اندازی وہ کر سکتے تھے وہ کر دکھائی اور مُلک پر اِس کا اثر اچھا

پڑا تھا۔ خیر۔ میں تو داخلہ کونسل کا ہی مخالف تھا۔ ایسی حالت میں وہاں کیا پالسی چلائی جائے اِس کا فیصلہ کرنے والا میں نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ جو لوگ وہاں گئے ہیں وہی اس کا فیصلہ کریں۔ اُن کی رائے سے جو پالسی کانگریس اِس بارے میں اختیار کرے وہی مجھے مان لینی چاہیئے۔ اِس پالسی کو چلانے میں جو مدد میں دے سکوں دینی چاہیئے۔ مہاتما جی شاید اِس حد تک خود جانے کو تیار نہیں تھے، کیونکہ اُنہوں نے کہا تھا کہ اگرچہ سوراجیوں کے خیال سے کانگریس نے کونسل کا بائیکاٹ چھوڑ دیا تھا تو بھی کانگریس کسی کو کونسل کے لئے ووٹ دینے اور کسی طرح سے اُس کی مدد کرنے کے لئے پابند نہیں کر سکتی۔ میں اِس سے کچھ آگے بڑھتا تھا اور سوچتا تھا کہ جب کانگریس نے ایک بار داخلہ کونسل کا پروگرام اپنے ہاتھ میں لے لیا تو میرے ذاتی خیالات کچھ بھی ہوں مجھے حتی الوسع اِس پروگرام کو کامیاب بنانے میں مدد کرنی چاہیئے۔ اِسی پالسی کے مُطابق میں نے کام بھی کیا۔ الکشن میں پوری طاقت لگا کر خوب دَوڑ دھوپ بھی کی۔

کانپور میں بھی سودیشی کی نمائش ہوئی تھی، وہاں ہندوستانی سیوادَل کی اچھی تنظیم تھی۔ ایک دِن خبر پھیل گئی کہ کانگریس کے کیمپ میں کچھ لوگ آگ لگا دینے والے ہیں سیوادَل والوں نے ڈاکٹر ہارڈیکر کی سرکردگی میں پہرہ لگایا۔ اجلاس بغیر کسی ہنگامہ کے کامیابی کے ساتھ ختم ہوا۔ وہاں ایک اور واقعہ ہوا تھا۔ اجمیر کانگریس کا ایک صوبہ سمجھا جاتا تھا آئین میں اِسے بھی اور صوبوں کی طرح نمائندے چننے کا حق تھا۔ وہاں کے اِنتخاب کے سلسلہ میں کچھ شکائتیں تھیں اور اُس میں انتخاب کو ورکنگ کمیٹی نے رد کر دیا تھا جس پر کچھ لوگ ناراض ہو کر شری ارجن لال سیٹھی کی سرکردگی میں یا تو کانگریس میں زبردستی گھسنا چاہتے تھے یا دوسروں کو وہاں جانے سے روکنا چاہتے تھے۔ اِس نازک حالت میں بھی سیوادَل کو کام کرنا پڑا تھا۔

کانگریس میں ایک آزاد پارٹی

کانگریس کے فیصلے کے مطابق مارچ کے مہینے میں جب کوئی قابلِ اطمینان جواب نہ مل سکا تب آل انڈیا کمیٹی نے طے کیا کہ سوراج پارٹی کے لوگ مرکزی اسمبلی اور صوبائی کونسلوں سے نکل آئیں۔ اُنہوں نے ایک طے شدہ تاریخ پر ایسا ہی کیا بھی۔ پنڈت موتی لال نہرو نے جو سوراج پارٹی کے لیڈر تھے، اسمبلی میں ایک بیان دیا جس میں اس فیصلہ کی وجہیں بتا کر اس کی تائید کی اِسی طرح اور صوبوں کے لوگوں نے بھی کیا۔ سوراج پارٹی سے سبھی کونسلیں خالی ہو گئیں۔ طے کیا گیا کہ جو لوگ باہر نکلیں گے، وہ اپنا وقت تعمیری کام اور کانگریس کے اُصولوں اور پروگرام کو نشر کرنے میں لگائیں گے۔ کچھ نے ایسا کیا۔ مگر بہتیرے لوگ اپنے ذاتی من مانے کام میں ہی لگے رہے۔ اِسی سال کے آخر میں پھر نئے انتخابات ہونے والے تھے اِسی دوران کچھ افسوسناک واقعات گذرے جن کا ذکر کر دینا ضروری ہے۔

ہندو مسلم جھگڑے کئی برسوں سے چلے آ رہے تھے۔ ہندو مہاسبھا کی طرف سے، خاص کر آریہ سماج کی طرف سے، شُدھی اور سنگٹھن پر زور دیا جا رہا تھا۔ اِدھر مسلمانوں نے بھی تبلیغ اور تنظیم کی تحریکیں جاری کر دی تھیں۔ تلخی بڑھتی ہی گئی تھی۔ کوہاٹ کے فساد کا ذکر

کیا جا چکا ہے اور یہ بھی کہا جا چکا ہے کہ سرکار نے مہاتما گاندھی کو وہاں جانے سے روک دیا تھا بعدازاں مہاتما جی اور مولانا شوکت علی اِس سلسلہ میں تحقیقات کرنے کے لئے راولپنڈی گئے۔ وہاں سے آگے جانے کی اِجازت نہ تھی۔ اِس لئے وہیں لوگوں کو بلاکر حتی الامکان جانچ کی گئی۔ کچھ باتوں میں دونوں میں اتفاقِ رائے نہ ہوسکا۔ جب جُدا جُدا رپورٹ چھپی تو معلوم ہوا کہ جو دو آدمی برابر ایک رائے کئی برسوں سے رکھا کرتے تھے، اُن کا بھی اِس معاملہ میں اتفاقِ رائے نہ ہوسکا۔ مہاتما جی نے اپنے انداز میں لکھا بھی کہ اس سے لوگوں کو یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ یہ لوگ ہمیشہ صرف ہاں میں ہاں نہیں ملایا کرتے۔ کبھی کبھی مختلف رائے بھی رکھ سکتے ہیں۔ چاہے اِن دونوں حضرات کے جذبات میں فرق نہ آیا مگر اس کا اثر ملک پر اچھا نہیں پڑا۔ یہ مسئلہ اور پیچیدہ ہوتا گیا۔ سیاسی اختلاف تو تھے ہی مہاتما جی ایک طریقے پر سبھی سیاسی کاموں سے الگ ہوگئے، اُن کی صحت بھی بہت خراب ہوگئی تھی۔ کسی طرح اُنہوں نے کانپور کانگرس تک کام چلادیا۔ اس کے بعد ڈاکٹروں کی رائے سے اُنہوں نے ایک سال تک سابرمتی میں رہنے کا تہیّہ کرلیا۔ وہاں رہ کر وہ آشرم اور کھدّر کی تنظیم کو بہتر بنانے میں لگ گئے۔ کچھ لوگ جو یہ سمجھتے تھے کہ مہاتما جی رنجیدہ ہوکر الگ ہوگئے ہیں۔ بہت زور دینے لگے کہ اُن کو پھر رہنمائی کرنی چاہیئے۔ مگر یہ بات ہی نہ تھی۔ اُنہوں نے سابرمتی میں کام کرنا اپنی صحت اور مُلک دونوں کے لئے مفید سمجھا۔ اِس لئے وہ اپنے فیصلہ پر اٹل رہے۔

اِدھر ہندو مسلم جھگڑے بہت بڑھ گئے۔ کلکتہ میں بہت بڑا فساد ہوگیا۔ جس میں بہتیرے ہندو مسلمان مارے گئے۔ ہفتوں تک بلوہ فساد جاری رہا۔ بقرعید کے موقع پر کئی جگہ فساد ہوگئے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خلافت کمیٹی کے خاص لوگ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے۔ اُن کے ایک خاص اجلاس میں تلخ تقریریں ہوئیں۔ اس میں طے کیا گیا کہ

خلافت کمیٹی آیندہ مسلمانوں سے تعلق رکھنے والے سبھی معاملوں میں دل چسپی لے گی اور مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کا انتظام کرے گی۔ دوسری طرف ہندوؤں میں بھی بہتیری کڑوی تقریریں ہوئیں اور تحریریں لکھی جانے لگیں۔ ہمارے صوبے کے لئے ایک بات یہ ہوگئی، کہ پنڈت موتی لال نہرو اور محمد شفیع میں اختلافِ رائے ہوگیا۔ مولوی محمد شفیع نے اسمبلی میں استعفیٰ دے دیا۔ آزاد حیثیت سے پھر کھڑے ہوکر وہ چُن لئے گئے۔ اُنہوں نے آزاد حیثیت سے کچھ تبلیغ بھی شروع کردی۔ ہمارے صوبے کی فضا بھی بگڑتی جارہی تھی۔ مولانا مظہرالحق صاحب اِس سے بہت رنجیدہ تھے۔ اُنہوں نے بہار کے خاص خاص کانگریسی اور خلافت کمیٹی کے لوگوں کو اور چند دوسرے آزاد لوگوں کو بھی مدعو کر کے ایک چھوٹی سی کانفرنس چھپرا میں کی۔ کئی دنوں تک وہاں بہت صفائی اور خلوص کے ساتھ بات ہوتی رہی۔ ہم سب نے محسوس کرلیا کہ معاملہ ایسا ہے کہ اب اِس کا چھوڑنا ٹھیک نہیں اور جہاں تک ہم سے ہو سکے بگڑی فضا کو اور زیادہ بگڑنے سے روکنا چاہیئے۔ ہم سب نے طے کیا کہ اِس کے لئے ہم متحدہ کوشش کریں گے۔ اِس جلسہ میں ہم کو ایک بار اور حق صاحب کے حُبِّ وطن اور سچّی قوم نوازی کا ثبوت ملا۔ ہم سمجھ گئے کہ ہم کو ایک ایسا لیڈر ملا ہے جو ہندو مسلم اتّحاد کے لئے سب کچُھ قربان کرنے کے لئے تیار ہے اپنی زندگی کا بہت حِصّہ اُنہوں نے اِسی کام میں گذارا تھا۔ جب تک وہ جیتے رہے اِسی کوشش میں ہی لگے۔ کانفرنس کے فیصلہ کے مطابق حق صاحب، مولوی محمد شفیع، بابو جگت نارائن لال، میں اور دوسرے کئی بھائی صوبے کا دَورہ کرنے نکل گئے۔

اِس کا اثر صوبے پر بہت اچھا پڑا۔ مُلک میں اِس بات کا بہت چرچا ہونے لگا کہ بہار میں ہندو مسلم اِتّحاد کے مشکل مسئلہ کو حل کرنے کے لئے مولانا مظہرالحق صاحب کی رہنمائی

میں بہت مساعی جمیلہ ہورہی ہیں۔ بہار کی فضا بہت حد تک پُرسکون رہی۔ ایک اثر یہ بھی دیکھا گیا کہ جب کچھ دنوں کے بعد پھر کونسل اور اسمبلی کا انتخاب ہوا تو مسلمان بھی کانگریس کی طرف سے کھڑے ہوئے اور چُنے گئے۔ مولوی محمد شفیع اور پنڈت موتی لال نہرو کے اختلافِ رائے سے جو اَن بَن ہو گئی تھی وہ بھی جاتی رہی۔

نومبر کے مہینے میں الکشن ہوا۔ یہ تو اِدھر اچھا ہوا کہ بہار میں مولوی محمد شفیع صاحب ہم لوگوں کے ساتھ مل کر کام کرنے لگے مگر اُدھر لالہ لاجپت رائے اور پنڈت موتی لال نہرو میں اختلاف ہو گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پنڈت مدن موہن مالوی اور لالہ لاجپت رائے نے ایک نئی پارٹی بنائی۔ اِس پارٹی کی طرف سے جو اُمیدوار کھڑے کئے گئے۔ اُنہوں نے کانگریسی اُمیدواروں کی مخالفت کی۔ بہار میں بابو جگت نارائن لال کانگریس کے خاص کارکنوں میں تھے، اُن کے خیالات ہندو سنگھٹن کے حق میں تھے۔ وہ ہندو مہاسبھا میں خاص حصہ لینے لگے۔

اس وقت تک کانگریس میں ہندو مہاسبھا کا ممبر ہونا منع نہیں تھا۔ ہم میں سے بہت سے اِس کے ممبر تھے۔ اُوپر کہا جا چکا ہے کہ مظفّر پور کے سالانہ جلسہ (ہندو مہاسبھا) میں بودھ گیا کے متعلق تجویز پاس کرانے میں ہم نے بھی پورا زور لگایا تھا۔ اسی لئے اگرچہ کچھ لوگوں کو جگت بابو کا کانگریس سے اتنا گہرا ربط رکھنا اور ہندو مہاسبھا کو اتنا وقت دینا اچھا نہیں لگتا تھا۔ پھر بھی اُن کے ایسا کرنے میں کوئی آئینی رُکاوٹ نہیں تھی۔ مگر جب پنڈت مالوی جی اور لالہ جی نے آزاد کانگریس پارٹی کی تنظیم کرلی اور کانگریس کے فیصلہ کے خلاف کانگریسی امیدواروں کی مخالفت کرنے لگے تو حالت بہت بدل گئی۔ جگت بابو کانگریس کی طرف سے اُمیدوار کھڑے کئے گئے تھے۔ مگر اُسے

چھوڑ کر اُنہوں نے اِس نئی پارٹی کی طرف سے کھڑا ہونا پسند کیا۔ مجبور ہو کر اُن کی مخالفت کرنی پڑی۔ کچھ لوگ اور بھی جو کانگریس سے ناراض تھے یا جو کانگریس کے مخالف تھے یا جن کو کانگریس نے اُمیدوار نہ بنا کر کسی دوسرے کو بنا دیا تھا اُس پارٹی میں جا ملے ایسے لوگوں میں سارن ضلع کے بابو شری نندن پرشاد نارائن سنگھ شرما بھی تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہار میں بھی اس الکشن میں کافی گرمی آگئی۔ مالوی جی اور لالہ جی یہاں اپنے اُمیدواروں کی حمائت میں دورہ کرنے لگے پنڈت موتی لال جی اور دوسرے سوراجی لیڈر کانگریسی اُمیدواروں کی حمایت کے لئے پہنچ گئے۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکتا تھا کر ہی رہا تھا۔

میں اِسی دَورہ میں چھوٹا ناگپور گیا۔ پُرلیا سے رانچی موٹر پر جا رہا تھا۔ گاڑی خوب تیز جا رہی تھی، کیونکہ اُس دن رانچی میں اُمیدواروں کی درخواستوں کی جانچ ہونے والی تھی۔ ٹھیک وقت پر پہنچنا ضروری تھا۔ راستے میں ایک بھینسا گاڑی آگئی۔ موٹر کو اُس سے بچنے کے لئے موڑنا پڑا۔ وہ قابو سے باہر ہو کر ایک پیڑ سے ٹکرا گئی۔ میرے سر اور ناک پر چوٹ آئی۔ تھوڑی چوٹ اوروں کو بھی لگی موٹر کا کچھ حصہ ٹوٹ گیا۔ مگر ہم لوگ کچھ دیر کے بعد کسی طرح رانچی پہنچ گئے۔ کیونکہ یہ حادثہ رانچی کے نزدیک پہنچنے پر ہوا تھا۔ وہاں تو کچھ نہیں معلوم ہوا کہ مجھے چوٹ زیادہ ہے۔ ڈاکٹر نے پٹّی باندھ دی۔ میں دَورے کا کام کرتا رہا اور چھوٹا ناگپور کا کام پورا کر کے میں اُتر بہار میں چلا گیا۔ بیگو سرائے، ہمستی پور وغیرہ ہوتے ہوئے مظفر پور ضلع میں گیا۔ سیتا مڑھی پہنچ کر تقریباً ایک ہفتہ پٹنہ میں رہنے کے بعد سر میں درد معلوم ہوا۔ میں سمجھا کہ تھکاوٹ یا سردی لگ جانے کی وجہ سے درد ہے، کچھ دوا کھا لی اور آگے بڑھ گیا۔ خوش قسمتی سے اُس دن پٹنہ واپس آنے کا پروگرام تھا۔ وہاں پہنچتے پہنچتے درد بڑھ گیا۔ کئی دنوں تک بہت تکلیف رہی۔ ڈاکٹر لوگ بھی

کچھ طے نہیں کر سکتے تھے کہ یہ درد کیوں ہے۔ مگر دو تین دن کے بعد سارے چہرے پر ورم آ گیا۔ تب معلوم ہوا کہ یہ اُس چوٹ کا نتیجہ ہے جو موٹر کے حادثہ میں مجھے لگی تھی میں اِس بیماری کی وجہ سے اور کئی جگہوں میں جہاں جانا تھا نہیں جا سکا۔ الکشن میں بہت بیہودہ پرچار کیا گیا تھا۔ پنڈت موتی لال جی پر سرِ عام ذاتی حملہ کئے گئے تھے کہیں بھدّے کارٹون بھی دکھائے گئے تھے۔ ہم نے بہت زوروں سے اِن سب کی مخالفت کی نتیجہ یہ ہوا کہ جِن مقامات کے لئے ممبر چنے والے تھے۔ اُن میں زیادہ تر کانگریس کے ہی چُنے گئے آزاد پارٹی کے بھی بہت سے لوگ منتخب ہوئے جن میں بابو جگت نرائن لال اور بابو شری نندن پرشاد، نارائن سنگھ شرما تھے۔ یہ لوگ پہلے بہار کونسل میں سوراج دَل کے لیڈر شری میشور پرشاد کو جو کانگریس کی طرف سے کھڑے کئے گئے تھے۔ ہرا کر چُنے گئے۔ لوگوں کے بہت کہنے اور ضد کرنے پر مولانا مظہر الحق صاحب بھی کھڑے ہوئے تھے۔ اُن کا مقابلہ کیا گیا۔ دونوں اُمیدواروں کے حق میں برابر ووٹ آئے۔ فیصلہ کے لئے پرچی ڈالی تو حق صاحب کے مخالف کے حق میں نکلی۔ اِس طرح اِدھر صوبائی کونسل کے چناؤ میں کانگریسی لوگ ہی زیادہ تعداد میں چُنے گئے، پھر بھی حق صاحب جیسی ہستی منتخب نہ ہو سکی اور نہ کانگریس کا وہ اُمیدوار جو سوراج پارٹی کی رہنمائی قابلیت سے کر چکا تھا۔ ساتھ ہی یہ بھی صاف تھا کہ منتخب شدہ لوگوں سے اُن میں اکثریت رکھتے ہوئے بھی کانگریس کی مخالفت میں وزارت بن سکے گی۔ کیونکہ آئین کے مطابق ایک اچھی تعداد سرکار کے ذریعے نامزد ممبروں کی ہوا کرتی تھی۔ کانگریس کے مخالف لوگ اور ایسے نامزد ممبر مل کر کانگریس پارٹی سے تعداد میں زیادہ ہو جاتے تھے۔ مرکزی اسمبلی میں بھی ہماری زیادہ کامیابی رہی۔ وہاں جو ایک دو جگہیں ہمارے ہاتھ میں نہ آئیں اُن میں بھی کانگریس سے ہمدردی رکھنے والے ہی چُنے گئے۔ بہار کونسل میں کئی آدمی

جو آزاد حیثیت سے چنے گئے تھے کانگریس کے ساتھ ہی رہتے تھے۔ آزاد کانگریس پارٹی کے لوگوں میں سے کچھ کانگریس کے ساتھ اور کچھ وزارت کے ساتھ ہو گئے تھے۔ اِس طرح اِس الکشن سے کوئی بات صاف نہیں ہوئی، وزارت کے ساتھ جو کانگریس کی پہلے نیک فہمی تھی، اب وہ نہ رہی کیونکہ الکشن کے وقت ہمیں وزیروں کا اور اُن کے ذریعے حمایت شدہ اُمیدواروں کی مخالفت کرنی پڑی تھی۔ جب وہی لوگ پھر وزیر بن گئے اور اُن کی مخالفت کرنا کانگریسی ممبروں کا خاص کام ہو گیا، تب یہ اَن بَن اور بھی بڑھتی گئی۔ وزیر سر گنیش دت سنگھ کانگریسی اُمیدوار کے خوف سے کئی جگہوں سے کھڑے ہوئے تھے مگر کہیں سے اپنے مقام کو محفوظ نہ دیکھ کر اُنھوں نے مِل مِلا کر ایک اُمیدوار کو ایک ایسے مقام سے جہاں کانگریس نے کوئی اُمیدوار نہیں کھڑا کیا تھا، بٹھا دیا اور وہاں سے بلا مقابلہ چُنے گئے۔ اِس الکشن میں مذہب اور ذات پات کا پرچار کر کے کچھ لوگوں نے فائدہ اُٹھایا۔ شاید سبھی کانگریس والے بھی اِس سے اپنے کو بچا نہ سکے۔

برسات ختم ہونے کے وقت دسمبر میں گوہاٹی میں کانگریس کا سالانہ اجلاس ہونے والا تھا۔ صدارت سے مولانا مظہر الحق کے انکار کرنے پر مسٹر سری نواس آئینگر اتّفاقِ رائے سے صدر چُنے گئے، کیونکہ ڈاکٹر انصاری نے بھی جن کا نام پیش ہوا تھا اپنا نام ہٹا لیا تھا۔

بھائی صاحب اور میں دونوں معہ خاندان کانپور کانگریس میں گئے تھے وہیں میران بہن سے میری پہلی ملاقات ہوئی۔ وہ کچھ دن پہلے ہندوستان آ چکی تھیں۔ مگر مجھ سے مُلاقات نہیں ہوئی تھی۔ اِن دنوں سے ہی اُن کے جذبۂ پرستاری[ا] ایقان اور اعتقاد کی چھاپ میرے

[ا] بھگتی وشواس اور شردھا

دل پر پڑ گئی وہ ایک انگریز ایڈمرل (امیر البحر) کی لڑکی ہیں۔ اُن کے والد ہندوستان میں برسرِ عہدہ رہے تھے۔ اس زمانے میں وہ بھی اپنے والد کے ساتھ بمبئی میں تھیں۔ ایسی خاتون کا مہاتماجی کے آشرم میں رہنا اور وہاں کے لوگوں میں مِل جُل جانا انگریزوں کو کب پسند تھا۔ کچھ انگریزی اخباروں نے یہ خبر چھاپتے ہوئے لکھا کہ گاندھی جی نے اُن کو ایک طرح سے پھسلا کر رکھ لیا تھا۔ بات ایسی تھی نہیں۔ میراں بہن نے اس کی تردید کی۔ بات یہ تھی کہ جرمن کی لڑائی کے زمانے میں وہ جنگ کی خوں ریزی سے عاجز آگئی تھیں۔ وہ اِس تلاش میں گھر چھوڑ کر روماں رولاں کے پاس گئیں کہ وہ اِس قسم کی گرانبار زندگی سے بچنے کا کوئی راستہ بتا دیں گے مسٹر روماں رولاں نے اُنہیں گاندھی جی کی کتابیں پڑھنے کی صلاح دی اور کہا کہ اُن کے بغیر اُن کی پیاس نہیں بُجھ سکے گی۔ گاندھی جی کی لکھی جو کتابیں مل سکیں میراں بہن نے پڑھیں وہ جیسے جیسے پڑھتی گئیں، اُن کا عقیدہ جمتا اور مضبوط ہوتا گیا۔ آخر اُنہوں نے گاندھی جی کے پاس آنا چاہا گاندھی جی نے اُنہیں روکا۔ ولایت میں ہی وہ حتی الوسع آشرم کی زندگی گذارنے لگیں۔ آخر میں جب اُنہوں نے بہت ضد کی تب گاندھی جی نے آنے کی منظوری دی۔ تب سے وہ برابر اُن کے ساتھ ہیں جو کچھ اُن کا اپنا تھا گاندھی جی کو نذر کر دیا۔

وہیں سے میں کائستھ کانفرنس کی صدارت کرنے کے لئے جونپور گیا اس کا ذکر اُوپر کر چکا ہوں۔

بہار وِدّیاپیٹھ (قومی یونیورسٹی)
اور کھدّر کے پرچار کا کام

اُن دِنوں میرا زیادہ تر وقت کھدّر کے پرچار اور بہار ودیاپیٹھ کے خرچ کے لئے روپے جمع کرنے میں لگتا تھا۔ شروع میں ہی ہم لوگوں نے دیکھ لیا تھا کہ ودیاپیٹھ کی جانب بہتیرے بھائی کچھ بے رُخی سی رکھتے تھے۔ کچھ لوگ اسے بہ نظرِ حقارت دیکھتے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں ہی اس جذبے کا کچھ اظہار ہونے لگا تھا۔ سب سے زیادہ تعجب اور افسوس کی بات یہ تھی کہ جن لوگوں نے بہت زور دے کر اُسے قائم کرایا تھا، وہی لوگ یا تو بے اعتنائی کر رہے تھے یا مخالفت۔ شروع میں ایک کرائے کے مکان میں اُس کا قیام عمل میں آیا تھا۔ تقریباً دو سو روپے کرایہ دیا جاتا تھا۔ ہم نے سوچا کہ خرچ حتی الوسع کم کرنا چاہیئے۔ طے کیا کہ صداقت آشرم میں، جسے مظہر الحق صاحب نے کھول رکھا تھا۔ اور جس میں اُنہوں نے کچھ مکان بھی بنوا دیئے تھے اِسے لے جایا جائے۔ حق صاحب نے اس بات کو بہت پسند کیا، ہم ودیاپیٹھ وہاں لے گئے۔ کچھ نئے مکان بھی بنوا لئے گئے۔ جہاں تقریباً سبھی طالب علم

اور بیشتر معلّم رہنے لگے۔ طلبار کی تعداد کم ہونے لگی تھی۔ ضلعوں میں جو اسکول کھلے تھے، وہ بھی جابجا بند ہونے لگ گئے تھے۔ لوگوں کا حوصلہ کم ہو گیا تھا۔ بہتیرے اِسکول روپے یا طلبار کی کمی سے بند ہو چکے تھے تو بھی مارچ ۱۹۲۶ء میں ۹ ہائی اِسکول، ۱۶ مڈل اِسکول، اور ۳۰ پرائمری اِسکول چل رہے تھے۔ جن میں طلبار کی تعداد بھی علی الترتیب ۷۹۷، ۲۸۵، اور ۱۰۱۹ تھی اور معلّموں کی ۷۹، ۷۰ و ۳۴ تھی اور خرچ ۱۹۵۰، ۱۲۶۰، اور ۴۲۶ روپے مہینہ تھا یعنی کل اسکولوں کی تعداد ۵۵ تھی، جن میں ۱۸۳ معلّم کام کر رہے تھے اور ۳۶۳۶ روپے مہینہ خرچ ہو رہا تھا مگر کچھ اِسکول سبھی مصیبتوں کو جھیلتے ہوئے قائم رہ گئے اور آج تک چل رہے ہیں۔ ودیا پیٹھ کا قائم رہنا ہم نے ضروری سمجھا اِس لئے روپے وقتاً فوقتاً ضرورت پڑنے پر جمع کرنے لگے۔

ہم نے مہاراشٹر میں دیکھا تھا کہ کئی اِدارے لوگ سالانہ چندے سے چلاتے تھے، چندے کی رقم کسی ایک آدمی کی بہت بڑی نہیں ہوتی تھی، مگر بہت سے لوگ پانچ یا دس روپے یا اِس سے بھی کم رقم سالانہ دینے کے پابند کر لیئے جاتے تھے۔ اور اِدارہ کی سالانہ رپورٹ وی، پی کے ذریعے ایسے سبھی ممبروں کے پاس بھیج دی جاتی تھی چند دِنوں میں ہی بھی روپے وی پی کے جواب میں آجاتے تھے۔ ہم نے بھی کچھ ایسا ہی کرنے کو سوچا۔ گھوم پھر کر پانچ روپئے سالانہ کے ممبر بنوائے۔ جو لوگ یک مُشت بڑی رقم دے دیتے اُن کو لائف ممبر (تاحیات رکن) یا ٹرسٹی بنا لیتے مگر ہمارے صوبے میں لوگوں کو اس طرح پابندی کے ساتھ سالانہ چندہ دینے کی عادت نہ تھی۔ اُنہوں نے وعدہ تو کیا اور ممبری کا فارم بھی بھر دیا لیکن سال ختم ہونے پر بڑی مشکل سے روپے دیئے ایک دو برس کے بعد وہ بھی بند کر دئے یہ وقت نہیں تھا کہ خاص خاص لوگ ہر سال ممبروں کے پاس موعود

رقم وصول کرنے کے لئے جائیں۔ لہذا ہمارے لئے یہ تدبیر کارگر نہیں ثابت ہوئی۔ گھوم پھر کر جہاں گئے وہاں سے ہم کو کچھ لانا پڑتا ہی رہا۔ ہاں پٹنہ میں چند اصحاب نے کچھ ماہانہ رقم دینا منظور کیا۔ اور ان میں سے بہتیرے برابر دیتے بھی رہے۔ شروع میں ہی ایک صاحب (شری بھگوان داس) نے کچھ زمین عطیہ کے طور پر دے دی تھی۔ جس کی تھوڑی آمدنی ہر سال ملتی جاتی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد منظفرپور میں شری گجادھر پرشاد ساہو نے اپنے ٹرسٹ میں سے ودیاپیٹھ کے لئے بھی کچھ دیا۔ یہ رقم برابر ملتی جاتی تھی، اس طرح ودیا پیٹھ کی مالی دشواری ہمیشہ قائم رہی۔

ہم نے اِس بات کی کوشش کی کہ اچھے عالموں کو وہاں بلائیں جس سے بچوں کو اِس کی افادیت اور وہاں ملنے والی تعلیم پر اعتماد ہو۔ بنارس سے مشہور عالم شری رام داس گوڑ بھی آئے۔ اِسی طرح بنگال سے بھی ایسے عالم اُستاد لائے گئے جنہوں نے یونیورسٹیوں میں اعزاز کے ساتھ امتحانات پاس کئے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد قدیم تاریخِ ہند کے مشہور ماہر شری جے چند ودیا النکار بھی ودیا پیٹھ میں تاریخ کے معلّم ہو کر آگئے۔ اِن کے ساتھ میرا تعارف اُسی زمانے میں ہوا تھا اور آئندہ زیادہ ربط ضبط ہو گیا۔ اور بھارتیہ اتہاس پریشد (ادارۂ تاریخ ہند) کے قیام کے اسباب میں سے ایک خاص سبب ہوا۔ یہ سب ہونے پر بھی طلبار کی تعداد گھٹتی گئی۔ ہم نے وقتاً فوقتاً وہاں کے نصابِ تعلیم میں بھی تبدیلی کی۔ اِس بات کا بھی اہتمام کیا کہ طلبار صرف کتابی تعلیم نہ پاکر زیادہ صاحبِ علم، مُحبِّ وطن بنیں۔ مگر سب کچھ کرنے پر بھی قومی تعلیم بہت ہی محدود دائرہ میں رہ گئی۔ پھر بھی جہاں تک رہ گئی ہمارے طلبار اور معلّم اچھے خدمت گذار نکلے ہیں۔ ستیہ گرہ کے زمانے میں اُنہوں نے ہمیشہ بہت کام کیا ہے۔

مارچ سنہ ۱۹۲۶ء میں کنووکیشن کے موقعہ پر ایڈریس کے لئے شری راج گوپال آچاری

بلائے گئے۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ تعلیم گاہ ہمارے حوصلہ کی جوت جگائے ہوئے ہے۔ یہ بات حرف بہ حرف سچ ہے۔ کنووکیشن بڑے جوش سے ہوا۔ اُن کی تقریر بھی بہت حسین اور زوردار تھی۔ جو لوگ اس تقریب میں شریک ہوئے سب نے دل کھول کر اس کی تعریف کی۔ ودّیا پیٹھ اور اُس کے طلبا کی سادہ زندگی اور سرکاری یونیورسٹیوں کے کنووکیشن کی شان و شوکت یاد کر کے سب لوگ ہمارے چھوٹے سے ادارہ کی افادیت کے قائل ہو گئے۔

ودّیا پیٹھ کے ماسوا میرا زیادہ تر وقت کھدّر کے کام میں لگتا تھا۔ جب سے کھدّر کا کام شروع ہوا، میری دلچسپی اُس میں تھی۔ مگر اُن دنوں جتنا وقت میں اِس میں دے سکا اُتنا پہلے کبھی نہ دے سکا تھا۔ بہار میں کھدّر کا کام ۱۹۲۱ء میں ہی شروع ہوا۔ جب تک سوراج فنڈ سے ایک اچھّی رقم بہار صوبائی کمیٹی کو اس کام کے لئے ملی تھی، اِس کام کے چلانے کے لئے ملی تھی۔ اِس کام کے چلانے کا بار شروع میں صوبائی کمیٹی نے ہی لیا۔ کئی ضلعوں میں اِس کی طرف سے کچھ لوگ اِس کے چلانے کے لئے مقرر ہوئے نہ تو صوبائی کمیٹی میں اِس کام کا کسی کو تجربہ تھا، نہ اِن لوگوں میں سے کسی کو۔ نتیجہ کچھ اچھّا نہ نکلا۔

کانگریسی کارکن شری رام بنود سنگھ نے آزادانہ حیثیت سے یہی کام شروع کیا، اُن کو آچاریہ کرپلانی سے مدد ملی۔ مدھوبنی میں ایک پیداوار کا مرکز کھول کر وہ اچھا کھدّر تیار کرنے لگے۔ یہ کھدّر دوسرے صوبوں تک پہنچا۔ کھدّر کے متعلق کام اور بہار کا نام انہوں نے اُونچا کیا۔ آچاریہ کرپلانی کی سفارش اور میری منظوری سے اُن کا کام بڑھانے کے لئے ایک بڑی رقم کا قرض کھدّر بورڈ کی طرف سے ملا۔ صوبائی کمیٹی کا کام چنداں کامیاب نہ ہوا۔ کیونکہ کام پھیلایا تو گیا بہت مگر اُس میں نہ تو سائنٹیفک علم کا زیادہ استعمال ہوا اور نہ تاجرانہ عقل کا ہی اِس لئے اس میں خسارہ بھی بہت رہا، جب آل انڈیا چرخہ سنگھ قائم ہو گیا اور میں ایجنٹ مقرر

ہوا اور شری لکشمی نارائن سکریٹری بنے تب نئے سرے سے سارے کام کی تنظیم کی گئی۔ بہت سے بھنڈار (سٹور) بند کر دئے گئے۔ جہاں بغیر خسارے کے کام ہو سکتا تھا وہاں جاری رکھا گیا۔ اِس سے کچھ کانگریسی کارکن غیر مطمئن بھی ہوئے جو کھدّر کے کام میں آئے اُن کی ضابطہ بندی بھی زیادہ ہونے لگی۔ یک دلی سے اِس کام میں لگنے کے لئے اُن پر زور دیا گیا نتیجہ کے طور پر کام کا ڈھنگ بہت بہتر ہو گیا۔ کھدّر کی پیداوار اور فروخت میں اضافہ ہونے لگا۔

میں ان دنوں کھدّر کی تیاری کے سبھی مرکزوں میں سال میں تقریباً ایک بار جایا کرتا تھا۔ وہاں ایک ایک دو دو دن رہ کر کام دیکھا کرتا تھا۔ بھنڈار (سٹور) میں جہاں سوت کی خرید اور روئی کی فروخت ہوتی تھی، خود بیٹھتا بھی تھا۔ اپنے ہاتھوں روئی، سوت تولتا اور بیچتا، خریدتا تھا۔ کپڑے کی بُنائی کو بھی جا کر دیکھتا۔ اور تیار کپڑے کے دام بٹھلانے کے کام میں حتی الوسع حصہ لیتا اِس سے میری ذاتی واقفیت بڑھتی گئی۔ ساتھ ہی یہ بھی تجربہ ہوتا گیا کہ ہم اِس معاملہ میں کتنی کم واقفیت رکھتے ہیں اور یہ واقفیت نہ ہونا ہی خسارہ کا خاص سبب تھا جو ہم خرچ کا بجٹ بناتے اِسے چرخہ سنگھ کے سکریٹری شری شنکر لال بینکر اور اُن کے دفتر کے لوگ خوب سوچ سمجھ کر منظور کراتے۔ پھر بھی کئی بار خسارہ ہو گیا۔

اِس زمانے میں کھدّر کو بڑھاوا دینے کے لئے ہم سب کی خواہش رہتی تھی۔ آل انڈیا چرخہ سنگھ کی بھی پالسی تھی کہ ہم جتنا سستا کھدّر بنا اور بیچ سکیں اتنا ہی اچھا ہے اِسی پالسی کے مطابق سستی سے سستی شرح پر سوت خریدنے، کم سے کم بُنائی دے کر اُسے بُنوانے اور دُکانوں میں کم سے کم خرچ کر کے اُسے بیچنے کی کوشش کی جاتی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ کارکنوں کی کمی اور ناقابلیت کے سبب سے دکانوں میں فروخت ٹھیک نہ ہوتی، مال کا حساب ٹھیک نہ رہتا اور تیاری کے مرکزوں کا حال اگرچہ کچھ بہتر ہوتا، پھر بھی پورا

اطمینان بخش نہ ہو پاتا، اِس لئے اِس دیکھ بھال کی بہت ضرورت ہوتی۔ اتنا ہم ضرور کہیں گے کہ اِن دِنوں جتنی شاخیں تھیں اُن میں بہار کا کھدّر بشیتر اچھّا اور سستا ہوتا تھا بار یک کھدّر کے لئے آندھر مشہور تھا۔ بہار کی کٹی سبھی صوبوں میں جاتی۔ اِس سے بہار کی شہرت کافی ہوگئی۔ رنگائی، چھپائی کا کام بھی شروع کر دیا گیا تھا۔ اب رنگ برنگ کا کھدّر مل سکتا تھا۔ مگر میرے اطمینان کے قابل ابھی پکّی تنظیم نہیں ہو پاتی۔

جب کام شروع کیا گیا تھا تو کھدر بھنڈار کا دفتر اور خاص اسٹور پٹنہ میں ہی تھا کھدّر زیادہ تر دربھنگہ ضلع میں تیار ہوتا تھا مگر مرکز پھر بھی پٹنہ ہی میں تھا اِس سے ذرا دشواری تھی مگر ہم سبھی پٹنہ میں ہی رہتے تھے۔ اِس لئے مرکزی بھنڈار اور دفتر کو وہاں سے ہٹانے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ جب لکشمی بابو سکریٹری ہو گئے اور کام بڑھانے کا خیال ہوا تو فیصلہ کیا گیا کہ کاروبار پٹنہ سے ہٹا کر مظفر پور لایا جائے۔ پٹنہ کے دوست اس کے سخت مخالف تھے مگر میں نے اِس میں فائدہ دیکھا اور ہٹانے کی رائے دیدی مظفر پور میں اکھاڑہ گھاٹ پر گنڈک ندی کے کنارے کچھ جھونپڑے بنے جن میں کارکن رہنے لگے اور وہاں رنگائی وغیرہ کا کام ہونے لگا۔ جگہ بہت اچھی تھی۔ میں بھی کبھی کبھی جاکر وہاں رہتا۔ مال رکھنے کا گودام اور خاص بھنڈار شہر میں سریاں گنج میں کرایہ کے مکان میں رکھے گئے تھے۔ وہاں سے کام بہت بڑھا، کچھ دنوں کے بعد ہم نے محسوس کیا کہ یہ انتظام بھی ٹھیک نہیں ہے۔ کیونکہ پیداوار کے مرکز خاص کر دربھنگہ ضلع میں تھے۔ وہاں سے کپڑا تیار کرا کر مظفر پو لایا جاتا، مظفر پور میں دُھلائی، رنگائی، چھپائی وغیرہ کا کام ہوتا۔ تب وہاں سے فروخت کے لئے بھنڈاروں میں کھدّر بھیجا جاتا۔ اِس میں خرچ زیادہ پڑتا، اِس لئے طے ہوا کہ خاص بھنڈار (دربھنگہ) میں ہی لے جایا جائے۔ اِس کے پہلے رام بنود کا بھنڈار وہاں تھا ہی۔ اِس لئے چرخہ سنگھ کا

کام زیادہ نہ ہوکر پنڈول میں ہی ہوتا تھا تاکہ دونوں اِداروں میں آپس میں رقابت نہ ہو اور دونوں آزادانہ کام بڑھاتے اور چلاتے رہیں مگر کچھ دنوں میں رام بنود بابو اور اُن کے شرکار کارنے جن میں سے خاص شری دھجا پرشاد اور رام دیو ٹھاکر تھے۔ اختلافِ رائے ہوگیا۔ رام بنود بابو کا کام بھی چرخہ سنگھ کے مقابلے میں کم ہوگیا۔ اِس لئے اب مدھوبنی جانے میں ہی سہولت نظر آئی، ایک تو وہ بہت بڑا مرکز ہوسکتا تھا۔ دوسرے بہت سے پیداوار کے مرکزوں کے لئے وہ ایک ایسی جگہ تھی جہاں سے کارکنوں کو آنے جانے میں کافی سہولت تھی۔ تیسرے ریل، تار، ڈاک، بینک وغیرہ کی بھی آسانی تھی۔ اِس لئے مظفر پور سے دفتر اور مرکزی سٹور ہٹاکر مدھوبنی، لے جائے گئے۔ آہستہ آہستہ وہاں چرخہ سنگھ کا اپنا مکان بن گیا۔ آج تو وہ ایک قابلِ دید مقام ہوگیا ہے۔ اِس میں نہ جانے کتنے سال لگے ہیں۔ مگر ایک جگہ ہی اِس کا ذکر کر دینا ٹھیک سمجھا۔

سنہ ۱۹۲۶ء میں کھدر کے متعلق میرا خاص کام یہ بھی رہا کہ جگہ جگہ کھدّر کی نمائش کراؤں میری کوشش تھی کھدّر میں سب لوگوں کی دلچسپی پیدا ہو، اِسی مقصد سے پٹنہ میں نمائش کامیابی کے ساتھ کی گئی تھی، جس کا ذکر پہلے آگیا ہے۔ سنہ ۱۹۲۶ء کی نمائش میں بھی اس کا خاص اِہتمام کیا گیا۔ جا بجا انگریزوں اور دوسرے غیر ملکیوں نے بھی دلچسپی لی۔ بیتیا (چمپارن) کی نمائش کا اِفتتاح اُس زمانے کے بیتیا راج کے مینیجر مسٹر ایچ، سی پرائر آئی، سی ایس نے کیا۔ مسٹر رور فورڈ کے ہٹ جانے پر وہی یہاں کے مینیجر ہوئے تھے۔ موتی ہاری کی نمائش کا افتتاح ریورینڈ جے اینڈریوز نے کیا۔ وہ ایک معزز پادری تھے جن کا تعارف گاندھی جی سے اور مجھ سے پہلے ہی ہو چکا تھا، جمشید پور میں بھی ایک معرکہ کی نمائش کی گئی ٹاٹا کمپنی کے بڑے افسر مسٹر ٹِل سے جو خود انجینیر تھے اور جمشید پور کے ٹاؤن ایڈمنسٹریٹر بھی نمائش

کے افتتاح کرنے کا اصرار کیا گیا۔ انہوں نے اسے مان لیا۔ کھدر کی افادیت پر تقریر بھی خوب کی۔ کمپنی کے جنرل منیجر مسٹر کینن اور اُن کی میم صاحبہ جو دونوں امریکی تھے۔ نمائش میں آئے۔ دونوں نے کچھ کھدّر بھی خریدا۔ اِن نمائشوں سے کھدّر کی تبلیغ ہی نہیں ہوئی بلکہ فروخت بھی خوب ہوئی جو مال نیا تیار ہوگیا تھا اس کی نکاسی میں پوری مدد ملی۔ ۱۹۲۵ء میں گاندھی جی نے بہار کے کچھ ضلعوں میں جو دورہ کیا تھا اس میں کھدر اور دیش بندھو داس میموریل کے لئے روپیہ جمع کیا تھا۔ بہار میں تقریباً پچاس ہزار روپے جمع ہوئے تھے۔ یہ رقم سرمائے میں جوڑ دی گئی تھی، اِس سے کام خوب بڑھنے لگا تھا۔

مگر مہاتما جی کی صحت اکثر خراب ہو جاتی، خون کا دباؤ بڑھ جاتا وہ گرمی کے دنوں میں میسور راج کے نندی پہاڑ پر آرام کرنے کے لئے گئے، وہاں میں بھی گیا۔ اُن کے ساتھ کئی دنوں تک ٹھہرا۔ مقام بہت ہی خوش گوار تھا۔ پہاڑ پر چڑھائی کچھ محنت کا کام تھا۔ مگر ابھی تک میرا دمہ اتنا نہیں بڑھا تھا۔ گرمیوں میں تو میں تقریباً اچھا ہی رہتا تھا، اِس لئے میں پہاڑ پر پیدل ہی چڑھ گیا یوں ہی واپسی میں اُترا بھی، اِس صوبے میں یہ میرا پہلا سفر تھا، وہاں سے مہاتما جی کے ساتھ بنگلور آیا۔ اور ٹھہرا۔ وہاں کھدّر کی ایک نمائش بہت ہی اچھّی ہوئی۔ جس میں زیادہ تر حصہ تامل ناڈ اور آندھر کی شاخوں نے ہی لیا۔ اپنے ڈھنگ کی وہ نمائش بہت ہی اچھی ہوئی۔ وہاں سے ریاست میسور میں کھدّر کی تبلیغ کی تنظیمی شکل میں بُنیاد پڑی۔ اِس موقع پر کھدر کے متعلّق عملوں میں نمائش کے ساتھ ساتھ کھدّر کے متعلّق تقریریں بھی ہوئیں۔

ہندی کی اشاعت کا کام بھی دکن میں ہوتا رہا۔ وہاں ایک خاص اجلاس کر کے کچھ فارغ التحصیل طلباء کو سارٹیفکٹ تقسیم کئے گئے۔ میں نے پہلے پہل ہندی کے متعلّق

یہ جوش دیکھا۔ ایک ہی ساتھ شوہر اور بیوی، ماں بیٹی، ساس بہو اور باپ بیٹے ہندی سیکھنے والے ملتے۔ ایک ہی ساتھ امتحان میں بھی بیٹھتے۔ میرے لئے یہ سب نیا تجربہ تھا۔ اِس سفر کو اپنے لئے میں بہت ہی سبق آموز مانتا ہوں۔

بنگلور میں نمائش ختم ہونے کے بعد میں نے دکن کے کئی مقامات کا دورہ کیا۔ تامل ناڈ کے خاص کھدّر اسٹور کو دیکھا۔ یہ ترّوپور میں تھا۔ دوسرے کئی اور بھنڈاروں کو بھی جاکر دیکھا۔ راجہ جی نے اپنا آشرم سیلم ضلع میں بنا رکھا تھا۔ وہاں وہ کھدر کا کام بہت زوروں سے چلا رہے تھے۔ وہاں بھی گیا۔ اِن سب جگہوں میں وہاں کے کام کی ترتیب اور تنظیم کے طریقوں کا پوری طرح مُطالعہ کیا، جو کچھ نیا اور علمی علم وہاں مِلا اُسے اپنے صوبے میں داخل کرنے کی کوشش بھی کی۔ وہاں کی تنظیم اور حساب رکھنے کا طریقہ مجھے بہت پسند آیا۔ میں نے اُن کا مُطالعہ کیا۔ اِن دِنوں سب سے زیادہ کھدّر تامل ناڈ میں تیار ہوتا تھا۔ سب سے نفیس باریک کھدّر (کوکٹی کو چھوڑکر) آندھرا میں تیار ہوتا تھا اِس لئے میں نے سوچا کہ تامل ناڈ میں کھدّر کی تنظیم دیکھنے کے بعد آندھرا بھی جانا چاہیئے۔ وہاں کے چرخہ سنگھ کے سکریٹری شری سیتا رام شاستری کا اصرار بھی تھا کہ میں چلوں اور کھدر کے متعلّق تقریر بھی کروں۔

واپسی پر میں آندھرا ہوتا ہوا آیا۔ وہاں کے کئی ضلعوں میں گیا۔ سبھی جگہ میں نے کھدّر کے متعلق تقریر کی۔ میری تقریریں وہاں انگریزی میں ہی ہوئیں۔ میں نے دیکھا کہ میں جب سائنٹیفک طریقے سے کھدّر کے متعلّق لوگوں کو سمجھاتا اُس کا اثر کافی اچھا پڑتا۔ خاص کر پڑھے لِکھے طبقہ پر جو اکثر کھدّر کی اِفادیت اور کامیابی کے متعلّق بہت شک وشبہ رکھا کرتا تھا۔ وہاں کے لوگوں کا کہنا تھا کہ میرے دورے سے کھدّر کی تبلیغ میں اچھی مدد ملی۔

جب میں پٹنہ واپس آیا تو کچھ بھائیوں کا خیال ہوا کہ جو کچھ میں نے اپنی تقریروں میں کہا ہے قلم بند کر دیا جائے تو اچھا ہوگا۔ اس لئے میں نے اپنی تقریروں کا خلاصہ لکھ ڈالا۔ اِکنامکس آف کھادی (ECONOMICS OF KHADI) کے نام سے اِسی کی ایک کتاب کی شکل میں اِشاعت ہوئی۔ اِس کا ہندی ترجمہ بھی 'کھادی کا ارتھ شاستر' کے نام سے شائع ہوا۔ اس طرح اِس سال کا بیشتر حِصّہ کھادی کے کام میں ہی گذرا۔

کانپور کانگریس کے زمانے میں آسام سے کچھ لوگ آئے تھے۔ جن میں ایک فردِ خاص شری نوین چندر باردولوئی تھے۔ یہ میرے ایک دیرینہ دوست تھے۔ اُن کے ساتھ اِس زمانے میں ہی ربط ضبط ہو گیا تھا جب ہم دونوں کلکتہ ہائی کورٹ میں وکالت کیا کرتے تھے۔ تحریکِ ترکِ موالات میں یہ شروع سے ہی آ گئے تھے اور اپنے صوبے کے خاص لوگوں میں سے تھے۔ اِن لوگوں کی خواہش تھی کہ کانگریس کا آیندہ اِجلاس آسام میں ہی مدعو کریں۔ اِس بارے میں اُنہوں نے میری رائے لی۔ میں نے ان کو منع کیا کیونکہ گیا کانگریس کے تجربے نے مجھے بتا دیا تھا کہ کانگریس کے اِجلاس میں بہت طوالت ہے اور آسام چھوٹا سا صوبہ ہے۔ پہلے تو کافی رقم جمع کرنے میں ہی مشکل ہو سکتی ہے کیونکہ آسام صرف چھوٹا ہی نہیں غریب صوبہ بھی ہے۔ دوسرے کانگریسی لوگ سرکاری صوبے کے صرف اُسی حِصّے کو آسام کہتے ہیں جس کی بولی آسامیوں کی ہے، یعنی برہم پتر کی گھاٹی۔ جو بنگلہ بولنے والا حِصّہ ہے۔ جسے سرما گھاٹی کہتے ہیں، وہ تو بنگال کے ساتھ ہے۔ اِس طرح صوبہ اور بھی چھوٹا ہو گیا ہے۔ کارکنوں کی تعداد بھی کافی نہیں ہے۔ اِتنے پر بھی اِن لوگوں میں جوش بہت تھا۔ اُنہوں نے میری بات نہیں مانی، کانگریس کو مدعو کر ہی لیا۔

ان لوگوں کی یہ بھی خواہش تھی کہ کانگریس کے اِجلاس سے پہلے ہی اِس صوبے میں

کھدّر کے کام کی پھر سے تنظیم ہو جائے۔ پہلے کچھ کام ہوا تھا۔ مگر موزوں کارکن نہ ملنے کی وجہ سے ٹھیک نہ چلا تھا۔ اُسے بند کر دینا پڑا تھا۔ اُنہوں نے اِس کی ازسرِ نو تنظیم میں مجھ سے مدد مانگی۔ میں انکار نہ کر سکا۔ وہاں جانے کا وعدہ کر لیا۔ کچھ دنوں کے بعد وہاں گیا بھی۔ آسام کے کئی ضلعوں میں جہاں کھدّر کا کام اچھی طرح چل سکتا تھا، دَورہ کیا۔ اُس دَورہ کا تجربہ بہت ہی اچھا رہا۔ کھدّر کے لئے آسام ایک نہایت موزوں صوبہ ہے۔ کیونکہ اِس کے لئے وہاں جیسی سہولتیں ہیں۔ ویسی شاید ہی کسی اور صوبے میں ہوں۔ ریشم کے کیڑے پالنے، اُن سے سوت نکالنے اور اُس سوت کو بُن لینے کا رواج ابھی تک آسام میں جاری ہے۔ کپڑا بُننا وہاں کی عورتیں اِسی طرح جانتی ہیں جیسے ہمارے صوبے کی عورتیں سینا پرونا۔ اچھّے گھروں کی لڑکیوں کی تو شادی ہی نہیں ہو سکتی اگر وہ اچھّی طرح بُنائی نہ جانتی ہوں۔ وہ بُنائی بھی معمولی بُنائی نہیں، وہ اپنے کرگھوں پر رنگ برنگے پھول بھی بُن سکتی ہیں نہایت خوب صورت پھول دار کناروں کی ساریاں بھی بُن سکتی ہیں۔ تقریباً سبھی گھروں میں کرگھے چلا کرتے ہیں کرگھے بھی اکثر بانس سے ہی بنے ہوتے ہیں۔ بُنائی کے سوا وہاں کی عورتیں سوت کاتنا بھی جانتی ہیں۔ مجھے وہاں یہ دیکھ کر بہت حیرت آموز مسرت ہوئی کہ وہاں کی عورتیں کھدّر بھنڈار میں تیار کپڑا لے کر آتیں اور اُس سے روئی بدل کرے جاتیں۔ اِس صوبے کے کچھ حصّہ میں روئی بھی پیدا ہوتی ہے جو بہت اچھّی تو نہیں کہی جا سکتی، پھر بھی کام چلانے کے لئے ٹھیک ہے۔ اِس طرح میں نے اِس صوبے میں کھدّر کے پرچار کے لئے بہت اچھّا میدان پایا۔ میرے زور دینے پر کچھ روپئے دئے گئے، پھر وہاں کا کام منظّم طریقے پر چلنے لگا۔

گوہاٹی کانگریس

گوہاٹی میں جو کانگریس کا اجلاس ہوا اُس کے لئے وہاں کے لوگوں نے بڑے جوش سے برہم پُتر کے کنارے ہی کانگریس نگر بنوایا تھا۔ اُس مقام اور کیمپ کا منظر نہایت حسین تھا کھدر کا کام بہت آگے بڑھ نکلا۔ یہاں کی نمائش بھی بہت اچھی ہوئی۔ نمائش کے کامیاب بنانے میں چرخہ سنگھ کی ہی خاص کوشش ہوا کرتی تھی۔ اِس لئے چرخہ سنگھ میں اِس کے مہتم تجربہ حاصل کرتے جا رہے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ اُس نمائش میں چرخہ سنگھ کی بہار کی شاخ کے کارکنوں نے بہت اچھا کام کیا تھا۔ اِس بار کانگریس کے صدر تھے مدراس کے مسٹر سری نواس آئنگر استقبالیہ کمیٹی کے صدر تھے شری تُرنارام پھوکن اور سکریٹری شری نوین چندر باردولائی۔ اِن لوگوں نے دل و جان سے معقول اہتمام کا تہیہ کیا تھا۔ عین کانگریس کے اجلاس سے کچھ دن پہلے ایک ہتیارے مسلمان نے دلّی میں سوامی شردھانند جی کو اُن کے گھر میں گھس کر مار ڈالا تھا۔ اِس سے سارے مُلک کے ہندوؤں میں غم و غصّہ کی لہر دوڑ گئی جس کا اثر گوہاٹی میں پہنچے ہوئے لوگوں پر بھی پڑے بغیر نہ رہ سکا۔ سب سے بڑھ کر ہندوؤں کے دل دُکھانے والی بات یہ ہوئی کہ قتل کرنے والے اُس آدمی کے مقدّمہ کی پیشی میں محمد علی جیسا لیڈر

بھی گیا۔ ہندوؤں کے دل پر یہ اثر پڑا کہ مولانا صاحب بھی اس کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں اور شاید اِس قتل کو پسند بھی کرتے ہوں۔ سوامی جی کئی برسوں سے شدّھی اور سنگٹھن کے کام میں بڑی دلچسپی لے رہے تھے۔ اِس لئے کٹر مسلمان ان سے ناراض تھے۔ اُن کے قتل کا یہی سبب تھا۔ اِن دِنوں کسی نہ کسی مذہبی وجہ سے اِس قسم کے ہندوؤں کے کئی قتل ہوئے بلوے فساد بھی ہو ہی رہے تھے۔ اِس سے سارے مُلک کی فِضا بہت بگڑ گئی تھی۔ جو سُہانا سماں سالِ ۱۹۲۱ء میں دیکھنے میں آیا تھا، وہ یکبارگی جاتا رہا۔

اجلاس میں کوئی خاص اہمیّت کی بات نہیں ہوئی۔ گاندھی جی اُن دنوں کانگریس میں جاتے تو تھے مگر ایک طرح پر کنارہ کش رہتے تھے، کیونکہ انہوں نے اس کام کو سوراج پارٹی کے ہاتھوں میں سپرد کر دیا تھا۔ ایک واقعہ گوہاٹی میں ہوا، جسے یہاں لِکھنا غیر مناسب نہ ہوگا نابھہ (پنجاب) کے مہاراجہ تخت سے اُتار لئے گئے تھے۔ اُن کے کچھ حامی اِس سے بہت ناراض تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ کانگریس اِس سِلسلے میں حکومت کی پالسی کی مذمّت کرے اور دوسرے طریقوں سے بھی معزول مہاراجہ کی مدد کرے مہاتما جی کی غیر حاضری میں سبجکٹس کمیٹی میں ایک تجویز منظور بھی ہو گئی مگر مہاتما جی کو یہ بات پسند نہیں تھی کیونکہ وہ دیسی ریاستوں کے جھگڑے میں کانگریس کا پڑنا، کانگریس اور ریاستوں دونوں کے لئے مُضر سمجھتے تھے۔ اِس لئے اُنہوں نے اِصرار کیا کہ سبجکٹس کمیٹی میں پھر اِس مسئلہ پر غور کیا جائے۔ چنانچہ اُنہوں نے اس مسئلہ پر کوئی تجویز پاس نہ ہونے دی اِس سے مسٹر ہانمین جو بمبئی کی طرف سے ڈیلی گیٹ ہو کر آئے تھے، بہت کبیدہ خاطر ہوئے۔ اُنہوں نے دوبارہ غور کرنے کی بہت مخالفت کی تھی۔ اِس زمانے میں دیسی ریاستوں کے متعلق کچھ میری بھی واقفیت نہ تھی۔ میں اِس پالسی کو ٹھیک ٹھیک نہ سمجھ پایا تھا۔ بعد ازاں کئی سال گذرنے پر کانگریس کی پالسی کے متعلق کانگریسی لوگوں میں

بڑا اختلاف رائے پیدا ہوگیا۔ کئی برسوں تک سال بہ سال وہ ایک خاص متنازعہ مسئلہ بنا رہا۔ اِس کا ذکر کہیں آگے آئے گا۔ گوہاٹی کانگریس کے زمانے میں بہت پانی برسا جس سے وہاں کے منتظموں اور مہمانوں کو مصیبت اُٹھانی پڑی تھی۔ مگر یہ خلل پڑنے پر بھی وہاں کا اجلاس کامیاب رہا۔ سب کام حسبِ دل خواہ ختم ہوئے۔ رام گڈھ کانگریس کی طرح سارا کام تہس نہس نہ ہوا مگر اِس سے خرچ بڑھ گیا اور آمدنی جس کا بڑا حصّہ وزیٹروں کے ٹکٹ سے ہی آتا ہے گھٹ گئی۔ اِستقبالیہ کمیٹی کو بہت خسارہ سہنا پڑا۔ اُس کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے اِمداد طلب کرنی پڑی۔ اِمداد تو دی گئی مگر وہ کافی نہ تھی۔ شری پھوکن اور شری باردولائی کو ذاتی طور پر نقصان اُٹھانا پڑا۔ یہ جھگڑا بہت دنوں تک چلتا رہا مگر حال میں ورکنگ کمیٹی نے باقی حساب بے باق کر کے اِس معاملے کو ختم کر دیا ہے۔ میں نے جس بات سے ڈر کر اپنے دوست شری باردولائی کو کانگریس کا اجلاس آسام میں طلب کرنے سے منع کیا تھا، وہ بات ہو کر ہی رہی، قدرت کے عتاب نے آمدنی گھٹا کر مالی حالت کو اور بھی نازک بنا دیا۔

اُوپر کہا جا چکا ہے کہ احمد آباد کے اِجلاس سے ہی تقریباً ہر سال کوئی نہ کوئی اِس مضمون کا ایک ریزولیوشن پیش کرتا کہ کانگریس کا نصب العین صرف سوراج نہ رکھ کر مکمّل آزادی کر دیا جائے، اور یہ ہر سال نامنظور کر دیا جاتا۔ گوہاٹی کے اجلاس کے صدر مسٹر آئینگر اِس کے حامی ہو گئے۔ اس میں اب زور آنے لگا۔ مگر گوہاٹی تک پاس نہ ہو سکا تھا۔

جب سے کانگریسی حضرات کونسلوں میں گئے، کچھ لوگ اسی کام میں لگ گئے۔ کچھ لوگ کھدر کے پرچار میں لگے رہے اور کچھ لوگ کانگریس کا تنظیمی کام کرتے رہے۔ کونسلوں میں جو کام ہوتا، اُس کی اخباروں میں خوب اِشاعت ہوتی۔ لوگوں نے کام بھی اچھّا کیا۔ مرکزی اسمبلی میں پنڈت موتی لال جی ہی لیڈر ہوئے تھے۔ جہاں اُنہوں نے دوسری

پارٹیوں کے لوگوں کو ملا کر سرکاری بجٹ کو کئی بار نامنظور کرا دیا۔ دوسرے معاملوں میں بھی اُنہوں نے حکومت کے خلاف تجاویز منظور کرائیں۔ مسٹر سری نواس آئینگر بھی وہاں کے ممبر تھے۔ کئی باتوں میں پنڈت جی کا اُن سے اختلاف رائے ہو جایا کرتا۔ مگر ابھی تک بات کچھ بگڑی نہیں تھی۔ وہاں پر سب سے خاص بات یہ ہوئی کہ شری وِٹھل بھائی پٹیل صدر منتخب ہوئے۔ اُنہوں نے اپنی عِلمیت اور رُعب داب کا بہت عمدہ ثبوت دیا۔ ہر طرح سے غیر پابند رہتے ہوئے بھی اُنہوں نے حکومت کو کئی بار بڑی مشکل میں ڈال دیا۔

ہندو مسلم مسئلے

گوہاٹی کانگریس کے بعد مسٹر سری نواس آئینگر نے دو باتوں پر خاص طور پر زور دیا۔ ہندو مسلم مسئلہ بہت پیچیدہ ہوتا جا رہا تھا۔ بلوے فساد تو ہوتے ہی رہتے تھے۔ آپس میں کانگریسی لوگوں میں بے اعتمادی بڑھتی جاتی تھی۔ اِس جھگڑے کے دو پہلو تھے، ایک مذہبی دوسرا سیاسی۔ عام لوگ چاہے ہندو ہوں یا مسلمان مذہبی پہلو میں زیادہ دِل چسپی رکھتے تھے۔ تعلیم یافتہ اور مال دار لوگ جو اندر باہر کی کچھ باتوں سے واقف تھے، سیاسی پہلو میں زیادہ دِل چسپی رکھتے تھے۔ دونوں کا ایک دوسرے پر اثر پڑتا ہی رہتا اور تعلیم یافتہ طبقہ جسے سیاسی طبقہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ عام لوگوں کی اِس دل چسپی کو بھی اپنے کام میں لاتا۔ دونوں کے دو طرح کے راستے ہوتے اور اُن کے حل بھی دو طرح کے۔

ہندو گائے کے لئے عقیدت بلکہ پرستش کا جذبہ رکھتے ہیں، گئوکشی کے نام سے ہی وہ بہت مضطرب ہو جاتے ہیں اور خاص کر یہ بات بِہار اور اُتر پردیش میں ہے۔ اِس گاؤکشی کے سبب سے جانے کتنے بلوے ہو چکے۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے مسلمان بادشاہوں نے بھی محسوس کیا تھا کہ گاؤکشی سے ہندوؤں کے دِلوں کو کتنی ٹھیس لگتی ہے۔ اِن میں سے

جو فراخ دل تھے اُنہوں نے ہندوؤں کو دِل گرفتہ ہونے سے بچانے کے لئے گاؤکشی کی ممانعت بھی کر دی تھی۔ یہ جذبہ ہندوؤں میں آج تک موجود ہے۔ اِس جذبے سے پڑھے لکھے ہندو قطعاً خالی نہیں ہیں۔ وہ بھی گاؤکشی سے مشتعل ہو جاتے ہیں۔ اِدھر مسلمان بقرعید کے دِن قربانی کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ غریبوں کے لئے یہ فرض گائے کی قربانی سے ہی ادا ہو سکتا ہے۔ کیونکہ اِس میں کم خرچ پڑتا ہے۔ اِس لئے اُس دن جا بجا گائے کی قربانی کی وجہ سے بلوے ہو جایا کرتے ہیں۔

بہار کی حکومت نے اِس جھگڑے کو نبٹانے کے لئے ایک فہرست بنا رکھی تھی کہ کِن کِن گاؤں میں برابر قربانی ہوتی آئی ہے۔ اگر ایسے کسی گاؤں میں ہندو مداخلت کریں تو اُن کو دَبا کر وہاں قربانی کرائی جائے۔ جہاں مُسلمان نئے سرے سے قُربانی کرنا چاہتے ہیں وہاں اُن کو روک دیا جائے۔ حکومتِ بہار کی یہ دیرینہ پالسی رہی ہے۔ بقرعید کے موقع پر ہمیشہ اندیشہ رہتا کہ کہیں جھگڑا نہ ہو جائے۔ حکومت بھی بہت چوکنّی رہتی۔

مسلمانوں کی طرف سے مسجد کے سامنے باجے گاجے کے ساتھ ہندوؤں کے جُلوس نکلنے کی مخالفت کی جاتی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مسجد میں نماز پڑھنے والے مسلمانوں کے دھیان میں باجے کی وجہ سے خلل پڑتا ہے اِس لئے وہ باجہ نہیں بجنے دینا چاہتے۔ اس لئے بھی اکثر ہندوؤں کی تقریبوں کے دِن بلوے ہو جایا کرتے ہیں۔ بات تو یہ ہے کہ روزانہ نہ جانے کتنی ہی گائیں ذبح خانوں میں ماری جاتی ہیں یا تو گوشت کھانے کے لئے یا چمڑا وغیرہ بیچ کر پیسے بنانے کے لئے۔ خاص کر جہاں گوروں کی فوجی چھاؤنیاں ہیں، یا کلکتہ جیسے شہر میں جہاں گوروں کی بہت آبادی ہے وہاں تو اچھّی اچھّی گائیں بھی ماری جاتی ہیں۔ مگر اِس پر ہندو زیادہ توجہ نہیں دیتے۔ روزانہ کے ذبیحوں کو تو وہ برداشت

نہیں کرتے۔ اِسی طرح بڑے بڑے شہروں میں بڑی سے بڑی مسجدوں کے چاروں طرف ٹرام، موٹر، گاڑی، چھکڑے اور دوسری طرح کی شور مچانے والی چیزوں کی آواز تو دِن رات ہوتی رہتی ہے۔ محرّم کے دِنوں میں مسلمانوں کے ہی جُلوس میں غضب کا شور مچتا ہے۔ باجے بجتے ہیں، اِن سے تو مُسلمان نہیں گھبراتے مگر ہندوؤں کے کسی مذہبی یا سوشل جلوس کے باجے کو برداشت نہیں کر سکتے۔ بہر حال یہ ایک شدید مسئلہ ہے جس سے عوام گہرا تعلّق رکھتے ہیں۔

تعلیم یافتہ اور سیاسی طبقہ کے لوگ سرکاری یا ڈسٹرکٹ بورڈ میونسپلٹی اور کونسلوں وغیرہ کے الکشن میں بہت دِل چسپی لیتے ہیں۔ اگر اُن میں مُسلمانوں کی تعداد اُن کی خواہش کے مطابق نہ ہوئی تو مسلمان بگڑ جاتے ہیں۔ اگر ہندوؤں کی رائے میں مسلمانوں کی تعداد اُن کی آبادی کے تناسب سے زیادہ ہوگئی تو ہندو بگڑ جاتے ہیں۔ یہاں جو تھوڑا بہت اختیار ہندوستانیوں کو مِلا ہے یا مِل سکتا ہے، اِس کے بانٹنے کا سوال ہے جو لوگ اِن اختیارات میں حصّہ بٹانا چاہتے ہیں وہ اِن میں کسی طرح ٹھیس لگنے پر طیش میں آجاتے ہیں۔

مسٹر سری نواس آئینگر کی بہت خواہش تھی کہ کوئی سمجھوتہ ہو جائے مگر یہ ہندو مسلم مسئلہ جتنا پیچیدہ شمالی ہندوستان میں ہے اِتنا دکھن میں نہیں، وہاں تو زیادہ جھگڑا برہمنوں اور غیر برہمنوں کے درمیان یا چھُوت اَچھوت کا ہے۔ مُسلمانوں کی تعداد وہاں کم ہے جس گاؤکشی کی وجہ سے شمالی ہند میں اِتنے فساد ہوا کرتے ہیں اُس کے لئے اِدھر اتنے جھگڑے نہیں ہوتے۔ ہاں باجے کے سوال پر کچھ جھگڑے ہوتے ہیں اور وہ عیسائیوں کے ساتھ بھی۔ اس لئے اس مسئلہ کی پیچیدگی اور ہندوں کے جذبات کا اندازہ دکھنی لوگ ٹھیک ٹھیک

نہیں کر سکتے۔ مسٹر سری نواس آئینگر کچھ جلد باز بھی تھے۔ جتنی تیزی سے وہ بولتے تھے اُتنی ہی تیزی سے وہ رائے بھی قائم کر لیتے تھے۔ ایک بار رائے قائم کر لینے پر اُس سے جلد ہٹنا نہیں چاہتے تھے۔ عقل بہت تیز تھی، مگر کاروباری نہیں۔ اِس لئے جہاں تک قانون کی کتابوں کے علم کا تعلّق تھا وہ بہتیروں کو مات کر سکتے تھے۔ مگر جہاں صلاح کار کی بات آتی، وہاں اُن کی عقل چنداں کارگر نہ ہوتی تھی۔ اُنھوں نے اپنی صدارت کے زمانے سے ہی اِس بات کی کوشش کی کہ ہندو مسلم مصالحت ہو جائے۔ مگر جسے وہ سمجھوتہ مانتے تھے اُسے ہندو عوام تو ضرور اور کانگریسی ہندو بھی شائد منظور نہ کرتے اِس لئے اُن کی یہ نیک کوششیں کامیاب نہ ہوئیں۔

سائمن کمیشن : مدراس کانگریس

۱۹۲۰ء میں نیا آئین بنا تھا، اِس میں ایک دفعہ تھی کہ دس برس بعد پارلیمنٹ اِس آئین پر عمل درآمد ہونے کا جائزہ لے گی اور سیاسی حالات پر پھر سے غور کرے گی اور حسبِ ضرورت اس کی جانچ کرانے کے لئے کسی کو مقرر کرے گی۔ جب سے یہ آئین بنا کانگریس نے اِس کی مخالفت ہی کی۔ ۱۹۲۰ء کے الکشن میں کانگریسی شریک نہ ہوئے۔ اُنھوں نے اور اُن کے اور خلافت کمیٹی کے کہنے سے تقریباً سبھی جان دار ہندوؤں اور مسلمانوں نے اس کا بائیکاٹ ہی کیا تھا۔ یوں تو کوئی نہ کوئی منتخب ہو کر اُن جگہوں کو پُر کر ہی دیتا تھا مگر دنیا یہ جانتی تھی کہ عوام کے سچے نمائندے اِن قانون ساز مجالس میں نہیں آئے۔ کیونکہ کانگریسی اور خلافتی لوگوں نے خود کو صرف اُمیدواری سے ہی الگ نہیں رکھا تھا بلکہ رائے دینے والوں کو بھی منع کر دیا تھا کہ رائے نہ دو۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت کم ووٹروں نے ووٹ دئے۔ ۱۹۲۳ء کے چناؤ میں کانگریس نے اِتنا ہی کہا تھا کہ جو کانگریسی قانون ساز مجالس میں جانا چاہیں، وہ جا سکتے ہیں۔ مگر کانگریس فی نفسہٖ انتخاب میں حصّہ نہ لے گی۔ اِس لئے اگرچہ اِس بار کانگریسی منتخب ہوئے اور کچھ زیادہ ووٹروں نے الکشن میں حصہ لیا۔ پھر بھی یہ نہیں کہا جا سکتا

تھا کہ یہ انتخاب سارے عوام کے نمائندے منتخب کرانے میں کامیاب ہوا تھا۔ ۱۹۲۶ء کے الکشن میں کانگریس نے حصہ لیا اور عوام نے بھی خوب زوروں سے ووٹ دئے۔ اِس الکشن کا نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں تک انتخابی کامیابی مِل سکتی تھی کانگریس کو ملی مگر آئین ہی ایسا بنا تھا جس سے کانگریس والوں کی اور عوام کے نمائندوں کی اکثریت نہ ہو سکے۔ اِس لئے زیادہ تعداد میں چُنے جانے پر بھی سرکاری اور سرکار کے ذریعہ نامزد ممبروں کو ملاکر جو تھوڑے لوگ چُنے جاسکتے تھے، کانگریس کے خلاف اکثریت حاصل کر سکے مگر وہ بھی سب جگہوں میں نہیں، جو لوگ منتخب ہوئے وہ بھی خاص کر مرکزی اسمبلی میں پنڈت موتی لال نہرو کی سرکردگی میں حکومت کو ہمیشہ ہراتے رہے۔ اِن سب باتوں سے حکومت بھی شائد سوچتی رہی کہ اِس بے اطمینانی کو دُور کرنا چاہیئے۔ اِس لئے دس برسوں کا انتظار نہ کر کے اُس نے ۱۹۲۷ء میں ہی ایک کمیشن مقرر کیا، اور اِعلان کیا کہ وہ کمیشن ۱۹۲۸ء کے شروع میں ہندوستان پہنچ کر جانچ کا کام شروع کرے گا۔ اِس کمیشن کے صدر سر جان سائمن تھے۔ دوسرے بھی سبھی ممبر انگریز تھے۔ ایک بھی ہندوستانی اُن میں نہیں تھا۔ اِس اِعلان کے شائع ہوتے ہی سارے مُلک میں بڑا اضطراب دیکھنے میں آیا۔ کانگریسی لوگوں کا تو کہنا ہی کیا، جو لوگ اعتدال پسند پارٹی کے تھے وہ بھی بہت غیر مطمئن تھے۔ ہندو اور مسلمان تقریباً سبھی اس معاملے میں ایک رائے کے تھے۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ پھر ایک بار سبھی مل کر اِس کی مخالفت کریں گے۔

پٹنہ میں اِس بارے میں ایک کانفرنس ہوئی۔ سر علی امام صدر ہوئے۔ سبھی پارٹیوں کے لوگ شریک ہوئے طے کیا گیا کہ سب لوگ مل کر اس کمیشن کا بائیکاٹ کریں۔ بائیکاٹ کے لیڈر سر علی امام ہوئے۔ تمام مُلک کی سبھی پارٹیوں کے لوگ کمیشن کے بارے میں کہنے لگے کہ اِس میں کسی ایک بھی ہندوستانی کو جگہ نہ دے کر برٹش سرکار نے ہندوستان کی بڑی توہین

کی ہے۔اس لئے ہم اِس کمیشن کے ساتھ کسی قسم کا تعاون نہ کریں گے۔ اگرچہ برٹش سرکار نے کمیشن میں کسی ہندوستانی کو جگہ تو نہ دی، مگر اِتنا کہہ دیا کہ کمیشن کے صلاح کار کی حیثیت سے کچھ لوگ اِس کے ساتھ رہیں گے۔ اور ہر صوبے میں اِسی طرح صلاح کار مقرر کئے جائیں گے ہندوستان میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو برٹش سرکار کا ساتھ دینے کو ہمیشہ تیار رہتے ہیں چاہے سرکار جو کچھ کرے، اِس موقع پر بھی ایسے لوگ اُسے مِل ہی گئے مگر یہ بات موجبِ اِطمینان تھی کہ کسی بھی سیاسی پارٹی کی طرف سے کوئی آدمی شریک نہ ہوا۔

کمیشن کو ۱۹۲۸ء میں آنا تھا۔ اس کے سامنے پیش کرنے کے لئے حکومت مواد جمع کرنے لگی۔ دوسرے لوگ اُس کے بائیکاٹ کی بات کرنے لگے۔ اِسی بیچ میں مدراس میں ہونے والے کانگریس کے اجلاس کا زمانہ آگیا۔ ڈاکٹر انصاری اس کے صدر چُنے گئے۔ مہاتما جی کانگریس میں گئے۔ کانگریس کا یہ اِجلاس بڑا اہم تھا۔ سائمن کمیشن کے آنے کی بات مُلک کے سامنے تھی ہی۔ کانگریس نے سوچا کہ صرف مخالفت کرنا ہی کافی نہیں ہے۔ اِس لئے اُس نے طے کیا کہ ایک ایسی کمیٹی مقرر کی جائے جو اور سب پارٹیوں کے لوگوں کے ساتھ مِل کر ہندوستانیوں کے لئے ایک آئین تیار کرے۔ یہ مسودۂ آئین سائمن کمیشن کے سامنے پیش کرنے کے لئے نہیں تھا، مگر یہ سوچا گیا کہ اِس کے ذریعے ہم اپنے خیالات اور مطالبات مُلک کے سامنے رکھ سکیں گے اور سب پارٹیاں مل کر اسے منظور کرنے کے لئے برٹش حکومت کو مجبور کر سکیں گی۔

مدراس کانگریس میں بھی مکمل آزادی کے متعلق ایک تجویز منظور ہوئی، پنڈت جواہر لال نہرو کچھ دنوں تک یوروپ میں رہ کر حال ہی میں واپس آئے تھے۔ وہ اِس کے بڑے حامی تھے۔ اُنہوں نے ہی اسے سبجکٹس کمیٹی میں زور لگا کر پاس کرایا۔ میں نے اِس کی

مخالفت کی۔ میرا خیال تھا کہ ہم کو کوئی ایسی تجویز منظور نہ کرنی چاہیے جس کو ہم عملی شکل دینے کے لئے تیار نہ ہوں۔ اِس زمانے میں میں مُلک میں کوئی ایسی تیاری بھی نہیں دیکھتا تھا جس کے برتے پر یہ بھروسہ کیا جائے کہ ہم اِس مقصد کو حاصل کر سکیں گے۔ مگر یہ تجویز اکثریت سے پاس ہو گئی پھر بھی ابھی یہ صرف ایک تجویز ہی تھی۔ دو برسوں کے بعد لاہور کانگریس میں کانگریس کے آئین میں مکمل آزادی کو نصب العین قرار دیا گیا۔

ہندو مسلم اِتحاد کے متعلق بھی ایک تجویز کانگریس کے سامنے پیش کرنے کے لئے سبجکٹس کمیٹی نے منظور کی۔ اِس میں اور اور باتوں کے علاوہ گاؤ کشی کے متعلق یہ کہا گیا تھا کہ مسلمانوں کو اس کا پورا حق ہے کہ وہ جہاں چاہیں آنکھ بچا کر گاؤ کشی کر سکتے ہیں۔ یہی بات مسٹر آئینگر پہلے بھی کہا کرتے تھے۔ اب یہ بات کانگریس کے سامنے ایک ریزولیوشن کی شکل میں آئی میں سمجھا کہ چاہے اِس کی معقولیت جو بھی ہو، ہندو عوام اِسے کبھی نہ مانیں گے۔ اگر مسلمان اِس حق کا استعمال کرنا شروع کریں گے تو اِس کا نتیجہ بہت بڑے پیمانے پر بلوہ فساد کے سوا اور کچھ نہ ہو گا۔ یہ کسی طرح مُلک کے لئے مفید نہ ہو گا۔ گاندھی جی سبجکٹس کمیٹی میں نہیں آئے تھے۔ جب مسٹر آئینگر نے کانگریس کے اجلاس سے پہلے ہی بات چلائی تھی تو میں نے گاندھی جی کو اِسی مضمون کا خط لکھا تھا۔ اِس لئے مہاتما جی پہلے ہی اِس سوال کے دونوں پہلوؤں کو جانتے تھے جب سبجکٹس کمیٹی نے بھی اس تجویز کو منظور کر لیا تو میں نے جا کر اُن سے کہا۔ وہ خود اس کی دوسری نشست میں آئے۔ اُن کے کہنے سے اُس پر پھر سے غور کیا گیا۔ تجویز کی شکل بدل کر ایسی بنائی گئی جو سب کو منظور ہو جائے۔ مگر میں جانتا ہوں کہ کچھ مسلمان بھائیوں کو یہ بہت بُرا لگا۔ آپس میں اختلافِ رائے کی جو خلیج بن گئی تھی وہ اور بھی وسیع ہو گئی۔

لنکا کا دورہ

میرے گھر کی عورتوں کی خواہش ہوئی کہ مدراس کانگریس کے زمانے میں اِدھر سے ہی وہ تیرتھ یاترا بھی کرتی آویں، کیونکہ رامیشورجی وہاں سے قریب ہیں۔ میرے ساتھ میری بھابی، بیوی اور کئی دوسرے دوستوں کے گھر کی عورتیں مدراس گئیں۔ جاتے وقت ہم لوگ گوداوری میں نہانے کے لئے راج مہیندری میں ٹھہر گئے تھے۔ کانگریس کے اجلاس کے بعد مدورا رامیشور وغیرہ تیرتھوں پر اور لوگوں کے ساتھ گئے۔ رامیشورجی کے درشن کے بعد ہم لوگ لنکا چلے گئے۔ گھر کے لوگوں کو وہیں چھوڑا۔ لنکا جانے کی ایک سہولت یہ بھی تھی کہ اِن دِنوں شری رامودر داس وہاں لاٹیا کے ایک کالج میں بودھ مذہب کی مقدّس کتابوں کا مُطالعہ کر رہے تھے۔ اُنہوں نے کئی برسوں تک چھپرا میں کانگریس کا کام کر کے اور کئی بار قید و بند میں رہنے کے بعد بودھ مذہب کی کتابوں کے مُطالعہ کے لئے وہاں جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ اُن کو وہاں سنسکرت پڑھانے اور پالی میں ترپٹکا وغیرہ کتابوں کے مُطالعہ کا اچھّا موقع مِلا۔ کچھ دنوں کے بعد بودھ دھرم میں داخل ہو کر وہ شری راہُل سانکرتائن کے نام سے مشہور ہوئے اور بھکشو (بودھ سادھو) ہو گئے۔ اس وقت وہ صرف مُطالعہ

کررہے تھے باضابطہ بھکشو نہیں بنے تھے۔

جب ہم لوگ وہاں گئے تو لنکا کے خاص خاص مقامات میں ہمیں لے جانے کا انتظام کیا۔ ہم نے ایک لاری کرائے پر لی اور کئی دِنوں تک وہاں گھومتے پھرتے رہے۔ یہ ہم لوگوں کے لئے پہلا ہی موقع تھا کہ اِس حسین جزیرے میں ہم سفر کر رہے تھے۔ جزیرہ کی خوب صورتی اور سبزہ زاروں نے ہم لوگوں کو مگن کر دیا۔ کنڈی کے خوب صورت مندر میں جاکر ہم نے درشن کئے۔ وہاں سے نور لیا پہاڑ پر جاکر ایک رات گذاری۔ وہاں سے سیتا ایلیا گئے۔ کہا جاتا ہے کہ وہیں راون نے شری جانکی جی کو قید کر کے اشوک باٹکا نام کے باغ میں رکھا تھا، وہاں جاتے وقت ایک عجیب چیز ہم لوگوں نے دیکھی ستیا ایلیا، نور یلیا سے کچھ دُور ہے۔ نور یلیا پہاڑ کی چوٹی ہے اور ستیا ایلیا پہاڑ کے نیچے ہے۔ اس کے چاروں طرف پہاڑ ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قدرت نے گویا ایک کٹورا بنا دیا ہے۔ جس کی دیواریں پہاڑ کی ہیں، اور جس کی تلی میں ایک چھوٹا سا جھرنا ہے، وہاں ایک چھوٹا سا مندر ہے جہاں شری جانکی جی قید کی گئی تھیں۔ پہاڑ سے اُترنے میں موٹر کو کئی بار چکّر لگانا پڑتا ہے۔ اُترتے وقت ہم نے دیکھا کہ کچھ دُور تک چاروں طرف پھیلا ہوا سُرخ اشوک کا جنگل ہے۔ پہاڑ کاٹ کر جو سڑک بنی تھی اُس کی بغل میں دیوار کی طرح پہاڑ کھڑا تھا۔ اُس دیوار میں کئی طرح کی مٹّی یا پتھر دیکھنے میں آتے تھے۔ اُس میں ایک تہہ جو تقریباً دو تین فٹ چوڑی تھی۔ ایسی مٹّی کی تھی جو بالکل راکھ جیسی تھی۔ ہم نے اِس مٹّی کو کھود کر دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ جیسے اور نیچے پتھریلی مٹّی کی تہہ ہے اور بیچ میں یہ ایک تہہ راکھ کی ہے۔ اشوک کے پتے اور راکھ ہم دونوں ساتھ میں لائے تھے۔ ان کو دیکھ کر رامائن میں مذکور اشوک باٹکا اور ہنومان جی کے لنکا جلانے کی بات یاد آگئی۔ بے شمار مقاموں کو ——— جن میں ایک خوب صورت گپھا

بھی تھی۔ جس میں بہت پُرانی مگر حسین تصویریں بنی تھیں دیکھتے ہوئے ہم لوگ انورادھ پور پہنچے۔ یہاں ایک بہت بڑا استوپ (بودھ خانقاہ) ہے۔

کہا جاتا ہے کہ اشوک کے لڑکے مہیندر نے یہاں پر آ کر گیا سے لائی ہوئی مہابودھی درخت کی ایک شاخ لگائی تھی۔ ہم لوگ وہاں رات کے نو بجے کے قریب پہنچے تھے۔ پیپل کے ایک درخت کے پاس بودھوں کا مذہبی جلسہ ہو رہا تھا اُس میں ایک بھکشو کچھ وعظ فرما رہے تھے، منظر بہت ہی سُہانا تھا۔ دِل پر اُس کا بہت اثر پڑا۔ ہم اُس تلقین کو سمجھ تو نہ سکے مگر وہاں بیٹھی ہوئی سامعین کی جماعت بیچ بیچ میں جو سادھو سادھو کہہ اُٹھتی تھی اُسے ہم سمجھ سکے۔ لوگوں نے بتایا کہ پیپل کا یہ درخت وہی ہے جسے مہیندر نے لا کر یہاں لگایا تھا۔ یوں تو بودھ گیا میں بھی جو مہابودھی درخت تھے وہ بھی اُس وقت کا نہیں ہے لیکن اِسی مقام پر اُسی درخت سے پیدا ہوا ہے اِسی طرح انورادھ پور کا مہابودھی درخت مہیندر کا ہی لگایا ہوا نہیں ہے، بلکہ اُس درخت سے پیدا شدہ ہے جو اُسی مقام پر آج تک کسی نہ کسی طریقے سے قائم ہے۔ مگر اِس سے بھی زیادہ کرامات اور تعجّب کی بات ہمیں یہ سُنائی گئی کہ وہاں جو چراغ جل رہا تھا وہ بھی مہیندر کا جلایا ہوا تھا۔ اُس وقت سے آج تک وہ چراغ کبھی بجھا نہیں ہے۔ بودھوں نے اُسے بائیس تئیس سو برس سے برابر جلائے رکھا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو شاید دُنیا میں کوئی ایسی لو نہ ملے گی جو دو ہزار برسوں سے بھی زیادہ زمانے سے برابر جلتی آ رہی ہو۔

لنکا کا دورہ ختم کر کے ہم لوگ رامیشورجی واپس آئے۔ وہاں سے خاندان کے لوگوں لوگوں کو لے کر جن مقدس مقامات پر پہلی بار نہ جا سکے تھے وہاں ہوتے ہوئے چھپرا لوٹے۔

سفرِ یورپ

بابو ہری جی کے مقدّمے میں مہاراجہ ڈمراؤں نے پریوی کونسل میں اپیل کردی تھی۔ اب اپیل کی پیشی کا وقت قریب تھا۔ بابو ہری جی چاہتے تھے، کہ میں بھی وہاں کے بیرسٹروں کی مدد کے لئے ولائت جاؤں۔ اُنہوں نے ترکِ موالات کی ابتداء کے زمانے میں ہی وعدہ لے لیا تھا کہ اُن کے مقدمہ میں میں برابر کام کروں گا۔ اِسی وعدے کی تکمیل کے لئے ہائی کورٹ میں پیشی کے وقت بھی میں نے کام کیا تھا۔ اب ولائت جانے کا وقت آیا تو انکار نہیں کر سکتا تھا۔ اور کچھ یہ بھی لالچ تھا کہ اِسی بہانے غیر مُلکی سیاحت بھی ہو جائے گی۔ اِس لئے اب میں وہاں جانے کی تیاری کرنے لگا۔ میرا بھتیجا جناردن، جو لوہا بنانے کا کام سیکھنے وہاں گیا تھا۔ حال ہی میں واپس آیا تھا۔ ٹاٹا کمپنی جمشید پور میں اُسے نوکری بھی مل گئی تھی۔ وہاں کے رہن سہن کے متعلق اِس سے اور دوسرے لوگوں سے مشورہ کر کے میں نے سردی کے لئے گرم کپڑے بنوائے۔ میں برابر صرف کھدّر ہی پہنا کرتا تھا۔ وہاں جا کر بھی اِس قاعدہ کو توڑنا میں نے مناسب نہ سمجھا۔ اِس لئے کشمیری اُون کے کپڑے ہی کھادی بھنڈار سے منگوا کر بنوائے۔ کپڑے بھی دیسی وضع کے سِلوائے۔ انگریزی پوشاک نہ پہننے کا ہی فیصلہ کر لیا۔ اِس

کے دو نتیجے ہوئے۔ بہت کم خرچ میں کام کے لائق کافی کپڑے تیار ہو گئے۔ پوشاک چونکہ ہندوستانی تھی اس لئے اُس میں کچھ بھول یا بھدّا پن بھی ہو تو کوئی غیر مُلکی سمجھ نہیں سکتا تھا۔ انگریزی پوشاک اور رہن سہن اختیار کرنے پر اُن کے لوگوں کے فیشن اور رسم و رواج کے مطابق ہی چلنا پھرنا، کپڑا پہننا اور کھانا پینا پڑتا ہے۔ اپنا طریقِ بود و باش قائم رکھنے پر یہ قباحت دور ہو جاتی ہے۔ خاص کر مجھ جیسے آدمی کے لئے یہ جھنجھٹ کچھ کم نہیں ہے، کیونکہ میں نے کبھی زندگی بھر کپڑے اور فیشن پر دھیان ہی نہیں دیا ہے۔ میں نے تو کپڑے کو جسم گرم رکھنے اور حیاداری کا وسیلہ ہی سمجھا ہے۔ اِسی لائحہ عمل پر برابر چلتا آیا ہوں۔ باپو ہری جی چاہتے تھے کہ مجھے ہر طرح سے آرام رہے۔ اِنگلستان میں بھی جہاں تک ہو سکے اُن کا کام کرتے ہوئے آرام سے ہی رہوں۔ اِس لئے اُنھوں نے اِصرار کیا کہ میں اپنے ساتھ اپنا نوکر بھی لے جاؤں اور برابر پہلے درجے میں ہی سفر کروں۔ میرے سبھی دوست جن کو انگلستان کا کچھ بھی تجربہ تھا، اُس کو غیر ضروری سمجھتے تھے مگر اُنھوں نے نہیں مانا۔ میں نے گوبردھن کو ساتھ لے لیا۔ مارچ کے شروع میں ہی ایک یومِ سعید پر جسے اُن کے نجومیوں نے طے کرادیا تھا۔ میں گھر سے روانہ ہو کر بمبئی پہنچا۔ وہاں کھادی بھنڈار میں کچھ اور کپڑے بھی تیار کرانے کو کہہ دیا۔ وہاں سے مہاتما گاندھی سے رخصت لینے کے لئے سابرمتی چلا گیا۔ روانہ ہونے کے دن بھائی صاحب بھی بمبئی پہنچ گئے۔ میں قیصرِ ہند جہاز میں بمبئی سے چلا۔

یہ میری پہلی غیر مُلکی سیاحت تھی۔ میں ابھی اُن لوگوں کی قربت میں بہت نہیں آیا تھا جو غیر مُلکی طریقے سے رہتے اور کھاتے پیتے ہیں۔ جانے سے پہلے ایک دن ڈاکٹر سچدانند سنہا نے مجھے اپنے یہاں انگریزی طریقے سے ٹیبل پر کھلایا تھا۔ میں نے کانٹے چمچ کا اِستعمال دیکھ لیا تھا۔ اتفاق سے جہاز میں میرے کمرے میں ایک پارسی صاحب

تھے۔ وہ غیر ملکی سیر کے لئے جا رہے تھے، اُن سے تو جان پہچان ہو ہی گئی۔ مگر دوسرے کوئی مُلاقاتی بھائی یا بہن اِس جہاز میں نہیں تھے۔ میری عادت بھی کچھ ایسی ہی ہے کہ میں کسی سے جان پہچان یا ملاقات کرنے میں بہت جھجکتا ہوں۔ اِس لئے جہاز پر کسی بھی مُلکی یا غیر مُلکی سیّاح سے ایک یا دو دن تک ملاقات یا بات چیت نہیں ہوئی مگر اتنا میں دیکھتا تھا کہ میری ہندوستانی پوشاک پر بہتیروں کی نظر تھی۔ میں جہاز کے ڈیک پر اپنی کرسی رکھ کر کتابیں پڑھتا یا ٹہلتا رہتا۔ سمندر بہت پُرسکون تھا۔ اِس لئے کسی قسم کی متلی چکّر وغیرہ مجھے نہیں آئے۔

دو دِنوں کے بعد ایک انگریز سیّاح جو آئی، ایم، ایس (انڈین میڈیکل سروس) کے پنشن پائے ہوئے افسر تھے، میرے نزدیک آئے اور مجھ سے باتیں کرنے لگے۔ میرے کھدّر کے کپڑے اور تنہائی میں چُپکے بیٹھے رہنے سے اُن کی اور اُن کی میم صاحبہ کی توجہ مبذول ہوئی تھی، پنشن پانے کے بعد وہ کسی کمیشن کے ممبر ہو کر پھر ہندوستان آئے تھے، اپنا کام پورا کر کے وہ واپس جا رہے تھے۔ دونوں بہت ہی اچھّے مزاج کے تھے۔ وہ گاندھی جی کے متعلّق جانتے تھے، کھدّر کے متعلّق بھی اخباروں میں کچھ پڑھا تھا۔ اُن کی خواہش تھی کہ ہندوستان میں گاندھی جی کو دیکھتے مگر یہ سعادت نہ مل سکی۔ جب بات چیت سے اُن کو معلوم ہو گیا کہ گاندھی جی سے میرا کیا تعلّق ہے تو اُن کی دِلچسپی اور بڑھ گئی۔ ہم سے وہ برابر گفتگو کیا کرتے۔ اُن کو یہ جان کر تعجب ہوا کہ میں گوشت خور نہیں ہوں۔ وہ خود بھی گوشت خور نہیں تھے۔ اُنہوں نے مجھے بتایا کہ انگلستان اور تمام یوروپ میں ایسے بہت سے ہوٹل ہیں جن میں نباتاتی غذا مل سکتی ہے۔ وہاں سبزی کثرت سے ملتی ہے، دُودھ اور دُودھ سے بنے ہوئے بہت طرح کے کھانے کے سامان مل سکتے ہیں۔

مگر وہاں کے لوگ انڈے کو بھی نباتاتی غذا میں ہی مانتے ہیں، نباتات خور خوب انڈے کھاتے ہیں جو لوگ پکّے نباتات خور ہیں وہ دُودھ اور دُودھ سے بنے ہوئے سامان کو نہیں کھاتے کیونکہ وہ دُودھ کو بھی جانور کے خون کا بدلا ہوا روپ ہی مانتے ہیں۔ اِس لئے اُنہوں نے مجھے متنبہ کر دیا کہ اگر اِنگلستان کے کسی ہوٹل میں کھانا پڑے تو یہ خاص طور پر کہہ دینا ہوگا کہ مجھے انڈے سے بھی پرہیز ہے۔ تبھی بغیر انڈے کی غذا ملے گی ورنہ کچھ نہ کچھ انڈے کی آمیزش رہے گی ہی۔ ساتھ ہی اُنہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ بغیر انڈے کے بسکٹ وغیرہ بھی سب جگہ نہیں ملتے لیکن اگر کوئی دُکان دار کہے کہ کوئی بسکٹ یا کھانے کی چیز بغیر انڈے کے ہی ہے تو اس کی بات مجھے مان لینی چاہیے کیونکہ اُنہیں سچ بولنے ہی میں نفع ہے۔ انڈا مہنگا پڑتا ہے۔ یہ سب باتیں میرے لئے نئی تھیں۔ مگر اُن میاں بیوی کی ملاقات نے میرے لئے اِس طرح کی بہت سی جاننے کے لائق باتیں بتا دیں۔ روزانہ زندگی کے کام میں آنے والے نسخے اُنہوں نے بتا دئے۔ میں وہاں بھی اپنی پابندیوں کے رہ سکا۔ راستہ میں مجھے معلوم ہوا کہ جب تک جہاز نہر سوئیز سے گذرتا ہے تب تک ٹامس کک کمپنی کی طرف سے ایسا انتظام رہتا ہے کہ جو مسافر چاہے موٹر سے جا کر شہرِ قاہرہ اور اُس سے تھوڑی دُور پر سفنکس کو دیکھ آسکتا ہے۔ میں نے یہ دیکھ لینا اچھّا سمجھا۔ میرے ہی جیسے کچھ مُسافر بھی تھے۔ جنہوں نے ٹامس کُک کے ساتھ وہاں جانے کا انتظام کر لیا۔ ہم لوگ بہت سویرے ہی قریب پانچ بجے جہاز سے اُتر کر موٹر پر قاہرہ چلے گئے۔ قاہرہ پہنچنے پر منہ ہاتھ دھونے اور کچھ ہلکا ناشتہ کر لینے کے لئے ایک ہوٹل میں ہم لوگ لے جائے گئے۔ اس کے بعد قاہرہ کا عجائب گھر دیکھنے گئے۔ وہیں اہرامِ مصر کی کُھدائی سے نکلی ہوئی چیزیں محفوظ رکھی گئی ہیں۔ یہ بڑا خوب صورت مجموعہ ہے۔ قدیم مصر کے

جتنے بڑے نامی اور شاندار بادشاہوں کی لاشیں (ممی) جو اہرام سے نکلے ہیں وہاں محفوظ ہیں۔ اب دیکھنے میں وہ کالے پڑ گئے ہیں مگر انسانی چہرہ اور ہاتھ پاؤں توجوں کے توں ہیں وہ جس باریک کپڑے میں لپیٹ کر دفن کئے گئے تھے وہ کپڑا ابھی تک ویسا ہی لپٹا ہوا ہے یہ کپڑا بہت ہی باریک ہوا کرتا تھا۔ سُنا جاتا ہے کہ یہ ہندوستان سے ہی جایا کرتا تھا ان دِنوں وہاں کے رہنے والوں کا عقیدہ تھا کہ آرام کے سبھی سامان اگر مُردے کے ساتھ گاڑ دئے جائیں تو عقبےٰ میں بھی وہ اُن سے آرام پاسکتا ہے۔ اِسی عقیدے کے مطابق اِہرام کے اندر لاش کے ساتھ سبھی ضروری چیزیں دفن کی جاتی تھیں۔ پہننے کے کپڑے اور گہنے بیٹھنے کی چوکی وغیرہ، کھانے کے لئے غلّہ، سنگار کے لئے سامان، سواری کے لئے رتھ اور ناؤ بھی یہ سب چیزیں ایک سے ایک اچھّی بنی ہیں۔ اِن سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس زمانے میں بھی لوگ سونے کا اِستعمال جانتے تھے۔

سُنا ہے کہ اس قسم کی کُھدائی سے مہنجدارو (سندھ) میں جو گیہوں نِکلا وہ بو دینے پر اُگ گیا۔ عجائب گھر کے مجموعہ اور خاص کر پُر جلال بادشاہوں کی لاشیں دیکھ کر انسانی زندگی کی بے ثباتی صاف صاف نظر آنے لگی۔ میں نے کچھ تصویریں خریدیں، اگرچہ عجائب گھر کا سفر بہت اچھّا رہا پھر بھی میرے دل پر عارضی زندگی کی بے ثباتی کا گہرا اثر پڑا۔ میں وہاں سے اُداس ہی نکلا۔

اُس میوزیم کے دیکھنے کے بعد ہم لوگوں کو شہر کی کچھ قدیم اور نامی عمارتیں، اور دوسری کچھ مشہور جگہیں دکھائی گئیں، جن میں ایک بڑی اور خوب صورت مسجد بھی ہے۔ مصر میں مسلمان مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ کیونکہ وہاں سے کعبہ مشرق کی طرف ہے۔ یہ ہندوستانی کے لئے کچھ عجوبہ سا معلوم ہوتا ہے۔ وہاں کی مسجد بھی اِسی وجہ سے

ہندوستان کی مسجدوں جیسی مشرق رویہ نہ ہوکر مغرب رویہ ہوتی ہیں۔ یہ مسجد بھی ویسی ہی تھی۔ وہاں کی زبان عربی ہے، مگر یورپ کی زبانوں میں سے زیادہ رواج وہاں فرانسیسی کا ہے، لوگ صاف معلوم ہوتے تھے۔ پولیس والے ترکی ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔ قاہرہ اگرچہ پرانا شہر ہے مگر جس حصّہ کو ہم نے دیکھا وہ بہت کچھ آج کل کے شہروں جیسا ہی تھا۔

دوپہر کا کھانا کھاکر ہم لوگ اہرام دیکھنے گئے۔ کچھ دور تک موٹر پر گئے، ایک جگہ پہنچ کر موٹر چھوڑ دینی پڑی۔ اونٹوں پر سوار ہوکر اہرام تک جانا پڑا۔ میرے لئے اونٹ کی سواری بالکل نئی تھی کیونکہ میں کبھی ہندوستان میں اونٹ پر نہ چڑھا مگر ایک بار چڑھ جانے پر کوئی خاص بات نہ ہوئی۔ اہرام کو نزدیک جاکر دیکھا۔ یہ بہت اونچی چوگوشہ عمارتیں ہیں۔ ہمارے ملک میں اینٹوں کا پزاوہ جیسے بنتا ہے ویسے ہی یہ پتھروں کے بہت بڑے بڑے چورس کئے ہوئے ٹکڑوں سے بنے ہیں۔ پزاوے کی طرح سے ہی نیچے کی چوڑائی بہت زیادہ ہے اور اوپر کی طرف کم ہوتی گئی ہے۔ اینٹوں کا پزاوہ تو چھوٹا ہوتا ہے، یہ بہت بڑے اور بہت اونچے ہیں۔ جس تناسب سے یہ اونچے اور وسیع ہیں اسی تناسب سے ان میں لگی ہوئی اینٹیں بھی پتّھر کی اینٹوں سے لمبائی چوڑائی اور دبازت میں زیادہ ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ ایک ایک اینٹ شاید چار پانچ ہاتھ لمبی ہوگی۔ اسی کے مطابق اس کی چوڑائی اور موٹائی بھی ہوگی۔ نہ معلوم کتنے دنوں میں ایک ایک اینٹ کاٹ کر اتنی بڑی عمارت تیار ہوئی ہوگی۔ اس میں کتنے غریبوں نے اپنی زندگی کا کتنا حصّہ لگایا ہوگا۔ یہ سب کسی ایک بادشاہ کے نام کو اس کے مرنے کے بعد بھی قائم رکھنے کے لئے کیا گیا تھا۔ نام تو اب صرف کتابوں میں رہ گئے ہیں۔ یہ عمارتیں جن سے انسان کوئی فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ ہزاروں برسوں کے بعد اپنی جگہ جوں کی توں کھڑی ہوئی ہیں، ان میں سے بہتوں کی اندر سے کھدائی ہوئی ہے۔ انہیں میں سے بہتوں سے نکلے ہوئے سامان

کی نمائش عجائب گھروں میں ہے۔

سنفکس ایک عجیب چیز ہے، انسان کا منہ اور جسم جانور کا ہے۔ ایک بہت بڑا بُت اسی شکل کا اِس ریگستان میں بنا پڑا ہے سُنتے ہیں کہ قدیم زمانے میں اِس سے سوال کئے جاتے تھے اور یہ مستقبل کی باتیں بتا دیتا تھا۔ مگر یہ جو کچھ کہتا تھا اُس کا سمجھنا بہت مشکل تھا۔ اَب یہ باتیں تو نہیں ہیں۔ مگر یہ یوں ہی کھڑا اُس زمانے کی یاد دِلاتا رہتا ہے۔

یہ سب دیکھ کر ہم لوگ شام تک واپس آکر ریل پر سوار ہوئے۔ گیارہ بجے رات کے قریب پورٹ سعید پہنچے۔ وہاں جہاز پہنچ گیا تھا۔ ہم سب اپنے اپنے کمرے میں جا کر سو رہے۔ کھانا پینا راستہ میں ریل میں ہی ہو چکا تھا۔

بحیرۂ وسطیٰ میں پہنچ کر کچھ سردی لگنے لگی۔ لال سمندر تو بہت گرم تھا، بحیرۂ عرب سے بھی زیادہ۔ بحیرۂ وسطیٰ میں ہوا بھی زور سے چلتی تھی۔ اس لئے جہاز کچھ ہلتا تھا۔ مجھے ایک روز کچھ متلی سی ہوئی مگر زیادہ نہیں۔ راستے میں جو دیکھنے کو ملا، میں سب کچھ دیکھتا گیا۔ اِٹلی کے نزدیک جہاز جزیرہ سسلی کے پاس ہو کر ہی گذرا۔ وہاں کا شہر کچھ دُور پر نظر آیا۔ پہاڑ تو صاف نظر آتا تھا۔ کئی دنوں کے بعد ہم لوگ مارسیلز (فرانس) پہنچ گئے۔ راستے میں کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ کبھی کبھی کوئی جزیرہ نظر آجاتا تھا، تو سب لوگ اُسے دیکھنے لگتے تھے۔ سمندری سفر میں چاروں طرف پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ لہذا رات دن پانی ہی پانی دیکھتے دیکھتے ایک دو دِن میں جی اُکتا جاتا ہے۔ اگر کہیں کوئی گذرتا ہوا جہاز نظر آگیا یا زمین دیکھنے کو ملی تو بڑی مسرت ہوتی ہے۔ سبھی مسافر اُسے اِس طرح دیکھنے لگتے ہیں گویا اُنہوں نے زمین دیکھی ہی نہیں ہے۔

ہم لوگ مارسیلز میں سویرے ہی اُترے۔ وہاں ایک ہوٹل میں ٹھہر گئے۔ وہاں بھی

کُک کمپنی کی مہربانی سے سبھی قابلِ دید مقامات دیکھ لئے۔ٹامس کُک کا انتظام بہت اچھّا ہوتا ہے۔مسافروں کو اُن کا مترجم خاص خاص مقام دکھا دیتا ہے۔ اُن کی اپنی موٹر رہتی ہے اتنی عمدہ تقسیم اوقات ہوتی ہے کہ وقت مقررہ کے اندر سب کچھ دیکھ لیا جاتا ہے۔سویرے جہاز سے اُترتے ہی رات میں جانے والی گاڑی میں، میں نے اپنے لئے جگہ ٹھیک کرالی تھی دن بھر گھوم پھر کر رات کی گاڑی سے پیرس کے لئے روانگی ہوئی۔ پیرس سے گاڑی بدل کر کیلے پہنچے۔ وہاں پھر جہاز پر چڑھ کر شام ہوتے ڈوور میں اُترے اور ڈوور سے ٹرین میں بیٹھ کر رات کو تقریباً ۹ بجے لندن میں رسائی ہوئی۔ وہاں میں مارچ کے تیسرے ہفتہ میں پہنچا تھا۔مگر ابھی تک خاصی سردی تھی۔سٹیشن پر پہلے ہی وہاں پہنچے ہوئے ایک دوست مل گئے۔میں سیدھے اُس مکان میں چلا گیا جو پہلے سے کرایہ پر لیا گیا تھا۔ وہ گولڈرس گرین میں تھا۔ہم لوگ کچھ دنوں تک وہیں ٹھہرے رہے۔

وہاں پر سب اِنتظام پہلے سے ہی تھا۔مسٹر مہابیر پرشاد بیرسٹر اور شری کنور بہادر پہلے سے ہی وہاں ٹھہرے تھے۔ اس لئے وہاں گھر جیسا ہی معلوم ہوا۔پھر گوبردھن کے میرے ساتھ آجانے سے کھانا بھی ہندوستانی ملنے لگا۔ جیسے ہم لوگ یہاں دال، چاول، روٹی، ترکاری کھاتے ہی ویسے ہی وہاں بھی کھانے لگے۔میں تو مقدّمے کی پیروی کے لئے گیا تھا، جس رات کو گیا لوگوں سے کُچھ بات چیت کر کے سو گیا۔ پہنچتے ہی معلوم ہو گیا کہ صبح اُٹھ کر بیرسٹر کے یہاں جانا ہوگا، کیونکہ اُس نے آپس میں گفتگو کرنے کے لئے وقت دیا تھا۔ اِس لئے لندن پہنچنے کے بارہ گھنٹوں کے اندر ہی میں کام میں لگ گیا، اور جب تک مقدمہ ختم نہ ہوا، دن رات اُسی کے کام میں لگا رہا۔

لندن میں پروگرام

میرا پروگرام وہاں یہ تھا کہ میں اپنی عادت کے مطابق بہت سویرے اُٹھتا۔ وہاں لوگ سویرے بہت دیر تک سوتے رہتے ہیں۔ زیادہ تر رات کے پہلے پہر میں ہی جاگ کر کام کرتے ہیں۔ میں ایسا کبھی نہیں کرتا۔ وہاں بھی ایسا نہ کر سکا۔ جب سب لوگ سوتے ہی ہوتے تھے میں مُنہ ہاتھ دھو کر غُسل کر کے کپڑے پہن کمرے میں بیٹھ جاتا، اور مقدمے کا کاغذ پڑھنے لگتا۔

سب لوگ سویرے تقریباً نو ساڑھے نو بجے تیار ہوتے۔ اُس وقت تک میں تقریباً دو گھنٹے کام کر چکا ہوتا تھا۔ اِس کے بعد ناشتہ کر کے تقریباً دس بجے لائبریری میں چلا جاتا۔ وہاں قانون کی کتابیں پڑھنے لگتا۔ وہاں کے ہمارے ایٹارنی (قانونی مشیر) نے لائبریری میں ہمارے لئے آسانی کرادی تھی اِس سے انگریزی قانون کی ہر طرح کی کتابیں دیکھنے کو مل جاتیں۔ پھر شام تک کورٹ میں کام کر کے میں نزدیک کے ہی ایک نباتاتی غذا کے رسٹوران میں چلا جاتا، وہاں کچھ پھل، روٹی، دودھ وغیرہ نوش کر کے تقریباً چھ بجے وہاں سے واپس ہو جاتا۔ آنا جانا ریل سے ہوتا جو زیرِ زمیں چلتی ہے۔ گھر پر شام کا کھانا کھا کر شام کو کچھ دیر

کے لئے ٹہلنے جاتا اور واپس آکر کچھ کام کر کے سو جاتا، کسی کسی دن بیرسٹروں کے ساتھ صلاح مشورہ ہوتا۔ اِسی کے مطابق اِس پروگرام میں تبدیلی ہو جاتی، اِس طرح تقریباً دو مہینے گذرے۔ اب بابو ہری جی بھی پہنچ گئے۔ اِسی درمیان مجھے کچھ دنوں کے لئے ہائیٹھ میں جاکر رہنا پڑا تھا۔

ہماری طرف سے سینیر بیرسٹروں میں ایک مسٹر لگس مُور تھے جو تھوڑے ہی دنوں بعد وہاں ہائی کورٹ کے جج ہو گئے۔ میں تقریباً پندرہ دن تک وہاں رہا۔ کام کے سِلسلہ میں اُن سے بہت ربط ضبط ہو گیا۔ ہمارے سب سے سینیر بیرسٹر مسٹر اپ جون تھے، اُن کی عمر اُس وقت چھہتّر سال سے بھی زیادہ تھی لیکن اب وہ کافی محنت کر لیتے تھے۔

مسٹر اپ جون نے ہم لوگوں کا کیس تیار کیا، ہم نے اُسے دیکھا۔ ہم سب کو، خاص کر بابو ہری جی کو پورا یقین ہو گیا کہ اُنہوں نے ساری پیچیدگیوں کو سمجھ لیا ہے اور سبھی کاغذوں کو پورا پورا پڑھ لیا ہے۔ اِس سے ہم لوگوں کو کلّی اطمینان ہو گیا۔ قانون داں لوگوں کے برتاؤ کا یہ بہت اچھّا آدرش میرے دیکھنے میں آیا۔ میں بھی اس پر فریفتہ ہو گیا۔

مسٹر اپ جون سے میری جان پہچان ایک عجیب طریقے سے بڑھی میرا ہندوستانی لباس دیکھ کر وہ سمجھتے تھے کہ میں یا تو بابو ہری جی ہوں یا اُن کا کوئی رشتہ دار جو مقدمے کی پیروی کے لئے آیا ہے۔ وہ مجھے وکیل نہیں جانتے تھے۔ ایک دِن کنسلٹیشن (قانونی مشورہ) کے وقت اُنہوں نے کچھ سوالات کئے۔ میں پیچھے بیٹھا تھا۔ میں نے جواب دے دیا۔ اُنہوں نے میری طرف دیکھا مگر کہا کچھ نہیں، بعد میں ہم سے ایک آدمی سے جو اُن کے یہاں وکیل کی حیثیت سے آیا جایا کرتے تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ ہم لوگوں کا مؤکل تو بڑا ہوشیار معلوم ہوتا ہے۔ اُس نے میرے سوالوں کا اچھّا جواب دیا۔ اِس پر ہمارے ساتھی نے میرے

بارے میں بتایا کہ میں مؤکل نہیں بلکہ ایک وکیل ہوں اور اپنی وکالت چھوڑ دی ہے۔ اِس سے اُن کا اشتیاق کچھ بڑھ گیا۔ بعد ازاں اُنہوں نے مجھ سے بہت کام لیا۔ بہت طرح کے نوٹ تیار کرنے کی فرمائش کی۔ میں برابر تیار کر کے دے دیتا۔ جب مقدّمے کی پیشی کا وقت آیا تو انہوں نے مجھ سے پوچھا، کیا تم اِجلاس میں حاضر رہنا چاہتے ہو، میرے ہاں کہنے پر بولے۔

یہ ضروری نہیں ہے تمہارا وقت دوسرے طریقے سے بہتر استعمال میں آئے گا مجھے بہت معاملوں پر نوٹ چاہئیں۔ تم گھر پر رہ کر تیار کرو۔

میں نے کہا "اگر میں نوٹ تیار کر کے دے دیا کروں اور گھر پر رہنا ضروری نہ ہو تو"

اُنہوں نے کہا، نہیں "نوٹوں کے تیار کرنے میں دیر نہ کرو اور اجلاس میں بھی حاضر ہو سکو تو مجھے کچھ عُذر نہیں ہے، مگر نوٹ میں دیر لگنا میں برداشت نہیں کر سکوں گا"

یہ بات مشہور تھی کہ وہ اپنے مخالف اور ساتھی بیرسٹروں اور ججوں سے بھی اُلجھ جایا کرتے تھے۔ اِس لئے میں بہت ڈرتا تھا، مگر میں نے دیکھ لیا کہ وہ میرے نوٹوں سے مطمئن ہو جاتے تھے، وہ ٹیلی فون کر دیتے کہ میں اجلاس لگنے سے دس پانچ منٹ پہلے اُن سے ملوں۔ وہاں وہ گھر سے ہی اِن معاملوں کو نوٹ کر کے لاتے، جن پر مجھ سے وہ نوٹ لکھانا چاہتے تھے۔ مجھے وہ اِن نوٹوں کو لکھوا دیتے۔ میں اس کے پہلے کے نوٹ دیکھ کر آتا اور اُن میں جو کچھ پوچھنا ہوتا پوچھ لیتا۔ اگر میں پہلے سے کاغذ پنسل لے کر تیار نہ رہتا تو اِس پر بھی وہ بگڑ جاتے۔ وقت کا اِتنا صحیح استعمال کرتے کہ ایک منٹ بھی برباد نہ ہونے پاتا۔

میں نے ایک بات اور دیکھی۔ وہ ہمارے ملک میں خاص کر پٹنہ اور کلکتہ میں، وکیلوں اور بیرسٹروں کے لئے قابلِ تقلید ہے۔ جب میں وکالت کرتا تھا، میرا تجربہ ہوا کہ کورٹ میں جاتے پر جب تک ہم گھر واپس نہیں ہوتے تب تک ہمارا زیادہ تر وقت جو اپنے مقدمے کی پیشی میں نہیں لگتا تقریباً بے کار ہی جاتا ہے۔ بار ایسوسی ایشن یا لائبریری میں بیٹھ کر ہم لوگ بہت کم کتابیں یا کاغذات پڑھتے ہیں ہم لوگ اپنے مقدمے کی تیاری گھر پر ہی کیا کرتے ہیں۔ کورٹ میں جب مقدمہ پیش ہوتا ہے اور جب تک چلتا رہتا ہے، تب تک جس کا مقدمہ رہا اُس کا وقت تو کام میں لگا مگر جن دوسرے لوگوں کے مقدمے کی پیشی نہیں ہوئی وہ صرف گپ شپ میں سارا وقت گذارتے ہیں وہاں میں نے دیکھا کہ بیرسٹر اپنا سارا کام لائبریری میں یا اپنے چیمبر میں ہی پورا کرتے ہیں۔ اِجلاس میں ججوں کے بیٹھنے سے کچھ پہلے ہی آجاتے ہیں۔ پھر اِجلاس اُٹھ جانے کے بعد بھی گھنٹہ دو گھنٹہ بیٹھ جاتے ہیں۔ بیچ میں جب مقدمے کی پیشی سے فرصت ملتی ہے، کام کرتے ہیں، بعض بعض تو گھر پر مقدمے کے کاغذ بھی نہیں جاتے یہاں تک کہ گھر میں قانون کی کتابیں بھی نہیں رکھتے، اُن کا خیال ہے کہ گھر تو بس گھر ہی ہے وہاں بال بچوں سے ملنا، باتیں کرنا، کھانا پینا، دل بہلانا اور جو چاہے تو خواہش کے مطابق دوسری کتابیں پڑھنا چاہیئے، اِس طرح دِن کا پورا وقت ٹھیک استعمال میں آتا ہے اور رات اور صبح کا وقت اپنا ہوتا ہے جسے ہم جس طرح چاہیں اپنے کام میں لاسکتے ہیں۔

وہاں کے بہتیرے وکیل بیرسٹر سنیچر اور اتوار کو لندن کے باہر چلے جاتے ہیں مسٹر اپ جون بلاناغہ ہر جمعہ کو شام کے اِجلاس سے اُٹھ کر باہر چلے جاتے ہیں۔ وہاں سے ریل کے ذریعے لندن سے تقریباً ستّر میل کی دُوری پر اپنے گاؤں کے گھر میں جاکر رہا کرتے تھے پھر اتوار کی شام کو لندن چلے جاتے تھے، ہفتہ کے آخر میں دو دن ہمیشہ گاؤں کی کھلی ہوا

میں ہی گذارنے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ ہفتہ کے یہ دو دن اگر میں گاؤں کی کھلی ہوا میں نہ گذاروں تو ہفتہ کے باقی پانچ دن میں کام کے لائق نہیں رہوں گا۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ اگر میں یہ پابندی نہ رکھتا تو آج اِس عمر میں اتنا کام کر سکتا تھا اگر ہمارے مُلک کے لوگ بھی اس طرح وقت کا استعمال کرتے اور صحت کا خیال کرتے تو ہماری زندگی کچھ طویل ہو جاتی اور ہم کام بھی زیادہ کر سکتے۔

ہم لوگوں کا، خاص کر ہمارے بڑے بیرسٹروں کا، خیال تھا کہ ہمارا مقدمہ بہت مضبوط ہے۔ ہم ضرور جیتیں گے۔ مسٹر اپ جون کا کہنا تھا کہ ہم کو شاید بہت جواب دینے کی بھی ضرورت نہیں پڑے گی، دوسرے فریق کی طرف سے مقدمے کی بحث بیس بائیس دِن تک چلی۔ ابھی شاید ایک ڈیڑھ مہینے تک اُدھر کی بحث چلتی۔ اِسی درمیان کچہری تقریباً تین مہینے کے بند ہونے جا رہی تھی۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ مقدمہ کی پیشی پھر اکتوبر میں ہوتی اور شاید دسمبر تک پی جاتی۔ اُن دِنوں کافی سردی پڑتی اور ہم میں سے بہتیرے اُسے سہہ نہ سکتے، خاص کر میں تو اِس سردی کو برداشت ہی نہیں کر سکتا تھا۔ بابو ہری جی اِس سے بہت گھبرائے۔ ایک موقع ملا تو کسی سے بغیر پوچھے ہی صلح کی بات طے کر لی۔ وہ جانتے تھے کہ وکیل، بیرسٹر صلح کرنے کی بات پسند نہیں کریں گے۔ کیونکہ وہ تو مقدمہ جیتنے کی پوری اُمید رکھتے تھے۔ تب بھی، خرچ بچانے اور جاڑے کی دقّت سے بچنے کے لئے بہت نقصان اُٹھا کر اُنھوں نے صلح کر لی۔ سب باتیں طے کر کے لکھ کر داخل کرنے کے وقت اُنھوں نے وہ باتیں سب سے کہیں۔ دوسروں کو اب کہنا ہی کیا تھا، صلح نامہ پیش ہو گیا۔ مقدمہ اچانک ایک دِن، جولائی کے آخر ہفتہ میں، ختم ہو گیا۔ ہم سب کو چُھٹی مل گئی۔

مسٹر اَپ جون مقدمہ کی باتوں کے ماسوا کوئی اور باتیں نہیں کرتے تھے۔ اُن سے میرا

اتنا کام پڑا کہ اُنہوں نے میرے متعلّق جاننے کی غرض سے شری کنور بہادر سے کچھ باتیں پوچھیں، اُن کو یہ معلوم ہوگیا کہ اب وکالت چھوڑ کر میں گاندھی جی کے ساتھ کام کرتا ہوں۔ اِس سے اِن کو تعجّب ہوا، ایک دِن مجھ سے پوچھا بھی۔ یہ بھی کہا کہ گاندھی جی اُن کے مؤکل رہے ہیں جلیانوالہ باغ کے واقعہ کے لئے جنرل ڈائر پر مقدّمہ چلانے کے متعلّق اُن سے رائے لی گئی تھی۔ اُنہوں نے رائے بھی دی تھی۔ میں نے اُن سے کہا کہ گاندھی جی ڈائر پر مقدّمہ چلانے کے خلاف تھے۔ ہو سکتا ہے کہ پنڈت موتی لال نہرو اور دیش بندھو داس نے آپ کی رائے منگائی ہو۔ اِس پر اُنہوں نے کہا کہ میں نے سمجھا کہ کانگریس کی طرف سے گاندھی جی نے ہی میری رائے منگائی ہے۔ اُس وقت تک میں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ جلیانوالہ باغ کا معاملہ اِس حد تک پہنچا ہے۔ اور ولایت کے بیرسٹر سے رائے لی گئی ہے۔ میرے متعلّق اُنہوں نے اِتنا ہی کہا کہ تم کو وکالت نہیں چھوڑنی چاہیئے۔ اِس بارے میں مقدّمہ ختم ہونے پر ایک روز باتیں کروں گا۔ لیکن مقدّمہ تو اچانک ختم ہوگیا اور مجھے بہت جلد لندن چھوڑ دینا پڑا۔ اِس لئے اُن سے پھر باتیں نہ ہوئیں۔

جلسۂ مخالفتِ جنگ میں

لندن چھوڑنے کا ایک خاص سبب ہوا، جس دِن مقدمہ ختم ہوا، اُس کے دو ہی دِنوں کے بعد آسٹریا کے ایک چھوٹے گاؤں سنتاس برگ میں جو ویانا سے کچھ دُور پر ہے ایک بین الاقوامی کانفرنس جنگ کی مخالفت میں ہونے والی تھی، میں اِس معاملے میں کچھ دلچسپی رکھتا تھا۔ مسٹر فنر براکوے اُس کے صدر ہونے والے تھے۔ بہار کے ہی شری تارنی پرشاد سنگھ نے جو اِنگلستان میں بہت دنوں سے تھے اور جو اِس جلسہ میں جانے والے تھے، مجھ سے کہا کہ تم بھی چلو تو اچھا ہوگا۔ اِس طرح کی کانفرنس کی بات میں نے پہلے سے سُن رکھی تھی، اُس میں جانے کا پہلے سے اِرادہ بھی کر رکھا تھا۔ مقدمہ ختم ہو جانے سے بہت اچھا موقع مِل گیا۔ اِس لئے میں وہاں جانے پر فوراً رضامند ہوگیا ہم لوگ ایک پنجابی دوست کے ساتھ روانہ ہوگئے، اور دوسرے دن وہاں پہنچ گئے۔ راستہ میں کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ یورپ کے چھوٹے چھوٹے مُلکوں کا صِرف کچھ اندازہ ہوگیا جب گاڑی چار، پانچ گھنٹے چل کر ٹھہر جاتی تب معلوم ہوتا کہ ہم دوسرے مُلک کی سرحد پر پُہنچ گئے ہیں۔ وہاں اُس مُلک کے سرکاری کارکن چُنگی کے لئے ہمارا سامان دیکھنے آجاتے۔

ہمارے پاسپورٹ (پروانہ راہ داری بھی جانچتے۔ اِس طرح ہم تقریباً چوبیس گھنٹوں میں آسٹریا پہنچے۔ راستہ میں تین چار بار سامان دکھانا پڑا۔

جنگ کی مخالفت میں کانفرنس ایک گاؤں ہوئی۔ وہاں ایک چھوٹی سی پہاڑی پر پرانا گرجا گھر تھا۔ اس میں جرمنی، آسٹریا، فرانس، انگلستان، فلسطین، چکوسلوویکیا، ہالینڈ وغیرہ بہت سے ملکوں کے نمائندے موجود تھے۔ نمایندوں کی تعداد بہت بڑی نہیں تھی، مگر اپنے اپنے مقام پر سبھی بہت دُھن سے جنگ کی مخالفت کے کام میں لگے ہوئے تھے اُن میں سے بہتیروں نے اُس کے لئے سزا بھگتی تھی۔ جیل خانے ہو آئے تھے۔ اُن لوگوں کو میرے بارے میں معلوم ہوا کہ میں گاندھی جی کے ساتھ کام کرتا ہوں تو قدرتاً اُن کی توجہ میری طرف ہوئی۔ وہ لوگ مجھ سے گاندھی جی کے پروگرام اور طریقِ کار کے متعلق بہت کچھ پوچھ گچھ کرتے رہے۔ کانفرنس میں بھی کچھ کہنے کا مجھ سے اِصرار کیا گیا میں نے مہاتما جی کے کام کے متعلق کچھ باتیں بتائیں۔ ہندوستان میں اُن دِنوں باردولی کی ستیہ گرہ چل رہی تھی۔ اِس کی کچھ خبر ہم کو وہاں ملی تھی۔ میں نے خاص کر چمپارن اور باردولی کے متعلق ہی تقریر کی۔ میں نے یہی ظاہر کیا کہ کس طرح اُن کی عدم تشدّد کی پالیسی مسائلِ عامہ کو حل کرنے کے کام میں لائی جاتی ہے اور وہ کہاں تک کامیاب ہوتی ہے۔ ہم لوگ وہاں دو تین دِن ٹھہرے، بہت اچھا وقت گذرا۔

کانفرنس کی کارروائی جرمن، فرانسیسی، انگریزی، اور اسپرینٹو چار زبانوں میں ہوتی تھی۔ ایک جرمن نوجوان جس کا ذکر پہلے کر چکا ہوں، چاروں زبانوں کا ایسا اچھا ماہر تھا کہ چاہے کسی بھی زبان میں تقریر ہو وہ شارٹ ہینڈ (مختصر نویسی) سے ساری تقریر لکھ لیتا تھا اور اپنے نوٹ سامنے رکھ کر باقی تینوں زبانوں میں پوری تقریر سُنا دیتا تھا۔

کانفرنس میں جنگ کی مخالفت میں تجویزیں پاس ہوئیں۔ یہ طے ہوا کہ کانفرنس کے بعد چند خاص مقامات پر اُس کے نمائندے جاکر جنگ مخالفت میں تقریریں کریں۔ وہاں سے کچھ دُور پر گراٹز نامی شہر ہے۔ وہاں ڈاکٹر اسٹانڈی ناتھ اپنی اہلیہ کے ساتھ رہا کرتے تھے۔ یہ وہاں کے میڈیکل کالج میں معلّم تھے۔ مہاتماجی سے اُن دونوں کی خط و کتابت ہوا کرتی تھی، اگرچہ یہ لوگ اُس وقت تک ہندوستان نہیں آئے تھے۔ میرے یوروپ جاتے وقت مہاتماجی نے مجھے اُن کے نام ایک خط دیا تھا اور کہا تھا کہ اُدھر جانا ہو تو اُن سے مل لینا۔ جب گراٹز بھی جانے کی بات ہوئی تو میں نے اُن کو اطلاع دے دی اور گاندھی جی کا خط بھی بھیج دیا۔ کانفرنس کے سکریٹری انگلستان کے مسٹر رنہم براؤن تھے۔ اُن کے ساتھ کئی اور نمایندے ویانا اور گراٹز جانے کے لئے مقرر کیے گئے۔ ویانا میں ایک جلسہ ہوا جس میں وہاں کے ایک مشہور پادری مسٹر اودا صدر ہوئے، وہاں کے جلسے میں کچھ ایسے لوگ آئے تھے جو بیچ بیچ میں بہت شور مچاتے رہے میں اُن کی بات سمجھ نہیں سکتا تھا، اِس لیے یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ کیا بولتے یا چاہتے تھے مگر اتنا معلوم ہوا کہ وہ لوگ مخالف خیال کے تھے۔ اس جلسہ میں اس سے زیادہ کوئی واقعہ نہیں ہوا۔

دوسرے دن ہم لوگ گراٹز گئے۔ وہاں شام کو پانچ بجے ہم پہنچے۔ سات بجے سے جلسہ ہونے والا تھا۔ اِسٹیشن پر اسٹانڈی ناتھ اپنی اہلیہ کے ساتھ آئے تھے۔ اُنہوں نے مجھے اپنے یہاں ٹھہرنے کے لئے بلایا اور میں چلا گیا۔ دوسرے ساتھی کسی دوسری جگہ ٹھہرے جس کا مجھے پتہ نہ تھا۔ یہ سمجھ لیا تھا کہ پھر دو گھنٹوں کے بعد تو ملاقات ہوگی ہی ڈاکٹر اسٹارڈی ناتھ کے گھر سے تھوڑی ہی دُور پر جلسہ گاہ تھی۔ اُن کے گھر پر ہاتھ مُنہ دھوکر اور کچھ کھاکر ان دونوں کے ساتھ میں جلسہ گاہ کے لئے وقت سے کچھ پہلے روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر اس بڑے کمرے کے اندر گیا جہاں جلسہ ہونے والا تھا اِس طرح کا جلسہ میں نے

کبھی دیکھا نہ تھا۔ ایک بڑا عمل تھا جس میں تقریباً چار پانچ سو آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ چھوٹی چھوٹی میزیں سارے کمرے میں رکھی تھیں۔ ہر ایک میز کے چاروں طرف پانچ چھ آدمی بیٹھے تھے۔ ہر ایک کے سامنے شراب کا گلاس رکھا تھا۔ تقریباً سبھی سگریٹ یا سِگار پی رہے تھے۔ سارا کمرہ دھوئیں سے بھرا ہوا تھا۔ کمرے کے اندر جانے کے لئے ایک طرف دروازہ تھا۔ کمرے کے دوسرے سرے پر دیوار کے نزدیک لکڑی کا ایک چبوترہ (پلیٹ فارم) بنا ہوا تھا جس پر پانچ سات کرسیاں رکھی تھیں اور ایک لمبی سی میز تھی۔ اِس پلیٹ فارم کے ایک گوشہ کے نزدیک ایک چھوٹا سا دروازہ بھی تھا، جس کے پَٹ بند تھے، ہم لوگ کمرے کے اندر گھسے میری پوشاک سے ہی شائد کچھ لوگ سمجھ گئے کہ میں بھی اُن لوگوں میں سے ہوں جو یہاں بولنے آئے ہیں۔ ہمارے کمرے میں گُھستے ہی ایک شخص نے پوچھا۔

آپ جرمن زبان میں تقریر کریں گے یا کسی اور زبان میں۔

میں نے جواب دیا۔

میں انگریزی جانتا ہوں اور جو کچھ کہنا ہوگا انگریزی میں کہوں گا۔ اگر منتظموں نے ترجمے کا کوئی انتظام کیا ہوگا تو میری تقریر کا ترجمہ کوئی کر دے گا۔

ہم جوں ہی کمرے کے بیچ تک پہنچے، ایک طرف سے کچھ شور غل شروع ہوا میں کچھ سمجھ نہ سکا مگر اُن دونوں نے مجھ سے کہا کہ مخالف لوگ یہ شور مچا رہے ہیں۔ ہم تینوں سیدھے اِس پلیٹ فارم کی طرف چلے گئے۔ پروفیسر اسٹارڈی ناتھ اِس پلیٹ فارم کے کونے والے دروازے کی طرف گئے۔ اُسے اُنہوں نے کھولنا چاہا۔ وہ بند تھا۔ اِسی درمیان کوئی دس، بارہ آدمی اُچھل کر پلیٹ فارم پر آگئے وہ مجھے تھپّڑ اور مُکّے مارنے لگے۔ اِن دونوں نے بیچ میں پڑ کر کچھ چوٹیں اپنے اُوپر لیں۔ اِتنے ہی میں حملہ آوروں میں سے کچھ نے کرسیوں کو

پٹک پٹک کر توڑ ڈالا اور ان ٹوٹے ٹکڑوں سے ہم پر حملہ جاری رکھا۔ وہ میاں بیوی بیچارے گھائل ہو گئے۔ اُن کے سر سے خون بہنے لگا۔ میں بھی زخمی ہوا، اور میرے سر سے بھی خون بہنے لگا۔ ہم لوگ سمجھ ہی نہ سکے کہ یہ کیا ہوا، اور ہم پر کیوں حملہ کیا گیا۔ اس وقت میرے دل میں یکایک یہ خیال آیا کہ یہاں سے نیچے اُتر جانا چاہیئے۔ ہم پلیٹ فارم سے کود کر نیچے اُتر گئے۔ ہمیں پتہ نہ تھا کہ نیچے بیٹھے ہوئے لوگوں کا کیا رُخ ہے۔ جب تک ہم پر حملہ ہو رہا تھا نہ کوئی اُٹھا، نہ کوئی کچھ بولا۔ ہم جب نیچے اُتر گئے، تب بھی کوئی کچھ نہ بولا۔ اُن کے درمیان ہو کر ہم دروازے کی طرف چلے گئے صرف ایک عورت ہمارے ساتھ ہو گئی اور ہمارے باہر نکلنے پر وہ پروفیسر اسٹارڈی ناتھ سے کچھ باتیں کرتی رہی۔ ہم لوگ خون سے تر بتر گھر پہنچ گئے۔ یہاں پروفیسر نے پہلے میرے زخم دھو کر پٹّی باندھی۔ اس کے بعد اپنی عورت کے اور اپنے گھاؤ دھوئے۔ وہ لوگ انگریزی کم جانتے تھے اور مشکل سے اپنے خیالات بتا سکتے تھے۔

میں سمجھ گیا کہ جن لوگوں نے حملہ کیا تھا وہ اس پارٹی کے تھے جو جنگ کی حامی تھی اِس لئے وہ جنگ کی مخالفت کی تبلیغ کو روکنا چاہتے تھے۔ اپنے ساتھیوں کی مجھے کچھ بھی خبر نہ ملی بعد میں سُنا کہ وہ لوگ پلیٹ فارم کے چھوٹے دروازے کے نزدیک ہمارے انتظار میں باہر کھڑے تھے۔ بعد میں انہیں معلوم ہوا کہ اندر یہ واقعہ ہو گیا۔ جلسہ تو ہو ہی نہ سکا۔ وہ لوگ بھی چلے گئے۔ میں دوسرے ہی دن سویرے وہاں سے ویانا کے لئے روانہ ہو گیا۔ مجھے کچھ دُور تک پہنچانے کے لئے اسٹارڈی ناتھ اپنی بیوی کے ساتھ آئے۔ پٹّی ہم تینوں کے بندھی ہوئی تھی۔ ریل کے مسافروں نے ہمارا حال پوچھا اور ڈاکٹر اسٹارڈی ناتھ نے سب باتیں کہہ سنائیں، تب ایک عورت نے اپنی گٹھری کھول کر کچھ کھانے کی چیزیں مجھے دیں، مگر وہ گوشت کی بنی ہوئی تھیں، ہم نہیں لے سکے۔ شکریہ ادا کر کے ڈاکٹر نے اُنہیں سمجھا دیا۔ میں نے

دیکھا کہ اِس دُور دراز کے غیر ملک میں بھی عام لوگ پردیسی کے لئے وہی جذبہ رکھتے ہیں، جو ہم ہندوستان میں کہیں بھی دیکھ سکتے ہیں۔ اِس واقعہ کی خبر اخباروں میں چھپی۔ وہاں کے اخباروں نے اِس پر رائے زنی بھی کی۔ یہاں ہندوستان تک خبر پہنچ گئی۔ مہاتماجی کو بھی اِدھر اُدھر سے کچھ سننے کو ملا۔ میں نے اس وقت کسی کو نہ لکھا۔ مگر ڈاکٹر اسٹار ڈی ناتھ نے مہاتماجی کو لکھ بھیجا اُنہوں نے ینگ انڈیا میں پہلے پہل پورا حال چھاپ دیا۔

روماں رولاں سے ملاقات:
نوجوانوں کی کانفرنس

میں وہاں سے سیدھے سوئٹزرلینڈ گیا۔ میری بڑی خواہش تھی کہ مسٹر روماں رولاں سے جا کر ملوں۔ اِسی لئے وہاں گیا تھا۔ جہاں وہ عموماً رہا کرتے ہیں۔ مگر وہاں جا کر اُن کی بہن سے مُلاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ گرمی کی وجہ سے کارٹیرنگی پہاڑ پر گئے ہوئے ہیں۔ میں وہاں چلا گیا۔ راستہ بہت ہی اچھا تھا۔ ریل اُونچے پہاڑ پر آہستہ آہستہ چڑھتی گئی۔ وہاں برف سے ڈھکے پہاڑ تھوڑی دُور پر نظر آ رہے تھے۔ میں ایک ہوٹل میں ٹھہرایا گیا۔ مسٹر روماں رولاں نے ہی سب انتظام کر دیا تھا، دو روز تک وہاں رہا۔ اُن سے مُلاقات ہوئی، باتیں بھی ہوئیں۔ لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ انگریزی نہیں بول سکتے تھے اور میں فرانسیسی زبان نہیں سمجھ سکتا تھا۔ ہوٹل میں ایک انگریزی جاننے والا انہوں نے ڈھونڈ نکالا۔ مگر اُس کا علم بھی کچھ یوں ہی سا تھا۔ اُن سے مل کر مجھے جتنا فائدہ ہونا چاہیئے تھا، نہیں ہو سکا۔

اُنہوں نے گراٹز کے واقعہ کا حال اخباروں میں پڑھا تھا۔ میرے پٹی بندھے ہوئے سر اور ہاتھ کو بھی اُنہوں نے دیکھا۔ وہاں سے روانہ ہو کر سوئٹزرلینڈ کے کچھ اور شہروں کو دیکھتے ہوئے میں لندن کے لئے چل دیا۔ میں نے برن ویل، نیوٹاٹیل، لوسان اور جنیوا شہروں کو دیکھا۔ نیوٹاٹیل میں ایک چھوٹا سا حیرت انگیز واقعہ ہوا۔ میں وہاں بازار میں گھوم رہا تھا ایک دوکان میں ہاتھ کا بُنا ہوا کپڑا بکتا تھا۔ میں وہاں گیا۔ ایک لڑکی اُسے فروخت کر رہی تھی۔ وہ انگریزی جانتی تھی۔ جب میں نے ہاتھ سے بُنے ہوئے کپڑے کی بات کی اور اُس نے میری پوشاک دیکھی تو سمجھ لیا کہ میں ہندوستان سے آیا ہوں۔ مجھے یہ جان کر بہت تعجّب ہوا کہ وہ گاندھی جی کا صرف نام ہی نہیں جانتی تھی، بلکہ جو کتابیں اُن کے بارے میں اُسے ملی تھیں انہیں پڑھ بھی چکی تھی۔ اُس نے مجھے میونچ کی ایک دوکان کا پتہ بھی دیا، جہاں ہاتھ کے بُنے کپڑے مِل سکتے تھے۔ اپنی دوکان میں رکھے ہوئے پُرانے سوئس چرخے کا نمونہ بھی دِکھایا۔ یہ ہمارے مُلک کے پُتی والے چرخے کی طرح کا ہی تھا۔ مگر وہ اُونچی کرسی، یا اسٹول پر بیٹھ کر چلایا جا سکتا تھا۔ میں نے پہلے پہل وہاں سمجھا کہ گاندھی جی کے متعلق رومان رولاں کی کتاب نے کتنا اثر ڈالا ہے۔

سوئٹزرلینڈ کے شہروں کو دیکھتا ہوا میں پیرس پہنچا، وہاں بھی ایک یا دو دِن ٹھہر کر شہر دیکھا، پھر لندن پہنچا۔ لندن میں جس مکان میں ٹھہرا تھا وہاں چھ سات بجے پہنچا مگر پہنچنے پر سناٹا پایا۔ کوئی بھی نہیں تھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ میری غیر حاضری میں ایک خوفناک حادثہ ہو گیا ہے۔ شری ستیہ رنجن پرشاد سنگھ، جو ہم لوگوں کے ساتھیوں میں تھے ایک روز وہاں واپسی پر ٹھیک اپنے مکان کے سامنے ہی بس سے اُترے اور سڑک پار کرتے ہوئے ایک موٹر سے ٹکر کھا کر گرے اور بے ہوش ہو گئے۔ اُن کی حالت بہت خراب تھی

سبھی لوگ اُس نرسنگ ہوم میں گئے ہوئے تھے، جہاں اُن کا علاج ہو رہا تھا۔ ہاتھ منہ دھوکر میں بھی فوراً وہاں گیا۔ چوٹ لگنے کے بعد سے وہ کبھی ہوش میں نہ آئے۔ جب میں پہنچا تب بھی اُن کی حالت تشویش ناک تھی، ہوش نہ تھا۔ اُسی رات کو وہ گذر گئے۔

میری خواہش تھی کہ مقدمہ ختم ہو جانے پر لندن دیکھوں گا۔ اور چند دوسری جگہوں میں بھی کچھ گھوم پھر کر ہندوستان واپس ہوں گا۔ مگر اس حادثے نے سبھی لوگوں کو بہت ملول کر دیا۔ ہم سب کی خواہش ہوئی کہ جلد سے جلد اب ہندوستان واپس چلا جائے۔ اب وہاں ٹھہر کر کسی چیز کے دیکھنے کو ذرا بھی جی نہیں چاہتا تھا۔ اُن کی وفات کے دو تین روز تک وہاں موت کے متعلّق کارونر کی جانچ کے لئے ٹھہرنا پڑا۔ اُس نے فیصلہ دیا کہ موت حادثہ سے ہوئی ہے، کسی کا قصور نہیں ہے، لاش ہم کو مل گئی۔ جب ہم لوگوں نے وہاں بجلی کی چِتا، (کریموٹیریم) میں جلا دیا۔ میں اُسی رات اڈنبرا چلا گیا۔ وہاں سے واپس آکر ہم سب لوگ روانہ ہو گئے۔ لندن میں کچھ نہیں دیکھ سکا۔ یہاں تک کہ برٹش میوزیم کو بھی اُچٹتی نظر ہی دیکھا۔ اس کے اندر جاکر کچھ نہ دیکھ سکا۔

ہم لوگ لندن سے اِس اِرادے سے روانہ ہوئے کہ مارسیلز میں 'ملتان' نامی جہاز پر سوار ہوں گے جو اگست کے آخر ہفتہ میں وہاں سے کسی دِن روانہ ہونے والا تھا۔ بیچ میں دس بارہ دن مِل جاتے تھے۔ میں نے سوچا کہ یہ دس بارہ دِن یوروپ کے ملکوں کو دیکھنے میں لگاؤں۔ اُنہیں دِنوں ہالینڈ میں نوجوانوں کی ایک بین الاقوامی کانفرنس ہونے والی تھی۔ میں وہاں بھی گیا۔ اسی کانفرنس میں بنگال کے ڈاکٹر سانیال سے ملاقات ہوئی، وہ بھی کچھ کچھ مخالفتِ جنگ کی ہی کانفرنس تھی۔ اس میں بھی کئی مُلکوں کے نوجوان آئے تھے۔ ایک خصوصیّت یہ بھی تھی کہ اس میں امریکہ کے بہت نمائندے تھے۔ متذکرہ سابقہ مخالفت جنگ کی

(ستناس برگ) کانفرنس کے مقابلے میں یہاں نمایندوں کی تعداد بہت زیادہ تھی مگر قلبی سنجیدگی اور دِلی جوش کا عالم وہاں تھا، یہاں میں نے نہیں دیکھا۔ یہ کانفرنس بھی کسی شہر میں نہ ہو کر ایک گاؤں میں ہوئی تھی۔ ہم سب کسی مکان میں نہ ٹھہر کر ایک خیمہ میں ٹھہر گئے تھے، انتظام بہت سادہ تھا۔ وقت پر سائرن (بھونپو) بجتا تھا۔ سبھی لوگ اپنے گلاس اور طشتری لے کر ایک بڑے خیمے میں پہنچ جاتے، وہاں لکڑیوں کے ٹکڑے جوڑ کر کام چلاؤ میزیں اور بنچیں بنی تھیں وہیں کھانا یا ناشتہ مل جاتا پھر سائرن بجنے پر کانفرنس میں سبھی پہنچتے تھے۔ تب وہاں تقریریں ہوتیں، میں نے دیکھا کہ مختلف ملکوں سے آئے ہوئے اِن نوجوانوں کو تمام قومی اور بین الاقوامی معاملوں میں پوری دلچسپی ہے۔ وہاں بڑے جوش کے ساتھ بین الاقوامی لیگ جیسی انجمنوں اور اُن کی کارروائیوں اور افادیت پر زوروں کی بحث ہو رہی، کچھ جرمن بھی اس میں شریک تھے میں نے قیاس گیا کہ اس مُلک میں آپس میں اِختلافِ رائے ہے، اور دوسرے مُلکوں کے نمایندوں میں بھی وہاں کے مسائل کے متعلّق اندازِ فکر میں فرق ہے۔ اِس کانفرنس میں بھی میں نے تقریر کی۔

جرمنی، اِٹلی کی سَیر اور واپسی

وہاں سے میں برلن گیا۔ میں نے سفر کا ایک پروگرام بنالیا تھا جس میں جرمنی کے تین شہر رکھ لئے تھے۔ برلن، لپزگ اور میونچ۔ اٹلی میں وَنیس اور روم اور پھر فرانس کے جنوب میں نیس ہوتے ہوئے مارسلز پہنچنے کا خیال تھا۔ وقت اِتنا کم تھا کہ اس سے زیادہ کہیں جا نہیں سکتا تھا اور اِن شہروں میں بھی میں پورا وقت نہیں دے سکتا تھا۔ میں اکثر رات کی گاڑی سے روانہ ہوتا۔ وہاں کی گاڑیوں میں زیادہ کرایہ دینے پر سونے کی جگہ مل جاتی ہے۔ اِس لئے میں ایسی گاڑی منتخب کرلیتا تھا جو رات کو دس گیارہ بجے روانہ ہوتی اور صبح ہوتے منزلِ مقصود پر پہنچ جاتی۔ سونے کا ٹکٹ لے کر رات کو آرام سے گاڑی میں سوتا ہوہے گاڑی سے ہی ہاتھ منہ دھوکر اُترتا۔ سٹیشن پر اس کمرے کی تلاش کرلیتا، جہاں مسافروں کے سامان حفاظت سے رکھے جاتے ہیں۔ تقریباً ہراسٹیشن پر ٹامس کُک کا نمائندہ مل ہی جاتا۔ صرف لپزگ میں وہ نہیں مِلا۔

برلن اسٹیشن پر اُترنے پر پہلے کوئی جانا پہچانا آدمی نہیں ملا مگر جب میں ٹیکسی والے سے صرف اپنے اشاروں کے سہارے انگریزی ہوٹل کی تلاش کرنے کی کوشش میں لگا تھا

ٹامس کک کا آدمی نظر آگیا۔ وہ مجھے ایک ہوٹل میں لے گیا۔ اتفاق سے بابو ہری جی بھی اُسی ہوٹل میں آ پہنچے، اُن سے ملاقات ہوئی، دو یا تین دِن، میں وہاں ٹھہرا، گھوم گھام کر برلن دیکھا، وہاں شری بی چٹو پادھیائے سے ملاقات ہوئی۔ روس سے اُن کا کچھ تعلق تھا۔ مجھ سے اُنہوں نے کہا کہ وہاں جانا چاہو تو پاسپورٹ کا انتظام ہو سکتا ہے۔ مگر وقت کی کمی کی وجہ سے میں یہ فائدہ نہ اُٹھا سکا۔ برلن میں میں ایک ایسے ریسٹوران میں کھانا کھایا کرتا تھا جہاں نباتی غذا مل سکتی تھی۔ اُسی نے سارے یورپ کے بڑے بڑے شہروں کے نباتاتی غذا کے ہوٹلوں کی فہرست دے دی۔ اس میں سب کے نام اور پتے چھپے تھے۔ اِسٹیشن پر اُتر، اسی کاغذ کو دکھلا کر میں ایسے ریسٹوران تک پہنچ جاتا، اور وہیں کھانا کھاتا۔ انڈے کی وجہ سے کچھ دقّت ہوتی، مگر میں نے ایک دو لفظ سیکھ لئے تھے جن سے یہ جتا دیتا کہ مجھے انڈے سے بھی پرہیز تھا۔

لپزگ میں صرف دن بھر ٹھہرا۔ وہاں ٹامس کک کا نمائندہ نہیں ملا، اِس لئے وہاں اپنی عقل سے ہی کام لینا پڑا۔ اِنگلستان جانے سے پہلے کئی مہینوں تک میں نے لوئی کونے کے پانی کے علاج کے طریقے سے کمر تک کا غسل کیا تھا، جس سے کچھ فائدہ بھی ہوا تھا۔ اُن کی کتاب بھی انگریزی میں پڑھی تھی۔ اِس لئے مجھے اشتیاق تھا کہ خود اُن سے جا کر ملوں لہٰذا میں نے اپنے دورے کے پروگرام میں لپزگ کو رکھا تھا اسٹیشن سے اُتر کر سیدھا اُن کے شفا خانے میں گیا۔ وہاں سُنا کہ اُن کی وفات ہو گئی ہے اور وہ بھی عجیب طریقے سے۔ وہ پھل کھانے کے بڑے شوقین تھے، عمر کافی ہو گئی تھی، تب بھی کسی درخت پر پھل توڑنے چڑھے اور گر گئے، چوٹ زیادہ لگی اور مر گئے۔ اُن کے لڑکے تھے جو انگریزی نہ جاننے کے برابر جانتے تھے۔ اُن سے کسی طرح باتیں ہوئیں۔ اُنہوں نے میرے لئے نہانے کا طریقہ اور

غذا کے متعلق نسخہ لکھ کر دیا۔ وہیں ایک بار نہلا کر بتا بھی دیا۔ وہ نسخہ جرمن زبان میں تھا۔ میں اُس سے فائدہ نہ اُٹھا سکا اور وہیں پر وہ کھو بھی گیا۔

کھانے کے وقت میں وہاں ایک ریسٹوران میں گیا۔ وہاں تو ایک بھی آدمی انگریزی جاننے والا نہ تھا، میں بڑی مشکل سے نوکر کو کچھ بتانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایک عورت مجھ سے کچھ دُور ٹیبل پر کچھ کھانے بیٹھی تھی۔ اُس نے میری دقّت دیکھی۔ وہ میرے پاس آئی۔ انگریزی خوب جانتی تھی، وہ خود تو جرمن تھی مگر اُس کا شوہر امریکی تھا۔ جو اُس زمانے میں امریکہ گیا ہوا تھا۔ اُس نے میری پوری مدد کی، اُس دن ٹامس کُک کے نمایندے کا کام اُسی نے کر دیا۔ گھوم پھر کر تمام شہر بھی دکھا دیا اور شام کو ریل سے سوار کرا دیا۔ اس قسم کی صاحب دلی اکثر دیکھنے میں نہیں آتی۔

اپنے دَورے کے پروگرام کے مطابق میں میونخ گیا۔ وہاں وہ مشہور سیلر ہاؤس دیکھا جس میں اکثر ہٹلر کی تقریر ہوا کرتی تھی، وہاں کا وہ مشہور عجائب گھر بھی دیکھا جس میں سائنٹیفک چیزیں جمع ہیں۔ وہاں تلاش کرتے کرتے میں اس دوکان تک پہنچا جہاں نیو ٹائیل میں مجھ سے کہا گیا تھا کہ، ہاتھ کے بنے ہوئے کپڑے ملتے ہیں، مگر ایسا کوئی کپڑا ملا نہیں۔

میونخ سے میں وینس گیا۔ عجیب سہر ہے۔ سمندر گھر گھر میں ہے۔ گھر سے نکل کر کشتی میں باہر جایا جاتا ہے، کشتی کے سوا وہاں کوئی دوسری سواری نہیں ہوتی۔ پانی کے بیچ میں چٹان ہے۔ اُسی پر مکان بنے ہیں۔ جو مشہور گرجا گھر ہے وہی کچھ خالی جگہ ہے۔ وہاں میں شام کے وقت ٹہلتا رہا۔ رات کے دس گیارہ بجے ہوٹل میں جا کر ٹھہرنا چاہا، مگر وہاں اِتنے مچھّر تھے کہ مسہری لگانے پر بھی وہاں ٹھہرنا مشکل ہو گیا۔ اِس لئے گاڑی کے وقت سے پہلے ہی اسٹیشن چلا گیا۔

روم میں دو دن ٹھہرا۔ نئی اور پُرانی چیزیں، ٹامس کُک کے انتظام کے مطابق خوب دیکھیں۔ اِٹلی کے دونوں شہروں میں فوج کے بہت سے آدمیوں کو جا بجا آتے جاتے دیکھا۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ فوج کا وہاں بہت زور ہے۔ میرا سفر کچھ ایسا رہا کہ سیاحوں کے دیکھے جانے والے مقامات کے سوا میں کچھ اور نہ دیکھ سکا۔ نہ کسی سے مل سکا۔ وقت بھی نہ تھا اور اس کا انتظام بھی نہ تھا۔ پہلے سے اگر اہتمام ہوتا تو کچھ لوگوں سے مل لیتا۔ وقت ملتا تو وہاں کے حالات جاننے کی بھی کوشش کرتا، لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ جس کا افسوس رہا، مگر ناچاری تھی۔

آخر میں مارسلز کے لئے روانہ ہوا۔ راستہ میں نیس میں اُترا۔ وہاں بھاگل پور کے شری دیپ نارائن سنگھ سے ملاقات ہوگئی۔ چند گھنٹوں تک اُن کا ساتھ رہا۔ وہاں پاس ہی کے مشہور "کینو کو دیکھا۔ جہاں لوگ جوا کھیلتے ہیں۔ اِن سب چیزوں کے دیکھنے میں میرا جی نہیں لگا۔ فوراً ہی مارسلز واپس چلا گیا۔ دوسرے ہی دن جہاز پر سوار ہونا تھا۔ بابو ہری جی سے ملاقات ہوگئی۔ ہم رات بھر ایک ہوٹل میں ٹھہرے، دوسرے دِن 'مُلتان' جہاز پر سوار ہوگئے۔ جہاز ہندوستان کے لئے روانہ ہو گیا۔ اِس بار ہم لوگ آٹھ دس آدمی ساتھ تھے اِس لئے جہاز میں کسی قسم کی دقّت نہ ہوئی۔ میری طبیعت کچھ خراب ہوگئی۔ ایک دو دن سمندر کی ہوا لگنے پر پھر دمہ ہو گیا مگر وہ جلد ہی اچھا بھی ہو گیا۔ ہم لوگ بمبئی میں ستمبر کے دوسرے ہفتے میں اُتر گئے۔ جہاز پر کوئی خاص واقعہ نہ ہوا۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر سر فلپ ہارٹوگ اُسی جہاز سے واپس آرہے تھے، اُن سے ملاقات ہوگئی۔ جہاز پر اکثر اُن سے باتیں ہوا کرتی تھیں۔

سائمن کمیشن کا دوسرا دورہ

بمبئی میں جہاز سے اُتر کر میں سیدھا احمد آباد چلا گیا۔ وہاں ایک دن ٹھہر کر پھر پٹنہ واپس ہوا۔ میری غیر حاضری میں دو بہت اہم واقعات مُلک میں ہو چکے تھے۔

(۱) بار دولی میں زمین کا لگان بڑھانے کی وجہ سے ستیہ گرہ، اور

(۲) مُلک کے لئے سبھی پارٹیوں والوں کے مل کر آئین تیار کرانے کے لئے نہرو کمیٹی کی تنظیم۔

بار دولی کا ستیہ گرہ خوب کامیاب رہا۔ حکومت نے اپنی طرف سے ہر طرح اُسے دبانے کی کوشش کی۔ لوگوں نے بھی جوش کے ساتھ اس جبر و تشدد کو برداشت کیا۔ سختیاں جھیلنے میں عوام کو پوری کامیابی ملی۔ گاندھی جی کی دُعا اور اِمداد تو شامل حال تھی ہی، تحریک چلانے کا سارا بار حقیقتاً سردار ولبھ بھائی پٹیل پر تھا۔ جنہوں نے اُسے بڑی عقل مندی، استقلال، بے خوفی اور محنت سے چلایا تھا۔ سبھی پارٹیوں کے لوگوں نے اُسے انتہائی اہم تحریک سمجھا۔ سب نے مدد بھی دی تھی۔ سردار نے گجرات کے باہر کے لوگوں کو آنے سے منع بھی کر دیا تھا اس لئے دوسرے صوبوں کے کارکن باہر سے ہی جو اِمداد پہنچا سکتے پہنچاتے رہے۔ وہاں کوئی گیا نہیں

سارے ملک کے سامنے ستیہ گرہ کا ایک اعلیٰ نمونہ آگیا۔ لوگوں کو یہ معلوم ہوگیا کہ اگر تنظیم اور قربانی کافی ہو تو غیر متشدّد ستیہ گرہ کے ذریعے سے زبردست حکومت بھی دبائی جاسکتی ہے جس چیز کی راہ ۱۹۲۱ء سے ہی لوگ دیکھ رہے تھے، اُسے ایک تعلقہ کے سردار نے آنکھوں دکھا دیا۔ اب اس کے بعد لوگ یہی سوچنے لگے کہ سارے ملک کو باردولی کیسے بنایا جائے اِس ستیہ گرہ نے ملک میں نئی جان ڈال دی۔ جو ستیہ گرہ بعد میں ۱۹۳۰ء میں ہوا، اُس کے لئے زمین بھی تیار ہوگئی۔

مدراس کانگریس میں ایک کمیٹی مقرر ہوئی تھی۔ یہ کام اُس کے سپرد کیا گیا تھا کہ سبھی پارٹیوں کے لیڈروں سے مِل کر وہ ایک پلان تیار کرلے۔ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ تو سب نے کیا تھا، مگر وہ اپنا کام کرتا ہی جارہا تھا۔ سوچا گیا کہ جب تک اپنی طرف سے تیار کرکے کوئی منصوبہ دُنیا کے سامنے نہیں رکھا جائے گا، تب تک یہی سمجھا جائے گا کہ ہم لوگ صرف نکتہ چینی کرسکتے ہیں کوئی تعمیری کام نہیں کرسکتے۔ اِس لئے اس کمیٹی کو سب پارٹیوں کے لوگوں سے مدد ملی۔ پنڈت موتی لال نہرو اِس کے کنوینر (داعی) مقرر ہوئے۔ اِسی لئے اس کا نام نہرو کمیٹی پڑا۔ اسی کمیٹی نے پلان تیار کرلیا تھا۔ سب پارٹیوں کے نمائندوں نے، کچھ باتوں کو چھوڑ کر زیادہ تر باتوں کو منظور کرلیا تھا۔ اب اِس مسودے کو کانگریس کے سالانہ جلسے میں ایک آل پارٹیز کانفرنس سے باضابطہ منظور کرالینا تھا۔ دسمبر میں کانگریس کا اجلاس کلکتہ میں ہونے والا تھا۔ پنڈت موتی لال نہرو صدر چُنے گئے۔ نہرو کمیٹی کی رپورٹ کا سارے ملک میں چرچا تھا۔ سب اہل الرائے حضرات اس کے بارے میں اپنی اپنی رائیں ظاہر کررہے تھے۔ یہ پلان حکومت درجہ اِستعماریت (ڈومنین سٹیٹس) کو ہندوستان کا نصب العین مان کر ہی بنائی گئی تھی۔ اِس لئے وہ کانگریسی جو مکمل سوراج کے حامی تھے اِس سے مطمئن نہ تھے۔ اِن میں خاص تھے پنڈت جواہر لال نہرو،

شری سبھاش چندر بوس اور مسٹر سری نواس آئنگر۔

ملک میں میرے واپس آنے کے کچھ دنوں بعد، سردی شروع ہوتے ہی، سائمن کمیشن پھر ہندوستان واپس آگیا۔ جن صوبوں میں وہ اب تک نہیں جاسکا تھا، اُن میں جانے لگا۔ پنجاب میں اُس کے بائیکاٹ اور اظہارِ مخالفت میں، لالہ لاجپت رائے شریک ہوئے تھے پولیس نے مظاہرین پر لاٹھیاں چلائیں۔ محترم لالہ جی کو پولیس کی لاٹھیوں سے بہت چوٹ آئی وہ بیمار پڑ گئے، پھر اچھے بھی نہ ہوئے۔ اب قیاس کیا جاتا ہے کہ کچھ دنوں بعد جو اُن کی وفات ہوئی وہ اِن ضرباتِ شدید کا ہی نتیجہ تھی۔ جب کمیشن اُتر پردیش پہنچا تو وہاں بھی مظاہرین پر پولیس نے لاٹھیاں چلائیں۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو بھی چوٹ لگی تھی۔ اِس طرح یہ کمیشن پولیس کی لاٹھیوں کے ساتھ ملک کا دورہ کر رہا تھا۔ اب پٹنہ میں اُس کے آنے کے دِن مقرر ہو گئے۔

میری غیر حاضری میں بہار میں بھی دو اہم واقعات ہوئے تھے۔ سرچ لائٹ اخبار پر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر کُرٹنے ٹرل نے توہینِ عدالت کا مقدمہ چلایا تھا۔ پٹنہ ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر ڈاسن ملر اسی سال پنشن لے کر چلے گئے۔ وہ ایک انتہائی متحمل مزاج، اور آزاد خیال جج تھے۔ اگرچہ وہ مقدموں کو ٹھیک سمجھنے میں تھوڑا وقت لیتے تھے مگر اُن کے فیصلے بہت اچھے ہوا کرتے تھے۔ سبھی لوگ اُن سے مطمئن تھے۔ اُن کے جانے پر انگلستان سے نئے چیف جسٹس آئے جو لوگوں سے ملنے جلنے میں تو بہت اچھے تھے مگر مزاج کے یک رُخ تھے اور اکثر فیصلوں میں بہک جایا کرتے تھے۔ اُن کے ایک فیصلے پر سرچ لائٹ نے سخت تنقید کی تھی۔ اِسی لیے اُس پر مقدمہ چل گیا تھا۔ اِس مقدمے کی اہمیت اتنی زیادہ ہو گئی کہ الٰہ آباد سے پنڈت موتی لال نہرو اور سر تیج بہادر سپرو اور کلکتہ سے شری سرت چندر بوس بحث

کرنے آئے کچھ دِنوں تک پٹنہ میں بڑی چہل پہل رہی، میں نے سُنا کہ بہت ہی پر مغز اور جوشیلی بحثیں ہوئیں۔ آخر سرچ لائٹ کو کچھ سزا ہوئی، اِس سے تعلیم یافتہ طبقہ، خاص کر وکیلوں میں خاصی کھلبلی مچی تھی۔

دوسرا واقعہ گیا ڈسٹرکٹ بورڈ سے تعلّق رکھتا تھا۔ وہاں شری انوگرہ نارائن سنگھ چیرمین تھے۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ صوبائی کونسل کے چناؤ میں سر گنیش دت سنگھ کی (جو ۱۹۲۱ء سے ہی وزیر ہوتے چلے آرہے تھے اور جو وزیر کی حیثیت سے سبھی منیو سپلٹیوں اور ڈسٹرکٹ بورڈوں کی دیکھ بھال کرتے آرہے تھے) کانگریس نے مخالفت کی تھی۔ مخالفت کی شدّت دیکھ کر وہ چار جگہوں سے اُمیدوار کھڑے ہوئے تھے۔ سبھی جگہ کانگریس کے اُمیدوار اُن کی مخالفت کر رہے تھے۔ ایک جگہ، گیا میں، ایک دوسرے صاحب کی وجہ سے جو اپنے آپ کو کانگریس کا ہمدرد بتاتے تھے، اُمیدوار نہیں کھڑا کیا گیا تھا۔ آخر اُسی جگہ سے اُن حضرت کی اُمیدواری ہٹوا کر سر گنیش دت چُنے گئے۔

اِس انتخاب کا ایک اور واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ بیگوسرائے کے علاقے سے بھی سر گنیش دت اُمیدوار تھے وہاں بھومی ہار برہمنوں کی (جس ذات کے سر گنیش دت بھی ہیں) بہت اچھّی آبادی ہے۔ وہ اِسی امید پر وہاں سے کھڑے ہوتے تھے مگر کانگریسی اُمیدوار بھی بھومی ہار برہمن ہی تھا۔ پھر بھی سر گنیش دت کی شہرت اپنی ذات میں کئی وجہوں سے بہت تھی۔ میں الکشن کے سلسلہ میں وہاں گیا۔ ایک بڑا جلسہ ہوا۔ اُس میں سر گنیش دت کے مددگار بھی آئے تھے اُنہوں نے مجھ سے سوال کیا کہ آخر سر گنیش دت کی مخالفت میں کانگریس کیوں اُمیدوار کھڑا کر رہی ہے اُنہوں نے سر گنیش دت کی سبھی باتیں کہیں جن میں خاص بات یہ تھی کہ وہ جب سے وزیر بنے ہیں تب سے اُنہوں نے اپنی تنخواہ کا تھوڑا ہی حِصّہ اپنے خرچ کے لئے لیا ہے۔ زیادہ تر

ہیں تب سے انھوں نے اپنی

روپئے رفاہِ عام کے لئے دان کر دئے ہیں۔ بات سچی تھی اُنہوں نے کئی لاکھ روپے کا ٹرسٹ قائم کر کے ایک بہت اچھا نصب العین پیش کیا تھا۔ جس کے لئے ہم سب ان کے بڑے خیر خواہ اور مدّاح تھے۔ مگر یہ سب ہوتے ہوئے بھی وہ کانگریس کے پروگرام سے متفق نہیں تھے اور صرف اسی وجہ سے اُن کی مخالفت کرنی پڑی تھی۔ میں نے جلسہ میں یہی کہا کہ کانگریس ملک بھر کی جماعت ہے۔ اگر سر گنیش دت اُس کی رہنمائی میں کام کرنا منظور کر لیں تو کانگریسی اُمیدوار ہٹا لیا جائے گا مگر اتنی بڑی جماعت کسی فرد کو من مانی کرنے کے لئے چھوڑنا نہیں چاہتی۔ میں نے اُن کے حامیوں سے بھی کہا کہ میں ایک دن اور ٹھہروں گا۔ اس درمیان وہ لوگ اُنہیں بلا لائیں یا اُن کا خط یا تار، منگوا لیں جس میں وہ میری شرط منظور کر لیں تو میں کانگریسی اُمیدوار کو ہٹا لوں گا۔ جلسہ میں زیادہ تر لوگ اُنہیں کی ذات کے تھے جن پر اُن کا پورا بھروسہ تھا۔ میری بات کو ان سب لوگوں نے بہت پسند کیا۔ میں وہاں ٹھہر بھی گیا مگر اُن کے آدمی پھر واپس نہیں آئے۔ میں نے دیکھا کہ وہاں کے عوام پوری طرح کانگریس کے حق میں ہو گئے۔ اِس کے بعد سر گنیش دت نے گیا میں اُن حضرت کو ہٹا کر کسی طرح بلا مقابلہ چُنے جانے کا اہتمام کر لیا۔ یہ بات تو ہو چکی تھی مگر اُن کے دِل میں کانگریس سے بہت رنجید گی تھی جس کو، جب تک وہ رفاہِ عام کا کام کرتے رہے، کبھی بھولے نہیں۔ گیا ڈسٹرکٹ بورڈ میں اُن کو اپنے اُسی دوست کو چیرمین بنانا تھا جس نے اپنی اُمیدواری ہٹا کر اُن کو منتخب ہونے کا موقع دیا تھا۔ اِس لیئے اُنہوں نے کئی تدبیروں سے وہاں کی چیرمینی سے انوگرہ نارائن سنگھ کو ہٹا دیا۔ یہاں تک کہ اُن کو ممبر ہونے کے حق سے بھی محروم کر دیا۔ جب میں انگلستان سے واپس آیا تو یہ سازش دیکھ کر مجھے بہت رنج ہوا۔ ہمارے سبھی کانگریسی دوست بہت ناراض تھے، ہم لوگوں کے دل میں یہ بھی شک تھا کہ اِن دِنوں ملک میں سائمن کمیشن دورہ کر رہا تھا اور اُس کے سامنے یہ بات بھی آنے والی تھی کہ جو تھوڑے بہت اِختیار دئے گئے

تھے، اُن کا اِستعمال بھی ہندوستانیوں نے کہاں تک ایمان داری اور کامیابی سے کیا ہے۔ بہار کے سب سے زیادہ آمدنی والے ڈسٹرکٹ بورڈ کو اِس طرح ناکارہ ثابت کرنے کی کوشش ہم سمجھ رہے تھے۔ خاص کر اِس لئے یہ کہا گیا کہ سائمن کمیشن کے سامنے حکومت اس کو بھی ہماری قابلیت کے نمونے کے طور پر پیش کر سکے۔ اِس لئے سارے صوبے میں خاصا احتجاج ہوا، گیا میں جلسہ ہوا۔ میں بھی وہاں گیا۔ اُس میں میری ایک بہت ہی سخت تقریر ہوئی، ایسی سخت تقریر میں نے شاید ہی کبھی کی ہو۔ جو جو الزام ڈسٹرکٹ بورڈ پر لگائے گئے تھے، اُن کی جانچ کانگریس کی طرف سے ہم نے کرائی۔ سب الزامات کو ہم نے بے بنیاد پایا۔ تب صوبائی کانگریس کا اجلاس کرنے کا خیال ہوا۔ وہ پٹنہ میں ہوا۔ اُس کے صدر انوگرہ بابو بنائے گئے۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر ڈاکٹر سچدا نند سنہا ہوئے۔ اِس کانفرنس کی تاریخ سائمن کمیشن کے پٹنہ پہنچنے کے ایک یا دو دن پہلے رکھی گئی تھی۔ سوچا گیا تھا کہ جو لوگ کانفرنس میں آئیں گے وہ کمیشن کے خلاف مظاہرہ کرنے میں بھی شریک ہو سکیں گے۔ کانفرنس کامیابی کے ساتھ ختم ہو گئی۔ اُس کے دوسرے دِن سویرے ہی سائمن کمیشن اسپیشل ٹرین سے آنے والا تھا۔

ہم نے سُنا کہ اسپیشل ٹرین پٹنہ جنکشن کے اسپیشل پلیٹ فارم پر، جس پر پرنس آف ویلز (ولی عہد انگلستان) اُتارے گئے تھے، لگائی جائے گی۔ یہ ٹھیک ہارڈنگ پارک کے سامنے پڑتا تھا۔ ہارڈنگ پارک کے سامنے لکڑیوں کے مضبوط بلّے گاڑ کر، مجمع عوام کو آگے بڑھنے سے روکنے کے لئے انتظام کیا جا رہا تھا۔ ہم کو معلوم ہی تھا کہ پنجاب میں لالہ لاجپت رائے اور اُتر پردیش میں پنڈت جواہر لال نہرو پر لاٹھیاں برسائی جا چکی ہیں۔ اِس پر ہمیں کچھ تعجب نہیں تھا۔ ہم سمجھتے تھے کہ مظاہرے کے وقت کچھ خون خرابہ ہوگا۔ مگر عوام میں جوش بہت تھا، جس کا کچھ نمونہ ہم صوبائی کانفرنس میں دیکھ چکے تھے۔

اُسی دن شام کو ڈاکٹر سچدانند سنہا نے مجھے اپنے یہاں بلایا۔ میں نے وہاں پہنچ کر دیکھا کہ پولیس کے انسپکٹر جنرل مسٹر سوین بھی موجود ہیں۔ اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ میرے کہنے پر ڈاکٹر سنہا نے آپ کو بلایا ہے۔ سائمن کمیشن کے متعلق باتیں کرتی ہیں۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ میں نہیں چاہتا کہ جیسے حادثے پنجاب اور اُتر پردیش میں ہوئے ہیں۔ ویسے ہی بہار میں بھی ہوں اس میں ہم دونوں کی بدنامی ہوگی۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ کوئی ایسا راستہ اگر نکل سکے جس سے پولیس اور مظاہرین میں مڈبھیڑ نہ ہو تو اچھا ہے میں نے کہا کہ عوام تو غیر مسلح ہیں ہی، وہ بالکل غیر متشدد رہیں گے جو کچھ ہوگا آپ ہی کی طرف سے ہوگا۔ اُنہوں نے یقین دلایا کہ وہ ایسا نہیں ہونے دیں گے۔ مگر خوف اس بات کا ظاہر کیا کہ بہت مجمع ہو جانے پر کہیں کسی پارٹی کو کسی آدمی نے کوئی بے تکی بات کہہ دی، یا بدتمیزی کر دی تو اس کا اثر سارے عوام پر پڑ جاتا ہے اُسے کوئی روک نہیں سکتا، اس لئے مجمع ہونے میں ہی خطرہ ہے۔ میں نے صاف صاف کہہ دیا کہ یہ تو نہیں رُک سکتا۔ اُن کے پوچھنے پر میں نے یہ بھی کہہ دیا کہ شاید دس ہزار آدمی آجائیں۔ یہ تعداد میں نے ڈرتے ڈرتے کم کر کے کہی تھی، کیونکہ دسمبر کے جاڑے میں صبح ساڑھے چھ بجے گاڑی پہنچی تھی۔ مجھے خوف تھا کہ شہر کے لوگ اتنے سویرے بڑی تعداد میں جمع نہ ہوسکیں گے آخر انہوں نے کہا کہ اگر مجمع ہونا ہی ہے تو کیا کوئی ایسی نہیں نکل سکتی کہ دونوں پارٹیوں کے آدمی ایک ساتھ نہ ہوں، الگ ہی الگ رہیں۔ میں نے اُسے خوشی سے منظور کر لیا اور کہا کہ سڑک کے ایک طرف استقبال کرنے والے رہیں اور دوسری طرف مخالفت کرنے والے۔ اس تجویز کو ہم دونوں ہی نے پسند کر لیا۔ خاص کر اس وجہ سے کہ اس طریقہ سے یہ بات بھی صاف ہو جائے گی کہ استقبال کرنے والے کتنے کم اور مخالف کتنے زیادہ ہیں۔ بات طے ہوگئی۔ میں نے کہہ دیا کہ ہمارا کوئی آدمی چوبی حدوں کے باہر نہیں جائے گا۔ ہم شہر کی طرف سڑک کے شمال اور

دوسری پارٹی کے لوگ سڑک کے جنوب، ریلوے لائن کے پاس رہیں گے۔

دوسرے دن تقریباً تین بجے رات کو ہی ہم لوگ اُٹھے۔ سارے شہر میں پربھات پھیری ہوئی۔ بھیڑ اسٹیشن کی طرف اُمنڈ چلی۔ چھ بجتے بجتے تقریباً پچیس تیس ہزار کا مجمع ہم لوگوں کے احاطہ میں آگیا۔ اُدھر تو کچھ لوگ موٹر پر سوار ہو کر آئے، کچھ لاریاں شہر کے لوگوں کو جمع کرنے کے لئے چکر کاٹتی رہیں، مگر شاید ہی ڈیڑھ، دو سو آدمی اُدھر کے احاطہ میں ہوں گے، جن میں زیادہ تر سرکاری نوکر اور اُن کے چپراسی وغیرہ تھے۔ ایسا بھی دیکھا گیا کہ کچھ لوگ، اُن کی لاری میں چڑھ کر آئے اور اُس احاطہ میں گئے۔ مگر جب اُن کو معلوم ہوا کہ یہ استقبال کرنے والی پارٹی ہے اور مخالف پارٹی سڑک کے اُس پار ہے۔ تو وہاں سے نکل کر سیدھے اِدھر چلے آئے۔ میں وہاں اپنے آدمیوں کے سامنے جنہیں لکڑی کے کٹھرے سے دو ہاتھ الگ ہی رکھا تھا، ٹہل رہا تھا۔ وہاں مسٹر سوین سے ملاقات ہوئی۔ اُنھوں نے اِس انتظام پر اطمینان ظاہر کیا اور تہنیت پیش کی۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ میرا دس ہزار آدمیوں کے آنے کا وعدہ پورا ہوا یا نہیں۔ اُنہوں نے کہا کہ اِس تعداد سے تو کہیں زیادہ آدمی ہیں جب میں نے اُن کی اس رائے کو کہ دونوں پارٹیوں کے لوگ دو طرف رہیں۔ مان لینے کا سبب بتایا تو وہ بہت ہنسے۔ اِس طرح بہت ہی خوبی اور امن کے ساتھ مظاہرہ ہوا۔ کالے جھنڈے دِکھانے اور سائمن گو بیک (سائمن واپس جاؤ) کے نعرے لگانے کے سِوا اور کچھ نہیں ہوا۔

اِس مظاہرے میں صوبہ بھر کے کانگریسی لوگ بڑی تعداد میں شریک ہوئے تھے۔ جب وہ اپنے اپنے مقام کو واپس ہوئے تو اِس پُرجوش مظاہرے کی داستان ساتھ لیتے گئے۔ اِس سے سارے صوبے میں جوش اُمنڈ پڑا۔ کچھ دنوں تک تو جابجا سڑکوں پر

چھوٹے بچّے یوں ہی بغیر سوچے سمجھے سائمن گو بیک کے نعرے لگاتے پھرتے تھے۔ اِس سبب سے اور ایسے ہی اور وجوہ سے ملک میں نئی بیداری کے علامات نظر آنے لگے۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ ۱۹۲۱ء کے دن پھر پلٹ آئیں گے۔ اِسی درمیان کلکتہ میں کانگریس کا اِجلاس اور آل پارٹیز کانفرنس ہونے کے دن آ گئے۔ آل پارٹیز کانفرنس کے صدر ڈاکٹر انصاری تھے اور کانگریس کے پنڈت موتی لال نہرو۔

کلکتہ کانگریس اور آل پارٹیز کانفرنس

میں آل پارٹیز کانفرنس میں شریک تو ہوا مگر پہلے سے سبھی باتوں کو جاننا نہیں تھا، اِس لئے کچھ زیادہ وہاں کرنا نہ تھا۔ ایک رات کی مجھے یاد ہے۔ ہندو مسلم کے کچھ پہلوؤں پر باتیں ہونے لگیں۔ یہ پورا اِجلاس نہیں تھا کچھ خاص خاص لوگ اِس میں تھے۔ وہاں مسٹر جناح نے جہاں تک مجھے یاد ہے دو باتوں پر بہت زور دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ وہ مرکزی اسمبلی میں مُسلمانوں کے لئے ایک تہائی جگہیں محفوظ رہنی چاہئیں اور صوبوں کو وہ سبھی اختیاراتِ خصوصی ملنے چاہئیں جو مرکزی حکومت کو صاف طور پر آئین میں دئے گئے ہوں، مجھے یاد ہے، کہ اِن باتوں پر بہت رات تک بحث جاری رہی۔ مگر لوگوں نے اِسے منظور نہیں کیا۔ مخالفوں میں سب سے زبردست مسٹر جیکر معلوم ہوتے تھے۔ اُن کے ساتھ ہندو مہاسبھا والے لوگ تھے بولنے والے وہی ایک تھے۔ آخر میں یہ بات طے نہ ہو پائی۔ اجلاس نے یہ پالسی رکھی تھی کہ جس بارے میں سب کی رائے متفق نہ ہو اُس بارے میں نوٹ کر دیا جائے کہ کس کی کیا رائے ہے، کھُلے اِجلاس میں مولانا محمد علی نے بھی کچھ ترمیمیں پیش کیں جنہیں لوگوں نے کثرت رائے سے نامنظور کر دیا۔ اجلاس نے مندرجۂ بالا طریقے سے اپنا کام تو ختم کر دیا مگر یہ ظاہر ہو گیا کہ مسلمانوں کے

ساتھ بات نہیں بنی، اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس اِجلاس کے ختم ہوتے ہی مسلمانوں کی ایک آل پارٹیز کانفرنس ہوئی جس میں بہت سے کانگریسی مسلمان بھی جا ملے، اُن میں علی برادران مولانا محمد شفیع وغیرہ تھے۔ یہاں سے صاف صاف مسلمانوں کا ایک بااثر طبقہ کانگریس سے الگ ہوگیا۔ اِس طرح پر جس مقصد کے حل کے لئے یہ کانفرنس ہوئی تھی وہ اور بھی مشکل ہوگیا جس کا بُرا نتیجہ آگے اور دیکھنے میں آیا۔ مسٹر جناح نے اپنی طرف سے مسلمانوں کے چودہ نکات پیش کئے جن کی منظوری کو اُنھوں نے کسی بھی سمجھوتہ کے لئے لازمی بتایا۔

اُدھر کانگریس میں نہرو رپورٹ کو لے کر سوراج کے معنی کے متعلق بہت اختلافِ رائے تھا۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو، سبھاش بابو اور مسٹر آئنگر وغیرہ مکمل سوراج کو ہی کانگریس کا مقصد منوانا چاہتے تھے۔ دوسرے لوگ سوراج لفظ سے ہی مطمئن تھے اور سمجھتے تھے کہ ہمیں یہ لفظ سوراج ہی پورا موقع دیتا ہے اور جب موقع آئے گا تب طے کیا جا سکتا ہے کہ ہم سوراج درجۂ نوآبادیات کو ہی مقصد مان کر رہیں گے۔ یا مکمل آزادی لیں گے۔ نہرو رپورٹ سوراج درجۂ نوآبادیات کو ہی مان کر تیار کی گئی تھی اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ اِس کے تیار کرانے میں اِعتدال پسند طبقہ کا، خاص کر سر تیج بہادر سپرو وغیرہ کا پورا ہاتھ تھا۔ اگر وہ نہ مانی جاتی تو شائد وہ مسودہ تیار ہو کر ایک آل پارٹیز کانفرنس کے سامنے تک نہ پہنچ پاتی۔ اِس لئے اگر کانگریس اِس بنیادی چیز کو ہی اپنی تجویز سے بدل دیتی تو نہرو رپورٹ اُسی حد تک قابل قبول ہوتی جہاں تک اُسے آل پارٹیز کانفرنس نے منظور کیا تھا۔ کانگریس کی سبجکٹس کمیٹی میں اِس موضوع پر بہت بحث ہوئی۔ مہاتما جی کا خیال تھا کہ نہرو رپورٹ منظور کی جائے۔ مگر وہ ہمیشہ اپنی رائے کے مخالفوں کی رائے لینے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ آخر میں اُنھوں نے مکمل سوراج کے حامیوں کے ساتھ جن کے لیڈروں کے نام میں اُوپر دے چکا ہوں،

یہ سمجھوتہ کر لیا کہ ایک برس تک کانگریس کا مقصد جیسا ہے ویسا ہی رہے گا۔ اگر برٹش سرکار ایک سال کے اندر نہرو رپورٹ کو مان لیتی ہے اور ہندوستان کا درجۂ نوآبادیات کا سوراج دے دیتی ہے تو ٹھیک ورنہ کانگریس ایک برس کے بعد مکمل سوراج کو ہی اپنا مقصد مان لے گی اور اس کے حصول کے لئے کام کرے گی۔ یعنی ایک سال کے اندر مل جاتے تو ہم حکومت درجۂ نوآبادیات سے ہی مطمئن ہو جائیں گے۔ اس کے بعد اس کی بات نہ رہے گی۔ کانگریس مکمل سوراج پر ہی مُصر رہے گی۔ یہ طے ہو جانے کے بعد ہم سب نے سمجھا کہ اب معاملہ طے ہو جائے گا، مگر دوسرے دن سبھاش بابو کی طرف سے معلوم ہوا کہ وہ اس سمجھوتے کو نہیں مانتے۔ اس سے مہاتما جی کو بہت دُکھ ہوا۔ کیونکہ پہلی رات کو سبھاش بابو نے اُسے مان لیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اُن کے ساتھیوں اور حامیوں نے اُسے پسند نہیں کیا۔ اس لئے وہ پھر مُکر گئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور مسٹر سری نواس آینگر چاہے وہ پسند نہ بھی کرتے ہوں سمجھوتے پر قائم رہے۔ مہاتما جی نے اس بات پر سخت نکتہ چینی کی، آخر میں مہاتما جی نے سمجھوتے کی تجویز پیش کی اور وہ منظور ہو گئی۔

اس کانگریس کی سبجکٹس کمیٹی میں اور معاملوں پر بھی اختلاف رائے رہا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کچھ لوگ گاندھی جی کے لائحہ عمل سے مطمئن نہیں ہیں۔ جیسے کچھ کمیونسٹ لوگ، جن میں خاص تھے مسٹر نمبکر اور مسٹر جوگلیکر، جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں بہت بولا کرتے تھے۔ اس کانگریس میں ایک خاص واقعہ یہ ہوا کہ کلکتہ کے مزدوروں کی ایک بہت بڑی پارٹی مظاہرہ کرنے کے لئے جلوس بنا کر کانگریس نگر تک پہنچی۔ وہ کانگریس پنڈال میں جانا چاہتی تھی۔ کچھ لوگوں کا قیاس تھا کہ اُن کا ارادہ پہلے سے ہی کانگریس میں جا کر بیٹھنے کا تھا۔ تاکہ اجلاس کے وقت وہ وہاں سے ہٹیں نہیں اور اس طرح سب کام تتّر بتّر کر دیں۔ مگر شاید اُن کی خواہش ایسی نہیں تھی، کیونکہ مہاتما جی نے جا کر اُن سے کچھ کہا اور وہ واپس چلے گئے۔ اس کانگریس کی

استقبالیہ کمیٹی سے بہار کے لوگوں کا کچھ اختلاف انتظام کے متعلق ہو گیا۔ بہار کے سبھی نمائندوں نے کانگریس میں جانے سے انکار کر دیا۔ سبھاش بابو کو یہ خبر ملی، وہ خود آئے۔ انہوں نے شکایت دور کر دینے کا وعدہ کیا، سب لوگ کانگریس کے اجلاس میں شریک ہوئے۔

کلکتہ کانگریس کا اجلاس ایک طرح سے بڑا اہم رہا۔ مکمل آزادی کا نصب العین اُس نے ایک طرح پر منظور کر لیا۔ کیونکہ اُسی نے طے کر لیا کہ حکومت خود اختیاری درجۂ نوآبادیات سے کانگریس ایک سال کے بعد ہرگز مطمئن نہ ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ کانگریس میں بہت سے لوگ ایسے بھی ہوں جو سمجھتے ہوں کہ یہ تجویز مان تو لی گئی مگر ایک برس کے بعد پھر دیکھا جائے گا مگر گاندھی جی کانگریس کی تجویزوں کو بہت اہمیت دیتے ہیں۔ خاص کر اس حالت میں جب اُن میں کوئی وعدہ یا عہد کیا گیا ہو۔ اس لئے اُنہوں نے تو مان لیا کہ برٹش سرکار کو ۱۹۲۹ء کے دسمبر سے پہلے ہی کچھ کر کے طے کر لینا چاہیئے، نہیں تو آئندہ اجلاس میں کانگریس کو مکمل آزادی کو اپنا نصب العین بنانا ہی ہو گا۔

میں اس معاملے میں پس و پیش میں تھا۔ برٹش آئین کا میں حامی تھا۔ میں مانتا تھا کہ نوآبادیات کو اپنے کاروبار چلانے کی پوری آزادی ہے۔ اِس لئے اگر ہم کو بھی آزادی مل جائے تو ہمارے لئے وہی کافی سمجھنی چاہیئے۔ مکمل آزادی تو فخر کا باعث ضرور ہے مگر آخر میں دنیا کی قوموں اور ملکوں کے درمیان کسی نہ کسی طرح کا ایسا سمجھوتہ ضرور کرنا پڑے گا، جس سے وہ ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہیں۔ اگر ایسا نہ ہوا تو لڑائیاں ہوتی رہیں گی۔ برٹش سامراج دُنیا کے کئی ملکوں کے لوگوں کی ایک طرح کی تنظیم ہے ہی اُس میں شریک رہنے ہمارا کوئی نقصان نہیں، بلکہ کئی باتوں کی سہولت ہی ہے۔ اِس کے علاوہ ہم ابھی اتنے منظّم بھی نہیں ہیں کہ ہم برٹش سرکار کو مجبور کر کے مکمل آزادی لے سکیں۔ اِنہیں وجہوں سے میں نے

مدراس کانگریس میں مکمّل آزادی کی تجویز کی مخالفت کی تھی۔ مجھے گاہے بہ گاہے ٹھیس بھی لگا کرتی تھی، جن سے اُکتا کر کبھی کبھی مکمّل آزادی کی بات بھی کیا کرتا تھا، مگر وہ ٹھیس برٹش سامراج کی نوآبادیات کے ہندوستان کے ساتھ سلوک سے لگا کرتی تھی۔ خاص کر دکھنی افریقہ میں ہندوستانیوں کے ساتھ جو سلوک ہوا کرتا تھا، اُس سے میں اتنا گھبراتا تھا کہ کبھی کبھی تو میں یہ بھی سوچتا کہ ایسے سامراج کے ساتھ تعلّق رکھنے سے ہم کو کیا فائدہ، جس کے کسی بھی حصّے میں ہمارے مُلکی بھائیوں کے ساتھ بُرا سلوک ہو سکتا ہے۔ پھر میں سوچتا کہ جب تک ہم کو وہی اختیار اور مقام حاصل نہیں ہے جو ان نوآبادیات کو ہے تبھی تک ایسا ہوتا ہے۔ جب ہم کو بھی ایسا ہی راج مِل جائے گا تب ایسی بات نہ ہو سکے گی۔ اِس طرح میں اپنے دِل کو اطمینان بھی دیا کرتا تھا۔

اِسی طرح کی اُدھیڑ بُن میرے دل میں ہوا کرتی تھی۔ میں اِسی خیال سے خاص کر نوآبادیات کے دستور اور اختیارات کے متعلّق واقفیت حاصل کرنے کے لئے پروفیسر کیتھ کی کتابیں پڑھا کرتا۔ ۱۹۲۶ء میں جو امپیریل کانفرنس کے فیصلے ہوئے، اُنھیں بھی میں نے دیکھا تھا۔ سب باتوں پر سوچ بچار کرنے کے بعد باوجود اِن لاٹھیوں کے میں اس وقت تک حکومت درجہ نوآبادیات سے ہی مطمئن تھا اور مکمّل آزادی کو نصب العین مان لینا اپنے راستہ کی دشواریاں بڑھا لینا سمجھتا تھا۔ میں اس زمانے میں پنڈت جواہر لال نہرو کی اِس بات کو ٹھیک نہیں سمجھتا تھا کہ ہماری بات غیر مُلکی لوگ نہیں سمجھ سکتے کیونکہ حکومت درجۂ نوآبادیات تو انگریزوں نے اپنی ذات اور اپنے مُلک کے لوگوں کو ہی دیا۔ جن کے ساتھ اُن کے ہزاروں طرح کے تمدّنی سماجی اور مذہبی تعلقات تھے۔ مگر ہمارے ساتھ تو اُن کا اِس طرح کا ایک بھی تعلق نہیں ہے۔ ایسی حالت میں نہ تو وہ ہمیں مکمّل آزادی دے سکیں گے اور نہ ہم اسے لے کر مطمئن ہو سکیں گے۔ میرے دل پر گوکھلے مرحوم کی وہ بات اِس طرح جم گئی تھی جیسے من کا ایک

ہٹا نہ سکتا تھا۔ جب ۱۹۱۰ء میں اُنہوں نے مجھ سے سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی میں شریک ہونے کے لئے کہا تھا۔ تبھی اُنہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ برٹش سامراج کی جو تصویر اپنے سامنے رکھتے ہیں وہ تو یہ ہے کہ جتنے لوگ اِس کے اندر ہیں سبھی برابری کا درجہ پائیں گے اور سبھی مِل کر اِس کا انتظام کریں گے۔ اِس لئے جب وہ وقت آجائے گا تو سامراج رہ ہی نہیں جائے گا اور اگر رہا بھی تو اپنی اکثریت کی وجہ سے ہندوستانی اسے اپنا سامراج بنالیں گے۔ میں یہی سوچتا تھا کہ سچ مچ اگر ہم کو بھی وہی مقام اور اختیارات مِل جائیں گے جو انگلستان اور دوسری مستعمرات کو ملے ہیں تو حقیقت میں ہمیں اِس سے زیادہ کی ضرورت نہ پڑے گی۔ خیر، کانگریس نے کلکتہ میں طے کر لیا کہ ۱۹۲۹ء کے اندر ہی حکومت درجۂ نوآبادیات ہونی چاہیئے۔

ایک افسوسناک واقعہ

مُلک میں نئی بیداری کے آثار نظر آنے لگے تھے۔ کلکتہ سے واپس آکر گاندھی جی نے بھی کانگریس کے کام میں بہت زیادہ تعاون شروع کیا۔ ۱۹۲۹ء میں اور بھی واقعات ہوئے، جن کے نتیجے کے طور پر بیداری بہت بڑھ گئی۔ گاندھی جی کا خیال برابر یہ رہا کہ ہمارے مُلک کی غریبی کی وجہوں میں سے ایک خاص وجہ یہ ہے کہ اِس مُلک سے کپڑے کی حرفت انگریزوں نے اُٹھالی ہے، جِس کے نتیجے کے طور پر چرخے، کرگھے بند ہوگئے اور کروڑوں غریبوں کی روزی کا ذریعہ اُن کے ہاتھوں سے چھِن گیا۔ اِس لئے وہ چرخے کو پھر چلانا چاہتے تھے۔ کھدّر کے متعلق اسی لئے لوگوں میں جذبہ بیدار کیا جا رہا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں ایک دھاگہ بھی بدیشی نہ آئے۔ وہ کپڑے کی حرفت کو از سرِ نو زندہ کرنا چاہتے تھے جس سے غریبوں کی روزی پھر واپس آجائے۔ اِس کے لئے وہ ہر قسم کے بدیشی کپڑے کا ہندوستان میں آنا بند کرنا چاہتے تھے۔ صرف انگلستان کے کپڑے ہی کو نہیں، دوسرے لوگ بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ کا مطلب اکثر انگریزی کا ہی بائیکاٹ مان لیا کرتے تھے۔ اُن لوگوں کو اِس بارے میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی کہ ہندوستان میں یہ دھندا پھر سے گاؤں گاؤں میں جاری

ہو جائے۔ وہ اِتنے سے ہی مطمئن ہو جاتے کہ صرف انگریزی کپڑا نہ آئے۔ وہ یہ مانتے تھے کہ صرف انگریزوں کے ساتھ ہمارا جھگڑا ہے، اِس لئے اِنہیں کے مُلک کا سامان کا ہم بائیکاٹ کریں اور اِس طرح اِن پر زور ڈالیں اور اپنے مطالبے منوانے کے لئے اِنہیں مجبور کریں۔ گاندھی جی اِس طرح کے بائیکاٹ کو تشدّد آمیز سمجھتے تھے اور برابر اِسے روکتے تھے۔ کلکتہ کانگریس کے بعد سودیشی کی لہر ایک بار اور چلی۔ گاندھی جی نے اُسے صرف برٹش مال کے بائیکاٹ کا روپ دے دیا۔ وہ صرف بائیکاٹ سے ہی مطمئن نہ تھے۔ اُس کے ساتھ ساتھ وہ چرخہ کا پرچار بھی اتنا ہی ضروری سمجھتے تھے۔ چرخے کے پرچار کا کام تو چرخہ سنگھ کر رہا تھا۔ بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ کے لئے ایک کمیٹی بنائی گئی جو اِس کے لئے بہت زوروں سے پرچار کرنے لگی۔ ۱۹۲۹ء کا سال اِسی کام میں لگا۔ جو کچھ بھی بیداری ہوئی۔ اُس سے اس کو فائدہ پہنچا اور اُس کا اثر اُس بیداری پر ہوا۔

گاندھی جی نے کئی جگہوں پر بدیشی کپڑوں کو جلوایا، جس سے لوگوں میں زیادہ جوش بڑھنے لگا۔ کلکتہ وہ ایک دِن کے لئے آئے تھے، برما جا رہے تھے سو راستے میں ٹھہر گئے وہاں لوگوں نے جلسۂ عام کیا۔ اِس میں بدیشی کپڑے جلانے کا بھی اہتمام کیا۔ بدیشی کپڑے جلائے گئے۔ مگر پولیس نے اِس کے پہلے ہی کسی بھی سکوائر میں اس طرح کی کارروائی کرنے کی ممانعت کر دی تھی۔ جلسہ ہو گیا۔ کپڑے بھی جلا دئے گئے اور ہم سب وہاں سے چلے بھی آئے تب پولیس نے آکر آگ بجھا دی، جو لوگ وہاں رہ گئے تھے۔ اُنہیں منتشر کر دیا۔ دوسرے دِن مہاتما جی پر مقدمہ چلا جس کی سماعت پریسیڈنسی مجسٹریٹ کے سامنے ہوئی۔ گاندھی جی تو کچھ بولنا نہیں چاہتے تھے، مگر وکیلوں نے بہت بحث کی کہ یہ کارروائی غیر قانونی تھی اور جس قانون کی بنیاد پر یہ مقدمہ چلایا گیا تھا وہ نافذ ہی نہیں تھا۔ مگر مسٹر روکس برا نے فیصلہ خلاف دیا۔

گاندھی جی پر حکم عدولی پر ایک روپیہ جرمانہ ہوا۔ گاندھی جی رنگون چلے گئے تھے۔ وہاں سے اُن کے واپس آنے پر اِس کا فیصلہ ہوا۔

اِس زمانے میں کلکتہ میں گاندھی جی کے رہتے ایک اور بات ہوئی جس کے ساتھ میرا ذاتی تعلق تھا۔ واقعہ افسوسناک ہے۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں ہی کھدّر کے پرچار کا کام شروع کیا گیا تھا۔ ہمارے صوبے میں شری رام بنود سنگھ نے بہت جوش اور قابلیت کے ساتھ اُسے شروع کیا تھا۔ اُن کی کامیابی اور سلیقۂ کار سے متاثر ہو کر اُنہیں تلک سوراج فنڈ سے ۲۵ ہزار روپئے کا قرض دیا گیا تھا جس سے اُنہوں نے کھدر کے کام کو بہت آگے بڑھایا تھا۔ مگر اپنے ساتھیوں سے اُن کا اختلاف رائے ہو گیا تھا، کیونکہ اُن کے خیال میں رام بنود سنگھ نے اِس جائداد کو اپنی ذاتی جائداد بنا لیا تھا۔ قرض کے لئے سفارش کرنے والے آچاریہ کرپلانی بھی اِسی فیصلے پر پہنچے تھے۔ وہ بھی زور لگا رہے تھے کہ چرخہ سنگھ اُن سے روپئے واپس لے لے۔ دیہات کی شاخ کا ایجنٹ ہونے کی وجہ سے یہ بار میرے سر پر آتا تھا۔ چرخہ سنگھ کے صوبائی سکریٹری شری لکشمی نرائن نے چرخہ سنگھ کے فیصلے کے مطابق روپیوں کا حساب مانگا۔ حساب میں اُن کے اور رام بنود بابو کے درمیان اختلافِ رائے ہو گیا۔ بات گاندھی جی تک پہنچی۔ اُنہوں نے ہدایت کی کہ شری ستیش چندر داس گپت اِس معاملہ کی جانچ کر کے رپورٹ کریں۔

ستیش بابو نے کلکتہ میں ہی جانچ کی۔ لکشمی بابو وغیرہ وہیں سب کاغذات لے کر پہنچ گئے تھے۔ میں بھی تھا۔ میں اِس تحقیقات میں شریک نہیں ہوا تھا مگر اُن کی رپورٹ سے مجھے دُکھ ہوا۔ روپئے تو کم و بیش جو کچھ باقی ہوں شری رام بنود سنگھ سے بہار چرخہ سنگھ کو ہی پانے تھے مگر اُنہوں نے رپورٹ میں بہار کی شاخ کی ناقابلیت کی بھی شکایت کی۔ حساب بھی جیسا رام بنود کہتے تھے۔ ویسا ہی منظور کیا۔ میں نے اُسے دیکھا تو مجھے بہت بُرا لگا۔ اِس لئے نہیں کہ بہار شاخ کے

خلاف فیصلہ تھا بلکہ اِس لئے کہ اُنہوں نے اپنے اختیارات کی حد سے باہر جاکر بہار کی شاخ کو ناقابل اور ناکارہ ٹھہرایا تھا۔ میں نے مہاتما جی سے کہا کہ میں اِس فیصلے سے بہت غیر مطمئن ہوں۔ آپ کو خود حساب دیکھنا سمجھنا ہوگا۔ کیونکہ ایک طرف تو ایک پبلک جماعت ہے جس کے چلانے کا کام کئی ایثار پسند اور سچّے خادم بہت جوش اور محنت کے ساتھ کر رہے ہیں اور دوسری طرف ایک کارکن ہیں جو پختہ کار ہیں اور جنہوں نے کھدّر کے پرچار کا بہت کام بھی کیا ہے۔ مگر جن کے خلاف شکایت ہے کہ وہ پبلک جماعت کے روپئے سے بنے بنائے اِدارے کو اپنی ذاتی ملکیت مان بیٹھے ہیں۔ اِس میں بھی کوئی ہرج نہیں۔ کیونکہ اُنہوں نے محنت اور وقت صرف کیا ہے، مگر چرخہ سنگھ کے روپئے تو ٹھیک ٹھاک واپس ہو ہی جانے چاہئیں۔

برما سے گاندھی جی کے لوٹنے پر کلکتہ میں جب سب باتیں اُن کے سامنے پیش کی گئیں تب اُنہوں نے سب کچھ خود دیکھنے کا وعدہ کیا۔ بات بہت دنوں تک چلتی رہی۔ حساب کی جانچ کے لئے مہاتما جی نے شری نارائن داس گاندھی کو تعینات کیا۔ آخر میں جو حساب چرخہ سنگھ کی طرف سے پیش کیا گیا تھا، اُسے ہی شری نارائن داس نے ٹھیک سمجھا۔ گاندھی جی نے رام بنود بابو سے کہا کہ اس میں اگر بھول ہے تو ہم کو سمجھاؤ۔ اِس کے لئے دن بھی طے کیا گیا۔ مگر بات آگے نہیں بڑھی۔ وہیں کی وہیں رہ گئی۔ ہاں گاندھی جی نے سمجھ لیا کہ ہم نے جو بات کہی تھی وہی ٹھیک ہے۔

اِس واقعہ کو میں افسوسناک اِس لئے مانتا ہوں کہ اِس کے چلتے رام بنود بابو اور شری ستیش چندر داس گپت کے متعلق کچھ یہاں لکھنا پڑا۔ اِس سے بھی زیادہ رنج مجھے اِس وقت کی ساری باتوں سے ہوا تھا۔ پبلک لائف میں ہمیں یونہی بارہا ایسے کام کرنے پڑتے ہیں جنہیں ہم ذاتی حیثیت سے کرنا پسند نہیں کرتے۔ مگر اُنہیں فرض کے اِعتبار سے ناخوش گوار

ہوتے ہوئے بھی کرنا ہی پڑتا ہے۔ شری رام بنود سنگھ کو میں اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ بھاگل پور کالج میں پڑھتے تھے اور پہلی جنگ جرمن کے زمانے میں نظر بند کئے گئے تھے۔ اُس وقت کی مُلاقات گاندھی جی کے چمپارن آنے پر اور گہری ہو گئی۔ ترکِ موالات کی تحریک میں خاص کر کھدّر کو لے کر، اُن سے میرا تعلق ہی نہیں بڑھا۔ بلکہ اُن کے سلیقہ کار میں میرا یقین بھی اور بڑھ گیا۔ ایسے شخص کے متعلق اگر کچھ بھی کہنا پڑے تو تکلیف ہوتی ہی ہے۔ ستیش بابو کے لئے میرے دل میں جو عقیدت اور محبّت ہے، میں بیان نہیں کر سکتا۔ اُن کی صلاحیتِ عمل اور اُن کا ایثار بے مثل ہے۔ اُن کی مہربانی بھی مجھ پر رہتی ہے۔

جمشید پور کے مزدوروں کی ہڑتال

بہار میں جمشید پور ایک بہت ہی اہم مقام ہے۔ وہ ہندوستان کا ہی نہیں سارے ایشیا کا سب سے بڑا لوہے کا کارخانہ ہے جو دُنیا کے بڑے کارخانوں میں بھی شاید دوسرا یا تیسرا مقام رکھتا ہے۔ ایسے شہر میں مزدوروں کا سوال ایک نہایت اہم سوال ہوتا ہے۔ اِس صوبے میں مزدوروں کی تنظیم خاص اہمیت رکھتی ہے۔ کیونکہ یہاں کوئلے کی کانیں بھی سبھی صوبوں سے زیادہ ہیں۔ شکر سازی کے کارخانے بھی اُتر پردیش کو چھوڑ کر یہیں سب سے زیادہ ہیں، اور سب صوبوں سے زیادہ چینی یہیں بنتی ہے۔ ۱۹۲۱ء سے ہی میں گاہے بگاہے جمشید پور جایا کرتا تھا۔ کانگریس کا تبلیغی پروپگنڈا کر کے چلا آتا۔ اِسی طرح جھریا کے ساتھ بھی میرا ویسا ہی تعلق تھا۔ مزدوروں کی تنظیم کو کبھی میں نے اپنے ہاتھ میں نہیں لیا۔ جمشید پور میں ایک سنگھ بنا تھا جس کے صدر دین بندھو اینڈ روز ہوئے تھے۔ گاندھی جی وہاں گئے تھے۔ ٹاٹا کمپنی کے ڈائریکٹر آر۔ جی ٹاٹا مرحوم آئے تھے۔ میں بھی گاندھی جی کے ساتھ تھا۔ مزدور سنگھ (ٹریڈ یونین) کو مسٹر ٹاٹا نے مان لیا۔ وہاں کچھ کام کرتا چلا آیا۔ مسٹر اینڈ روز وہاں رہتے نہیں تھے، کبھی کبھی آجایا کرتے تھے۔ اِس لئے اگرچہ اُن کی ہمدردی سے فائدہ تو تھا مگر تنظیم اتنی مضبوط

نہیں تھی، جتنی ہونی چاہیے تھی۔

مزدوروں کی شکائتوں کی وجہ سے ۱۹۲۸ء میں وہاں ہڑتال ہوئی جو کچھ دنوں تک چلی۔ سبھاش بابو کلکتہ سے آئے اور ٹریڈ یونین کے صدر ہوئے۔ آخر میں اُنھوں نے ٹاٹا کمپنی سے سمجھوتہ کیا، مگر اُسی زمانے میں وہاں مزدوروں کی تنظیم میں ایک اور صاحب دِل چسپی لینے لگے تھے۔ اُنہوں نے اسے منظور نہیں کیا تھا کچھ مزدوروں کو لے کر اُنہوں نے الگ سنگھ قائم کرلیا۔ سُبھاش بابو کے خلاف اُن کی طرف سے بُری طرح پر چار ہونے لگا تھا اگرچہ بات توطے ہوگئ تھی۔ مگر سب مزدور ایک رائے کے نہ تھے۔ اِس لئے کمیٹی کی طرف سے کچھ کرنا نہیں پڑا۔ یہ سب میری غیر حاضری میں ہوا تھا۔ وہاں مزدوروں میں دو پارٹیاں ہوگئیں۔ اُن کی انجمنیں بھی دو تھیں۔ اِن دونوں میں بد دلی بہت تھی۔

اِسی زمانے میں وہاں ایک دوسری کمپنی کے کارخانے میں جس کا نام ٹِن پلیٹ کمپنی ہے، ہڑتال ہوئی۔ وہاں کے لوگوں نے بھی شری سبھاس چندر بوس کی مدد مانگی۔ وہ آئے۔ ہڑتال چلی مگر کمپنی کے مالکوں نے بہت سخت رُخ اختیار کیا۔ وہ کسی طرح مزدوروں کی بات سُننے کو تیار نہیں ہوتے تھے۔ سُبھاس بابو نے مجھے بھی تار دے کر بلوایا۔ اِس ہڑتال میں دل چسپی لینے کے لئے مجھ سے کہا۔ پروفیسر عبدالباری وہاں سبھاش بابو کی مدد کر رہے تھے۔ میں نے بھی اپنے صوبے میں ہونے کی وجہ سے اور مزدوروں کے مطالبوں کو منصفانہ سمجھ کر، اس ہڑتال کی حمایت کی۔ اِس کے بعد اِس کے چلانے کا تقریباً سارا بار پروفیسر عبدالباری اور میرے اُوپر آگیا۔ میں کئی بار وہاں گیا۔ ہڑتال تقریباً آٹھ دس مہینے تک چلتی رہی۔ میں نے حکومت سے اس بات کی سفارش کی کہ یہ معاملہ ٹریڈ ڈسپوٹ ایکٹ کے مطابق پنچائت میں دے دیں مگر وہ اس پر راضی نہ ہوئی۔ تب چیف سکرٹیری اور سرکاری ممبر سے میں نے مُلاقات کی۔ اُنہوں

نے یہی کہا کہ سرکار اِس ہڑتال کو غلط اور بے وجہ سمجھتی ہے۔ کیونکہ جمشید پور میں مزدوروں کے لیڈر مسٹر ہومی بھی اُس کے خلاف تھے۔ یہ وہی حضرت تھے جنہوں نے ٹاٹا کمپنی میں سبھاش بابو کی مخالفت کر کے دوسری جماعت قائم کر لی تھی۔ اِس وقت حکومت کو اُن کی رائے اس لئے جچ گئی کیونکہ وہ کچھ کرنا نہیں چاہتی تھی اور کمپنی کی مدد کرنا پسند کرتی تھی، خیر، ہزار کوشش پر بھی کمپنی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ آٹھ، دس مہینوں تک چل کر ہڑتال ختم ہو گئی۔ مگر بہتیرے مزدور جنہوں نے کام چھوڑ دیا تھا۔ اپنے کام پر واپس نہیں آئے۔ اور جو آنا چاہتے تھے اُنہیں کمپنی نے اُن کی جگہ پر واپس نہیں لیا۔

سرکاری اِعلان کا مطلب

سنہ ۱۹۲۹ء میں میرا زیادہ وقت بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ میں لگا۔ جس کی تعمیری شکل کھدّر کی تیاری تھی۔ اس کے علاوہ جمشید پور کے معاملے نے بھی کچھ وقت لیا۔ کھدّر کے کام کی دیکھ بھال کے لئے میں مدھوبنی میں، جہاں اب چرخہ سِنگھ کا خاص مرکز اور صوبائی دفتر ہو گیا تھا، کچھ دِنوں ٹھہرا رہا۔ کام کو آگے بڑھانے کے متعلق کارکنوں سے بات چیت کی۔ وہیں مجھے تار ملا کہ میرے بھتیجے جناردن کے لڑکا ہوا ہے۔ قدرتاً بھائی صاحب کو خوشی ہوئی۔ اور ہم سب خوش تھے۔

بچّہ بہت خوب صورت اور ہونہار نظر آیا۔ ہم دونوں بھائی اسے بہت پیار کرتے تھے، کیونکہ اس وقت گھر میں وہی ایک لڑکا تھا۔ وہ جیسے جیسے بڑھتا گیا، محبّت بھی بڑھتی گئی۔ مگر جب وہ پانچ سال سے کچھ زیادہ تھا تو بھائی صاحب کی وفات کے دو مہینے کے بعد وہ بھی تپِ محرقہ (ٹائیفائڈ) میں مبتلا ہو گیا۔ حتی المقدور ڈاکٹر نے بچانے کی کوشِش کی مگر وہ سب بے کار ہوئی۔ وہ جاتا رہا، اب بھی، جب اُس کی یاد آجاتی ہے، دِل بے قرار ہو جاتا ہے۔

اِس زمانے میں ہندوستان کے بڑے لاٹ لارڈ اِرون تھے۔ وہ چھٹی لے کر کچھ دِنوں کے لئے اِنگلستان گئے۔ وہاں ہندوستان کی حالت کے متعلق اُنھوں نے باتیں کیں۔ اِس زمانے میں وہاں لیبر پارٹی کی وزارت تھی۔ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ وزیر اعظم اور مسٹر کے وجووڈ بین وزیر ہند تھے۔ لارڈ ارون نے وہاں سے واپس آکر برٹش سرکار کی طرف سے ایک اعلان کیا کہ ہندوستان کے لئے حکومتِ خود اختیاری اور درجہ مستعمرات (نوآبادیات) مضمر ہے۔ شاید اُنھوں نے یہ بھی کہا کہ اِس معاملہ پر غور کرنے کے لئے ایک گول میز کانفرنس لندن میں کی جائے گی۔

یہ اِعلان یہاں کی حالت دیکھ کر کیا گیا۔ سائمن کمیشن کا بائیکاٹ ہندوستان کی سبھی پارٹیوں نے کیا۔ اِس کی مخالفت کے مظاہروں میں لوگوں پر لاٹھیاں چلی تھیں۔ اس میں مُلک کے کئی باوقار اصحاب زخمی بھی ہوئے تھے۔ سارے مُلک میں ہل چل تھی۔ اِس میں لاہور کی سازش کے قیدیوں کی بھوک ہڑتال نے اور بھی جان ڈال دی تھی۔ بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ کا پرچار زور پکڑتا جا رہا تھا۔ کلکتہ کانگریس نے تجویز منظور کر لی تھی کہ سنہ ۱۹۲۹ء کے اندر اگر حکومت درجۂ مستعمرات (نوآبادیات) نہ ملی تو کانگریس مکمّل آزادی کو اپنا نصب العین مان لے گی۔

حکومت نے شاید سوچا تھا کہ شاید یہ اعلان اُس بے اطمینانی کو فرو کرنے میں کارگر ثابت ہوگا۔ اِس اِعلان کے معنی کے متعلق اخباروں میں بحث چھڑی اِعتدال پسند طبقہ کچھ مطمئن سا نظر آیا۔ لیکن اگر اِس کی اچھی طرح چھان بین کی جاتی تو سرکار کے سبھی اِعلانات کی طرح اِس کے بھی کئی معنی نکل سکتے تھے اور سرکار حسبِ سہولت جب چاہتی ویسا مطلب نکال سکتی تھی۔ کانگریس کے لوگوں نے اِسے اپنے مطالبہ کی تکمیل کرنے والا اعلان نہیں سمجھا۔ بعد میں جب اِس کی تشریح ہوئی تو معلوم ہو گیا کہ کانگریس کا شک بالکل درست تھا۔ دوسروں نے اپنی خواہش کے مطابق معنی نکالے تھے، جو الفاظ سے نہیں نکل سکتے تھے۔

لاہور کانگریس کے عین پہلے گاندھی جی اور پنڈت موتی لال نہرو، لارڈ اِرون سے ملے اُنہوں نے وائسرائے سے اس کا مطلب پوچھا تو معلوم ہوا کہ اُنہوں نے اس کا جو مطلب سمجھا تھا وہی ٹھیک تھا۔ دوسروں نے من مانے مطلب نکالے تھے ابھی حکومت درجۂ مستعمرات دُور تھی جو اُسے آیا ہوا سمجھے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے بھی ویجوڈ بین کے اُس لیکچر کو جس میں اُنہوں نے کہا تھا کہ حکومت درجہ مستعمرات پر تو حقیقتاً عمل درآمد ہو رہا ہے۔ DOMINION STATUS IN ACTION الفاظ کی چالاکی نہ سمجھ کر لفظوں کے معنی لگانے میں غلطی کی تھی۔ یہ ہمارے لئے اس بات کی ایک اور تنبیہہ ثابت ہوئی کہ برٹش سرکار کے اِعلانات کو خوب باریکی کے ساتھ دیکھنا چاہیئے۔ اُن سے من مانا مطلب نہیں نکالنا چاہیئے۔ اِس تنبیہہ کے لئے ہمیں اُن کا ممنون ہونا چاہیئے

برما کا سفر

جب ہم لوگ بابو ہری جی کا مقدمہ ختم کرکے اِنگلستان سے واپس آرہے تھے۔ بابو ہری جی نے خواہش ظاہر کی تھی کہ میں ایک بار برما جاؤں اور جیاواڑی میں جو کچھ اُنھوں نے کیا ہے اُسے دیکھوں۔ میری بھی خواہش تھی کہ اُن کے اُس کارنامے کو بھی دیکھوں، اور برما کا دورہ بھی کروں۔ یہ خواہش ۱۹۲۸ء میں پوری نہ ہوئی۔ ۱۹۲۹ء میں بابو ہری جی خود برما گئے۔ میں نے بھی سوچا کہ وہاں جانے کا یہ اچھا موقع ہے۔ اِسی درمیان ایک اور معاملہ سامنے آگیا۔ جس طرح دیوان جے پرکاش لال، بابو ہری جی کے والدِ مرحوم نے برما میں برٹش سرکار کے حوصلہ دلانے سے زمین لی تھی، اُسی طرح ایک انگریز نیل والے مسٹر ملن نے بھی برما میں بہت زمین لی تھی۔ شاہ آباد ضلع میں وہ نیل کا کام کیا کرتے تھے۔ اُنھوں نے بھی بہار سے، خاص کر شاہ آباد سے کسانوں کو لے جاکر بابو ہری جی کی طرح سے ہی اپنی زمین پر بسایا تھا۔ کچھ اور لوگوں نے بھی وہاں زمین لی تھی مگر وہ ٹھیک انتظام نہ کرسکے آخر اُنھوں نے زمین چھوڑ دی یا وہ ضبط ہوگئی۔ مگر اِن دو بڑے زمینداروں نے وہاں بہت بڑی زمینداری حاصل کرلی۔ بہت محنت اور مستعدی سے کافی روپئے خرچ کرکے ایسے جنگلوں

کو جہاں ہاتھی اور شیر بستے تھے، کاٹ کر زمین صاف کر کے اِن لوگوں نے بہاریوں کو بسایا تھا۔ وہاں دھان، گنّا اور دوسری فصلیں بھی پیدا ہوتی تھیں۔ مسٹر ملن کی رعیّت میں کچھ بے چینی سی نظر آ رہی تھی۔ رعیّت نے یہاں خط بھیجا تھا کہ میں جا کر اُن کی مدد کروں۔ شاید اُنہوں نے سُنا تھا کہ میں نے گاندھی جی کے ساتھ چمپارن میں کام کیا تھا۔ اِس لئے میری خدمت پر اُنہیں یقین ہو گیا تھا۔ پس دوسرے مناسب موقع کو پا کر میں نے وہاں جانا طے کر لیا۔ شری متھرا پرشاد جی کے ساتھ نومبر میں میں وہاں گیا۔ مسٹر ملن کی زمینداری کا نام تھا چوتسگا اور بابو ہری جی کی زمینداری کا جیا واڑی۔ میں اِن دونوں جگہوں میں گیا۔ رنگون میں بھی کچھ دِن ٹھہرا۔ سب ملا کر شاید پندرہ دن وہاں رہا۔

سٹیمر کا سفر معمولی تھا۔ سمندر پُرسکون تھا۔ جہاز میں آرام تھا۔ ہم لوگ مزے میں پہنچ گئے۔ کچھ دُور سے ہی رنگون کے بودھ مندروں کے سنہرے کنگُرے اور گنبد نظر آئے۔ نزدیک پہنچتے پہنچتے اُن کا بڑا حصہ نظر آنے لگا۔ رنگون کے لوگوں نے اچھی خاطرداری کی ایک پبلک جلسہ میں مجھے ایڈریس دیا گیا۔ میں نے اُس کے جواب میں کہا کہ ہندوستان اور برما کا پُرانا تعلق آج کے تعلّق سے الگ قسم کا تھا۔ ہندوستان نے بھی اپنا سامراج دوسرے ملکوں میں قائم کیا تھا۔ مگر آج کل کے سامراج کی طرح وہ تشدّد توپ تفنگ اور فوجی طاقت کی بُنیاد پر قائم نہیں تھا۔ وہ مذہبی سامراج تھا۔ ہندوستان کا تعلّق دوسرے ملکوں کے ساتھ ایک ریشمی ڈوری میں گُتھے جواہرات کا سا تھا جو ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تو ہیں مگر ایک دوسرے پر حکومت نہیں کرتے۔ آج میں جب دنیا میں ہوتے ہوئے خوں خرابہ دیکھتا ہوں تو مجھے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کا وہ مذہبی رشتہ جو فوج کی طاقت سے نہیں بلکہ مذہب اور کیریکٹر کے بل پر ہی قائم تھا، آج کے سامراج سے کہیں زیادہ مضبوط اور تمام

مخلوق کے لئے کہیں زیادہ مفید ثابت ہوا ہے - ہندوستان سے خاص کر اپنی زاد بوم بہار سے بودھ مذہب یکبارگی اُٹھ گیا ہے -تب بھی آج اُسے دنیا کے زیادہ سے زیادہ لوگ مانتے ہیں -وہ لوگ آج بھی اس بانیٔ مذہب کے ساتھ تعلق رکھنے والے مقامات کو تیرتھ مانتے ہیں -بُدھ دیو نے جہاں جنم لیا، جہاں معرفت حاصل کی، جہاں اپنی مذہبی تبلیغ شروع کی وہ سبھی مقام آج ہندوستان میں دُنیا کے بودھوں کے لئے زیارت گاہ بنے ہوئے ہیں -اُنہیں تیرتھوں کی وجہ سے دنیا کے بودھ ہماری آج کی گری حالت میں بھی ہمیں عزّت کی نظر سے دیکھتے ہیں -کسی سیاسی سامراج کو یہ خوش قسمتی نہ حاصل ہوئی ہے اور نہ ہوگی -برما میں جاکر میرے دل یہ سب جذبات خود ظاہر ہو گئے -وہاں چونگا کی رعایا سے میں ملا -مالک تو وہاں تھے نہیں، ولائت میں تھے -مگر اُن کے کارکن اور اُن کے لڑکے وہاں تھے -اُن سے رعایا کی شکایت کے متعلق باتیں ہوئیں -رنگ ڈھنگ سے معلوم ہوا کہ باتیں طے ہو جائیں گی -مگر آخر میں ولایت سے کوئی تار آگیا -ہاتھ میں آئی ہوئی کامیابی بھی نکل گئی -مگر مجھے یقین ہے کہ وہاں کے لوگوں کی حالت بہت کچھ سنبھل گئی -اگرچہ سب باتیں ہمارے سامنے طے نہ ہو سکیں

جیاواڑی میں بھی رعایا کی کچھ شکائیتیں تھیں -مگر بابو ہری جی کی خوش سلیقگی اور نیک سلوکی کی وجہ سے وہ اُس وقت تک شدّت نہیں اختیار کر سکی تھیں -ہم لوگوں کو اُن کے متعلق کچھ کرنا نہیں پڑا -کچھ دیر ٹھہر کر وہاں کا حال دیکھا -وہاں کے گاؤں میں جانے پر ایسا نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ہم بہار سے باہر آئے ہیں -وہی بھوجپوری بولی، وہی کپڑے، وہی طرز بود باش، اُسی طرح کا مکان -ویسی ہی کھیتی باڑی -میں نے مقدّمے کے وقت کاغذوں کو پڑھا تھا -اُن کو پڑھنے سے ہی بابو ہری جی کی خوش سلیقگی اور قوت انتظامی کا میں قائل

ہوگیا تھا۔ اب اِس زمانے کے یعنی تیس برس پہلے کے جنگل کو لہلہاتے ہوئے گاؤں کے روپ میں دیکھ کر اور بھی عقیدت ہوگئی۔ آج اُن میں ہزاروں بہاری رہتے اور کھیتی کر کے آرام سے زندگی گذارتے ہیں، اور بابو ہری جی کو بھی لاکھوں روپے کی سالانہ آمدنی دے دیتے ہیں۔ ہمارے سامنے اُنھوں نے رعیتوں کا ایک جلسہ بھی کیا جس میں خیر خواہوں کو صلافے تقسیم کئے اور دوسرے طریقوں سے بھی تواضع کی۔ بہار ودیا پیٹھ کے لئے بھی کچھ روپئے وہاں ملے۔ رنگون کے تاجروں نے بھی دئے جنہیں لے کر میں واپس آیا۔

رنگوں میں بھی بہاریوں کی خاصی آبادی ہے۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ زیرادیئی کا رہنے والا میرا ایک پرانا نوکر رنگوں میں آکر مجھے ملا۔ وہاں وہ کہیں نوکری کرتا تھا۔ میرے آنے کی خبر سُن کر وہ مجھ سے ملنے آیا۔ وہاں گجراتی اور مارواڑی تاجر بھی کافی ہیں۔ مگر گاؤں میں زیادہ تر مدراس کے رہنے والے چیٹی لوگ ہیں۔ جو تقریباً روپیہ لگانے یا قرض دینے کا کام کرتے ہیں۔ آندھر کے بھی بہت لوگ ہیں مگر وہ بھی بہاریوں کی طرح نوکری یا مزدوری کرتے ہیں۔ اُسی زمانے میں آندھر کے شری ناگیشور راؤ پنتلو بھی وہاں گئے تھے۔ رنگون سے میں جہاز پر کلکتہ کے لئے روانہ ہوگیا۔

لاہور کانگریس: مظہرالحق کی رحلت

جہاز پر ہی مجھے دمہ کا دَورہ بہت زوروں سے شروع ہو گیا۔ حالت اتنی خراب ہوگئی جہاز کے ڈاکٹر کو سوئی لگانی پڑی۔ کلکتہ میں جہاز سے اُتر کر میں اپنے دوست مسٹر یوگیندر نارائن موجمدار بیرسٹر کے گھر جاکر ٹھہر گیا۔ تین چار دنوں کے بعد منگیر میں بہار پولٹیکل کانفرنس ہونے والی تھی۔ میں اُس کا صدر منتخب ہوا۔ میں نے سوچا کہ کلکتہ میں دو تین دِن تک آرام کروں اور صحت یاب ہو کر منگیر جاؤں۔ اب تک میں نے حکیم اور وید کے علاج کے سِوا ایلوپیتھک علاج کرایا تھا۔ میرے دوست کا خیال ہوا اور میں نے بھی پسند کیا کہ ایک بار ہومیوپیتھی کو بھی آزمانا چاہیئے۔ ایک بزرگ ڈاکٹر کو، جن سے اُن کو بہت عقیدت تھی اُنہوں نے بلوایا۔ ڈاکٹر نے ایک خوراک دَوا دی اور کہا کہ اب دو مہینے تک اور دوا نہیں لینی ہوگی۔ میں نے وہ خوراک وہیں کھالی، دو مہینے تک دوا سے چھٹّی مل گئی۔

میں وہاں بیٹھ کر صوبائی کانفرنس کے لئے تقریر بھی لکھ رہا تھا، تیسرے یا چوتھے دن رات کی گاڑی سے میں منگیر کے لئے روانہ ہوا۔ گاڑی میں بھیڑ بہت تھی۔ رات بھر بیٹھے رہنا پڑا۔ شاید ہوا بھی لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منگیر پہنچتے پہنچتے طبیعت بہت خراب ہوگئی میں

کانفرنس میں شریک نہ ہو سکا۔ میری تقریر اور کسی نے پڑھ کر سُنادی، دسمبر کا آغاز تھا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد لاہور کانگریس ہونے والی تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو صدر منتخب تھے۔ مُلک کے سامنے حکومتِ خود اختیاری درجہ مستعمرات (نوآبادیات) یا مکمل آزادی کی بحث چل رہی تھی، میں تو وہاں اتنا سخت بیمار ہو گیا کہ اُس کانفرنس کے فیصلوں کو بھی نہ جان سکا۔ مگر بعد کو معلوم ہوا کہ میں صوبائی کانگریس کمیٹی کا صدر چُن لیا گیا ہوں۔

منگیر سے کسی طرح بھائی صاحب مجھے پٹنہ لائے، وہاں بھی کھانسی اور بخار کا زور رہا۔ یہاں کے ڈاکٹر بنرجی برابر دیکھتے رہے۔ ڈاکٹر پھنی مکرجی نے عکس ریز کے ذریعہ پھیپھڑوں کی جانچ کی۔ اِس کے نتیجے سے وہ اور ڈاکٹر بنرجی کچھ فکرمند ہوئے۔ وہ لوگ مجھے دیکھتے تو تھے مگر میں کسی کی دوا نہیں کھاتا تھا۔ کلکتہ کے ہومیوپیتھک ڈاکٹر کے پاس روز ٹیلیفون کیا جاتا۔ جواب ملتا کہ کچھ گھبرانے کی بات نہیں اور نہ دوا کی ہی ضرورت ہے۔ ایک دِن پٹنہ کے ڈاکٹر لوگ زیادہ متفکر ہوتے۔ اُنھوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ اگر دوسرے دِن تک کوئی افاقہ نہ ہوا تو حالت تشویشناک ہو جائے گی۔ اور وہ مجھے ایک دور دراز کے ڈاکٹر کی دعاؤں کے بھروسے بلا علاج کے نہیں چھوڑیں گے۔

کلکتہ خبر دی گئی۔ ڈاکٹر پٹنہ بلائے گئے۔ اُنھوں نے ایک دوا دینے کو کہا جو بعد میں معلوم ہوا کہ پانی کے سوا اور کچھ نہ تھی۔ اُن کے آجانے سے یہاں کے ڈاکٹروں نے جوابدہی سے اپنے آپ کو بری سمجھا۔ وہ وہاں دو دِن ٹھہرے، مگر دوا کوئی نہیں دی۔ اِنھی دِنوں بیماری خود بخود کم ہونے لگی۔ چار، پانچ دنوں میں بخار کے ساتھ کھانسی بھی جاتی رہی بذریعۂ عکس ریز پھر جانچ کی گئی۔ پھیپھڑا بالکل صاف نکلا۔

میں زیرادیئ چلا گیا، اور جو دوست لاہور کانگریس میں شرکت کرنے والے تھے،

لاہور چلے گئے۔ میں نہ جا سکا۔ شری ستیش چندر مکرجی کے ساتھ تقریباً ایک مہینہ گھر پر رہا۔

اِسی درمیان میں نے ایک چھوٹی سی کتاب لکھی۔ مضمون تھا اہنسا (NON VIOLENCE) ۱۹۳۰ء کا ستیہ گرہ چھڑ گیا۔ میں اُس میں اِس طرح مشغول ہو گیا کہ پھر اس کتاب کی طرف توجہ ہی نہ گئی۔ نہ معلوم اُس کا کیا ہوا۔

لاہور کانگریس کا اِجلاس بڑی دھوم دھام سے ختم ہوا۔ وہاں جانے سے پہلے ہی مہاتما گاندھی اور پنڈت موتی لال نہرو نے دلّی میں وائسرائے سے ملاقات کی تھی۔ وہیں معلوم ہو گیا تھا کہ وائسرائے کے اِعلان سے کانگریس کا مطالبہ پورا نہیں ہوتا۔ اِس لئے ایک طرح پر طے ہی ہو گیا کہ کانگریس کا نصب العین بدلا جائے گا۔ وہ بدل بھی دیا گیا۔ اب کانگریس کا نصب العین مکمّل آزادی ہو گیا۔

اُدھر لاہور کانگریس کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اِدھر اپنے گاؤں میں ٹھہرے ہوئے مظہر الحق صاحب کی رحلت ہو گئی۔ پٹنہ سے جا کر حق صاحب چھپرا ضلع میں اودر کے نزدیک فرید پور میں رہا کرتے تھے۔ وہاں اُن کی کچھ زمینداری تھی۔ اُنہوں نے ایک بہت بڑا آم کا باغ لگایا تھا۔ اِسی باغ میں ایک چھوٹا سا بنگلہ تھا جس میں وہ رہا کرتے تھے پاس کی ہی ندی داہا کے سیلاب میں اپنے بڑے لڑکے کے اچانک ڈوب کر مر جانے سے وہ بہت ملول رہتے تھے۔ وہاں چند دنوں کی بیماری کے بعد ہی اُن کی وفات ہو گئی۔ اُن کا وہ گاؤں میرے گاؤں سے تقریباً پانچ میل کی دُوری پر ہے۔ خبر پاتے ہی میں وہاں گیا اور اُن کی بیگم صاحبہ سے مل کر تعزیت پیش کی۔

مظہر الحق صاحب کے انتقال سے ہم سب کو بڑا رنج ہوا۔ اُن کے چلے جانے سے

ہندو مسلم اتحاد اور سمجھوتے کا بہت بڑا ستون ٹوٹ گیا۔ پٹنہ میں جلسۂ عام ہوا جس میں اُن کے نام پر یادگار قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ میرا خیال رہا ہے کہ ایک قومی ہال بنے جو اُن کے نام پر ہو۔

یوم آزادی اور نمک ستیہ گرہ

لاہور کانگریس نے مکمّل سوراج کا حصول کانگریس کا نصب العین بنا دیا تھا ساتھ ہی اُس نے اِس کے لئے ستیہ گرہ کرنے کی ہدایت بھی دے دی۔ تقریباً پچھلے دو برس سے جو بیداری نظر آ رہی تھی اُسی کا یہ پھل تھا۔ کانگریس کے اجلاس کے تھوڑے ہی دِنوں کے بعد ورکنگ کمیٹی نے سارے مُلک کو ہدایت کی کہ ۲۶ جنوری کو آزادی کا دن منایا جائے۔ اُس دن اُس سال اتوار تھا۔ ایک شاندار بیان نکالا گیا جس میں مُلک کی حالت کا بیان اور حصول سوراج کا عہد تھا۔ ہدایت یہ تھی کہ سبھی مقامات پر بڑے بڑے جلسے کر کے حاضرین سے کہا جائے کہ وہ اِس عہد نامے کو دُہرائیں۔ مختلف صوبوں کے لوگ اپنی زبانوں میں ترجمہ کرا لیں۔ اور ایسا اہتمام کریں کہ عوام اُسے سمجھ کر دُہرائیں۔ کوئی دوسری تقریر اِس موقع پر نہ کی جائے۔ صرف اعلان ہی دُہرایا جائے۔ یہ جلسے تیسرے پہر ہی ہوں، سویرے جہاں ہو سکے وہاں قومی جھنڈا لہرایا جائے۔ یہی پروگرام سارے مُلک میں چلایا جائے۔

اِس زمانے میں مُلک میں بہت بیداری دیکھنے میں آئی۔ تقریباً سبھی شہروں اور بہتیرے گاؤں میں یوم آزادی کا پروگرام پورا کیا گیا۔ اِن مُبارک علامات سے یہ معلوم

ہوتا تھا کہ مُلک کوئی بڑا قدم اُٹھانے جا رہا ہے۔ سبھی جگہوں پر ستیہ گرہ کا چرچا تھا۔ باردولی کی فتح حال میں ہی ہو چکی تھی۔ وہ لوگوں کے دلوں کو بہت حوصلہ دِلا رہی تھی۔ لوگ اِس بات کا زوروں سے انتظار کر رہے تھے کہ کب کہاں اور کس طرح ستیہ گرہ شروع کیا جائے گا۔ گاندھی جی کی تحریریں لوگوں میں نئی روح پھونک رہی تھیں۔

مہاتما گاندھی اُن دنوں سابرمتی کے ستیہ گرہ آشرم میں رہتے تھے۔ وہاں ورکنگ کمیٹی کی نشست ہوئی۔ اُس میں اُنھوں نے ستیہ گرہ شروع کرنے کی بات کی۔ وہاں اِس معاملہ پر غور ہوتا رہا کہ ملک ابھی اس بارے میں تیّار ہے یا نہیں۔ بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ کچھ اور تیّاری کر لینی چاہئے مگر گاندھی جی اور پنڈت جواہر لال نہرو بہت اصرار کر رہے تھے اس بات پر بھی بہت بحث ہوتی رہی کہ کون سا قانون توڑا جائے۔ گاندھی جی کا پختہ خیال تھا کہ اِبتدا نمک ستیہ گرہ سے ہی کی جائے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اس قانون کی رو سے نمک پر ٹیکس لگتا ہے۔ غریبوں کو جو نمک مُفت مِل سکتا ہے یا بہت کم دام پر مل سکتا ہے وہ مہنگا ملتا ہے۔ بہت سے غریب اِس وجہ سے اِتنا نمک نہیں کھا سکتے جتنا اُن کی صحت کے لئے ضروری ہے۔ نمک ہماری غذا میں ایک اِنتہائی ضروری چیز ہے۔ وہ سمندر کے کنارے جمع کرنے سے مفت میں مل سکتا ہے۔ دوسری جگہوں میں بھی مٹّی سے بنایا جا سکتا ہے جہاں نمک کا پہاڑ ہے وہاں بھی لوگ کھود کر بغیر دام کے نکال سکتے ہیں۔ مگر حکومت صرف ٹیکس حاصل کرنے کے لئے اُس کے جمع کرنے پر پابندی لگاتی ہے۔ خُدا نے پانی اور ہوا کی طرح نمک بھی مُفت بانٹنے کا اہتمام کیا ہے۔ مگر حکومت لینے نہیں دیتی۔ اِس لئے گاندھی جی کا خیال تھا کہ اس سے خراب دوسرا ٹیکس نہیں ہو سکتا۔ اِس کے خِلاف ستیہ گرہ کرنے کی بات غریب بھی آسانی سے سمجھ لیں گے۔ دنیا کے لوگ بھی مان لیں گے کہ یہ مُنصفانہ

بات ہے۔

مہاتما جی کا ہمیشہ یہ طریقہ رہا ہے کہ ایک چھوٹی چیز کو لے کر اس سے بڑا نتیجہ نکالنا چاہتے ہیں۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر ایک غیر منصفانہ ٹیکس کا ہم اِس طرح ردّ عمل کر سکیں گے، تو دوسرے سبھی ٹیکسوں کی حد بندی ہم کر سکیں گے۔ اِس طرح جب اُنہوں نے پنجاب کے خونیں واقعہ اور خلافت کے لئے انصاف پر زور دیا تھا کہ ہم میں اگر اُن کے لئے اِنصاف کرا لینے کی طاقت آجائے گی تو وہی طاقت ہمیں اور بے انصافیاں ہٹانے کے لئے مقتدر بنا دے گی۔ اس طرح نمک قانون توڑ کر، ہم سب طرح اپنی خواہش کے مطابق حکومت سے کام کرا لینے کی قوت حاصل کر لیں گے۔

یہ باتیں ہم لوگ ٹھیک نہیں سمجھ پاتے تھے کہ حکومت پر زور ڈالے بغیر ہم اُسے مجبور کیسے کر سکیں گے۔ ساتھ ہی اِس سے بھی زیادہ رُکاوٹ یہ نظر آتی تھی کہ نمک قانون ہم توڑیں گے تو کیسے۔ جو سمندر کے کنارے رہتے ہیں۔ وہ تو وہاں کنارے پر سرکاری منظوری کے خلاف نمک جمع کر کے یا نمکین پانی گرم کر کے قانون توڑ سکتے ہیں۔ مگر ہندوستان کی اکثریت تو سمندر کے کنارے نہیں رہتی۔ قانون کیسے توڑے گی۔ ہاں بہت جگہوں پر خاص کر بہار اور اُتر پردیش میں مٹّی سے نمک بنایا جایا کرتا تھا۔ ایک ذات نونیا (یا لونیا) ہوتی ہے جو یہی کام کیا کرتی تھی۔ مگر جب سے بدیشی یا دیسی نمک سبھی جگہوں پر سمندر کے کنارے یا کھیوڑہ سے پہنچنے لگا ہے۔ تب سے اُن کا روزگار ہی بند ہو گیا ہے۔ وہاں پر اگر سرکاری مرضی کے خلاف نمک بنایا جائے تو قانون ٹوٹ سکتا تھا۔ مگر کیا اس طرح نمک بنانے میں عام لوگوں کو جوش ہوگا۔ کیا پڑھے لکھے لوگ اس میں دلچسپی لیں گے۔ صرف نونیا ہی اِس کام کو کامیابی سے کر سکتے ہیں۔ مگر وہ غریب اور غیر تعلیم یافتہ ہیں۔ اُن سے اِس کی اُمید کرنا

ٹھیک نہیں جچتا۔ اُن کو حوصلہ دلا کر قانون تڑوانا بھی منصفانہ معلوم نہیں ہوتا۔ یہ سب باتیں گاندھی جی سے کہی گئیں مگر اُن کا فیصلہ اٹل رہا کہ نمک قانون ہی توڑنا چاہیئے۔ اِس میں عوام جوش سے حصہ لے گی۔ یہی چیز سارے ملک میں چل سکے گی۔

مجھے بھی اِس پروگرام کی کامیابی میں بہت شک تھا۔ میں نے اُن سے کہا کہ بہار میں چوکیداری ٹیکس ایک ایسا ہے جو سبھی لوگوں کو دینا پڑتا ہے۔ اِس سے غریب بہت غیر مطمئن ہیں۔ اِس کی وصولی میں بھی غریبوں پر بہت سختی کی جاتی ہے۔ باقی ٹیکس کے لئے اُن کے برتن بھانڈے بھی ضبط کر کے نیلام کر دئے جاتے ہیں۔ میں نے کہا کہ بہار میں اِس ٹیکس کے بند کرنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔ عوام بہت جلد اور خوشی سے اِس کا دینا بند کر دیں گے۔ بہار کے لئے چوکیداری ٹیکس بند کرنے کی اجازت دی جائے۔ مہاتما جی نے کہا کہ اگر تم اِس سے کام شروع کرو گے تو بہت جلد ہار جاؤ گے۔ پہلے نمک قانون توڑ کر ہی کام شروع کیا جائے۔ بعد میں اگر لوگوں میں کافی جوش آ جائے تو ٹیکس بند کرنے پر غور کرنا۔ میں نے یہ بات سُن تو لی مگر دل میں نہیں بیٹھی۔ میں سوچتا تھا کہ اِس سیدھے راستے کو چھوڑ کر نمک قانون کے پھیر میں پڑنا کیوں ضروری ہے۔ مگر گاندھی جی کے اِن معاملوں پر تجربہ کاری کا میں قائل تھا۔ میرا عقیدہ ہو گیا تھا کہ وہ بہت دور تک دیکھ لیتے ہیں۔ جہاں تک ہم نہیں دیکھ سکتے۔ اِس لئے کچھ دِنوں سے میں نے یہ طریقہ بنا لیا تھا کہ اپنے خیالات اُن کے سامنے رکھ دوں، اگر وہ مان لیں تو ٹھیک نہیں تو اُن کی رائے کے مطابق کام کرنا ہی ٹھیک ہے۔ آخر میں میرا تجربہ بتاتا تھا کہ اُنہیں کی رائے ٹھیک نکلتی تھی۔ میں نے اِس موقع پر بھی طے کر لیا کہ بہار میں نمک قانون ہی توڑا جائے گا۔

گاندھی جی کی ڈانڈی یاترا (کوچ)

ورکنگ کمیٹی کی نشست کے بعد گاندھی جی نے اپنے لئے ایک تاریخ مقرر کرلی کہ وہ اِس دِن آشرم سے نکل کر چلیں گے۔ تقریباً ایک مہینے تک پیدل چل کر سورت ضلع کے ڈانڈی نام کے گاؤں میں سمندر کے کنارے پہنچیں گے۔ وہیں وہ پہلے پہل نمک قانون خود توڑیں گے۔ اِس فیصلہ کو منظور کرنے کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اِجلاس سابرمتی میں کیا گیا۔ یہ اِجلاس تو ہوا مگر اِس وقت تک مہاتما گاندھی ڈانڈی یاترا کے لئے نکل چکے تھے۔ اِس لئے ورکنگ کمیٹی کے فیصلے کو ہی آل اِنڈیا کانگریس کمیٹی نے منظور کرلیا۔

ڈانڈی یاترا سے پہلے جو ایک طرح سے ستیہ گرہ کا آغاز تھا گاندھی جی نے اپنے اُصول کے مُطابق ایک خط بڑے لاٹ صاحب کو لکھ بھیجا۔ اِس میں اُنہوں نے سبھی باتیں بتادیں۔ یہ خط اُنہوں نے ایک انگریز کے ہاتھ بھیجا۔ اُن کا نام رینالڈس تھا۔ اُس زمانے میں وہ سابرمتی میں رہتے تھے۔ مگر جیسا خیال تھا کوئی قابلِ اطمینان جواب نہیں آیا۔ دَورہ شروع کرتے وقت اُنہوں نے کانگریس کمیٹیوں اور کانگریسی لوگوں کو ہدایت کردی تھی کہ جب تک میں اجازت نہ دوں کوئی ستیہ گرہ نہ کرے۔ چاہے سرکاری احکام بُرے بھی

لگیں تو انہیں ماننا چاہیئے۔

اِرادہ تھا کہ ۵؍اپریل تک وہ ڈانڈی پہنچ جائیں گے۔ اور اُسی دِن خود سب سے پہلے ستیہ گرہ کریں گے۔ ستیہ گرہ آشرم کے ۸۰ یا ۸۱ آدمیوں کو اپنے ساتھ لیا۔ سِلسلہ یہ تھا، کہ سویرے کچھ دور تک جانا ہوتا دوپہر کو کسی طے شدہ مقام پر غسل کرنا اور آرام کیا جاتا۔ پھر تیسرے پہر کچھ دُور جایا جاتا۔ شام کو کہیں ڈیرہ پڑ جاتا۔ وہیں رات کو آرام کیا جاتا۔ پھر دوسرے دن سویرے وہی سلسلہ شروع ہوتا۔ یہ دَورہ تقریباً ایک مہینہ کا ہوا۔ بیچ میں بہت شہر اور گاؤں بھی ملے۔ ۱۵۰ میل کا دورہ تھا۔ تقریباً ۸، ۱۰ میل روز چلنا پڑتا تھا۔ جس دِن گاندھی جی سابرمتی سے نکلے۔ اُس دِن آشرم پر رات بھر بہت بھیڑ لگی رہی۔ سویرے ہزاروں آدمیوں کے جے کے نعروں کے درمیان گاندھی جی اور اُن کے ساتھی آشرم سے نکلے۔ ان لوگوں کے پاس اپنی اپنی جھولی میں اُن کے لئے ضروری سامان تھا۔ بڑا ہی جوش تھا۔ دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا گویا سارا احمدآباد اور وہاں کا علاقہ اُمنڈ آیا ہے۔

گاندھی جی نے یہ بھی اِعلان کر دیا کہ سوراج حاصل کئے بغیر آشرم میں واپس نہ آئیں گے اِس کا اثر سارے مُلک پر جادو کا سا پڑتا رہا۔ سبھی لوگ بڑے اشتیاق سے ۵؍اپریل کی راہ دیکھ رہے تھے۔ لوگ چاہتے تھے کہ ہم کو بھی ستیہ گرہ کا مبارک موقع ملے۔ کانگریس کے لوگ بھی بیٹھے نہیں تھے۔ وہ چاروں طرف بہت زوروں سے پرچار میں لگے تھے۔ گاندھی جی جیسے جیسے بڑھتے گئے مُلک میں جوش بھی بڑھتا گیا۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل یاترا شروع ہونے سے پہلے ہی گرفتار کر لئے گئے۔ اِس لئے وہ یاترا میں یا اِس کے بعد شروع ہونے والے ستیہ گرہ میں شریک نہیں ہو سکے۔

اِسی درمیان آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اِجلاس احمد آباد میں ہوا۔ وہاں سے پنڈت موتی لال نہرو، پنڈت جواہر لال نہرو وغیرہ کے ساتھ ہم لوگ جمبوسر تک گئے۔ وہیں گاندھی جی سے ملاقات ہوئی۔ ہم لوگ بھی کچھ دُور تک اُن کے ساتھ گئے۔ پھر اپنے اپنے مقام کو لوٹ آئے۔ میں نے بہار میں آکر سب جگہ کے لوگوں کو ہدایت کر دی کہ جب تک گاندھی جی کا حکم نہ ملے کوئی ستیہ گرہ نہ کرے۔ پنڈت جواہر لال جی نے چار، پانچ دن تک صوبے کا دَورہ کیا۔ سارے مُلک میں جوش کی لہر دوڑ گئی۔

بہار میں نمک ستیہ گرہ

نہرو کے دَورے کا آخری دن تھا۔ وہ الہ آباد چلے جانے والے تھے۔ جہاں تک مجھے یاد ہے، آخری جلسہ ضلع چھپرا کے قصبۂ مہاراج گنج میں شام کے وقت ہوا۔ وہیں تار سے یا اخباروں سے یہ اِطلاع ملی کہ ۶ اپریل سے سب لوگ اپنے اپنے مقام پر ستیہ گرہ شروع کر سکتے ہیں، گاندھی جی کی یہی ہدایت ہے۔ اِس اطلاع نے ایک طرح سے ہمارا پروگرام گڑبڑ کر دیا۔ ابھی ہم نے یہ طے نہیں کیا تھا کہ کون کہاں ستیہ گرہ کرے گا۔ سبھی جگہوں کو راتوں رات خبر دے دی گئی۔ چمپارن کے لوگوں نے پہلے سے سوچ رکھا تھا کہ بپن بابو موتی ہاری سے پیدل چل کر سات، آٹھ دِنوں کے سفر کے بعد جو گاپٹی کے پاس پہنچ کر ستیہ گرہ کریں گے۔ اُنہوں نے ۶ اپریل کو ہی دورہ شروع کر دیا۔ مظفر پور ضلع میں بھی ایسا ایسا ہی ہوا۔ دو چار دِنوں کے اندر ہی سبھی جگہوں میں نمک قانون ٹوٹنے لگا۔ جس دن بپن بابو نے نمک بنایا میں وہاں پہنچ گیا۔ مگر میرے پہنچنے سے پہلے ہی وہ گرفتار کر لئے گئے تھے۔ وہیں ایک باغیچہ میں مجسٹریٹ نے کچہری لگا دی، اور آناً فاناً مقدمہ سُن کر اُن کو سزا بھی دے دی۔ میں راستے میں موٹر سے اُن مقامات کو دیکھتا گیا، جہاں جہاں

ستیہ گرہ کے مجاہد ٹھہرے تھے۔ بے مثال جوش ظاہر ہو رہا تھا۔ جہاں قانون توڑا گیا تھا وہاں کے لوگوں کے جوش کا تو ٹھکانا ہی نہیں تھا۔

مجسٹریٹ ایک ایسے حضرت تھے، جنہوں نے سنہ ۱۹۲۱ء میں پٹنہ کالج سے ترکِ موالات کر کے کچھ دِنوں تک ہمارے قومی کالج میں قیام کیا تھا۔ اپنے گھر والوں کے زور دینے پر وہ واپس چلے گئے تھے۔ پڑھنے میں تیز تھے۔ اِمتحان پاس کر کے ڈپٹی مجسٹریٹ ہو گئے۔ برسوں کے بعد اِس درجے پر پہنچے تھے۔ مقدّمے کی سماعت کے وقت اُنہوں نے ایک بار بھی سر نہ اُٹھایا، سر جُھکاتے ہوئے ہی حکم بھی سُنا دیا۔ وہاں سے بپن بابو کو موٹر پر موتی ہاری جیل لے آئے۔

میں بھی اپنی گاڑی میں موتی ہاری تک آ کر پٹنہ یا کسی دوسرے مقام کے لئے روانہ ہو گیا۔ اِدھر گاندھی جی نے نمک جمع کیا۔ مگر سرکار نے اِنہیں گرفتار نہیں کیا۔ مُلک بھر میں بے شمار مقامات پر لوگ نمک بنانے لگے۔ گرفتاریاں ہونے لگیں۔ اپنے لئے میں نے یہ پروگرام بنا لیا کہ سبھی ضلعوں میں دَورہ کر کے ستیہ گرہیوں کا حوصلہ بڑھاؤں۔ ایک دو دِن کے اندر سارے ضلع میں دوڑ جاتا۔ جہاں جہاں نمک بنا ہوتا یا بنانے کی تیاریاں ہوتیں ستیہ گرہیوں سے جا کر مِل لیتا۔ جہاں تک ہو سکتا پبلک جلسے بھی کر لیتا۔ میں دو چار دنوں کے اندر ہی آدھی رات کو پہنچنے والے سٹیمر سے پٹنہ پہنچا۔ وہاں گنگا گھاٹ پر ہی لوگوں نے کہا کہ پٹنہ شہر میں اُسی دن ستیہ گرہ شروع کیا گیا ہے۔ اُس کی شکل یہ تھی کہ کچھ ستیہ گرہی باقر گنج محلّہ سے نِکل کر جھنڈا لئے شہر میں جا رہے تھے جہاں وہ نمک بنانے والے تھے۔ جب وہ سلطان گنج تھانہ کے سامنے پہنچے تو پولیس نے اُنہیں روک لیا۔ ابھی تک اُن کا قصور اتنا ہی تھا کہ وہ جھنڈا لے کر پانچ سات آدمیوں کا جلوس بنا کر سڑک پر جا رہے تھے۔

وہ گرفتار بھی نہیں کئے گئے تھے مگر پولیس کے سپاہیوں نے قطار باندھ کر اُن کا راستہ روک لیا تھا۔ وہ دن بھر وہیں کھڑے رہے۔ رات کو بھی وہیں سڑک پر سو رہے۔

میں سیدھے اُس جگہ گیا۔ دیکھا کہ سپاہی سڑک روکے کھڑے ہیں اور ستیہ گرہی آرام سے سڑک پر سوئے ہوئے ہیں۔ اُن کے سونے کے لئے محلّے کے لوگوں نے بستر بھی دے دیا تھا۔ کھانا بھی کھِلا دیا تھا۔ میرے جانے پر وہ اُٹھے۔ مجھ سے بہت محبّت سے ملے۔ رات کو تو کچھ ہونے والا نہ تھا۔ میں صداقت آشرم چلا گیا۔ دوسرے دن علی الصّباح ہی اُس جگہ پہنچا۔ میں تو سارے صوبے کا چکّر لگایا کرتا تھا۔ اور آشرم میں بیٹھے بیٹھے برج کشور بابو سبھی جگہوں کو ضرورت کے مُطابق ہدایت اور مدد بھیجا کرتے تھے۔ اِس بار ابھی تک کانگرس کمیٹی غیر قانونی قرار نہیں دی گئی تھی۔ اور نہ صداقت آشرم ہی ضبط ہوا تھا۔ اِس لئے یہ کام وہاں سے چلتا رہا۔ گرفتاریاں بھی اُنہیں لوگوں کی ہوتیں جو نمک بناتے، اور سب کی نہیں۔

دوسرے دِن صبح وہاں پولیس کی بہت بھیڑ تھی۔ گھوڑ سوار بھی آ گئے۔ سُنا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اور پولیس کپتان بھی تھانے میں موجود ہیں۔ اِدھر عوام کا مجمع بھی بڑھنے لگا۔ میں سمجھا کہ ستیہ گرہی یا تو گرفتار کر لئے جائیں گے یا مار پیٹ کر چھوڑ دیے جائیں گے مجھ سے ایک آدمی نے آ کر کہا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مجھے تھانے میں بُلاتے ہیں۔ میں وہاں گیا اُنہوں نے مجھ سے کہا کہ ستیہ گرہیوں کو میں ہٹالوں نہیں تو اُن کو کارروائی کرنی پڑے گی۔ میں نے کہا "آپ اِنہیں گرفتار کر سکتے ہیں"۔

اُنہوں نے کہا "میں بھیڑ کو بھی ہٹاؤں گا اور ایسا کرنے میں سخت کارروائی بھی کرنی پڑ سکتی ہے"۔ میں نے والنٹیروں کو ہٹانے سے اِنکار کر دیا۔ اُنہوں نے کہا کہ

اِس کی جواب دہی آپ پر رہے گی اور میں مناسب کارروائی کروں گا۔ ساتھیوں سے صلاح کرنے کے لئے میں سیدھے موٹر پر صداقت آشرم گیا۔ سب کی رائے ہوئی کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ مجسٹریٹ جو چاہے کرے۔ میں نے فوراً ٹیلیفون پر سلطان گنج تھانے کو یہی جواب دیا۔ پھر یہ سمجھ کر کہ اب کچھ نہ کچھ ہو کر رہے گا، میں سُلطان گنج تھانے کے لئے روانہ ہوگیا۔

راستہ میں باقر گنج میں اِدھر سے مجسٹریٹ کی موٹر کو واپس آتے دیکھا۔ اُنہوں نے بھی مجھے دیکھا۔ مُسکراتے ہوئے وہ آگے بڑھ گئے۔ میں سمجھا کہ وہ کچھ کارروائی کر کے آرہے ہیں۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ اُنہوں نے پہلے ستیہ گرہیوں کو چلے جانے کا حُکم دیا۔ جب وہ نہیں ہٹے تو کچھ دُور پر کھڑے گھوڑ سواروں کو گھوڑے دوڑانے کا حُکم دے دیا۔ جب گھوڑے چلے تو لڑکے سڑک پر لیٹ گئے۔ اِس طرح اُنہوں نے راہ روک لی۔ گھوڑے وہاں تک دوڑتے آئے مگر اُن کے پاس پہنچ کر رُک گئے۔ تب وہ لڑکے اُٹھا اُٹھا کر ایک موٹر لاری میں رکھ دئے گئے۔ اِسی طرح گرفتار کر کے ہٹا دئے گئے۔

ہم نے طے کر لیا کہ ستیہ گرہی پانچ پانچ کا جلوس بنا کر دن بھر وہاں جاتے رہیں۔ جب ایک جتھہ گرفتار ہو جائے، تب دوسرا چلے۔ دن رات یہی سِلسلہ جاری رہے۔ اپریل کا مہینہ آدھے سے زیادہ گذر چُکا تھا۔ گرمی خاصی پڑ رہی تھی ہمارے ستیہ گرہیوں کو بھی دھوپ لگتی تھی۔ پولیس والے تو دِن رات کھڑے ہی رہتے تھے۔ ایک دو دن یہی سِلسلہ جاری رہا تب میں نے طریقہ بدل دیا۔ دِن رات گرفتاریوں کا انتظار نہ کر کے وقت مقرر کر دیا گیا۔ دن رات میں چار پانچ جتھے مقررہ وقت پر جاتے۔ وہ شروع میں تو گرفتار کر لئے جاتے، مگر بعد میں جب تماشائیوں کا ہجوم زیادہ ہو جاتا تو گھوڑ سوار

گھوڑے دوڑاتے اور لوگوں کو ڈنڈوں سے پیٹتے۔ ستیہ گرہی تو اِس دھکّے مکّے میں کبھی گرفتار ہوتے، کبھی نہیں بھی ہوتے۔ مگر عوام پر خوب مار پڑتی۔ یہ خاص کر صبح اور تیسرے پہر جب جتھا جاتا تبھی ہوا کرتا۔ میں بھی وقت پر پہنچ جایا کرتا اور عوام کے مجمع میں رہ کر سب دیکھا کرتا شاید پولیس والے مجھے پہچانتے تھے، اِس لئے مجھے کبھی چوٹ نہ لگی مگر پروفیسر عبدالباری کو بہت چوٹ لگی تھی۔

یہ سِلسلہ کئی دِنوں تک چلتا رہا۔ مجمع روزانہ بڑھتا گیا۔ مورچے کا مقام سُلطان گنج تھانے کے مغرب کی طرف سے ہٹتا ہٹتا پٹنہ کالج کے سامنے تک آگیا۔ ہمارے آدمی اور عوام الناس بھی برابر فضا کو پُر امن رکھتے۔ مار پیٹ جو کچھ ہوتی وہ پولیس ہی کی طرف سے۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ سیّد حسن امام کی اہلیہ نے کہیں سے آتے ہوئے پولیس کو مار پیٹ کرتے دیکھا۔ کئی آدمیوں کے سر پھٹ گئے تھے۔ اُن کے دل پر اِس کا بہت اثر ہوا۔ اُنہوں نے جاکر سید حسن امام صاحب سے کہا کہ بہت خون خرابہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ اُس وقت تک مجھے معلوم نہیں تھا کہ حسن امام صاحب اِس معاملہ میں کچھ دلچسپی لے رہے ہیں۔ اِس بارے میں اُن سے مِلا نہ تھا اور نہ اُن سے کچھ باتیں کرنے کا مجھے موقع ہی ملا تھا۔ اپنی بیوی کی بات سُن کر اُنہوں نے مجھے فوراً ٹیلیفون سے بلایا۔ میں نے سب باتیں تفصیل سے کہہ سُنائیں۔ وہ بڑے جذباتی انسان تھے۔ سب باتیں سُن کر اُنہیں بھی غصّہ آگیا۔ وہ طیش میں آگئے۔ اُنہوں نے کہا کہ میں پوری مدد کروں گا۔ اُن کا یہ جوش بڑھتا گیا۔ اِس کا حال میں آگے چل کر بتاؤں گا۔

اِسی درمیان ایسٹر کی تعطیلات آگئیں۔ میں اِس ستیہ گرہ کو مذہبی جنگ سمجھتا تھا۔ میں نے سوچا کہ یہ اگر مذہبی چیز ہے تو اِس کے ذریعے کسی کو اپنے مذہب پر چلنے میں

رکاوٹ نہ آنی چاہیئے۔ میں نے ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو ایک خط لکھ دیا کہ پولیس والوں میں کچھ عیسائی بھی ہیں۔ جو ایسٹر میں کچھ مذہبی رسوم کرتے ہوں گے۔ اِس لئے سوموار (پیر) کو جتھہ نہیں جائے گا۔ پھر منگل سے ضابطہ کے مطابق جتھے جایا کریں گے۔ جمعہ کے دن بھی دوپہر کو جانے کے لئے جو جتھہ مقرر تھا اُسے میں نے روک دیا۔ کیونکہ گھوڑ سواروں میں زیادہ تر مسلمان ہی تھے۔ میں نے یہ خط سچے دل سے لکھا تھا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے خط پڑھنے پر بذریعہ ٹیلیفون مجھ سے پوچھا کہ میں نے جو کچھ لکھا ہے وہ کیا سچ مچ مذہبی خیال سے ہی لکھا ہے میں نے کہہ دیا کہ ہاں سچّے دل سے ہی لکھا ہے۔ اُس پر اُنہوں نے کہا کہ میں اُن سے ملوں۔ وہ غور کریں گے کہ یہ جھگڑا کیسے طے ہو سکتا ہے۔

دوسرے ہی دن پیر تھا۔ میں گیا۔ بہت دیر تک بات ہوئی۔ میں نے کہہ دیا کہ یہاں جھگڑا بہت چھوٹا ہے۔ پانچ آدمیوں کا جلوس سڑک پر ہو کر جانا چاہتا ہے۔ اِس میں خلافِ قانون بات نہیں ہے۔ وہ جلوس کو نکل جانے دیں، اُسے روکیں نہیں۔ سارا جھگڑا طے ہو جائے گا۔ جب جتھہ نمک قانون توڑے اُسے گرفتار کر لیا جائے اور قانوناً سزا دی جائے۔ اُنہوں نے دوسری سڑک سے جلوس لے جانے کی بات کہی۔ میں اِس پر رضامند نہ ہوا۔ بات اتنی ہی تک ہو کر رہ گئی۔ دوسرے دِن جو جتھہ گیا وہ گرفتار کر لیا گیا۔ گرفتاری کے بعد مجمع خود بخود ہٹ گیا۔ مار پیٹ کی کوئی نوبت نہیں آئی۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ پولیس کی تعداد بہت کم ہے۔ گھوڑ سوار تو ہیں ہی نہیں۔ پولیس کے اسسٹینٹ سپرنٹنڈنٹ نے گرفتاری کی۔ ستیہ گرہی فوراً کچہری میں پیش کئے گئے۔ مقدمہ چل ہی رہا تھا کہ دوسرے جتھے کے آنے کا وقت ہو گیا۔ وہ جتھہ سیدھے راستے سے چلا گیا۔ کسی نے اس کو نہیں روکا ہم لوگ کچہری میں ہی تھے کہ یہ خبر ملی۔ اُن ستیہ گرہیوں کو بھی کچہری اُٹھنے تک کی قید ہو گئی۔

حکم سُنا کر حاکم اُٹھ گئے۔ ہم سب ستیہ گرہیوں کے ساتھ ہی وہاں سے نکلے۔ اب صاف ظاہر تھا کہ جتھے کو پولیس نہیں روکے گی۔ شام کو جبھی جتھہ گیا مگر کوئی روک ٹوک نہیں ہوئی۔ اِس کے جتھہ بھیجنے کا سِلسلہ بند کر دیا گیا۔ مگر نمک بنانے کا کام جاری رہا۔ اِس لئے لوگ گرفتار ہوتے رہے۔ پٹنہ شہر میں بھی گرفتاریاں ہوتی رہیں۔

نمک ستیہ گرہ کے بعد

اِدھر گاندھی جی کچھ دنوں کے بعد گرفتار ہو گئے۔ دھرسنا میں جہاں نمک کا سرکاری ذخیرہ تھا، ستیہ گرہی دھاوا بولنے لگے۔ وہاں باہر میدان میں ہی نمک بہت جمع کیا پڑا رہتا تھا۔ والنیٹر اُسے لوٹنے تو جاتے نہیں تھے۔ مگر سرکاری حکم کے خلاف اُس جگہ پر پہنچنا چاہتے تھے۔ اِس لئے وہاں وہ لاٹھیوں سے خوب پیٹے جاتے۔ پہلے گاندھی جی اِس کے بعد شری عباس طیب جی اور بعد ازاں مسز سروجنی نائیڈو نے اُن کی رہنمائی کی۔ وہ یکے بعد دیگرے گرفتار ہوتے گئے۔ وہاں والنٹیروں کے بے رحمی سے پیٹے جانے، لاٹھیوں کی چوٹ سے بے ہوش ہونے، بے ہوشی کی حالت میں گھسیٹ کر جھاڑیوں میں چھوڑ دئے جانے اور کانگریسیوں کے ذریعہ چارپائیوں پر اُٹھائے جاکر کانگریسی ہسپتال میں پہنچائے جانے کی لرزہ خیز خبریں چھپتی رہیں۔ اِس سے جوش بڑھتا ہی جاتا تھا۔ گھٹتا نہ تھا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ بہت زوروں کی مار کھائیں گے سینکڑوں آدمی روز جاتے۔ یہ سلسلہ، جب تک برسات نہ ہو گئی اور اُس مقام پر جانا غیر ممکن سا نہ ہو گیا، برابر جاری رہا۔

بہار کے صوبے میں سمندر کا کنارہ تو تھا نہیں مگر سبھی جگہوں پر کچھ نہ کچھ شورمٹی مل جاتی۔ اُسے جمع کر کے اُس کا پانی نچوڑ لیتے اور اُسے ہانڈی میں گرم کر کے سُکھا دیتے۔ کچھ نمک ایسی چیز نکل آتی۔ میں نے خود کہیں نمک نہیں بنایا۔ مگر جہاں جاتا وہاں کے بنے ہوئے نمک کو جلسوں میں بیچتا یا نیلام کرتا۔ اِس سے خرچ کے کچھ روپے بھی مِل جاتے اور سرِعام قانون بھی ٹوٹتا، کیونکہ بغیر ٹیکس دیئے نمک بیچنا ویسے ہی جرم ہے، جیسے نمک بنانا مگر میں بہت دنوں تک گرفتار نہیں ہوا۔

پنڈت جواہرلال جی کی گرفتاری شروع میں ہی ہو گئی اُن کی جگہ پنڈت موتی لال کام کرنے لگے۔ وہ بھی تقریباً جون کے آخر تک گرفتار نہیں کئے گئے۔ مجھے بھی ورکنگ کمیٹی کا ممبر بنا لیا گیا تھا۔ اِس درمیان گاہے بہ گاہے الہ آباد میں ورکنگ کمیٹی کی نشست بھی ہوئی۔ وہاں سے ضرورت کے مطابق ہدائتیں نکلیں۔ جس قسم کی مدد لوگ مانگتے وہی دی جاتی۔ سارے مُلک میں حکومت کی تشدّد کی پالسی زوروں سے چل رہی تھی۔ گرفتاریاں جتنی ہوسکتی تھیں، سرکار اتنی نہ کرتی تھی۔ اُس نے یہ پالسی بنالی کہ کچھ قانون شکن گرفتار کئے جائیں اور باقی مار پیٹ کر چھوڑ دئے جائیں۔ اِس لئے جہاں کہیں لوگ جمع ہو کر نمک بناتے، پولیس والے پہنچتے ہی ہانڈی اور چولھا توڑ پھوڑ ڈالتے۔ جو لوگ وہاں رہتے اُن میں سے ایک دو کو گرفتار کرتے اور دوسروں کو لاٹھیوں سے پیٹ کر چلے جاتے۔ اِس سے نمک بننا بند نہ ہوتا۔ پھر نئی ہانڈی پہنچ جاتی۔ نیا چولھا بن جاتا اور نمک بنانے والوں کی تعداد جوں کی توں بنی رہتی۔ گاؤں والے یہ کام چھپ کر نہیں کرتے تھے۔ کیوں کہ سرِعام کرنے کی ہدایت تھی۔ میں برابر دن رات دورہ کر رہا تھا۔ سبھی جگہوں میں دیکھتا کہ لوگ گاؤں کے کسی خاص مقام پر کیلے کے کھمبے وغیرہ گاڑ کر جھنڈے اور جھالر لگا کر

گھیر بنا لیتے۔ وہیں چولھا اور مٹی سے پانی نچوڑنے کے لئے چھوٹی پوٹلی بنا لیتے۔ گاؤں کے سبھی لوگ جانتے کہ کہاں تک نمک بنتا ہے۔ کسی آنے والے شخص کو یا پولیس کو نمک بنانے کی جگہ کا پتہ آسانی سے لگ جاتا تھا

مجھے کچھ دنوں تک حکومت نے گرفتار نہیں کیا۔ میں اوپر کہہ چکا ہوں کہ ستیہ گرہ شروع ہونے سے پہلے مجھے ستیہ گرہ کی کامیابی میں شبہ تھا۔ پھر بھی میں نے اِس کے لئے پوری کوشش کی۔ جیسے جیسے گاندھی جی اپنے دَورہ میں ڈانڈی کی طرف آگے بڑھتے جاتے تھے۔ ملک میں جوش بڑھتا جاتا تھا۔ یہ سب دیکھ کر میرا عقیدہ بھی مضبوط ہوتا گیا کہ اِس میں پوری کامیابی ہوگی۔ تب میں اور بھی زور لگاتا گیا۔ پنڈت موتی لال جی کا بھی کچھ ایسا ہی خیال تھا۔ اُنہوں نے الہ آباد میں اپنے آنند بھون میں ہی، جیسے لیبارٹری میں کوئی عمل ہوتا ہے، ویسے ہی فلٹر کاغذ کے ذریعہ مٹی سے نمک نکالا۔ اُنہوں نے اسے بہت فخر کے ساتھ ہم لوگوں کو دکھایا۔ ہم لوگوں کو بھی اِس کا فخر رہا۔ اُن کے حکم اور ہدایت سے بہار کی حالت کی طرف توجہ رکھتے ہوئے میں نے یہ پروگرام بنایا کہ بہار میں جون تک نمک بنایا جائے۔ یعنی اِس پر زیادہ زور رہے۔ اِس کے بعد بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ پر زور لگایا جائے۔ ساتھ ہی شراب بندی بھی چلے۔ برسات میں نمک نہیں بن سکتا، اِس لئے جون کے بعد بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ اور نشہ بندی کے لئے پہرے وغیرہ کا کام چلایا جائے۔ برسات ختم ہونے پر چوکی داری ٹیکس بند کرنے کا پروگرام چلایا جائے۔

مجھے خبر ملی تھی کہ شروع میں حکومت کا خیال مجھے گرفتار کرنے کا نہیں تھا۔ میں سرکار کے خیال کی پرواہ نہ کر کے کام کرتا ہی جاتا تھا۔ مجھے کچھ

دِنوں کے بعد پتہ چلا کہ ضلع مجسٹریٹ کو صوبائی حکومت کی منظوری مل گئی ہے کہ اگر وہ چاہیں تو مجھے گرفتار کر سکتے ہیں

بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ اور شراب بندی

شہروں کا پروگرام، نمک سازی کے سوا، زیادہ تر بدیشی کپڑے کا بائیکاٹ اور شراب بندی کا ہوتا۔ الہ آباد ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ کے وقت یہ معلوم ہو گیا کہ مُلک کی کئی جگہوں میں غیر مُلکی کپڑے کے بائیکاٹ کا کام بھی زوروں سے چل رہا ہے۔ یہ کام بہار میں بھی شروع ہو گیا۔ تاجروں اور عوام دونوں میں بڑا جوش تھا۔ اِس لئے کام بہت آسانی سے آگے بڑھنے بڑھنے لگا۔ جس طرح گاؤں گاؤں میں نمک بنانے کا مقابلہ سا ہونے لگا، اِسی طرح بڑے بڑے شہروں میں یہ مقابلہ ہو گیا کہ وہاں کی دُکانوں، اور آڑھتیوں میں جتنا بھی بدیشی کپڑا ہو، اُس کی فروخت بند کر دی جائے۔ مہاتما جی نے لکھا تھا کہ اِن پر اور شراب کی دُکانوں پر پہرے کا کام زیادہ تر عورتوں کے ہی ہاتھوں میں رہے اور اِس کی تکمیل کا بار وہ اپنے اُوپر سمجھیں۔ اِس لئے کہیں کہیں عورتیں دکانوں کا پہرہ دینے لگیں۔ کسی نے وہیں ایک طریقہ جاری کر دیا اور وہ تقریباً سبھی جگہوں پر رائج ہو گیا وہ یہ تھا کہ سبھی کپڑے کے دُکان دار اپنی دکانوں کے بدیشی کپڑے کو باندھ کر اُس پر کانگریس کی مہر لگا کر رکھ دیتے اور لکھ کر وعدہ کر لیتے کہ جب تک کانگریس کا حکم نہ ہو گا اِس گانٹھ کو

نہیں کھولیں گے۔ تاجر اکثر آپس میں ہی کمیٹی بنا لیتے، جس پر کانگریس کی دیکھ بھال رہتی اور جس میں کانگریس کے نمایندے بھی رہتے۔ وہ اس کمیٹی پر اس طرح سارے بدیشی کپڑے کو بند ھوا دینے اور اُس کی فروخت نہ ہونے دینے کا بار ڈال دیتے۔ اگر کوئی تاجر وعدہ خلافی کرتا تو اس کو یہ کمیٹی جرمانہ کی سزا بھی دیتی اور اِس طرح اُن پر پورا کنٹرول رہتا۔ جو تاجر رضامند نہ ہوتا اُس کی دُوکان پر پہرہ بٹھا دیا جاتا اور اُس کی فروخت بند ہوجاتی

آج بھی یہ یاد کر کے بہت خوشی ہوتی ہے کہ بہار کے تقریباً سبھی شہروں میں اور بہتیرے گاؤں میں چھوٹے چھوٹے تاجروں نے بھی اپنے سبھی کپڑے کو گانٹھوں میں باندھ کر کانگریس کی مُہر لگا کر الگ رکھ چھوڑا۔ سارے صوبے میں پہرے کا کام تھوڑا ہی کرنا پڑا، اور بہت کامیابی سے ہوا۔ پہرہ آغاز کرتے ہی گانٹھوں کے باندھنے کا کام شروع ہو جاتا اور دو چار دنوں میں ہی کام پورا ہو جاتا۔ یہ منظر میں نے تقریباً سبھی جگہوں میں دیکھا۔ جون کا مہینہ ختم ہوتے ہوتے یہ کام بھی سارے صوبے میں پورا ہو گیا جو کام ہوتا تھا، اُس میں دیکھا دیکھی بڑا اثر ہوتا تھا، اگر خبر مل گئی کہ کسی ایک شہر کے تاجروں نے گانٹھ باندھنا شروع کر دیا ہے تو دوسرے شہر کے تاجر اُس پر غور کرنے لگتے اور وہاں کے کانگریسی بھی اُن پر زور ڈالنے لگتے، بس وہاں بھی کام شروع ہو جاتا اور جلد ہی ختم بھی۔ پنڈت موتی لال نہرو سے کانپور، دلّی، پنجاب وغیرہ کے بڑے بڑے تاجر ملتے اور اُن سے باتیں کرتے کہ مرکزوں میں کس طرح یہ کام پورا کرایا جائے۔ اور اِس میں ہندوستانی مل والوں سے کس طرح مدد لی جائے، اِس پر غور کرتے۔ عہد نامہ کا مسودہ تیار کرا کر سب جگہ بھیج دیا گیا۔ عوام اور تاجر اپنے اپنے عہد ناموں پر دستخط کرتے تھے۔

کسی کسی صوبے میں شراب بندی پر زیادہ زور دیا گیا۔ وہاں اِسی کو لے کر سرکاری تشدّد چلا۔ لوگوں کو قید اور گولیوں تک کا شکار بننا پڑا۔ ایسے لرزہ خیز واقعات سرحد میں ہوئے بہت سے پٹھان گولیوں کا شکار ہوئے۔ سارے مُلک میں سنسنی پھیل گئی۔ شری وٹھل بھائی پٹیل نے جو مرکزی اسمبلی کے پہلے منتخب اسپیکر تھے۔ اپنے عہدے سے اِستعفیٰ دے دیا۔ وہ صوبۂ سرحد کے گولی چلنے کے واقعات کی جانچ کے لئے چلے گئے۔ اُن کی رپورٹ کو سرکار نے ضبط کرلیا۔ اُس کی بہت اشاعت نہ ہوسکی۔ مگر جتنی کچھ خبر چھپتی تھیں اُسی کا اَثر سارے مُلک میں بجلی کی طرح بہت تیزی سے کام کرتا جب سبھی جگہوں پر ایک سے ایک حوصلہ افزا کارروائیاں پوری ہوں۔ تب یہ انتخاب مشکل ہوجاتا ہے کہ کس کس کا ذکر کیا جائے۔ مجھے اِس بات کا افسوس ہے کہ ابھی تک مُلک بھر کے ستیہ گرہ کی تفصیلی تاریخ نہیں لکھی گئی مگر کچھ ایسی باتیں ہیں جن کا ذکر کر دینا اچھّا ہوگا۔

بِہار ایسا صوبہ ہے جہاں پردہ کا رواج بہت ہے۔ جب میں اِنگلستان میں تھا یہاں پردہ ہٹانے کی ایک خاص کوشش شروع ہوئی تھی۔ دربھنگہ ضلع کے نوجوان شری رام نندن مشرا اپنے گھر کے لوگوں کی خواہش کے خلاف اپنی بیوی کو پردہ سے باہر لے آئے۔ اُسے وہاں سابرمتی آشرم میں بھی کچھ دنوں کے لئے لے گئے۔ مہاتما جی نے شری مگن لال گاندھی کی لڑکی رادھا کو پردہ ہٹانے کے لئے بِہار بھیجا۔ شری مگن لال جی یہاں کا کام اور اپنی لڑکی کو دیکھنے آئے۔ وہ اچانک بیمار پڑ گئے۔ اور پٹنہ میں اُن کی وفات بھی ہوگئی۔ اُس کا بڑا اثر ہوا۔ پردہ ہٹانے کا کام زوروں سے شروع ہوا۔ اُس کے لئے ایک صوبائی کانفرنس ہوئی جس میں شری برج کشور پرشاد بھی رہنمائی کر رہے تھے۔ کام چلتا رہا جو کام گیا کانگریس کے زمانے میں چھوٹے پیمانے پر شروع ہوا تھا، وہ بڑھتا ہی گیا۔

جب ۱۹۳۰ء کا ستیہ گرہ شروع ہوا اور گاندھی جی نے شراب بندی اور بدیشی کپڑے کے بائیکاٹ کو خاص کر عورتوں کا کام بتایا۔ اُس سے عورتوں میں جوش کی لہر بڑھ چلی۔ شہروں میں جہاں جہاں دُکانوں پر پہرے کا کام ہوتا۔ عورتیں ہی کرلیتیں۔ دُکان پر اُن کے کھڑے ہوتے ہی کوئی خریدار اُس طرف جھانکنے کی ہمّت نہ کرتا، دکان دار بھی سہم جاتے اور اُن کے ساتھ شریفانہ سلوک کرتے۔ پٹنہ میں اِس قسم کا پہرہ دو چار دن کے لئے کچھ دُکانوں پر بٹھانا پڑتا تھا۔ اِس میں خاص کام کرنے والی شریمتی وندھیہ باسنی دیوی تھیں۔ ایسی عورتیں بھی اِس میں شریک ہوئیں جو کبھی گھر کے باہر نہ نکلی ہوں گی۔ سویرے ہی آٹھ، نو، بجے تک کانگریسی کارکن اُنہیں اپنے اپنے گھروں سے اُنہیں بُلا لاتے اور مقررہ دُکانوں پر بٹھا جاتے۔ پھر وقت ہوجانے پر اُنہیں اُن کے گھروں پر پہنچا بھی دیتے۔ ایک دِن کا ذکر ہے کہ کسی گھر کی نئی دُلہن آگئی۔ والنیٹیر اُسے گھر پہنچا دینا بھول گیا۔ رات ہوگئی۔ اُسے کوئی لے جانے نہیں آیا۔ ایک دوسری کام کرنے والی عورت کے شوہر اپنی بیوی کو اپنے گھر لے جانے کے لئے آئے تو اُنہوں نے اِس لڑکی کو ایک دُکان پر کھڑے دیکھا پوچھنے پر معلوم ہوا کہ اُسے گھر لے جانے کے لئے کوئی نہیں آیا اِس لئے وہ ابھی تک وہاں کھڑی ہے اُنہوں نے اُسے اپنی موٹر پر چڑھالیا اور چاہا کہ اُس کے گھر پہنچادیں۔ مگر وہ اپنا گھر بھی نہیں پہچان سکتی تھی۔ کیونکہ گھر سے باہر وہ کبھی نکلی ہی نہیں تھی۔ شہر کے تقریباً سبھی گھروں کو ایک طرح کا دیکھ کر اپنا ہی بنا دیتی۔ ہمارے یہاں رواج ہے کہ عورتیں اپنے شوہر کا نام نہیں لیتیں۔ اِس لئے وہ اپنے شوہر کا نام بھی نہیں بتا سکتی تھی۔ جس سے اُس کے گھر کا پتہ چلے۔ شاید وہ کبھی رسم الخط میں اپنا نام لکھ لیتی رہی ہو۔ اِس سے زیادہ لکھی پڑھی بھی نہ تھی، موٹر والے صاحب کبھی نہیں جانتے تھے کہ شوہر کا نام اُس سے لکھوا کر گھر

کا پتہ لگا لیں۔ کچھ دیر تک اِدھر اُدھر موٹر دوڑاتے رہے۔ پھر اُس کے شوہر کا نام اُس سے لکھوا کر کسی سے پڑھوایا تب گھر کا پتہ چلا۔ اِس طرح اُسے اُس کے گھر پہنچا دیا۔ یہ واقعہ میں نے اس لئے لکھ دیا ہے کہ قارئین اِس سے اندازہ لگا سکیں کہ اِس زمانے میں عورتوں میں کتنا جوش تھا اور کس طرح بے پڑھی لکھی عورتیں بھی اِس کام میں آگے تھیں۔

بیہہ پور کا ستیہ گرہ

ایک بار الہ آباد گیا ہوا تھا۔ وہاں ورکنگ کمیٹی کی نِشست تھی۔ وہاں سے پٹنہ واپس آیا تو سُنا کہ بھاگل پور ضلع کے بیہہ پور گاؤں میں نئے طریقے کا ستیہ گرہ شروع ہو گیا ہے۔ اِس کی کچھ خبر الہ آباد میں ہی پھیل گئی تھی پٹنہ میں کچھ زیادہ باتیں معلوم ہوئیں۔ تب میں نے فوراً وہاں جانے کا تہیّہ کیا۔ بیہہ پور گنگا کے اُتر میں بھاگل پور سے تھوڑے ہی فاصلہ پر ہے۔ بی، این، ڈبلیو ریلوے کا چھوٹا سا جنکشن ہے، وہاں سے بھاگل پور گھاٹ کو گاڑی جاتی ہے۔ یہاں کا سارا علاقہ برسات میں زیرِ آب ہو جاتا ہے۔ ایسے علاقوں میں جیسا دیکھا جاتا ہے، یہاں کے لوگ بڑے بہادر اور لٹھ باز تھے۔ یہاں کانگریس کے لئے لوگوں میں بہت جوش تھا۔

سنہ ۱۹۲۱ء میں ہی ایک بار میں بہت اصرار سے یہاں بلایا گیا تھا، لوگ مجھے آس پاس کے گاؤں میں بھی لے گئے تھے، بڑے جوش اور محبّت کے ساتھ وہاں کے لوگوں نے میرا اِستقبال کیا۔ وہاں سے کچھ دُور گوری پور گاؤں ہے، جہاں میں گیا تھا۔ واپسی کے وقت بہت زور سے پانی برسنے لگا۔ بیچ میں ایک ندی پار کرنی پڑتی تھی۔ ہاتھی کی سواری تھی۔

ندی پار کرتے کرتے ہم لوگ خوب بھیگ گئے۔ مگر جب بیہہ پور کی جلسہ گاہ پر پہنچے تو دیکھا کہ بڑا اژدہام ہے۔ خوب زوروں سے پانی برس رہا ہے۔ مگر ایک بھی آدمی ہٹتا نہیں ہے۔ مجھے بھی اُسی بارش میں کھڑے ہو کر تقریر کرنی پڑی۔ اِس طرح وہاں کے جوش کا نمونہ میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا۔ وہاں کی کچھ تاریخ بھی میں نے سُن لی تھی۔ اس میں سے ایک بات یہاں لکھ دینی مناسب ہے۔ وہاں ایک انگریز کی زمینداری تھی۔ رعیت سے ایک زمین کی خاطر بہت دنوں سے جھگڑا چلا آتا تھا۔ کچہریوں میں مقدّمے چل رہے تھے۔ گورے صاحب نے زمین کی حفاظت کے لئے کچھ گورکھوں کو نوکر رکھ کر رکھوالی کا کام اُن کے سپرد کیا تھا۔ سنا جاتا ہے کہ ایک رات کو اس عِلاقے کے لوگوں نے سبھی گورکھوں کو جن کی تعداد بیس پچیس تھی، مار کر بڑھی ہوئی ندی میں پھینک دیا۔ پتہ بھی نہ لگا کہ کس نے مارا اور اُن کی لاشیں کہاں گئیں۔

ایسے مقام کے لوگوں میں ستیہ گرہ کے لئے جوش ہونا کوئی تعجّب کی بات نہ تھی۔ مگر خوف یہ تھا کہ وہ غیر متشدد رہ سکیں گے یا نہیں۔ یہ خوف بھی تھا اور تعجّب بھی۔ وہاں ایک نئے طریقے کا ستیہ گرہ گانجے کی دُکان پر شروع ہو گیا۔ ریلوے اسٹیشن کے قریب ہی مغرب کی طرف کچھ زمین ہے جس میں کانگریس کا آشرم بنا ہوا تھا۔ وہاں ایک چھوٹی سی کوٹھری تھی، جس میں کھدر بھنڈار تھا۔ وہاں سوت خرید کر رکھا جاتا تھا اور بیچنے کے لئے روئی اور کپڑے رکھے جاتے تھے۔ دوسری کوٹھریوں میں کانگریس کے کارکن اور والنٹیر رہا کرتے تھے۔ اِن دِنوں یہ مکان جھونپڑے جیسے تھے۔ اب تو وہاں آشرم کی خوب صورت عمارت بن گئی ہے جو ریل کے مسافروں کو گاڑی میں سے ہی نظر آتی ہے۔

اِسٹیشن کے دکھن میں پانچ سات دُکانوں کا ایک چھوٹا سا بازار ہے۔ انہیں میں

سے ایک دکان پر گانجہ بکا کرتا تھا۔ کانگریس کے والنٹیروں نے گانجے کی دکان پر پہرہ بٹھا دیا۔ پولیس نے ایک دن کارکنوں کو آشرم سے مار پیٹ کر نکال دیا۔ آشرم پر بھی قبضہ کر لیا۔ روئی، سوت، کھدر وغیرہ کو اِدھر اُدھر پھینک پھانک دیا۔ جب آس پاس کے لوگوں کو معلوم ہوا کہ پولیس نے اِس طرح آشرم پر قبضہ کر لیا ہے تو اُنہوں نے آشرم میں دخل چاہا۔ اس کے لئے پہلے چار پانچ آدمیوں کا ایک جتھہ ہاتھ میں جھنڈا لئے وہاں گیا۔ ظاہر ہے کہ جہاں پولیس کا جتھہ ہتھیار بند بیٹھا تھا، وہاں چار پانچ آدمی خالی ہاتھ جا کر زبردستی دخل نہیں پا سکتے تھے۔ یہ تو ستیہ گرہ کا ایک ذریعہ تھا۔ پولیس بھی اُسے ویسا ہی سمجھتی تھی۔ وہ اُن لوگوں کو جو جتھہ بنا کر جاتے تھے گرفتار کر لیتی تھی۔ یہ کام روزانہ تیسرے پہر ہوتا۔ کبھی کبھی پولیس جتھے کو گرفتار نہ کر کے اُسے مار پیٹ کر چھوڑ دیتی۔ روزانہ تماشائیوں کا ہجوم بڑھتا گیا۔ وہاں سے دوسرے دن دوپہر کو بیہہ پور پہنچا۔

یہاں پندرہ بیس ہزار کے مجمع کے سامنے ستیہ گرہیوں کا جتھہ نکلا اور سڑک پر ہو کر اُس مقام پر پہنچا جہاں پولیس کھڑی تھی۔ وہ سہولت کے ساتھ گرفتار کر لیا گیا، مار پیٹ نہیں ہوئی۔ ہم لوگوں نے سمجھا کہ اس دِن کا کام ختم ہو گیا۔ اب سب لوگ چلے جائیں گے۔ عوام اب منتشر ہونا ہی چاہتے تھے کہ آشرم کے اندر سے کپتان پولیس کچھ لٹھ بند سپاہیوں کے ساتھ نکلے، اور اُنہوں نے سڑک پر کھڑے مجمع پر لاٹھیاں برسانے کا حکم دے دیا سڑک وہاں اُونچی ہے آشرم اور بازار دونوں ہی نیچی زمین میں ہیں۔ پولیس والے بے تحاشا لاٹھیاں چلاتے اور بھیڑ کو چیرتے، اسٹیشن تک آ گئے۔ نہیں معلوم کتنے آمیوں کو لاٹھیاں لگیں، مگر کوئی کچھ نہ بولا۔ وہاں سے پولیس کپتان کے ساتھ وہ لوگ بازار پہنچ گئے، جہاں میں کھڑا تھا۔ کچھ دور پر ایک دکان کے چھپّر والے سائبان میں سے کپتان پولیس نے چار دن

طرف نظر دوڑائی اور وہاں سے چلّاتے ہوئے کہا "مارو سالوں کو"

پولیس اُسی طرح لوگوں پر بے تحاشا لاٹھیاں چلاتی آگے بڑھی۔ مجھ پر بھی چار، پانچ لاٹھیاں پڑیں۔ ایک نوجوان والنٹیر رام گنی سنگھ نے بیچ میں پڑ کر کچھ لاٹھیوں کے زور کو اپنے اُوپر جھیل لیا۔ اِس لئے اگرچہ مجھے چوٹ لگی مگر اتنی نہیں لگی، جتنی لگ سکتی تھی۔ مجھ سے کچھ دُور پر شری بلدیو سہائے اور شری مرلی منوہر پرشاد تھے۔ اُن کو بھی کچھ چوٹ لگی، کچھ دُور پر پروفیسر عبدالباری بھی تھے۔ اُن کے بہت چوٹ آئی۔ وہ گر گئے۔ اُن کا سارا بدن لہولہان ہوگیا۔

اِس طرح مارتے پیٹتے پولیس کا جتھہ کپتان کے پیچھے پیچھے پھر آشرم میں چلا گیا۔ بھیڑ تو لاٹھی چلنے سے پہلے ہی چھٹ چلی تھی۔ لوگ اِدھر اُدھر چلے گئے۔ ہم لوگ جو بھاگل پور سے آئے تھے وہیں ٹھہرے رہے۔ کیونکہ ہماری گاڑی سات، آٹھ بجے رات کو چھوٹتی تھی مجمع کے منتشر ہونے اور پولیس والوں کے چلے جانے کے بعد، اس بازار کے رہنے والے ایک ڈاکٹر آئے، وہ ہم لوگوں کے زخموں کو دھو کر پٹّی باندھنے لگے۔ ہم لوگ وہیں بازار کے سامنے کھُلے میدان میں گھاس پر پڑے تھے۔ اِسی درمیان کپتان پولیس سپاہیوں اور تھانے دار کے ساتھ پھر اُدھر آتا نظر آیا۔ ہم لوگوں نے سوچا شاید پھر ہم پر لاٹھیوں کا وار ہو۔ مگر ایسا کچھ نہیں ہوا۔ وہ لوگ کچھ دور الگ ہی ٹھہر گئے۔ تھانے دار نے بھاگل پور کے نامی وکیل اور کانگریسی کارکن شری ٹپل بابو کو، جو ہم لوگوں کے ساتھ آئے تھے گرفتار کر لیا۔ وہ لوگ اُن کو لے کر واپس چلے گئے۔ ہم لوگ رات کی گاڑی سے بھاگل پور پہنچے۔ وہاں بڑی سنسنی پھیل گئی۔ میں بھی ایک دو دِن وہاں ٹھہر گیا۔

بھاگل پور بہار بھر میں، بدیشی کپڑے کی آڑھت کا سب سے بڑا مرکز تھا۔ اور تقریباً سب جگہوں میں تاجروں نے بدیشی کپڑے کی گانٹھیں مُہر بند رکھ چھوڑی تھیں مگر

ابھی تک بھاگل پور میں ایسا نہیں ہوا تھا۔ اِس واقعہ کے بعد وہاں بھی عورتوں نے دکانوں پر پہرہ دینا شروع کیا۔ میرے پاس دُکان دار کہنے لگے کہ وہ گانٹھ باندھ کر مُہر لگوا لینے کے لئے تیار ہیں۔ انہوں نے آپس میں کمیٹی بھی بنالی۔ دو چار دن کے اندر وہاں بھی سب بدیشی کپڑے بکری کے بازار سے اُٹھا کر گانٹھوں کے اندر مہر بند کر کے، رکھ دیئے گئے۔ بیہہ پور کے واقعات کا فوری نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں یہ کام بغیر محنت کے ہی ہوگیا۔

ہم لوگوں کے ساتھ اسمبلی کے دو ممبر۔ شری اننت پرشاد اور شری کملیشوری سہائے بیہہ پور گئے تھے۔ بھیڑ بھاڑ میں اُن کو بھی دھکّا تو ضرور لگا تھا لیکن عین پولیس کے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے وہ لاٹھیوں کی چوٹ سے بچ گئے تھے۔ مگر سارا کھیل انہوں نے اپنی آنکھوں دیکھا تھا۔ وہ بھی وہاں سے بہت برہم ہو کر واپس ہوئے تھے۔ اِن دونوں کی رائے بھی یہی تھی کہ لاٹھی بالکل بِلا وجہ چلی تھی، کیونکہ لاٹھی چلنے کے پہلے ہی مجمع منتشر ہونا شروع ہوگیا تھا۔ دو چار منٹ کے اندر ہی لوگ اِدھر اُدھر چلے گئے ہوتے اور ہم لوگوں پر جو وار کیا گیا اُس کی تو کوئی خاص وجہ تھی ہی نہیں۔ اِس لئے اُنہوں نے اپنے اِستعفے بھیج دئے تھے۔

سب سے حیرت انگیز ایک دوسری بات ہوئی۔ پولیس والوں میں دو پارٹیاں ہوگئیں۔ کچھ تو ایسے تھے، جو کپتان کے حکم کو ٹھیک مانتے اور خوب لاٹھیاں پھٹکارتے تھے۔ مگر کچھ ایسے بھی تھے جو لاٹھی چلانے کو غلط سمجھتے اور ہوشیاری سے چوٹ بچا دیتے تھے۔ ہم لوگوں پر جو لاٹھیاں پڑیں وہ ایک ہی پارٹی کی تھیں، دوسری کی نہیں۔ سپرنٹنڈنٹ (کپتان پولیس) آگے آگے چل رہا تھا۔ اور یہ لوگ اس کے پیچھے چاروں طرف بے دریغ لاٹھیاں چلاتے جاتے تھے۔ جب لاٹھی کی چوٹ سے پروفیسر عبدالباری وہیں کے وہیں

بے ہوش ہو کر گر گئے۔ تب بھی ایک سپاہی نے اُن پر پھر لاٹھی اُٹھائی۔ وہ بے ہوش پڑے ہوئے باری صاحب پر پھر لاٹھی مارنا ہی چاہتا تھا کہ ایک دوسرے سپاہی نے اُس کی لاٹھی کو اپنی لاٹھی پر روک لیا۔ ایک تیسرے سپاہی نے تو باری صاحب کو لاٹھی مارنے والے اُس سپاہی کو ہی لاٹھی مار دی۔ دونوں پارٹیاں اِس طرح آپس میں لڑتے جھگڑتے آگے نکل گئیں اور عبدالباری صاحب اس بھاری چوٹ سے بچ گئے۔ یہ بات خود اُنھوں نے ہم لوگوں سے کہی۔

ایک اور عجیب واقعہ ہوا۔ پولیس انسپکٹر چھپرا ضلع کے رہنے والے تھے وہ میرے اِسکول کے ساتھی تھے۔ ہم دونوں چار برس تک ایک ساتھ پڑھے تھے۔ ایک ساتھ ہی اِنٹرنس بھی پاس کیا تھا۔ اس کے بعد میں کلکتہ پڑھنے چلا گیا، وہ پولیس کی نوکری میں چلے گئے۔ تب سے ہم دونوں کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ مگر میں یہ نہ جانتا تھا کہ وہ پولیس میں ملازم ہیں۔ اب وہ کچھ بوڑھے بھی ہو گئے تھے۔ اُن کے بال تقریباً سفید ہو گئے تھے، جب اُس دِن ہم لوگ گھاس پر پڑے تھے، وہ دوسری بار کپتان پولیس کے ساتھ ٹپل بابو کو گرفتار کرنے آئے۔ اُنھوں نے آہستہ سے مجھے پرنام (سلام) کیا۔ میں نے اُنھیں پہچانا نہیں۔ مگر اُنھوں نے مجھے پہچان لیا تھا۔ بعد میں دریافت کرنے پر اُن کا نام معلوم کیا۔ میں نے کھدّر بھنڈار کے ایک کارکُن رام بلاس شرما کو بیہہ پور بھیجا کہ وہاں کے پولیس افسر سے کہہ کر کھدّر سوت، چرخے وغیرہ جو اِدھر اُدھر پھینکے گئے تھے، اُنھیں جمع کر کے لائیں اور بھاگل پور کے بھنڈار میں جمع کرا دیں۔ رام بلاس بہت باتونی اور شوخ مزاج کے ہیں۔ اُنھوں نے سُن لیا تھا کہ تھانے دار میرے ساتھی ہیں۔ وہاں پہنچ کر اُنھوں نے دیکھا کہ وہی حضرت وہاں کے اِنچارج ہیں۔ اُن سے وہ جا کر مِلے۔ کچھ باتیں کرنے پر پتہ

لگ گیا کہ انسپکٹر صاحب اُس دِن کے واقعہ سے کچھ شرمندہ سے ہیں۔ اِس پر شرماتے میرا حوالہ دے کر اُن سے کہا کہ میں اُن کا ساتھی ہوں اور اُس دن آپ کے سلام کرنے پر بھی اُنہیں ٹھیک سے نہ پہچان کا مجھے بہت افسوس ہے۔ وہ جیسے اُن سے باتیں کرتے جا رہے تھے، اُن کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔ اُنہوں نے شرما سے کہا کہ اِن سب باتوں کا چرچا نہ کیجئے۔ اِتنا کہہ کر اُنہوں نے دوسری طرف منہ پھیر لیا۔ رام بلاس نے موقع دیکھ کر اور باتیں چھیڑ دیں۔ پھر میرا ذکر کرتے ہوئے کہنا شروع کر دیا کہ مجھے اِس بات کا بہت افسوس رہا کہ اِتنے دنوں کے بعد سامنا ہوا تو پُرانے ساتھی سے کچھ باتیں بھی نہ ہو سکیں۔ اِس پر اُنہوں نے رام بلاس کو آگے باتیں کرنے سے روکا۔ رام بلاس نے دیکھا کہ اُن کی آنکھیں ڈبڈبا گئی تھیں۔

میں جانتا ہوں کہ اِس طرح کے واقعات بے شمار جگہوں پر ہوئے۔ ایک دوسرے پولیس افسر کا بھی یہی حال ہوا۔ اُنہوں نے رات کو مجھ سے ملاقات۔ آنسو بہاتے ہوئے میرے پاؤں پکڑ لئے اور کہا کہ اِسی ضلع میں اُن کے رہتے رہتے ایسا واقعہ ہوا کہ میں لاٹھی سے پیٹا گیا اور وہ کچھ بھی کر سکے۔ یہاں پر یہ بھی لکھ دُوں کہ ۱۹۳۳ء کی جنوری میں جب دوبارہ ستیہ گرہ کے وقت میں پٹنہ جیل سے ہزاری باغ جیل میں پہنچایا گیا تو ہزاری باغ روڈ اسٹیشن سے ہزاری باغ تک جو پولیس انسپکٹر مجھے پہنچانے گئے تھے وہ یہی انسپکٹر تھے۔ مگر وہ رات کا وقت تھا۔ جاڑوں کے کپڑوں میں وہ بھی خوب چھُپے تھے اور میں تو تھا ہی۔ لاری کی اگلی سیٹ پر وہ بغیر کچھ بولے بیٹھ گئے۔ ہم لوگ پیچھے بیٹھے تھے اور خوب سویرے ہی جیل کے دروازے پر پہنچ گئے۔ ہم لوگوں کے اُترتے اُترتے ہی وہ ہٹ گئے۔ راستہ میں کہیں وہ ایک لفظ بھی نہیں بولے تھے کہ جس سے میں پہچان سکوں۔ جیل کے پھاٹک پر بھی دیکھا نہیں۔ بعد میں جیلر نے ہم سے اُن کا نام بتایا۔ یہ بھی بتایا کہ راستہ بھر وہ کس طرح اپنی جان بچاتے آئے ہیں

جیلر بھی چھپرا کے رہنے والے تھے۔ لوگوں کے ایک دوسرے ساتھی چھوٹے بھائی تھے۔ اِس لئے ہم اُنہیں لڑکپن سے ہی جانتے تھے۔

بیہہ پور میں لاٹھی چارج کے بھی جتھہ ویسے ہر روز جاتا رہا۔ وہ گرفتار ہوتا یا پٹتا جاتا۔ جب تک گاندھی اِروِن سمجھوتہ نہ ہوا اور کانگریس نے ستیہ گرہ بند نہ کیا۔ یہ عمل برابر جاری رہا۔ بعد کے جتھہ والے بے رحمی سے پیٹے جانے لگے۔ ایک والنٹیر تو بہت ہی پٹا تھا آخر میں سائیکل کا پمپ اُس کے کان میں لگا کر اس طرح ہوا بھر دی کہ اُس کے کان کی جھلی پھٹ گئی۔ ۱۹۳۲ء میں جب ستیہ گرہ پھر شروع ہوئی تو سرکار نے بیہہ پور کے آشرم کو ضبط نہیں کیا۔ اگرچہ سمجھوتے کے زمانے میں بہت کوشش کرنے پر بھی وہ اُسے چھوڑنے پر رضامند نہیں ہوئی تھی۔ زمین کے مالک نے آشرم کی سرزمین کانگریس کو لکھ دی تھی، ہم لوگوں کو اسی پر پورا حق تھا۔ مگر سرکاری کارکنوں نے کسی دوسرے آدمی کو کھڑا کر کے زمین لکھوا دینے کی کوشش کی تھی۔ جب ہم نے نالش کرنے کی دھمکی دی۔ تب وہ آشرم ہمیں واپس ملا جس زمانے میں پولیس نے آشرم پر قبضہ کیا تھا، ضبطی کا کوئی حکم نہیں نکلا تھا۔ بعد میں بھی کبھی باضابطہ ضبطی نہیں ہوئی تھی۔ تب بھی وہ اُسے چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ کسی سے لکھوا کر اس پر بالکل جھوٹا دعویٰ کر رہے تھے، وہیں ہم کو صاف معلوم ہو گیا کہ سرکاری کارکن اپنے پہلو کی مضبوطی کے لئے چاہے جو کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ اِس کے لئے مجھے اس زمانے کے چیف سکریٹری مسٹر ہیلٹ سے اور بہار کے گورنر سے بھی سمجھوتے کے زمانے میں ملاقات کرنی پڑی تھی۔

میری پہلی گرفتاری

پٹنہ واپس آنے پر مجھے معلوم ہوا کہ اب میری گرفتاری کے لئے سرکار کا حکم ہو گیا ہے۔ میں نے پہلے کی طرح اپنا دورہ جاری رکھا۔ کئی ضلعوں کا دورہ کر آیا مگر وہاں گرفتار نہ کیا گیا۔ بعد ازاں معلوم ہوا کہ میں ایک ضلع کا چکّر لگا کر بہت جلد دوسرے ضلع میں چلا جاتا ہوں۔ اِس لئے ضلع مجسٹریٹ مجھے گرفتار کر کے ایک بلا اپنے سر نہیں لینا چاہتے۔ لہٰذا میں بچتا چلا گیا۔ اِسی درمیان ایک دِن مسٹر وٹھل بھائی پٹیل پٹنہ آئے۔ وہ حال ہی میں مرکزی اسمبلی کے صدر کے عہدے کو چھوڑ چکے تھے۔ اِس لئے لوگوں میں اُن کی عقیدت اور بڑھ گئی تھی۔ پٹنہ میں ایک جلسۂ عام کیا گیا۔ مسٹر حسن امام اُس میں آئے۔ وہیں خبر ملی کہ اُسی دِن سویرے پنڈت موتی لال نہرو گرفتار کر لئے گئے۔ میں نے سمجھ لیا کہ اب میری گرفتاری میں بھی دیر نہیں میں نے چلتے وقت مسٹر حسن امام سے ملاقات کی۔ اُنہوں نے بڑے جوش سے مجھے یقین دلایا اور کہا "بچّو، تمہاری گرفتاری ہو جانے سے کام رُکے گا نہیں"

میں اُسی جلسے کے بعد مسٹر وِٹھل بھائی پٹیل کو وِداع کر کے خود چھپرا ضلع کے دورے پر چلا گیا۔ وہاں بھی تین دنوں کا پروگرام تھا۔ ضلع کے مغربی حِصّے سے شروع کر کے

کرکے تیسرے دن مشرقی حصّہ کا دورہ ختم کرکے پٹنہ پہنچ جانا تھا۔ پہلی رات زیرادئی میں اور دوسری چھپرا میں گذارنی تھی، تیسری رات کو پٹنہ پہنچنا تھا۔ دو دن بیت چلے تھے۔ دوسرے دن شام کا پروگرام پورا کرتے بہت رات ہوگئی، شام کو چھپرا پہنچنا تھا، اور پہنچا آدھی رات کو۔ بہار بینک میں پہنچے پر معلوم ہوا کہ بھائی کہیں گئے ہیں۔ چھپرا میں نہیں ہیں اور پولیس والے تقریباً دس گیارہ بجے تک میرے انتظار میں بینک میں ٹھہرے رہے ہیں۔ میں سمجھ گیا کہ گرفتاری کے لئے تلاش کر رہے ہوں گے۔ میں کھانا کھاکر سوگیا۔ سویرے اُٹھ کر غسل وغیرہ سے فارغ ہوکر قریب ساڑھے آٹھ بجے موٹر پر گڑکھا کے لئے روانہ ہوا۔ وہیں پہلا جلسہ ہونے والا تھا۔ پولیس والوں کو معلوم ہی تھا اس لئے وہ گڑکھا جاکر میرا انتظار کرنے لگے۔ ایک پارٹی اُس راستے پر ٹھہری رہی جدھر سے میں گڑکھا پہنچنے والا تھا۔ میں ابھی چھپرا شہر سے باہر بھی نہیں گیا تھا کہ گڑکھا کی طرف سے ایک موٹر پر واپس آتے پولیس والے مونا محلے میں مل ہی گئے۔ اُنھوں نے اشارہ کرکے میری گاڑی کو رکوایا۔ مجھ سے مخاطب ہوکر کہا کہ "ہم تو آپ کی تلاش میں پہلے دِن سے ہی گھوم رہے ہیں"۔ میں اُن کے ساتھ اُن کی گاڑی پر ہو لیا۔ گھر پہنچ کر ایک آدھ گھنٹے کے اندر ہی تیار ہوکر اُن کی گاڑی میں پھر سوار ہوگیا۔ ابھی تک اس بات کی خبر شہر میں پہنچی بھی نہ تھی کہ میں سیدھے جیل لے جایا گیا۔

جیل کا یہ میرا پہلا تجربہ تھا۔ ایک بار میں چھپرا جیل میں کچھ دوستوں سے مِلنے گیا تھا مگر اس سے زیادہ اُس کے یا کسی اور جیل کے بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ جیل میں اُس زمانے میں تقریباً تین چار سو ستیہ گرہی قیدی تھے۔ اُن کو معلوم ہوگیا کہ میں پھاٹک کے اندر پہنچ گیا ہوں۔ وہ جے کے نعرے لگاتے پھاٹک کے پاس

پہنچ گئے۔ جیلر کچھ گھبرا گئے۔ اُنہوں نے اندر کا پھاٹک نہیں کھولا۔ اِس پر لوگ اور بھی شور کرنے لگے۔ میں نے جیلر سے کہا کہ مجھے اندر لے چلیں۔ سب پُر سکون ہو جائیں گے۔ اُنہوں نے کہا جب تک یہ لوگ پھاٹک کے نزدیک رہیں گے، قاعدہ کی رُو سے پھاٹک نہیں کھولا جا سکتا۔ اس لئے جب یہ لوگ چلے جائیں تبھی وہ مجھے اندر لے جائیں گے۔ میں بستیہ گرہیوں سے کچُھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا، کیونکہ چھوٹے سوراخ سے کہاں تک باتیں ہو سکتی تھیں۔ میں جانتا تھا کہ یہ جوش صرف استقبال کے لئے ہے۔ میرے اندر جاتے ہی اور ملاقات ہوتے ہی سب خاموش ہو جائیں گے مگر جیلر اس بات کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ کچھ دیر کے بعد پھاٹک کھول کر وہ مجھے اندر لے گئے۔ وہ سب لوگ اتنا ہی چاہتے تھے۔ سب میرے ساتھ ہو لئے اور مجھے جہاں رہنا تھا وہاں تک پہنچا کر اپنی جگہ چلے گئے۔ اسی درمیان باہر سے جے جے کی نعروں کی آواز آنے لگی۔ وہاں کی جیل میں ایک دو منزلہ مکان ہے۔ اُس پر بھی کچھ لوگ رہتے تھے۔ اُنہوں نے دیکھا کہ ایک بڑا مجمع جیل کی طرف جے کے نعرے لگاتا آ رہا ہے۔ وہ مجمع باہر سڑک پر تھا۔ جیلر کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔ اُنہوں نے جیل کے وارڈوں کو پھاٹک پر سے بندوق چھوڑنے کا حکم دیا۔ بندوق کی آواز سُن کر ہم لوگوں کو خیال ہوا کہ شائد گولی تو نہیں چل گئی۔ مگر بات ایسی نہیں تھی۔ جیل ایک طرح سے بیچ شہر میں ہے۔ چاروں طرف سڑک ہے۔ لوگوں نے صرف جیل کے اِردگرد جلوس نکال کر اور نعرے لگا کر کام ختم کر دیا۔ مگر جیلر اپنی گھبراہٹ میں خواہ مخواہ بندوق چھڑوانے لگے۔ خیریت تھی کہ خالی فیر کیا جاتا تھا۔ سُنا ہے کہ بعد میں جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو اس کی خبر ملی تو اُنہوں نے جیلر کو ڈانٹا کہ یہ بڑی بھول تھی۔ اگر عوام بندوق چھوٹتے دیکھ کر بگڑ جاتے، تو وہ جھوٹے فیر سے اُسے کیسے روک سکتے۔ خاص کر جب اُنہوں نے پولیس یا مجسٹریٹ کو بھی

خبر نہیں کی تھی۔

میرا پہلا تجربہ عجیب رہا۔ کیونکہ بعد میں جب اوروں کے تجربے سے اپنے تجربے کو ملایا تو معلوم ہوا کہ اوروں کو ایسا تجربہ نہیں ہوا تھا۔ اِس وقت تک چھپرا میں قیدیوں کی درجہ بندی کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ میرے متعلق کوئی خاص حکم بھی نہ تھا۔ اس لیے میں لوہے کے تسلے میں جو کچھ وہاں ملتا وہی کھاتا۔ گھر سے لوگوں نے کھانا بھیجا مگر میں نے منع کر دیا اور اُسے نہیں کھایا۔ جیلر کا کہنا تھا کہ جب تک میں حوالاتی ہوں تب تک گھر کا کھانا کھا سکتا ہوں، مگر پھاٹک پر جا کر کھانا ہوگا۔ میں تو یوں ہی انکار کرتا۔ اِس شرط نے اور بھی مجبور کر دیا۔ دوسرے دن بھائی صاحب چھپرا پہنچے۔ مقدّمے کی پیشی کے وقت جو جیل ہی میں ہوئی، آ کر مِلے۔ جیلر قاعدے کی پابندی میں اتنے سخت تھے کہ میرے گھر سے کچھ آم آئے تو اُنھیں بھی پھاٹک پر آ کر ہی کھانے کے پیغام بھیجا۔ میں نے انکار کر دیا۔ آم بھی واپس کر دینے کو کہہ دیا۔ تب تک آم لانے والا آدمی واپس چلا گیا تھا۔ پھر اُنہوں نے خود آ کر کہا تو میرے سبب پوچھنے پر کہنے لگے کہ جیل میں ایک قیدی دوسرے قیدی کو اپنا کھانا نہیں دے سکتا۔ اِس لیے ہم اُسے باہر کی چیز بھی اندر کھانے کو نہیں دیتے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ اُن کا من گھڑت قاعدہ تھا۔ کسی دوسری جیل میں ایسا نہیں ہوا۔

جن مجسٹریٹ کے سامنے مقدّمہ پیش ہوا اُن کی میری پہلے سے ملاقات تھی۔ میری وکالت کے دِنوں میں وہ میرے مؤکّل رہ چکے تھے۔ اُن کے ذاتی مقدّمے میں میں کام کر چکا تھا۔ اتّفاق کی بات ۱۹۳۳ء میں جب میں پٹنہ میں گرفتار ہوا وہ وہاں کے سب ڈویژنل افسر تھے۔ اس بار بھی اُن کو ہی میری سزا سُنانی پڑی۔ مقدّمے میں کچھ کہنا سُننا تو تھا نہیں۔ کوئی دفعہ لگا کر مجھے چھ مہینے کی قید کی سزا اُنہوں نے دے دی۔

مجھے کچھ بھی معلوم نہ تھا کہ مجھے وہیں رکھیں گے یا کہیں اور لے جائیں گے۔ مگر اِتنا میں جانتا تھا کہ صوبے کے خاص خاص آدمی ہزاری باغ میں رکھے گئے ہیں۔ جیلر نے بھی کچھ نہیں بتایا کہ میں وہیں رہوں گا یا ہزاری باغ جیل بھیجا جاؤں گا۔ اِس طرح پانچ چھ دن گذر گئے۔ ایک روز شام کو کھانا کھا کر میں اپنی بارک کے چھوٹے صحن میں کرتہ پہنے اور ایک انگوچھا ہاتھ میں لئے ٹہل رہا تھا۔ جیلر نے آکر کہا ڈپٹی صاحب پھاٹک پر آئے ہیں اور آپ سے مِلنا چاہتے ہیں۔ اُن دِنوں وہاں کے کپتان پولیس رخصت پر گئے تھے۔ ایک ڈپٹی مجسٹریٹ اُن کی جگہ کام کر رہے تھے۔ میں سمجھا وہی آئے ہوں گے۔ میں گیا، پھاٹک کھُلا۔ جیسے ہی میں اندر داخل ہوا، وہی صاحب دوسری طرف منہ پھیر کر باہر والے دروازے کی طرف چلتے بنے۔ مجھے کچھ تعجّب ہوا۔ وارڈر نے مجھے اندر لے جا کر داخلی دروازہ بند کر کے دوڑ کر باہر کا دروازہ کھولا۔ اُس کے کھلتے ہی دوسرے صاحب اندر آ گئے۔ جو مسٹر خان ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ تھے۔ اُنہوں نے کہا کہ آپ کو فوراً چلنا ہے۔ میں نے کہا کہ سامان اندر ہے جا کر لے آؤں۔ اُنہوں نے کہا کہ اِس کی پرواہ نہ کیجئے، یہ سب آ جائے گا۔ جیل کا ایک قاعدہ یہ بھی تھا کہ لپٹے ہوئے کپڑے اور بستر کے سوا کچھ اندر نہیں جانے دیتے تھے۔ اس لئے تھوڑے کپڑے پھاٹک پر ہی تھے۔ میں نے ٹوپی نکال لی اور اُسے پہن کر ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی موٹر پر بیٹھ گیا۔ اِس کے چاروں طرف پردے لگے ہوئے تھے۔

مجسٹریٹ نے ڈرائیور سے کہا کہ مغرب کی طرف سے لے چلو۔ میرے پوچھنے پر کہ کہاں جانا ہے۔ اُنہوں نے کہا کہ بعد میں بتاؤں گا۔ جس سے چھپرا جنکشن مغرب کی طرف ہے۔ مگر جب اسٹیشن کی طرف موٹر پہنچی تو اُدھر موڑنے کے بدلے اُنہوں نے

سیدھے جانے کو کہا۔ کچھ دیر میں ہم لوگ شہر سے بالکل باہر پہنچ گئے۔ تب اُنہوں نے پردہ گرادیا۔ مجھ سے معافی مانگتے ہوئے کہنے لگے کہ افسوس ہے کہ مجھے اِس طرح کی کارروائی کرنی پڑرہی ہے۔ آپ کو ہزاری باغ جانا ہوگا مگر راستہ نہیں ہے۔ مجھے وہ مانجھی اسٹیشن پر جو چھپرا بنارس لائن میں سرجو کے کنارے ایک چھوٹا سا اسٹیشن ہے بنارس کی گاڑی میں سوار کرائیں گے۔ وہاں سے بنارس کے راستے مغل سرائے جانا ہوگا۔ جہاں سے گرانڈ کارڈ لائن کے ذریعے سون ایسٹ بینک اسٹیشن تک جاکر اُترنا ہوگا۔ پھر وہاں سے موٹر پر ہزاری باغ پہنچنا ہوگا۔ آپ کے لئے ریلوے پولیس کے اسسٹینٹ سپرنٹنڈنٹ اپنا سیلون (ریل گاڑی کا خاص ڈبہ) لے کر آرہے ہیں۔ کوئی تکلیف نہ ہوگی۔

خیر ہم لوگ جلدی ہی مانجھی اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ تھوڑی دیر میں ڈپٹی صاحب بھی میرے سامان کے ساتھ پہنچ گئے۔ گاڑی بھی آگئی۔ میں سیلون میں سوار ہوگیا۔ پولیس کپتان نے مجھ سے اِتنا ہی کہا کہ میں لوگوں کو اپنا تعارف نہ دوں۔ میں نے کہا کہ میں خود تھوڑے ہی کسی کو اپنا تعارف دیتا چلوں گا لیکن اگر کوئی مجھے پہچان ہی لے تو میں کیا کروں گا۔ اِس پر وہ ہنسے اور مزے میں ہم دونوں ساتھ چلے۔ رات کا وقت تھا۔ ہمارا ڈبہ گاڑی کے آخر ڈبے کے پیچھے جوڑا گیا تھا۔ اِس سے وہاں تک کوئی مسافر پہنچتا بھی نہیں تھا۔ کچھ رات رہتے ہی ہم بنارس پہنچ گئے۔ وہاں سے موٹر پر مغل سرائے پہنچے۔ وہ رفرشمنٹ روم میں مجھے کچھ کھلانے کے لئے گئے۔ مگر میں ابھی تیار نہیں تھا۔ کچھ دیر تک وہاں بیٹھا۔ اِتنے میں گاڑی آگئی۔ اِس درمیاں شاید دو چار آدمیوں نے مجھے پہچانا ہوگا۔ کھانے کے لئے اُنہوں نے آم خرید لئے۔ گاڑی چلنے پر میں نے منہ ہاتھ دھوکر غسل وغیرہ سے فارغ ہوکر ناشتہ کرلیا۔ سون ایسٹ بینک اسٹیشن پر گیا ضلع کے پولیس سپرنٹنڈنٹ ملے اُنہوں نے مجھے موٹر

پر سوار کرا کر ایک انسپکٹر کے ساتھ ہزاری باغ کے لئے روانہ کیا۔ وہاں میں ایک بجے دن کے کچھ پہلے پہنچ گیا۔ دوستوں کے ساتھ وہاں رکھا گیا۔ اِس لمبی چوڑی یاترا کی باتیں جب دوستوں نے سنیں تو سب حیرت زدہ ہوئے۔ مسٹر خان نے چھپرا میں ہی پوچھنے پر اِس طرح لے جانے کا سبب بتایا تھا۔ سرکار نہیں چاہتی تھی کہ چھپرا، سون پور، پٹنہ، گیا اسٹیشنوں پر لوگوں کا مجمع اور مظاہرہ ہو۔ اِس لئے یہ راستہ سوچ کر نکالا گیا۔ ساتھ کے انسپکٹر نے بھی کہا کہ راستہ میں کہیں بھی موٹر نہ روکنے کا حکم ہے اور اورنگ آباد (گیا) میں جہاں قصبے کے بیچ ہو کر سڑک جاتی ہے، وہاں موٹر کو تیز لے جانے کا حکم ہے۔ ایسا اُنہوں نے کیا بھی۔

'چھپرا جیل سے میرے نکل آنے پر جب جیلر میرا سامان لانے اندر گئے تو لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ میں وہاں سے ہٹا دیا گیا ہوں۔ وہاں کے لوگوں میں بڑا اضطراب پھیلا کچھ لوگوں نے کوٹھے پر سے چلانا شروع کر دیا کہ مجھے کسی نامعلوم جگہ پر لے جایا گیا ہے۔ شہر کے کسی آدمی نے دوڑ کر بہار بینک میں پہنچ، بھائی کو خبر دے دی۔ وہ اپنی موٹر پر فوراً چھپرا اسٹیشن پہنچے۔ وہاں اُنہیں معلوم ہوا کہ میں کسی گاڑی میں سوار نہیں کرایا گیا ہوں۔ وہ سمجھے کہ شاید کسی آگے کے اِسٹیشن پر سوار کرائیں گے۔ مگر اُنہیں یہ کیا پتہ کہ سون پور کی طرف نہ جا کر مجھے بنارس کی طرف لے گئے ہیں۔ وہ سون پور تک موٹر پر پہنچے۔ جب وہاں بھی مجھے نہ پایا تو مایوس ہو کر پھر چھپرا واپس گئے۔ بعد میں جب معلوم ہوا کہ میں ہزاری باغ جیل پہنچ گیا تو وہاں آ کر مجھ سے ملے۔

ہزاری باغ جیل میں

ہزاری باغ جیل کے جیلر بابو نارائن پرشاد مجھے پہلے سے جانتے تھے۔ اُن کے ایک بڑے بھائی میرے اِسکول کے ساتھی تھے۔ جن سے میری دوستی تھی۔ میں کبھی کبھی اُن کے گھر جایا کرتا تھا۔ یہ بڑے صالح کار اور سمجھ دار جیلر تھے۔ اُنہوں نے مجھے وہی جگہ دی جہاں رام دیال بابو، شری بابو، بپن بابو وغیرہ رہتے تھے۔ جیل میں میرا وقت کچھ پڑھنے میں گذرتا تھا، کچھ سوت کاتنے میں۔ بعد میں جیل سپرنٹنڈنٹ میجر ائینگر سے کہہ کر میں اُس کارخانے میں، جہاں کپڑے اور نواڑ کی بُنائی ہوئی تھی، کام کرنے لگا۔ اِن پانچ چھ مہینوں میں میں نے تقریباً دو سو گز نواڑ اور چودہ پندرہ گز کپڑا بھی بُن لیا۔ مگر وہ کپڑا چرخے کے سوت کا نہیں تھا، جیل کا ہی تھا۔ اِس لئے اُسے وہیں چھوڑ دیا۔ ہاں نواڑ کو چلتے وقت دام دے کر خرید لیا تھا۔ میں جولائی کے پہلے ہفتہ میں گرفتار ہوا تھا اور دسمبر کے آخر تک رہ کر رہا ہوا وقت گذرتے دیر نہ لگی۔

اِس درمیان بابو دیپ نارائن سنگھ بھی وہاں پہنچ گئے۔ وہ بھی ہمارے ساتھ ہی اُسی کمرے میں رہے۔ جنوبی افریقہ والے سوامی بھوانی دیال بھی اسی کمرے میں رہتے

تھے۔ دوسرے وارڈ میں جو دوست رہتے تھے وہ بھی جیلر سے اجازت لے کر وقتاً فوقتاً ہم لوگوں سے ملتے رہتے تھے یا ہمیں اُن کے وارڈ میں جاکر اسی طرح مل لیتے تھے کسی بات کی تکلیف نہیں تھی۔ کتابیں ملنے میں کچھ رکاوٹ تھی۔ کوئی کتاب پولیس یا مجسٹریٹ کے پاس لئے بغیر ہم لوگوں کو نہیں تھی۔ پاس کرنے والے حضرت کچھ بہت پڑھے لکھے معلوم نہیں ہوتے تھے جس کتاب کے نام میں کسی طرح پولٹیکس یا پولٹیکل لفظ آجاتا، اُسے وہ ہرگز پاس نہیں کرتے، جس میں یہ لفظ نہ آئیں اُس کتاب کو وہ پاس کرادیتے چاہے وہ اُن کے نقطۂ نظر سے کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو۔ مثال کے طور پر وہاں کا ایک لطیفہ ملاحظہ کیجیے۔ کسی نے اکنامکس (معاشیات) کی ایک کورس کی کتاب منگائی جو کالجوں میں پڑھائی جاتی تھی۔ اُس کا نام ٹکسٹ بک آف پولٹیکل اکانومی (Test Book of Political Economy) اُسے اُنھوں نے نامنظور کردیا۔ کیونکہ نام میں لفظ پولٹیکل تھا مگر اے، بی، سی آف کمیونزم اور تھیوری آف لیبزر کلاس کے پاس کرنے میں اُنہیں تامل نہ ہوا۔ پہلی کتاب کو نہ معلوم کیا سمجھ کر پاس کیا مگر دوسری کتاب کے متعلق ہم لوگوں کا قیاس تھا کہ اُنھوں نے سمجھا ہوگا کہ اس میں ایسے لوگوں کے دل بہلانے کی باتیں ہوں گی جن کے پاس بہت فالتو وقت رہتا ہے۔

میں نے جیل میں سوچا کہ گاندھی جی کے مضامین زیادہ تر اُن کے ہفتہ وار ینگ انڈیا کی فائلوں میں ہی پڑے ہیں۔ اگرچہ مدراس کے ناشر مسٹر گنیش نے اُن کو جمع کر کے ایک کتاب کی صورت میں شائع کیا تھا اور اس کے لئے میں نے ایک طویل دیباچہ بھی لکھا تھا، تو بھی میرا خیال ہوا کہ اگر ایک ایک مضمونوں کی سبھی تحریروں کو الگ الگ چھاپا جائے اور شروع کے چھوٹے سے دیباچہ میں اِن تحریروں کا مختصر خلاصہ دے دیا جائے، جس سے ناظرین اُس مضمون پر اُن کے خیالات کو تھوڑے لفظوں میں جان لیں

اور تب اُن کا تفصیلی مطالعہ گاندھی جی کے اپنے الفاظ میں یک جا کریں - یہ اچھا ہوگا۔ اِس لئے میں نے اُن مضامین کو کئی عنوانات میں تقسیم کیا۔ جیسے اہنسا (عدم تشدد) سوراج ستیہ گرہ، تعلیم، کھدّر وغیرہ - پھر ہر ایک مضمون پر خلاصہ لکھا جو اُن کے خیالوں کا نچوڑ تھا۔ تحریروں کو چُن لیا۔ کچھ دوستوں نے الگ الگ اُن کی نقل بھی تیار کر دی۔ میرا دیباچہ بھی مکمل ہوگیا۔ میں اسی زمانے میں رہا ہوگیا۔

باہر جانے پر وقت نہ ملا کہ اُسے ایک بار دیکھ کر چھپوا لوں - گاندھی جی سے ملاقات ہونے پر اُن سے پوچھا کہ کیا وہ اُسے پسند کریں گے۔ اُنہوں نے اپنی منظوری دے دی یہ بھی کہا کہ کچھ دن پہلے کسی نے گجراتی میں ایسا ہی مجموعہ شائع بھی کیا ہے۔ کچھ اور دوستوں نے بھی اِسے پسند کیا۔ خاص کر پُرولیا کے شری نبارن چندر داس گپت نے اُسے بہت پسند کیا تھا۔ اُنھوں نے دیباچہ میں کچھ اِصلاح بھی تجویز کی تھی جسے میں نے تسلیم بھی کر لیا۔ ۱۹۳۱ء میں یہ مجموعہ پریس میں نہ جا سکا۔ جب ۱۹۳۲ء میں پھر ہم لوگ گرفتار ہوگئے تو صداقت آشرم بھی ضبط ہوگیا۔ بس پھر یہ مسودہ مجھے نہیں مِلا - نہ معلوم کیا ہوا۔ کس طرح غائب ہوگیا۔

جیل کے اندر چرخہ چلانے اور صنعت و حرفت کے ماسِوا مذہبی کتابوں کا مُطالعہ بھی ہوا کرتا تھا۔ چھپرا میں پنڈت بھرت مشر بھی ساتھ تھے۔ اُن سے بالمیکی رامائن کی کتھا اور پنڈت وشنودت شکل سے درگا سپت شتی کی کتھا سُنی - میں خود پہلے پہل خاص خاص اپنشدوں کو شروع سے آخر تک پڑھ گیا۔ ہزاری باغ جیل میں صوبے کے تقریباً سبھی ضلعوں کے خاص خاص کانگریسی لوگ بھیجے گئے تھے۔ میں برابر صوبے میں دورہ کیا کرتا تھا۔ زیادہ تر کانگریسی کارکنوں کو جانتا تھا۔ مگر جیل میں جِتنے دِنوں تک ایک ساتھ رہنے کا موقع ملا، اِتنا باہر نہیں مِلا تھا۔ وہیں سوامی بھوانی دیال کے

ساتھ بہت دنوں تک رہ کر ایک دوسرے کی جان پہچان کا موقع ملا۔ وہ یاد ہمیشہ ایک لطیف یاد رہے گی۔ مظفر پور ضلع کے ٹھاکر نواب سنگھ ایک پرانے خیال کے بزرگ تھے بلکہ یوں کہیں تو بہتر ہوگا کہ انگریزی تعلیم سے نابلد تھے۔ گاندھی جی کی تحریکِ ترکِ موالات نے گاؤں میں بہتوں کو متاثر کیا تھا۔ بہار کے، خاص کر گاؤں کے، لوگوں پر ہی زیادہ اثر پڑا تھا۔ اِس کے خلاف پاس کے ہی صوبہ اُتر پردیش میں زیادہ اثر شہروں پر پڑا تھا۔ چمپارن میں گاندھی کے کام سے دیہات کے لوگ واقف ہو گئے تھے۔ اِس لئے کسانوں میں جو زیادہ تر گاؤں میں ہی رہتے تھے اُن کا بہت اثر تھا۔ اِسی اثر میں ٹھاکر نواب سنگھ شروع میں ہی اس تحریک میں شریک ہو گئے تھے۔ آئے بھی تو اکیلے نہیں۔ اُن کے لڑکے، بھتیجے، پوتے سب کے سب ساتھ آئے۔ سیتامڑھی سب ڈویژن میں جو کچھ ہوتا ہو، جو کچھ کرنا ٹھاکر نواب سنگھ پر اُس کا بار پڑتا۔ وہی رہنمائی کرتے۔ جدید تعلیم نہ پاکر بھی وہ اتنے سمجھ دار تھے کہ سب باتوں کو جلد سمجھ لیتے۔ کانگریس کی ہدایت کو پورا کرنے میں حتی المقدور خوب کوشش کرے۔ وہ بھی اپنے لڑکے کے ساتھ اِسی جیل میں تھے۔ اُن کو بھی زیادہ جاننے کا مبارک موقعہ مجھے وہیں ملا۔ اُنہوں نے اپنی زندگی کے آخر تک اپنے خیالات مضبوط رکھے۔ ۱۹۴۲ء کے اگست میں گاندھی جی اور دوسروں کی گرفتاری کے بعد جو ہل چل شروع ہوئی، اِس میں بھی وہ اِسی حوصلے، بے خوفی اور اور کامل اعتقاد کے شریک ہوئے جس کے ساتھ وہ شروع میں تحریک میں آئے تھے۔ سیتامڑھی نیپال کے قریب ہے۔ وہ پولیس کی دھاندلی سے بچ کر کام کرنے کے لئے نیپال کی ترائی میں چلے گئے۔ وہیں سے کانگریس کا کام کرتے رہے، وہیں بیمار پڑے اور ہم نے جیل میں سُنا کہ اُن کا اِنتقال ہو گیا۔

سوامی سہجانند بھی جیل میں تھے۔ بہتیرے لوگ اُن سے گیتا پڑھتے تھے۔ میری

بھی خواہش تھی مگر وقت کی تنگی سے وہ پوری نہیں ہوئی ۔ مگر سب سے زیادہ ربط ضبط بنارن چندر داس گپت سے بڑھ گیا۔ وہ ایک درویشانہ فطرت کے اِنسان تھے۔ اُنھوں نے گاندھی جی کے ترکِ موالات کی تحریک کو صرف ایک سیاسی تحریک نہ مان کر مذہبی فروغ کا ایک ذریعہ بھی مانا تھا۔ اُن کے ساتھ ہم لوگوں نے پاتن جلی کے لوک سوتر کا مطالعہ کیا۔ وہیں اُن کی علمیت اور عمیق مُطالعے کا پتہ چلا ۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ اُنھوں نے کس طرح اپنی زندگی کو شاستر کے اُن قاعدوں کے مطابق ڈھالنے کا جتن کیا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد تپِ دِق میں مبتلا ہو کر اُنھوں نے ایک ایسا مقام خالی کیا جو ابھی تک پُر نہیں ہوا ہے۔

جیل میں کچھ باتوں میں آپس میں لطیف مقابلے بھی رہے ۔ کچھ لوگوں نے "بندی" یا "قیدی" نام کا ایک ماہانہ اخبار بھی نکالا جو ہاتھ سے لکھا جاتا تھا۔ دوسروں نے "کاراگار" نام کا دوسرا ماہنامہ نکالا۔ جس میں لکھا تھا کہ قیدی یا بندی تو آتے جاتے رہتے ہیں ، بدلتے رہتے ہیں مگر جیل خانہ تو مستقل طور پر چلتا ہی رہتا ہے ۔ اِن اخباروں میں قومی تحریک کے متعلّق تحریریں لکھی جاتی تھیں ۔ ایک خاص نمبر میں سبھی ضلعوں کے خاص کارکنوں سے اپنے اپنے ضلع میں تحریک کی رفتار پر مضامین لکھائے گئے۔ میرا خیال ہے کہ اِس سے بہت کچھ ایسا مواد ملتا جس سے تحریک کی تاریخ لکھی جا سکتی ۔ یاد نہیں وہ خاص نمبر کہاں ہے ۔ اِن اخبارات کے خاص ممبر منتظموں، مضمون نگاروں میں سوامی بھوانی دیال گنگیا کے بابو متھرا پرشاد سنگھ، شری رام برکش بینی پوری اور باحوصلہ نوجوان مہامایا پرشاد تھے، ایک دو نمبروں میں کچھ تصویریں بھی تھیں جن کے بنانے اور بنوانے کا سہرا گدھور کے گمار کالکا پرشاد سنگھ کے سر تھا۔

اس جیل یاترا میں ہم کو جیل کی باتوں کا خاص علم یا تجربہ نہیں ہوا۔ کیونکہ ایک تو

اپنے ہی لوگ اتنے تھے کہ دوسروں کی طرف توجہ زیادہ گئی ہی نہیں۔ دوسرے معمولی قیدیوں سے ملنے کا بہت موقعہ بھی نہ ملا۔ ہم لوگوں کو کام کرنے کے لئے جو قیدی ملتے یا جب میں کارخانے میں نواڑ یا کپڑا بُننے جایا کرتا تو وہاں جو قیدی کام کرتے تھے بس اُن سے ہی ملاقات ہوتی تھی۔ دوسروں سے نہیں۔ مگر اِن میں بھی جو ملے اُن میں بہت سے اچھّے بھی معلوم ہوئے۔ کسی نہ کسی سبب سے وہ جیل چلے آئے تھے۔ مگر اُن میں معمولی طور پر کوئی ایسی بات نہیں نظر آتی تھی جس کے لئے اُنہیں طویل سزا ملنا مناسب معلوم ہو۔ اس بارے میں بعد از آں تجربے ہوئے جس کا ذکر کسی اور جگہ کیا جائے گا۔

ہم لوگوں کو شروع میں کوئی اخبار نہیں ملتا تھا۔ جس کی ضرورت سبھی بہت محسوس کرتے تھے مگر جیل ایک ایسی جگہ ہے جہاں انتظام کرنے پر سب کچھ مل سکتا ہے اس خاص انتظام کے لئے لوگوں نے ایک خاص لفظ ڈھونڈ نکالا۔ اِسے "ٹکرٹم" کہتے ہیں۔ کچھ لوگ ٹکرٹم سے کبھی نہ کبھی کوئی اخبار منگا ہی لیتے تھے۔ اُسے پڑھ کر چھپی خبروں کو دوسروں تک پہنچا دیتے تھے۔ کچھ دِنوں کے بعد ایک صاحب سب کی رائے سے کہیں سے اخبار حاصل کر کے پڑھ لیتے اور سب کو خبریں سنا دیتے۔ جب خبریں سُنانے کا وقت آتا سبھی لوگ اشتیاق سے اُن کی راہ دیکھتے، اُن کی یادداشت اور قوت بیان بھی ایسی تھی کہ سب لوگ بہت خوش ہو جاتے۔ حکومت نے کچھ دِنوں کے بعد اخبار دینا منظور کیا۔ مگر جیسا اُن کا سب کام ہوا کرتا ہے۔ دِکھانے کے لئے تو کہا جاتا کہ اخبار دئے جاتے ہیں مگر ہم لوگوں کو ملتا تھا ہفتہ میں ایک ہی بار، ایک اخبار۔ وہ بھی اسٹیٹسمین کا ہفتہ وار ایڈیشن۔ وہ غیر مُلکوں کے لئے شائع ہوتا تھا۔ اُس میں زیادہ تر ایسے خیالات ہوتے تھے، جن کے جاننے کا اشتیاق ہم لوگوں میں شاید ہی کسی میں ہو۔ خبریں اُس میں ایسی ہوتیں جن

ہیں غیر ملکی ناظرین کو ہی زیادہ دلچسپی ہو سکتی تھی اور جو ایک ہفتہ پُرانی بھی ہوتیں۔ ہندوستان میں رہنے والوں کو، خاص کر ستّیہ گرہیوں کو اِن خبروں سے کیا فائدہ۔ چاہے آئین کی شکل ہوں یا دوسری قسم کے اصلاحات کے رُوپ میں۔ برطانوی حکومت، جو سہولتیں دینے کا اِعلان کرتی ہے۔ کہنے کے لئے ایک چیز دی تو گئی۔ مگر جس میں کوئی جان نہیں، اصلی عنصر نہیں۔ اِنہیں چیزوں سے جیل کا وقت کٹتا تھا۔

گول میز کانفرنس:
پنڈت موتی لال کی وفات

اِنہی دِنوں میرے ہزاری باغ پہنچنے کے چند روز بعد ہی لندن میں ہونے والی گول میز کانفرنس کی بات چھڑی۔ سب سے پہلے پنڈت موتی لال جی سے ہوئی، مُلاقات کی بات مسٹر سلوکومب نے شائع کی۔ اِس کے بعد سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکر بیچ بچاؤ کرنے لگے اُن کے ہی بیچ بچاؤ سے پنڈت موتی لال، پنڈت جواہر لال اور ڈاکٹر محمود سے جونیی جیل سے پونہ لے جائے گئے، جہاں مہاتما گاندھی اور ورکنگ کمیٹی کے کچھ دوسرے ممبر تھے، باتیں ہوئیں۔ مگر بات نہ بنی اور معاملہ ٹوٹ گیا۔ میں نے اپنے آدمیوں سے جو ہزاری باغ جیل میں تھے ایک بات دیکھی۔ جب اخباروں میں سمجھوتہ کی کوئی خبر چھپتی تو اُسے بڑے اِشتیاق سے پڑھتے اور سبھی باتوں پر آپس میں بحث کرتے۔ ایسا معلوم ہوتا کہ اُن میں سے بہت سے سمجھوتے کے مشتاق ہیں۔ ہاں کچھ لوگ ضرور ایسے تھے جو اِس بات پر ڈٹے رہتے تھے کہ جب تک سوراج کے متعلق قابلِ اطمینان بات طے نہ ہو جائے سمجھوتہ نہیں

ہونا چاہیئے مگر دوسرے ایسے لوگ بھی تھے جو سمجھتے تھے کہ گول میز کانفرنس میں کچھ نہ کچھ قابلِ اطمینان بات طے ہو جائے گی۔ اس لئے یہاں جھگڑا نہ اُٹھا کر وہاں جانا منظور کر لینا چاہیئے۔ جب سمجھوتہ نہ ہو سکا تو ایسے لوگوں کو یہ بات ضرور ناپسند ہوئی۔

دسمبر میں جیل سے چھوٹ کر میں سیدھے بمبئی گیا۔ کیونکہ اس زمانے میں بمبئی میں ایک طرح پر تحریک کا مرکز تھا۔ وہاں آزاد میدان میں جلسے ہوتے اور لاٹھیوں سے منتشر کر دئے جاتے۔ بہتیرے گھائل ہوتے۔ سب لوگوں کی خدمت اور تیمارداری کا انتظام کانگرس ہسپتال میں تھا۔ وہاں کا روئی بازار بہت دنوں تک بند رہا۔ دوسری طرح سے وہاں کے عوام تحریک میں خوب حصّہ لے رہے تھے۔ وہاں جا کر سب لوگوں سے ملا۔ سردار ولبھ بھائی سے بھی ملاقات ہوئی۔

بہار میں چوکی داری ٹیکس بند کرنے کا پروگرام چل رہا تھا۔ سرکار سختی سے اُسے دبا رہی تھی۔ جس سے دو چار آنے کا بھی بقایا رہتا۔ اُس کا بہت حال برباد کر دیا جاتا۔ جہاں کسی گاؤں کے لوگوں نے ٹیکس دینا بند کر دیا، سارا گاؤں ہی لوٹ لیا جاتا۔ میں نے ایک گاؤں کے متعلق واقفیت حاصل کی جو ہم لوگوں کی ہی زمینداری میں تھا۔ وہاں پولیس نے جا کر ایک آدمی کو گولی سے مار ڈالا تھا اور دوسروں کو خوب پیٹا تھا۔ ایک دوسرے گاؤں میں میں نے خود جا کر دیکھا تھا، وہاں گھر میں گھس کر غلّہ رکھنے کی کوٹھیاں توڑ ڈالی گئی تھیں۔ سبھی برتن چور چور کر دئے گئے تھے۔ یہی نہیں بلکہ چارپائیوں کی بُناوٹ بھی کاٹ دی گئی تھی۔ مکان کے لکڑی کے ستون بھی کاٹ دئے گئے تھے۔ ایک گاؤں کی یہ کیفیت تھی کہ پولیس کے چلے جانے کے بعد وہاں نہ ایک گھڑا تھا نہ ایک رسّی جس سے وہاں کے لوگ کنوئیں سے پانی نکال کر پیاس بجھا سکیں۔ اس طرح کی باتیں بے شمار گاؤں میں ہوئی

تھیں۔ ہماری غیر حاضری میں بہت سے گاؤں میں گولی بھی چلی تھی۔ اِستبداد زوروں پر تھا۔ بعد ازاں جب حکومت نے دیکھا کہ صرف جیل جانے سے لوگ نہیں ڈرتے تو جرمانہ کرنا شروع کر دیا۔ جرمانے کی بڑی بڑی رقموں کی وصولی کے لئے لوگوں پر زیادتیاں کی جاتیں۔ ایک کے بدلے دس کا مال برآمد کیا جاتا۔ ہائی کورٹ میں کسی نے اپیل کر دی تو ایک ایسا فیصلہ ہو گیا کہ ہندوؤں کے مشترکہ خاندان میں ایک آدمی کے قصور کے لئے، سارے خاندان کی مشترکہ جائداد نیلام یا ضبط نہیں کی جا سکتی۔ اِس سے کچھ رُکاوٹ پڑی تو بھی جرمانہ اور چوکی داری ٹیکس نہ دینے کی وجہ سے جو لوٹ مار ہوتی۔ اُس سے لوگوں میں دہشت سی ہوتی نظر آئی پھر بھی تحریک چل ہی رہی تھی، کہیں بھی رُکی نہیں تھی۔

تقریباً اِسی زمانے میں پنڈت موتی لال جی رہا ہو گئے۔ اُن کی صحت بہت بگڑ گئی تھی میں الہ آباد جا کر اُن سے مِلا۔ وہ علاج کے لئے کلکتہ گئے۔ کچھ دنوں تک وہاں ٹھہر کر الہ آباد واپس آ گئے۔ اُنھوں نے تحریک کے چلانے کا بار اپنے اوپر لے لیا تھا۔ اگرچہ وہ بیمار تھے۔ میں اُن کی ہدایت کے مطابق کام کرتا۔ اِس زمانے میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کو سرکار نے غیر قانونی قرار دے رکھا تھا۔ اِسی طرح صوبائی اور بہت سی دوسری کمیٹیاں بھی غیر قانونی ہو گئی تھیں اِس لئے ورکنگ کمیٹی کی باضابطہ نشست غیر قانونی تھی۔ مگر بے ضابطہ طور پر ہم لوگ کر سکتے تھے۔ اُدھر اِنگلستان میں گول میز کانفرنس کا کام تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ کچھ کام آگے نہ بڑھا وزیر اعظم مسٹر میکڈانلڈ نے ایک بیان دے کر اُسے ملتوی کیا۔ اس میں گول مول باتیں تھیں۔ اُن لوگوں کی خواہش معلوم ہوئی کہ کانگریس کو گول میز کانفرنس میں شریک کرنے کی ایک اور کوشش کی جائے۔ وزیر اعظم کی اِس تقریر سے کچھ پہلے ہی پنڈت جی کی رائے سے ورکنگ کمیٹی کے وہ ممبر جو جیل کے باہر تھے الہ آباد بُلائے گئے۔ سب کے پاس خط بھیج

دئے گئے۔ اِس کی اِطلاع اخباروں میں نہیں دی جا سکتی تھی اور دی بھی نہیں گئی۔ لاہور میں پولیس نے ایک ممبر کی تلاشی لی اور اس کے پاس یہ خط مل گیا۔ یہ بات اخباروں میں چھپ گئی اور ہم لوگوں نے پڑھ لیا۔ تب تک مسٹر میکڈانلڈ کی تقریر بھی اخباروں میں آ گئی ہم لوگ سوچ رہے تھے کہ اگر یہ نشست ہوئی تو سب لوگ ایک ساتھ ہی گرفتار کر لئے جائیں گے۔ جیسا پہلے ورکنگ کمیٹی کے ساتھ ہو چکا تھا۔ پنڈت جی نے ہدایت کی کہ اخباروں میں چھپوا دو کہ مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کی تقریر پر غور کرنے کے لئے ورکنگ کمیٹی کی نشست فلاں تاریخ کو الہ آباد میں ہوگی۔ اُدھر مالوی جی بھی خرابیِ صحت کی حالت میں اسی زمانے میں چھوٹے۔ وہ بھی مدعو کئے گئے۔

ورکنگ کمیٹی کے جو ممبر آ سکتے تھے الہ آباد آ گئے۔ ہم لوگ سمجھتے تھے کہ اس غیر قانونی نِشست میں ہم سب گرفتار ہو جائیں گے۔ مگر پنڈت جی کہتے تھے کہ جب ہم مسٹر میکڈانلڈ کی تقریر پر غور کرنے کا اعلان کر چکے ہیں تو گرفتاریاں نہیں ہوں گی۔ یہی ہوا۔ اُس دِن تیسرے پہر سے رات گئے تک بات چیت ہوتی رہی۔ ہم لوگ ایک فیصلے پر پہنچے جس کی رو سے مسٹر ریمزے میکڈانلڈ کے بیان کو ناکافی سمجھا گیا اور اُسے نامنظور کر دیا گیا۔ پنڈت جی خرابی صحت کی حالت میں بھی برابر کام کرتے رہے۔ ہم لوگوں کے ہزار کہنے پر بھی نہ مانے۔ قرار داد تیار ہو گئی۔ پنڈت جی کا خیال ہوا کہ اُسے فوراً اخباروں میں دے دینا چاہئے۔ کیوں کہ ایسا نہ کرنے سے لوگ یہ سمجھ کر ڈھیلے پڑ جائیں گے کہ صلح ہونے جا رہی ہے۔ میں نے کہا کہ اِسے ایک بار اور دیکھ کر سویرے اخباروں میں دیا جائے۔ پنڈت جی نے یہ بات مان لی ورکنگ کمیٹی کی خبر انگلستان پہنچ گئی تھی۔ وہاں سے مسٹر سری نواس شاستری۔ سر تیج بہادر سپرو اور مسٹر جیکر کا تار اسی رات پنڈت جی ملا۔ جس میں لکھا تھا کہ وہ ہندوستان واپس آ رہے ہیں۔ اور جب تک اُن سے ورکنگ کمیٹی کی ملاقات نہ ہو جائے۔ تب تک کوئی آخری

فیصلہ نہ کیا جائے - دوسرے دن سویرے جب میں پنڈت جی سے ملا تو اُنہوں نے وہ تار دکھایا اور کہا کہ اب وہ تجویز اخباروں میں نہ دو - صرف اتنا ہی دے دو کہ ورکنگ کمیٹی تار پہنچنے سے پہلے ہی ایک فیصلہ پر پہنچ گئی تھی مگر تار پا کر اُس کی اشاعت ملتوی کر دی گئی ہے۔ میں اِس زمانے میں الہ آباد میں اکثر سوراج بھون میں ہی ٹھہرا کرتا تھا۔

اِن سب باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ حکومت نے ورکنگ کمیٹی کے سبھی موجودہ اور سابق ممبروں کو چھوڑ دیا۔ جب سے ستیہ گرہ شروع ہوا تھا، ورکنگ کمیٹی کے ایک ممبر کی گرفتاری پر اُس کی جگہ کوئی قائم مقام بنا دیا جاتا تھا - اِس طرح اِبتدائی اور قائم مقام ممبروں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی، سب کے سب چھوڑے گئے - رِہا ہوتے ہی گاندھی جی الہ آباد پہنچ گئے سب لوگ بلائے گئے - وہاں باتیں شروع ہوئیں - پنڈت جی کی صحت روز بروز خراب ہوتی چلی جا رہی تھی - جواہر لال جی اِسی وجہ سے میعاد پوری ہونے سے پہلے ہی چھوڑ دیئے گئے تھے - میں جب سوچتا ہوں کہ بیماری کی حالت میں بھی پنڈت جی کام کرتے رہے تو مجھے ایسا لگتا ہے کہ پنڈت جی کی بیماری معمولی نہ ہونے اور خرابیٔ صحت زیادہ ہونے کے باوجود، اگر اُنہیں اِتنی زیادہ محنت نہ کرنی پڑی ہوتی تو شاید اُن کی بیماری بڑھتی نہیں اور مُلک کو اُن کی فراست اور استقلال سے اور بھی کچھ دنوں تک فائدہ اُٹھانے کا مبارک موقعہ ملتا - اُن کے آخری دنوں میں اُن کے ساتھ رہنے کی میں اپنی خوش قسمتی کو میں بڑی اہمیت دیتا ہوں - اُسی زمانے میں اُن کے صبر و سکون، اِستقلال اور حبِ وطن کا مجھے پورا علم ہوا۔ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی مُلک میں چلتی ہوئی تحریک، اُس کی رفتار اور مُلک کے مستقبل کی بات چھوڑ کر کچھ اور سوچتے ہی نہ تھے - اپنی صحت کی کچھ بھی پرواہ نہ کر کے فلاحِ وطن کی فکر میں لگے رہتے۔

کلکتہ سے کویراج شری شاما داس واچسپتی آئے۔ وہ پنڈت جی کو محنت کرنے سے منع کرتے رہے۔ مگر پنڈت جی کہاں ماننے والے تھے۔ اُن کی حالت خراب ہوگئی۔ پنڈت جواہر لال آچکے تھے۔ وہ اُنہیں لے کر لکھنؤ گئے۔ پنڈت جی اتنے خوش مزاج تھے کہ اُس وقت بھی مذاق سے باز نہ آئے۔ چہرے پر کچھ ورم آگیا تھا۔ جب میں اُن کے الہ آباد سے روانہ ہونے کے وقت سلام کرنے گیا تو ہنستے ہوئے اُنھوں نے حاضرین سے کہا "میرا چہرہ دیکھو میں بیوٹی کمپٹیشن میں (مقابلۂ حُسن) میں کمپٹیشن (مقابلہ) کرنے جا رہا ہوں۔" سب لوگ زبردستی مسکرائے۔ مگر سب کے دِل میں یہ دھڑکا تھا کہ اب شاید اُن کا دیدار میسّر نہ ہوگا۔ ایسا ہی ہوا۔ لکھنؤ جاتے ہی ان کی رحلت ہوگئی۔ میں اُن کو لکھنؤ کے لئے روانہ کر کے پٹنہ پہنچا ہی تھا کہ یہ دِل سوز خبر ملی۔ میں اُلٹے پاؤں الہ آباد گیا۔ مگر میرے پہنچنے سے پہلے ہی اُن کی لاش جلائی جا چکی تھی۔

ایسے وقت میں پنڈت جی کی وفات سے سارے مُلک میں کہرام مچ گیا۔ صدمہ چھا گیا ملک بھر میں نہ جانے کتنے تعزیتی جلسے ہوئے۔ الہ آباد کے تعزیتی جلسۂ عام میں بھی شریک ہوا اور میں نے چند الفاظ کہے۔ مگر مُلک جو نقصان محسوس کر رہا تھا۔ وہ ناقابلِ بیان تھا۔ اُن کی غیر موجودگی اس لئے اور بھی کھلتی اور چبھتی تھی کہ ٹھیک اسی زمانے میں ورکنگ کمیٹی کے لوگ مُلک کی حالت پر سوچ بچار کر رہے تھے۔ حکومت سے کچھ بات چیت چل رہی تھی، یا چلنے والی تھی۔ عین ایسے موقعہ پر پنڈت جی کی دور اندیشی اور سیاسی تدبر سے مُلک محروم ہوگیا۔

گاندھی - اِروِن سمجھوتہ

ولایت واپس آتے ہوئے گول میز کانفرنس کے ممبروں کی ملاقات ورکنگ کمیٹی سے ہوئی۔ وہاں کا سب حال اُنھوں نے بتایا۔ اور سب باتوں کے علاوہ، مہاتما جی اِس بات پر بہت زور دے رہے تھے کہ حکومت کو اس بات پر رضا مند ہونا چاہیے کہ تحریک کو دبانے میں اُن کے کارکنوں نے جو زیادتیاں کی ہیں اُن کے متعلّق ایک غیر جانب دار عدالت جانچ کرے۔ مگر لارڈ اروِن یہ بات سننے کو ہی تیار نہ تھے۔ الہ آباد میں تو ایسا معلوم ہوا کہ بات آگے چلے گی ہی نہیں۔ اور معاملہ جہاں تھا وہیں رہ جائے گا۔ مہاتما جی اپنے نظریے پر ڈٹے رہے۔ وائسرائے سے اُن کی ملاقات کی بات چلی۔ مگر جب تک گاندھی جی اپنی بات پر اٹل رہتے یہ ملاقات ہونے والی ہی نہ تھی۔ آخر گاندھی جی نے ایک روز اپنی طرف سے وائسرائے کو ایک خط لکھا اور اُن سے ملنے کی خواہش ظاہر کرتے ہوئے وقت مانگا۔ اِسی سے ملاقات کا راستہ کھُل گیا۔ دِلّی میں دونوں کی ملاقات ہوگئی ہم لوگ ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی وہاں بلائے گئے۔ میں بھی جاکر ڈاکٹر انصاری کے مکان پر ٹھہرا وہیں دوسرے لوگ بھی ٹھہرے تھے۔ مہاتما جی کی ملاقات لگ بھگ بیس روز تک

روزانہ ہوتی رہی۔ کبھی کبھی تو مہاتما جی دِن دِن بھر وائسرائے کے یہاں رہ جاتے۔ کبھی کبھی بہت رات گذر جانے پر واپس آتے۔ جس دن وہاں رہ جاتے، میراں بہن اُن کا کھانا لے جاتیں۔ وہاں سے واپس آنے پر مہاتما جی ہم سب کو یک جاکر کے وہاں کی بات چیت کا خلاصہ بتا دیتے، اور ہم لوگوں کی رائے لیتے۔ جس دن وہ زیادہ رات بیتے آتے، اور ہم لوگ سو گئے ہوتے تب بھی سب لوگ اُٹھ کر اُسی وقت اُن سے سب باتیں سُن لیتے۔

گجرات کے کسانوں کی بہت سی زمین تحریک کے زمانے میں ضبط کرلی گئی تھی۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل اس پر مُصر تھے کہ وہ سب واپس ہونی چاہیئے۔ اِدھر حکومت بمبئی اِس بات کو مانتی نہ تھی۔ آخر یہ طے ہوا کہ اِس معاملے کی جانچ ہوگی۔ اسی پر بات طے ہوئی نمک کے لئے ستیہ گرہ شروع ہوا تھا۔ مہاتما جی اِس بات پر بہت زور دے رہے تھے کہ اِس بارے میں غریبوں کو کافی سہولت ملنی چاہیئے۔ پنڈت جواہر لال نہرو ساری بات چیت سے غیر مطمئن تھے۔ اُن کو ڈر تھا کہ اِس طرح کے سمجھوتے سے مُلک پیچھے ہٹ جائے گا۔ اوروں کا خیال تھا کہ قابلِ اطمینان سمجھوتہ اگر ہو سکے تو اچھا ہوگا بُرا نہیں۔ مہاتما جی روز صبح ٹہلنے جایا کرتے تھے۔ میں بھی ساتھ جایا کرتا تھا۔ ایک دن میں نے کہا کہ ایسی تدبیر کیجیے کہ سمجھوتہ ہو جائے مگر ہو ایسا کہ ہماری شکست نہ معلوم ہو، فتح ہی نظر آئے۔ مہاتما جی ہنسے اور بولے کہ سمجھوتے سے ہار جیت تھوڑے ہی معلوم ہوگی۔ اگر جیت ہے تو سمجھوتہ چاہے جو بھی ہو جیت ہے، اور سب لوگ ایسا ہی محسوس کریں گے۔ اگر ہار ہوئی ہے تو چاہے اوپر سے ہم کچھ بھی کہیں ہم ہارے ہی ہیں۔ اور لوگ بھی ایسا سمجھیں گے۔ آخر میں جو سمجھوتے کی شرطیں قلم بند کی گئیں اُن پر کئی دنوں تک بہت چھان بین کے ساتھ غور ہوتا رہا۔ مہاتما جی کو اُدھر لارڈ ارون کے ساتھ اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرنا ہوتا، اِدھر ہم لوگوں کے ساتھ بھی۔

لارڈ ارون اور مہاتماجی دونوں بہت ہی برداشت اور صبر کے ساتھ سمجھوتے کے مسودہ کو آخری شکل دے چکے تھے۔ جب ہم لوگوں سے باتیں ہوئیں تو ایک فقرہ اُس میں ایسا تھا کہ مہاتماجی کو اُس میں باطل کی بدبو آنے لگی۔ لارڈ ارون کے ساتھ باتیں کرتے وقت اُن کو اِن لفظوں کے وہ معنی نظر نہ آئے تھے۔ جب ہم لوگوں سے باتیں ہونے لگیں تو ہم سے کسی نے اس فقرے کے نئے معنی لگاکر کچھ بات چلائی۔ سنتے ہی مہاتماجی چوکنے ہو گئے۔ اُنھوں نے غور سے پھر پڑھا اور کہا کہ یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ مطلب ہے تو بات غلط ہے۔ اِس بیچ میں لارڈ ارون نے ولایت سے اسی صورت میں سمجھوتہ کی منظوری مانگ لی۔ جب مہاتماجی نے جاکر یہ بات اُن سے کہی تو لارڈ ارون بھی مشکل میں پڑ گئے۔ مہاتماجی کسی طرح اس شکل میں اِسے منظور نہ کر سکتے تھے کیونکہ اس میں باطل کی بدبو تھی۔ آخر لارڈ ارون نے اس فقرے کو بدل دیا اور مہاتماجی نے اس ترمیم شدہ ہیئت میں اُسے منظور کر لیا۔ بات طے ہو گئی۔ میں تو سمجھوتے سے خوش تھا۔ پنڈت جواہر لال جی کو چھوڑ کر تقریباً سبھی ممبر خوش تھے۔ پنڈت جی بہت دُکھی تھے۔ مہاتماجی نے اُن کو بہت سمجھایا مگر وہ مطمئن نہ ہوئے۔

اب تک ستیہ گرہ ملتوی نہ ہوا تھا۔ سمجھوتہ کی بات چل رہی تھی اور ستیہ گرہ بھی جاری تھا۔ قدرتاً اس بات کی وجہ سے ستیہ گرہ کی رفتار دھیمی پڑ گئی تھی۔ مگر اُس درمیان بھی کئی جگہوں پر گمبھیر واقعے ہوئے۔ مہاتماجی نے وائسرائے کو اُن سے واقف کر دیا۔ وائسرائے نے اُن کے متعلق تحقیقات کرنے کا وعدہ بھی کر لیا۔ سمجھوتہ پر دستخط ہوتے ہی ورکنگ کمیٹی نے سبھی صوبوں کو ہدایت کر دی کہ ستیہ گرہ ملتوی کر دیا جائے۔ حکومت نے بھی کانگریس کمیٹیوں پر سے پابندی اُٹھالی۔

اِنہی دنوں میرے چھوٹے لڑکے دھنّو (دھننجے) کی شادی کی بات چل رہی تھی۔

دِن بھی مقرر ہو گیا تھا۔ بھائی نے وہ دِن یہ سوچ کر مقرر کیا تھا کہ اُس کے پہلے ہی لارڈ اِرون سے ہونے والی بات چیت ختم ہو جائے گی۔ اور میں شادی میں شریک ہو سکوں گا۔ مگر بات بڑھ گئی۔ ایسا معلوم ہونے لگا کہ اُس دِن کچھ طے نہ ہو سکے گا۔ میں نے خبر دے دی کہ اگر گفتگو ختم ہو جائے گی تو میں آ جاؤں گا لیکن اگر ختم نہ ہوئی تو میرے لئے انتظار نہ کر کے مقررہ دن پر شادی کر دی جائے۔ لیکن شادی کے ٹھیک دو دِن پہلے سمجھوتہ پر دستخط ہو گئے۔ میں اُسی دِن زیرادیئی کے لئے روانہ ہو گیا۔ برات کی روانگی سے تقریباً پندرہ گھنٹے پہلے زیرادیئی پہنچ گیا۔ سمجھوتہ کی شرطوں میں ستیہ گرہیوں کی رہائی کی بات بھی تھی۔ اِس لئے میں نے کچھ دوستوں کو جو ہزاری باغ جیل میں تھے۔ مدعو کر لیا تھا مگر کوئی پہنچ نہ سکا۔ اگرچہ میں کسی طرح برات میں شریک ہو گیا۔

میرا خیال ہے کہ لارڈ ارون نے سمجھوتہ سچّے دل سے کیا۔ وہ چاہتے تھے کہ جو باتیں طے ہوئی ہیں اُن پر ٹھیک عمل درآمد ہو اور تکمیل ہو۔ سمجھوتہ کو سِول سروس کے لوگ پسند نہیں کرتے تھے۔ اُن کی ہی رخنہ اندازی کی وجہ سے اُس کے طے ہونے میں دیر لگی تھی۔ لارڈ ارون کے میعادِ عہدہ ختم ہو گئی اور وہ جلد ہی ایک ڈیڑھ مہینے کے بعد ہی چلے جانے والے تھے۔ اُن کی جگہ پر لارڈ ولنگڈن وائسرائے ہو کر آئے۔ وہ بمبئی اور مدراس کے گورنر رہ چکے تھے۔ ہندوستان سے وہ بہت پہلے سے واقف تھے سِول سروس کی چالوں کا بھی اُنہیں پورا علم تھا۔ اُنہوں نے آ کر سِول سروس کا ہی ساتھ دیا۔ اُن کے ہندوستان پہنچتے ہی ہوا کا رُخ بدل گیا۔ کیونکہ سمجھوتہ ہو چکا تھا۔ اِس لئے اُسے وہ کھُلے بندوں توڑنا نہیں چاہتے تھے۔ مگر اس کی شرطیں پورا کرنے میں ہر طرح آنا کانی ہونے لگی۔

ہم یہ مانتے ہیں کہ یہ سمجھوتہ بڑی اہمیت کا تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ یہ پہلا ہی موقع تھا کہ برٹش سرکار ہندوستانی عوام کے کسی نمایندہ جماعت سے بات چیت اور سمجھوتہ کرنے پر تیّار ہوئی تھی۔ دوسری بات یہ تھی کہ نمک کے متعلّق غریبوں کو بہت کچھ سہولت مل گئی۔ تیسری بات یہ تھی کہ کانگریس کو گول میز کانگریس میں جاکر آئین کی تشکیل میں ہاتھ بٹانا تھا۔ آئین میں جو تحفظات کی شرطیں انگریزوں کے تحفظ کے لئے رکھی جانے والی تھیں۔ وہ اب اِس نظر سے دیکھی جانے والی تھیں کہ وہ ہندوستان کے لئے بھی مفید ہیں یا نہیں۔ اور تبھی مانی جانے والی تھیں جب عوام کے لئے مفید ہوں۔ چوتھی بات یہ تھی کہ تمام ہندوستان کے لئے کانگریس نے ایک مرکزی حکومت کو تسلیم کر لیا تھا۔ مگر صوبوں کو اپنا انتظام کرنے کی آزادی ہونے والی تھی۔ اور اِس مرکزی تشکیل میں دیسی ریاستوں کے راجا بھی شریک ہونے والے تھے۔ اِس طرح کئی باتوں کا خاکہ، دُھندلا ہی سہی، سامنے آگیا تھا۔ لہٰذا میں تو اِسی کا حامی تھا اور اس سے مطمئن بھی۔ افسوس یہ رہا کہ برٹش حکومت کی طرف سے یہ بھی پہلے کے بے شمار اعلانوں اور سمجھوتوں کی طرح پورا نہیں کیا گیا۔

کراچی کانفرنس

دِلّی میں سمجھوتہ ہو جانے کے بعد کانگریس کا اجلاس کرانے کی بات پکّی ہو گئی۔ یہ طے ہوا کہ اجلاس کراچی میں ہو گا۔ وقت بہت کم تھا مگر کراچی کے کارکنوں نے انتظام کرنا منظور کر لیا۔ لاہور میں بہت سردی ہونے کی وجہ سے طے ہوا تھا کہ اجلاس دسمبر میں نہ ہو کر فروری یا مارچ میں ہوا کرے گا۔ اسی لئے جو اجلاس معمولی طور پر لاہور کانگریس تک دِسمبر میں ہوا کرتا تھا، اس کا اِس سال مارچ میں ہونا ضابطہ کے مطابق ہی تھا۔ حسنِ اتّفاق سے سمجھوتہ ہو جانے کی وجہ سے جو رکاوٹ راستے میں تھی وہ بھی ہٹ گئی۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل صدر چُنے گئے۔

سازشِ لاہور کے مقدّمے کا ذکر اُوپر آ چکا ہے۔ اُس کی سماعت بہت دِنوں تک چلی۔ اُس کا آخری فیصلہ اب ہوا۔ سردار بھگت سنگھ کو اُن کے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ پھانسی کی سزا ملی۔ دوسروں کو طویل قید یا کالا پانی کی سزا ہوئی۔ بھوک ہڑتال کی وجہ سے شری جتیندر ناتھ داس کی موت سے مُلک میں ہل چل مچ گئی تھی، اب اِس واقعہ سے اور بھی کھلبلی مچی۔ خاص کر نوجوان ہی اِس مقدّمے میں ملزم تھے۔ مقدّمے کی خبریں بہت دنوں تک

اخباروں میں چھپتی رہیں کیونکہ مقدمہ بہت دنوں تک چلتا رہا۔ اِس سے بہت لوگ اِس میں دلچسپی لینے لگ گئے تھے۔ سردار بھگت سنگھ نے بڑی بہادری کے ساتھ مقدمے میں حصّہ لیا تھا جس کا اثر بھی لوگوں پر بہت پڑا تھا۔ اِس لئے پھانسی کی سزا سے سارے ملک میں غم و غصّہ کی لہر دوڑ گئی۔ مہاتما جی نے لارڈ اِروِن سے کہا کہ پھانسی کی سزا کو بدل کر قید یا کالا پانی کی سزا کر دیں لارڈ اِروِن کے جانے کا وقت بھی بہت قریب تھا۔ وہ مہاتما جی کی بات نہ مان سکے۔ اُنہوں نے سمجھوتہ ہی اپنے حالی موالی افسروں کی رائے کے خلاف کیا تھا۔ اب یہ ایک اور کام اُن کی رائے کے خلاف نہ کر سکے۔ معاملہ بہت دنوں تک یوں ہی لٹکتا رہا۔ لوگوں کو اُمید ہونے لگی تھی کہ شاید پھانسی سے وہ بچ جائیں۔

آخر میں لارڈ اِروِن نے گاندھی جی سے اپنی ناچاری ظاہر کی مگر یہ کہا کہ اگر وہ چاہیں تو کانگریس کے بعد تک کے لئے پھانسی ملتوی کر دی جائے۔ غالباً اُن کا مطلب تھا کہ پھانسی سے ناراض ہو کر کانگریس شاید سمجھوتے کو نامنظور کر دے یا کانگریس کے وقت گاندھی جی سے کانگریس میں جانے والے خفا ہو جائیں۔ وہ اسے بچانا چاہتے تھے۔ مگر گاندھی جی نے اِسے منظور نہیں کیا۔ اُنہوں نے کہہ دیا کہ پھانسی سے اُن کو بچا نہیں سکتے تو اچھا یہی ہوگا کہ جو کچھ کرنا ہو کانگریس کے پہلے ہی کر دیا جائے۔ کیونکہ ایسا نہ کرنے سے مُلک اور کانگریس کے ساتھ دھوکا ہوگا ایسا ہی ہوا۔ کانگریس کے اِجلاس کے عین پہلے پھانسی ہو گئی۔ یہ خبر اخباروں میں چھپی کہ لاش کے ساتھ بھی بے عنوانی کی گئی۔ اِس سے لوگوں کو بہت رنج ہوا اور نوجوان طبقہ گاندھی جی سے بھی غیر مطمئن ہو گیا۔ وہ لوگ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ گاندھی جی سے جو کچھ ہو سکا اُنہوں نے کیا اور اگر وہ سردار بھگت سنگھ کو نہ بچا سکے تو اِس میں اُن کا قصور نہیں تھا۔ کراچی کے راستے میں گاندھی جی کے سامنے مخالفانہ مظاہرہ کیا گیا۔ کہیں تو لوگ کپڑے کے کالے پھول اپنا غم و غصّہ

دکھانے کے لئے گاندھی جی کو دینے کے لئے آئے۔ اُنہوں نے اُن لوگوں کو منظور کیا اور ذرا بھی اپنی طرف سے غصّہ یا گھبراہٹ کا اظہار نہیں کیا۔

کراچی کانگریس میں بھی برابر اسی قسم کی سنسنی رہی۔ اس کے یہ معنی نہیں تھے کہ لوگ گاندھی جی کے لئے بدخاطری کا جذبہ رکھتے تھے۔ جب صبح شام کھلے میدان میں وہ پرارتھنا کرتے، وہاں عوام کا بہت بڑا مجمع ہو جاتا۔ اُن کے درشن کے لئے ویسی ہی بھیڑ ہوتی جیسی کہیں بھی ہوا کرتی ہے۔ مگر لوگوں کے دِل کو جو چوٹ پہنچی تھی، اُس کے مظاہرے کے لئے یہ ایک راستہ مل گیا۔ اِس طرح پر لوگ اپنے دردِ دِل کا اظہار کر سکے۔ اِس دردِ دل کا ایک خاص سبب تھا۔ سردار بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھیوں کی بہادری کے لئے تو درد تھا ہی، اُن کے خلاف یہ بھی الزام تھا کہ اُنہوں نے اس انگریز کو مارا تھا جس کے متعلق سمجھا جاتا تھا کہ اِسی نے سائمن کمیشن کے خلاف مظاہرے میں لالہ لاجپت رائے پر لاٹھی چلائی تھی، جس سے آخر اُن کی موت واقع ہوئی کچھ ہو، کراچی کا اِجلاس بڑے معرکے کا ہوا۔

لاہور میں ہی طے ہوا تھا کہ جب کانگریس فروری، مارچ میں ہوگی تو وہ شام کے وقت ہو سکے گی۔ اِس لئے پنڈال پر سائے کی ضرورت نہ ہوگی۔ اِس طرح کھُلے میدان میں آسمان کے نیچے یہ کانگریس کا پہلا اجلاس تھا۔ شام سے شروع ہو کر بہت رات گئے تک اِس کی نشست ہوتی۔ دِن میں سبجکٹس کمیٹی سایہ دار پنڈال میں ہوتی۔ اِس سے پنڈال بنانے کا خرچ بچ گیا۔ مگر اس کے بدلے روشنی کا انتظام کافی کرنا پڑا۔ منظر بہت حسین تھا اور اُس وقت نیا ہونے کی وجہ سے بہت دل کش بھی تھا۔ جوش کا تو کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ ستیہ گرہ کے بعد یہ پہلا اِجلاس تھا۔ لوگ اِس بات کو نہیں بھول سکتے تھے کہ ستیہ گرہ کے نتیجے کے طور پر سرکار کو کانگریس کے ساتھ صُلح کرنی پڑی تھی۔ بہتیرے ایسے لوگ تھے جو ستیہ گرہ میں قید ہوئے تھے اور اِس

صلح نامہ کی وجہ سے وقت سے پہلے ہی رہا ہوئے تھے۔ اگرچہ ابھی بہت سے نہیں بھی چھوڑے گئے تھے اور اُن کی رہائی کے متعلق خط وکتابت ہورہی تھی یا جن کو کسی سبب سے حکومت صلح نامے کی شرطوں کے اندر چھوڑنے کے قابل نہیں سمجھ رہی تھی۔ پھر بھی سمجھوتہ کی وجہ سے رہا ہونے والے ستیہ گرہیوں کی خاصی تعداد وہاں پہنچ گئی تھی۔ مقدمۂ سازشِ لاہور میں ملزموں کو پھانسی اور سزا ہونے کا بھی اثر پڑا تھا ہی۔ اِن سب باتوں کا نتیجہ وہاں کی بحث اور بات چیت میں جھلک جاتا تھا۔

کراچی میں دو خاص تجویزیں پاس ہوئیں۔ ایک سمجھوتہ کے متعلق جس میں سمجھوتہ منظور کیا گیا تھا۔ اس پر بحث کافی ہوئی۔ وقت بھی اس میں کافی لگا۔ دوسری تجویز بہت اہم تھی۔ اِس میں ہندوستان کے سوراج حاصل کرنے کے بعد کا خاکہ بنایا گیا تھا۔ اِس میں ایک طرح سے ہندوستانیوں کے بنیادی حقوق کا، جن میں معاشی آزادی کی بھی کچھ بات آگئی تھی، پہلے پہل کانگریس کے پلیٹ فارم سے اعلان کیا گیا۔ نہرو رپورٹ میں بھی کچھ باتیں اِسی قسم کی تھیں مگر واضح اور مفصّل یہ خاکہ تھا، خاص کر معاشی معاملات کو لے کر، اتنا نہرو رپورٹ میں نہیں تھا۔ اِس تجویز کی ابتدا کا سہرا پنڈت جواہر لال نہرو ہی کے سر ہے۔ مہاتما جی اور سردار ولبھ بھائی پٹیل نے اُن کی ہی رائے مان کر اسے منظور کیا۔ یہ قطعاً نیا مضمون تھا جس پر بہت تبادلۂ خیالات نہیں ہوا تھا۔ یہ سبجکٹس کمیٹی کے سامنے بھی جلدی میں اِجلاس ختم ہوتے وقت ہی پیش ہوا۔ وہاں لوگوں کو اِس بات کی شکایت ہوئی کہ اتنے بڑے فیصلہ پر پہنچنے کے پہلے سوچ بچار کا پورا وقت نہیں دیا گیا اِس لئے قرارداد کو کانگریس نے منظور تو کر لیا۔ مگر اِس کے ساتھ ایک بات جوڑ دی۔ یعنی یہ کہ اِس پر سبھی صوبائی کمیٹیاں اپنی رائے ظاہر کریں اور ایک سب کمیٹی اُن پر غور کر کے آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں موزوں ترمیم پیش کرے اور آل اِنڈیا کانگریس کمیٹی اُسے موزوں ترمیمات

کے ساتھ آخری منظوری دے۔

کراچی کانگریس میں یہ بھی طے ہوا کہ حکومت اگر بلائے گی تو گول میز کانفرنس میں کانگریس کے نمائندے بھی شامل ہوں گے۔ اُس زمانے میں یہ طے نہیں ہوا تھا کہ کتنے نمائندے ہوں گے اور اِس بارے میں حکومت سے ہمارے مطالبے کیا ہوں گے۔ آزادیِ کامل کے متعلق کانگریس کی قرارداد منظور ہو ہی چکی تھی۔ آیندہ کے لئے آئین کیا ہو اِس کی بھی تھوڑی وضاحت سمجھوتہ میں اور کراچی میں تجویزوں کے ذریعے ہو گئی تھی۔ سوچا گیا کہ اور جو کچھ ہو گا اس کے متعلق ورکنگ کمیٹی یا آل انڈیا کانگریس کمیٹی ہدایت دے گی۔ بات چیت چلنے پر ورکنگ کمیٹی میں مہاتما جی کی رائے ہوئی کہ اگر جانا پڑا تو کانگریس اپنا نمائندہ صرف اُنہیں کو بھیجے۔ کیونکہ وہاں ہاتھ گن کر کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ اگر وہ لوگ بات ماننے والے ہوں گے تو ایک آدمی کافی ہو گا۔ اگر نہ ماننے والے ہوں گے تو مجمع کثیر بھی اُن کو مجبور نہ کر سکے گا۔

ترنگے جھنڈے کی قومی شکل

کراچی سے واپسی کے بعد میرا بہت وقت قیدیوں کو رہا کرانے کے متعلق خط و کتابت میں لگا جو اَب تک جیلوں میں بند تھے۔ اس طرح اپنے اپنے صوبہ میں سبھی لوگوں کو لکھا پڑھی کرنی پڑی۔ سمجھوتہ کی شرطوں میں ہم کو تو صرف ستیہ گرہ بند کر دینا تھا۔ اُسے ہم نے ایک اعلان نکال کر اور سبھی ماتحت کمیٹیوں کو ہدایت بھیج کر پورا کر دیا مگر حکومت کو تو سب کچھ کرنا تھا۔ لارڈ اِروِن کو چلے جانے کے بعد اِس میں بہت کچھ آنا کانی ہوئی۔ مہاتما جی اور کانگریس کے صدر سردار ولبھ بھائی پٹیل کل ہند نوعیت کے مسئلوں پر سرکار کے ساتھ خط و کتابت کرتے رہے مہاتما جی کو اس بارے میں سرکاری عہدہ داروں سے بات چیت بھی کرنی پڑی۔ مجھے بھی اپنے صوبے کے چیف سکریٹری مسٹر ہیلیٹ اور صوبائی گورنر سر اسٹفنسن سے ملاقات کرنی پڑی تھی۔ بہت سی باتوں میں کامیابی بھی ہوئی مگر اس میں اتنا وقت لگا اور اتنی جھنجھٹ ہوئی کہ جی اُکتا گیا۔ ہم اب یہ سمجھے کہ جسے ہم واضح اور غیر مبہم سمجھتے تھے اُسے کس طرح غیر واضح اور مبہم کر دیا جائے۔ آج اس کی مثالیں یاد نہیں ہیں۔ مگر اُس زمانے کے اخباروں کو دیکھنے سے یہ بات صاف واضح ہو جائے گی۔ ایک ہی بات حوصلہ افزا تھی کہ پٹنہ کیمپ جیل اور دوسری جیلوں

سے قیدیوں کی ٹولیوں کی ٹولیاں رہا ہو کر آتیں اور ایک رات یا کچھ وقت تک ٹھہر کر کھانا کھا کر نیتاؤں، رہنماؤں کی جے مناتے اپنے اپنے گھروں کو چلی جاتیں۔ گھر جانے کا ریل کا کرایہ وغیرہ تو انہیں حکومت سے ہی مل جاتا تھا مگر کچھ مدد صوبائی فنڈ سے بھی مجھے دینی پڑتی۔ سوراج کے محبّ وطن سپاہیوں کے یہ لہر دل کے اضطراب کو کچھ سکون بخشتی رہی۔

کچھ دنوں کے بعد بمبئی میں ورکنگ کمیٹی کی نشست ہوئی۔ اُس زمانے میں ایک اہم سوال یہ بھی تھا کہ ہندو مسلم مسئلہ پر کانگریس کا کیا رُخ ہو گا۔ کلکتہ کانگریس کے بعد ہی بہتیرے مسلمان کانگریس سے الگ ہو گئے تھے۔ وہ مسلمانوں کی الگ جماعت قائم کر کے اپنے مطالبے پیش کر رہے تھے۔ مسٹر جناح کے چودہ مطالبات مشہور ہو چکے تھے۔ سرکار کے ذریعے کی جانے والی گول میز کانفرنس میں شریک ہونے کے پہلے ہمیں اپنے خیالات تو صاف کر لینے چاہیئے تھے۔ اِس معاملے پر اِس اجلاس میں غور ہوا۔ میں بمبئی پہنچ کر بیمار پڑ گیا۔ اِس لئے اگرچہ میں جس کمرے میں تھا اس کے پاس ہی کمرے میں نشست تھی پھر بھی میں شریک نہ ہو سکا۔ وہاں یہ طے کیا گیا کہ کانگریس مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ ویسا ہی سمجھوتہ کر سکتی ہے جو قومی جذبات کے خلاف نہ ہو۔ ہاں اگر وہ سب فرقے کسی سمجھوتے کو مان لیں تو کانگریس بھی اُسے منظور کرے گی سمجھوتے کے خاص اصولوں کی فہرست بھی مختصراً اِس میں دے دی گئی تھی۔ اسے ورکنگ کمیٹی کے مسلمان ممبروں نے منظور ہی نہیں کیا تھا بلکہ اُن کے ہی زور دینے سے ورکنگ کمیٹی نے اُسے تیار کیا اور مانا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ جب دوسرے لوگوں نے بہت باتیں کہی ہیں تو کانگریس کو بھی اپنا خیال واضح کر دینا چاہیئے۔ تاکہ اہلِ مُلک کو وہ باتیں معلوم ہو جائیں اور کانگریسی نمائندوں کو جہاں موقع ملے وہاں اُنہیں با اختیار طریقے پر کہہ سکیں اور پیش کر سکیں۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک اہم اجلاس ہوا جس میں بنیادی حقوق کے متعلق کراچی

کے ریزولیوشن پر غور کیا گیا۔ سب کمیٹی نے اپنا کام پورا کر لیا تھا۔ سبھی صوبائی کمیٹیوں کی رائے حاصل کر کے اپنی اپنی رپورٹ تیار کی تھی۔ کوئی خاص اہم ترمیم نہیں ہوئی۔ کچھ معمولی باتیں کم و بیش کر کے بنیادی حقوق اِس اجلاس میں منظور ہو گئے۔

اُس زمانے میں ایک اور جھگڑا چل رہا تھا۔ قومی ترنگا جھنڈا ابھی کبھی باضابطہ منظور نہیں ہوا تھا۔ مگر ۱۹۲۱ء سے یہ رائج ہو گیا تھا۔ اِس میں تین رنگ کے کپڑے ہوتے تھے۔ سب سے نیچے لال اس کے اوپر ہرا اور سب کے اوپر سفید۔ بیچ میں چرخے کی تصویر ہوتی گاندھی جی نے اور لوگوں نے تین رنگوں کا مطلب بتا دیا تھا۔ جسے سب لوگوں نے مان لیا تھا۔ لال رنگ ہندوؤں کی علامت تھا۔ اور اُن کی تعداد سب سے زیادہ ہونے کی وجہ سے سب کی بنیاد کی حیثیت سے وہی سب کے نیچے تھا۔ اس کے بعد مسلمانوں کی تعداد ہے۔ اس لئے لال رنگ کے اُوپر اس کا ہرا رنگ آتا تھا۔ سفید رنگ میں اور سبھی لوگ شامل تھے اُن کی تعداد ہندوؤں اور مسلمانوں سے کم ہونے کے سبب سے اسے سب کے اوپر رکھا گیا تھا۔ ہم پُرامن طریقوں سے ہی سوراج حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اسی لئے بیچ میں اِس کا نشان چرخہ دیا گیا تھا۔ اِس سے سکھوں کو بے اطمینانی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ اُن کے لئے ایک الگ رنگ ہونا چاہئے اور جھنڈے میں اِس کو بھی جگہ ملنی چاہئے۔ اِن لوگوں نے بھی قومی تحریک میں کافی حصّہ لیا تھا۔ ایک جیتی جاگتی اقلّیت اُن کی ہے۔ اِدھر ہندو مہاسبھا ان کو بھی ہندو ہی سمجھتی ہے اور تاریخی اعتبار سے بھی وہ ہندو ذات ہی ایک ضمنی ذات ہے۔ پھر بھی وہ اپنے آپ کو الگ کرنا چاہتے تھے۔ اِس معاملہ پر غور کرنے کے لئے ایک سب کمیٹی بنائی گئی۔ اس نے اپنی رپورٹ پیش کی اور جھنڈے کی شکل میں تبدیلی کر دی۔ اُسی کی رپورٹ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے منظور کر لی۔ جھنڈا تو ترنگا ہی تھا مگر اُس کے رنگوں میں اور اُن کے مقامات

میں تبدیلی ہوگئی۔ لال رنگ ہٹادیا گیا۔ اُس کی جگہ درخشاں زعفرانی رنگ رہا۔ سفید کپڑے پر چرخے کی تصویر۔ سب سے اہم بات یہ ہوئی کہ رنگوں میں جو فرقہ وارانہ معنی لگادیئے گئے تھے، وہ ہٹادیئے گئے۔ اب کوئی رنگ کسی خاص ذات کا نشان نہ رہا۔ اِس پر سکھ بھی راضی ہوگئے۔ اُن کا رنگ کیسریا ہے اگرچہ وہ جھنڈے کی خوب صورتی کے لئے کیا گیا تھا پھر بھی اُن کے لئے وہ باعث اطمینان ہوا۔ دیکھنے میں بھی نیا قومی جھنڈا اُس سے زیادہ خوب صورت تھا اس لئے اس تجویز سے مُلک کو صرف ایک نہایت خوب صورت قومی جھنڈا ہی نہیں ملا بلکہ رنگوں کے خاص خاص قوموں کے نشان سے جو ایک جھگڑا کھڑا ہوگیا تھا وہ ختم ہوگیا۔ اور سارے مُلک کے سامنے کانگریس نے باضابطہ اپنی تجویز کے ذریعے جھنڈا قائم کردیا۔

میں اِس برس بہار کے کئی ضلع میں دَورہ پر گیا۔ لوگوں کو تعمیری کام میں لگانے کے خیال سے ہی یہ دَورہ کیا گیا تھا اور اس میں کچھ کامیابی بھی ملی۔ ایک تجربہ بھی یہاں لکھ دینا اچھا معلوم ہوتا ہے۔ جب میں ۱۹۲۱ء میں سنتھال پرگنہ میں گیا تھا تو وہاں اتنا سرکاری تشدّد ہوا تھا کہ مجھے کہیں ٹھہرنے کی جگہ ملنے میں دِقّت ہوتی تھی۔ وہاں کے پاکُر قصبہ کا واقعہ کا ذکر پہلے کر چکا ہوں اِس بار میں ضلع کے اندر دور دور گاؤں تک گیا۔ بڑا استقبال ہوا، بڑی خاطر تواضع ہوئی۔ پاکُر میں رات کے ۸ بجے ریل سے اُترا۔ وہاں اسٹیشن پر لوگوں نے دیوالی منا رکھی تھی۔ چاروں سمت فضا جگمگا رہی تھی۔ بہت دھوم دھام کے ساتھ شہر تک جلوس نکلا۔ وہاں کے بڑے زمینداروں کے یہاں میں ٹھہرایا گیا۔ میں نے اُن کی ہی موٹر پر سارے ضلع کا دورہ کیا۔ اُنھوں نے کہا بھی کہ یہ ۱۹۲۱ء کا کچھ کفارہ ہے۔

گول میز کانفرنس میں گاندھی جی

گول میز کانفرنس کے دِن نزدیک آ گئے مگر ابھی تک سمجھوتے کی سبھی شرطیں پوری نہیں ہوئی تھیں۔ خاص طور پر ایک بات تھی جس پر سردار پٹیل بہت زور دیتے تھے۔ گجرات کے گاؤں میں جو زمین ضبط یا نیلام کر دی گئی تھی اِس کے متعلّق ابھی تک جانچ کا کام شروع نہیں ہوا تھا حکومت کی جانب سے بڑی دشواریاں پیش کی جا رہی تھیں۔ مہاتما جی خط و کتابت کرتے کرتے اُکتا گئے تھے۔ اِنگلستان سے زور دیا جا رہا تھا کہ مہاتما جی کو ضرور وہاں کسی نہ کسی طرح جانا ہی چاہیئے۔ مہاتما جی کو سمجھوتہ کے بارے میں شملہ میں جانا پڑا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اِس بار بھی کانگریس گول میز کانفرنس میں شریک نہ ہو سکے گی۔ آخر سبھی باتیں مان لی گئیں۔ دیر اتنی ہو چکی تھی کہ اگر مہاتما جی اُس ہفتہ کے جہاز سے روانہ نہ ہوتے تو وہاں پہنچنے میں بہت دیر ہو جاتی۔ اِس لئے مہاتما جی کو شملہ سے ہی سیدھے بمبئی جا کر جہاز پکڑنا پڑا۔ جہاز کو بھی اُن کے لئے کچھ دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ خاص انتظام کے ذریعے بڑی مشکل سے وہ شملہ سے بمبئی پہنچائے گئے۔

گجرات میں جانچ شروع ہوئی۔ سردار نے مجھے بُلا بھیجا۔ میں گیا۔ باردولی میں تحقیقات ہو رہی تھی۔ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی عوام کی جانب سے وکالت کر رہے تھے۔ حکومت کی

طرف سے اس ضلع کے سرکاری وکیل تھے میں بھی تحقیقاتی عدالت میں کبھی کبھی جاتا۔ کئی ہفتوں تک تحقیقات جاری رہی۔ آخر میں کچھ سرکاری کاغذ پیش کرنے کی بات آئی جو پیش نہیں کئے گئے اور حاکم نے بھی اُسے مان لیا۔ مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی نے اُسے انصاف کا خاتمہ سمجھا، اور تحقیقات میں حصّہ لینے سے انکار کر دیا۔ اِس کے بعد یک طرفہ سرکار کی جانب سے رپورٹ ہو گئی۔ میں وہاں گیا تھا اِس خیال سے کہ سردار کو اُن کے کام میں کچھ مدد دوں۔ پر اُن کو میری مدد کی ضرورت ہی نہیں پڑی۔ وہاں کے ہی کام کرنے والے کافی رہے۔ ہاں صدر کانگریس کی حیثیت سے اُن کے پاس جو کاغذات آتے، یا سوال کئے جاتے، اُن کے بارے میں بات چیت ہوا کرتی۔ میں تقریباً دو ہفتہ تک رہ کر واپس چلا آیا۔ وہاں رہتے رہتے میں نے بہار کے اخباروں میں کچھ مضمون لکھے تھے جن میں گاندھی جی کی چمپارن یاترا کے متعلق کچھ باتیں تھیں۔

مہاتما جی اِنگلستان پہنچے مگر اُن کے وہاں پہنچتے پہنچتے وہاں کی وزارت بدل گئی۔ اب ویجوڈ بین کی جگہ سر سیموئیل ہور وزیر ہند ہوئے۔ مگر مسٹر میکڈانلڈ اپنی مزدور پارٹی کے زیادہ تر لوگوں سے الگ ہو کر وزیرِ اعظم بنے رہے۔ اگرچہ نام کے لئے یہ سب پارٹیوں کی وزارت تھی۔ مگر حقیقت میں یہ وزارت کنسرویٹو پارٹی (رجعت پسند جماعت) کی ہی تھی۔ اِس لئے وہاں سے جو تھوڑی بہت فراخ دِلی کی اُمید کی جا سکتی تھی، اُس کا راستہ بھی بند ہو گیا۔ گاندھی جی نے کانگریس کا مطالبہ پیش کیا، اُن کی بہت آؤ بھگت اور خاطر داری بھی ہوئی۔ مگر ہندوستان کے لئے کوئی بھی اطمینان بخش آئین نہ بن سکا۔ پنڈت مالوی جی اور مسز سروجنی نائیڈو بھی وہاں مدعو ہو کر گئے تھے۔ کانگریس کی طرف سے صرف مہاتما جی ہی تھے اور اس کی طرف وہی بولتے تھے جیسا برابر ہوتا آیا ہے۔ دوسرے لوگ سرکار کے نامزد

تھے اور چُن چُن کر ایسا بھان متی کا کُنبہ جمع کیا گیا تھا جو کبھی ہم خیال شاید ہو ہی نہیں سکتا تھا
مہاتما جی نے بہت کوشش کی کہ ایک ہی کانگریسی مسلمان سہی مگر بلایا ضرور جائے، مگر
حکومت اِس پر رضامند نہ ہوئی۔ شاید دوسرے مسلمان ممبروں نے اِس کی مخالفت کی تھی
وہاں اِس بات کی بھی کوشش ہوئی کہ آپس کے جھگڑے طے ہو جائیں تو یہ بھی نہ ہو سکا شاید
ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

اتّحاد تو ہوا نہیں۔ اِس کے عوض انگریزوں، مسلمانوں اور ہریجنوں میں ایک طرح کا
سمجھوتہ ہو گیا۔ جب آپس میں باتیں طے نہ ہو سکیں تو مسٹر میکڈانلڈ نے فرقہ وارانہ مسئلہ پر اپنا
فیصلہ دیا جس کے ذریعے مسلمانوں کے تقریباً سبھی مطالبے پورے کر دئے گئے۔ اِس سے
ہندوؤں اور سکھوں میں بڑی بیزاری پیدا ہوئی۔ اِس فیصلہ میں ہریجنوں کے لئے بھی جداگانہ
انتخاب کا اہتمام تھا۔ مہاتما جی نے اِس کی بہت مخالفت کی۔ اُنہوں نے ایک تقریر میں یہاں
تک کہہ دیا کہ اگر ہریجنوں کے حلقہ ہائے انتخاب الگ قائم کئے گئے اور اُن کو اعلیٰ ذات
کہلانے والے ہندوؤں کے انتخاب میں یا اُن ہندوؤں کو ہریجنوں کے انتخاب میں حصہ لینے
کا موقع نہ ملا تو اس طرح کے جداگانہ انتخاب کی وہ سخت مخالفت کریں گے اور اپنی جان تک
کی بازی لگا دیں گے۔ برٹش سرکار کو کچھ کرنا تو تھا ہی نہیں۔ اِس لئے آپس کی پھوٹ کا بہانہ
بنا لیا۔ یہاں کے جو لوگ گئے تھے اِس بات کو سمجھ گئے۔ اُنہوں نے آپس میں مشورہ کر کے
آغا خاں کو اپنا لیڈر بنا کر مشترکہ آئین تیار کر کے پیش کر دیا مگر اُن کی بھی ایک نہ سُنی گئی۔ تب
جیسا انگریز چاہتے تھے ویسا ہی آئین بنانے کا اُنہوں نے آپس میں تہیہ کر لیا۔

یہاں ہندوستان میں بھی حالات روز بروز بدلتے اور بگڑتے جا رہے تھے۔ ہم
سمجھ گئے حکومت کوئی نہ کوئی بہانہ تلاش کر رہی ہے جس کی آڑ میں سمجھوتے کو ختم کر کے وہ

کانگریس سے بدلہ لینا چاہتی ہے۔ سول سروس والوں کی تو ایسی ہی رائے تھی کہ سمجھوتہ ختم ہو۔ لارڈ ولنگڈن کی بھی یہی رائے تھی۔ اِس لئے اب کسی موزوں موقع کا ہی انتظار تھا۔ تقریباً دو برسوں سے سبھی چیزوں کے دام گھٹتے گئے تھے خصوصاً غلّے کے۔ اِس وجہ سے کسانوں کو روپئے ملنے میں بڑی دشواری ہو رہی تھی۔ وہ لگان ادا نہیں کر سکتے تھے۔ کیوں کہ اِتنا پیدا ہی نہیں ہوتا تھا جسے بیچ کر وہ لگان ادا کر سکیں اور اپنے ضروری کام پورے کر سکیں۔ خاص کر اُتر پردیش کی حالت بہت نازک ہو چلی۔ ۱۹۳۰ء کے ستیہ گرہ کے زمانے سے ہی کسانوں کی حالت خراب ہو رہی تھی اور وہاں بہت سے کسان کانگریس سے یہ اُمید رکھتے تھے کہ وہ انہیں امداد دلوانے میں مقتدر ثابت ہو گی۔ کہیں کہیں، خاص کر الہ آباد کے ضلع میں لگان بندی کی تحریک بھی چلی تھی۔ صلح نامے کے بعد اب لگان بندی کو روکنا تھا۔ کیوں کہ ہمیں ہر قسم کی ستیہ گرہ کو روک دینا تھا۔ مگر وہاں صرف سیاسی ہی معاملہ نہ تھا، کسانوں کی مالی حالت اتنی خراب تھی کہ اگر وہ لگان ادا کرنا چاہتے بھی تو کر نہیں سکتے تھے۔ کانگریس ستیہ گرہ تو بند کر دیتی، مگر اُن کی اِس مالی مجبوری کو دُور کر کے اُن سے لگان دلوا دینا اُن کے یا کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اگر وہ لگان ادا کرنے کو نہ کہے تو سمجھا جاتا کہ سمجھوتے کو وہ پورا نہیں کر رہی ہے۔ اِس لئے وہاں ضروری ہو گیا کہ سیاسی اور معاشی حالات کو الگ الگ کر کے لگان بندی کی تحریک کو (جو ستیہ گرہ کا جزو تھی) نہ چلا کر کسانوں کی حالت کے مطابق، اُن کے لئے سہولیات فراہم کرنے کی کوشش کی جائے، کیا تو یہی گیا۔ مگر حکومت اِسے کب ماننے والی تھی۔

اِدھر زمیندار بھی اپنی رقم وصول کئے بغیر مطمئن ہونے والے نہیں تھے حکومت نے لگان میں کچھ معافی دی، مگر وہ اتنی کم تھی کہ اُس سے بہت سہولت نہیں ملی، علاوہ ازیں

کسانوں نے جو تھوڑا بہت ادائگی کا جتن کیا، اور کچھ دیا۔ اُس کا اثر اُن کے لئے اچھا نہیں ہوا۔ کیوں کہ جو باقی رہ گیا اُسی کے لئے اُن کے کھیت ضبط ہوگئے اور وہ اپنی زمین سے محروم کردئے گئے۔ پہلے کا بقایا جوں کا توں پڑا ہی رہا۔ اِس بات کی بہت کوشش کی گئی کہ کچھ اور معافی کرا کے، لگان گھٹا کر اُن کی مدد ہو۔ مگر پہلے تو حکومت کچھ کرنے پر راضی ہی نہ ہوتی۔ اور اگر رضامند بھی ہوتی تو یہ چھوٹ اتنی کم ہوتی کہ اِس سے کسانوں کو کوئی سہولت نہ ملتی۔ پنڈت جواہرلال، شری پرشوتم داس ٹنڈن اور اُس زمانے کے صوبائی کاموں کے ورکنگ پریسیڈنٹ مرحوم تصدق احمد خاں شروانی نے بہت کوشش کی کہ کچھ ہو جائے۔ مگر وہ ناکام رہے کامیاب ہوتے تو کیسے۔ حکومت کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ وہ اگر کچھ کرنا بھی چاہتی تھی تو کانگریس کے اصرار سے نہیں، کیوں کہ ایسا کرنے سے کسانوں میں کانگریس کا اثر رسوخ بڑھ جاتا۔ اِس لئے ہر طرح سے عاجز آ کر وہاں کی صوبائی کمیٹی نے فیصلہ کیا کہ وہ کسانوں کو مشورہ دے کہ وہ اپنی بے بسی کی وجہ سے لگان نہ دیں۔ یہ ایک طرح سے لگان بندی کی تحریک سمجھ لی گئی۔ آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کی منظوری کے بغیر ایسا نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اِس لئے اِجازت مانگی گئی۔

اُدھر بنگال میں بھی حالت نازک ہوگئی۔ وہاں کی صوبائی حکومت ہمیشہ اِنقلاب پسند پارٹی سے دہشت زدہ رہتی تھی اور یوں ہی بہت سے نوجوانوں کو جیلوں میں بند رکھتی جا رہی تھی۔ گاندھی اِروِن سمجھوتہ میں ستیہ گرہی قیدیوں کے چھوٹنے کی ہی بات ہوئی تھی، اور اُن کے چھوٹنے میں بڑی دشواری پیش آرہی تھی۔ حکومت کی طرف سے طرح طرح کے بہانے تراشے جا رہے تھے۔ انقلاب پسندوں کی تو بات ہی کیا۔ اِس سے وہاں کے لوگ بہت آزردہ تھے۔ اِسی دوران میں ہجلی کیمپ جیل میں جہاں انقلاب پسند نظربند قیدی تھے، ایک واقعہ بھی ہو گیا۔ جس میں جیل کے اندر گولی چل گئی، اور کچھ قیدی گھائل

ہوئے اور شاید ایک آدھ ہلاک بھی ہوئے - اِس سے اور کھلبلی مچی - چٹگاؤں میں کسی پولیس والے کو ایک انقلاب پسند نے مار ڈالا - اِس میں کوئی ہندو مسلم بات نہیں تھی، کیوں کہ اِنقلاب پسندوں نے کتنے ہی ہندو پولیس افسروں کو بھی مار ڈالا تھا - وہ کسی بھی سرکاری رُکن کو اُس کی ذات یا مذہب کی بنا پر نہ مارتے تھے - بلکہ اُسے غدّارِ وطن سمجھ کر چاہے وہ کسی بھی ذات یا مذہب کا کیوں نہ ہو مار ڈالتے تھے - مگر یہاں اُسے ہندو مسلم جھگڑے کا روپ دے دیا گیا اور ہندوؤں کے ساتھ بہت زیادتیاں کی گئیں، جن میں انگریزوں اور اینگلو انڈین یا نیم گوروں کا بھی پورا ہاتھ تھا -

اِن سب باتوں سے بنگال میں بڑی کھلبلی مچی - حکومت بھی نئے آرڈیننس نکالنے میں ذرا ہچک رہی تھی - بنگال کی صوبائی سیاسی کانفرنس برہم پور (مرشد آباد) میں مشہور بزرگ کانگرسی لیڈر شری ہردیال ناگ کی صدارت میں ہوئی - سردار پٹیل نے شری اینے اور مجھ کو کانگرس کی طرف سے وہاں بھیجا - ہم لوگوں نے کانفرنس میں شرکت کی اور میں نے بنگلہ زبان میں تقریر بھی کی - اِسی طرح صوبۂ سرحد کی حالت بھی کچھ اچھی نہیں تھی، وہاں بھی دورِ استبداد تھا - اِس طرح جوں جوں گول میز کانفرنس کا کام ختم ہونے پر آرہا تھا، ویسے ہی یہاں کی حالت اور بھی دشوار ہوتی جارہی تھی، ہم سمجھ رہے تھے کہ اب پھر انتشار ہوگا اور پھر جھگڑا مچے گا -

جب ورکنگ کمیٹی میں اُتر پردیش کی درخواست پر غور ہونے لگا تو ہم لوگوں نے اپنی بڑی جواب دہی محسوس کی - ابھی تک گاندھی جی واپس نہیں آئے تھے - اُن کی غیر حاضری میں لگان بندی شروع کرنا ہمارے لئے کہاں تک مناسب ہوگا، اور اگر مناسب بھی ہو تو ہم کہاں تک اِسے چلا سکیں گے، ایسے ایسے پہلوؤں پر ہم لوگ کئی دن تک سوچ بچار

کرتے رہے۔ میرے دل میں اندیشہ تھا کہ وہاں کے عوام اس جور و جبر کو برداشت بھی کر سکیں گے یا نہیں جو لگان بندی کے بعد لازماً ہوگا۔ بہار میں چوکی داری ٹیکس ایک معمولی ٹیکس ہے جو کسی پر بھی بارہ روپئے سالانہ سے زیادہ نہیں ہو سکتا اور معمولی طور پر غریبوں پر چھ یا بارہ آنہ سالانہ ہوتا ہے۔ معمولی کسانوں پر ایک ڈیڑھ روپیہ یا اس سے کچھ زیادہ حیثیت کے مطابق ہوا کرتا ہے۔ اس کے بند کرنے پر جتنی زیادتیاں ہوئی تھیں میں نے اپنی آنکھوں گاؤں میں جا کر دیکھی تھیں ابھی ایک سال بھی نہیں گزرا تھا کہ یہ سب دیکھنے کو ملا۔ اِس سے میں بہت ڈرتا تھا، کہ لگان بند کرنے کی بات بڑی گمبھیر ہوا کرتی ہے۔ زمیندار لگان کی وصولی بند ہونے سے سرکاری مال گزاری بھی نہیں دے سکے گا۔ اِس لئے سرکاری آمدنی کا ایک بہت بڑا حصّہ رُک جائے گا، اور حکومت کو بھی اپنا کام چلانے میں دشواری پیش آئے گی۔ لہذا لگان بندی کی صورت میں حکومت کی طرف سے بھی بہت سختی ہوگی۔ میں نے اِنہی وجوہ سے بار بار یہ پوچھا کہ عوام کہاں تک جبر و تشدد کو برداشت کرنے کے لئے تیار ہوں گے۔ اِس کا جواب قطعی طور پر تو نہیں دیا جا سکتا تھا۔ مگر وہاں کے بھائیوں نے اس بات کا یقین دلایا کہ عوام بڑی حد تک مُصیبت برداشت کرنے کے لئے تیار ہیں۔

سردار پٹیل کا خیال تھا کہ جب وہاں کی صوبائی کانگریس کمیٹی اور خاص لوگ حالت ایسی سمجھتے ہیں اور اِس کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہیں اور اِس کی وجہ سے جو دورِ تشدد ہوگا اُسے بھی برداشت کرنے کے لئے عوام کو تیار مانتے ہیں تو ہم لوگ جو آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر ہیں، کس طرح منظوری دینے میں آنا کانی کر سکتے ہیں۔ آخر کار بہت کچھ سوچ بچار کر بہت پابندیوں کے ساتھ منظوری دی گئی۔ وہ بھی یہ نہیں کہ فوراً لگان کر دی جائے بلکہ اس لئے کہ اس کی تیاری کی جائے سرکار تو اِسی کی تاک میں بیٹھی تھی۔ اُس نے فوراً ہی کارروائی شروع کر دی۔ اصل بات تو یہ تھی کہ غلّہ

کی قیمت اتنی گر گئی تھی کہ لگان ادا کرنا ہی غیر ممکن تھا۔ اِس بات کو کچھ دنوں کے بعد وہاں کے گورنر ہیلی صاحب نے کھُلے طور پر منظور بھی کر لیا۔ اُنہوں نے یہاں تک کہہ ڈالا کہ جب تک اِس بھدّے لگان قانون کی بنیادی طور پر دُرستی نہ ہوگی۔ سماج کی ساری تنظیم ڈانواڈول رہے گی مگر اِس وقت تو مقصد تھا کانگریس کو دبانا اِس لئے دوسری کارروائی شروع کر دی گئی۔

حکومت کا خوفناک دورِ استبداد

گول میز کانفرنس کا کام ختم ہوتے ہی گاندھی جی مایوس ہوکر ہندوستان کے لئے روانہ ہو گئے۔ اُن کے ہندوستان پہنچنے کے دن بمبئی میں ورکنگ کمیٹی کی نشست رکھی گئی۔ سب لوگ اپنے اپنے صوبے سے بمبئی کے لئے روانہ ہوئے۔ بنگال میں دورِ استبداد چل ہی رہا تھا۔ اِسی درمیان سرحد میں بھی خاں عبد الغفار خاں، ڈاکٹر خان صاحب اور دوسرے لیڈر یکایک گرفتار کر لئے گئے۔ وہ اپنے صوبے کے باہر نظر بند کرکے اِدھر اُدھر بھیج دیے گئے۔ اُتر پردیش میں شری پرشوتم داس ٹنڈن اور شروانی صاحب بھی گرفتار ہو گئے۔ ہم جس گاڑی سے جا رہے تھے۔ اُسی سے پنڈت جواہر لال نہرو بھی بمبئی جا رہے تھے۔ ڈاک گاڑی الہ آباد سے تھوڑی ہی دُور پر ایک چھوٹے اسٹیشن پر ٹھہر گئی۔ وہاں پہلے سے موٹر لے کر پولیس والے پہنچے ہوئے تھے۔ پنڈت جی وہیں گرفتار کر لئے گئے۔ ہم لوگ سیدھے بمبئی چلے گئے۔

بمبئی میں مہاتما جی کے استقبال کی بڑی تیاری تھی۔ جس راستے سے اُن کو گزرنا تھا اُس پر مکان لوگوں کے اژدہام سے کھچا کھچ بھرے ہوئے تھے۔ سڑکوں پر بھی مجمع کثیر تھا، اس طرح کی بھیڑ شاید ہی کسی دوسرے موقع پر کسی کو دیکھنے کے لئے اکٹھی ہوئی ہو۔ طے شدہ مقام

پر پہنچنے کے بعد سبھی باتیں گاندھی جی سے کہی گئیں۔ وہ بھی سمجھ گئے کہ حکومت اب کھلم کھلا دبانا چاہتی ہے۔ ورکنگ کمیٹی کی باضابطہ نشست ہوئی۔ حالاتِ حاضرہ پر ایک طویل قرارداد منظور ہوئی۔ گاندھی جی نے وائسرائے کو تار دے کر اُس کا خلاصہ بتایا اور اُن سے ملاقات کی منظوری طلب کی یہ سب ہو جانے پر ہم لوگ اپنے اپنے مقام کے لئے روانہ ہو گئے۔

جب میں روانہ ہوتے وقت گاندھی جی سے وِداعی رخصت لینے گیا تو دیکھا کہ مسٹر بینتھل اُن سے باتیں کر رہے ہیں۔ وہ بھی گول میز کانفرنس میں ہندوستان کے انگریزوں کے نمایندے ہو کر گئے تھے۔ وہاں اُنھوں نے مسلمانوں اور انگریزوں کا گٹھ جوڑ کرانے کی بہت سی کارروائیاں کی تھیں۔ ہم لوگ تو سمجھ ہی گئے تھے کہ اب کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ بہت جلد حکومت دبائے گی اور کانگریس کو مجبور ہو کر پھر ستیہ گرہ کرنا پڑے گا۔ ہم لوگوں میں سے کسی کی خواہش نہیں تھی کہ ستیہ گرہ شروع ہو۔ نہ اُس کے لئے تیاری تھی اور نہ ذہنی آمادگی۔ ہاں، ہمارے معزز ساتھیوں کو حکومت نے بلاوجہ گرفتار کر لیا تھا، اُن کے متعلق وائسرائے سے گفتگو کرنا ضروری تھا، اور جب ایسی ہی مجبوری تھی تو کچھ کرنا بھی لازم تھا مگر گاندھی جی کے ہندوستان واپس آنے سے پہلے ہی یہاں کی حکومت نے سب تیاریاں کر لی تھیں۔ اِس کی طرف سے وار بھی ہو لیا تھا۔ اس کی تیاریوں کی کچھ خبر پہلے سے ہی ہم لوگوں کو اِدھر اُدھر مل گئی تھی۔ یہاں تک کہ ڈاکٹر انصاری کو اِس کا بھی پتہ چل گیا تھا کہ اِس قسم کے آرڈیننس جاری کئے جائیں گے۔ اُنھوں نے یہ باتیں آپس کے لوگوں کو بتا بھی دی تھیں۔ اب تو بات اور واضح ہو گئی تھی۔

بمبئی سے چل کر میں نے سوچا کہ اب تو بہار میں بھی جبر و تشدّد ہو گا ہی، اِس لئے اپنے آدمیوں سے ایک بار مل لینا اچھا ہو گا، اٹارسی جنکشن سے میں نے کئی تار بھیجے۔ جن میں بہار صوبائی ورکنگ کمیٹی کی نشست پٹنہ میں کرنے کی بات کے ماسوا اِس کے ممبروں کے دعوت نامے

بھی تھے۔ جب دوسرے دِن صبح میں پٹنہ پہنچا تو معلوم ہوا کہ وہاں تار ملا ہی نہیں ہے، تاروں کو سرکار نے روک لیا تھا۔ تب بھی کچھ لوگ پٹنہ پہنچ ہی گئے۔ وہاں ورکنگ کمیٹی کی نِشست بھی ہم لوگوں نے کر لی۔ اسی رات مہاتما جی کی گرفتاری ہو گئی۔ اُن کے ساتھ وِلبھ بھائی پٹیل اور دوسرے کئی خاص لیڈر گرفتار کر لئے گئے۔ یہ سب ہم اخباروں میں دیکھ چکے تھے اور سمجھ گئے تھے کہ اب ہم لوگوں کی گرفتاری بھی جلد ہی ہو جائے گی۔ اِسی لئے پٹنہ پہنچتے ہی ہم نے ورکنگ کمیٹی کا کام کیا۔ سب لوگوں کے لئے ہدایتیں مرتب کر کے اُنہیں چھپوانے کا بھی انتظام کر لیا۔ یہ سب کام پورا کر کے ہم تیار ہوئے ہی تھے کہ پولیس کے آنے کی اطلاع مِلی جو ابھی صداقت آشرم تک پہنچی نہیں تھی، مگر آ ہی رہی تھی، ہم بھی گرفتار ہونے کا انتظار کرنے لگے۔ شری رام دیال بابو، پروفیسر عبد الباری اور دو ایک اور ممبر کام ختم کر کے چلے جا چکے تھے۔ تِرہُت کے کچھ ممبر دوپہر کے اسٹیمر سے دیگھا گھاٹ تک آئے تھے مگر جیل سے باہر رہ کر کانگریس کا کام کرنے کے خیال سے اُدھر ہی رہ گئے۔

کپتان پولیس مسلح سپاہیوں کو لئے آدھمکے۔ اُنہوں نے آشرم گھیر لیا۔ ہم دو چار آدمی جو بیٹھے تھے اُن سے پوچھنے لگے کہ کیا ورکنگ کمیٹی کی نِشست ہو رہی ہے۔ ہم نے کہہ دیا کہ وہ کام تو پورا ہو چکا اور بہتیرے ممبر اِدھر اُدھر چلے گئے ہیں۔ اُنہوں نے سرکاری اعلان دکھایا جس کی رو سے کانگریس کمیٹی اور اس کی سبھی شاخیں غیر قانونی قرار دی گئی تھیں پولیس نے پہلے تو ٹیلیفون اپنے قبضہ میں کیا۔ پھر قومی جھنڈے کی جگہ اپنا یعنی برٹش حکومت کا جھنڈا لگا دیا۔ اب وہاں کی تلاشی شروع ہوئی۔ تلاشی میں کوئی خاص چیز تو ملی نہیں مگر کئی گھنٹے لگ گئے۔ ہم سب گرفتار کر لئے گئے۔ مگر ابھی وہیں رہے۔ دِن کے تقریباً ایک، دو بجے سے آٹھ بجے تک ہم سب وہیں رہے۔ آشرم اور ودیا پیٹھ کی سبھی عمارتیں ضبط

کرلی گئیں۔ ودیاپیٹھ کے جتنے طالب علم اور معلم وہاں تھے سب کو چلے جانے کا حکم دیا گیا۔ شری برج کشور پرشاد، شری متھرا پرشاد، شری کرشن بلبھ سہائے، بابو جگت نرائن بی ایس سی اور میں اور ہمارے ساتھ پنڈت پرجاپتی مشر بھی گرفتار کرلئے گئے۔ رات کے نو بجے تک ہم لوگ بانکی پور جیل پہنچائے گئے۔ پولیس کی لاری میں اپنا سامان لے کر ہم سب سوار ہوئے کپتان پولیس بھی ساتھ ہی جیل میں پہنچے۔ اپنا اپنا بستر، بکس وغیرہ سب سامان ہم لوگوں کو خود اُتارنا اور ڈھونا پڑا۔ کپتان پولیس کی یہی مرضی تھی۔

رات کو ایک گندے وارڈ میں، جو خالی رکھا گیا تھا، ہم لوگ بند کردئے گئے۔ بچھانے کو کچھ کمبل ملے۔ کھانے کے لئے بازار سے پوریاں منگائی گئیں۔ وہاں پیشاب کی اتنی بدبو آتی تھی کہ ہم رات بھر چین سے نہ سو سکے۔ بازار کی پوریاں بھی کچھ ایسی تھیں کہ شوق سے کھاتے نہ بنیں۔ دوسرے دن سویرے انگریز سول سرجن جو جیل کے سپرنٹنڈنٹ تھے آئے۔ اُنھوں نے کہا کہ اگر آپ چاہیں تو اپنا کھانا باہر سے منگا سکتے ہیں۔ ہم لوگوں نے کہہ دیا کہ جو کچھ جیل میں ملے گا، وہی ہم لوگ کھائیں گے۔ وہی لوہے کا تسلا اور وہی کھانا ملا جو سب قیدیوں کو ملتا ہے ہم لوگ وہی کھاتے رہے۔ دو دن کے بعد حکم آیا کہ ہم لوگ اَپر ڈویژن (اونچے درجے کے) قیدی سمجھے جائیں۔ تب سے کچھ الگ کھانا ملنے لگا۔ دوسرے دن سے ہی ہم ایک دوسرے وارڈ میں لے جاکر رکھے گئے۔ جیل میں ہی ہم لوگوں پر مقدمہ چلایا گیا۔ برج کشور بابو کو پانچ مہینے اور باقی سب کو چھ مہینے کی سزا ملی۔ چند دنوں کے بعد ہم سب ہزاری باغ جیل بھیج دئے گئے۔ وہیں ہم نے میعاد پوری کی۔

ہم لوگ تو گرفتار ہو گئے اِس لئے باہر کی تحریک میں کچھ بھی حصہ نہ لے سکے، مگر باہر کے لوگوں نے بہت کام کیا۔ لارڈ ولنگڈن کی یہ لاف زنی تھی کہ دو ہفتہ میں وہ سارا معاملہ

ختم کر دیں گے۔ مگر یہ تحریک بھی تقریباً دو سال تک چلتی رہی۔ اُس وقت تو لوگوں میں بہت ہی جوش تھا۔ نہ جانے کہاں کہاں سے نئے نئے لیڈر میدان میں آ گئے۔ اُنہوں نے اپنے اپنے طریقے پر پروگرام بھی بنا لیا اور قانون شکنی کا کام زوروں سے چلنے لگا۔ قانون توڑنے میں خاص دشواری بھی نہ تھی۔ حکومت کی طرف سے سبھی جگہ جلسہ جلوس وغیرہ کی ممانعت تھی اِس حُکم کی خلاف ورزی ہونے لگی۔ جلسے ہونے لگے، جلوس نکلنے لگے۔ جلسوں اور جلوس پر لاٹھیاں برستیں، کہیں کہیں گولیاں بھی چلتیں، مگر وہ ہوتے ہی رہے۔ سبھی کانگریس کمیٹیوں کے مکانوں اور آشرموں کو حکومت نے ضبط کر لیا تھا۔ اُن پر لوگ دھاوا بولتے تھے جیسے پہلے بیہہ پور (بھاگل پور) میں آشرم پر پچھلے ستیہ گرہ میں برابر دھاوے ہی ہوتے رہے ویسے ہی بہت سے آشرموں پر دھاوے ہونے لگے۔ صداقت آشرم پر بھی روز روز دھاوے ہوتے رہے اور لوگ گرفتار بھی ہوتے رہے۔ یہاں کے جھنڈے پر خاص حملہ ہوتا رہا۔ یونین جیک لگے ہوئے لگے (لول) کو لوگوں نے آخر جُھکا کر ہی چھوڑا۔

یہ وار حکومت نے ۴ جنوری کو شروع کیا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد ۲۶ جنوری کو یوم آزادی منانے کا فیصلہ لوگوں نے کر لیا۔ اُس دن کئی جگہ گولی چلی۔ موتی ہاری میں وہاں کی ضلع کمیٹی کے مکان کے سامنے والے میدان میں بڑا جلسہ ہوا جس میں گاؤں سے بھی بہت لوگ آئے تھے۔ وہاں پر گولی چلی اور کئی آدمی مارے گئے، مگر لوگ ہٹے نہیں۔ آج بھی اُس جگہ شہیدوں کے نام پر چبوترہ بنا ہوا ہے۔ آخر گولی چلانا بند کر کے جب پولیس والے چلے گئے تب بھی عوام وہیں ڈٹے رہے۔ رات کو وہیں رہ کر اُسی جگہ لوگوں نے کھایا پیا۔ دوسرے دن گاؤں والے اِدھر اُدھر چلے گئے۔ مُنگیر ضلع کے تاراپور اور بیگو سرائے میں بھی بہت لوگ گولیوں کے شکار ہوئے۔ ایک طالب علم نے گولی کھا کر مرتے ہوئے یہ الفاظ کہے:

"میں سوراج کے لئے مر رہا ہوں، لوکمانیہ تلک کے پاس پہنچ کر سندیسہ کہوں گا۔"

بہار کی اَن گِنت جگہوں پر لوگوں نے اس طرح کی بہادری دکھائی۔ پھر ۱۹۳۰ء کی طرح صوبے بھر کے سبھی جیل خانے بھر گئے۔ اور پٹنہ کیمپ جیل بھی۔ ۱۹۳۰ء سے اس بار یہ فرق تھا کہ جیلوں میں زیادہ سختی ہوگئی۔ اُوپر کے درجے میں بہت تھوڑے لوگ رکھے گئے۔ بہار میں ایسے لوگ یوں تو پہلے ہی کم تھے مگر اِس بار اُن کی تعداد اور بھی کم ہوگئی۔ حکومت جس جلدی اور تیزی کے ساتھ تحریک بند کرانا چاہتی تھی، نہ کر سکی۔ اندولن چلتا ہی رہا۔ ہم لوگ ہزاری باغ میں پہلے کی طرح دن گزارنے لگے۔ نئی بات یہ ہوئی کہ اس بار ہم لوگوں کو کارخانے میں جانے کی اجازت نہیں ملی، کیونکہ سمجھا جاتا تھا کہ وہاں معمولی قیدیوں سے ہماری ملاقات ہوگی اور ہم وہاں اُنہیں بگاڑ یا بہکا دیں گے۔ اِس لئے ہم اِس بار اُس طرح کا کچھ صنعتی کام نہیں کر سکے۔ مگر سوت زیادہ کاتا گیا۔ مذہبی کتابوں کا مطالعہ بھی خوب ہوا۔ قرآن شریف بودھ دھرم کی کتابوں اور بائبل وغیرہ کا مطالعہ بھی خوب کیا گیا۔

اِس بار کی جیل یاترا میں ایک عجیب بات ہوئی۔ شری مہامایا پرشاد ایک بہت تندرست نوجوان تھے وہ بہت کسرت وغیرہ کیا کرتے تھے۔ ہم لوگوں کے کھانے کی دیکھ بھال اُنہیں کے ذمّے تھی۔ ایک دن اپریل میں جب گرمی کافی ہوگئی تھی، وہ چوکے سے دوپہر میں آئے۔ طبیعت کچھ سُست تھی۔ سب سمجھے کہ معمولی سی بات ہے۔ دوسرے دن سے آہستہ آہستہ اُن کی بولی بند ہونے لگی دو دِن میں وہ اس طرح بند ہوگئی کہ وہ اوں بھی نہیں کر سکتے تھے، جو کچھ کہنا ہوتا لکھ کر بتاتے۔ باتیں تو سنتے سمجھتے تھے، مگر بول نہیں سکتے تھے۔ وہاں کے ڈاکٹروں اور سول سرجن نے دیکھ بھال کی مگر کچھ کر نہیں سکے۔ اُن کی میعاد بھی پوری ہونے کو تھی۔ اِس لئے وہ چھوڑ دئے گئے۔ کلکتہ میں وہ علاج کرانے گئے۔ وہاں کے ڈاکٹروں اور

ڈیڈوں کی ہزار کوششوں کے باوجود اُن کی آواز نہ کھلی۔ سبھی لوگ کہتے تھے کہ آواز والی نلی میں کوئی کسر تو ہے نہیں مگر پھر بھی آواز نکلتی نہیں۔ یہی کیفیت تقریباً دو برس تک رہی۔ جب ۱۹۳۲ء میں ڈاکٹر انصاری یوروپ گئے تو وہ بھی اُن کے ساتھ گئے۔ وہاں ویانا (آسٹریا) میں ایک ماہرِ خصوصی کا عِلاج کیا جس سے ایک دو ہفتے کے اندر ہی آواز کچھ کچھ نکلنے لگی۔ کچھ دِنوں بعد وہ پوری طرح صحت یاب ہو کر اپنے وطن واپس آگئے۔ بعد میں اُن کی آواز پہلے کی سی ہو گئی تھی۔

اِس طرح سب طرف قانون شکنی چل رہی تھی کہ ایک عجیب بات کانگریس کے اِجلاس کے متعلق ہوئی۔ اوپر لکھ چکا ہوں کہ اِس بار حکومت نے گرفتاریاں ۴ جنوری سے شروع کر دی تھیں۔ کانگریس کا سالانہ اجلاس مارچ میں ہونے والا تھا۔ اُتکل (اڑلیسہ) کے لوگوں نے کانگریس کو مدعو کیا تھا۔ وہ تیاریاں بھی کر رہے تھے۔ جب یکایک وار شروع ہو گیا تو وہاں کے لوگ بھی گرفتار ہو گئے۔ بہار اور اُڑلیسہ کا ایک ہی مشترکہ صوبہ تھا اس لئے وہاں کے بھی خاص خاص کانگریسی جو اپر ڈویژن میں تھے ہزاری باغ میں آگئے اور ہم سب ساتھ ہی تھے۔ اُڑلیہ میں اجلاس ہونے کی بات تو اب تھی نہیں مگر جو لوگ باہر تھے اُنھوں نے سوچا کہ اِجلاس مارچ میں کہیں نہ کہیں ضرور ہونا چاہیئے۔ حکومت تُلی ہوئی تھی۔ اِجلاس کسی طرح نہ ہونے دے گی لوگوں نے طے کیا کہ اجلاس دِلّی میں ہو۔ اِس کے لئے دِن بھی طے کر کے اِعلان کر دیا گیا۔ پنڈت مدن موہن مالوی جی کی صدارت کا اِعلان کر دیا گیا۔ بہتیرے لوگ مختلف صوبوں سے مقررہ دن سے پہلے ہی دلی پہنچ کر جا بجا ٹھہر گئے۔ لوگوں نے یہ اِعلان بھی کر دیا کہ مقررہ تاریخ پر ۱۰ بجے دِن کے وقت چاندنی چوک میں اجلاس ہو گا۔ مالوی جی دِلّی کے لئے روانہ ہوئے۔ وہ سیدھے ریل سے دلی تک نہیں گئے۔ کہیں راستے سے موٹر میں ہو لئے۔ غازی آباد اور دِلّی کے درمیان وہ گرفتار کر لئے گئے۔ اِس کی بھی اطلاع لوگوں کو مل گئی۔ عین جلسہ کے دن اندر ہی اندر

یہ خبر اُڑا دی گئی کہ اجلاس چاندنی چوک میں نہ ہو کر کہیں نئی دلّی میں ہوگا۔ یہ خبر اس طرح پھیلائی گئی کہ پولیس کو اس پر یقین ہو گیا۔ اِس لئے اُس دن پولیس کی تیاری چاندنی چوک میں نہ ہو کر اُن دوسری جگہوں میں رہی۔ مقررہ وقت پر باہر سے آئے ہوئے ڈیلی گیٹ جو گھنٹہ گھر کے پاس کی جگہوں میں اِدھر اُدھر تھے۔ چاروں طرف سے نکل آئے۔ وہ گھنٹہ گھر کے سامنے بیچ سڑک پر ہی جمع ہو گئے۔ کانگریس کے دستور کے مطابق صدر معین کی غیر حاضری میں احمد آباد کے ایک مِل مالک سیٹھ رنچھوڑ داس صدر چُنے گئے۔ اُن کی مختصر سی تقریر ہوئی۔ ایک مناسب موقع پر تجویز باضابطہ پیش کی گئی اور سب نے اُسے منظور کیا۔ یہ ہو ہی رہا تھا کہ پولیس کو اس کی خبر مل گئی۔ گھوڑ سوار اور دوسرے جتھے، لاریوں پر سوار، وہاں پہنچ گئے اور حاضرین کو لاٹھیوں سے منتشر کر دیا مگر اس سے پہلے ہی ساری کارروائی ختم ہو چکی تھی یہ خبر اخباروں میں چھپی۔ لوگوں میں بڑی دل لگی رہی۔ اِتفاق سے سیٹھ رنچھوڑ داس گرفتار بھی نہ ہوئے۔ معلوم نہیں اِس نام کے سیٹھ صدر ہوئے بھی تھے کہ یوں ہی اُن کے نام کا اعلان کر دیا گیا۔ مگر اتنا ٹھیک ہے کہ یہ اجلاس کانگریس کے باضابطہ اجلاسوں میں شمار نہیں ہوا۔ آیندہ اِجلاس کے صدر کی طرح اِس اجلاس کے صدر کو بھی آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں حیات ممبری نہیں ملی۔

اِس بار بھی ملک نے کانگریس کا پورا ساتھ دیا۔ حکومت نے پچھلی بار ہی دیکھ لیا تھا کہ دھن کی مار بہت زبردست ہوتی ہے۔ اس لئے اس بار بڑی بڑی رقموں کے جرمانے ہوئے۔ کانگریس کی ساری جائداد ضبط کر لی گئی۔ کانگریس کا مکان تو کہیں تھا ہی نہیں۔ بینکوں میں جو کچھ کانگریس کے حساب میں جمع ملا وہ ضبط کر لیا گیا۔ مگر کانگریس سے بہت کچھ سرکار کو ملا نہیں۔ سرکار اور دوسرے لوگوں میں کچھ مغالطہ ہے کہ کانگریس کے پاس بہت روپے

ہیں اور وہ روپیوں کے بل پر کام کرالیتی ہے۔ ۱۹۲۱ء میں ایک بار کانگریس نے بڑی رقم جمع کی تھی۔ وہ قومی تعلیم اور کھدر پر بہت کچھ خرچ ہوگئی۔ اِس کے علاوہ کانگریس کے سامنے کوئی کام آجاتا ہے تو وقت کے وقت ہی اس کے لئے چندہ کرلیتی ہے مگر کانگریس کی کسی بھی کمیٹی کے پاس بہت روپئے جمع نہیں رہتے۔ ہاں جابجا کانگریس کے چھوٹے چھوٹے مکان ہو گئے ہیں۔ یہ بھی مقامی لوگوں سے وقتی طور پر چندہ کر کے بنائے گئے ہیں۔ مگر اتنا ٹھیک ہے کہ جب جیسی ضرورت ہوتی ہے لوگوں سے رقم مل جاتی ہے۔ جہاں لوگوں کے پاس دھن ہے وہاں کچھ زیادہ رقم مل جاتی ہے۔ مگر جہاں اِن میں سے کسی بات کی کمی ہے وہاں رقم کم ملتی ہے۔

گاندھی جی کو یقین ہے اور وہ اسی حکمتِ عملی پر چلتے ہیں کہ عوامی انجمنوں کو اپنے خرچ کے لئے روپیہ جمع کر کے نہیں رکھنا چاہیئے۔ ضرورت کے مطابق رقم جمع کر کے کام چلا لینا چاہیئے اِسی سے وہ جماعت بے مہار نہیں ہوسکتی، کیونکہ اگر اُس نے کام ٹھیک نہیں کیا تو وہ اپنی ہر دل عزیزی کھو بیٹھے گی اور اُسے چندہ نہیں ملے گا۔ اِس طرح اِس جماعت کو اپنی زندگی کے لئے عوام پر انحصار کرنا پڑتا ہے اور وہ اپنے فرض کو ٹھیک نبھانے پر ہی زندہ رہ سکتی ہے میرے تجربے نے اِس بات کو حرف بحرف صحیح ثابت کیا ہے۔ ہمارا صوبہ ایک غریب صوبہ ہے بڑے بڑے زمینداروں سے کانگریس کا تعلق نہ ہونے کے برابر رہا ہے۔ مگر جب کبھی ضرورت پیش آئی۔ متوسط طبقے کے لوگوں نے ضرورت کے مطابق ہماری مالی اِمداد کی۔ میں مانتا ہوں کہ روپیہ جمع کرنے میں ہمارا وقت بھی بہت لگتا ہے اور طاقت بھی اور اگر ہم اس فکر سے آزاد ہوتے تو شاید کام زیادہ کر سکتے۔ کام کرنے والے بہت رہے ہیں۔ اچھے سمجھ دار اور کانگریس کے سچے حامی۔ مگر روپیوں کی کمی کی وجہ سے ہم اُنہیں آشرموں میں رہنے کا خرچ نہیں سکتے۔ اُن کے بال بچّوں اور خانداں کا ذکر ہی کیا۔ بہتیرے تو اِس مجبوری کی وجہ

بے بادلِ ناخواستہ کبھی کبھی فکرِ معاش میں کانگریس کے کام سے الگ بھی ہو گئے۔ یہ سب ہوتے ہوئے بھی میں سمجھتا ہوں کہ روپیہ نہ ہونے سے ہمارا کام کبھی رُکا نہیں ہے۔ ایک طرح سے ہماری غریبی معاون رہی ہے۔ غریب صوبے کی صوبائی کمیٹی وہاں کے عوام کی نمایندگی غریب رہ کر ہی کر سکتی ہے۔ اِس لئے میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ہم اپنے صوبے کے صحیح نمایندے رہے ہیں۔

بہرحال، ہمارے صوبے میں حکومت کو کانگریس کے حساب میں بہت رقم نہیں ملی۔ مگر اس کے امکان سبھی ضبط ہو گئے۔ جب ہمیں وہ واپس ملے تو اکثر کی حالت خراب ہو چکی تھی۔

حکومت نے اِس بار کانگریس یا اس کے کسی کارکن کو مالی یا کسی قسم کی مدد دینا جرم قرار دے دیا تھا۔ کئی نئے آرڈننس بن گئے تھے جو عام طور سے دوسرے مُلکوں میں صرف زمانۂ جنگ میں بنا کرتے ہیں۔ اِس لئے ہمارے باہر رہ جانے والے کارکنوں کو بہت سی جگہوں پر کرایے پر بھی مکان نہیں ملتے تھے۔ سواری بھی جلد نہ ملتی بہت دہشت پھیلانے کی کوشش کی گئی مگر کام رُکا نہیں۔ کیوں کہ عوام برابر مدد کرتے رہے۔ اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے۔ جو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے دفتر کو اپنے ہاتھ میں رکھ کر سارے مُلک کو وقتاً فوقتاً ہدائتیں پہنچاتے اور سبھی جگہوں کی کارروائی کی خبر لیتے رہے۔

اِس طرح اگرچہ کانگریس غیر قانونی جماعت ہو گئی۔ جس کے نہ گھر تھے، نہ دفتر، نہ پیسے، نہ ممبر، نہ عہدے دار، تو بھی جیسے کسی خفیہ مقام سے سوت سے پانی نکلتا ہی رہتا ہے۔ یوں ہی کانگریس کا کام بھی کہیں چھپی ہوئی جگہ سے نکل ہی آتا اور اُسے پورا کرنے والے بھی حسبِ ضرورت اور حسبِ موقع مل ہی جاتے۔ لارڈ ولنگڈن کی یہ لن ترانی، کہ کانگریس

دو ہفتے میں ختم کردی جائے گی، پوری نہیں ہوئی۔ ہزاری باغ جیل میں اتنی سختی تھی کہ خان عبدالغفار خاں اور ڈاکٹر خاں سے جو اسی جیل میں تھے۔ ہم لوگوں کی ایک بار بھی ملاقات نہ ہو سکی۔

ہریجنوں کے لئے گاندھی جی کا ترکِ غذا

چھ مہینے کی سزا کاٹ کر میں ہزاری باغ سے رہا ہو گیا۔ چند گھنٹوں کے لئے مجھے ہزاری باغ شہر میں ٹھہرنا تھا۔ اسی وقت مجھے زوروں سے جاڑا بخار ہو گیا اور کچھ ٹھہر جانا پڑا۔ جب کچھ صحت مند ہو کر میں پٹنہ آیا اب بھی بیمار ہی تھا۔ کمزوری بھی بے حد تھی۔ میں نے کچھ افاقہ ہو جانے پر باہر کی واقفیت حاصل کی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے کارکنوں سے میری ملاقات ہوئی صوبے میں بھی جو باہر تھے اُن سے ملا۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا مدد بھی کی۔ مگر کام چلانے کا کام میں نے اپنے اوپر نہیں لیا۔ جو لوگ چلا رہے تھے اُنہیں پر رہنے دیا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے کام میں ہی میں نے زیادہ دلچسپی لی اور وقت دیا۔ میں کاشی میں پنڈت مدن موہن مالوی جی سے جا کر ملا اور وہاں کئی روز تک ٹھہرا رہا۔ پھر بمبئی بھی گیا اور کلکتہ بھی۔ سبھی جگہ کارکنوں سے ملا اور حتی الوسع روپے جمع کرنے میں اُن کی کچھ مدد کی۔ ابھی تک میں پوری طرح صحت یاب نہ ہو پایا تھا۔ مگر ایسا بیمار بھی نہ تھا کہ کام رُک جائے۔

میں مانتا تھا کہ مجھے باہر نہیں رہنا چاہیئے اور سوچ بھی رہا تھا کہ کوئی موزوں موقع

ملے تو پھر جیل یاترا کروں ۔ اتنے ہی میں اخباروں میں ایک دن مہاتما جی کے ترکِ غذا کی بات پڑھی ۔ ہم جب سے بمبئی میں گاندھی جی سے مل کر آئے تھے ، اُن کی کوئی خبر ہم کو نہیں تھی ۔ مگر حکومت کے ساتھ کچھ دنوں سے اُن کی خط و کتابت ہو رہی تھی ۔ پہلے لکھ چکا ہوں کہ گول میز کانفرنس میں اُنہوں نے اچھوت طبقہ کے لئے جُداگانہ حلقۂ انتخاب کی مخالفت کرتے ہوئے جان کی بازی لگا دینے کو کہا تھا ۔ میکڈانلڈ نے اپنے فیصلہ میں جُداگانہ حلقہ کی بات کہہ دی تھی ۔ مہاتما جی نے اپنی اُسی تقریر کی یاد دلاتے ہوئے کہا کہ اگر حکومت اس فیصلہ کو نہ بدلے گی تو وہ آمرن برت کریں گے ۔ اِس لئے حکومت کے نہ ماننے پر اُنہوں نے یہ برت شروع کر دیا ۔ حکومت نے ساری خط و کتابت شائع کر دی اور اُس کے شائع ہوتے ہی ملک بھر میں بڑی سنسنی پیدا ہو گئی ۔

مہاتما جی یرودا جیل میں تھے ، وہیں یہ برت شروع ہوا ۔ میں خبر پاتے ہی بمبئی پہنچا ۔ محترم مالوی جی بھی پہنچے ۔ شری راج گوپال آچاری اتفاق سے باہر تھے ، وہ بھی آ گئے ، اور لوگ جو باہر تھے ، بمبئی پہنچ گئے اور کوشش ہونے لگی کہ مہاتما جی کا یہ برت چھڑایا جائے مگر مہاتما جی اپنے عہد سے کب ہٹنے والے تھے ۔ مسٹر میکڈانلڈ کے فیصلہ میں ایک بات یہ بھی تھی کہ وہ فیصلہ تب تک قائم رہے گا جب تک اُن ذاتوں کے لوگ جن کا فیصلہ سے تعلق تھا آپس کے سمجھوتے سے اُس کی جگہ کوئی دوسری بات طے نہ کر لیں ۔ قدرتاً اس طرف لوگوں کی توجہ گئی ۔ اب اِس بات کی کوشش ہونے لگی کہ اچھوت ذات کے لوگوں کو ہی راضی کر کے جداگانہ حلقۂ انتخاب ختم کرائے جائیں ۔ بمبئی میں ڈاکٹر امبیدکر رہتے تھے ، حکومت نے اُن کو ہی اچھوتوں کا لیڈر بنا کر گول میز کانفرنس میں بھیجا تھا ۔ اُن سے باتیں ہونے لگیں ایک دو دن گزر گئے مگر کوئی بات تب تک طے نہ ہو سکتی تھی جب تک گاندھی جی سے

بھی رائے نہ لی جائے۔ اسی درمیان اچھوت ذات والوں میں بھی ہل چل مچ گئی۔ کیونکہ اچھوت پن دُور کرانے میں گاندھی جی نے بہت کام کیا تھا۔ اس طبقہ کے لوگ دیکھنے لگے کہ اگر اسی وجہ سے موت ہو گئی تو اُن کے لئے ایک امِٹ کلنک ہو جائے گی۔

گاندھی جی نے جس وجہ سے جُداگانہ حلقۂ انتخاب کی مخالفت کی تھی وہ وجہ بھی کچھ لوگ ضرور سمجھتے تھے۔ گاندھی جی کا کہنا تھا کہ اچھوت والے ہندو ہیں مگر کسی وجہ سے سماج میں ایسا دقیانوسی پن آگیا ہے کہ ہندوؤں کے اور فرقے اُنہیں اچھوت سمجھنے لگے ہیں۔ وہ خود اِس اچھوت پن کو ہندوؤں اور ہندو سماج کے لئے کلنک مانتے اور اُسے ہٹا دینا چاہتے تھے۔ یوں تو جو اچھوت عیسائی یا مسلمان ہو جاتا ہے اور اس طرح ہندو سماج اور ہندو مذہب سے الگ ہو جاتا ہے، وہ اُن سے بالکل کٹ جاتا ہے۔ اور اگرچہ وہاں بھی کچھ حد تک اچھوت پن رہ ہی جاتا ہے، پھر بھی وہ ہندوؤں کے لئے اچھوت نہیں رہ جاتے۔ اِس لئے یہ سوال اُن کے متعلق ہی ہوتا تھا جو ہندو رہ جاتے تھے۔ گاندھی جی سمجھتے تھے کہ سیاسی انتخاب کے لئے بھی اگر الگ حلقہ ہو جائے تو یہ ایک نیا اچھوت پن ہو جائے گا اور جہاں اچھوت پن دُور کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی اور جہاں اس کے دوسرے روپ ہٹ رہے ہیں وہاں یہ اُس کا ایک نیا سبب، ایک نئی مشکل ہو جائے گی۔ اچھوتوں کے پڑھے لکھے لیڈر یہ مانتے تھے کہ جب سب حقوقِ انتخاب کی بُنیاد پر ہی ہوں گے تو اُن کو بھی اپنی تعداد کی طاقت کا فائدہ ملنا چاہیئے، اور یہ تبھی پوری طرح مل سکتا ہے جب اُن کے لئے حلقہ ہائے انتخاب الگ ہو جائیں گے اِس لئے گول میز کانفرنس میں ڈاکٹر امبیدکر نے اس پر زور دیا تھا۔

بمبئی اور پونا کے درمیان کچھ لوگ دوڑ دھوپ کرنے لگے مگر یہ بہت طوالت کا کام تھا۔ اِسی لئے سب لوگ جن کو اِس میں کچھ کرنا تھا پونہ ہی چلے گئے۔ ڈاکٹر امبیدکر اور اُن کے

کچھ ساتھی بھی پونہ گئے۔ وہاں دو تین دن تک باتیں چلیں۔ مہاتما جی سے بھی جیل میں ملاقات کی اجازت مل گئی تھی۔ وہاں پھاٹک کے نزدیک ہی ایک چھوٹے سے وارڈ میں گاندھی جی سے ملاقات ہوا کرتی۔ جہاں ایک آم کے درخت کے نیچے اُن کی چارپائی رہتی۔ شری راج گوپال آچاری، پنڈت مالوی جی، ٹھکر بابا، گھنشام داس برلا، پرشوتم داس، ٹھاکر داس وغیرہ نے بہت کام کیا۔ ڈاکٹر امبیدکر، ڈاکٹر سولنکی وغیرہ بھی اپنی طرف سے برابر گفتگو میں شریک رہے جوں جوں دن گزرتے جاتے میں گھبراتا تھا۔ کیونکہ بات چیت میں گاندھی جی کو پوری محنت کرنی پڑتی اور میں ڈرتا تھا کہ وہ اتنی محنت کے ساتھ بہت دیر تک اپنا برت برداشت نہیں کرسکیں گے۔ جب جب باتیں ہوتیں، میں بھی شریک ہوتا مگر اپنی عادت کے مطابق باتیں بہت کم کرتا۔ گاندھی جی نے ایک دن شام کو ڈاکٹر اُمبیدکر سے بہت باتیں کیں اور اُن سے زوردار اپیل بھی کی۔ باتیں طے ہو گئیں۔ خاص شرطیں یہ تھیں کہ الگ حلقۂ انتخاب نہیں ہوں گے۔ اُن کے بدلے میں چناؤ کا طریقہ یہ ہوگا کہ طے شدہ تعداد میں اچھوت طبقے کے لئے جگہیں (سیٹیں) محفوظ رہیں گی۔ چناؤ کے وقت اچھوت ووٹروں کو حق ہوگا کہ ہر سیٹ کے لئے چار اُمیدوار نامزد کردیں۔ اگر چار سے زیادہ اُمیدوار ہوں تو صرف اُن کے ہی ووٹ سے چار ہی چُن لئے جائیں۔ اور اِن چار کی اُمیدواری قائم رہے۔ چاروں ناموں پر ووٹ لئے جائیں۔ ووٹ اونچی اور نیچی ذات کہلانے والے سبھی ہندو دیں اور جو سب سے زیادہ پائیں وہی چُنے جائیں۔ یہ دس برس تک رہے گا اور اس کے بعد اس پر پھر غور کیا جائے گا۔ مسٹر میکڈانلڈ کے فیصلے میں اچھوتوں کو جتنی جگہیں ملی تھیں، اُن کی تعداد بہت بڑھا دی گئی۔ وہ اُن کی تعداد کے تناسب سے کہیں بڑھ گئیں۔ یہ باتیں طے ہو گئیں، اور وزیر اعظم اِنگلستان مسٹر میکڈانلڈ کے پاس تار بھیج دیا گیا۔ اُنہوں نے اُسے منظور کر لیا اور اس حد تک اپنے

فیصلہ کو بدل دیا۔

اتنا ہوجانے پر گاندھی جی کے برت کا اب کوئی سبب نہیں رہ گیا۔ اُسے اُنھوں نے ختم کردیا۔ اس سمجھوتے سے ہم لوگوں کو بہت خوشی ہوئی۔ راجاجی اور ڈاکٹر امبیدکر نے اپنے قلم آپس میں بدل لئے۔ یہ راجاجی کی خواہش سے ہوا کیونکہ وہ بہت ہی خوش تھے۔ ولائت سے جواب آنے میں زیادہ دیر نہیں لگی۔ شاید چوبیس گھنٹے کے اندر ہی منظوری آگئی۔ مگر یہ چوبیس گھنٹے بھی ہم لوگوں کو بہت زیادہ لگ رہے تھے۔ اِس دِن صبح سے ہی ہم سب پریشان تھے ہوتے ہوتے دوپہر ہوگئی۔ معلوم ہوا کہ جواب آگیا ہے اور جلد ہی جیل میں پہنچنے والا ہے۔ اسی دن شاعرِ اعظم رابندر ناتھ ٹیگور پونہ پہنچے۔ وہ روانہ ہوئے گاندھی جی کو دیکھنے کے لئے، اُس وقت تک سمجھوتے کی خبر اُن کو نہیں تھی۔ پونہ پہنچنے پر اُنہیں اس کی خبر ملی۔ وہ ٹھیک اُسی وقت جیل میں پہنچے جب سمجھوتے کی منظوری کی خبر وہاں پہنچی اور گاندھی جی کے برت توڑنے کا وقت آگیا۔ وہ کیا ہی ساعتِ سعید تھی۔ دُعا کی گئی۔ گردیو ٹیگور نے ایک دل کش گیت گایا اور آشیرواد دیا۔ اِس کے بعد گاندھی جی نے نارنگی کا رس پی کر برت ختم کیا۔ سارے مُلک میں خوشی منائی گئی۔ اچھوت اُدھار کی زبردست لہر دَوڑ گئی۔

اچھوت اُدّھار کی کوشش

کچھ سیاسی سوالوں پر سمجھوتہ ہو جانے سے ہی گاندھی جی مطمئن ہونے والے نہیں تھے۔ اُن کے دل میں تو اچھوت پن کو جلا دینے کے لئے ایک آگ بھڑک رہی تھی۔ وہ آگ صرف انتخاب میں حلقے یا اچھوتوں کو کچھ خاص محفوظ جگہیں مل جانے سے کیسے بُجھ سکتی تھی۔ یہ سب سوال اُس وقت تک اُٹھتے ہی رہیں گے جب تک اُن کے ساتھ اچھوت پن کا سلوک ہوتا رہے گا اور ہندو اِنہیں انسانوں کے طبقے سے ایک طرح الگ ہی سمجھتے رہیں گے۔ اِسی لئے وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ اسے جڑ سے اُکھاڑ پھینکنے کی تدبیر کی جائے۔ وہاں سے بمبئی آکر ایک اچھّا جلسہ ہوا جس میں ہندوؤں کی طرف سے اِس بات کا عہد کیا گیا کہ وہ اچھوت پن کو دور کرا دینے کی پوری کوشش کریں گے۔ اِس کام کو چلانے اور دوسرے طریقوں سے اچھوتوں کی خدمت کرنے کے لئے ایک اور ادارہ قائم ہوا۔ گاندھی جی نے اس وقت تک اچھوتوں کو ہریجن کہنا شروع کر دیا تھا۔ اِس لئے اِس ادارہ کا نام ہریجن سیوک سنگھ رکھا گیا۔ اِس کے صدر ہوئے سیٹھ گھنشیام داس برلا، اور سکریٹری ہوئے شری امرت لال ٹھکر جنہیں لوگ پریم سے ٹھکّر بابا کہا کرتے تھے۔ وہ انجمن ابھی تک اچھّا کام کر رہی ہے۔ سارے مُلک

میں اِس کی شاخیں قائم ہو گئی ہیں۔ ٹھکر بابا کے پیروں میں گویا چکر رہے ہے۔ وہ اپنے بڑھاپے میں بھی سارے مُلک کا دَورہ کرتے ہوئے سبھی جگہ ہریجنوں کی تعلیم اور سہولتوں کا انتظام کر کے ہر قسم کی خدمت کرتے رہتے ہیں۔

اُس وقت یہ بھی خیال ہوا کہ اچھوت پن دُور کرنے کا ایک سیدھا طریقہ جسے سبھی سمجھ سکتے ہیں اور اپنی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں یہ ہے کہ مندروں میں جہاں اُن کے داخلے کی ممانعت ہے وہاں اُن کا داخلہ کرایا جائے۔ مندروں کو اُن کے لئے بھی ایسے ہی کھلوایا جائے جیسے وہ دوسرے ہندوؤں کے لئے کھُلے ہیں۔ اِس طرح عوامی کنووں میں بھی اُنہیں پانی بھرنے کا حق ہونا چاہیئے۔ جہاں دوسرے ہندو جا سکتے ہیں، بیٹھ سکتے ہیں وہاں جانے بیٹھنے کا حق اور سہولت اُنہیں بھی ملنی چاہیئے۔ گاندھی جی کے برت کے دوران ہی بہت جگہوں میں ہندوؤں نے اُن کے لئے مندروں کے دروازے کھلوانے شروع کئے اور اُن کے دوسرے ذاتی حقوق بھی بہت جگہوں میں تسلیم کئے گئے مگر اِتنے بڑے مُلک کے لئے ایسے مقاموں کی تعداد پھر بھی کم تھی۔ اس جوش کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ بمبئی کے جلسے کے بعد بہت جگہوں میں اِس سلسلہ کی کانفرسیں ہونے لگیں، جن میں اچھوت پن دُور کرنے کی تجویزیں پاس ہوتیں اور مندر وغیرہ کھلوائے جاتے۔ اِسی قسم کی ایک کانفرنس بہار کے ضلع چھپرا میں تھوڑے ہی دنوں بعد ہوئی۔ جس میں کاشی کے مشہور وِدوان (عالم) ڈاکٹر بھگوان داس نے مسندِ صدارت کو زینت بخشی۔ بہت جوش دیکھنے میں آیا اور عوام کی طرف سے ہریجنوں کے لئے بہت محبّت اور عملی ہمدردی کا مظاہرہ ہوا۔

بمبئی میں راجا جی نے مجھ سے اِصرار کیا کہ میں اُن کے ساتھ مدراس جاؤں۔ اچھوت پن کا سخت پن اور ہولناک رُوپ سب سے زیادہ اسی علاقے میں دیکھا جاتا ہے۔ مالا بار میں تو اچھوت پن یہاں تک ہے کہ کچھ ذاتیں اُس سڑک پر نہیں چلنے پاتیں جن پر اُونچی ذات کے

لوگ چلتے ہیں۔ جہاں اُن ذاتوں کے لوگ سڑک پر چلنے پاتے ہیں وہاں بھی اُن کو پکار کر چلنا پڑتا ہے تاکہ انجان کی حالت میں دوسرے اُن کے پاس نہ پہنچ جائیں۔ کنوؤں اور تالابوں میں پانی بھرنے کی تو بات ہی نہیں ہو سکتی۔ اِس کے سوا دکن میں بڑے بڑے مندر ہیں۔ جہاں ہندوستان کے ہر گوشے کے یاتری (زائر) جایا کرتے ہیں۔ اِن مندروں کا انتظام پنچایت کے ذریعے ہوتا ہے۔ پنچ کہیں کہیں عوام کے ذریعے سے چُنے جاتے ہیں اور کہیں کہیں سرکار کی طرف سے نامزد ہوتے ہیں۔ اگر اُن لوگوں میں پرچار ہو اور وہ مندر کھول دیں تو بہت بڑی بات ہو جائے۔ میں راجاجی کے ساتھ وہاں گیا۔ مدورا اور شری رنگم کے مندر کھلوانے کی بہت کوشش کی گئی۔ وہاں کے پجاریوں اور منتریوں سے بہت باتیں ہوئیں۔ کچھ ہمدردی بھی ظاہر کرتے تھے۔ ہم لوگ کئی روز تک اُن دونوں مقاموں پر کوشش کرتے رہے۔ عام جلسے ہوئے۔ پنڈتوں سے بہت باتیں ہوتی رہیں، مگر ان بڑے مندروں کو کُھلوانے میں ہم لوگ کامیاب نہیں ہوئے۔ کچھ دوسرے مندر جن کی اِتنی کُل ہند اہمیت نہ تھی، کھولے گئے۔ اِس سے اِتنا تو ضرور معلوم ہوا کہ کام مشکل تو ہے ناممکن نہیں۔ جن لوگوں کو ہم بہت کٹّر سمجھتے تھے وہ بھی بات سُننے اور بات کرنے کے لئے تیار تھے۔ ہم وہاں سے نا اُمید ہو کر نہیں بلکہ بہت سی اُمیدیں لے کر آئے۔

ہماری کوششوں کا نتیجہ فوراً تو نہیں نکلا مگر کئی برسوں کے بعد مالابار میں جہاں سب سے زیادہ کٹّر پن تھا۔ ٹراونکور کے مہاراج نے وہاں کے سب سے مشہور، شری پدم نابھ جی کا مندر کھول دیا۔ سارے راج میں سبھی ریاستی مندر کھول دئے گئے۔ مدراس میں قانون بنا کر راجاجی نے، جب وہ چیف منسٹر (وزیرِ اعلیٰ) تھے، مدورا کے مندر کو کُھلوا دیا، چنانچہ اُسی وقت یہ بات بھی چل پڑی کہ قانون بنا کر مندر کُھلوانے چاہئیں۔ قانون کی کیا شکل

ہوا اور اس میں کیسی شرطیں ہوں، اس پر عام لوگ غور کرنے لگے۔ جس کا نتیجہ بعد میں دیکھنے میں آیا۔ سب سے زیادہ حیرت کی بات دکن میں یہ دیکھنے میں آئی کہ وہاں کے غیر برہمن اعلیٰ ذات کہلانے والوں کے ماسوا مقابلے میں برہمن ہی اس ریفارم (سدھار) کے لئے تیار پائے گئے وہاں سے واپسی پر میں آندھرا پردیش کے کئی جگہوں میں ٹھہرتا ہوا آیا۔ وہاں بھی ایسی ہی اصلاحی لہر دیکھنے میں آئی اور میں کئی جگہ مندر کھولنے کی تقریب میں شریک ہوا۔

اُتّری شمالی ہند میں بھی اسی طرح کی لہر دوڑ گئی۔ ان گنت جگہوں میں جلسے ہونے لگے۔ مندر کھلنے لگے اور دوسرے طریقوں سے بھی اچھوت پن دُور کرنے کے عملی ثبوت دئے جانے لگے۔ گاندھی جی جیل سے ہی اس معاملے پر بیان دیتے تھے۔ حکومت نے اِس بات کی اجازت دے دی تھی کہ اچھوت ادھار کے متعلق ان کے بیان اخباروں میں اشاعت کے لئے بھیجے جا سکتے ہیں۔ اِس حق کا اُنھوں نے بڑی مستعدی سے استعمال کیا۔ اور اُن کی بہت سی تحریریں شائع ہونے لگیں۔ کچھ دنوں کے بعد اُنھوں نے محسوس کیا کہ اِس طرح اخباروں میں بیان چھپنا کافی نہیں ہے۔ اِس کے لئے اپنا ایک اخبار نکالنا چاہیئے۔ اُن کا "ینگ انڈیا" بند ہو چکا تھا۔ اِسی لئے ہریجنوں کی خدمت کے لئے انگریزی میں "ہریجن" اور ہندوستان کی دوسری زبانوں میں "ہریجن بندھو" اور "ہریجن سیوک" کے نام سے ہفتہ وار اخبار نکالے گئے جو کئی سال تک اچلے مگر اسی درمیان اور بھی بہت سی باتیں ہوئیں، جن کا ذکر پہلے آنا چاہیئے۔

ایک طرف اِس طرح ہریجنوں کی خدمت اور اچھوت پن دور کرنے کے لئے بے مثال جوش پیدا ہوا، دوسری طرف ایسے گوشوں سے مخالفت کے کچھ علامات دیکھنے میں آئے۔ جہاں سے اُمید نہ تھی، ایک تو سب سے زیادہ حیرت کی بات دیکھنے میں آئی کہ اِس ساری کوشش کو کچھ ہریجن لوگ ناپسند کرتے تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ یہ سب ڈھونگ ہے اور ہماری سیاسی

بیداری میں مخل ہوگا۔ اُن کو سیاسی اور معاشی آزادی حاصل ہو جائے گی تو اچھوت پن آپ سے آپ دور ہو جائے گا۔ جب تک یہ نہیں ہوتا تب تک اُونچی ذات والوں کے ذریعے یہ تدبیریں پھر غفلت کی نیند میں سلا دیں گی، جس کی وجہ سے وہ اوروں کے مقابلے میں پیچھے رہ جائیں گے۔ اِس لئے وہ چاہتے تھے کہ بے ایمانی اور بھی بڑھے تاکہ بیداری پیدا ہو۔ اُن کی طرف سے ہریجن نام کی مخالفت کی گئی۔ وہ اِس سوال کو مذہبی اور سماجی نہیں سمجھتے تھے۔ اِسے صرف سیاسی اور معاشی نظر سے ہی دیکھتے تھے۔ ہریجن سیوک سنگھ اور گاندھی جی کی تدبیریں اُن کی معاشی ترقی میں خلل انداز تو ہوتی ہی نہیں تھیں۔ سچ تو یہ ہے کہ پونہ کے سمجھوتے سے اُن کو صوبوں اور مرکز کی اسمبلیوں میں اتنی جگہیں مل گئی تھیں کہ جتنی مسٹر میکڈانلڈ نے بھی نہیں دی تھیں۔ اور کسی طرح کی حقیقی مخالفت تھی بھی نہیں۔ مگر اُن کے دل میں شبہ تھا جس کا کوئی علاج نہ تھا۔ جب کام زوروں سے چلنے لگا تو بہتیروں کا اندیشہ کچھ حد تک دور ہوا، مگر اس نے اتنی گہری جڑ پکڑلی تھی کہ بعد کو وہ پھر اُبھر آیا۔ اِس میں جو تعلیم یافتہ تھے اور مُلکی وغیر مُلکی باتیں سمجھ سکتے تھے وہ یہ بھی دیکھتے تھے کہ مُلک کا آئینی دستور بننے والا ہے۔ اُس میں زیادہ تر لوگوں کو حق ملے گا۔ اِس لئے اپنے اِدارے پر توجہ دے کر پورا فائدہ اُٹھانا چاہتے تھے۔ کوئی اُن کی شکایت بھی نہیں کرسکتا۔ مگر اس کے لئے اچھوت پن دور کرنے کی تدبیروں کو ڈھونگ سمجھنا بالکل غلط تھا۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں میں بھی کچھ ایسے ضرور تھے جو اُن کے اس رُخ سے بہت غیر مطمئن ہو گئے اور کہنے لگے کہ سیاسی اختیارات سے ذاتی فائدہ اُٹھانے کے لئے کچھ پڑھے لوگوں کی ہی یہ چال ہے۔ جو بھی ہو، مخالفت کی شکل عملی نہیں ہوتی صرف نظریوں اور بیانوں کی اشاعت ہوتی رہی۔

دوسری رکاوٹ کانگریسی لوگوں میں سے بھی کچھ کی طرف سے پیش آنے لگی۔ یہ تو ظاہر

ہے کہ جس وقت گاندھی جی نے برت شروع کیا، ستیہ گرہ چل رہا تھا۔ حکومت زوروں سے دبا رہی تھی۔ اُن لوگوں کا کہنا تھا کہ ایسے وقت میں مہاتما جی نے اس جھگڑے کو کھڑا کر کے عوام کی توجہ ستیہ گرہ کی طرف سے ہٹا کر ایک سماجی مرکز پر منعطف کر دی۔ یہ وقت ملک کے لئے برٹش سرکار سے لڑنے کا تھا نہ کہ ملک کی ایک ہزاروں برس کی بُرائی کو دُور کرنے کا۔ وہ لوگ سمجھتے تھے کہ اِس طرح ستیہ گرہ کو کم زور کر دیا گیا۔ کانگریس کے کچھ رکن اچھوت اُدھار میں لگ گئے۔ کچھ تو باضابطہ ہریجن سیوک سنگھ کے عہدہ دار بن کر اپنا سارا وقت اِسی میں دینے لگ گئے۔ اگرچہ یہ بات ٹھیک تھی کہ اس طرف سے جی کھچ گیا اور کچھ کام کرنے والے بھی ہریجن سیوا میں لگ گئے پھر بھی یہ قابلِ غور بات ہے کہ جو لوگ ستیہ گرہ کا کام چھوڑ کر اس میں آ گئے تھے، جو ستیہ گرہ کا کام کرنے کے لئے تیار تھے کسی نہ کسی سبب سے اُن میں سے بہتیرے اب اِس کام سے الگ ہونا ہی چاہتے تھے اور وہ اگر اِس کام میں لگے بھی تو ستیہ گرہ کا کام جو اِس سے تعلق رکھتا تھا، اُنہوں نے چھوڑا نہیں تھا۔ اگر یہ کام نہ ہوتا پھر بھی وہ ستیہ گرہ چھوڑنے والے ہی تھے۔ یہ بھی ایک بات ہے کہ ہریجن سیوک سنگھ میں کام کرنے والوں میں ایسے لوگوں کی بہت بڑی تعداد تھی جو کانگریس اور ستیہ گرہ میں کام نہ کرتے تھے۔ اُن میں سب سے بڑی نمایاں مثال تو سنگھ کے صدر سیٹھ گھنشیام داس برلا اور ٹھکر بابا ہی ہیں۔

کچھ بھی ہو کانگریس میں اِس طرح کی بے اطمینانی پیدا ہوئی۔ جو لوگ اس خیال کے تھے وہ یہ نہیں دیکھ پاتے تھے کہ اِس ملک میں غیر ملکی راج کا خاص سبب ہماری کمزوریاں ہیں جو ہمارے سماج میں یا انفرادی صورت سے ہم میں گھر کر گئی ہیں گاندھی جی نے شروع سے ہی اِن کمزوریوں کو دُور کرنے کے لئے ہی تعمیری کام پر اِتنا زور دیا۔ ہم جوں جوں آگے بڑھتے ہیں اُن کمزوریوں کو محسوس کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ اُن کی وجہ سے

ہماری گاڑی قدم قدم پر رُک جاتی ہے اگر ہم اِس کمزوری کو دور کر سکیں، کروڑوں بھائیوں اور بہنوں کو اِس کا شکار ہونے سے بچا سکیں تو یہ بہت بڑی خدمت ہوگی، اِس سے سوراج بھی، اگر وہ سچا ہے اور سب کے لئے ایک طرح کا ہونے والا ہے، نزدیک آجاتا ہے۔ میں تو ہمیشہ تعمیری کام کا قائل رہا ہوں اور حتی الوسع اپنی طرف سے کوشش بھی کرتا رہا ہوں، مگر یہ بات کانگریس کے سبھی لوگوں کی نہیں ہے۔ دو طبقۂ خیال کی مخالفت اور ٹکراؤ ہے، کون کہہ سکتا ہے کہ کون ٹھیک ہے۔ ہم اتنا کہہ سکتے ہیں کہ ہم اپنے خیال کو از روئے عقیدہ درست سمجھتے ہیں۔ ہم یہ بھی مانتے ہیں کہ ایسا کرنے سے ہماری رکاوٹوں کو دُور کرنے کی اِتنی زبردست کوشش نہیں کی جاتی جتنی ہونی چاہیئے۔ اسی لئے یہ رکاوٹیں دور نہیں ہو رہی ہیں۔

اِن غیر متوقع مخالفتوں کے ماسوا کٹر سناتنی لوگوں کی مخالفت تو تھی ہی جس کا مظاہرہ کچھ دنوں کے بعد دیکھنے میں آیا۔ جب گاندھی جی دورہ پر نکلے، کئی جگہوں میں اُن پر حملے کئے گئے۔ پونہ میں ہی جہاں اِس ساری تحریک کی انقلاب پسندی کا جنم ہوا، جلسۂ عام میں جاتے وقت گاندھی جی پر بم پھینکا گیا۔ بہار جیسے گاندھی بھگت اور پُر اعتقاد صوبہ میں بھی گاندھی جی کی موٹر پر لاٹھیاں چلائی گئیں۔ یہ حرکت دیوگھر ویدناتھ دھام میں ہوئی۔ جہاں موٹر کی چھت کی وجہ سے باپو چوٹ سے بچ گئے۔ موٹر کی چھت تو لاٹھیوں سے چور چور ہو گئی۔ آج اِتنے دِنوں کے بعد جب میں ساری باتوں پر غور کرتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ جو ہوا اور کیا گیا سب ٹھیک ہی تھا۔ اِس رواج کے دور ہونے میں کامیابی بھی کافی ملی ہے۔ اگرچہ ابھی ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اِس میں ہم پوری طرح کامیاب ہوئے ہیں۔ حقیقت میں ابھی بہت سفر کرنا رہ گیا ہے۔ مگر جب ہم یہ یاد کرتے ہیں کہ ہزاروں برس کا دقیانوسی پن، جو ہماری نس نس

میں داخل ہے، جس کا ہمارے دھرم کے ساتھ ایک طرح کا اٹوٹ رشتہ سا ہو گیا ہے۔ کتنا زبردست دقیانوسی پن ہے۔ پھر بھی جو ترقی ہوئی ہے وہ کم نہیں معلوم ہوتی، کچھ اور دھکے لگے اور بس یہ پرانی دیوار گری۔ کام کرنے والوں کے عقیدہ اور اِستقلال سے کام کرتے رہنے کی ضرورت ہے۔

الٰہ آباد کی اِتّحاد کانفرنس

دلّی میں نئے قائم شدہ ہریجن سیوک سنگھ کی نشست ہوئی، اگرچہ میں اُس کی ورکنگ کمیٹی کا ممبر نہیں تھا مگر بلایا گیا۔ میں دلّی گیا۔ بدقسمتی سے مجھے بخار ہوگیا۔ دمہ کا دورہ بھی شروع ہوگیا۔ مجھے وہاں کئی دن تک ٹھہرنا پڑا۔ کچھ صحت یاب ہوگیا تھا کہ خبر ملی، کہ الٰہ آباد میں اتّحاد کانفرنس ہونے جارہی ہے۔ اِس میں شرکت کے لئے میں بھی بلایا گیا۔ میں دلی سے سیدھا الٰہ آباد چلا گیا۔

اِس کانفرنس میں خاص خاص ہندو مسلمان، سکھ اور عیسائی لیڈر شریک ہوئے۔ کانگریسی لوگ تو زیادہ تر جیل میں ہی تھے، مگر جو باہر تھے وہ بلائے گئے تھے مولانا شوکت علی اور مولانا ظفر علی خان بھی شروع میں ہی آ گئے۔ کچھ دِنوں کے مولانا شوکت علی کسی کام سے چلے گئے۔ مگر دوسرے لوگ برابر حِصّہ لیتے رہے۔ مسٹر میکڈانلڈ کا فیصلہ تو نکل ہی چکا تھا۔ اِس میں تقریباً سارے مطالبے جو مسلمانوں کی طرف سے پیش ہوئے تھے مان لئے گئے۔ ایک بات یہ تھی کہ مرکزی آئین ساز اسمبلی میں مسلمانوں کی تعداد ایک تہائی ہونی چاہیئے اور سندھ کو ایک الگ صوبہ بنا دینا چاہیئے۔ اِن معاملوں پر ابھی فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ کانفرنس کا اجلاس

اور بڑھ گیا۔ تقریباً تین ہفتہ تک ہم لوگ صبح سے دوپہر تک اور پھر تیسرے پہر سے رات کے نو بجے تک بیٹھا کرتے تھے۔ جو کچھ مسلمانوں کی طرف سے کہا جاتا یا جو کچھ اُنہیں فیصلہ کی رُو سے ملا تھا، اُس سب کی مانگ سکھوں کی طرف سے ہوتی۔ اگر چہ مسلمانوں کو وائسرائے کی کونسل میں ضرور جگہ ملنی چاہیئے تو سکھوں کو بھی۔ اگر مسلمانوں کے لئے جُداگانہ حلقۂ اِنتخاب ہوں تو سکھوں کے لئے بھی۔ اِسی طرح بہت زوردار بحث ہوتی۔ مسلمانوں اور سکھوں میں مطالبات کا مقابلہ سا ہو گیا۔ مگر لوگوں کے مزاج میں نہ گرمی تھی نہ ترشی۔ اِتنے دِنوں کی گرما گرم بحث میں دو تین ایسے موقعے آئے۔ جب کسی نے کچھ جوش میں آکر کوئی سخت بات کہہ دی یا اُٹھ کر چلے جانے کی آمادگی ظاہر کی۔ مالوی جی کے صبر کی انتہا نہ تھی، کچھ لوگ تو بحث سے تھک جاتے تھے وہ یہ بھی چاہتے تھے، کچھ بھی طے ہو جائے یا جس معاملے پر ایک رائے نہ ہو اُسے چھوڑ کر اور باتوں پر غور ہو مگر مالوی جی چھوڑتے ہی نہیں تھے۔ آخر بہت سی باتوں پر ایک رائے ہو بھی گئی۔ مگر اِس بات پر اتفاق رائے نہ ہو سکا کہ مرکزی آئین ساز اسمبلی میں مسلمانوں کے لئے ایک تہائی جگہیں محفوظ رکھنی چاہئیں۔ اس میں ہندوؤں کی طرف سے سو میں بتیس جگہیں دینے کی بات کہی گئی۔ کئی دنوں تک باتیں کرنے کے بعد سو میں اکتیس یا بتیس تک جگہ دینے کی رضامندی ظاہر کی گئی مگر ۳۳½ تک ابھی نہیں پہنچے تھے۔ اِسی طرح سندھ کا الگ صوبہ بنانے کے بارے میں بھی اتفاقِ رائے نہ ہو سکا تھا مگر معلوم ہوتا تھا کہ شاید اِس میں رضامندی ہو بھی جائے۔

آخر رائے ٹھہری کہ اِس طرح کی دو تین باتیں غیر طے شدہ رہ گئی ہیں۔ اُن کے متعلق ایک ہفتہ بعد کلکتہ میں پھر سب لوگ ملیں اور وہیں آخری فیصلہ کیا جائے۔ میکڈانلڈ فیصلہ میں یہ بات تھی کہ وہ فیصلہ رد کر دیا جائے گا۔ بشرطیکہ ہندو مسلمان اور دوسرے لوگ آپس

میں مل کر کوئی دوسرا سمجھوتہ کرلیں۔ اِسی شرط کی وجہ سے اچھوت لوگوں کے الگ حلقۂ انتخاب کو پونہ کا سمجھوتہ ہو جانے پر مسٹر میکڈانلڈ نے ہٹا دیا تھا کہ آپس کا سمجھوتہ اگر ہو جائے گا تو جو تلخی میکڈانلڈ ایوارڈ سے پیدا ہوئی تھی وہ دُور ہو جائے گی۔ مگر ہم لوگ ابھی برٹش سرکار کے ہتھکنڈوں کو نہیں سمجھ پائے تھے۔ جب بہت دِنوں میں اِتفاق رائے ہو گیا اور ایسا معلوم ہونے لگا کہ اب صرف مرکزی دستور ساز اسمبلی میں نمایندگی کی بات رہ گئی ہے اور وہ بھی شاید کلکتہ میں طے ہو جائے گی۔ عین اسی وقت برٹش سرکار نے انگلستان سے ایک اعلان شائع کر دیا۔ ہم لوگ کلکتہ جا رہے تھے اور راستے میں ریل پر ہی یہ اعلان دیکھنے کو ملا۔ اس میں مرکزی اسمبلی میں ایک تہائی نِشستوں کا مطالبہ منظور کر لیا گیا تھا۔ جس بات پر ہم اتنی بحث کر چکے تھے اور جس پر ایک بار اور غور کرنے کے لئے ہم کلکتہ جا رہے تھے وہ حکومت نے ٹھیک اسی وقت دے دی۔ ہم سمجھ گئے کہ اب اِس کانفرنس کا کام ختم ہو گیا۔ برٹش سرکار میکڈانلڈ فیصلہ کو کسی طرح بدلنا نہیں چاہتی تھی۔ اِس کے قائم رہنے سے ہی آپس کے جھگڑے قائم رہیں گے۔ وہ اگر ہمارے سمجھوتہ کی وجہ سے رَد کر دیا گیا اور اُس کی جگہ ہمارا آپس کا سمجھوتہ رہ گیا، جس کو ماننے کے لئے اخلاقی صورت سے سب پابند ہوں گے تو پھر برٹش راج کو تیتر، بٹیروں کی جیسی پالی لڑانے کا موقعہ نہیں رہے گا اور نہ بلّیوں کی لڑائی میں بندر بانٹ کا ہی۔ اِس لئے یہ موقع اس فیصلہ کی ایک کمی کو پورا کرنے کے لئے انتہائی موزوں سمجھا گیا اور فوراً اعلان کر دیا گیا۔ کانفرنس ختم ہو گئی۔ ہم کلکتہ میں ملے، مگر یہ ملنا برائے نام تھا۔

کانفرنس کا اتنا اچھا اثر سارے ملک پر پڑا تھا کہ سبھی لوگ آس لگائے بیٹھے تھے کہ اب معاملہ طے ہو کر ہی رہے گا۔ اس کی خبر پاکر مہاراجہ الور الہ آباد آ گئے تھے۔ اُن کی اور

مالوی جی کی خواہش تھی کہ کانفرنس کے آخری اجلاس میں جو ایک عام جلسہ کی صورت میں وہ بھی بولیں ۔ وہ جلسہ ہوا بھی جس میں بتایا گیا کہ سب باتیں طے ہوگئی ہیں اور جو دو ایک باتیں رہ گئی ہیں وہ بھی طے ہو جانے والی ہیں ۔ مہاراجہ صاحب کی بھی اچھی تقریر ہوئی ۔ بعد میں اُن کے ساتھ جو سُلوک ہوا اُس سے معلوم ہو گیا کہ برٹش سرکار سے وہ جتنے بیزار تھے ۔ اِس سے بھی زیادہ برٹش سرکار اُس سے بیزار تھی تھوڑے ہی دِنوں بعد وہ گدی سے اتار دئے گئے ۔ کچھ دنوں بعد اُنہوں نے انگلستان میں خودکشی کرلی ۔

اِس جلسہ کے وقت تک ہم لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ اِس کانفرنس کے ذریعے ہم لوگ اِتّحاد قائم کرلیں گے ۔ مجھے اِس کانفرنس میں ایک بات سے تو اُمید بندھی اور میں نے دیکھا کہ بہت سی باتوں میں اتّفاق رائے ہو گیا ہے مگر بحث سے میں بھی کبھی کبھی اُکتا جاتا تھا ، اگرچہ میں بحث میں بہت کم حصّہ لیتا تھا ۔ کبھی کبھی مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ چھوٹی باتوں کو لے کر ہم آپس میں جلد متّفق الرّائے نہیں ہو سکتے تھے ۔ بتیس اور ۳۲½ میں بہت تھوڑا ہی فرق ہے ۔ مگر ہم اِس کو بھی نہ سلجھا سکے ۔ اِس کے لئے کانفرنس ملتوی کرنی پڑی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ برٹش سرکار نے لاٹھی ماردی اور اُس گرہ کا سُلجھنا غیر ممکن سا ہو گیا ۔

دوبارہ گرفتاری اور یونائٹڈ پارٹی

کلکتہ میں گیا تو تھا اِتحاد کانفرنس کے کام سے۔ مگر وہاں کچھ ٹھہر جانا پڑا۔ میں نے وہاں تحریک کے لئے بھی کچھ کام کرلیا۔ ان دِنوں روپیوں کی ضرورت تھی۔ اِس ضرورت کو پورا کرنے میں میں نے کچھ ہاتھ بٹالیا۔ لوگوں میں تحریک کے لئے جوش اور اعتقاد تھا۔ مگر لوگ بہت ڈر گئے تھے، اِسی لئے کوئی مال دار آدمی کھلّم کھلّا مدد کرنے کو تیار نہیں تھا، مگر چُپ چاپ پیسے دینے والے سب تھے۔ اُس کی ایک بہت ہی موزوں مِثال یہ دینا مناسب ہوگا جب میں بنارس میں ٹھہرا ہوا تھا تو ایک دِن کہیں جاتے ہوئے سڑک پر ایک پرانے واقف کار دوست سے ملاقات ہوگئی۔ وہ گاندھی جی کے یہاں آیا جایا کرتے تھے۔ اُنہیں دیکھ کر کچھ تعجّب ہوا۔ وہاں اُنہوں نے مجھ سے اِتنا ہی جان لیا کہ میں بابو شیو پرشاد گُپت کے یہاں ٹھہرا ہوں وہ اگر مجھ سے ملے، اُنہوں نے کہا "سُنا ہے کہ تحریک کے لئے روپیوں کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت مدراس اور بہار میں خاص طور پر محسوس ہورہی ہے"۔ میں نے کہا "روپیوں کی ضرورت تو ہے ہی"۔ روپئے وہ ساتھ لائے تھے آج مجھے ٹھیک یاد نہیں" مگر کل ہند کام کے لئے آٹھ دس ہزار روپئے کے نوٹ اُنہوں نے میرے ہاتھ میں رکھ دئے۔ میں بہت ممنون

ہوا اور اُن کی مرضی کے مطابق روپئے مناسب جگہوں پر بھجوا دیئے۔ اِسی طرح لوگوں کی مدد کلکتہ میں ملی۔ کلکتہ سے میں پٹنہ واپس آگیا۔

مجھے جیل سے نکلے تقریباً چھ مہینے گزر چکے تھے۔ دِن گزرتے دیر نہیں لگتی۔ اِسی درمیان دوبارہ بیمار پڑا۔ گاندھی جی کی اُپواس اور پونہ کے سمجھوتے کے وقت وہاں حاضر رہا۔ ہریجن لوگوں کی خدمت کے متعلق یاترائیں اور سبھائیں کیں۔ الہ آباد کی اتحاد کانفرنس کے طویل اِجلاس میں کام کرنا اور پھر کلکتہ میں اسی کے لئے آنا پڑا۔ یہ سب کرتا ہوا بھی میں برابر محسوس کیا کرتا تھا کہ مجھے باہر نہیں رہنا چاہیئے۔ میں ہی کانگریس کا صدر یا ڈکٹیٹر سمجھا جاتا تھا اور اُس زمانے کی رسم کے مطابق اپنی جگہ کے لئے نامزد کرتا تھا۔ اِلہ آباد میں اِتّحاد کانفرنس کے ختم ہونے کے وقت ہی میں نے سوچ لیا تھا کہ اب میں کلکتہ سے واپسی پر ہی جیل یاترا کروں گا۔ وہاں پر راجاجی اور شری اینے بھی تھے۔ اُن سے میں نے صلاح لی اور راجاجی کو نامزد کرنا چاہا مگر اُنہوں نے ابھی کچھ وقت اور ہریجن طبقہ کی خدمت کا کام کرنے کی خواہش ظاہر کی۔ آپس کے مشورے کے بعد میں نے شری اینے کو نامزد کر دیا۔ میری گرفتاری کے بعد وہی ڈکٹیٹر ہوئے۔

کلکتہ سے واپسی پر میں پٹنہ میں موزوں دِن کے لئے انتظار کر رہا تھا۔ بڑے دِن کی چھٹیاں ہو رہی تھیں۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ۴ جنوری ۱۹۳۳ء کو میں کسی طرح گرفتار ہو جاؤں گا۔ ۴ جنوری کو ہی ۱۹۳۲ء میں حکومت نے گاندھی جی کو گرفتار کر کے دورِ استبداد شروع کیا تھا۔ اُس کی یادگار میں اِس سال بھی ایک اِعلان کانگریس کی جانب سے پڑھا جانے والا تھا۔ اِسی درمیان ایک دِن آچاریہ کرپلانی جو باہر تھے، مجھے ملنے آئے۔ وہ کچھ روپیوں کے بندوبست کے لئے ہی آئے تھے۔ جو کچھ کلکتہ میں ہوا تھا میں نے اُن کو بتا دیا۔ کسی دوست

کے نام سے جو مجھے یاد نہیں ہے، انہیں ایک خط بھی دے دیا۔ وہ اس خط کو لے کر جا رہے تھے پٹنہ اسٹیشن پر وہ گرفتار کر لئے گئے۔ گرفتاری ہوتے ہی انہوں نے وہ خط پھاڑ کر پھینک دیا۔ مگر پولیس نے ٹکڑوں کو یک جا کر کے ترتیب دے کر پورا خط پھر تیار کر لیا۔ اُن پر مقدمہ چلا۔ وہ بانکی پور جیل کے اندر ہی پیش ہوا۔ میں بھی پیشی میں مقدمہ دیکھنے گیا۔ مقدمہ ختم ہونے پر میں باہر نکلا۔ اپنی سواری پر جوں ہی بیٹھنا چاہتا تھا کہ پولیس افسر نے آکر مجھے خبر دی کہ مجھے بھی وہیں رہ جانا چاہئے۔ میں فوراً پھر پھاٹک کے اندر داخل ہوا۔ کرپلانی جی اور بابو متھرا پرشاد پہلے ہی سے وہاں آ گئے تھے۔ متھرا بابو ۲۶ جنوری کا اعلان پڑھنے پر گرفتار ہوئے۔ میں بھی اُن کا ساتھی ہو گیا۔ ایک دو دن بعد مجھ پر بھی مقدمہ چلا، متھرا بابو کو ۱۸ مہینے، کرپلانی جی کو چھ مہینے اور مجھے پندرہ مہینوں کی سزا ہوئی۔ مجھے تعجب ہوا کہ مجھے ۱۵ مہینے کیوں ملے جب متھرا بابو کو اٹھارہ مہینے دئے گئے۔ میں نے مذاق میں مجسٹریٹ سے پوچھا بھی۔ یہ وہی سابق متعارف مجسٹریٹ تھے جنہوں نے مجھے چھپرا میں سزا دی تھی اور جو میری وکالت کے زمانے کے میرے پرانے مؤکل بھی تھے۔ خیر چند دن بعد ہم لوگ ہزاری باغ پہنچا دئے گئے۔

ہزاری باغ میں پھر اُسی طرح پڑھنے اور چرخہ کاتنے میں وقت گزرنے لگا۔ خان برادران ابھی تک وہیں تھے۔ کچھ دنوں کے بعد اخباروں سے پتہ چلا کہ گاندھی جی کو ہریجنوں کے متعلق جو سہولت ملی تھی وہ بند کر دی گئی اس لئے انہوں نے پھر انشن (ترک غذا) کر دیا۔ آخر کار حکومت کو انہیں یہ سہولت دینی پڑی اور اُن کو چھوڑ دینا بھی پڑا۔ باہر نکل کر انہوں نے ملک کی حالت دیکھی۔ انہوں نے ہریجنوں کی جانب اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کی طرف سے کفّارہ اور اُن کے فرائض سے روشناس کرانے کے لئے ۲۱ دن کا برت کیا۔ اِس سے

ہم لوگ بہت فکرمند ہوئے۔ وہاں روزانہ ہم لوگ پرارتھنا (دعا) کرتے۔ یوں تو شام کے وقت عین کوٹھری بند ہونے کے پہلے جماعتی دُعا ہم لوگ برابر کرتے ہی تھے۔ مگر اِس برت کے دِنوں میں اور بھی زیادہ پرارتھنا ہوتی۔ کوئی گیتا پڑھتا، کوئی رامائن کا پاٹھ کرتا، کوئی صرف پھل کھا کر رہتا۔ اپنی اپنی پسند اور مقدور کے مُطابق بہتیروں نے کچُھ نہ کچُھ اِصلاحِ نفس کے لئے وہاں کیا۔ جس دِن یہ ۲۱ دن کا برت بعدِ تکمیل ختم ہوا۔ اُس دِن ہم لوگوں نے جمع ہو کر خاص پرارتھنا کی اور ایشور کا شُکریہ ادا کیا۔

اِس اُپواس کے اثر سے اچھے ہو جانے کے بعد۔ گاندھی جی نے ایسے کانگریسیوں کی سبھا کی جو باہر تھے۔ اِس میں مُلک کی حالت پر بہت تبادلۂ خیالات ہوا۔ اُس زمانے میں پنڈت جواہر لال نہرو بھی باہر آگئے تھے۔ ہمیں پتہ چلا کہ ستیہ گرہ کی صورت انفرادی کر دی گئی ہے۔ سبھی صوبوں میں پھر سے کچُھ بیداری ہوئی۔ کچھ لوگ انفرادی صورت میں پھر جیلوں میں گئے۔ اس میں بِہار نے اچّھا جوش دکھایا۔ یہاں چھ سات سو سے زیادہ آدمی گرفتار ہوئے۔

جب حکومت نے بہت سختی کے ساتھ جبر کر کے کانگریس کے لئے نہ مکان رہنے دیا، نہ رقم اور نہ کھُلے طور پر کام کرنے والے۔ تب کچھ لوگوں نے تنظیم کو قائم رکھنے کے لئے چھُپ کر ہی کام کرنا شروع کر دیا۔ اُنہوں نے کام بھی کیا اور کانگریس کی تنظیم کو ٹوٹنے بھی نہیں دیا۔ تقریباً سبھی صوبوں میں صوبائی کمیٹیاں کام کرتی رہیں اور اِس طرح ضلعوں میں بھی کمیٹیوں کے نمایندے کام کرتے رہے۔ یہ زنجیر ٹوٹ نہیں سکی۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ہدایت اور منصوبے سبھی صوبوں میں پہنچتے رہے۔ اور اُن کے مطابق تھوڑا بہت کام بھی ہوتا رہا۔ مگر عام لوگوں میں جن میں سے نئے ستیہ گرہی اور اور کارکُن ملتے، جوش کم ہوتے لگا۔

چھپ کر کام کرنے کا اثر بالآخر اچھا نہیں ہوا۔ ستیہ گرہ کی لڑائی اِس بارے میں اور لڑائیوں سے الگ نوعیت کی ہے۔ اِس میں لیڈروں کو ہی آگے میدان میں کودنا پڑتا ہے۔ اپنے کو ہی اُنہیں سب سے پہلے آگ میں جھونکنا پڑتا ہے۔ آج کل کے ہتھیاروں کی لڑائی میں جرنیل آگے نہیں جاتا۔ اکثر تو وہ میدانِ جنگ میں جاتا ہی نہیں وہ پیچھے رہ کر ہی فوجوں کو احکام دیتا ہے۔ فوج بھی یہ اُمید رکھتی ہے کہ جرنیل بھی اپنے آپ کو پیچھے رکھتے ہوئے فوج کی رہنمائی کرے گا۔ اِس لئے اُس کے پیچھے رہنے سے بھی فوج پر بُرا اثر نہیں پڑتا۔ مگر ستیہ گرہ میں فوج بھی اُمید رکھتی ہے کہ سردار ہی سب سے آگے جوجھے گا۔ اِس لئے اِس میں اُس کے پیچھے رہنے سے فوج میں قدرتاً بے اطمینانی اور کم زوری آ جاتی ہے۔ ایسا ہی ۱۹۳۳ء میں بھی ہوا۔

جب میں باہر تھا سنہ ۱۹۳۲ء میں ایک بات اِس صوبے میں ہوئی۔ گول میز کانفرنس وغیرہ کی کارروائیوں سے اِتنا یقینی معلوم ہوتا تھا کہ کچھ نہ کچھ دستور و آئین میں اِصلاح ہوگی ہی۔ اور چاہے وہ اِصلاح کانگریس کو مطمئن کرے یا نہ کرے۔ نئے انتخابات تو ہوں گے ہی اور عوام کو حصّہ لینا پڑے گا۔ بہار ہی کیا سارے مُلک میں کسانوں کی ہی بڑی تعداد ہے اُن کے ہاتھوں میں بہت ووٹ ہوں گے۔ کانگریس پر اُن کا پورا اثر تھا۔ اس کا مظاہرہ سنہ ۱۹۲۳ء اور سنہ ۱۹۲۶ء کے انتخاب میں ہو چکا تھا۔ سنہ ۱۹۳۰ء اور سنہ ۳۳-۱۹۳۲ء کے ستیہ گرہ کے بعد وہ اثر بڑھا ہی تھا، گھٹا نہیں تھا۔ یہ سمجھ کر بہار کے گورنر نے بہار کے زمینداروں کو کسانوں کی تنظیم کے لئے حوصلہ دلایا تھا۔ ظاہر تھا کہ کسانوں کا جھگڑا ابھی زمینداروں کے ساتھ ہوا کرتا تھا۔ اِس لئے اُنہوں نے ایک نئی پارٹی بنائی جس میں کسانوں کو بلانے کی بھی کوشش کی گئی۔ اِس پارٹی کا نام یونائیٹڈ (متحد) پارٹی پڑا۔ اُن لوگوں کی خواہش تھی کہ جب تک کانگریس والے

لڑ رہے ہیں۔ ہم لگان کے قانون میں کچھ ایسی تبدیلی کریں گے جس سے کسانوں کو کچھ سہولت مِل جائے۔ اور اِس طرح اُن کو ملالیں گے۔ جب نیا انتخاب آئے گا اور کانگریس اُس میں حِصّہ لے گی تو یہ پارٹی اتنی مضبوط ہو چکے گی، اور کسان اُس کا اتنا ساتھ دیتے رہیں گے کہ کانگریس مقابلہ نہیں کرسکے گی۔

اِس پارٹی کے قاعدے بُرے نہیں تھے۔ اگرچہ کانگریس کی نگاہ میں وہ کافی نہیں تھے۔ اُس نے بھی اپنا نصب العین ڈومینین اسٹیٹس (حکومتِ درجۂ نوآبادیات) مان لیا۔ اور جس طرح کی قراردادیں لبرل فیڈریشن (اعتدال پسندوں کی جماعت) میں ہوا کرتی ہیں، اِسی طرح کی کچھ قراردادیں بھی کیں۔ بِہار میں کانگریس کے سوا کوئی پارٹی نہیں تھی۔ اِس پارٹی کے لوگوں سے میری ملاقات اور گفتگو بھی ہوئی تھی۔ میں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ کوشش کانگریس کے مدِ مقابل کو کھڑا کرنے کے لئے کی جارہی ہے، اور اِس میں گورنر کا بھی اِشارہ ہے، تو بھی میرے دل میں ایک لمحہ کے لئے بھی یہ اندیشہ نہ ہوا کہ یہ پارٹی کانگریس کا مقابلہ کرسکے گی۔ کانگریس کا اثر اُس کی خِدمت اور ایثار کی وجہ سے ہے۔ اِس پارٹی میں وہ بات نہ ہوسکے گی۔ میں یہ بھی سمجھتا تھا کہ جو پارٹی انتخاب میں سیٹیں لینے کے لئے ہی بنائی جارہی ہے اُس میں آپس کے جھگڑے ہوئے بغیر نہ رہیں گے۔ کیوں کہ پارٹی کے اُمیدواروں کی تعداد نشستوں سے کئی گنی زیادہ ہوجائے گی اِس کے علاوہ آپس میں مقابلہ بھی ہوتا رہے گا۔ اِس لئے مجھے یہ ڈر نہیں تھا کہ یہ پارٹی کانگریس کا مقابلہ کرسکے گی۔ میں یہ بھی سمجھ چکا تھا کہ اگر ایک ایسی بیچ کی پارٹی ہوجائے تو کچھ بُرا بھی نہ ہوگا۔ کیوں کہ جب کبھی حکومت سے جنگ کرنے میں کانگریس مُبتلا ہوجاتی ہے تو تعمیری کام کرنے والا بھی کوئی نہیں رہ جاتا۔ شاید اِس پارٹی سے موقع پر

مُلک کی کچھ خدمت ہو سکے گی۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ اگر یہ کسانوں کو اپنی طرف سے کچھ سہولتیں دے بھی دے گی تو اِس سے بھی کسانوں کا فائدہ ہی ہوگا اور پھر جب کانگریس کے ساتھ اس کا مقابلہ ہوگا تو کسان صرف کانگریس کا ہی ساتھ دیں گے اور سوراج کی بات کو نہیں بھولیں گے۔ اِس لئے میں اس پارٹی کی تنظیم سے بےفکر تھا۔ میں نے اس بارے میں ایک بیان بھی دیا۔

اِس بیان کی خبر ہزاری باغ میں دوستوں کو مل گئی تھی۔ کچھ لوگ اِس سے غیر مطمئن ہوئے۔ وہاں میرے پہنچنے پر اِس بارے میں باتیں ہوئیں۔ میں نے اپنے خیالات بتا دیئے۔ مگر شاید وہ مطمئن نہ ہوئے۔ ہم لوگ وہیں تھے جب اِس پارٹی کی طرف سے قانون لگان میں کچھ اِصلاح کی بات چیت چلی۔ میں تو یہ سب جانتا ہی تھا اور جان کر بھی بےفکر تھا مگر کچھ دوست اِسی سے اور گھبرائے۔ وہ سوچنے لگے کہ اِس طرح کی پارٹی کی مخالفت ضروری ہے۔ کانگریس تو جیل میں تھی اور غیر قانونی جماعت بھی بنا دی گئی تھی۔ اِس لئے کسان سبھا ہی مخالفت کر سکتی تھی۔ شاید پہلے کی ہی سبھا تھی جو کانگریس کے زور کی وجہ سے کچھ خاص کام نہیں کر رہی تھی۔ اُسے کچھ لوگ پھر سے زندہ کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ وہاں سے اُن لوگوں کو حوصلہ افزائی کے پیغام بھیجے گئے۔ سوامی سہجانند جی سے خاص طور پر اصرار کیا گیا کہ وہ کسان سبھا کی تنظیم کر کے قانونِ لگان کی تجویز کی مخالفت کرائیں۔ میں اُسے غیر ضروری سمجھتا تھا۔ وجہ اُوپر بتا چکا ہوں۔ مگر میں اِس کی مخالفت نہیں کر سکتا تھا۔ میں چُپ رہا۔ برج کشور بابو بھی کسان سبھا جیسی ایک دوسری جماعت کی ضرورت نہیں سمجھتے تھے۔ مگر اُنھوں نے باہر رہ کر بھی اور میں نے جیل کے اندر رہتے ہوئے اس کی مخالفت نہیں کی۔ اِس طرح کسان سبھا کی زبردست تنظیم ہم لوگوں

کی غیر حاضری میں ہونے لگی۔ لگان قانون میں اِصلاح کی مخالفت زوروں سے ہونے لگی۔ پہلے کی کسان سبھا کے کچھ کارکن اِس کِسان سبھا کی مخالفت اور اصلاح حمایت زوروں سے کرنے لگے۔ یہ بات ایک ڈیڑھ برس تک چلتی رہی۔ جیل سے ہم لوگوں کے چھوٹنے تک یہ طے نہیں ہوئی تھی۔

میری سخت بیماری

میں ۱۹۳۳ء کی جولائی کے پہلے ہفتہ میں بیمار پڑ گیا۔ کچھ کھانسی شروع ہو گئی۔ شاید اچانک سردی لگ جانے سے ہی ایسا ہوا۔ پہلے تو میں سمجھا کہ یہ معمولی کھانسی ہے۔ جلد ٹھیک ہو جائے گی، مگر یہ کم نہ ہو کر دن پر دن بڑھتی چلی گئی۔ دمہ بھی زور پکڑ گیا۔ ایک بار تو اتنے زور سے دمہ اُٹھا کہ تقریباً دو دن تک میں بہت پریشان رہا۔ اس کے بعد سوئی لگائی گئی۔ دمہ کچھ کم ہوا، تب میں کچھ کھانے بیٹھا، جیسے ہی چمچہ لے کر دودھ اور روٹی کا ٹکڑا منہ میں دیا کہ پھر دمہ بہت زوروں سے شروع ہو گیا اور سانس اس طرح گھٹنے لگا گویا دمِ آخر ہے۔ میں بے ہوش سا ہو گیا۔ جیل کے ڈاکٹر نے آکر کچھ سنگھایا، تب ہوش آیا۔ اس کے بعد بہت زور کی پیچش ہو گئی۔ دن میں چوبیس پچیس دست آنے لگے۔ کم زوری بہت بڑھ گئی۔ جسم بہت لاغر ہو گیا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل نے سرکار کو لکھا کہ پٹنہ ہسپتال میں علاج کے لئے بھیجا جائے پہلے اس پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ بھائی صاحب کو خبر ملی۔ وہ گھبرا کر وہاں پہنچے۔ میری حالت دیکھ کر بہت متفکر ہوئے۔ رانچی گئے۔ کچھ دوستوں سے ملے۔ آخر سرکاری حکم مجھے پٹنہ بھیجنے کے لئے ہوا۔ یہ ہوا ستمبر کے پہلے ہفتہ میں بیماری شروع ہونے سے دو مہینے بعد۔

حکم تھا کہ پٹنہ جیل بھیجا جاؤں اور پٹنہ ہسپتال میں بیماری کی جانچ کی جائے۔ مجھے جب حکم بتایا گیا تو میں نے کہا کہ اگر پٹنہ ہسپتال میں نہیں جانا ہے اور پٹنہ جیل میں ہی جانا ہے تو یہیں رہنا بہتر ہے مگر مجھے بتایا گیا کہ قاعدہ یہی ہے لکھنے کا۔ اِس کے معنی یہ ہیں کہ میں ہسپتال بھیجا جا رہا ہوں۔

دوسرے دِن سویرے کسی طرح مجھے پٹنہ لے آئے۔ بھائی بھی ساتھ ہی آئے۔ پہلے پٹنہ جیل لے جاکر فوراً ہسپتال لے گئے۔ عِلاج شروع ہوا۔ کئی دنوں تک تو حالت خراب رہی مگر آہستہ آہستہ سُدھرنے لگی۔ اچانک ایک اور خبر ملی کہ سرکاری حکم آیا ہے کہ فوراً بانکی پور جیل بھیج دیا جاؤں۔ شاید کسی نے سرکار کے پاس کچھ خبر بھیج دی تھی، یا چغلی کھائی تھی کہ میرے پاس بہت لوگ مِلنے آتے ہیں، اور میں چارپائی پر پڑے پڑے تحریک چلا رہا ہوں۔ بات بالکل جھوٹی تھی۔ مجھ سے لوگ مِلنے تو آتے تھے مگر وہ محض بیماری کی وجہ سے، تحریک کے بارے میں تو میں نے کسی سے بات ہی نہیں کی۔

خیر، ہسپتال سے میں فوراً بانکی پور جیل بھیج دیا گیا۔ وہاں بھی وہی دوا جاری رہی، میں کچھ اچھا تو ہو ہی گیا تھا۔ جیل میں بھی افاقہ ہوتا رہا۔ سردی کے دِن آ رہے تھے جب میری طبیعت اکثر خراب ہوا کرتی ہے۔ ایک دِن اچانک پھر بڑے زور کا دمہ شروع ہو گیا دو دِن میں حالت بہت خراب ہو گئی۔ سول سرجن نے بہت کوشش کی مگر کوئی اِفاقہ نہ ہوا، آخر جیل سے مجھے ہسپتال بھیجنے کا انتظام کیا گیا۔

میں بہت بُری حالت میں ہسپتال پہنچایا گیا۔ اِس بار سختی بھی بہت تھی۔ حکم تھا کہ گھر کی دو عورتیں ہی ساتھ رہ سکتی ہیں اور کام کے لئے ایک یا دو نوکر۔ کوئی دوسرا مِلنے نہیں آ سکتا۔ ہفتہ میں ایک بار گھر کے لوگوں سے ملاقات ہو سکتی ہے۔ وہ بھی پولیس اور جیل کے

کارکنوں کی موجودگی میں۔ مجھے اِس سے کوئی خاص تکلیف نہیں تھی۔ کیونکہ میں پہلے بھی کسی سے تحریک کی باتیں نہیں کیا کرتا تھا اور اب تو اِتنا بیمار تھا کہ چارپائی سے اُٹھ کر کرسی پر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس بار بیماری پہلے سے بھی زیادہ سخت تھی۔ ہزار کوشش کے باوجود اِس میں کمی نہیں آئی تھی۔ کبھی کبھی تو اِنجکشن پر اِنجکشن دینا پڑا۔ سانس کا پھولنا، چار پانچ گھنٹوں کے لئے کچھ کم ہو جاتا پھر جوں کا توں۔ پھر سوئی لگائی جاتی۔ نومبر اور دسمبر بہت خراب گزرے۔ اگرچہ میں بیمار بہت پڑتا ہوں مگر اتنی سخت بیماری کبھی نہیں ہوئی تھی۔ دسمبر میں ہسپتال کے ڈاکٹروں نے حکومت کو لکھا کہ حالت خراب ہے اور بیماری قبضہ میں نہیں آتی رات کو اتنی پریشانی رہتی کہ میڈیکل کالج کے دو طالب علم باری باری سے آ کر دیکھ بھال کرتے، سرکار کا کام جلد تو ہوتا نہیں۔ آخر حکم ہوا کہ میڈیکل بورڈ میری جانچ کرے۔ میرا تجربہ تھا کہ دسمبر کے آخر سے ہر سال بیماری کا زور کچھ کم ہو جایا کرتا ہے۔ اِس سال بھی ایسا ہی ہوا۔ جب میڈیکل بورڈ سنہ ۱۹۳۴ء کی جنوری کے پہلے ہفتہ میں جانچ کرنے آیا، بیماری میں کچھ کمی آ چکی تھی۔ سب حالت اور روزانہ رپورٹ دیکھ کر بورڈ نے میری رہائی کی سفارش کی۔ مجھ سے کہا نہیں گیا۔ ایک سال سے زائد جیل میں ہو چکا تھا۔ پندرہ مہینے کی سزا تھی۔ شائد ڈیڑھ دو مہینے باقی رہ گئے تھے۔ حکومت نے ۱۵ فروری سنہ ۱۹۳۴ء کو رپورٹ پر غور کیا اور مجھے چھوڑ دینے کا حکم دیا۔

بہار کا قیامت خیز زلزلہ

ہسپتال میں چارپائی پر لیٹے لیٹے میں سوچ رہا تھا کہ جب بیماری کا بہت زور تھا اور یہ عالم تھا کہ اب کیا ہوتا ہے، تب کیا ہوتا ہے، تب تو سرکار نے کچھ کیا ہی نہیں، اب جب کچھ اچھا ہو گیا ہوں۔ صحت میں روز بروز بہتری ہونے کی اُمید ہے اور میعاد بھی پوری ہو چلی ہے، تب یہ مفت کا اِحسان مُجھ پر کیوں لادا جا رہا ہے۔ بیماری کی شدّت کے زمانے میں تو گھر کے کسی آدمی سے حتّٰی کہ بھائی سے بھی ہفتہ میں ایک بار ہی ملاقات ہو سکتی تھی۔ سختی اِتنی تھی کہ ایک بار میری بھابی چلی گئی اور میرے بھتیجے کی بیوی دو چار دِن کے لئے خدمت کرنے آئی۔ اُس کا ایک چار سال کا بچّہ تھا، جو اُس سے کبھی الگ نہ رہ سکتا تھا اُس پر حکم ہوا کہ صرف دو کے رہنے کی اِجازت ہے یہ تیسرا بچّہ ساتھ نہیں رہ سکتا۔ اُسے چلا جانا پڑا۔ اب کیوں یہ مفت کا اِحسان لیا جائے۔

میں اِسی اُدھیڑ بُن میں چارپائی پر کروٹیں بدل رہا تھا کہ چارپائی ہلتی ہوئی معلوم ہوئی۔ پھر مکان کے دروازے اور جنگلے ہلنے لگے، مُجھے خیال ہوا کہ میں بیماری کی وجہ سے اتنا کم زور ہو گیا ہوں اور اتنی دیر سے سوچ بچار میں لگا رہا ہوں اِسی لئے دماغ میں چکّر

آگیا ہے۔ میں اسی خیال میں تھا کہ میری بھاوج نے دوسرے کمرے سے چلا کر کہا، بھونچال آگیا ہے۔ اب میں سمجھا کہ کیا معاملہ ہے۔ کہا گیا کہ سب نکل بھاگو۔ میں فوراً چارپائی سے اُتر کر سامنے کے میدان میں کھڑا ہو گیا۔ زمین اتنے زور سے ہل رہی تھی کہ کھڑا رہنا مشکل تھا۔ بھیانک گھبراہٹ تھی۔ ہزاروں ریل گاڑیوں کی سی یک جائی آواز آرہی تھی اتنی زور کی گھڑگھڑاہٹ تھی۔ کچھ دوسرے بیمار جو اُس پاس کے کمروں میں تھے اور چل سکتے تھے میرے نزدیک آکر ہی کھڑے ہو گئے۔ میدان میں بہت سی گائیں چر رہی تھیں وہ دُم اُٹھا کر اِدھر اُدھر دوڑنے لگیں۔ ایک بار سب مل کر جہاں ہم لوگ کھڑے تھے وہاں اس طرح دوڑ آئیں کہ معلوم ہوا کہ ہم لوگوں پر حملہ کر رہی ہیں۔ مگر ایسا کچھ نہ کر کے دوڑتی ہوئی آکر ہم لوگوں کے پاس کھڑی ہو گئیں۔ گویا اُنہوں نے اس مقام کو محفوظ سمجھ کر اور ہم لوگوں کو اپنا محافظ سمجھ کر ہمارے پاس رہنا ہی مناسب سمجھا۔ اِتنے میں پاس ہی نرسوں کے رہنے کا دو منزلہ بڑا مکان گر پڑا۔ گھڑگھڑاہٹ اِتنی تھی کہ مکان گرنے کی آواز مشکل سے سُنائی دی۔ صرف دُھول اُڑتے دیکھ کر ہم نے اندازہ کیا کہ مکان گرا ہے۔ ہسپتال کے حصے جا بجا گرے مگر خوش قسمتی سے کوئی مرا نہیں نہ کوئی زخمی ہوا۔ کچھ دیر میں سکون ہوا۔

میں نے اندازہ کیا کہ بھونچال کوئی ساڑھے چار منٹ تک رہا ہوگا۔ پھر صوبے کے الگ الگ مقامات سے خبریں آئیں تو معلوم ہوا کہ زلزلہ جا بجا ساڑھے چار منٹ سے سات منٹ تک رہا ہے۔ سب لوگ اِدھر اُدھر سے ڈرے گھبرائے نکلنے لگے۔ اب گھر کے اندر جانے کی کسی کو ہمت نہ ہوتی تھی۔ میں جب سے ہسپتال آیا تھا یہ پہلا ہی موقع تھا کمرے کے باہر نکلا اور پہلا ہی موقع تھا کہ دوسرے لوگوں سے باتیں ہوئیں۔ باتیں اور کیا ہو سکتی تھیں۔ بھونچال کے ہی بارے میں تھیں۔ دوست دوڑ کر میری حالت دیکھنے آئے رفتہ رفتہ

خبریں آنے لگیں کہ شہر میں بہت سے مکان گر گئے ہیں۔ ہسپتال میں کچھ زخمی لوگ بھی لائے گئے۔ ہم لوگوں کی چارپائیاں باہر نکال دی گئی تھیں۔ شام تک وہیں پڑے رہے۔ جنوری کی سردی، زوروں کی ہوا، کڑاکے کا جاڑا۔ میرے سامنے سوال تھا کہ رات کو کیا کیا جائے مکان کے اندر جاکر لوگوں نے دیکھا کہ کئی جگہ دیوار پھٹ گئی تھی، مگر کوئی حصّہ گرا نہیں۔ میں نے سوچا کہ رات میں باہر رہنے سے سردی کی وجہ سے میری بیماری ضرور بڑھ جائے گی اور میں بچ نہ سکوں گا۔ اگر رات کو زلزلہ آیا تو پھر نکل آئیں گے۔ ہمّت کر کے میں اندر چلا گیا۔ دیکھا دیکھی کچھ اور مریض گئے مگر سب نہیں۔ پاس ہی بچّوں کا وارڈ تھا۔ اِس کا ایک حِصّہ گر گیا تھا۔ دیواریں کچھ کم زور ہو گئی تھیں اِسی لئے ہسپتال والوں نے سب کی چارپائیاں میدان میں ہی رکھوادیں اور اِسی سردی میں وہ رات کاٹنے لگے۔ رات کو ایک بجے زلزلے کے اور جھٹکے آئے۔ یہ بھی زبردست تھے کیونکہ چارپائیاں اِتنی ہلیں کہ میں جاگ اُٹھا اور باہر نکل آیا مگر یہ اِتنی دیر تک نہ رہا جتنی دیر تک دن کا زلزلہ رہا تھا۔ کسی طرح ہم لوگوں کو باہر کی کچھ خبر نہ ملی۔ شہر کی تھوڑی خبر ملی جس سے معلوم ہوا کہ شہر میں بہت بربادی ہوئی ہے۔

دوسرے دن سویرے دس بجے ڈاکٹر مجھے دیکھنے آئے۔ میں اُن سے باتیں کرتے کرتے برآمدے سے نیچے اُتر ہی رہا تھا کہ ایک جھٹکا اور آیا۔ ہم دونوں باہر نکل گئے۔ اُن سے پہلے پہل معلوم ہوا کہ منگیر کی حالت خراب ہے۔ اگرچہ واضح خبر نہیں ملی ہے۔ وہ منگیر کے ہی رہنے والے تھے اور بہت فکر مند تھے۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ سرکاری حکم ہے کہ جتنے ڈاکٹر مل سکیں تیار رکھے جائیں۔ جہاں جانے کا حکم ملے فوراً چلے جائیں اور ہسپتال میں بھی گھائلوں کی جگہ اور انتظام ٹھیک رکھا جائے۔ اب پتہ چلا کہ یہ زلزلہ دُور تک کرامات دِکھا چکا ہے۔

یہ بھی سُننے میں آیا کہ سرکاری سکریٹریٹ کا ایک حصّہ گر گیا ہے۔ سب کام تتر بتر ہو گیا ہے اسی ہلّہ میں میری رہائی کا حکم بھی نہ آسکا۔ دو دِن بعد چھوڑا گیا۔ اس دن سول سرجن نے آکر چار بجے مجھ سے کہا کہ میں چھوڑ دیا گیا ہوں اور جو چاہوں کر سکتا ہوں۔ پولیس کا پہرہ ہٹا دیا گیا کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ حکومت نے مُجھے زلزلہ کی وجہ سے چھوڑا۔ جیسا میں پہلے بتا چکا ہوں، بیماری کی وجہ سے میری رہائی کا حکم زلزلہ سے چند گھنٹے پہلے ہو گیا تھا، اور اس کی اطلاع بھی مُجھے مِل گئی تھی۔ زلزلہ کی وجہ سے دو دِن کی دیر ہو گئی۔ کیونکہ سب معاملہ ہی گڑبڑ میں پڑ گیا۔ جب اُتری بہار کی حالت کا اندازہ دو دِن کے بعد کُچھ لگنے لگا تو سرکار نے اُدھر کے رہنے والے کچھ ستیہ گرہیوں کو بھی چھوڑ دیا۔ اُن لوگوں کو میری رہائی کا عِلم ہوا میں سوچ ہی رہا تھا کہ زلزلہ زدوں کے لئے کچھ کرنا چاہیے اِتنے میں وہ لوگ آگئے۔ میں نے اُنہیں ترہٹ کے ضلع میں بھیجا۔ کچھ روپئے اُدھار لے کر اُن کے لئے کمبل خرید والئے اُن لوگوں کے پاس اوڑھنے کے لئے کچھ نہیں تھا وہ سب گرمی میں گرفتار ہوئے تھے اور چلتے وقت وہی گرمی کے کرتہ دھوتی واپس ملے تھے اور کُچھ خرچ مِلا تھا۔ اِس طرح چمپارن مظفرپور دربھنگہ اور سارن کی خبریں لینے اُنہیں بھیجا۔ ریل، تار سب بند۔ اِس کا بھی پتہ نہ تھا کہ وہ کیسے جائیں گے۔ اُنہوں نے ہمّت کر کے تار پر اور پیدل جا کر پتہ لگانا شروع کیا۔

میں نے مدد کے لئے روپیوں کی فکر کی اور ایک اپیل نکالنے کو سوچا۔ کئی روز گزر چُکے تھے۔ ابھی تک کچھ ٹھیک خبر نہیں ملی تھی مگر جو تھوڑی بہت خبر ملی تھی وہ بہت خطرناک تھی۔ ڈاکٹروں نے مجھے ہسپتال میں ہی روک رکھا تھا۔ میں بہت کم زور تھا مگر اِس وقت نہ جانے کہاں سے طاقت آگئی۔ میں نے ہسپتال سے ہی کام کرنا شروع کر دیا۔ ہزاری باغ سے متھرا بابو اور ستیہ نارائن بابو چھوٹ کر ہسپتال میں میرے پاس آگئے۔ کُچھ دوست ہسپتال

میں ہی تھے اور رائے ٹھہری کہ ایک اپیل نکالی جائے اور ریلیف کمیٹی کے نام سے ایک کمیٹی بنائی جائے۔ ہم نے طے کیا کہ یہ کمیٹی صرف کانگریسیوں کی نہ ہو کر سبھی پارٹیوں ے لوگوں کی ہو۔ ہم برابر ہر مصیبت کے وقت یہی کرتے آئے تھے۔ اِس بار بھی یہی کرنا تھا۔ ابھی یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ کتنا بڑا کام ہوگا۔ ابھی نقصان کی پوری خبر نہیں ملی تھی۔ گورنر نے بھی ایک جلسۂ عام کرنے کو سوچا۔ مسٹر سید عبدالعزیز جو اُن دِنوں ایک وزیر تھے، مجھ سے ہسپتال میں ملے۔ اُنہوں نے کہا کہ الگ اپیل نہ کر کے سرکار کے ساتھ مل کر کام کرنا ہی اچھا ہوگا۔ شفیع داؤدی صاحب بھی ملے اور اُن کی بھی یہی رائے ہوئی۔ اُنہوں نے یہ بھی کہا کہ اپیل سے آئے روپیوں کے سِوا سرکار اپنی رقم میں سے بھی صرف کرے گی اور ہم لوگوں کی اپیل پر بہت ملنے کی اُمید نہ کی جا سکتی تھی، کیونکہ ستیہ گرہ کی وجہ سے کانگریس کمیٹی کی تنظیم تتّر بتّر ہو گئی ہے اور کام کرنے والے بھی بہت ضلعوں میں ہیں۔ میں نے ان دونوں صاحبوں سے کہہ دیا کہ اس بارے میں سرکار جو کرے گی، اس کی مخالفت تو ہمیں کرنی ہی نہیں۔ مگر کچھ ایسے لوگ بھی ہوں گے جو سرکار کو پیسے نہ دے کر یہ چاہیں گے، کہ کوئی غیر سرکاری اِدارہ کام کرے۔ ہم لوگ ہر سنکٹ کے وقت ایسا کرتے آئے ہیں۔ اس لئے ہم سے عوام کی بھی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ سرکار سے ہمارا مقابلہ نہیں۔ جو لوگ ہمیں کچھ دیں گے اُسی کا اچھا سے اچھا استعمال کر کے چُپ ہو جائیں گے اور سرکار اگر ہم سے کچھ لینا چاہے گی تو ہم نہیں ہچکیں گے۔ ایسا کہہ کر میں نے کچھ دوستوں سے بات کی تو اُنہوں نے میری رائے پسند کی۔

ایک دن ایک چھوٹا سا جلسہ ہوا جس میں "بہار سنٹرل ریلیف کمیٹی کے نام سے ایک جماعت قائم کی گئی۔ میں اُس کا صدر بنایا گیا اور اُسی کے نام سے میں نے اپیل نکالی۔ اُس

کے بعد حکومت کی طرف سے ایک جلسۂ عام ہوا۔ اُس میں میں بھی شریک ہوا۔ اُنھوں نے بھی اپیل نکالی۔ میری اپیل پر چاروں طرف سے روپئے اور سامان آنے لگے۔ اخباروں میں اب تباہی کی تفصیل بھی چھپنے لگی۔ اُس کو پڑھ کر سارے مُلک میں اور غیر ملکوں میں بھی بِہار سے بہت ہمدردی پیدا ہوئی۔ پنڈت جواہرلال پٹنہ آئے۔ ترہٹ اور منگیر جاکر جہاں تباہی سب سے زیادہ ہوئی تھی اُنھوں نے بچشمِ خود ملاحظہ کیا۔ منگیر میں تو اُنھوں نے گرے مکانوں کا ملبہ کھود کر مردے نکالنے میں بھی مدد کی اور ایک طرح سے سب کے لئے نمونہ پیش کیا۔ بنگال کی سنکٹ تران ستمی (ازالۂ آفات کی کمیٹی) کی طرف سے شری ستیش چندر روپئے اور مال اسباب لے کر آئے۔ میں نے گاندھی جی کو بھی تار سے اطلاع دی۔ وہ اِن دِنوں بہت دُور صوبۂ مدراس میں کہیں ہریجن یاترا میں گھوم رہے تھے۔ تار پاتے ہی اُنھوں نے بھی اپیل نکالی اور رقم جمع کرنے لگے۔ کمیٹی کی طرف سے سبھی ضلعوں میں کارکن مقرّر کئے گئے۔ اور اُن کی ماتحتی میں بے شمار آدمی کام کرنے لگے۔ ہندوستان کے سبھی صوبوں سے روپئے آنے لگے۔ کپڑا، چاول اور دوسری کھانے کی چیزیں، برتن، کمبل دوا وغیرہ پہنچنے لگیں سب چیزوں کی ضرورت تھی۔ پٹنہ سے ہم ضرورت کے مطابق سب چیزیں مصیبت زدہ عِلاقوں میں بھیجنے لگے۔ دو چار دِنوں کے اندر ہی کام بہت بڑھ گیا۔ ہمارے بہت سے ساتھی جیلوں میں تھے حکومت نے تقریباً سب کو جو ترہٹ، بھاگل پور اور پٹنہ کمشنریوں کے رہنے والے تھے۔ رفتہ رفتہ چھوڑ دیا۔ وہ لوگ بھی آکر کام میں لگ گئے۔

پنڈت جواہرلال نہرو نے ایک دن پٹنہ میں ٹھہر کر مرکزی دفتر کی تنظیم اور دوسری باتوں میں اپنی صلاح سے مدد دی۔ وہ دو بار اس صوبے میں آئے اور جی جان سے منہمکِ کار تھے مگر افسوس ہے کہ اِس کے بعد ہی وہ گرفتار کر کے پھر جیل میں بند کر دیئے گئے۔ اِسی

لئے ہیں اُن کی رہنمائی سے زیادہ فائدہ نہ مل سکا۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل بھی جیل میں ہی تھے
اُنھوں نے گجرات میں، وہاں کے سیلاب کے زمانے میں خدمتِ خلق کا جو انتظام کیا تھا۔
اس کے تجربے کا بھی ہم لوگوں کو فائدہ نہیں مِلا۔ مگر مہاتماجی، سیٹھ جمنالال بجاج اور سردار
کے حلیف شری لکشمی داس پرشم داس وغیرہ آگئے اُترپردیش کے آچاریہ نریندر دیو اور
شری پرکاش جی پہنچ گئے۔ سب باہر سے آئے بھائیوں اور بہنوں کے نام گنانا مشکل ہے۔
اگر کسی کا نام چھوٹ جائے تو ہمارے لئے شرم کی بات ہوگی۔ مگر کچھ نام ایسے ہیں جن کا ذکر
نہ کرنا انتہائی احسان فراموشی ہوگی۔ اُن میں شری جے سی کمار آپا ہیں۔ یہ حساب کی جانچ کا
کام کیا کرتے تھے۔ ولائت سے اِس کی تعلیم حاصل کرکے بمبئی میں بڑی بڑی کمپنیوں کے
حِساب جانچا کرتے تھے اور گاندھی جی کے ساتھ آجانے پر وہ کام چھوڑ کر، گجرات ودیاپیٹھ
میں مصروفِ کار تھے۔ جب کانگریس نے ایک ایسی کمیٹی بنائی جس کے ذمّے ہندوستان
پر لادے ہوئے قرض کے بار کی تحقیقات تھی تو یہ بھی اس کے ممبر بنائے گئے۔ مہاتماجی نے
اِن کو حساب کی دیکھ بھال کے لئے یہاں بھیج دیا۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہے کہ اگر یہ نہ آگئے ہوتے
اور سارے حساب کا اچھا بیورا نہ کیا ہوتا تو ہم مشکل میں پڑ جاتے۔ ہمارے کام کرنے والوں
کی تعداد دو ہزار سے بھی زیادہ ہوگی۔ وہ بارہ ضلعوں میں بٹے ہوئے تھے، اِن میں تھوڑے ہی
ایسے تھے جو کچھ بھی حساب جانتے ہوں۔ کام بھی بہت طرح کے تھے اور سب کا حساب
الگ الگ رکھنا پڑتا تھا۔ یہ کام اِتنا پھیلا ہوا تھا کہ اِس کا سنبھالنا بہت ہی مشکل تھا مگر
اُن کے بتائے ہوئے طریقے سے حساب رکھنے پر سب کام ٹھیک ہوگیا۔

میں نے شروع میں ہی بہار بینک کو کمیٹی کا خزانچی بنا دیا تھا۔ روپئے کمیٹی کے
پاس اور سیدھے بینک کے پاس آتے تھے۔ ایک دن میں دو سو، تین سو منی آرڈر پہنچتے تھے۔

سینکڑوں پارسل روز آتے اور اُن میں ہر طرح کی چیزیں آتیں۔ سب کا حساب الگ رکھا جاتا مرکزوں میں پہنچ کر جب روپیوں اور چیزوں کا خرچ ہوتا تو اُس کا بھی حساب مرکزی دفتر کی دیکھ بھال ہی میں رکھا جاتا۔ کچھ دِنوں کے بعد جب ہم نے پہلی رپورٹ نکالی اور اُس کے ساتھ رقم اور سامان دینے والوں کے ناموں کی فہرست چھاپی تو وہ تقریباً چار سو صفحوں کی کتاب ہوگئی۔ سماجی کام میں روپئے پیسے کے معاملے میں حساب صاف رہنا نہایت ضروری ہے۔ کام کرنے والے ٹھیک اور موزوں طریقے سے عوام کے دئے روپئے خرچ کریں بھی، اور حساب ٹھیک نہ رکھیں تو بدنامی ہوجاتی ہے۔ اکثر بدنامی بے بنیاد ہوتی ہے۔ کیونکہ خرچ تو ٹھیک ہوا کرتا ہے مگر حساب کے علم سے ناواقفیت کی بنیاد پر اور سستی یا کاہلی کی وجہ سے حساب ٹھیک نہ رہنے سے بدنامی ہوجاتی ہے۔ جب اُمّید سے زیادہ لوگوں میں جوش نظر آیا اور روپئے برسنے لگے تو مجھے یہی فکر تھی کہ لوگوں کا اعتماد کہیں جھوٹا نہ پڑ جائے۔ مگر بفضلہ، اور خاص کر کُمار اُپّا جی کی اور اُن کے ماتحت کام کرنے والے سینکڑوں کام کرنے والوں کی دانش مندی اور مستعدی سے کام اچھی طرح پورا ہوگیا۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ لوگوں کے دئے ہوئے روپئے اور سامان کا اچّھا سے اچّھا استعمال ہوا حقیقت میں جیسا صحیح خرچ ہونا چاہیئے تھا ویسا ہی ہوا۔

بہار سنٹرل ریلیف کمیٹی کی خدمات

میں قید سے رہا ہونے کے بعد بھی دس دن تک ہسپتال میں رہا۔ مگر میں باہر بھی آیا جایا کرتا۔ روز بروز طاقت بڑھتی گئی۔ کثرتِ کار کا یہ عالم تھا کہ سویرے چار بجے اُٹھ کر چارپائی پر ہی لکھنے کا کام شروع کر دیتا۔ خطوں کی بھرمار تھی۔ اُن کا جواب دیتا اخباروں میں آئی ہوئی خبروں کے خلاصہ کو پھر نئی اپیل کی صورت میں بھیج کر لوگوں کو یہاں کی بدحالی کی خبر دیتا اور پھر اپنے مرکزوں سے آئے ہوئے خطوں کا جواب دیتا۔ یہ کچھ کم کام نہیں تھا مسٹر عزیز نے اپنا ایک چھوٹا مکان دفتر کے لئے دیا۔ مگر جلد ہی کام اِتنا بڑھ گیا کہ وہ جگہ ناکافی ہوگئی۔ تب ہم نے ایک دوسرا بڑا مکان کرائے پر لیا۔ دفتر کے کئی حِصّے کر دئے گئے سب کے چارج میں ایک ایک خاص کارکن رکھا گیا۔ شروع میں شری جے پرکاش جی ہی دفتر کے چارج میں رہے۔ بعد ازاں جب انوگرہ بابو رہا ہو کر آگئے اور کام بہت بڑھ گیا تو اُنہوں نے اُسے سنبھالا۔ جو کمیٹی ہم نے بنائی اُس میں سبھی پارٹیوں اور صوبوں کے لوگوں کو جنہوں نے مدد پہنچائی تھی، ممبر بنا لیا۔

تھوڑے ہی دنوں بعد گاندھی جی آئے۔ اُن کے آنے سے قبل میں نے سوچا کہ

میں پہلے ہی ایک بار اُن جگہوں کو دیکھ آؤں جہاں سب سے زیادہ نقصان ہوا ہے۔ یہ تقریباً زلزلے کے ایک مہینہ بعد ہوا۔ اب تک میں دفتر میں رہ کر کام کرتا تھا۔ کچھ کمزوری کی وجہ سے اور کچھ کام کی کثرت کے سبب۔ اب مدد دینے والے آگئے۔ کام سدھ گیا۔ اور اُن لوگوں نے اُسے سنبھال لیا تو میں باہر نکلا۔ میں جہاں جہاں گیا، وہاں کی حالت دیکھ کر رپورٹ بھیجتا گیا۔ جو ایک کتابچہ کی صورت میں شائع بھی ہوگئی۔ اپنے کارکنوں، داتاؤں اور ہمدردی رکھنے والوں کو سب باتوں سے آگاہ رکھنے کے لئے ہم نے ایک بلیٹن نکالنا شروع کر دیا، جو کچھ دِنوں تک باقاعدہ نکلتا رہا اور پھر غیر ضروری سمجھ کر بند کر دیا گیا۔

جنہوں نے کمیٹی کے پاس رقم بھیجی یا سامان بھیجا یا خود آکر اُس کی تنظیم میں شریکِ کار ہوئے اُن کے ماسوا بہت سی دوسری انجمنیں نجی طور پر کام کرنے آئیں۔ اُن سب کا ہماری کمیٹی کے ساتھ تعاون تھا۔ ہماری کوشش تھی کہ ہم سب کے کام میں مخالفت نہ ہو، اور نہ ایک ہی کام دو اِداروں کے ذریعے دُہرایا جائے۔ اُس سے یہ فائدہ ہوا کہ عوام کی رقم چاہے اس کمیٹی کے پاس آئی ہو یا کسی دوسرے اِدارے کے پاس، اچھے استعمال میں آئی۔ ایسے اِدارے بہت تھے جن کی پوری فہرست شائع شدہ رپورٹ میں ملے گی۔ مگر سب کا اِحسان مانتے ہوئے یہاں خاص خاص کے نام ہی دے سکتا ہوں۔ یہ ادارے تھے مارواڑی ریلیف سوسائٹی، میمن ریلیف سوسائٹی اور سری رام کشن مشن۔ باباگُردت سنگھ جی کی پارٹی نے بھی اچھا کام کیا۔ ریڈ کراس اور انڈین میڈیکل ایسوسی ایشن نے بھی مدد دی۔ شری ستیش چندر داس گپت کی معرفت بنگال کی سنکٹ تران کمیٹی نے بھی دوا، سواری وغیرہ میں اچھی مدد کی۔

ایک طرف حکومت کی اپیل تھی، دوسری طرف بہار سنٹرل ریلیف کمیٹی کی کچھ دنوں تک تو عوام کا اور فیاض حضرات کو اِتنا جوش رہا کہ دونوں کے فنڈ تقریباً برابر برابر چلتے رہے۔ ہم بھی روزانہ کی آمدنی شائع کرتے تھے اور سرکار بھی۔ مہاتما جی جب آ گئے اور سیٹھ جمنالال بجاج اپنے ساتھیوں کے ہمراہ بہار میں جب بیٹھ گئے تو میرے سر کا بوجھ کچھ ہلکا ہو گیا۔ لوگوں کو راحت پہنچانے میں دشواریاں بہت تھیں۔ پہلے تو ریل کی پٹریاں ٹوٹ گئی تھیں۔ مال ریل پر نہیں جا سکتا تھا۔ راستے کے پل ٹوٹ گئے تھے۔ اس لئے بیل گاڑی اور موٹر لاری پر بھی لے جانا آسان نہیں تھا۔ رہنے کے لئے بہت جگہوں میں مکان نہیں ملتا تھا۔ بہت جگہوں میں پانی کی قلت تھی۔ ہم کو ریلیف کمیٹی کی طرف سے کئی موٹر لاریاں خریدنی پڑیں۔ رفتہ رفتہ سڑکیں کچھ درست ہوئیں۔ پل تو نہیں بنے مگر اُن کے پاس سے ہو کر جہاں کوئی پٹری نہیں تھی، دوسرا راستہ نکل گیا۔ ندیوں میں ناؤ سے بھی کام لیا جانے لگا۔ ریلیف کمیٹی کے جھونپڑے سبھی جگہوں میں بن گئے۔ کارکنوں کی تنظیم میں آچاریہ کرپلانی ڈاکٹر ہارڈیکر اور مسز صوفیہ سوم جی نے بڑا کام کیا۔ کام کرنے والوں کی دیکھ بھال بھی کچھ آسان نہیں تھی۔ کارکنوں کے لئے ہمیں سینکڑوں سائیکلیں دینی پڑیں۔ اُن کے رہنے کے لئے جھونپڑے بنانے اور کھانے کا انتظام کرنا پڑا۔ مگر یہ جان کر تعجب ہو گا کہ اپنے کارکنوں کے کھانے کا خرچ دو آنے روز سے زیادہ ہم نہیں دیتے تھے۔ اِتنے میں جو کچھ ہو سکتا وہ کھا پی کر کام کرتے۔ اُن کے لئے اِتنا ہی کافی تھا۔ مہاتما جی بھی اُن ضلعوں میں گئے جہاں نقصان زیادہ ہوا تھا۔ اُن کا جانا دو اِعتبار سے ضروری تھا ایک تو یہ کہ وہ تباہ کاری کو دیکھ لیں اور دوسرے یہ طے کرنے میں ہماری مدد کریں کہ جہاں اِتنی تباہی ہوئی ہے وہاں ہم کتنی اور کس طرح کی مدد کریں۔ دوسرے یہ کہ اُن کے آنے سے لوگوں کی ہمت بڑھتی اور

مُصیبت میں ڈھارس بندھتی۔ اِسی لئے سب جگہ یہ زور دیا جا رہا تھا کہ مہاتما جی ہمارے یہاں بھی آئیں۔ یہ تو خیر ممکن ہی نہ تھا، پھر بھی وہ بہت جگہ گئے۔ اُنھوں نے وہ بے مثل دل سوز منظر دیکھے۔ جو زلزلہ نے فراہم کئے تھے۔

ہمارے سامنے دو طرح کے سوال تھے۔ زلزلہ کی وجہ سے لوگوں کے مکان گر گئے جو کچھ گھر میں تھا برباد ہو گیا۔ نہ کھانے کو دانہ، نہ پہننے کو کپڑا۔ اناج ملے بھی تو پکانے کو برتن نہیں۔ رہنے کو گھر نہیں۔ کنوئیں اَٹے پڑے تھے۔ تالابوں میں ریت بھر گئی۔ اِس لئے پینے کو پانی نہیں۔ یہ سب ایسی باتیں تھیں جن کا اِزالہ فوراً ضروری تھا۔ اس لیے مہاتما جی کے آنے سے پہلے ہی کھانا کپڑا اور برتن جہاں تک ممکن تھا ہم نے تقسیم کئے۔ اِس سے بھی پہلے جہاں تک ہو سکا مکانوں کا ملبہ ہٹانے کی کوشش کی تاکہ اُن کے نیچے دبے لوگ نکالے جائیں۔ اِس کام میں ریلیف کمیٹی بہت کچھ نہیں کر سکی۔ یہ کام جو کچھ ہوا، بہت کچھ متقامی لوگوں نے ہی کیا، کیوں کہ ریلیف کمیٹی کے منظّم ہوتے ہوتے اور کارکنوں کے پہنچتے پہنچتے جو ملبے کے نیچے دبے تھے یا تو نکال لئے جا چکے تھے یا مر چکے تھے مگر جو بچ گئے تھے اُن کو مدد دینے کے کام میں ریلیف کمیٹی نے پورا ہاتھ بٹایا۔ مہاتما جی کے پہنچتے پہنچتے یہ کام بھی بہت کچھ ہو چکا تھا۔ اگرچہ ابھی کلّیتاً ختم نہیں ہوا تھا۔ اب جو کچھ باقی رہا وہ کچھ زیادہ مستقل نوعیّت کا کام تھا۔ اِن میں دو یا تین قسم کے کام خاص تھے، جن میں ہم کو طے کرنا تھا کہ کیا کریں۔

لاکھوں ہی مکان گر گئے تھے۔ اُن کے بنوانے میں لوگوں کی اِمداد کرنا بڑا کام تھا اِسی طرح لاکھوں ہی کنوئیں ریت سے اَٹ گئے تھے۔ بہتیرے ایسے گاؤں تھے جہاں کنوؤں میں پانی تھا ہی نہیں۔ یہاں تک کہ کہیں گہرے گڑھے اس طرح بھر گئے تھے کہ وہاں یہ پتہ

نہیں لگتا تھا کہ یہاں کبھی گڑھا بھی رہا ہے۔ کہیں کہیں چھوٹی موٹی ندیوں کا پیٹ ریت سے بالکل بھر گیا تھا۔ پانی کی سخت تکلیف تھی۔ یہ کسی ایک گاؤں یا علاقے کی بات نہیں ہے۔ گنگا کے اُتر میں تقریباً سبھی ضلعوں میں سینکڑوں میل کی لمبائی اور تقریباً چالیس پچاس میل کی چوڑائی میں کم وبیش یکساں حالت تھی۔ پانی کس طرح پہنچایا جائے یہ بڑا مشکل سوال تھا۔ تیسرا سوال جو ہمیں بہت پریشان کر رہا تھا وہ کھیتوں میں ریت کا آجانا تھا۔ کھیتوں میں پانی کے فوّارے پھوٹ نکلے۔ اور اُن کے ساتھ ریت بھی نکلی اور اِتنی زیادہ نکلی کہ کھیت ریت سے پَٹ گئے۔ جب پانی سوکھا تو معلوم ہوا کہ سارا علاقہ ریت سے پُرسراب کی صورت کا ہو گیا ہے۔ اگر یہ ریت یوں ہی چھوڑ دی جاتی تو پھر یہاں کوئی فصل نہ ہوتی، یہ اندیشہ ہونے لگا۔ لہٰذا یہ مسئلہ زیرِ غور تھا کہ یہ ریت کس طرح صاف کی جاسکتی ہے یا نہیں۔ میں نے بہ چشمِ خود دیکھا کہ کہیں کہیں ریت کی سطح پانچ چھ فٹ تک تھی، ایک جگہ تھوڑی زمین میں تجربے کے طور پر ریت صاف کر کے دیکھا تو خرچ اِتنا زیادہ پڑا کہ یہ عمل ناممکن نظر آنے لگا۔

ایک اور فوری سوال گنّے کی وجہ سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ شمالی بِہار میں چینی کے بہت کارخانے تھے۔ لوگ گنّے کی کھیتی کرتے ہیں اور اُن کارخانوں کے ہاتھ ایکھ بیچ دیتے ہیں۔ اِس سے اُن کو رقم مِل جاتی ہے۔ زلزلہ نے تقریباً سبھی کارخانوں کو بےکار کر دیا۔ وہ سب رُک گئے۔ کروڑوں روپئے کی ایکھ کھیتوں میں کھڑی تھی۔ اب وہ بےکار ہونے لگی۔ ہم نے سوچا کہ پُرانے کولھو پر چلائے جائیں جس سے تھوڑا بہت ایکھ کا گُڑ بن جائے اور کسانوں کو کچھ نہ کچھ بچ جائے۔ حکومت نے بھی اُسے پسند کیا۔ دونوں اِداروں کی طرف سے کولھو تقسیم کئے گئے۔ مگر کولھو چلنے میں بھی دشواری تھی

کیوں کہ وہ اِتنی زیادہ تعداد میں تیار نہیں تھے۔ اُن کے لئے بازار بھی نہیں تھا۔ اِس لئے اُن کا بننا ایک طریقے سے رُک گیا تھا۔ پھر بھی ہزار کولھو ہم نے اور سرکار نے بانٹے اور کچھ ایکھ اِس طرح بچائی گئی تھی۔ مگر خوش قسمتی سے کچھ ہی دنوں کے اندر بہت سی مِلوں کی مرمّت ہو گئی۔ اُنھوں نے اپنا کام شروع کر دیا۔ اِس لئے جتنا نقصان ہو سکتا تھا اُتنا نہیں ہوا۔

اِن کے سِوا اور ابھی چھوٹے چھوٹے سوال تھے۔ اِس پر غور کر کے، فوری اِمداد کا کام ختم کر کے آیندہ کے لئے لائحہ عمل مُرتّب کرنا تھا۔ اِس لئے کمیٹی کی ایک نِشست پٹنہ میں کی گئی۔ اس میں سبھی صوبوں کے خاص لوگ، جو اُس کے ممبر تھے، آئے۔ اس میں تجویز ہوئی کہ سرکار کے کام میں ہم ہر طرح ساتھ دینے کو تیار ہیں۔ اپنے کام کے لئے ہم نے ایک مجلس عاملہ (ورکنگ کمیٹی) بنا لی۔ معمولی قاعدے بھی بنا دئے۔ اتنی بڑی کمیٹی کا اجتماع بار بار ہونا مشکل تھا۔ اِس لئے مجلس عاملہ پر ہی سارا کام کا بار آ پڑا۔ اِس کی میٹنگ برابر ہوا کرتی اور سب معاملے طے کیا کرتی۔ مہاتما جی کی رائے ہوئی، اور ہم سب لوگ اُن سے متفق تھے، کہ ریت ہٹانے کا کام ہمارے لئے غیر ممکن ہے۔ اِس لئے ہم اُس میں ہاتھ نہ لگائیں۔ مکان بنوانے کے کام میں ہم مدد دے سکتے ہیں، مگر اِس سے بھی زیادہ ضروری اور مفید کام پانی بہم پہنچانے کا ہے۔ اِس میں انفرادی اِمداد کا بھی موقع رہے گا۔ اِس لئے کسی فردِ خاص کی جانب داری کا موقع کم آئے گا۔ اور ہمارا کام بھی زیادہ صاف ہوگا اِس لئے ہم پہلے کنوئیں اور تالاب بنوائیں۔ جس سے انسانوں اور جانوروں کے لئے پانی کی آسانی ہو۔

مگر یہ کام بھی اِتنا بڑا تھا کہ ہماری سب رقم خرچ ہو جاتی اور یہ جزواً بھی پورا نہ

ہوتا۔ پھر بھی پہلے اِسی پر زور دینے کا فیصلہ ہوا۔ یہ بھی سوال اُٹھا کہ ہم ٹیوب ویل بنوائیں، یا پکّے بنوائیں۔ ٹیوب ویل بہت جلد تیار ہو سکتے تھے اور یہ کام ٹھیکے داروں کے ذریعے آسانی سے ہو سکتا تھا۔ ہم نے کچھ چلوائے بھی مگر ہم نے دیکھا کہ اُن سے کام نہیں چلے گا۔ ایک تو یہ کہ ایک ٹیوب ویل سے ایک گھڑا پانی نکالنے میں ایک آدمی کا جتنا وقت لگ جاتا ہے اتنے ہی وقت میں کنوئیں سے چار، پانچ آدمی ایک ساتھ ہی چار پانچ گھڑے پانی نکال سکتے تھے۔ دوسرے اُن کی مرمّت کا سوال بھی مسکل تھا۔ بگڑنے پر گاؤں والے اُن کی مرمّت کیسے کرائیں گے۔ اِس کے لئے ہم کو بڑا اِسٹاک رکھنا پڑے گا۔ پھر کچھ دِنوں کے بعد وہ بے کار ہو جائے گا۔ یہ بھی دیکھا گیا کہ کہیں کہیں ٹیوب ویل اور کنوئیں میں برابر ہی خرچ پڑتا ہے۔ اِس لئے ہم نے کنوئیں بنوانے کا ہی تہیّہ کیا۔ سبھی جگہوں پر کارکنوں نے گاؤں والوں کے تعاون سے کنوئیں بنوانے شروع کر دئے۔ ہم چاہتے تھے کہ برسات سے پہلے ہی زیادہ سے زیادہ کنوئیں بن جائیں۔ اور پھر پرانے کنوؤں کی مرمّت بھی ضروری تھی۔ ریت کو نکال کر اُن کو صاف کر دینے سے ہی بہت جگہوں میں کام چل جاتا تھا۔ اِن سب باتوں میں گاؤں والے جسمانی طور پر مدد کر سکتے تھے۔ اِسی طرح پُرانے تالابوں کو صاف کرا دینے سے مویشیوں کے لئے پانی کا اُنتظام ہو جاتا تھا۔ ہم نے کئی ہزار کنوئیں بنوائے اور بہت سے پُرانے کنوؤں کی مرمّت اور صفائی بھی کرائی کئی تالاب کھدوائے یا بگڑے ہوئے تالابوں کی مرمت کرائی۔ یہ سب کام اپریل سے جولائی کے پہلے ہی تک ختم ہو گیا، کیونکہ اِس کے بعد دوسرا ہی سوال آ کھڑا ہوا، اور ہم اُس میں لگ گئے۔

پانی فراہم کرنے کا فیصلہ بہت ہی ٹھیک رہا۔ کیوں کہ اِس سے ہم ایک مستقل کام

کر سکے۔ ایک کنوئیں یا تالاب سے بہت لوگوں کو فائدہ پہنچا سکے۔ یہ گاندھی جی کی دور اندیشی کا ہی پھل تھا کہ اتنا مستقل کام ہو سکا۔ نہیں تو سب روپے یا تو مکانوں کی مرمت یا ریت صاف کرانے میں لگ جاتے۔ تب بھی نتیجہ اتنا جامع نہ ہوتا۔ ہماری انجمن صحیح یا غلط الزاموں سے بھی نہ بچ سکتی۔

زلزلہ کے بعد کے مسئلے

ہم لوگ ابھی اِس کام میں لگے ہی ہوئے تھے کہ اور سوال اُٹھ کھڑا ہوا۔ سبھی جگہوں میں ندی نالے بھر گئے تھے۔ چنانچہ اندیشہ تھا کہ گنگا، سرجو اور گنڈک جیسی بڑی بڑی ندیوں کا پیٹ بھی کچھ ریت سے بھر گیا ہوگا۔ زمین کی سطح ناہموار ہو گئی تھی۔ اِن سب وجہوں سے اندیشہ تھا کہ برسات کے زمانے میں سیلاب آجانے سے نئی مصیبت آسکتی ہے۔ ہم کو اِس کے لئے تیاری کرنی پڑی۔ سرکار نے بھی اپنی تیاری کی۔ ہم کو بہت سی کشتیاں بنوا کر یا خرید کر اُن جگہوں میں رکھنی پڑیں جہاں سیلاب کا زیادہ خطرہ تھا۔

زلزلہ کے بعد غریبوں کے لئے، جو مزدوری کیا کرتے ہیں، کام کی کمی نہ رہی۔ کسی نہ کسی طرح کا کام اُن کو ملتا رہا۔ مگر اس بات کا خوف تھا کہ برسات میں اُنہیں کام نہیں ملے گا یوں تو دو چار دِنوں تک مُصیبت کے زمانے میں غریبوں کو کھانا دے دینا اچھا ہے مگر بغیر کام کرائے اِنہیں خیرات کھلانا نکما اور کاہل بنا دینا ہے۔ اس لئے ہم نے شروع سے ہی یہ طریقہ رکھا تھا کہ حتیٰ الوسع بغیر کام کرائے مُفت نہ کھِلایا جائے۔ عوام کو مزدوروں کی ضرورت تھی ہی۔ سبھی لوگ، جو کام کرا سکتے تھے، اپنے گِرے پڑے مکانوں کی صفائی یا مرمّت

کرا رہے تھے ۔ بہتوں نے تو نئے مکان بنانے کی بھی ابتدا کردی ۔ کھیتوں کا کام تھا ہی ۔ ریلیف کمیٹی نے جو ہزاروں کنوئیں بنوائے اور مرمت کرائے اور ہزاروں تالاب یا جوہڑ کھدوائے یا صاف کرائے ۔ اُن میں بھی بہتیرے مزدور کام کرتے رہے ۔ کئی جگہوں پر ہم نے نئی سڑکیں بنوادیں یا پُرانی خراب سڑکوں کی مرمت کرادی ۔ پانی کے نالے بھر گئے تھے ۔ اگر وہ برسات کے پہلے صاف نہ کرادئے جاتے تو پانی کا نکاس ہی نہ ہوتا ۔ برسات میں گاؤں کی حالت اور دردناک ہو جاتی ۔ لہٰذا اِس طرح کے نالوں کو بھی ہم نے بہت جگہوں میں صاف کرایا ۔

مظفّر پور ضلع میں ، سیتامڑھی جانے کے راستے پر مرتھوا کا ایک مشہور جَپور ہے زلزلہ سے پہلے ہی وہاں کی حالت کچھ ایسی خراب ہو گئی تھی کہ باگ متی ندی کا پانی ہمیشہ وہاں جمع رہتا تھا جو پہلے ہری بھری زمین تھی ، جہاں بہت اناج پیدا ہوا کرتا تھا ، وہاں کی ساری زمین اِس طرح زیرِ آب رہنے لگی ۔ کچھ بھی پیدا نہ ہوتا ۔ یہ پانی بھی اتنا خراب تھا کہ وہاں کے بڑے بڑے تناور درخت بھی سوکھ گئے ۔ بڑے بڑے باغیچے یوں سوکھے پڑے تھے کہ دیکھ کر تعجب ہوتا تھا ۔ اِس طرح کا منظر میں نے کوسی ندی کے کنارے کے کچھ گاؤں میں دیکھا ہے ۔ جہاں اِسی طرح بڑے بڑے درخت بغیر پتے کے سوکھے کھڑے تھے ۔ گاندھی جی دورانِ سفر وہاں گئے تھے اور وہاں کی حالت دیکھ کر دُکھی ہوئے تھے ۔ وہاں کے کارکنوں نے اِس پر بہت زور دیا کہ کوئی تدبیر ہونی چاہیئے ۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ پہلے ایک نالہ تھا یا نہر جس سے وہاں کا پانی نکل جایا کرتا تھا ۔ باگ متی نے اپنا پُرانا گھاٹ چھوڑ دیا اور یہ نالہ بھر گیا ۔ اُسی کا یہ نتیجہ تھا کہ یہاں پانی ٹھہر گیا اور نکل نہیں سکتا تھا ۔ اگر یہ نالہ کسی طرح پھر کھول دیا جائے تو سینکڑوں مربّع میل کا علاقہ پھر ہرا بھرا ہو جائے ۔

ہم لوگوں نے طے کیا کہ حکومت اگر اِس کا انتظام کرنے کو تیار نہ ہو تو ریلیف کمیٹی کے

ذریعے یہ کام کرادیا جائے گا۔ ہمارے اندازے کے مطابق خرچ تقریباً پچاس ہزار روپئے کا تھا۔ حکومت سے خط و کتابت ہوئی۔ اُس نے نہر کھدوانے کا بار اپنے ذِمّے لے لیا۔ اِس طرح کی چھوٹی موٹی نہریں ہم نے کئی اور جگہ پر کھدوا کر بہت سی زمین جو برباد ہو رہی تھی، ہری بھری بنوادی۔ جہاں غریب عورتیں دوسرا کام نہیں کر سکتی تھیں، چرخے کے ذریعے انہیں کام دیا گیا۔ اِسی طرح ریلیف کمیٹی نے سوت اور کھدر کا کام بھی کئی جگہوں میں جاری کیا بعد میں جب کمیٹی کا کام سمیٹا گیا تو یہ سارا کام بہار چرخہ سنگھ کے ذمّے کر دیا گیا۔ مکان اتنے بنوانے تھے کہ لوگوں کو مکان بنوانے کے سامان کی بہت ضرورت تھی۔ اینٹ، کھپرے رسّی، بانس، لکڑی اور لوہے کے سامان وغیرہ کی بڑی مانگ تھی۔ ہم نے بہت جگہوں میں کمیٹی کی طرف سے دُکانیں کھول دیں، جہاں لاگت کے دام پر چیزیں دی جاتیں۔ مگر اِس سے بھی زیادہ ہم نے یہ کیا کہ اینٹ، لکڑی، سیمنٹ وغیرہ کے تاجروں کے ساتھ بات چیت کر کے لاگت کے دام پر یا بہت کم منافع پر سامان بیچنے کا انتظام کرایا۔ جو ہمارے پُرزے لے جاتے۔ اُن کو اس مقررّہ دام پر سامان مِل جاتا۔ کمیٹی کی طرف سے اُن کو کچھ کمیشن دیا جاتا تھا۔ کہیں کہیں بغیر اِس کے بھی کام چل جاتا۔ اِس طرح ہم نے کمیٹی کی طرف سے جو براہِ راست مدد کی۔ اُس کے ماسوا ان سب چیزوں کے دام کی جانچ میں بہت بڑا حصّہ لے کر، مناسب قیمت پر لوگوں کو سامان مہیّا کرایا۔

اِس بات کا بھی بہت اندیشہ تھا کہ برسات کے دِنوں میں چاول کی کمی صوبے کے بہت سے حِصّوں میں ہوگی۔ دیکھنے میں آیا کہ چاول کا بھاؤ کچھ چڑھتا جا رہا ہے۔ ہم نے صوبہ کے باہر سے چاول خرید کر اُن سبھی جگہوں میں، جہاں قلّت کا اندیشہ تھا، چاول کی رعایتی دکانیں کھول دیں۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاول کی قیمت نہیں چڑھی اور لوگوں کو مناسب

دام پر چاول ملتا رہا۔ ریلیف کمیٹی کے روپئے بھی چاول بک جانے پر واپس آ گئے۔ ملیریا اور ہیضہ کی وبا کا بھی اندیشہ تھا۔ کہیں کہیں اُن کا زور ہوا بھی۔ اِس کے لئے کمیٹی کے ڈاکٹری شعبہ نے اپنی شاخیں بہت سی جگہوں میں کھول دیں اور اُن سے لوگوں کو بہت فائدہ پہنچا۔ سیلاب کے دِنوں میں بہت مشکل سے اُن لوگوں کی مدد کی جا سکی۔ کمیٹی اور سرکار کی صلاح سے ناویں ان جگہوں میں رکھی گئی تھیں جہاں سیلاب کا خطرہ تھا۔ اِن کے ذریعے سے سیلاب زدوں کو مدد پہنچانے میں بہت سہولت ہوئی

اِس کے ماسوا ہم نے بہت سے لوگوں کو مکان مرمت کرانے یا بنوانے کے لئے نقد روپئے بھی دئے۔ کمیٹی نے طے کر لیا تھا کہ جو لوگ زلزلہ سے پہلے اچھی حیثیت رکھتے تھے یا جن کے بڑے مکان تھے یا جو بڑا مکان بنوانا چاہتے تھے اُن کی اِمداد کی طاقت کمیٹی میں نہیں کیونکہ اِتنی رقم نہیں تھی۔ وہ تو غریب اور متوسط درجہ کے لوگوں کی ہی مدد کر سکتی تھی۔ اِسی لئے اُس نے طے کیا کہ کسی ایک فردِ واحد کو دو سو پچاس روپئے سے زیادہ مدد نہ دی جائے گی، مزید براں ریلیف کی شرح سے اینٹ، بانس، لکڑی سیمنٹ وغیرہ وغیرہ چیزیں دی جاتی تھیں، سرکار زیادہ رقم کی مدد دیتی تھی۔ ہم نے اِس طبقہ کے لوگوں کی اِمداد کا بار سرکار پر ہی چھوڑ دیا۔ اب ناظرین کو کچھ اندازہ ہو گیا ہو گا کہ کتنی قسم کی اِمداد دینی پڑی اور کتنے قسم کے کام کمیٹی کو کرنے پڑے۔ اِس کی رپورٹ وقتاً فوقتاً چھپتی گئی اور لوگوں میں خاص کر چندہ دینے والوں میں تقسیم کی گئی۔

ایک بڑا اہم تجربہ ہوا جس کا ذکر ضروری ہے۔ جب مہاتما گاندھی زلزلہ زدہ علاقوں میں گھوم رہے تھے۔ اُن کے ساتھ اِنگلستان کی دو خواتین بہت جگہوں میں گئیں، ایک تھیں مس موریل لیسٹر، جن کے مہمان مہاتما گاندھی گول میز کانفرنس کے زمانے میں رہ چکے تھے۔

دوسری تھیں وہاں کی ہندوستان سے ہمدردی رکھنے والی ایک سماجی کام کرنے والی مِس اگاتھا ہیرلین۔ یوں تو اور بھی بہت سے غیر ملکیوں نے زلزلہ کی تباہ کاری دیکھی تھی۔ سب نے اپنے اپنے دوستوں کو لکھا تھا۔ دین بندھو اینڈریوز تو سبھی جگہوں میں جہاں مصیبت پڑی تھی جایا ہی کرتے تھے۔ بہار میں بھی آئے تھے۔ اُنھوں نے ایک کتاب لکھ کر اِنگلستان اور امریکہ میں چھپوائی تھی۔ اِن سب کاموں سے وہاں کے لوگوں میں بھی بہار سے ہمدردی پیدا ہوئی۔ سرکار کی اپیل بھی وہاں پہنچی تھی۔ اس پر لوگوں نے مالی اِمداد بھی کی تھی۔

یورپ میں ایک انجمن ہے جس کے ممبر مخالفِ جنگ ہیں۔ مگر وہ مانتے ہیں کہ فوج میں جس قسم کا ڈسپلن ہوتا ہے، اور لوگوں کو اپنا سب کچھ حتیٰ کہ جان تک دینے کا موقع ملتا ہے۔ اِس سے بہت سے نوجوان اُس طرف راجع ہوتے ہیں، لیکن اگر اِس ایثار اور طاقت کو ہلاکتِ انسانی میں نہ لگا کر خدمتِ عامہ میں لگایا جائے تو بہت بڑا کام ہو جائے۔ اِسی لئے اِس انجمن کے ممبر اپنے آپ کو فوج کی سی تنظیم میں رکھتے ہوئے جہاں کوئی مصیبت آتی ہے، وہاں جا کر خدمتِ عامہ کرتے ہیں۔ قوم یا مُلک کا لحاظ نہیں کرتے۔ یورپ میں پچھلی جنگِ عظیم کے بعد جہاں بہت سی تباہی ہوئی تھی، اُن لوگوں نے جا کر خدمت کی تھی۔ اِسی طرح کی جگہوں میں مصیبت زدہ عوام کی خدمت کرنے کا اُنھیں تجربہ تھا۔ اُن کے لیڈر تھے سوئٹزرلینڈ کے پیَر سیرے سول، وہ انجینیر تھے۔ بڑے اونچے خاندان کے تھے۔ اُن کے گھر کے لوگ اپنے مُلک کی حکومت میں، خاص کر فوج کے اُونچے عہدوں پر رہ چکے تھے۔ اُنھوں نے مخالفتِ جنگ کے اُصول پر وہ سب چھوڑ دیا تھا اور فوجی تعلیم سے انکار کرنے کی وجہ سے سزا بھی بُھگتی تھی۔ بہار میں یہ کچھ ساتھیوں کو لے کر خدمتِ عامہ کے لئے آئے۔

ہم لوگوں نے دیکھا تھا کہ کہیں جگہیں اتنی برباد ہو گئی تھیں کہ وہاں کے لوگوں کو وہاں

سے ہٹانا ہی ٹھیک تھا۔ ہم نے بہت کوشش کی کہ لوگ اپنا مقام چھوڑ کر کہیں دُور جاکر بسنا پسند کریں۔ اِس کے لئے دوسرے مقامات پر زمینداروں سے بات چیت کرکے زمین کے بندوبست کرانے کا جتن بھی ہم کر رہے تھے مگر کہیں کوئی اپنے گھر کو چھوڑ کر دور جانے والا نہیں ملا۔ اسی لئے کسی بڑے پیمانے پر جگہ منتقل کرنے یا بدلنے کو ناممکن سمجھ کر ہم نے چھوڑ دیا۔ مظفر پور ضلع میں کچھ گاؤں کے لوگ سیلاب سے اتنے دُکھی تھے کہ گاؤں چھوڑ کر کچھ دُور الگ بس جانے پر رضامند ہو گئے۔ ہم نے سوچا کہ مکان وغیرہ بنوانے میں اُن کی مدد کریں۔ حکومت بھی اس بات پر راضی ہو گئی کہ ریلیف کمیٹی اور وہ دونوں مل کر اِس میں خرچ کریں۔ کام کا بار ایک مقامی کمیٹی کے سپرد کیا گیا۔ ڈاکٹر سیرے سول نے اس کام کا بار لیا۔ ہم نے ریلیف کمیٹی کی طرف سے اُن کو ہی اِس کمیٹی کا ممبر بنا دیا اور اُن کی مدد کے لئے اپنے کارکن شری بھپنیندر موہن دت کو دے دیا۔

وہاں کئی نئے گاؤں بسائے گئے۔ اِس میں ایک سال سے زیادہ وقت لگا۔ ڈاکٹر سیرے سول وہاں برابر رہے۔ بیچ میں ایک بار یوروپ گئے بھی مگر پھر کچھ دنوں کے بعد واپس آکر کام میں لگ گئے۔ اُن کے ساتھ کئی ملکوں کے چار پانچ ساتھی تھے۔ اُنہوں نے جسمانی طور پر بھی بہت محنت کی۔ ڈاکٹر سیرے سول کی عمر ۶۰ سال سے زیادہ تھی بہت لمبے تگڑے تھے۔ یہاں کی گرمی سے پریشان ہو جاتے تھے تب بھی اُس گاؤں میں ہی رہتے تھے وہاں کھانے کی مصیبت تھی۔ آرام کی وہاں کوئی جگہ نہ تھی جس کے وہ عادی تھے۔ پھر بھی دَوڑ دھوپ کرتے رہتے۔ اُنہیں مصروفِ کار دیکھ کر اوروں بھی جوش آتا تھا۔ جو گاؤں بسائے گئے اُن میں سے خاص کا نام شانتی پور رکھا گیا۔ یہ خوب صورت بارونق گاؤں آج بھی آباد ہے اور نمونے کی بستی ہے۔

زلزلہ اور سیلاب کی وجہ سے کئی جگہ ملیریا کی وبا پھیل گئی ۔ ریلیف کمیٹی کی طرف سے کئی جگہوں میں ملیریا سے لوگوں کو بچانے کے لئے خاص انتظامات کرنے پڑے اُن میں خاص ہیں رام پور رہری اور منسمارا کا علاقہ مظفر پور ضلع میں، پنڈول اور مدھوبنی کا علاقہ دربھنگہ ضلع میں، اور سولول کا علاقہ بھاگل پور ضلع میں ۔ یہ اتنا بڑا کام ہو سکا تو کارکنوں کے جوش اور ایثار سے ہی ۔ اُن کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے ۔ اگر رقم دے کر سب کارکن رکھنے پڑتے تو ریلیف کمیٹی کا بہت روپیہ صرف کارکنوں پر ہی صرف ہو جاتا ۔ ہم شروع سے ہی اِس بات پر بہت دھیان رکھتے تھے کہ بے سہارا لوگوں کو مدد دینے میں ہی زیادہ سے زیادہ خرچ ہو اور مدد پہنچانے کے عمل میں کم سے کم خرچ ہو ۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ کارکنوں کو ہم سادہ سے سادہ غذا دیتے تھے جس کی لاگت دو آنے روز کے قریب تھی ۔ کام تقریباً ۱½ سال تک چلتا رہا ۔ اِسی لئے دفتر میں کچھ لوگ ایسے ضرور رکھے گئے جن کو کچھ گزارہ بھی دینا پڑتا مگر وہ بھی کفایتی شرح سے ۔ مزید برآں دفتر کے لئے مکان، سامان وغیرہ کا خرچ بھی کرنا پڑتا تھا ۔ مال ڈھونے کے لئے اور کارکنوں اور نگہداروں کو کم سے کم وقت میں اپنے مقامات پر پہنچانے کے لئے ہمیں لاریاں اور سواریاں بھی خریدنی پڑی تھیں ۔ یہ سب خرچ انجمن کے نام سے لکھا جاتا ۔ ہمیشہ ہم اس بات پر توجہ رکھتے کہ یہ انجمن کے خرچ کا تناسب کام کے خرچ سے کم سے کم ہو ۔ ہم اپنی رپورٹ میں اس کا بھی برابر ذکر کرتے ۔ شروع میں جب لوگوں اناج کپڑا وغیرہ پہنچانا تھا تب مرکز سے اُنہیں ڈھونڈ کر امداد کی جگہ لے جانے اور تقسیم کرنے کا خرچ زیادہ پڑا ۔ یہ تو قدرتی تھا ہی ۔ جب کنوئیں، جوہڑ، تالاب، سڑک، پل، نہر وغیرہ میں ہاتھ لگایا گیا تو انجمن کا خرچ کم ہو گیا ۔ جب مکان کے لئے روپئے بانٹنے کا وقت آیا تو یہ خرچ اور بھی کم ہو گیا ۔

یہاں ایک چھوٹے سے واقعہ کا ذکر ضروری ہے۔ سرکار نے سول سروس کے ایک قابل افسر مسٹر برٹ کو ریلیف کمشنر بنایا تھا۔ ریلیف کے سارے کام کا بار اُنھیں پر تھا۔ اُنہوں نے اس بارے میں ایک رپورٹ لکھی جس میں اُنہوں نے بہار سنٹرل ریلیف کمیٹی کا انتظامی خرچ کا خلاصہ بھی اِس رپورٹ میں دیا۔ وہاں انہوں نے غلط لکھ دیا کہ ریلیف کمیٹی کا انتظامی خرچ زیادہ پڑا بعد میں وہ رُخصت پر انگلستان چلے گئے۔ ہم نے اِس طرف حکومت کی توجہ دلائی مگر وہ کیا کرنے والی تھی۔

جب ریلیف کا کام ختم ہو گیا تو جو روپئے بچے تھے وہ ہنگامی مصیبتوں کے وقت بہار میں خرچ کرنے کے لئے ایک ٹرسٹ کے سپرد کر دے گئے۔ ٹرسٹی تھے سردار ولبھ بھائی پٹیل، سیٹھ جمنالال بجاج اور میں۔

ستیہ گرہ مُلتوی

ریلیف کمیٹی کے کام سے جب مہاتما گاندھی تباہ شدہ جگہوں کا دَورہ کر رہے تھے ایک واقعہ ہوا جس کا اثر یہاں کی سیاست پر بہت پڑا۔ ۱۹۳۳ء کے درمیانی زمانے میں ہی ستیہ گرہ میں سستی آگئی تھی۔ انفرادی ستیہ گرہ سے کچھ بیداری دیکھنے میں آئی۔ مگر وہ دھیرے دھیرے جاتی رہی۔ جب زلزلہ آیا تو گاندھی جی دکن کے علاقے میں ہریجن دورہ کر رہے تھے وہیں سے بہار آئے تھے۔ اب تک نئی اصلاحات کی بات اِنگلستان میں کچھ آگے بڑھ چُکی تھی۔ دوسری گول میز کانفرنس کے بعد کچھ اور کارروائی ہوئی اور ایک وائٹ پیپر (قرطاسِ ابیض) شائع ہوا۔ جس میں وہ اُصول درج تھے جن کے مطابق نیا آئین بننے والا تھا۔ لوگ سمجھتے کہ وائٹ پیپر کے مطابق جلد ہی قانون بن جائے گا اور نیا آئین کام میں آنے لگے گا کچھ لوگ سوچ رہے تھے کہ یہ نیا آئین چاہے کتنا ہی خراب کیوں نہ ہو اور چاہے اِس کے مطابق کام کرنا ہم منظور کریں یا نہ کریں۔ کانگریس کو الکشن میں حصّہ لینا چاہیئے۔ اس بات کا ذکر چاروں طرف ہونے لگا اور کانگریس والوں میں بھی یہ بات چلی۔ ڈاکٹر انصاری، ڈاکٹر بی سی رائے اور شری بھولا بھائی ڈیسائی نے یہ بات کانگریسیوں میں چلائی تھی، میں تو ریلیف کے کام میں ہی

مصروف تھا۔ اِس لئے مجھے تو اس طرف توجہ دینے کی فرصت ہی نہ تھی۔ مہاتما جی شاید کچھ نہ کچھ سوچتے رہے ہوں۔

شمالی بہار کے سفر میں ایک دن بھاگل پور ضلع کے سہرسہ نام کے گاؤں میں ہم لوگ ٹھہرے۔ دوسرے دِن سوموار (پیر کا دن) تھا جس دن مہاتما جی مون (خاموش رہنے کا) برت رکھتے تھے۔ مہاتما جی خاموشی کے عالم میں کچھ لکھتے رہے۔ میں یوں تو کبھی بے کار اُن کا وقت نہ لیتا تھا اور اُس دن تو وہ لکھ رہے تھے۔ اس لئے دِن بھر میں اُن سے کوئی بات نہ کر سکا۔ شام کو چار بجے کے قریب اُنہوں نے میرے ہاتھ میں ایک کاغذ دیا اور لکھ دیا کہ اس بارے میں اپنی رائے دو۔ میں نے اُسے پڑھا۔ اس میں ستیہ گرہ بند کر دینے کی بات تھی۔ اور چناؤ کے متعلق اِشارہ تھا۔ اُنہوں نے اس میں یہ بتایا تھا کہ کچھ اُن کے قابلِ اعتماد لوگ ہیں جو جیل سے نکلے ہیں۔ اُنہوں نے ایسی باتیں کہی ہیں۔ جن سے اُن کو اس نتیجے پر پہنچنا پڑا ہے۔ مُلک بھر میں پھیلی ہوئی سُستی تو تھی ہی مگر میرے صوبے میں تو زلزلہ کے بعد سے ایک دوسری ہی فضا ہو گئی تھی۔ یہاں ستیہ گرہ تو ہو ہی نہیں رہا تھا۔ بلکہ ہم لوگوں کے تقریباً سب ساتھی جیل سے رہا کر دیئے گئے تھے اور ریلیف کے کام میں اگر اُن کا پورا پورا تعاون نہیں تھا تو کسی طرح کی مخالفت بھی نہیں تھی۔ اگر پورے تعاون میں کسی قسم کی کمی تھی تو وہ ہماری وجہ سے نہیں تھی۔ سرکار ہی پورا تعاون نہیں جانتی تھی اور ہمارے سبھی کاموں کو شبہ کی نظر سے دیکھتی تھی۔ اس لئے تحریک کو، جو بہت کچھ خود ہی بند ہو چکی تھی، باضابطہ بند کرنے کی بات مجھے کھٹکی نہیں اور باتیں بھی ایسی نہیں تھیں جن سے کچھ چوٹ لگے۔ اِس لئے غور سے پڑھنے کے بعد اس بیان کی میں نے تائید کر دی۔ فوراً اِس کی نقل کی گئی، اور مہاتما جی کا خیال ہوا کہ اُسے اخباروں میں بھی بھیجا جائے۔ لیکن وہاں سے تار نہیں جا سکتا

تھا۔اِس لئے میں وہ بیان دے کر کسی کو پٹنہ بھیجنے کا انتظام کر رہا تھا کہ اتنے میں ایک آدمی پٹنہ سے آگیا۔

پٹنہ میں ڈاکٹر انصاری کا تار آیا تھا۔اُسی کو لے کر وہاں کے لوگوں نے ایک آدمی بھیج دیا تھا۔پٹنہ میں لوگوں نے یہ سمجھا تھا کہ سہرسہ میں تار نہیں ملے گا۔اس تار میں ڈاکٹر انصاری کے پٹنہ آنے کی بات تھی۔ڈاکٹر انصاری مہاتما گاندھی سے باتیں کرنے آ رہے تھے اُن کے ساتھ ڈاکٹر بدھان چندر رائے اور شری بھولا بھائی ڈیسائی بھی آنے کو تھے۔یہ تار پاکر مہاتما جی نے اپنا بیان اخباروں میں بھیجنے سے روک دیا اور پٹنہ جانا طے کیا۔دوسرے دن صبح کے وقت ہم لوگ پٹنہ پہنچ گئے۔ڈاکٹر انصاری وغیرہ سے باہمی گفتگو ہوئی اِس کے بعد یہ بیان اخباروں میں بھیج دیا گیا۔اس بیان سے بہتیرے کانگریسی مطمئن تھے۔مگر جو وجہ بتائی گئی تھی اُسے وہ پسند نہ کرتے تھے۔اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب خاص خاص کانگریسیوں کو اکٹھا ہو کر اس معاملہ پر غور کرنا ضروری ہو گیا۔مہاتما جی کا بہار کا دورہ ابھی پورا نہیں ہوا تھا۔چھوٹا ناگپور جانا باقی تھا،اُدھر زلزلہ سے کوئی نقصان نہیں ہوا تھا۔مگر گاندھی جی نے ہریجنوں کے متعلق کام کے سلسلہ میں اُدھر کا بھی دورہ کرنا پسند کیا۔وہ اُدھر چلے گئے صلاح مشورہ کے لئے خاص خاص کانگریسیوں کو رانچی میں بلایا گیا۔یہ کوئی باضابطہ نشست نہیں تھی۔لوگوں کی رائے جاننے کے لئے ہی مدعو کیا گیا تھا،وہاں میں بھی گیا۔سبھی صوبوں سے بہت سے لوگ آئے۔دو تین دنوں تک بات چیت ہوئی۔فیصلہ ہوا پٹنہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا باضابطہ اجلاس کیا جائے۔اِس درمیان مہاتما جی اور جگہوں کا دورہ کر لیں گے۔مئی ۱۹۳۴ء میں پٹنہ میں یہ اجلاس ہوا۔

اس اجلاس کی خصوصیت یہ تھی کہ اب تک سبھی کانگریس کمیٹیاں غیر قانونی تھیں۔

ان میں سے کسی کی بھی نشست غیر قانونی ہوتی۔ مگر حکومت نے بھی رنگ ڈھنگ سمجھ لیا تھا۔ اُس کی طرف سے کسی طرح کی روک ٹوک نہیں ہوئی۔ شریمتی رادھکا سنگھ ہال میں نشست ہوئی اور شام کے وقت اُسی کے میدان میں دو طرح کے لوگ تھے۔ جو تجویز کمیٹی کی طرف سے پیش کی گئی۔ اُس میں ستیہ گرہ بند کرنے کی ہدایت تھی۔ صرف گاندھی جی کو ستیہ گرہ کرنے کا حق دیا گیا تھا۔ کونسل کے چُناؤ میں حصہ لینے کی بھی بات تھی۔ ساتھ ہی مہاتما جی کے بیان کی تائید کی۔ کچھ لوگ تو اِس تجویز سے متفق تھے، کچھ لوگوں نے اس کی بہت سخت مخالفت کی۔ مخالفت اِس فیصلہ کے ساتھ تو تھی ہی۔ مہاتما جی کے بیان میں جو سبب بتایا گیا تھا، اس کے ساتھ بھی تھی کچھ لوگ جو ستیہ گرہ بند کرکے مخالف نہیں تھے۔ کونسل کے الیکشن میں حصہ لینے کے خلاف تھے۔ بہت گرما گرم بحث کے بعد قرارداد منظور ہوئی۔ اِس مخالفت میں زیادہ حصہ اُن لوگوں کا تھا جنہوں نے کانگریس سوشلسٹ پارٹی بنائی۔ پٹنہ میں ہی اِس موقع پر سوشلسٹ لوگوں نے اپنی ایک الگ کانفرنس کی جنہوں نے اپنی پارٹی، کانگریس کے اندر رہ کر ہی منظم کی۔ اِن کی خاص کارکُن اور لیڈر آچاریہ نریندر دیو اور شری جے پرکاش نارائن تھے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں۔ مخالفوں میں سب سے خاص آچاریہ نریندر دیو ہی تھے۔

خیر، آخر آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ستیہ گرہ ملتوی کر دیا گیا۔ اِس کے بعد اب سرکار کے لئے بھی راستہ کھُل گیا۔ اُس نے کچھ دِنوں کے بعد کانگریس کمیٹی پر سے غیر قانونی ہونے کا حکم اُٹھالیا۔ کچھ دنوں میں ورکنگ کمیٹی کی نشست ہوئی۔ اُس نے ہدایت کی کہ کانگریس کی نئی تنظیم جلد سے جلد کر دی جائے اور سبھی کمیٹیاں باضابطہ کام کرنا شروع کر دیں۔ اِس بار دونوں پارٹیوں نے اپنے اپنے نصب العین آزادانہ طور پر ظاہر کر دئے تھے۔ اِس لئے کسی پر کسی کا دعوے یا بندش نہیں تھی۔ گاندھی اِرون سمجھوتہ کے بعد اِس کی شرطوں کو پورا کرنے

میں بڑی دشواریاں ہوئی تھیں۔ اِس بار وہ سب بکھیڑا نہیں تھا۔ کچھ دِنوں کے بعد حکومت نے ایک ایک کر کے سبھی آشرم اور کانگریسی عمارتیں واپس کر دیں۔ وہ جس حالت میں تھے، اُسی حالت میں اُنہیں ہم کو لے لینا تھا اور پھر مرمّت وغیرہ کا سارا کام ہم کو خود کرنا تھا۔ اِس لئے اِس بار لکھا پڑھی میں نہ وقت لگانا پڑا اور نہ سر کھپانا پڑا۔ وردھا میں ورکنگ کمیٹی کی نشست ہوئی، جس میں ایک خاندانی حادثہ کی وجہ سے میں نہیں جا سکا۔ اِن دِنوں سیٹھ جمنالال بجاج قائم مقام صدر بنائے گئے اور وہی کانگریس کو چلانے لگے۔ طے ہوا کہ کانگریس کا خاص اجلاس اکتوبر میں بمبئی میں ہو۔ سبھی ستیہ گرہی ابھی تک رہا نہیں ہوئے تھے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل پنڈت جواہر لال وغیرہ ابھی تک جیل میں ہی تھے۔ سردار تو بمبئی کانگریس کے پہلے ہی رہا ہو گئے مگر پنڈت جواہر لال نہرو بمبئی کانگریس کے بہت بعد تک جیل میں رہے۔

بھائی کی رحلت اور قرض کی مصیبت

ریلیف کے کام میں بھائی نے بھی بہت محنت کی تھی۔ چھپرا میں ہی اُن کو زیادہ کام کرنا پڑا تھا۔ صوبائی کام میں بھی اُنہوں نے اچّھا حصہ لیا تھا۔ اُنہوں نے آسام میں جو زمین لی تھی، اُسے دیکھنے کبھی کبھی وہاں بھی جایا کرتے تھے۔ ابھی تک اُس کا کوئی موزوں انتظام نہ ہو سکا تھا۔ وہ مئی کے مہینے میں ایک بار گئے۔ وہاں سے واپس آئے تو بخار ہو گیا۔ وہ جگہ بہت ملیریائی تھی۔ وہ وہاں ملیریا کی گرفت میں آ گئے۔ جس کا اثر گھر آنے پر معلوم ہوا، مگر وہ اچھے ہو گئے۔ میں ایک دِن چھپرا گیا تو اُن کو اچھا پایا اور دیکھا کہ وہ بینک کا کام کرنے لگے مگر وہ کم زور بہت تھے۔ میں نے منع کیا اور کہا کہ ابھی کچھ اور آرام کر لیجیے، طاقت آنے پر کام کیجیئے گا۔ یہ باتیں کہہ کر میں پٹنہ چلا گیا۔ میرے پٹنہ واپس آنے کے دو چار دِنوں کے اندر ہی ایک روز دوپہر کو چھپرا سے تار آیا کہ اُن کی طبیعت خراب ہے۔ ڈاکٹر رگھوناتھ شرن کو میں بھیج دوں یا ساتھ لے کر آؤں۔ تار پڑھ کر میری تشویش بڑھ گئی۔ یہ تار چھپرا کے سول سرجن ڈاکٹر رامیشور پرشاد کی رائے سے دیا گیا تھا۔

ڈاکٹر شرن سے مِل کر چھپرا جانے کا ارادہ ہو ہی رہا تھا کہ دوپہر کا سٹیمر جو گنگا پار جاتا ہے

نکل گیا۔ہم لوگوں نے رات تک ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔موٹر پر ڈاکٹر شرن کے ساتھ میں روانہ ہوگیا۔کشتی سے موٹر کو گنگا پار کرکے ہم لوگ آگے چلے۔ زلزلہ کی وجہ سے سڑکیں یوں ہی خراب ہوگئی تھیں، ریل بند ہو جانے سے جو بہت بیل گاڑیاں اور لاریاں چلی تھیں۔ اُس سے سڑکوں کی حالت اور بھی ردّی ہوگئی تھی۔ہم لوگ تقریباً دس بجے رات کو چھپرا پہنچے۔ وہاں کے سبھی ڈاکٹر بہت چاؤ اور پریم سے علاج کر رہے تھے۔ ڈاکٹر راجیشور پرشاد تو دن رات وہیں رہتے تھے۔جب اُنہوں نے حالت قابو کے باہر دیکھی تبھی تار دیا تھا۔ بخار تو تھا ہی مگر گُردے کی حالت بھی خراب ہوگئی تھی۔ اِس لئے پیشاب اور خون کی جانچ بہت ضروری تھی۔ اُن کو پہلے سے کچھ شکر آتی تھی اور اُس کا علاج بھی کرایا گیا تھا۔جس سے کچھ افاقہ ہوا تھا۔اب کمزوری کی حالت میں شاید وہ مرض بھی اُبھر آیا۔

رات کو ہی قارورہ وغیرہ لے کر آدمی پٹنہ بھیجا گیا۔ ڈاکٹروں نے بہت محنت کی، مگر بیماری روز بروز بڑھتی گئی۔ پٹنہ سے ویدراج پنڈت برج بہاری چوبے کو بھی بلایا۔ اُنہوں نے بھی کچھ علاج کیا۔مگر کوئی افاقہ نظر نہ آیا۔آخر ڈاکٹروں کی رائے ہوئی کہ شاید ایک گروہ نکال دینے سے کچھ فائدہ ہو۔ ڈاکٹر راجیشور پرشاد اچھے سرجن ہوتے ہوئے بھی یہ ذمہ داری اکیلے نہیں لینا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر بنرجی کے بُلانے کی کوشش کی گئی مگر میڈیکل کالج بند ہونے کے سبب سے وہ پٹنہ میں نہیں تھے۔ منگیر کے قابل سول سرجن ڈاکٹر ٹیک دیو پرشاد ورما بُلائے گئے۔ مگر اُن کے ہاتھ میں کوئی دوسرا مریض تھا جسے چھوڑ کر وہ فوراً باہر جا نہیں سکتے تھے۔لکھنؤ تار دیا گیا کہ وہاں کے نامی سرجن ڈاکٹر بھاٹیہ بلائے جائیں، مگر وہ بھی نہ آسکے۔ کلکتہ تار دیا تو وہاں کے دوستوں نے مشہور سرجن ڈاکٹر پنچانن چٹرجی کو بھیجا۔ پٹنہ کے کرنل الگزینڈر کو بھی بلایا۔سب نے دیکھ کر کہا کہ کمزوری اتنی

ہے کہ آپریشن کرنا مناسب نہ ہوگا۔ ہار مان کر نشتر کی بات چھوڑ دی گئی۔ اِس کے دو دِنوں کے اندر ہی وہ رِحلت فرما گئے۔

ہم نے تار دیکر جمشید پور سے جناردن اور اُن کے بیوی بچّوں کو بلا لیا تھا۔ لکھنؤ سے داماد اور لڑکی بھی آگئی۔ شکار پور کی بُبونی، بھائی صاحب کے انتقال کے بعد پہنچی بھائی متھرا پرشاد پٹنہ سے ساتھ ہی ساتھ آئے تھے۔ محترم برج کشور بابو بھی آ گئے۔ اِس طرح سبھی عزیز و اقارب کے درمیان بال بچّوں سے گھرے ہوئے اُنھوں نے جسمِ خاکی چھوڑا ہم سب رام نام لے رہے تھے اور گیتا پاٹھ کر رہے تھے۔ ہم سب کے لئے تو آفت کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ ہم نے گھر سے تعلق رکھا ہی نہ تھا۔ سب کچھ وہی کرتے تھے۔ جب میں وکالت کر رہا تھا اور روپئے کما رہا تھا تب بھی وہی میری دیکھ بھال کرتے تھے۔ جب میں ترکِ موالات کر کے قلّاش ہوگیا۔ تب بھی وہی میری دیکھ بھال کرتے تھے۔ میرے بیوی بچے بھی برابر اُنھی کے ساتھ رہتے تھے۔ میں جب کبھی جاتا تھا تو اُن سے مل آتا تھا۔ اُنھوں نے گھر کی عورتوں کو کبھی ایک دوسرے سے الگ نہ ہونے دیا۔ لڑکوں میں کسی قسم کی تفریق و امتیاز کو روا نہ رکھا تھا۔ لڑکے بھی اُن کو ہی پِتا جانتے اور مانتے تھے۔ یہ مصیبت اچانک آن پڑی اور آئی بھی ایسے وقت جب میں دوسرے کام میں مصروف تھا۔

ہم لوگ داہ کریا (لاش جلانے کی رسم) کے لئے سرجو جی گئے، جو اِن دِنوں چھپرا شہر سے کچھ دور پر تھیں۔ داہ کریا کرتے دیر ہو گئی۔ دوسرے دِن سویرے گھر کے سب لوگوں کے ساتھ موٹر پر ہم زیرادیئی چلے گئے۔ وہیں گھر پر شرادھ (آخری تعزیتی مراسم) وغیرہ ہوئی۔ بھائی سارے صوبے میں مشہور تھے۔ وہ خدمتِ عامہ میں بہت وقت لگاتے تھے۔ مزید برآں چھپرا میں اور دوسری جگہوں میں بھی لوگوں کی خدمت اور مدد کیا کرتے تھے۔ کسی کے گھر میں

یگیہ ہو تو انتظام اور مدد کرتے۔ کسی قسم کا جلسہ ہو یا کانفرنس وہ انتظام میں لگ جاتے تھے۔
ذاتی سلوک لوگوں کے ساتھ اِتنا اچّھا رکھتے تھے کہ کسی کو کوئی ضرورت ہو تو اس کو پورا کرنے میں ہچکتے نہیں تھے۔ اِسی لئے اُن کی وفات کی خبر جب چھپی تو سارے صوبے سے بہت سے دوستوں کے تعزیتی تار اور خط آئے۔ اِن سب سے مجھے بڑا ڈھارس بندھا۔ مہاتما جی کے تسلّی آمیز لفظوں کا اثر تو پڑے بغیر رہ ہی نہیں سکتا تھا۔

یہ سب ہوتے ہوئے بھی میرے لئے یہ بہت ہی کٹھن اور دُکھ کا وقت تھا۔ میں کہہ چُکا ہوں کہ گھر کے کاروبار سے میرا کچھ سروکار نہیں رہا کرتا تھا۔ سب کچھ بھائی ہی دیکھا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ جب میں رقم پیدا کیا کرتا تھا۔ تب بھی میرے ذاتی آرام اور ضرورت کی چیزوں کا انتظام وہی کیا کرتے تھے۔ جب پٹنہ آتے تو نوکر سے پوچھتے کہ اُن کے کپڑے تو ٹھیک ہیں نا۔ دھوتیاں سالم ہیں یا پُرانی ہو گئی ہیں، کُرتے کتنے ہیں۔ ناشتہ کیا کرتے ہیں، وغیرہ۔ ضرورت کے مطابق اِس نوکر کو یا میرے محترم مولوی شرافت حسین کو، جن کو ہم سب منشی جی کہا کرتے تھے۔ ہدایت دے جاتے۔ میں بھی جو کچھ خرچ کر کے بچ جاتا، سب اُن کے ہی حوالے کر دیتا۔ گھر پر تھوڑی زمینداری تھی جس سے چار سو، پانچ سو تک ماہانہ بچت ہو گی۔ والدِ ماجد زمینداری کے کام سے الگ ہی رہتے تھے۔ اِس سے کچھ بدانتظامی ہو گئی تھی۔ جس کی وجہ سے اِتنی آمدنی ہوتے ہوئے بھی کبھی کبھی دِقّت ہو جایا کرتی۔ میں پہلے ہی لکھ چکا ہوں کہ جب بھائی الہ آباد میں بی اے میں پڑھ رہے تھے تب اِمتحان کے لئے اُنہوں نے یونیورسٹی فیس کے روپئے مانگ بھیجے۔ اِتنی رقم کوئی بڑی چیز نہ تھی۔ مگر انتظام کا سارا بار دیوان پر تھا۔ دیوان جلد نہ دے سکے تو والد نے قرض لے کر روپئے بھجوائے۔ یہ تو ایک معمولی مثال ہے۔ روپئے کی دِقّت ہمیشہ رہا کرتی۔

میں چھپرا میں جب پڑھتا تھا تو وہاں نقد روپے کی بہت کم ضرورت ہوتی۔ دو مودیوں سے بات پکّی ہو گئی تھی۔ میں پرچہ لکھ دیتا وہ ضرورت کی چیزیں دے دیتے۔ سب پرزے لے کر وہ زیرا دیئی جاتے اور روپیے وہیں سے پاتے۔ صرف اسکول کی فیس اور کتابیں یا کپڑا خریدنے کے لئے نقد روپیے کی ضرورت ہوتی۔ جب بھی کوئی گھر سے زمینداری کے مقدّمے کی پیروی کے لئے آتا تو اس سے میں لے لیتا۔ اِس کے لئے ایک آدمی جس کا نام رِکنُو رائے تھا، مقرر تھا۔ وہ ہمیشہ چھپرا آتا جاتا رہتا۔ اِس لئے مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوئی، مگر یہ بات بھائی کے ساتھ نہیں تھی۔ اُن کو پٹنہ یا الہ آباد میں ہر مہینہ خرچ کے لئے نقد روپیہ چاہئے تھا۔ اِس کے لئے اُن کو بہت مصیبت اُٹھانی پڑی تھی۔ اِس بات کو وہ بھولے نہیں تھے۔ اس لئے والد کے اِنتقال کے بعد جب اُنھوں نے زمینداری کا انتظام سنبھالا تو میرے پاس خرچ بھیجنے کا بہت اچھّا انتظام کر دیا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ والد کی زندگی میں ہی جب وہ الہ آباد سے بی اے پاس کر کے آ گئے زمینداری کا کام دیکھنے لگے اور اُنھوں نے انتظام اچھّا کر دیا۔

والدِ ماجد کے انتقال کے وقت کچھ قرض تھا۔ اُن کی وفات کے بعد ایک بھتیجی کی شادی میں بھی کچھ قرض ہو گیا۔ اِس طرح کئی ہزار کا قرض تھا۔ مگر اِتنی زمینداری کے لئے یہ قرض اِتنا بڑا نہ تھا کہ ادا ہی نہ ہو سکے۔ خاص کر اگر کچھ باہر کی نقد آمدنی ہو جائے بھائی صاحب بہار بینک کی چھپرا کی شاخ کے منیجر تھے۔ مگر اُن کو اِتنی تنخواہ نہ ملتی تھی کہ وہاں کا سب خرچ چلا کر وہ کچھ بچا سکیں۔ میں کچھ کماتا ضرور تھا مگر خرچ بھی کافی کرتا تھا۔ اِسی لئے یہ قرض ادا نہ ہو سکا۔ ایک اور لڑکی کی شادی آ گئی۔ اُس میں بھی خرچ پڑا۔ چچی صاحبہ مر گئیں اُن کی شرادھ میں خرچ پڑا۔ مگر اِن سب سے قرض نہیں بڑھا۔ بلکہ آمدنی کچھ بڑھ گئی، کیوں کہ

بارہ سو روپیے کی سالانہ آمدنی جو چچی صاحبہ کو تیرتھ یاترا کے لئے ملی ہوئی تھی، اب بچنے لگی۔ پھر بھی بوجھ کسی طرح ہلکا نہ ہوا۔ مگر سب لوگ بہت آرام سے رہتے۔ اوپر کا ٹھاٹھ باٹھ بہت اچھا تھا۔ نام اور شہرت بھی بہت اچھی تھی بھائی صاحب بہت ہی فیاض تھے خرچ کافی کیا کرتے۔ کسی عیش پرستی یا شوقینی میں نہیں۔ مگر طرح طرح کے دوسرے خرچ تھے۔ اِسی لئے اچھا انتظام ہونے پر بھی پہلے کا قرض اَدا نہ ہو سکا۔ وہ اُس لگائے تھے کہ میں اِتنے پیسے کما لوں گا کہ قرض آسانی سے اَدا ہو جائے گا۔ جب میں نے وِکالت چھوڑنے کا تہیّہ کر لیا تو اُن کی سب اُمّیدوں پر پانی پھر گیا مگر کبھی اُنہوں نے مجھ سے ایک لفظ بھی نہیں کہا۔

وہ جانتے تھے کہ خدمتِ خلق کی طرف میری رغبت اُن کے ہی حوصلہ دلانے سے ہوئی تھی۔ جہاں تک ہو سکا وہ برابر اُس میں میری مدد ہی کرتے تھے۔ کبھی بے اِطمینانی ظاہر نہ کرتے۔ وہ مجھے اس طرح کے کام سے روکنے کا خیال بھی اپنے دل میں نہ آنے دیتے اِسی لئے اپنی تمام دنیوی اُمیدوں پر پانی پھرتے دیکھ کر بھی وہ خوش ہی رہے اور ہمیشہ مجھے خوش رکھنے کے جتن میں ہی لگے رہے۔ اُنہوں نے سوچا کہ بینک کی نوکری سے آمدنی زیادہ نہیں ہو سکتی۔ زیادہ تنخواہ والی دوسری نوکری چاہتے تو مل جاتی کیونکہ وہ چُست مینجر ہونے کی حیثیت سے کافی مشہور تھے۔ مگر جس بینک کے قائم ہونے میں اُنہوں نے مدد کی تھی اُس کو کسی طرح چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔ پھر اس میں سہولت بھی تھی۔ وہ نوکر کی طرح نہیں مالک کی طرح کام کرتے۔ اِتنی محنت شاید کوئی نوکر (مینجر) کسی بینک میں کرتا۔ ساتھ ہی وہ تقریباً ہر اتوار کو زیرادیئی چلے جاتے اور گھر کا کاروبار دیکھ آتے، سماجی کاموں میں بھی بہت وقت لگاتے۔ بینک کے عہدہ داروں کی طرف سے اس میں کبھی رکاوٹ نہ ڈالی جاتی۔ اِنہی

وجہوں سے اُنہوں نے بینک سے الگ ہونا غیر مناسب سمجھا مگر سوچا کہ دوسرے ذریعوں سے کچھ آمدنی بڑھائی جائے۔ اسی لئے اُنہوں نے چاول کی ایک مِل کھولی۔

میں تو کانگریس کے کام میں مصروف تھا۔ مِل کا کام بہت آگے بڑھ جانے پر مجھے اس کا پتہ لگا۔ بھائی کے ہاتھ میں بینک کا کام، کواپریٹیو سوسائٹیوں کا کام اور دوسرے اِتنے زیادہ کام تھے کہ وہ اس کی دیکھ بھال میں کچھ وقت نہ دے سکے۔ اُنہوں نے دوسروں پر بھروسہ کیا، دوسرے لوگ چاہے تجربہ کی کمی سے یا سستی سے یا کسی اور سبب سے ٹھیک انتظام نہ کر سکے۔ مِل میں روپئے کی کمی ہوگئی۔ دھان کا موسم گزرتا جاتا تھا۔ مگر اس وقت دھان نہ خریدا جاتا تو منافع نہ ہوتا۔ مگر اُمید کی جاتی تھی کہ اگر کسی سے روپئے لے کر لگا دئے جائیں تو موسم گزرنے پر چاول بِک جانے سے روپئے واپس آجائیں گے اور مہاجن کی ادائیگی ہوجائے گی۔ بازار کی حالت ایسی سمجھی جاتی تھی کہ لاگت اور روپیوں کا سود دینے کے بعد بھی اچھا منافع رہتا۔ اُنہوں نے ایسا ہی سمجھا اور مجھ سے کہا کہ سیٹھ جمنالال جی سے ایک موسم کے لئے کچھ روپئے لادو۔ سیٹھ جی نے اِس بات کو منظور کر لیا۔ روپئے آگئے۔ مِل خوب زوروں سے چلنے لگی۔ تیار ہونے سے پہلے ہی چاول بک ہو جاتا۔ خریداروں کی بھیڑ لگی رہتی۔ سب سمجھتے تھے کہ خوب منافع ہوگا۔ مِل کے جو حضرت مہتمم تھے اُنہوں نے دام لگانے میں ہی غلطی کر دی تھی۔ لاگت سے کم شرح پر ہی چاول بک رہا تھا۔ ایسی حالت میں خریداروں کا ٹوٹ پڑنا کوئی تعجب کی بات نہیں، جتنا زیادہ چاول بنتا اور بِکتا، خسارہ اُتنا ہی بڑھتا گیا۔ سیٹھ جی کے روپئے آجانے سے میں نے بھی تھوڑی دلچسپی لی۔ ایک دن مِل میں گیا۔ وہاں ٹھہر کر حساب دیکھا تو معلوم ہوا کہ لاگت سے کم پر ہی چاول بِک رہا ہے۔ مینجر میری بات مانتے ہی نہ تھے۔ آخر بھائی صاحب کو بھی وقت لگانا پڑا۔ اُنہوں نے بھی حساب لگا کر دیکھا، اور

سمجھ لیا کہ بہت نقصان ہو چکا ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیٹھ جی کا روپیہ وقت پر نہیں دیا جا سکا۔ آہستہ آہستہ کچھ ادا ہوا مگر بہت زیادہ باقی رہ گیا۔

ایسی حالت معلوم ہوئی تو ہم دونوں بہت شرمندہ ہوئے مگر کچھ کر نہیں سکتے تھے تقاضا ہوتا رہا مگر روپے ادا نہ ہو سکے۔ سیٹھ جی کے ایک مارواڑی دوست شری ویدناتھ کیڈیا بہار میں کہیں تھوڑی زمین لے کر کھیتی کرنا چاہتے تھے۔ ایک بار سیٹھ جی اور کیڈیا جی دونوں زیرادیئی آئے۔ میری زمینداری میں ستر اسّی بیگھہ زمین ایسی ہے جو خود کاشت ہے اس میں دھان گیہوں ایکھ وغیرہ ہر قسم کی فصل پیدا ہو سکتی ہے۔ میرے مکان سے تقریباً ایک میل کے اندر ہی یہ سب زمین ہے۔ سیٹھ جی کے اور دوسرے قرض ملا کر ساٹھ پینسٹھ ہزار ہوتے تھے۔ وہ اِس پر رضامند ہو گئے کہ یہ زمین اور مکان اُن کو ہم بیچ دیں تو وہ سب کا سب قرض چکتا کر دیں گے۔ مکان پکّا ہے، شاندار ہے۔ بنا تو تھا دادا کے وقت میں مگر بھائی صاحب نے کئی ہزار روپئے لگا کر اُسے بڑھایا تھا اور کچھ حصّہ کو دو محلا بنایا تھا۔ اگر مکان اور زیرادیئی کی زمین ہم اس وقت بیچ دیتے اور قرض سے نجات پا جاتے تو ہر طرح اچھا ہوتا۔ اِس کے بعد بھی کم سے کم پانچ سو روپے کی بے داغ آمدنی زمینداری سے بچ جاتی۔ ہاں گھر کہیں اور بنانا پڑتا۔ مگر اس زمانے میں گھر کے لوگ زیادہ تر چھپرا رہا کرتے تھے۔ چھوٹا گھر کہیں اپنی زمینداری میں بنا لینا مشکل نہیں تھا۔ میں نے اِس رائے کو پسند کیا اور اس پر زور دیا کہ قرض ادا کرنے کا اس سے بہتر راستہ اِس وقت نہیں ہو سکے گا۔ اِس لئے اِسے طے کر دینا چاہیئے۔

سیٹھ لوگوں سے بات چیت ہوئی وہ تو راضی تھے ہی۔ سیٹھ جمنالال بجاج نے بھی بہت زور دیا کہ یہ بوجھ ہٹا دینا چاہیئے ورنہ آگے چل کر یہ گلا دبا دے گا۔ بھائی صاحب

باپ دادا کے بنائے اور ہم سب کے جنم استھان پُرانے مکان کو بیچنے میں بہت ہچکے مگر مجبوراً کچھ کچھ رضامند بھی ہوئے۔ بعدازاں گھر کی عورتوں اور کچھ دوستوں کی رائے سے جن میں بابو متھرا پرشاد بھی تھے۔ وہ متاثر ہو کر مکان اور کھیت بیچنے پر راضی نہیں ہوئے آبائی مکان اور زراعت کے کھیت تو نہیں بکے مگر تھوڑے ہی دنوں میں دوسرے مہاجنوں کا اتنا زور ہوا کہ کافی زمینداری بیچنی پڑی۔

چاول مِل کے خسارہ سے تو دبے تھے ہی۔ اُنہوں نے کچھ دوسرا کاروبار کرنا چاہا چھپرا میں بجلی کا کارخانہ کھولنے کا انتظام کیا۔ ۱۹۳۰ء میں جب میں جیل میں تھا۔ یہ بات طے ہوئی۔ روپئے اِتنے پاس تھے نہیں۔ چھپرا الیکٹرک سپلائی کمپنی قائم کی گئی۔ سرکار نے لائسنس اُن کو دیا کمپنی کو نہیں۔ اِس لئے بجلی کی مشینری اُنہوں نے ہی لگائی۔ روپئے قرض کے تھے۔ کچھ بینک سے لے کر کمپنی نے دیا۔ کچھ حصّے بیچ کر اور کچھ اُنہوں نے اپنی ذمہ داری پر قرض لے کر روپئے لگائے۔ پہلے کا اور سب کا ملا کر خرچ بہت ہو گیا تھا۔ مرنے کے ایک دو سال پہلے ہی اُن کو تقریباً دو ہزار دو سے روپئے سالانہ آمدنی کی زمینداری بیچ دینی پڑی تب بھی ابھی تک قرض ادا نہ ہوا۔ سیٹھ جمنالال بجاج کے روپئے تو باقی رہ ہی گئے۔ دوسرے بھی بہتوں کے قرض کے روپئے باقی تھے۔ مجھے سیٹھ جی کے سوا دوسروں کے قرض کی خبر نہیں تھی۔ جب زمینداری بکی تو میں نے سوچا تھا کہ سب بوجھ ہلکا ہو جائے گا مگر یہ کہاں ہونے والا تھا۔ کچھ تو خرچ کی وجہ سے اور کچھ اِس طرح کے بیوپار کی وجہ سے قرض بڑھتا ہی گیا۔ کبھی کبھی وہ کہا کرتے تھے کہ بجلی کے حصّے اگر بک جائیں، اور جو روپئے لگائے گئے ہیں وہ اُتر جائیں تو بوجھ ہلکا ہو سکتا ہے مگر یہ بھی اُنہوں نے صاحبِ رجا ہونے کی وجہ سے کہا تھا۔ کچھ حصّے بیچنے کی کوشش بھی کی گئی مگر چونکہ بجلی کے

کارخانے پر کمیٹی کی ملکیت ہی نہیں تھی حصہ بکنے میں دشواریاں ہوئیں۔ اِس طرح اپنے اوپر قرض کا بھاری بوجھ بڑھتا گیا، سود بھی بڑھتا گیا اور ادا کرنے کا کوئی سامان نظر نہیں آتا تھا۔ لڑکوں میں میرا بھتیجا اِنگلستان سے لوہا بنانے کا کام سیکھ کر آیا اور ٹاٹا کمپنی میں اُسے جگہ مِل گئی۔ وہاں اُسے تین سو، ساڑھے تین سو روپئے ماہانہ کے قریب تنخواہ ملتی تھی۔ مگر وہاں کا خرچ اور گھر کے لوگوں کے رہ جانے کا خرچ اِتنا زیادہ ہوتا کہ وہ بہت بچا نہ سکتا تھا۔ شاید بھائی صاحب جس طرح مجھ سے کبھی کچھ نہ مانگتے اور نہ مجھے زیادہ فکر میں ڈالنا چاہتے، اُسی طرح اُس سے بھی کبھی کچھ نہ چاہتے اور نہ کہتے۔ اُن کی وفات ہو جانے کے بعد ہم کو اس کا پتہ چلا کہ ہم کتنے گہرے پانی میں اُتر چکے ہیں۔ لوگوں کو اِن پر اِتنا اِعتبار تھا کہ بغیر کسی لکھا پڑھی کے ہزاروں روپئے کا قرض اُنہیں دے دیا تھا۔ اگر وہ زندہ رہتے تو اور بھی نہ معلوم کتنے ہزار اُن لوگوں سے مل جاتے۔

اُن کے مرنے کے بعد جب میرے یہ سب دیکھنے کی نوبت آئی تو پہلے تو مجھے یہی نہیں معلوم تھا کہ کس کو کتنا دینا ہے اور کس سے کتنا پانا ہے۔ میں چھپرا میں ٹھہر گیا، اُن کے ایک معتبر بنک کے نوکر تھے، جو اُن کے ذاتی لین دین کی بھی پوری خبر رکھتے تھے۔ اُنہوں نے مجھے کچھ بتایا اور بعد میں مہاجن لوگ ایک ایک کر کے خود میرے پاس آئے اور بتانے لگے جب مجھے پورا پتہ چلا کہ کتنا دینا ہے تو میں بہت پریشان ہو گیا، کیون کہ سب کچھ بیچ دینے پر بھی سب کا قرض ادا ہونا مشکل تھا۔ ہاں اگر اچھی قیمت آجائے تو کسی طرح شاید سب ادا ہو سکے۔ مگر اب زمینداری کی اچھی قیمت دیتا کون تھا، اور وہ بھی جب جلدی میں بیچنا ہو۔ اِتنے قرض کا بار سر پر رکھنا میرے لئے ناقابلِ برداشت تھا، میں چاہتا تھا کہ کسی طرح لوگ زمینداری لے لیتے اور ہم کو نجات دے دیتے تو بڑی عنایت ہوتی۔ مگر کوئی مہاجن زمینداری لینی نہیں چاہتا تھا۔ میں نے سب سے کہا کہ میں کوئی نہ کوئی انتظام کر کے ایک سال کے اندر

روپیہ ادا کرنے کا جتن کروں گا اور جو زمینداری لینا چاہیں اُن کو تو فوراً ہی لکھ کر دینے کو تیار ہوں۔ لوگوں کا بھائی صاحب پر اِتنا اعتبار تھا اور اُن کے ساتھ اِتنا پریم تھا اور مجھ پر بھی اِعتماد تھا کہ سب بے تامّل میری بات مان گئے۔ میں چاہتا تھا کہ اب سب کام چھوڑ چھاڑ کر زمینداری بیچنے کے اہتمام میں لگ جاؤں اور اِس بوجھ کو ہٹا کر پھر قومی کام میں آ لگوں۔

قرض سے نجات اور بمبئی کانگریس

بمبئی میں ہونے والی کانگریس کا وقت نزدیک آنے لگا اور صدارت کے لئے میرا نام آیا۔ کراچی کانگریس کے بعد اُڑیسہ میں ہونے والی کانگریس کی صدارت کے لئے بھی میرا نام پیش ہوا تھا اور ایک طرح سے میں چُنا بھی گیا تھا مگر ستیہ گرہ چھڑ جانے کی وجہ سے وہ اِجلاس ہوا ہی نہیں۔ جب پھر باضابطہ کانگریس ہونے لگی تو لامحالہ میرا ہی نام لوگوں میں جچنے لگا۔ مزید برآں مصیبت زدگانِ زلزلہ کی اِمداد کے نام سے سارے مُلک میں میرے لئے بہت التفات اور اعتماد ہو گیا تھا۔ گاندھی جی بھی میری ہی صدارت ہونا چاہتے تھے۔

بھائی کی وفات کے صدمے سے میں گھائل تھا ہی اِس پر قرض کے بوجھ کا پتہ لگتے ہی اور بھی جی چھوٹ گیا۔ میں نے ایسی حالت میں کانگریس کی صدارت کا بار اُٹھانا نامناسب اور ناممکن سمجھا۔ مہاتما جی کی طرف سے شری مہادیو بھائی ڈیسائی نے لکھا کہ زلزلہ کے متعلّق کاموں سے مطمئن ہو کر ملک آپ کے پر اعتماد اور اِعتقاد ظاہر کرنا چاہتا ہے۔ آپ کے لئے یہ بار اُٹھانا مناسب ہے۔ قرض کے متعلق سیٹھ جمنالال جی سے کچھ باتیں ہوئی ہیں، وہ دیکھیں گے۔ شاید وہاں یہ سمجھا گیا تھا کہ اُن کا ہی زیادہ قرض ہے، تو وہ کوئی تدبیر سوچ کر

کچھ انتظام کر دیں گے۔

سیٹھ جی ایک بار میرے گھر کے لوگوں سے ملنے زیرادیئی آئے۔ گھر کے لوگوں کے ساتھ بھی اُن کا بہت پریم ہو گیا تھا۔ میری بھابی، میری بیوی اور دو بہوئیں بہت دنوں تک سابرمتی آشرم میں رہی تھیں۔ وہیں اُن سے سب کی ملاقات ہو گئی تھی۔ اِسی لئے بھائی کے مرنے پر پُرسے کے لئے وہ آئے تھے۔ گھر کا سب حال اور قرض کا بھی کچھ حال سنا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ سب زمینداری اگر ٹھیک قیمت پر بِک جائے تو سب قرض اَدا ہو سکے گا مگر زمینداری کا لالچ قطعاً چھوڑنا پڑے گا۔ میں اِس پر راضی تھا ہی اِس لئے مہاتما جی نے اُن کا حوالہ دیا اور قرض کی فکر اُن پر چھوڑ کر کانگریس کا بار اُٹھانے کو کہا۔ یہاں مہاجنوں نے بھی ایک سال کی مُہلت دے دی تھی۔ میں نے صدارت کا بارِ عظیم منظور کر لیا۔ سیٹھ جی نے اپنے منیم کو بھیج دیا کہ سب مہاجنوں سے حساب کر لیں جس سے اس کا پورا پتہ لگ جائے کہ کتنا دینا ہے اور اُن سے بات چیت کر کے بھی یہ پتہ لگائیں کہ ان میں سے کون کون زمینداری لینے پر راضی ہیں۔

مگر میری مصیبت کا ابھی خاتمہ نہیں تھا۔ میرے بھتیجے جناردن کا ایک چھ برس کا ہونہار بچہ، جسے ہم سب پیار کرتے تھے۔ ٹائیفائڈ میں چل بسا۔ میں بہت ہی محزوں تھا مگر کانگریس کی صدارت منظور کر لی۔ یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ اِس میں جی لگ گیا اور اب گھر کی فکر کرنے کا وقت ہی نہ رہا۔ کانگریس کی صدارت کی بات کرنے سے پہلے گھر کی بات پوری کر دینا اچھا ہوگا۔ اگر چہ یہ باب صدارت کے بعد بھی کچھ دنوں تک چلتا رہا۔

جب قرض کا سب حساب دیکھ لیا گیا اور سیٹھ جی کو رپورٹ دی گئی تو اس بات کی کوشش کی گئی کہ جو راضی ہوں اُن کو زمینداری دے دی جائے۔ کچھ مہاجن راضی ہوئے اُن کے ہاتھ زمینداری بیچ دی گئی۔ مہاجن لوگ تقریباً سبھی ایک کو چھوڑ کر بہت اچھی طرح

پیش آئے۔ ایک حضرت نے کس کر سود لیا۔ عام طور پر مہاجن بے باقی کے وقت کچھ رقم چھوڑ دیا کرتے ہیں۔ اُنہوں نے ایک پیسہ بھی نہ چھوڑا اور سبھوں نے بھائی صاحب کی وفات سے لے کر ادائیگی کے دن تک کا، جو سات آٹھ مہینے ہوتے تھے۔ سود نہیں لیا۔ کسی کسی نے اور بھی کچھ رقم چھوڑ دی۔ زمینداری وغیرہ کا بیشتر حصّہ بیچ ڈالنے پر بھی کچھ مہاجنوں کے جو زمینداری لینا نہیں چاہتے تھے اور سیٹھ جی کے روپئے باقی رہ گئے۔ میں نے باقی ساری زمینداری سیٹھ جی کے نام زرِ پیشگی لکھ دی۔ اور اُنہوں نے دوسرے مہاجنوں کے نقد روپئے ادا کر دئے۔ سب روپئے اس وقت وہ اپنے پاس سے نہیں دے سکتے تھے تو اُنہوں نے سیٹھ گھنشیام داس برلا سے کچھ روپئے دِلوائے اور کچھ خود دئے اِس طرح سارا کا سارا قرضہ ادا ہو گیا۔ مگر ایک شمّہ زمین بھی اپنی زمینداری کی نہیں رہ گئی۔ سیٹھ جی کو بہار میں زمینداری تو لینی نہیں تھی۔ اُس وقت اُنہوں نے اُسے اِس لئے لکھوا لیا تھا کہ آہستہ آہستہ زمینداری بیچ کر اُن کے روپئے ادا کر دئے جائیں گے۔ یہی خیال سیٹھ گھنشیام داس کا بھی تھا۔ اِس طرح میں قرض کے بوجھ سے چھٹکارہ پا گیا۔

ہاں، زمینداری بیچ کر سیٹھوں کے روپئے ادا کرنے تھے۔ جب تک ادا نہ ہوں سود دینا تھا۔ اب زمینداری میں سے ایک حبّہ بھی ہم گھر کے خرچ میں نہیں لے سکتے تھے۔ خود کاشت کی زمین بھی زرِ پیشگی میں تھی۔ مگر سب کی کاشت وغیرہ ہم لوگوں کو ہی کرانی تھی اور اُن لوگوں کو سالانہ سود ادا کرتے جانا تھا۔ زمینداری کا ٹھیکہ اُنہوں نے میرے چھوٹے لڑکے دھنّو کے نام لکھ دیا تھا۔ اِس طرح اگرچہ قانونی طور پر زرِ پیشگی دار سیٹھ جی ہوئے پھر بھی زمینداری اور خود کاشت ہمارے قبضہ میں ہی رہی۔ اُن کو صرف سالانہ سود ملنا تھا اور جیسے جیسے ہو سکے اصل روپے بھی پلانے تھے۔ لڑکے کچھ نہ کچھ

رقم پیدا کر رہے تھے، اِس لئے زمینداری پر معاش کے لئے انحصار کرنے کی ضرورت نہیں تھی
میں نے اِس بات کی کوشش کی کہ بچی ہوئی زمینداری بِکے مگر اب زمینداری کی قیمت اور بھی
گھٹتی گئی۔ کانگریس وزارت نے لگان گھٹا کر آمدنی بھی کم کر دی۔ اَب زمینداری کی نہ وہ قیمت
رہی نہ وہ عزّت۔ اِس لئے زمینداری ابھی تک بِکی نہیں۔ مگر میں صرف اُسے بیچنے کے ہی
بھروسے بیٹھا نہیں رہا۔ چمپارن میں کچھ زمین میں نے وِکالت کے زمانے میں ہی لی تھی۔ وہاں
پاس ہی چینی کے مِل کُھل جانے سے ایکھ (گنّے) سے کچھ رقم ملنے لگی۔ زیرادیئی کے پاس
کی زراعت میں بھی ایکھ سے کچھ پیدا ہونے لگا۔ کچھ خباروں کی کمائی سے، کچھ دھنّو کے ایکھ کے
ٹھیکے کی بچت سے، کچھ گھر کے پُرانے قیمتی شال دوشالے بیچ کر، ہم نے سود اور اصل اَدا
کرنا شروع کر دیا یعنی جو کچھ آتا اور بچتا، سب اسی کام میں لگا دیا جاتا۔ اِس طرح اَب تک
اِس قرض کی اچھّی رقم ادا ہو چکی ہے، مگر اب بھی کچھ رقم باقی ہے۔ سود ہمیشہ ادا ہوتا گیا
ہے۔ اب ایسی حالت میں میں اُمید کرتا ہوں کہ اصل بھی کچھ دِنوں میں اِسی طرح سے بغیر زمینداری
بیچے ادا ہو جائے گا۔ وہ دِن میرے لئے بہت ہی تیرہ و تار تھے۔ جب اپنے اُوپر اِتنے
قرض کا بار میں نے پایا۔ سیٹھ جمنالال جی کی فِراست و فیّاضی سے راستہ نکالا اور گھنشیام داس جی
کی مدد لے کر اُنھوں نے میرے سر کا بوجھ ہلکا کر دیا۔ زمین تو نہیں بچی مگر عزّت بچ گئی، ایمان
بچ گیا۔ سب مہاجنوں کا جو ہم پر اعتماد تھا، وہ بھی بچ گیا۔ ساتھ ہی مُلک کے اہم کام کا بار
اُٹھانے کی سکت بھی بچ گئی۔

بھائی صاحب گئے، جمنالال جی نے اُن کی جگہ لے لی۔ میں پہلے جیسا ہی نِٹھلّا بنا رہا
اُن کے تئیں الفاظ کے ذریعے اِحسان مندی ظاہر نہیں کی جا سکتی۔ ساتھ ہی میں اپنے بھتیجے
جنار دن اور دونوں لڑکوں مرتنجے اور دھننجے کو بھی دِل سے دُعا دیتا ہوں۔ قرض کی

مُصیبت کے اِن سخت دِنوں میں بھی وہ بے صبر نہیں ہوئے ۔ گھر کا سب کچھ خوشی خوشی ہنستے ہنستے ، اُنہوں نے دے ڈالا ۔ ایک طرح سے پہلا کام اُن کا اِس بوجھ کو ڈھونے اور قرض کو ادا کرنے کے لئے دستاویز پر دستخط کرنا ہی ہوا ۔ اُنہوں نے نہ کبھی شکایت کی نہ منہ بنایا ۔ اب وہ اپنا کھاتے کماتے ہیں ۔ جو بوجھ ابھی رہ گیا ہے ، اُس کو بھی ہٹانے کی فکر میں وہ ہیں ۔ اِس ہمت اور صبر کے لئے اُن کو بھی مبارک باد ۔ خُدا اُن بھی بھلا کرے گا ۔ ابھی کچھ اچھے دِن لوٹتے دکھائی دینے لگے ہیں ۔

بمبئی کانگریس کے دِن قریب آ گئے ۔ مارچ ۱۹۳۱ء کے بعد کانگریس کا باضابطہ اِجلاس یہی ہونے والا تھا ۔ اِسی درمیان ، دوبارہ ستیہ گرہ ہو چکا تھا ۔ برٹش سرکار نے اپنی ریفارم کی پالسی وائٹ پیپر کی شکل میں شائع کر دی تھی ۔ وِلایت میں نیا آئین اِسی کے مطابق بن رہا تھا ۔ کانگریس اب غیر قانونی جماعت نہیں ۔ وہ اِن معاملوں پر اپنی رائے دینے والی تھی ۔ ساتھ ہی نومبر ۱۹۳۴ء میں ہی یعنی کانگریس کے اجلاس کے چند ہفتوں کے اندر ہی مرکزی اسمبلی کے ممبروں کا چُناؤ ہونے والا تھا ۔ اِس بارے میں بھی کانگریس کو آخری فیصلہ دینا تھا ۔ آیندہ آئین کے متعلق پالسی بھی مرتب کرنی تھی ۔ اِس لئے آئین کی اہمیت کافی تھی ۔ میں نے رُوایت کے مُطابق اپنی تقریر لکھی ۔ مگر وہ پوری نہ ہو پائی تھی ۔ میں نے سوچا تھا کہ کچھ پہلے ہی وردھا چلا جاؤں گا اور وہاں تنہائی میں بیٹھ کر اُسے ختم کروں گا ۔ وہاں گاندھی جی سے باتیں کر لینے کا موقع ملے گا ۔ مگر جو تقریر میں نے لِکھی تھی ، اُس میں مجوزہ آئین کی کافی تنقید تھی ، میں نے اُسے ڈاکٹر سچدا نند سنہا کو دِکھایا کہ کہیں کسی پہلو میں ناواقفیت یا بے اطمینانی کی وجہ سے میں نے کوئی بھول تو نہیں کی ہے اُنہوں نے اُسے دیکھا اور مجھے یقین دِلایا کہ تنقید درست ہے ، اور کوئی غلطی نہیں ہے ۔ میں پٹنہ

سے جمشید پور گیا، وہیں سے واردھا جانے والا تھا۔ وہاں مجھے بخار اور دمہ کا دورہ ہو گیا۔ وہیں ٹھہر جانا پڑا۔ اچھا ہو کر واردھا گیا۔ وہاں کی آب و ہوا سے جلد ہی اچھا ہو گیا مقالہ بھی وہیں مکمّل کر سکا۔

بمبئی کانگریس

بمبئی والوں کو کانگریس کے اِجلاس کے انتظام کے لئے وقت کم مِلا تھا۔ مگر انہوں نے بہت ہی اچھا اور عظیم انتظام کر لیا۔ جیسے ریلیف کمیٹی کے روپیہ جمع کرنے کے وقت لوگوں میں جوش تھا ویسے ہی اِس اجلاس کے لئے بھی جوش ہو گیا تھا۔ لوگ سمجھتے تھے کہ یہ دکھا دینا چاہیئے کہ کانگریس مری نہیں ہے۔ اُنہوں نے ایک کانگریس نگر بسایا تھا۔ وہیں سمندر کے کنارے، کھلے میدان میں اِجلاس کے لئے، آسمان کے نیچے وسیع پنڈال بنایا۔ جس میں تقریباً ایک لاکھ آدمی بیٹھ سکتے تھے۔ کھدّر کی نمائش کا بھی ویسا ہی خوب صورت اور عظیم اہتمام کیا۔ صدر کے اِستقبال کا خاص انتظام تھا۔ کلیان اسٹیشن پر ہی میں ناگپور میل سے اُتار لیا گیا۔ وہاں منہ ہاتھ دھو کر ناشتہ کر کے میں تیار ہو گیا۔ کلیان میں ہی کئی انجمنوں کی طرف سے مجھے ایڈریس دئے گئے۔ وہاں سے میں گھر کے لوگوں اور کچھ دوستوں کے ساتھ اسپیشل ٹرین پر گیا۔ کلیان اسٹیشن پر ہی شری دیپ نرائن سنگھ اُتر پڑے اور میرے ساتھ ہو لئے۔ اُن کی مہربانی مجھ پر بہت دِنوں سے تھی۔ مجھے صدر دیکھ کر اُن کی خوشی کا ٹھکانا نہ رہا۔ خاص کر اِسی لئے وہ وہیں اُتر کر میرے ساتھ ہو لئے۔

میں بڑے تزک و احتشام سے بمبئی پہنچا۔ جا بجا راستے میں گاڑی ٹھیری، استقبال کرنے والوں کا ہجوم تھا۔ گاڑی کا ڈبّا پھولوں کے ہاروں سے بھر گیا۔ لوگوں نے رنگ برنگی چیزیں نذر کیں۔ بمبئی اسٹیشن پر اتنی بھیڑ تھی کہ مجھے اُتار کر سواری تک لے جانا مشکل تھا۔ لوگوں نے چار گھوڑوں کی گاڑی پر چڑھا کر جلوس میں لے جانے کا انتظام کیا تھا۔ میں کم زور تھا مگر لوگوں کی خواہش اور استقبالیہ کمیٹی کے فیصلے اور اِس اہتمام کے خلاف کچھ بھی کرنا غیر ممکن، اِس لئے مسز سروجنی نائیڈو، شری نریمان اور اپنی بیوی کے ساتھ میں گاڑی پر سوار ہو کر جلوس میں چلا۔ اُس دن تک بہت لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ میری بیوی بھی ہے کیونکہ وہ میرے ساتھ کبھی جلوس وغیرہ میں نہیں جایا کرتی تھی۔ اُس دن بھی مسز سروجنی نائیڈو اُسے ساتھ نہ لیتیں تو وہ شاید اور لوگوں کے ساتھ اقامت گاہ پر چلی جاتی۔

جلوس بہت لمبا تھا۔ شہر کی تیاری بھی انوکھی تھی۔ لوگوں کا مجمع بھی ویسا ہی تھا، تمام دُکانیں سجائی گئی تھیں۔ جگہ جگہ لوگوں نے خوب صورت محرابیں بنوائی تھیں۔ بازار میں جہاں جو چیز خاص تھی وہاں اِس چیز کا زور سجاوٹ اور محرابوں میں نظر آتا۔ جہاں پھلوں کی دُکانیں تھیں، وہاں کی آرائش پھلوں سے ہی کی گئی تھی۔ روئی بازار کی محراب روئی کی گانٹھوں کی تھی۔ میں نے سُنا کہ اُس محراب میں جو بہت ہی عظیم الشّان تھی لاکھ روپئے سے زیادہ کی گانٹھیں لگی تھیں۔ راستے بھر میں بے شمار مقامات پر لوگوں نے پھول مالا، آرتی وغیرہ سے استقبال کیا۔ نہ معلوم کتنی چیزیں نذر کرتے گئے۔ گاڑی چیزوں سے بالکل بھر گئی تھی۔ اِس جلوس اور استقبال کے متعلق لوگوں کا یہ کہنا تھا کہ بمبئی میں پہلے کسی کا خیر مقدم اس طرح کا نہیں ہوا تھا۔ ۱۹۱۸ء میں حسن امام صاحب کا بھی وہاں بہت استقبال ہوا تھا جب وہ کانگریس کے اجلاسِ خصوصی کے صدر بنے تھے۔ مگر اس بار کی تیاری اُس سے

بھی کہیں زیادہ تھی۔ کیونکہ ۱۹۱۸ء کے مقابلے میں عوام میں بیداری اب کہیں زیادہ تھی، جلوس میں تقریباً تین گھنٹے سے زیادہ لگے۔ آخر میں کانگریس بھون ہوتا ہوا جائے اقامت پر جو کانگریس نگر میں ہی تھی پہنچایا گیا۔ میں بہت ہی تھک گیا تھا، مگر بیمار نہیں پڑا۔

دوسرے دن آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور سبجکٹس کمیٹی کی نشست ہونے والی تھی۔ مہاتما جی اور دوسرے لیڈر بھی پہنچ گئے تھے۔ سبجکٹس کمیٹی میں بحث بہت گرما گرم ہوتی رہی، کئی باتیں ایسی ہو گئی تھیں جن سے قدرتاً ایسا ہونا ہی تھا۔ کانگریس کے اجلاس سے کچھ پہلے گاندھی جی نے ایک بیان نکالا تھا۔ اُنھوں نے اُس میں کہا تھا کہ میں کانگریس سے الگ ہو جاؤں گا اور اُس کی جو کچھ خدمت یا مدد ہو سکے گی وہ کانگریس کے باہر رہ کر کرتا رہوں گا۔ ساتھ ہی اُنھوں نے یہ بھی کہا تھا کہ کانگریس کے آئین میں ردّوبدل کرنا ضروری ہے، جس سے وہ اور بھی زیادہ چُست اور عوام کی نمایندگی کرنے والی جماعت بن سکے۔ مہاتما جی کے اِس بیان سے مُلک میں یک گونہ کھلبلی مچ گئی تھی۔ اگرچہ مہاتما جی نے اِس بات کا پورا یقین دلا دیا تھا کہ باہر رہ کر بھی وہ کانگریس کی پوری مدد کر سکیں گے اور اُن کے اِس طرح ہٹ جانے سے کانگریس میں کمزوری نہ آئے گی بلکہ اُس کی طاقت بڑھے گی پھر بھی لوگوں کو اِس یقین دہانی سے تسلّی نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اپنی صدارتی تقریر میں مہاتما جی کے اِس تہیّے کی بھی تائید کی تھی۔ مگر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبروں میں اِس سے بڑی بے اطمینانی تھی۔

میں سوچتا تھا کہ مہاتما جی نے یہ فیصلہ کانگریس کو کمزور کرنے یا اس کی کسی طرح بُرائی کرنے کے لئے تو کیا ہی نہیں تھا۔ ہم جب چاہیں اُن سے صلاح و مشورہ کر سکیں گے اور سبھی اہم باتوں میں اُن کی رہنمائی حاصل رہے گی۔ مگر اُن کے ہٹ جانے سے

ایک بات ضرور ہوگی ۔ سبھی فیصلوں کا بار اُن کو سوچ سمجھ کر لینا ہوگا ، جو لوگ رہ جائیں گے ۔ جب سے مہاتما جی کانگریس میں آئے ۔ اُن کی شخصیّت کے سامنے دوسرے لوگ کچھ ماند پڑ جاتے تھے اور یہ لوگ بھی کچھ ایسے ویسے نہیں ۔ ہمارے لیڈروں میں کافی قابلیّت ، دور اندیشی ، اور ایثار ہے ، وہ سبھی معاملوں پر ہر پہلو سے غور کر سکتے ہیں ۔ پبلک کے بھلے کے لئے وہ موزوں فیصلوں پر پہنچ سکتے ہیں ۔ مگر گاندھی جی کی رہنمائی میں ، ہم میں سے کچھ اُن پر (گاندھی جی پر) اتنا زیادہ بھروسہ کرتے کہ جو کچھ وہ کہہ دیتے اُسے ہم مان لیتے ۔ ہم اپنی طاقت اور قوّتِ متخیلہ کو کام میں لانے کی ضرورت نہ سمجھتے تو بھی میں مانتا تھا کہ جو فیصلے گاندھی جی کی رہنمائی میں کانگریس نے کئے ہیں بغیر سمجھے بوجھے نہیں کئے ۔ مہاتما جی سمجھتے تھے کہ وہ الگ ہو کر سوچنے سمجھنے کا بار سب لوگوں پر ڈال دیں گے اور یہ دیکھنے میں آتا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے اُن کے کہنے سے ہوتا ہے یہ رجحان دُور ہو جائے گا ۔

میں نے اِن باتوں سے متّفق ہو کر ہی اُن کے فیصلے کی تائید کی تھی ۔ مگر دوسرے لوگ اِس بات پر اِس نظرئے سے غور نہیں کر رہے تھے ، کچھ تو گھبراتے تھے کہ مہاتما جی کے ہٹ جانے کے معنی اُن کا کانگریس سے بالکل الگ ہو جانا ہے اور اب اُن کا صلاح مشورہ بھی نہیں ملے گا ۔ کچھ یہ مانتے تھے کہ اُن کے ہٹ جانے سے کانگریس پر عوام کا اِعتماد نہیں رہ جائے گا ، جتنا آج ہے ۔ اِسی لئے کانگریس کم زور ہو جائے گی ۔ کچھ شاید یہ بھی سمجھتے تھے کہ کانگریس کے اندر الگ خیالات کے لوگوں کے آجانے سے گاندھی جی ناراض ہو کر ہٹ رہے ہیں ۔ اُن کو کسی نہ کسی طرح ضرور رکھنا ہی چاہیئے ۔ اِن وجہوں سے سبجکٹس کمیٹی میں اِس معاملے پر بہت بحث ہوئی ۔ وہاں گاندھی جی سے اِصرار کیا گیا کہ وہ اپنے خیالات بدل دیں اور جس طرح رہنمائی کرتے آئے ہیں ، کرتے رہیں ۔ مگر وہ پنے فیصلے پر

قائم رہے۔ وہ اِسی بات پر زور دیتے رہے کہ اُن کے ہٹنے سے کانگریس کا کچھ نقصان نہیں ہوگا۔ ساتھ ہی پوچھے جانے پر صلاح مشورہ کی یقین دہانی بھی کرتے جاتے تھے اور کانگریس کے آئین میں ترمیم کی بات بھی کرتے جاتے تھے۔ آخر جب یہ واضح ہوگیا کہ وہ اپنے فیصلے سے کسی طرح ہٹنے والے نہیں ہیں، تب اور بات چلنے لگی

آئین کی ترمیم پر بھی کافی بحث رہی ایک سب کمیٹی بنائی گئی، جس نے ترمیم کا مسوّدہ تیّار کیا۔ اُس میں خاص ہاتھ گاندھی جی کا اور نوساختہ سوشلسٹ پارٹی کا ہی رہا۔ ایک اور مسئلہ زیرِ بحث تھا جس کا تعلّق مجوزہ آئینِ ہند کے ساتھ تھا۔ اُوپر لکھا جاچکا ہے کہ گول میز کانفرنس کے زمانے میں وزیرِ اعظم اِنگلستان مسٹر میکڈانلڈ نے کمیونل اوارڈ (فرقہ وارانہ فیصلہ) دیا تھا۔ جس کے ایک جزو کے خلاف گاندھی جی کو ترکِ غذا کا برت کرنا پڑا تھا۔ اور جو ہریجنوں کے ساتھ پونہ میں سمجھوتہ کرکے بدلوایا گیا تھا۔ اس فیصلہ میں اور بھی ایسی باتیں تھیں جن کو کوئی بھی قومی اِحساسات رکھنے والا آدمی منظور نہیں کرسکتا تھا۔ مگر اس میں ایک شرط لگادی گئی تھی۔ وہ یہ تھی کہ اگر وہ سبھی لوگ جن کا تعلّق اُس سے تھا، یا جن کے ذاتی حقوق کا اِس پر اثر پڑتا تھا، آپس میں مل کر سمجھوتہ کرلیں۔ اور اِس سمجھوتہ کے ذریعے اُسے بدلنا چاہیں، تو وہ بدل دیا جائے گا۔ اِسی شرط کے مطابق اِس کا وہ حصّہ جس کا تعلّق ہریجنوں کے ساتھ تھا اُن کے ساتھ سمجھوتہ کرکے بدلوادیا گیا تھا۔ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اُس فیصلہ کو غیر منصفانہ مانتے ہوئے بھی طے کیا تھا کہ وہ اُسے نہ تو منظور کرتی ہے اور نہ اُس کی مخالفت ہی کرتی ہے۔

ورکنگ کمیٹی کے اس فیصلے کے یہ معنی نہ تھے کہ وہ اس کی تائید کرتی ہے یا اُسے منصفانہ سمجھتی ہے۔ اُس نے اِس کی مذمّت سخت الفاظ میں کی تھی۔ اِسی لئے کوئی یہ

نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ کسی طرح اِس کی تائید کرتی ہے۔ مگر وہ اِس کی مخالفت نہ کرنا چاہتی تھی کیوں کہ اِس کے معنی ہوئے دوسروں کے ساتھ کھُلّم کھُلّا جھگڑا، اور یہ غیر ضروری بھی تھا کمیٹی نے تو سارا آئین ہی نامنظور کر دیا تھا۔ اِس لئے یہ جزو بھی کل کے ساتھ نامنظور ہی ہوگیا تھا۔ الگ سے نامنظور کرنے کے یہ بھی معنی ہوتے تھے۔ ہم بالواسطہ طور پر اور حِصّوں کو مان لیتے ہیں، تبھی تو ایک جزو کو خصوصیّت سے نامنظور کرتے ہیں۔ ساتھ ہی آئین کا یہ جزو ایسا تھا جس کو بدلنے کا حق ہمارے ہاتھ میں نہ تھا۔ دوسرے کسی جزو کو بدلنے کا حق ہمیں آئین کی رُو سے نہیں ملا تھا۔ اِسی خیال سے متاثّر ہوکر ورکنگ کمیٹی نے اپنا فیصلہ ظاہر کیا تھا۔ جِس کا خُلاصہ یہ تھا کہ کمیٹی سارے آئین کو نامنظور کرتی ہے اور سارے آئین کے ساتھ ساتھ یہ جزو بھی حذف ہو جائے گا۔ اور اگرچہ وہ اُسے قومیت کے لحاظ سے مُہلک سمجھتی ہے تب بھی مُندرجہ بالا اسباب سے وہ اُسے نہ منظور کرتی ہے اور نہ اُس کی مخالفت کرتی ہے۔ اِس موضوع پر پنڈت مدن موہن مالوی جی اور شری اینے کے ساتھ بہت باتیں ہوئی تھیں۔ مگر نہ وہ گاندھی جی کو سمجھا سکے، اور نہ گاندھی جی اُن کو۔ کانگریس کی سبجکٹس کمیٹی میں اِس موضوع پر کافی بحث رہی، مگر یہ ظاہر تھا کہ ورکنگ کمیٹی کی رائے سے ہی کانگریس کو اِتّفاق ہے، کئی دنوں تک گرما گرم بحث کے بعد تجویز مرتب ہوئی اور کانگریس کے جلسۂ عام کا وقت آگیا۔

میں اگرچہ بہت کم زور ہو گیا تھا۔ پھر بھی اُس زمانے میں نہ جانے کہاں سے طاقت آگئی اور سب کام ٹھیک سے انجام دیتا گیا۔ سوشلسٹ پارٹی کے لوگ منظم طور پر بحث میں حِصّہ لے رہے تھے۔ اُن میں اچھے عالم اور مقرّر تھے۔ وہ سبھی باتوں میں اپنے آزادانہ خیالات رکھتے تھے۔ میرے سامنے اکثر ضابطہ کے سوالات آتے رہے۔ میں کبھی کسی اسمبلی یا کونسل کا

ممبر نہیں رہا تھا۔ کانگریس کے قواعد و ضوابط میں ایسے معاملوں کی وضاحت نہیں ہے وہاں جب ایسے سوال اُٹھتے ہیں تو اُن کا نبٹارہ انگریزی پارلیمنٹ اور سبھا سوسائیٹیوں کے قواعد و ضوابط کے مطابق کیا جاتا ہے۔ یہاں کی اسمبلی اور کونسل کے قواعد و ضوابط بھی اسی بنا پر بنتے ہیں۔ ملک کی سبھاؤں اور کمیٹیوں کی بنا بھی وہی ہیں۔ اُن سے میری کوئی خاص واقفیت نہیں۔ اِس موقع پر بہت سے سوال اُٹھائے گئے جن کا فیصلہ مجھے فوری طور پر وہیں دینا پڑا۔ میں نے اپنی عقل سے جو مجھے ٹھیک معلوم ہوا فیصلہ دیا۔ بعد ازاں مجھے یہ جان کر اطمینان ہوا کہ میرے فیصلے باضابطہ تھے۔

میں نے کانگریس کے اِجلاس میں اپنا پورا ایڈریس نہیں پڑھا۔ گاندھی جی کی رائے سے ہم نے سوچ لیا تھا کہ کانگریس کا اِجلاس مقررہ وقت کے اندر ہی ختم کر لینا چاہیئے تھا۔ ظاہر تھا کہ جس قسم کے متنازعہ مسئلے آنے والے تھے اُن کا نبٹارہ، اگر وقت نہ بچایا جاتا، تو نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے تجربے سے یہ بھی دیکھا ہے کہ مطبوعہ صدارتی ایڈریس پڑھا جانا لوگ پسند بھی نہیں کرتے، اُسے دھیان دے کر سُنتے بھی نہیں، کیونکہ چھپا ہوا ایڈریس اُن کے ہاتھ میں ہوتا ہے جسے وہ سہولت سے پڑھ لیتے ہیں۔ بلگاؤں کانگریس میں گاندھی جی نے اپنا صدارتی ایڈریس اِجلاس سے پہلے ہی بٹوا دیا تھا، کہ نمائندے اُسے پڑھ کر ہی اِجلاس میں آئیں۔ میں نے بھی اِسی خیال سے ایڈریس پڑھنے میں کانگریس کا وقت نہیں لیا، کچھ حِصّے پڑھ دیئے۔ اِس کے بعد خاص تجویز پر بحث چھڑ گئی جو آئینِ ہند کے متعلق تھی۔ اِس میں ورکنگ کمیٹی کی قرار داد و متعلقہ حقوق کی تائید تھی۔ پنڈت مالوی جی نے ترمیمی تجویز پیش کی اور بہت زوردار تقریر بھی کی۔ دوسرے دن بھی اس پر بہت زوروں سے بحث چلی۔

آخر جب اس پر رائے لینے کا وقت آیا۔ پنڈت مالوی جی اُس پر پھر کچھ بولنے چاہتے تھے۔ ضابطہ کی رُو سے اُن کو کچھ کہنے کا حق نہیں تھا مگر اُنھوں نے خواہش ظاہر کی۔ میرے لئے بڑا مشکل مسئلہ تھا۔ اگر ان کی شخصیت کی وجہ سے قاعدہ توڑ دوں تو اوروں کے لئے بھی ایسا ہی کرنا پڑے گا۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ ان کو اجازت نہیں دوں گا۔ بہت انکسار کے ساتھ میں نے اُن کو قاعدے کا حوالہ دے کر اپنی مجبوری ظاہر کی اور انہیں جو کچھ کہنا تھا اُسے خود کانگریس سے کہہ دینے کا وعدہ کیا اور وہ سب باتیں کانگریس سے کہہ بھی دیں۔ وہاں کانگریس میں زبردست لاؤڈ اسپیکر لگے تھے۔ وہاں جو کچھ ہو رہا تھا، مہاتما گاندھی اپنی جھونپڑی میں بیٹھے بیٹھے سُن رہے تھے اُنھوں نے وہ بات چیت سُنی تو دوسرے دِن مجھ سے ہنستے ہنستے کہا کہ تم نے مالوی جی کو بولنے سے روک دیا۔ مجھے اس بات کا دکھ ہوا کہ ایسی محترم ہستی کی بات میں نہ مان سکا مگر وہاں میں راجیندر نہیں تھا، کانگریس کی صدر کی حیثیت سے بیٹھا تھا دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ رائے لینے پر بہت بڑی اکثریت ورکنگ کمیٹی کے حق میں نکلی مگر کچھ لوگ جو اُس کے مخالف تھے، آپے سے باہر ہو گئے۔ دو چار آدمیوں نے جوتے بھی دکھائے جو مجھے تیز روشنی میں صاف نظر آئے۔

کانگریس کی دوسری تجویزوں پر بہت بحث نہیں ہوئی۔ کانگریس کے آئین کے متعلق تجویز تو ایک طرح بغیر بہت بحث کے ہی اتفاق رائے سے پاس ہو گئی۔ کیونکہ باہر ہی اس پر بہت بحث ہو چکی ہے یہ قرارداد بہت اہم تھی اب تک کانگریس کے ڈیلی گیٹوں کی تعداد صوبے کی آبادی کے حساب سے ہوتی تھی، اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ چاہے کسی صوبے میں کانگریس کا کام کچھ ہوتا ہو، چاہے وہاں کانگریس کمیٹیاں کام

کرتی ہوں یا نہ کرتی ہوں۔ مگر وہاں کی آبادی کے مطابق نمایندوں اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبروں کی تعداد پکّی رہتی تھی۔ دوسرے صوبے زیادہ کام کرکے بھی اپنی مقررہ تعداد سے زیادہ ممبر نہ بھیج سکتے تھے۔ بمبئی کے آئین میں نمایندوں کی تعداد کانگریس کے ممبروں کی تعداد کے تناسب سے بنا دی گئی۔ یہ قاعدہ بن گیا کہ ہر ایک نمایندے کے لئے کم سے کم مقرّرہ تعداد میں ممبر ضرور ہونے چاہئیں۔ جہاں اُن کے ممبر نہ ہوں، وہاں نمایندے چُننے کا حق نہ ہو۔ بمبئی میں پانچ سو ممبروں پر ایک نمایندہ چُننے کا حق دیا گیا۔ یہ تعداد بعد میں بدل دی گئی۔ ساتھ ہی یہ بھی خیال تھا سبھی صوبوں کے نمایندوں کی تعداد وہاں کی آبادی کے تناسب سے بھی رہے۔ اِس سے یہ ہوا کہ اگر سارے صوبے میں جتنے نمائندے آبادی کے حساب سے ہوتے تھے اتنے پانچ سو ممبر نہ ہوئے تو صوبے کے نمائندوں کی تعداد کم ہو جائے گی۔ اگر ہر نمائندے کے پیچھے پانچ سو سے زیادہ ممبر ہو گئے ہوں تو ہر نمائندے کے چُناؤ کے لئے پانچ سو سے زیادہ ممبروں کے علاقے بنائے جائیں گے۔ اِس طرح ممبر بنانے پر زور دیا گیا۔ ساتھ ہی آبادی کا بھی خیال رکھا گیا۔

دوسرا اہم سوال یہ تھا کہ اقلیت کی نمایندگی کیسے ہو۔ اگرچہ سیدھے طور پر رائے لی جائے تو اِن کا ایک آدمی بھی نہ آسکتا تھا۔ مگر اُن کے اکثریت والے صوبوں کو اگر یک جا کیا جائے تو کچھ آدمی اُن کے آسکتے تھے۔ سوشلسٹوں نے جن کی تعداد کم تھی، ایک واحد قابلِ انتقال رائے کے ذریعے متناسب نمایندگی (PROPORTIONAL REPRESENTATION BY SINGLE TRANSFERABLE VOTE) پر زور ڈالا۔ کانگریس کے نمایندوں کے چناؤ کے لئے یہ ممکن نہیں تھا۔ مگر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبروں کے چناؤ کے لئے اسے منظور کر لیا گیا۔ آئین میں جو ترمیمیں کی گئیں اُنہیں بروئے کار لانے پر کئی خامیاں ظاہر ہوئیں۔ اِس

کے بعد کئی بار تبدیلیاں کرنی پڑیں مگر قواعد و ضوابط کی جو بنیاد وہاں پڑی وہ ابھی تک اپنی جگہ ہے۔ ہاں متناسب نمایندگی کے متعلق بہت اختلافِ رائے رہا۔ مگر اب بہت لوگ اس بات کو ماننے لگے ہیں کہ بہت تھوڑے لوگوں کے ہاتھ میں چناؤ کا حق رہنے سے بہت برے نتیجے نکل سکتے ہیں۔ کانگریس کے دستور کی رو سے آٹھ ڈیلی گیٹوں پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک ممبر ہوتا ہے یعنی اگر آٹھ آدمی مل جائیں تو ایک آدمی کو چُن سکتے ہیں۔ چُناؤ میں دیکھا گیا ہے کہ آٹھ آدمیوں کو کسی ایسے شخص کے لئے جمع کر لینا مشکل نہیں جو اپنے کو منتخب کرانے پر تُلا ہوا ہو۔ جو اِس طرح اپنے انتخاب میں دِل چسپی نہیں لیتا یا جس کے دوست اِس کے انتخاب میں دلچسپی نہیں لیتے۔ وہ چاہے کتنا ہی اچھّا کام کرنے والا کیوں نہ ہو، نہیں چُنا جاتا۔ اِس سے چھوٹے گروہوں میں اضافہ ہوتا ہے۔ اچھے اچھے لوگ نہیں چُنے جاتے اور گروپ بندی کرنے والے چُن لئے جاتے ہیں۔ اِسی لئے اب بہت سے لوگ اِتنے دِنوں کے تجربے سے سمجھ گئے ہیں کہ یہ ہمارے کام کی چیز نہیں ہے۔ مگر یہ ابھی تک دستور میں ہے۔ وہاں بمبئی کے اجلاس کے وقت یہ سمجھا جاتا تھا کہ اس کی مخالفت کے ایک ہی معنی ہو سکتے ہیں یعنی یہ کہ سوشلسٹوں کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں نہ گھسنے دینے کا اِرادہ۔ خیر، وہاں تو منظور ہو ہی گیا۔

کانگریس کا اِجلاس مقررہ وقت پر رات کے بارہ بجے کے قریب، تیسرے دن ختم ہو گیا۔ میں نے کام پورا کر دیا۔ لوگ بڑے جوش کے ساتھ اپنے اپنے گھروں کو واپس گئے۔ جاتے ہی مرکزی اسمبلی کی ممبری کا چُناؤ لڑنا تھا۔ کانگریس کے جوش سے وہیں صاف ظاہر تھا کہ کانگریس کی جیت اِس الکشن میں ہوگی۔

میں کانگریس کا کام ختم کر کے اپنی جائے اِقامت پر گیا اور رات کو دو بجے سے

دمہ کا دَورہ شروع ہو گیا۔ دوسرے دِن کوئی اور خاص کام نہیں تھا۔ ورکنگ کمیٹی بنا لینی تھی۔ یہ بار مجھے ہی سونپا گیا تھا۔ میں نے کچھ تو وہیں طے کر لیا اور کچھ بعد میں۔ نام اخباروں کو دے دئے گئے۔ سب سے اہم سوال سکریٹری کے چُناؤ کا تھا۔ میں ایسے آدمی کو چاہتا تھا جو اپنا پورا وقت اس کام میں دے سکے اور جس کی رائے میرے ساتھ سبھی باتوں میں ملتی ہو میں نے بہت سوچنے کے بعد آچاریہ کرپلانی کو مقرر کیا۔

بنگال سے میں ایک آدمی کو ورکنگ کمیٹی میں لینا چاہتا تھا۔ مگر کچھ ایسا اتّفاق ہوا کہ میں کسی کو نہیں لے سکا۔ لہٰذا وہاں کے دوست مجھ سے بہت خفا ہو گئے۔ مجھے بہت گالیاں بھی کھانی پڑیں۔ میرا بنگال کے ساتھ پرانا تعارف اور گہرا تعلق تھا۔ میں بنگال کی عظمت کو بخوبی جانتا ہوں۔ بنگالیوں میں سے میرے کئی قریبی دوست بھی ہیں۔ مگر وہاں کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ بات نہیں بنی۔ اِس کا مجھے بہت افسوس رہا۔ وہاں دو گروہ تھے۔ کسی ایک کو ورکنگ کمیٹی میں لینا، دوسرے کو دشمن بنانا تھا۔ دو کے لئے جگہ تھی نہیں، اگر ہوتی تو وہاں کا جھگڑا ورکنگ کمیٹی میں آجانے کا خوف تھا۔ اِس لئے اپنے اوپر بدنامی لے کر بھی میں نے بھی ورکنگ کمیٹی کو اس جھگڑے سے محفوظ رکھا۔

میں نے کمیٹی میں یہ سوچ لیا تھا کہ جب بقول گاندھی جی کے ہم نے اُن کو کانگریس کے روزمرہ کے کام سے آزاد کر دیا ہے اور عظیم مسئلوں پر ہی اُن سے رائے لینا ٹھیک ہے، تو میں اُن کو زیادہ تکلیف نہیں دوں گا اور ہر ایک ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں اُن کو آنے کی زحمت نہ دوں گا۔ ہاں جو اہم باتیں ہوں گی۔ اُن کے متعلّق اُن سے مل کر مشورہ لیا کروں گا۔ میں نے اپنی صدارت کے دَور میں کام بھی اِسی حکمتِ عملی سے لیا۔ گاندھی جی کو کمیٹیوں میں آنے کی زحمت نہیں دی، میں وار دھا برابر جاتا، آتا رہا۔ اور وہیں ان سے رائے لے لیا کرتا۔

مرکزی اسمبلی کا انتخابی مُقابلہ

بمبئی سے میں پٹنہ آیا۔ پہلا کام جو کانگریس کو کرنا تھا وہ مرکزی اسمبلی کے لئے اپنے اُمیدوار کھڑے کرنا اور اُن کو منتخب کرانا۔ حکومت سمجھتی تھی ۳۲-۱۹۳۰ء کے ستیہ گرہ کے سبب سے اُس نے کانگریس کو اِتنا دبا دیا ہے کہ وہ اب پھر اُٹھ نہ سکے گی۔ ۱۹۳۲ء کے شروع میں جب گول میز کانفرنس سے واپسی پر گاندھی جی اور کانگریس کو ستیہ گرہ پر مجبور کیا گیا تو لارڈ ولنگڈن نے کہا تھا کہ دو چار ہفتوں میں تحریک کو دبا دیا جائے گا۔ اُنھوں نے اِس کی پوری کوشش بھی کی مگر دو چار ہفتوں کے بدلے دو برس تک تحریک چلتی رہی۔ اور شروع شروع میں تو بہت زوروں سے چلی۔ تو بھی ابھی کوئی ایسا موقع نہیں آیا تھا جہاں کانگریس کی ہر دل عزیزی کا پورا جائزہ لیا جا سکے۔ زلزلہ زدوں کی اِمداد اور بمبئی کانگریس کے اِجلاس سے کچھ کچھ پتہ چلا تھا۔ مگر اب بھی سب لوگوں کو اور خاص کر سرکار کے لوگوں کو اِس بات کا یقین نہیں تھا کہ کانگریس سارے ملک کی ہر دل عزیز جماعت ہے اِس چناؤ میں ایک طرح سے اِس بات کی جانچ ہونے والی تھی کہ کانگریس کہاں تک عوام کی نمائندگی کرتی ہے۔ ہم بھی اِس چناؤ کو اِسی وجہ سے اہمیت دیتے تھے۔

صوبہ مدراس میں ۱۹۲۰ء سے ہی وہاں کی جسٹس پارٹی کی وزارت چل رہی تھی۔ اس نے اپنی طاقت بڑھانے اور اپنے کو منظم کرنے میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا تھا اس میں قابل لوگوں کی بھی کمی نہیں تھی، اُس پارٹی میں برہمنوں کو چھوڑ کر تقریباً سبھی ذاتوں کے لوگ شریک تھے۔ اس میں بھی شک نہیں تھا کہ برہمنوں کے علاوہ عوام کے سبھی طبقوں کی طرف سے وہ بولا کرتی تھی اس نے ایک طرح سے برہمن اور غیر برہمن کا اِتنا جھگڑا اکھڑا کر دیا تھا اور لوگوں میں اتنا پروپگنڈا کیا تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ وہاں کانگریس کے معنی برہمن کے سمجھے جاتے ہیں۔ اِس لئے وہ پارٹی کانگریس کو ہی اپنا سب سے بڑا مخالف مانتی تھی۔ سرکار کو بھی اس پر پورا بھروسہ تھا، کیوں کہ وہاں کے زمیندار اور دوسرے مال دار طبقوں اور عوام کا بہت غالب عُنصر اِنھی ذاتوں کا تھا، جو اِس میں شریک مجھی جاتی تھیں اور جو غیر برہمن تھیں۔

چناؤ تو سارے ہندوستان میں ہونے والا تھا۔ سبھی صوبوں میں چُناؤ کے لئے ایک ہی دن نہیں رکھا گیا تھا۔ یہ ضرور سوچا گیا تھا کہ ایک جگہ کے چناؤ کا اثر دوسری جگہوں پر لازماً پڑے گا۔ ایسا تو ممکن نہیں تھا کہ ایک ہی صوبے میں الگ الگ ضلعوں میں انتخاب کے وقت اِتنا فرق ہو کہ ایک کا نتیجہ معلوم ہونے پر دوسری جگہ چناؤ ہوں، مگر سارے مُلک کے لئے یہ ممکن تھا۔ اور ایسا ہی اِنتظام عمّالِ حکومت نے کیا بھی۔ چونکہ وہ مدراس پر سب سے زیادہ بھروسہ رکھتے تھے۔ اِس لئے اُنہوں نے سب سے پہلے مدراس صوبے میں ہی چناؤ رکھا اِس کے بعد اور صوبوں میں، چناؤ میں کانگریس نے سبھی جگہوں میں اپنے اُمید وار کھڑے کیے اور سبھی جگہوں میں مخالف بھی کھڑے ہوئے۔ مخالف ایسے ہی لوگ تھے جن کی یا تو سرکار کے ساتھ اچھی بنتی تھی یا جو کسی خاص پارٹی کی طرف سے کھڑے ہوئے تھے مگر جسٹس پارٹی کے سوا کوئی ایسی زبردست جماعت نہیں تھی جس کی طرف سے کانگریس کی مخالفت

کے لئے اُمیدوار کھڑے کئے گئے ہوں۔

میں تو بمبئی سے بیمار ہی واپس آیا اور حسبِ معمول دسمبر تک بیمار ہی پڑا رہا۔ اِسی درمیان سارا چناؤ ہو گیا۔ میں اس میں کوئی خاص حصّہ نہ لے سکا مگر دوسروں نے خاص کر سردار ولبھ بھائی پٹیل نے بہت اَن تھک محنت کی۔ وہ بہار میں بھی دورے پر آئے، دوسرے کئی صوبوں میں بھی گئے۔ میں بہار میں ہی دو چار جگہوں میں جا سکا۔ زیادہ کچھ نہیں کر سکا۔ مدراس میں چناؤ کا نتیجہ سب سے پہلے معلوم ہونے لگا۔ کیونکہ وہیں سب سے پہلے چناؤ ہوا۔ وہ سرکاری حلقوں کے لئے بہت ہی حیرت انگیز تھا۔ وہاں صرف اِتنا ہی نہیں ہوا کہ سبھی جگہوں پر کانگریسی منتخب ہوئے۔ بلکہ سبھی کانگریسی بہت بڑی اکثریت سے چُنے گئے۔ جو ایسی جگہیں تھیں جن کے متعلق جسٹس پارٹی والوں کو کوئی شُبہ نہیں ہو سکتا تھا اور جن کو جیتنا ہم بھی مُشکل سمجھتے تھے وہاں بھی کانگریس کی زبردست فتح ہوئی۔ مثال کے طور پر دو جگہیں ایسی مانی جاتی تھیں۔ ایک جگہ ایسی تھی جہاں سے مسٹر ستیہ مورتی چُنے گئے۔ اُن کے مخالف ایک نہایت قابل اور جسٹس پارٹی کے نامی اور خاص آدمی، سر راماسوامی مدالیار تھے۔ دوسری جگہ وہاں کے تاجروں کے نمائندوں کی تھی وہاں سے کانگریس کی مخالفت میں کھڑے ہوئے تھے۔ مسٹر شنمکھم چیٹی اور کانگریس کی طرف سے شری ونکٹا چالم چیٹی۔ مسٹر شنمکھم چیٹی پہلے پنڈت موتی لال نہرو کے ساتھ کانگریس کی طرف سے منتخب ہو کر مرکزی اسمبلی کے ممبر رہ چکے تھے اور کانگریسی ممبروں میں بھی اُن کی قابلیت کے قائل تھے۔ اُنہوں نے کام بھی اچھّا کیا تھا مگر ستیہ گرہ کے وقت وہ کانگریس سے الگ ہو گئے تھے۔ اَب اِس چناؤ میں اُنہوں نے کانگریس کی مخالفت کی، وہ چیٹی ذات کے تھے۔ چیٹی لوگ ہی صوبہ مدراس میں تجارت کا کام زیادہ تر کرتے تھے اور وہ غیر برہمن بھی تھے جسٹس پارٹی نے اُن کو ہی اپنی طرف سے اُمیدوار بنا لیا تھا۔

پھر کیا تھا، کامیابی کے تمام اسباب اُن کے ساتھ موجود تھے۔ مزید برآں کہا جاتا تھا کہ لارڈ ولنگڈن ان کو بہت مانتے تھے۔ مگر اُنھوں نے بھی کراری شکست کھائی۔

جیسے ہی مدراس کے نتیجے اخباروں میں نکلنے لگے۔ خاص کر کانگریس کے حق میں ووٹوں کی تعداد دیکھ کر ملک میں جوش بڑھتا گیا۔ سبھی صوبوں میں کانگریس کی بڑی جیت ہوئی۔ بہار میں ویسی ہی ہوئی۔ یہاں ایک بڑے معرکے کی بات یہ ہوئی کہ ایک بہت بڑے سیٹھ سے مقابلہ ہوگیا۔ وہ تھے سیٹھ رام کرشن ڈالمیا کانگریس کے نظام کے اندر آنا بھی نہیں چاہتے تھے مگر اُن کے ساتھ سب کی ذاتی نیک فہمی قائم رہی۔ اُنہوں نے بہت خرچ کیا مگر وہ بھی بُری طرح شکست کھا گئے۔

ایک طرف تو اس طرح کی کامیابی ہوئی جس سے سبھی لوگوں کو بہت مسرت ہوئی۔ دوسری طرف ایک ایسی بات بھی اس چناؤ میں ہوئی جو بہت رنج دہ تھی۔ پہلے کہا جا چکا ہے کہ بمبئی کانگریس کے پہلے سے ہی وزیر اعظم میکڈانلڈ کے فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل اوارڈ) کی وجہ سے کانگریسی لوگوں میں اختلاف رائے ہوگیا تھا اور بمبئی کانگریس میں پنڈت مالوی جی نے، اِس تجویز کی مخالفت کی تھی جس میں کانگریس کے نئے نئے آئین کے متعلق رائے ظاہر کی گئی تھی۔ اُن کی ترمیمی تجویز بہت بڑی اکثریت سے نامنظور ہوگئی تھی۔ اِس خیال کے لوگوں نے اپنی طرف سے اُمیدوار کھڑے کئے۔ بہار میں بھی شری جگت نرائن لال کھڑے ہوئے۔ بنگال میں تو تقریباً سبھی جگہوں کے لئے اُمیدوار کھڑے کئے گئے اور صوبوں میں بھی کچھ لوگ کھڑے ہوئے۔ یہ لوگ یوں تو اور سب باتوں میں کانگریس سے متفق تھے مگر ایک اسی معاملہ میں یہ کانگریس سے الگ تھے۔ کانگریس نے شری اینے کے خلاف کوئی اُمیدوار نہیں کھڑا کیا اور وہ بلا مقابلہ چُنے گئے۔ مگر اور جگہوں میں دو طرح کے

کانگریسیوں میں مُٹھ بھیڑ ہو گئی۔ بہار میں تو کانگریس سے کوئی نہیں جیتا مگر بنگال میں تقریباً سبھی جگہوں میں کانگریس کو شکست کھانی پڑی۔ اور اس پارٹی کے لوگوں کی جیت ہوئی۔ اِس کا خاص سبب یہ تھا کہ مسٹر میکڈانلڈ کے فیصلے سے بنگال کے اُونچی ذات کے ہندوؤں کو سب سے زیادہ نقصان پہنچا تھا۔ وہاں مسلمانوں کی تعداد تقریباً پچپن چھپن اور ہندوؤں کی چوالیس فی صدی کے لگ بھگ ہے۔ اقلیت میں ہونے کے سبب سے ہندوؤں کو وہاں کچھ سہولت ملنی چاہیئے تھی۔ مگر اِس فیصلے کے مطابق دس فی صدی جگہیں یورپینوں کو مل گئیں اور باقی نوّے کے بٹوارے میں اکیاون مسلمانوں کو اور ۳۹ فی صدی ہندوؤں کو ملیں۔ یعنی اپنی آبادی کے تناسب سے بھی کم جگہیں اُن کو صوبائی اسمبلیوں میں ملیں۔ اِس کے بعد جب اچھوتوں سے مہاتما جی کے برت کے بعد پونہ میں سمجھوتہ ہوا تو ہریجنوں کے لئے محفوظ جگہوں کی تعداد بھی بہت بڑھ گئی جو ہندوؤں کی جگہوں میں سے ہی ہو سکتی تھیں۔ اِس لئے وہاں اُونچی ذات کے ہندوؤں میں بہت بے اطمینانی تھی وہ چاہتے تھے کہ اِس فیصلہ کی زبردست مخالفت کی جائے۔ اِس میں کانگریسی اور غیر سرکاری سبھی ہندو شریک تھے اس لئے وہاں کے چناؤ میں کانگریس کی ہار ہوئی اور اِس نئی پارٹی کی جیت ہوئی جس میں کانگریسی لوگ ہی چُنے گئے، جو اور باتوں میں کانگریس کا ہی ساتھ دینے والے تھے نومبر کے آخر تک سارے مُلک میں چناؤ ہو گیا، اور کانگریس کی بہت بڑی جیت ہوئی کانگریس نے اب پالیسی بھی طے کر دی تھی۔ اِسی کے مطابق مرکزی اسمبلی میں کام ہونے والا تھا۔

مُلک کا دَورہ :
مسٹر جناح سے گفتگو

اگرچہ انتخاب میں کانگریس کی فتح ہوئی اور دوسرے طریقے سے بھی معلوم ہوتا تھا کہ کانگریس زندہ ہے ، پھر بھی ہم یہ ضروری سمجھتے تھے کہ اس کا نظام مضبوط بنا دیا جائے کیونکہ چار برسوں کی لڑائی میں جب کانگریس کمیٹیاں غیر قانونی قرار دے دی گئی تھیں کانگریس کا نظام تِتر بِتر ہو گیا تھا ۔ اس کو ایک بار پھر سے زندہ اور ازسرِ نو منظم کرنا ضروری تھا ، اِس لئے ایک بار سبھی جگہوں کا دَورہ ضروری معلوم ہوا ۔ صوبائی کمیٹیوں کی طرف سے اِس بات کا تقاضا بھی ہوا کہ میں صدر کی حیثیت سے دَورہ کروں ۔

دِلّی میں اسمبلی کا کام جنوری میں شروع ہونے والا تھا ۔ وہیں ورکنگ کمیٹی کی نشست بھی ہوئی ۔ وہاں مہاتما جی بھی اتفاق سے آ گئے تھے ۔ وہاں کے لوگوں کی خواہش بھی تھی کہ صدرِ کانگریس کا دَورہ وہیں سے شروع کیا جائے ۔ اِس لئے جب میں وہاں پہنچا تو وہاں کے لوگوں نے بھی بڑی شان سے استقبال کیا ۔ بمبئی نے استقبال کا ایک خاصا نمونہ قائم کر دیا

تھا۔ دِلّی میں بھی اِسی طرح کا استقبال بہت بڑے جلوس میں کیا گیا۔ شہر کے لوگوں نے بہت جوش دکھایا۔

مگر اس یاترا کو شروع کرنے سے پہلے ایک دوسرا سوال تھا جس کا حل ضروری تھا۔ مسٹر میکڈانلڈ نے فرقہ وارانہ فیصلہ دے کر مسلمانوں کو بہت خوش کر دیا تھا۔ مگر ہندو اِس سے بہت کبیدہ خاطر تھے۔ سبھی سمجھ دار لوگ مانتے تھے کہ اگر کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو یہ سب سے اچھا ہو گا۔ اِس کے لئے ڈاکٹر انصاری بہت مشتاق تھے۔ اُنہوں نے مسٹر جناح سے خط و کتابت شروع کی تھی۔ دِلّی میں ورکنگ کمیٹی کے سامنے اُنہوں نے یہ بات پیش کی۔ ورکنگ کمیٹی نے کہا کہ اگر کوئی راہ نکل سکے تو اُسے ضرور ڈھونڈ نکالنا چاہیئے۔ اِسی درمیان مسٹر جناح بھی دلّی پہنچ گئے۔ ایک دن ڈاکٹر انصاری کے مکان پر ورکنگ کمیٹی کے ممبروں سے اُن کی ملاقات اور کچھ گفتگو ہوئی۔ مگر وہ بات چیت ایسی نہیں تھی کہ اِتنے لوگ ایک ساتھ صحیح طور پر کر سکیں اور معاملہ فوری طور پر طے ہو جائے۔ آخر مسٹر جناح کی رائے ہوئی کہ وہ اور کانگریس کے صدر ہی بات کریں۔ اگر کچھ راستہ نکل آئے تو اپنی اپنی جماعت سے اُس کی منظوری کرا لیں۔ ڈاکٹر انصاری کے گھر پر پہلے دن جو باتیں جس طریقے سے ہوئیں، اُس سے اور اِس طریقے سے مجھے کچھ زیادہ اُمید نہیں ہوئی۔ پھر بھی یہ بات ایسی تھی کہ اِس میں اپنی طرف سے کسی قسم کی کوتاہی نہیں کی جا سکتی تھی۔ اِسی لئے میں اِس میں دِل و جان سے پڑ گیا۔ مجھے اِس بات کا شک تھا کہ میں اِس طرح کے کام کے لئے کہاں تک موزوں ہوں۔ مگر مجھے ڈاکٹر انصاری اور سردار پٹیل کی پوری مدد تھی۔ مہاتما جی کی دعائیں بھی تھیں۔ اِس سے میں سمجھتا تھا کہ کوئی غلطی نہ ہونے پائے گی۔ گفتگو بہت طویل ہوئی۔ مجھے کئی ہفتوں تک دلّی میں رہنا پڑا۔ مسٹر جناح سے

میری بات چیت صفائی سے ہوئی۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہم دونوں کا ایک دوسرے کے لئے جذبہ بھی اچھا ہی تھا۔ میں بات چیت کے بعد اُس کا خلاصہ اُسی روز لکھ لیا کرتا۔ اُس وقت کے لکھے ہوئے وہ نوٹ آج بھی کہیں موجود ملیں گے۔

آخر میں بات ختم کرنی پڑی۔ سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔ اِس کا مجھے بہت افسوس ہوا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ ہم جن شرطوں پر سمجھوتہ کرنا چاہتے تھے اور جن پر ہم نے مسٹر جناح کو راضی کر لیا تھا۔ وہ شرطیں مُلک کے لئے مفید ہوئیں۔ اِس سے بھی زیادہ افسوس اِس لئے ہوا کہ جس سبب سے سمجھوتہ نہ ہو سکا وہ ایسی بات تھی جس کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی۔ اُسے نہ ماننا یا اس پر ضد کرنا میرے خیال سے دونوں بے کار تھے۔

میں نے بات چیت شروع کرنے سے پہلے ہی صاف کر لیا تھا کہ میں صرف کانگریس کی طرف سے باتیں کر رہا ہوں۔ مجھے کسی دوسری پارٹی کی طرف سے گفتگو کرنے کا حق بھی نہیں ہے اور میں دوسروں کی ذمہ داری لے بھی نہیں سکتا۔ ہاں ہم جو کچھ طے کریں گے وہ کانگریس سے منظور کرا لیں گے۔ اِسی طرح مسٹر جناح سے بھی ہم یہی اُمید رکھیں گے کہ وہ بھی مسلم لیگ سے سمجھوتہ کو منظور کرا دیں گے۔ اُنہوں نے یہ منظور کیا تھا۔ وہ دیکھ چُکے تھے کہ ابھی حال میں ہی ہم نے کانگریس میں فرقہ وارانہ فیصلہ کے متعلق اپنا غیر جانب دارانہ رُخ رکھا تھا اور اُس کے لئے ہم کو پنڈت مالوی جیسے معزّز اور محترم لیڈر کی بھی مخالفت کرنی پڑی تھی۔ وہ یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ ہم ایک صوبہ چھوڑ کر تقریباً سبھی صوبوں میں چناؤ میں بھی جیتے ہیں۔ اِسی لئے وہ اِس پر رضامند تھے۔ میں نے یہ بھی صاف کہہ دیا تھا کہ اگر وہ مسلمانوں کے لئے جداگانہ حلقۂ انتخاب قائم کرنے پر تُلے ہیں تو بات چیت کی کوئی گنجائش نہیں ہے کیونکہ ہم جُداگانہ انتخاب کو قومیّت کی نظر سے اِتنا مُہلک مانتے ہیں کہ اگر وہ رہ جائے

توکسی سمجھوتہ سے کوئی کام نہ ہوگا۔ اِسی لئے بات چیت اِسی بنیاد پر شروع ہوگی کہ وہ جُداگانہ انتخاب چھوڑنے پر تیار ہو جائیں۔ اِس پر اُن کی طرف سے سوال ہوا کہ یہ چیز تو مسلمانوں کو مِل چکی ہے اور وہ جسے کچُھ دِنوں سے بروئے کار لاتے رہے ہیں۔ اِس کے عوض اُن کو جب تک کچھ واضح طور پر نہ مِلے تب تک اُن کو منانا اور راضی کرنا ممکن نہ ہوگا۔

میں نے اُن کے لئے اِتنی ہی محفوظ نشستیں مان لیں جتنی کہ اُن کو فرقہ وارانہ فیصلہ سے ملی تھیں۔ ہم دونوں نے اِن باتوں کو مان کر کے ہی آگے بات چلائی تھی۔ اُن کی طرف سے یہ مطالبہ ہوا کہ حلقہائے اِنتخاب میں جہاں مسلمان ووٹر ان کی تعداد ان کی آبادی کے اِعتبار سے کم ہو ووٹ کے حق کے لئے ضروری قابلیت کو کم کر کے مسلمان ووٹروں کی تعداد اُن کی آبادی کے تناسب سے بنادی جائے۔ وہ کہتے تھے کہ مُسلمان غریب ہیں اور بہت جگہوں میں اُن کی تعلیم بھی کم ہے۔ اِسی لئے جہاں ٹیکس دینا بھی حق رائے دہی کی بُنیاد ہو وہاں سے مُسلمان چھَٹ جائیں گے اور ووٹروں میں اُن کی تعداد آبادی کے تناسب سے بہت کم ہو جائے گی۔ اِسی لئے یہ ہونا ضروری ہے۔ پنجاب کے متعلق جو کچھ بھی اعداد مِل سکے، میں نے اُن کا خوب اچھی طرح مطالعہ کیا۔ مجھے جہاں تک پتہ چلا اُن میں ووٹروں کی تعداد کے تناسب سے کئی جگہوں میں کچُھ کم ہوتی تھی مگر بہت بڑا فرق نہیں تھا۔ شاید دو فی صدی یا اِس سے کم ہی کا فرق تھا۔ جب ہندو اور مسلمان دونوں کا مشترکہ حلقۂ اِنتخاب ہونے والا تھا تو مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ووٹروں میں اُن کی تعداد آبادی کے تناسب سے ہو مجھے منصفانہ معلوم ہوئی اور میں نے اُسے مان لیا۔ خاص کر جب کانگرس نے یہ طے کر لیا تھا کہ چناؤ میں حق رائے دہی سبھی بالغوں کو دیا جائے تو یہ مطالبہ مان لینے میں مجھے

کوئی قباحت نہیں معلوم ہوئی۔ مگر جب سکھوں اور ہندوؤں سے میں نے باتیں کیں تو سکھوں نے اس کی زبردست مخالفت کی۔ پنجاب کے ہندوؤں سے باتیں ہونے پر اُن سے متعدد خاص افراد نے اِس کو مان لیا۔ مگر بنگال کے ہندو اِسے کسی طرح ماننے کو تیار نہ ہوئے جو لوگ بنگال سے مرکزی اسمبلی میں چُن کر گئے تھے، پہلے اُن کی میری باتیں ہوئیں۔ اُنہوں نے سب باتیں سُن سمجھ کر سمجھوتے کو پسند کیا۔ مگر وہ بنگال کے اور لوگوں کی رائے لینا ضروری سمجھتے تھے۔

پنڈت مالوی سے باتیں ہوئیں تو اُنہوں نے سکھوں اور بنگال کے ہندوؤں کا حوالہ دے کر کہا کہ جب تک وہ نہ مانیں گے تب تک کچھ نہیں ہو سکتا۔ میں نے بنگال کے اعداد شمار بہت تلاش کیے، مگر مجھے سرکار کی کسی رپورٹ یا کتاب سے کچھ بھی پتہ نہ چل سکا کہ واقعی وہاں کی حالت اِس بارے میں کیا ہوگی۔ اِس لئے جس طرح میں پنجاب کے ہندوؤں کے سامنے اعداد شمار رکھ کر بحث کر سکا، اِس طرح بنگال کے ہندوؤں کے ساتھ نہیں تب میں نے مسٹر جناح سے بحث کی کہ وہ اِس مطالبے پر اِصرار نہ کریں، کیوں کہ اِس میں کوئی اُصول کی بات نہیں ہے، جہاں مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت ہے۔ وہاں ایک یا دو فی صدی کی کمی سے چُناؤ کے نتیجوں پر کوئی خاص اثر یا فرق نہیں پڑے گا۔ مگر وہ اِس پر رضامند نہیں ہوتے تھے۔ کانگریس کی طرف سے میں اُسے مان لینے پر بھی راضی تھا۔ مگر اُنہوں نے اِس پر زور دیا کہ پنڈت مالوی جی کی منظوری بھی ضروری ہے، کیونکہ سمجھوتہ اگر ہوا بھی اور پنڈت مالوی جی کی رہنمائی میں فرقہ وارانہ فیصلہ کے خلاف تحریک چلتی ہی رہی تو مسلمانوں کو اِس سمجھوتے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اُدھر اُنہیں دِنوں دِلی میں فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل اوارڈ) کے خلاف ایک کانفرنس ہوئی جس میں بنگال کے کچھ لوگ آئے۔

اُنہوں نے اِس کی بھرپور مخالفت کی۔ میں پنڈت مالوی جی کو کسی طرح رضامند نہ کر سکا۔ آخر میں اُنہوں نے اِس بات پر بھی زور دیا کہ جتنی جگہیں مسلمانوں کو ملی ہیں، خاص کر بنگال اور پنجاب میں، اُنہیں بھی گھٹانا چاہئے اور جب تک یہ کمی نہ کی جائے تب تک وہ راضی نہیں ہو سکتے۔ اُدھر مسٹر جناح بھی اِس بات پر تُل گئے کہ جب پنڈت مالوی جی کے دستخط نہیں ہوں گے، تب تک وہ رضامند نہیں ہوں گے۔ اپنی طرف سے وہ یہ کہتے تھے کہ میں مسلمان لیڈروں کی رضامندی حاصل کر سکتا ہوں۔ اِس طرح، اگرچہ یہ بات چیت میں نے کانگریس کی طرف سے شروع کی تھی۔ اور کانگریس اور مسلم لیگ کے صدر کے درمیان یہ ہو رہی تھی۔ پھر بھی آخر وہ اِس لئے ٹوٹ گئی کہ مسٹر جناح صرف کانگریس کے سمجھوتے پر رضامند نہیں ہوئے اور ہندو مہاسبھا کی منظوری ضروری سمجھنے لگے۔

وہ چاہتے تھے کہ کانگریس مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد جماعت مان لے اور خود ہندوؤں کی طرف سے سمجھوتہ کرنے پر راضی ہو جائے۔ کانگریس نہ اُس وقت صرف ہندوؤں کی جماعت تھی اور نہ آج ہے۔ وہ ہمیشہ سے قومی جماعت رہی ہے، جس میں سب ذاتوں اور سب مذہبوں کے لوگوں کے لئے جگہ ہے اور رہے گی۔ اس کی پالیسی بھی ویسی ہی قومی پالیسی ہے اور رہے گی۔ اُس دِن سمجھوتہ نہیں ہوا۔ یہ دُکھ کی بات ہے، کیونکہ اِس کے بعد سے حالت برابر بگڑتی ہی گئی۔ اور آج بھی فضا زہریلی ہے۔ جب تک یہ گفتگو چلتی رہی میں دِلّی میں ہی رہا مگر کبھی کبھی ایک دو دِن کے لئے کہیں چلا جاتا۔ اِنہی دنوں میں میں اِلہ آباد اور آگرہ ہو آیا۔ مارچ سے باضابطہ سلسلہ وار میں نے دورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ سب سے پہلے پنجاب جانے کا تہیّہ کیا۔ مارچ میں وہاں گیا۔ جالندھر میں اُتارا گیا۔ وہاں سے کچھ دُور کھدر کا خاص سنٹر آدم پور میں ہے۔ وہاں جا کر کام دیکھا۔

جالندھر سے لاہور گیا۔ وہاں بارش میں بھیگنے اور سردی لگنے سے دوسرے ہی دِن سویرے ہی کھانسی دمہ شروع ہوگیا۔ سارا پروگرام بدل دینا پڑا۔ اچھا ہونے پر میں بِہار واپس ہوگیا۔

اپریل میں پھر دَورہ کا پروگرام بنا۔ اُسے میں تقریباً آخر جون تک بے خلل ٹھیک ٹھیک پورا کرتا رہا۔ اپریل میں جبل پور میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس رکھا گیا جو کامیابی سے ختم ہوا۔ وہاں سے میں دَورہ پر نکل گیا۔ دَورہ کی اِبتدا صوبۂ برار سے ہوئی۔ وہاں صوبائی سیاسی کانفرنس تھی جس کے صدر پنڈت گووند بلبھ پنت تھے خاتمہ کے بعد میں برار کے سبھی ضلعوں میں گیا۔

سبھی جگہوں میں جلسے ہوئے، استقبال ہوتا، جلوس نکلتا۔ لوگوں میں خاصا جوش نظر آیا۔ میرے لئے اس قسم کے دَورہ کا، اپنے صوبے کے باہر یہ پہلا ہی تجربہ تھا۔ یہ تجربہ اچھا اور خوش کُن تھا، کیونکہ الگ الگ صوبوں کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ کانگریس کی تنظیم کو مضبوط کرنے کا کچھ موقع ملتا اور عوام سے رابطہ بڑھتا۔

برار کا دَورہ ختم کر کے میں سیدھا کرناٹک چلا گیا۔ وہاں کے سبھی ضلعوں کا دَورہ کیا اِس کے بعد سارے مہاراشٹر میں گیا۔ برار، کرناٹک اور مہاراشٹر کے دَورہ میں ہی تقریباً نصف اپریل، پوری مئی اور پورے جون کا مہینہ ختم ہوگیا۔

میں نے اسی دَورہ میں کہیں کوئٹہ میں خوفناک زلزلہ کی خبر سنی۔ پہلے کئی دنوں تک وہاں کا پورا حال نہیں ملا۔ مگر جب تفصیل اخباروں میں آنے لگی تو معلوم ہوا کہ وہاں کی حالت بھی کچھ بِہار جیسی ہی ہوگی۔ میں نے ایک ریلیف کمیٹی بنادی اور میں ہی اس کا صدر بنا۔ روپیے جمع ہونے لگے۔ بہار اور کوئٹہ میں دو باتوں کا بڑا فرق تھا۔ کوئٹہ کا زلزلہ

کوئٹہ شہر اور اُس کے آس پاس کے علاقے کے لئے اتنا ہی قیامت خیز تھا جتنا بہار کا مگر اُس کا علاقہ بہار جیسا وسیع نہیں تھا۔ کوئٹہ ایک فوجی چھاؤنی ہے۔ اِس لئے وہاں فوج موجود تھی، جو لوگوں کو مدد پہنچانے کے کام میں لگائی گئی اور اِسی وجہ سے وہاں کوئی بھی غیر سرکاری جماعت کام نہ کر سکی۔

وہاں بہت سے لوگ سندھ اور پنجاب کے تھے۔ جو بچے، اُن میں بہتیرے سندھ اور پنجاب واپس چلے گئے۔ اِن لوگوں سے ہی طرح طرح کی خبر پھیلی۔ باہر کے لوگوں نے ایسے بے سہارا لوگوں کی اِمداد کی۔ اُن کی اِمداد ضروری تھی۔ کیوں کہ اِن کا سب کچھ وہاں ضائع ہو گیا تھا۔ بہتوں کا کاروباری اور کمانے والے اہلِ خاندان یہاں مر گئے تھے۔ پہلے اِنہیں کو کسی ایسی جگہ پہنچا دینا تھا جہاں وہ رہ سکیں۔ مگر ایسی جگہ پہنچنے پر بھی انہیں کوئی ٹھکانا ملنے کی کوئی اُمید نہیں تھی۔ اِسی لئے اُنہیں کہیں بھی لے جا کر کچھ دنوں کے لئے اُن کے رہنے اور کھانے پینے کا انتظام کر دینا اور پھر کسی روزگار میں لگا دینا ضروری تھا۔ میری بہت خواہش تھی کہ میں وہاں جاؤں اور جو تھوڑا بہت تجربہ بہار کے زلزلہ میں کام کرنے سے ہوا تھا، اُس کا فائدہ وہاں کے لوگوں کو دے کر اُن کی مدد کروں۔ مگر سرکار نے اجازت نہ دی۔ اِس بات پر اخباروں نے مذمت کی۔ لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔

اِس لئے مجھے باہر سے ہی کارِ خدمت کرنا پڑا۔ میں کوئٹہ تو نہیں گیا مگر کراچی جیکب آباد سکھر، شکار پور وغیرہ سندھ کے شہروں میں گیا۔ ڈیرہ غازی خاں، ملتان، لاہور وغیرہ پنجاب کے شہروں میں بھی گیا۔ جہاں لوگ بھاگ کر وہاں سے آئے تھے۔ میں نے سبھی جگہوں میں اُن کے لئے امدادی کمیٹیاں بنا دی۔ اِن کمیٹیوں نے حتی الوسع اُن کی مدد

کی۔ کوئٹہ ریلیف کمیٹی کی اپیل پر کئی لاکھ روپئے بھی آ گئے جو تقسیم کئے گئے۔ یہاں اِمداد کی شکل بہار سے بالکل مختلف تھی۔ یہاں کوئٹہ میں اس مقام پر تو ہم پہنچے ہی نہیں جہاں مدد کی ضرورت تھی لہذا خاص کوئٹہ جاکر ہم کچھ کرنے سے مجبور رہے۔ اِدھر ہی کچھ روپئے شرنارتھیوں کے کھلانے پلانے اور اُن کی دوا دارو میں خرچ ہوئے۔ مگر زیادہ خرچ اُن کو پھر اِنفرادی طور سے کہیں زندگی شروع کرنے کے وسائل بہم پہنچانے میں ہی کیا گیا۔ اِس کام کا بار سندھ میں شری جے رام داس اور پنجاب میں ڈاکٹر گوپی چند بھارگو نے ہی اُٹھایا۔ اُن کے مددگار مقامی لوگ تھے۔ جنہوں نے بڑی مستعدی سے کام کیا۔

کانگریس کی تاریخ:
دیسی ریاستوں کا مسئلہ

کانگریس کا جنم ۱۸۸۵ء کے دسمبر میں ہوا تھا، جب اِس کا پہلا جلسہ بمبئی میں کیا گیا تھا، دسمبر ۱۹۳۵ء میں اُس کے پچاس برس پورے ہوتے تھے۔ اِس لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ کانگریس کی گولڈن جوبلی دھوم دھام سے منائی جائے۔ اِس کے لئے پروگرام بنایا گیا تھا۔ جس کا ذکر آگے آئے گا۔ مگر ایک بات یہاں کہہ دینا ضروری ہے۔ اگرچہ کانگریس کے تقریباً ۵۰ سال گزر چکے تھے تب بھی کانگریس کی کوئی صحیح تاریخ شروع سے آج تک کی یکجائی لکھی ہوئی نہیں ملتی تھی۔ ڈاکٹر پٹابھی ستیارامیہ نے ایک تاریخ لکھ رکھی تھی جو ہنوز شائع نہ ہوئی تھی۔ رائے ہوئی کہ گولڈن جوبلی کے موقع پر ایک تاریخ بھی شائع کی جائے۔ ڈاکٹر ستیارامیہ سے میں نے اِصرار کیا کہ اپنی لکھی تاریخ کو وہ پورا کر دیں، اور کانگریس

کی طرف سے وہ چھپوائی جائے۔ اُنہوں نے تاریخ پوری کر دی۔ مگر برسات میں، میں نے اور اُنہوں نے واردھا میں بیٹھ کر اُس پر نظر ثانی کی۔ اِس میں کئی دن لگے، جو کچھ باقی رہ گیا تھا، اُسے الہ آباد میں سوراج بھون میں بیٹھ کر دُہرایا گیا۔

وہ تاریخ انگریزی میں لکھی گئی تھی۔ ہم نے یہ بھی طے کیا کہ دیسی زبانوں میں بھی اِس کے ایڈیشن اِسی زمانے میں شائع ہوں۔ اِسی لئے، ہندی، مرہٹی، کنڑ، تلیگو، تامل، اُردو وغیرہ زبانوں میں بھی اِس کا ترجمہ چھاپنے کا انتظام کر دیا گیا۔ انگریزی ایڈیشن چھاپنے کے خرچ کا بار تو آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے لیا۔ کیونکہ ہم جانتے تھے کہ اِس میں جو رقم لگے گی وہ کتاب کے بک جانے پر واپس آجائے گی۔ ملک کی اور زبانوں میں ترجمہ کرانے اور چھاپنے کا بار کچھ ناشروں نے یا اِن صوبوں کی کمیٹیوں نے لے لیا۔ جہاں کی زبان میں ترجمہ ہوا تھا۔ جس دن کانگریس کی جوبلی منائی گئی اُس دن جہاں تک مجھے یاد ہے انگریزی، ہندی، مرہٹی، کنڑ، تلیگو، تامل اور اُردو کے ایڈیشن چھپ کر تیار ہو گئے۔ ہندی اور مرہٹی کے دو ایڈیشن اُن چند دنوں کے اندر ہی نکالنے پڑے۔ انگریزی کا کئی ہزار کا ایڈیشن پورا کا پورا بک گیا اور دوبارہ چھپوانا پڑا جس کے کچھ نسخے بعد تک بچے رہے۔ مجھے اِن کتابوں پر نظرِ ثانی کرنے میں کافی وقت لگانا پڑا، اور اُن کے لئے دیباچہ بھی لکھنا پڑا تھا۔

اِس جوبلی کے موقع پر کانگریس کے متعلق چھوٹی موٹی اور بہت سی کتابیں چھپیں میں نے پہلے سے ہی سوچ رکھا تھا کہ برسات کے بعد جنوبی ہند کا دورہ کروں گا۔ اِسی لئے مدراس پریسیڈنٹی کے تین صُوبوں تامل ناڈ، کیرل اور آندھرا کے لئے پروگرام بنایا گیا۔ میں نے سوچا کہ دسہرہ کے بعد یہ دَورہ شروع کروں گا۔ اِسے شروع کرنے کے پہلے مدراس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اِجلاس کا فیصلہ کیا گیا۔ وہ ایک خاص سبب سے ضروری تھا

کانگریس کی حکمتِ عملی شروع سے یہ رہی تھی کہ دیسی راجاؤں اور ریاستوں کے اندرونی معاملوں میں وہ مداخلت نہ کرے گی۔ پہلے چاہے جس سبب سے یہ پالیسی مانی گئی ہو اب اِس کے بارے میں بہت اختلاف رائے ہونے لگا تھا۔ دیسی ریاستوں میں جمہوریت نہیں ہے راجاؤں کی من مانی ہی چلتی ہے۔ کہیں کہیں اچھے دیوان یا اصلاح کار مِل گئے تو راج کا اِنتظام اچھا ہوا، اور رعایا کو فائدہ بھی پہنچا مگر کہیں بھی حکومت میں رعایا کا دخل نہیں تھا۔ اِن چھ، سات سو ریاستوں میں چند بیگھوں کے رقبے اور چند آدمیوں کی آبادی والے چھوٹے راجوں سے لے کر ہزاروں میل کے رقبے اور کروڑوں کی آبادی والے بڑے بڑے راج بھی تھے مگر کسی بھی دیسی راج میں برٹش سرکار کے خلاف کوئی اہم کام نہیں ہو سکتا تھا۔

پھر بھی برٹش ہند میں پچاس برسوں سے زیادہ زمانے سے سیاسی جلسے ہوتے رہے ہیں اور یہاں عوام میں کافی بیداری آگئی ہے۔ برٹش سرکار کو مجبور ہو کر اور برٹش سیاست کی جمہوری ساخت کی وجہ سے ہندوستان کے لئے بھی جمہوری حکومت قائم کرنے کا اعلان کرنا پڑا۔ جو آئین وقت وقت پر بنتے گئے وہ ہندوستان کو اسی طرف لے جاتے رہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ہم جہاں تک جانا چاہتے تھے وہاں تک وہ ہمیں نہیں پہنچنے دے رہی تھی۔ پھر بھی اِس سے اِنکار نہیں کہ یہاں کے آئین کا رُخ اِس طرف تھا۔ برٹش ہندوستان اور دیسی ریاستیں دونوں اس طرح مِلے جُلے تھے کہ کوئی اُن میں معمولی طور پر فرق نہیں دیکھ سکتا تھا۔ فرق طرزِ حکومت میں تھا کہ نہ دونوں کے عوام میں پھر بھی طریقِ حکومت میں بہت بڑا فرق پایا جاتا تھا۔ اِسی لئے جب برٹش ہندوستان میں بیداری آئی تو اِس کا اثر دیسی ریاستوں کے باشندوں پر پڑے بغیر نہ رہ سکتا تھا۔ اِن لوگوں نے بھی اپنی ریاستوں کی حکومت میں حق حاصل کرنے کی خواہش اور تمنّا

پیدا ہوئی ۔ وہاں کی نادر شاہی کے سبب ، اِس اِختیار کی ضرورت بھی خوب محسوس ہونے لگی ۔ وہاں بھی لوگوں نے کچھ تنظیم شروع کی ۔ وہ لوگ بھی برٹش سرکار کی سیاسی تحریکوں میں حصہ لینے لگے اور اِس طرح یہاں کے خیالات کو راج کے اندر اپنے ساتھ لے جانے لگے ۔ اسی لئے کانگریس کی پُرانی حکمتِ عملی کہ وہ دیسی راجاؤں کے اندرونی معاملوں میں دست اندازی نہ کرے گی ، لوگوں کو کھٹکنے لگی ۔ ناگپور کانگریس کے زمانے میں دسمبر ۱۹۲۰ء میں جب کانگریس نے نئے سرے سے اپنا آئین بنایا اور زبانوں کے مطابق کانگریسی صوبوں کی تنظیم کی تو اُس نے دیسی ریاستوں کے لوگوں کو اپنے پاس کے برٹش ہند کے صوبوں کی کمیٹیوں میں شریک ہونے کا حق دے دیا۔

کانگریس دیسی ریاستوں میں کانگریس کمیٹیاں قائم کرنا نہیں چاہتی تھی ۔ کیونکہ اگر ایسا کیا جاتا اور وہاں کے اربابِ حکومت سے کسی بات میں اختلافِ رائے ہو جاتا یا دہ کانگریس کمیٹیاں قائم ہونا پسند نہ کرتے تو اُن کے ساتھ مُڈبھیڑ ہو سکتی تھی ۔ کانگریس اِسے پسند نہیں کر سکتی تھی ۔ جب دیسی ریاستوں کے عوام میں بیداری آنے لگی تو اُن کی طرف سے کانگریس میں مطالبہ ہوا کہ کانگریس اپنی حکمتِ عملی کو بدل دے اور ریاستوں میں بھی جمہوریت کے لئے کانگریس اسی قسم کی کوشش کرے جیسے وہ برٹش ہندوستان کے لئے کراتی ہے ۔ اُن کا یہ مطالبہ منصفانہ تھا ۔ کیونکہ دونوں کے عوام میں کچھ فرق نہیں تھا اور کانگریس کے لئے بھی دونوں میں تفریق ٹھیک نہیں تھی ۔ کانگریس بھی دونوں میں فرق رکھنا نہیں چاہتی تھی ۔ مگر وہ اِس جھگڑے کو بھی ہاتھ میں لے کر اپنی دُشواریوں کو بڑھانا نہیں چاہتی تھی ۔ وہ یہ بھی مانتی تھی کہ اگر ہم برٹش سرکار میں برٹش سرکار کی طاقت کے ساتھ ، کچھ کر لیں گے اور یہاں جمہور قائم کر لیں گے تو دیسی ریاستوں میں بھی یہ آسانی

سے ہو جائے گا، کیونکہ وہ بھی برٹش سرکار کی طاقت پر ہی بہت کچھ منحصر تھے۔ یہ سب ہوتے ہوئے بھی اِدھر کئی برسوں سے اِس بارے میں ریاستی رعایا میں بڑی کھلبلی ہو رہی تھی اِس کے کئی سبب تھے۔

گول میز کانفرنس میں برٹش سرکار نے رجواڑوں کے نمایندوں کو بھی بلایا تھا، وہاں سارے ہندوستان کے لئے آئین بنانے کی کوشش کی گئی تھی۔ جس کے اندر برٹش ہندوستان اور ریاستی ہندوستان دونوں کا ہی اِشتمال تھا۔ دونوں کے لئے ایک ہی آئین بنانے کی اِبتدا بھی ہو سکی جب گول میز کانفرنس میں شریک ہونے والے راجاؤں نے اُسے منظور کیا کہ اگر قابلِ اطمینان آئین بنا اور اُن کے حقوق اِس میں محفوظ رہے تو وہ بھی اِس آئین کے اندر اپنی ریاستوں کو لا سکیں گے۔ سنہ ۱۹۳۵ء کے آئین میں مرکزی اسمبلی بننے والی تھی۔ اِس میں دو تہائی نمایندے برٹش سرکار کے نمایندے تو وہاں کی رعایا کے ذریعے چُنے جائیں گے۔ یہ بات وہاں کی رعایا کو تو کھٹکتی ہی تھی۔ ہم سب کو بھی بہت بُری لگتی تھی۔ کیوں کہ ہم سمجھتے کہ اِس طرح برٹش سرکار کہنے کے لئے مرکزی اسمبلی کو نمایندگی کا حق دیتی ہے۔ مگر حقیقت میں اِس کے تہائی ممبروں کے تقرّریں ریزیڈنٹوں کی معرفت وہ پورا پورا ہاتھ بٹا سکے گی۔ یہ بھی ایک خاص سبب تھا جس سے کانگریس پر زور دیا جانے لگا کہ اب دیسی ریاستوں کے اندر بھی کانگریس اُسی طرح کام کرے جس طرح وہ برٹش بھارت کے اندر تنظیم عوام کا کام کرتی ہے۔

دیسی راجاؤں میں کہیں کہیں کے حکمرانوں نے تازہ ماحول سے متاثر ہو کر کچھ اِصلاحیں کیں اور کہیں کہیں صرف نام کے لئے بہت اِختیارات کے ساتھ صوبائی اِسمبلیاں بھی قائم ہو گئیں۔

۱۹۳۰-۳۴ء کے ستیہ گرہ کی تحریک میں دیسی ریاستوں کی رعایا نے بہت جگہوں میں کافی حِصّہ لیا تھا۔ گجراتی اور مارواڑی لوگ تجارت میں بہت آگے بڑھے ہوئے ہیں۔ یہ بمبئی کلکتہ وغیرہ بڑے بڑے شہروں میں بیوپار کے لئے جاتے ہیں۔ وہاں جو تحریک بڑھی تو وہ اپنے کو اس سے الگ نہ رکھ سکے۔ جب بمبئی اور کلکتہ جیسے شہروں میں گجراتی اور مارواڑی وہاں کے ستیہ گرہ میں شریک ہوئے تو وہ اپنی ریاستوں میں بھی لامحالہ اِس تحریک کو اُنہیں اختیارات کے لئے جانا چاہتے تھے۔ جن کے لئے وہ برٹش سرکار میں کانگریس میں شریک ہوکر لڑ رہے تھے۔ اِس طرح کانگریس کے اندر ایک خاصی بڑی پارٹی تیار ہوگئی تھی جو کانگریس کی پالسی میں تبدیلی چاہتی تھی کانگریس کے اندر برٹش ہندوستان کے رہنے والوں میں بھی بہت سے ایسے تھے جو برٹش ہند اور ریاستی ہند میں کوئی فرق دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ اِسی لئے بمبئی کانگریس کے زمانے میں ہی یہ آواز اُٹھائی گئی تھی کہ کانگریس کی حکمتِ عملی تبدیل ہو۔

خود مہاتما گاندھی کا جنم ایک دیسی ریاست میں ہوا تھا۔ اُن کا خیال تھا کہ اگر ہم برٹش ہندوستان سے دیسی ریاستوں میں کام کرنا شروع کریں گے تو وہاں کا کام ٹھیک نہ ہوسکے گا۔ وہاں کی رعایا کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کا وہ اچھا موقع بھی نہ ملے گا۔ جس سے اس میں ضروری طاقت پیدا ہوسکے۔ اِسی لئے وہ دیسی ریاستوں کی رعایا کے ساتھ کافی ہمدردی رکھتے ہوئے بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ کانگریس اپنا کام ریاستوں میں بھی اسی طرح جاری کرے جس طرح وہ برٹش بھارت میں کرتی ہے، ہاں، وہاں کی رِعایا اِس قسم کی تحریک بلاشبہ چلا سکتی ہے اور کانگریس کی ہمدردی اُس کے ساتھ ضرور رہے اور رہے گی۔ وہ ہمدردی ضرورت پر اور سہولت کے مطابق عملی بھی ہو سکتی ہے، اور ہوگی

مگر وہاں کی تحریک اور تنظیم کا بار کانگریس اپنے اُوپر ابھی نہیں لے سکتی۔

مہاتما جی نے اپنے ایک بیان میں یہ رائے ظاہر کر دی مگر اُن لوگوں کو اُس سے اِطمینان نہ ہوا۔ جو دیسی ریاستوں کے معاملے میں کانگریس کی براہِ راست مداخلت چاہتے تھے۔ میں نے صدر کی حیثیت سے ایک بیان نکالا مگر اِس سے بھی لوگ مطمئن نہ ہوئے۔ آخر ورکنگ کمیٹی نے بھی ایک بیان نکالا۔ اِسی لئے مدراس میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ ورکنگ کمیٹی کے فیصلوں پر ہم غور کر سکیں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے ورکنگ کمیٹی کے بیان کو منظور کر لیا۔ مگر یہ جھگڑا کانگریس کے اندر چلتا رہا۔

مگر اِن سب کا ایک نتیجہ وہ ہے جو ہر طرح سے خواستہ تھا اور جو گاندھی جی کی حکمتِ عملی کا اصول تھا۔ اب ریاستوں کے اندر وہاں کی رعایا نے اپنی انجمنیں قائم کر لی ہیں۔ اب بہت سی ریاستوں میں پرجا منڈل یا کسی دوسرے نام کی انجمنیں بن گئی ہیں آل انڈیا دیسی راج پرجا منڈل بھی بن گیا ہے۔ اِس طرح وہاں کے لوگ اپنی تحریک خود چلانے لگے ہیں۔ کانگریس بھی جہاں ضرورت ہوگی ضرور اُن کی مدد کرے گی۔ اس حالت تک پہنچنے میں کئی سال لگ گئے ہیں۔ ۱۹۳۵ء میں ابھی بہت زور دار بحث چل رہی تھی اِس لئے حکمتِ عملی متعین کر کے اعلان کرنا ضروری تھا۔ یہ اختلاف صرف سیاسی تحریک کے بارے میں ہی تھا۔ جہاں تک وہاں جمہوری نظامِ حکومت کرنے کی بات تھی، کانگریس بھی اُسے کلیتاً اُسی طرح اپنا نصب العین سمجھتی تھی، جس طرح وہ برٹش سرکار کے لئے سمجھتی تھی۔ وہ اِس کا اعلان بھی کر چکی تھی۔ تعمیری کام کے متعلق بھی کوئی فرق نہ تھا۔ کئی ریاستوں کے اندر اچھوت اُدھار کے متعلق کام اور کھدر کی تیاری، اور پرچار کا کام کئی برس سے خوب چل رہا ہے۔ اِس میں بھی کوئی اختلافِ رائے نہ تھا۔

جُنوبی ہند کا دَورہ

میں واردھا سے مدراس کے لئے روانہ ہوا۔ وہاں سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس کے بعد جنوبی ہند کا دَورہ شروع کیا گیا۔ اِس دَورہ میں زبان کا سوال پیش آیا۔ مدھیہ پردیش اور تقریباً مہاراشٹر تک میں نے ہندی میں ہی تقریریں کیں۔ مدراس سے مجھے انگریزی میں تقریر کرنی پڑی۔ میں جو کچھ کہتا اُس کے ہر جُملے کا زبانی ترجمہ وہیں کے صاحب کر دیتے۔

جنوبی ہند میں ہندی کی اِشاعت کا کام ۱۹۱۸ء سے ہی مہاتما گاندھی کے ایما سے ہو رہا ہے۔ تامل کے علاقے میں بھی ہزاروں مرد و زن ایسے ہو گئے ہیں جو ہندی بول اور سمجھ سکتے ہیں۔ میں جس بڑے شہر میں پہنچتا ہندی پرچارک سے ملاقات ہو جاتی۔ کچھ تو وہیں کے باشندے تھے جنہوں نے ہندی سیکھ لی ہے۔ کچھ شمالی ہندوستان کے رہنے والے ہیں جو بہار اور اُتر پردیش سے جا کر وہاں اِس کام میں لگے ہوئے ہیں۔ وہاں کے لوگوں کی ہندی کے لئے رغبت اور عقیدت ناقابلِ بیان ہے۔ ہندی پرچار کا کام خاص کر پڑھے لکھے لوگوں میں زیادہ ہوا ہے۔ عورتوں نے اِس میں اِتنی ہی دِلچسپی لی ہے جتنی مردوں نے۔

ہندی پاٹھ شالاؤں میں بوڑھے اور بچے، عورتیں اور مرد ایک ساتھ تعلیم پاتے ہیں۔ جب میں ایک بار اور دکن میں گیا تھا تو میں نے دیکھا تھا کہ ایک ہی جلسہ میں باپ بیٹے ماں اور بیٹی کو ہندی کا امتحان پاس کرنے کے سارٹیفکٹ ایک ساتھ ہی دئے گئے تھے۔ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ لاکھوں لوگوں نے ہندی کا گیان حاصل کر لیا ہے تو بھی ہندی میں تقریر کرنا ابھی ممکن نہ تھا کیونکہ ہزاروں کی تعداد میں جو لوگ جمع ہوتے اُن میں ہندی سمجھنے والے تھوڑے ہی ہوتے انگریزی جاننے والوں کی تعداد ہندی جاننے والوں سے کہیں زیادہ ہوتی۔ اِس لئے میں چاہے میں انگریزی میں بولتا یا ہندی میں جلسہ میں موجود سو آدمیوں میں سے تقریباً نوے ایسے ہوتے ہی جو نہ ہندی سمجھتے تھے نہ انگریزی اور اُن کے لئے تقریر کا ترجمہ ہر حالت میں ضروری تھا۔

ہندی سے تامل میں ترجمہ کرنے والا ملنا مشکل ہوتا، اِس لئے مجھے تامل ناڈ میں اور کیرل میں زیادہ تر انگریزی میں ہی تقریر کرنی پڑی۔

مدراس میں ہندو نام کا ایک انگریزی روزنامہ بہت پرانا اور موقر ہے، میں جہاں جہاں گیا اُس کا نامہ نگار موجود ملا کرتا۔ وہ میری پوری تقریر کو جو انگریزی میں ہی ہوا کرتی تھی، مکمل طور پر اپنے اخبار کے پاس لکھ بھیجا کرتا۔ اِس طرح تامل ناڈ میں اور کیرل میں میری تقریروں کی مکمل اور جیسی اچھی رپورٹ چھپی ویسی اور کہیں نہیں۔

اُن سبھی جگہوں کا نام دینا تو مشکل ہے۔ جہاں جہاں میں گیا۔ اگر میں ایسا کہوں کہ سارے صوبے میں شاید ہی کوئی تعلقہ یا شہر ہو جہاں میں نہیں گیا۔ اور ایک تعلقہ سے دوسرے تعلقہ تک راستہ میں شاید ہی کوئی خاص جگہ ہوگی جہاں میں کچھ دیر کے لئے نہ ٹھہرا ہوں، تو یہ مبالغہ نہ ہوگا۔

میں نے اُوپر لکھا ہے کہ مدراس میں برہمن، غیر برہمن کا جھگڑا کچھ ایسا ہی ہے جیسا شمالی ہند میں ہندو مسلمان کا، یا بہار میں بہاری بنگالی کا۔ جسٹس پارٹی غیر برہمنوں کی پارٹی ہے۔ وہاں میرے جانے کے ایک سال پہلے ہی وہ مرکزی اسمبلی کے چناؤ میں کانگریس سے ہار چکی تھی مگر اس کا اثر تو ابھی تک کچھ باقی تھا۔ اس لئے کہیں کہیں اِس طرح کے سوال کئے جاتے تھے جن سے یہ مترشح ہوتا تھا کہ وہ لوگ کانگریس کو برہمنوں کی انجمن سمجھتے ہیں۔ میں نے کئی جگہ صاف صاف کہا کہ کانگریس میں سب کے لئے جگہ ہے اور آج بھی اُس کی ورکنگ کمیٹی میں بہت سے غیر برہمن ہیں۔ مثلاً مہاتما گاندھی، سردار ولبھ بھائی پٹیل، آچاریہ کرپلانی اور اپنا نام بھی میں نے لیا۔ میں نے دیکھا کہ سبب چاہے کچھ بھی ہو اس طرح کے پرچار کا یہ بُرا پھل ہوا کہ کانگریس جیسی پارٹی کے متعلق لوگوں میں شُبہ پیدا کر دیا گیا۔

مگر اس سے بھی زیادہ ایک دِل چسپ چیز اور کہیں کہیں دیکھنے میں آئی۔ وہاں پر ایک پارٹی غیر برہمنوں کی قائم ہوئی تھی جو اپنے کو (PARTY SELF RESPECT) خود دار پارٹی) کہا کرتی تھی۔ اُس کی طرف سے کہیں کہیں کچھ لوگ اِستقبال کے وقت کالے جھنڈے دکھاتے اور "گو بیک" (واپس جاؤ) کے نعرے لگاتے۔ مگر یہ ٹولی اِتنی چھوٹی ہوتی کہ صرف ایک مذاق کی ہی چیز بن جاتی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک جلسہ میں کچھ لوگ "گو بیک" کے نعرے لگا کر شور مچا رہے تھے۔ میں نے ہنس کر حاضرین سے پوچھا کہ کتنے لوگ چاہتے ہیں کہ میں واپس چلا جاؤں، اور کتنے چاہتے ہیں کہ میں نہ جاؤں۔ لوگوں نے جو ہاتھ اُٹھا کر اپنی رائے بتائی تو صاف ظاہر ہو گیا کہ "گو بیک" کہنے والوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی۔ میں نے تقریر سوال سے شروع کی کہ اِتنے زیادہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں نہ جاؤں اور اِتنے تھوڑے لوگ چاہتے کہ میں جاؤں تو ایسی حالت میں کیا کروں، میرے

پہنچا تو معلوم ہوا کہ یہیں رمن مہرشی قیام فرماتے ہیں۔ دورہ کا پروگرام اتنا لگا بندھا تھا کہ میں وہاں ٹھہر نہ سکا۔ بس چند لمحوں کے لئے اُن کا درشن کر سکا۔ مگر میری خواہش تھی کہ کبھی ہو سکا تو جا کر اچھی طرح درشن کروں گا۔ کچھ دنوں کے بعد شری شنکر لال بینکر نے بھی وہاں جانے کی صلاح دی۔ وہ خود وہاں کئی بار گئے تھے اور اُن کے دِل پر اچھا اثر پڑا تھا۔ اِسی لئے کئی برسوں کے بعد ایک بار سیٹھ جمنالال جی کے ساتھ میں وہاں گیا۔ کئی دنوں تک وہاں ٹھہر کر مہرشی کے درشن کرتا رہا۔ دوسری جگہ جس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں چِدمبرم ہے۔ وہیں پر انّ ملیہ یونیورسٹی راجا انّ ملیہ چیٹیر کے دان سے بنی ہے۔ اُن دِنوں مسٹر سری نواس شاستری وہاں کے وائس چانسلر تھے۔ میں دو دِنوں تک اُن کا مہمان رہا۔ یوں تو اُن سے میرا پہلے کا تعارف تھا مگر یہ پہلا ہی موقع تھا۔ جب میں اُن کے ساتھ ایک دو دن تک ٹھہرا۔ میری عقیدت اُن سے اور بھی بڑھ گئی۔

صوبہ کیرل میں میں کوچین بھی گیا۔ تاتا پورم میں تیل کے بڑے کارخانے کو دیکھا مگر میں ٹراونکور راج میں دو ایک مقامات ہی دیکھ سکا۔ اِن میں سے ایک راس کماری ہے جہاں جا کر کچھ وقت میں نے گزارا۔ ہندوستان کی سب سے جنوبی راس جہاں خلیج بنگال اور بحرِ عرب ملتے ہیں۔ ہندوستان کے لئے اور دنیا کے لئے بہت اہم ہے۔ لوگوں نے ہندوستان کے نقشے پر بھارت ماتا کا ایک نسوانی شکل میں مرقع پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اِس تصویر میں ماتا کے چرن یہیں پڑتے ہیں۔ میں نے سُنا ہے کہ جب سُوامی وویکانند اس مقام پر پہنچے اور یہاں کی چٹانوں کو جو ماں کے قدم میں دیکھا، جن کو سمندر برابر اپنی لہروں سے دھوتا رہتا ہے۔ وہ دفعتہً یہاں ہمہ تن ساجد ہو کر ماں کے قدموں میں گر پڑے۔ میرے جذبات بھی اِس جگہ کچھ ایسے ہی ہوئے۔ پھر جب میں نے یہ سوچا

سوال کرتے ہی سارے جلسہ میں قہقہہ پڑ گیا۔ لوگ اِتنا ہنسے کہ "گو بیک" کہنے والے بھی اپنی ہنسی نہ روک سکے۔ وہ بھی اِس ہنسی میں شریک ہو گئے۔ اس کے بعد جلسہ سکون سے ہوا

تامل ناڈ، کیرل اور آندھر پردیش میں بہت زبردست اِستقبال ہوا۔ پرچار کا کام بھی کافی ہوا آندھر میں سب سے بعد میں آیا۔ وہاں ایک نئی بات یہ ہوئی کہ میرے پورے سفر میں ہندی پرچار سبھا کے شری ستیہ نارائن ساتھ رہے۔ وہ آندھر کے رہنے والے ہیں مگر ہندی کا گیان اِتنا اچھا ہے کہ اگر وہ تقریر کرنے لگیں تو کسی ہندی اہلِ زبان کو یہ شبہ نہ ہو گا کہ اُن کی زبان ہندی نہیں ہے۔ اِسی لئے وہاں میری تقریروں کے ترجمے کا سوال آسان ہو گیا۔ آندھر میں تامل ناڈ کے مقابلہ میں ہندی پرچار زیادہ ہوا ہے۔ وہاں میں نے یہ بھی دیکھا کہ بہت جگہوں میں لوگ میری تقریر ہندی میں سُننا چاہتے تھے۔ اِسی لئے آندھر میں کچھ جگہوں کو چھوڑ کر باقی سب جگہ میں نے ہندی میں ہی تقریر کی۔ ستیہ نارائن جیسا مُترجِم ساتھ میں۔ جہاں تک میں سمجھتا تھا میرے مفہوم کا بہت سلیس تلنگانی زبان میں وہ ترجمہ کر کے بتا دیتے تھے۔

اِس دَورہ سے مجھے اِس بات کا پتہ چلا کہ ہندی پرچار سبھا نے کتنا اہم کام کیا ہے اور وہ کام قومی تعمیر میں کتنا معاون ہوا ہے۔ اور آیندہ کتنا معاون ہو گا۔ ایک بات اور دیکھنے میں آئی۔ میں جہاں گیا، وہاں جو تھوڑے مسلمان ملے، اُن میں بہتیرے ٹوٹی پھوٹی ہندی کچھ نہ کچھ سمجھ لیتے تھے۔ اُن کی بولی تو شاید مقامی ہی تھی۔ مگر وہ نہ معلوم کس طرح کچھ کچھ ایسی بولی سمجھ لیتے تھے جسے میں سمجھ سکتا تھا۔ وہ شُدھ ہندی تھی اور نہ فارسی آمیز خالص اردو۔ وہ تو ایسی زبان ہوتی ہے جسے ہر ایک ہندی داں سمجھ سکتا ہے۔ اِس زبان کو وہاں کے لوگ "مسلمانی" کہا کرتے تھے۔ اس سے خیال گزرا کہ اسے مسلمان ہی شمالی ہندوستان سے اس طرف لے گئے تھے۔

تامل ناڈ کے دورہ میں میں دو جگہوں کا ذکر ضروری سمجھتا ہوں۔ ترون ملیہ میں جب

کہ راس کماری کے سامنے دکن میں قطب جنوبی تک کوئی دوسرا جزیرہ یا زمین کا ٹکڑا نہیں ملتا تو یہ جذبہ اور بھی مضبوط ہو گیا کہ قدرت نے یہیں ایک طرح زمین کا خاتمہ کیا ہے۔ زمین قطبِ شمالی سے سائبریا چین، تبت ہمالیہ ہوتے ہوئے ہند کو پار کر کے وہاں (راس کماری) تک پھیلی ہے، وہیں اُس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اِس کے جنوب میں صرف پانی ہی پانی ہے جو قطبِ جنوبی تک پھیلا ہوا ہے۔ وہ سچ مچ ہمارے لئے ایک انتہائی خوب صورت دل کش اور پاک جگہ ہے، جس کو دیکھ کر کوئی ہندوستانی ہندوستان کی ایکتا اور وحدت کو بھول نہیں سکتا۔

راس کماری سے شمال میں شری جگناتھ پُری تک میں برابر موٹر میں پھرا۔ یہ تو ہندوستان کے شمالی حصّہ میں سمندر کے کنارے کنارے دَورہ ہوا۔ اِسی طرح مغربی کنارے پر بھی کرناٹک اور مہاراشٹر کے دَورہ میں بنگلور سے لے کر گجرات تک موٹر پر دَورہ کر چکا تھا۔ بیچ کے شہروں میں بھی وہاں کے تقریباً سبھی مقاماتِ خاص کو دیکھنے کا موقع ملا تھا۔ جو تھوڑی جگہیں ایسی تھیں جہاں نہیں جا سکا تھا وہاں بعد میں گیا۔ اِس طرح صرف حیدر آباد ریاست کے اندر کی جگہوں کو چھوڑ کر میں بندھیاچل کے جنوب میں سارے ہندوستان کا پورا دورہ کر چکا ہوں۔

پروگرام ایسا بنا تھا کہ دسمبر کی ۲۰ یا ۲۱ تاریخ تک میں تقریباً تین مہینوں میں سفر ختم کر کے واردھا پہنچ جاؤں، اور وہاں سے بمبئی جاؤں۔ جہاں کانگریس کی گولڈن جوبلی منانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ میں آندھر میں سب سے بعد وشاکھاپٹم (وزاگاپٹم) میں پہنچا۔ وہاں سے ٹرین پر سوار ہو کر رائے پور آیا۔ پھر واردھا میں ایک یا دو دن ٹھہر کر بمبئی چلا گیا۔

کانگریس کی گولڈن جوبلی

کانگریس کی پچاسویں سال گرہ پر سارے مُلک میں جشن منانے کا اِنتظام کیا گیا۔ خاص جشن بمبئی میں ٹھیک اُسی جگہ ہونے والا تھا جہاں دسمبر ۱۸۸۵ء میں کانگریس کا پہلا اِجلاس ہوا تھا۔ بمبئی کی صوبہ کانگریس کمیٹی نے اِس جشن کے لئے موزوں انتظام کیا تھا۔ جب میں بمبئی پہنچا تو مجُھے یہ معلوم ہوا کہ سر دِنشا واچہ بہت بیمار ہیں۔ اُس زمانے میں شاید وہ واحد شخص رہ گئے تھے جنہوں نے کانگریس کے پہلے اِجلاس میں حصہ لیا تھا۔ پنڈت مدن موہن مالوی جی شاید ایک یا دو برس بعد کانگریس میں جانے لگے تھے۔ سر دِنشا واچہ صرف سب سے پُرانے کانگریسی ہی نہیں تھے بلکہ وہ سب سے سن رسیدہ بزرگ تھے جو کانگریس کے صدر رہ چکے تھے۔ اِس لئے میں نے اپنا فرض سمجھا کہ جشن کے کام کی ابتدا اُن کے درشن کرکے اور اُن کی دعا حاصل کر کے کروں۔ اِدھر کئی برسوں سے کانگریس کے ساتھ اُن کا زبردست اختلاف ہو گیا تھا۔ وہ کانگریس سے بہت دُور ہو گئے تھے۔ پھر بھی کوئی ہندوستانی جو کانگریس کی تاریخ سے واقف ہو اُن کی خدمت کو بھول نہیں سکتا۔ اُن کے درشن میں نے تقریباً اُن کی بے ہوشی کی حالت میں کئے، یہ بھی میرے لئے خوش قسمتی کی بات تھی۔

گولڈن جوبلی کا جشن بڑی دھوم دھام سے بمبئی میں ہوا۔ ہندوستان کے تقریباً سبھی شہروں میں وہ بڑے تزک واحتشام سے منایا گیا۔ شاید اس طرح کا جشن اس کے پہلے کبھی سارے مُلک میں عوام نے اِتنے جوش سے نہیں منایا تھا۔ اُسی سال اِنگلستان کے بادشاہ جارج پنجم کے راج کے ۲۵ برس پورے ہوئے تھے۔ جس کے لئے سِلور جوبلی منائی گئی۔ لوگوں کے دِل میں شاید یہ بھی جذبۂ رقابت تھا کہ کانگریس جیسے عظیم اِدارہ کی جوبلی بھی شان وشوکت سے منائی جائے۔ اِس جذبے کا اُنھوں نے اِس جشن کی صورت میں عملی مظاہرہ کیا۔

اِس سفر میں میری تقریروں کا مقصد اور مطلب ایک ہی تھا۔ کانگریس کی تنظیم کو مضبوط بنانا۔ جہاں تک میں سمجھ سکا اِس دَورہ کا اثر اچھّا ہی پڑا، کیونکہ عوام چاہتے تھے کہ ۳۴-۱۹۳۰ء کے ستیہ گرہ کے بعد جب سرکار نے اپنے نزدیک کانگریس کو خوب دبا ڈالا تھا۔ اِنہیں یہ دِکھانے کا موقع مِلا کہ وہ اب بھی کانگریس کے لئے وہی محبّت اور عقیدت رکھتے ہیں میں نے اپنی صدارت کے زمانے کو اِس طرح بہت دَوڑ دھوپ کرکے گُزارا۔ شائد مجھ سے پہلے کسی صدر نے اِتنا طویل دَورہ نہیں کیا تھا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے جو میرے بعد ہی دوبارہ صدر ہوئے، اِس سلسلہ کو جاری رکھا۔ اپنی زبردست جسمانی قوت کے بَل پر اُنہوں نے اِس سے بھی زیادہ سخت دورہ کیا۔

۱۹۲۹ء میں لاہور کانگریس میں طے ہوا تھا کہ کانگریس کا اجلاس فروری یا مارچ میں ہوا کرے۔ اِس فیصلہ کے مطابق کراچی کا اِجلاس ۱۹۳۰ء میں نہ ہو کر ۱۹۳۱ء کے مارچ میں ہی ہونا تھا اور ہوا بھی ۳۳-۱۹۳۲ء میں ستیہ گرہ کی وجہ سے باضابطہ اجلاس نہیں ہو سکا۔ اِجازت کے خِلاف دِلّی اور کلکتہ میں حسبِ فیصلہ وقت مقررہ پر لاٹھیوں کی

مارچ کے درمیان کانگریس کے اجلاس ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں باضابطہ اجلاس ہوا مگر مارچ میں نہیں۔ کیونکہ اس زمانے میں کانگریس غیر قانونی جماعت تھی۔ یہ اجلاس اکتوبر میں بمبئی میں ہوا۔ اب ۱۹۳۵ء میں اگر مارچ میں اجلاس ہوتا تو وہ پچھلے اجلاس کے پانچ ہی مہینے بعد ہوتا اس لئے طے کیا گیا کہ ۱۹۳۵ء کے بعد ہی اجلاس کیا جائے۔ ۱۹۳۶ء کے فروری، مارچ میں پنڈت جواہر لال نہرو بمبئی کے اجلاس کے زمانے میں جیل میں تھے، اور جیل سے رہا ہونے پر وہ شریمتی کملا نہرو کی بیماری کی وجہ سے یوروپ چلے گئے۔ وہیں اس خاتونِ پاک کی رحلت ہوئی۔ پنڈت جواہر لال نہرو ہی کانگریس کے صدر چنے گئے۔ اس لئے ان کے واپس آجانے پر اور اس کے بعد ملک کی حالت سمجھ لینے پر ہی اجلاس ہو سکتا تھا۔ لہٰذا دوسرا اجلاس اپریل ۱۹۳۶ء میں لکھنؤ میں ہوا۔ ۱۹۳۵ء کے آخر تک میں سفر اور گولڈن جبلی میں مشغول رہا۔ اس کے بعد سردی کے سبب سے کچھ صحت بگڑ گئی، اور تھوڑا آرام کر لینا ضروری ہو گیا۔ اس لئے زیادہ طویل سفر نہیں کر سکا۔

جس دن پنڈت جواہر لال جی یوروپ سے کملا جی کے پھول لے کر ہوائی جہاز سے اُترے۔ میں اُن کے استقبال کے لئے الہ آباد گیا۔ وہ یومِ ماتم تھا کیونکہ کملا جی جیسی صالح کارکن اور ملک کے ساتھ محبت رکھنے والی خاتون شاذونادر ہی ملتی ہے۔ اس پر دیارِ غیر میں اُن کا انتقال ہونا اور جواہر لال جی کا اُن کی راکھ لے کر واپس آنا سبھی دُکھ بڑھانے والی باتیں تھیں۔ بڑے جوش کے ساتھ تربینی کے سنگم پر اُن کی ہڈیاں سرائی گئیں۔ اس کے بعد سے ہی لکھنؤ کانگریس کی تیاری ہونے لگی۔

لکھنؤ کانگریس

لکھنؤ کے اجلاس کے پہلے ورکنگ کمیٹی کی ایک نشست دلّی میں ہوئی جس میں مہاتماجی بھی آئے تھے۔ جواہر لال جی بہت دنوں بعد واپس آئے تھے اور ولایت جانے کے پہلے بھی بہت دنوں تک جیل میں رہے تھے۔ اِس لئے اُن کی خواہش تھی اور یہ مناسب بھی تھا کہ آیندہ صدر ورکنگ کمیٹی سے کانگریس کے اجلاس سے کچھ پہلے ہی مِل لے۔ اور اجلاس میں زیرِ بحث آنے والے موضوعوں پر مشورہ کرلے۔ جواہر لال جی کے خیالات پہلے ہی سے اشتراکیت کے حق میں ہیں۔ اور یوروپ کے دَورہ کے بعد اُن کے خیالات اور پختہ ہوگئے تھے۔ ہم سب اِس موضوع کو نہ تو بہت سمجھتے تھے اور نہ مانتے تھے۔ مُلک میں کانگریس کے اندر سوشلسٹ پارٹی پیدا ہوچکی تھی۔ پنڈت جی اگرچہ اس پارٹی میں شریک نہیں ہوئے پھر بھی بہت سے معاملوں میں ہم خیال ہونے کی وجہ سے اُن کی رائے اِس پارٹی کے ساتھ مل جاتی تھی۔ دِلّی کے اجلاس میں یہ دیکھا کہ کئی معاملوں پر اُن کا اور میرا اختلافِ رائے ہے اور یہ اختلاف رائے پروگرام کے بارے میں اِتنا نہیں تھا جتنا نظریہ کے متعلق۔ ہم دونوں کسی پروگرام کے متعلق ایک رائے کے بھی ہوتے تو اُس نتیجے پر ہم

دوراستوں سے پہنچتے۔ اگر ایک ہی بات کہنا بھی چاہتے تو اُسے دوطرح کی زبان میں کہتے اگر ایک ہی راہ پر چلنا بھی چاہتے تو دوطرح کی سواریوں پر چلنا چاہتے۔ اگر ایک ہی تجویز پیش کرنا چاہتے تو اس کی الگ الگ تمہید بناتے۔ اِتنی تمہید یہاں دے دینا ضروری ہے کیونکہ آیندہ وہ اِختلاف رائے ظاہر ہوگیا اور لکھنؤ کانگریس میں تو وہ بالکل طشت ازبام ہوگیا۔

لکھنؤ کے اِجلاس سے کئی روز پہلے الہ آباد میں ورکنگ کمیٹی کی نشست ہوئی۔ وہیں کچھ تجویزیں مُرتّب کی گئیں اور کچھ لکھنؤ کے لئے چھوڑ رکھی گئیں۔

لکھنؤ کے اِجلاس میں جیسا اُوپر لکھا گیا ہے اِختلاف رائے رہا تو شاید اس طریقے پر بیان کرنا مشکل ہو۔ مگر جیسا کہا جا چکا ہے، اختلاف زیادہ تر نظریہ کا ہی تھا، اُوپر کہا جا چکا ہے کہ بمبئی کانگریس کے زمانے میں اصلاحات کے متعلق برٹش سرکار کی تجویزیں معلوم ہو چکی تھیں۔ اگرچہ ابھی پورا قانون نہیں بنا تھا، بمبئی کانگریس نے اُسے نامنظور کر دیا تھا، میرے جنوبی ہند کے دَورہ میں مجھ سے اس بارے میں سوال کئے جاتے۔ خاص کر یہ کانگریس نئے آئین کے مُطابق وزارت قبول کرے گی یا نہیں۔ کانگریس کے اندر ایک پارٹی پیدا ہو گئی تھی جو یہ کہا کرتی تھی کہ کانگریس کو وزارت قبول کر لینی چاہئے۔ دوسری پارٹی اُس کے خلاف تھی۔ مخالفوں میں سب سے زیادہ بولنے والے سوشلسٹ لوگ تھے کانگریس نے اگرچہ آئین کو نامنظور کر دیا تھا۔ تب بھی اُس نے اِس بات کا فیصلہ نہیں کیا تھا کہ وہ اپنی نامنظوری کو کس طرح ظاہر کرے گی۔ کانگریس کے نامنظور کر دینے سے وہ آئین رد نہیں ہو جاتا تھا۔ اِسی لئے اِس کے مطابق جو چُناؤ ہونے والے تھے اُن میں کانگریس حِصّہ لے گی یا نہیں۔ الیکشن کا بائیکاٹ اِس طرح کرے گی یا نہیں جس طرح اُس نے ۱۹۲۰ء

میں کیا تھا۔ اگر انتخابات میں حصہ لے گی تو اس کے بعد وہ کیا کرے گی۔ اگر کانگریس کو اکثریت مِل جائے تو اِس حالت میں وہ وزارت نہ بنا کر دوسروں کو بھی بنانے نہ دے گی یا کسی دوسری طرح سے خلل اندازی کی حکمتِ عملی کے اِس آئین کو بے کار بنائے گی۔ اِس پالیسی کا کار آمد ہونا یا نہ ہونا زیادہ تر اُس کے ممبروں کے اکثریت سے چنے جانے پر منحصر تھا۔ اِسی لئے چناؤ کے پہلے کچھ بھی حتمی طور پر طے کر دینا ممکن اور مناسب نہیں تھا، چنانچہ جب مجھ سے کوئی سوال کرتا تو یہی کہنا پڑتا کہ کانگریس کے آئین کو نامنظور کر دیا ہے۔ مگر یہ نامنظوری کس صورت میں بروئے کار لائی جائے گی، یہ فیصلہ ابھی نہیں کیا گیا تھا اور وقت آنے پر ہی طے ہونے والا تھا۔ لوگ اِس جواب کے معنی الگ الگ لگاتے مگر بات یہ تھی کہ کانگریس میں اِس سے زیادہ ابھی تک طے کیا ہی نہیں گیا تھا۔ اگر میں صدر کی حیثیت سے کچھ کہہ دیتا تو ابھی سے آپس کا اختلاف رائے اِس موضوع پر مرکوز ہو جاتا اور دن رات یہی بحث چلنے لگتی۔

ایک دوسرا سوال تھا جس کے متعلق اگرچہ بنیادی اختلاف نہیں تھا، پھر بھی وقتاً فوقتاً سامنے آ جاتا تھا۔ یوروپ میں جنگ کی فضا تیار ہو گئی تھی۔ اٹلی نے ابی سینیا (حبش) پر چڑھائی کر کے اُس میں دخل کرنے کی کوشش شروع کر دی تھی۔ انگلستان اُوپر سے شاید اٹلی کی اِس کارروائی کو ناپسندیدہ بتاتا تھا۔ اور وہاں کے لوگ اُس کی مذمت کرتے تھے مگر وہ سچ مچ اِس بات کو لے کر اطالیہ سے بھڑنا نہیں چاہتا تھا۔ مجلسِ اقوام (LEAGUE OF NATIONS) نے حبش کے ساتھ ہمدردی دکھائی مگر اِس سے زیادہ کچھ نہیں کیا کچھ دنوں تک انگلستان نے اٹلی پر اقتصادی دباؤ ڈالنے کا بھی ڈھونگ کیا۔ مگر وہ بھی کچھ ایسے ہی ویسے۔ ہمارے کانگریسی سوشلسٹ چاہتے تھے کہ ہم اِس طرح کی تجویز پاس کریں کہ

ہندوستان کسی لڑائی میں انگریزوں کی مدد نہیں کرے گا اور ساتھ ہی وہ حبش کے ساتھ ہمدردی بھی دکھانا چاہتے تھے۔ جہاں تک ستائے ہوئے مُلک کے ساتھ ہمدردی کا سوال تھا، کسی قسم کا اختلافِ رائے نہیں تھا مگر اور طرح سے اس قسم کے بین الاقوامی موضوع پر اپنی رائے دے دینا مجھے کانگریس کے لئے قبل از وقت معلوم ہوا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں برٹش سرکار کو مدد دینے کے حق میں تھا۔ اِس لئے اگر ایسے موضوع پر کوئی تجویز مجھے مرتب کرنی ہوتی تو میں صرف اظہارِ ہمدردی کا اِعلان کرتا اور دوسری پارٹی کے لوگ ہمدردی کے ساتھ مخالفتِ جنگ کی رائے بھی ظاہر کرنا چاہتے تھے۔

بہرحال پنڈت جواہر لال کی رائے ہماری رائے سے نہیں ملتی تھی۔ مگر بین الاقوامی امور میں ہم مانتے تھے کہ وہ ہم سے کہیں زیادہ واقفیت رکھتے ہیں اور اُن کے خیالات کی ہم بہت قدر کرتے تھے۔ اِس لئے اُن کی یہ بات مان لیتے۔ وزارت کے متعلق بھی اُن کی رائے ظاہر تھی کہ اُس میں کانگریس کی شرکت نہیں چاہتے تھے۔ ہم نے ابھی تک اپنی رائے پختہ نہیں کی تھی۔ ہم سچ مچ اِس سوال کو اُس وقت تک اُٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ جب تک ہمارے ممبروں کی تعداد اور طاقت کا صحیح اندازہ نہ ہو جائے۔ جواہر لال جی نے اپنے خیالات ظاہر کر دیئے۔ اگرچہ اُس کے ساتھ ہی اُنہوں نے یہ بھی کہہ دیا کہ یہ میرے ذاتی خیالات ہیں، کانگریس نے ابھی تک کچھ فیصلہ نہیں کیا ہے۔

آج یہ کہنا مشکل ہے کہ لکھنؤ میں کن باتوں پر اختلاف ہوا مگر اتنا یقینی ہے کہ کئی معاملوں پر ہوا اور کمیٹی میں کئی باتوں میں اکثریت ہمارے ساتھ رہی مگر جیسا پہلے کہہ چکا ہوں یہ کوئی اُصولی باتیں نہیں تھیں جن کے باعث ہم دونوں کا الگ ہو جانا لازمی ہو جاتا، جیسا گیا میں سوراج پارٹی اور غیر تبدیلی پسندوں میں ہو گیا تھا۔ خاص کر لائحہ عمل میں کوئی بنیادی

اختلاف نہیں تھا۔ ہم لوگ جواہرلال جی کی کارکردگی، ایثار، محنت اور سنجیدگیِ خیالات کے قائل تھے۔ اُن سے الگ ہونا ہم ہرگز کسی طرح پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ بھی سمجھتے تھے کہ صوبوں میں کام کرنے والوں اور اثر رکھنے والوں میں شاید ہم لوگ زیادہ زبردست تھے اس لئے وہ بھی ہم کو الگ کرنا یا ہم سے الگ ہونا نہیں چاہتے تھے۔ بات یہ تھی کہ دونوں پارٹیاں باہمی طور پر جذبۂ احترام رکھتی تھیں۔ اور جانتے تھے کہ مُلک کے لئے آپس کا نفاق مفید نہ ہوگا۔ شاید ہم یہ بھی سمجھتے تھے کہ ہم ایک دوسرے کی کمی پوری کرتے تھے ہم یہ بھی سمجھتے تھے کہ چاہے ہم میں کتنا بھی اختلاف رائے ہو، مُلک یہ نہیں برداشت کرے گا کہ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں۔

کانگریس کے اِجلاس کے بعد جب ورکنگ کمیٹی کی تشکیل کا زمانہ آیا تو جواہرلال جی کو کچھ دشواریاں ضرور ہوئیں۔ وہ نئے خیال والے لوگوں کو اُس میں لینا چاہتے تھے۔ ہم بھی اِس کے خلاف نہیں تھے مگر ہم یہ ضرور چاہتے تھے کہ اگر ہم ورکنگ کمیٹی میں رہیں تو اس کی تشکیل ایسی ہو کہ ہماری باتیں بھی سُنی جائیں۔ مہاتما جی نے اِس معاملہ میں جواہرلال جی کو رائے دی کہ وہ جنہیں موزوں سمجھیں سوشلسٹوں میں سے ورکنگ کمیٹی میں لے لیں اور شاید اُنہوں نے اُن کے نام بھی بتائے۔ ہم نے بھی اُسے مان لیا۔ ورکنگ کمیٹی بنی جس میں دو طرح کے خیالات کی رَو تھی۔ اگرچہ ابھی تک طریقِ کار میں فرق نہیں تھا۔ سوشلسٹوں سے جو بھی اختلاف رائے ہو۔ اُس کے سبب سے کام میں خلل نہ پڑتا تھا مگر اُن کی تبلیغی حکمتِ عملی کچھ ایسی تھی کہ ہمیں وہ اچھی نہیں لگتی تھی۔ بہت باتوں میں تو پالسی گاندھی جی نے کانگریس میں سن ۱۹۲۰ء سے ہی چلا رکھی تھی۔ اس کی وہ بالواسطہ یا بلاواسطہ مخالفت کرتے اور ہم پر یہ اثر ہوتا کہ وہ اس سارے پروگرام اور پالسی کو تہس نہس

کرنا چاہتے ہیں جس کو گاندھی جی نے چلایا تھا جس پر کانگریس کام کرتی آرہی تھی اور جس پر چل کر وہ مُلک کو اِتنا آگے لے جا چکے تھے ۔ اِس معاملہ میں جہاں تک میں سمجھتا ہوں جواہر لال جی بھی اُن لوگوں کے ساتھ متفق نہیں تھے کیونکہ بہت سی باتوں میں گاندھی جی سے اختلافِ رائے ہونے پر بھی وہ اُن کی رہنمائی کی اہمیت کو جانتے اور مانتے تھے اُسے کسی طرح کم زور کرنا نہیں چاہتے تھے ۔ یہ بات دوسروں میں نہیں تھی ۔ یہی سبب تھا کہ اختلافِ رائے ہوتے ہوئے بھی ہم جواہر لال جی کے ساتھ کام کر سکتے تھے اور دوسروں کے ساتھ چلنا کٹھن ہو جاتا تھا ۔ بہر حال کانگریس کا اِجلاس ختم ہوا ۔ سب لوگ اپنی جگہوں کے لئے روانہ ہوئے ۔

قومی زبان کا سوال

مجھے لکھنؤ سے ہی ناگپور جانا تھا۔ وہاں آل انڈیا ہندی ساہتیہ سمیلن ہونے والا تھا جس کا میں صدر منتخب ہوا تھا، اور وہ عین کانگریس کے اجلاس کے بعد تین چار دنوں کے بعد ہی ہونے والا تھا۔ اس لیے میں اُس گاڑی میں گیا جس میں مہاتما جی گئے۔ اُن کے ساتھ ہی واردھا گیا اور وہاں سے سمیلن (کانفرنس) کے دن ناگپور آیا۔

واردھا میں بیٹھ کر میں نے تقریر لکھی۔ کچھ دنوں سے اِس بات پر بحث چل رہی تھی کہ ہندی لُغت میں غیر مُلکی زبانوں کے الفاظ کو لینا چاہیے یا نہیں۔ سچ پوچھیے تو سوال کو یہ شکل دینا بھی مناسب نہیں کیونکہ کوئی بھی ہندی کا لکھار، چاہے وہ کتنا ہی غیر مُلکی لفظوں کا مخالف کیوں نہ ہو۔ سبھی غیر مُلکی لفظوں کا بائیکاٹ نہیں کرنا چاہتا اور نہ اپنی تحریروں اور تقریروں میں اُن کا بائیکاٹ کرتا ہے۔ یہ جھگڑا ہندی اور اُردو کا ہے۔ ہندی میں، جیسا اس کا روپ آج ہو گیا ہے اور ہوتا جا رہا ہے سنسکرت کے لفظوں کی بہتات ہوا کرتی ہے۔ دونوں میں بہتیرے اچھے مصنف ہیں جو سادہ اور سہل زبان بھی لکھتے ہیں۔ دونوں میں کچھ ایسے لوگ بھی ہیں جو ہندی کو ہندوؤں کی اور اُردو کو مُسلمانوں

کی زبان مانتے ہیں۔ اِس طرح اس جھگڑے میں کچھ فرقہ بندی بھی آگئی ہے۔ اگرچہ بہت سے مسلمان شاعر اور مصنف ہوئے ہیں جنہوں نے ہندی کی سیوا کی ہے اور اِسی طرح بہت سے ہندوؤں نے اُردو کی خدمت کی ہے۔

کانگریس کے آئین میں جہاں زبان کا ذکر ہے وہاں نہ لفظ ہندی اِستعمال کیا گیا ہے نہ اُردو بلکہ وہاں لفظ "ہندوستانی" ہی استعمال ہوا ہے۔ جب گاندھی جی نے جنوبی ہند میں راشٹر بھاشا (قومی زبان) کا پرچار ۱۹۱۸ء میں شروع کیا تھا۔ تب ہندی ساہتیہ سمیلن کے اہتمام میں ہی آغاز کرایا تھا۔ اُسی زمانے میں وہ اندور میں ساہتیہ سمیلن کے صدر ہوئے تھے۔ کانگریس کے آئین میں ہندوستانی لفظ کا استعمال مہاتما جی اور شری پرشوتم داس ٹنڈن نے ہی کیا تھا۔ اُن کے ہی لفظ کو کانگریس نے مان لیا تھا۔ جنوبی ہند کی جس سبھا کے ذریعے قومی زبان کی تبلیغ کا کام آج بھی لیا جا رہا ہے، اُس کا نام دِکشن بھارت ہندی پرچار سبھا ہے۔ اِس سے ظاہر ہے کہ گاندھی جی نے جب سے یہ کام ہاتھ میں لیا ہے اُنہوں نے ہندی اور اُردو کو دو الگ الگ زبانیں نہیں مانا ہے۔ اگرچہ دونوں کے لغت میں فرق ہے اور یہ فرق روز بروز بڑھتا جا رہا ہے۔ پھر بھی دونوں کی گرامر (دیاکرن یا قواعدِ زبان) ایک ہی ہے جو کسی دوسری زبان سے پوری پوری نہیں ملتی۔ ماہرِ لِسانیات کا کہنا ہے کہ زبان کا اختلاف لُغت سے اِتنا نہیں ہے جتنا لفظوں کی ساخت اور قواعدِ زبان کی رُو سے ہوتا ہے۔ اِس لئے یہ ماننا نامناسب اور اُصولِ لسانیات کے خلاف نہیں ہے کہ ہندی اور اُردو ایک ہی زبان کا نام ہے یا یوں کہیے کہ ایک ہی زبان کی دو طرزیں ہیں۔ جو الگ الگ زبانیں نہیں۔ ہندوستانی ہندی بھی ہے اور اُردو بھی۔ کیونکہ وہ عموماً ثقیل لفظوں کو کام میں نہیں لاتی۔ وہ اپنا رُوپ ایسا رکھتی ہے جسے ہندی والے

اور اُردو والے دونوں ہی اپنا سمجھ سکیں۔

میں اِس نظریہ کا حامی ہوں کہ جس زبان کے لفظوں کا خزانہ جتنا بھرا پورا ہوگا۔ وہ زبان اُتنی ہی زیادہ ترقی یافتہ ہوگی۔ اگر ایک ہی معنی کے کئی الفاظ ہوں گے تو وقت پاکر اُن کے معنی میں تھوڑا بہت فرق ہوتا جائے گا۔ اور اُس میں باریکیاں آتی جائیں گی۔ خیالات کی نزاکت کو ظاہر کرنے کی طاقت ایسی زبان میں زیادہ ہوتی جائے گی۔ جیتی جاگتی زبان، دوسری زبانوں کے رابطہ سے اگر اُس میں قوتِ تحصیل و تحویل ہے تو فائدہ اُٹھاتی جائے گی اور اُس کے لفظوں کا خزانہ بڑھتا جائے گا۔ وہ اِس بات سے ڈر کر گھونگھے کی طرح اپنے خول کے اندر گھُس کر اپنے آپ کو بند نہیں کرلیتی کہ باہر کی ہوا سے یا باہر کے لفظوں سے وہ پِس جائے گی، اور اپنا وجود ہی کھودے گی۔ وہ ہمّت کے ساتھ سرِ عام مقابلے میں آئے گی اور دوسری زبانوں کے اچھے پر از معنویت لفظوں کو اپنے اندر سموے گی۔ ہاں ایسا کرنے میں وہ اپنے قواعد یا شکل کو نہیں بدلے گی۔ اپنی پوشاک اور سجاوٹ کو چاہے بدل کر گوناگوں کرے۔ میں نے اپنی تقریر کا موضوع یہی رکھا اور ادب ہندی کے خدمت گذاروں کے غور و خوض کے لئے یہ سوال پیش کیا۔ میرا کہنا تھا کہ ہندی کو غیر ملکی لفظوں کو لینے میں ہچکنا نہیں چاہیئے، چاہے وہ فارسی یا عربی کے ہوں یا انگریزی کے۔ مگر جو لفظ ہندی میں آئیں اُنہیں ہندی بن جانا چاہیئے یعنی ہندی میں آکر وہ اپنے ساتھ عربی، فارسی، یا انگریزی کے صرف و نحو کو ہندی میں داخل نہ کریں بلکہ وہ ہندی کی قواعد زبان کے اُصولوں کے ماتحت ہوکر رہ جائیں۔ میرا یہی خیال آج بھی ہے۔ اُس وقت سے آج تک اِس بات پر بہت بحث چھڑی رہی ہے مگر میں اپنے خیالات میں زندہ پختہ ہوتا گیا ہوں اور صرف اِن تین زبانوں کے ہی الفاظ نہیں لینے پڑیں گے، ہندی کو قومی زبان بنتے بنتے

بہتیرے دیسی لفظوں کو بھی اپنے میں لے لینا پڑے گا۔ جو صوبائی زبانیں ہیں، اُن کے ذخیرہ الفاظ سے بھی بہت سے لفظ لینے پڑیں گے۔

اِس بارے میں ایک اور بھی اہم سوال ہے جس پر غور کر لینا ضروری ہے کہ کیا آج کی جدید ہندی اور اُردو ایک ہیں، ہو سکتی ہیں؟ قواعدِ زبان ایک ہوتے ہوئے بھی الفاظ میں بہت فرق بڑھتا جا رہا ہے، آج صرف ہندی یا اُردو جاننے والوں کی محفل میں ایسی زبان بولی جا سکتی ہے جسے وہاں کے سامعین نہ سمجھ سکیں۔ ایسی سنسکرت آمیز ہندی جس کو اُردو جاننے والے نہ سمجھ سکیں اور ایسی فارسی، عربی آمیز اُردو جو ہندی والوں کے لئے عام فہم نہ ہو، یہ بھی ممکن ہے، بہت مشکل نہیں ہے کہ ایسی زبان بولی جائے جس کو صرف ہندی جاننے والے یا فقط اُردو جاننے والے اچھی طرح سمجھ جائیں۔ میں اسی کو ہندوستانی یا ہندوستھانی نام دیتا ہوں۔ بڑے بڑے جلسوں کے لئے اور اخباروں کے لئے، قصّے کہانیوں کے لئے اور دل پر اثر کرنے والی شاعری کے لئے بھی اِس طرح کی آسان زبان ہو سکتی ہے اِس میں شبہ نہیں۔ ہاں جب اُونچے درجے کی سائنس کی کتاب لکھنی ہو تو اُس کے لئے بہت سے سائنٹیفک اور توصیفی لفظوں کی ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ایسے لفظ ہمیشہ سہل اور عام فہم نہیں ہو سکتے۔ یہ کبھی بھی زبان میں نہیں ہیں۔ انگریزی ایک ترقی یافتہ زبان سمجھی جاتی ہے اگر انگریزی میں لکھی کوئی سائنس کی کتاب، انگریزی کے اچھے ماہر کو بھی دے دی جائے تو وہ اُسے ٹھیک نہ سمجھ سکے گا۔ کیونکہ اُس میں ہر فقرہ میں اِس طرح کے اصطلاحی لفظ ملیں گے جس کو صرف انگریزی اَدب جاننے والا عام طور پر نہیں جانتا۔ جانتا صرف وہی ہے، جو علم سائنس سے واقف ہے۔ یوں تو اَب، اِس طرح کی کہانیاں اور ایسے ناول بھی لکھے جاتے ہیں جن میں بہت سی کی باتیں رہتی ہیں۔ سائنس کے لفظ آجاتے ہیں۔

اِس وقت اس قسم کی خاص کتابوں پر غور نہیں کر رہا ہوں۔ عام طور پر کسی بھی معمولی انگریزی جاننے والے کے سامنے مادّی سائنس کی یا عِلاج کے متعلق کوئی انگریزی کتاب رکھ دی جائے تو وہ اُسے اکثر ٹھیک نہیں سمجھے گا۔ اگرچہ اس کی قواعد زبان اُس کے لئے آسان ہوگی مگر اُس کے بہت سے الفاظ ایسے ہوں گے جو اُس کے لئے نامانوس سے ہوں گے۔

اِسی طرح اگر ہندی اور اُردو میں اِس قسم کی سائنٹیفک اور فلسفیانہ کتابیں لکھی جائیں تو اُن کی زبان ایک الگ قسم کی ہوگی۔ اِصطلاحی لفظ کسی مہذّب حامل اِصطلاحات زبان سے لئے جا سکتے ہیں یا کسی مہذب یا حاملِ اِصطلاحات زبان کی مدد سے بنائے جا سکتے ہیں۔ وہ زبان چاہے سنسکرت ہو یا عربی۔ انگریزی میں بھی اس قسم کے الفاظ بہتات سے لیٹن (لاطینی) سے ہی بنے ہوئے ہیں۔ یہاں پر میں مانتا ہوں کہ ان سائنٹیفک اور اِصطلاحی لفظوں کے لئے ہم کو سنسکرت یا عربی کی طرف جانا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ یوروپی زبانوں کے بہت سے لفظوں کو جوں کا توں لینا پڑے مگر ہندوستان میں تو اِس قسم کے الفاظ اگر زیادہ تر سنسکرت کے ہی ہوں گے تو اُن کا زیادہ پرچار ہوگا۔ کیونکہ یہاں کی جتنی صوبائی زبانیں ہیں سبھی سنسکرت کے ساتھ گہرا تعلق رکھتی ہیں۔ یہاں تک دکھنی ہندوستان کی زبانیں بھی سنسکرت سے بہت متاثر ہوئی ہیں۔ اگر اُن کو بھی نئے لفظ لینے پڑے جنہیں وہ خود نہیں بنا سکتیں تو وہ سنسکرت سے ہی لینا پسند کریں گی۔ مثال کے طور پر اگر ہم کو جوتش (علم نجوم) کے لفظ لینا پڑے تو وہ علم نجوم کے مقابلہ میں زیادہ سہولت سے ہندی زبان کے صوبوں میں سمجھا جائے گا۔ بنگال، گجرات، مہاراشٹر، تامل، تلیگو، کیرل، پنجاب وغیرہ میں بھی لوگوں کی سمجھ میں آئے گا۔ اِسی سائنس کے لفظ نچھتر اور گرہ کو بھی لوگ سارے ہندوستان میں زیادہ سہولت سے سمجھ لیں گے۔ اِسی لئے میں سمجھتا ہوں کہ اِصطلاحی

لفظوں کے لئے راشٹر بھاشا (قومی زبان) کو چاہے ہم اُسے جس نام سے پکاریں، ہم کو سنسکرت پر ہی انحصار کرنا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ غیر ملکوں سے کچھ لفظ ایسے آگئے ہوں جو رائج ہو گئے ہیں اُن کو ویسے ہی رہنے دینا موزوں بلکہ لازمی ہے۔ لیکن جہاں نئے لفظ بنانے ہوں وہاں سنسکرت کی ہی مدد لینا مناسب اور مفید ہے۔ اِس میں اُردو والوں کا اگر کچھ اِصرار ہو تو وہ اپنے لفظ جیسے چاہیں بنالیں مگر یہ یاد رکھیں کہ اُن کے وہ الفاظ ملک گیر نہ ہوسکیں گے۔ صرف اُردو میں ہی رہ جائیں گے۔ اِس لئے جہاں تک معمولی بول چال اور اخباروں کی زبان کا تعلق ہے، ہم ایسی ہی زبان استعمال میں لاسکتے ہیں جو ہندی اور اُردو دونوں کے لئے قابلِ قبول ہو۔ مگر جہاں اصطلاحی لفظوں کا کام پڑے گا، وہاں دونوں الگ ہوسکتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی ضروری یا لازمی نہیں ہے۔ اور جیسا اُوپر لکھا گیا ہے یہ (اِصطلاحی) لفظ تبھی ہر دل عزیز اور مُلک گیر ہوسکتا ہے جب وہ سنسکرت کی اِمداد سے بنا ہو۔

قومی زبان کا تعلق زیادہ تر روزمرہ سے ہی رہتا ہے۔ اِس لئے جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں وہ ایسی ہونی چاہیے جسے اُردو اور ہندی دونوں ہی اپنا سکیں۔ سائنٹیفک اور فلسفیانہ لفظوں کو، شائد اعلیٰ درجہ کے ادب کی بھی زبان، ہندی اور اُردو میں الگ الگ ہوگی۔ اگر ہم اِس تفریق کو مان لیں تو ہندی اُردو کا جھگڑا بڑی حد تک مٹ سکتا ہے۔ ہم تو سارے ہندوستان میں آپس کے استعمال کے لئے ایک قومی زبان چاہتے ہیں وہ انگریزی نہیں ہوسکتی، وہ ہندی ہی ہوسکتی ہے، چاہے اُسے ہم ہندوستانی کہیں یا ہندی یا اُردو۔ آج کی مروجہ صوبائی زبانوں کی جگہ اُسے نہیں لینی ہے وہ اپنی اپنی جگہ پر جوں کی توں قائم رہ کر صوبائی کام میں اور صوبائی ادب میں مستعمل

ہوتی رہیں گی ۔ ہمیں کُل ہند استعمال کے لئے قومی زبان چاہیئے ۔ اگر اُس کو فارسی اور عربی کے بہت سے نامانوس لفظوں سے بھر کر کٹھن بنا دیں گے بنگال ، آسام ، اُتکل ، آندھر ، تامل کیرل ، کرناٹک ، مہاراشٹر ، گجرات وغیرہ میں مشکل سے دخل پا سکے گی ۔ لہذا اس کو قابلِ قبول بنانے کے لئے جہاں تک ہو سکے ، ان صوبائی زبانوں کے مروج الفاظ کو لے لینا مفید اور معاون ہو گا ۔ ساتھ ہی یہ بھی نہیں بھول سکتے کہ پنجاب ، سرحد اور کچھ مغربی اُتر پردیش کی زبان میں بھی اُردو ، عُنصر غالب ہے ۔ خاص کر پڑھے لکھے مسلمانوں میں ، وہاں فارسی ، عربی کے لفظ زیادہ آسانی سے بولے اور سمجھے جاتے ہیں ۔ قومی زبان ایسے لوگوں کو بھی اپنے دائرے سے باہر نہیں کر سکتی ۔ اِس لئے قومی زبان کو فیاضانہ پالسی اختیار کرنی پڑے گی اور بائیکاٹ کی پالسی چھوڑنی پڑے گی ۔

میں نے خود اپنے دورۂ ہند میں دیکھا ہے کہ مجھے دو طرح کی ہندی بولنی پڑتی ہے ۔ جب میں سرحد اور پنجاب میں گیا ۔ خاص کر ایسے جلسوں میں جہاں مُسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی ، تو میں فارسی آمیز ہندی بول کر ، اپنے خیالات ظاہر کر سکا اور لوگوں کو سمجھا سکا ۔ بنگال ، مہاراشٹر ، وغیرہ اور جنوبی ہند میں بھی ، جہاں کچھ ہندی سمجھی جاتی تھی ، میں سنسکرت آمیز ہندی ہی بول کر اپنا کام کر سکا ۔ میں نہ تو عربی ، فارسی کا عالم ہوں اور نہ سنسکرت کا پنڈت ۔ عربی کا علم تو بالکل نہیں ، فارسی سے کچھ واقفیت ہے ، اور سنسکرت کا بھی علم ، اِسی انداز کا ہے مگر میں دو طرح کی زبانیں ، کچھ کچھ بول سکتا ہوں دو طرح کے سامعین میں میری تقریریں آسانی سے سمجھ لی جاتی ہیں ۔ اِس کا خاص سبب اِن زبانوں اپنی ناواقفیت میں سمجھتا ہوں ۔ اِس لئے میں مانتا ہوں کہ میرے جیسے لوگوں کے لئے ۔ اور ایسے لوگوں کی تعداد ہی زیادہ ہے ، اور رہے گی ۔ ایسی ہی قومی زبان

کا اِستعمال آسان ہے۔ عالموں اور پنڈتوں کے لئے اُس میں زیادہ دِقّت ہے، اور رہے گی۔ کیونکہ جہاں کہیں لفظ کی کمی معلوم ہوئی وہ فوراً سنسکرت یا عربی کا سہارا لیتے ہیں اور میرے جیسے لوگوں کی وہاں رسائی نہیں ہوتی۔ اِس لئے ہم اپنے چھوٹے سے سرمایہ میں سے ہی کام کی چیز تلاش کر کے نکالنے پر مجبور ہوتے ہیں جو زیادہ تر میرے جیسے لوگوں کے لئے زیادہ مانوس ہی ہوگی۔

میں نے یہاں پر قومی بھاشا کے متعلق اپنے خیالات کو تفصیل سے بیان کر دیا، کیونکہ سمّیلن سے اِس کا تعلّق ہے۔ میں نے اسی طرح کے خیالات کو اپنی تقریر میں رکھا۔ سمّیلن قومی زبان کے پرچار کا کام بھی کرتا آیا ہے۔ اس لئے اُسے دو باتوں کا دھیان رکھنا پڑتا ہے۔ ایک طرف اُسے ہندی روپ میں اعلیٰ درجہ کی کتابوں کی تصنیف پر اور دوسری طرف زبان کے پرچار پر بھی نظر رکھنی پڑتی ہے۔ اِن دونوں مقصدوں میں یوں تو اختلاف یا تضاد نہ ہونا چاہیئے۔ مگر کہیں کہیں ہونا غیر ممکن بھی نہیں آگے چل کر سمّیلن کے اندر کچھ اس معاملہ پر اختلافِ رائے بھی ہوا۔ ناگپور میں ہی وہ اختلافِ رائے نظر آنے لگا مگر وہاں کے پروگرام میں کوئی فرق نہیں آیا۔ سمیلن نے قومی زبان کے پرچار کے لئے ایک کمیٹی (راشٹر بھاشا پرچار سمتی) بنادی جس کا صدر میں بنایا گیا۔ سمّیلن میں ایک پرچار سمتی قاعدہ کی رو سے ہوا کرتی ہے۔ ناگپور کے سمّیلن نے محسوس کیا کہ پرچار سمتی ہندی زبان والے صوبوں میں ادب کی تبلیغ کا کام کیا کرے اور قومی زبان کی پرچار سمتی اُن صوبوں میں قومی زبان کا پرچار کرے جہاں کی زبان ہندی نہیں ہے۔ جنوبی ہند میں آندھر، تامل کیرل اور کرناٹک میں۔ دکھن بھارت پرچار سبھا بہت اچھّا کام کرتی آرہی ہے اور اُس کے ذریعے پرچار کا کام خوب زوروں سے چلایا گیا ہے۔ مگر دوسرے غیر ہندی صوبوں

میں یہ تبلیغی تنظیم نہیں ہوئی تھی۔ اِس لئے گجرات، مہاراشٹر، بنگال، آسام اُتکل وغیرہ صوبوں میں پرچار کے کام کرنے کا بار اس راشٹر بھاشا پرچار سمتی کو سونپا گیا۔ میں اِس کا صدر تو بنا مگر اِس کی رہنمائی کا کام گاندھی جی نے لے لیا اور رقم جمع کرنے کا کام سیٹھ جمنا لال بجاج نے۔ اِس میں سمیلن کے کئی خاص اشخاص شری پرشوتم داس ٹنڈن۔ پنڈت وِدیا شنکر دوبے، ڈاکٹر بابو رام سکسینہ وغیرہ، ممبر بنائے گئے۔ کچھ غیر ہندی صوبوں کے نمائندوں کے روپ میں وہیں کے ہندی پریمی شامل کئے گئے۔ یہ سمتی تین سال کے لئے بنائی گئی تھی۔ مگر وہ تین سال گزرنے پر پھر مقرر کر دی گئی ۱۹۳۶ء سے ۱۹۴۲ء تک، اِن چھ برسوں میں اِس سمتی نے غیر ہندی صوبوں میں خاص کر گجرات مہاراشٹر، مدھیہ پردیش کے مرہٹی ضلعوں، اُتکل اور آسام میں بہت کام کیا۔ طالب علموں کے لئے کتابیں لکھوائیں، اِمتحان لئے۔ ہزاروں کی تعداد میں طلبا نے امتحان دئے اور پاس بھی ہوئے۔ سیٹھ پدم پت سنگھانیہ نے پانچ برسوں تک پندرہ ہزار روپیے سالانہ۔ کل پچھتر ہزار روپئے کا دان دے کر اِس کی مالی دشواری کو بہت کچھ دُور کر دیا۔ شری کاکا کالیلکر۔ شری ستیہ نارائن شریمن نارائن اور دادا دھرما دھیکاری نے محنت اور جوش سے گاندھی جی کے سایۂ عاطفت میں اُسے ایک جامع مؤثر بلند مرتبہ کامیاب جماعت بنا دیا۔

ناگپور میں ایک اور سمیلن ہوا۔ گاندھی جی نے دیکھا کہ ہندی اُردو کا آپس کا جھگڑا بڑھتا جا رہا ہے۔ وہ چاہتے تھے کہ اِن دونوں کی ہم آہنگی کی کوشش کی جائے اِس کے لئے ایک ایسی انجمن کی ضرورت تھی جس میں دونوں زبانوں کے عالم شریک ہوں اور جو بغیر کسی کھینچ تان کے صرف زبان کی ترقی کے مقصد سے کام کریں۔ اُنہوں نے اِس میں سری کنھیالال منشی کو، جو گجراتی ادیبوں میں بہت اُونچا درجہ رکھتے ہیں۔ لگانا چاہا۔

منشی پریم چند اور مولوی عبدالحق صاحب سے بھی مدد لینی چاہی۔ اِس انجمن (راشٹر بھاشا پریشد) کا اِجلاس ناگپور میں ہی کیا گیا۔ مندرجۂ بالا اصحاب اور دوسرے لوگ مدعو کئے گئے اِس جلسہ میں مولوی عبدالحق صاحب سے اختلافِ رائے ہو گیا۔ اُنہوں نے جلسہ کے بعد کچھ ایسے مضمون لکھے جن میں گاندھی جی پر بھدّا حملہ کیا گیا۔ اِس لئے یہ پریشد، مسلمانوں کی اِمداد حاصل نہ کر سکی۔ مگر منشی پریم چند اور شری کنھیا لال منشی نے، کاشی کے ہندی ماہنامہ "ہنس" کو پریشد کی طرف سے کچھ دِنوں تک چلایا۔ افسوس کہ منشی پریم چند تھوڑے ہی دِنوں کے بعد رِحلت فرما گئے۔ پریشد بہت دنوں تک زندہ نہ رہ سکی۔

صوبائی اسمبلیوں کا چُناؤ

۱۹۳۶ء کا سال نئے آئین کے مطابق ۱۹۳۷ء میں ہونے والے صوبائی اسمبلیوں کے چناؤ کی تیاریوں میں گزرا۔ لکھنؤ میں طے ہو چکا تھا کہ کانگریس اپنی طرف سے اُمیدوار کھڑے کرے اور چُناؤ لڑے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اِس نئے آئین کے مطابق کروڑوں ووٹر چناؤ میں حصّہ لے سکیں۔ اِن کروڑوں ووٹروں کو اِس طرح منظّم کرنا کہ وہ سبھی کانگریس کے اُمیدواروں کو ووٹ دیں کوئی آسان کام نہیں تھا۔ کانگریس ۱۹۳۵-۳۶ء میں پھر منظّم ہو گئی تھی۔ ۱۹۳۴ء میں وہ مرکزی اسمبلی کے لئے چُناؤ لڑ چکی تھی۔ اُس میں بڑی حد تک کامیابی بھی حاصل کر چکی تھی۔ مگر اِس انتخاب کے مقابلے میں یہ انتخاب کہیں زیادہ بسیط تھا۔ اُس میں تقریباً سو ممبروں کی چناؤ کی بات تھی۔ اِس میں تقریباً دو ہزار جگہوں کے لئے آدمی منتخب کرانے تھے۔ اِس میں خرچ بھی بہت پڑنے والا تھا۔ اُمیدواروں کو نامزد کرنا بھی کوئی آسان کام نہ تھا۔

سب سے پہلا کام تھا ایک ایسا منشور تیار کرنا جو کانگریس کی طرف سے ووٹروں کے سامنے رکھا جائے، اور جس کو پورا کرنے کے لئے اُن سے ووٹ مانگا جائے۔ کانگریس

کی تجویزوں اور اِس طرح کے اِعلانوں کا مسودہ پہلے مہاتما جی تیار کیا کرتے تھے۔ اِدھر جب سے پنڈت جواہر لال جی صدر ہوئے یہ کام زیادہ تر اُنہیں کو کرنا پڑتا تھا۔ اُنہوں نے دِل پھڑ کانے والی زبان میں ایک بہت بڑا منشور تیار کیا۔ آل انڈیا کمیٹی نے اُسے منظور کر لیا۔

ہمارے سامنے ایک دِقت تھی۔ کانگریس نے ابھی تک یہ طے نہیں کیا تھا کہ وہ اپنے ممبروں کو وزارت میں شریک ہونے دے گی یا نہیں۔ کچھ لوگ چاہتے تھے کہ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں بنیں اور جو کچھ بھی حقوق آئین کی رو سے ملے ہیں اُن کا وہ استعمال کریں۔ دوسرے لوگ ایسے تھے جو چاہتے تھے کہ کانگریسی صرف خلل انداز پالسی سے ہی کام لیں۔ نہ وزارت بنائیں نہ بننے دیں۔ اگر وہ بن بھی جائیں تو اُن کے کاموں میں رخنہ اندازی کرتے رہیں۔ کانگرس نے آئین نامنظور کر دیا تھا مگر ساتھ ہی چناؤ میں حِصّہ لینے کی اِجازت دی تھی، ہاں یہ نہیں بتایا تھا کہ چُنے جانے کے بعد ممبر کیا کریں گے۔ اِس لئے اس منشور میں یہ صاف نہیں کہا جا سکتا تھا کہ ہم وزارت بنائیں گے اور وہاں رہ کر فلاں فلاں کام کریں گے۔ اُس میں یہ بھی کہنا مشکل تھا کہ ہم وہاں کچھ نہیں کریں گے اور نہ کسی کو کچھ کرنے دیں گے۔ اُس میں بڑی ہوشیاری سے ایسی باتیں کہی گئی تھیں جو کراچی کانگریس میں اپنے بنیادی اور اقتصادی حقوق والی قرارداد میں منظور کی گئیں تھیں۔ ایسا کرنے سے، بغیر اس بات کا وعدہ کئے کہ ہم وزارت قبول کریں گے یا نہیں۔ کونسل کے لئے پروگرام بنا دیا گیا۔ یہ اِعلان سارے مُلک کے لئے تھا۔ اِس کے مطابق سبھی کانگریسی ممبر چاہے وہ جس صوبے میں ہوں، کام کریں گے، اِس کے علاوہ صوبائی کمیٹیوں کو حق دیا گیا کہ وہ اپنی اپنی جماعت کے مطابق، اگر وہاں کے لئے کوئی منشور نکالنا چاہیں تو نکال سکتی ہیں۔

اِس منشور میں زیادہ تر کسانوں کی حالت سُدھارنے کی بات کی گئی تھی۔ اُن کے

لئے لگان قانون میں ترمیم کر کے اُن کو اپنی اِسی زمین جسے وہ جوتتے بوتے ہیں مستقل حق دینے کی بات تھی، لگان کم کرنے پر بھی زور تھا۔ مزدوروں کی حالت سدھارنے کا وعدہ تھا اُن کی نوکری مستقل بنا کر، اُن کے رہن سہن کا معقول تدارک کرا کر اور اُن کی مزدوری میں ترقی دلا کر ساتھ ہی مزدور جماعتوں کو قائم اور منظّم کرنے کے حقوق دِلوانے اور دوسرے طریقے سے اُن کی حالت سدھارنے کی بات بھی کہی گئی تھی۔ ملک میں نشہ بندی کرانے کا وعدہ تھا یعنی اُس میں وہ سب باتیں تھیں جو کوئی بھی ہر دل عزیز وزارت کر سکتی ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ اگر ہم نے وزارت لی تو یہ سب کام کریں گے ہی لیکن اگر نہ بھی کیا تو اس طرح کی باتیں جو بھی وزارت ہو اس کے ذریعے کرا سکیں گے اور کرائیں گے۔

دوسرا مشکل کام تھا۔ اِتنے زیادہ اُمیدواروں کو چھانٹنا۔ ظاہر ہے کہ یہ کام آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی سارے ملک کے لئے کر نہیں سکتی تھی۔ ایک تو اس کے پاس اِتنا مسالہ نہ ہوگا کہ اگر وہ خود اِس بات پر غور کرنے بیٹھے کہ دو اُمیدواروں میں سے کس کو کانگریس کا ٹکٹ دینا چاہیئے تو اس کا فیصلہ کر سکے۔ اس کو خواہ مخواہ صوبائی اسمبلیوں یا اُن کی انتظامیہ کمیٹیوں پر ہی زیادہ بھروسہ کرنا پڑتا تو بھی یہ ظاہر تھا کہ کسِ کسِ مقامی کمیٹیوں میں پارٹی بندی تھی اور ہو سکتا ہے کہ اس کی وجہ سے کسی اُمیدوار کے ساتھ بے انصافی ہو جائے یا ایسا امیدوار چن لیا جائے جو عوام کے سامنے جواب دہ یا کامیاب نہ ہو سکے۔ کہیں کہیں یہ صوبائی کمیٹیاں چاہتی بھی تھیں کہ آخر فیصلہ آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ہاتھوں میں ہی رہے تو اچھا ہوگا۔ اسی لئے یہ طے ہوا کہ آخری فیصلہ آل انڈیا کمیٹی ہی کرے گی۔ مگر ورکنگ کمیٹی نے بھی اس کام کے لئے اپنے سبھی ممبروں کو یک جا کرنا مشکل سمجھا۔ اِس لئے اُس نے تین ممبروں کی ایک پارلیمنٹری کمیٹی

بنادی جس کے ذمہ یہ سب کام سپرد کر دیا گیا۔ اس پارلیمنٹری کمیٹی کے صدر بنائے گئے۔ سردار پٹیل اِس کے ممبر ہوئے مولانا ابوالکلام آزاد اور میں۔ جب الکشن کا وقت قریب آیا تب تجربے سے پتہ چلا کہ اِن ممبروں کا بھی ہمیشہ مل کر کسی بات کا فیصلہ کرنا وقت کی کمی اور ایک دوسرے کی دُوری کی وجہ سے ناممکن ہو جاتا تھا۔ اگر ساری ورکنگ کمیٹی کے ذمے یہ کام رہتا تو شاید اُسے مہینوں ایک ہی جگہ پر بیٹھے رہنا پڑتا۔ شروع میں مجھے بمبئی میں کچھ دنوں تک اس کمیٹی کے کام سے رہنا پڑا تھا مگر وہاں کی آب وہوا کی ناموافقت کی وجہ سے میں برسات میں وہاں نہ رہ سکا۔ ہم تینوں ہی اپنی اپنی جگہ کام کرنے لگے۔

ممبروں کی نامزدگی صوبائی کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی ہی کرتی تھی مگر وہ اپنے دل سے منظور کئے گئے سبھی ناموں کو پارلیمنٹری کے پاس بھیج دیتی کوئی آدمی جو صوبائی فیصلہ سے ناراض ہوکر پارلیمنٹری کمیٹی کے پاس اپیل کر سکتا تھا اور اس بارے میں سبھی کاغذ نیز رپورٹ وغیرہ محرم سے اس کے پاس جاتے تھے۔ جن جگہوں کے متعلق کوئی بھی اپیل یا ناراضی نہ ہوتی وہ بے تامّل صوبائی کمیٹی کے فیصلہ کے مطابق رہ جائے۔ مگر جس کے متعلق اپیل ہوتی، پارلیمنٹری کمیٹی اس کی جانچ کرتی۔ اگر ضرورت پڑتی تو اس کے ممبر اُس جگہ جا کر وہاں کے لوگوں سے مل کر نہ اُن سے دریافت کرنے کے بعد آخری فیصلہ کر دیتے۔ یہ کام آسان نہیں تھا، مگر اطمینان کی بات ہے کہ بہت کم فیصلوں کے متعلق پارلیمنٹری کمیٹی تک اپیل پہنچی۔ جو اپیل پہنچی بھی اُن میں سے بہت سوں کا بٹوارہ لکھا پڑھی کر کے سب کی رضامندی سے ہو گیا۔ تھوڑی ہی ایسی جگہیں تھیں جن کے کسی آدمی یا پارٹی کے خلاف فیصلہ دینا پڑا۔

چُناؤ کے معاملہ میں دو باتیں خاص تھیں۔ ایک تو یہ کہ مقررہ اُمیدوار کانگریس کے پروگرام کے مطابق ٹھیک سچائی اور ایمان داری سے کام کرے گا یا نہیں، دوسرے

یہ کہ اُس کے منتخب ہونے کی پوری اُمید ہے یا نہیں، ایک تیسری بات اور تھی جو اِن دو باتوں کے مقابلے میں ثانوی سمجھی جا سکتی ہے مگر بجائے خود کافی اہمیّت رکھتی تھی وہ یہ کہ اُمیدوار چناؤ کے لیے ضروری خرچ خود کر سکے گا یا نہیں اور اگر نہیں تو اس کے لئے پارلیمنٹری کمیٹی کو کیا مدد دینی پڑے گی۔ پہلی بات کا فیصلہ اُمیدواری کی سابقہ خدمات اور کانگریس کے ساتھ اُس کے تعلق اور اس کی کارروائیوں پر غور کر کے ہو سکتا تھا دوسری بات کا فیصلہ عوام میں اُس کی ہردل عزیزی پر منحصر تھا مگر اس وقت ہردل عزیزی کے بہت سے اسباب ہو سکتے تھے کوئی آدمی کانگریس کے ذریعے خدمت کی وجہ سے بہت مقبول عام ہے اور کوئی کسی خاص حلقہ میں دوسری قسم کی خدمتوں کی وجہ سے ہردل عزیز ہو گیا ہے۔ کوئی میدان ایسا تھا جہاں کسی خاص ذات یا سماج کے لوگوں کی اکثریت تھی، وہاں خدمت کے سوا، اِس خاص ذات یا سماج کا آدمی ہونا ہی ہردل عزیزی کا ــــ نجی ووٹ بنانے کی شکتی کا ــــ سبب ہو سکتا تھا۔ کوئی ایسا حلقہ ہو سکتا تھا جہاں زیادہ کام نہیں ہوا ہے اور جہاں کانگریس کا اثر بہت نہیں ہے وہاں اور وجہوں سے ہی اُمیدوار کے چُنے جانے کی اُمید ہو سکتی تھی۔ اِن سبھی باتوں کا فیصلہ زیادہ تر صوبائی کمیٹیاں ہی کر سکتی تھیں۔ اِسی لئے اُن کی ہی باتیں قابلِ قبول ہوتیں سب سے بڑی دشواری وہاں پڑتی جہاں کانگریس کے دو خدمت گزار اُمیدوار ہو جاتے اور اُن میں سے کوئی ہٹنے کو تیار نہ ہوتا۔ خدمت کے خیال سے دونوں میں اِمتیاز کرنا غیر ممکن نہیں تو مشکل ضرور ہوتا۔ عوام میں بھی دونوں کے لئے محبّت اور عقیدت ہوتی۔ ایسی حالت میں کسی ایک کو ناراض کر کے ہی فیصلہ دینا پڑتا۔ پہلے کا سوال بھی کچھ ہلکا نہ تھا۔ دو ہزار نشستوں کے لئے انتخاب کا خرچ بہت پڑتا۔

تھوڑا تھوڑا بھی خرچ پڑے تو بہت ہو جاتا ہے مقابلہ کے سبب سے بھی خرچ کچھ بڑھ سکتا ہے۔ اگر مخالف امیدوار محنتی ہو اور زیادہ خرچ کرنے پر آمادہ ہو گیا تو اپنی طرف سے خرچ کی رقم بڑھا دینی پڑتی ہے۔ کیونکہ مخالف کے پروپگنڈا کا ردِ عمل کرنا ضروری ہے۔

اِس بات کا اطمینان ہے کہ اِن سب دشواریوں کو پارلیمنٹری کمیٹی سردار ولبھ بھائی پٹیل کی رہنمائی میں حل کر سکتی۔ مجھے کل ہند انتخابات کے سوا اپنے صوبے کا کام بھی دیکھنا تھا۔ میں جب سے کانگریس کا صدر ہوا تھا صوبے میں کانگریس کا کام کچھ بھی نہیں کر سکتا تھا۔ تقریباً پانچ چھ سال سے میرا اور صوبے کا تعلق بہت کم ہو گیا تھا۔ شاید میں اِس سال صوبہ کمیٹی کا صدر بھی چنا گیا تھا۔ اِسی لئے صوبے کے امیدواروں کے چناؤ میں مجھے بہت وقت دینا پڑا۔ اور بہت تکلیف بھی اُٹھانی پڑی۔

ہمارے صوبے میں ایک اور بات ہے جو اکثر دوسرے صوبوں میں شاید زیادہ تر نہیں دیکھی جاتی۔ ضلع کمیٹیاں زیادہ تر فیصلہ صوبائی ورکنگ کمیٹی پر ہی چھوڑنا چاہتی تھیں کیونکہ وہ سمجھتی تھیں کہ اگر وہ فیصلہ کریں گی تو آپس میں اختلاف بڑھ جائے گا اور اِس لئے انتخاب میں دشواریاں بھی بڑھ جائیں گی مگر صوبائی ورکنگ کمیٹی کے لئے فیصلہ دینا آسان نہیں تھا کیونکہ وہ بھی مقامی حالات سے زیادہ واقف نہ تھیں۔ تو بھی میں سمجھتا ہوں کہ صوبائی ورکنگ کمیٹی کے ذِمّہ یہ کام چھوڑنا اچھا نہیں ہوا۔ اِس کے تقریباً سبھی فیصلے اِتّفاقِ رائے سے ہوئے۔ کچھ میں اختلاف ہوا اور کبھی کبھی یہ اختلاف شدید بھی ہو گیا۔ مگر آخر میں سبھی باتیں سب کی رائے سے طے ہو سکیں۔ مجھے کئی فیصلوں کے متعلق بڑی سختی سے اپنے کو ہٹانا پڑا، مگر میں نے اپنی ذاتی خیالوں کو جن کا تعلق افراد سے ہی تھا دبا دیا اور کمیٹی کی کثرتِ رائے کو ہی مان لیا، جہاں تک مجھے یاد ہے، میں نے

کبھی یہ نوبت بھی نہ آنے دی کہ میری وجہ سے کسی نام کے متعلق رائے لینے کی ضرورت پڑے ہاں جہاں ضرورت ہوتی اپنی رائے بتا دیتا۔ مگر اس کو لگی بندھی زبان میں بتاتا جس میں تلخی نہ آنے پائے۔ بہر حال صوبے کے اُمیدواروں کی نامزدگی ایک طریقے سے ہوگئی۔

صوبے میں ہم نے اس بات پر زور دیا کہ ایسے ہی لوگ زیادہ تر لئے جائیں جو کانگریس کے عملی خادم ہیں۔ ایک تو ایسے ہی لوگوں پر زیادہ بھروسہ کیا جا سکتا تھا۔ کیونکہ اُنھوں نے اپنے کام سے اپنی معتمدی کا ثبوت دے دیا تھا اور اُن سے اُمید بھی تھی کہ کانگریس کی جیسی ہدایت ہوگی ویسا ہی وہ کریں گے مگر کس کس حالات نے اُس کے لئے بھی مجبور کیا کہ ایسے لوگ بھی لئے جائیں جو کانگریس کے ساتھ ہمدردی تو رکھتے تھے اور جنہوں نے اس کی خدمت بھی کچھ کی تھی۔ مگر جو کارکنوں میں نہیں سمجھے جا سکتے تھے۔ یہ مقامی دشواریوں کی وجہ سے ـــــ اور کہیں فیصلہ کے خیال سے بھی کرنا پڑا۔

ایک خاص بات ہمارے صوبے میں تھی جہاں پر کسان سبھا کام کرتی آ رہی تھی اس کی ۱۹۳۳-۳۴ء میں سوامی سہجانند سرسوتی کی رہنمائی میں حوصلہ افزائی کی گئی۔ ان تین چار برسوں میں وہ کہیں کہیں گیا اور پٹنہ کے ضلع میں بالخصوص ـــــ عوام میں زور وں سے کام کر سکی تھی۔ کانگریس اور کسان سبھا کا اختلاف نہیں تھا۔ دونوں کے بے شمار بااثر کارکن ایک ہی تھے۔ جہاں جیسی ضرورت پڑتی، کانگریس اُن کی مدد بھی کرتی تھی جب انتخاب کے لئے اُمیدوار نامزد کئے جانے لگے تو سوامی سہجانند جو صوبائی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے۔ کچھ ایسے لوگوں کے لئے جانے پر اصرار کرنے لگے جو کسان سبھا سے زیادہ تعلق رکھتے تھے اور ممبروں کا ایسے لوگوں سے کوئی خاص اختلاف نہیں تھا۔ مگر کہیں کہیں ایسا موقع آیا کہ کسان سبھا کے کارکنوں اور کانگریس میں ہی مقابلہ ہو گیا تو بھی صوبائی ورکنگ کمیٹی

نے معاملہ سنبھال لیا۔ آخر میں جو باتیں طے ہوئیں وہ ایسی ہوئیں کہ انہیں سب لوگوں نے پسند کیا اور منظور کیا۔

ایک اور بات ہے جس کا ذکر ضروری ہے ۔ اُمیدواروں کے چناؤ میں ہمیں اس بات پر بھی دھیان رکھنا پڑتا تھا کہ کون اُمیدوار کس ذات کا ہے ۔ کانگریس کے لئے یہ کوئی اطمینان کی بات نہیں تھی ۔ مگر حالات کی وجہ سے ہم اس سے اپنے کو الگ نہیں رکھ سکے ۔ اس صوبہ کے لئے یہ دُکھ اور شرم کی بات ہے کہ ہم اس نامزدگی میں ذات پات کو ایک دم بھول نہ سکیں اور ہمیں یہ سوچنا پڑا کہ فلاں علاقہ میں فلاں ذات کے اُمیدوار کے چُنے جانے کا زیادہ امکان ہے اور یہ بھی دیکھنا پڑا تھا کہ اگر فلاں اُمیدوار کو ہم نہیں نامزد کرتے تو اُس کا اثر اُس ذات کے لوگوں پر تو بُرا اثر پڑے گا ہی ۔ چناؤ کے لئے بھی برا ہوگا ۔ ہم کو یہ بھی سوچنا پڑتا تھا کہ جتنے اُمیدوار نامزد کئے گئے ہیں ، اُن میں سبھی ذاتوں کے اُمیدوار لئے گئے یا نہیں ، اگر لئے گئے تو اتنی تعداد میں لئے گئے یا نہیں کہ ہم اس ذات کے لوگوں کو مطمئن کر سکیں ۔ یہ باتیں قومی جماعت کے لئے شایانِ شان نہیں مگر ہم کو چناؤ بھی جیتنا تھا اور ساتھ ہی ہم کو اس بات کا اطمینان بھی تھا کہ سبھی ذاتوں کے کانگریسی کارکن ایسے آئے موجود تھے اُن کو کانگریس کے نظریہ حساب سے چُن بھی سکتے تھے۔ اِسی لئے کسی کے چُننے میں ہمیں زیادہ چوٹ بھی نہیں لگی کیونکہ جن کو ہم نامزد کرتے وہ اکثر دوسرے اِعتبار سے بھی موزوں ہوتے ۔ مگر اُصولی اِعتبار سے اِس خیال کا آنے دینا ہی ٹھیک نہ تھا۔

پونہ میں جو سمجھوتہ ذات جاتیوں (ہریجنوں) کے ساتھ ہوا تھا اس میں یہ طے ہوا تھا کہ ہریجنوں کے قاعدے کی رو سے مخلوط نشستوں کے لئے ایک اِبتدائی چُناؤ ہو جس میں صرف ہریجن ہی حصّہ لیں ۔ اِس اِنتخاب میں اگر چار یا اس سے کم ہریجن اُمیدوار

ہوئے تو ووٹ لینے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ سب کے سب نامزد سمجھے جائیں گے۔ اگر اس سے زیادہ ہوئے تو صرف ہریجن لوگ ووٹ دے کر چن لیں گے۔ پھر دوسرے چناؤ میں ہریجن اور دوسرے سبھی لوگ ووٹ دیں گے جو سب سے زیادہ ووٹ لے گا، وہی چُنا جائے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو آخری چناؤ میں حصّہ لینے کا موقع ملتا تھا مگر وہ جسے چاہیں اسے نہیں چُن سکتے تھے۔ وہ اُنہیں چار میں سے ایک کو ووٹ دے سکتے تھے جن کو ہریجنوں نے پہلے چناؤ میں چن لیا ہو۔ اس سمجھوتے کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ ہریجنوں کو دوبار ووٹ دینے کا حق مِل جاتا تھا۔ ساتھ ہی ہریجن اُمیدواروں کو ایک بار صرف ہریجن ووٹروں میں اور دوسری بار ہریجن ووٹروں اور اعلیٰ ذات کے ووٹروں میں پرچار کرنا پڑتا تو آسان نہ تھا۔ کیونکہ اس میں خرچ بہت پڑتا تھا۔ اس صوبے میں ہریجنوں کی سولہ ۱۶ نشستیں تھیں۔ ہم نے کوشش کی کہ اِن سبھی جگہوں پر کانگریس اُمیدوار کھڑے کئے جائیں اور وہی جیتیں بھی۔ اسی لئے جو اُن کے خاص کام کرنے والے اور بااثر لوگ تھے اُن سے رائے لے کر ہی ہم نے اپنے ہریجن اُمیدوار کھڑے کئے۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس کو ایسے ہریجن مِل گئے جو اُن کے دستور کے مطابق کام کرنا چاہتے تھے۔ ہریجنوں نے بھی اُنہیں پسند کیا کیونکہ وہ اُن کی رائے سے ہی چُنے گئے تھے۔ اس میں خرچ بہت کم ہوگیا۔ کیونکہ زیادہ تر مقامات پر صرف ایک ہی ہریجن اُمیدوار کھڑا ہوا جو پہلے چناؤ میں بِلامقابلہ چنا گیا اور دوسرے چناؤ میں ایک ہی اُمیدوار ہونے کے سبب سے اُس کے نام پر ووٹ لینے دینے کی بات ہی نہیں رہی تھی۔ ہاں چند نشستیں ایسی تھیں جہاں چُناؤ لڑنا پڑا مگر آخر میں سولہ ۱۶ میں پندرہ نشستیں کانگریسی اُمیدواروں کو ہی مِلیں اور صوبوں میں یہ اِتنی خوبی سے نہ ہوسکا۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ ہریجنوں کی ایک سے

زیادہ پارٹیاں ہوگئیں۔ کچھ کانگریس کے ساتھ کچھ کانگریس کے خلاف اس مخالفت کی وجہ سے ہریجنوں کو کانگریس کے ساتھ رقابت بھی ہوگئی۔ ہم سب اِن دشواریوں سے بچ گئے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہاں اُن میں تعلیم کی بہت کمی ہے، اسی لئے اُن میں ایسے لوگ بہت نہیں تھے جو اپنی اپنی عظمت کی خواہش کے لئے الگ تنظیم ضروری سمجھتے۔

نامزدگی ہو جانے کے بعد سارے ملک میں پرچار کا کام منظم کرنا ضروری تھا۔ اس کے لئے رقم جمع کرنے کا کام بھی پارلیمنٹری کے ہی ذمّہ تھا۔ یہ کام خاص کر سردار ولبھ بھائی پٹیل نے ہی کیا۔ ضرورت کے مطابق صوبائی کمیٹیوں کو مدد دی گئی۔ صوبائی کمیٹیوں نے حتّی المقدور الگ الگ اپنا انتظام کیا تھا۔

کانگریس کا منشور اور کانگریس کے متعلق دوسرا لٹریچر چھاپ کر بانٹنا بھی ضروری تھا۔ وہ صرف چناؤ کے لئے ہی نہیں عوام کی تعلیم اور واقفیت بڑھانے کے لئے بھی۔ اس کی بھی ضرورت تھی کہ فقط جلسوں کے ذریعے ہی پرچار نہ کیا جائے۔ ووٹ کے لئے ہر ایک ووٹر تک بھی کہیں کہیں پہنچنا بہت ضروری تھا، خاص کر جہاں کوئی زبردست مقابل تھا۔ آج کل کے چناؤ موٹر کے بغیر تو ہو ہی نہیں سکتے۔ کیونکہ بغیر تیز سواری کے سبھی جگہوں میں پہنچنا غیر ممکن سا ہے۔ میرا قیاس ہے کہ بہار میں خرچ بہت زیادہ نہیں پڑا اور ہم نے اپنا کام کفایت سے چلایا۔ پھر بھی یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ ہم نے چاہے جتنا بھی کم خرچ کیا۔ گاندھی جی کے معیار سے تو بہت نیچے ہی رہے۔

گاندھی جی کا خیال تو یہ تھا کہ کانگریس پر لوگوں کا اِتنا اِعتماد ہونا چاہئے۔ یہ اعتماد اپنی بے لوث خدمت کے ذریعہ ہی حاصل کر سکتی ہے اور اس کے اُمیدوار

ایسے سچے اور ہر دلعزیز خادم ہونے چاہئیں کہ کانگریس کو اپنی طرف سے صرف منشور چھاپ کر تقسیم کر دینا اور اپنے اُمیدوار کا نام شائع کر دینا ہی کافی ہو۔ عوام میں اِتنا جوش ہونا چاہیئے کہ وہ بغیر کسی تحریک و ترغیب کے ٹھیک وقت پر اپنا ووٹ کانگریس کے اُمیدواروں کے حق میں دے دے۔ بالفاظ دیگر انتخاب کے وقت پرچار اتنا ضروری نہیں جتنا عوام کے درمیان ہمیشہ رہ کر اُس کی خدمت کرنا عوام کی خدمت ہی پرچار کا سب سے زیادہ قوی وسیلہ ہونا چاہیئے۔

بات تو ٹھیک ہے مگر ابھی ہم نے اتنی خدمت نہیں کی ہے جس حد تک ہماری خدمت پہنچی ہے۔ اسی حد تک ہم لوگ مقبول ہو سکے ہیں اور اسی تناسب سے چُناؤ میں ہمیں کم دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ پچھلے بیس برسوں کی خدمت بے کار نہیں گئی ہے۔ مگر اسے زیادہ وسیع اور مستقل ہونا چاہیئے۔ اِس میں جہاں خود غرضی کا جُزو آتا جائے گا ہماری دشواریاں بڑھتی جائیں گی۔

یہ افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ چُناؤ کے تجربوں نے مجھے یہ بات ماننے پر مجبور کر دیا ہے کہ بہتیرے کانگریسی کارکن اِتنی خِدمتوں کی قیمت لگانے لگے ہیں۔ اِس کے بدلے میں کُچھ نہ کچھ تلاش کرنے لگے ہیں۔ چاہے وہ اسمبلی یا کونسل کی ممبری ہو۔ خواہ ضلع بورڈ یا مینوسپلٹی کی ممبری یا کوئی دوسرا عقدہ چاہیے اور کچھ نہ ہو تو کانگریس کمیٹی کے اندر ہی کوئی عزّت و حقیقت کی جگہ ہو۔ اِس میں کوئی شک نہیں کہ ان جگہوں پر جا کر اِنسان خدمت کر سکتا ہے۔ کہیں کہیں تو خدمت کی طاقت بڑھ ہی جاتی ہے۔ اگر اِس جذبے سے اُن عہدوں یا نشستوں کی خواہش کی جائے تو ٹھیک ہے کون کہہ سکتا ہے کہ اِس خواہش میں جذبۂ خدمت غالب ہے یا اپنی وقعت بڑھانے کا یہ تو شائد

انسان کا دِل بھی ٹھیک نہیں بتا سکتا۔ کیونکہ وہ اپنے کو اکثر ایسے معاملوں میں دھوکہ دے دیتا ہے اور اس طرح انسان اپنے دِل کو ہی سمجھا لیتا ہے کہ وہ خواہشِ عظمت سے متاثر نہ ہو کر خدمت کے لئے ہی آرزو مند ہے۔

گاندھی جی نے ایک موقع پر کہا تھا کہ جو آدمی کانگریس کی صدارت کے لئے خواہش مند ہو اُسے صدر نہیں بنانا چاہیئے۔ جو اُسے عزت کے لئے نہیں خدمت کے لئے قبول کرتا ہے وہ اِس کے لئے خواہش نہیں کرتا۔ وقت آنے پر اُسے بسروچشم قبول کر لیتا ہے۔ یہی بات اُن سبھی جگہوں کے لئے ہونی چاہیئے۔ جن کے لئے عوام چُن کر خدمت گُزار مقرر کرتی ہے مگر آج کا مروّجہ چلن اُن سے ہے کہ "ثنائے خود بہ دہن خود" کا مضمون ہے۔ جذبۂ فطری کی جگہ خواہش عظمت لیتی ہے ہم اِن جگہوں کو اپنی زندگی میں اپنے لئے ترقی کا وسیلہ مانتے ہیں اور دُنیا کی دوڑ میں اُنہیں اپنے کو آگے بڑھانے کا ایک ذریعہ سمجھتے ہیں۔ یہ ہماری تہذیب و تمدن کے خلاف ہے۔ مگر آج کے مغربی خیالات کے تو مطابق ہی ہے۔ آج اِس سے بچنا مشکل ہو گیا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے سامنے آج یہ نصب العین رکھنے میں بھی جھجھک ہوتی ہے کہ چناؤ کے لئے کسی کو خود نہ کھڑا ہونا چاہیئے۔ جن کو چُننے کا حق ہو اُن پر ہی موزوں شخصیت کو ڈھونڈ نکالنے کا بار ڈال دینا چاہیئے۔ اگر اُن کی نظر ہم پر پڑ جائے اور وہ ہمیں چن لیں تو اُن کی مرضی کو مان کر اپنی طاقت بھر اُن کی خدمت جو اُس مقام سے ممکن ہو کر دینی چاہیئے۔ دنیا میں سچّی جمہوری تنظیم تب تک نہیں ہو سکتی جب تک کچھ اِس قسم کی بات نہ چلائی جائے۔ اس کے لئے ایثار کا جذبہ مضبوط ہونا چاہیئے۔ خط نفس کی خواہش کم زور کرنی چاہیئے۔ ہمارا مقصد ہونا چاہیئے۔ خدمت

نہ کہ عزت یا دوسرے قسم کی غرض۔

اِدھر پارلیمنٹری کمیٹی اِس طرح کے چُناؤ کی تیاری میں لگی تھی، اُدھر پنڈت جواہر لال جی ملک کے مختلف مقامات کا دَورہ کر کے لوگوں میں جوش پیدا کر رہے تھے۔ اُنھوں نے اِس وقت جیسی محنت اور جوش سے دورہ کر کے لوگوں کو جگایا شاید ویسا زبردست پرچار کسی صدر نے اپنے دورِ صدارت میں نہ کیا ہوگا۔ اُن کا کہنا تھا اور یہ ٹھیک ہی تھا کہ اِس طرح کے انتخاب میں جہاں کروڑوں آدمیوں سے ووٹ لینے تھے، ایک ایک ووٹر تک پہنچنے کی اُمید فضول ہے اور اگر ہم پہنچ بھی سکے تو اس کا بھروسہ نہیں کیا جا سکتا کہ ٹھیک وقت پر ہمارے پہنچنے کا پھل ملے گا۔ سب سے زیادہ ضرورت ہے فضا کو بدل لینے کی۔ جس سے اگر کوئی باہر نکلنے کی کوشش بھی کرے تو نہ نکل سکے۔ اُنھوں نے ایسی ہی فضا تیار کرنے میں اَن تھک کوشش کی نتیجہ بہت اچھا نِکلا۔

کانگریس کا پہلا دیہی اِجلاس

لکھنؤ کا اِجلاس اپریل میں ہوا تھا۔ وہاں ایک فیصلہ یہ بھی ہوا تھا کہ کراچی کا یہ ضابطہ بدل دیا جائے، جس کے مُطابق دسمبر میں کانگریس کا سالانہ جلسہ نہ کرکے فروری مارچ میں کرنا طے ہوا تھا۔ اِس لئے اِس کے بعد کا سالانہ اِجلاس دسمبر ۱۹۳۶ء میں ہی ہونے والا تھا۔ یہ صرف آٹھ مہینے کے بعد ہی پڑتا تھا۔ مُلک نے جواہر لال جی کو پھر تیسری بار صدرِ کانگریس چُنا۔ یہ اِجلاس فیض پور میں ہوا۔ یہ مقام صوبہ بمبئی —— کانگریس کے صوبہ مہاراشٹر —— کے پوربی خاندیش ضلع میں ہے۔ یہ ایک گاؤں ہی ہے یا قصبہ کہیں تو چھوٹا سا قصبہ۔ گاندھی جی نے خیال ظاہر کیا تھا کہ کانگریس کا اجلاس گاؤں میں ہوا کرے تو اِس سے عوام کو زیادہ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہوگی کہ گاؤں کے لوگوں کو اس کے انتظام میں حِصّہ لینا ہوگا اور اِس طرح اُن کے لئے اس کی سب کارروائی میں رَس پیدا ہوگا۔ دوسری بات یہ ہوگی کہ مہمانوں کی خاطر تواضع اور بود و باش

کے لئے جو انتظام کیا جائے گا اُس سے گاؤں والوں کو زیادہ فائدہ بھی پہنچے گا۔ گاندھی جی چاہتے تھے کہ انتظام بھی ایسا ہو کہ اس میں گاؤں کی چیزوں سے ہی کام لیا جائے۔ اس طرح وہ دیہاتی صنعتوں کی حوصلہ افزائی کا باعث بھی ہو۔ اُنہوں نے مہاراشٹر کے لوگوں سے اِصرار کیا کہ وہ اِس کانگریس کا انتظام حتی الوسع دیہاتی صنعتوں کے ذریعے تیار کی ہوئی چیزوں سے ہی کریں۔ کام مشکل تھا مگر استقبالیہ کمیٹی نے حتی الامکان کوشِش کی۔ بنگال کی وشو بھارتی کے مشہور ماہر فن شری نندلال بوس نے وہاں جاکر کانگریس نگر اور پنڈال وغیرہ کی سجاوٹ کا بہت اچھا انتظام کرایا۔ قابلِ تعریف بات یہ تھی کہ آرائش کے لئے گاؤں سے ملنے والے بانس اور لکڑی سے ہی کام لیا گیا تھا۔ جو پھاٹک بنے تھے، یا دوسری سجاوٹ کی چیزیں بنی تھیں، اُن میں سادگی و پرکاری تھی۔ یہ دیکھ کر لوگوں کو تعجب ہوا کہ اِن چھوٹی موٹی معمولی چیزوں سے فن کار کتنا تنوع اور تزئین پیدا کر سکتا ہے۔ آخر جمالِ فطرت تو اِنہیں چیزوں سے ہوتا ہے۔ کیا ہم قدرت سے بھی زیادہ خوب صورت کوئی چیز بنا سکتے ہیں۔ مگر ہماری نظر آج ناقص ہو گئی ہے۔ ہم حسن و فطرت کو ٹھیک سمجھ نہیں سکتے۔ ہم فن کو نیچر سے کوئی الگ چیز مان بیٹھے ہیں۔ بہر حال فیض پور کی خصوصیت وہاں کی سادگی کا حُسن تھا۔ پانی کے لئے وہاں لوگوں نے بہت بڑا کنواں کھدوایا جو کانگریس کے بعد بھی وہاں کے عوام کو فائدہ پہنچاتا رہے گا۔ رہنے کے لئے جھونپڑے بنوائے جن میں گاؤں کے ہی گھاس پھوس، بانس، چٹائی وغیرہ کا استعمال ہوا تھا۔ اِس طرح فیض پور کا اِجلاس کانگریس پہلا دیہی اجلاس ہوا جس میں دیہاتی صنعتوں کا ہی غلبہ تھا۔ اِن میں کھدر کا مقام تو خاص ہونا ہی تھا چنانچہ کھدر کا ہی ہر جگہ بول بالا رہا۔

مگر اجلاس دسمبر کے آخر ہفتہ میں ہوا۔ جب بہت سردی پڑا کرتی ہے۔ اِس لئے باہر

سے آئے ہوئے ہزاروں لوگوں کو بہت تکلیف ہوئی۔ کیونکہ اِس چھوٹے سے مقام میں ایسے آنے والوں (وزیٹروں) کے ٹھہرنے کے لئے بھی کوئی مکان یا دھرم شالہ یا جھونپڑے تک بھی نہیں مل سکتے تھے۔ وہ ہزاروں کی تعداد میں رات کو یوں ہی کھُلے میدانوں اور کھیتوں میں پڑے رہتے تھے۔ گاندھی جی کو یہ بات بہت کھٹکی۔ اُنہوں نے اِس قاعدہ کو پھر بدلوا دیا۔ تب سے پھر کانگریس مارچ (بسنت رت) میں ہوتی آرہی ہے۔

فیض پور کا اجلاس چُناؤ سے چند دن ہی پہلے ہوا تھا۔ اِس لئے وہاں چناؤ کے متعلق بڑا جوش تھا۔ کئی جگہوں کے کتنے ہی خاص کارکن، اپنے اپنے مقام پر الکشن کے کام میں لگے ہونے کی وجہ سے نہیں آسکے۔ یہاں بھی نئے آئین کو منظور کرنے اور انتخابات میں حصّہ لینے کی بات کی گئی۔ اِس بات کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی پر چھوڑ دیا گیا کہ وہ چُناؤ کے بعد یہ فیصلہ کرے کہ وزارت میں شریک ہونے کے متعلّق کانگریس کی کیا پالیسی ہوگی۔ جواہر لال جی کا خیال اِس کے خلاف تھا، یہ بات سب پر ظاہر تھی، مگر وہاں پتہ لگ گیا کہ کانگریس وزارت بنانے کے حق میں ہے اور اگر اس بارے میں وہاں تجویز ہوتی تو وہ اسے منظور کرلیتی۔ مگر ابھی اِس فیصلے تک پہنچنے کا وقت نہیں آیا تھا۔ اِس لئے یہ حق آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو دے کر ہی چھوڑ دیا گیا۔

اِسی اجلاس کے کچھ پہلے مسٹر ایم این رائے (مانویندر ناتھ رائے) ولائت سے لوٹنے کے بعد سزا کاٹ کر جیل سے نکلے تھے۔ وہ اس اِجلاس میں پہلے پہل شریک ہوئے۔ ہوسکتا ہے کہ جب وہ اتنے مشہور نہیں تھے یعنی ولائت جانے سے پہلے کانگریس میں شریک ہوئے ہوں، مگر اِدھر اُس میں شریک ہونے کا یہ اُن کا پہلا ہی موقع تھا۔ ہم لوگوں سے پہلے پہل وہیں ملاقات ہوئی۔ ابھی اُن کے خیالات سے

مُلک واقف نہیں تھا اور کانگریس میں قدرتاً اشتیاق تھا۔ وہ اُتّر پردیش کی طرف سے ڈیلی گیٹ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر چُنے گئے تھے۔ اِس طرح اُن کو کانگریس میں اچھی طرح حصّہ لینے کا موقع مل گیا تھا۔

دورہ و نتیجۂ انتخاب

کانگریس کے اجلاس کے بعد سب لوگ اپنے اپنے صوبہ میں چناؤ میں حصہ لینے کے لئے چلے گئے۔ ہم نے فیض پور میں ہی پنڈت جواہر لال نہرو سے بہار کے کچھ حصوں میں دورہ کرنے کا وعدہ لے لیا تھا۔ وہ چند دن بعد ہی بہار میں دورہ کرنے آ گئے۔ میں بھی دورہ کرنے کے قابل ہو گیا تھا۔ اپنے لئے بھی میں نے دورہ کا پروگرام بنایا۔ سبھی جگہوں میں جواہر لال جی کا جانا ممکن نہ تھا۔ اس لئے ایسا انتظام کیا گیا کہ جہاں وہ نہ جا سکیں وہاں میں جاؤں۔ اس طرح ہم دونوں نے مل کر تقریباً سارے صوبے کا دورہ کر لیا۔ پنڈت گووند بلبھ پنت وغیرہ دوسرے لیڈر بھی آئے۔ جہاں جہاں علاقہ میں کچھ کمزوری نظر آئی، وہاں وہ گئے۔ عوام میں بے مثل جوش تھا۔ اس دورہ کے بعد ہمارے دل میں کامیابی کے بارے میں ذرا بھی شک وشبہ نہیں رہ گیا۔ جب انتخاب کا نتیجہ نکلا تو معلوم ہوا کہ ہم نے جتنی امید کی تھی اس سے بھی زیادہ کامیابی ہوئی۔ ہریجنوں کی ۱۶ محفوظ نشستوں میں سے پندرہ پر کانگریسی امیدوار چنے گئے۔ عورتوں کے لئے محفوظ نشستوں میں سے تینوں غیر مسلم نشستیں کانگریس کو ملیں۔ مزدوروں کے لئے محفوظ نشستوں میں سے ایک کو چھوڑ کر باقی سبھی کانگریس کو ہی ملیں۔

آدی باسیوں (جنگلیوں کے قدیم باشندوں) میں سے بھی چند کو چھوڑ کر باقی تمام نشستیں کانگریس نے جیت لیں۔ ہاں زمینداروں کی نشستیں کانگریس کو نہیں ملیں۔ مگر ایک کے سوا اور کسی کے لئے کانگریس نے امیدوار بھی نہیں کھڑے کئے تھے۔ اِس ایک نشست پر بھی کانگریس کی ہار ہوگئی۔ ہم یہ جانتے بھی تھے۔ اِس لئے ہمارے لئے یہ کوئی مایوس ہونے والی بات نہ تھی۔

بہار کی اسمبلی میں مسلمانوں کے لئے ۳۹ یا ۴۰ نشستیں محفوظ ہیں۔ چُناؤ کے بہت پہلے سے ہی کانگریسی مسلمانوں اور دوسرے قومی خیالات کے مسلمانوں میں گفتگو چلتی رہی۔ کچھ کا خیال تھا کہ جہاں تک ہوسکے کانگریس کی طرف سے ہی سبھی جگہوں پر مسلمان کھڑے کئے جائیں۔ کچھ کا خیال تھا کہ قومی مسلم جماعتوں، مثلاً جمعیۃ علماء کے ساتھ سمجھوتہ کرلیا جائے۔ جس سے کانگریس اور ملتی جلتی پارٹیوں میں کوئی اختلاف نہ ہو۔ مگر کانگریسی مسلمان متفق الرائے نہیں تھے۔ اس لئے کانگریس کمیٹی کچھ مشکل میں تھی۔ تو بھی چند جگہوں کے لئے کانگریسی امیدوار کھڑے کئے گئے۔ ان میں سے چند کے لئے قومی خیال کے مسلمانوں نے مقابلہ میں امیدوار کھڑے نہیں کئے۔ چند جگہوں میں مقابلہ ہوا بھی۔ مگر قومی خیال کے علاوہ کچھ دوسری مسلمان پارٹیاں بھی تھیں۔ انھوں نے بھی انتخاب میں حصّہ لیا۔ مسلم لیگ کا کوئی زور نہیں تھا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے لیگ کی طرف سے شاید ہی کوئی امیدوار کھڑا کیا گیا ہو۔ جمعیۃ علماء کی مدد سے ایک پارٹی بنی جس کے خاص مددگار ہوئے جمعیۃ کے سرآوردہ لیڈر اور امارتِ شرعیت کے نائب امیر مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد۔ اِسی پارٹی میں مسٹر محمد یونس شریک ہوئے۔ مسلمانوں کی یہی پارٹی سب سے مضبوط پارٹی معلوم ہوتی تھی۔ اِسی پارٹی کے ساتھ کانگریس کی بات چیت ہوئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس نے چند جگہوں کے لئے ہی

امیدوار کھڑے کئے۔ کئی ایسے مسلمان جو ہر طرح سے کانگریسی سمجھے جا سکتے تھے اور جنہوں نے کانگریس کے پروگرام کے مطابق قید بھی سہی تھی، اسی پارٹی کی طرف سے کھڑے ہوئے۔ اِس پارٹی کو کافی کامیابی ملی۔ اسمبلی میں مسلمانوں کی سب سے زیادہ تعداد اسی پارٹی کی تھی۔ بعد ازاں جب مسلم لیگ کا زور بڑھا تب شاید یہ بات نہیں رہ گئی تھی۔ مگر یہ تو اسمبلی کی نشست ہونے پر ہی معلوم ہوتا کہ کس کے ساتھ زیادہ مسلمان ممبر ہیں۔ یونیورسٹی کی نشست ڈاکٹر سچدانند سنہا نے کانگریسی امیدوار کو شکست دے کر حاصل کر لی۔

بہار کا الکشن پہلے ہی ختم ہو گیا۔ اس لئے یہاں کے متعدد کارکن اُتر پردیش چلے گئے یہاں کی کامیابی کی بات پہلے پہنچ چکی تھی اور ان لوگوں نے بھی جا کر کچھ کام کیا۔ میں بھی چند دنوں میں گیا۔ چند دنوں کے بعد مدھیہ پردیش میں بھی گیا۔ اُتر پردیش میں اودھ کے کئی ضلعوں میں بھی گیا۔ پھر دھام پور ضلع میں گیا جہاں بہت زوردار مقابلہ تھا۔ دھام پور سے کچھ دور ترائی میں گیا۔ جانا اچھا رہا۔ کیونکہ وہاں کانگریس کی جیت محض چند ووٹوں سے ہوئی۔

اُتر پردیش سے پھر مہاراشٹرا اور کرناٹک چلا گیا۔ مہاراشٹر میں کئی دنوں تک دورہ کیا۔ مگر وہاں اتنی کامیابی نہیں ہوئی۔ جتنی اور جگہوں میں۔ سب سے زیادہ ہار رتنا گری میں ہوئی جہاں سے لوگ بہت امید رکھتے تھے۔ مہاراشٹر سے میں کرناٹک چلا گیا۔ کئی ضلعوں کا دورہ کیا۔ وہاں اچھی کامیابی ہوئی۔ ہاں ایک ایسی جگہ شکست ہوئی جہاں کے بارے میں وہاں کے لوگ بہت امید رکھتے تھے۔ وہاں کے امیدوار بھی کانگریس کے اچھے کارکن شری ہنومنت راؤ کوجل بھی تھے۔ مگر چناؤ میں اس طرح کی باتیں تو ہوا ہی کرتی ہیں۔

اس وقت تک اور جگہوں کا چناؤ کا کام تقریباً ختم ہو چکا تھا۔ میں آندھرا کے ایک ہی ضلع بلاری میں جا سکا۔ وہیں سے دورہ ختم کر کے واردھا واپس آگیا۔ اس طرح میرا دوسرا دورہ مہاراشٹر اور کرناٹک صوبوں کے کئی ضلعوں میں ہوا۔ کئی جانے بوجھے مقامات کو دوبارہ دیکھنے کا موقع ملا۔ اِس طرح سارے ملک میں انتخابی مقابلہ ہوا۔ کانگریس کی فتح بمبئی، مدراس، مدھیہ پردیش، اُتر پردیش، بہار، اڑلیسہ اور آسام میں اچھی ہوئی۔ پنجاب، بنگال اور سندھ میں بھی کانگریسی لوگ چُنے گئے۔ مگر اُن کی تعداد اتنی نہیں تھی کہ اور پارٹیوں کے مقابلہ میں اکثریت ہو۔ صوبہ سرحد میں بھی کانگریس پارٹی ہی سب سے بڑی تھی مگر غالب اکثریت کانگریس کو اُس وقت نہیں ملی۔

چُناؤ کے بعد اب یہ طے کرنے کا وقت آگیا کہ کانگریس وزارت لے یا نہیں۔ اتنے صوبوں میں اکثریت پا کر کیا وہ وزارت لے کر کام کرے گی یا بغیر عہدہ لئے ہی۔ اِس معاملہ پر غور کرنے کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی نشست دلّی میں کی گئی۔ صدر کا خیال ہوا کہ سبھی کانگریسی ممبروں کا بھی ایک جلسہ کیا جائے جس میں وہ کانگریس کے ساتھ اپنی عقیدت اور وفاداری کا حلف لیں۔ یہ سمیلن (کنونشن) بڑے جوش کے ساتھ ہوا۔ اِس میں سبھی حاضر ممبروں نے ایک ساتھ کانگریس کی ہدایتوں کی تعمیل اور ملک کے مفاد کے کام میں لگے رہنے کا عہد کیا۔ وہیں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی بھی نشست ہوئی جس میں یہ طے کیا گیا کہ کانگریس وزارت تبھی بنائے گی۔ جب گورنر اِس بات کا وعدہ کرے کہ جو اختیارات خصوصی اس کو آئین کی رو سے دیے گئے ہیں۔ اُن کا استعمال نہ کیا جائے گا بلکہ سب باتوں میں وزیروں کے مشورہ سے ہی کام کریں گے۔ گاندھی جی نے اِس بات پر بہت زور دیا کہ اِس طرح کا وعدہ لئے بغیر کانگریس کو وزارت قبول نہ کرنی چاہیے۔

کیونکہ آئین میں گورنروں کے لئے بہت اختیارات محفوظ رکھے گئے ہیں اگر وہ اُن کا استعمال کریں تو کانگریسی وزارت کوئی بڑا اور اہم کام نہیں کر سکے گی۔ اسی لئے اگرچہ کانگریس کو وزارت بنانے سے انکار نہیں کرنا چاہیئے پھر بھی وہ تبھی منظور کرے جب گورنر مندرجہ بالا وعدہ کریں۔

جس زمانے میں آئین بن رہا تھا اِن محفوظ اختیارات کے متعلق بہت تنقید و تبصرہ ہوا تھا۔ اس آئین کے نامنظور ہونے کے اسباب میں گورنر کے اختیارات ایک خاص سبب تھے۔ اُس زمانے میں برٹش سرکار نے ہندوستان کے اِس خیال پر توجہ نہ کی اور حسبِ مرضی آئین بنالیا۔ اب گاندھی جی کی اِس سوجھ نے صوبائی گورنروں کے ان اختیارات کو نکھار دینا چاہا۔ کیونکہ کتاب میں اگر یہ اختیارات لکھے رہ بھی جائیں اور گورنر انھیں کام میں نہ لائے تو آئین کی ایک بہت بڑی شکایت کی بات دور ہو جائے۔ ہم میں سے جو لوگ وزارت لینے کے زبردست حامی تھے وہ بھی اِس سے ناراض ہوئے۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ اِس بالواسطہ طریقہ سے برٹش سرکار آئین کے اُن دفعات کو رد نہیں کرے گی اور اگر کانگریس اِس شرط پر اڑی رہی تو وزارتیں نہیں ہوں گی۔ مگر جو لوگ وزارت سازی کے مخالف تھے وہ خوش تھے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ برٹش شرط کو نہیں مانے گی اور اِس طرح وزارت نہیں بنے گی۔ گاندھی جی اِس پر مُصر رہے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کہ اُن کی رائے میں وزارت نہ لینا بڑی غلطی ہوگی مگر اِس سے بھی بڑھ کر یہ غلطی ہوگی کہ وزارت بغیر اِس شرط کے لی جائے۔ آخر یہی بات منظور ہوئی۔ کانگریسی ممبروں کو ہدایت دی گئی کہ وہ اپنے لیڈر چن لیں۔ جب اُس لیڈر کو گورنر وزارت سازی کے لئے بلائے تو وہ یہی شرطیں پیش کرے اور کہے کہ گورنر

اگر اپنے خاص اختیارات کو عمل میں نہ لانے کا صاف صاف وعدہ کرے تو وہ وزارت سازی کے لئے تیار ہیں۔ ورنہ نہیں۔

۱۹۳۷ء کی پہلی اپریل سے نئے آئین کے مطابق وزارتیں بن جانی چاہیئے تھیں اسی دن سبھی صوبوں کی حکومت بھی شروع ہو جانی چاہیئے تھی۔ کانگریس کے اس فیصلہ کے بعد گورنروں کو اور انہیں ہدایت کرنے والے وائسرائے کو اب سوچنا پڑا کہ وہ کیا کریں آئین کی رو سے اُنہیں اس پارٹی کے لیڈر کو جو وہاں کی اسمبلی میں سب سے بڑی تھی، کہہ دینا تھا کہ وہ وزارت بنائے۔ اسمبلی کے پارٹی ممبروں کو بھی اپنا لیڈر چن لیا تھا۔ اس لئے سب سے پہلے سبھی صوبوں کے ممبروں کے لئے یہ ضروری تھا کہ وہ اپنے اپنے مقام پر ایک بار مل کر لیڈر منتخب کریں۔ بہار میں پارٹی اور صوبائی کمیٹی کی نشست ایک ہی دن ہوئی جس میں لیڈر کا چناؤ کرنا تھا۔

میں نے غور کر کے اپنی رائے طے کر لی تھی کہ سری کرشن ہی پارٹی لیڈر مقرر کئے جائیں۔ یہ فیصلہ کرنے میں مجھے اِس بات سے کافی مدد ملی تھی کہ دوسرے صاحب بھی دسری انوگرہ نارائن سنگھ، جن کے متعلق کچھ لوگ تذکرہ کر رہے تھے۔ مجھ سے ذاتی طور پر کہہ چکے تھے کہ وہ اِس عہدہ کو نہیں چاہتے اور لوگ اُن کے بارے میں اوروں سے کہہ رہے ہیں، وہ اُن کی مرضی کے مطابق یہ کام نہیں کر رہے ہیں۔ تیسرے صاحب جن کے متعلق کچھ خیال تھا ڈاکٹر سید محمود تھے۔ وہ کئی برس سے آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہ چکے تھے۔ خلافت کمیٹی کے دنوں میں اُس کے ناظم اعلیٰ بھی رہے تھے۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سکرٹیری رہ چکے تھے۔ قومی خیالات کے وہ پکے اور پرانے حامل اور حامی رہے ہیں۔ اُن کا ایثار کسی سے کم نہیں رہا ہے

پھر بھی وہ بہار صوبہ میں، خاص کر صوبہ کے کانگریسی کارکنوں میں، مندرجہ بالا دونوں صاحبان کے مقابلہ میں کم مقبول رہے ہیں۔ صوبے کے باہر زیادہ کام کرنے کی وجہ سے اُن سے سب کا اتنا تعارف نہیں تھا۔ جتنا ان دونوں صاحبان سے۔ ان دونوں میں بھی بابو سری کرشن سنگھ اپنی قوتِ تقریر کے ذریعہ خود کو زیادہ مقبول بنا سکے ہیں۔ ایثار کے مادّہ اور بے خوفی میں بھی وہ لاثانی ہیں۔ انوگرہ بابو کی قوتِ تنظیم اور دفتر چلانے کی شکتی کے سبھی قائل تھے۔ اِنہی وجوہ سے میری رائے سری کرشن بابو کے حق میں تھی۔ جب میں نے سبھی ضلع کے لوگوں سے باتیں کیں تو زیادہ تر لوگوں کی رائے میری رائے سے مل گئی۔ شری دیال سنگھ بھی صوبہ کے ایک ایسے معزز فرد ہیں کہ اُن کے متعلق بھی کچھ لوگوں کا خیال ہو سکتا تھا۔ مگر اِس میں شک نہیں کہ کچھ لوگ اُن کی کافی مخالفت بھی کرنے والے تھے۔ جس میں اُن کے ضلع کے بھی کچھ لوگ تھے۔ کچھ لوگ مجھ سے ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ میں نے ایک صاحب کے حق میں پرچار کر کے ضلع کے لوگوں سے اُن کو منوالیا ہے۔ بات ایسی نہیں تھی۔ اگر ہوتی بھی تو مجھے اِس کا افسوس یا شرم نہیں ہوتی۔ کیونکہ جہاں تک میں سمجھ سکتا اور دیکھ سکتا تھا۔ ضلع کے لوگ سری کرشن بابو اور انوگرہ بابو میں سے ایک کو لیڈر بنانا چاہتے تھے۔ مگر انوگرہ بابو اِس مقابلہ میں پڑنا نہیں چاہتے تھے۔ اسی لئے اگر میں نے کچھ کیا بھی تو اُس کا اثر صرف اتنا ہی تھا کہ میں نے دو نام پیش ہونے نہیں دیئے آخر ایک ہی نام آیا اور وہ سری کرشن بابو کا۔ جسے لوگوں نے اتفاقِ رائے سے منظور کر لیا۔

بہار میں یہ پہلا مسئلہ خوبی کے ساتھ طے ہو گیا۔ مگر سبھی صوبوں میں ایسا نہیں ہوا۔ کئی جگہوں میں جیسے مدھیہ پردیش اور اڑیسہ میں، آپس میں کافی بددلی ہو گئی۔

جس کا نتیجہ بعد میں معلوم ہوا، جب آپس کی پارٹی بندیاں پھوٹ کر نکل آئیں۔ اُتر پردیش میں شاید کسی قسم کا افتراق نہ ہوا۔ بمبئی میں ایک ایسے صاحب لیڈر بنائے گئے جن کے کیرکٹر اور قابلیت کے بارے میں تو کسی کو شبہ نہ تھا۔ مگر جو وہاں کے زیادہ مشہور لوگوں میں نہیں تھے۔ وہ تھے بالا صاحب کھیر۔ وہ ہمیشہ اپنے آپ کو پیچھے رکھا کرتے تھے اگرچہ خیالات کے پختہ اور کام میں قابل تھے۔ پھر بھی اُن کو باہر کے لوگ کم ہی جانتے تھے۔ اُتر پردیش میں بھی پنڈت گووند بلبھ پنت کو سبھی جانتے اور چاہتے تھے۔ مرکزی اسمبلی میں انہوں نے جس طرح کام کیا تھا اِس سے وہاں یا دوسرے صوبہ کے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال ہی نہیں ہو سکتا تھا کہ اُن کے سوا کوئی دوسرا اس عہدہ پر چنا جا سکتا ہے۔ یہی بات مدراس صوبہ کے وزیر شری راج گوپال آچاری کے بارے میں تھی۔

گورنروں نے اپنے اپنے صوبہ میں جہاں کانگریس کی اکثریت تھی یا جہاں سب سے بڑی پارٹی کانگریس کی تھی۔ کانگریس پارٹی کے لیڈر کو بلوایا اور آئین کی رو سے ان کو وزارت بنانے میں مدد دینے کو کہا۔ اُن لیڈروں نے اپنی طرف سے وہی باتیں پیش کیں جن کی ہدایت آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے ان کو ملی تھی۔ گورنر کہیں بھی اس بات پر راضی نہیں ہوئے کہ وہ اپنے خصوصی یا محفوظ اختیارات کو کام میں نہیں لائیں گے۔ ان کا کہنا تھا کہ آئین کو بدلنے کا اختیار اُن کو نہیں تھا اور وہ اسے اِس طرح وعدہ بالواسطے طور پر نہیں بدل سکتے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ سب سے پہلے مدراس کے گورنر نے راجا جی کو بلایا جو بات وہاں ہوئی وہی سبھی جگہوں میں دہرائی گئی۔ وہاں کی یہ خبر اخباروں میں چھپ گئی۔ راجہ جی نے گورنر کے اِنکار پر وزارت سازی سے اِنکار کر دیا۔ یہی سب جگہوں میں ہوا۔

مگر برٹش سرکار نے اِس طرح سے اُس آئین کو جس کے بنانے میں اُس نے کئی سال لگائے تھے اور جس کے متعلق اتنا پرچار کیا گیا تھا جنم لینے سے پہلے ہی مرنے دینا پسند نہیں کیا۔ اُس کے کارکنوں کے دل میں شاید امید تھی کہ کانگریس والے وزارت کے لالچ پر قابو نہ پاسکیں گے۔ اِس لئے پہلی اپریل کو نہیں تو کچھ دنوں بعد اُن میں پھوٹ ڈال کر ان کی اکثریت کو تتر بتر کر دیا جاسکے گا۔ اِسی لئے انہوں نے طے کر لیا کہ چاہے جیسے ہو اور جہاں کہیں ہو چند دنوں کے لئے ہی سہی، اسمبلی کی اکثریت کے خلاف ہی کیوں نہ ہو، وزارت بن جانی چاہیئے۔ کسی نہ کسی کو وزیر اعلیٰ اور اُن کے ساتھ کچھ اوروں کو لگا کر پہلی اپریل کو وزارت کے نام شائع ہو جانے چاہئیں۔ اب یہی کوشش سبھی صوبوں میں ہونے لگی۔ مگر یہ کانگریس کے لئے بڑے فخر کی بات رہی کہ کسی صوبہ میں ایک بھی کانگریسی ایسا نہیں ملا جو اِس حکمہ میں آکر وزارت کا عہدہ قبول کرے۔ اِسی لئے کانگریس کے باہر کے لوگوں میں سے ہی کچھ لوگوں کو مقرر کرنا ضروری ہو گیا۔ گورنر ایسا کر بھی سکتے تھے۔ کیونکہ آئین کی رو سے چھ مہینے تک اسمبلی کے اجلاس کے بغیر بھی حکومت کا کام گورنر کی رائے اور اس کے بجٹ منظور کر دینے سے چل سکتا تھا۔ انہوں نے اِسی امید سے سب جگہوں میں وزارتیں بنادیں کہ ان پانچ چھ مہینوں میں شاید ہوا بدل جائے۔ شاید کانگریسیوں کا کچھ داؤ بدل جائے۔

بہار صوبہ میں گورنر نے یہ کام مسٹر محمد یونس کے سپرد کیا۔ یہ حضرت مسلمانوں کی آزاد پارٹی کی طرف سے چُنے گئے تھے جس کے خاص معاون تھے مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد جمعیۃ علماء کے خاص فرد تھے۔ سمجھا جاتا کہ کانگریس کے ساتھ اُن کی پوری ہمدردی ہے۔ چُناؤ میں بھی اگرچہ اُن سے صلح نہیں تو کوئی جھگڑا بھی نہیں ہوا تھا۔ کتنے ہی کانگریسی مسلمانوں نے اُن کی پارٹی میں اس لئے اپنے نام لکھائے تھے کہ وہ اِس طرح آسانی سے

چُنے جاسکیں گے۔ خاص کر جب وہ یہ سمجھتے تھے کہ کانگریس کی پالیسی سے مولانا سجاد بڑی حد تک متفق ہیں مگر اس موقع پر مولانا چُوکے۔ اُنھوں نے اپنی پارٹی میں طے کیا کہ وہ وزارت بنائیں۔ معلوم نہیں وہاں کیا باتیں ہوئیں۔ طرح طرح کی باتیں اس زمانے کی ہوا میں تھیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ کانگریسی مسلمانوں نے مخالفت کی مگر اُن کی تعداد اوروں کے مقابلہ میں ایک یا دو کم تھی۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ پارٹی کو آخری فیصلہ دینے کا موقع ہی نہیں ملا۔ کیونکہ جب ایک جگہ بیٹھ کر پارٹی اس معاملہ پر غور کر رہی تھی کہ وہ وزارت بنائے یا نہیں، تب مسٹر یونس گورنر کے پاس جا کر وعدہ کر آئے کہ وہ وزارت بنانے کے لئے تیار ہیں اور گورنر کے کہنے پر انھوں نے وزیروں کے نام بھی دے دیئے جن کو گورنر نے منظور کر لیا اور جب انھوں نے آکر پارٹی کی میٹنگ میں جو اُن کا انتظار کر رہی تھی۔ یہ خبر دی کہ وزارت بن گئی تو پارٹی اِس کے بعد کچھ نہ بول سکی۔ شاید اُنھوں نے بھی اس بارے میں اب کچھ کہنا فضول سمجھا۔ معلوم نہیں حقیقت کیا تھی۔

اِس بارے میں بہار میں ایک بڑی بات ہوئی۔ ہم کو خبر ملی کہ یونس صاحب کانگریس کے دوسرے ممبروں کو تو نہیں توڑ سکے مگر وہ ہریجن ممبروں پر بہت زور ڈال رہے ہیں اور اُنھوں نے شری جگ جیون رام کو وزارت میں ایک جگہ دینا منظور کیا۔ یہ بھی خبر لگی کہ وہ شری جگ جیون رام کو ساتھ لے کر گورنر کے پاس گئے بھی ہیں اور کہیں دوسری جگہ اُن سے باتیں کرنے کے لئے انھیں لے گئے ہیں۔ سب لوگ کچھ متفکر ہونے لگے کہ شاید ایک کانگریسی کو بھی توڑ لینے میں وہ کامیاب نہ ہو جائیں۔ مگر مجھے اس بات کی فکر نہیں تھی کیونکہ مجھے پہلے ہی خبر مل چکی تھی کہ مسٹر یونس کی کوشش ضرور ہے۔ مگر شری جگجیون رام اس طرح بہکانے میں آنے والے نہیں۔ آخر ایسا ہی ہوا۔ وزارت بنی مگر اس میں شامل

ہونے سے شری جگ جیون رام نے صاف انکار کر دیا۔ کوئی بھی دوسرا کانگریسی شریک نہ ہوا۔ اِس طرح یہ پہلی زبردست کوشش ناکام رہی۔ وزارت بننے سے ہمیں کوئی فکر نہیں تھی کیونکہ ہم جانتے تھے کہ چھ مہینے کے اندر یا تو وزارت ٹوٹے گی یا آئین ہی رد ہو گا یا اُسے بدلنا پڑے گا۔ وجہ یہ کہ اتنی غالب اکثریت سے کانگریسی چُنے گئے تھے کہ کوئی دوسری پارٹی یا سبھی دوسرے لوگ مل کر بھی اسمبلی میں کانگریس کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے اگر اسمبلی اور کونسل دونوں کا ملا جُلا اجلاس بھی ہو تو کانگریس کی ہی اکثریت رہے گی۔ جس دن وزارت بنی اس دن پٹنہ میں کچھ لوگوں نے مسٹر یونس کے خلاف مظاہرہ کیا جن میں خاص تھے شری جے پرکاش نرائن۔ وہ گرفتار کر لئے گئے۔ اُن پر مقدمہ چلنے کے بعد سزا بھی ملی۔ مگر بعد میں مسٹر یونس نے میعاد پوری ہونے سے پہلے ہی اُنہیں چھوڑ دیا۔

اِسی طرح اور صوبوں میں بھی وزارتیں بن گئیں۔ کم سے کم دکھانے کے لئے یہ ہو گیا کہ نئے آئین کے مطابق حکومت ہونے لگی ہے۔ مگر یہ بات گورنر لوگ بھی جانتے تھے اور وزراء صاحبان بھی کہ چند روزہ تماشا ہے۔ وہ لوگ اِس کوشش میں تھے کہ اگر وہ جوڑ توڑ کر کے اکثریت نہ بنا سکے تو کوئی نہ کوئی راستہ کانگریس کے ساتھ میل کرنے کا میل کرنا ہی چاہیئے۔ کانگریس میں وزارت بنانے کے مخالف تھے، خوش تھے کہ کسی طرح کانگریس اِس میں نہیں پڑی اور ان کی خلل انداز حکمت عملی کے کام میں آنے کا اب بھی موقع ہے۔ جو حق میں تھے وہ یہ سمجھتے تھے کہ آج ہی نہیں تو چند دنوں کے بعد کانگریسی وزیر ہوں گے ہی۔ اور جب ہوں گے تب گورنر کے اختیاراتِ خصوصی کو ملتوی کرا کر ہی ہوں گے۔ اِسی لئے اس وقت اس بارے میں کانگریسی بے فکر تھے۔ وزارت اپنے کو مقبول بنانے کی فکر میں تھی اور گورنر لوگ اور وائسرائے اِس زچ کے حل نکالنے

ہیں لگے تھے۔ سرکار کی طرف سے وقتاً فوقتاً اعلانات نکلتے تھے اور کانگریس کی طرف سے انہیں ناکافی بتایا جاتا اور چھوڑ دیا جاتا۔

تین مہینے بعد وائسرائے نے ایک اعلان نکالا۔ جس پر ورکنگ کمیٹی نے غور کر کے کچھ اور وضاحت چاہی اور کانگریس پارٹی کے لیڈروں کو ہدایت کی کہ اگر وضاحت انھیں قابلِ اطمینان معلوم ہو تو وہ وزارت قبول کر سکتے ہیں۔ بات یہ تھی کہ برٹش سرکار یہ بات صاف لفظوں میں نہیں کہہ سکتی تھی کہ آئین کے کچھ دفعات اڑا دیئے گئے۔ کیونکہ اُنھیں یہ کہنے کا حق بھی نہیں تھا۔ مگر اُس نے اپنی پالیسی گھما پھرا کر بتا دی کہ حقوق رہتے ہوئے بھی گورنر اُن سے کام نہیں لیں گے۔ چونکہ یہ بات صاف لفظوں میں نہیں کہی گئی تھی، وضاحت ضروری تھی۔ ورکنگ کمیٹی کے اِس فیصلہ کے بعد معلوم ہو گیا کہ اب جلد ہی پھر کانگریسی لوگ وزارت بنانے کے لئے بلائے جائیں گے۔

اِسی زمانے میں بہار صوبائی کانفرنس کا اجلاس سارن ضلع میں سرکھ گاؤں میں کرنے کا فیصلہ ہوا تھا۔ پروفیسر عبدالباری اِس کے صدر مقرر ہوئے۔ وہاں ہم سب گئے اور کانفرنس کا کام ختم کر کے چھپرا پہنچے۔ وہیں معلوم ہوا گورنر نے بابو سری کرشن سنہا کو بُلا بھیجا ہے۔ وہاں ہم لوگوں کو موقع ملا کہ وزارت کے متعلق ہم کچھ باتیں کر لیں۔ مگر ابھی تک ہم یہی فیصلہ کر سکتے تھے کہ ورکنگ کمیٹی کی ہدایت کے مطابق اگر وضاحت قابلِ اطمینان ہوتی ہے تو ہم وزارت بنانے کے لئے تیار ہیں۔ اگر گورنر وزارت بنانے کو کہے تو اِس کے لئے وقت لے کر سری کرشن بابو آجائیں گے اور جب ہم لوگ یکجا ہو کر غور کریں گے کہ کون کون وزارت میں لئے ہیں۔ چھپرا میں کچھ ابتدائی گفتگو ہو گئی۔ تبادلۂ خیالات بھی ہو گیا جس کی بنا پر ہم چند آدمی جو رہ گئے تھے۔ اس درمیان سوچ سکتے۔

وزیروں کا انتخاب کارِ دشوار تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ وزیر ہوں کتنے۔ میرا خیال تھا کہ اِس سے پہلے چار آدمی تھے جو حکومت کا کام سنبھالے ہوئے تھے اور سبھی محکموں کی نگرانی کر لیا کرتے تھے۔ اُن میں سے دو تو گورنر کی اگزکٹو کونسل کے ممبر ہوا کرتے تھے۔ اور دو وزیر اِسی لئے میں سمجھتا تھا کہ جب اس نئے آئین کے پہلے چار آدمی سب کام سنبھال لیتے تھے تو اب بھی چار وزیروں کو ہی سب کام سنبھال لینا چاہیئے۔ زیادہ وزیر بنانے سے خرچ زیادہ ہوگا اور کچھ ایسا معلوم ہوگا کہ یہ لوگ اپنے لئے عہدہ پانے کی آرزو سے آئے ہیں۔ اور جتنے ہو سکتے ہیں اتنے عہدے پیدا کر کے آپس میں بٹوارہ کر رہے ہیں۔ جہاں جہاں وزارت پکّے طور پر بن گئی تھی۔ وزیروں کی تعداد زیادہ رکھی گئی تھی۔ اور ہم نے اِس بات پر کچھ تنقید بھی کی تھی۔ اگرچہ کانگریس کے وزیروں کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے مکان اور سواری کے علاوہ پانچ سو روپیہ مہینہ طے کر دیا تھا اور اِس طرح خرچ بہت کم ہو جاتا تھا۔ تو بھی میرا یہ پختہ خیال تھا کہ وزیروں کی تعداد زیادہ نہ ہونی چاہیئے۔ خاص کر بہار میں چار سے زیادہ کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں میں نے دیکھا کہ میرا خیال غلط تھا۔ کیونکہ ہمارے سبھی وزیر اِس قسم کے کام میں ابھی نو آموز تھے اور پہلے کا کچھ خاص تجربہ نہیں رکھتے تھے۔ مزید براں ہمارے وزیروں کو پہلے کے چلائے ہوئے ڈھرّے پر ہی کام نہیں کرنا تھا۔ لکیر نہیں پیٹنی تھی۔ ان کو بہت سے نئے پروگرام چلانے تھے۔ اِس لئے اُن نئے پروگراموں کے متعلق واقفیت حاصل کرنے اور رائے قائم کرنے میں وقت لگتا تھا۔ لہٰذا کچھ دنوں کے تجربے کے بعد میں نے سوچا کہ شاید چار سے زیادہ وزیر رکھنا ہی اچھا ہی اچھا ہوتا۔ مگر اُس دن میں اپنے خیال میں پختہ تھا اور سوچتا تھا کہ چار سے زیادہ وزیر رکھنا بہار کے لئے مناسب نہ ہوگا۔

اِس کے سوا ایک بات اور تھی جس کا اثر اِس فیصلے پر پہنچنے میں کچھ نہ کچھ ضرور پڑتا تھا۔ ہم لوگ سوچ رہے تھے کہ صوبہ کے کچھ ایسے خاص اصحاب ہیں جن کے بارے میں کسی قسم کا اختلاف رائے نہیں ہو سکتا تھا۔ مگر جب ہم اُن سے آگے بڑھتے تھے تو کچھ ایسے لوگ سامنے آجاتے تھے جن میں سے انتخاب کرنے میں کس کو لینا اور کس کو نہیں لینا یہ فیصلہ کرنے میں۔ کافی دشواری سامنے آتی تھی۔ اس لئے بھی خیال ہوتا تھا کہ ان خاص اشخاص تک ہی اپنا انتخاب محدود رکھیں تو بُرا نہ ہوگا۔

اور بھی ایک دو باتوں کا تذکرہ موزوں ہوگا۔ اِس بارے میں تقریباً سبھی متفق ہو گئے تھے کہ ایک ہریجن کا وزیر بنانا ضروری ہوگا۔ اگر اور خیالوں کو چھوڑ بھی دیا جائے تو بھی انہوں نے مسٹر یونس کی بات نہ مان کر بہت بڑے لالچ پر غلبہ پاکر وزارت کے لئے اپنا دعویٰ ثابت کر دیا ہے۔ اِسی لئے یہ ایک غیر متنازعہ بات سب کے دل میں خود بخود طے ہو چکی تھی۔

ہزاری باغ کے شری رام نارائن سنگھ چاہتے تھے کہ چھوٹا ناگپور کی طرف سے وہاں کا کوئی وزیر ضرور مقرر کیا جائے۔ اُن کا کہنا تھا کہ صوبے کا وہ حصہ بچھڑا ہوا مانا جاتا ہے اور کانگریس بھی اس کی طرف پوری توجہ نہیں دیتی۔ اس کی شکایت وہ دوستانہ انداز میں برابر کیا کرتے تھے کہ میں بھی اِس حصہ پر کافی توجہ نہیں دیتا ہوں۔ اس کی تائید میں وہ کہا کرتے تھے کہ میں وہاں جاکر کبھی کچھ دنوں کے لئے نہیں رہتا ہوں۔ میں بھی اُن سے مذاق میں کہا کرتا تھا کہ پچھلے بیس بائیس برسوں میں جتنا میں ایک ساتھ چھوٹا ناگپور میں رہا اتنا کسی دوسرے شہر میں نہیں رہا کیونکہ جیل کی زندگی کے برابر ہزاری باغ میں ہی گزارنی پڑتی تھی۔ یہ مذاق کے لئے تو ٹھیک جواب تھا۔ مگر اُن کو اِس سے اطمینان نہ ہوتا تھا۔ اِسی

لئے انہوں نے زور لگایا کہ چھوٹا ناگپور کا بھی ایک وزیر ضرور ہونا چاہیئے۔ وہ خود وہاں کے خاص کارکن تھے۔ اُس زمانے میں وہ مرکزی اسمبلی کے ممبر تھے صوبائی انتخاب کے وقت وہ صوبائی اسمبلی کے لئے کھڑے نہیں ہوئے تھے، اسی لئے اگر وہ وزیر بنائے جاتے اس کے یہ معنی ہوتے کہ کہیں جگہ خالی کر کے کچھ دنوں کے اندر صوبائی اسمبلی کا ممبر بھی بنانا پڑتا۔ جو چُنے ہوئے کانگریسی لوگ تھے۔ وہ اِسے بہت بُرا مانتے کیونکہ وہ یہ مانتے اور ٹھیک ہی مانتے کہ اُن میں کوئی اِس عہدے کے قابل نہیں سمجھا گیا۔ اِسی لئے چُنے ہوئے لوگوں کو چھوڑ کر باہر سے ایک آدمی لینا پڑا۔ اِن خیالات سے اُن کو وزارت میں لینا غیر ممکن ہو گیا۔ اِس سے وہ بہت غیر مطمئن ہوئے۔ اُنھوں نے میرے پاس کئی خط بھی بھیجے۔ جن کا میں نے جواب تو دیا مگر شاید اُنہیں اطمینان نہ دے سکا۔ پبلک لائف میں ایسا کبھی کبھی کرنا پڑتا ہے۔ مجھ جیسے آدمی کے لئے جسے کسی کے ساتھ تلخی پیدا کرنے میں بہت دکھ ہوتا ہے۔ ایسا ناخواستہ کام بڑی مشکل پیش کر دیتا ہے۔ مگر فرض کی نظر سے آج بھی میں سمجھتا ہوں کہ اس بارے میں جو فیصلہ ہوا وہ ٹھیک ہی ہوا۔

آخر میں ہم کو ایک اور دشواری کا حل کرنا تھا۔ ہریجنوں میں وہ خاص کانگریسی تھے۔ ایک شری جگ لال چودھری جو ۱۹۲۰ء میں کلکتہ میڈیکل کالج کے آخری سال میں پڑھ رہے تھے اور کچھ ہی مہینوں میں ایم بی پاس کر کے ڈاکٹر ہو جانے والے تھے۔ کانگریس کی پکار پر امتحان چھوڑ کر یک دلی کے ساتھ کانگریس کی خدمت میں خاص کر تعمیری کام میں لگے۔ ستیاگرہ میں بھی حصہ لے کر جیل یاترا کر آئے تھے دوسرے شری جگ جیون رام جو بڑے پُر جوش اور قابل کارکُن تھے۔ تھوڑے ہی دنوں سے کانگریس کا کام کرنے پر بھی کافی اثر رکھتے تھے اور مسٹر لونس کی

دی ہوئی وزارت ٹھکرا چکے تھے۔ سب باتوں پر بہت سوچنے کے بعد ہم نے شری جگ لال چودھری کو وزیر اور شری جگ جیون رام کو پارلیمنٹری سکریٹری بنانے کا فیصلہ کیا۔

کانگریسی وزارتوں کی تشکیل

اِس طرح ہم نے طے کرلیا کہ سری کرشن سنہا وزیرِ اعلیٰ ہوں۔ اُن کے ڈاکٹر سید محمود، شری انوگرہ نرائن سنگھ اور شری جگ لال چودھری وزیر ہوں اور چار وزیروں کے ساتھ آٹھ پارلیمنٹری سکریٹری ہوں۔ شری رام دیال سنگھ سپیکر مقرر ہو ہی چکے تھے اور پروفیسر عبدالباری ڈپٹی سپیکر۔ پارلیمنٹری سکریٹریوں میں سری کرشن بلبھ سہائے، شری سارنگ دھر سنگھ، شری جیمت باہن سین، شری ونودا نند جھا، شری شونندن منڈل، شری جگ جیون رام، شری صدیۃ الحق مقرر کیے گئے۔ اُس زمانے میں، میں نے سمجھا کہ یہ تقرر ٹھیک ہوئے تھے اور بعد میں بھی مجھے اپنی رائے بدلنے کا موقع پیش نہیں آیا۔ اگرچہ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اِس سے بہتر تقرر ہو سکتے تھے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا سب وزیروں کی بھی اِس بات میں میرے ساتھ رائے ملتی تھی۔

میں دو باتیں کہنا بھول گیا۔ اگرچہ اُنہیں پہلے ہی کہنا چاہتا تھا۔ ایک بات کا تعلق تھا۔ صوبائی لیجسلیٹو کونسل کے چناؤ کے ساتھ اور دوسری بات تھی۔ اسمبلی کے صدر یا سپیکر کے چناؤ کی۔ کونسل کے ووٹر زیادہ تر ایسے ہی لوگ ہیں جو مالدار طبقے کے

ہیں یعنی جن میں زمینداروں کی زیادہ مالگذاری دینے والوں اور کافی انکم ٹیکس دینے والوں کی تعداد زیادہ ہے۔ اِسی لئے ہم کو جیسے زمینداری کی نشستوں کے انتخاب میں جیتنے کی امید نہ تھی، ویسے ہی اُن جگہوں کو جیتنے کی بھی امید تھی۔ مگر اِس میں دو طرح سے ممبر چنے جاتے ہیں۔ کچھ تو ایسے ہوتے ہیں جو ووٹرز کے ذریعے سے چنے جاتے ہیں اور کچھ اسمبلی کے ممبروں کے ذریعے۔ اسمبلی کے ذریعے چنے جانے والے لوگوں میں تو کانگریسی کافی لوگوں کو چن سکتے ہیں مگر ممبروں میں اُن کے اتنے زیادہ مددگار شاید نہیں تھے۔ اِسی لئے ہم نے پہلے سے ہی سوچ رکھا تھا کہ ہم سبھی جگہوں کے لئے امیدوار نہیں کھڑے کریں گے۔ مگر جو چند جگہیں مل سکتی تھیں۔ اُن کے لئے ہم نے امیدوار کھڑے کئے اور جیتے بھی۔ مگر ہماری طاقت اسمبلی کے ذریعہ ظاہر ہوسکتی تھی۔

اسپیکر کا چناؤ کرنے کے لئے ایک دن اسمبلی کا اجلاس ہوا۔ اُس دن کے لئے گورنر نے ڈاکٹر سچدانند سنہا کو صدر مقرر کر دیا تھا۔ میں بھی اُسی ایک دن اُس اسمبلی میں گیا۔ اس کے پہلے کبھی بہار اسمبلی میں نہیں گیا تھا۔ اِس کے بعد بھی پھر کبھی جانے کا نیک موقع نہیں ملا۔ خیر، شری رام دیال سنگھ چنے گئے۔ چناؤ کے بعد ڈاکٹر سچدانند سنہا نے ایک مزے دار تقریر کی جس میں انہوں نے رام دیال بابو کا استقبال کیا۔ اِس طرح وزارت مقرّر ہو گئی۔

مجھے وزارت کے سلسلہ میں اُڑیسہ بھی جانا پڑا۔ وہاں پارٹی کے لیڈر کے انتخاب کے وقت آپس کا اختلافِ رائے معلوم ہوا تھا۔ یہ بات پارلیمنٹری کمیٹی تک آئی تھی۔ پنڈت نیلکنٹھ داس اُڑیسہ کی خاص ہستیوں میں سے ہیں۔ ۱۹۲۱ء سے ہی اُنہوں نے کانگریس میں بہت کام کیا تھا۔ وہ سورگیہ (مرحوم) پنڈت گوپ بندھو داس کے شرکار

میں سے تھے۔ ۳۴-۱۹۳۰ء کی تحریک ستیہ گرہ میں ہم لوگوں کے ساتھ ہی ہزاری باغ جیل میں تھے۔ ان دنوں بھی ان کی رائے معلوم ہوتی تھی کہ جو نیا آئین بنے اس میں کانگریس کو وزارتی عہدے قبول کرنے چاہئیں۔ جب ۱۹۳۴ء میں مرکزی اسمبلی کے لئے چناؤ ہوا تو وہ اُڑیسہ کے حلقے سے کانگریسی ممبر چنے گئے تھے۔ ۱۹۳۷ء میں نئے آئین کے مطابق جب بہار سے اُڑیسہ الگ ہو چکا تھا۔ اُس کی اسمبلی کے لئے ممبروں کا چناؤ ہوا تو وہ خود کسی حلقہ سے صوبائی اسمبلی کے لئے کھڑے نہیں ہوئے مگر جب کانگریس کی اکثریت ہو گئی اور یہ معلوم ہو گیا کہ جب کبھی کانگریس وزارت لے گی تو اسمبلی کا لیڈر ہی وزیر اعلیٰ ہوگا تب انہوں نے وہاں کے ممبروں سے لیڈر چنے جانے کی خواہش ظاہر کی۔ صوبائی انتخاب میں انہوں نے محنت بھی کی تھی۔ اِس انتخاب کی کامیابی میں اُن کا ہاتھ تھا مگر وہاں کے ممبروں کے سامنے اب یہ سوال پیش ہو گیا کہ کسی ایسے آدمی کو جو اسمبلی کا ممبر نہیں تھا۔ اسمبلی پارٹی کا لیڈر وہ کیسے چُنیں۔ اسمبلی پارٹی کے لیڈر کو اسمبلی میں حاضر رہنا چاہیئے۔ وہاں رہ کر ہی وہ اپنا کام پورا کر سکتا ہے۔ مزید براں اگر گورنر بلائے گا تو وہ اسمبلی کے ہی کسی ممبر کو بلانا چاہے گا اور کسی باہر کے فرد کو بلانے میں اُسے دِقّت ہوگی۔ یہ دوسری بات ہے کہ باہر کا آدمی بھی اِس شرط پر وزیر ہو سکتا ہے کہ چھ مہینے کے اندر وہ کہیں سے ممبر چنا جائے گا۔ مگر پنڈت نیلکنٹھ داس صرف وزیر ہونا نہیں چاہتے تھے۔ وہ وزیرِ اعلیٰ ہی ہو سکتے تھے۔ کیونکہ وہی عہدہ ان کے قابل تھا۔ پارلیمنٹری کمیٹی کی رائے ہوئی تھی کہ ممبروں میں سے کوئی لیڈر چُنا جا سکتا ہے۔ اِسی لئے شری وشوناتھ داس ہی لیڈر چُنے گئے۔ یہ برہم پور ضلع کے رہنے والے ہیں اور پہلے مدراس اسمبلی کے ممبر رہ چکے تھے۔ جب اُن کا یہ ضلع صوبۂ مدراس کا حصّہ تھا۔

مجھے اس لئے جانا پڑا کہ وہاں آپس کے اِن جھگڑوں سے کچھ تفرقہ کا خوف تھا۔ میں وہاں گیا۔ سب سے نازک سوال یہ اٹھا کہ مسلمانوں میں وزیر کون بنایا جائے۔ وہاں کی اسمبلی میں مسلمانوں کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ جو عارضی وزارت بنی تھی، اُس میں ایک مسلمان صاحب وزیر تھے۔ دوسرا کوئی ایسا فرد نہیں نظر آیا جو کانگریس کی طرف سے چُنا گیا ہو اور وزارت کا کام کر سکتا ہو۔ جو ایسے افراد تھے جن میں کام چلانے کی صلاحیت تھی، کانگریسی ٹکٹ پر چنے نہیں گئے تھے اور اب بھی کانگریس میں شریک ہونے کے لئے تیار نہ تھے۔ میں دو تین دن تک کٹک میں ٹھہرا رہا۔ اس بات کی پوری کوشش ہوئی کہ کوئی موزوں مسلمان وزیر بنے مگر اِس میں کامیابی نہیں ہوئی۔ آخر بغیر کسی مسلمان کے ہی اس وقت وزارت بنائی گئی۔ مگر اِس بات کا فیصلہ بعد میں مولانا آزاد سے پوچھ کر ہی کرنے کے لئے چھوڑ دیا گیا۔

اُتر پردیش میں بھی مسلمان وزیر کے متعلق دقت تھی۔ کیونکہ وہاں بھی کانگریس کے ٹکٹ پر ایک ہی دو مسلمان چُنے گئے۔ دوسرے مسلمان آزاد حیثیت سے چنے گئے تھے۔ مولانا آزاد نے وہاں کے متعلق باتیں کیں۔ کچھ مسلمان جو کانگرس کے ساتھ ہمدردی رکھتے تھے۔ کانگریس کی طرف سے چُنے نہیں گئے تھے۔ مولانا آزاد کے ساتھ کچھ سمجھوتے کے لئے تیار تھے۔ اگر وہ سمجھوتہ ہو گیا ہوتا تو شاید جو جھگڑا لیگ کے ساتھ اُٹھ کھڑا ہوا وہ نہیں ہوتا۔ اور اس وقت صوبے کے خاص کانگریسی اس بات پر رضامند نہیں ہوئے۔ مولانا کو بھی وہاں ٹھہرنے کا پورا وقت نہ مِلا۔ بمبئی چلا جانا پڑا۔ اِسی لئے وہاں کی وزارت میں ایک کانگریسی مسلمان جناب رفیع احمد قدوائی اور۔ دوسرے جو کانگریس ٹکٹ پر نہیں چُنے گئے تھے۔ حافظ محمد ابراہیم وزیر بنائے گئے۔ یہاں یہ کہہ دینا مناسب ہے کہ حافظ صاحب نے

اسمبلی سے استعفیٰ دے دیا اور پھر کانگریس ٹکٹ پر چُن لئے گئے۔ بمبئی کی دِقّت مولانا کی رائے سے طے ہوگئی اور مسٹر نوری وزیر بنے۔ اِس طرح مدھیہ پردیش میں مسٹر شریف وزیر ہوئے۔

مسلمان وزیروں کے بارے میں اتنا لکھنا اِس لئے ضروری ہوگیا کہ آگے چل کر مسلم لیگ نے بہت شور و غل مچایا۔ اُس زمانے تک کانگریسی اور دوسرے لوگ انتخاب میں اور آئین کے مطابق بنی ہوئی وزارتوں میں انگلستان کی وزارت کا شاہی نقشہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ لوگ وہاں کے رسم و رواج کے مطابق ہی یہاں کی وزارت کی بھی تنظیم اور کارروائیاں کرنا چاہتے تھے۔ اِسی وجہ سے سبھی منظم جماعتوں نے اپنے اپنے امیدوار کھڑے کئے تھے۔ چناؤ کے وقت کچھ نئی پارٹیاں بھی بنی تھیں جیسے بہار کی انڈیپنڈنٹ (آزاد) پارٹی۔ چناؤ کے بعد جب ایک پارٹی۔ کانگریس کی اکثریت کئی صوبوں میں غالب ہوگئی تو اُس کو اپنے باہر سے کسی کو وزیر بنانے کی بات، اس قسم کے دستوری ضابطہ کے خلاف معلوم ہوئی۔ ساتھ ہی کانگریس پارٹی میں بھی مسلمان تھے۔ اُن کو چھوڑ کر باہر جانا اُن کے ساتھ بے انصافی ہوتی تھی۔ چناؤ تک مسلم لیگ کا کچھ ایسا زور بھی نہیں تھا۔ بہت کم جگہوں کے لئے مسلم لیگ نے امیدوار کھڑے کئے تھے جہاں اس کے امیدوار کھڑے ہوئے بہت کامیاب بھی نہیں ہوئے تھے۔ اِسی وجہ سے مسلم لیگ کے لئے وزیر بنانا تقریباً سبھی جگہوں میں جہاں کانگریس کی اکثریت تھی، غیر آئینی ہوتا۔ کانگریس کو ایک منشور کے مطابق الکشن لڑ کر جیتنا تھا۔ اِس کے مطابق کام کرنا اُس کا فرض تھا۔ اس کے سبھی مزدوروں نے سوگند لی تھی کہ اس کی ہدایت کے مطابق کام کریں گے اور جب ہدایت ہوگی تو عہدہ چھوڑ دیں گے۔

کانگریس کے پاس ترکِ وزارت کا ایک ہتھیار تھا جس کے ذریعہ وہ آئینی طریقہ سے اختلاف ہونے پر گورنر کو دے سکتی تھی۔ اگر وہ کسی غیر کانگریسی کو بلا ان شرطوں کو قبول کرائے۔ وزیر بنا دیتی تو اُس کے ہاتھ میں کوئی دوسرا ہتھیار رہتا ہی نہیں جس کے ذریعہ گورنر پر وہ اپنا اثر جما سکتی۔ آئینی وزارت میں، سبھی کی یکساں جواب دہی مانی جاتی ہے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ چاہے کسی بھی وزیر نے کوئی بھی کام کیا ہو، اُس کی جواب دہی اس کے سبھی ساتھیوں پر ہے۔ اِس طرح سبھی ایک دوسرے کی مدد کرتے ہیں اور ایک دوسرے کی کارروائی پر انکس بھی رکھتے ہیں۔ اگر اختلاف ہو گیا تو اکثریت سے الگ رائے رکھتا ہے، اُسے ہٹ جانا پڑتا ہے۔ اگر دو انجمنوں کی ہدایتوں کو ماننے کے لئے پابند یا وعدہ کئے ہوئے وزیر کہیں کسی وزارت میں ہوں اور اِن دونوں جماعتوں نے ایک ساتھ مل کر کام کرنے کا فیصلہ اور انتظام نہ کر لیا ہو تو ہو سکتا ہے کہ دونوں جماعتوں کی متضاد ہدایتیں آئیں اور وزیر اپنی اپنی جماعتوں کی ہدایتوں کو مانیں۔ تو وزارت کی کارروائیوں میں ہی اختلاف پیدا ہو جائے گا۔ اِس لئے یہ ضروری تھا کہ وزارت کے سبھی ارکان کسی ایک جماعت کے حکم ماننے کے لئے پابند یا وعدہ کئے ہوئے ہوں اور آپس میں کم سے کم کچھ ایسے سمجھوتے ہوں جس سے اس قسم کے متضاد پروگرام پیش نہ ہو سکیں اور اگر ہوں تو اُن کا نبٹارا جلد بغیر تلخی کے ہو جائے۔ جب کسی اسمبلی میں جہاں اِس طرح کی آئینی وزارت کام کرتی ہو، کسی ایک پارٹی کی اکثریت نہیں ہوتی اور وزارت ایک سے زیادہ پارٹیوں میں سے لی ہوئی شخصیتوں سے بنتی تو وہاں پہلے اُن پارٹیوں سے گفتگو کر کے اُس کے لئے راہ نکال لی جاتی ہے۔ پھر جب کبھی اختلافِ رائے ہو تو جس پارٹی کی وزارت سے اختلاف ہوتا ہے وہ وزارت سے اپنے وزیر کو ہٹا لیتی ہے اور دوسرے وزیروں کو اپنی پارٹی

کی امداد سے محروم کر دیتی ہے۔ یہاں یہ بات اس لئے نہیں ہوئی کہ یہاں کانگریس کی اتنی غالب اکثریت تھی اور سبھی پارٹیاں ایک ساتھ ملتیں تو کانگریس اکیلے ہی ان سب سے کہیں زیادہ ممبروں کو اپنی طرف سے کھڑا کر سکتی اور سب کو اپنے ہی ووٹ سے ہرا دیتی۔ یہاں کسی دوسری پارٹی کے ساتھ سمجھوتہ کا سوال اٹھتا ہی نہیں تھا۔ تو بھی جہاں تک مسلمانوں کا سوال تھا ہم نے کوشش کی کہ دوسری پارٹی کے مسلمانوں کے ساتھ میں سمجھوتہ کر لیں مگر ایسا نہیں ہوا۔

ہم نے اُس وقت سمجھا تھا اور آج بھی میری رائے وہی ہے کہ آئینی اعتبار سے کانگریس نے کوئی غلطی نہیں کی۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ اُسے انگلستان کے آئین کی تقلید نہیں کرنی چاہئے تھی اور جو جمہوریت کے لگے بندھے ضابطے اور رسم و رواج ہیں اُن سے الگ اپنے رسم و رواج بنانے چاہئیں تھے۔ کسی نے اُس وقت اس قسم کی بات کہی بھی نہیں اور میں نہیں جانتا کہ مسلم لیگ کے سوا آج بھی کوئی صاحبِ خیال فرد یا جماعت ہے جو یہ کہے کہ ہندوستان میں جمہوریت نہیں چل سکتی اور نہیں چلنی۔ اگر جمہوریت نہ چلتی ہو تو ملک میں کوئی دوسرا آئین جو مناسب سمجھیں بنائیں۔ مگر جب تک موجودہ جمہوریتوں کے راستہ پر ہم کو چلنا ہے، اس جمہوریت کے ضابطوں اور رسم و رواج سے ہم خود کو الگ نہیں کر سکتے۔ میں یہ بھی مانتا ہوں کہ ملک کبھی جمہویت کو چھوڑ کر کسی اور طرح کے آئین کو نہیں مانے گا اور اس میں میں مانتا ہوں ہندو اور مسلمان سبھی دوسرے لوگ متفق الرائے ہوں۔ جمہوریت چھوڑنے کے معنی ہونے ہیں کسی فردِ واحد یا جماعت کے ہاتھوں میں ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ سونپ دینا یا ہندوستان کی حکومت کی باگ ڈور دے دینا۔ میں نہیں مانتا کہ مسلمان بھی یہ چاہتے ہیں کہ عوام کے ہاتھوں

ہیں اختیار نہ دے کر کسی ایک فرد یا جماعت کے ہاتھوں میں دے دئے جائیں۔ دوسرے کسی طرف سے کسی جماعت نے آج تک اس طرح کی بات کہی بھی نہیں ہے کہ ہندوستان میں جمہوریت نہیں ہونی چاہیے اور نہیں چل سکتی۔

عین جولائی ۱۹۳۷ء میں تو نہیں۔ جب اور صوبوں میں چند روزہ وزارتوں نے استعفے دے دیئے اور کانگریسی وزارتیں بن گئیں تو اس کے کچھ بعد وزارتِ صوبۂ سرحد کو بھی استعفیٰ دینا پڑا۔ اس صوبے میں چناؤ کے وقت کانگریس پارٹی کے نمائندے ہی سب سے زیادہ چنے گئے تھے مگر ان کی تعداد اتنی زیادہ نہیں تھی۔ جیسا دوسرے صوبوں میں ہوا تھا کہ وہ اکیلے ہی اور سبھی پارٹیوں کو ووٹ سے ہرا دیں۔ اِسی لئے وہاں کی وزارت اور لوگوں کو ملا کر کچھ دیر تک چلتی رہی مگر وہ بھی دیر تک نہ چل سکی۔ اُسے اسمبلی کے اجلاس کے استعفیٰ دینا پڑا۔ دوسرے صوبوں میں اسمبلی کے اجلاس سے پہلے ہی عارضی وزارتوں نے استعفیٰ دے دیا۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ مجھے وہاں بھی جانا پڑا۔ وہاں کی وزارت کی تنظیم میں مدد کرنی پڑی۔ اِس میں کچھ زیادہ دشواری نہیں ہوئی جو کچھ کرنے والے تھے مولانا ہی تھے۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ ڈاکٹر خان صاحب اور خان عبدالغفار خان کے رہتے ہوئے زیادہ کچھ کرنے کی ضرورت بھی نہیں تھی۔ میں نے اس صوبے میں جانے کے لئے اِس موقع کو ایک بہانہ سا ہی مانا۔

صوبہ سرحد کا دورہ

سرحدی صوبے میں میرے جانے کا یہ پہلا موقع تھا۔ ہم لوگ پہلے سیدھے ایبٹ آباد گئے۔ جہاں اُن دنوں گورنر رہتے تھے اور جہاں وزارت کی تشکیل کی بات ہو رہی تھی۔ یہ ایک پہاڑی جگہ ہے جہاں گرمی کی وجہ سے وہاں کی اسمبلی کا اجلاس ہوتا تھا۔ جاتے وقت وہاں پر پہنچنے پر باضابطہ جلوس کی تیاری تھی۔ مولانا صاحب تو جلوس میں شریک نہیں ہوئے۔ مجھے ہونا پڑا۔ مگر راستہ میں پانی زوروں سے برسنے لگا ہم سب بھیگ گئے۔ جلوس بھی منتشر ہو گیا۔ وزارت کی تشکیل کا کام پورا کر کے ہم لوگ چند جگہوں میں گھومے پھرے۔ مانسہرہ ایک جگہ ہے جو پہاڑی پر ہے اور جہاں پر ڈاک بنگلہ سے چاروں طرف کا بہت خوب صورت منظر دیکھنے میں آتا ہے۔ ہم لوگ وہاں تھوڑی دیر کے لئے گئے۔ وہاں سے پشاور آئے۔ پھر خان صاحب کے گاؤں اُتمان زئی چرسدہ ہوتے ہوئے گئے۔ وہاں کے آزاد علاقہ کو دیکھتے پھر پشاور واپس آئے۔ دوسرے دن ہم دوسری طرف کا چکر لگا آئے۔ پھر خیبر کی وادی پار کر کے افغانستان کی سرحد تک پہنچے، جہاں برٹش سرکار اور افغانی سرکار کے سنتری اپنی

اپنی سرحد پر ڈٹے پہرہ دیتے رہتے ہیں - وادیِ خیبر مسحور کن حُسن سے پُر ہے - یوں تو پہاڑ بالکل بے سبزہ و اشجار ہیں - گرمیوں میں گویا آگ برستی رہتی ہے - مگر پہاڑوں کے درمیان راستہ بہت ہی خوبصورت اور سُہانا معلوم ہوتا ہے -

تمام وادی میں جو کئی میل لمبی ہے - حفاظت کے لئے فوجی انتظام ہے - ایک بڑا قلعہ بیچ میں ہے اور ایک جمرود میں جہاں وادی شروع ہوتی ہے، سڑک کے پاس ہی پاس ریل بھی چلتی ہے - جس کے بنانے میں بہت عقل و فراست اور رقم خرچ ہوئی ہوگی - ساری وادی میں - سڑک چھوڑ کر برٹش کی کوئی چیز نہیں ہے - سناکہ صرف سڑک اور اس کے آس پاس دونوں طرف کی کچھ فٹ زمین ہی برٹش کی ہے اور آس پاس کی آبادی، ساری کی ساری آزاد قبیلوں کی ہے جو اپنے مقام پر آزاد ہیں - اُس آزاد علاقہ میں برٹش قانون نہیں چلتا - اِسی لیے سڑک سے کچھ فٹ پر اگر کوئی واقعہ ہو جائے تو اس کی جانچ برٹش افسر نہیں کرتے - سننے میں آیا ہے کہ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اگر کوئی مسافر سڑک سے ہٹ کر آزاد علاقہ میں چلا جاتا ہے تو اسے وہاں کے لوگ اپنے حق کو قائم رکھنے اور جتانے کے لئے گولی مار دیتے ہیں - ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ آزاد علاقہ کے لوگ جب گھر سے باہر جاتے ہیں تو اپنے ساتھ بندوق اسی طرح لے جاتے ہیں جس طرح ہمارے صوبے میں کہیں کہیں لوگ لاٹھی ڈنڈے لے کر نکلتے ہیں -

وہاں کے گاؤں بھی کچھ انوکھے ڈھنگ کے ہیں - ہر گاؤں میں ایک اونچا مقام بنا ہوتا ہے - تقریباً کسی مکان میں ایک گنبد جیسا رہتا ہے - جہاں سے آدمی چاروں طرف دور تک دیکھ سکتا ہے - قبیلہ کے لوگ وہاں سے برابر اس بات کو دیکھا کرتے ہیں کہ کہیں کسی طرف سے کوئی گاؤں پر حملہ کرنے تو نہیں آرہا ہے - یہاں کے لوگ دیکھنے میں

بہت غریب معلوم ہوتے تھے۔ کیونکہ زمین اِس علاقہ میں بہت اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ پانی کی بہت دِقّت تھی۔ یہ آزاد قبیلے خاص کر اِس پہاڑی علاقہ ہی میں رہتے ہیں۔ پشاور ضلع کے چرسدہ کی قرب وجوار کی زمین جہاں سوات اور دوسری ندیاں ہیں بہت اچھی معلوم ہوتی ہے مگر پہاڑی زمین اُپجاؤ نہیں ہے۔ آزاد قبیلوں کی غریبی بھی اُن کی بے قاعدہ زندگی کا خاص سبب ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اُن کی معاشی حالت سدھار کر اُن کی معاشی زندگی کو باقاعدہ بنانے کا کوئی جتن کیا گیا ہے شاید برٹش سرکار کی پالیسی اُن کو ہمیشہ بے قاعدہ رکھنے کی ہی ہے۔ کیونکہ اگر اِس طرف توجہ کی گئی ہوتی تو جتنا خرچ وہاں فوجی کام کے لئے کیا گیا ہے اور کیا جاتا رہا ہے، اُتنے خرچ میں یہ خطۂ زمین اب تک ہرا بھرا بن گیا ہوتا۔ قبیلہ والے دوسرے صوبوں کے لوگوں کے ساتھ سبھی باتوں میں مقابلہ کرتے ہوتے شاید جب تک وہ آزاد ہیں تب تک ایسا کرنا برٹش سرکار کے لئے ممکن نہیں۔ مگر باقاعدہ زندگی والے آزاد اچھے ہمسایہ بھی تو ہو سکتے ہیں۔ اُنھیں آزاد رہنے دے کر بھی اُن کی تعلیم و تنظیم میں خرچ کیا جا سکتا ہے۔ جو خرچ وقت وقت پر توپوں اور ہوائی جہازوں کے گولوں کا شکار بنا کر دبانے میں کیا جاتا ہے۔ وہی خرچ اُن کے اور ہندوستان کے لئے دونوں کے لئے۔ زیادہ مفید ہوتا۔

سرحد سے واپسی کے وقت میں، اور میرے ساتھ بابو متھرا پرشاد جو میرے ساتھ وہاں گئے تھے، دونوں ہی راستہ میں اُفتادہ تکشلا کے کھنڈروں کو دیکھنے گئے۔ وہاں کھدائی سے نکلی ہوئی چیزوں کو وہاں کے عجائب گھر میں دیکھا۔ کھنڈروں کو تو گھوم پھر کر دیکھا۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہاں ایک بہت ہی وسیع شہر رہا تھا جس میں چوڑی سڑکیں تھیں جن کے کنارے دو رویہ مکان بنے تھے۔ مکانوں میں بود و باش اور آرام

کے لئے ہر طرح کا انتظام تھا۔ سب کچھ دیکھنے سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ ایک انتہائی ترقی یافتہ جگہ کے کھنڈر ہیں۔ یہ قدیم ہندوستان کی اُن یادگاروں میں ہیں جن کی وجہ سے آج بھی ہم اپنا سر اونچا رکھ سکتے ہیں۔ یہاں ایک مشہورِ زمانہ یونیورسٹی تھی۔ یہاں ہندوستان کے باہر سے بھی طالب علم آیا کرتے تھے۔ یہاں کے طالب علم ہندوستان کے سبھی مقامات پر جا کر اپنی شہرت پھیلائے ہوئے تھے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ سارے صوبہ سرحد میں بودھوں کے زمانے کی یادگاریں پائی جاتی ہیں۔ اگر ہم وہاں کچھ دن ٹھہر سکتے تو ایسی یادگاریں دیکھ سکتے مگر اس کے لئے وقت نہ تھا ہم کو اس کے لئے وقت نہ ملا کہ ہم کوہاٹ اور ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے علاقہ تک جا سکیں۔ اِس لئے صرف ہزارہ اور پشاور کے کچھ حصوں کو دیکھ کر ہی بادل ناخواستہ واپس آئے۔

ہم جیسے بہاریوں کے لئے جس کو دانا پور کی فوجی چھاؤنی کے سوا اور کہیں کوئی خاص فوجی سامان یا پڑاؤ دیکھنے کا موقع نہیں ملتا۔ سرحد کا صوبہ ایک بڑا فوجی اڈہ نظر آیا۔ جہاں جائیے، جدھر جائیے، فوجی چھاؤنی موجود ہے۔ فوجی سڑکیں۔ فوجی اڈے ہر طرف سامنے آجاتے ہیں۔ یہ سلسلہ پنجاب سے ہی شروع ہو جاتا ہے اور جیسے جیسے پچھم کی طرف بڑھتے جائیے یہ فوجی نظارے بڑھتے جاتے ہیں۔ صوبۂ سرحد تو گویا سارے کا سارا فوجی اڈہ ہی ہے۔

خیبر کی وادی دیکھ کر ایک بات دل میں آئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ ایک ایسی وادی ہے جہاں بچاؤ بہت آسانی سے کیا جا سکتا ہے۔ خاص کر جب ہوائی جہاز نہیں تھے۔ خدا نے اِس ملک کے شمال کی طرف ہمالیہ کو کھڑا کر کے مشرقی اور مغربی سرحدوں پر پہاڑی سلسلوں کی دیواریں کھڑی کر کے ایک ایسی حد بندی کر دی ہے جسے چھوڑ کر

کوئی شخص باہر سے ہندوستان پر حملہ نہیں کر سکتا۔ اِس طرح ایک طرف قدرت نے زمینی حملہ سے اس ملک کو محفوظ بنا دیا اور دوسری طرف سمندر نے اُس کے لئے ایک زبردست خندق کا کام کیا۔ مگر پھر بھی ہم اِس ملک کے لوگ اتنے بدقسمت ہیں کہ آپس کی پھوٹ کی وجہ سے اِس بنی بنائی گھاٹی کی بھی حفاظت نہ کر سکے۔ انگریزوں سے پہلے آج تک جتنی چڑھائیاں ہندوستان پر ہوئیں تقریباً سبھی اِس وادی سے ہوئی ہیں۔ انگریز بھی برابر ڈرتے رہے ہیں کہ کہیں روس اِس راستہ سے ہندوستان پر چڑھائی نہ کر دے۔ اِسی لئے وہاں اتنی فوجی تیاری ہے۔ روس کا خوف کم ہونے پر ان کو جرمنی کا خوف رہتا ہے شاید اسلامی ملکوں سے بھی ڈرتے ہیں۔ اب جب ہوائی جہاز کا بول بالا ہو گیا ہے اِس وادی کی اہمیت شاید اتنی نہ رہے۔ مگر اِس پر افسوس ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ حفاظت کے سبھی سامان خدا جمع بھی کر دے اور انسان اپنے نکمّے پن سے اُس کا صحیح استعمال نہ کر سکے تو اُس کی حفاظت نہیں ہو سکتی۔ خیبر وادی اور ہندوستان کی تاریخ اِس کی شاہد ہیں کہ جو اپنی مدد نہیں کرتا اس کی مدد خدا بھی نہیں کرتا اور جو خدائی وسائل کو بھی کام میں لانے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اُس کا زوال لازمی ہے جیسے راس کماری میں پہنچ کر ہندوستان کی عظمت کا نظارہ آنکھوں کے سامنے جھلک گیا تھا۔ ویسے ہی خیبر وادی کو دیکھ کر ہندوستان کے باشندوں کی بے عملی کی تصویر آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگی۔

وزارتوں کی کچھ آئینی دشواریاں

وزارتوں کا کام شروع ہو گیا اور چلنے لگا۔ بہار میں ایک سوال سامنے آیا جس کا حل کچھ دشوار تھا اور جس نے بعد میں ہمارے لئے دشواریاں پیش کیں جب مسٹر یونس وزیر ہوئے اُنہوں نے سر سلطان احمد۔ کو بہار کا ایڈوکیٹ مقرر کر دیا۔ سر سلطان احمد کئی برسوں سے ایڈوکیٹ تھے ۔ نئے آئین میں سرکاری ایڈوکیٹ کی جگہ ایڈوکیٹ جنرل مقرر کرنا تھا۔ وہ اُسی زمانے میں گورنمنٹ آف انڈیا (حکومت ہند) میں وائسرائے کی اگزکٹو کونسل کے ممبر مقرر ہو گئے۔ سنا گیا کہ انہوں نے وائسرائے کی کونسل میں کانگریس کے ساتھ سمجھوتہ کر لینے کی بات پر زور بھی دیا تھا۔ جب وائسرائے کا بیان نکلنے کے بعد، کانگریسی وزارت بنی تب بھی وائسرائے کی کونسل کے ممبر تھے ۔ بہار کی وزارت کے سامنے یہ سوال آیا کہ وہ از سرِ نو ایڈوکیٹ جنرل کا تقرر کرے یا مسٹر یونس کے کئے ہوئے تقرر کو ہی بحال رکھے۔ ایڈوکیٹ جنرل سرکار اور وزارت کا قانونی صلاح کار ہوتا ہے ۔ نئے آئین میں اُسے بغیر ممبر ہوئے ہی اسمبلی اور کونسل میں کسی معاملہ پر بولنے کا حق ہے ۔ یہ حق اِس لئے دیا گیا کہ کوئی قانونی بحث اُٹھ جانے پر ایک ایسا آدمی ہونا چاہئے جو ذمہ داری کے ساتھ سرکار اور وزارت کی طرف سے بات

کرسکے۔ انگلستان میں سب سے بڑا قانونی افسر جو سبھی ججوں کے اوپر سمجھا جاتا ہے لارڈ چانسلر ہوتا ہے۔ وہ دارالامراء میں صدر کا کام کرتا ہے۔ جب اس ایوان کے سامنے قانونی طور پر اپیل پیش ہوتی ہے۔ تب بھی وہ صدارت کرتا ہے اسی لئے وہ ہمیشہ ایک نامی قانون داں آدمی ہوا کرتا ہے۔ یہ تو ہوئی ججوں کے سردار کی بات۔ سب سے بڑا قانونی صلاح کار، اٹارنی جنرل بھی وزارت کا ایک رُکن ہوتا ہے۔ وہ دارالعوام کا ممبر ہوتا ہے۔ ان دونوں جگہوں پر وزارت کے ساتھ ساتھ ان کے تقرر کے لئے بھی نام دیا کرتا ہے اور شہنشاہ انگلستان انہیں ہی مقرر کر دیتے ہیں۔

ہمارے یہاں لوگوں کا خیال ہوا کہ انگلستان میں جو اٹارنی جنرل کا مقام ہے وہی مقام ایڈوکیٹ جنرل کا بھی ہونا چاہیئے۔ اس کا تقرر اور استعفےٰ بھی وزارت کے ساتھ ہی ہونا چاہیئے۔ اگر گورنر کے ساتھ اختلاف ہونے کی وجہ سے یا اسمبلی کے عدم اعتماد ظاہر کرنے کے سبب سے وزارت استعفےٰ دے تو اسے بھی ہٹنا چاہیئے اور جو نئی وزارت بنے اُسے نئے آدمی کو اِس جگہ مقرر کرنے کا حق ہونا چاہیئے۔ جیسا انگلستان میں ہے۔ اِس کے لئے کافی وجوہ بھی ہیں۔ وزارت کو ایسا قانون داں صلاح کار رکھنے کا حق ہونا چاہیئے جس پر اُس کا اعتماد تو ہو ہی، وہ اس کے خیالات اور لائحہ عمل سے بھی پوری طرح واقف و متفق ہو تاکہ وزارت کے کام چلانے میں وہ قانونی طور پر ہر پہلو سے پوری مدد کر سکے۔ بہار میں کابینہ کے آگے سب سے بڑا سوال قانون لگان کی ترمیم کا تھا۔ اس معاملہ میں اختلاف رائے کی کافی گنجائش تھی۔ کابینہ کا خیال تھا کہ کوئی پکا کانگریسی، جس کا خیال وزارت کے خیالوں سے ملتا ہو، ایڈوکیٹ جنرل ہونا چاہیے۔ سر سلطان کچھ ایسے آدمی نہیں تھے جو کابینہ کی ہاں میں ہاں ملایا کرتے۔ اگر کسی معاملہ میں کابینہ سے اُن کا اختلاف ہو جاتا

توپھر کابینہ کو اُن کے خیالات اور قابلیت کا فائدہ نہ ملتا۔ اِسی وجہ سے انگلستان میں بھی اٹارنی جنرل وزارتی پارٹی کا ہی آدمی ہوا کرتا ہے۔ یہ سوچ کر وزارت نے میری رائے سے طے کیا کہ وہ اپنا ایڈوکیٹ جنرل مقرر کرے گی۔ وہ اِس رسم کو چلانا بھی چاہتی تھی کہ اُس کو اپنا قانونی صلاح کار چننے اور مقرر کرنے کا حق ہونا چاہیئے۔ اگر رائج ہو جائے تو یہ صرف کانگریس کے لئے ہی نہیں ہوگی۔ چاہے جس پارٹی کے لوگ ہوں۔ جب اپنی وزارت بنائیں گے تب اپنا صلاح کار مقرر کریں گے اور اِس رسم سے فائدہ اٹھائیں گے۔

یہی سوال صوبہ بمبئی میں بھی پیش ہوا۔ وہاں ایک انگریز ایڈوکیٹ جنرل تھا۔ کانگریس جنہیں مقرر کرنا چاہتی تھی۔ وہ صاحب اُس زمانے میں کہیں ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ جب یہ بات گورنر سے کہی گئی تو اُنہوں نے یہ منظور کرنا نہیں چاہا کہ کابینہ کو ایڈوکیٹ جنرل مقرر کرنے کا حق ہے۔ مگر اُنہوں نے سر سلطان کو شاید سب باتیں لکھ بھیجیں۔ سر سلطان نے شملہ سے استعفٰے لکھ بھیجا۔ اتفاق سے مرکزی حکومت میں کام کرنے کی اُن کی میعاد بھی کسی وجہ سے بڑھ گئی۔ اِس لئے دیکھنے میں تو معاملہ سلجھ گیا اور کانگریسی وزارت نے شری بلدیو سہائے کو ایڈوکیٹ جنرل مقرر کر دیا۔ مگر آگے چل کر مسلمانوں نے اِس بات کو ہندو مسلم تنازعہ کی شکل دے دی۔ کچھ کہنے لگے کہ سر سلطان صرف اِس لئے ہٹا دیئے گئے کہ وہ مسلمان ہیں۔ میں تو اِس بحث کے دوران برابر کابینہ کے ساتھ رہا۔ اِسی لئے میں کہہ سکتا ہوں کہ اِس تقرر کے وقت ہندو مسلم سوال کسی کے ذہن میں ایک لمحہ کے لئے بھی نہ آیا۔ سوال یہی تھا کہ سیاسی نظر سے اور خاص کر اگان قانون کی درستی سامنے رکھتے ہوئے کس سے زیادہ مدد ملے گی اور قانونی صلاح کار کے تقرر میں انگلستان کا رواج چلا جانا اچھا ہوگا یا نہیں۔ اِسی رسم کے مطابق آئین میں ایسی ترمیم کرانے کا سب کا

خیال تھا کہ گورنر صرف آئینی گورنر رہ جائے اور سبھی اختیارات وزارت کے ہاتھ میں آجائیں۔ جب آئین میں ترمیم ابھی نہیں ہو سکتی تو کانگریس نے گورنروں سے خاص اختیارات کو برتنے کا وعدہ لے کر اِس کمی کو اس طرح دُور کرایا تھا۔ یہ ایک معاملہ اور تھا جس میں یہاں کا آئین انگلستان کے آئین کے نزدیک پہنچایا جا سکتا تھا اور کانگریسی وزارت نے اِسی مقصد سے اس بات پر زور دیا۔

بمبئی میں انگریز ایڈوکیٹ جنرل نے استعفےٰ دے دیا۔ کسی نے پھر اس کی شکایت کچھ نہیں سنی مگر بہار میں اس کی آئینی شکل نہ بن ڈال دی گئی۔ اس کی فرقہ وارانہ اہمیت ہوگئی۔ افسوس کی بات ہے۔ مگر ہم اِس بات کو آج بھی مانتے ہیں کہ ایسا کرنے میں وزارت نے فرقہ وارانہ خیالات کو اپنے نزدیک نہیں آنے دیا۔ جب قانون لگان کی ترمیم پیش ہوئی تو یہ بات صاف ہوگئی۔ مگر جہاں فرقہ وارانہ باتیں اُٹھا دی جاتی ہیں وہاں ہماری آنکھیں اور سب چیزوں کو دیکھنے سے قاصر رہ جاتی ہیں۔

کسانوں اور زمینداروں کا سمجھوتہ

وزارت سازی کے بعد مجھ پر یہ ذمہ داری رہی کہ حتی المقدور میں اُن کی (خاص کر بہار میں) حسب ضرورت مدد کروں۔ شروع میں ہی میرے سامنے دو سوال آ گئے۔ یو۔پی وزیراعلیٰ پنڈت گووند بلبھ پنت نے چاہا کہ کانپور میں مل مزدوروں کی حالت کے متعلق جانچ کی جائے اور اُن کی حالت بہتر بنانے کی بھی کوشش کی جائے۔ اِس کے لئے وہ کمیٹی بنانا چاہتے تھے۔ اُنہوں نے مجھے اس کا صدر بنانا چاہا۔ کام ضروری تھا۔ مگر مجھ میں اِس کے لئے کوئی خاص قابلیت نہیں تھی کیونکہ میں نے نہ تو کبھی مزدوروں کے درمیان کچھ کام کیا تھا اور نہ اِن خاص سوالوں کا مطالعہ۔ پنت جی کا خیال تھا کہ ایک طرح سے یہی میری خاص قابلیت تھی کیونکہ میں باتوں کو جانچ کر جو مجھے مناسب معلوم ہوگا کہہ سکوں گا۔ اور پہلے لگے بندھے لائحہ عمل یا خیالات کی بندش سے آزاد ہونے کی وجہ سے، حالات کے مطالعہ کی بنیاد پر ہی اپنی رائے قائم کر سکوں گا۔ اِس کے سوا وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ مجھ میں مزدور اور مل مالک دونوں فریقوں کا اعتماد ہوگا اور میرے "تقرر" سے دونوں مطمئن ہوں گے۔ میں پہلے تو بہت انکار کرتا رہا مگر آخر مجھے یہ عہدہ قبول کرنا پڑا۔ جس وقت

میں سرحد میں وہاں کی وزارت کی تشکیل کے لئے جا رہا تھا۔ میں لکھنؤ میں کچھ دیر کے لئے ٹھہر گیا۔ ایک طرح سے اِس کمیٹی کے کام کی ابتدا اُس وقت ہو گئی۔ اگرچہ باقاعدہ کام اُدھر سے واپسی کے بعد ہی شروع ہوا۔

دوسرا کام جو مجھے جلد شروع کرنا پڑا وہ تھا اپنے پورب کے کسانوں اور زمینداروں سے بات چیت کر کے لگان کے قانون کی درستی کے لئے اگر ہو سکے تو دونوں کو متفق الرائے کر دینا۔ اس کی ابتدا ابھی وزارت بننے کے تھوڑے ہی دنوں بعد ہوئی۔ جس وقت ہم لوگ ۱۹۳۰-۳۴ء کے ستیاگرہ میں لگے تھے، بہار کے گورنر کی حوصلہ افزائی سے یہاں ایک پارٹی بنی تھی جس کا نام تھا یونائیٹڈ پارٹی۔ اُس زمانے میں نئے آئین کے متعلق انگلستان میں گفتگو چل رہی تھی۔ یہ سمجھا جاتا تھا کہ نئے آئین میں کچھ نہ کچھ حق تو عوام کے نمائندوں کو ملے گا ہی۔ اِس لئے اگر کوئی ایسی پارٹی بنے جو عوام کے ذریعہ منتخب ہو سکے اور جو کانگریس کی طرح بالکل آزاد نہ ہو تو سرکار کے لئے بھی وہ باعثِ سہولت ہو گی۔ اِسی خیال سے اس پارٹی کی تخلیق میں اس زمانے کے گورنر نے ہاتھ بٹایا تھا۔ اسی مقصد سے اس وقت کی کونسل میں زمینداروں کی طرف سے ایک بل پیش کیا گیا تھا جس کے ذریعہ لگان کے قانون میں کچھ ترمیمیں پیش کی گئی تھیں۔ یہ ترمیمیں کسانوں کے حق میں ٹھیک تھیں۔ امید کی گئی تھی کہ اس طرح کسان جن کی تعداد یقیناً ووٹروں میں بہت زیادہ ہو گی۔ یونائیٹڈ پارٹی کے حق میں کر لئے جائیں گے اور یہ پارٹی انتخاب میں کامیاب ہو سکے گی۔ کچھ دور اندیش زمیندار یہ بھی ضرور سوچتے تھے کہ جب اس طرح کسانوں کے ہاتھ میں اختیارات جا ہی رہے ہیں تو ان کو خوش رکھنا ہی ہمارے لئے مفید ہو گا۔ کچھ ایسے بھی زمیندار ضرور ہوں گے جو کسانوں کے مطالبوں کو منصفانہ

مانتے ہوں گے اور اسی لئے قانون میں ترمیم ضروری سمجھتے ہوں گے۔ بہر حال کچھ ایسے لوگ جو پہلے کسانوں میں کچھ کام کیا کرتے تھے اور جو کسانوں کے رہنما اور لیڈر سمجھے جاتے تھے، اِس پارٹی میں شریک ہو گئے۔

سوامی سہجانند نے کسان سبھا کو بیدار کر کے اِس بل کی مخالفت کی۔ اس مخالفت کے لئے کسان منظّم بھی ہو گئے۔ ان دنوں کانگریس غیر قانونی انجمن تھی۔ اِس نام سے کوئی کام نہیں ہو سکتا تھا۔ اِس کے کارکن بھی، جو اِس کام کو کر سکتے تھے۔ بہت بڑی تعداد میں جیلوں میں بند تھے۔ اِس مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ترمیموں میں اور ترمیم ہوئی۔ آخر میں جب ہم لوگ ۱۹۳۴ء میں جیل سے باہر نکلے تو ہم لوگوں سے بھی باتیں ہوئیں کہ ترمیم سب کی رائے سے کی جائے۔ ہم لوگوں کے آدمی ان دنوں کونسل میں نہیں تھے۔ بات اتنی آگے تک پہنچ گئی تھی کہ ہم کانگریس کی طرف سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ جو کچھ ترمیم ہوئی اور اس سے جو کچھ فائدہ پہنچ سکتا تھا وہ کسانوں کو ملا مگر معاملہ طے نہیں ہوا۔ الکشن کے وقت تک پارٹی بھی کچھ غیر منظّم ہو گئی اور الکشن سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ کسانوں کو زمینداروں سے ملانے کی کوشش بھی بار آور نہیں ہوئی۔ کانگریس کے منشور میں کسانوں کی حالت سدھارنے پر زور دیا گیا تھا۔ زمیندار بھی جانتے تھے کہ اِس بارے میں وزارت ضرور اور جلد کچھ کرے گی ہی۔ وہ بھی چاہتے تھے کہ اگر مشورہ سے کوئی بات ہو جائے تو اُن کے لئے بھی اچھا ہوگا۔ کیونکہ تب وہ اِس بدنامی سے بچ جائیں گے کہ وہ اپنے ذاتی مفاد سے وابستہ رہے اور کانگریس نے زبردستی قانون بنا کر کسانوں کی بھلائی کی۔ وزارت بننے کے بعد ہی، ان کے کچھ خواص وزیروں سے ملے۔ اُنھوں نے یہ سوال پیدا کیا کہ قانون لگان اور کسانوں کی حالت درستی کے متعلق سرکار جو کچھ کرنا چاہے، اُس کے لئے زمینداروں سے

بات کرلے ۔ وہ بھی تیار تھے کہ حتی الوسع وہ مدد کریں گے۔ کابینہ کی رائے ہوئی (جس سے میں بھی متفق تھا)، کہ قانون لگان کی ترمیم کے متعلق اگر کوئی چیز بات چیت سے طے ہوجائے تو اچھا ہوگا کیوں کہ اس حالت میں جو بھی قانون بنے گا وہ جلد اور آسانی سے اسمبلی اور کونسل میں پاس ہوجائے گا۔ اِس سے کسانوں کو حکومت جلد سے جلد فائدہ بھی دلوا سکے گی اور آپس کی بددلی بھی کم ہوگی، زمیندار مخالفت کر کے قانون کا بنانا روک تو نہیں سکیں گے، کیونکہ کانگریس کی بہت غالب اکثریت تھی، مگر ہر قدم پر آئینی طریقہ سے بحث و مباحثہ کے ذریعہ کچھ وقت تک روک سکیں گے۔

کانگریس کا فیصلہ تھا نئے آئین کو نامنظور کرنے یعنی اُسے ناکارہ بنانے کا۔ ہوسکتا ہے کہ جلد ہی کچھ تجربہ کے بعد وزارت چھوڑ دینے کا فیصلہ کرنا پڑے۔ اِسی لئے جو کچھ ہوسکے اور جہاں تک جلد ہوسکے، عوام کی خدمت اور فلاح ہوجائے تو ٹھیک رہے گا۔ مزید براں زمیندار مالدار ہیں اپنا انتظام کرلینے کی طاقت رکھتے ہیں مگر کسان غریب ہیں اور اتنے منظم نہیں ہیں۔ قانون بنتے پر بھی اس کو بے کار بنانے کے ہزاروں طریقے وکیل نکال سکتے ہیں۔ اگر ترمیم جھگڑے کے بعد ہوگی تو سرکار کی کوششوں کے بعد بھی اس سے فائدہ اٹھانے میں کسانوں کو بڑی سختیوں کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ اِن سب خیالات سے کابینہ نے میری منظوری سے چاہا کہ اگر کوئی بات صلح سے طے ہوسکے تو اچھا ہوگا۔ ہاں اگر صلح کی کوشش سے کوئی قابل اطمینان نتیجہ نہ نکلے تو پھر جیسا مناسب ہو کیا جائے گا۔ صلح کی کوشش سے خاص کر جب زمیندار بھی اُسے چاہتے تھے فائدہ ہی ہوگا۔ اِسی لئے سوچا گیا کہ بشرطیکہ فرصت میں ان سے گفتگو شروع کروں۔ پارلیمنٹری کمیٹی کے ایک ممبر مولانا آزاد بھی تھے۔ زمیندار اُن سے بھی ملے۔ اُنھوں نے بھی اس بات کو پسند کیا۔

اس طرح مولانا آزاد اور میں دونوں مل کر پٹنہ میں زمینداروں کے نمائندوں سے باتیں کرنے لگے۔

اِس بارے میں ایک سوال یہ بھی تھا کہ کسان سبھا یا اُس کے خاص کارکنوں سے ہمارا کیا تعلق رہے گا۔ ہم یہ مانتے تھے کہ کانگریس پر کسانوں کو پورا بھروسہ تھا اور ہم بھی اُن کے مفاد کا خیال کر کے اُن کی بھلائی کے لئے جو کچھ ہو سکتا تھا، کر سکیں گے۔ ہم زمینداروں اور کسانوں کو آپس میں سمجھوتہ کرنے کے لئے چھوڑ دیں اور وہ کرلیں تو یہ اور بھی اچھا ہوگا۔ مگر جہاں تک ہم دیکھ اور سمجھ سکتے تھے، اِس کی اُمید نہیں ہوتی تھی کہ دونوں فریق کسی بات پر رضامند ہو سکیں گے۔ لہٰذا ہم کو بیچ میں پڑنا ہی ہوگا۔ ہم کانگریس کو اِس قابل سمجھتے بھی تھے۔ ہم جانتے تھے کہ جب کوئی بات سمجھوتے سے طے ہوتی ہے تو اُس میں کسی فریق کی بات پوری نہیں مانی جا سکتی۔ دونوں کو کچھ نہ کچھ اُترنا یا جھکنا پڑتا ہے۔ اِس لئے اُن دونوں پر بار نہ چھوڑ کر اگر کانگریس ہی یہ کام کرے تو بُرا نہ ہوگا۔ اِس کا ایک نتیجہ کسانوں کے حق میں یہ ضرور رہے گا کہ جو رعایتیں ان کو ملیں گی انہیں وہ کشادہ پیشانی سے لے سکیں گے اور اِس سے جو زیادہ ضروری سمجھیں گے، اُسے مانگتے رہیں گے کیونکہ وہ کسی سمجھوتے کی بندش میں بندھے نہیں ہوں گے۔ یہ بات زمینداروں سے بھی کہہ دی گئی۔ اُنھوں نے بھی یہ سمجھ لیا کہ ہم کسان سبھا کی طرف سے باتیں نہیں کر رہے ہیں۔ اگرچہ کسانوں کے لیڈروں سے ہم سبھی باتوں میں مشورہ برابر لیتے رہیں گے۔

ایک دوسری بات اور طے کرلینی تھی۔ کیا یہ سمجھوتہ صرف لگان قانون کے بارے میں ہوگا یا اور معاملوں سے بھی تعلق رکھے گا؟ حکومت کو آمدنی بڑھانے کی ضرورت تھی، اس کے لئے وہ ایک نیا ٹیکس لگانے والی تھی جس میں زمینداروں کو زیادہ دینا پڑتا۔ ہم نے

سوچ لیا کہ ہو سکے تو اس کو بھی سمجھوتے کے ذریعے سے طے کرلیں گے۔ کئی دنوں تک گفتگو چلی۔ صداقت آشرم میں ہی نشست ہوتی، میں کچھ بیمار بھی تھا۔ اِس لئے لوگ مجھے آنے جانے کی مصیبت سے بچا دینا بھی چاہتے تھے۔ سبھی سوالوں پر ہم زمینداروں کی رائے سُن لیتے، وزیروں سے بھی باتیں کرکے اُن کی رائے بھی جان لیتے۔ اِس طرح ہر نقطۂ نظر سے پوری طرح واقفیت کرنے کے بعد کچھ طے کرلیتے جسے ہم اور زمیندار دونوں منظور کرتے۔

تین چار سوال خاص تھے۔ لگان میں جو کمی ہونی چاہیئے وہ کس طرح اور کس تعداد میں ہو کہ کسی کے ساتھ بے انصافی نہ ہو اور سب کو فائدہ بھی پہنچ سکے؟ یہ سرسری طور پر روپے میں کچھ آنے لگان کم کردینے سے ہوسکتا تھا۔ مگر تمام صوبے کی یکساں حالت نہیں تھی۔ صوبہ میں کاشتکاری زمین پر چار آنے سے لے کر بیس پچیس روپئے بیگھے تک لگان لگتا تھا۔ کہیں حال ہی میں مال گذاری میں اضافہ ہوا ہے اور کہیں نہیں ہوا۔ کہیں اضافہ بہت زیادہ ہوا۔ کہیں بہت تھوڑا اور کہیں بالکل نہیں۔ کہیں بٹائی کا لگان بدل کر نقدی کردیا گیا ہے اور کہیں ایسا ہوا ہی نہیں ہے۔ اگر ساری جگہوں میں بلاامتیاز ایک ہی شرح سے لگان گھٹا دیا جائے تو کچھ کسان بہت منافع میں رہیں گے، کچھ کو صرف نام نہاد رعائتیں ملیں گی۔ کچھ زمینداروں کے ساتھ بے انصافی ہوجائے گی اور کچھ مزے سے بچ جائیں گے۔ خاص کر جو کسان بہت سخت لگان ہونے کے سبب سے بہت مصیبت میں ہے، اُس کو بہت تھوڑی رعائتیں ملیں گی۔ یا اسے یوں کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا کہ جس کسان پر بہت بوجھ ہے وہ تقریباً ویسا کا ویسا ہی بوجھ ڈھوتا رہ جائے گا اور جس پر کم ہے اس پر اور بھی کم ہوجائے گا۔ جس کو رعایت کی سب سے زیادہ ضرورت ہے اُسے وہ نہیں کے برابر ملے گی اور جس پر پہلے سے ہی لگان کی کفایت ہے اُسے اور بھی زیادہ رعایت مل جائے گی اور اِس لئے سرسری

لگان گھٹانے کی بات زمینداروں نے اور ہم نے نامنظور کردی۔ ایک ایسا نسخہ تجویز کیا گیا جس سے خاص کر وہاں زیادہ رعایت ملے جہاں بہت زیادہ لگان ہو گیا تھا، چاہے وہ اضافہ کی وجہ سے ہو یا بٹائی سے نقد لگان کر دینے کے سبب سے، اور جہاں کم ہے وہاں کم رعایت ملے یا بالکل نہ ملے۔ ہم نے موٹا موٹا حساب لگا کر سوچا تھا کہ اِس طرح سارے صوبے کے لگان میں روپے میں چار آنہ گھٹ جائے گا۔ کہیں کہیں تو روپے میں آٹھ دس آنے تک کی کمی ہو گی اور کہیں کہیں بالکل نہیں۔ جس زمیندار نے جتنی طاقت سے کام لیا ہوگا اور جتنا لگان بڑھایا ہوگا، اس کی آمدنی اسی تناسب سے کم ہو گی۔ جس نے کم بڑھایا ہو گا، اُس کی آمدنی کم گھٹے گی۔ آخر جب سرکاری کارکنوں نے لگان میں کمی کی کارروائی کی اور لگان میں کمی کی گئی، تو معلوم ہوا کہ ہم لوگوں کا وہ تخمینی حساب کہ صوبے میں اندازاً ایک چوتھائی لگان کم ہو جائے گا۔ تقریباً ٹھیک ہی نکلا۔

دوسرا سوال تھا کسانوں کے اپنی کاشتکاری منتقل کرنے کا۔ بنگال کے قانون لگان کے مطابق جو بہار میں بھی نافذ ہوتا تھا یہ حق ان کو معمولی طور پر نہیں تھا۔ اِس لئے کوئی کاشتکار، کاشتکاری بیچ نہیں سکتا تھا۔ مگر وکیلوں کی عقل اور ججوں کے فیصلے نے قانون کو گورکھ دھندا بنا رکھا تھا۔ جو آدمی قانون داں نہ ہوتا، اس کے لئے یہ سمجھ لینا آسان نہ تھا کہ کاشتکاری زمین کس حالت میں اور کس طرح منتقل ہو سکتی ہے۔ یکبارگی بیچ کر یا ادائگی سود لگا کر یا زرِ پیشگی کے ذریعے۔ اور اگر منتقل کی جا سکتی ہے تو کتنی تعداد میں۔ سب کی سب زمین یا اس کا ایک حصہ۔ اور اگر صرف حصہ ہو تو وہ بھی کتنا؟ ایسے بہت سے مشکل سوال اٹھے تھے۔ وقتاً فوقتاً ہائی کورٹ کے فیصلے بھی ہوئے تھے۔ کبھی دو ججوں نے فیصلہ کیا تو اُس پر تین یا پانچ ججوں نے نظرِ ثانی کی۔ کبھی فیصلہ بدلا گیا تو کبھی اُس میں اور نئی

باریکی لادی گئی۔ بنگال سے بہار کے الگ ہو جانے پر یہاں ہائی کورٹ نے اپنا ہی خیال رکھا جو ہمیشہ کلکتہ کے خیال سے نہیں ملتا تھا۔ اِس لئے یہ ضروری تھا کہ اِس معاملہ میں قانون صاف ہو جائے جسے سبھی لوگ، خاص کر کسان آسانی سے سمجھ سکیں۔ اِس کے دو طریقے تھے، یا تو منتقل کرنے کا حق بالکل نہ دیا جائے اور قانوناً اُسے یکبارگی کر دیا جائے یا یہ حق پورا پورا دے دیا جائے اور اُس میں کسی قسم کی رکاوٹ نہ رہے۔ کسان سبھا کے لوگ غیر متنازعہ طریقہ پر زمین بیچنے کی مکمّل آزادی چاہتے تھے۔ زمیندار اسے منظور نہیں کرتے تھے کیوں کہ ان کا دعویٰ تھا کہ زمین اُن کی ہے۔ اُنھوں نے صرف کاشت کے لئے ہی اسے کسان کو دیا ہے۔ اِسی لئے کسانوں کو حق بیع نہیں ہے۔ ہاں اگر زمیندار بیچنے کی منظوری دیدے تو وہ بیچ سکیں۔ اِس معاملہ پر کسان سبھا کا بہت ہی زور تھا۔

میرا اپنا خیال تھا اور آج بھی ہے کہ بغیر روک ٹوک اگر زمین بیچنے کا حق کسانوں کو دے دیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ چھوٹے چھوٹے کسانوں کے ہاتھ سے زمین نکل کر دوسروں کے ہاتھ میں چلی جائے گی۔ اِس لئے اُن کی حفاظت کے خیال سے ان کو یہ حق پوری طرح نہیں ملنا چاہیئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ آج بھی اگر اس بات کی جانچ کی جائے تو پتہ لگ جائے گا کہ اِس طرح بہت سی زمین کچھ دنوں کے بعد غریبوں کے ہاتھ سے نکل کر مال دار لوگوں کے قبضہ میں چلی جائے گی اور کھیتی ہار مزدوروں کی تعداد بہت بڑھ جائے گی۔ یہ میرا ذاتی خیال تھا مگر میں جانتا تھا کہ جتنے بولنے والے کسان تھے اس کے خلاف تھے۔ زمینداروں نے اپنے ترمیمی قانون میں ایک طرح سے زمین منتقل کرنے کے حق کو پورا پورا مان لیا تھا۔ صرف ایک شرط رکھی تھی کہ زمین فروخت ہونے پر اُن کو کچھ مل جایا کرے۔ ہم نے بھی اُن سے طے کیا کہ بیچنے کا حق آئینی ہو جائے اور جو سلامی زمیندار

کو ملتی تھی وہ اور بھی کم ہو جائے۔

تیسری بات یہ تھی کہ لگان اگر باقی رہ جائے تو زمیندار کو بہار میں یہ حق نہیں تھا کہ لگان باقی رہنے کے سبب سے کسان کو وہ کھیت سے بیدخل کر دے وہ عدالت میں باقی لگان کے لئے نالش کر کے ڈگری حاصل کر سکتا تھا اور اس ڈگری کو جاری کرا کر اُس کے سارے جوت کو نیلام کرا سکتا تھا۔ کسانوں کو شکایت تھی کہ تھوڑی بقایا رہنے پر بھی سارا جوت نیلام ہو جایا کرتا ہے جس سے اُن کا بہت نقصان ہوتا ہے۔ زمینداروں کا کہنا تھا کہ پڑوسی اتر پردیش میں بقایا لگان کے لئے کاشتکار اپنی زمین سے بے دخل کیا جاسکتا ہے۔ یہاں تو اس سے بہت کم سختی ہوتی ہے۔ اگر کسانوں پر اتنا دباؤ بھی نہ رہے گا تو وہ لگان دینے میں بہت آنا کانی کریں گے اور وصولی میں زمیندار کی دقت اور بڑھ جائے گی۔ اِس کے بارے میں یہ طے ہوا کہ لگان کی جتنی بقایا نکلے اتنی ہی قیمت کی زمین نیلام کی جائے، سارا جوت نہیں۔ ہاں جو کاشتکار برابر لگان باقی رکھتا آیا ہو اور عدالت اُسے اس طرح ہمیشہ باقی رکھنے والا آدمی قرار دے تو اُس کا سارا جوت نیلام کیا جاسکتا ہے۔

چوتھی بات بٹائی کے متعلق تھی۔ بہار کے پٹنہ گیا اور کچھ حصہ منگیر کے ضلعوں میں اکثر یہ رواج جاری تھا کہ پیدا ہوئے غلّہ کے ایک حصّہ کی شکل میں لگان نقد ملتا تھا اکثر آدھی پیداوار زمیندار کو اور آدھی کسان کو بانٹ دی جاتی تھی۔ اِس کے دو طریقے تھے۔ کھیت میں جو کچھ غلّہ پیدا ہوتا تھا۔ زمیندار کے سامنے ہی درونے اور اُسانے کے بعد کھلیان میں تیار کیا جاتا تھا۔ پھر تول کر اس کے دو حصّے کر دیئے جاتے تھے۔ جس میں سے ایک کسان لیتا تھا اور دوسرا زمیندار۔ اِسے بھاؤلی بٹائی کہتے تھے۔ دوسرا طریقہ یہ تھا کہ جب فصل پک کر قریب قریب تیار ہو جاتی تھی تو زمیندار کا ایک گماشتہ

یا خود زمیندار کھیت کے ایک چھوٹے حصہ کی فصل کاٹ کر دیکھ لیتا کہ کتنا غلّہ ہوا اور اسی حساب سے سارے کھیت کی پیداوار آنک لی جاتی، جس کا آدھا زمیندار کا سمجھا جاتا، جو وہ وقت پر وصول کر لیتا، اِسے دانہ بندی کہتے تھے۔ بٹائی میں کاشتکاروں کی شکایت تھی کہ جب تک زمیندار کا ایک آدمی حاضر نہ رہے وہ فصل کو کاٹ نہیں سکتے تھے۔ جب زمیندار انہیں تکلیف پہنچانا چاہتے تو دانہ بندی کرنے آتے ہی نہیں یا کسی سبب سے اگر دیر کر دیتے ہیں تو وہ (کسان) اپنے کھلیان میں تیار غلّہ رکھ کر بھی اناج کے بغیر دُکھ پاتے ہیں اور اگر وہ زمیندار کی غیر حاضری میں غلّہ تیار کر کے اٹھالے جائیں تو زمیندار اُن پر دباؤ ڈال کر، اُن سے من مانا وصول کر لیتے ہیں۔ اور زبردست زمیندار تو کئی طرح سے جھوٹے دعوے بھی کر دیتے ہیں۔ دانہ بندی کے متعلق بھی کاشتکاروں کی شکایتیں ہوئیں کہ ہمارے کھیت کی پیداوار کا من مانا تخمینہ لگا کر دانہ بندی کر دی جاتی ہے اور نام کے لئے پیداوار کا آدھا ہی زمیندار کو دینے کی بات ہوتی ہے۔ مگر حقیقت میں ہمیں اُن کو بہت دینا پڑتا ہے قانون میں پہلے ایک دفعہ تھی جس کے ذریعہ کاشتکار اور زمیندار دونوں کو یہ حق دیا گیا تھا کہ اگر وہ بٹائی رکھنا نہ چاہیں تو عدالت کے ذریعے بٹائی کو نقد بنوا سکتے ہیں۔ عدالت کی سب باتوں پر غور کر کے جن میں پچھلے کئی برسوں میں وصولی کا اوسط بھی ایک جزو تھا۔ جو مناسب سمجھے، نقد لگان مقرر کر دے سکتی ہے۔

سنہ ۱۸-۱۹۱۴ء کی یورپ کی جنگ عظیم کے بعد بڑی گرانی کا زمانہ آیا۔ کسانوں کو غلّہ کا آدھا حصّہ دینا اب جبر محسوس ہونے لگا۔ بہتوں نے عدالت کے ذریعہ نقد لگان مقرر کرا لیا مگر گرانی میں غلّہ کی قیمت زیادہ ہونے کی وجہ سے وصولی کا اوسط بھی زیادہ ہوا۔ جب سنہ ۳۰-۱۹۲۹ء کے بعد بہت ارزانی آگئی تو وہ نقد لگان کسی طرح اب پیداوار سے

ادا نہیں ہو سکتا تھا۔ لگان کم کرنے کی وجہوں میں یہ ایک خاص وجہ تھی۔ اوپر کہا جا چکا ہے کہ جہاں لگان زیادہ ہو گیا تھا وہاں زیادہ گھٹایا گیا۔ اب اِس ترمیم سے طے کیا گیا کہ کاشتکاروں کی درخواست بٹائی کے بدلے نقد لگان ضرور کر دیا جائے اور زمیندار کا حصہ بھی آٹھ آنے کے بدلے کچھ کم دیا جائے۔ کچھ کم کر بھی دیا گیا۔

لگان قانون کی خاص ترمیمیں یہی تھیں۔ مزید براں سرکار ایک نیا ٹیکس۔ ایگریکلچرل اِنکم ٹیکس لگانا چاہتی تھی۔ اِس کے متعلق بھی زمینداروں سے سمجھوتہ ہوا کہ وہ کس پر لگایا جائے گا۔ اس کی کیا شرح ہوگی اور اس سے کون بچ سکیں گے۔ یہ سب موٹی موٹی باتیں میں نے بتا دیں۔ مگر ان سب کے تفصیلی پہلو تھے، جن کے طے کرنے میں بہت وقت لگا۔ میرے اور مولانا آزاد کے ساتھ باتیں ہو جانے کے بعد قانون بنانے اور قانون کے الفاظ کو درست کرنے میں بھی بہت وقت لگا۔ گفتگو بھی بہت کرنی پڑی۔ وزیرِ اعلیٰ نے قانون بناتے وقت اُن لوگوں سے بات طے کی۔ اِس سمجھوتہ کا یہ اثر ہوا کہ یہ قانون دونوں فریق کے اتفاق رائے سے چند مہینوں کے اندر ہی پاس ہو سکے اور ۱۹۳۸ء میں ہی سرکار نے اپنے بہت سے افسروں کو۔ جو بالکل نئے تھے اور محض اسی کام کے لئے بحال کئے گئے تھے تعینات کر دیا کہ وہ نئے قانون کے مطابق کاشتکاروں کے لگان گھٹا کر اُن کے خسرہ کھتونی کی درستی کر دیں۔

جب ۱۹۳۹ء کے نومبر میں کانگریسی وزارت نے استعفےٰ دیدیا۔ بہار میں لگان کم کر کے خسرہ کھتونی درست کرنے کا کام پورا ہو چکا تھا اور نیا لگان بھی زمینداروں پر لگ چکا تھا۔ ایسا اور کسی صوبے میں نہیں ہو پایا۔ اُتر پردیش میں صلح نہیں ہوئی۔ وہاں قانون بنانے میں قدم قدم پر زمینداروں کی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اگرچہ استعفےٰ سے پہلے ایک قانون

وہاں پاس ہو چکا تھا مگر گورنر کی منظوری استعفے کے بعد ملی۔ مجھے نہیں معلوم کہ اُس کے مطابق کہاں تک اور کب کارروائی کی گئی۔ اُڑیسہ میں قانون تو پاس ہی نہ ہو سکا۔ مدراس میں وزارت نے ایک کمیٹی مقرر کی۔ اُس نے بہت محنت سے رپورٹ تیار کی۔ لیکن اس پر عملدرآمد ہونے سے پہلے ہی وزارت نے استعفےٰ دے دیا۔ یہ رپورٹ جوں کی توں پڑی رہ گئی۔ بنگال میں اگرچہ کانگریسی وزارت نہیں تھی، تاہم وہاں بھی ایک کمیٹی بنی۔ اُس نے بھی رپورٹ دی جس پر ابھی تک کوئی کام نہیں ہوا ہے۔ بہار میں اس سمجھوتے سے کسانوں کو جلد سے جلد رعایتیں دی جا سکیں۔ چونکہ یہ باتیں سمجھوتے سے طے ہوئی تھیں۔ اِس لئے آپس میں بددلی بہت نہیں بڑھی۔ اگرچہ یہ ماننا پڑے گا کہ وزارت پر دونوں فریق وار کرتے رہے۔ زمیندار بھی شکایت کرتے اور کسان سبھا کے لوگ بھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کسان سبھا کے لوگ دانائی سے کام لیتے اور وزارت کی کارروائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اور شکایتوں کو بھی دور کرانے کی کوشش میں لگے رہتے، تو وزارت اور بھی کام کر سکتی مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ وہ زمینداروں سے بھی زیادہ وزارت پر وار کرتے رہے۔ وزارتی دِقتوں کے بڑھانے میں اُن کا کافی ہاتھ تھا۔

ایک معاملہ میں کوئی معقول بات طے نہیں ہو پائی تھی جس کی وجہ سے وزارت کو خاصی تکلیف اٹھانی اور کسان سبھا کو بھی اُس کی شکایت یا بدنامی کرنے کا خاصا موقع موقع ملا۔ جو زمین باقی لگان کے لئے نیلام کرا کے زمیندار خرید لیتا ہے، وہ اگر کسی بھی کاشتکار رعیت کے ساتھ بندوبست کر دی جائے، تو بندوبست کے ساتھ ہی اُس رعیت کو کاشتکاری کا حق ہو جاتا ہے۔ کئی جگہوں میں زمینداروں کے پاس اِس طرح کی نیلام میں خریدی ہوئی رعیتی زمین بہت پڑی تھی۔ اسے قانونی زبان میں باکاشت مالک

کہتے ہیں۔ وہ رعیت کو کاشتکاری حق نہیں دینا چاہتے تھے، کیونکہ ایک بار کاشتکاری حق دینے پر رعیت کا زمین پر پورا حق ہو جاتا۔ یہ اُس کے مرنے کے بعد اُس کے وارث کو بھی ملتی ہے۔ مالک صرف لگان وصول کر سکتا ہے۔ کاشتکار کو بیدخل نہیں کر سکتا اور اب تو وصولی میں ساری زمین کو نیلام نہیں کرا سکتا تھا۔ اِس لئے زمیندار حتی المقدور اُسے خود جوتنا چاہتے تھے یا کسی نہ کسی ترکیب سے باقاعدہ بندوبست کر کے رعیت کو کاشتکاری حق حاصل ہونے دینا نہیں چاہتے تھے۔ اُدھر رعیت دیکھتی تھی کہ اگر ہم کاشتکاری حق پر بہت زور دیتے ہیں تو زمیندار زمین دیتا ہی نہیں اپنے قبضہ میں رکھ لیتا ہے اس لئے اُن میں سے بہت سے اِس حق کی طرف توجہ نہ دے کر، سال بھر کے لئے ہی سہی، جوتنے کے لئے زمین لیتے۔ اور پھر زمیندار سال کے آخر میں چاہے اُسے واپس لے لیتا یا اِس شرط پر چھوڑ دیتا کہ وہ حق کاشتکاری کا دعوی نہ کریں۔ اِس طرح ایسی زمین بہت تھی جس پر قانونی طور سے تو حق کاشتکاری ہو گیا ہوگا۔ مگر اس حق کے ثابت کرنے کا کوئی وسیلہ یا کوئی ثبوت رعیت کے پاس نہیں تھا۔ بڑی زمینداریوں میں نیلام میں خریدی ہوئی زمین کا اکثر پھر بندوبست کر دیا جاتا ہوگا۔ کیونکہ وہ ساری زمین کو خود کاشت کرانے کا بار نہیں لے سکتے تھے مگر چھوٹے چھوٹے زمیندار اسے آسانی سے کر سکتے تھے۔ کچھ بڑے زمیندار بھی اب ٹریکٹروں کے ذریعے بڑے پیمانہ پر کھیتی کرنے کی بات سوچ رہے تھے۔ اس لئے وہ باکاشت زمین کو کسانوں کے قبضے میں نہیں دینا چاہتے تھے۔ اِس جھگڑے کا کوئی نبٹارہ اُس وقت نہیں ہو سکا۔ کئی جگہوں پر کسانوں نے اِس طرح کی باکاشت زمین پر جا کر ستیا گرہ کے ذریعے قبضہ کرنا چاہا۔ سرکار کو یہ دیکھنا پڑا۔ جب تک کانگریسی وزارت کے استعفٰی کے بعد یہ جھگڑا خود بخود ختم سا معلوم ہوتا ہے، کیونکہ اس کے بعد ستیا گرہ کی

بات کہیں سننے میں نہیں آئی۔ اِس سمجھوتے کی بنیاد پر کسان سبھا کے کچھ لوگوں نے وزارت کے ساتھ میری بھی شکایتوں کا دفتر جا بجا کھولا۔ مگر میں سمجھتا ہوں کہ اس سمجھوتے کی رو سے ہم نے کسانوں کے لئے جتنی رعایتیں دلوائیں۔ اتنی کسی صوبے میں نہیں ملیں۔

کسان سبھا سمجھوتے میں شریک نہیں تھی۔ اُس کو پورا حق تھا کہ اِس سے جو فائدہ ہو اُسے وہ لے لے اور باقی کے لئے اپنے مطالبے جاری رکھے۔ وزارت اور زمینداروں سے اُن کے لئے تقاضا کرتی رہے اور بے کار جھگڑے میں اپنی طاقت کا غلط استعمال نہ کرکے، اُسے تعمیری طریقے سے کسانوں کی حالت سدھارنے میں لگائے۔ بگر بدقسمتی سے اس کی طاقت کا بڑا حصہ وزارت کی مخالفت میں ہی صرف ہوا۔ جہاں ستیاگرہ کا مورچہ لگا، وہاں وزارت کو خاصی دشواری اُٹھانی پڑی اور بدنامی بھی۔

کانپور کی مزدور کمیٹی

اس سمجھوتے کو پورا کرتے کرتے میں بیمار پڑ گیا۔ کچھ دنوں کے لئے ۳۸-۱۹۳۷ء کی سردیوں میں اپنے گاؤں چلا گیا۔ کچھ آرام کر کے مجھے پھر کانپور کی مزدور کمیٹی کے کام میں لگنا تھا۔ جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ میں ورکنگ کمیٹی کی نشست میں واردھا میں شریک ہوا۔ وہیں سے کانپور آنے والا تھا۔ راستہ میں شاید کھانے میں کچھ غلطی ہو گئی۔ بعد میں شک ہوا کہ کھانے میں شاید زہر کا کچھ اثر آ گیا تھا۔ جب لکھنؤ ہوتے ہوئے کانپور پہنچا تو طبیعت خراب ہو گئی۔ مگر کمیٹی کا کام کرتا گیا۔ جہاں تک جانچ کا کام تھا، اُسے ختم کیا۔ اِس کمیٹی میں مجھ جیسے غیر جانب دار لوگوں کے سوا، مل مالک اور مزدور دونوں فریقوں کے نمائندے بھی ممبر تھے۔ جلدی ہمیں اس بات کا تجربہ ہوا کہ دونوں فریقوں کے نمائندوں کو ساتھ لے کر کمیٹی کا کام پورا کرنا مشکل ہوگا۔ اگر ایسے لوگ ممبر ہوتے جو مل مالکوں اور مزدوروں کی بات سمجھ بوجھ کر اپنی رائے دے سکتے۔ جو سیدھے اُن کے ایسے نمائندے نہ ہوتے جن کو اُن کے کہنے کے مطابق ہی رائے دینی پڑے۔ تو اتنی دشواری نہ ہوتی۔ وہاں بھی شاید اُن پر ایسی مجبوری نہیں تھی مگر ساری جانچ ایک ہی جگہ اور اس جگہ کے بھی ایک ہی طرح کے کارخانے

کے بارے میں تھی۔ وہیں کے مل مالکوں اور وہیں کے مزدوروں کے نمائندوں کے لئے اپنی اخلاقی ذمہ داری بھی آجاتی تھی کہ وہ اُن کے ہی خیالات کی نمایندگی کریں۔ اِن خیالات سے سرکار نے شری شوراؤ کو ایک ممبر مقرر کر دیا جن کو صوبہ مدراس میں مزدوروں کی تنظیم کا کافی تجربہ تھا۔ پروفیسر رودر پہلے سے ہی ممبر تھے۔ اگرچہ مل مالک اور مزدور سبھا کے نمائندے، جانچ کمیٹی کے سامنے پیش ہونے والے کاغذوں اور گواہوں کے متعلق پوچھ گچھ اور خرچ وغیرہ کر سکتے تھے اور اُنہوں نے کی بھی، پھر بھی آخری رپورٹ کا بار ہم تینوں پر ہی رہ گیا۔ میں بیمار ہونے پر بھی اظہار لینے وغیرہ کا کام ختم کر سکا۔ ہاں ملوں میں گھوم پھر کر میں سب باتیں دیکھ نہ سکا۔ کیونکہ بہت کمزور ہو گیا تھا۔ اِسی لئے کام ختم کر کے میں پٹنہ آیا۔ سوچا کچھ آرام کر کے اور ممبروں سے مل کر رپورٹ تیار کی جائے گی۔

پٹنہ میں صوبائی کمیٹی کا اجلاس تھا۔ اُس میں قانون کے لگان کے بارے میں غور ہونے والا تھا۔ وہاں بہت بحث ہوئی۔ صوبائی کمیٹی نے اُسے بہت بڑی اکثریت سے منظور کیا۔ مگر مجھے ابھی کانپور کی کمزوری ستا رہی تھی۔ یہاں بھی خاصی محنت پڑی میں تقریباً دو بار کام کرتے کرتے بیہوش ہو گیا۔ مگر میں نے اپنی حالت پر کسی پر ظاہر نہیں دی میں چاہتا تھا کہ اُسی دن کام پورا کر کے آرام کر کے زیرا دئی چلا جاؤں۔ اِسی ارادے سے چلا بھی، انوگرہ بابو گیا ضلع میں کسی کام سے گئے تھے۔ وہاں داؤد نگر کے پاس رات کے وقت اِن کی موٹر سڑک کی پٹری سے اُتر کر درخت سے لڑ گئی۔ وہ بہت زخمی ہو گئے۔ ان کے ساتھ ساتھ پنڈت پارس ناتھ تریاٹھی تھے جو وہیں مر گئے۔ موٹر چلانے والا بھی گھائل ہوا مگر زیادہ نہیں۔ انوگرہ بابو کسی طرح پٹنہ لاکر ہسپتال میں رکھے گئے۔ میرے کانپور جانے سے پہلے ہی یہ واقعہ ہو چکا تھا۔ میں اُن کی تکلیف دیکھ کر بہت دکھی رہتا۔ میں نے

سوچا کہ زیرادئی جانے کے وقت ان کو ہسپتال میں دیکھ کر اُدھر ہی سے سٹیمر پر چلا جاؤں گا ایسا ہی کیا بھی مگر سٹیمر پر پہنچتے پہنچتے کچھ ایسا پریشان ہو گیا کہ وہاں جا کر فوراً لیٹ گیا۔ بڑی مشکل سے کسی طرح سون پور کی گاڑی میں سوار ہو سکا۔ مگر اتفاق سے میرے بھتیجے جناردن جمشید پور سے چھٹی میں اُسی گاڑی سے گھر آ رہے تھے۔ اُنہوں نے میرے لئے جگہ بنائی۔

ہم دونوں بھنٹاپوکھر اسٹیشن پر رات کے نو بجے پہنچے۔ وہاں ریل سے اُترتے ہی زوروں سے قے آنا شروع ہو گئی، جیسا کانپور میں ہوا تھا۔ میں کسی طرح پالکی پر زیرادئی پہنچا۔ سوچا تھا کہ وہاں کچھ دن آرام کر لینے پر سب اچھا ہو جائے گا مگر رات کو عالت خراب ہو گئی۔ جناردن اور مرتنجے اُس دن وہیں تھے۔ حالت بگڑتی دیکھ کر پٹنہ خبر کر دی سوان کے ڈاکٹر سویرے پہنچے، کچھ دیر کے بعد چھپرا سے بھی ڈاکٹر سور آ گئے۔ سب کو شک تھا کہ کھانے میں زہر کا اثر تھا۔ وہ اس کا علاج کرنے لگے۔ رات میں پٹنہ سے ڈاکٹر بنرجی اور ڈاکٹر شرن بھی پہنچ گئے۔ دو تین دنوں میں حالت بہتر ہوئی۔ مگر اب زوروں کا دمہ شروع ہو گیا۔ ڈاکٹر گھوشال بھی پٹنہ سے پہنچ گئے۔ ایک ہفتہ تک وہیں پر دوا ہوتی رہی۔ جونہی ڈاکٹروں نے دیکھا کہ میں پٹنہ لے جانے کے قابل ہو گیا ہوں۔ وہ مجھے پٹنہ لے آئے۔ یہاں بھی ہسپتال میں رکھا گیا۔ گھر کے لوگ بھی ساتھ تھے۔ بیماری کچھ دنوں تک زور پر رہی مگر آہستہ آہستہ کم ہوئی۔ کچھ دنوں میں بھی اُسی کاٹج میں لے جایا گیا، جہاں انوگرہ بابو تھے۔ اگرچہ ہم دونوں ایک ہی جگہ تھے۔ وہ نیچے کے کمرے میں تھے اور میں اوپر کے۔ پھر بھی ہم لوگ کئی دنوں تک مل نہیں سکے۔ وہ چارپائی پر کروٹ بھی نہیں بدل سکتے تھے۔ میں سیڑھیوں سے اُتر چڑھ نہیں سکتا تھا۔ وہیں تقریباً

دو مہینے تک رہا۔ آہستہ آہستہ بدن میں کچھ طاقت بھی آئی۔ کچھ دنوں کے بعد میں نیچے اتر کر آتا اور انوگرہ بابو کے پاس بیٹھتا۔ وہ چارپائی پر لیٹے لیٹے سرکاری کاغذوں کو دیکھ کر اُن پر حکم لکھا کرتے۔ شروع کے چند دنوں کو چھوڑ کر جب بالکل مجبور تھے اور کچھ کام نہیں کر سکتے تھے، اُنھوں نے برابر کام جاری رکھا۔

ہری پورہ کانگریس، وزارت کا استعفیٰ

جب ہم دونوں اسی مکان میں تھے۔ ہری پورہ کانگریس کا اجلاس ہوا۔ ہم دونوں نہیں جا سکے۔ کانگریس نے جولائی ۱۹۳۷ء میں وزارتیں بنائی تھیں۔ ہری پورہ کانگریس کا اجلاس فروری ۱۹۳۸ء میں ہوا۔ ان سات مہینوں میں وزارتوں نے سبھی صوبوں میں اپنا کام زوروں سے شروع کر دیا تھا۔ مگر ابھی تک کوئی کام پورا نہ ہو سکا تھا۔ اسی زمانے میں ایک رکاوٹ آ گئی۔ کانگریس کے انتخابی منشور میں ایک وعدہ یہ بھی تھا کہ ہم سیاسی قیدیوں کو چھڑائیں گے۔ اس کی کوشش وہ کرنے لگے مگر پوری کامیابی نہ ہوئی۔ اسی زمانہ میں جزیرہ انڈمان (کالا پانی) کے سیاسی قیدیوں نے بھوک ہڑتال شروع کر دی۔ بڑی دقتوں کے بعد حکومت اس بات پر رضامند ہوئی کہ وہ وہاں سے ہندوستان واپس کر کے اپنے اپنے صوبوں میں بھیج دیئے جائیں۔ جب وہ یہاں آ گئے تو اب تقریباً صوبائی حکومتوں کے اختیار میں ہو گئے۔ اِس طرح اُن کو رہا کرنے کا سوال آیا۔ وزارت انہیں رہا کرنا چاہتی تھی۔ مگر گورنر اس پر رضامند نہیں ہوتے تھے۔ میری بیماری کی حالت میں ہی مولانا ابوالکلام آزاد پٹنہ آ کر مجھ سے ہسپتال ملے۔ میں اُن سے

بہت باتیں نہ کرسکا۔ وہ وہاں سے جاکر سردار ولبھ بھائی پٹیل اور مہاتما جی سے ملے۔ سب کا فیصلہ ہوا کہ گورنر اگر سیاسی قیدیوں کی رہائی پر رضامند نہ ہو تو وزیر استعفےٰ دیدیں اُتر پردیش اور بہار میں وزارتوں نے بہت زور لگایا مگر گورنر رضامند نہیں ہوتے۔ آخرکار ہری پورہ کانگریس میں جانے سے پہلے وزارتوں نے دونوں جگہ استعفےٰ دیدیا۔ اُسے گورنر نے اُس وقت منظور نہیں کیا۔ یہ کہہ کر بات ٹال دی کہ جب تک وہ اِس اس بات پر غور کرتے ہیں اور دوسرے وزیر ڈھونڈتے ہیں تب تک وزراء کام جاری رکھیں۔ بہار کے اور وزیر تو ہری پورہ چلے گئے۔ صرف انوگرہ بابو چارپائی پر پڑے کام کرتے رہے۔ میں بھی وہیں اُن کا ساتھ دیتا رہا۔

اِس استعفے کا اثر دیکھنا تھا۔ اگرچہ ایک طرح وائسرائے اور گورنروں نے اپنے اختیارات خصوصی کو کام میں نہ لانے کا وعدہ کیا تھا۔ تاہم یہ پہلا ہی موقع تھا جب اُنہوں نے اسے کام میں لانا چاہا۔ کانگریسی وزارت نے اُتر پردیش اور بہار میں اسے نہیں مانا۔ عہدہ چھوڑ دیا۔ یہ بات سارے ملک میں اور برٹش سرکار پر بھی ظاہر ہوگئی کہ کانگریسی وزارت اپنی بات پر قائم رہے گی۔ اگر کامیابی نہ ہوئی تو عہدہ چھوڑ دے گی۔ اپنی بات نہ چھوڑے گی۔ یہ پہلا امتحان تھا جس میں برٹش سرکار اور وزارت دونوں کا امتحان ہو رہا تھا۔ برٹش سرکار نے وزارت کی بات مان لی اور سیاسی قیدیوں کو رہا کرنے کی ذمہ داری اُنہیں کو دے دی۔ وہاں ہری پورہ میں استعفے کی خبر پہنچتے ہی فضا ایک دم سے بدل گئی۔ جو لوگ عہدۂ وزارت کے مخالف تھے اور کہا کرتے تھے کہ وزارتیں قبول کر لینے پر وزراء اپنی کرسیوں پر چپکے رہ جائیں گے اور اپنے وعدے بھی بھول جائیں گے اُن کی بھی آنکھیں کھل گئیں۔ اگر وہ سچ مچ ایسا مانتے تھے تو اُن کو بھی اپنے خیالات تبدیل

کر دینے پڑے۔ میں تو کانگریس میں جا ہی نہیں سکا۔ مگر جو کچھ سنا اُس سے معلوم ہوا کہ جو تھوڑا بہت اختلاف وزارت قبول کرنے کے بارے میں تھا وہ اِس استعفے کے سبب سے اب جاتا رہا۔

ہری پورہ کانگریس کی دھوم دھام بھی لاثانی تھی۔ شری سبھاش چندر بوس صدر تھے۔ یہاں کا انتظام اتنے بڑے پیمانے پر اور اتنے مصارف کے ساتھ کیا گیا تھا کہ اس کا مقابلہ ابھی تک اور کسی اجلاس نے نہیں کیا۔ ہم لوگوں کے ہسپتال میں رہتے رہتے ہی، ہری پورہ سے لوگ واپس آ گئے۔ استعفے بھی واپس ہو گئے۔ وزارتیں پھر کام کرنے لگیں۔ ابھی جو پروگرام بن چکے تھے۔ اُن کا کام سات آٹھ مہینوں میں پورا نہیں ہو پایا تھا۔ اسی لئے وزارت کا پھر اپنی جگہ آ جانا اچھا ہی ہوا۔ اب زیادہ جوش کے ساتھ کام ہونے لگا۔ کیونکہ کوئی کہہ نہیں سکتا تھا کہ کب اور کس بات کو لے کر پھر استعفا دینا پڑے۔ اِس لئے جو کچھ ہو سکے کر گزرنا ہی اچھا ہوگا۔

بِہار کی مزدور کمیٹی

وزارت نے طے کیا کہ بِہار کے مزدوروں کی حالت جانچنے اور سدھارنے کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے۔ کانپور کا کام ایک طرح سے ختم ہو چکا تھا۔ اِسی لئے میں اب اِس کام کو اپنے ہاتھ میں لے سکتا تھا۔ کمیٹی بنی، میں اُس کا صدر بنایا گیا۔ اپنی خرابیٔ صحت کی وجہ سے کانپور کا کام میں اپنے اطمینان کے بموجب نہیں کر سکا تھا۔ وہاں کی رپورٹ پر جب سرکار نے کارروائی کرنی چاہی تو مِل مالکوں نے مخالفت کی۔ مزدوروں کی طرف سے ہڑتالیں ہوئیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت دنوں تک کشمکش چلتی رہی۔ مجھے معلوم نہیں کہ ہماری سفارشوں میں کتنی منظور ہو سکیں۔ مجھے اِس کا افسوس ہی رہا کہ اگر میں صحت مند ہوتا اور وقت کچھ زیادہ لگا سکتا اور کانپور جا کر رپورٹ دینے سے پہلے دونوں فریقوں سے کھل کر باتیں کر سکتا تو شاید اتنی زبردست مخالفت نہ ہو سکتی۔ ہو سکتا ہے کہ سفارشوں میں کچھ ردوبدل ہو جاتا۔ کم سے کم جو بھی سفارش ہوتی، مل مالکوں میں اتنی تلخی نہ آتی۔

بہرحال اب تو وہ بات بن ہی سکتی تھی۔ مگر بِہار میں پھر اسی قسم کا کام مجھے کرنا پڑا

اور وہاں سے بھی یہاں کا مسئلہ زیادہ پیچیدہ تھا کیوں کہ وہاں تو صرف ایک ہی شہر کے ایک ہی قسم کے مزدوروں کی حالت جانچنی تھی مگر یہاں کمیٹی کے ذمہ سبھی طرح کے مزدوروں کی۔ جو کارخانوں میں کام کرتے تھے۔ حالت رکھی گئی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں، جتنی قسم کے کارخانے ہندوستان میں ہیں، تقریباً سبھی قسم کے بہار میں موجود ہیں شاید بہت باتوں میں بہار اور صوبوں سے اس بات میں بڑھا ہوا ہے۔ یہاں پر کانوں کا کام بہت پھیلا ہوا ہے۔ کوئلہ کی کانیں اتنی ہیں جتنی کسی بھی دوسرے صوبے میں نہیں ہیں یا یوں کہیں کہ کوئلہ کی جتنی کانیں بہار میں ہیں سارے ہندوستان دوسرے صوبوں کو ملا کر بھی نہیں ہیں تو ٹھیک ہی ہوگا۔ یہی حالت لوہے اور تانبے کی کانوں کی ہے۔ ابرق کی کانیں بھی اتنی ہیں کہ کسی بھی صوبے میں اتنی نہیں۔ سب صوبوں کو ملا کر بھی نہیں۔ شاید ساری دنیا کے اور کسی ملک میں اتنی نہیں جتنی بہار میں ہیں اور کئی چیزیں بھی تھوڑی بہت بہار کی کانوں سے نکلتی ہی ہیں۔

ایکھ کی کھیتی بھی یہاں کافی ہوتی ہے۔ پچھلے بارہ برسوں میں چینی کے کارخانے بہت بن گئے ہیں۔ اُتر پردیش کو چھوڑ کر اور کسی صوبے میں اتنے کارخانے نہیں ہیں، جتنے بہار میں۔ جمشید پور میں ٹاٹا کمپنی کا لوہے کا کارخانہ ہندوستان کا ہی نہیں، ایشیا کا سب سے بڑا کارخانہ مانا جاتا ہے اور دنیا کے بڑے بڑے کارخانوں میں سے ایک ہے۔ یہاں اور بھی بہت قسم کے کارخانے ہیں۔ ٹین کی چادریں بنانے کے لئے۔ لوہے کے تار اور کانٹے بنانے کے لئے متعدد کارخانے ہیں۔ کئی تو جمشید پور کے آس پاس ہی بنے ہیں۔ اس کے سوا اور بھی لوہے کے کارخانے دوسرے مقامات پر ہیں۔ لاکھ کی کھیتی چھوٹا ناگپور اور سنتھال پرگنہ میں ہیں۔ یہاں جنگلوں میں کافی لاہی ملتی ہے۔ جا بجا جوٹ بننے اور روئی سے کپڑا

بنانے کے کچھ کارخانے بھی ہیں مگر اور صوبوں کے مقابلہ میں کم ہیں۔

اِس طرح بہار کی کمیٹی کو تقریباً سبھی طرح کے مزدوروں کی حالت جانچنی تھی جمشید پور کے کارخانے کے مزدور ایک جدید طرز کے بنے ہوئے شہر میں رہتے ہیں۔ وہاں کے کارخانے دن رات چوبیسوں گھنٹے کام کرتے ہیں۔ سال میں ایک دن بھی بند نہیں ہوتے۔ کچھ مزدور ایسے ہیں جو گاؤں میں اپنے گھروں میں رہتے ہیں اور سال میں چار پانچ مہینے چینی کے کارخانوں میں کام کرتے ہیں۔ کچھ مزدور اور جگہوں کی طرح مختلف کارخانوں میں حسب ضرورت کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ پھر کانوں کے اندر کام کرنے والوں کی حالت اِن سب سے مختلف ہے۔ کیونکہ وہاں کا کام ہی اور ڈھنگ کا ہے۔ کانوں میں بھی کام کرنے والے نہ تو ایک طرح کا کام کرتے ہیں اور نہ ان کے رہنے سہنے کا ایک سا طریقہ ہے جھریا میں کوئلہ کی کانوں کا جمگھٹ ہے۔ چند میلوں کے اندر بہتیری کانیں ہیں۔ اِسی لئے وہاں مزدوروں کی آبادی کچھ ملی جلی سی ہے۔ ابرق کی کانیں ایک دوسرے سے الگ، جنگلوں اور پہاڑوں پر دور ہیں۔ اِسی لئے ان کے مزدوروں کے رہنے کا کسی ایک جگہ انتظام نہیں۔ جھریا میں تمام کارخانوں کے مزدوروں کے لئے ایک ہی واٹر ورکس سے پانی ملنے کا انتظام ہے۔ ایسا ابرق کی کان والوں کے لئے نہیں ہے۔ اور شاید ہو بھی نہیں سکتا۔ اِس طرح بہت قسم کے کاموں کی وجہ سے بہت طرح کے مزدور ہیں۔ اُن کے رہن سہن کے انتظام میں اور مزدوری میں بھی قدرتاً بہت فرق ہے۔ بہار کمیٹی کو ان سب کی جانچ کرنے کی سفارش کرنی تھی۔ کام کی وسعت اور بھاری پن کو دیکھ کر میں سہم گیا۔ مگر چھٹکارا نہ پا سکا۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا کہ وقت زیادہ لگے تو لگے مگر اسے اچھی طرح پورا کرنا چاہیئے اور ایسا کیا بھی گیا۔

مزید براں اور بھی سوال پیش تھے جن کے متعلق کچھ نہ کچھ کرنا پڑا۔ وزارت بنتے ہی ایکھ کے متعلق ایک سوال ان کے سامنے پیش ہو گیا جس پر اُسے جلد کچھ کرنا ہی تھا۔ بہار میں چینی کے بہت سے کارخانے بن جانے کی وجہ سے یہاں کے کسان ایکھ کی کھیتی بہت کرتے ہیں اور اُسے کارخانوں کے ہاتھ بیچ دیتے ہیں۔ کارخانوں کے بننے سے پہلے کاشتکار اتنی ہی ایکھ کی کھیتی کرتا تھا جتنی وہ خود اپنے کولھو سے پیل کر گُڑ بنا سکتا تھا۔ کھیتی کے کام کا کچھ ایسا سلسلہ ہے کہ جن دنوں میں ایکھ پیلنے کا کام ہوتا ہے، ان دنوں بیلوں کو اور دوسرا کام بہت نہیں رہتا۔ کیونکہ ایکھ پیلنے کا کام کارتک کے بعد شروع ہوتا ہے۔ ربیع بونے کا کام ختم ہوتا ہے اس لئے کسان اتنے ہی انداز سے ایکھ بویا کرتے تھے جتنے وہ اپنے بیلوں سے پیل سکیں۔ اِس طرح ایکھ کی کھیتی کا دوسری فصلوں کے ساتھ ایک قدرتی تناسب ہو جایا کرتا تھا۔ جب سے کارخانے بن گئے کسان ایکھ پیلنے کے جھگڑے سے فرصت پا گیا۔ وہ اُسے کارخانے تک یا نزدیک کے اسٹیشن تک پہنچا دینے کا ہی کام کرتے اور پیلنے کا کام کارخانے کر لیتے۔ ایکھ سے نقد پیسے بھی ملتے ہیں اِس لئے اس کی کھیتی بہت بڑھ گئی۔ اگر کسی وجہ سے کارخانے ایکھ نہ لیں تو کسان بالکل بے بس ہو جاتے ہیں۔ اُن کی سال بھر کی کمائی برباد ہو جاتی ہے۔ ایسی حالت ۱۹۳۴ء میں ہوئی تھی۔ جب زلزلہ کی وجہ سے بہت سے کارخانے برباد ہو گئے تھے۔ سرکار اور ریلیف کمیٹی کو کھیتوں میں لگی فصل کو بچانے کے لئے کاشتکاروں کو پھر کولھو چلانے کا حوصلہ دینا پڑا۔ لاکھوں روپے تقسیم کئے گئے۔ پھر بھی اِن کولھوؤں سے کام پورا نہ ہونے والا تھا اور کچھ دنوں کے بعد کارخانوں کی مرمت ہو گئی اور چالو ہو گئے کسانوں کی فصل کا کچھ حصہ بچ سکا۔ کسانوں کو ایکھ کے دام کارخانے والے دیا کرتے ہیں

سرکار نے دیکھا کہ کسان کارخانے کے اتنے بس میں ہیں کہ وہ جب چاہیں دام گھٹا سکتے ہیں۔ اِسی لئے کانگریس وزارت بننے سے بہت پہلے سے ہی ایکھ کے دام مقرر کرنے کا حق قانون کی رو سے سرکار ہی کے ہاتھ میں تھا۔ وہ کہہ دیا کرتی کہ اتنے آنے فی من سے کم دام پر کوئی ایکھ نہیں خرید سکتا۔ ہاں اگر کوئی زیادہ دینا چاہے تو دے سکتا ہے۔ اِس طرح کسانوں کو ایک رقم ضرور مل جاتی۔ اگر کارخانوں میں مقابلہ ہو تو اُس سے زیادہ بھی مل سکتی تھی۔

۱۹۳۶ء میں کسی سبب سے ایکھ کی کھیتی کم ہوئی۔ کارخانوں میں خوب مقابلہ ہوا اِس سے کسانوں کو خوب دام ملے۔ اُنھوں نے دوسرے سال ایکھ کی کھیتی زیادہ کردی ۱۹۳۷ء میں اتنی ایکھ تھی کہ معلوم ہوتا تھا کہ کارخانے سب ایکھ نہیں لے سکیں گے۔ چینی کی قیمت بھی اتنی گر گئی کہ سرکاری طور پر مقرر شدہ دام بھی بہت کم تھا۔ کارخانے اتنے دام پر بھی ایکھ لینے کو تیار نہیں تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کسان بہت تباہ ہوئے۔ اُسی زمانے میں چندروزہ وزارت بنی تھی۔ اُس نے بھی کچھ کوشش کی مگر وہ اپریل میں آئی جب ایکھ کا کام تقریباً خاتمہ پر ہوتا ہے۔ اس کے پہلے ہی سے ہم نے کارخانے والوں سے بات چیت کرنی شروع کردی تھی کہ وہ کسی طرح سے ایکھ ضرور لے لیں۔ کچھ راضی بھی ہوئے اپنے علاقے کی ایکھ انہوں نے لے لی۔ جب تک وہ ختم نہ ہوئی کارخانے چلتے رہے اگرچہ معمولی طور پر آدھے اپریل کے بعد ایکھ سے چینی کا جزو کم نکلتا ہے۔ جب جولائی میں کانگریسی وزارت بنی تو اُسے اِس معاملہ پر غور کرنا تھا کو جو تجربہ کسانوں کو ۱۹۳۷ء کے مارچ اپریل میں ہوا تھا اور اُنہیں جو کارروائی اُس وقت کرنی پڑی، اس کا سامنا ان کو پھر نہ کرنا پڑے۔ اِس بارے میں میری اور اس صیغہ کے وزیر ڈاکٹر سید محمود کی باتیں۔

ہوئیں اور ایک کانفرنس بھی کی گئی۔ دیکھا گیا کہ ایکھ کی کھیتی سب سے زیادہ یوپی اور بہار میں ہی ہوتی ہے۔ اِسی لئے جو کچھ کرنا ہو اگر دونوں مل کر کریں تو ٹھیک ہوگا۔ دونوں کے سامنے مسئلہ ایک ہی تھا۔ دونوں میں کانگریسی وزارتیں تھیں۔ اِسی لئے دونوں صوبوں کی وزارتوں نے مل کر ایک کانفرنس کی۔ اُسی میں اپنا پروگرام بھی مرتب کیا۔ مجھے بھی اُس میں حصّہ لینا پڑا تھا۔ چونکہ ہندوستان میں جتنی چینی بنتی ہے اس کا تین چوتھائی حصّہ انہیں دونوں صوبوں میں بنتا ہے۔ اِسی لئے لوگوں نے سوچا کہ یہ دونوں مل کر جیسا انتظام چاہیں گے کر سکیں گے۔

دونوں صوبوں نے قانون بنائے۔ اس کے مطابق صرف ایکھ ہی نہیں چینی کی بھی قیمت مقرر کرنے کا انتظام سرکار نے اپنے ہاتھوں میں لیا۔ کچھ کارخانے والوں نے مخالفت کی لیکن آخر میں سب رضامند ہو گئے۔ کارخانے والوں کی ایک انجمن بنی، وہی سبھی کارخانوں پر نگرانی رکھتی۔ جو کارخانہ انجمن میں شریک نہ ہو، اسے ایکھ پیلنے کی سند (لائسنس) سرکار نہ دے گی۔ اِس طرح جو نہ بھی چاہتے تھے۔ اُنہیں بھی اِس انجمن میں شریک ہونا پڑا۔ کسانوں کو اِس سال قیمت ٹھیک ملی۔ میرے دل میں کچھ شبہ تھا کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ کارخانوں کے ساتھ اگر زیادہ سختی کی جائے گی تو ہو سکتا ہے کہ وہ اِن صوبوں کے باہر کارخانوں کے ساتھ جہاں کسی قسم کی دست اندازی یا پابندی نہیں تھی۔ مقابلہ نہ کر سکیں۔ اِسی لئے میں نے کہا کہ بہتر ہو اگر سبھی صوبوں کے ساتھ مل کر کچھ کیا جائے۔ حکومتِ ہند کچھ کرنے پر تیار نہیں تھی۔ اِسی لئے صوبوں کے ساتھ ہی بات چیت ہو سکتی تھی۔ دوسرے صوبوں کی وزارتیں۔ کانگریسی وزارتیں تھی۔ ان دونوں کے مل کے علاوہ اپنے یہاں کے کارخانوں پر پابندی عائد کرنے پر رضامند نہ ہوئیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان صوبوں کے کارخانوں

کو، خاص کر دیسی ریاستوں کے کارخانوں کو بہت سہولت مل گئی۔ وہاں نئے کارخانے بنے۔ پرانوں نے بہت نفع کمایا۔ بہار کے ایک دو کارخانے بک کر صوبے سے باہر چلے گئے مگر اس میں کچھ شبہ نہیں کہ جو کچھ کانگریسی وزارت نے کیا۔ اس سے کسانوں کو اس وقت بہت پہنچا اور جب تک کانگریسی وزارت رہی فائدہ ہوتا رہا۔

بہار میں تعلیم کا کام اور سیلاب کانفرنس

تعلیم کا معاملہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ڈاکٹر محمود اس صیغہ کے وزیر تھے۔ اُنھوں نے چاہا کہ مجھے وہ پٹنہ یونیورسٹی کے سینٹ کا ممبر بنادیں۔ میں نے سینٹ کی ممبری سے ۱۹۲۱ء میں استعفیٰ دے دیا تھا۔ اُنھوں نے بہت ضد کی کہ مجھے یہ پھر سے قبول کر لینی چاہیئے۔ ڈاکٹر سچدانند سنہا وائس چانسلر تھے، اُنھوں نے بھی اصرار کیا۔ اِسی لئے میں نے ممبری قبول کر لی۔ سینٹ کے اجلاس میں میں نے ایک تجویز پیش کی جس کا مفہوم یہ تھا کہ سرکار طرزِ تعلیم کی اصلاح پر غور کرے اور اس کے لئے ایک کمیٹی مقرر کرے جو ابتدائی سے لے کر اعلیٰ تعلیم تک کی اسکیم مرتب کرے۔ اس تجویز کے پیش کرنے کے وقت میں بیمار تھا۔ بڑی مشکل سے سینٹ کے اجلاس میں جا سکا۔ مگر میں نے اپنی تقریر لکھ لی تھی۔ ایک دوست نے اُسے پڑھ دیا۔ اس میں مروّجہ طریقِ تعلیم پر سخت سخت تنقید تھی۔ کچھ ممبروں نے، جس میں زیادہ تر معلّم ہی تھے، حرف گیری کی۔ مگر قرارداد اتفاقِ رائے سے منظور ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد اُسے سرکار کے پاس بھیجا گیا تو اُسے منظور کر کے کابینہ نے ایک کمیٹی بنادی۔ میں بھی اُس کا ایک ممبر بنایا گیا۔ صدر بنائے گئے، بمبئی والے

مسٹر کے ٹی شاہ۔

میری تجویز کے پیش ہونے کے پہلے بھی، مہاتما گاندھی نے ایک پلان پیش کر کے تعلیم کے متعلق سارے ملک کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ انہوں نے کئی مضمون ہریجن میں لکھے۔ اُن کی سکیم کی خاص بات یہ تھی کہ بچوں کی تعلیم جو آج صرف حرفوں کے ذریعے دی جاتی ہے، صرف حرفوں یا کتابوں کے ذریعہ ہی نہ دی جائے۔ کچھ ہنر یا دستکاری کے ذریعے دی جائے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اگر ایسا کیا جائے گا تو بچے جو کام کر کے کمائیں گے۔ اُس سے ابتدائی تعلیم کا خرچ بھی نکل جائے گا۔ اُنہوں کے بہ یک کرشمہ دو کار کا منصوبہ بتایا۔ اُن کے مطابق تعلیم بھی آج کی تعلیم سے بہتر ہوگی اور اُس کے لئے خرچ بھی سرکار کو نہیں کرنا پڑے گا۔ اِس کے پہلے جب کبھی یہ سوال اٹھایا جاتا تھا کہ سبھی بچوں کی بغیر فیس اور لازمی تعلیم کا انتظام کیا جائے تو سرکار کی طرف سے بھی عذر پیش کیا جاتا تھا کہ اُس کے پاس اتنا روپیہ نہیں کہ وہ اسے کر سکے۔ گوکھلے مرحوم کے وقت سے ہی اِس بات پر زور دیا جاتا رہا تھا اور سرکار روپیہ نہ ہونے کے بہانے سے مخالفت کرتی آرہی تھی۔ کہیں مفت تعلیم کا اور کہیں کہیں مفت اور لازمی تعلیم کا بھی انتظام کیا گیا تھا مگر وہ اتنے کم مقامات اور اتنے چھوٹے پیمانہ پر برٹش سرکار میں ہوا تھا کہ اُس سے یہ امید نہیں کی جا سکتی تھی کہ یہ منصوبہ سارے ہندوستان میں کبھی پورا ہو سکے گا۔

بہار کے چھپرا ضلع میں کچھ حد تک مفت تعلیم کا انتظام کیا گیا تھا۔ اُس میں خاص دلچسپی لینے والے دو اصحاب تھے میرے بھائی صاحب مہندر پرشاد اور چھپرا ضلع کے اسکولوں کے اُن دنوں کے ڈسٹرکٹ انسپکٹر بابو رادھکا پرشاد۔ مگر سرکار نے اگر اُسے نامنظور نہیں کیا تاہم کبھی اس کی بہت حوصلہ افزائی بھی نہیں کی۔ کسی طرح سے یہ اسکیم

چل رہی تھی۔ گاندھی جی نے اپنی اسکیم سے ہلچل سی مچادی۔ اُنہوں نے کچھ ایسے لوگوں کی جو تعلیم سے محبت رکھتے ہیں اور اُس کی تبلیغ میں لگے رہتے ہیں ایک کانفرنس واردھا میں کی۔ وہاں اُن کی سکیم پر غور ہوا۔ کانفرنس نے ایک سب کمیٹی بنادی۔ جامعہ ملّیہ (دلّی) کے شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین اُس کے صدر ہوئے۔ سب کمیٹی نے ایک اسکیم بنائی جو واردھا سکیم کے نام سے مشہور ہوئی۔ گاندھی جی کی سکیم کی ہی اس سب کمیٹی نے بہت حد تک تائید کی اور ابتدائی تعلیم دستکاری کے ذریعے دینے کی سفارش کی۔ سب کمیٹی خرچ کے متعلق اُس حد تک جانے کو تیار نہیں تھی جہاں تک گاندھی کا خیال تھا مگر وہ بھی اِس کے مخالف نہیں تھی کہ خرچ کا کچھ حصّہ اگر بچوں کی دستکاری سے نکل آئے وہ نکال لینا چاہیئے۔

اس طرح جو ماہرینِ تعلیم وہاں جمع ہوئے اُنھوں نے یورپ اور امریکہ کے ماہرینِ تعلیم کے خیالات سے گاندھی جی کے خیالات کو تقویت دی اور معلوم ہوا کہ بغیر اُن کے خیالات اور کتابوں کا مطالعہ کئے ہی گاندھی جی نے جو کچھ کہا ہے وہ ماہرینِ جدید کے بھی خیالات ہیں۔ اِسی لئے جب میں نے اپنی تجویز پیش کی تھی تو میرے دل میں یہ بات بھی تھی کہ واردھا اسکیم پر بھی کمیٹی غور کرے گی۔ اگر اس کی رائے بھی اِس سے مل گئی تو گاندھی جی جو کرنا چاہتے تھے وہ بہار میں حکومت آسانی سے کرسکے گی۔ میں نے اِس کمیٹی کی ممبری منظور کرلی۔ اِس کا کام بھی جاری ہوگیا۔ مگر اِس کمیٹی کے کام کا بار اُس کے صدر مسٹر کے ٹی شاہ پر ہی زیادہ رہا۔

بہار سرکار کے محکمۂ تعلیم نے ایک اور کمیٹی مقرر کی۔ اُس کا بھی میں ممبر بنایا گیا ہندی ہندوستانی کے متعلق ہندی ساہتیہ سمیلن کے ناگپور کے اجلاس میں میں نے

اپنے خیالات پیش کئے۔ بہار میں یہ سوال پیش ہوا کہ یہاں کے نصاب تعلیم میں ایسی زبان کہاں تک چل سکتی ہے جسے ہندی اور اُردو جاننے والے دونوں ہی قبول کریں اور اِس کے لئے لغت بنانے کی بھی کوشش کی گئی۔ ڈاکٹر محمود نے مجھے ہی اِس کا صدر بنایا مگر میں نے اِسے منظور نہیں کیا کیونکہ میرے پاس دوسرے کام بہت ہو گئے تھے اسی لئے میں نہ تو اس میں کافی وقت دے سکتا تھا اور نہ ایسے وزنی کام کی قابلیت ہی اپنے میں سمجھتا تھا۔ اِسی لئے اُس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد صاحب بنائے گئے۔ اس کا کام بھی شروع ہوا۔ اِس طرح میرے ذمہ اپنے صوبے میں بہت کام آگیا۔ ورکنگ کمیٹی کے ذریعہ مقرر شدہ پارلیمنٹری کمیٹی کا ممبر تو میں تھا ہی، ۱۹۳۶ء سے ۱۹۳۷ء تک کا بہت وقت تقریباً اِنہی کاموں میں لگا۔ وقت کافی لگا۔ کیونکہ جن مسئلوں پر غور کرنا تھا وہ گمبھیر تھے اور ان کا نبٹارہ آسانی سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ جو سفارشیں ہوتیں ان کا بھی اثر کافی پڑتا۔ اِسی لئے اگرچہ میں وزارت میں نہیں تھا پھر بھی اپنی طاقت اور عقل کے مطابق حتی الوسع مدد دینا میرا ضروری فرض ہو گیا تھا۔

ایک اور معاملہ تھا جس پر بہت غور کیا گیا مگر کچھ راستہ تک نہیں نکلا۔ وہ ہے بہار کے کچھ حصہ کا سیلاب کی زد میں آجانا۔ چھپرا اور پٹنہ کے بیچ میں سرجو، گنگا، سون اور گنڈک نام کی چار بڑی بڑی ندیوں کا سنگم ہے۔ جب کبھی انہیں ندیوں کے منبع یا راستہ میں لگاتار بہت بارش ہو جاتی ہے تو ان میں ایک ساتھ باڑھ آجانے سے اُس کے آس کے مقاموں کی حالت بہت خراب ہو جایا کرتی ہے ایسا پہلے سے ہی آتا چلا آرہا تھا مگر ۱۹۳۴ء کے زلزلہ کے بعد سے سیلاب کا زور بڑھ گیا ہے۔ کچھ لوگوں کا قیاس ہے کہ زلزلہ کی وجہ سے ندیوں کی گہرائی کم ہو گئی ہے۔ اُن میں

اب اتنے پانی کے نکاس کی طاقت نہیں رہ گئی جتنی پہلے تھی۔ اِسی لئے اب پانی دور تک باہر پھیل آتا ہے اور جہاں جاتا ہے وہاں پانی کی گہرائی بھی زیادہ ہوتی ہے۔ مگر اُس علاقہ کے سوا جہاں ندیوں کے سنگم کی وجہ سے اکثر سیلاب آجایا کرتا ہے۔ بہار کے خاص کر شمالی بہار کے اور بھی حصّہ ہیں جہاں سیلاب بہت آیا کرتا ہے۔ سیلاب کے اسباب میں لوگوں کی رائے ہے ایک زبردست سبب ریلوے کے بند بھی ہیں جو پانی کو روک دیتے ہیں اور اُسے آسانی سے بہہ کر نکلنے نہیں دیتے۔ اِن بندوں میں کافی پُل اور پانی کے نکاس کے راستے نہیں ہیں۔ کہیں کہیں تو اِن بندوں کی وجہ سے بہت نقصان ہو جایا کرتا ہے۔ ریلوے والے لوگوں کی کچھ سنتے نہیں۔ مزید براں دوسرے بند بھی ہیں جو خاص طور سے پانی روکنے کے لئے ہی بنائے گئے ہیں۔ اُن کے اثر کے متعلق اختلافِ رائے کی گنجائش ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سیلاب کا سوال بہار کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے۔ میں نے اِس بارے میں کچھ مضمون لکھے تھے اور جب کانگریسی وزارت بنی تو اُسے اس مسئلہ پر بھی غور کرنا ضروری معلوم ہوا۔ اُس نے ایک کانفرنس کی جس میں تجربہ کار انجنیروں اور عوام کے نمائندوں کو بلایا گیا بہت تبادلۂ خیالات ہوا مگر کوئی قابل اطمینان حل نہیں نکلا۔ کیونکہ نہ تو وجوہِ سیلاب پر اتفاقِ رائے ہو سکا اور نہ انسداد کے متعلق۔ کانفرنس میں میں بیماری کی وجہ سے شریک نہیں ہو سکا۔ مگر میرے خیالات وہاں پیش ہوئے تھے۔ بہار کے یہ بڑے بڑے سوال تھے جن سے میرا خاص تعلق تھا اور بھی بہت سے چھوٹے موٹے سوال تھے جن کے بارے میں میری رائے لوگ پوچھ لیا کرتے تھے۔ دوسری جگہوں کی وزارتوں سے میرا اتنا گہرا تعلق نہ رہا۔

گاندھی سیوا سنگھ

میں ہسپتال میں مارچ کے آخر ہفتہ تک رہا۔ جب طبیعت کچھ سنبھلی اور قدرے طاقت آئی تب وہاں سے نکلا۔ گاندھی سیوا سنگھ کا سالانہ اجلاس اِس سال اُڑلیسہ میں پُری کے پاس بیل گاؤں میں ہونے والا تھا۔ میں سیدھے وہیں گیا۔ مہاتماجی بھی وہیں جانے والے تھے۔ وہاں کچھ لوگ کئی دنوں تک رہے۔ گاندھی سیوا سنگھ کے سمّیلن چار پانچ ہی بار ہوئے مگر اُن کو اہمیت یہ تھی کہ وہاں گاندھی جی کے سامنے سبھی ممبروں کو کئی دنوں تک رہنے کا اچھا موقع مل جاتا۔ اُصولی باتوں پر آپس میں بہت بحث ہوتی۔ پیش شدہ مرحلوں پر گاندھی جی کی رائے مل جاتی۔ جو ممبر وہاں جس کام سے لگا رہتا وہ وہاں سے جوش کے ساتھ جاکر پھر کام کرتا۔

گاندھی سیوا سنگھ کے ممبر زیادہ تر تعمیری کام ہی میں لگے تھے۔ کوئی چرخہ سنگھ کے ذریعہ یا آزادانہ طور پر کھدر یا چرخہ کے پرچار کے کام میں لگا تھا تو کوئی ہریجنوں کی خدمت میں اپنا وقت لگا رہا تھا۔ کوئی دیہاتی صنعتوں کو ہی ازسرِ نو زندہ کرنا اپنا خاص فرض مان کر اُسی میں لگا ہوا تو کچھ لوگ واردھا اسکیم کی توسیع کے لئے قائم

تعلیمی سنگھ میں تبلیغ تعلیم کا کام کر رہے تھے کچھ لوگ گئو سیوا (گائے کی خدمت) میں ہمہ تن مصروف تھے، جس میں مردہ جانوروں کی کھال نکالنے پکانے اور اُس سے جوتے، بکس وغیرہ سامان بنوانا بھی شامل تھا۔ خاص کر انھیں سب اثباتی نوعیت کے کاموں میں جن کے لئے گاندھی جی نے حوصلہ دلایا تھا، سنگھ کے لوگ دلدادہ تھے۔ کچھ ایسے بھی ضرور تھے جو کانگریس کی تنظیم کا کام کرتے تھے۔ یہ جا بجا کانگریس کمیٹیوں کی خدمت کر رہے تھے مگر ایسے ممبروں کی تعداد بہت کم تھی۔ وہاں بھی اُن سے زیادہ تر تعمیری کام کرنے کی ہی توقع رکھی جاتی تھی جب کونسلوں کا چناؤ ہونے لگا اور کچھ ممبر امیدوار بنائے گئے تو اس معاملہ پر گاندھی سیوا سنگھ کی کانفرنس میں خاص بحث چھڑی تھی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ سنگھ کے لوگوں کو اس کام میں نہیں پڑنا چاہیئے۔ مگر سنگھ نے کچھ کو اجازت دیدی تھی۔ مجھے، جہاں تک یاد ہے اِس معاملہ پر دو اجلاسوں میں غور ہوتا رہا اب تو اس کے ممبر شری جگ لال چودھری وزیر اور شری کرشن بلبھ سہائے پارلیمنٹری سکرٹیری ہو گئے تھے۔ سنگھ کی ممبری اخلاقی اعتبار سے انسان کو اگر وہ سچائی سے کام لیتا۔ اونچا اٹھا سکتی تھی۔ اُس سے امید رکھی جاتی تھی کہ گاندھی جی کے سچائی اور عدمِ تشدد کے اصولوں کو حتی الوسع اپنی زندگی میں اتارنے اور تبلیغ کرنے کی کوشش کرے گا۔

اِس سنگھ کا مقصد کبھی کوئی سیاسی پارٹی تیّار کرنے کا نہیں تھا۔ اس نے کبھی ایسا کیا بھی نہیں۔ کبھی اِس سنگھ کی طرف سے کسی نے چُناؤ میں حصہ نہیں لیا چاہے وہ کانگریس کا ہو یا میونسپلٹی یا ڈسٹرکٹ بورڈ کا، اسمبلی کا ہو یا کونسل کا۔ بیشتر تو ان سبھی جماعتوں سے خود کو الگ رکھتے تھے۔ کسی چناؤ سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ اگر کہیں کوئی الکشن میں

کھڑا بھی ہوتا تو ذاتی حیثیت سے، اپنی خدمت کے بل پر نہ کہ سنگھ کی ممبری سے فائدہ اٹھا کر۔

سنگھ میں سیٹھ جمنالال بجاج، سردار ولبھ بھائی پٹیل اور مجھ جیسے لوگ بھی تھے جو کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے ممبر تھے اور اپنے اپنے مقام پر کانگریس کے کام میں نمایاں حصّہ لیتے تھے۔ خود گاندھی جی ممبر تو نہیں تھے مگر رہنما تو تھے ہی۔ پھر بھی یہ کہنا بالکل بے بنیاد تھا کہ جیسے کانگریس کے اندر سوراج پارٹی یا کانگریس سوشلسٹ پارٹی بنی تھی ویسی ہی جماعت یہ بھی تھی۔ اس کا مقصد خادمِ تیار کرنا تھا۔ اُن کے ذریعہ تعمیری کام میں حتی الوسع مدد پہنچانا تھا۔ مگر کچھ لوگوں نے اس پر الزام لگایا کہ وہ بھی ایک پارٹی ہے۔ رام گڈھ کانگریس کے کچھ پہلے جو سنگھ کا سالانہ جلسہ بنگال میں ہوا تھا اس میں سنگھ کو توڑنے کا فیصلہ کر لیا گیا۔

دیہات کی اصلاح کا منصوبہ

ناسک میں قیام

اُڑیسہ میں ہم لوگوں کو معلوم ہوا کہ وہاں کی اسمبلی کی کانگریس پارٹی کے اندر بہت اختلاف چل رہا ہے۔ وزارت کے خلاف کچھ لوگوں کو شکایتیں ہیں۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل اور میں پارلیمنٹری کمیٹی کے دو ممبر وہاں موجود تھے۔ ہم نے مناسب سمجھا کہ دونوں فریقوں سے باتیں کر لی جائیں اور ہو سکے تو اِس جھگڑے کو طے کر دیا جائے۔ ایک طرف وزیر تھے اور دوسری طرف پنڈت نیل کنٹھ داس، پنڈت گوداورش مشر وغیرہ تھے۔ شری گوپ بندھو، چودھری کسی پارٹی کے نہیں تھے۔ وہاں پر ہم نے سبھی باتیں سُن کر اپنی رائے دے دی۔ شری گوپ بندھو داس کو، جو گاندھی سیوا سنگھ کی طرف سے وہاں کٹک میں آشرم بنا کر تعمیری کام میں لگے ہوئے تھے اور کانگریس سے الگ ہو گئے تھے۔ کانگریس کا کام سنبھالنے کے لئے دونوں فریقوں کی رائے سے کہا گیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ جھگڑا ختم ہو جائے گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ بعد میں اِس کے بہت بُرے نتیجے دیکھنے میں آئے

جس کا ذکر مناسب جگہ آئے گا۔

ایک واقعہ وہاں جو ہوا وہ قابل ذکر ہے۔ جو لوگ اس کانفرنس میں گئے تھے اُن میں سے کچھ شری جگدیش کے درشن کے لئے پُری چلے گئے۔ اُن میں ہمارے گھر کی عورتیں بھی تھیں۔ اُن کے متعلق تو نہیں مگر دوسروں کے متعلق مہاتما جی کو اس سے بہت دکھ پہنچا۔ شری جگن ناتھ جی کا مندر ابھی تک ہریجنوں کے لئے نہیں کھلا ہے یعنی ہریجن وہاں اس طرح درشن پوجا نہیں کر سکتے جس طرح اعلیٰ ذات کے ہندو، مہاتما جی خود ایسے مندر میں نہیں جاتے جہاں ہریجن نہ جا سکتے ہوں۔ اُن کا خیال ہے کہ اگر ان کو درشن پوجا کا حق نہیں ہے تو ہمیں بھی نہ ہونا چاہیئے۔ جو لوگ خود کو گاندھی جی کا پیرو سمجھتے تھے اُن کو بھی اتنی سختی کچھ کھٹکی۔ مگر اس سے ہریجنوں کے لئے گاندھی جی کی محبت اور ہمدردی کی گہرائی کا پتہ لگ گیا۔

ہسپتال سے نکلنے پر ڈاکٹروں کی رائے تھی کہ مجھے ابھی کچھ اور آرام کرنے کی ضرورت ہے اِسی لئے جب گرمی شروع ہوئی تو میں نے طے کیا کہ کچھ دنوں تک کسی صحت بخش مقام پر جا کر رہ آوں۔ اِسی لئے میں نے ناسک جا کر رہنے کا فیصلہ کیا۔ وہاں سیٹھ برلا کا ایک مکان تھا جس کا وہ خاص کر ہوا بدلنے کے لئے مقام (سینیٹوریم) کی طرح استعمال کرتے ہیں۔ میں نے وہیں جا کر ٹھہرنا طے کیا۔ سیٹھ رامیشور داس برلا نے بمبئی سے سب انتظام بھی کر دیا۔ ناسک جانے کا خیال ایک اور سبب سے بھی ہوا۔ مئی کے مہینے میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہونے والا تھا۔ سوچا کہ ناسک بمبئی کے قریب ہے وہاں سے آسانی سے اس جلسہ میں شریک ہو سکوں گا۔

ناسک جانے سے پہلے ایک اور کام تھا جس کے متعلق مجھے طے کر لینا تھا۔ وزارت

بہار کا خیال تھا کہ دیہات کی اصلاح سرکاری طور پر کچھ کام کیا جائے۔ اِس کے لئے وہ ایک محکمہ بنانا چاہتی تھی۔ اِس کے لئے ایک ایسا پلان بنانا تھا جس کے مطابق کام کیا جائے اور اس کے لئے ایک ایسا آدمی بھی درکار تھا جو اس نظریہ سے اس کام کو چلائے جسے وزارت پسند کرتی تھی۔ اب تک دیہات کی اصلاح کا کام سرکاری طور پر کچھ بھی نہیں ہوا تھا یہ پہلا پروگرام تھا۔ اس میں خاص کر گاؤں میں رہنے والوں کی حالت ہر طرح سے سدھارنے کا ہی خیال تھا۔ اب تک جو لوگ سرکاری کام کیا کرتے تھے۔ وہ ایک طرح سے عوام کے مالک اور حکمراں بن کر ہی کیا کرتے تھے۔ ضرورت تھی کہ کچھ لوگ خادم بن کر کام کریں۔ یہی کام اس محکمہ کے سپرد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ میں نے ایک اسکیم بنائی۔ سرکار نے پنڈت پرجاپتی مشر کو اس محکمہ کا چارج دیا۔ دوسرے کارکن بھی مقرر ہوئے۔ بہتیرے کانگریسی کارکن مقرر ہوئے اس کا سبب یہ نہیں تھا کہ کانگریسی لوگوں کو نوکری دینی تھی۔ یہ کام ہی ایسا تھا جس کا تھوڑا بہت تجربہ اگر کسی کو تھا تو کانگریسی کارکنوں کو ہی، دوسروں کو نہیں۔ کیونکہ کسی نے صوبۂ بہار میں اِس قسم کا کوئی کام کیا ہی نہ تھا مگر ان کے ساتھ دوسرے لوگ بھی مقرر ہوئے۔ سمجھا گیا کہ سب کو کچھ دن کے لئے تربیت دیکر تیّار کیا جائے۔ جو پلان میں بنا رہا تھا وہ پورا نہیں ہو پایا تھا۔ اِسی لیے پنڈت پرجاپتی مشر ناسک میں آکر مجھ سے ملے۔ وہیں پر ہم نے اُسے پورا کیا۔ جب تک وہ رہے تب تک یہ محکمہ کام کرتا رہا۔ اُسی سانچے پر کام ہوا۔ میرا خیال ہے کہ عوام کو اِس سے فائدہ پہنچ رہا تھا۔ مگر وزارت کے استعفےٰ دینے کے بعد اُس کا رُخ آہستہ آہستہ بدل گیا۔ آخر میں سرکار نے اسے توڑ دیا۔

ناسک کے سفر میں میرے ساتھ شری چکر دھر شرن نہیں جاسکے۔ اُن کا مقام

شری امبکا کانت سنگھ نے لے لیا۔ ایک اور صاحب ملے جن کا کچھ ذکر کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے وہ تھے ایک صاحب جن کا نام تھا شری دیورات جی برہمچاری ۔ وہ کرناٹک صوبہ میں سمندر کے کنارے آباد گوکرن نام کے تیرتھ کے برہمن تھے ۔ مظفر پور میں سُہردِ سنگھ کی سالانہ کانفرنس میں گیا وہیں اُن سے پہلی ملاقات ہوئی تھی۔ وہاں انھوں نے مناجات کے طریقہ کی ایک چیز تیار کی تھی جسے پڑھ کر سُنایا تھا۔ سنسکرت کے اچھے عالم تھے مگر وہاں اُن سے زیادہ کھل کر بات نہیں ہو سکتی تھی ۔ ایک دن میں آشرم میں بیٹھا تھا۔ میری بہن بھی تھیں۔ اُس دن کوئی مذہبی تقریب کی تاریخ تھی اِس لئے بہت لوگ گنگا نہانے آئے تھے میں نے دیکھا کہ وہ صاحب بھی ان میں تھے۔ بہن کا خیال اُن کی طرف گیا اور اُن کی خاطر تواضع کی ۔ جب باتیں ہوئیں تو اُن کی علمیت وغیرہ کا کچھ پتہ چلا۔ میں نے اُنھیں دعوت دی کہ کچھ دنوں تک میرے ساتھ رہیں۔ اُنھوں نے اُسے منظور کیا۔ وہ یونہی دورہ کرتے کرتے بہار آگئے۔ میں زیرادئی گیا وہ بھی وہاں آئے کچھ دنوں تک ہم لوگ ساتھ رہے۔ اُن کو میں نے ناسک میں بھی بلا لیا۔ وہ ویدک برہمن تھے وید اُن کو تقریباً زبانی یاد تھی۔ اُپنشد تو وہ بغیر کتاب دیکھے ہی سُنا جاتے تھے۔ اُن سے معلوم ہوا کہ کرناٹک میں آج بھی یہ رواج ہے کہ وہاں برہمن ویدوں اور اپنشدوں کو حفظ کر لیتے ہیں وہ اپنا کام کرتے ہوئے کھیتی کرتے وقت بھی ان کا پاٹھ بھی کیا کرتے ہیں۔ اُس زمانے میں وہ ایک نقشہ بنا رہے تھے جس میں وہ ویدوں کے مطابق وجودِ کائنات ایک چاند کی صورت میں دیکھنا چاہتے تھے۔ اسی میں وہ موزوں رچاؤں اور منتروں کو اس طرح لکھتے تھے کہ سمجھنے والا شخص منتروں کو بھی پڑھ سکے اور بہت کچھ اس تصویر سے بھی سمجھ لے۔ اُن کا کہنا تھا کہ اِس کام میں انھوں نے کئی

سال لگاتے ہیں مگر وہ ابھی تک پورا نہیں ہوا تھا۔ وہ اِس کام کو اپنے دورہ میں ہی کر رہے تھے۔ اُن کی حیرت انگیز قوت حافظہ اور علمیت کا یہ ایک بیّن ثبوت تھا۔ کیونکہ اُن کے پاس ایک بھی کتاب نہیں تھی اُنھوں نے سب کچھ اپنے حافظہ سے ہی تیّار کیا تھا۔ ناسِک میں ہم لوگ گھومتے پھرتے اور وہ شام کے وقت اُپنشد کی تفسیر کرتے۔ وہ یوگی تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ میں اگر کچھ عمل پابندی کے ساتھ کیا کروں تو دمہ چھوٹ جائے۔ میں نے دھوتی کریا دکپڑا حلق کے اندر ڈال کر سینہ اور پیٹ تک کی صفائی، ان کی دیکھ بھال میں شروع کی۔ مگر ناسِک میں کُل پندرہ سولہ دن ہی رہ سکا۔ اس کے بعد بمبئی جانا پڑا۔ وہاں بہت بیمار پڑ گیا۔

دیورات جی سے ملاقات بہت اچھی رہی۔ وہیں معلوم ہوا کہ وہ پہلے کچھ دنوں تک شری رمن کے ساتھ تروون ملئے میں بھی رہ چکے تھے۔ شری رشی کے سوانح حیات میں ان کی علمیت اور ان کے محبّت بھرے ناچ کا ذکر ہے۔ وہ رشی کے ساتھ رہنے والے جید عالم گنپتی شاستری کے شاگرد تھے۔ اِسی تعلق سے وہاں آشرم میں جاکر کچھ سال رہے تھے وہ گوکرن میں ایک پاٹھ شالہ اور گئو شالہ چلا رہے ہیں۔ شمالی ہندوستان میں تو دورہ کے لئے وہ چلے آئے تھے۔ ہندی بھی اُنھوں نے اچھی سیکھ لی۔ اُن کی بولی سُن کر اُن کے متعلق کوئی ایسا نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ جنوبی ہند کے رہنے والے ہیں۔ ان کے ساتھ ناسِک سے ہم تریمبک بھی درشن کرنے کے لئے گئے۔ یہ مقام گوداوری کا منبع سمجھا جاتا ہے آس پاس کی پہاڑیوں میں پُرانے غار ہیں جنھیں میں نے جاکر دیکھا۔ ان ہی سے اُن پرانے دنوں کی فن کاری کے ساتھ اس دور کے اہلِ ریاض کی زندگیوں کا کچھ پتہ چلتا تھا۔

ناسک میں کئی اور چیزیں دیکھنے کو ملیں ۔ وہیں وہ سرکاری چھاپہ خانہ ہے جہاں سب ہی طرح کے نوٹ اور عدالتی اور ڈاک خانہ کے اسٹامپ چھپتے ہیں ۔ کارخانہ بہت بڑا ہے ۔ ہم نے پوسٹ کارڈ اور لفافہ چھپتے اور بنتے دیکھے ۔ ڈاک خانہ کے ٹکٹ بھی بنتے دیکھے، نوٹ چھپتے دیکھے ۔ اُس سارے عمل کو دیکھا جہاں سب سے پہلے نوٹ کا خاکہ بنایا جاتا ہے ۔ اِس کے لئے فن کار لوگ مقرر ہیں جو ہمیشہ اِسی خاکہ کی بنیاد پر جب وہ منظور ہو چکتا ہے، نوٹ چھاپنے کا سامان تیار کیا جاتا ہے ۔

دوسری ایک اور چیز دیکھی جو چھوٹی ہے مگر اس کی بھی اہمیت انہی چیزوں جیسی ہے دیا سلائی پر ٹیکس لگایا گیا ہے ۔ اُس کے وصول کرنے کا طریقہ یہاں کی دیا سلائی کی ہر پیٹی یا ڈبی پر کاغذ کی ایک پتلی دھاری سی چپکا دی جاتی ہے اور جب تک وہ نہ توڑی جائے اندر سے دیا سلائی نہیں نکالی جا سکتی ۔ کارخانہ سے کوئی پیٹی اس دھاری کے چپکائے بغیر نہیں جا سکتی ۔ کارخانہ والے ٹیکس ادا کر کے ہی اِس دھاری کو سرکار سے خرید سکتے ہیں وہ دھاری بھی جو لمبے فیتے کی شکل میں ہوتی ہے ۔ اسی کارخانہ میں چھپتی ہے ۔ ایک حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اگرچہ وہاں کام کرنے والے نہ جانے کتنے لاکھوں کروڑوں کے نوٹ چھاپتے ہوں گے مگر ان بے چاروں کی مزدوری تقریباً وہی ہے جو دوسرے کارخانوں میں ملتی ہے ۔ ان میں بہت سے خاص غریبی کی زندگی گزارتے ہیں جو روزانہ لاکھوں کے کاغذی نوٹ بناتا ہے وہ شاید ایک روپیہ روز پاتا ہوگا ۔ کیسی حیرت کی لیلا ہے کیسی آج کی دنیا ہے ۔

مدھیہ پردیش کی وزارت میں جھگڑا

ناسک سے میں بمبئی گیا۔ وہاں ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کمیٹی کے اجلاس ہونے والے تھے ہری پورہ کانگریس کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا یہ پہلا اجلاس تھا۔ جس میں شری سبھاش چندر بوس کو صدارت کرنی تھی۔ آٹھ مہینوں سے کانگریسی وزارتیں کام کرتی آرہی تھیں۔ کچھ لوگ اُن پر سخت نکتہ چینی کرتے آرہے تھے۔ کہیں کہیں کانگریسی لوگ بھی اُن کے خلاف آپس میں پارٹی بندی کر رہے تھے۔ جس سے ان کے کام میں کچھ دشواری بھی پڑ رہی تھی ممکن تھا کہ اس معاملہ پر وہاں کچھ غور ہو۔ اگرچہ ہری پورہ کانگریس کے اجلاس کے زمانے میں دو صوبوں میں ان کے استعفٰی دینے سے فضا میں بہت فرق پڑ گیا تھا۔ پھر بھی جو لوگ غیر مطمئن تھے اپنی حرکتوں سے باز نہیں آرہے تھے۔ میں تو وہاں جا کر بیمار ہو گیا۔ اجلاس میں شریک نہ ہو سکا۔ ایک کام اہمیت کا ہوا۔ وہیں طے ہوا کہ سارے ملک کے لئے ایک پلاننگ کمیٹی بنائی جائے جو سبھی صوبوں سے رائے اور مدد لے کر ایک پروگرام بنائے۔ جس کے مطابق سبھی صوبوں میں وزارتیں کام کریں۔ پنڈت جواہر لال نہرو اس کے صدر اور پروفیسر کے ٹی شاہ سکریٹری بنائے

گئے۔ سبھی صوبوں کی کانگریسی وزارتیں اس کمیٹی کی پوری مدد کرنے لگیں۔ دوسرے صوبوں کے لوگوں نے بھی مدد دینا منظور کیا۔ یہ کمیٹی کئی سب کمیٹیاں بنا کر کام کرتی رہی اس کی رپورٹ تقریباً تیار ہو چکی تھی۔ مگر رپورٹ مکمل ہونے سے پہلے ہی کانگریس کا برٹش سرکار سے جھگڑا چھڑ گیا۔ وہ رپورٹ پاس ہو کر ملک کے سامنے نہ آسکی۔

بمبئی میں مجھے برانکو نمونیہ کی بیماری ہو گئی۔ بخار بہت بڑھ گیا۔ کھانسی بھی خاصی زبردست ہو گئی۔ میں وہاں برلا ہاؤس میں ٹھیرا تھا۔ اُن لوگوں نے ہر طرح سے میری تیمارداری کا انتظام کیا۔ ایک چھوٹا سا واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ اُن دنوں ہٹلر نے جن یہودیوں کو اپنے ملک سے نکال دیا تھا وہ ملک بدر ہو کر بڑی تعداد میں اِدھر اُدھر چلے گئے تھے اُن میں کچھ ڈاکٹر تھے جو بمبئی آکر اپنا پیشہ کر رہے تھے اُن میں سے ایک برلا ہاؤس میں آجایا کرتا تھا۔ اِسی نے میرا علاج شروع کیا۔ دو تین دنوں تک اس کا علاج رہا مگر ابھی کچھ افاقہ نہیں ہو رہا تھا۔ سنا کہ بمبئی میں کچھ ڈاکٹر جن میں شری پرشوتم پٹیل بھی تھے، یہ جان کر خفا ہوئے ہیں کہ ان لوگوں کو نہ بلا کر ایک جرمن ڈاکٹر کا علاج ہو رہا ہے۔ جب یہ خبر ملی تو وہ بلائے گئے۔ بعد میں ڈاکٹر گلڈر بھی آئے جو اُن دنوں بمبئی کے ایک وزیر تھے۔ اُن لوگوں نے علاج شروع کیا۔ جب میں اچھا نہ ہوا تو مہاتما جی کی رائے ہوئی اور میں بھی اس سے متفق ہوا کہ میں واردھا چلا جاؤں۔ بمبئی کی ہوا میں نمی رہتی ہے جو مجھے برداشت نہیں۔ اس لئے میں واردھا چلا گیا۔ طبیعت اچھی ہونے پر میں وہیں ٹھیر گیا۔

بمبئی میں ہی معلوم ہو گیا تھا کہ مدھیہ پردیش کی وزارت میں آپس کا بہت اختلاف ہو گیا ہے ایک دوسرے کی شکایتیں کرتے ہیں۔ اسی زمانہ میں پارلیمنٹری

کمیٹی نے طے کیا کہ وہ اس کی جانچ کرے گی۔ اُن دنوں پنچ مڑھی میں وزارتی مرکز تھا۔ اِس لئے سردار ولبھ بھائی پٹیل اور مولانا ابوالکلام آزاد وہاں گئے۔ میں بیمار ہونے کی وجہ سے نہیں جاسکا۔ جھگڑا وزیرِ اعلیٰ ڈاکٹر کھرے اور پنڈت دوار کا پرشاد مشر میں تھا۔ ہندوستانی مدھیہ پردیش میں وزارت بننے سے پہلے دو پارٹیاں تھیں ایک میں پنڈت دوار کا پرشاد مشر سمجھے جاتے تھے، دوسری میں پنڈت روی شنکر شُکل۔ جس زمانے میں ۱۹۳۷ء میں اسمبلی کا چناؤ ہوا تھا۔ اُسی زمانے میں ایک مقدمہ پنڈت دوار کا پرشاد مشر کے خلاف چلنے کی خبر نکلی۔ اُنھوں نے ورکنگ کمیٹی کو خبر دیدی کہ چونکہ اُن کے خلاف مقدمہ کی بات چیت چل رہی ہے اِس لئے جب تک وہ اِس سے نکل کر اپنے کیرکٹر کی صفائی نہ دے دیں تب تک وہ کانگریس کے سبھی عہدوں سے الگ رہنے کو تیار ہیں۔ وہاں جب تک ہندوستانی حصّہ کے ممبروں کی پوری مدد نہ ملے تب تک کوئی کانگریس پارٹی کا لیڈر نہیں ہوسکتا تھا۔ پنڈت دوار کا پرشاد نے ڈاکٹر کھرے کی مدد کی اُن کی مدد سے ہی وہ لیڈر چنے گئے۔ جب وزارت بننے کا وقت آیا تو اُن سے ہی گورنر نے وزارت بنانے کو کہا۔ جو مقدمہ پنڈت دوار کا پرشاد مشر پر چلنے والا تھا اُسے بے بنیاد سمجھ کر وہاں کے حاکموں نے اٹھالیا۔ اِس کے بعد پنڈت دوار کا پرشاد مشر بھی وزارت میں شامل ہوگئے۔ اِس طرح یہ سمجھا جاتا تھا کہ اُن کی اور ڈاکٹر کھرے کی بڑی دوستی ہے۔ بات بھی ایسی ہی تھی۔ پنڈت روی شنکر شکل بھی وزیر بنے تھے۔ کانگریس کے کام میں وہ پنڈت دوار کا پرشاد مشر کے حریف سمجھے جاتے تھے۔ وزارت کے کام میں شکل جی اور مشر جی کی رائے بہت سی باتوں میں ایک ہوئی۔ دونوں کا ڈاکٹر کھرے سے اختلاف ہوا۔ اگر اتنا ہی رہتا تو کوئی حرج نہیں کیونکہ دوستی ایک الگ چیز ہے

اور خدمت ملک کے متعلق اختلاف دوسری چیز۔ ڈاکٹر کھرے نے مشرجی کی شکایت کی اور مشرجی نے ڈاکٹر کھرے کی۔

اِنہیں شکایتوں کو دُور کرنے کے لئے سردار پنچ مڑھی گئے۔ وہاں کچھ باتیں طے ہوسکیں۔ امید بندھی کہ سب معاملہ طے ہوجائے گا اور دونوں کام چلانے لگیں گے، مگر بات ایسی نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر کھرے اپنا خیال نہیں بدل سکے۔ انھوں نے سوچ لیا کہ مِشرجی کے ساتھ اُن کی نہیں نبھے گی۔ اُدھر مِشرجی کے ساتھ کام کرتے کرتے شکل جی ان سے زیادہ گھُل مل گئے۔ ایسا معلوم ہوا کہ ڈاکٹر کھرے ان دونوں کو کسی نہ کسی طرح وزارت سے ہٹائیں گے۔ جو کوشش یہ جھگڑا نبٹانے کی ہوئی وہ بے سود ثابت ہوئی۔ آپس کی بددلی بڑھتی ہی گئی۔ میں اچھا ہوکر واردھا ہی میں آرام کر رہا تھا کہ اچانک ایک روز خبر ملی کہ جھگڑے نے شدید شکل اختیار کرلی ہے۔ پارلیمنٹری کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ اسکے دو ہی دنوں بعد ہونے والی تھی۔ ڈاکٹر کھرے اس کے پہلے ہی موجودہ وزارت کو توڑ کر اُس کی جگہ نئی وزارت بنالینا چاہتے تھے۔ اُنھوں نے اِس کے لئے گورنر کی مدد لی۔ جب مجھے خبر ملی تو میں نے اُن کو ایک خط لکھا کہ وہ ایسی کوئی کارروائی نہ کریں۔ دو دن بعد طے ہونے والی پارلیمنٹری کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی کا انتظام کرلیں۔ وہ خط اُن کے پاس رات کو گیا۔ اُسی رات کو اُنھوں نے وزارت کا استعفےٰ گورنر کو دیکر منظور کرالیا اور نئی وزارت بنا بھی لی۔ میرا خط اُن کے پاس کسی طریقے سے رات کو پہنچنے نہ پایا۔ دوسرے دن سویرے نئی وزارت بن گئی۔ اُس میں وہ دونوں پہلے وزیر پنڈت روی شنکر شکل اور پنڈت دوار کا پرشاد مِشر نہیں تھے۔ کچھ نئے لوگ لئے گئے تھے۔ سب باتیں اتنی جلدی سے راتوں رات طے ہوئیں کہ نزدیک رہتے ہوئے بھی ہم کو

نئی وزارت کی پوری خبر اس کے بعد ہی ملی۔ جب دوسرے دن پارلیمنٹری کمیٹی کی نشست ہوئی تو اسے سب لوگوں نے بہت بُرا مانا۔ دونوں پارٹیوں کے لوگ بلائے گئے۔ شری سبھاش چندر بوس بھی پہنچ گئے۔ اگرچہ یہ پارلیمنٹری کمیٹی کے ممبر نہیں تھے پھر بھی یہ کانگریس کے صدر تھے۔ اِس لیے سب سے بالاتر تھے۔ اُن کی حاضری میں دونوں فریقوں کی باتیں سنی گئیں۔ کمیٹی نے رائے قائم کی کہ اِس طرح نئی وزارت بنا لینا بیجا ہوا ہے۔ خاص کر جب فوراً ہی پارلیمنٹری کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی کی نشستیں ہونے والی تھیں۔ نئی وزارت کے وزیروں سے کہا گیا کہ وہ استعفےٰ دے دیں۔ یہ باتیں ہوتے ہوتے بہت رات گزر گئی تھی مگر اُسی وقت ٹیلیفون پر ڈاکٹر کھرے نے گورنر کو خبر دے دی کہ وہ اور اُن کے ساتھ نئے وزیر استعفےٰ دے رہے ہیں۔ دوسرے دن اُنھوں نے استعفے لکھ کر بھیج دیا۔ ویسا ہی دوسروں نے کیا۔ اب نئی وزارت بنانے کا فیصلہ ہوا جس میں پنڈت روی شنکر شکل وزیرِ اعلیٰ بنے اور پنڈت دوار کا پرشاد مشر بھی ایک وزیر ہوئے۔ ڈاکٹر کھرے اِس میں نہیں آئے۔ وہاں کی اسمبلی کی کانگریس پارٹی کا اجلاس واردھا میں ہوا جس میں سبھاش بابو اور ہم لوگ بھی موجود تھے اُس نے شکل جی کو ہی اپنا لیڈر چُنا۔ اِس لئے وہی وزیر اعلیٰ بنے۔

اِس ساری کارروائی سے بڑی ہلچل مچ گئی۔ ڈاکٹر کھرے بہت طیش میں آ گئے۔ اُنہوں نے بہت زوروں سے پارلیمنٹری کمیٹی اور مہاتما جی کی شکایت کی۔ ساری کارروائی کی سخت الفاظ میں نکتہ چینی بھی کی۔ وہ مہاراشٹری برہمن ہیں۔ شکل جی اور شری اُتری ہندوستان کے ہندی زبان والے کانیکُبج برہمن ہیں۔ وہاں اور دوسری جگہوں میں بھی مہاراشٹری اور غیر مہاراشٹری کا جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا۔ کچھ دنوں تک ایسا معلوم ہوتا تھا

کہ کانگریس کے اندر زبردست پھوٹ پڑجائے گی۔ ڈاکٹر کھرے کی کارروائیاں ایسی ہوئیں کہ کچھ دنوں بعد ان پر ضابطہ کی کارروائی کرنی پڑی۔ اُن کو کانگریس سے خارج کرنا پڑا۔ یہ جھگڑا چل ہی رہا تھا کہ ایک کتاب نکلی جس میں ڈاکٹر کھرے کی باتوں کی تائید کی گئی تھی۔ جو کارروائی ورکنگ کمیٹی نے کی تھی اُس کی مذمّت کی گئی۔ ساری باتیں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے سامنے آنے والی تھیں۔ سبھاش بابو کئی دنوں تک واردھا میں اور اس کے بعد ناگ پور میں ٹھیرے رہے۔ اُنھوں نے ایک بہت بڑا بیان تیار کیا۔ جس میں ساری باتیں لکھی ہوئی تھیں۔ وہ بیان ایک کتابی شکل میں چھاپ دیا گیا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی نشست کے وقت وہ تقسیم بھی کیا گیا۔ اِس سارے معاملہ پر غور ہوا۔ ڈاکٹر کھرے کو کانگریس سے نکالنے کا فیصلہ ہوا۔ میں ڈاکٹر کھرے کو ۱۹۳۴ء سے ہی اچھی طرح جان گیا تھا۔ جب اُنھوں نے مرکزی اسمبلی کے چناؤ میں ڈاکٹر مُنجے کا مقابلہ کیا تھا۔ اُس زمانے میں انھوں نے بہت جوش کے ساتھ کانگریس کی طرفداری کی تھی۔ جب شری ابھینکر کی رحلت ہو گئی تو مرہٹی زبان والے مدھیہ پردیش کے وہی لیڈر مانے جانے لگے۔ ہم سب کے ساتھ اُن کا بہت اچھا سلوک تھا۔ صوبائی اسمبلی کے چُناؤ کے وقت اُنہیں کی رائے سے سب باتیں پارلیمنٹری کمیٹی نے کیں۔ وزارت کی تنظیم میں بھی وہی برابر خاص سمجھے جاتے رہے۔ اِس طرح پارلیمنٹری کمیٹی کے لوگوں کا اُن پر بھروسہ تھا اور اُن کے ساتھ سلوک اچھا تھا۔ جب میں صدر کی حیثیت سے اُن کے صوبے میں گیا تھا تو اُنہیں کے یہاں ٹھیرا تھا۔ اُنھوں نے بھی دورہ میں میرا ساتھ دیا تھا۔ اِس طرح وہ سب کے مانے ہوئے تھے۔ مگر اِس معاملہ میں نہ جانے کیوں اُنھوں نے ایسا خیال بنا لیا۔ جو جھگڑا مشرجی کے ساتھ ہوا اُس میں پارلیمنٹری کمیٹی کو بھی گھسیٹ کر

اُنھوں نے جوت دیا۔ مہاتما جی کو بھی اُنھوں نے اچھوتا نہ چھوڑا۔ یہ سارا واقعہ بہت تکلیف دِہ تھا۔ کیوں کہ اُن جیسا ایک قابل شخص کانگریس کا مخالف بن گیا۔ اِس کے بعد اُنھوں نے کانگریس کو ہر موقع پر نیچا دکھانے کی کوشش کی۔ ان کے ایسے ایسے بیان ہوئے اور ایسی ایسی باتیں اُنھوں نے کانگریس کے متعلق کہیں جیسی شاید کانگریس کے سخت سے سخت مخالف بھی نہیں کہتے ہوں گے۔ ہم لوگوں کی نظروں میں کانگریس کے وقار اور اس کی ضابطہ بندی کی حفاظت کے سوا کوئی بات نہیں تھی۔ سچ پوچھئے تو میں جتنا ڈاکٹر کھرے کو جانتا تھا اور اُن کے لئے جتنی عقیدت رکھتا تھا اتنی مِشرجی کے لئے نہیں۔ کیوں کہ مِشرجی کے ساتھ کام کرنے کا اتنا موقع نہیں ملا تھا۔ ڈاکٹر کھرے کو بھی مشرجی سے بڑی عقیدت تھی اور اُن پر بہت اعتماد کیا کرتے تھے۔ مگر کچھ معاملوں میں اختلافِ رائے ہو جانے کے سبب سے دونوں کا ایک ہی وزارت میں رہنا غیر ممکن ہو گیا۔

آسام اور اڑیسہ کی وزارتیں

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی اُسی نشست میں جس میں ڈاکٹر کھرے کو ہٹائے جانے کی تجویز پاس ہوئی۔ کچھ بحث وزارتوں کے متعلق ہوئی تھی۔ اُس میں یہ پتہ چلا کہ کانگریس کے اندر بھی کچھ لوگ وزارتوں سے ناخوش تھے۔ اور چاہتے جس طرح ہو اُن پر کچھ نہ کچھ الزام لگانا ہی چاہتے تھے۔ اگرچہ اُس بحث میں بہت باتیں کہی گئیں اور جو لوگ اپنے کو بایاں بازو (لفٹسٹ) کہا کرتے تھے اُنہوں نے بہت زور لگایا پھر بھی آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے وزارتوں کی مذمّت نہیں کی اور کام چلنے دیا۔

ایک طرف تو جہاں وزارتیں بن گئی تھیں وہاں اِس طرح اُن پر حملے کئے جا رہے تھے دوسری طرف جہاں کانگریسی وزارت نہیں تھی۔ وہاں کانگریسی وزارت بنانے کی کوشش بھی چلتی رہی۔ آسام اُن صابوں میں ہے جہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے ماسوا انگریزوں اور قدیم باشندوں (آدی باسیوں) کی خاصی تعداد اسمبلی میں ہے۔ کانگریس نے غیر مسلم نشستوں پر کافی کامیابی چُناؤ کے وقت حاصل کرلی تھی۔ کانگریسی لوگ ہی سب سے زیادہ تعداد میں چُنے گئے تھے۔ ساری اسمبلی میں کانگریس پارٹی ہی

سب سے بڑی تھی۔ مگر ساری اسمبلی میں اُن کی واحد اکثریت نہیں تھی۔ جب اور کانگریسی صوبوں میں عارضی وزارتیں بنی تھیں تب وہاں بھی بنی مگر اور جگہوں سے یہاں یہ فرق تھا کہ اکیلے کانگریسی لوگ یہاں اکثریت نہیں رکھتے۔ اس لئے اگر دوسرے لوگ سب کے سب مل جائیں تو وہ اقلیت میں رہ جاتے تھے۔ پس چند مہینوں کے بعد دوسرے صوبوں میں کانگریسی وزارتیں بنیں تب وہاں نہیں بن سکیں اور کچھ دنوں تک وہاں غیر کانگریسی وزارت دوسروں کو ملا کر اپنی اکثریت قائم رکھ سکی۔ یہ اکثریت مستقل نہیں تھی ۱۹۳۸ء کے پچھلے حصہ میں وہاں کی حالت ایسی ہو گئی کہ اُس وزارت کے ساتھ اکثریت نہیں رہ گئی۔ وہاں بھی ایسا موقع آگیا کہ دوسری پارٹیوں کے لوگوں کے ساتھ مل کر کانگریس اپنی اکثریت بنا سکتی تھی۔ ایسی حالت پیش آنے پر وہاں کے لوگوں نے پارلیمنٹری کمیٹی اور کانگریس کے صدر کی اجازت جاننی چاہی۔ خود صدر کانگریس سبھاش چندر بوس اور پارلیمنٹری کمیٹی کے وہ ممبر (مولانا آزاد) جن کے ذمہ اس صوبہ کی دیکھ بھال تھی وہاں گئے۔ شری سبھاش چندر بوس کی زبردست رائے تھی کہ وزارت بنائی جائے مگر مولانا آزاد اِسے ناپسند کرتے تھے۔ مجھ سے اور سردار ولبھ بھائی پٹیل سے ٹیلیفون کے ذریعہ رائے پوچھی گئی۔ ہم دونوں دو جگہوں میں تھے۔ اس لئے مشورہ کر کے کوئی رائے نہیں دے سکتے تھے۔ جو جہاں تھا وہیں سے اپنی رائے دے دی۔ میں نے مولانا آزاد کی رائے سے اتفاق کیا۔ سردار پٹیل نے سبھاش بابو کی رائے مان لی۔ ہمارے سامنے سوال اُصولی تھا۔ کانگریس نے اُصولاً وزارتیں قبول کی تھیں۔ وہ صرف عہدہ کی خاطر عہدہ نہیں لینا چاہتی تھی، جہاں اُس کی اپنی اکثریت نہیں تھی۔ وہاں اُسے دوسرے خیال کے لوگوں پر بھروسہ کرنا پڑتا۔ ہم سمجھتے تھے کہ وہاں اس طرح آزادی اور یکسوئی کے

ساتھ کام نہیں ہو سکتا تھا۔ جس طرح اُن صوبوں میں جہاں کانگریس کے پاس اپنی اکثریت تھی۔ اسی اکثریت کے بل پر بہار اور اُتر پردیش میں استعفے دے کر وزارتیں وہاں کے سیاسی قیدیوں کو رہا کرا سکتی تھیں۔ اِسی اکثریت کے بل پر اڑیسہ میں سر جون ڈین کو گورنر ہونے سے روک دیا تھا۔ کیا ایسا موقع آنے پر آسام میں دوسروں کے بل کانگریس اِس طرح کا کوئی زبردست کام کر سکے گی؟ اس میں شبہ تھا۔ اِس لئے میں سمجھتا تھا کہ وہاں عہدہ تو ملے گا اور ہو سکتا ہے کہ معمولی طور پر وزارت کا کام بھی چلے۔ مگر کسی گمبھیر موقع پر ہم کانگریس کے کام کو نہ چلا سکیں گے۔ لیکن سبھاش بابو کا خیال تھا کہ عہدہ لے لینے سے کانگریس کی طاقت بڑھ جائے گی اور جو لوگ اس وقت الگ تھے وہ اس کے ساتھ آجائیں گے اِس لئے عہدے قبول کرنا مناسب ہوگا۔ سردار پٹیل نے صدر کانگریس کی بات رکھی۔ وہاں عین اُسی زمانے میں وزارت بنی جب دو چار دن میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہونے والا تھا۔ آسام سے واپسی کے وقت راستہ میں سبھاش بابو کی طبیعت کچھ خراب ہوگئی۔ وہ اجلاس میں دیر کر کے پہنچے۔

اوپر اڑیسہ کا ذکر آیا ہے وہاں مسٹر ڈین سِول سروس کے اونچے عہدہ دار تھے وہاں کے گورنر رخصت پر جانے لگے۔ ان کی جگہ چند مہینوں کے لئے مسٹر ڈین مقرر کئے گئے۔ وزارت نے کہا کہ جو افسر ہمارے ماتحت کام کرتا رہا ہے۔ اور ہو سکتا ہے کہ گورنر کی میعاد پوری ہونے پر اُسے پھر ہماری ماتحتی میں کام کرنا پڑے۔ اُسے گورنر نہیں بنانا چاہیئے کیوں کہ جو آج ہمارے ماتحت ہے کل ہمارے اوپر ہو جائے، تو اُسی کے ماتحت ہمیں کام کرنا پڑے گا یہ ٹھیک نہیں ہے۔ کام کرنے میں دشواری پیش آسکتی ہے اور سول سروس کے لوگوں پر وزارت کا تحکم ٹھیک نہیں چل سکے گا۔

وزارت نے دھمکی دی کہ اگر مسٹر ڈین گورنر مقرر کئے جائیں گے تو وزیر اپنے عہدوں پر نہیں رہ سکیں گے، کابینہ کا استعفیٰ آجائے گا۔ مسٹر ڈین سے وزیروں کو کوئی ذاتی پرخاش نہیں تھی۔ اگرچہ کچھ دن پہلے کسی معاملہ پر ان سے اختلافِ رائے ہو گیا تھا۔ وہ اِس بات کی صرف اصولی مخالفت کر رہے تھے نتیجہ یہ ہوا کہ گورنر نے چھٹّی نہیں لی۔

لہٰذا قائم مقام گورنر کے تقرر کا موقع اس وقت نہیں آیا۔ دوسرے صوبوں میں جہاں کہیں گورنر نے چُھٹی لی اور قائم مقام گورنر کے تقرر کا موقع آیا اس صوبہ کے سویلین کو یہ عہدہ نہ ملا دوسرے صوبہ سے ہی کوئی لایا گیا۔ خیر اصولاً تو یہ بات ٹھیک تھی۔ مگر یہ قابلِ غور بات ہے کہ اگر کسی سویلین کو ہی گورنر ہونا ہے تو چار مہینوں کے لئے۔ اتنے دنوں کے لئے ہی اکثر گورنر چھٹی لیا کرتے ہیں۔ دوسرے صوبہ کے کسی سویلین کو لاکر گورنر بنانا صوبہ کے لئے کہاں تک مفید ہے؟ چار مہینوں میں تو وہ صوبہ کی حالت کی واقفیت بھی نہیں حاصل کر سکتا۔ اِس کا نتیجہ یہی ہوگا کہ وہ صرف جگہ گھیر کر بیٹھے گا۔ کچھ کر نہیں سکے گا۔ سب سے اچھا طریقہ تو یہ ہوگا کہ اُسی صوبہ کا کوئی غیر سرکاری آدمی گورنر بن جائے۔ جو صوبہ کی سب باتیں جانتا ہو اور دوسرے طریقہ سے بھی قابل ہو۔

ترپوری کانگریس سے پہلے اور بعد

آل انڈیا کانگریس کمیٹی میٹنگ تو ختم ہو چکی تھی۔ مگر ابھی کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر وہیں تھے۔ جب یورپ سے خبر آئی کہ ہٹلر چیکوسلویکیا پر چڑھائی کرنا چاہتا ہے اور انگلستان کے وزیر اعظم مسٹر چیمبرلین، ہٹلر سے ملنے گئے ہیں۔ جو خبریں ملیں اُن سے اس بات کا خوف ہوا کہ انگلستان اور جرمنی میں کہیں جنگ نہ چھڑ جائے ورکنگ کمیٹی اس لئے وہاں ٹھیر گئی اور اس بات پر غور کرنے لگی کہ لڑائی اگر چھڑ جائے تو کانگریس کو کیا کرنا چاہیئے۔ اِس میں شک نہیں معلوم ہوتا تھا کہ ہٹلر کا چیکوسلویکیا پر چڑھائی کرنا نامناسب ہے اِتنا ہی نامناسب جتنا اٹلی کا حبش پر چڑھائی کرنا۔ اگرچہ یہاں ہٹلر کو یہ کہنے کا بہانہ تھا کہ کچھ جرمن چیکوسلویکیا میں ہیں جن کے ساتھ وہاں کی حکومت کا سلوک اچھا نہیں اور جو جرمنی کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں۔ چیکوسلویکیا میں تین طرح کے لوگ بستے تھے۔ کچھ جرمن، کچھ چک، کچھ سلواک۔ یہ ملک پہلی جنگ عظیم سے پہلے آسٹریا کے سامراج کے ماتحت تھا۔ اُس جنگ کے بعد یہ آزاد ہوا تھا۔ وہ سامراج جب ٹکڑے ٹکڑے کیا گیا تھا تب یہ ایک ٹکڑا الگ آزاد

ملک کی شکل میں قائم کر دیا گیا۔ جس زمانہ میں حبش کی لڑائی چل رہی تھی۔ اور ہٹلر اس پر حملہ کر کے اسے اپنے قبضہ میں لے لینے کی کوشش میں تھا، کانگریس نے حبش کے ساتھ ہمدردی دکھائی تھی۔ مگر ہمدردی تو برٹش سرکار بھی دکھاتی تھی۔ کانگریس نے فیصلہ کیا کہ سامراجیوں کی لڑائی میں وہ برطانیہ کی مدد نہیں کرے گی۔ اس وقت یہ سوال اٹھا کہ اگر برٹش سامراج حبش جیسے کمزور ملک کی مدد کے لئے اٹلی سے لڑائی ٹھان لے تو کانگریس مشکل میں پڑے گی۔ کیوں کہ کانگریس کو حبش کی امداد مقصود تھی۔ مگر برطانوی سامراج کی امداد نہیں۔ یہی سوال اس وقت پھر پیش آیا۔ ساتھ ہی یہ بھی سوچنے کی بات تھی کہ کانگریس کیا مدد دے سکتی ہے؟ ایک تو کانگریس کا اُصول عدم تشدد ہے۔ اِس اُصول کو مانتے ہوئے وہ مُسلح جنگ میں مدد کر سکتی ہے یا نہیں۔ یہ مشکل مسئلہ درپیش تھا۔ ساتھ ہی ہم یہ بھی دیکھتے تھے کہ کانگریسی وزارتیں کئی صوبوں میں کام کر رہی ہیں اور اُن کا سارا کام عدم تشدد کے اصول پر نہیں چل رہا ہے۔ کہیں کہیں بلوہ فساد کے وقت کانگریسی وزارت کے تحت بھی گولی چلانی پڑی تھی۔ پولیس اور جیل خانے اپنے اپنے کام کر ہی رہے تھے۔ حکومت ہند پر کانگریس کا اختیار نہیں تھا مگر وہاں بھی اس کی طرف سے فوج کی مخالفت اِس بنیاد پر کبھی نہیں کی گئی کہ ہم تو عدم تشدد کے قائل ہیں۔ اور ہمیں مُسلح فوج کی ضرورت نہیں ہے۔ اِس کے سوا اگر سچ مچ لڑائی چھڑ جائے تو وہ ہمارے قابو سے باہر کی چیز ہو گی اور کانگریس کو مجبوراً اس کی مدد یا مخالفت کرنی ہی پڑے گی۔ یہ سب سوال اچانک ہمارے سامنے آ گئے۔ مہاتما جی بھی وہاں موجود تھے۔ مگر اُن دنوں پنڈت جواہر لال نہرو یورپ گئے ہوئے تھے۔ اِس لئے مہاتما جی کی رائے تو مل سکتی تھی مگر پنڈت جواہر لال نہرو کی رائے نہیں معلوم ہو سکتی تھی۔ سب پہلوؤں پر

غور ہوتا رہا۔ خاص کر یہ سوال تو سامنے تھا ہی کہ ہم کانگریسی وزارتوں کو کیا ہدایت دیں گے۔ اسی زمانے میں ورکنگ کمیٹی کے ممبروں میں اِس مسئلہ پر اختلاف رائے معلوم ہوا۔ مگر بہت کوشش کے بعد بھی ہم یہ نہیں جان سکے کہ صدر صاحب کی کیا رائے تھی اور وہ کیا ہدایت دیتے۔ ہم ابھی غور کر ہی رہے تھے کہ اُدھر خبر آگئی کہ اس وقت انگلستان اور فرانس نے کسی طرح جرمنی کے ساتھ اپنی بات بنالی اور اب لڑائی نہیں چھڑے گی۔

یہ سال بھی تقریباً خاتمہ پر تھا۔ اس سال کانگریسی خاص کر وزارت کے ہی کام میں ہی لگے۔ جابجا کانگریس کمیٹیوں میں بھی جھگڑے ہوئے۔ کانگریس کے الکشن بہت جوش کے ساتھ لڑے گئے۔ اِن دو تین برسوں میں کانگریسی ممبر خوب بنے۔ کیوں کہ کارکنوں نے اِس میں بہت زور لگایا۔ پہلے تو کچھ دنوں تک کانگریس غیر قانونی ہوگئی تھی۔ اِس لئے جب وہ پھر کام کرنے لگی تو لوگوں میں بہت جوش تھا۔ اِس کے بعد نئے آئین کے مطابق اسمبلی کا چناؤ ہونے والا تھا۔ کانگریس کی طرف سے نامزدگی کے لئے لوگوں نے جوش دکھایا۔ کچھ نے شاید یہ بھی سوچا کہ اگر اُن کے ہم خیال کانگریس میں آجائیں گے تو وہ اپنے ہم خیالوں کو نامزد کرسکیں گے اِسی طرح کی اور وجہیں بھی ہوئی گئیں اور کانگریس کی ممبری بہت بڑھ گئی۔ اب کانگریس کے نمائندوں، آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور کانگریس کے صدر کے انتخاب کا زمانہ بھی قریب آگیا۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ اِس بار مولانا ابوالکلام آزاد صدر چُنے جائیں۔ سنا گیا کہ سبھاش بابو کی بھی خواہش تھی کہ وہ پھر منتخب ہوں۔ مگر یہ بات ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کے سامنے نہیں آئی۔ ہری پورہ کانگریس کے پہلے سب کی رائے اور خاص کر مہاتما جی کی تائید اور دعا کے ساتھ سبھاش بابو اتفاق رائے سے چُنے گئے اگر وہ اپنی خواہش مہاتما جی سے ظاہر کرتے اور ہم سب مل کر مشورہ کرتے

توشاید کوئی راستہ نکل آیا ہوتا اور بات آگے نہ بڑھتی۔ مگر انہوں نے یا ان کے موئدوں نے ایسا نہیں کیا۔ بعد میں اِس وجہ سے بہت بُری طرح جھگڑا اُٹھ کھڑا ہوا۔

مارچ ۱۹۳۹ء میں کانگریس کا سالانہ جلسہ مدھیہ پردیش میں جبل پور کے قریب تری پوری میں ہونے والا تھا۔ جنوری میں ورکنگ کمیٹی کی ایک نشست باردولی میں ہوئی مہاتما جی ادھر کئی برسوں سے ہر سال جاڑے کا ایک مہینہ باردولی میں گزارتے تھے۔ اُن دنوں وہ وہیں تھے اس لئے یہ نشست وہیں کی گئی۔ جہاں تک مجھے یاد ہے وہاں کوئی خاص اہم معاملہ پیش نہیں تھا۔ وہاں سے واپسی کے وقت ہم میں آپس میں جو تھوڑا بہت تذکرہ ہوا اس سے میں نے سمجھا کہ اس بار مولانا صاحب کو ہی ہم لوگ صدر منتخب کریں۔ مہاتما جی سے مولانا کی باتیں ہوئیں اور وہ صدارت کے لئے رضامند بھی ہو گئے۔ مگر ہم نے سنا کہ بعد میں اُنہوں نے اپنی رائے بدل دی اور مہاتما جی سے اپنی غیر رضامندی ظاہر کی۔ میں پٹنہ پہنچ گیا تھا۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل کا تار ملا کہ ڈاکٹر پٹا بھی سیتارامیہ کی تائید کے لئے یہاں پر میرے دستخط چاہئیں۔ میں نے منظور کر لیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ یہ فیصلہ ہے کہ ڈاکٹر پٹا بھی ہی چُنے جانے چاہئیں۔ یہ فیصلہ سردار پٹیل نے مہاتما جی کی تائید سے کیا تھا۔ اب بات ظاہر ہو گئی کہ مولانا صدر ہونا نہیں چاہتے اور مقابلہ ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رمیہ اور شری سبھاش چندر بوس میں ہے۔

یوں تو ہر سال دو چار نام صدر کے انتخاب کے لئے پیش کئے جاتے ہیں اور اُنہیں میں سے ایک چُنا جاتا ہے۔ مگر ادھر کئی برسوں سے کبھی دو کا مقابلہ نہیں ہوتا تھا۔ تقریباً سبھی صوبوں کے لوگ یوں ہی بغیر کسی کے بتائے مان لیتے تھے کہ اس بار فلاں صاحب کو منتخب کرنا ہے وہی چُنا بھی جاتا تھا۔ جو دوسرے نام رہتے تھے اُن کے

بارے میں کوئی خاص کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ جا بجا کچھ ووٹ اُن کو بھی مل جاتے تھے مگر اِس کے معنی کوئی یہ نہیں لگاتا تھا کہ دوسرے کے مقابلہ میں ایک آدمی چُنا گیا ہے۔ اِس بار انتخاب کی شکل دوسری ہو گئی۔ معلوم ہوا کہ دو آدمیوں میں مقابلہ ہے اتنا ہی نہیں کچھ ایسا بھی معلوم ہوا کہ ایک طرف اس خیال کے لوگ ہیں جو گاندھی جی کے خیالات سے متفق ہیں اور دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو گاندھی جی کے پروگرام میں یقین نہیں رکھتے۔ اگرچہ گاندھی جی بمبئی کانگریس کے وقت سے ہی کانگریس سے الگ ہو گئے تھے مگر اب تک اُن کا ہی اندازِ فکر کانگریس میں کام کر رہا تھا۔ سب باتوں میں ان کی رائے سے ہی کام ہوتا آرہا تھا۔ جب کبھی اختلاف ہوتا تو وہی سب مشکلوں کا حل نکالتے اور آخر سب جھگڑوں کا وہی نبٹارہ کرتے اِس بار معلوم ہوا کہ معاملہ کچھ دگرگوں ہے۔ اس لئے ایسے آدمی کو منتخب ہونا چاہیئے جو اپنا پروگرام خود بنائے گا اور اپنے بنائے ہوئے راستہ پر کانگریس کو لے چلنا چاہے گا۔ یہ باتیں تھیں تو سہی مگر انتخاب کے وقت واضح نہیں ہوئیں۔ گاندھی جی نے اپنی طرف سے کوئی بیان نہیں نکالا۔ اگر مولانا امیدوار رہ گئے ہوتے تو اِس میں شبہ نہیں کہ وہ بہت بڑی اکثریت سے چُنے گئے ہوتے۔ کیونکہ تمام کانگریسی اُنہیں چاہتے تھے اور وہ گاندھی جی کے لائحہ عمل سے الگ ہونا بھی نہیں چاہتے تھے۔ کانگریسی لوگوں نے یہ نہیں سمجھا کہ اِس چناؤ میں ڈاکٹر پٹابھی سیتارمیہ ایک طبقۂ خیال کے اور ایک لائحہ عمل کے نشان کی شکل میں چناؤ کے امیدوار ہیں۔ چنانچہ چناؤ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ زبردست اکثریت سے شری سبھاش چندر بوس چُنے گئے۔

کئی برسوں سے کانگریس کے اجلاس سے کچھ پہلے ورکنگ کمیٹی کی نشست ہوا کرتی ہے جس میں کانگریس کے وقت ہونے والی سبجکٹس کمیٹی کے لئے تجویزوں کا

مسودہ مرتب کیا جاتا ہے ۔ اِس بار بھی ویسا ہی ہونا تھا۔ ورکنگ کمیٹی میں جو لوگ تھے اُن میں زیادہ تر ایسے تھے جو سبھاش بابو کی رائے سے، جہاں تک وہ معلوم تھی متّفق نہیں تھے ۔ ہم نے سوچا کہ اچھا ہو اگر سبھاش بابو اپنے خیال کے لوگوں سے مشورہ کر کے تجویزیں تیار کریں۔ کیونکہ اُن کو ہی کانگریس کا بار لینا ہوگا۔ اور اُن کے لئے نیز ہم لوگوں کے لئے بھی، جو گاندھی جی کے اندازِ فکر پر یقین رکھنے والے تھے ۔ یہی اچھا ہوگا۔ ورکنگ کمیٹی کے ممبر رہ کر اور ان تجویزوں کی تیاری میں مدد دے کر اگر ہم کانگریس کے اجلاس کے وقت ان تجویزوں کی مخالفت کریں تو یہ ہمارے لئے نامناسب ہوگا——

سبھاش بابو کو بھی ہماری حاضری سے تردّد ہوگا اور وہ اپنی مرضی کے مطابق تجویزیں مُرتّب نہ کرا سکیں گے۔ کیونکہ ورکنگ کمیٹی میں ہم لوگوں کی اکثریت تھی اِس لئے ہم نے ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا اور اِس طرح اُن کو پورا موقع دے دیا کہ وہ اپنی مرضی کے مطابق اپنی ورکنگ کمیٹی بنالیں اور اسی کی مدد سے تجویزیں بھی مرتب کریں ۔ ایسا ہونے سے، اِن تجویزوں کو دیکھنے کے بعد بھی اگر ہم اُن سے متفق نہ ہوں گے تو کانگریس مین اُن کی مخالفت کرنے کے لئے آزاد رہیں گے ۔ جمہوریت کا عام اصول بھی یہی ہے کہ جس کے ساتھ اکثریت ہو وہی اس کو چلانے کا بار لے اور اکثریت کی مرضی کے مطابق پروگرام بنائے ۔

ہم لوگ واردھا گئے جہاں ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہونے والی تھی۔ گئے بھی وقت پر تاکہ سب باتیں آمنے سامنے ہو جائیں اور ہماری اِس کارروائی سے کوئی غلط فہمی نہ ہو۔ مگر بد قسمتی سے سبھاش بابو بیمار ہو گئے وہاں گئے ہی نہیں۔ ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کا استعفیٰ جوں کا توں پڑا رہا۔ اگر چاہتے تو ان کی غیر موجودگی میں

ہم اپنے خیال کے مطابق تجویزیں تیار کر لیتے اور اُنھیں سبجکٹس کمیٹی کے سامنے پیش کرنے کی کوشش کرتے۔ مگر ہم نے یہ مناسب نہیں سمجھا کیوں کہ صدر کے انتخاب کے معنی ہم نے یہ سمجھے کہ ڈیلی گیٹوں کی اکثریت سے سبھاش بابو متفق ہیں اور ہمارے لئے مناسب ہے کہ ہم ان کو پورا موقع دیں تاکہ وہ جس طرح مناسب سمجھیں کام چلائیں، نتیجہ یہ ہوا کہ ورکنگ کمیٹی کی نشست ملتوی کرنی پڑی۔ ہم ترپوری کے اجلاس کا انتظار کرنے لگے۔ کانگریس کے لوگوں میں اس چناؤ اور اِس کے بعد بھی واقعات کے متعلق تذکرہ اور بحث مباحثہ ہو رہا تھا۔

اُدھر کاٹھیاواڑ میں ایک دوسری حالت پیدا ہو رہی تھی۔ وہاں کئی ریاستوں میں رعیت اور راجا کے درمیان بد دلی پیدا ہو گئی تھی۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل دلچسپی لے رہے تھے۔ وہاں کے لوگ ان کی رائے سے ہی کام کر رہے تھے۔ کانگریس کی پالیسی ابھی تک یہی تھی کہ وہ خود سیدھے طور پر ریاستوں کے معاملہ میں دست اندازی نہیں کرے گی۔ مگر دیسی ریاستوں کے عوام جمہوری خواہشات کے ساتھ وہ ہمدردی رکھتی ہے اور کانگریس کے لوگ انفرادی طور پر اُن کی امداد بھی کر سکتے ہیں اِسی پالیسی کے مطابق ڈاکٹر پٹابھی سیتا رمیہ ریاستی پرجا منڈل کے صدر ہوئے تھے اور پنڈت جواہر لال نہرو بھی۔ مہاتما جی تو سبھی باتوں میں پوچھنے ہی جاتے تھے اور اپنی رائے اور ہدایت سے اُن کو چلاتے تھے۔ گجرات اور کاٹھیاواڑ کی ریاستوں میں سردار ولبھ بھائی پٹیل بڑی مستعدی اور لگن سے کام کرتے تھے۔ جہاں ضرورت پڑتی وہاں جاتے بھی تھے۔ سیٹھ جمنا لال بجاج بھی خاص کر راجپوتانہ کی ریاستوں کے متعلق کام کرنے اور پرجا منڈل قائم کرنے میں امداد دینے

اسی زمانے میں کاٹھیاواڑ کی ریاست راج میں جو راجا پر جا میں اَن بَن ہوئی اُس میں سردار ولبھ بھائی پٹیل پڑے۔ اُن کے ثالث ہونے سے کچھ باتیں طے ہوئیں جنہیں راجا نے منظور کر لیا۔ اِس سمجھوتہ سے مہاتماجی متفق تھے۔ بعد ازاں راجا اور ریاستی حکمراں سمجھوتے کی شرطوں کو پورا کرنے سے مُکر گئے۔ مہاتماجی کو یہ بات بُری معلوم ہوئی۔ وہ عہد و پیمان کی بڑی توثیق رکھتے ہیں۔ کسی کے عہد کو ٹوٹتے دیکھ کر اُن کو دلی اذیت ہوتی ہے۔ خاص کر عوامی معاملوں میں کئے گئے عہد و پیمان کا وقار اور بھی زیادہ ہے۔ اُن کی خواہش تھی کہ جو بات ایک بار طے ہو گئی ہے اُسے ریاستوں کو پورا کرنا چاہیئے۔ اِس کے لئے انہوں نے پوری کوشش کی۔ خود راج کوٹ گئے۔ جب وہ کامیاب نہیں ہوئے تو انہوں نے اَن شن (ترک غذا) شروع کر دیا۔ یہ طریقۂ کار اُن کے لئے کچھ نیا نہ تھا۔ جب وہ جنوبی افریقہ سے واپس آکر ہندوستان میں کام کر رہے تھے۔ تب احمد آباد کے مزدوروں نے ہڑتال کی تھی اُس ہڑتال میں مزدوروں نے عہد کیا تھا کہ جب ان کے مطالبے پورے نہ ہوں گے وہ کام نہیں کریں گے۔ عہد کرتے وقت شاید مزدوروں نے عہد کی اہمیت نہیں سمجھی تھی۔ ہندوستان کے لئے گاندھی ابھی بالکل نئے تھے۔ کسی نے عہد پر اس وقت اتنا زور نہیں دیا تھا۔ جب مزدوروں کو تکلیف ہونے لگی تو وہ کام پر واپس جانے لگے۔ گاندھی جی اِس بات کو برداشت نہیں کر سکے۔ اُنہوں نے ترک غذا کا برت شروع کر دیا۔ اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قابل اطمینان سمجھوتہ ہو گیا۔ اِسی پالیسی کے مطابق انہوں نے راج کوٹ کی ریاست سے عہد پورا کرانے کے لئے یہ برت شروع کر دیا۔ یہ برت عین اُسی زمانے میں ہوا جب تری پورہ میں کانگریس کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اِس لئے گاندھی جی تری پورہ نہیں

جا سکے۔ وہاں جو کچھ ہوا ان کی عدم موجودگی میں ہوا۔

گاندھی جی کے اس برت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اِس معاملہ میں وائسرائے لارڈ لنلتھگو پڑے۔ ایک طرح سے اُس وقت معاملہ طے ہو گیا۔ گاندھی جی نے غذا لی مگر انہوں نے اس برت سے داخلی اخلاقی اصول اخذ کئے جس کا ذکر انہوں نے زیادہ تر ہفتہ وار ہریجن میں کیا۔ اُن کا خیال ہوا کہ یہ برت تشدد سے مُبرّا نہیں تھا۔ اُنھوں نے دوبارہ غور کرنے کے بعد اپنی غلطی سمجھی اور اِس بات کو مشتہر بھی کر دیا۔ جس باریکی سے وہ ایسے اخلاقی سوالات پر غور کرتے ہیں اور جہاں کہیں اُن کے دل میں کسی معاملہ میں کوئی کارروائی بال برابر بھی سچائی سے ہٹی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اُسے فوراً تسلیم کر کے اُس سے باز آنے میں ذرا بھی نہیں ہچکتے۔ یہ وہی کرتے ہیں اور کر سکتے ہیں دوسرا کوئی سیاسی آدمی اِن معاملوں کو اِس اخلاقی بلند نظری سے نہ تو دیکھ سکتا ہے اور نہ چھوٹی چھوٹی خامی کی وجہ سے لائحہ عمل بدل دیتا ہے۔

ترپوری کانگریس کا اجلاس ایک عجیب اور مصیبت ناک حالت میں ہوا۔ چناؤ کے بعد اخباروں میں بحث و تمحیص ہوئی۔ اِس سے آپس میں خاصی تلخی آ گئی تھی۔ سبھاش کے حامی ہم لوگوں پر یہ الزام لگا رہے ہیں کہ اُن کے اکثریت سے چُنے جانے کی وجہ سے ہم لوگ خفا ہو گئے ہیں۔ اُن کو نیچا دکھانا چاہتے ہیں۔ اسی لئے ہم نے ورکنگ کمیٹی سے استعفٰی دے دیا ہے اور اسی لئے اُن کے راستے میں ہر طرح خلل اندازی کر رہے ہیں۔ ہم یہ سمجھتے تھے کہ اگر سچ مچ اکثریت اُن کے ساتھ ہے تو کانگریس چلانے کا بار اُن کو اٹھانا چاہیئے اور ایسے ہی لوگوں کی ورکنگ کمیٹی بنا کر پروگرام طے کرنا چاہیئے جو اُن سے پوری طرح متفق ہوں۔ ہم اُن سے بہت باتوں میں

متفق نہیں تھے اور ہمارے لئے اُن کے ساتھ مل کر کام کرنا مشکل تھا۔ اگر اصولی اور عملی طور پر ہمارے اُن کے درمیان اختلاف نہیں تھا تو ان کو الکشن لڑنا ہی مناسب نہ تھا۔ اگر اُن کے ساتھ اکثریت نہیں تھی اور وہ لوگوں کی نادانی کی وجہ سے یا کسی دوسرے سبب سے چُنے گئے تھے تو وہ چناؤ ہی غلط تھا۔ بہر حال ہم چاہتے تھے کہ بات صاف ہو جائے۔ ہم نہیں چاہتے تھے کہ پروگرام تو وہ اور اُن کے ہم خیال لوگ بنائیں اور اُس کی جواب دہی ہمارے سر پر رہے۔ ہم یہ بھی نہ کہہ سکیں کہ ہم اُن سے متفق نہیں ہیں۔ اِنہیں خیالات سے ہم نے کانگریس کے اجلاس سے پہلے ہی استعفےٰ دے دیا تھا مگر جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے یہ استعفےٰ منظور نہیں ہوا۔ تر پوری کانگریس کے وقت پرانی ورکنگ کمیٹی بنی رہی

تری پوری میں اجلاس سے پہلے اور اجلاس کے وقت آپس میں بہت کشمکش تھی۔ کارکنوں میں سخت اختلاف رائے تھا۔ بد قسمتی سے سبھاش بابو بیمار بھی تھے۔ تر پورہ وہ بہت گری ہوئی طبیعت کی حالت میں پہنچے تھے۔ ہم نے وہاں بھی بہت کوشش کی کہ صدرِ منتخب نئی ورکنگ کمیٹی بنالیں اور ہم لوگوں کو چھٹکارا دے دیں۔ تاکہ ہم آزادی کے ساتھ کانگریس کے کام میں حصّہ لے سکیں۔ مگر ایسا نہیں۔ جو پروگرام وہ بنانا چاہتے تھے اوّل تو وہ مکمل طور پر ہم لوگوں کو معلوم ہی نہیں ہوا اور جہاں تک معلوم تھا ہم اُن سے متفق نہیں تھے۔ ایسی حالت میں ورکنگ کمیٹی کو اپنی تجویز مرتب کرنی کرنی پڑی۔ اُس میں ہم نے ساری حالت کا پس منظر بیان کرتے ہوئے یہی کہا کہ صدر صاحب اگر چاہیں تو اپنی مرضی کے مطابق ورکنگ کمیٹی بنا کر اپنا پروگرام اور ورکنگ کمیٹی گاندھی جی کی رائے سے بنائیں۔ اِن دونوں باتوں میں سے وہ کوئی بھی نہیں

کرنا چاہتے تھے۔ کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اگرچہ وہ اکثریت سے چُنے گئے ہیں تاہم اُن کے پروگرام کو کُھلی کانگریس منظور نہیں کرے گی۔ ایسی حالت میں اُن کو یا تو پھر گاندھی کے پروگرام کو منظور کر کے اُسی کے مطابق چلنا ہوگا یا استعفےٰ دینا پڑے گا۔ وہ گاندھی جی کے پیرووٗں کے پروگرام کو بھی منظور نہیں کرنا چاہتے تھے اور اُن کو چھوڑنا بھی نہیں چاہتے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ ہم لوگ اُن کے پروگرام کی ذمہ داری لیں اور اُسے چلائیں۔ ہم لوگوں میں سے کچھ آدمی وقتاً فوقتاً جا کر ان باتوں کے بارے میں اُن سے تبادلۂ خیالات کرتے۔ مگر کوئی راستہ نہ نکلا اور آخر میں یہی طے ہوا کہ ہم لوگ اپنی تجویز سبجکٹس کمیٹی کے سامنے رکھ دیں۔ صدر صاحب جو مناسب سمجھیں کریں۔

سبجکٹس کمیٹی کی میٹنگ میں سبھاش بابو خرابیِ صحت کی حالت میں کسی طرح لائے گئے۔ وہ تختِ صدارت پر لیٹے رہے۔ اُنہوں نے لیٹے لیٹے چھوٹی سی تقریر بھی کی جس میں اپنی رائے اور اپنا نظریہ بتا دیا۔ ہم لوگوں کی تجویز بھی رکھی گئی اور کثرتِ رائے سے وہی منظور ہوئی۔ بات واضح ہو گئی کہ سبجکٹس کمیٹی میں جس کے ممبر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر ہی ہوا کرتے تھے اُن کی اکثریت نہیں ہے اور اُنہی لوگوں کے ساتھ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی شکل میں جب تک دوسرا اجلاس نہ ہو اور نئے ممبر نہ چن لئے جائیں صدر کو کام کرنا ہوگا۔ مگر ابھی یہ نہیں معلوم تھا کہ کانگریس کے کھلے اجلاس میں ڈیلی گیٹوں کا کیا رُخ ہوگا۔ ہم جانتے تھے کہ وہاں بھی بہت بڑی اکثریت ہمارے ساتھ ہوگی۔ تو بھی جب تک اجلاس نہ ہو لے اسے کوئی دعوے کے ساتھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

کُھلے اجلاس کا وقت آ گیا۔ سبھاش بابو اجلاس میں شریک نہیں ہوئے اس لئے

ان کی جگہ مولانا آزاد بیٹھے ۔ یہ تب ہی ہوا جب بہت انتظار کے بعد صدرِ منتخب نہیں پہنچے۔ اُن کی خرابیِ صحت کا حال سب لوگوں کو معلوم تھا۔ اور وہاں بھی سب باتیں بتادی گئیں۔ اجلاس شروع ہوا۔ صدارتی ایڈریس پڑھ کر سنادیا گیا۔ مصر کے کچھ نمائندے کانگریس دیکھنے آئے تھے۔ اُن کا استقبال کیا گیا۔ انھوں نے مصر کی طرف سے ہندوستان کے ساتھ اور تحریکِ آزادی کے ساتھ ہمدردی دکھائی۔ اِس کے بعد باضابطہ پروگرام شروع ہونے ہی کو تھا جب کچھ لوگوں کی طرف سے کہا گیا کہ صدر کی غیر حاضری میں تجویز پیش نہ کی جائے ۔ سارے ملک کے نمائندے جمع تھے ۔ اتنے بڑے جلسے کو ملتوی کرنا مناسب نہیں معلوم ہوا ۔ صدر نے کہا کہ تجویز پیش کردی جائے گی اور زیادہ بحث یا رائے شماری دوسرے دن ہوگی ۔ جب امید کی جاتی ہے کہ صدرِ منتخب آجائیں گے ۔ ان کی یہ بات کچھ لوگوں نے پسند نہیں کی ۔ کچھ لوگوں نے شور مچانا شروع کردیا۔ شور کرنے والوں کی تعداد زیادہ نہ تھی ۔ مگر ایک بڑے جلسے میں بھی تھوڑے سے لوگ خلل ڈال سکتے ہیں۔ اس وقت پنڈت جواہر لال نہرو اسٹیج پر کھڑے تھے ۔ اُنھوں نے لوگوں کو خاموش کرنے کی پوری کوشش کی مگر شور مچانے والے خاموش ہونے کے بدلے اپنے مقام سے آگے بڑھنے لگے اور اسٹیج کے نزدیک آپہنچے اور زیادہ شور مچانے لگے — جواہر لال جی اپنی جگہ سے ہٹے نہیں ۔ وہ لاؤڈ اسپیکر پر پچاس ہزار حاضرین اور دوسرے نمائندوں سے اصرار کرتے رہے کہ وہ اپنے اپنے مقام پر سکون سے بیٹھے رہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جو تھوڑے لوگ شور مچا رہے تھے وہ تو آگے آگئے مگر اُن کا ساتھ دوسروں نے نہیں دیا۔ اور اِس مجمع میں مٹھی بھر نظر آنے لگے ۔ وہ اسٹیج کے قریب پہنچ کر کچھ دیر تک شور کرتے رہے مگر جواہر لال جی اپنے مقام سے ہٹے نہیں ۔ آخر وہ لوگ تھک کر

خاموش ہو گئے۔ اِس کے بعد اجلاس کی کارروائی ٹھیک چلی۔ دونوں تجویزیں پیش کر دی گئیں اور بحث پر رائے لینے کی بات دوسرے دن کے لئے رکھ چھوڑی گئی۔

ہم نے دیکھا کہ اِس مظاہرہ سے حاضرین اور دوسرے نمائندے ناراض ہو گئے جن لوگوں نے مظاہرے کے ذریعہ عوام اور نمائندوں کو اپنی طرف کھینچنے کی بات سوچی تھی اُن کی کوشش صرف بیکار ہی نہیں ہوئی بلکہ ان کے لئے مضر بھی ثابت ہوئی۔ کیوں کہ جو تھوڑے سے لوگ اُن کا ساتھ بھی دینے والے تھے وہ بھی اُن کی اِس کارروائی سے رنجیدہ ہو کر دوسری طرف چلے گئے۔ دوسرے دن اِس معاملہ پر غور کرنے کے لئے اجلاس اُس کھلے پنڈال میں نہ کر کے سبجکٹس کمیٹی کے خیمے میں کیا گیا۔ وہاں صرف ڈیلیگیٹ ہی آنے دئے گئے۔ تاکہ رائے لینے کی آسانی ہو اور کسی کی شکایت نہ رہ جائے۔ وہاں پوری بحث کے بعد رائے لی گئی۔ بہت بڑی اکثریت سے ہم لوگوں کی قرارداد منظور ہوئی کھلے اجلاس میں دوسری قرارد جس کے متعلق کوئی اختلاف رائے نہیں تھا، پاس کر کے اجلاس ختم ہوا۔

اجلاس تو ختم ہوا مگر تلخی اور بھی بڑھ گئی۔ کسی بات کو ہم طے نہیں کر سکے۔ کانگریس کے اجلاس نے ایسی قرارداد منظور کی جسے صدر کانگریس نہیں چاہتے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ کانگریس نے صدر کی تجویز کو نامنظور کر دیا۔ اب سوال یہ تھا کہ صدر صاحب کیا کرتے ہیں۔ اگر اس قرارداد کو وہ مان لیتے ہیں تو اُن کو نئی ورکنگ کمیٹی ایسی بنانی ہوگی جس پر گاندھی جی کا اعتماد ہو اور جس سے وہ متفق بھی ہوں۔ ترپوری میں بیمار رہنے کی وجہ سے وہاں سبھاش بابو نے نئی ورکنگ کمیٹی نہیں بنائی (جیسا صدر کیا کرتے ہیں) اور ہم سب لوگ اپنے اپنے مقام پر واپس آ گئے۔

تریپوری میں جو فیصلہ ہوا اس کے مطابق سبھاش بابو کام نہیں کرنا چاہتے تھے۔ اُن کی صحت بھی ایسی نہیں تھی کہ کچھ دنوں تک ان کے ساتھ غور کر کے کوئی فیصلہ کیا جا سکے۔ شاید مہاتما جی کے ساتھ ان کی کچھ خط و کتابت ہوتی رہی۔ مگر کوئی بات طے نہیں ہو پائی اُنہوں نے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی نشست کرنی چاہی جو کلکتہ میں ہونے والی تھی، اِس سے پہلے میں اُن سے ایک بار اُن کی بیماری کی حالت میں جھریا کے جاما دُوا کان کے علاقہ میں جا کر ملا تھا۔ جہاں وہ اپنے بھائی کے ساتھ درستی صحت کے لئے مقیم تھے۔ مگر مجھ سے کُھل کر کچھ باتیں نہیں ہوئیں۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کلکتہ میں ہوئی۔ مہاتما جی بھی کلکتہ گئے۔ اگرچہ وہ کمیٹی کے اجلاس میں شریک نہیں ہوئے۔ مہاتما جی سون پور کے کھادی پرتشٹھان میں ٹھیرے اور ہم لوگ شہر میں۔ سبھاش بابو اور مہاتما جی میں کئی بار باتیں ہوئیں جن میں ہم بھی اکثر شریک رہے مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ واضح ہو گیا کہ سبھاش بابو صدر نہیں رہ سکیں گے۔ سوال ہوا کہ صدر بنے کون۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل سے سبھاش بابو اور دوسرے لوگ غیر مطمئن تھے کیونکہ وہ سب سے صاف صاف باتیں کرتے تھے۔ پنڈت جواہر لال جی اِن ساری باتوں سے کچھ اکتا سے گئے تھے اگرچہ اُنہیں بھی کوئی دوسرا راستہ نظر نہیں آتا تھا۔ پھر بھی وہ صدر کا عہدہ لینا پسند نہیں کر سکتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ہم لوگوں کے بالکل متفق تھے۔ بگر بدقسمتی سے الہ آباد اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر گر جانے سے پیر کے زخمی ہو جانے کے سبب سے چارپائی پر پڑے تھے۔ اُن پر بار ڈالنا مناسب نہیں معلوم ہوتا تھا۔ اور ایسی خرابی صحت میں وہ اُسے منظور بھی نہیں کرتے۔

لوگوں کا خیال ہوا کہ سبھاش بابو کے استعفےٰ دینے پر میں ہی صدر بنایا جاؤں گا

مجھے یہ بات بالکل پسند نہیں تھی۔ ایک تو میں اس طرح کے جھگڑے سے ہمیشہ بچنا چاہتا ہوں میں سمجھتا تھا کہ جب تک پھر کانگریس نہ ہو اور نیا صدر نہ چن لیا جائے تب تک گڑبڑ مچتی رہے گی اور میں اِس جھنجھٹ کو نہیں سنبھال سکوں گا۔ کیوں کہ میرا مزاج ہی ایسا نہیں ہے کہ جھگڑے کر سکوں۔ دوسرے تری پورہ کے بعد بہار میں ہی کانگریس مدعو تھی اور مجھے اس کے لئے بھی انتظام کرنا تھا۔ مجھے اُسی میں وقت لگانا پڑے گا۔ اگر میں کل ہند نوعیت کے کام میں ہی پھنس گیا تو اپنے صوبہ کا کام بگڑ جائے گا۔ اِن سب خیالات کی بنا پر میں نہیں چاہتا تھا کہ صدر میں بنایا جاؤں۔ مگر جب مہاتما جی نے دوسری تدبیر نہ دیکھ کر مجھے ہدایت کی کہ یہ بار اٹھانا ہی پڑے گا۔ تب میں انکار نہیں کر سکا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی پہلے دن کی نشست کسی طرح ختم ہوئی جس میں کوئی خاص کام نہیں ہوا۔ ہم سب جب پنڈال سے اپنے اپنے مقام کے لئے روانہ ہو رہے تھے تو ہم نے سنا کہ پنڈت گووند بلبھ پنت کے ساتھ جنہوں نے تری پوری کی تجویز کانگریس کے سامنے پیش کی تھی اور شری بھولا بھائی ڈیسائی کے ساتھ کچھ لوگوں نے بدسلوکی کی۔ اور کرپلانی جی کو بھی کچھ لوگوں نے گھیر لیا تھا اور معلوم ہوتا تھا کہ ان کے ساتھ بھی کچھ بدسلوکی کریں گے۔ اِن باتوں کی خبر مجھے اُس وقت تو نہیں ملی مگر شہر میں یہ خبر پھیل گئی۔ شمالی ہند کے رہنے والے بہت غصہ میں آ گئے۔ جواہر لال جی کو اِس کا پتہ لگ گیا۔ اور اُن لوگوں کو سمجھا بجھا کر روک تھام کی، نہیں تو دوسرے دن جلسے سے پہلے ہی مار پیٹ ہو جاتی۔ دوسرے دن جلسہ میں سبھاش بابو نہیں آئے۔ اُنہوں نے اپنا استعفےٰ بھیج دیا کمیٹی نے اُسے منظور کر کے مجھے صدر چن لیا۔ میں جوں ہی کھڑا ہوا اور آگے کی کارروائی شروع کرنے والا تھا کہ کچھ لوگ شور مچانے لگ گئے۔ جو منظر تری پوری میں ہوا تھا وہی

پھر چھوٹے پیمانہ پر ہونے لگا۔ میں اپنی جگہ کھڑا ہی رہا۔ جب شور غل ختم ہو گیا تو کچھ تھوڑا کام کر کے میں نے جلسہ برخاست کر دیا۔ وہاں سے چلتے وقت والنٹیر حفاظت کے لئے میرے چاروں طرف ہو لئے۔ اُن میں سے ایک دو نے حفاظت کے بہانے میری بنڈی پکڑ لی اور کھینچا تانی کرنے لگے۔ تب تک دوسرے بچانے لگے۔ مجھے کچھ چوٹ نہیں لگی مگر بنڈی کا بٹن ٹوٹ گیا۔ میں گاڑی پر سوار کر کے اپنی جگہ پہنچا دیا گیا۔ میں نے اِس کا ذکر کسی سے نہیں کیا کیونکہ اس سے خصومت اور بڑھتی۔ رات کی گاڑی سے جب میں روانہ ہوا تو مجھے اسٹیشن پر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر بدھان چندر رائے کے گھر پر کچھ لوگوں نے جا کر شور غل مچایا اور کچھ چیزیں توڑ پھوڑ بھی دیں۔ جو نئی ورکنگ کمیٹی بنی اس کے ممبروں میں بنگال کے ڈاکٹر بدھان چندر رائے اور ڈاکٹر پرپھل چندر گھوش تھے پنڈت جواہر لال نہرو نے اس زمانے میں ممبر ہونا منظور نہیں کیا۔ تاہم انہوں نے وعدہ کیا کہ وہ ہر طرح مدد دیں گے۔

ایک نہایت خوشگوار کام

کلکتہ کی نشست میں کوئی خاص کام نہیں ہو سکا تھا اِس لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ایک دوسری نشست ضروری تھی۔ ایک نشست بمبئی میں تھوڑے ہی دنوں بعد کی گئی۔ تر پوری میں خاص تجویز میں پنڈت گووند بلبھ پنت نے خاص حصہ لیا تھا۔ پنت جی اُتر پردیش کے وزیرِ اعلیٰ تھے۔ ہم لوگوں کے مخالفوں نے وہاں اور بعد میں بھی اِس بات کا بہت پروپیگنڈا کیا کہ کانگریسی وزارتیں سبھاش بابو کی مخالف تھیں۔ اور اِنہی لوگوں نے تر پوری میں اپنے اثر سے اور اپنے عہدہ کے رسوخ سے بے جا فائدہ اٹھا کر تر پوری کی قرارداد منظور کرائی ہے۔ کچھ اور وجہوں سے بھی کچھ لوگ کانگریسی وزارتوں سے غیر مطمئن تھے۔ اِس طرح سے ایک پارٹی ایسی پیدا ہو گئی تھی جو وزارتوں کی شکایت اور اُن کے راستہ میں رکاوٹیں پیدا کیا کرتی تھی۔ وزارتیں سبھی صوبوں میں جہاں کانگریسی ممبروں کی اکثریت تھی۔ کانگریس کی مرضی کے مطابق کام کر رہی تھیں۔ پارلیمنٹری کمیٹی کبھی اُن کے کاموں میں دست اندازی نہیں کرتی تھی۔ مگر اس بات کی نگہبانی رکھتی تھی کہ جو اعلان اور وعدہ ان کے چُناؤ سے پہلے

کانگریس کی طرف سے کہا گیا تھا وہ پورا کیا جائے۔ وزارتیں بھی حتی الوسع اس کوشش میں لگی تھیں۔ میرا خیال ہے کہ اپنے اختیار کے اندر اور بہ حالاتِ موجودہ جو کچھ ہوسکتا تھا وہ کر رہے تھے۔ مگر کانگریس کے اندر کے لوگوں میں سے ہی کچھ ان کی مخالفت کر رہے تھے۔ یہ مخالفت عملی شکل اختیار کرتی جاتی تھی۔ ہم لوگ مخالفین کانگریس کی مخالفت تو سمجھ سکتے تھے۔ کانگریسیوں کے خیالات کا اختلاف بھی سمجھ میں آسکتا تھا۔ حتی المقدور اُن کو ملانے کی کوشش وزارتیں کیا کرتی تھیں۔ مگر اب حالت کچھ اس قسم کی پیدا کر دی گئی کہ سبھاش بابو کے سبھی پیرو اور وزارتوں کے مخالف ایک ساتھ ہو کر کام کرنے لگے۔

لوگوں کا رجحان کچھ ایسا نظر آنے لگا کہ کانگریس کے اندر جو جھگڑا تر پوری اجلاس کے پہلے اور بعد ہوا اُس کو وزارتوں کے خلاف کام میں لا کر وزارت کو مطعون کیا جائے اور اس طرح اُن کی بے قدری کی جائے۔ اِس میں ڈاکٹر کھرے اور ان کے کچھ ساتھی بھی تھے جیسے مدھیہ پردیش کی وزارت کی مخالفت میں شریک ہو گئے۔ کچھ لوگوں کا یہ خیال نظر آنے لگا کہ وزارتوں کو توڑنا سبھاش بابو کے مخالفوں کو نیچا دکھانا ہوگا۔ ہم لوگوں کے خلاف کچھ کہنا کرنا مشکل تھا۔ مگر وزارتوں کیلئے کچھ کہدینا اور کر دینا آسان تھا۔ کیوں کہ اُن کو کچھ نہ کچھ کرنا پڑتا تھا اور کسی بات کو لے کر اُس میں رخنے نکالنا کچھ مشکل نہیں تھا۔ ہم لوگوں کا کہنا تھا کہ اگر وزارت کے کسی کانگریسی کو کچھ شکایت ہو تو کانگریس کی کمیٹیوں کے سامنے پیش کرے۔ پارلیمنٹری کمیٹی، ورکنگ کمیٹی اور ضرورت پڑنے پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی بھی ان شکایتوں کی جانچ کر کے انہیں دُور کرنے کو تیار تھی۔ مگر اُن شکایتوں کو لے کر صرف رائے ہی ظاہر کرنا نہیں بلکہ وزارت کو نیچا دکھانے کی کارروائی کرنا کسی بھی کانگریسی کے لئے نامناسب تھا۔ اِس طرح جو مظاہرے ملک میں بڑھتے جا رہے تھے اُن سے

وزارتوں اور ان کے ساتھ ساتھ کانگریس کے وقار کو دھکا پہنچا تھا۔

بمبئی میں ایک تجویز رکھی گئی جس میں اِس طرح کی عملی مخالفت کی مذمت کی گئی اور کانگریسیوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ ایسا نہ کریں۔ سبھاش بابو اور ان کے پیرووں نے زوروں سے اِس کی مخالفت کی مگر تجویز بہت بڑی اکثریت سے پاس ہو گئی۔ ہم سمجھتے تھے کہ کانگریسی لوگ اس قرارداد کو مان لیں گے اور اِس طرح کی بات اور کارروائی اب نہیں ہو گی۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ بہت جلد اِس طرح کی باتیں ہوئیں جن سے ہم کو سبھاش بابو کے خلاف ضابطہ شکنی کے لئے کارروائی کرنی پڑی۔

اِس المیہ سے پہلے ایک خوشگوار واقعہ کا ذکر ضروری ہے۔ اِدھر کئی برسوں سے گاندھی سیوا سنگھ کا ایک جلسہ ہوا کرتا تھا جس میں اُس کے سبھی صوبوں کے سبھی ممبر ایک ایک طے شدہ مقام پر جمع ہو کر اہم اصولوں اور سوالوں پر غور کیا کرتے تھے۔ اِس میں گاندھی جی بھی شریک ہوتے تھے۔ جہاں یہ نشست ہوتی تھی وہاں کے مقامی ممبر کچھ خدمتِ عامّہ کا کام کیا کرتے تھے۔ کھدر اور سوت کی کتائی وغیرہ کی نمائش بھی ہوا کرتی تھی۔ اِس بار گاندھی سیوا سنگھ کا جلسہ بیتیا (ضلع چمپارن) کے پاس برندابن نامی ایک مقام پر ہونے والا تھا۔ وہاں کچھ دنوں سے پنڈت پرجاپتی مِشر نے ایک آشرم کھول رکھا تھا۔ اِسی علاقہ میں واردھا اسکیم کے مطابق، بہار سرکار کی طرف سے ابتدائی درجوں کی درس گاہیں بھی کھولی گئی تھیں۔ وہاں کے کارکنوں نے بڑے جوش کے ساتھ جلسہ کے لئے خوب تیاری کی تھی۔ مہاتما جی کو ایک تھیلی پیش کرنے کی اسکیم بنائی گئی تھی۔ اُس جلسہ کی تاریخ رکھی گئی تھی کہ کلکتہ میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی نشست کے بعد ہی مہاتما جی اور ہم سب لوگ براہِ راست وہاں آ جائیں۔ اِسی لئے آل انڈیا

کانگریس کمیٹی کی نشست ختم کر کے میں بھی کلکتہ سے بیتیا کے لئے روانہ ہوا۔ آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے بہت سے ایسے ممبر جو اِس سنگھ کے ممبر نہیں تھے۔ جلسہ میں شریک ہونے کے لئے آئے۔ اِس موقع پر اس سنگھ کے جلسہ کے ساتھ تعلیمی سنگھ کی بھی، جو تعلیم کی اسکیم کو بروئے کار لانے میں لگا ہوا تھا، نشست وہیں کی گئی تھی۔ اُس کے صدر ہونے والے تھے۔ صوبہ بمبئی کے صدر اور محکمۂ تعلیم کے وزیر شری بی جی کھیر۔ وہ بھی ہمارے ساتھ کلکتہ سے وہاں آئے۔ جلسہ بڑی دھوم دھام سے ہوا۔ لوگوں نے بھی بڑا جوش دکھایا۔ ایک تو گاندھی جی کو چمپارن کے عوام بہت پریم اور بھگتی سے دیکھتے تھے۔ دوسرے اِس قسم کی اتنی بڑی کوئی دوسری سبھا وہاں ہوئی نہیں تھی۔ اتنے لوگ باہر سے وہاں کبھی نہیں آئے تھے۔ دونوں فریقوں میں آنے والوں اور استقبال کرنے والوں میں کافی جوش تھا۔ سبھی باتیں بہت اچھی طرح ختم ہوئیں۔ گاندھی جی کو تھیلی بھی دی گئی۔ جس کو انھوں نے کچھ ہریجن سیوا اور کچھ دوسرے کاموں کے لئے بانٹ دیا۔ ہریجن سیوا کے لئے روپے تو ہریجن سیوک سنگھ کو دے دئے گئے۔ مقامی کاموں کے لئے جو تھا وہ مقامی آدمیوں کے لئے سپرد کر دیا گیا۔ ایک اچھی رقم بہار میں مزدوروں کی تنظیم کے لئے الگ کر کے رکھ دی گئی۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اِس اجلاس کے بعد، جس میں طے کیا گیا تھا کہ کوئی بھی کانگریسی کسی ایسے عملی کام میں حصہ نہ لے جس سے کانگریس یا وزارتوں کے وقار کو ٹھیس لگے۔ شری سبھاش چندر بوس نے اعلان کیا کہ کانگریس کمیٹی کے اِس فیصلہ کے خلاف سارے ملک میں زبردست مظاہرہ کیا جائے۔ اوپر کہا جا چکا ہے کہ یہ فیصلہ بہت بڑی اکثریت سے منظور ہوا تھا۔ اب اِس فیصلہ کی براہِ راست مخالفت پر مظاہرین تُل

گئے۔ یہ اعلان اخباروں میں پڑھ کر میں نے صدر کی حیثیت سے سبھاش بابو کو تار دیا کہ اس قسم کی خلاف ورزی مناسب نہیں اور وہ اِس سے باز آئیں مگر انھوں نے ایسا کرنے سے انکار کیا اور اپنے فیصلہ کے مطابق اِس قسم کے مظاہرے کرائے جن میں کانگریسی کارکن بھی بہت جگہوں میں شریک ہوئے۔ ہمارے سامنے اب یہ مشکل سوال پیش تھا کہ اِس طرح کی خلاف ورزی کانگریس کب تک برداشت کر سکتی ہے۔ کانگریس کے اندر اختلاف نبٹانے کا واحد راستہ یہ ہے کہ اِس سوال پر رائے لے لی جائے اور جب تک یہ فیصلہ اکثریت سے بدلوا نہ دیا جائے تب کسی کانگریسی کو کانگریس کے فیصلہ کے خلاف خیال رکھتے ہوئے اور اختلاف ظاہر کرتے ہوئے بھی کوئی مخالفانہ کارروائی نہیں کرنی چاہیئے۔ خاص کر ایسی کوئی کارروائی جس سے کانگریس کے وقار کو ٹھیس لگتی ہو۔ اِس مظاہرے میں حصہ لینے والوں نے ٹھیک ایسا ہی کیا تھا۔ ہمارے لئے لازمی ہو گیا کہ ہم ضابطہ کی کارروائی کریں۔

ورکنگ کمیٹی کی نشست ہوئی۔ سبھاش بابو سے کیفیت طلب کی گئی۔ انہوں نے جوابدہی میں اپنی کارروائی کو حق بجانب کہا اور اس کی تائید کی۔ ورکنگ کمیٹی نے بہت غور و خوض کے بعد فیصلہ کیا کہ سبھاش بابو کا کام ایسا ہے جس پر اُس کو مجبوراً ضابطہ کی کارروائی کرنی چاہیئے۔ یہ فیصلہ کچھ آسان نہیں تھا۔ کیوں کہ سبھاش بابو کانگریس کی خاص ہستی تھے۔ وہ کانگریس کے صدر دوبارہ چنے گئے اور ہو چکے تھے۔ اختلاف رائے کی وجہ سے اِس وقت وہ اس عہدے سے ہٹ گئے تھے مگر اُن کے حبِ وطن بے خوفی اور ایثار کے سبھی قائل تھے۔ ایسی شخصیت کے خلاف ضابطہ کی کارروائی کیسے کی جائے سب کو کھٹکتا تھا۔ نہ معلوم کیوں میری کچھ اُلفت باطنی بھی ان کے

ساتھ تھی۔ اگرچہ مجھے اُن کے ساتھ مل کر کوئی کام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اور نہ ہم دونوں میں کسی زمانے میں اتنا ربط ضبط ہی ہوا تھا۔ ہاں ان کے بھائی سرت چندر بوس کو میں تعلیم کے زمانے سے ہی جانتا تھا۔ کیونکہ ہم دونوں ایک ہی زمانے میں پریسیڈنسی کالج میں پڑھتے تھے اور ایک ہی ہوسٹل میں رہا کرتے تھے۔ اُن کے ساتھ کچھ ربط ضبط تھا اور اُن کے لئے کچھ احترام اور محبت بھی۔ مگر سوال یہ تھا کہ کانگریس کے سارے نظام میں اس طرح دھکا لگنے دینا کیا مناسب ہوگا۔ کیا اپنے ذاتی خیالات کی بنا پر اِس عوامی اور ملک گیر جماعت کے وقار کو ٹھیس پہنچانے والے کے ساتھ ضابطہ کی کارروائی نہ کی جائے۔ جیسا ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے۔ جماعت کے لئے ادائے فرض کا جذبہ شخصی جذبات کو دبانے کے لئے مجبور کر رہا تھا۔ ہم سب نے بہت دکھ کے ساتھ مگر ادائے فرض کے جذبہ سے مجبور ہو کر سبھاش بابو کو کانگریس کمیٹی سے ایک مدت کے لئے خارج کر دیا۔ جن دوسرے لوگوں نے اُن کا اِس مظاہرے میں ساتھ دیا تھا اُن کے ساتھ بھی کچھ کارروائی کرنا ضروری تھا۔ مگر ورکنگ کمیٹی نے اُسے خود نہ کر کے صوبائی کمیٹیوں پر چھوڑ دیا۔ کہ وہ جانچ کر جہاں جیسا مناسب سمجھیں کارروائیاں کریں۔

سبھاش بابو تریپوری کے اجلاس کے زمانے سے ہی نئی پارٹی کی تشکیل کر رہے تھے جس کا اُنہوں نے فارورڈ بلاک نام رکھا تھا۔ اب وہ زیادہ زوروں سے منظم کیا گیا۔ اِس کے بعد اس پارٹی اور کانگریس کے درمیان کھلا اختلاف چلنے لگا۔ صوبائی کمیٹیوں نے بھی جا بجا کچھ لوگوں پر ضابطہ کی کارروائی کی۔ آپس کا جھگڑا اور بھی بڑھ گیا۔ کانگریس کی مخالفت اس پارٹی کی طرف سے سب جگہ ہونے لگی۔

اڑلیسہ اور مدھیہ پردیش کی وزارتیں

اِس بار میرا صدر کانگریس ہونا میرے لئے تکلیف دِہ تھا۔ کیوں کہ ایسا ماحول پیدا ہو گیا کہ سبھی جگہوں میں جھگڑے ہی چلتے رہے اور دوسرا کام مشکل ہو گیا۔ دو جھگڑے اور ہوئے جن کا ذکر کر دینا اچھا ہوگا۔ ایک اڑلیسہ کا اور دوسرا مدھیہ پردیش کا۔ کچھ لوگ جا بجا وزارتوں کے خلاف بہت باتیں کرنے لگ گئے تھے۔ اس طرح کے کچھ لوگ اڑلیسہ میں تھے جنھوں نے وہاں کی وزارت کی شکایتیں شروع کر دی تھیں۔ گاندھی سیوا سنگھ کے سامنے کچھ شکایتیں آئیں تو ہم نے اُن کی تھوڑی بہت جانچ کر کے معاملہ نبٹا دینے کی کوشش کی مگر اندر ہی اندر آگ سلگتی رہی۔ پارلیمنٹری کمیٹی کے سامنے بات آئی۔ اُس کے صدر سردار پٹیل نے آخر یہ کہا کہ شاکیوں کو چاہیئے کہ شکایتیں ٹھیک ٹھیک لکھ کر دیں تب وہ جانچ کرائیں گے مگر دونوں فریقوں کو سمجھ لینا چاہیئے کہ شکایت اگر ٹھیک نکلے گی تو وزیر پر، اور اگر جھوٹی ثابت ہوگی تو شکایت کرنے والے پر کارروائی کی جائے گی۔ ترپوری کانگریس کچھ پہلے صدر کانگریس کے رشتہ سے سبھاش بابو کے پاس شکایتیں پہنچیں۔ اِن سب وجوہ سے جانچ کرانا ضروری ہو گیا۔

سبھاش بابو نے جانچ کا کام میرے سپرد کر دیا۔ میں نے جانچ شروع کی مگر وہ پوری نہیں ہو سکی۔ مجھے ایک بار سے زیادہ اڑلیسہ جانا پڑا۔ کئی دنوں تک دونوں فریقوں کی باتیں سننی پڑیں۔ شہادتیں لینی پڑیں، بہت کاغذوں کو پڑھنا پڑا جب میری رپورٹ تیار ہوئی سبھاش بابو صدارت سے استعفیٰ دے چکے تھے۔ میں صدر ہو چکا تھا میری طویل رپورٹ ایک عدالتی فیصلے کی شکل رکھتی تھی۔ اُسے پارلیمنٹری کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی نے منظور کیا۔ خاص شکایتیں غلط ثابت ہوئیں۔ شاکیوں کے خلاف کارروائی کی گئی۔ مگر کچھ دنوں کے بعد اُن کے معافی مانگ لینے پر ضابطہ کی کارروائی اُٹھا لی گئی۔

اِن باتوں کو یہاں اتنی تفصیل کے ساتھ لکھ دینا اِس لئے ضروری تھا کہ شکایت کرنے والے پیچھے جو لوگ مددگار تھے انہوں نے بعد ازاں کانگریس کے خلاف سرِ عام کام کیا۔ پنڈت نیل کنٹھ داس اور پنڈت گوداورش مشر اِن میں خاص تھے وہ شری وشوناتھ داس وزیرِ اعلیٰ کی مخالفت شروع ہی سے کرتے تھے۔ یہ دونوں اصحاب ۲۱-۱۹۲۰ء سے ہی کانگریس کی خدمت کرتے آرہے تھے۔ صوبۂ اڑلیسہ کے لوگوں نے دونوں کا احترام کیا۔ جب ۱۹۳۷ء میں صوبائی اسمبلی کیلئے چناؤ ہوا تو پنڈت نیل کنٹھ داس مرکزی اسمبلی کے ممبر تھے۔ انہوں نے صوبائی اسمبلی کے لئے امیدواری کی درخواست نہیں دی مگر چناؤ میں انھوں نے پورا حصہ لیا۔ کانگریس کی طرف سے تبلیغی کام بھی کیا۔ پنڈت گوداورش مشر صوبائی اسمبلی کے لئے کھڑے ہوئے اور چنے بھی گئے۔ چناؤ کے بعد جب وزارت بننے کا وقت آیا تو وہاں کی اسمبلی کے ممبروں نے پنڈت نیلکنٹھ داس کو جو اُس اسمبلی کے ممبر نہیں تھے لیڈر نہ چن کر شری وشوناتھ داس کو لیڈر کو چن لیا جب وزارت بنی تو لیڈر منتخب ہونے کی وجہ سے قدرتاً وہی وزیرِ اعلیٰ بنے۔ پنڈت نیلکنٹھ داس

اِس سے بہت ناراض تھے جو شکایتیں آتی تھیں وہ ایسی ہوتی تھیں جن سے وشوناتھ داس کے اخلاقی کیرکٹر اور ایمانداری پر حملہ ہوتا تھا۔ اِسی لئے جانچ کے پہلے اِس بات کی تنبیہ کرنی پڑتی تھی۔ اگر شکایت ثابت نہ ہوئی تو مدعی کے خلاف کارروائی کی جائے گی۔

شکایت کرنے والے مدعی پنڈت نیل کنٹھ داس کے ساتھ کام کرنے والے صاحب تھے۔ بعد ازاں شاید وہ اُن سے الگ ہو گئے۔ اُس وقت اُن لوگوں کا کچھ بس نہ چلا۔ کیونکہ شکایت غلط اور بے بنیاد ثابت ہو گئی۔ کانگریس سے سبھاش بابو کے الگ ہو جانے پر پنڈت نیل کنٹھ داس نے اُن کا ساتھ دیا اور مرکزی اسمبلی میں بھی اُن کی کارروائی ایسی ہوئی جیسی کانگریس ممبر کے ذریعہ نہیں ہونی چاہیئے تھی۔ وہ کانگریس کے عہد نامہ پر دستخط کر کے مرکزی اسمبلی کے ممبر چُنے گئے تھے۔ اُس میں انھوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ کانگریس کے ضابطہ کو مانیں گے۔ مگر کچھ دنوں کے بعد اُنہوں نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا۔ کانگریس پارٹی سے وہ الگ ہو گئے۔ جب یورپ کی جنگ عظیم کے شروع ہونے کے بعد کانگریسی وزارتوں نے استعفیٰ دیا تو اڑیسہ کی وزارت بھی اور جگہوں کی طرح ٹوٹ گئی۔ پنڈت نیلکنٹھ داس اور پنڈت گوداوریش مشرا اس بات کی فکر میں لگے رہے کہ کسی نہ کسی طرح وہاں وزارت بنے مگر جب کانگریسی ممبروں کی اکثریت نے اُن کا ساتھ نہیں دیا تو وہاں کی زمیندار پارٹی کے ساتھ مل کر جس کے لیڈر پارلاکیمیڈی کے مہاراجہ بہادر تھے۔ اُنہوں نے وزارت قائم کرائی جس میں شری گوداوریش مشر وزیر ہوئے اور مہاراجہ وزیرِ اعلیٰ۔ کچھ کانگریسی لوگوں کو انہوں نے توڑ لیا۔ مگر بیشتر کو جیل میں بند کر کے کسی طرح انہوں نے اپنی اکثریت کر لی۔

مدھیہ پردیش کی بھی کچھ اسی طرح کی شکایتیں تھیں۔ جن کا اشارہ پہلے کر چکا

ہوں۔ ڈاکٹر کھرے کے ساتھیوں میں سے کچھ لوگوں نے پرانی گندہ شکایتیں اور کچھ نئی باتوں کو لے کر پارلیمنٹری کمیٹی اور ورکنگ کمیٹی کے سامنے وزارت اور خاص کر مسٹر جی کے خلاف شکایتیں پیش کیں۔ پہلے شری بھولا بھائی دیسائی کو اِن شکایتوں کا بار سونپا گیا مگر اُن سے مدعی لوگوں کا اختلاف رائے ہوگیا۔ آخر میں مجھے صدر کی حیثیت سے اِس معاملہ کو بھی دیکھنا پڑا۔ میں نے اِس میں بھی دونوں فریقوں کی باتیں سنیں۔ بہت سے کاغذوں کو دیکھا اور فیصلہ دیا جو ورکنگ کمیٹی کے سامنے پیش ہوکر منظور ہوگیا۔ کچھ لوگ فیصلے کے بعد بھی بہت کچھ لکھتے بولتے رہے مگر ایک بار فیصلہ ہو جانے اور اخباروں میں چھپ جانے پر معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔

میرا زیادہ وقت اس قسم کے کاموں میں ہی لگا۔ جن سے جی گھبراتا تھا۔ اور ٹھیک طرح سے تعمیری کام کرنے کا وقت نہیں ملتا تھا۔ اس بار صدر ہونے کا ایک اور نتیجہ یہ نکلا کہ اپنے صوبے کے ساتھ جو گہرا تعلق رہا کرتا تھا وہ کم ہوگیا۔ وقت کی کمی کی وجہ سے میں صوبے کے کاموں اور باتوں میں اتنی دل چسپی نہ لے سکا اور نہ صوبہ کے دورہ ہی کر سکا ۱۹۳۴ء ۱۹۳۵ء ۱۹۳۶ء میں جب صدر تھا اور صوبوں کے دوروں میں ہی سارا وقت لگا دیا تھا۔ بہار میں کچھ بھی وقت نہ دے سکا۔ وہی بات اِس بار بھی ہوئی۔ اگرچہ اِس بار دورہ کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ مگر بہار میں کانگریس کا اجلاس ہونے والا تھا۔ اِس لئے روپیہ جمع کرنے کو کہیں کہیں ضرور جانا پڑا۔ جب کُل ہند کام سے فرصت ملتی تو اِدھر دوڑا جاتا یا یوں کہئے کہ دونوں کے بیچ میں اِدھر اُدھر دوڑتا رہا۔

رام گڈھ کانگریس کے لئے جگہ کا انتخاب

تر پوری سے واپس آتے ہی ہم کو یہ سوچنا تھا کہ بہار میں کانگریس کا جلسہ کہاں کیا جائے۔ اِدھر کئی برسوں سے جلسہ کسی گاؤں میں ہوا کرتا تھا ہم بھی چاہتے تھے کہ کہیں گاؤں میں ہی کریں۔ میرا خیال پہلے یہ ہوا کہ جلسہ سون پور میں کیا جائے۔ وہ تین ضلعوں کی سرحد پر ہے وہاں ہر سال بہت بڑا مشہورِ ہند میلہ لگا کرتا ہے۔ اُس میں ملک بھر کے لاکھوں آدمی آتے ہیں۔ لاکھوں کی تعداد میں مویشی، گھوڑے، ہاتھی اور دوسرے جانور فروخت کے لئے جاتے ہیں۔ اِسی لئے وہاں بہت باغیچے ہیں۔ لاکھوں آدمیوں کے لئے پانی کا انتظام آسان نہیں۔ اِسی لئے بہت سے کنویں بنائے گئے ہیں۔ میلہ کے وقت پانی کی کل بھی چلائی جاتی ہے۔ جسے ضلع بورڈ نے بنا رکھا ہے میلہ کارتک کی پورنماشی کو ہوا کرتا ہے۔ کانگریس کا جلسہ تقریباً تین مہینہ بعد ہوتا۔ اِسی لئے ہم میلہ میں بانس، چٹائیاں وغیرہ بہت سستا سامان خرید سکتے تھے۔ ڈیلی گیٹوں کی رہائش کا انتظام میلہ کے بعد بھی شروع کر کے آسانی سے پورا کر سکتے تھے۔ اِن سہولتوں کے سوا گنڈک ندی کے کنارے ہونے کی وجہ سے بانس، لکڑی، پھوس وغیرہ ندی کے ذریعے لائے

جا سکتے تھے۔ گنگا کے اتر ضلع بہار میں کانگریس کے کام کے لئے بہت جاندار ضلعے سمجھے جاتے ہیں۔ پہلے دو بار کانگریس کے جلسے بہار میں ہو چکے تھے۔ مگر دونوں بار گنگا سے دکھن میں، پٹنہ اور گیا میں۔ اُتر کے لوگ بہت چاہتے تھے کہ شمالی بہار میں بھی ایک جلسہ ہو۔ اِن سب خیالوں سے میری رائے تھی کہ یہیں جلسہ کیا جائے۔ مگر سب کی رائے لینی تھی۔ سب سے زیادہ یہ دیکھنا تھا کہ جو نگر ہم بسائیں گے اُس کے بسانے میں صحت کے لحاظ سے کہاں زیادہ آسانی ہوگی۔ اِسی لئے تر پوری سے واپس آکر ہم دو چار آدمی اُن سبھی جگہوں کو دیکھنے گئے جو جلسہ کے لئے موزوں سمجھی جاتی ہیں۔ تر پوری میں ہی میں نے ایک تجربہ کار انجنیر شری رام داس گُلاری کو مدعو کر دیا تھا کہ بہار کانگریس نگر کی تشکیل میں اُن کو آنا چاہیئے۔ اُنہوں نے اس دعوت نامہ کو بخوشی قبول کر لیا تھا فیض پور میں جب پہلے پہل دیہات میں کانگریس کا جلسہ منعقد کرنے کا مہاتما جی کا خیال ہوا تو وہاں تشکیلی کام میں مدد دینے کے لئے گُلاری جی ہی گئے تھے۔ تر پوری میں بھی اُنہوں نے ہی کانگریس بنانے کا کام کرایا تھا۔ اُن کے تجربہ سے فائدہ اٹھانے کے لئے ہی میں نے ان کو دعوت دے دی تھی۔ وہ ٹھیک وقت پر آ گئے جگہ کے انتخاب میں شریک رہے وہ بھی ان سبھی جگہوں پر گئے جن کو ہم موزوں سمجھتے تھے۔

ہم لوگوں نے پٹنہ ضلع میں راج گرہ کو بھی اس کام کے لئے دیکھا وہ بہت ہی پُرانا اور تاریخی مقام ہے۔ اُس کو جراسندھ کی راجدھانی اور بُدھ دیو کی جائے رہائش رہنے کا فخر حاصل ہے۔ بودھ اور جینیوں کے زمانے میں بھی اُسے بہت شہرت مل چکی ہے۔ نالندا کی وہ عظیم یونیورسٹی بھی جہاں کسی زمانے میں ہزاروں طالب علم اور بھکشو تعلیم حاصل کیا کرتے تھے اور جہاں سے عالم بھکشو اور فارغ التحصیل طلبا ر

بودھ مذہب کی تبلیغ کے لئے تبت، چین وغیرہ ملکوں میں گئے تھے جہاں کے مسمار بہاروں (مٹھوں)، اور آثارِ قدیمہ کی کھدائی سے نکلی ہوئی عمارتیں اور قسم قسم کے سامان آج بھی لوگوں کو متحیر کرتے ہیں۔ وہاں سے چند میل کے فاصلہ پر ہے۔ تاریخی اعتبار سے یہ جگہ بہت موزوں اور قدرتی خوبصورتی کے لحاظ سے دل کش اور صحت بخش تھی۔ مگر دورِ جدید کی آسانیوں کا نہ ہونا سب سے زیادہ وہاں پہنچنے کی دشواری، پانی کی بھی کمی، اِن وجہوں سے اُسے چھوڑ دینا پڑا۔ بعد میں خیال بھی ہوا کہ پٹنہ کے پاس پھُلواری شریف میں جلسہ کیا جائے۔ مگر یہ مقام پٹنہ کے اتنے قریب تھا کہ وہ شہر کا ہی جلسہ سمجھا جاتا اور شہر کی سہولتیں وہاں ملتیں نہیں۔

اُدھر چھوٹا ناگپور کے لوگوں کا خاص کر ہزاری باغ کے بہادر کانگرسی بابو رام نرائن سنگھ کا بہت زور تھا کہ کوئی مقام چھوٹا ناگ پور میں ہی چُنا جائے۔ ان کو ہمیشہ شکایت رہا کرتی تھی کہ ہم لوگ چھوٹا ناگ پور کے ساتھ بے پروائی کا سلوک کرتے ہیں۔ چنانچہ چھوٹا ناگ پور بھی خیال میں رکھا گیا۔ ہم لوگوں نے آخر میں ہزاری باغ ضلع کے رام گڑھ کو ہی پسند کیا۔ اِس کا بھی سہرا شری رام داس گلاری کے سر ہے کیونکہ انہوں نے اِس جگہ کو صحت کے خیال سے زیادہ موزوں سمجھا۔ میری خواہش تھی کہ اِن سندر سہاؤنے جگہوں کے بیچ دامودر ندی کے کنارے جلسہ اپنے طرز کا نرالا ہوگا۔

جگہ تو چُن لی گئی مگر اجلاس کے طے شدہ مقام پر جنگل تھا۔ جسے صاف کرانا تھا۔ اور تقریباً سب کو وہیں لگنا تھا۔ شروع میں ہی میں نے شری امبکا کانت سنگھ کو وہاں 'اور وہاں رہ کر بڑی محنت اور لگن کے ساتھ کام کرنے لگے۔ میں بھی کچھ

دنوں تک رانچی میں ٹھیرا رہا۔ جہاں سے رام گڈھ تقریباً تیس تینتیس میل کی دوری پر ہے نقشہ وغیرہ گلاری جی بنانے لگے۔ جنگل کٹنے لگا۔ کام آگے بڑھنے لگا۔ میں اِدھر اُدھر روپے جمع کرنے کے لئے اور بھائیوں کے ساتھ دورہ کرنے لگا۔ اُن میں خاص کر میرے ساتھ تقریباً سبھی جگہوں کے جاننے والے بابو متھرا پرشاد تھے۔ دوڑ دھوپ کرتا رہا۔ رام گڈھ میں ہی تھا کہ خبر ملی کہ جرمنی نے پولینڈ پر چڑھائی کر دی ہے اور انگلستان اور فرانس کے ساتھ بھی لڑائی چھڑ گئی ہے۔ اُس زمانے میں جرمنی نے لڑائی سے کچھ دن پہلے روس کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا تھا۔

کانگریس اور دوسری جنگ عظیم

اس معاملہ پر غور کرنے کے بعد ۱۹۳۸ء کے ستمبر میں بغیر کسی فیصلہ پر پہنچے ورکنگ کمیٹی نے بات وہیں چھوڑ دی تھی۔ کیونکہ لڑائی چھڑی نہیں اور چیمبرلین نے چکوسلوکیہ کو ہٹلر کا شکار چھوڑ کر صلح کر لی تھی۔ اب کانگریس کو کچھ طے کرنا تھا۔ اُدھر جواہر لال جی اس وقت چین گئے ہوئے تھے۔ گاندھی جی کی وائسرائے سے ملاقات ہوئی۔ ورکنگ کمیٹی کی نشست واردھا میں کی گئی۔ میں بیمار تو تھا مگر کسی طرح واردھا پہنچ گیا۔ مہاتما جی نے شری مہادیو ڈیسائی کو بھیجا کہ چاہے جس طرح ہو سکے مجھے وہ ضرور واردھا لے آئیں۔ ورکنگ کمیٹی کی نشست کئی روز تک رہی اس درمیان پنڈت جواہر لال نہرو چین سے واپس آ گئے۔ معاملہ بہت گمبھیر تھا۔ یہ سوچا گیا کہ اگرچہ شری سبھاش چندر بوس کانگریس سے الگ ہیں تاہم اس موقع پر انہیں بلانا چاہیئے اور ان کی رائے بھی لینی چاہیئے کانگریس کے دوسرے خاص فرد بھی جو ورکنگ کمیٹی کے ساتھ نہیں بلا لئے گئے۔

گاندھی جی نے وائسرائے سے ملاقات کے بعد ایک بیان شائع کیا تھا۔

جس میں انہوں نے انگلستان کے ساتھ ہمدردی دکھائی تھی اور یہ بھی کہا تھا کہ ہم کو انگلستان کی مدد بغیر شرط کے کرنی چاہیئے ۔ اس سے کچھ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی ۔ بعد میں جب کانگریس کمیٹی کی طرف سے اس بات کا مطالبہ پیش کیا گیا کہ برٹش سرکار جنگ کے متعلق اور جنگ کے بعد قیام امن کے متعلق اپنے خیالات اور مقاصد صاف صاف بتا دے ۔ تبھی ہندوستان دل کھول کر مدد کر سکے گا ۔ تو انگریزوں کو یہ کہنے کا موقع ملا کہ گاندھی جی اپنے شائع کردہ بیان سے ہٹ گئے ۔ کانگریسیوں میں بہتوں کو یہ بات پسند نہیں کہ اس طرح غیر مشروط مدد اس سامراج شاہی لڑائی میں دینا انہوں نے منظور کرلیا ۔ بات یہ تھی کہ دونوں فریقوں کا خیال جزوی تھا ۔ گاندھی جی نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا کہ ہندوستان سے روپے اور آدمی کی مدد لی جائے گی ۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس جنگ میں ہندوستان جیسے محکوم ملک کی ہمدردی انگریزوں کے لئے ایک ایسی قیمتی چیز ہوگی جو ساری دنیا کی ہمدردی اُن کے ساتھ لا سکے گی ۔ انہوں نے اسی ہمدردی کی بات سوچی تھی مگر اس میں شک نہیں کہ اس وقت اس طرح کے بیان سے لوگوں میں کچھ کھلبلی پیدا ہوئی تھی ۔

ورکنگ کمیٹی کے سامنے سوال تھا کہ وہ اس جنگ کے متعلق کیا رُخ رکھے گی کانگریس لڑائی میں مدد دے گی یا نہیں اور اگر مدد دے گی تو غیر مشروط یا کسی شرط کے ساتھ ۔ مدد کی صورت کیا ہوگی ۔ کانگریس میں اپنے نصب العین میں عدم تشدد کو ہی وسیلہ مانا ہے ۔ اس تشدد جنگ میں ایک غیر متشدد جماعت کیسے اور کونسی مدد کر سکتی ہے وغیرہ وغیرہ ۔ کمیٹی کئی دنوں کے غور کے بعد ایک فیصلہ پر پہنچی اور ایک قرارداد منظور کی ۔ اس میں نازی ازم اور فاسسزم کی مخالفت ظاہر کرتے ہوئے کمیٹی کے سامراج واد

(استعماریت) کے خلاف بھی اپنا جذبہ ظاہر کیا۔ اور برٹش راج سے اصرار کیا کہ ہندوستان کے عوام کو اس جنگ میں دل سے مددگار بنانے کے لئے اپنے مقاصد صاف صاف بتا دے۔

اس قرارداد کی زبان بہت ہی خوب صورت اور جذبہ بھی انتہائی بلند اور موزوں تھے۔ اس کا سہرا خاص کر پنڈت جواہر لال نہرو کے سر تھا۔ انہوں نے مسودہ تیار کیا تھا۔ اُسی اجلاس میں یہ ظاہر ہو گیا کہ کانگریس اپنی عدم تشدد کی پالیسی کی وجہ سے اس جنگ میں برٹش سرکار کی مدد کرنے سے انکار نہیں کر سکتی۔ اور اگر موقع ملا تو وہ ہتھیار کی مدد کرنے سے بھی نہیں ہچکچے گی۔ یہ کہہ دینا اسی لئے ضروری ہے کہ اس کے بعد جب موقع آیا کانگریس کے انگریز مخالف خاص کر وزیر ہند مسٹر ایمری اور بھارت سرکار کے اونچے کارکن جن میں لارڈ لنلتھگو شامل تھے یہ کہنے سے نہیں جھجکے کہ گاندھی جی کے عدم تشدد کی وجہ سے ہی کانگریس مدد نہیں دیتی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس نشست میں یہ بات اتنی واضح نہیں ہوئی تھی۔ مگر اس تجویز سے یہ ظاہر تھا کہ برٹش سرکار اگر قابل اطمینان طریقہ سے اپنے مقاصد کی تشریح کر دے گی تو کانگریس کو مدد دینی ہی پڑے گی اور اس مدد کی شکل متشدد ہوئے بغیر نہیں رہے گی۔ اس وقت سارے ملک میں خاص کر کانگریسی لوگوں میں سے بہتیروں میں برطانیہ کے لئے ہمدردی تھی اور اگر برٹش سامراج والے اس کا تھوڑا بھی کنا یہ دیتے کہ وہ سچ مچ یہ لڑائی جمہوریت کے لئے کر رہے تھے جیسا کہ اُس وقت انگلستان کے کچھ خاص سیاسی مدبر اور اخبار گلا پھاڑ پھاڑ کر چلا رہے تھے تو ہندوستان کے تقریباً سبھی لوگ ان کے ساتھ دل کھول ہو جاتے مگر دنیا کی ہمدردی پانے کے لئے تو یہ لڑائی جمہوریت قائم کرنے کے لئے کی جا رہی تھی۔ اور حقیقت میں

وہ برٹش سامراج کی حفاظت اور مضبوطی کے لئے کی جارہی تھی جیسا بعد میں واضح ہوتا گیا۔

اس قرارداد کے بعد مجھے صدر کی حیثیت سے دوبار لارڈ لنلتھگو سے ملنے کا موقع ملا۔ ایک بار پنڈت جواہر لال نہرو کے ساتھ، دوسری بار مہاتما گاندھی اور مسٹر جناح کے ساتھ۔ اُس وقت لارڈ لنلتھگو ہندوستان کی سبھی پارٹیوں اور سبھی طرح کے خیال والے لوگوں سے مل کر لڑائی ہندوستان کی مدد کی بات کرتے تھے اور چاہتے کہ ہندوستان کے لوگ راضی خوشی مدد کریں۔ اور کسی قسم کی گڑبڑ نہ ہونے دیں۔ لڑائی شروع ہوتے ہی بغیر کسی سے پوچھے اور مشورہ کئے ہی انہوں نے برٹش سرکار کی طرف سے اعلان کر دیا تھا کہ ہندوستان بھی لڑائی میں شریک ہے۔ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی قائم تھی۔ سبھی صوبوں میں ۱۹۳۵ء کی آئین کی رو سے وزارتیں کام کر رہی تھیں۔ جن میں گیارہ میں سے آٹھ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں قائم تھیں۔ کسی سے نہ پوچھا گیا اور نہ رائے لی گئی۔ گویا ہندوستان کی کسی جماعت یا کسی فرد کو اس لڑائی سے تعلق ہی نہ تھا۔ بغیر پوچھ گچھ کے ہی ہندوستان کو بھی جنگی فریقوں میں شامل کر دیا گیا۔ کانگریس کمیٹی بھی بہت ناراض تھی ہندوستان کے دوسرے لوگ بھی اِسے پسند نہیں کرتے تھے۔ ایسی حالت میں جب تک اُن کا مطلب واضح نہ ہو جائے کچھ بھی کسی کے لئے ممکن نہ تھا اور نہ مناسب۔ لارڈ لنلتھگو بعد میں اِسی لئے لوگوں سے صلاح و مشورہ کرنے لگے۔ اُنہوں نے ملک کی سیاسی جماعتوں کو مطمئن کرنے کے لئے یہ سکیم رکھی کہ اُن کی روالسرائے کی) اگزکٹو کونسل (مجلس عامہ) کے ممبروں کی تعداد بڑھا دی جائے گی اور اُس میں زیادہ ہندوستانی لے لئے جائیں ساتھ ہی اس بات پر ڈٹے رہے کہ اُن

کے نئے یا پرانے ممبروں کے اختیارات میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔ اُن کے خیال سے یہ ممبر اپنے اپنے صیغہ کے سردار جیسے ہیں۔ اُن کو کوئی آزاد اختیار حاصل نہیں اور کونسل کی نشست تو صرف سبھی ممبروں کو ایک دوسرے محکمہ کی کارروائیوں سے متعارف کرانے کے لئے ہی ہوتی ہے۔ وہاں کچھ باتوں پر وہ صرف غور کر سکتے ہیں۔ مگر سبھی اہم سوالوں کے نبٹانے کا بار آخرش وائسرائے پر ہی ہے۔ اور اُن کو ہی حق بھی حاصل لڑائی کے زمانے میں وہ کوئی آئینی تبدیلی کرنے کا امکان نہیں دیکھتے تھے اور اسی لئے جو کچھ ہو سکتا تھا وہ ۱۹۳۵ء کے آئین کے اندر ہی ہو سکتا تھا۔

کانگریس کے مطالبے دو تھے برٹش سرکار کے لڑائی کے مقاصد کی وضاحت کے ساتھ آزادیِ ہند کے متعلق کانگریس چاہتی تھی کہ مستقبل کے پلان کے نصب العین کو واضح طور پر آزادی کی شکل دیدی جائے اور ساتھ ہی ساتھ ابھی فوراً ہندوستان کے نمائندوں کو حکومت کے متعلق ایسے اختیارات مل جائیں جن کے ذریعہ وہ سچ مچ ہندوستان کی مرضی کے مطابق انتظام کر سکیں اور لڑائی میں سچی مدد کر سکیں مستقبل کے اعلان کی اہمیت کو کچھ کم بھی کر دیا جائے تو جب تک فوری اختیارات نہ مل جائیں، لڑائی میں عوام کی دلچسپی نہ ہوگی اور وہ دل سے مدد نہیں کر سکیں گے۔ کانگریس برٹش سامراج شاہی کو بھی دنیا کے لئے کوئی مفید چیز نہیں مانتی۔ وہ سامراج شاہی کے بدلے میں سچی جمہوریت کی حامی رہی ہے اور ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ برٹش سامراج شاہی تبدیل ہو کر سچی جمہوریت کی شکل ان ملکوں اور نوآبادیوں کے لئے اختیار کرے جو آج اس سامراج شاہی کی ایڑیوں کے نیچے کچلے جا رہے ہیں۔ لڑائی کے شروع میں جمہوریت کی طول طویل باتیں کی گئیں۔ کانگریس نے ایک سوال کر کے اس تبلیغ کا بھانڈا پھوڑ

دیا سوال صرف اتنا ہی تھا کہ کیا جمہوریت ہندوستان کے لئے بھی ہوگی۔ ایشیا اور افریقہ کی پامال قوموں کے لئے بھی ہوگی یا صرف انگریزوں اور یورپ والوں کے لئے ہی ہوگی اگر ایشیا اور افریقہ کے لئے بھی تو کھل کر واضح لفظوں میں کہہ دیا جائے اور اس کا یقین ابھی حتی الوسع اختیارات دے کر عملی طریقہ سے سبھی لوگوں کو دیدیا جائے۔

نومبر ۱۹۳۹ء سے ۱۹۴۲ء تک اس سوال کا قابل اطمینان جواب کانگریس اور ہندوستان کو نہیں ملا۔ پہلے یہ کوشش کی گئی کہ اصل مقصد لفظوں کے جال میں چھپا رکھا جائے۔ یہ مقصد تھا برطانوی سامراج کو اٹوٹ بنائے رکھنے کا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا یہ بات صاف ہوتی گئی۔ اس زمانہ میں لارڈ لنلتھگو نے ہزار کوشش کی مگر کوئی بھی سیاسی جماعت اُن کی تجویز سے مطمئن نہیں ہوئی۔ ہاں مسلم لیگ کو خوش کرنے کے لئے انہوں نے کچھ دن بعد اعلان کر دیا کہ ۱۹۳۵ء کے آئین پر لڑائی کے بعد از سرِ نو غور کیا جائے گا۔ اس آئین کی کانگریس نے بھی زبردست مخالفت کی تھی اور شاید کچھ ماڈریٹ طبقہ کے لوگوں کے علاوہ کسی سیاسی جماعت نے اس کے مطابق کام کرنے کی رضامندی ظاہر نہیں کی تھی۔ اس لئے لڑائی کے بعد اس کو ایک طرح سے بنیادی طور پر ترمیم اور تبدیل کرنے کا وعدہ کر کے انہوں نے صرف مسلم لیگ کو ہی نہیں شاید دوسروں کو بھی مطمئن کرنے کی کوشش کی ہو۔ مگر ایسا معلوم نہیں ہوتا کیونکہ اُن کی اُس وقت کی اور بعد کی کارروائیوں کا ایک ہی نتیجہ نکلتا ہے وہ چاہتے تھے کہ کانگریس کے مقابلہ میں ایک دوسری جماعت کھڑی کر دیں اور ادھر ہندوستان سے کہیں کہ جب تک یہ دونوں جماعتیں مل کر ایک مطالبہ پیش نہیں کرتیں ہم کچھ بھی کرنے سے مجبور ہیں اور ساتھ ہی دنیا میں بتا سکیں کہ انگریز تو حقوق دینے کے لئے تیار ہیں مگر ہندوستان کے لوگ اتنے نالائق

ہیں کہ آپس میں میل ہی نہیں کر سکتے۔ اس لیے وہاں برٹش سرکار کا با اختیار رہنا ضروری بلکہ لازمی ہے اِس میں لارڈ لنلتھگو اپنے وقت میں بہت کامیاب بھی ہوئے۔ اُس زمانے میں ان ملاقاتوں کا نتیجہ یہی نکلا کہ کوئی قابلِ اطمینان جواب ہم کو برٹش سرکار کی طرف سے نہیں ملا۔ جو اعلان انہوں نے سرکار کی طرف سے نکالا تھا۔ اُس کے متعلق ہمیں صاف صاف کہہ دینا پڑا کہ ہم مطمئن نہیں ہیں۔

وائسرائے سے ملنے کے بعد ہم کو یہ بھی طے کرنا پڑا کہ کانگریسی لوگ وزارتوں میں نہیں رہ سکتے اور صوبوں میں حکومت کا بار بھی اپنے اوپر نہیں رکھ سکتے۔ ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی بہت غور و خوض کے بعد اس فیصلہ پر پہنچی تھی۔ کانگریس کے اندر کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو اِس پالیسی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ جو تھوڑے بہت اختیارات ہمارے ہاتھ آئے ہیں اُنہیں چھوڑنا نہیں چاہیئے۔ وہ یہ بھی سوچتے تھے کہ ہم اپنے ہاتھوں میں یہ اختیار رکھ کر ملک کی زیادہ خدمت کر سکیں گے اور جنگ میں جو نقصان ہمیں پہنچ سکتا ہے اُس سے بچنے میں اور جنگ سے جو فائدہ ہم اٹھا سکتے ہیں اُسے حاصل کرنے میں، دونوں ہی میں اختیار رکھ کر ہی ہم زیادہ کامیاب ہو سکتے ہیں مگر ایسے لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ جوں جوں جنگ طول پکڑے گی۔ صوبوں کے اختیارات مرکزی حکومت اپنے ہاتھوں میں لیتی جائے گی۔ وزارتیں اپنے صوبوں میں کچھ بنانے کا اختیار تو رکھ نہیں سکیں گی مگر جو کچھ خرابی واقع ہو گی اُن کی جوابدہی اُن کے سر آئے گی۔ مرکزی حکومت میں ہندوستانیوں کو کوئی اختیار ملتا نظر نہیں آتا۔ اِس لئے وہاں جو بھی ہندوستانی ممبر وائسرائے کے ساتھ کام کرے گا۔ اُسے وزیرِ جنگ اور وائسرائے کی طرف ہاں میں ملانے کے سوا

اور کچھ کرنے کا موقع نہیں ملے گا۔ وہ چاہیں بھی تو صوبائی وزیروں کی کوئی خاص مدد نہ کر سکیں گے۔ نہ عوام سے جنگ میں پوری امداد کی امید کی جائے گی۔ عوام خوشی سے مدد دیں گے نہیں کیونکہ اُن کے سامنے نہ تو مستقبل کی روشن امید ہے اور نہ زمانۂ حال میں ان کے نمائندوں کو کوئی اختیار، اِس لئے جب وہ برٹش سرکار کی ہدایت کے مطابق مدد نہیں دے سکیں گے تو وزارتوں کو عوام کے ساتھ کچھ زور زبردستی بھی کرنی پڑے گی مگر کوئی خدمتِ عوام کا سچا عہد کرنے والی جماعت ایسی حالت میں یہ نہیں کرے گی۔ اس لئے کانگریسی وزارت بھی ایسا کرنے سے ناچار ہوگی۔ برٹش سرکار کو بھی لڑائی لڑنا ہی ہے اور اُسے جو مدد چاہیئے وہ خوشی سے دی جائے یا زبردستی، ملنی ہی چاہیئے۔ وہ وزارتوں سے اس مدد کی امید رکھے گی ہی اور ان کی امید پوری نہ ہوگی تو قدرتاً غصّہ آئے گا۔ لہٰذا اچھا یہی ہوگا کہ ہم اِس خشک جوابدہی کو اپنے اوپر نہ لیں۔ نہیں تو ہم کو عوام اور برٹش سرکار دونوں کے لات جوتے سہنے پڑیں گے۔ اور اگر وہ نہ سہنا پڑا تو کم از کم دونوں کی پھٹکار ضرور کھانی پڑے گی۔ خاص کر ایسی حالت میں جب ہم کانگریسی اُن حالات جو آج قائم ہیں اور جو جنگ کے باعث اور بھی شدید ہونے والے ہیں، سنبھالنے کی طاقت سے محروم رکھے جا رہے ہیں اور اگر کسی کا خیال ہو کہ برٹش سرکار سچ مچ ہندوستان کے ساتھ انصاف کرنا اور اُسے آزاد کرنا چاہتی ہے تو اس کا ثبوت اس کی کارروائیوں سے مل جائے گی اور اگر وہ نہیں چاہتی ہے تو کانگریس کا ہٹ جانا ہی ٹھیک ہوگا۔

ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے فیصلہ کر لیا کہ کانگریس کے سوالوں کا اگر تسلی بخش جواب نہیں ملا تو کانگریسی وزارتوں کو استعفیٰ دے کر ہٹ جانے کے لئے

مشورہ دینا پڑے گا۔ واردھا میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ اُس کے ورکنگ کمیٹی کو اختیار دیدیا گیا کہ اس بات کا وہی فیصلہ کرے اور حسبِ ضرور وزارتوں کو استعفیٰ دینے کی ہدایت کرے۔ جب والسرائے سے بات چیت اور سرکاری اعلان سے ورکنگ کمیٹی کو اطمینان نہیں ہوا تو اُس نے کانگریسی وزارتوں کو اطلاع دیدی کہ اپنے اپنے صوبوں کی اسمبلیوں میں وہ ملک کے مطالبہ کی تائید کرائیں اور اس کے بعد استعفیٰ دیدیں۔ اُنھوں نے ایسا ہی کیا۔ نومبر ۱۹۳۹ء میں سبھی صوبوں کی کانگریسی وزارتیں ٹوٹ گئیں۔ کانگریس کی اکثریت اتنی تھی کہ کوئی دوسری وزارت بن نہیں سکتی تھی۔ کیونکہ بنتے ہی اُس پر عدم اعتماد ظاہر کیا جا سکتا تھا۔ ساتھ ہی شاید گورنر صاحبان اور والسرائے یہی پسند کرتے تھے کہ اس قسم کی بہ نسبت، جو کبھی چوں چیں ہی کر سکتے تھے، کسی بھی وزارت کا نہ رہنا ہی اُن کے لئے اچھا ہوگا۔ اُن کو اپنی من مانی کرنے کا پورا موقع رہے گا۔ اس لئے اُنھوں نے ان سبھی صوبوں کو آئین کی دفعہ ۹۳ کے مطابق نظم و نسق اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اب صرف کام کاج چلانے کا ہی نہیں، نئے قانون بنانے اور پرانے بدلنے یا رد کرنے کا بھی پورا اختیار گورنروں کے ہاتھوں میں آگیا۔ جنگ شروع ہوتے ہی برٹش سرکار نے ۱۹۳۵ء کے آئین میں ایک دن میں ترمیم کر لی جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ والسرائے جب کبھی چاہیں صوبائی سرکاروں کے اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے سکتے تھے۔ اور اُن سے اپنی ہدایتوں کی تعمیل کرا سکتے تھے۔ یہ جنگ کی نازک حالت کے نام پر کیا گیا تھا۔ مگر مطلب صاف تھا۔ اور جب وزارتوں نے استعفے دیدیا تو اُن کا راستہ اور بھی صاف ہوگیا۔

کچھ لوگ آج بھی زور دے کر کہتے ہیں کہ اگر وزارتوں نے استعفیٰ نہ دئے ہوتے اور اپنی جگہوں پر ڈٹے رہتے تو جوڑیا ونیاں اور دھاندلی لڑائی کے نام پر صوبوں میں

ہوئی ہیں اور کی گئی ہیں وہ نہ ہونے پاتیں۔ جو لوگ اس طرح کی باتیں کرتے ہیں وہ آئین اُس ترمیم کو بھول جاتے ہیں اور یہ بھی بھول جاتے ہیں کہ جہاں وزارتیں قائم رہی ہیں وہاں بھی مرکزی حکومت کی دھاندلی چلی ہے۔ بنگال کی وزارت اِس کا جیتا جاگتا ثبوت ہے وہاں وزارت کے بنانے اور توڑنے میں گورنر نے پورا ہاتھ بٹایا ہے۔ وہاں کے عوام لاکھوں کی تعداد میں دانے دانے کے لئے محتاج ہو کر مرے ہیں۔ وزارت نہ اُن وجوہ کو ہی دور کر سکی جن سے وہاں کا خطرناک قحط پیدا ہوا اور نہ قحط پڑ جانے پر عوام کی کچھ امداد ہی کر سکی۔ جب تک مرکزی حکومت نے اس میں ہاتھ نہیں لگا۔ سب مبینہ اختیارات کے رہتے ہوئے بھی نہ تو مسٹر فضل الحق کی وزارت اور نہ سر ناظم الدین کی ہی وزارت بنگال کو اِس مصیبت سے بچا سکی۔ اِسی سلسلہ میں پنجاب اور سندھ کی وزارتوں کی بے بسی بھی صاف ثابت ہو گئی۔ مرکزی حکومت نے اُن کو دبا کر اُن سے گرانی اور غلّہ کی برآمد کے متعلق کارروائی کرائی جب ہم صوبائی حکومت کے اختیارات کے بارے میں غور کرتے ہیں تو ہمیں اس سے مطلب نہیں ہے کہ وہ حکومت صحیح کام کر رہی تھی یا غلط۔ اگر اختیار رہے تو صحیح کرنے کا بھی اور غلط کرنے کا بھی۔ غلطی کرنے پر ہی یہ ٹھیک پتہ چلتا ہے کہ اختیار ہیں یا نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ جن معاملوں میں مرکزی حکومت نے اُن کو دبا دیا۔ اُس نے ٹھیک ہی دبایا اور وہ غلط کام کر رہی تھیں۔ مگر اِس سے یہ بات ثابت ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی کہ صوبائی حکومتوں کے اختیارات محدود ہیں اور جنگی آرڈیننس کے زمانے میں مرکزی حکومت اُن سے جو چاہے وہ کرا سکتی تھی۔ یاد رہے کہ یہ وزارتیں برٹش سرکار کی مدد کرنے کا دعویٰ برابر کرتی رہی ہیں اور مدد کرتی بھی رہی ہیں۔ پھر بھی مرکزی حکومت نے اُنہیں دباؤ دینے میں ذرا بھی تامل نہیں کیا۔ کانگریسی وزارتیں

اگر اپنی جگہ پر رہ گئی ہوتیں اور کانگریس کا برٹش سرکار کے ساتھ سمجھوتہ تسلی بخش ہوا ہوتا جیسا نہیں ہو سکا تو اس میں ذرا بھی شبہ کی گنجائش نہیں کہ اُن کو بہتیرے ایسے کاموں کے کرنے پر مجبور کر دیا جاتا جن کو نہ تو کانگریس اور نہ وہ خود پسند کرتے۔ ان کو مجبور ہو کر کچھ دنوں میں استعفٰے دینا پڑتا اور نہیں تو گورنر کی ہاں میں ہاں ملا کر اپنے خیالوں اور اصولوں کے خلاف اُن کی فرماں برداری کرنی ہی پڑتی۔

آج یہ قیاس اور بھی مضبوط ہو گیا ہے کہ ہم وزارت میں رہ کر ملک کو فائدہ پہنچانے میں بالکل ناطاقت تھے۔ ہم اپنے کو ملک کے لئے صرف مضرت کا وسیلہ ہی بنا سکتے تھے۔

اِن خیالات کے باوجود میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں اُن دنوں انگلستان کی ہار کو پسند کرتا۔ چاہے جن اسباب سے ہو، جرمنی کی فتح منظور نہیں تھی۔ اُس نے چیکوسلویکیہ کے ساتھ زیادتی کی تھی اور زیادتی بھی اِس لئے کہ وہ اُس کے مقابلہ میں کمزور تھا۔ جب جرمنی نے اُس ملک کے ساتھ زیادتی کی، تب دوسرے لوگ بھی کچھ نہ کچھ فائدہ اٹھانے کی طمع پر غلبہ نہ پا سکے۔ اُن میں ہنگری اور پولینڈ خاص تھے۔ اِس لئے جب جرمنی نے اُلٹے پولینڈ پر بھی زیادتی شروع کر دی تب دل میں کچھ ایسا ہی جذبہ اٹھتا تھا کہ ٹھیک ہی کیا۔ پولینڈ کے ساتھ چاہ کن را چاہ درپیش کا معاملہ ہوا۔ پھر جب اُس نے ہالینڈ، بلجیم، ڈنمارک اور ناروے پر بھی چڑھائی کر دی تو میرے دل پر اِس کا بہت اثر ہوا۔ مجھے معلوم ہونے لگا کہ کسی بھی کمزور ملک کو جرمنی آزاد نہیں رہنے دے گا۔ انگریزوں پر جو تھوڑا سا غصّہ تھا وہ کم ہو گیا اور مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ ہم کو برطانیہ کی مدد کرنی چاہیئے۔ جس سے وہ جرمنی کو ہرا سکے اور اِس غیر منصفانہ طاقت کو فی النار کر سکے۔ یہ جذبہ اتنا غالب ہو گیا

کہ میں نے ایک چھوٹے بیان میں اپنے محسوسات کو شائع بھی کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ بہتیرے دوسرے کانگریسی بھی اسی طرح سوچتے تھے۔ ہم برٹش گورنمنٹ کی خامیوں اور ہندوستان سے اُس کی بے انصافیوں کو یاد رکھتے ہوئے بھی جرمنی کی دھاندلی سے اتنے سراسیمہ ہو گئے کہ برٹش سامراج کی کرتوتوں کو تقریباً بھول سے گئے۔ اس لئے یہ کہنا، جیسا آج انگریز اور اُن کے بہتیرے پٹھو کہہ دیا کرتے ہیں کہ کانگریسی لوگ انگلستان کی کمزوری کو محسوس کر کے اپنے پُرانے بَیر کا بدلہ لینا اور اُس کی مصیبت سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ سراسر خلافِ حقیقت ہے۔ باوجود ہزار شکایتوں کے جنگ کی ابتدا کے وقت سے جولائی ۱۹۴۰ء تک جب بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں کانگریس کی طرف سے یہ کہا گیا کہ اگر برٹش سرکار ہندوستان کی آئندہ آزادی کا اعلان کر دے اور اُسے حکومت میں وقتی اختیار دیدے تو ہندوستان ایک رائے ہو کر لڑائی میں مدد کرے گا۔ تقریباً کسی بھی کانگریسی کے دل میں برٹش سرکار کے لئے تلخی نہیں تھی اور اُس وقت تک سبھی کانگریسی لوگ برٹش کی مدد کرنا اپنا فرض ہی سمجھتے تھے۔ ہاں اِس فرض کی ادائیگی کے لئے اختیار چاہتے تھے جس کے بغیر عوام کو حوصلہ دلانا ممکن نہیں تھا۔

بمبئی کی اِس نشست کے بعد جس کی وجہ سے گاندھی جی کو کانگریس سے علیحدگی اختیار کرنی پڑی اور ان کو الگ کر کے بھی ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بھی جنگ میں عملی امداد کا عہد کیا تھا۔ برٹش سرکار نے اِس تجویز کو اتنی جلد ٹھکرا دیا، تب بہتوں کے دلوں میں خفگی پیدا ہوئی اور وہ خفگی بھی مسٹر ایمری اور مسٹر چرچل کی باتوں سے روز بروز بڑھتی گئی ہے اس میں بھی شک نہیں کہ جتنے کم دام پر انگلستان اس وقت سودا کر سکتا تھا۔ اتنے پر شاید پھر کبھی نہ کر سکے گا۔ ہاں یہ دوسری بات ہے کہ اپنی حیوانی طاقت سے وہ ہندوستان کو

کچھ دنوں تک دبائے رکھے۔ اگر اُس وقت سمجھوتہ ہو گیا ہوتا تو شاید جاپان کو یہ یقین ہو جاتا کہ ہندوستان برٹش سرکار کے ساتھ ہر طرح سے دامے، درمے، سخنے، قدمے، ہے تو اس کی ہمت مشرقی ایشیا پر اِس طرح یکبارگی حملہ کرنے کی نہ ہوتی جس طرح ہوئی۔ اگر وہ ایسی ہمت کرتا بھی تو کون کہہ سکتا ہے کہ اُسے اتنی کامیابی ملتی جتنی ملی۔ ہندوستان کی آزادی کے ساتھ ساتھ برما کی آزادی کا معاملہ بھی طے ہو گیا ہوتا۔ اگر برما کی بات ہو گئی ہوتی تو ملایا اور سنگاپور کی یہ حالت نہ ہوتی جو ہوئی۔ اسی لئے میں مانتا ہوں کہ جتنی تنگ نظری برطانیہ نے اُس وقت دکھائی اُتنی اُس نے اپنی تاریخ میں ایک موقع کو چھوڑ کر کبھی نہیں کی۔ وہ موقع تھا جب اُس نے امریکہ کی نوآبادیوں کا مطالبہ اٹھارویں میں ٹھکرایا تھا۔ اس کا نتیجہ ان کے لئے اچھا نہیں ہوا۔ اگرچہ وہ دنیا کے لئے شاید اچھا ہی ہوا۔ ہو سکتا ہے کہ انگلستان کے لئے اب اس سے بھی برا ہو جو امریکہ میں ہوا اور دنیا کے لئے بھی اس سے زیادہ مفید۔ پروپیگنڈا کرکے چاہے کانگریس پر کچھ بھی الزام لگایا جائے سچائی کا تقاضہ یہی رہے گا کہ کانگریس نے ہر قدم پر اس بات کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان عزت اور کامیابی کے ساتھ با اختیار طریقہ پر برٹش سرکار اور جمہوری ملکوں کو مدد دینے کے قابل بنا دیا جائے۔ لیکن ہر قدم پر اُس کو صرف نفی میں جواب ہی نہیں ملا بلکہ ہمیشہ اس کی توہین بھی کی گئی۔ آخر اُکتا کر اُسے ۱۹۴۲ء کا وہ فیصلہ کرنا پڑا جس کا ذکر آگے آئے گا۔

جنگ شروع ہو جانے کے بعد کچھ وقت کے لئے یہ مبہم سا رہا کہ کانگریس کا اجلاس ہوگا کہ نہیں اور ہوگا تو کب ہوگا۔ کانگریس کا ضابطہ پھر بدل گیا تھا اور طے ہو گیا تھا کہ دسمبر میں ہی سالانہ اجلاس ہو۔ یہ واضح ہو گیا کہ اب دسمبر میں اجلاس نہ ہوگا۔ مگر تھوڑے دنوں میں یہ بھی صاف ہو گیا کہ اجلاس ضرور کرنا ہی چاہیئے۔ اِسی لئے اب فیصلہ ہوا

مارچ میں سالانہ اجلاس کیا جائے ۔ رام گڈھ میں اب پھر زوروں سے تیاری ہونے لگی ۔ میں وہاں بہت وقت نہیں دے سکا ۔ کیونکہ مجھ پر آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے کام کا بھی بار تھا ۔ مگر اب وہاں صرف شری امبکا کانت ہی نہیں رہ گئے ۔ وزارت کے استعفے کے بعد دوسرے لوگ بھی وہاں جانے کے بعد فرصت پا گئے ۔ خاص کر انوگرہ بابو، شری کرشن بلبھ سہائے اور شری رام نرائن سنگھ کی خدمات بھی حاصل ہو گئیں ۔ اسی لئے میں بڑی حد تک نچنت ہو گیا ۔

رام گڈھ کانگریس کا بارانی اجلاس

رام گڈھ میں لکڑی اور بانس کی کمی نہیں تھی - مزدور بھی کافی ملتے تھے۔ اس لئے جنگل صاف کر کے جھونپڑیاں بنوانے کا کام زوروں سے شروع ہوگیا - مگر شری رام داس گلاری بیمار ہو گئے - اب اُن کا وہاں رہنا دشوار ہوگیا۔ خوش قسمتی سے عین اُسی زمانے میں انجینرنگ کی اعلیٰ تعلیم پاکر ولایت سے شری رام جی پرشاد ورما واپس آگئے یہ لڑکپن ہی سے کانگریس کے ساتھ تھے ۱۹۳۰ء میں جیل گئے تھے وہاں بیدزنی کے شکار بھی ہوئے۔ پڑھنے میں تیز تھے اسی لئے کالج کے پرنسپل نے اُن کو پھر انجینرنگ کالج میں جہاں وہ پہلے پڑھ رہے تھے بھرتی کرلیا۔ وہاں سے اچھی طرح سے آخری امتحان میں کامیاب ہوکر انجینیر ہو گئے - کچھ دنوں تک اِدھر اُدھر کچھ رقم کما کر مزید تعلیم کے لئے انگلستان جانے کا اُن کا خیال ہوا - وہاں جاکر خوب اچھی طرح بڑے بڑے امتحان پاس کرلئے - عین ان کی وہاں سے روانگی کے وقت ہی لڑائی چھڑ گئی - مگر کسی طرح یہ ہندوستان پہنچ گئے۔ سے ہی رام گڈھ کے خاص انجینیر کا کام انہوں نے سنبھال لیا۔ رہنے کے لئے

جھونپڑی، کھلے اجلاس کے لئے پنڈال، اور سبجکٹس کمیٹی کے لئے بھی پنڈال بنوانے کے ماسوا نمائش گاہ کے لئے بھی جھونپڑے بنوائے تھے۔ پانی کا انتظام کرنا تھا روشنی کے لئے اہتمام کرنا تھا۔ ہر ایک بات کا بار کسی نہ کسی پر ڈالا گیا۔ مگر تشکیل کا سارا کام انجینیر کے کندھوں پر ہی رہا۔ وہ ٹھیک طریقہ سے وقت کے اندر پورا بھی ہوگیا۔

ہم نے جو جگہ کانگریس کے لئے منتخب کی تھی وہاں ایک دو چھوٹے موٹے کنویں تو تھے مگر اس قابل نہیں تھے کہ جتنے آدمی آئیں گے اُن میں سے سویں حصہ کے لئے بھی پورا پانی دے سکیں گے۔ دامودر ندی کے کنارے پر جگہ تھی مگر اس موسم میں دامودر ندی اکثر خشک سی رہتی ہے۔ وہی دامودر جو سیلاب آنے پر خطرناک صورت اختیار کر لیتی ہے اور بہار سے نکل کر بنگال میں خاص کر بردوان ضلع میں بڑی مصیبت اور آفت کا سبب بن جاتی ہے۔ رام گڈھ میں جاڑے اور گرمیوں میں ایک پتلی دھار کے ذریعے ہی، جسے آدمی بغیر دھوتی بھگوئے آسانی سے پار کر سکتا ہے، وہ اپنا وجود ظاہر کرتی رہتی ہے مگر اوپر کی دھار تو پتلی اور اُتھلی رہتی ہے پھر بھی ریت کے نیچے پانی کی مقدار کافی رہتی ہے اگر پانی نکالنے اور روکنے کا انتظام کیا جا سکے تو وہ سرچشمہ اٹوٹ ہوتا ہے۔ اسی لئے یہ فیصلہ کیا گیا کہ ندی سے پانی نکالنے کا اہتمام کیا جائے۔ کنویں کے ذریعہ بھی شاید یہ ہو سکتا تھا مگر پتھریلی پہاڑی ہونے کی وجہ سے یہ طے کرنا مشکل تھا کہ وہ کنواں کہاں کھدوایا جائے اور کھودنے پر بھی اُس میں کافی پانی ملے گا یا نہیں۔ ندی میں کنواں کھودنا آسان تھا اور بہت نزدیک پانی مل جاتا تھا اِسی لئے ندی میں

کنواں کھود کر پمپ لگایا گیا۔ پانی صاف کرنے کے لئے بڑی بڑی پختہ ٹنکیاں بنائی گئیں۔ جن میں بہ یک وقت ایک لاکھ آدمیوں کے لئے دو یا تین ضلعوں کے خرچ بھر کے لئے کافی پانی رہ سکے۔ سارے نگر میں پائپ لگا کر پانی پہنچانے کا اہتمام کیا گیا۔ اس انتظام کے لئے، گیا میونسپلٹی اور بھاگل پور میونسپلٹی کے واٹر ورکس کے ماہرینِ خصوصی انجنیروں نے اَن تھک محنت سے کام کیا۔ پانی کا انتظام ٹھیک ہوگیا۔ اُس میں صرف ایک خامی رہ گئی۔ وہ یہ تھی کہ کنویں ندی میں تھے اور ندی میں اچانک پانی آجانے پر کنویں اور پمپ دونوں بیکار ہو جا سکتے تھے۔ مگر یہ کون جانتا تھا کہ مارچ میں اتنی برسات ہوگی کہ دامودر میں سیلاب آجائے گا۔

پانی کے خیال سے اور زینت بڑھانے کے لئے بھی ہم نے ایک اور انتظام کیا۔ جہاں کانگریس نگر بسا تھا اُس کے پاس ہو کر ایک چھوٹی ندی ہُرہُری وہیں دامودر میں ملتی تھی۔ اُس ندی کو ہم لوگوں نے پختہ بند سے باندھ دیا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک طرف تیرنے کے قابل خوب گہرا پانی جمع ہوگیا اور دوسرے باندھ کی اونچائی پر سے جو پانی بہتا وہ ایک چھوٹے جھرنے کی نظارگی کے ساتھ ساتھ نہانے والوں کے لئے ایک تفریح کی چیز بھی ہوگیا۔

اِرادہ تو تھا کہ گاؤں کی کانگریس میں جہاں تک ہوسکے گاؤں کی چیزوں کا ہی استعمال کیا جائے۔ مگر ایسا نہ ہوسکا۔ اِس ضابطہ کی خلاف ورزی سب سے پہلے واٹر ورکس کے ذریعہ ہوئی۔ اب رہ گئی روشنی کی بات۔ اس کے لئے یا تو بجلی کا انتظام کیا جائے یا گیس بتیوں کا۔ دونوں میں سے ایک بھی دیہات کی چیز نہیں۔ تیل مشعلوں، پنچ شاخوں اور گیندوں سے کام چلانا مشکل معلوم ہوا۔ ہم نے حتیٰ الوسع

کوشش کی کہ کوئی ایسا ہی اہتمام کیا جائے مگر ہو نہ سکا۔ آخر میں بجلی کا ہی آسرا لینا پڑا۔ اِس میں ایک سہولت بھی دفعتہً بے سعی مل گئی۔ گیا کاٹن ملز کے مالکوں نے ٹھیک اِسی زمانے میں نیا انجن اور ڈائنمو وغیرہ منگایا تھا۔ انھوں نے اُن سب چیزوں کو بندھا بندھایا اور لدا لدایا پارسل گیا میں نہ کھول کر اپنے انجنیئر کے ساتھ سیدھے رام گڈھ بھیج دیا۔ کام آسان ہوگیا۔ بجلی لگ گئی۔

نمائش کا کام مشکل ہوا کرتا ہے کیونکہ اس میں بہت چیزیں جمع کرنی پڑتی ہیں۔ چرخہ سنگھ کے سکریٹری شری لکشمی نرائن نے اِس کا بار اٹھایا۔ اُنہوں نے آل انڈیا چرخہ سنگھ اور گرام اُدیوگ سنگھ کی مدد سے خاصا انتظام کرلیا۔ ہاں انہوں نے اصولاً نمائش کے احاطہ کے اندر بجلی نہیں آنے دی۔ کیونکہ نمائش سراسر دیہاتی صنعتوں پر ہی منحصر تھی۔

کچھ دوستوں کا خیال تھا کہ آنے والے ڈیلیگیٹوں کے لئے بہار کی ایک تاریخ ہندی میں تیار کردی جائے۔ مجھے یہ بات پسند آئی۔ ترپوری میں بھی اس طرح کی تاریخ تیار ہوئی تھی۔ بہار کی تاریخ تو عظیم ہے۔ یہ کام شری جے چند ودیا لنکار کے سپرد کیا گیا۔ اُس کے چھاپنے کا بار لہریا سرائے کے شری رام لوچن شرن بہاری نے لیا۔ تاریخ چھپ کر تیار ہوگئی۔

بہار میں کچھ ہونہار مصوّر تیار ہو رہے ہیں۔ سب کی خواہش ہوئی اور میری بھی رائے ہوئی کہ بہار کی تاریخ میں کچھ عظیم واقعات مُصوّر شکل میں دکھلائے جائیں۔ اِس کام کو بزرگ مشّاق ماہرِ فن بابو ایشوری پرشاد ورما کی رہنمائی کا فخر ملا۔ وہ کلکتہ آرٹس اسکول کے وائس پرنسپل تھے۔ اب وہ وہاں سے پنشن پاکر اپنی زاد بوم

پٹنہ میں رہ رہے تھے۔ کچھ خوبصورت متنوع تصویریں بنائی گئیں اور نمائش میں رکھی گئیں اُن کی نقلیں ایک کتابی صورت میں شائع کی گئیں۔ اِن کتابوں میں مصوّر مناظر کی تاریخ تفصیل سے دے دی گئی۔ یہ کتابیں لوگوں کو پسند آئیں۔ تصویریں لوگوں نے بہت اشتیاق سے دیکھیں۔

کانگریس کا اہتمام بہت بڑے پیمانہ پر جیسا ہوا کرتا تھا کیا گیا۔ مولانا ابوالکلام آزاد تقریباً اتفاق رائے سے صدر چُنے گئے۔ تقریباً اتفاقِ رائے سے اس لئے کہا کہ شری مہندر ناتھ رائے (مسٹر ایم این رائے) بھی امیدوار تھے مگر اُنہیں بہت تھوڑے ووٹ ملے۔ زبردست اکثریت مولانا کے حق میں تھی۔

کانگریس کے اجلاس سے کچھ پہلے ہی پٹنہ میں ورکنگ کمیٹی کی نشست حسبِ معمول کی گئی۔ اِس نشست کے بعد ہی میں رام گڈھ کے لئے روانہ ہوگیا۔ مجھے لوگوں نے استقبالیہ کمیٹی کا صدر چن لیا تھا۔ راستہ میں نالدہ میں اُتر گیا۔ وہاں کی کھدائی سے نکلی ہوئی عمارتوں اور میوزیم میں جمع کی ہوئی چیزوں کو دیکھنے کا موقع ملا۔ مجھے دیکھ کر تعجّب ہی نہیں ہوا۔ بہار کی عظمتِ ماضی کے لئے عقیدت اور بھی بڑھ گئی۔ نالدہ سے کچھ آگے بڑھ کر کچھ تو آرام کرنے کے لئے اور کچھ استقبالیہ تقریر تیار کرنے کے لئے رجیلی ڈاک بنگلہ پر میں دو دن کے لئے ٹھہر گیا۔ جگہ بھی اپنے لئے موزوں مل گئی۔ تھوڑی ہی دور پر جنگل اور پہاڑ اِس مقام کی رونق بڑھاتے ہیں۔ ہم لوگوں کے دوست اور پرانے کانگریسی شری گوری شنکر شرن سنگھ کا گھر اُسی گاؤں میں ہے اِسی لئے بغیر تردّد اور فکر کے وہاں عزلت نشین ہو کر تقریر لکھنے میں سہولت ہوئی۔ تقریر میں میں نے کہا کہ

تاریخ پر تھوڑی سی طائرانہ نظر ڈالی تھی ۔ حالات و مسائل حاضرہ کے سلجھانے اور ان پر رائے ظاہر کرنے کی کوشش میں نے جان بوجھ کر چھوڑ دی تھی ۔

رام گڈھ پہنچ کر تیاری میں جو کمی تھی اُس کو پورا کرنے میں ہی دن رات لگا رہا ۔ مہاتما جی وقت سے پہنچ گئے ۔ اُنہیں نمائش کا افتتاح کرنا تھا اِس لئے وہ کچھ پہلے ہی آ ئے ۔ اُن کے پہنچنے کے ایک دن پہلے بہت پانی برس گیا ۔ کچھ آندھی سی آ گئی ۔ نمائش کے کام میں کچھ خلل پڑا ۔ مگر بات سنبھال لی گئی ۔ مہاتما جی نے وقت پر افتتاح کر دیا ۔ اُمید کی جاتی تھی کہ اب اِس برسات کے بعد آسمان صاف رہے گا اور جو کچھ ہونا تھا ہو چکا مگر ہونا کچھ اور ہی تھا ۔

ٹہر ہری اور دامودر کے کنارے لیڈروں کے لئے جھونپڑے بنے تھے جن میں سے ایک میں مہاتما جی دوسرے میں صدر کانگریس اور باقی جھونپڑوں میں اور لوگ ٹھیرائے جانے والے تھے ۔ جھونپڑوں کی بناوٹ اچھی اور خوبصورت تھی ۔ بانس کی چٹائی کی دیوار ، جھانکڑوں کی چھت اور ساکھو کی لکڑی کے کھمبے اِسی درمیان سبھی جھونپڑوں کی تعمیر کی گئی ۔ چاہے وہ ٹھیرنے کے لئے ہوں یا نمائش کے لئے یا کمیٹی کی نشست کے لئے ۔ درمیان میں اچھی چوڑی سڑک بنائی گئی تھی بیچ بیچ میں ضرورت کے مطابق گلیاں بنی تھیں ۔

یہ جگہ پٹنہ اور رانچی کے راستے میں ہی تھی ۔ اس میں دامودر ندی پر ایک بڑا پل بنا ہوا ہے ۔ پل اور سڑک سے نگر کی رونق خوب نظر آتی تھی ۔ سڑک برابر چلتی رہتی ہے ۔ اُس وقت تو اور بھی زیادہ چلتی تھی ۔ وہاں ریل کے دو اسٹیشن ہیں ۔ ایک بی این آر (بنگال نادرن ریلوے) کا اسٹیشن رام گڈھ ، نگر سے

آدھے میل دکھن کی طرف، دوسرا اسٹیشن ای آئی آر (ایسٹ انڈین ریلوے) کا رانچی روڈ جو وہاں سے تقریباً چار میل اُتّر کی طرف تھا۔ دونوں ریلوے کے افسروں نے مجمع کی سہولت کے لئے اسٹیشنوں پر کافی انتظام کیا تھا۔ مہاتماجی رام گڈھ اسٹیشن پر اُترے۔ اور صدر صاحب رانچی روڈ اسٹیشن پر۔ بڑے جلوس کے ساتھ صدر صاحب کانگریس نگر میں پہنچائے گئے۔ نگر کا نام مولانا مظہر الحق مرحوم کے نام پر رکھا گیا تھا ایک خاص پھاٹک دیپ نارائن سنگھ مرحوم کے نام پر تھا۔

آل انڈیا کانگریس کمیٹی اور سبجکٹس کمیٹی کی نشستیں دو تین دن پہلے شروع ہوئیں۔ اُنہوں نے اپنا کام کانگریس کے کھلے اجلاس کے دن تقریباً مکمل کرلیا تھا۔ اجتماع ہو چکا تھا۔ پنڈال بہت خوبصورت تھا۔ اسے قدرت نے ہی خوبصورت بنایا تھا۔ ہمارا کام تو مقام منتخب کرکے زمین ہموار کر دینا۔ لیڈروں کا اسٹیج یعنی پلیٹ فارم بنوا دینا، روشنی لگا دینا اور چاروں طرف احاطہ کر دینا۔ پنڈال کے پاس ہی گھنا جنگل تقریباً دونوں طرف تھا۔ جنگل تھا پہاڑ پر، اسی لئے وہاں سے دو اور خوبصورت اُبھرتے ہوئے پہاڑ اور جنگل تا حدِ نظر دکھائی دیتے تھے۔ دوسری طرف کانگریس کے ڈیلیگیٹوں کی قیام گاہیں وغیرہ دور تک پھیلی ہوئی تھیں۔ جو رات کے وقت روشنی سے جگمگانے لگتی تھیں۔ پلیٹ فارم سب میں نیچا تھا اور ڈیلیگیٹوں اور وزیٹروں کے بیٹھنے کی جگہیں قدرتاً گیلری جیسی بنی تھیں۔ چاہے کوئی بھی وزیٹر کتنی ہی دور پر کیوں نہ ہو وہ اسٹیج پر بیٹھے صدر اور دوسرے لیڈروں کو خوب دیکھ سکتا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر کی وجہ سے ان کی باتیں سننے میں کوئی دشواری تو تھی ہی نہیں۔

کانگریس کے اجلاس کا دن آگیا۔ وزٹیروں کے ٹکٹ دھڑا دھڑ بک رہے تھے۔ شاید ایک گھنٹہ میں چھ سات ہزار یا اُس سے بھی زیادہ آمدنی ہو رہی تھی۔ اجلاس شام کو پانچ چھ بجے سے ہونے والا تھا۔ میں صدر صاحب کو لانے کے لئے چلا گیا۔ پنڈال کے احاطہ میں ایک سایہ دار جھونپڑا کچھ دور پر بنا تھا۔ جہاں سے خاص لیڈروں کو صدر کے ساتھ جلوس بنا کر لے جانے کا انتظام تھا۔ کچھ لوگ وہاں تک پہنچ گئے۔ کچھ لوگ آہی رہے تھے۔ اتنے میں اچانک آسمان کے ایک گوشہ میں بادل اُمنڈ آئے اور پانی برسنا شروع ہو گیا صدر صاحب اس جھونپڑے تک پہنچ گئے تھے۔ مگر ابھی جلوس نہیں نکلا تھا۔ پانی پڑنے لگا۔ چند منٹوں کے اندر اتنے زور کی موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ کہ نیچے کی زمین پانی سے بھر گئی۔ سبھی وزٹیر اور ڈیلیگیٹ اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہے اور بھیگتے رہے۔ اِس امید میں کہ اب پانی رُک جائے گا۔ اور اجلاس ہو سکے گا۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔ بارش کا زور بڑھتا ہی گیا۔ آخر پلیٹ فارم کے پاس نیچے کی زمین میں اتنا پانی بھر گیا کہ وہاں لوگوں کا کھڑا رہنا بھی مشکل ہو گیا۔ لاوڈ اسپیکر کا سارا انتظام اسی جگہ تھا۔ اسی لئے وہ بالکل بیکار ہو گیا۔ آخر اِسی بارش میں صدر صاحب اسٹیج پر گئے۔ میں بھی ساتھ گیا۔ میں نے دو چار لفظوں میں استقبال کر دیا۔ ایڈریس پڑھنے کا نہ کوئی موقع تھا نہ کوئی ضرورت اور نہ کوئی اسے سُن ہی سکتا تھا صدر صاحب نے دو چار لفظ کہہ کر اُس دن کا اجلاس ختم کر دیا۔ جن لوگوں نے مہینوں سے دن رات محنت کر کے اِس مبارک دن کی تیاریاں کی تھیں۔ وہ لوگ بہت مایوس ہوئے مگر کیا ہی کہا جا سکتا تھا۔ اب دیکھنا یہ تھا کہ ڈیلیگیٹوں کے رہنے کی جگہ کا کیا حال ہے یہ امر موجبِ تسلی تھا کہ جھونپڑیاں اس موسلا دھار

بارش کو بھی برداشت کر گئیں۔ ڈیلیگیٹ ان میں رات کو پانی برستے رہنے پر بھی سو سکے۔ ان کو پریشانی تو ضرور ہوئی مگر میں سمجھتا ہوں کہ ہم لوگوں کے ساتھ سب کی ہمدردی رہی۔ کسی کو اس سے یا ہمارے انتظام کے نقص سے رنج نہیں ہوا۔

دوسرے دن پانی نہیں برسا۔ اگرچہ کچھ بوندا باندی ہوتی رہی۔ جھنڈے کی سلامی کے لئے کھلے میدان میں ایک فارم بنایا گیا تھا جو پکا سمنٹ کا تھا۔ اس کے سر پر اشوک کی لاٹ کی طرح شیروں کی تصویر تھی۔ اسی کے چاروں طرف لوگ جمع ہو گئے۔ کانگریس کا اجلاس وہیں کیا گیا۔ پنڈال میں پانی جمع ہو جانے کی وجہ سے بیٹھنا یا کھڑا ہونا بھی غیر ممکن تھا۔ اس کھلے میدان میں ستون والے چبوترے پر صدر صاحب، مہاتما جی اور کچھ دوسرے خاص آدمی بیٹھے۔ اور سب لوگ چاروں طرف زمین پر بیٹھ گئے۔ جو تجویزیں سبجکٹس کمیٹی نے پیش کی تھیں وہ باضابطہ پیش ہوئیں۔ پوری بحث کے بعد وہ منظور ہوئیں۔ جو کچھ باضابطہ اجلاس میں ہونا وہ سب کیا گیا۔ مگر کچھ کم پیمانہ پر، کیونکہ ہمیشہ آسمان کا ڈر لگا رہتا تھا۔ کہ کہیں پھر پانی نہ برسنے لگے۔ مہاتما جی کی تقریر ہوئی۔ آخر میں نے سب لوگوں سے دِقّتوں کے لئے معافی مانگتے ہوئے عرض کیا کہ وہ لوگ اپنے مقامات کو چلے جائیں کیونکہ ندی میں باڑھ آجانے کی وجہ سے ہمارا واٹر ورکس کا انتظام بے کار ہو گیا تھا۔ لوگوں کو اب ندی کے گندے پانی پر بھروسہ کرنا پڑے گا۔ ہمارے خزانے میں اب چوبیس گھنٹہ سے زیادہ کے لئے پانی نہیں رہ گیا تھا۔ لوگوں نے بات مان لی۔ اجلاس ختم ہوتے ہی لوگ مختلف مقاموں کے لئے روانہ ہو گئے۔

اسی رات کی گاڑی سے صدر صاحب اور دوسرے خاص لیڈر بھی مختلف مقاموں کے لئے روانہ ہو گئے۔

رام گڈھ کانگریس کا فیصلہ بھی اہمیت رکھتا ہے۔ آغازِ جنگ سے جو پالیسی ورکنگ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے کانگریس کی طرف سے اختیار کی تھی۔ کانگریس نے اس کی تائید کر دی۔ ساتھ ہی یہ بھی صاف صاف کہہ دیا کہ مستقبل میں آزادی کے لئے بھی ہمیں کچھ کرنا پڑے گا۔ اس کے لئے ابھی سے تعمیری کام کو زوروں سے چلا کر لوگوں کو تیار کیا جائے۔

رام گڈھ کانگریس کے وقت رام گڈھ میں ہی ایک دوسرا بڑا جلسہ بھی ہوا۔ اس کا نام تھا جلسہ مخالف مصالحت

اس کے لیڈر تھے شری سبھاش چندر بوس۔ اس صوبہ کے منتظموں میں خاص تھے۔ شری سوامی سہجانند سرسوتی اور شری دھن راج شرما۔ جب سے سبھاش بابو سے اختلاف ہو گیا تھا۔ انھوں نے ایک دوسری پارٹی قائم کر لی تھی۔ جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ وہ لوگ کانگریس کی انتظامیہ کمیٹی کے خلاف یہی پروپیگنڈا کر رہے تھے کہ وہ برٹش سرکار کے ساتھ سمجھوتہ کرنے پر تلی ہوئی ہے اور ملک کو نقصان پہنچا کر بھی سمجھوتہ کر لے گی۔ اس پارٹی میں بہت قسم کے لوگ شریک تھے جن میں کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو سبھاش بابو کی رائے اور خیالات سے کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے مگر جو کانگریس ورکنگ کمیٹی سے خفا تھے وہ یہ اچھا موقع دیکھ کر مخالفت میں لگ گئے۔ کانگریس نہ سمجھوتہ سے کچھ ڈرتی تھی اور نہ اس کے لئے ملک کو

نقصان پہنچانا چاہتی تھی۔ اگر اُس میں کسی قسم کی بیتابی تھی تو صرف اِتنی ہی کہ ملک کا فائدہ ہو۔ یہ کانفرنس بھی اچھے ٹھاٹھ سے ہوئی۔ اُس میں اور کانگریس کے اجلاس میں یہ فرق رہا کہ اُس کا جلسہ کانگرس کے پہلے ہونے کی وجہ سے برسات شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو چکا تھا۔

بہار کی تین اہم کمیٹیاں

رام گڈھ کے فیصلہ کے مطابق ہم لوگوں کو تعمیری کام پر زور دینا ضروری تھا اِس لئے وہاں کا کام ختم ہوتے ہی ہم نے سوچ لیا کہ اپنے صوبہ میں اِس کا انتظام کرنا چاہیئے۔ مہاتما جی کی ہدایت کے مطابق ہمارے سبھی والنٹیروں کو چرخہ چلانے وغیرہ کی تعلیم لے لینی چاہیئے۔ اور منضبط زندگی بسر کرنے کا بھی سبق سیکھ لینا چاہیئے۔ اس لئے ہم نے طے کر لیا کہ ایک کیمپ کھولا جائے جس میں صوبہ بھر کے خاص خاص آدمی اگر کم از کم ایک ہفتہ ساتھ رہیں۔ جو چرخہ چلانا وغیرہ پوری طرح نہ جانتے ہوں اُن کو اس کی تعلیم مل جائے۔ اور روزانہ تبادلۂ خیالات کر کے اپنے خیالات بھی غیر مبہم اور مستقل بنا لئے جائیں۔ اور ساتھ ہی ساتھ کیمپ کی زندگی میں جو اتحاد اور مساوات کا سبق ملتا ہے وہ بھی لے لیا جائے۔ ہم نے اِس کے لئے سون پور کا مقام چن لیا۔ وہ تاریخ مقرر کر دی گئی جس دن یہ کیمپ کھولا جانا تھا۔ وہاں کے لوگوں کو اس سے اطمینان بھی ہوا۔ کیونکہ وہ کانگریس سے پہلے ہی امید کرتے تھے۔ کہ اجلاس یہیں ہوگا۔ وہ تو نہ ہوا مگر کیمپ سے ہی اُن کو کچھ اطمینان ہو گیا۔

میں سمجھ گیا تھا کہ چار و ناچار کچھ نہ کچھ کرنا ہی پڑے گا۔ اس لئے اپنے ہاتھ کے کاموں کو جلد سے جلد ختم کر کے چھٹی پالینا ضروری سمجھتا تھا۔ کانگریسی وزارت نے تین بڑے کاموں میں مجھے لگا دیا تھا۔ بہار مزدور جانچ کمیٹی مقرر کر کے اُس کے ذمہ بہار کے مزدوروں کی حالت جانچنے اور اس کے متعلق سفارشیں کرنے کا بار سپرد کر دیا تھا۔ میں ہی اُس کمیٹی کا فردِ خاص تھا۔ وزیر تعلیم ڈاکٹر محمود کے بہت زور لگانے سے پٹنہ یونیورسٹی میں پھر سینیٹ کا ممبر ہونا پڑا۔ جس سے میں نومبر ۱۹۳۰ء میں ہی الگ ہو گیا تھا۔ اِس کا کچھ ذکر پہلے بھی آ چکا ہے۔ سینیٹ میں تعلیم کی اصلاح کی تجویز پیش کرتے وقت موجودہ طرزِ تعلیم پر شدید نکتہ چینی کرتے ہوئے میں نے بتایا تھا کہ ہم صوبہ میں خاص کر تعلیم میں کس طرح پچھڑے ہوئے ہوئے ہیں۔ کچھ قانون داں اور کلرکی پیشہ والوں اور ڈاکٹروں کو چھوڑ کر ہم اور کسی طرح کے لوگوں کو تیار نہیں کر رہے ہیں اور نہ کسی معاملہ میں کوئی نئی دریافت کر کے اپنی ذکاوت کا ہی ثبوت پیش کرتے ہیں۔ زرعی صوبہ ہونے پر بھی یہاں علم نباتات کی تعلیم اور زراعت کی تعلیم کی کوئی ترجیح یا تنظیم نہیں ہے

دھات کی چیزوں میں ہندوستان میں سب سے زیادہ مالدار ہونے پر بھی اس صوبہ کے لوگوں کو نہ تو اس کے متعلق تعلیم کی کوئی خاص سہولت حاصل ہے نہ اُن چیزوں سے فائدہ اٹھانے کا کوئی حوصلہ ہی دیا جاتا ہے۔ خیر قرارداد منظور ہوئی اور سرکار نے کمیٹی بھی بنا دی جس کا پورا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے۔ ایک تیسری ہندوستانی کمیٹی بھی میری صدارت میں تھی مگر میں نے اپنے ہاتھ میں بہت کام ہونے کی وجہ سے اُس سے استعفیٰ دیدیا تھا۔ اور مولانا ابوالکلام آزاد اُس کے صدر بنائے

گئے تھے۔ اس کا بھی ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اِن تین کمیٹیوں کے کام کو پورا کر دینا ضروری تھا۔ تعلیمی کمیٹی کے فرد خاص، بمبئی کے ماہرِ اقتصادیات اور ماہرِ تعلیمات مسٹر کے ٹی شاہ بہت ہی محنتی اور ذی فہم انسان ہیں۔ اور اُنھوں نے ہی اِس کے کام کو سنبھالا اگرچہ مجھے بھی کافی محنت کرنی پڑی۔ مگر اُن کے اور دوسرے ممبروں کے تعاون سے محنت تقسیم ہو جانے کی وجہ سے میں نے اتنا زیادہ محسوس نہیں کیا۔ تعلیمی کمیٹی کی رپورٹ تین حصّوں میں تیار کی گئی۔ پہلے حصہ میں ابتدائی تعلیم کے متعلق سفارشیں کی گئیں۔ ہماری خاص سفارش واردھا کی تعلیمی اسکیم سے ملتی جلتی تھی۔ یا یوں کہیں کہ واردھا اسکیم کی بنیاد ہی پر مبنی تھی۔ تو مبالغہ نہ ہوگا۔ ایسا ہونا قدرتی بھی تھا کیونکہ واردھا اسکیم گاندھی جی کے اپنے دماغ کی اپج ہی کیوں نہ ہو مگر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ موجودہ ترقی پسند علم الدرسیات اُسی کی تائید کرتا ہے۔ تعلیم کے ماہروں میں ڈاکٹر ذاکر حسین، پروفیسر سیدین اور مسٹر کے ٹی شاہ اُس کے خاص اصول کے حامی تھے اور جب یورپ و امریکہ کے ماہرین تعلیم بھی اسی اصول کے حامی ہیں تو کوئی وجہ نہیں تھی کہ کمیٹی کے دوسرے ممبر اُسے منظور نہ کریں۔ مجھے یہ جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ گاندھی جی کی یہ اسکیم سب کے ذریعہ منظور ہو سکی۔ صرف ایک معاملہ میں میرا اختلاف رہا۔ میں گاندھی جی کے ساتھ اِس بات کو بھی مانتا تھا کہ ہندوستان جیسے غریب ملک میں طلباء کے ہنر اور فن سے جو کچھ اسکولوں میں ہم پیدا کر سکیں گے وہ اِتنا کافی ہوگا کہ اس کی آمدنی سے ہی پورا نہیں تو زیادہ تر خرچ نکل آئے گا۔ دوسرے ممبر اتنا ماننے کو تیار نہیں تھے۔ کچھ کا تو یہ بھی خیال تھا کہ اگر ہم آمدنی پر نظر رکھیں گے تو اُن فنون کی طرف سے خیال بٹ کر آمدنی پر ہی مرکوز ہو جائے گا اور تعلیم سے بچّوں کو

خاطر خواہ فائدہ نہیں پہنچ سکے گا۔ بہرحال اِس بارے میں جو اختلاف تھا اُسے بھی ہم نے اِس طرح مٹا دیا کہ اگرچہ آمدنی حاصل کرنا ہمارا مقصدِ خاص نہیں ہے۔ ہنروں کا سیکھنا تعلیم کے لئے ہی ہوگا نہ کہ آمدنی کے لئے۔ دوسرا حصہ اسکولی تعلیم سے تعلق رکھتا تھا اور تیسرا یونیورسٹی کی اعلیٰ تعلیم کے ساتھ۔ تینوں حصّوں کو تیار کرنے کے لئے الگ سب کمیٹیاں بنا دی گئی تھیں۔ جن میں سے ابتدائی تعلیم اور یونیورسٹی کی تعلیم سے تعلق رکھنے والی سب کمیٹیوں کا ممبر میں تھا۔ سب کمیٹیوں کی رپورٹ بڑی کمیٹی کے سامنے پیش ہوکر منظور ہو جانے پر سرکار کے پاس بھیج دی گئی۔

مسٹر شاہ سے میری پہلے کی بہت ملاقات نہیں تھی۔ اِس سلسلہ میں اُن کو زیادہ جاننے کی خوش قسمتی ملی۔ اُن کی علمیت، جانفشانی اور نیک دلی سے طبیعت خوش ہوگئی۔ اِسی طرح ڈاکٹر ذاکر حسین اور پروفیسر سیّدین سے (خاص کر ڈاکٹر سیّدین سے) اِسی معاملہ کو لے کر گہری ملاقات ہوئی۔ ڈاکٹر ذاکر حسین سے ملنے کے اور موقعے ملتے رہے ہیں۔ اِن دونوں کے لئے بھی محبت اور عزت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ ڈاکٹر سچدانند کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے وہ میرے طالب علمی کے زمانے سے ہی میرے سرپرست سے رہے ہیں۔ انہوں نے مجھے ہمیشہ چھوٹے بھائی کی طرح پیار کیا۔ اور شفقت رکھی سیاسی معاملوں میں ہزار اختلاف ہونے پر بھی اُن کی اِس محبت آمیز شفقت میں میں نے کچھ بھی فرق نہیں آنے دیا۔ اِس کمیٹی میں ایک ساتھ کام کرنے سے بھی ہم دونوں میں اور زیادہ کیا ہو سکتا تھا۔ یہی بات شری بدری ناتھ ورما

کے ساتھ بھی ہے ۔ اگر ڈاکٹر سنہا بڑے بھائی کی طرح رہے ہیں تو شری ورما چھوٹے بھائی کی طرح ۔ اُن سے سیاسی سوالوں پر بھی کوئی اختلاف نہیں ہوا ہے اُن ۔ سے بھی صرف اِسی کام کی بنا پر کوئی خاص ملاقات کی بات نہیں تھی ۔ ڈاکٹر امرناتھ جھا سے اِس کمیٹی میں کم ہی کام پڑا ۔ کمیٹی کے سکریٹری شری بھوناتھ مُکرجی میرے پرانے واقف کار تھے ۔ جب میں کچھ دنوں کے لئے مظفرپور کے بھومی ہار کالج میں پروفیسر تھا تب وہ وہاں طالب علم تھے ۔ میں نے بھی اُنہیں کچھ پڑھایا تھا ۔ اب بھی وہ میرے لئے وہی جذبہ رکھتے ہیں جس کا بہت کچھ اظہار کمیٹی کے کاموں سے ہوا ۔ بالآخر اِس کمیٹی کا کام ختم ہوگیا ۔

مزدور کام کمیٹی کا کام ابھی پورا نہیں ہوا تھا ۔ اُس کے متعلق کمیٹی کے ممبروں کو تقریباً اُن سبھی جگہوں میں جانا پڑا تھا جہاں بڑے بڑے کارخانے ہیں اور جہاں بہت مزدور کام کرتے ہیں اگر غور کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ جتنی قسم کے اور جس پیمانہ کے گوناگوں کام اس صوبہ کے مزدور کرتے ہیں اُتنے شاید ہی کسی دوسرے صوبہ میں کرتے ہوں ۔ کھیتی ہار مزدوروں کی بات الگ ہے ۔ وہ اس کمیٹی کے باہر رکھے گئے تھے ۔ اِس کمیٹی کو صرف کارخانوں کے مزدوروں کی حالت کو جانچ کرنے کا اختیار دیا گیا تھا ۔ مگر کارخانے بھی بہت قسم کے ہیں ۔ شمالی بہار میں ایکھ سے چینی بنانے کے کارخانے خاص کر کسی شہر میں یا اُس کے آس پاس ہوتے ہیں یا مزدوروں کے اجتماع کی وجہ سے خود شہر بنا لیتے ہیں ۔ یا کارخانوں کے ساتھ ساتھ بڑھتے اور ترقی کرتے جاتے ہیں ۔ کیونکہ دیکھا دیکھی اور کچھ سہولتوں کے حصول کی وجہ سے ایک بڑے کارخانے کے

کھلتے ہی بے شمار کارخانے اس مقام پر کھل جاتے ہیں۔ مگر شکر کے کارخانے اِس سے بالکل مختلف الگ الگ گاؤں میں ہوتے ہیں کیونکہ اُن کو ایکھ سے کام چلانا پڑتا ہے اور وہ چھوٹے دائرے میں پیدا نہیں کی جاسکتی۔ اور نہ بہت دُور سے لائی جاسکتی ہے اِس لئے کارخانے کو کچّے مال کے پاس جانا پڑتا ہے یعنی اُسی جگہ کارخانہ قائم کرنا پڑتا ہے جہاں کچّا مال پیدا ہوسکتا ہے۔ کیونکہ وہ بہت دن ٹھیر نہیں سکتا اور بہت دور سے ڈھو کر لایا نہیں جاسکتا۔ کارخانہ بھی سال بھر نہیں چلتا، تقریباً چار پانچ مہینوں تک ہی چلتا ہے۔ گاؤں میں کارخانہ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر مزدور اپنے گاؤں میں جاکر ہی کام کرتے ہیں اور چھُٹّی کے وقت اپنے گھر چلے جاتے ہیں۔ یہ ہوئی ایک قسم۔ دوسری قسم بہار کے کوئلہ کی کارخانوں میں پائی جاتی ہے وہاں کا کام سال بھر چلتا ہے۔ بہتیرے مزدور کچھ دور سے آکر کارخانوں کے نزدیک ہی جھونپڑوں میں رہتے ہیں۔ جو کانوں کے مالک اُن کے لئے بنواتے ہیں۔ یہ کام بھی کچھ پھیلا ہوا ہے۔ اگرچہ یہ پھیلاؤ ایکھ کی کھیتی کے مقابلہ میں نہ ہونے کے برابر ہے۔ تیسری قسم جمشید پور کے بڑے کارخانہ میں پائی جاتی ہے اِس میں تقریباً سبھی صوبوں کے لوگ کام کرتے ہیں جو وہیں رہتے ہیں۔ یہاں ان کی سہولتوں کے لئے کمپنی کی طرف سے انتظام ہے۔ صوبہ کے دوسرے حصّوں میں کچھ اور بھی کارخانے ہیں جو طرح طرح کی چیزیں بناتے ہیں۔ جیسے لوہا اور لاکھ، کپڑا اور جوٹ بُننے کے، چاول اور تیل وغیرہ کے۔ ابرق کی کانیں اور کارخانے بھی بہت ہیں۔ دوسری دھاتوں کی بھی کانیں ہیں۔ اِن سب قسم کے کارخانوں کے مزدوروں کی حالت جاننے اور جانچنے کے لئے بھی قسم کے

کارخانوں اور کانوں کو کمیٹی کے ممبروں نے جاکر دیکھا۔ مزدوروں اور سرمایہ داروں کی باتیں سُنیں۔ اوران کے بیان لئے۔ میں ایکھ کے اور کچھ دوسری قسم کے کارخانوں کو چھوڑ کر کمیٹی کے ممبروں کے ساتھ تقریباً سب ہی جگہوں میں گیا۔ بیانوں اور اظہاروں کے لینے میں شریک ہوا۔ رپورٹ پر بہت باتیں بھی ہو چکی تھیں۔ یہ کام ختم کر کے کمیٹی کی رپورٹ لکھنے کا بار کمیٹی کے سکریٹری پروفیسر راجندر کشور کو دیا گیا تھا۔ اُنھوں نے اُسے تیار کیا تھا۔ مگر اُس پر کمیٹی نے بیٹھ کر ابھی تک غور نہیں کیا تھا۔ رام گڈھ کانگریس کے ختم ہوتے ہی اِس کام کو پورا کر دینے کا فیصلہ میں نے کر لیا تھا۔ اِس لئے کمیٹی کی نشست کانگریس کے اجلاس کے تین چار دن بعد ہی مقرر کر دی گئی تھی۔ رام گڈھ سے میں پٹنہ آیا اور اِس کمیٹی کے کام میں لگ گیا۔

کمیٹی کی نشست تقریباً چودہ پندرہ دنوں تک ہوتی رہی۔ صبح ساڑھے سات بجے سے ایک بجے تک اور پھر ڈھائی بجے سہ پہر سے شام کو ساڑھے آٹھ بجے تک روزانہ ہم بیٹھتے۔ اِس کے علاوہ رات کو اور دوپہر کو جو تھوڑا بہت وقت مل جاتا اُس میں بیٹھ کر متعلقہ باتوں کا مطالعہ کرتے۔ اِس انتھک محنت کے بعد رپورٹ منظور ہوئی۔ مجھے اِس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ رپورٹ کی سبھی بڑی بڑی سفارشیں اتفاق رائے سے منظور ہوئیں۔ کچھ چھوٹی موٹی باتوں میں چاہے اختلاف رائے رہا ہو مگر رپورٹ ہم آہنگی سے پاس ہوئی۔ اِس کی اہمیت اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ اُس میں سرمایہ داروں کے نمائندے بھی تھے اور مزدور یونینوں کے بھی۔ کچھ غیر جانب دار سمجھے جانے والے بھی تھے۔ تینوں کا اتفاقِ رائے تھا کیونکہ ہم سب اِس بات پر تُلے ہوئے تھے کہ ایسی ہی سفارشیں کریں جن کو ایک طرف سے مزدور اور دوسری طرف سے کارخانوں

کے مالک یکبارگی نہ ماننے قابل اور ناممکن سمجھ کر نامنظور نہ کر دیں۔ اِس میں سب نے پوری مدد کی۔ سب کی نیک فہمی اور نیک دلی کا ہی نتیجہ یہ اتفاقِ رائے تھا۔ ہم جانتے تھے کہ لڑائی کی وجہ سے حالات میں بہت تبدیلی ہوسکتی ہے۔ اور اگرچہ ابھی اُس وقت تک (اپریل ۱۹۴۰ء تک) ہندوستان میں کوئی اتنی بڑی اقتصادی تبدیلی نظر نہیں آتی تھی مگر اِس کا امکان آنکھوں سے اوجھل نہیں تھا۔ اِس لئے ہم جانتے تھے کہ شاید ہی ہماری سفارشیں پوری طرح کام میں لائی جائیں۔ تب بھی ہم نے اپنا کام پورا کیا۔ ہم نے سوچا کہ جو مواد ہم نے تیار کیا ہے، جو واقفیت حاصل کی ہے وہ اِس مضمون پر غور کرنے والوں کے لئے کام کی ضرور ہوگی۔ اور اگر کانگریس کو پھر اختیار مل سکے گا تو وہ ضرور کچھ نہ کچھ کر سکے گی۔ ہماری امیدیں پوری نہیں ہوئیں جہاں تک میں جانتا ہوں کمیٹی کی سفارشیں دفتر میں ہی رہ گئیں۔ اُن پر کوئی عملدرآمد نہیں کیا گیا۔ ہم نے مزدور صیغہ قائم کرنے کی سفارش کی تھی۔ سنا کہ اِس معاملہ میں کچھ کیا جا رہا ہے مگر وہ بھی کچھ ادھورا اور برائے نام ہی۔ مزدوروں کی سہولتوں کے متعلق ایک بھی سفارش کام میں نہیں لائی گئی۔ سرکار نے اس معاملہ کو شاید کچھ اہمیت نہیں دی۔ اس کمیٹی کے ممبروں میں مسٹر ہنیمن پہلے سے مجھ سے بالکل ناواقف تھے انہوں نے ریلوے بورڈ میں کام کر کے موقع حاصل کر کے ٹاٹا کمپنی کے حساب کے صیغہ کے آڈیٹر جنرل کا کام لیا تھا۔ اِس طرح وہ اس بڑے کارخانہ کے خاص لوگوں میں سے ایک تھے۔ کمیٹی میں میں نے دیکھا کہ اُن کی محنت کی طاقت حیرت انگیز ہے اور اُن کے خیالات بھی ترقی پسندانہ ہیں۔ اگر وہ اور مسٹر ایم بی گاندھی جو سرمایہ داروں کے نمائندے کی حیثیت سے تھے ساتھ نہ دیتے تو اتفاقِ رائے نہ ہوتا۔ اِسی طرح

پروفیسر عبدالباری اگر مزدوروں کی طرف سے ہماری بات نہ مانتے تو بھی اتفاقِ رائے ہونا مشکل ہو جاتا۔ اِس لئے یہ لوگ خاص طور پر مستحسن ہیں۔ اور لوگوں میں پروفیسر رادھا کمل مکرجی اور شری راجیندر کشور نے اپنی تعلیم اور مطالعہ سے کمیٹی کی رپورٹ میں بہت مدد پہنچائی۔ اِس کے علاوہ شری بار کھلے کے بمبئی کے مزدور سنگھ کے تجربوں کا اور شری جگت نرائن لال اور شری ہربیندر بہادر چند کے بہار کے متعلق واقفیت سے فائدہ اٹھا کر کمیٹی نے رپورٹ تیار کی تھی۔

اِس باب میں ایک المناک واقعہ ہو گیا۔ کمیٹی کی رپورٹ تیار ہونے کے تھوڑے ہی دنوں بعد پروفیسر راجیندر کشور کی اچانک وفات ہو گئی۔ ان کو پیٹ کی بیماری سے پہلے ہی سے تھی۔ ہم جانتے تھے کہ وہ بہت تکلیف سہا کرتے ہیں۔ کمیٹی کے کام میں اِن کو کافی محنت کرنی پڑتی تھی۔ بیماری بڑھ جانے کی وجہ سے علاج کے لئے بمبئی گئے۔ سنا کہ وہیں پیٹ کا اپریشن ہوا اور اسی میں موت واقع ہوئی۔ مجھے یہ بات رہ رہ کر تکلیف پہنچاتی ہے کہ شاید کمیٹی کی محنت شاقّہ نے ہی بہار کے ایک ہونہار قابل اور حوصلہ مند عالم کو ہم سے قبل از وقت اتنی جلد الگ کر دیا۔

تیسری کمیٹی تھی ہندوستانی کمیٹی جس کا کام لمبا تھا کیونکہ وہ ایک ہم معنے لفظوں کا لغت اور دوسرا ایسے لفظوں کا لغت، جو ہندی اور اُردو میں قابل قبول ہوں، تیار کرنے لگی تھی۔ اِس کے سوا اونچے درجوں کی درسی کتابیں تیار کرانے اور ہندوستانی گرامر بنانے کا کام بھی اُس نے اپنے ذمہ لیا تھا۔ یہ سب الگ الگ سب کمیٹیوں کے سپرد تھا اور اس وقت تک پورا نہیں ہوا تھا۔ یہ کام ۱۹۴۳ء میں جا کر ختم ہوا۔ ۱۹۴۲ء کے اگست سے ہی جیل میں رہنے کی وجہ سے میں کمیٹی کے کاموں میں

شریک نہ ہوسکا۔ تقریباً اِس ابتدائی کام کے سوا جس کو سب کمیٹیوں کے قیام کے متعلق کرنا پڑا تھا اور کسی اہم کام میں حصہ نہ لے سکا۔ اہمیت کے کام تھے دونوں لغتوں اور گرامر کی تیاری۔ میں اُن میں سے کسی ایک کو بھی نہ دیکھ سکا۔ اِس ہندوستانی کمیٹی کے بارے میں ہمارے صوبے میں اور اِس کے باہر بھی بہت طرح کی باتیں ہوئیں اور کی گئیں۔ ہندی والوں نے اسے ہندی کا مخالف سمجھا اور بعد میں اُردو والوں نے اُن کی تقلید کی۔ میں اِس بات کو نہیں مان سکتا کہ میں ہندی کا مخالف ہوں اور اُس کا نقصان چاہتا ہوں۔ اِسی طرح اُردو والے بھی ڈاکٹر عبدالحق کو اُردو کا مخالف کسی طرح نہیں کہہ سکتے کیونکہ وہ اُردُو کے صرف بڑے حامی ہی نہیں ہیں۔ اُنھوں نے اس کی بہت خدمت بھی کی ہے۔ اِس طرح سے وہ اُردو کے متعلق سبھی تحریکوں کے فردِ خاص کہے جاسکتے ہیں۔ تو بھی دونوں فریقوں نے اس کی مخالفت کی کوئی شکایت نہیں۔ مگر اِس بات کی شکایت ضرور ہے کہ بہت باتیں اناپ شناپ اور بے بنیاد کہی گئیں اور اُن بے بنیاد باتوں سے عوام میں اختلاف پیدا کیا گیا۔ بہرحال اِس کا کام ختم ہوگیا۔ معلوم نہیں جو لغت اور گرامر بنی اُس کے متعلق رائے عامہ کیا ہوگی میں یہ بھی نہیں کہہ سکتا کہ میں خود ہی کیا کہوں گا۔ کیونکہ اُن کو دیکھنے کا ابھی تک موقع نہیں ملا۔

مزدور جانچ کمیٹی کا کام ختم کر کے میں سیدھے واردھا چلا گیا۔ جہاں ورکنگ کمیٹی کی نشست ہونے والی تھی۔ پہلے کہہ چکا ہوں کہ سون پور میں کیمپ کھولنے کا خیال قائم ہوگیا تھا۔ اور تاریخ بھی طے ہوگئی تھی۔ میں واردھا سے ٹھیک اُسی دن واپس آیا جس دن کیمپ کھولنا تھا۔ اور سیدھے سون پور چلا گیا۔ وہاں ایک ہفتہ رہا۔ سوت

کاتنے کے سوا وہاں مختلف جگہوں سے آئے ہوئے لوگوں کے ساتھ بہت باتیں کرنی پڑتیں۔ اس طرح وہ وقت بھی محنت کا ہی وقت رہا۔ تقریباً ڈیڑھ دو سو خاص کارکن وہاں ٹھیرے تھے۔ کبھی کبھی شام کو جلسۂ عام بھی ہو جاتا جس میں آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی آ جاتے۔ خاص کر تعمیری کام پر ہی زور دیا گیا۔ کیونکہ اسی کو تیاری کا وسیلہ ہم مانتے ہیں۔ ہم وسیلہ اس لئے نہیں مانتے کہ ہم اس کے ذریعہ لوگوں کو نجات سکھاتے ہیں بلکہ اس لئے کہ اس کے ذریعہ کارکنوں میں وہ خود ضبطی آتی ہے جو ستیا گرہ کے لئے لازمی ہے اور عوام کے ساتھ وہ تعلق پیدا ہوتا ہے جو کسی بھی مجمعِ عوام کو ساتھ لے کر کام کرنے کے لئے انتہائی ضروری ہے۔

کیمپ کا کام ختم کر کے میں پٹنہ واپس آیا وہاں ایک دوسرا کام کرنے میں لگ گیا۔ جس کو پورا کر دینا میں اپنا فرض سمجھتا تھا۔ یہ کام تھا پنچایت کا جس کو میں نے قبول کر لیا تھا۔ مفادِ عامہ کے اعتبار سے اِس کی اہمیت اتنی ہی ہے جتنی کسی پنچائت کی ہو سکتی ہے۔ مگر اِس میں جو محنت پڑی وہ میری صحت کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوئی۔ کچھ صحت یاب ہونے پر آرام کرنے کے لئے زبرادیئی چلا گیا۔ وہاں تقریباً ایک مہینے تک پڑا رہا تب جا کر پھر کچھ کام کے لائق ہو سکا۔

مُسلم لیگ کی کچھ باتیں

کانگریسی وزارتوں کے زمانے میں ہی مسلم لیگ نے زوروں سے مخالفت شروع کردی تھی۔ اُس نے یہ بات اٹھائی کہ وزارتیں مسلمانوں کے ساتھ انصاف نہیں کرتیں۔ بلکہ زیادتیاں کیا کرتی ہیں۔ اُس نے ایک کمیٹی مقرر کی جس کے صدر پیرپور کے راجا تھے۔ اِس کمیٹی نے ایک رپورٹ تیار کی جس میں کانگریس کے ذریعہ کئے گئے مبینہ مظالم کی فہرست دی گئی تھی۔ بہار کے مسٹر شریف بیرسٹر نے اِس طرح کی رپورٹ دو جلدوں میں دوبار کر کے شائع کی۔ اِن رپورٹوں میں بہتیری غلط، بے بنیاد اور بے تکی باتیں لکھی تھیں۔ وزارتوں نے اِن کی تردید شائع کی۔ جہاں اسمبلی میں باتیں پیش ہوئیں، اُن کا پورا پورا جواب دیا۔ مگر وزارتیں جو کچھ کہتیں یا کرتیں اُس کی تو تبلیغ مسلمانوں میں ہو نہیں پاتی۔ اور لیگ جو چاہتی اور کہتی، اس کی تبلیغ زوروں سے ہونے لگتی۔ لیگ نے ہٹلر کی ایسی حکمتِ عملی کا سہارا لیا۔ جس میں مخالف کے خلاف جھوٹی شکایتوں کا۔ اور اگر کچھ سچائی بھی ہو تو اُسے بہت مبالغہ کے ساتھ اور بار بار دُہرا کر۔

پروپیگنڈا کیا جاتا ہے اور یہ پروپیگنڈا اتنا زبردست ہوتا ہے کہ عوام اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اِس طرح کانگریس کے اور ہندوؤں کے خلاف مسلمانوں میں بد دلی کا زہر پھیلایا گیا اور بڑی خلیج پیدا کی گئی۔ جس وقت چناؤ ہوا تھا جس کے نتیجہ کے طور پر وزارتیں بنی تھیں، لیگ کا زور بہت کم تھا۔ بہار میں تو لیگ کی طرف سے کوئی امیدوار کھڑا ہی نہیں ہوا۔ اِسی طرح بہت صوبوں میں لیگ کا وجود ہی نہیں تھا۔ جہاں تھا بھی، وہاں وہ ایک کمزور جماعت تھی۔ اس لئے جب کانگریس کو وزارتیں بنانی پڑیں تو وہ لیگ کے لوگوں کو وزارت میں نہ لے سکی۔ دوسرے مسلمانوں میں سے ہی اُن لوگوں کو، جو چنے گئے تھے وزارت میں شریک ہونے کی دعوت دی گئی۔

اُتر پردیش میں اِس بات کی کوشش ہوئی کہ مسلم لیگ کے ممبر وزارت میں لئے جائیں اور آج ایسا قیاس ہوتا ہے کہ اگر یہ کر لیا گیا ہوتا تو شاید لیگ کو اتنی تقویت نہ پہنچتی۔ مگر کانگریس کے اندر ہی کچھ لوگ اِس کو پسند نہیں کرتے تھے اس لئے لیگ کے ساتھ سمجھوتہ نہیں ہو سکا۔ لیگ اس سے بہت ناراض ہوئی۔ کانگریس کے خلاف پروپیگنڈا کرنا اُس نے اپنا خاص مقصد بنا لیا۔ جو شکایتیں پیر پور رپورٹ اور شریف رپورٹ میں چھپی تھیں، اُن کی جانچ کسی بھی غیر جانب دار عدالت یا فرد کے ذریعے نہیں ہوئی تھی۔ میں نے صدر کانگریس کی حیثیت سے مسٹر جناح کو لکھا کہ ہم اِس بات پر تیار ہیں کہ اِن باتوں کی جانچ فیڈرل کورٹ کے چیف جسٹس سر مارس گوائر یا کسی ایسے ہی دوسرے غیر جانب دار فرد کے ذریعے کرائی جائے اور وہ اپنی شکایتیں ایسے فرد کے سامنے پیش کریں۔ اُنھوں نے جواب میں اسے منظور نہیں

کیا اور کہا کہ معاملہ وائسرائے کے سامنے پیش ہے، وہی جو مناسب سمجھیں گے کریں گے۔

وائسرائے کانگریس سے خوش نہیں تھے۔ وہ تو مسلم لیگ کو مدد دے کر اُسے کانگریس کے خلاف کھڑا کرنے اور اِس طرح اُسے طاقتور بنانے پر تلے بیٹھے تھے۔ اُنھوں نے اِس شکایت کے بارے میں جانچ کرانے کی بات پر کچھ کہا ہی نہیں اور نہ شاید مسٹر جناح نے ہی اس پر زور دیا۔ بات جہاں تھی وہیں رہ گئی۔ مگر اخباروں، رسالوں اور بیانوں میں اِن غیر مصدقہ شکایتوں کے پروپیگنڈے کا سلسلہ جاری رہا۔ لارڈ لنلتھگو نے لیگ کی یہ بات مان لی تھی کہ ۱۹۳۵ء کے آئین پر جنگ کے بعد پھر از سرِ نو غور کیا جائے گا اور اِس میں جو سارے ہندوستان کے لئے ایک فیڈریشن (وفاق) بنانے کی بات کہی گئی ہے، وہ چھوڑ دی جائے گی۔ مسلم لیگ اِسی فیڈریشن کی مخالفت کر رہی تھی اور اسے حسبِ دلخواہ تسلّی برٹش سرکار نے دے دی۔ جب کانگریسی وزارتوں نے استعفےٰ دے دیا تو اِن سب باتوں سے حوصلہ پاکر مسٹر جناح نے مسلم لیگ کو خوشیاں ہونے کی ہدایت دی اور وزارتوں کا استعفےٰ مسلمانوں کے لئے نجات سمجھا گیا۔ اِس۔ بیج کا اِتنا اثر سمجھدار مسلمانوں پر بھی پڑا تھا کہ وزارتِ بہار کے استعفےٰ دے دینے کے بعد مولوی خورشید حسنین نے میرے پاس مبارک باد کا تار بھیجا۔

مسلم لیگ نے ابھی تک تقسیم ہند کی بات منظور نہیں کی تھی۔ مگر بہتیرے مسلمان اس بات کو کئی شکلوں سے پیش کر رہے تھے۔ جب میں ۱۹۳۹ء کے نومبر دسمبر میں واردھا میں ٹھیرا۔ تب میں نے اس معاملہ کا خاص مطالعہ کیا۔ اُس

وقت تک پاکستان کے بارے میں میں کچھ خاص طور سے نہیں جانتا تھا۔ وہاں اس بارے میں لٹریچر (ادب) منگایا اور پڑھا۔ پھر ایک طویل نوٹ تیار کیا جو رام گڑھ کانگریس کے زمانے میں ہندوستان ٹائمز میں مضمونِ خصوصی کی شکل میں شائع ہوا۔ بعد میں یہ ایک کتابی صورت میں چھپا۔ بہتیروں نے اُسے پڑھ کر پاکستان کی بات جانی۔ اُدھر مسلم لیگ بھی چپ نہیں بیٹھی تھی۔ رام گڑھ کانگریس کے چند دنوں بعد ہی مارچ ۱۹۴۰ء میں ہی لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا۔ وہاں لیگ نے پاکستان کے حق میں قرارداد منظور کی۔ اِس کے بعد سے پاکستان ہی مسلم لیگ کا مقصدِ خاص رہ گیا۔ ایک برس بعد مدراس کے سالانہ جلسے میں اُس نے پاکستان کے قیام کو مسلم لیگ کا نصب العین مان لیا۔ اِس مقصد خاص کو دستور العمل میں نصب العین کی حیثیت سے شامل کر لیا۔

انفرادی ستیاگرہ: سبب اور نتیجہ

یوروپین جنگ کی صورت انگلستان کے لئے خطرناک ہوتی جارہی تھی۔ جرمنی بہت تیزی سے یورپ کے ایک ملک کے بعد دوسرے پر قبضہ کرتا جارہا تھا۔ پولینڈ، بلجیم، ہالینڈ، ڈنمارک، ناروے وغیرہ ۱۹۴۰ء کی گرمی سے پہلے اس کے قبضہ میں آگئے۔ اب فرانس کی باری تھی۔ فرانس بھی بہت دنوں تک تاب نہ لاسکا۔ آخر اُسے بھی ہتھیار ڈال دینے پڑے۔ ڈنکرک سے انگریزوں کی فوج بہت نقصان اٹھاکر کسی طرح انگلستان بھاگ سکی۔ اِس سے انگلستان کے لوگوں میں بہت برہمی پیدا ہوئی۔ چیمبرلین کی وزارت گر گئی۔ اس کی جگہ سب پارٹیوں کی مشترکہ وزارت قائم ہوئی جس کے وزیراعظم مسٹر ونسٹن چرچل ہوئے اور وزیر ہند مسٹر ایمری۔ انگلستان بہت بہادری کے ساتھ جرمنی کے ہوائی حملوں کا مقابلہ کر رہا تھا۔ اٹلی نے یہ سمجھ کر کہ اب انگلستان ہار ہی جائے گا اور فرانس نے ہتھیار ڈال ہی دیئے ہیں، جنگ میں شریک ہوجانا مناسب سمجھا۔ انگلستان کے لئے یہ بہت ہی نازک لمحات تھے۔ ابھی تک امریکہ لڑائی میں نہیں آیا تھا اور نہ روس سے ہی جرمنی کی جنگ چھڑی تھی۔

ہماری ورکنگ کمیٹی میں اس نازک صورت حالات پر غور ہوتا رہا۔ آخر یہ رائے ٹھہری کہ ایک بار اور انگلستان سے صاف کہا جائے کہ وہ ہندوستان کا معاملہ نبٹا لے، تو حتی الوسع ہر طرح سے کانگریس اُس کی مدد کرے گی۔ ورکنگ کمیٹی میں اِس مسئلہ پر بہت بحث وتمحیص ہوئی۔ مہاتما جی جنگ میں عملی صورت میں مدد دینے کے حق میں نہیں تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ ایسا کرنا کانگریس کے عدمِ تشدد کے اصول کے خلاف ہوگا۔ انہوں نے جو انگلستان کی مدد کی بات کہی تھی وہ صرف اخلاقی مدد کی تھی۔ دوسروں کا خیال تھا کہ ہم اگر اپنی آزادی کا مطالبہ پیش کرتے ہیں تو ساتھ ہی ہم کو مدد بھی کرنی چاہیئے۔ کانگریس کا مقصد صرف اِتنا ہی تھا کہ انگریزوں سے سوراج حاصل کرنے کی کوشش میں، وہ پُرامن طریقوں سے ہی کام لے گی۔ اِس میں کسی غیر ملکی طاقت کے حملہ کرنے پر۔ اور ہندوستان کے آزاد ہو جانے کے بعد بھی۔ غیر متشدد رہنے کی نہ تو کوئی بات تھی اور نہ ہم کو اپنی کارروائی سے ملک کو کسی طرح باندھنا ہی چاہیئے۔ ایسا کرنے کا ہم کو حق بھی نہیں ہے مگر ایک بات پر سبھی متّفق تھے کہ سوراج حاصل کرنے کے کام میں اور آپس کے جھگڑوں میں عدمِ تشدد کو نہیں چھوڑنا چاہیئے۔

اِس طرح کچھ لوگ عدمِ تشدد کے اصول کو محدود اور مشروط کر کے برٹش سرکار کو مدد دینے کے لئے تیار تھے مگر گاندھی جی اور کچھ دوسرے لوگ عدم تشدد کو اچھوتا رکھنا ہندوستان اور دنیا کے لئے ضروری سمجھتے تھے: میرا ذاتی خیال بھی اسی کے حق میں تھا، اگرچہ مجھے بھی جنگ کی حالت سے کچھ گھبراہٹ تو تھی اور کبھی کبھی یہ دہشت بھی ہوتی تھی کہ ہم کچھ کر سکیں گے یا نہیں۔ خان عبدالغفار خاں بہت

ہی مضبوطی سے عدم تشدد کے اصول پر قائم رہے ۔ جب ورکنگ کمیٹی نے دلّی کی نشست میں طے کر لیا کہ اِس شرط پر کہ ہندوستان کی آزادی کا اعلان کر دیا جائے اور ہنگامی حکومت کو ایسی شکل دی جائے کہ ہندوستان کے لیڈروں کے ہاتھوں میں اختیارات آجائیں ۔ کانگریس عملی مدد لڑائی میں دے گی ۔ تو خاں صاحب نے ، میں نے اور کچھ دوستوں نے ورکنگ کمیٹی سے استعفیٰ دے دیا ۔ مگر صدر کانگریس مولانا آزاد کی اِس یقین دہانی پر کہ ابھی جب تک برٹش سرکار ہمارا مطالبہ منظور نہیں کرتی تب تک عملی امداد اور عدم تشدد کو چھوڑنے کی بات نہیں آتی ، اس لئے ہم کو استعفیٰ واپس لے لینا چاہیئے اور جب برٹش سرکار ہماری بات مان لے گی اور تب ہمیں مدد کرنی پڑے گی تب ہم لوگ استعفیٰ دے سکتے ہیں ۔ میں نے اور کچھ ساتھیوں نے استعفیٰ واپس لے لئے ۔ مگر خان صاحب اس سے مطمئن نہیں ہوئے ۔ مہاتما جی نے طے کر لیا کہ اُن کا اب کانگریس کے ساتھ تعلق نہیں رہے گا ۔ اِس سے ورکنگ کمیٹی میں اور باہر بھی لوگوں کے دل میں بڑی کھلبلی مچی ۔

ورکنگ کمیٹی کی ایک دوسری نشست واردھا میں کی گئی ۔ اِس کے بعد پونہ میں اِس مسئلہ پر غور کرنے کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی میٹنگ بلائی گئی ۔ اختلافِ رائے رہ گیا اور پونہ کی نشست میں ورکنگ کمیٹی کی تجویز کو کثرتِ رائے سے منظور کر لیا گیا ۔ اِس نشست میں ہم لوگ بھی شامل تھے ۔ گاندھی جی پونہ نہیں گئے تھے ۔ ہم نے دوستوں کی طرف سے اپنی رائے بتا دی اور یہ بھی کہدیا کہ ہم ورکنگ کمیٹی کی تجویز کی مخالفت نہیں کریں گے ۔ غیر جانب دار رہ جائیں گے ۔

ایسا ہونے پر بھی بہت لوگوں نے اختلاف کیا ہی - اگر ہم جانب دار رہ گئے ہوتے تو شاید وہ تجویز نامنظور ہوگئی ہوتی - اِس طرح برٹش سرکار کو کانگریس کی طرف سے باضابطہ مدد دینے کی تجویز بھیجی گئی - امید کی جاتی تھی کہ وہ اِس تجویز پر غور کرے گی اور ہمارے ساتھ پھر کچھ بات چیت ہوگی - مگر ایسا نہیں ہوا - تجویز پاس ہونے کے چند روز بعد ہی اس کی طرف سے اس کی نامنظوری کا اعلان کر دیا گیا -

لارڈ لنلتھگو نے ایک اعلان میں یہ کہا کہ برٹش سرکار لڑائی کے زمانے میں قانون نہیں بدل سکتی - مگر اس کے اندر رہتے ہوئے وہ وائسرائے کی انتظامیہ کونسل میں ہندوستانیوں میں سے - بالخصوص خاص خاص سیاسی پارٹیوں کے سربرآوردہ افراد میں سے چُن کر نئے ممبر مقرر کریں گے اور کونسل میں بیش تر ہندوستانی ممبر ہوں گے ، مگر ان کے اختیارات وہی ہوں گے جو اب تک کونسلروں کے رہے ہیں - اِس کے سوا جنگ کے متعلق باتوں میں صلاح و مشورہ دینے کے لئے ایک دوسری کمیٹی وہ بنائیں گے - اُس میں بھی خاص خاص ہندوستانیوں کو جگہ دیں گے - اِس اعلان سے یہ بات ظاہر ہوگئی کہ وہ ہندوستانیوں کو کوئی حق نہیں دینا چاہتے، تمام اختیارات اپنے ہی ہاتھوں میں رکھنا چاہتے ہیں - کانگریس کے مطالبے کو ماننے کا کوئی ذکر ہی نہیں تھا - اِس طرح جو نقشہ ورکنگ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے بنایا تھا - وہ بات کی بات میں ٹوٹ پھوٹ گیا -

عدمِ تشدد اور تشدد کی بحث بہت ہو چکی تھی - اِس لئے پونا میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے اِس بارے میں بھی ایک تجویز منظور کی - اُس میں یہ بات صاف صاف کہدی گئی کہ جہاں تک سوراج حاصل کرنے کے لئے برٹش سرکار کے ساتھ ہماری

کوششیں جاری ہیں، اِس میں ہندوستانیوں کے اندر آپسی جھگڑوں کے متعلق کانگریس اپنے عدمِ تشدد کے طریقوں کا سہارا لینے کے مقصد پر قائم ہے اور اُس میں کسی قسم کی تبدیلی یا ہیر پھیر نہ سمجھا جائے۔ اگرچہ یہ قرارداد اتفاق رائے سے منظور ہوئی مجھے شبہ ہے اور کانگریس کے اندر بہت سے لوگوں کو یہ یاد ہوگا کہ جنگ کے متعلق کانگریس کی عدم تشدد پالیسی میں جو ڈھیل آگئی اُس کا اثر روز بروز بڑھتا ہی گیا ہے۔ ایسا ہونا بھی قدرتی ہے۔ عدمِ تشدد کا اصول انوکھا اصول ہے۔ اتنے بڑے پیمانے پر، خاص کر ایک بڑی طاقت کے ہاتھوں سے سوراج حاصل کرنے میں اُس کا استعمال اور بھی انوکھا ہے۔ بہتوں نے اسے حکمتِ عملی کی صورت میں مانا ہے اور وہ سچائی سے اس پر عامل رہے ہیں۔ تھوڑے ہی لوگ اسے ایک مذہبی عقیدہ کی حیثیت سے مانتے ہیں۔ اِس لئے اِس پر لوگوں کو اٹل رکھنا کچھ آسان نہیں ہے۔ چونکہ اب تک کانگریس کے اندر عملی شکل سے اِس بارے میں کوئی اختلاف نہیں اس لئے عوام میں اس بارے میں کوئی ذہنی اختلاف بھی نہیں پیدا ہوا تھا۔ اب جب ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں ہی اختلاف پیدا ہوگیا اور وہ صاف طور پر لوگوں کو نظر بھی آنے لگا تب عوام میں اور خاص کر کانگریسی کارکنوں میں ذہنی اختلاف ہونا کوئی تعجب کی بات نہیں ایسے معاملوں میں ٹھیک وہی حال ہوتا ہے۔ جو پانی کے بہاؤ کے بند کے ذریعہ روک رکھنے کے بعد اُس بند میں ایک چھوٹا سوراخ کو خود بخود بڑھاتا جاتا ہے اور تھوڑے ہی وقت میں جو روک پانی پر رہتی ہے وہ ہٹ جاتی ہے۔ پھر تو ایک طرح سے سیلاب سا آجاتا ہے۔ ایسا ہی ہوا بھی۔

میں پونہ میں بہت بیمار پڑ گیا۔ کچھ نمونیہ سا ہوگیا۔ کسی طرح واردھا پہنچا۔

برسات کے دن تھے جو میرے لئے سراسر خراب ہوا کرتے ہیں۔ وہاں کچھ دنوں میں صحت یابی ہوئی تو سیٹھ جمنالال جی کا خیال ہوا کہ آرام کرنے کے لئے میں کچھ دنوں کے لئے راجستھان کی خشک آب وہوا میں رہوں۔ اُنہوں نے خود میرے لے جانے کے لئے انتظام بھی کر لیا تھا۔ مہاتما جی نے بھی اسے پسند کیا۔ میں سیٹھ جی کے ساتھ جے پور گیا۔ اتّفاقاً وہاں بھی اُن دنوں بارش ہو رہی تھی۔ راستہ کی گڑبڑ اور برسات کی وجہ سے پھر طبیعت کچھ خراب ہو گئی۔ اِس لئے مجھے کچھ دنوں تک جے پور میں کچھ ٹھہر جانا پڑا۔ پہلے تو ڈاکٹروں کی اور پھر وید شری نند کشور کی دوا ہونے لگی۔ سب کی رائے ہوئی کہ جے پور سے زیادہ فائدہ سیکر جیسے ریتلے مقام پر ٹھہرنے سے ہوگا۔ اِس لئے سیٹھ جی کے ساتھ میں سیکر چلا گیا۔ وہاں تقریباً ایک مہینہ رہا۔ سیکر میں ہی ان ذاتی کوائف کا لکھنا شروع ہوا۔ اِسی قیام کے دوران مجھے سیٹھ جمنالال بجاج کی جنم بھومی (زاد بوم) کاشی کیو رس نام کے گاؤں میں جا کر دیکھنے کا اچھا موقع ملا۔ وہاں سے نزدیک ہی ایک مقام ہے لوہا گرجی جسے لوگ تیرتھ استھان مانتے ہیں۔ وہ پہاڑیوں کے بیچ بہت خوب صورت لبا ہوا ہے۔ جمنالال جی ایک دن مجھے وہاں لے گئے۔ طبیعت بہت سدھر گئی۔ ہر طرح سے تندرست ہو گیا۔ ایسا ہی محسوس ہوا۔ وہاں میرے قیام کے دوران ہی بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی پھر نشست ہوئی جس میں برٹش سرکار کے اعلان پر غور کیا گیا اور یہ طے ہوا کہ اسے کانگریس منظور نہیں کر سکتی۔ اب کانگریس کو عملی طور پر دنیا کے سامنے اپنی پالیسی پیش کر دے۔ انفرادی ستیاگرہ کا بھی فیصلہ ہوا۔ ستیاگرہ چلانے کا بار گاندھی جی کو دیا گیا۔ اُنہوں نے طے کیا کہ اگرچہ یہ ستیاگرہ انفرادی ہوگا، اجتماعی نہیں۔ پھر بھی اُن سے منظوری حاصل کئے

بغیر کوئی شخص ستیا گرہ نہیں کر سکے گا۔ اور وہ اجازت ایسے ہی لوگوں کو دیں گے جنھوں نے تعمیری پروگرام کے کسی ایک صیغہ کو اپنایا ہو اور اس میں کام کیا ہو یا کر رہے ہوں۔ ساتھ ہی یہ بھی طے ہوا کہ ایسے ہی لوگوں کو منظوری دی جائے گی جو نمایندہ ہوں یا جن کی حیثیت ایسی ہو کہ وہ صرف ایک فرد واحد نہ ہوں بلکہ بہتوں کے نمائندے ہوں۔ جیسے اسمبلی اور کونسل کے ممبر، ضلع اور میونسپل بورڈوں کے ممبر، کانگریس کمیٹیوں کے عہدہ دار، اور چُنے ہوئے ممبر وغیرہ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ صرف ایسے ہی لوگوں کو اجازت ملی۔ جو خود سوت کاتتے ہوں اچھوت پن کے جذبہ سے خود کو آزاد کر چکے ہوں اور کہیں نہ کہیں کے چُنے ہوئے ممبر ہوں۔ شروع میں اسمبلی اور کونسل کے ممبروں اور کانگریس کمیٹی کے عہدہ داروں کو ہی اجازت ملی۔ صوبائی کمیٹیاں ایسے لوگوں کی فہرست تیار کرتیں اور گاندھی جی کے پاس منظوری کے لئے بھیج دیتیں۔ جب وہ منظور کر لیتے تبھی مندرج فہرست اصحاب ستیا کرتے۔

ستیا گرہ کی شکل یہ ہوتی کہ ستیا گرہی یہ اعلان کرتے کہ ہم جنگ میں کسی طرح مدد نہیں کر سکتے۔ لوگوں نے اس کے لئے ایک نعرہ بنالیا۔

نہ ایک بھائی، نہ ایک پائی

یعنی ہم نہ اپنے میں سے ایک بھائی کو بھی لڑائی میں بھیجنا چاہتے ہیں اور نہ لڑائی کے لئے ایک پائی کی بھی مالی امداد دینا چاہتے ہیں۔ لوگوں کو اس بات کی سخت تاکید کردی گئی تھی کہ ستیا گرہ میں کوئی مظاہرہ نہ کیا جائے، کیونکہ ہم ستیا گرہ کے ذریعے اپنے لئے ایک حق حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ ہم جو بھی مناسب سمجھیں ملک میں اس کا پرچار کر سکتے ہیں، اور ہمارے اس حق میں کسی قسم کا خلل نہیں پڑنا چاہیئے یہاں تک کہ

لڑائی کے نازک زمانے میں بھی ہم چاہیں تو ہم کو اس کے خلاف پروپیگنڈا کرنے کا حق ہونا چاہیئے۔

اِس ستیاگرہ کی کچھ لوگوں نے تو مخالفت کی اور کچھ نے اس کا مذاق اڑایا۔ پُرجوش باتیں بازو والوں کا کہنا تھا کہ اس طرح کے ٹھنڈے ستیاگرہ سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ اِس سے برٹش سرکار پر کوئی اثر نہیں پڑسکتا اور نہ اُس کے کام میں ہم اس کے ذریعے کوئی رخنہ اندازی ہی کر سکتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے تھے کہ پرچار اور بچار کی آزادی کی بات صرف دھوکے کی ٹٹی ہے۔ ہم لڑائی کی مخالفت کرنا چاہتے ہیں مگر ہم کو کھُل کر ایسا کرنے کی ہمّت نہیں ہوتی، اِس لئے یہ ڈھکوسلا پھیلا رکھا ہے۔ بات یہ تھی کہ ہمیں دنیا کو دکھانا تھا کہ ہم برٹش سرکار کی جنگ میں اس کا ساتھ نہیں دے رہے ہیں، اور یہ ہم بغیر کسی شور وغل یا ہنگامے کے دکھا دینا چاہتے تھے۔ اگر اجتماعی ستیاگرہ کیا جاتا تو بہت شوروغل کے بغیر کام ہونا مشکل تھا۔ اور نمائندگی کرنے والوں کو ہی ستیاگرہ کی اجازت دے کر ہم یہ دکھا رہے تھے کہ وہ صرف ایک فرد نہیں ہے، اس کے پیچھے اس کے چننے والے بے شمار مرد وزن ہیں اور یہ ستیاگرہ اُن سب کی طرف سے ہو رہا ہے، وہ فرد صرف ایک نشان ہے ورنہ ستیاگرہ سب کر رہے ہیں۔ اِنھی وجہوں سے مظاہرہ سختی سے روکا گیا تھا۔ ساتھ ہی نمائندوں کو چننے میں پوری سختی برتی جاتی تھی۔ ایسے لوگ جن کا جیل جانا مناسب تھا مگر جو کسی سبب سے ستیاگرہ میں شریک نہیں ہو سکتے تھے، درخواست دے کر چھُٹی لے لیتے تھے۔

بہار میں اپنی خرابیِ صحت کی وجہ سے میرے لئے ستیاگرہ میں شریک ہونے

کا یعنی اپنی بیماری کی دیکھ بھال کا بار سرکار پر ڈالنا تھا۔ اِس لئے گاندھی جی نے مجھے خود روک لیا۔ پہلے روز جب بابو سری کرشن سنہا اور بابو انوگرہ نارائن سنگھ کا پٹنہ کے دو مقاموں پر، ایک سے کچھ دیر بعد دوسرے کا ستیاگرہ کرنا طے ہوا تھا اور اِس فیصلہ کے مطابق بابو سری کرشن سنہا ستیاگرہ کرنے کے لئے بانکی پور کے میدان میں پہنچے، تو وہاں بہت لوگ جمع ہو گئے جن میں اکثریت طلبار کی تھی۔ وہاں کچھ شور وغل ہوا۔ جو جیل کے پھاٹک تک، جہاں بابو سری کرشن سنہا کو گرفتار کر کے لے گئے، جاری رہا۔ میں نے دیکھا کہ یہ ابتدا گاندھی جی کی ہدایتوں کے خلاف ہوئی اور اگر اِس کی حوصلہ افزائی ہوئی تو بعد میں اسے سنبھالنا دوبھر ہو جائے گا۔ خود اپنے ہی لوگ ضابطہ بندی کی دھجیاں اڑا دیں گے۔ اِس لئے میں نے انوگرہ بابو کے ستیاگرہ کو اور سارے صوبے کے ستیاگرہ کو اُس وقت تک کے لئے بند کر دیا جب تک لوگ ستیاگرہ کے راز کو پوری طرح سمجھ نہ لیں اور گاندھی جی کی ہدایت کے مطابق لفظ بہ لفظ سب باتیں ٹھیک کرنے کو تیار نہ ہو جائیں۔ یہ بات سارے صوبے میں پھیل گئی۔ لوگوں نے سمجھ لیا کہ اِس طرح کی باتیں نہیں چلنے پائیں گی۔ میرے پاس دوسرے ہی دن لوگوں نے آ کر بتایا کہ اب ایسی غلطی نہیں ہونے پائے گی اور سارے صوبے میں ستیاگرہ ملتوی ہو جانے سے صوبے بھر کی بدنامی ہو گی۔ میں نے دیکھ لیا کہ فضا درست ہو گئی ہے، دو دنوں کے بعد میں نے پھر اجازت دے دی اِس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارے صوبہ میں پوری شانتی کے ساتھ، جیسا گاندھی جی چاہتے تھے، ستیاگرہ چلتا رہا۔

وزیرِ اعلیٰ بابو سری کرشن سنہا سے شروع کر کے، اسمبلی اور کونسل کے

بشیتر ممبر، ضلع بورڈوں اور میونسپلٹیوں کے بہتیرے ممبر، کانگریس کمیٹیوں کے بے شمار عہدہ دار اور کچھ ممبر کئی ہزار کی تعداد میں، ستیاگرہ کر کے جیل چلے گئے۔ سرکار کی کچھ ایسی پالیسی تھی کہ تقریباً سبھی لوگوں کو ایک ایک برس کی سزا دی جاتی تھی۔ ان میں سے سبھی لوگوں کو تین مہینے کی معافی (جسے جیل کی زبان میں معرکہ کہتے ہیں) ملتی گئی۔ سبھی لوگ سزایابی کے تقریباً نو مہینے کے بعد رہا ہوتے گئے۔ میں تو باہر رہ گیا تھا اور زیادہ تر وقت گاندھی جی کے ساتھ واردھا میں ہی گزارنا پڑا۔ اِس کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ کانگریس کے صدر کے جیل جانے کے بعد، کانگریس کی تنظیم کا سارا بار ایک طرح سے اُن پر ہی آپڑا۔ اگرچہ کانگریس کے سکرٹیری اچاریہ کرپلانی جی بھی باہر رکھے لئے گئے تھے۔ کام میں بھی مدد دینے کے لئے گاندھی جی میرے اور اُن کے وہیں رہنے پر اصرار کرتے تھے۔ ہم نے ایسا ہی کیا بھی۔

کانگریسی لوگوں نے وزارت کے عہدوں سے تو استعفےٰ دے ہی دیا تھا۔ اب جہاں جہاں پہلے کانگریسی وزارتیں تھیں وہاں حکومت کے قانون ۱۹۳۵ء کی دفعہ ۹۳ کے مطابق گورنر حکومت کر رہے تھے۔ کچھ دنوں تک انہوں نے راستہ دیکھا کہ کانگریس والے شاید پھر واپس آجائیں مگر جب اِس کی کوئی امید نظر نہیں آئی تو اسمبلی وغیرہ کے ممبروں کو جو تنخواہ ملتی تھی اُسے انھوں نے بند کر دیا۔ اگرچہ اسمبلی وغیرہ کے اسپیکروں کے ساتھ کے چپراسی وغیرہ نہیں ہٹائے گئے اور وہ کچھ نہ کچھ کام بھی کرتے رہے، لیکن اُن کی بھی تنخواہ بند کر دی گئی۔ کانگریس نے ضلع بورڈوں اور میونسپلٹیوں سے کانگریسیوں کے ہٹ جانے کی ہدایت نہیں تھی۔ بہت سی جگہوں میں کانگریسی لوگ چیرمین اور وائس چیرمین تھے۔ اُن کا کام سبھی کانگریسی ممبر مل کر کرتے رہے

ایسا بھی دیکھا گیا کہ کچھ لوگ ستیاگرہ کی وجہ سے اچھے ممبروں کے ہٹ جانے سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اُن کی جگہوں پر جا بیٹھے۔ کچھ ہم لوگوں سے بھی یہ غلطی ہوئی کہ جہاں ہمارے چیرمین وغیرہ کے ستیاگرہ میں جانے کی وجہ سے جگہ خالی ہوئی، وہاں ہم نے اُن خالی جگہوں کو ایسے لوگوں سے پُر کر دینے کی اجازت بھی دے دی جن سے اُمید کی جاتی تھی کہ ہماری ضابطہ بندی کو مانیں گے۔ کہیں کہیں نئے چناؤ بھی ہوئے اور اُن جگہوں پر اگر صاف صاف نہیں تو بالواسطہ طریقہ سے کانگریسی لوگ آ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اُن بورڈوں پر جیسا چاہیئے ویسا کانگریس کا انضباط نہیں رہ سکا۔ بہت طرح کی شکایتیں بھی سننے میں آنے لگیں۔ کانگریس کے اندر جو پارٹیاں بندی تھیں، وہ بھی اب باہر پھوٹ پڑیں۔ اِس طرح کانگریس کی بدنامی ہونے لگی۔

میرے اپنے صوبے میں سب کا بار مجھ پر تھا۔ میں زیادہ تر واردھا میں رہنے کی وجہ سے بہت کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ اِس لئے میں نے روک تھام کے خیال سے ایک چھوٹی کمیٹی بنا دی۔ اُسی میں ان بورڈوں کی نگرانی کا کام سونپ دیا۔ مجھے افسوس ہے کہ بہت کوشش کے بعد بھی حالت بہتر نہ ہوئی۔ میں نے طے کیا کہ بہار میں اِن سبھی بورڈوں سے کانگریسی لوگوں کو ہٹا دینے میں ہی نجات ہے۔ مگر اِس فیصلہ پر پہنچنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد صوبہ کے خاص خاص آدمیوں کی رہائی کا وقت آ رہا تھا۔ اِس لئے اُن کی رہائی تک اسے ملتوی رکھا کیونکہ ان کی بھی رائے لے لینا مناسب تھا۔ اُن کی رہائی پر اُن کی رائے لے کر میں نے یہ ہدایت کر دی کہ سبھی کانگریسی ضلع بورڈوں اور میونسپلیٹوں سے ہٹ جائیں۔ اِس کے بعد ہی پھر خرابی کی وجہ سے میں واردھا چلا گیا وہاں رپورٹ پہنچی کہ بیشتر لوگوں نے تو ہدایت

مان لی مگر کچھ لوگوں نے اُسے بھی نہیں مانا۔ ایسے لوگوں کی تعداد بہت زیادہ نہیں تھی۔ ضلع کمیٹیوں اور صوبائی کمیٹیوں نے ایسے لوگوں کے خلاف ضابطہ کی کارروائی کی بہتیرے لوگ کانگریس سے نکال دیے گئے۔ یہ سب ۱۹۴۱ء کے نومبر۔ دسمبر کی بات ہے۔ ۱۹۴۰ء کے نومبر سے ۱۹۴۱ء کے وسط تک کچھ اور باتیں ہوئیں جن کا ذکر کر دینا مناسب ہوگا۔

میرا دورۂ میسور

اُن دِنوں میرا بہت وقت واردھا میں گزرا۔ جب میں وہاں تھا میسور کانگریس سے شری واسپا واردھا آئے۔ اُنہوں نے مہاتما جی سے کہا کہ وہ اپنا سالانہ جلسہ کرنا چاہتے ہیں، جس میں مجھے جانا چاہیئے۔ اُس کے افتتاح کا کام میرے سپرد کیا گیا تھا۔ مہاتما جی نے اُن کے اصرار کو مان لیا۔ مجھے وہاں جانے کی اجازت ملی۔ یہ کانفرنس ہری ہر نامی مقام پر تنگ بھدرا ندی کے کنارے ہوئی تھی۔ منظر دل کش تھا۔ لوگوں میں جوش بھی کافی تھا۔ کانفرنس، نمائش وغیرہ کے کام کے سوا، شری واسپا مجھے کچھ خوبصورت اور قدامت رکھنے والے مقامات دکھا دینا چاہتے تھے۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ وہاں جانے سے پہلے ہی شری واسپا سے باتیں ہو چکی تھیں۔ اُنہوں نے پروگرام بھی بنا لیا تھا۔ بنگلور اور میسور کے سوا میں اُن پرانے مندروں کو بھی دیکھنے گیا جو جینیوں اور ہندوؤں کے زمانے کی سنگتراشی کے فن کے اچھے سے اچھے نمونے تھے۔ شرون بیل گول اور ہلے بیڈ کے منظر لاثانی ہیں۔ وہ دنیا کے اُن حیرت انگیز مقاموں میں ہیں، جن کو

نہ دیکھنا گویا انسان کے فن کے اعلیٰ سے اعلیٰ نمونوں کو دیکھنا ہے ۔ باہوبلی کی ، ۵۷ فٹ اونچی ایک عظیم الشان مورت ایک پہاڑ کی چوٹی پر پہاڑ کاٹ کر بنائی گئی ہے جو بہت دور سے تقریباً دس پندرہ میل سے نظر آنے لگتی ہے ۔ تعریف یہ کہ اتنی بڑی مورت کچھ الگ سے تیار کر کے وہاں کی چوٹی پر بٹھائی نہیں گئی ہے ۔ بلکہ وہ پہاڑ کی چوٹی کو ہی کاٹ کر بنا دی گئی ہے اور چاروں طرف سے پہاڑی کاٹ کر ہموار کر دی گئی ہے ۔ مورت ایسی سندر بنی ہے کہ چاہے آپ میلوں دور سے دیکھیے یا نزدیک جا کر اس کے سبھی اعضا ایسے تناسب سے بنائے گئے معلوم ہوں گے کہ کوئی بھی خامی نظر نہ آئے گی ۔ ہر ایک عضو پیر کی انگلیوں سے لے کر ناک کان تک اپنے اپنے مقام پر ٹھیک تناسب سے نظر آتا ہے ۔ یہ جینیوں کا ایک بہت بڑا تیرتھ (زیارت گاہ) ہے جہاں ہندوستان کے جینی درشن کرنے آتے ہیں ۔

اب ہلے بیڈ میں کچھ ایسے نمونے ملے ہیں جن میں باریکی کی حد ہو گئی ہے ۔ وہاں کے مندروں میں پرانوں کی کتھائیں مورتوں کے ذریعے منقوش کر کے پیش نظر کی گئی ہیں ۔ یہ مورتیں انتہائی خوب صورت اور دل کش ہیں ۔ کوئی پندرہ بیس فٹ کی اونچائی پر ایک تصویرِ سنگ بنی تھی ، جس میں کوئی پھل یا پھول دکھایا گیا تھا اور اس پر ایک شہد کی مکھی بیٹھی تھی ۔ نیچے سے دیکھنے میں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ سچ مچ شہد کی مکھی ہے جس کے پاؤں اور پر بھی ہیں مگر حقیقت میں اُسی پتھر پر جس کو کاٹ کر پھل یا پھول بنایا گیا تھا ، یہ شہد کی مکھی بھی اسی طرح بنائی گئی تھی ۔ کوئی الگ سے بنا کر وہاں بٹھائی نہیں گئی تھی ۔ دکھن کے مندروں میں پتھر کی بنی زنجیر اکثر دیکھنے میں آتی ہے ۔ کسی دھات کی زنجیر بنانا تو مشکل نہیں ۔ کیونکہ اس کی ایک ایک کڑی الگ الگ بنا کر ایک دوسرے

سے گوندھ دی جاتی ہے اور تب جوڑ کر یا منھ دبا کر یا گرم کر کے سلسلہ بند کر دیا جاتا ہے لیکن پتھر کی زنجیر میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس میں کڑیاں الگ الگ نہیں بنائی جا سکتیں ایک پتھر کے لمبے ٹکڑے کو کاٹ کر ایک دوسرے سے گتھی ہوئی کڑیاں بنانی پڑتی ہیں کام خاصا مشکل ہے۔ کیونکہ اگر کہیں ایک ٹانکی یا چھینی بھی زور سے لگ گئی اور کڑی ٹوٹ ٹوٹ گئی تو پھر ساری زنجیر بکھر کر خراب ہو گئی۔ دوسرے مندر میں میں نے زنجیر دیکھی تھی۔ مگر اس کی کڑیاں بڑی تھیں۔ ہلے بیڈ میں میں نے ایک مورت کچھ اُنچائی پر دیکھی اور وہ بے شمار زیوروں سے مُزین کی گئی تھی۔ سب زیور پتھر کے تھے اور اسی ایک پتھر کے ٹکڑے میں سے، جس سے یہ مورت بنائی گئی تھی، کاٹ کر بنائے گئے تھے۔ وہ مورت ایک چھوٹی سی جھلنی یا نتھ (نک نیسر) پہنے ہوئے تھی۔ وہ بھی پتھر کی تھی، بہت ہی چھوٹی اور ناک میں ایک چھوٹے سوراخ سے لٹک رہی تھی جو بالی ناک میں تھی وہ بھی بہت باریک تھی اور ناک کے سوراخ میں وہ چاروں طرف گھمائی جا سکتی تھی اور اس نتھ کا قطر آدھ انچ سے زیادہ نہ ہوگا اور اسی سے ناک کے سوراخ کا بھی اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ عظمت اور باریکی دونوں کے خوب صورت سے خوب صورت نمونوں کا بیان پڑھ کر ناظرین سمجھ سکتے ہیں کہ وہاں کتنی فن کاری اور کتنے فنون کے نمونے ہم دیکھ سکتے ہیں پتھر میں اس قسم کے عظیم و باریک کام ہم اجنتا اور ایلورا میں دیکھ سکتے ہیں۔ اجنتا میں فن سنگ تراشی کی حیرت انگیز ارتقا دیکھنے میں آتی ہے اور ایلورا میں پہاڑ کاٹ کر بنایا گیا عظیم الشان مندر اور خوب صورت اور باریک بت تراشی کے فن کا کراماتی نمونہ۔

تیسرا حیرت انگیز نظارہ قدرتی تھا۔ وہ ہے گری سپّا کا جھرنا۔ یہ ایسی جگہ ہے جہاں برٹش اور میسور راجوں کی سرحد ملتی ہے۔ تقریباً ایک ہزار فٹ کی اُنچائی سے

پانی گرتا ہے۔ اِس کو ایک طرف برٹش راج کے گوشے سے اور دوسری طرف میسور راج کے گوشے سے ہم دیکھ سکتے ہیں۔ مگر میسور راج کے گوشے سے دیکھنے پر منظر زیادہ خوب صورت اور سہانا معلوم ہوتا ہے۔ وہاں ٹھہرنے اور بیٹھ کر دیکھنے کا بھی ایک خوب صورت مقام راج کی طرف سے بنادیا گیا ہے۔ میں کچھ دیر تک بیٹھ کر قدرت کی اِس کرامات کو دیکھتا رہا۔ اُن دنوں وہاں سے بجلی نکالنے کے لئے کارخانہ بنانے اور دور دور تک بجلی پہنچانے کا انتظام میسور راج کی طرف سے کیا جارہا تھا۔ بہت سے مزدور وہاں سے کئی میل کی دوری تک کام کرتے ملے۔ معلوم نہیں اِس قدرتی کرامات پر اِس انسانی زبردستی کا کہاں تک اثر پڑا ہے اور وہ رونق اب بھی ہے یا نہیں۔

بِہار شریف کا فساد

میں چند دنوں کے لئے پٹنہ آیا تھا اور پھر واردھا کو واپس ہوگیا۔ جس دن پٹنہ سے جانے والا تھا، اُسی رات کو یہ سنا کہ بِہار شریف میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں کچھ ان بن ہے مگر ایسا نہیں معلوم ہوا کہ کوئی بڑی بات ہے۔ جس کا نتیجہ خوفناک خون خرابہ ہوسکتا ہے۔ واردھا پہنچنے کے ایک دن بعد ہی اخباروں سے معلوم ہوا اور پھر تار پہنچا کہ بِہار میں خوفناک (دنگا) فساد ہوگیا ہے۔ گاندھی جی کی رائے ہوئی اور میں نے بھی کہ ایسی حالت میں مجھے فوراً بِہار جانا چاہیئے۔ میں پہلی ٹرین سے روانہ ہوگیا۔ پٹنہ پہنچنے پر معلوم ہوا کہ شاہ محمد عذیر منیمی اور متھرا بابو کئی دنوں سے بہار میں ہی ہیں اور وہاں کی حالت بہت خراب ہوگئی ہے۔ کئی ہندوؤں اور مسلمانوں کا خون ہوچکا ہے اور بلوہ صرف بہار شریف تک ہی محدود نہ رہ کر۔ جہاں شروع ہوا تھا گاؤں میں پھیلتا جا رہا ہے۔ مجھے یاد تھا کہ ۱۹۱۸ء میں اسی طرح شاہ آباد کے ایک گاؤں پیرو میں شروع ہوکر اُس ضلع کے سوا آس پاس کے ضلعوں کے کچھ حصّوں میں بھی فساد بلوہ پھیل گیا تھا۔ اِس لئے میں اور بھی چونکا۔ اتفاق سے اُن دنوں پروفیسر عبدالباری

بھی، جو باہر تھے پٹنہ پہنچ گئے۔ ہم نے موٹر اور لاری ساتھ لی۔ اُن پر بہار ودیاپیٹھ (قومی یونیورسٹی) کے معلموں اور طالب علموں کو اور دوسرے کارکنوں کو سوار کرالیا۔ اسی دن بہار شریف کی طرف چل دیئے۔ وہاں پہنچنے پر جب شاہ عذیر منیمی اور متھرا بابو سے ملاقات ہوئی تو سب حال معلوم ہوا۔ بہت خون ہو چکے تھے۔ مگر اب حالت کچھ روبہ اصلاح تھی۔ سرکار نے پولیس کا بھی کافی انتظام کر لیا تھا۔ ضلع مجسٹریٹ اور متھرا بابو اپنی جان کی بازی لگا کر جہاں جہاں ہنگامہ ہوتا پہنچ جاتے، اور بلوہ و فساد روکتے۔ کہیں کہیں بلوائیوں کی شرارت کے بعد پہنچتے اور وہاں سے لاشوں کو اٹھا اٹھا کر مناسب جگہ بھجوانے کا انتظام کرتے۔

ہم لوگ پہنچتے ہی چاروں طرف کے گاؤں میں جہاں جہاں سے کچھ خراب خبر آئی پھیل گئے۔ لوگوں کا ڈھارس بندھوانے اور غلط افواہوں کے روکنے اور امن قائم کرنے میں سب کے سب لگ گئے۔ تین چار دنوں میں حالت سدھر گئی۔ وہیں صدر صوبائی مسلم لیگ خان بہادر محمد اسمٰعیل سے باتیں ہوئیں۔ ہم دونوں ایک دن کے لئے پٹنہ آئے۔ وہاں ایک بڑے جلسۂ عام میں ہم دونوں نے تقریریں کیں۔ میں پھر بہار شریف گیا۔ کچھ دنوں تک وہاں رہ کر جہاں جہاں لوٹ مار اور خون خرابہ ہوا تھا، وہاں جا کر لوگوں سے ملاقات کی اور انہیں پرسکون کیا۔ جو منظر دیکھنے میں آئے بہت ہی بھیانک اور دردناک تھے۔ ہندو مسلمان جب اس طرح کے جھگڑے میں پڑ جاتے ہیں۔ تب مذہب اور انسانیت دونوں کو بھول جاتے ہیں اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہو جاتے ہیں۔ اس جھگڑے میں ہندو اور مسلمان دونوں مارے گئے تھے۔ مگر مسلمانوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اگر یہ فساد دُکا نہ ہوتا تو حالت اور بھی خطرناک ہو گئی ہوتی۔ سکون ہو جانے کے بعد میں پھر

واردھا واپس چلا گیا۔

یہاں ایک اور کام میں نے اپنے ذمہ لے لیا تھا بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ مجھ پر یہ کام ڈال دیا تھا۔ سندھیا اسٹیم نیویگیشن کمپنی ہندوستانیوں کی جہازی کمپنی ہے۔ اس کے جہاز خاص کر ہندوستان اور برما کے بیچ اور ہندوستان کے ساحلی بندرگاہوں میں زیادہ تر جایا اور مال ڈھویا کرتے ہیں۔ یہ کمپنی چاہتی تھی کہ جہاز بنانے کا ایک کارخانہ کھولا جائے۔ اُس نے وشاکھا پٹم (وزاگا پٹم) کو جو آندھرا کے صوبہ میں ہے اِس کے لئے موزوں مقام چُن لیا۔ اُس کے ڈائرکٹروں میں خاص ہیں۔ سیٹھ وال چند، ہیرا چند اور سیٹھ شانتی کمار نروتم مُرارجی۔ ان کی یہ رائے ہوئی کہ میں اس کی بِنا ڈالوں۔ میں اس زمانے میں کوئی کام گاندھی جی کی رائے کے بغیر نہیں کرتا تھا۔ اِس لئے انہوں نے گاندھی جی سے کہا۔ مجھے اجازت ملی کہ میں وہاں جاؤں۔ اِس سلسلہ میں کچھ ہندوستانی جہازی تجارت کی تاریخ کے مطالعہ کا بھی موقع ملا۔ میں نے اُس موقع وہاں جو تقریر کی، اُس میں ساری تاریخ اور حالات کا جائزہ لیا۔ کمپنی کی طرف سے بڑی دھوم دھام کی گئی تھی۔ اُس کے سبھی ڈائرکٹر وہاں آئے تھے۔ سارے ہندوستان سے بہت سے خاص خاص افراد مدعو کئے گئے تھے۔ سرکاری بحری بیڑے کے افسر بھی موجود تھے۔ بڑے تزک و احتشام کے ساتھ یہ تقریبِ عظیم ختم ہوئی۔ اِن لوگوں نے عوامی کاموں کے لئے مجھے کچھ روپے بھی دیئے۔ جن کو میں نے ان کی خواہش کے مطابق اِن اداروں کو دیدیا جو اِس کام میں لگے تھے۔

ضلع ڈھاکہ کے فساد کی تحقیقات

والٹیر سے جو وزاگاپٹم کے پاس ہی ہے، روانہ ہو کر میں متھرا بابو کے ساتھ سیدھے ڈھاکہ جانے کے لئے کلکتہ پہنچا۔ راستہ میں کٹک میں بھی کچھ دیر کے لئے ٹھہرا تھا۔ ڈھاکہ جانے کا سبب یہ تھا کہ وہاں بھی خوفناک فساد ہو چکا تھا۔ یہ بلوہ شہر سے شروع ہو کر کئی گاؤں تک جا پہنچا تھا۔ گاؤں کے گاؤں لوٹے اور جلا دیئے گئے تھے۔ ڈھاکہ میں خونریزی بھی بہت ہوئی۔ جس دن میں پہنچا فضا پُرسکون تھی وہاں جانے سے پہلے ہی کلکتہ میں اُس زمانے کے وزیراعلیٰ مسٹر فضل الحق اور سر ناظم الدین سے میری ملاقات ہو گئی تھی۔ مسٹر فضل الحق کو میں اُسی زمانے سے جانتا تھا۔ جب میں کلکتہ ہائی کورٹ میں وکالت کیا کرتا تھا۔ سر ناظم الدین سے بنگال کی جیلوں میں بھوک ہڑتالی سیاسی قیدیوں کے بارے میں گفتگو کرنے کے لئے ملاقات ہو چکی تھی۔

میں ڈھاکہ میں وہاں کے خاص خاص لوگوں سے ملا۔ ہندوؤں پر بہت ظلم ہوئے تھے۔ لہذا قدرتاً اُن میں بہت غصہ تھا۔ مسلمانوں نے وہاں کے نواب صاحب کے محل میں مجھ سے ملاقات کے لئے ایک چا پارٹی دی۔ وہیں سب باتیں ہوئیں۔ پُرانے

کانگریسی اور اُس وقت مقامی ضلع کمیٹی کے صدر شری ستیش چندر چٹرجی کے گھر پر ٹھہرا تھا۔ ڈھاکہ سے کچھ دور جاکر اُن گاؤں کو دیکھا جو لوٹے اور جلائے گئے تھے۔ منظر بھیانک تھا۔ بنگال کے مکان اکثر پکّے نہیں ہوتے۔ پھوس کے چھپر یا ٹین کے سائبان ہوتے ہیں۔ دیوار، بانس وغیرہ کی ٹٹّی کی ہوتی ہے۔ جو لکڑی کے کھمبوں کے سہارے کھڑی رہتی ہے۔ زمین کی نمی یا سیل سے بچنے کے لئے مکان کے اندر کا فرش کہیں کہیں سیمنٹ کا بنا ہوتا ہے۔ ایسے گاؤں بھی دیکھنے میں آئے جہاں صرف لکڑی کے جلے ہوئے کھمبوں کے ٹکڑوں یا نشان اور سمنٹ کے فرش کے سوا اور کچھ دیکھنے کو نہ ملا۔ حالت بہار شریف میں بھی خراب تھی مگر ڈھاکہ ضلع کا اِس سے کسی طرح مقابلہ نہیں ہو سکتا تھا۔ بہار میں ہندوؤں کی آبادی زیادہ ہے، وہاں مسلمان ہی زیادہ مارے یا لوٹے گئے تھے۔ ڈھاکہ میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے، وہاں ہندو ہی زیادہ مارے یا لوٹے گئے تھے۔ مگر جیسی لوٹ اور آتش زدگی ڈھاکہ میں ہوئی تھی اُس کا کچھ بھی مقابلہ بہار نہیں کر سکتا تھا۔

دو تین دنوں تک اِن گاؤں میں گھوم پھر کر دیکھنے کے بعد میں پھر ڈھاکہ واپس آیا۔ دیہات میں گھومتے پھرتے دو گاؤں میں میرے اپنے گاؤں زیرادیئی کے دو آدمیوں سے ملاقات ہو گئی۔ وہ یہاں کام کی تلاش میں آئے تھے۔ بہتیرے بہاریوں کی طرح یہ بھی یہاں سے کچھ پیدا کر کے بہار آجایا کرتے تھے۔ مجھے دیکھ کر تعجب ہوا کہ جس طرح آسام کے سفر میں سارن ضلع کے آدمیوں سے ملاقات ہو گئی تھی، اِسی طرح بنگال کے دیہات میں بھی ہمارے صوبے کے لوگ پھیلے ہوئے تھے۔ غریب دیہاتی مزدوروں میں بہت ہمّت اور جانفشانی ہے جو وہاں کے پڑھے لکھے لوگوں میں نہیں دیکھی جاتی۔ پڑھے لکھے طبقے کے لوگ صوبہ کے باہر بہت کم ملتے ہیں۔ مگر بے پڑھے لکھے مزدور ایک

طرف بمبئی میں مجھے اتفاق سے مل گئے تو دوسری طرف برما، بنگال اور آسام میں پھیلے ہوئے تھے۔ تو کیا انگریزی تعلیم ہمارے صوبہ کے لوگوں کو بزدل اور نکما بنا دیتی ہے۔

اِس سلسلہ میں ایک بات اور یاد آجاتی ہے۔ یہ بیچارے غریب مزدور بنگال اور آسام وغیرہ میں جاکر مزدوری کرتے ہیں۔ وہاں کے کھیتوں کو کاشت کرتے ہیں۔ اور فصل تیار ہونے پر کاٹتے ہیں، پالکی ڈھوتے ہیں، بیل گاڑی ہانکتے ہیں مٹی کھودنے کے کام پر تو گویا ان لوگوں کا اکھنڈ راج ہے۔ گاؤں میں تالاب اور کنوئیں کھودنا، مکان بنانا وغیرہ جتنے ضروری کام ہیں سبھی کرتے ہیں۔ مال دار لوگوں کے گھروں میں نوکری کرتے ہیں، خدمت گاری اور پہرہ داری دونوں کام زیادہ تر انہی لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ اِس طرح بنگال، آسام وغیرہ سے بہار کے گاؤں میں بہت پیسے آیا کرتے ہیں۔ خاص کر سارن ضلع میں۔ زیرادیئی گاؤں میں، ڈاک خانہ میں جب کماؤ لوگ باہر گئے رہتے ہیں۔ تب تقریباً فی ہفتہ چار پانچ ہزار روپے منی آرڈر کے ذریعے آیا کرتے ہیں۔ لوگوں نے حساب لگایا ہے کہ اِس طرح بہار کے گاؤں میں باہر سے تقریباً ۵ کروڑ روپیہ سالانہ آیا کرتا تھا۔ کچھ بھائیوں کا کہنا تھا کہ بہار کے لوگ بنگالیوں کی شکایت کرتے ہیں کہ وہ بہار میں آکر بہت روپیہ پیدا کیا کرتے ہیں جب کہ بہاری اتنے زیادہ پیسے بنگال سے لاتے ہیں۔ یہ بات سچ ہے کہ بہاری اس بات کی شکایت کیا کرتے ہیں۔ خاص کر تعلیم یافتہ بہاری، جن کو بنگالیوں کے ساتھ سرکاری دفتروں اور وکالت خانوں میں مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ معلوم نہیں کہ اس طرح سرکاری دفتروں کے کلرک، راجوں، مہاراجوں کی نوکری کرنے والے، بابو، کالجوں اور اسکولوں کے معلم، وکیل، ڈاکٹر وغیرہ بہار سے

کتنا لے جاتے ہیں، کیونکہ ان کے روپے تو غریبوں کی طرح چھوٹے چھوٹے منی آرڈروں میں جاتے نہیں ہیں۔ اور یہ کہنا مشکل ہے کہ حساب لگانے پر بہار منافع میں پایا جائے گا یا بنگال۔ مگر ایک بات واضح ہے کہ بہاری لوگ بنگال میں جاکر ایسے ضروری کام کرتے ہیں جن کے بغیر وہاں کے لوگوں کو زندگی گزارنا ہی کٹھن ہو جائے۔ اور جن کی ضرورت بنگالی بھائی محسوس کرتے ہیں۔ مگر بہار میں بنگالی ایسا کام کرتے ہیں جن کے بارے میں پڑھے لکھے بہاری چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بنگالی اگر اُن کاموں پر نہ آئیں تو ان کا کچھ نقصان نہیں ہوگا۔ اور وہ خود ہی سنبھال لیں گے۔ اِن کے سوا جتنا سیکڑوں بہاری ایڑی چوٹی کا پسینہ ایک کر کے اور ملیریا کا شکار بن کر پیدا کرتے ہیں، اتنا ایک بنگالی حکومت کی کرسی پر بیٹھ کر آرام کرتے ہوئے پیدا کر لیتا ہے۔ بہرحال اس قسم کی بددلی بہت دنوں سے چلی آرہی ہے۔ نوکری پیشہ لوگوں میں بنگالی اور بہاری میں کافی مقابلہ ہے۔ غریبوں کی بات تو شاید ہی کسی کے دھیان میں آتی ہے۔

اِسی جھگڑے کی وجہ سے کانگریسی وزارت کے زمانے میں بہار میں بہت تحریک چلی۔ ایک طرف بہاریوں کو شکایت تھی کہ بہت سے صیغوں میں دفتریں اور سرکاری عہدوں پر اُسی وقت سے۔ جب بنگال اور بہار ایک ساتھ تھے۔ بنگالیوں نے قبضہ کر رکھا ہے اور الگ صوبہ قائم ہونے سے تقریباً تیس برسوں کے بعد بھی اُن کا ویسا ہی عمل دخل ہے۔ دوسری طرف بنگالیوں کا کہنا تھا کہ بہتیرے بنگالی صرف زبان تو بنگلہ بولتے ہیں مگر وہ بہار میں بس کر بہاری ہو گئے ہیں۔ اس لئے اُنہیں سرکاری نوکریاں دینے میں کسی قسم کا بنگالی۔ بہاری تفریق کرنا مناسب نہیں۔ اُن کی شکایت تھی کہ اِس طرح کی تفریق کی جاتی ہے۔ یہ شکایت کانگریس تک پہنچی۔

اور جس زمانے میں شری سبھاش چندر بوس کانگریس کے صدر تھے، اُس زمانے میں ورکنگ کمیٹی نے تحقیقات کر کے رپورٹ دینے کا بار مجھ پر ڈالا۔

میں نے سب باتوں کی جانچ پڑتال کر کے ایک طویل رپورٹ دی جس میں تاریخی پس منظر دینے کے سوا آئندہ کے لئے بھی حل پیش کئے کہ سب کے ساتھ انصاف کا سلوک کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ ورکنگ کمیٹی نے میری رپورٹ کو منصفانہ سمجھ کر منظور کر لیا اور کانگریسی وزارت کو اسی کے مطابق کام کرنے کی ہدایت کی۔ میرا قیاس ہے کہ میری سفارشوں کو منظور کیا اگرچہ کسی ایک فریق کے سارے مطالبے اُس میں منظور نہیں کئے گئے تھے۔ پھر بھی لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ جو میں نے کہا ہے وہ ایک طرح ٹھیک ہی ہے۔

جب میں دیہات سے واپس ہو کر ڈھاکہ شہر میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ ڈھاکہ کے فساد کے متعلق حکومت نے جانچ کرانے کا فیصلہ کیا ہے اور سرکاری طور پر بنگال کے مستقل قنصل میرے پُرانے دلی دوست شری یوگیندر نارائن موزمدار پیروی کے لئے بھیجے گئے ہیں۔ بہت دنوں سے اُن سے ملاقات نہیں ہوئی تھی اور اس موقع کو اچھا سمجھ کر میں اُن سے ملنے گیا۔ وہ ندی کے ایک چھوٹے اسٹیمر میں ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔ اُن سے باتیں کر رہی رہا تھا کہ خبر آئی ڈھاکہ شہر میں پھر خون خرابہ شروع ہو گیا اور ایک دو آدمیوں کو چھرا گھونپ دیا گیا۔ مجھے دوسرے ہی دن چلا آنا تھا۔ رات کو بھی یہ کام جاری رہا۔ سویرے معلوم ہوا کہ شہر میں بڑی ہلچل ہے اور کئی آدمی چھُروں کے شکار ہو گئے ہیں ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ہندوؤں کو اگر پتہ لگ گیا کہ مسلمانوں نے کسی محلہ میں ایک یا دو ہندوؤں کو چھُرا اتار دیا تو دو چار گھنٹوں کے اندر کسی نہ کسی محلہ

میں اُننے ہی مسلمانوں کو چُھرے گھونپ دیئے جاتے تھے۔ اِس طرح کا مقابلہ ہندو مسلمانوں میں چل رہا تھا۔ مارنے والے اِس بات کا خیال نہیں کرتے تھے کہ جو مارا گیا اُس نے کیا قصور کیا تھا۔ مارنے والے تو محفوظ رہ جاتے تھے اور چپ چاپ اپنی راہ آنے جانے والے بے گناہ بے قصور۔ ہندو ہوں یا مسلمان۔ بے سبب مارے جاتے تھے۔ دوپہر کو ہمارے روانہ ہونے تک آٹھ دس خون ہو چکے تھے تحقیقات کا کام اِن حالات میں ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اِس لئے تحقیقات ملتوی کر دی گئی۔ اور جس جہاز سے میں واپس ہوا اُسی جہاز سے یوگیندر بابو بھی کلکتہ واپس آئے۔

کلکتہ سے میں سیدھے پٹنہ واپس آیا۔ میں پٹنہ میں جون ۱۹۴۱ء کے آخر میں پہنچا۔ راستہ میں ہی جو کھانسی دمہ شروع ہوا تھا، وہ بہت بڑھ گیا۔ بخار بھی ہو گیا۔ میں پٹنہ ہی میں رک گیا۔ برسات بھی شروع ہو گئی۔ تقریباً دو مہینے تک میں وہیں پڑا رہا۔ آخر انفرادی ستیہ گرہ میں قید ہوئے چھوٹنے لگے۔ خاص کر بابو سری کرشن سنہا، انوگرہ بابو وغیرہ خاص لوگ رہا ہو گئے۔ اُن سے ملاقات کر کے اور ضلع بورڈوں اور میونسپلٹیوں سے کانگریسی ممبروں کے نکل آنے کی ہدایت دے کر میں درستیِ صحت کے لئے واردھا چلا گیا۔

کرپس اسکیم

جب میں ڈھاکہ میں تھا تبھی جرمنی نے روس کے ساتھ جنگ کا اعلان کر دیا بہت زوروں سے روس میں جرمن فوج داخل ہو کر آگے بڑھنے لگی۔ تھوڑے ہی دنوں میں روس کے بہت بڑے حصّہ پر جرمنی نے قبضہ کر لیا۔ یہ لڑائی بہت بڑے پیمانہ پر ہو رہی تھی۔ روس کے شمالی سرے سے لے کر جنوبی سرے تک جرمن اور روسی فوجوں میں ٹکّر ہو رہی تھی۔ جرمنی نے مغرب میں ہسپانیہ (اسپین) اور پُرتگال شمال میں سویڈن اور جنوب میں اٹلی کو چھوڑ کر یورپ کے تقریبًا سبھی ملکوں پر قبضہ کر لیا تھا۔ اسپین میں فرانکو کا عمل دخل تھا، جس کو ڈکٹیٹر بنانے میں جرمنی نے بہت مدد دی تھی۔ اِس لئے وہ جرمنی کا بہت احسان مند تھا۔ سویڈن بہت کچھ دب گیا تھا۔ اٹلی بھی لڑائی میں جرمنی کا شریک ہو گیا تھا۔ مندرجۂ بالا شکست خوردہ ملکوں میں کچھ لوگ چھپ چھپ کر گوریلا لڑائی جابجا جرمنی سے کر رہے تھے۔ مگر زیادہ تر مقاموں پر جرمن حکومت چل رہی تھی یا جرمنی نے ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں اختیارات دے رکھے تھے جو اس کی طرف سے حکومت کر رہے تھے۔

امریکہ کی ہمدردی انگلستان کے ساتھ تھی - جہاز ہتھیار وغیرہ دے کر وہ انگریزوں کو مدد بھی پہنچا رہا تھا - مگر کھُلم کھُلا ابھی لڑائی میں نہیں اترا تھا - اُدھر جاپان بھی چین کے بہت بڑے حصّہ پر قبضہ کر چکا تھا اور دن پر دن آگے بڑھتا جا رہا تھا - امریکہ تو چین کی مدد کرنا چاہتا تھا مگر اس کو مدد پہنچانے کا ایک ہی راستہ تھا جو خطرے سے خالی نہیں تھا - وہ راستہ تھا برما ہو کر - انگریز جاپان کو ناخوش نہیں کرنا چاہتے تھے - اس لئے انہوں نے برما کا راستہ بند کر دیا - چین ایک طرح سے ناچار ہوتا جا رہا تھا - جاپان اِس تاک میں تھا کہ موقع پا کر امریکہ سے بدلہ لے - یہ موقع ۱۹۴۱ء کے موسمِ سرما کے آغاز میں اس نے ڈھونڈ نکالا اور امریکہ کے پرل ہاربر پر دھاوا بول کر امریکہ کی بحری طاقت کو زبردست نقصان پہنچایا - اُس نے امریکہ اور ہالینڈ سے بھی لڑائی ٹھان لی اور جرمنی اور اٹلی کے ساتھ دوستی گانٹھ لی - ۱۹۴۱ء کے نومبر سے شروع کر کے تھوڑے ہی دنوں میں اُس نے جنوب مشرقی ایشیا کے بہت بڑے حصّہ پر سکّہ جما لیا - ڈچ نوآبادیاں جیسے جاوا، سماترا، بورنیو اور دوسرے جزیرے اُس کے قبضہ میں آ گئے - انگریزوں سے سنگاپور اُس نے جلد ہی جیت لیا - ملایا پر دخل جماتے ہوئے وہ برما کی طرف آگے بڑھا - جلد ہی مولمین، رنگون، مانڈلے وغیرہ برمی شہروں پر قبضہ جما کر تقریباً سارے برما کو ہی ہڑپ کر لیا - لڑائی چھڑنے کے ایک دو دن کے اندر ہی اُس نے برطانوی بحری بیڑے کو سنگاپور کے قریب کہیں ایک ترائی میں زبردست شکست دی - پرنس آف ویلز نام کے بہت بڑے جہاز پر انگریزی امیر البحر مسٹر فلپ بہت فخر کر کے یہ اعلان کرتے ہوئے نکلا تھا کہ وہ جاپانی بحری بیڑے کی تلاش میں جا رہا ہے - اُسے جاپان نے ڈبو دیا -

شمالی افریقہ میں برطانوی لوگوں کی کچھ نوآبادیاں ہیں - وہاں سے انگریزوں سے لڑائی

ٹھن گئی ۔ اور جرمن پہنچ گئے ۔ انہوں نے چند مہینوں کے اندر ہی شمالی افریقہ کو تقریباً مصر کی حد تک اپنے چنگل میں کر لیا ۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بھی ملک اب جرمنی اور جاپان کی فوجوں کے سیلاب کو روک نہ سکے گا ۔ سردی کی وجہ سے روس میں جرمن فوج کو رک جانا پڑا ۔ مگر وہ پیچھے نہیں ہٹی ۔ جہاں تک پہنچ گئی وہیں ڈٹی رہی ۱۹۴۲ء کے ابتدائی مہینوں میں ایسی حالت معلوم ہوتی تھی کہ لڑائی میں امریکہ کے آجانے سے برطانیہ میں پھر سے جان تو آگئی لیکن ابھی جرمن فوج اور جاپانی فوج کا مقابلہ کوئی نہیں کر سکتا تھا ۔ امریکہ بہت بڑے پیمانہ پر فوجی سامان ، بحری بیڑہ اور پیدل فوج تیار کرنے لگا ۔ وہ اِن سبھی ملکوں کو ہتھیار وغیرہ پہنچانے لگا جو حلیفان جنگ کی طرف سے لڑنا چاہتے تھے ۔ اُس کی پوری شکتی کو منظم طریقہ سے لڑائی میں پوری مدد پہنچانے میں وقت کا سوال تھا اور ۱۹۴۲ء کے ابتدائی زمانے تک وہ وقت نہیں آیا تھا جرمنی کے خلاف یہ شکایت کی جاتی تھی کہ جو ملک اس کا ساتھ دینے کو تیار نہیں ہوتے ۔ اُن پر دھاوا بول کر وہ قبضہ کر لیتا ۔ مگر اِس عیب سے انگریز اور اُن کے ساتھی ملک بھی بری نہیں تھے ۔ اُن کو ڈر تھا کہ جرمن اور جاپانی فوجوں کا سنگم ہندوستان میں کسی وقت ہو سکتا ہے ۔ اِسی کو روکنے کے لئے انگریز ایک طرف برما کی سرحد پر لڑنا چاہتے تھے ۔ ایک اور مورچہ عرب اور ایران میں بنانا چاہتے تھے ۔ اِس لئے انھوں نے عرب اور ایران پر بھی قبضہ کر لیا ۔ ایران کے بادشاہ رضا شاہ پہلوی کو جس نے ۱۹۱۸ء ۔ ۱۹۴۱ء کی جنگ کے زمانے میں ایران کو مضبوط بنانے کی کوشش کی تھی اور جو وہاں کے لوگوں کی ترقی کرنے میں بہت کچھ کامیاب بھی ہوا تھا ، تخت سے اتار کر ملک بدر کر دیا ۔ پھر کیا تھا روسی اور انگریزی نیز امریکی فوجوں کا ایک بہت بڑا اڈہ اس ملک میں بن گیا ۔ مشترکہ مصیبت کے زمانے میں دشمن بھی دوست

بن جاتے ہیں۔ مسٹر چرچل نے روس کے ساتھ جس کی مخالفت اُنھوں نے زندگی بھر کی تھی، اور جس کو نہ معلوم کتنی گالیاں دی تھیں دوستی کر لی۔ ایسا معلوم ہوا کہ پچھلی ساری باتیں دونوں بھول گئے۔

ایسی حالت میں انگلستان نے یہ سوچا کہ ہندوستان کے ساتھ کچھ طے کر لینا چاہئے سر اسٹیفورڈ کرپس جو انگلستان کے سفیر بنا کر اُس زمانے میں روس بھیجے گئے تھے جب جرمنی اور روس کی دوستی تھی اور جنھوں نے روس کو جرمنی کے خلاف بہت کچھ اکسانے میں مدد کی تھی۔ لڑائی ٹھن جانے پر انگلستان واپس آ گئے۔ تب وہاں کی جنگی کونسل کے وہ خاص ممبر بن گئے۔ اپنے ترقی پسند خیالات کی وجہ سے وہ لیبر پارٹی سے بھی الگ کر دیئے گئے تھے۔ مگر اس سخت دور میں اپنی قابلیت کی وجہ سے اور خاص کر روس میں جو شہرت کما چکے تھے، اُس کی وجہ سے وہ بہت ہر دل عزیز ہو گئے۔ اُنھوں نے برٹش کیبنٹ کو اس بات کے لئے تیار کیا کہ ہندوستان کے ساتھ کچھ سمجھوتہ کر لینا چاہیے۔ کیبنٹ (کابینہ) نے جس میں لبرل پارٹی اور لیبر پارٹی کے بھی ممبر شامل تھے۔ ایک اسکیم تیار کی۔ اُسے لے کر سر اسٹیفورڈ کرپس ہندوستان آئے۔ یہ اسکیم پہلے ظاہر نہیں کی گئی۔ بہت ہی دھوم دھام کئے یہ کہتے ہوئے کہ ہندوستان کے یہ بہت ہی اہم اسکیم ہے۔ اُسے ہندوستان سے منظور کرا لینے کا بیڑہ اٹھا کر وہ مارچ ۱۹۴۲ء میں ہندوستان پہنچے۔ پہنچتے ہی صدر کانگریس مولانا آزاد، گاندھی جی اور دوسرے لیڈروں سے ملاقات شروع کر دی۔ کچھ دنوں کے بعد اسکیم بھی شائع کر دی گئی۔ ورکنگ کمیٹی کی نشست دلی میں ہوئی۔ ہم سبھی وہاں تقریباً دو تین ہفتے اِسی پر غور کرتے رہے۔ شروع میں کچھ وقت گاندھی جی بھی دلّی میں رہے مگر کستوربا گاندھی کی خرابیِ صحت کی وجہ سے وہ سیواگرام چلے گئے۔ کانگریس کی

طرف سے مولانا آزاد اور پنڈت نہرو بات چیت کرتے رہے۔ ورکنگ کمیٹی کے سبھی ممبر دلّی میں ٹھہرے تھے۔ جو باتیں ہوتیں ان پر غور کرنے کے لئے برابر ورکنگ کمیٹی کی نشستیں ہوتی رہتیں۔

کرپس اسکیم دو خاص حصّوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔ اس کے پہلے حصّہ میں ہندوستان کا آئندہ آئین بنانے کا طریقہ بتایا گیا۔ دوسرے میں یہ بتایا گیا کہ عارضی طور پر حکومتِ ہند کا کام چلانے کے لئے وائسرائے کی موجودہ کونسل میں کیا تبدیلی ہوگی۔

اس میں آئندہ کے بارے میں یہ صاف کر دیا گیا تھا کہ لڑائی کے بعد ہندوستان کو وہی مقام ملے گا جو دوسری نوآبادیوں کا ہے اور اگر وہ چاہے تو سامراج سے الگ ہو جانے کا بھی حق ہوگا۔ آئین سازی کے لئے ایک مجلس بنے گی جسے صوبائی اسمبلیاں چنیں گی۔ ہر صوبہ کو اختیار ہوگا کہ اگر وہ چاہے تو اپنے آپ کو ہندوستان کے فیڈریشن سے الگ کرلے اور اگر کسی صوبہ نے ایسا کیا تو برٹش سرکار کا اس سے وہی تعلق ہوگا جو باقی ہندوستان یا ہندوستانی یونین کے ساتھ ہوگا۔ اس طرح اس اسکیم نے مسلم لیگ کا مطالبہ مان لیا اور پاکستان کے قیام کو صوبوں پر چھوڑ رکھا فوری اعتبار سے اس اسکیم میں یہ نہیں کہا گیا تھا کہ وائسرائے کی کونسل کو اختیار دیا جائے گا۔ اس میں صرف اتنا ہی تھا کہ اُسے فوج کے متعلق اور جنگ کے متعلق کوئی اختیار نہیں ہوگا۔ جس کا مطلب لوگوں نے عام طور سے یہی لگایا کہ دوسرے صیغوں اور محکموں میں کونسل کو اختیار ملے گا۔ پوچھنے پر کرپس صاحب نے کچھ ایسا ہی کہہ بھی دیا۔

گاندھی جی کو اس اسکیم سے اطمینان نہیں ہوا۔ انھوں نے ملاقات میں سر کرپس سے کہہ بھی دیا۔ ورکنگ کمیٹی کے خیال میں بھی یہ اسکیم قابل قبول نہیں ثابت ہوئی۔

مگر اُس نے بہت وقت دے کر اِس پر فیصلہ کیا۔ آئندہ کے بارے میں اگرچہ ایک طریقہ سے پاکستان کی بات یہ اسکیم مان لیتی تھی اور اُسے ورکنگ کمیٹی ماننا نہیں چاہتی تھی۔ تب بھی ورکنگ کمیٹی یہ سمجھتی تھی اور اُس نے اپنے فیصلہ میں یہ کہا بھی کہ یہ بات اگر ثابت ہو جائے کہ کسی صوبے کے لوگ الگ ہونا چاہتے ہیں تو اُسے وہ زبردستی اپنے ساتھ رکھنا بھی خود فیصلگی کے اُصول کے خلاف سمجھتی ہے۔ اس کی خاص توجہ تو فوری کام کے لئے مجوّزہ کونسل پر تھی، کیونکہ وہ مانتی تھی کہ لڑائی کے زمانے میں سارا بوجھ اُس پر پڑے گا اور اس میں، اگر کچھ اختیار ہندوستانیوں کو نہیں ملنا ہے تو اس بوجھ کو ہندوستان کے مفاد کے خیال سے ہندوستانیوں کے لئے اُٹھانا غیر مناسب ہی نہیں بلکہ غیر ممکن یا کم سے کم دشوار تو ضرور ہی ہوگا۔ اِس لئے اُس نے اِس بات کو پوری طرح صاف کر لینا چاہا کہ جنگ سے یا فوج سے تعلق رکھنے والا کوئی بھی اختیار کونسل کو ہوگا یا نہیں یا سب کچھ وائسرائے یا جنگی لاٹ کے ہی ہاتھوں میں ہوگا۔ بات چیت کے بعد انھوں نے کچھ تھوڑا سا نام نہاد اختیار کونسل کے ہندوستانی ممبروں کے ہاتھوں میں دینا بھی منظور کر لیا۔ مگر جب پوچھا گیا کہ وہ اختیار کون سا اور کیا ہوگا تو معلوم ہوا کہ وہ بالکل برائے نام ہوگا جس میں کچھ بھی اختیار حقیقتاً منتقل نہیں ہوگا۔

ورکنگ کمیٹی کو جب یہ بات صاف صاف معلوم ہو گئی تو اُس نے یہ طے کیا کہ وہ اسکیم کو منظور نہیں کرے گی۔ لیکن ابھی تک اُس کا یہی خیال تھا کہ فوج اور جنگ کے معاملوں کو چھوڑ کر دوسرے معاملوں میں کونسل کو پورا اختیار ہوگا اور وائسرائے اُس کی مرضی کے مطابق ہی کام کرے گا۔ ساتھ ہی یہ بھی ظاہر تھا کہ لڑائی کے دنوں میں دوسرے حصوں میں کچھ خاص کام تو ہوگا نہیں اور لڑائی ایسی چیز ہے جس کو چلانے میں سرکار

کو ساری طاقت لگانی پڑے گی۔ دوسرے صیغوں کو بھی اِسی کام میں لگ جانا پڑے گا۔
اِس طرح وہ بھی ایک طرح سے فوج اور لڑائی کے محکموں کے ہی ماتحت ہو جائیں گے
اِس لئے اُنہیں اختیار ملنے کی بھی کوئی اہمیت نہیں رہ جائے گی۔ ورکنگ کمیٹی کے
یہ فیصلہ کر لینے کے پہلے ہی جب یہ سب بات کہی گئی تھی تو سر کرپس نے کہا تھا کہ ورکنگ
کمیٹی اپنے فیصلہ کو ملتوی رکھے اور وہ کیبنٹ سے اِس بارے میں خط و کتابت کریں گے
اِسی خط و کتابت کا یہ نتیجہ تھا کہ فوج کے متعلق نام نہاد اختیار دینے کی بات ہوئی تھی۔
جب اِس پر بھی غور کرنے کے بعد اسی نتیجہ پر پہنچے کہ کچھ بھی حقیقی اختیار نہیں ملتا تو
اُس کے سامنے اسکیم کو نامنظور کرنے کے علاوہ دوسرا راستہ ہی رہ گیا۔ اُس نے
یہ فیصلہ بھی کر لیا۔ عین اُسی زمانے میں صدر روزولٹ کے خاص سفیر کرنل جانسن دلّی
پہنچے۔ پنڈت جواہر لال نہرو سے اُن کی ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے کہا کہ کچھ وقت دیجئے
میں بھی کوشش کر کے دیکھوں کہ کچھ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اُن کی کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ
جو بات سر کرپس نے فوج کے بارے میں خط و کتابت کے بعد کہی تھی اُس کی شکل میں
تبدیلی ہوئی۔ کیبنٹ کی تجویز تھی کہ فوج کے متعلق کچھ باتوں کو چھوڑ کر اور سبھی باتیں جنگی
لاٹ کے تحت ہوں گی۔ اب یہ تجویز آئی کہ حسبِ ذیل باتیں جنگی لاٹ کے ماتحت ہوں گی
اور باقی سب باتیں ممبر کے ماتحت۔

دیکھنے میں بات اچھی لگی مگر سوال یہ تھا کہ حسب ذیل باتوں میں کونسی باتیں ہونگی۔ پوچھنے پر کچھ
صیغوں کے نام بتا دیئے گئے۔ کرنل جانسن بھی اس بات کو نہیں جانتے تھے کہ صیغوں کے نام جو دیئے گئے
تھے انکے باہر کون باتیں رہ گئی تھیں جو ممبروں کے اختیار میں آئیں گی۔ آخر میں بہت پوچھ گچھ
کے بعد معلوم ہوا کہ صرف وہی باتیں ہوں گی جو کیبنٹ کی تجویز میں پہلے کہی گئی تھیں

اُن سے کچھ بھی زیادہ نہیں ۔اِس سے واضح ہوگیا کہ یہ لفظی ہیر پھیر تھا۔کوئی حقیقی فرق نہیں تھا۔ یہ ہم لوگوں کو بُرا معلوم ہوا ۔اِس پر بھی ہم سوچنے لگے کہ فوج اور جنگ کے متعلق اختیار اگر نہیں ملتے ہیں تو نہ سہی مگر دوسرے صیغوں میں اختیار ملتے ہیں تو اُن پر اطمینان کیا جا سکتا ہے ۔مگر یہ جان لینا چاہیئے کہ وہ بھی کہاں تک حقیقی صورت میں ملتا ہے۔ پوچھنے پر سر اسٹیفورڈ کرپس نے کہا کہ اِس بارے میں وائسرائے سے ہی باتیں کرنی ہوں گی کیونکہ یہ بات، ان کی کونسل سے تعلق رکھتی ہے اور جب تک قانون نہیں بدلتا تو مروجہ قانون کے مطابق اُن کو بڑا اختیار رہیں اُن کے متعلق وہی کچھ کہہ سکتے ہیں۔جب کہا گیا کہ کیبنٹ اُنہیں ہدایت کرے کہ وہ اپنے اختیارات کو کام میں نہ لائیں اور اِن معاملوں میں کونسل کی رائے کے مطابق ہی کام کیا کریں تو جواب ملا کہ کیبنٹ اس قسم کی ہدایت نہیں دے سکتی۔ ہم لوگوں کو یہ پوری طرح معلوم تھا کہ کونسل کے ممبروں کی کوئی حیثیت وائسرائے نہیں مانتے تھے ۔وہ مانتے اور کہا بھی کرتے تھے کہ ممبروں کو کوئی اختیار نہیں ہے ۔ بالآخر سارا اختیار وائسرائے کو ہی ہے اور اُسے وہ چھوڑنا نہیں چاہیئے ۔

جب یہ ظاہر ہو گیا کہ ان صیغوں میں بھی اختیار نہیں ملتا اور جو باتیں سر کرپس نے پہلے کہی تھیں کہ کیبنٹ کی طرح کونسل بھی با اختیار ہوگی اور کام کرے گی۔ وہ صرف بات بنانا تھا اُس میں کچھ بھی حقیقت نہیں تھی تو ورکنگ کمیٹی اسے نامنظور کرنے سوا اور کچھ کر ہی نہ سکی۔ویسی ہی قرارداد پاس کر کے بھیج دی گئی۔سر کرپس نے بھی اسی دن اعلان کر دیا کہ وہ واپس جا رہے ہیں اور جو بات کیبنٹ کی طرف سے ہندوستان کے سامنے پیش کی گئی تھی وہ واپس لی جاتی ہے ۔مسلم لیگ کانگرس کے فیصلہ کا انتظار کر رہی تھی اور جیسے ہی ہم نے فیصلہ کیا اُس نے بھی فیصلہ کو نامنظور کر دیا۔ مگر وجہ یہ بتائی کہ اُس

میں پاکستان نہیں دیا گیا ہے، صرف اُس کا امکان ہے اور وہ صرف اتنے سے مطمئن نہیں ہے۔

اس طرح کانگریس اور لیگ دونوں ہی نے اسکیم کو نامنظور کر دیا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی مانتی تھی کہ پاکستان کا امکان بتانا بھی ٹھیک نہیں تھا۔ اگر کوئی صوبہ سچ مچ الگ ہونے کی خواہش رکھتا ہے تو اس کا پورا ثبوت مل جانے پر اسے زبردستی ساتھ رکھنا خود فیصلگی کے اصول کے خلاف ہوگا، تو بھی اس نے اِس بنیاد پر نامنظور نہیں کیا تھا۔ اُس کی نامنظوری کا سبب یہ تھا کہ فوری طور پر کچھ اختیار نہیں مل رہے تھے۔ اگرچہ کونسل پر جنگ میں مدد کرنے کا بار پورا پورا آجاتا تھا، جس کا مطلب صرف اتنا ہی تھا کہ چندہ اور ٹیکس وصول کرنے اور رنگروٹ بھرتی کرنے اور کرانے کے سوا، اُس کو کوئی دوسرا اختیار نہیں ملتا۔ لیگ کی نامنظوری کا سبب فوری طور پر نہ ملنے والے اختیارات سے تعلق نہیں رکھتا تھا۔ وہ سبب تو صرف لیگی مسلمانوں کی رائے کے مطابق فوراً پاکستان قائم نہ کرنا تھا۔

ورکنگ کمیٹی کے اندر شری راج گوپال آچاری کا خیال تھا کہ کرپس اسکیم کو مان لینا چاہیئے۔ اُنھوں نے ہی اِس بات پر زور دیا تھا کہ اس کے ذریعہ والسرائے کی کونسل کے ممبروں کو فوج اور جنگ چھوڑ کر اور سب محکموں پر پورا اختیار مل جاتا ہے۔ مگر جب آخر میں یہ واضح ہو گیا ہو گیا کہ اس معاملہ میں بھی کچھ فرق ہونے والا نہیں ہے اور والسرائے اپنی من مانی کرنے کے اختیار میں کسی قسم کی کمی آنے دینا نہیں چاہتے ہیں تو اُن کا مونہہ بھی بند ہو گیا۔ ورکنگ کمیٹی کے اِس فیصلے کے بارے میں ورکنگ کمیٹی کے اندر بھی بہت لوگوں کو بہت غلط فہمی رہی جیسا بعد میں جا کر معلوم ہوا مگر ہمارے دل میں کبھی کوئی شبہ نہیں رہا۔ سر کرپس نے بھی کچھ ایسی باتیں کہیں جو بے بنیاد تھیں۔ اُنھوں نے اپنے

ایک بیان میں یہ کہہ دیا کہ اس کی نامنظوری ہندو مسلم جھگڑے کی وجہ سے ہوئی ہے۔ کانگریس اور مسلم لیگ ایک رائے نہیں ہو سکی، تو دونوں نے اُسے نامنظور کر دیا۔ اُن کے بیان کا یہ مفہوم تھا کہ اِس نامنظوری کا قصور کانگریس پر ہی ہے۔ بات یہ تھی کہ اِس معاملہ میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کے سامنے ہندو مسلم جھگڑے یا اختلاف رائے کی بات اِس شکل میں آئی ہی نہیں۔ جس شکل میں لوگوں نے بتایا۔ پاکستان کے متعلق اعلان کے بارے میں ورکنگ کمیٹی میں اسکیم پر اختلاف ضرور تھا، مگر اس نے اِس بنا پر اُسے نامنظور نہیں کیا تھا۔ اِس نامنظوری کا سبب، جیسا پہلے ہی مختصراً کہا گیا ہے، بس ایک ہی تھا اور وہ یہ کہ اِس کے ذریعہ ہندوستانی کونسلروں کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہیں آتا تھا، اس لئے دورانِ جنگ یہ جوابدہی لے کر وہ ملک کا بھلا نہیں کر سکتی تھی اور لڑائی میں مدد کرنے کی ذمہ داری سر پر آجاتی۔ یہ بھی غلط ہے کہ اِس بات پر اختلاف رائے ہوا کہ اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد کتنی کتنی ہوگی۔ جیسا کہ مخالفوں کے بیان سے معلوم ہوتا تھا۔ کونسل میں کتنے ممبر ہوں گے، اُن میں کتنے ہندو اور کتنے مسلمان ہوں گے۔ کتنے کانگریسی اور کتنے لیگی رہیں گے۔ یہ سوال ایک بار بھی ہمارے سامنے نہیں آیا۔ اِس کا موقع بھی نہیں تھا۔ کیونکہ یہ سوال تو تب اٹھتا جب ہم فیصلہ کر لیتے کہ کونسل میں ہمیں جانا چاہیئے۔ ہم نے جب وہاں جانے سے ہی انکار کر دیا تب یہ سوال کیسے اٹھ سکتا تھا کہ ہماری تعداد اُس میں کتنی ہوگی۔ یہ سوال کبھی اٹھا بھی نہیں۔ لیکن ہمارے خلاف یہ پروپیگنڈا بہت کیا گیا۔

کرپس اسکیم کی نامنظوری کے بعد

کرپس اسکیم کی نامنظوری ورکنگ کمیٹی نے کی تھی۔ اب اُس پر غور کرنے کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ضروری تھا جو الہ آباد میں تھوڑے ہی دنوں بعد ہوا۔ یہ بات اب صاف نظر آنے لگی کہ معاملہ نامنظوری تک ہی نہ رہے گا۔ کانگریس کو اپنی پالیسی بتانے کے لئے کچھ اور ہی کرنا پڑے گا۔ جاپان تیزی سے آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ انگریزی فوج اُس کا مقابلہ نہ کرسکتی تھی۔ ہندوستان میں اِس مقابلہ کے لئے پوری تیاری بھی نہیں تھی۔ بڑی تیزی کے ساتھ انگریزی اور امریکی فوجیں یہاں لائی جا رہی تھیں۔ ہتھیار بھی لائے جا رہے تھے مگر ابھی ایسا نہیں معلوم ہوتا تھا کہ مقابلہ کامیاب ہو سکے گا۔ ملک کے سامنے سوال یہ تھا کہ جاپان اگر آگیا تو کیا ہندوستان اس کے آگے سر جھکا کر اس کا استقبال کرے گا۔ یا اُس کا مقابلہ کرے گا۔ انگریزی حکومت جس نے ہندوستان کی حفاظت کا بار اپنے اوپر لے رکھا تھا، ناطاقت معلوم ہوتی تھی۔ مگر اب اِس ناطاقتی کے باوجود ہمارے ساتھ سمجھوتہ کر کے ہم کو اِس کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی کہ ہم بھی اپنے ملک کی حفاظت میں ہاتھ بٹا سکیں۔ گاندھی جی کی غیر متشدد طریقہ پر مقابلہ کرنے کی حکمتِ عملی کو

ورکنگ کمیٹی نے ایک طرح سے چھوڑ دیا تھا۔ وہ مسلح طریقہ پر انگریزی فوج کے ساتھ شانہ بہ شانہ جاپان کا مقابلہ کرنے کی تیاری کا اعلان کر چکی تھی۔ اور کرنا بھی چاہتی تھی۔ مگر وہ ایسا جبھی کر سکتی تھی جب وہ بھی انگریزوں کی برابری میں با اختیار طریقہ پر کام کر سکے۔ انگریز یہ پسند نہیں کرتے تھے وہ چاہتے تھے کہ ہندوستان جو کچھ مدد کر سکتا ہے کرے مگر اُسے غلامی سے نجات نہیں دینا چاہتے تھے۔ مسٹر چرچل نے بار بار یہ کہا تھا کہ برطانیہ کسی نئے ملک کو اپنے قبضہ میں رکھنے کا لالچ نہیں رکھتا مگر ساتھ ہی ساتھ جو اُس کا ہے اُسے چھوڑنا بھی نہیں چاہتا۔ یہ ظاہر تھا کہ ہندوستان تو اُس کا مقبوضہ تھا ہی اور اُسے وہ مصیبت کے زمانے میں بھی چھوڑنا نہیں چاہتا تھا۔ نازک لمحوں میں اُنھوں نے فرانس سے کہا تھا کہ برٹش سامراج اور فرانسیسی سامراج دونوں ملا دیئے جائیں وہی برٹش سامراج جسے کتنی لڑائیوں اور کتنی خونریزیوں کے بعد برطانیہ نے فرانس سے جیتا تھا۔ مگر ہندوستانیوں کا اپنے بالمقابل بیٹھنا برطانیہ کو گوارا نہیں تھا۔ انگریز اِس کے لئے تیار نہیں تھے کہ ہندوستانیوں کو اپنے ملک میں با اختیار طریقہ پر جاپانیوں کا مقابلہ کرنے کا موقع دیا جائے۔

ایسی حالت میں ہمارے سامنے سوال یہ تھا کہ ہم اپنی حفاظت کس طرح کریں؟ لوگوں میں اگر حوصلہ نہ رہا تو جاپانی آسانی سے قبضہ کر لیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ ایسے ہوں جو یہ سمجھتے ہوں کہ انگریز اگر کسی طرح ہٹے اور جاپانی اگر بیٹھ بھی جائیں تو خاص تشویش کی بات نہیں، بعد میں اُن سے نبٹ لیں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ جاپان سے مدد لے کر انگریزوں کو ہٹانے میں کوئی نقصان نہ دیکھتے ہوں۔ مگر ورکنگ کمیٹی کے اندر یا خاص کانگریسی حضرات میں کوئی بھی ایسا نہیں تھا جو جاپان کو مدد دے کر

یا غیر جانب دار رہ کر برٹش سرکار کو اس ملک کے باہر کرنا چاہتا ہو۔ اِس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ برٹش سرکار کو جاپان سے بہتر سمجھتے تھے۔ مگر ہم جاپان کو برٹش سرکار سے ہرگز اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اس نے چین کے ساتھ جو سلوک کیا تھا، وہ جس طرح چین کو دبا کر اس کے بہت بڑے حصّے کو مُٹھی میں کئے ہوئے تھا۔ اِس کا ایک ہی مطلب ہو سکتا تھا۔ یعنی وہ بھی برطانیہ کی طرح اپنا سامراج وسیع اور مضبوط کرنا چاہتا تھا ایک سامراج سے نکل کر دوسرے سامراج میں جانا کوئی عقلمندی نہیں تھی۔ وہ تو ایسا تھا جیسے چڑھی کڑھائی سے اُچھل کر آگ میں کود پڑنا۔ اِس لئے ہم نے تہیّہ کر لیا تھا کہ ہمیں جاپان کا مقابلہ کرنا ہی پڑے گا۔ کانگریس اپنے اصول کو چھوڑ دینے پر بھی برٹش سرکار اسے مسلح اور با اختیار مقابلہ کا موقع نہیں دینا چاہتی تھی۔ اِس مقابلہ کی تیاری کا اِس کے سوا کوئی اور طریقہ نہ تھا کہ عوام میں مقابلہ کا حوصلہ بڑھایا جائے۔ کیا وہ ملک نو وارِد جاپانیوں کے مقابلہ کے لئے تیار کیا جا سکتا تھا جو قائم شدہ برٹش سامراج کا مقابلہ کرنے میں ناچار تھا۔ یا مقابلہ نہیں کرنا چاہتا تھا؟ ہم سمجھتے تھے کہ ایسی حالت میں، مقابلہ کے لئے ہندوستانیوں کے دل میں آزادی کی آگ دہکانے کے سوا دوسری کوئی تدبیر نہیں ہو سکتی۔

اِس کا نتیجہ برٹش اور جاپان دونوں کے خلاف نکلنا تھا۔ پھر بھی یہ قصور ہمارے سر نہیں تھا، بلکہ برٹش کے سر پر تھا۔ انہوں نے ہمیں آزادی دینے سے ـــــ وہ محدود آزادی بھی جس پر ہم عارضی طور پر رضامند تھے۔ انکار کر دیا۔ برٹش اور جاپانی میں ہماری نظروں میں کیا فرق رہ جاتا تھا۔ ایک نے ہماری آزادی چھین رکھی تھی اور مصیبت کی گھڑی میں بھی جاپان سے مقابلہ کرنے کے لئے ہمیں آزادی دینے پر

راضی نہیں تھا۔ دوسرا ہماری آزادی چھین کر اپنا سامراج قائم کرنا چاہتا تھا۔ ہماری نظروں میں دونوں یکساں ہی تھے۔ کہنے کو تو انگریز کہتے تھے، لڑائی میں ہماری مدد کرو، لڑائی کے بعد تم کو حکومت درجۂ نوآبادیات تمہیں ملے گی اور جاپانی بھی کہتے تھے کہ ہماری مدد کرو، ہم تمہیں آزاد کر دیں گے۔ ہم کس طرح مانتے؟ اس لئے ہم نے تہیہ کیا کہ دونوں میں سے کسی کی بات پر اعتماد نہیں کر سکتے۔ ہمیں اپنی آزادی حاصل کرنے کے لئے خود تیار ہو جانا چاہیئے۔ خواہ انگریز اسے بُرا ہی کیوں نہ مانیں۔

گاندھی جی نے اِن خیالات سے متاثر ہو کر زوردار مضمون لکھنے شروع کر دیئے الہ آباد میں ہونے والی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے لئے ایک قرارداد کا مسودہ تیار کر کے اُنہوں نے میرا بہن کے ہاتھوں وہاں بھیجا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی میں اِس پر بہت بحث و تمحیص ہوئی۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہاں دو رائیں ہیں —— ایک تو گاندھی جی کے مسودہ کے حق میں اور دوسرے وہ لوگ جو اتنی دور نہیں جانا چاہتے تھے اور اِس نظریہ کو منظور نہیں کرتے تھے۔ اِس میں ترمیم کی بہت کوشش کی گئی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ آخر ہم آہنگی قائم رکھنے کے لئے ہم نے اپنا اختلاف ہٹا لیا اور جو کچھ بھی اوروں نے مناسب سمجھا اُسے منظور کر لیا۔ یہ بات ورکنگ کمیٹی میں ہوئی۔ ملک کا رُخ زیادہ تر گاندھی کی طرف تھا۔ اگر وہی مسودہ آل انڈیا کانگریس کمیٹی میں پیش کر دیا گیا ہوتا تو شاید منظور ہو جاتا، لیکن آپس کے اختلاف بھی طشت از بام کر دیتا۔ اگر اپنی طرف سے کچھ کرنا ہی تھا، تو وہ اس طرح آپس کی پھوٹ کو مشتہر کر کے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اِس لئے اِس اختلاف کو دبا دینا ہی مناسب معلوم ہوا اور گاندھی جی کی تجویز کسی شکل میں پیش نہ ہوئی۔ ہاں جو تجویز پیش ہوئی اس میں گاندھی جی کے جذبات

کا کافی دخل تھا۔ جب گاندھی جی نے اُسے دیکھا تو انھوں نے کہا کہ اگرچہ وہ اُسے پورا پسند نہیں کرتے تھے، تو بھی اُس میں ان کے لئے کام کرنے کا کافی موقع تھا۔ اِس لئے وہ اُسے ایک طرح سے منظور کرتے تھے۔

دورانِ جنگ ملک کی حالت

میں الہ آباد سے سیدھے واردھا چلا گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اب برٹش سرکار کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئے بغیر نہ رہے گی۔ گاندھی جی زبردست مضامین لکھ رہے تھے۔ ملک میں بڑی بے چینی تھی۔ ہم لوگوں کے دل میں بھی جلن تھی۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ ایک بار سارے صوبہ کا دورہ کرنا مناسب ہے۔ ایک تو لوگوں کو گاندھی جی کی باتیں بتا دینا ضروری تھا اور آنے والی مصیبت اور نازک زمانے کے لئے لوگوں کو تیار کرنا تھا۔ دوسرے جاپان کے آگے بڑھتے جانے کی وجہ سے لوگوں میں جو دہشت پھیلتی جاتی تھی اُس کا ردِّ عمل کرنا تھا اور لوگوں کو یہ بھی بتانا تھا کہ اگر وہ کہیں ہندوستان کی سرزمین میں پہنچ تو ہمارا کیا فرض ہوگا۔

ان دنوں سرکار کی طرف سے خوب اندھیر گردی تھی۔ سمندر کے کنارے کے گاؤں میں جہاں یہ خوف تھا کہ جاپانی فوج اُتر سکتی ہے، جو تھوڑی بہت فوجی تیاری ہو رہی تھی اس کے سوا یہ پالیسی بھی برتی جا رہی تھی کہ جاپانی فوج اگر پہنچ ہی گئی تو ایسا کر دیا جائے گا کہ اُسے کوئی چیز ہاتھ نہ لگنے پائے۔ اِس لئے کشتیاں ضبط ہو رہی تھیں کہیں

کہیں اُنھیں برباد کر دینے کا کام جاری تھا۔ خاص کر بنگال میں جہاں کشتیوں کے ذریعہ ہی سب کام ہوا کرتے ہیں، اِس کا اثر بہت بڑا پڑ رہا تھا۔ لوگوں کا آنا جانا یا سامان لاد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جانا، یہاں تک کہ چھوٹے چھوٹے بازاروں میں معمولی خرید و فروخت کا کام بھی، ایک طرح سے سب رک گیا تھا جو دھان یا چاول گاؤں میں تھا اُسے بھی سرکار اپنے قبضہ میں کر رہی تھی، تاکہ وہ دشمن کے ہاتھ نہ لگنے پائے۔ بہار میں چھوٹا ناگپور سے لے کر سون ندی تک ایک بڑے مورچے کی تیاری ہو رہی تھی اِس کے لئے بہت جگہوں پر ہوائی اڈوں اور ہوائی جہازوں کے اُترنے کے لئے راستے بنائے جا رہے تھے۔ ہزاروں بیگھ زمین جابجا سرکار لے رہی تھی۔ اُس پر بسے ہوئے عوام اور اُسے جوتنے والے کسان پریشان تھے۔ کہا جاتا تھا کہ زمین اور مکان وغیرہ جو اُنھیں خالی کرنے پڑے تھے۔ اُس کے لئے انھیں معاوضہ ملے گا۔ مگر ابھی تک کسی کو کچھ نہیں مل رہا تھا۔ سب کام بہت تیزی سے چلایا جا رہا تھا۔ شمالی بہار اور چھوٹا ناگ پور میں بہت بڑی انگریزی فوج جمع تھی۔ معلوم نہیں کتنے لاکھ لوگ آ چکے تھے اور کتنے اور آنے والے تھے۔ آسام کی سرحد پر لڑائی پہنچ جانے کے سبب اُدھر فوج کے کام میں ہی ریل گاڑیوں کے زیادہ لگ جانے سے عوام کا کہیں آنا جانا مشکل ہو گیا تھا۔ خاص کر بی۔ این۔ ڈبلو ریلوے میں جو شمالی بہار (ترہٹ) ہو کر اودھ میں جاتی ہے بڑی تکلیف تھی اُس میں فوجی گاڑیاں بہت چلتی تھیں۔ اُس میں کئی تو زخمیوں کو آسام کے مورچے سے لاد کر شمالی ہندوستان کے کسی مقام پر لے جایا کرتیں۔ بہتیرے لوگ پورب کی طرف سے بہار، اتر پردیش اور اِن سے بھی پچھم کی طرف بھاگے جا رہے تھے۔ اِن سب باتوں کو دیکھ کر لوگوں میں اور بھی گھبراہٹ پھیل رہی تھی۔ جابجا بھاگتے ہوئے لوگوں

کے ٹھہرنے کے اڈے بنائے جا رہے تھے۔ نئی سڑکیں نکالی جا رہی تھیں اور جا بجا اُن کے لئے غلہ اور پانی جمع کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اِس میں دور اندیشی تو ضرور تھی لیکن عام طور پر عوام یہ سمجھتے تھے کہ یہ سب انتظام لڑائی نہ کر کے بھاگ جانے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ عوام کیا جانیں آج کل کا مورچہ کتنا وسیع ہوتا ہے اور اُس میں کتنی طرح کی لڑائیاں ہوا کرتی ہیں۔

سب کا نتیجہ یہ تھا کہ تمام ملک میں زبردست کھلبلی تھی۔ میں نے پہلے ہی طے کر لیا تھا اور وہ فیصلہ وار دھا میں اور بھی مضبوط ہو گیا کہ مجھے سارے صوبہ کا دورہ کرنا چاہیئے۔ اب میری صحت ایسی نہیں تھی کہ جیسے چھوٹے چھوٹے گاؤں میں پہلے جاتا تھا ویسے ہی جاؤں۔ اور طوفانی دورہ میں ایک ایک دن میں سات سات آٹھ آٹھ جگہوں پر تقریریں کروں۔ اِس لئے میں نے طے کیا کہ ہر ضلع کے ایک یا دو خاص مقامات پر ہی جاؤں گا۔ وہاں جلسہ عام کے ماسوا کانگریسی کارکنوں کی خاص نشست ہوگی۔ غلہ اور کپڑے کی ہائے ہائے تھی۔ اِس بارے میں بھی تاجروں اور عوام سے بھی صلاح و مشورہ کر کے واقفیت حاصل کرنا ضروری تھی۔ اِس لئے یہ بھی سوچا گیا کہ ایسے لوگوں کے ساتھ الگ ملاقات کی جائے ایسا ہی پروگرام بنا کر میں نے سارے صوبے کا دورہ اپریل کے آخر ہفتہ میں شروع کر کے جون کے آخر ہفتہ میں ختم کیا۔

یہ بات ظاہر ہو گئی تھی کہ گاندھی جی نے ورکنگ کمیٹی کے لئے کوئی تجویز الٰہ آباد میں بھیجی تھی۔ پولیس اُن کی تاک میں تھی۔ کہ اس کی نقل کسی طرح اُس کو مل جائے۔ مگر اُس وقت شاید اُسے نہیں ملی۔ کچھ دنوں کے بعد ایک دن اچانک سوراج بھون کی تلاشی ہوئی۔ وہاں سے پولیس نہ صرف مسودہ کی نقل لے گئی بلکہ اُس کے ساتھ ورکنگ

کمیٹی کی بحث کا وہ مختصر نوٹ بھی لے گئی جو دفتر کے کام کے لئے رکھا گیا تھا۔ اس مسودہ اور نوٹ کو حکومت نے اپنی اس کتاب میں، جسے اگست کی انقلابی تحریک پر حکومت کے سکریٹری رچرڈ ٹوٹنہم نے لکھا تھا۔ خوب استعمال کیا۔ مجھے کچھ شبہ ہوتا ہے کہ پولیس کو مسودے کا پتہ لگنے دینے کا سبب کچھ حد تک میں ہوں۔ میں نے اوپر بتایا ہے کہ گاندھی جی کے مسودہ میں کچھ ترمیم کرنے کی کوشش میں نے کی تھی۔ میری وہ نقل جس میں میں نے کچھ ترمیم کی تھی دفتر میں رہ گئی۔ میں الہ آباد سے سیدھے واردھا چلا گیا۔ روانہ ہوتے وقت اس نقل کو ساتھ لے جانا بھول گیا۔ سٹیشن پر یا راستہ میں یہ بات یاد آئی میں نے دفتر کے لوگوں سے کہہ دیا یا لکھ دیا کہ اُسے فوراً واردھا بھیج دیں، کیونکہ میں سمجھتا تھا کہ گاندھی جی شاید اُسے دیکھنا چاہیں۔ دفتر سے وہ نقل اُسی دن ڈاک سے بھیجدی گئی۔ اگر راستہ میں پولیس اُسے روک نہ لیتی، تو میرے واردھا پہنچنے کے بعد دوسرے ہی دن وہ پہنچ جاتی۔ مگر وہ مجھے ملی نہیں میں نے مان لیا کہ دفتر والوں نے اُسے بھیجا ہی نہیں۔ بعد میں جب دفتر کی تلاشی ہوئی تو میں نے دریافت کیا۔ معلوم ہوا کہ انھوں نے اُسی دن ڈاک سے میرے پاس واردھا بھیج دیا تھا۔ شائد اسی نقل کو دیکھ کر پولیس نے فیصلہ کیا ہو گا کہ تلاشی لینے سے کچھ مسالہ مل جائے گا۔

بہر حال، واردھا سے واپس آ کر میں نے دورہ شروع کیا۔ اس بارے میں کسی طرح کا شبہ میرے دل میں نہیں رہ گیا تھا کہ برٹش سرکار کے ساتھ ہمارا ٹکراؤ ہو گا ہی۔ میں نے کھل کر صاف صاف یہ بات اپنی سبھی تقریروں میں کہی۔ ابھی تک ہمارے پاس کوئی پروگرام نہیں تھا۔ اِس لئے میں پروگرام نہیں بتا سکتا تھا اور نہ بتایا مگر اتنا ضرور کہا تھا کہ یہ پروگرام سول نافرمانی کی صورت ہی اختیار کرے گا۔ ساتھ ہی بالکل پُرامن

ہوگا۔ اور یہ بھی کہا کہ پہلے کی تحریکوں سے یہ کہیں تیز ہوگا۔ اُن دنوں جاپان کی طرف سے ریڈیو کے ذریعہ سے اِس بات کا زوروں سے پروپیگنڈا کیا جا رہا تھا کہ جاپان ہندوستان کو آزاد کرنے کے جتن کر رہا ہے اور وہ ہر طرح سے ہندوستان کی مدد کرے گا۔ اِس بارے میں بھی میں نے اپنی سبھی تقریروں میں کہا کہ جاپان کی بات پر اعتماد نہیں کرنا چاہیئے۔ خاص کر جب ہم دیکھتے ہیں کہ اُس نے اپنے پڑوسی چین کا گلا دبا رکھا ہے اور زیادہ سے زیادہ تیز ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں برٹش اور جاپان دونوں سے ہندوستان کو آزاد کرنا ہے، اُسے ایک سے بچا کر دوسرے کے قبضہ میں جانے دینا ہم ہرگز نہیں پسند کر سکتے۔ اِس لئے ہمارا مقابلہ دونوں کے ساتھ ہوگا اور زبردست ہوگا میری تقریریں زوردار اور تیز ہوا کرتی تھیں۔ میں بھی سمجھتا تھا اور لوگ بھی مجھ سے کہا کرتے تھے کہ پہلے میری تقریریں بہت ٹھنڈی ہوا کرتی تھیں مگر اب تو میں آگ اُگل رہا ہوں۔

اِس بار میری تقریروں میں یہ بھیگا کمبل کہیں کسی طرح دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس کے خلاف ان میں کافی حوصلہ افزا اور جوش زا مسالہ رہا کرتا تھا۔ ساتھ ہی میں تعمیری کام بھی کرتا جاتا تھا۔ تاجروں اور عوام سے کپڑے اور غلّہ کی قلّت سے بچنے اور بچانے کی بات بھی کرتا جاتا تھا۔ مجھے یقین ہے کہ اگر حکومت عوام کا تعاون لیتی تو اس قلّت کا وہ بھیانک روپ نہ ہوتا جو ہوا اور جو آج تک بھی ہے۔ ہمارا مقصد برٹش سرکار کے خلاف لوگوں کو اُبھارنے کا نہیں تھا اور نہ یہ تھا کہ اُس کے راستے میں ہم روڑے اٹکائیں یا جیسے تیسے اُس کو پریشان کریں۔ ہمارا مقصد تھا کہ لوگوں کو ہم اِس بات کے لئے تیار کریں کہ وہ جاپان کا مقابلہ کر سکیں اور چونکہ برٹش سرکار اس کا موقع ہمیں نہیں دے رہی تھی ہم اُس سے بھی ہر وقت لڑ کر یہ موقع لینا چاہتے تھے۔ اِس لئے ہم بے ڈھنگے طریقہ

سے اُسے پریشان کرنا نہیں چاہتے تھے۔ اپنی اِس پالیسی کو اس لئے عملی صورت میں دکھا دینے اور مصدّقہ کر دینے کا ایک موقع مجھے مل گیا۔

ان دنوں جگہ جگہ ہوائی جہاز کے اڈے اور فوج کے لئے چھاونیاں بنانے کو عوام کی زمین لی جا رہی تھی۔ میں گیا میں پہنچا تو سُنا کہ شہر سے تھوڑی ہی دور پر جہاں پہلے سے ہی اڈّا تھا، اور بھی بہت سی زمین لی جا رہی ہے اور ہزاروں آدمی بے گھر بار اور بے کھیت ہو گئے ہیں، اُن کو کچھ معاوضہ بھی نہیں ملا ہے۔ ان وجہوں سے ان میں غصّہ ہے۔ میں وہاں گیا۔ سنتے ہی لوگ ہزاروں کی تعداد میں جمع ہو گئے۔ اُن کی حالت سچ مچ قابلِ رحم تھی۔ کئی گاؤں پست کر دیئے گئے تھے۔ کئی اور پست کئے جانے والے تھے۔ کھیتوں کی کاشت روک دی گئی تھی۔ اڈّے بنانے کے لئے زمین تیار کی جا رہی تھی۔ وہاں ہزاروں مزدور کام کر رہے تھے۔ بہت سی لاریاں سامان لاد کر پہنچا رہی تھیں جن کے گھر اور زمین لے لی گئی تھی۔ وہ اِدھر اُدھر مارے مارے پھر رہے تھے۔ اُن کا کوئی پرسانِ حال نہیں تھا۔ میرے پہنچتے ہی لوگوں نے اپنا سب دکھڑا کہہ سنایا۔ اگر سرکاری یا لڑائی کے کام میں روڑے اٹکانا ہمارا مقصد ہوتا، تو اس سے بڑھ کر دوسرا موقع نہیں ملتا۔ مگر میں نے لوگوں کو سمجھایا کہ لڑائی کے کام کے لئے سرکار ایسا کئے بغیر بچاؤ کا انتظام نہیں کر سکتی، اِس لئے اُن کو معاوضہ لے کر اپنا کچھ دوسرا انتظام سوچنا چاہیئے اور میں معاوضہ دلانے کی کوشش کروں گا۔ میں نے کہہ تو دیا مگر یہ نہیں جانتا تھا کہ سرکار میری بات سنے گی بھی۔

میں نے پٹنہ واپس آتے ہی گورنمنٹ ایڈوائزر کو خط لکھا جس میں سب باتیں صاف صاف بتا دیں اور یہ بھی بتا دیا کہ معاوضہ کس طرح کا ہونا چاہیئے۔ یہ بھی لکھا کہ

معاوضہ تقسیم کرنے میں گڑبڑ ہوا کرتی ہے۔ اِس لیے تقسیم معاوضہ کے وقت کانگریس کے آدمی بلا لیے جائیں اور اُن کے سامنے روپے بانٹے جائیں۔ کچھ زمین تو ایسی تھی جس پر مکان بننے والے تھے یا جہازوں کے اُترنے کے لیے مضبوط سڑکیں بنائی تھیں وہ تو واپس ہونے پر بھی کسان کے کام نہیں رہ جائیں گی۔ مگر بیش تر زمین صرف ہموار کر کے رکھی جائے گی اور اُس میں گھاس اُگ جائے گی، دوسری کوئی تبدیلی نہیں ہوگی۔ حکومت کو میں نے یہ لکھا کہ لڑائی کا کام جب ختم ہو جائے، تو زمین جس کی تھی اُس کو واپس کردی جائے اور یہ حتی الوسع کسان کے کام کے لائق بنا کر واپس کردی جائے۔ اِس درمیان اُس زمین سے کسان جو کچھ پیدا کرتا اُس کا بھی معاوضہ اسے دیا جائے۔ جو زمین واپس نہیں ہونے کی ہے اور جو مکان وغیرہ گرائے جا رہے ہیں، اُن کی قیمت نقد دے دی جائے۔ اور نقد تقسیم کر کے یا فصل کا معاوضہ فیصل کرنے اور چکانے کے وقت کانگریس کے کارکنوں سے مدد لی جائے۔

میرا خط پاتے ہی کمشنر نے اُس پر کارروائی کی میری سفارشیں اُنھوں نے مان لیں اور میرے پاس شکریہ کا خط بھیجا، جس میں یہ لکھا تھا کہ وہاں کی نازک حالت کو میں نے بہت ٹھیک طرح سے سنبھال لیا۔

میں جب مان بھوم ضلع میں گیا تو وہاں بھی ایسی ہی حالت تھی۔ وہاں کے کلکٹر نے بھی ویسا ہی کیا جیسا پٹنہ ڈویژن کے کمشنر نے کیا تھا۔ اِن باتوں کو اتنی تفصیل سے اس لیے لکھنا پڑا کہ جب تحریک شروع ہوئی تو حکومت نے ہم لوگوں پر جھوٹا الزام لگایا کہ ہم لوگ جاپان کی مدد کرنا اور برٹش سرکار کو ہر طرح پریشان کرنا چاہتے ہیں۔ بعد میں حکومت جاپان کی مدد کے الزام کو بے بنیاد ہونے کی بنا پر واپس لے لیا مگر ہمارے مسلم لیگ کے

بھائی اب بھی وہی لکیر پیٹتے جا رہے ہیں اور ویسا کہنے سے باز نہیں آتے۔

میں دورہ پر تھا تبھی واردھا میں ہونے والی کانگریس ورکنگ کمیٹی کی نشست کی اطلاع مل گئی تھی۔ میں نے دورے کا پروگرام بھی ایسا بنا لیا تھا کہ اُسے ختم کر کے سیدھے واردھا چلا جاؤں۔ جون کے آخری دنوں میں وہاں چلا بھی گیا۔ وہاں پہلے تو چرخہ سنگھ کی میٹنگ تھی اور اُس کے بعد کانگریس ورکنگ کمیٹی کی۔ کئی دن وہاں رہ جانا پڑا۔ کھدّر کی پیداوار کو بہت وسعت دینے کی اسکیم پر غور کیا گیا، کیونکہ ایسا نظر آنے لگا تھا کہ ملوں سے جو کپڑا عوام کو ملا کرتا تھا وہ لڑائی کی وجہ سے بڑی حد تک اب قابلِ حصول نہ تھا۔ سبب یہ کہ زیادہ تر فوجی کام کے لئے ہی ان کو کپڑا بنانا پڑ رہا تھا جو کپڑے کی قلّت تھی وہ چرخہ کرگھ کے ذریعہ دور کی جا سکتی تھی۔ اِس لئے کئی دنوں کے غور کے بعد چرخہ سنگھ نے بہت بڑے پیمانہ پر کام بڑھانا طے کیا۔ ورکنگ کمیٹی کی نشست کئی دنوں تک ہوتی رہی آخر ہم اس فیصلہ پر پہنچے کہ پُرامن سول نافرمانی ہم کو کرنی ہی ہوگی اور اس بات کی اجازت دینے کے لئے اگست کے شروع میں بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کا اجلاس کیا جائے۔

۱۹۴۲ء کے انقلاب سے پہلے

کانگریس ورکنگ کمیٹی میں بہت بحث ہوئی۔ وہاں اختلاف رائے کچھ واضح ہوگیا یہاں یہ کہہ دینا کچھ نامناسب نہ ہوگا کہ ڈاکٹر سید محمود ستیہ گرہ کے خلاف تھے۔ جولائی کا مہینہ قریب قریب آدھا گزر چکا تھا۔ بارش زوروں سے شروع ہو چکی تھی۔ حسبِ معمول دمہ کا دورہ بھی اُس کے ساتھ ہی ساتھ شروع ہوگیا تھا۔ مگر میں بھی سبھی نشستوں میں شامل ہوتا رہا اِتنی باتیں ہوئیں مگر ورکنگ کمیٹی نے ستیہ گرہ کا کوئی پروگرام مرتّب نہیں کیا۔ مجھے یہی بات کھٹکتی تھی۔ گاندھی جی سے میں نے کہا بھی کہ پروگرام کا کوئی تعین بھی وہ کریں۔ مگر انھوں نے صاف جواب دے دیا کہ اُن کا دماغ اس طرح کام نہیں کرتا۔ جب ایک بار یہ فیصلہ ہو جائیگا کہ ستیہ گرہ کرنا ہی ہوگا تبھی وہ پروگرام کے بارے میں سوچ سکیں گے ابھی تو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کو فیصلہ کرنا ہے۔ ورکنگ کمیٹی مکمل طور پر ایک رائے نہیں ہے اور اِس کے بعد حکومت کیا کرے گی۔ یہ بھی معلوم نہیں۔ ایسی غیر یقینی حالت میں وہ پروگرام کے متعلق ابھی کچھ بھی یقین نہیں کر سکیں گے۔ مگر اتنا ضرور تھا کہ اس بار کا ستیہ گرہ بہت تیز ہوگا۔ صرف جیل جانا ہی کافی نہ ہوگا۔ اس سے کہیں زیادہ قربانی کی ضرورت

پیش آئے گی۔ ضرورت پڑنے پر مال دھن گھر بار سب کچھ بھینٹ چڑھا دینا ہوگا۔ چرخہ سنگھ میں جو پچیس تیس لاکھ یا اِس سے بھی زیادہ روپے لگے ہیں اُس پر بھی چھاپہ پڑ سکتا ہے اور اگرچہ ہم نے کام بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے۔ پھر بھی سارا چرخہ سنگھ اور اُس کے آدمی اور روپے دونوں ہی بھینٹ چڑھ سکتے ہیں۔ مگر ابھی ستیاگرہ کے روپ کی تصویر ان کے سامنے نہ آئی تھی اور اِس پر ابھی وہ اپنا دماغ بھی لگانا نہیں چاہتے تھے۔ کیونکہ جب تک یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ ستیاگرہ لازمی ہے اور کرنا ہی پڑے گا تب تک پروگرام بنانے میں ان کا دماغ کام ہی نہیں کر سکتا۔ ہم لوگوں کو یہ ایک زبردست خامی معلوم ہوئی تھی مگر پروگرام تو گاندھی جی کو ہی بنانا تھا لہٰذا ہم کو مجبوراً اُن کی بات مان لینی پڑی۔

واردھا سے روانہ ہونے سے پہلے میں گاندھی جی سے وداع لینے سیواگرام گیا وہاں اور کئی آدمی تھے۔ اُن میں سے کسی نے پروگرام کی بات چھیڑ دی سوال یہ کیا کہ ٹیلیگراف اور ٹیلیفون کا تار کاٹنا یا ریل کی پٹری اکھاڑ دینا عدم تشدد کے اندر آسکتا ہے یا نہیں؟ سوال بر وقت تھا، کیونکہ میں جانتا تھا کہ جب ستیہ گرہ کی بات چلی ہے۔ کچھ لوگوں کا خیال اِس طرف گیا ہے اور انھوں نے یہ سوال چھیڑا ہے۔ سوال ہوتے ہی میں نے گاندھی جی سے کہا کہ یہ سوال بار بار اٹھا کرتا ہے۔ ۱۹۳۰ء کی تحریک میں بھی جب مہاتما جی اور بہت سے لیڈر جیل چلے گئے تھے اور پنڈت موتی لال نہرو قائم مقام صدر کانگریس تھے اور میں ورکنگ کمیٹی کے ممبر کی حیثیت سے الہ آباد گیا تھا، تو لوگوں نے یہی سوال اٹھایا تھا اور کہیں کہیں ٹیلیگراف اور ٹیلیفون کے تار لوگوں نے کاٹ بھی دیئے تھے، مگر یہ سب بہت کم جگہوں میں ہی ہو پایا تھا اور اُس وقت یہ روک دیا گیا تھا، اِس لئے اِس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ آج بھی جب ہم ستیہ گرہ کی

بات سوچ رہے ہیں، تو اس طرح کا خیال کچھ لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو رہا ہے۔ مہاتما جی کو چاہیئے کہ یہ پروگرام مرتب کرتے وقت اِس بارے میں کچھ صاف صاف ہدایات دیں۔ گاندھی نے کہا کہ لوہا لکڑی کاٹنے، توڑنے میں تشدد یا عدمِ تشدّد کی بات نہیں اٹھتی، ہم تو روز معمولی طریقہ پر لوہا لکڑی کاٹتے توڑتے رہتے ہیں۔ مگر ریل کی پٹری اکھاڑ دینا یا تار توڑ دینا دوسری بات ہے۔ کس مقصد سے یہ کام کیا جاتا ہے۔ کس طرح کیا جاتا ہے اور اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔ اِن باتوں پر متشدد یا غیر متشدد ہونا منحصر ہے، اگر اس سے جان جائے اور بے قصور لوگوں پر مصیبت آئے تو یہ تشدد ہوگا، مگر ہم ایسی حالت کا تصوّر کر سکتے ہیں جب یہ غیر متشدّد ہو سکتا ہے۔

ہم نے ان کے کہنے کا مطلب یہ سمجھا کہ اس کا غیر متشدّد ہونا بہت کچھ اس پر منحصر ہوگا کہ اِس کی وجہ سے کسی کی جان کا خطرہ نہ ہو اور جو کوئی بھی ایسا کام کرے، وہ اس کی جواب دہی اپنے اوپر صاف اور سیدھے طریقہ سے لے لے، تاکہ دوسروں کو جن کا اس سے کوئی سروکار نہ رہا ہو، اِس کا نتیجہ نہ بھگتنا پڑے۔ یہ باتیں یونہی ہو گئیں۔ کوئی پروگرام اُس وقت مرتب نہ ہوا نہ مرتب کرنے کی بات ہوئی۔ جب سرکار نے یہ الزام لگایا کہ ہم لوگوں نے ریل تار توڑنے کا پروگرام بنایا تھا تو گاندھی جی نے جواب میں کہا تھا سرکار نے ایک گفتگو یا اصولی تبادلۂ خیالات کو پروگرام مان لینے کی غلطی کی ہے۔ گاندھی جی کی یہ بات بالکل سچ تھی اور ہم نے اُس وقت اِس پروگرام کو یا کسی بھی پروگرام کو مرتب نہیں کیا تھا۔

واردھا سے میں پٹنہ کے لئے روانہ ہوا۔ پہلے ہی دو تین جگہوں میں جانے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ اُن میں ایک مقام گوندیا تھا، اِس لئے گوندیا میں اُتر گیا اور وہاں

جلسہ وغیرہ کر کے رات کی گاڑی سے روانہ ہو گیا۔ دوسرے دن رات کو بنارس پہنچا۔ وہاں بھارتیہ اتہاس پریشد (انجمنِ تاریخ ہند) کی انتظامیہ کمیٹی کی نشست ہونی تھی۔ اب یہ ایک طرح سے طے ہی تھا کہ تحریک تھوڑے دنوں میں عظیم شکل اختیار کرے گی۔ اِس لئے اس پریشد کے متعلق کچھ کام لینا ضروری تھا۔ ایک ضروری کام اس کے لئے کچھ روپے جمع کر لینا تھا اور جو جلدیں تقریباً تیار رکھی جاتی تھیں اُن کے چھپوانے وغیرہ کے متعلق شری جے چندر ودیا النکار سے باتیں کر لینی تھیں۔ کچھ رقم گوندیا میں ملی تھی اُسے جمع کر دیا اور دوسرے کاموں کا انتظام کر کے کاشی سے میں پٹنہ میں نہ ٹھہر کر سیدھے منگیر ضلع میں تاراپور چلا گیا۔ وہاں کسان کانفرنس ہونے والی تھی جسے لوگوں نے میری ہی خاطر ملتوی کر رکھا تھا۔ شری کرپلانی جی بھی وہاں اُس کا افتتاح کرنے کے لئے آئے تھے اور شری کرشن بلبھ سہائے صدر ہونے والے تھے۔ دوسرے خاص خاص افراد بابو شری کرشن سنہا اور بابو انوگرہ نارائن وغیرہ بھی آئے تھے۔ میں تاراپور پہنچ گیا مگر دمہ کا دورہ پڑ رہا تھا۔ کانفرنس کا کام شروع ہوا۔ میرے کچھ کہنے کی باری آئی میں نے کچھ کہنا شروع کیا کہ اتنے میں اچانک گھٹا اُمنڈ آئی اور زوروں سے بارش ہونے لگی۔ رام گڈھ کانگریس کی طرح کانفرنس کا کام رک گیا۔ ہم لوگ کسی طرح بھیگتے بھاگتے ڈاک بنگلہ پہنچے جہاں ٹھہرے ہوئے تھے۔ رات وہیں گزار کر دوسرے دن صبح میں پٹنہ کے لئے روانہ ہو گیا۔ پٹنہ پہنچتے پہنچتے دمہ خوب زور پکڑ گیا اور بخار بھی ہو گیا۔ اس دن سے بارہ یا چودہ دنوں کے بعد ہی بمبئی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی نشست ہونے والی تھی۔ مجھے فکر تھی کہ اُس وقت تک اچھا ہو جانا چاہیئے۔

بمبئی جانے سے پہلے صوبہ کانگریس کمیٹی کی ایک میٹنگ کر لینا ضروری معلوم

ہوا، جس میں واردھا کی تجویز کے متعلق، جس پر بمبئی میں غور ہونے والا تھا۔ صوبہ کے لوگوں کی رائے معلوم ہو جائے۔ صوبائی کمیٹی کی میٹنگ صداقت آشرم میں ۳۱ جولائی کو ہوئی۔ میری طبیعت بہت خراب تھی، بہت کمزور تھا۔ میں نے کمیٹی کے سامنے ایک پُرزور تقریر کی جو اُنھیں تقریروں کا خلاصہ تھا۔ جو سارے صوبہ کے دورے میں کی تھیں۔ ایک بات اور تھی یعنی واردھا میں جو باتیں ہوئی تھیں انھیں بھی میں نے لوگوں کو سنا دیا۔ سبھی لوگ سمجھ گئے کہ بمبئی میں جو فیصلہ ہو گا وہ انتہائی اہم ہوگا۔ اِس جلسہ کے بعد ایک دو دِنوں کے اندر ہی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ممبر اور بے شمار کانگریسی والنٹیر بمبئی کے جلسہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ میں اتنا بیمار تھا کہ وہاں جا نہ سکا اور پٹنہ میں ہی پڑا رہا۔

اُخباروں میں زوروں سے خبریں چھپا کرتی تھیں کہ حکومت کی طرف سے تیّاریاں ہو رہی ہیں اور بمبئی میں ہی سب لوگ گرفتار کر لئے جائیں گے۔ اِدھر اُدھر سے یہ بھی خبر پہنچ رہی تھی کہ بہار میں بھی تیاریاں ہیں، جو کیمپ جیل بند تھی وہ صاف کر کے تیار کر لی گئی۔ بمبئی میں ۵۔ اگست ۱۹۴۲ء کو کانگریس ورکنگ کمیٹی کی نشست شروع اور ۷۔ اگست کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس ہونے والا تھا۔ میں ریڈیو سے خبریں سنا کرتا تھا اور اخباروں میں پڑھا کرتا تھا جو قرارداد ۸۔ اگست کی رات کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں پاس کی گئی۔ وہ بھی ورکنگ کمیٹی کے پاس ہونے کے بعد اخباروں میں آچکی تھی۔ یہ خبر بہت گرم تھی کہ بمبئی میں ہی سب کو گرفتار کر کے تحریک شروع ہونے سے پہلے ہی دبا دی جائے گی۔ میں نے سوچا کہ اگر ایسا ہوا تو عوام کے سامنے کوئی پروگرام نہیں رہ جائے گا۔ کم سے کم اپنے صوبہ کے لئے میں کوئی پروگرام بنا دوں۔ اِتنی طاقت

نہیں کہ بیٹھ کر لکھ سکوں۔ اِس لیے جو دوست وہاں موجود تھے ان سے باتیں کر کے مسودہ تیار کرنے کو کہا۔ ان میں سے خاص تھے صوبائی کانگریس کمیٹی سکرٹری شری دیپ نارائن سنگھ اور شری متھرا پرشاد، انوگرہ بابو بھی بمبئی نہیں گئے، پٹنہ ہی میں تھے۔ جب مسودہ تیار ہو گیا تو میں نے انوگرہ بابو کے ساتھ دیکھ کر کچھ رد و بدل کر کے ٹھیک کر دیا۔ اُسے چھپوانے کا انتظام بھی کر دیا گیا۔ یہ طے ہوا کہ اگر واقعی سب لوگ گرفتار ہو گئے، تو جو لوگ رہ جائیں گے وہ اسی کے مطابق کام کریں گے۔ یوں تو گاندھی جی نے بارہا کہہ رکھا تھا کہ اگر لیڈر گرفتار ہو گئے اور کوئی پروگرام نہ دے سکے تو اِس حالت میں ہر ایک کانگریسی خود کو لیڈر سمجھے اور عدم تشدد کے اصول کے اندر رہتے ہوئے جو کچھ بھی ستیہ گرہ کی شکل میں کر سکتا ہو کرے۔ اِس جنگ کو آخری جنگ سمجھا جائے اور کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے، مگر عدم تشدد کو کسی طرح نہ چھوڑے۔ ہم نے جو پروگرام بنایا اُس میں اِس بات پر زور دیا کہ عدم تشدد کو نہیں چھوڑنا چاہیئے۔ اس میں ستیہ گرہ کے لئے پروگرام بھی بتایا جو پہلے کے ستیہ گرہ کے پروگراموں سے اُصولاً مختلف نہیں تھا لیکن زیادہ تیز ضرور تھا۔

اِسی درمیان دلّی میں ایک دن یہ خبر چھپی کہ ۸۔ اگست کے بعد کانگریسی لوگوں کی گرفتاری نہیں ہوگی اور حکومت اِس بات کا انتظار کرے گی کہ کانگریس کیا کرتی ہے۔ کانگریس کی طرف سے بھی یہ بات کہی جا رہی تھی کہ کوئی قدم اٹھانے سے پہلے گاندھی جی وائسرائے سے ایک بار پھر بات چیت کریں گے۔ جب وہاں کچھ نہ ہوگا تبھی کوئی نیا قدم اٹھانے کی رائے دیں گے۔ ہم نے اس خبر کو سچ مان لیا اور سمجھ لیا کہ ابھی فوری طور پر کچھ ہونے والا نہیں ہے۔ بمبئی گئے ہوئے لوگوں کی واپسی تک ہم کو انتظار کرنا چاہیئے۔ ہو سکتا ہے وہاں سے یہ لوگ معینہ پروگرام بھی ساتھ لائیں، اگر ایسا ہوا تو ہمارے

لئے ہمارے ذریعہ مرتب شدہ پروگرام کو کام میں غیر مناسب نہیں تو غیر ضروری ہو گا ہی۔ اِس طرح ہم نے طے کر لیا کہ اب ۱۱۔ اگست سے پہلے جب بمبئی سے لوگوں کی واپسی کی امید تھی، ہم کو کچھ نہیں کرنا ہے۔ اِسی فیصلہ کے مطابق انوگرہ بابو رائے بریلی چلے گئے، جہاں ان کے بھائی بیمار تھے اور بابو دیپ نارائن سنگھ مظفر پور ضلع میں پہلے سے متعلین کچھ کام پورا کرنے چلے گئے۔ میں متھرا بابو اور شری چکردھر شرن کے ساتھ آشرم میں ٹھہرا رہا۔

۱۹۴۲ء کے طوفانی دن

۸۔ اگست ۱۹۴۲ء کی رات کو تقریباً دس بجے کے بعد آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے قرارداد منظور کی۔ سنا کہ گاندھی جی نے طویل تقریر کی۔ جس میں انھوں نے لوگوں کو ''کرو یا مرو'' کا منتر دیا۔ ساتھ ہی انھوں نے وائسرائے سے ملنے اور ایک بار اور مصالحت کے لئے کوشش کرنے کی بھی بات کہی۔ دوسرے لیڈروں کی بھی تقریریں ہوئیں۔ جن میں سردار ولبھ بھائی پٹیل کی تقریر کی لوگوں نے بہت تعریف کی۔ ۹۔ اگست ۱۹۴۲ء کے سویرے میں سرچ لائٹ میں بمبئی کی کارروائی پڑھ رہا تھا۔ متھرا بابو شہر چلے گئے کہ اتنے میں ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ مسٹر آرچر پہنچے۔ میں چارپائی پر تھا۔ انھوں نے مجھے دیکھ کر میری صحت کا حال پوچھا اور یہ بھی دریافت کیا کہ میرا پروگرام کیا ہے۔ بس تو سمجھ ہی گیا تھا کہ اُن کے آنے کا سبب کیا ہے کیونکہ ریڈیو سے گاندھی جی اور ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کی گرفتاری کی خبر مختصراً آچکی تھی۔ میری بیماری دیکھ کر انھوں نے سرکار سے پوچھا کہ ایسی حالت میں کیا کیا جائے۔ وہاں سے حکم ہو کہ سول سرجن سے معائنہ کراؤ اور پوچھو کہ وہاں سے وہ دُور لے جانے کے قابل ہیں یا نہیں۔ مسٹر آرچر سول سرجن کو

لے آئے۔ اِسی درمیان میں میرے گھر کے ڈیرے پر خبر پہنچ گئی۔ وہاں سے بہن اور مرتنجے کی ماں وغیرہ پہنچ گئیں۔ سول سرجن کی رائے ہوئی کہ میں سفر کے لائق نہیں ہوں۔ اِس لئے مجھے گیارہ بارہ بجے دن کے قریب بانکی پور جیل میں ہی لے گئے پانی زوروں سے برس رہا تھا۔ خبر شہر میں پھیل گئی۔ صداقت آشرم سے میرے روانہ ہونے سے پہلے ہی کچھ لوگ، خاص کر طالب علم آشرم پہنچ گئے۔ صرف مجھی کو گرفتار کرنے کا حکم تھا۔ مسٹر آرچر کا طور طریقہ اچھا تھا۔ اُنھوں نے کسی طرح نہ تو کوئی جلدی کی اور نہ کوئی بے ادبی یا بدتمیزی۔ جیل میں میرے لئے سب انتظام ٹھیک کر کے متھرا بابو اور چکردھر واپس گئے۔ اِتنے ہی میں شری پھولن پرشاد ورما بھی گرفتار ہو کر پہنچ گئے۔ اِس طرح تقریباً ایک ڈیڑھ بجے سے پہلے ہی یہ یقینی ہو گیا کہ میں اکیلا نہ رہوں گا اور کم سے کم ایک ساتھی رات کو میری دیکھ بھال کرنے کے لئے ضرور رہے گا۔ متھرا بابو نے بھی مسٹر آرچر سے بات چیت کی اور وہ بھی شام سے پہلے ہی آ پہنچے۔ دوسرے دن سے اور لوگ بھی آنے لگے۔ بمبئی سے واپسی پر بابو سری کرشن سنہا، ستیہ نارائن بابو، مہامایا بابو وغیرہ بھی آ گئے۔ انوگرہ بابو بھی آئے۔ پٹنہ میں زوروں سے مظاہرے ہونے لگے۔ بڑے بڑے جلوس نکلنے لگے۔ کچہریاں بند ہو گئیں اور ایک بہت بڑا جلوس نعرے لگاتا ہوا گورنمنٹ ہاؤس کے دروازے تک جا پہنچا۔ رات ہو گئی تھی۔ اِس لئے اور کچھ اُس دن نہیں ہوا۔ لیکن خبر گرم تھی کہ دوسرے دن سکریٹریٹ پر جھنڈا لگانے کے لئے جلوس جائے گا۔

جیل میں خبر ملنے کا ذریعہ ایک ہی تھا اور وہ یہ تھا کہ گرفتار ہو کر نئے لوگوں کا آنا۔ اخبار ابھی بند نہیں تھے مگر اُن سے خبر تھوڑی ملتی تھی۔ سکریٹریٹ پر جلوس

گیا۔ گولی چلی۔ آٹھ دس نوجوان شہید ہو گئے۔ بہتیرے زخمی ہوئے جنہیں لوگوں نے ہسپتال پہنچایا۔ اِس جلوس میں سے چالیس پچاس لڑکے گرفتار کر کے اُسی رات کو بانکی پور جیل میں لائے گئے۔ اُن سے گولی چلنے کا واقعہ معلوم ہوا۔ رات بھر سارے شہر میں جلوس نکلتے رہے۔ جیل کے اندر بھی جلوسوں کی آواز پہنچتی رہی۔ اُسی دن تار اور ٹیلیفون توڑنے کا کام شروع ہو گیا۔ ہم نے سنا کہ پٹنہ میں ٹیلیفون بند ہو گیا۔ جیل کے دفتر میں بھی ٹیلیفون کا آنا جانا رُک گیا۔ جو لڑکے سکرٹریٹ کے جلوس سے گرفتار کر کے لائے گئے تھے، وہ کسی طرح بانکی پور جیل میں رات بھر رکھے گئے۔ دوسرے دن اُنھیں کیمپ جیل میں بھیجنے کی تیاری ہونے لگی جیل کی کیفیت یہ تھی کہ پہلے سے ہی ٹھسا ٹھس بھری تھی۔ معمولی قیدیوں کی تعداد سارے صوبہ میں بہت بڑھی ہوئی تھی، کیونکہ ڈاکے کئی برس پہلے سے ہی لڑائی کے زمانے میں بہت بڑھ گئے تھے اور چوری وغیرہ بھی زیادہ ہو رہی تھی قیدیوں میں بہتیرے ابھی حوالاتی تھے۔ جن کے مقدموں کی تحقیقات ابھی تک نہیں ہوئی تھی اِس لئے جب سیاسی قیدیوں کی تعداد بڑھنے لگی تو اُن کے لیے جگہ کم رہ گئی جو اونچے درجہ میں رکھے والے تھے وہ تو بانکی پور جیل میں رکھے گئے۔ اور باقی کو کیمپ جیل بھیجنے کا انتظام تھا۔ جب تک لڑکے کیمپ جیل میں نہیں بھیجے گئے۔ شہر کی بڑی جماعت جیل کے پھاٹک پر اور سڑکوں پر کھڑی تھی۔ بانکی پور جیل میں دو منزلہ مکان سڑک کے کنارے کی طرف ہے۔ اُس پر سے لڑکوں نے سڑک پر جمع بھیڑ سے کچھ باتیں بھی کیں۔ تین بجے کے قریب ان کو لے جانے کے لئے لاریاں لائی گئیں۔ اُن میں وہ سوار کر دیئے گئے۔ پہلی لاری آگے بڑھی تو عوام لاری پر ٹوٹ پڑے۔ لڑکوں کو چھڑا لیا اور لاری کو آگ لگا دی۔ دوسری لاری کو پھر آگے نہیں بڑھایا۔ اُن میں سوار لڑکوں کو

اُتار کر پھر جیل میں لے گئے۔ کچھ دیر میں فوج بلائی گئی۔ اُس نے راستہ صاف کیا۔ آگے پیچھے فوجی لاریوں کے بیچ میں قیدیوں کی لاریاں کیمپ جیل میں پہنچائی گئیں۔

جو لوگ اے کلاس میں رکھے جاتے تھے، ان کی تعداد بھی بڑھتی ہی جاتی تھی اور اُن کے لئے جیل کے ہسپتال کے سوا دوسری جگہ نہیں تھی۔ اُن کو بھی ہزاری باغ لے جانے کی بات تھی مگر تب تک ریل گاڑیوں کا آنا جانا بند ہو گیا۔

اُن کا وہاں جانا بے تعین میعاد کے لئے رک گیا۔ تقریباً ایک مہینہ بعد تک یہ لوگ اس چھوٹے سے ہسپتال میں ہی رہے اور کچھ لوگ اِدھر اُدھر بھی رکھے گئے۔ بانکی پور جیل پٹنہ جنکشن اسٹیشن کے نزدیک ہی ہے۔ وہاں سے گاڑیوں کے آنے جانے اور خاص کر ریل کی سیٹی کی آواز خوب سننے میں آتی تھی۔ یہ سب مہینوں تک بند رہا۔ صرف ایک انجن کی سیٹی سننے میں آیا کرتی جو ڈبوں کو اِدھر اُدھر اسٹیشن پر ہٹایا کرتا تھا۔ اُس کی آواز بھی ہم لوگوں نے پہچان لی تھی۔ ہم اُس سے اِس بھرم میں نہیں پڑتے تھے کہ گاڑیاں چلنے لگیں۔ تقریباً ایک مہینہ کے بعد سبھی لوگ ہزاری باغ لے جائے گئے۔ میں وہاں جانے کے لائق نہیں تھا۔ وہاں کی آب و ہوا بھی مجھے موافق نہیں تھی۔ اِس لیے میں پٹنہ ہی میں رکھا گیا۔

جیل میں پہنچنے کے دو چار دنوں بعد یہ خبر اڑی کہ مجھے کہیں باہر لے جائیں گے جہاں ورکنگ کمیٹی کے دوسرے ممبر رکھے گئے تھے۔ ریلوں کا چلنا بند ہو چکا تھا۔ اِس لئے لے جانے کا ایک ہی ذریعہ تھا یعنی ہوائی جہاز۔ ڈاکٹروں سے رائے لی گئی تو انھوں نے رائے دی کہ میری حالت ایسی نہیں ہے کہ ہوائی جہاز کا سفر برداشت کر سکوں۔ اِس لئے یہ خیال بھی ملتوی ہو گیا۔ تقریباً دس مہینے کے بعد جون ۱۹۴۳ء

میں ایک دن اچانک میجر مرڈک جنھوں نے گرفتاری کے وقت مجھے دیکھا تھا اور ہزاری باغ نہ لے جانے کی رائے دی تھی، جیل میں آگئے۔ انھوں نے مجھ سے کہا کہ ہمیں سرکاری حکم ملا ہے کہ آپ کو دیکھ کر آپ کی صحت کے بارے میں فوراً رپورٹ دی جائے۔ گرمیوں میں خاص کر جون کے شروع میں، میں بہت صحت مند رہا کرتا ہوں۔ اُس وقت بہت اچھا تھا۔ اِس لئے ایسے وقت جب صحت کے بارے میں کوئی خراب رپورٹ نہیں رہ گئی ہوگی، ڈاکٹر کا آنا تعجب کی بات تھی، میں نے تاڑ لیا کہ مجھے کسی دوسری جگہ بھیجنا چاہتے ہیں۔ میں نے ڈاکٹر سے پوچھا تو اُس نے کہا کہ باضابطہ خبر تو نہیں اور نہ وہ دے سکتا تھا لیکن بے ضابطہ طور پر وہ کہہ سکتا تھا کہ کچھ ایسی ہی بات تھی۔ کچھ اور زیادہ پوچھنے پر اُس نے یہ بھی کہا کہ میں ہزاری باغ نہیں بھیجا جاؤں گا۔ دکھن میں پونہ کی طرف جانا پڑے گا بعد میں جیل سے نکلنے پر یہ خبر ملی کہ احمد نگر کے قلعہ میں میرے بھیجے جانے کی بات تھی اور میرے لئے وہاں کمرہ ٹھیک کیا گیا تھا مگر نہ معلوم کیوں کچھ ہوا۔ نہیں۔ کچھ دنوں کے جب ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ملنے آیا۔ پوچھنے پر اُس نے کہا کہ نہ جانے کیوں بات آگے نہیں چلی۔

سرکار سمجھتی تھی کہ دنیا کو یہ بات معلوم نہیں کہ ورکنگ کمیٹی کے ممبر کہاں گئے ہیں۔ پتہ نہیں کہ باہر والوں کو کب معلوم ہوا کہ وہ لوگ احمد نگر کے قلعہ میں ہیں۔ مگر ہم لوگوں کو تو بانکی پور جیل میں گرفتاری کے چند دنوں کے اندر ہی یہ معلوم ہو گیا مقامی اخبار ہماری گرفتاری کے چند دنوں بعد تک تو نکلتے رہے مگر بہت جلد سب کے سب بند ہو گئے۔ بہار سرکار پٹنہ ڈیلی نیوز کے نام سے ایک

انگریزی روزنامہ نکالنے لگی، جس سے کچھ خبریں مل جاتیں۔ ایک خاص بات اُس سے یہ معلوم ہوئی کہ سرکار نے کسی ضلع پر کتنا مجموعی جرمانہ کیا یا تعزیری ٹیکس لگایا۔ ہم نے دیکھا کہ چند دنوں کے اندر تقریباً چھبیس لاکھ روپیہ جرمانہ کیا گیا۔

۱۹۴۲ء میں جیل کی زندگی کی کچھ باتیں

بانکی پور میں جیل کی زندگی میرے لئے کسی طرح مصیبت ناک نہ تھی۔ گھر کے لوگوں سے برابر ملاقات ہوتی رہی۔ چھوٹے چھوٹے بچے بھی ان کے ساتھ آجایا کرتے تھے۔ شاید وہ یہ تو نہ جانتے تھے کہ میں یہ کس جگہ ہوں اور کیوں یہاں بند رکھا گیا ہوں مگر سنا کہ ملاقات کے دن میرے پاس آنے کے لئے وہ مشتاق رہا کرتے تھے۔ ارُن طول عمرہٗ میرا پوتہ ڈھائی سال کا تھا۔ مگر جب وہ جیل کے پھاٹک کے اندر گھستا تو وہ وہاں سے سیدھے دوڑتا ہوا ہسپتال وارڈ میں میرے کمرے میں آجاتا۔ دو چار بار آنے کے بعد ہی اس نے راستہ پہچان لیا تھا اور میرا کمرہ بھی۔ اُس سے بڑی جو لڑکیاں تھیں وہ تو راستہ اور کمرہ جانتی ہی تھیں۔ میرے پاس پہنچ کر اُن بچوں کی فرمائش ہوتی بابا کچھ کھلاؤ۔ میں اُن کے لئے کچھ تیار رکھتا۔ آدھ گھنٹے تک رہ کر اور اِدھر اُدھر دوڑ دھوپ کر کے کچھ کھا کر وہ چلے جاتے، جاتے وقت جیل کے احاطہ میں کھلے ہوئے خوب صورت پھول اگر پسند آجاتے تو توڑ لیتے۔ جیل کے منتظم ان حرکتوں سے بگڑتے نہ تھے بلکہ بچوں کی شوخی دیکھ کر خوش ہونے اور ہنستے۔ جب تب ارُن میرا ہاتھ پکڑ کر چلتے وقت

کہتا "توہوں چل بابا دبابا تو بھی چل) چھوٹی عمر کا زمانہ بھی کیسا اچھا معصوم اور بے فکری کا ہوا کرتا ہے۔

جیل میں ایک زمانہ بہت تشویش کا گزرا۔ وہ تھا جب مہاتما گاندھی نے اُپواس کیا۔ اس کی خبر تو اخباروں سے مل گئی۔ میں نے سرکار کو لکھا کہ وہاں کی خبر مجھے تار کے ذریعے دی جاتی رہے۔ کچھ دوستوں کو تار بھجوانے کے لئے بھی کہلا بھیجا۔ تار آنے لگے مگر جب تک وہ خفیہ پولیس کے ذریعہ پاس نہ ہو جائیں۔ مجھے نہ ملتے۔ اتنی دیر لگتی کہ جیل کے دفتر میں پہنچنے کے لئے تقریباً ۲۴ گھنٹے بعد تار ملتا۔ اُدھر بھی اتنی ہی خبر لوگ بھیجنے پاتے جتنی سرکاری بلٹین میں چھپتی۔ وہ پٹنہ ڈیلی نیوز میں سویرے ہی ہم کو مل جاتی۔ اس لئے تار اور بھی بے کار ہو گئے۔ چند دنوں کے بعد تار منگانا بند کر دیا۔ ایک دن یہ خبر پہنچی کہ مہاتما گاندھی کی حالت بہت خراب ہے۔ شہر میں تو خبر اڑ گئی کہ وہ اب رہے ہی نہیں۔ ہم لوگوں کو یہ خبر جیل میں نہیں ملی۔ جب پٹنہ ڈیلی نیوز آیا تو معلوم ہوا کہ ابھی تو وہ محفوظ ہیں اور حالت بہتر ہے۔ ہم لوگ فکر مند تھے اور دعا کر رہے تھے۔ بفضلہ خطرے کے گھنٹے نکل گئے۔ معلوم ہونے لگا کہ اب وہ نازک لمحوں پر عبور پا جائیں گے۔ آخر میں مبارک خبر سننے کو ملی کہ یہ تپسیا بھی پورا ہو گیا۔ برٹش سرکار اور لارڈ لنلتھگو کی پالیسی اور سختی کا پورا مظاہرہ ہو گیا۔

بارے جیل کی زندگی بغیر کسی اہم واقعہ کے گزرتی رہی۔ باہر جو کچھ عوام، سرکاری افیسروں اور پولیس، فوج اور مجسٹریٹوں کے ذریعہ ہوا۔ اُس کی خبر کچھ کچھ ملتی رہی وہ خوفناک اور لرزہ خیز تھی مگر ہم ناچار تھے اور سن لینے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جو نئے آرڈیننس بن گئے تھے ان کے ذریعہ خوب اندھیر مچ رہا تھا۔ یہ اندھیر

صرف سیاسی معاملوں میں ہی نہیں معمولی مقدموں میں بھی تھا۔ یہاں دو مثالیں دیتا ہوں۔

ہمارے جیل جانے کے چند دنوں کے اندر ہی پٹنہ ضلع کے کسی گاؤں میں دو پارٹیوں میں کسی زمین یا کسی اور چیز کے لئے مارپیٹ ہوئی۔ ایک آدمی ہلاک ہوا۔ پولیس کے لئے اُن دنوں کسی بھی مقدمہ میں سزا دلوا دینے کا سب سے سیدھا راستہ یہ تھا کہ اُسے وہ سیاسی قرار دے دے۔ اُس نے اِسے بھی سیاسی جامہ پہنا دیا۔ خون کا سبب یہ بتایا گیا کہ جس آدمی کا خون کیا گیا تھا وہ فوج میں بھرتی ہوا تھا۔ چونکہ دوسرے فریق کے لوگ کانگریسی تھے، اِس لئے اُنھوں نے اُسے فوج میں بھرتی ہونے سے منع کیا۔ جب اُس نے اُن کی ایک نہ سنی تو انھوں نے اُس کا خون کر دیا۔ معاملہ سیدھے اسپیشل جج کے سامنے پیش ہوا۔ اُس نے فیصلہ میں لکھا کہ جس آدمی کا خون ہوا وہ کبھی فوج میں بھرتی ہوا ہی نہ تھا۔ اِس لئے اُس کے خون کا سبب یہ نہیں ہو سکتا۔ مگر سبب کچھ بھی ہو خون تو ہوا ہی تھا۔ اس لئے آٹھ آدمیوں کو پھانسی کی سزا حکم ہوا۔ آرڈیننس کے مطابق پھانسی کی منظوری ایک ہائی کورٹ جج کے ذریعہ ہونی چاہئے تھی اِس کے لئے ایک جج خاص طور پر مقرر کئے گئے تھے۔ اُنھوں نے سات آدمیوں کو چھوڑ دیا مگر ایک کی پھانسی کی سزا بحال رکھی۔ اُس کی طرف سے پریوی کونسل میں بھی اپیل ہوئی مگر وہ نامنظور کر دی گئی۔ جیل میں جب تک ہم لوگ رہے ایک کام ہم میں سے کسی کو کرنا پڑتا تھا۔ اِسے ہم خوشی سے کر بھی دیتے تھے۔ جب کسی معمولی قیدی کا جیل سے اپیل کرنے کا ارادہ ہوتا تو وہ کسی نہ کسی طرح ہم لوگوں کے پاس پہنچ جاتا اور اپیل کی درخواست لکھوا لے جاتا۔ پھانسی کی سزا کے

آدمی کی طرف سے رحم کی اپیل مجھے لکھنی پڑتی جیل کے حکام پھانسی والے کی طرف سے رحم کی درخواست بھجواتے ہیں۔ میں نے دیکھا، اکثر کچھ دل چسپی لیتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ انھوں نے دو معاملوں میں مجھ سے درخواست کا مسودہ لکھ دینے کو کہا تھا۔ یہ پہلا پھانسی کا معاملہ تھا۔ اس لئے پولیس نے سیاسی قرار دیا تھا۔ سیاسی ہونے کی وجہ سے ہی پھانسی کی سزا طے ہوئی تھی۔ میں نے درخواست لکھ دی۔ گورنر نے پھانسی کی جگہ دائم الحبس کی سزا کر دی۔ اُس کی جان بچ گئی۔ پولیس نے جو سیاسی شکل دے کر سزا دلوا دی، اُس کا ایک اچھا نتیجہ یہ ہوا کہ جب پھر ۱۹۴۶ء میں کانگریسی وزارتیں بنیں تو دوسرے سیاسی قیدیوں کے ساتھ وہ آدمی بھی چھوٹ گیا۔ چھوٹتے ہی میرے پاس آ کر صداقت آشرم میں مجھے ملاقات کر گیا۔ ایک عورت کو بھی پھانسی کی سزا طے ہوئی تھی۔ اُس کی درخواست جیلر نے خود مجھ سے لکھوائی تھی۔ اُس کی سزا بھی پھانسی کی نہ رہ کر دائم الحبس کی ہو گئی تھی۔

ایک دوسرا مقدمہ ڈاکہ کا تھا۔ مجرم پولیٹکل قرار نہیں دیا گیا تھا۔ مگر اُن دنوں معمولی مقدموں کی تحقیقات بھی آرڈیننس کے مطابق کی ہوا کرتی تھی۔ مجسٹریٹ کے اختیارات بڑھا دئے گئے تھے۔ وہ لمبی لمبی سزائیں بھی دے سکتے تھے۔ ایک آدمی تھا جس کی عمر ساٹھ سال سے کم نہ ہوگی۔ اُس کے ہاتھ میں کچھ عیب تھا۔ جس سے اس کی انگلیاں پوری کھلتی نہ تھیں۔ لنگڑا ہونے کے سبب سے مشکل سے چل سکتا تھا۔ دوڑنے کا تو ذکر ہی کیا۔ جیل میں بھی بیمار تھا۔ اُسی ہسپتال میں تھا جہاں میں تھا۔ مقدمہ یہ تھا کہ پٹنہ رانچی روڈ پر جو بہت آمدورفت کی سڑک ہے، ایک آدمی بیل گاڑی پر بوروں میں بھر کر چاول لے جا رہا تھا۔ کچھ ڈاکوؤں نے گاڑی روک کر چاول لوٹ لیا۔ وہ بوروں

کو پیٹھ پر لے کر کھیت سے ہو کر بھاگ نکلے۔ گاڑی والے نے شور مچایا تو کچھ آس پاس کے لوگ آ گئے۔ سب نے ڈاکوؤں کا پیچھا کیا۔ تقریباً ایک ڈیڑھ میل دور جانے پر کھیتوں میں بورے پھینک کر ڈاکو رفو چکر ہو جانا چاہتے تھے۔ مگر لوگوں نے اُنھیں پکڑ لیا۔ اُنہیں ڈاکوؤں میں مندرجہ بالا اشٹا بکر[۵۷] صاحب بھی تھے۔ چونکہ وہ بہت بیمار تھا۔ اس لئے مجسٹریٹ نے جیل کے ہسپتال میں آ کر ہی اس کا بیان لیا اور اُسے سات سال کی سزا دے دی۔ میں جب ہسپتال وارڈ سے باہر نکلا تو وہ پیر پکڑ کر رونے لگا۔ میں نے اُس سے اپیل کرنے کو کہا۔ اُس نے جیلر سے کہہ کر فیصلہ کی نقل منگائی۔ میں نے اپیل کی درخواست لکھ دی اور وہ ہائی کورٹ سے چھوٹ گیا۔ ججوں نے سارے واقعہ کو ناممکن سمجھا اور اُن غریبوں کی گرفتاری کا سبب بھی ڈکیتی کے علاوہ کچھ اور ہی سمجھا۔ مجھے یہ دیکھ کر پورا یقین ہو گیا کہ انصاف سچ مچ اندھا ہوتا ہے۔ کم سے کم آرڈیننسوں کے ماتحت کام کرنے والے مجسٹریٹوں نے تو اسے اندھا بنا ہی دیا تھا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اشٹا بکر کو دیکھنے کے بعد کوئی بھی آنکھ والا آدمی اِس بات کا یقین نہ کر سکتا کہ وہ گاڑی سے لوٹ کر چاول کا پورا پیٹھ پر لادے ایک ڈیڑھ میل تک دھان کے کھیتوں سے ہوتا ہوا بھاگنے کے بعد پیچھا کرنے والوں کے ہاتھوں پکڑا جائے۔ جس آدمی کے ہاتھ کی انگلیاں نہیں کھلتیں جس کا ہاتھ سیدھا نہیں رہ سکتا جس کے پیر ایسے لنگڑے تھے کہ وہ مشکل سے چل سکتا اور جس کی عمر ساٹھ برس کی ہو وہ دو من چاول کا بورا پیٹھ پر لے کر ایک ڈیڑھ میل بھاگ سکا ہوگا، اِس کا یقین اندھا ہی کر سکتا ہے مگر مجسٹریٹ

۵۷ اشٹا بکر کے معنی ہیں آٹھ جگہ سے ٹیڑھا۔ یہ ایک رشی کا نام تھا جن کے متعلق روایت میں ہے کہ اُن کا جسم آٹھ جگہ سے ٹیڑھا تھا اور جب ان پر لوگ ہنسے تو انھوں نے وہ اپدیش دیا جو اشٹا بکر گیتا کے نام سے مشہور ہے۔

نے یقین کر کے سات سال کی سزا دے دی تھی۔

سیاسی مقدموں کا تو کہنا ہی کیا۔ پٹنہ ضلع کا کچھ حصہ برسات میں پانی سے بھر جاتا ہے۔ اُسے 'ٹال' کہتے ہیں۔ برسات میں ریل پر سے ہی جہاں تک نگاہ جا سکتی ہے، پانی ہی پانی نظر آتا ہے۔ اِس ٹال میں جو گاؤں ہیں وہ برسات میں دنیا سے ایک طرح الگ ہو جاتے ہیں۔ وہاں سے باہر نکلنے کے لئے ناؤ کے سوا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں۔ یوں ہی دوسرے موسم میں بھی ان گاؤں میں ہفتہ میں ایک بار ڈاکیہ ڈاک لے جایا کرتا ہے برسات میں تو شاید مہینوں میں ایک آدھ بار ڈاکیہ پہنچ جاتا ہو تو بہت ہے۔ ایسے ہی ایک چھوٹے گاؤں کے لوگوں کا، وہاں کے ایک جزوی زمیندار کے ساتھ، کئی برسوں میں جھگڑا چلا آتا تھا۔ اِس تحریک کو غنیمت سمجھ کر اُنھوں نے وہاں کے خاص خاص کسانوں پر پولیس سے سیاسی مقدمہ چلوا دیا۔ وہ گرفتار کر کے جیل میں لائے گئے۔ جب اُن کا مقدمہ دورہ سپرد ہو گیا، تو وہ بانکی پور جیل میں ہی رکھے گئے۔ سیشن میں اتنے مقدمے تھے کہ اِس مقدمہ کی سماعت ۱۹۴۴ء میں جون۔ جولائی سے پہلے نہ ہو سکی۔ وہ لوگ تقریباً دو برس تک تو حوالات میں ہی پڑے رہے۔ اُن پر جرم بڑے سنگین لگائے گئے تھے۔ اُس گاؤں کے لوگوں نے بمبئی کے ۸۔ اگست کے ریزولیوشن کے بعد کانگریس کے حکم سے اپنے اور آس پاس کے گاؤں میں برٹش راج اٹھا کر اپنا راج قائم کر لیا ہے۔ ایک آدمی راجہ ہو گیا، دوسرا وزیر، تیسرا کمانڈر انچیف، اور اسی طرح اور لوگ بھی اس قیام سلطنت میں معاون تھے اور اِس راج کو چلانے کے لئے لوگوں پر ٹیکس لگایا تھا۔ جو سخت سے سخت دفعات ہو سکتے تھے، وہ اُن پر لگائے گئے جن کی سزا پھانسی یا ضبطی جائداد ہو سکتی تھی۔ راجہ وزیر کمانڈر ان چیف اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ بانکی پور جیل میں لائے گئے۔

کمانڈر اِن چیف اِتنے بیمار تھے کہ ان دو برسوں میں ان کا زیادہ تر وقت ہسپتال ہی میں گزرا۔ مقدمہ سیشن جج کے سامنے پیش ہوا۔ پولیس کا بیان یہ ہوا کہ بمبئی کی خبر پاکر اِن لوگوں نے اپنا راج قائم کرلیا۔ اُس گاؤں میں اور آس پاس کے گاؤں میں لوگوں سے ٹیکس وصول کرنے لگے اور جو ٹیکس نہیں دیتا اُس کا گھر بار لوٹ لیتے۔ اُن لوگوں کا جواب تھا کہ سارا مقدمہ جھوٹا ہے۔ وہ لوگ کانگریس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں رکھتے تھے۔ بمبئی کے فیصلہ کا اُن کو کچھ پتہ ہی نہ تھا۔ گاؤں کے اس چھوٹے جزوی زمیندار نے اپنی دشمنی نکالنے کے لئے، انھیں جھوٹے مقدمہ میں پھنسا دیا۔ سیشن جج کا فیصلہ ہوا کہ مقدمہ بالکل جھوٹا اور بے بنیاد ہے، اس زمیندار نے ہی مقدمہ کھڑا کیا ہے، کیونکہ ایسے گاؤں میں جس کا تعلق برسات میں باقی دنیا سے ایک طرح سے ٹوٹ جاتا ہے۔ بمبئی کے فیصلہ اور تحریک کی خبر بھی نہ پہنچی ہوگی۔ کیونکہ جس دن وہاں آزاد راج قائم کرنے کی بات کہی جاتی تھی، اُس دن تک پٹنہ شہر میں بھی ابھی تحریک نے زور نہیں پکڑا تھا۔ آخر کار سب کے سب چھوٹ گئے مگر دو برسوں تک حوالات میں رہے اور مقدمہ میں بہت خرچ کرنے کے بعد۔

ایک مثال اور لیجئے۔ اٹھارہ بیس برس کا ایک لڑکا تھا۔ سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ دیکھنے میں ذرا اچھا تھا۔ پولیس سے اُس کی ذرا رنجش تھی۔ وہ چھوٹی موٹی چوریاں کرنے والا یا جیب کترا سا ہوگا۔ ۹۔ اگست کی تحریک شروع ہونے سے کچھ پہلے ہی، وہ بلا ٹکٹ ریل پر سفر کرنے پر گرفتار ہوا۔ اِسی درمیان تحریک شروع ہوگئی۔ پولیس نے اُسے کچھ دنوں کے لئے جیل میں رکھ دینے کی تحریک یہ سوچی کہ تھانہ لوٹنے ریل توڑنے تار کاٹنے کے مقدموں میں وہ ملزم بنا دیا جائے۔ پولیس نے شاید یہ سوچا کہ اس طرح ایک جیب کترے کی گرفتاری کا بار کچھ برسوں کے لئے اُس کے سر سے اُتر

جائے گا۔ ٹکٹ والے مقدمہ میں اُسے ایک ہفتہ قید کی سزا ہوئی، جو بہت جلد ختم ہوگئی۔ مگر اُس پر کئی اور مقدمے تھے۔ وہ سیاسی حوالاتیوں کے پاس رکھا گیا۔ ایک مقدمہ ہوا جس میں اُس نے بیان دیا کہ واقعہ سے بہت پہلے ہی وہ جیل میں بند رہا ہے مجسٹریٹ نے اُس کی بات مان لی اور رہا کر دیا لیکن اُس پر اور بھی اس قسم کے مقدمے تحریک کے متعلق تھے، اِس لئے وہ چھُٹا نہیں۔ دو تین مقدمے ہوئے اور سب میں وہ بری ہوتا گیا۔ پھر بھی رہا نہیں ہوا۔ اِس طرح کئی مہینے گزر گئے۔ ایک اور مقدمہ چلا۔ اُس کا تعلق بھی تحریک سے تھا۔ مگر اُس کے یہ بیان دینے پر کہ وہ واقعہ سے بہت پہلے ہی جیل میں رہا ہے اور جیل کا رجسٹر دیکھ لینے سے ہی یہ بات ثابت ہو جائے گی۔ مجسٹریٹ نے اُسے کئی سال قید کی سزا دے دی۔ اپیل بھی نامنظور ہوگئی۔ مگر اُس کی طرف سے ایک درخواست تیار کی گئی۔ جس میں یہ سب باتیں لکھی گئیں۔ اُس کی گرفتاری کی تاریخ، واقعہ کی تاریخ، دوسرے مقدموں کا حال جن میں وہ چھوڑا گیا تھا، سب باتیں کھول کر لکھی گئیں اور کہا گیا کہ جیل کا رجسٹر منگا کر دیکھا جائے کہ واقعہ کے دن وہ جیل میں تھا یا نہیں۔ ضلع مجسٹریٹ جیل دیکھنے آیا تو اُس نے درخواست افسر مذکور کو دے دی۔ ضلع مجسٹریٹ کو تعجب ہوا مگر وہ درخواست ساتھ لیتا گیا۔ معلوم ہوا کہ اس نے کاغذوں کو منگا کر دیکھا اور اسے معلوم ہو گیا کہ وہ آدمی غلط سزا پا کر جیل میں سڑ رہا ہے۔ اُس نے سرکار کو لکھا اور اُس کی رہائی کا حکم منگوا لیا۔

اِس طرح کی اندھیر گردی نہ جانے کتنی ہوئی جس کے شکار سیاسی آدمی تو ہوئے ہی، دوسرے لوگوں کی بھی تعداد کم نہ تھی۔ سیاسی آدمیوں کی سزاؤں کی بات کیا کہوں؟ اُن لوگوں کو بھی دیکھا جن کو پچیس پچیس سال کی سزا ملی تھی۔ ایسے بھی تھے جن کو پچاس برس

سے زیادہ طویل سزا ملی تھی ۔ ایسے لوگوں کی تعداد کچھ کم نہ تھی جن کو دس برس یا دائم الحبس کی سزا ملی تھی ۔ سال دو سال چار سال کی تو بات ہی کیا ۔ جب کلکتہ ہائی کورٹ نے اُس آرڈیننس کو جس کی رو سے یہ مقدمے چلائے گئے تھے ۔ غیر قانونی بتا دیا اور لارڈ لنلتھگو کو نیا آرڈیننس بنانا پڑا اور اِن مقدموں کے ملزموں کو اپیل کا موقع ملا تو ہائی کورٹ نے بہتیروں کو چھوڑ دیا ۔ بہتوں کی سزائیں کم کر دی گئیں ۔ خاصی تعداد تو یہ کہہ کر چھوڑ دی گئی کہ ملزم جتنی سزا بھگت چکا ہے ، کافی ہے ۔ شروع میں ہی جب تحریک زوروں پر تھی اور مقدموں کی ابتدا ابھی ہو رہی تھی ۔ اندھیر گردی کے کچھ نمونے سامنے آگئے جن میں سے ایک کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ، جس میں آٹھ آدمیوں کو پھانسی کی سزا ضلع جج نے دے دی تھی ۔

ان کے پہلے کے مقدموں میں کانگریسی لوگ عدالتوں میں اپنا بچاؤ نہیں کیا کرتے تھے ۔ اُس زمانے میں بھی دھاندلیاں تو ہوا کرتی تھیں ، مگر سزاؤں میں کچھ تناسب رہتا اور اتنی لمبی لمبی سزائیں نہیں ہوتیں ۔ جرمانہ میں بڑی بڑی رقمیں کہیں کہیں لی جاتیں ، مگر عام طور پر لوگ اِن باتوں کی پروانہ کرتے اور گاندھی جی نے بچاؤ کرنے کی جو ممانعت کر دی تھی ۔ اُسے لوگ مانتے ۔ اس بار کے مقدموں کا رُخ کچھ دوسرا تھا ۔ اس میں بہت لمبی لمبی سزائیں (پھانسی تک کی) ہوتیں یا ہونے والی تھیں ، اس لئے یہ سوال اٹھا کہ بچاؤ کیا جائے یا نہیں ۔ بانکی پور جیل میں بھی ایسے لوگ تھے جنہیں پھانسی کا سزا کا حکم ہوا تھا ۔ ۳۱-۱۹۳۰ء اور ۳۴-۱۹۳۲ء کے ستیہ گرہ کی تحریک کے زمانہ میں بھی جرمانوں کی وصولی میں اندھیر گردی ہونے لگی تھی ۔ تھوڑی رقم کے لئے گھر کا سب اثاثہ صرف قانونی طریقہ پر ہی ضبط نہیں کیا جانے لگا ۔ بلکہ غیر قانونی طریقہ پر لوٹا بھی جانے لگا

کسی نے بغیر کسی سے رائے لئے ہی معاملہ کو ہائی کورٹ تک پہنچا دیا۔ وہاں سے حکم ہو گیا کہ بالاجمال ہندو خاندان کا مال کسی ایک آدمی پر جرمانے میں ضبط نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جرمانے کی وصولی کی اندھیر گردی بہت کم ہو گئی۔ کیوں کہ سبھی جگہوں میں لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ایسی نظیر قائم ہو گئی ہے۔ اس بار جب لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ ایسے سنگین مقدموں میں بچاؤ کیا جائے یا نہیں، تو میں نے رائے دی کہ بچاؤ ضرور کیا جائے۔ کچھ لوگوں کو یہ بات پسند نہیں آئی اور کچھ لوگوں کو اس کا پتہ ہی نہیں تھا کہ میں نے ایسی رائے دی ہے اس لئے کچھ لوگوں نے بچاؤ نہیں کیا۔ اور جو سزا ہوئی اسے ہنستے ہنستے جھیل لیا۔ ان میں شری جگ لال چودھری بھی تھے جن کو دس سال کی سزا ملی اور یہ بھی تب جب ان کا یہ جوان لڑکا گولیوں کا شکار بن چکا تھا اور ان کی گرفتاری تھانے پر ہوئی تھی جہاں اس کی لاش کی تلاش میں وہ گئے تھے۔

جب نئے آرڈیننس کی رو سے اپیل کا موقع ملا، تو اس میں بھی میں نے رائے دی کہ اپیلیں کی جائیں۔ میں نے یہ رائے دو وجہوں سے دی۔ ایک وجہ تو یہ تھی کہ میں سمجھتا تھا کہ بچاؤ کرنے سے مجسٹریٹوں کی دھاندلی شاید کچھ کم ہو اور دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نے دیکھا کہ اس تحریک میں بہتیرے ایسے لوگ بھی گرفتار ہوئے تھے جن کا کانگریس سے کبھی کوئی سروکار نہیں رہا تھا اور جو ہر حالت میں اپنا بچاؤ کرتے رہے۔ کانگریسی لوگوں میں بھی ایسے لوگ تھے جو اپنا بچاؤ کرنا چاہتے تھے اس لئے سزائیں بھی سخت ہونے والی تھیں۔ میں نے سوچا کہ ان کو اگر روکا جائے تو بے اطمینانی پھیلے گی اور ہو سکتا ہے کہ روکنے پر بھی بہت سے لوگ بچاؤ کریں ایسی حالت میں بچاؤ کرنے دینا ہی ٹھیک معلوم ہوا۔ میں جانتا تھا اور اپنے یقین کو، جن سے ملاقات ہوتی، ان سے کہہ بھی دیتا تھا کہ اگرچہ اُن کی

سزائیں طویل ہیں، پھر بھی وہ اور میرے ایسے لوگ بھی جو بغیر میعاد کے جیل میں رکھے گئے ہیں، رہا ہوں گے ایک ہی ساتھ۔ ہو سکتا ہے کہ ہم کچھ پہلے چھوٹ جائیں مگر ہم جب تک انہیں چھڑا نہ لیں باہر نہیں رہ سکیں گے۔ بات بھی ایسی ہی تھی۔ ہم اتنے لوگوں کو لمبی سزا بھگتنے کے لئے چھوڑ کر خود کیسے باہر رہ سکتے تھے؟ مجھے اس بات سے اطمینان ہوا کہ جب مہاتما گاندھی باہر نکلے تو انہوں نے بھی مقدموں میں بچاؤ کرنے کی ہی ہدایت کی۔ تشویش ان لوگوں کے بارے میں تھی جنہیں پھانسی کا حکم ہوا تھا جو قید ہیں وہ تو کچھ آگے پیچھے جیل سے نکالے جا سکتے ہیں مگر جن کو پھانسی کی سزا دی گئی ہے وہ تو ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جائیں گے۔ پٹنہ میں کئی آدمیوں کو پھانسی کا حکم ہوا، مگر کسی نہ کسی طرح سب بچ گئے۔ کچھ وقت تو اپیل وغیرہ میں لگا۔ بعد میں جب ہم لوگ رہا ہو گئے اور مہاتما گاندھی پھانسی والے مقدموں کے بارے میں لارڈ ویول سے باتیں کرنے لگے تو اوروں کے ساتھ پٹنہ والوں کی پھانسی کی سزا بھی دائم الحبس میں بدل گئی اور کانگریسی وزارت قائم ہونے پر وہ رہا ہو گئے۔ مگر مظفر پور، بھاگلپور، منگیر وغیرہ میں کئی آدمی پھانسی ہی پا گئے۔ اگر وہ بھی فوری طور پر لٹکا نہ دئے جاتے تو آخر میں رہا ہوتے ہی اگرچہ ان کے ساتھ ایک ہی مقدمہ میں سزا پائے ہوئے لوگ بعد میں چھوٹ گئے۔ پھر بھی وہ چلے ہی گئے۔ ان لوگوں کو جو پھانسی کی سزا کا حکم پا چکے تھے، آج باہر دیکھ کر ایک قسم کی خوشی محسوس ہوتی ہے اور اس بات پر افسوس بھی ہوتا ہے کہ دوسروں کو اس طرح ہم نہیں بچا سکتے۔

۱۹۴۲ء کی اشتعال انگیزیوں کا نتیجہ

اس بار ۹ راگست ۱۹۴۲ء کو میں جیل میں لایا گیا۔ وہاں سے جون ۱۹۴۵ء میں نکلا۔ شروع میں متھرا بابو اور شری چکردھر شرن میرے ساتھ رہے، دوسرے لوگ آتے جاتے رہے ۔ دوسرے لوگ آتے جاتے رہے، مگر میرے لئے نہیں ۔ اکتوبر ۱۹۴۳ء میں شری چکردھر شرن ہزاری باغ میں بھیجدئیے گئے۔ مارچ ۱۹۴۴ء میں متھرا بابو کی رہائی ہوگئی۔ اس کے بعد میرے ساتھ ۳ر دسمبر ۱۹۴۴ء تک صرف بالمیکی جی رہے ۔ نئے آرڈیننس کی رُو سے سرکار کی طرف سے ایک کمیٹی ہر چھٹے مہینے آتی اور نظربند لوگوں سے ملتی جن کے لئے یہ سفارش کرتی، وہ چھوڑ دیئے جاتے ۔ یہ کمیٹی پہلی بار مارچ ۱۹۴۴ء میں آئی ۔ متھرا بابو اسی کی کی سفارش پر اچانک چھوڑ دئے گئے ۔ مجھ سے کمیٹی کے ممبروں نے پوچھا تھا کہ کیا میں رہا ہونا چاہتا ہوں تو میں نے جواب دیا، اکیلے نہیں بلکہ سب لوگوں کے ساتھ۔ اس پر انہوں نے پوچھا کہ اگر چھوڑ دیا جاؤں تو کیا مجھے تعجب ہوگا۔ میں نے جواباً کہا کہ ضرور بہت تعجب ہوگا۔! انہوں نے کہا کہ توڑ پھوڑ کا پروگرام اگر کانگریس نے نہیں دیا تو لوگوں کو کیسے معلوم ہوا اور یہ بات سارے ملک میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک اتنی جلد کیسے پھیل گئی۔

میں نے جواب دیا کہ ۸۔ اگست کے ریزولیوشن کے ساتھ ساتھ ایک سرکاری اعلان ۹۔ اگست کے سویرے کے اخبار میں نکلا تھا جس میں حکومت نے گاندھی جی اور ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کی گرفتاری کا سبب بتا کر لوگوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی تھی کہ سرکاری کارروائی مناسب ہے۔ اسی میں یہ بات صاف لکھی تھی کہ کانگریس کی طرف سے اس بار ریل کی پٹری اور تار وغیرہ توڑنے کاٹنے کا پروگرام دیا گیا ہے۔ اُسی دن یا اس کے دوسرے دن مسٹر ایمری نے ریڈیو پر تقریر کی جس میں بھی یہ باتیں کہی گئی تھیں اور یہ تقریر بھی اخباروں میں چھپی تھی۔ کانگریس کی طرف سے کوئی پروگرام نہیں نکلا تھا۔ لوگوں نے سمجھ لیا کہ یہی پروگرام ہوگا اور سرکار کی ہی بات پر یقین کر کے لوگوں نے کام شروع کر دیا۔

میرا آج بھی یقین ہے کہ اس پروگرام کی اتنی زیادہ اور اتنی تیزی سے تبلیغ اسی وجہ سے ہوئی۔ لوگوں کے دل میں پہلے سے ہی، ۱۹۳۰ء سے ہی، اس طرح کی باتیں اٹھا کرتی تھیں، اس بار اس کی توثیق مل گئی اور عوام الناس نے اسے صحیح مان لیا۔ اِس کے دو زبردست ثبوت مجھے اُسی زمانے میں جیل میں مل گئے میں سمجھ گیا کہ یہ بات زوروں سے چلے گی۔ میری گرفتاری کے تھوڑے ہی دن بعد بھولن بابو جیل میں پہنچے۔ اُنھوں نے مجھ سے بتایا کہ جب آپ کی گرفتاری کی بات شہر میں پہنچی تو کچھ لوگ میرے پاس پہنچے اور پوچھا کہ پروگرام کیا ہے۔ لوگ سمجھتے تھے کہ میرے ساتھ اُن کی ملاقات ہوئی ہوگی اور میں نے کچھ بتایا ہوگا۔ مگر بہت دنوں سے میری ان کی ملاقات ہوئی ہی نہ تھی، اس لئے وہ کچھ نہیں بتا سکے۔ لیکن اسی دن چند گھنٹے پہلے اخباروں میں سرکاری اعلان چھپ چکا تھا اور لوگوں کی توجہ اس طرف گئی تھی۔ دو دن بعد جب کچھ لڑکے سکریٹریٹ پر گولی چلنے کے بعد گرفتار ہو کر بانکی پور جیل میں لائے گئے تو میں نے دیکھا کہ وہ سب کے سب تار ٹیلیفون

اور ریل نیز سڑکوں کو توڑنا کاٹنا اور کسی طرح رسل ورسائل کا بند کر دینا پروگرام میں داخل سمجھتے تھے۔ جب جیل کے پھاٹک کے نزدیک ایک لاری میں گرفتار کچھ طالب علم کہیں بھیجے جا رہے تھے، تو عوام نے انھیں بچا لیا اور لاری جلا دی، پھر باقی لاریوں سے اتار کر دوسرے طالب علم کچھ دیر کے لئے پھر جیل میں لائے گئے۔ میں بیمار تو تھا مگر پھر بھی میں نے اُن کو یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ یہ اچھا نہیں ہوا۔ اِس پر ان کو جواب یہی ملا کہ جب ٹیلیفون، تار وغیرہ توڑنا اور ریل روکنا ٹھیک ہے، تب تو لاری کو بھی بے کار کر دینا اِسی پروگرام کے اندر ہے، اِس لئے یہ بھی ٹھیک ہی ہونا چاہیئے۔ میرے بہت کہنے پر بھی میری بات ان کو جچی نہیں، اگرچہ میرے لحاظ سے وہ کچھ زیادہ بولے نہیں۔ وہ تو جیل میں کچھ دنوں تک بند رہے، اِس لئے انھوں نے تو اس پروگرام کو نہیں چلایا ہوگا۔ مگر یہ ظاہر تھا کہ لوگوں کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ توڑ پھوڑ بھی پروگرام میں ہے۔

اِسی سبب سے اتنے جلد، تقریباً مغل سرائے سے آسنول تک ای آئی آر (ایسٹ انڈین ریلوے) کی مین لائن (خاص لائن) پر گاڑیوں کا آنا جانا بہت دنوں تک بند رہا۔ اِسی طرح پٹنہ، گیا لائن بیکار کر دی گئی تھی۔ صرف گرانڈ کارڈ لائن میں بہت نقصان نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اُس کی گاڑیوں کا آنا جانا بند نہیں ہوا۔ گنگا کے اُتر کی طرف بی این ڈبلو ریلوے میں (جسے اب او ٹی ریلوے کہتے ہیں) اِدھر بنارس سے لے کر کٹھار تک اور اُدھر گورکھپور بستی سے لے کر وہاں تک کی لائن، جہاں چھپرا میں یہ بنارس لائن سے مل جاتی ہے، بہت توڑ پھوڑ ہوئی۔ تقریباً سبھی جگہوں پر اتنے اسٹیشن توڑ پھوڑ دیئے گئے اور لائن بھی اِس قدر برباد کر دی گئی تھی کہ کئی مہینوں تک گاڑیاں نہ چل سکیں۔ انہیں وجہوں سے بہار کے باہر کے لوگوں کا خیال ہے کہ تمام بہار اُتر پردیش کے پوربی ضلعوں

میں ہی تحریک کی شکل سب سے زیادہ تیز اور زبردست رہی لہذا یہیں سب سے زیادہ حکومت کی سختی بھی ہوئی ۔ نہ معلوم کتنے آدمی پولیس اور فوجیوں کی گولیوں کے شکار ہوئے۔ کتنے ہی گھر لوٹے اور جلائے گئے ۔ کتنی ہی اور قسم کی ناقابل بیان تعزیریں سہنی پڑیں ۔

جیل خانے والوں کی تعداد کا تو ہمیں کچھ ٹھیک پتہ بھی نہیں چلا۔ ہم اتنا ہی جانتے ہیں کہ بہار میں بہتیرے معمولی قیدیوں کو سیاسی قیدیوں کے لئے جگہ خالی کرنی پڑی ۔ اور اس طرح وہ میعاد سے پہلے ہی چھوڑ دیئے گئے ۔ بہت سے ایسے ملزم تو حوالات سے چھوڑ دیئے گئے جن پر سنگین جرم لگے تھے ۔ لوگوں کا کہنا ہے کہ بھاگلپور ضلع کے بانکا سب ڈویژن کے تیس چالیس ڈاکو اس لئے چھوڑ دیئے گئے کہ وہ باہر آکر ڈاکہ ڈالیں اور عوام کانگرس سے بیزار ہو جائیں ۔ سُنا کہ اُن میں سے کچھ نے باہر نکل کر تحریک میں حصہ لیا۔ ایک کو تو پھانسی کی سزا ہوئی اور کئی دوسروں کو دوسری سخت سزائیں ملیں ۔ میں نے جیل سے رہا ہونے پر گورنر سے یہ بات کہی تھی ۔ اُنھوں نے تحقیقات بھی کرائی تھی یہ معلوم ہوا کہ بہت سے ڈاکو اس طرح بانکا سے چھوڑ دیئے گئے ۔ میں نے سُنا کہ شروع میں، جب تک تحریک زوروں پر رہی ، چوری ، ڈکیتی یکبار بند ہو گئی تھی ۔

عاملانِ تحریک نے کچھ ڈاک خانوں اور رجسٹری دفتروں پر دخل کر لیا کہیں کہیں کچھ میں اُنھوں نے آگ بھی لگا دی ، مگر شروع میں جب تحریک زوروں پر تھی تو یہ بھی سننے میں آیا کہ جہاں کہیں روپے ملے ۔ اِن لوگوں نے اُن میں سے ایک بھی نہیں لیا ۔ چاندی کے روپے تو اُن دنوں دیکھنے کو بھی کم ہی ملا کرتے تھے ۔ لہذا اکثر نوٹ ہی ملا کرتے ۔ لوگ اُن نوٹوں کو جلا دیتے ۔ اُن سے ذاتی فائدہ اٹھانے کا یا انہیں تحریک کے لئے خرچ کرنے کا خیال بھی کسی کو نہ آتا ۔ لیکن کچھ دنوں بعد یہ بات نہ رہی کچھ لوگ

اِس طرح سے آئی ہوئی رقم کو تحریک چلانے کے لئے جمع کرنے لگے۔ یہاں تک کہ تحریک کے نام پر ڈاکے بھی ڈالے گئے۔ معلوم نہیں کہ اِن ڈاکوں سے ملا ہوا روپیہ کس کے پاس گیا اور کس نے اُسے کس طرح خرچ کیا؟ مگر یہ سب بہت بعد میں ہوا۔ جب تحریک ایک طرح سے بند ہو گئی تھی۔ تحریک کے زور کے دنوں میں تو سرکاری کارکن ہی لوگوں کو لوٹ کھسوٹ کے لئے مدعو کرتے۔ ڈاک خانے والے تو ڈاک خانہ کا لٹ جانا ہی اچھا سمجھتے اُن کو یہ کہنے کا بہانہ مل جاتا کہ جو روپیہ جمع تھا لوگ لوٹ گئے۔ چاہے وہ روپے سچ مچ لٹے ہوں یا نہیں مگر سرکار کو نہیں ملے۔ بہت جگہوں میں، شروع میں، تھانے والے بھی عوام کے ساتھ مل گئے۔ لوگوں کے پہنچتے ہی وہ تھانے پر جھنڈا لہرانے دیتے اور اُن کے ساتھ مل کر نعرے لگاتے۔ ایسے تھانیداروں کے ساتھ عوام کا بھی اچھا سلوک ہوتا۔ سنا ہے کہ کہیں کہیں تھانیداروں کو کشتی یا دوسری سواری پر سوار کرا کر ضلع کے صدر شہر میں لوگوں نے پہنچا دیا اور تھانے پر قبضہ کر لیا۔ جہاں تھانیدار کی طرف سے زیادتی ہوئی۔ وہاں تھانیدار کے ساتھ عوام نے سختی کی۔ کچھ جگہوں میں مگر بہت کم جگہوں میں وہ مار ڈالے گئے مگر ایسی جگہیں کم تھیں۔ کوئی کوئی تھانیدار بہت ظالم ثابت ہوا اور جب فوج آگئی تب تو پولیس کا رُخ ہی بدل گیا۔ اُنہوں نے اتنا زیادہ ظلم کیا کہ بیان کرنا مشکل ہے۔ اِس ظلم میں بیشتر داروغہ وغیرہ اوپر کے افسر حصہ لیتے تھے۔ سپاہیوں اور کانسٹبلوں نے کم حصّہ لیا۔

یہ سب کچھ جاننے کے بعد یہ ماننا پڑے گا کہ عوام نے ریل تار تو خوب توڑے اور سرکاری مکانوں کو بھی نقصان پہنچایا، مگر تحریک کا جتنا پھیلاؤ تھا۔ اُس تناسب سے عوام نے سرکاری کارکنوں کے ساتھ زیادہ سختی نہیں کی۔ جان لے لینا یا مار پیٹ کرنا

بہت کم ہوا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ عوام کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ کسی آدمی کو مارنا پیٹنا یا جان سے مار ڈالنا عدمِ تشدد کے اُصول کے خلاف ہے، مگر ریل، تار، مکان وغیرہ بے جان چیزوں کو توڑنا پھوڑنا یا جلا دینا بھی عدمِ تشدد کے اندر ہی ہے۔ اگرچہ کچھ سرکاری آدمی مارے گئے مگر ان کی تعداد بہت کم تھی۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ بہت دور دور تک تحریک پھیلی اور چلتی رہی، تو یہ خیال ہوتا ہے کہ عوام اگر چاہتے تو بہت سے لوگوں کو آسانی سے مار سکتے تھے۔ اِس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عوام نے جان بوجھ کر کتنوں ہی کو چھوڑ دیا۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو نہ معلوم کتنے اور تھانیدار قتل ہو گئے ہوتے۔ پھر بھی اِن تھوڑے سے ہی لوگوں کے بدلے میں سرکار نے نہ جانے کتنوں کو گولیوں کا شکار بنا ڈالا۔ اگر دونوں طرف سے مرے ہوؤں کی تعداد کا ٹھیک سے پتہ لگتا تو تناسب ایک کے بدلے ۵، نہیں تو پچاس ضرور نکلتا۔ مگر یہ تو محض قیاس ہے۔ ٹھیک تعداد تو نہ معلوم ہوئی ہے اور نہ شاید معلوم ہو گی ہی۔ تب بھی یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ تحریک بالکل پُرامن نہ رہ سکی اور عوام بھی اس پابندی کے باہر نکل گئے۔

تحریک کا زور تو تقریباً ایک سے دو مہینے تک رہا۔ اِس کے بعد اُس کا اثر چاہے کچھ رہ گیا ہو مگر لوگ حملہ نہ کر کے اپنے بچاؤ ہی میں لگ گئے اور حکومت کی جارحیت کا شکار بنتے رہے۔ کچھ لوگوں نے تحریک کے سر ہو جانے پر اُسے پھر سے گرمانے کی کوشش کی۔ مگر اِس کوشش کا کوئی خاص نتیجہ دیکھنے میں نہیں آیا۔ تحریک پھر نہ اُٹھی اور نہ چلی اکّے دُکّے واقعات کہیں کہیں ہوئے، مگر اُن کا اثر نہ تو سرکار پر کچھ پڑا، اور نہ عوام کو ہی اُن میں کچھ خاص دل چسپی رہی۔ ہاں اِن کی وجہ سے سرکاری جارحیت کا زور جاری رہا اور عوام کو بہت کچھ سہنا پڑا۔ کچھ لوگ جیل میں نہیں آئے۔ باہر ہی کام کرتے

رہے - کچھ لوگ جیل سے نکلنے پر اس قسم کی کوشش میں لگے رہے مگر تھوڑے ہی دنوں بعد یہ ظاہر ہو گیا کہ کوشش کرنے والے لوگ فی الحال عوام میں پھر جوش نہیں پیدا کر سکیں گے اور تحریک پھر جاری نہیں کی جا سکے گی۔ جو لوگ اِس طرح کی کوشش میں لگے ہوئے تھے وہ چھپ چھپا کر ہی کام کر سکتے تھے۔ اِس تحریک میں اِس قسم کے لوگ بہت تھے۔ کچھ دنوں کے بعد تو اِن لوگوں کو اپنی حفاظت کے سوا دوسرا کام کرنے کا نہ تو وقت ملتا اور نہ وسیلہ فرار رہنا ہی ایسا کام رہ گیا۔ جو اِن کی ساری طاقت اور سارا وقت لے لیتا۔ پھر بھی بہتیروں نے بہت بہادری سے کام کیا۔ کہیں کہیں زبردست تنظیم بھی کر دی جسے ہزار کوشش کے باوجود سرکار توڑ نہ سکی اور اِن کا پتہ بھی نہ پا سکی۔ جب کانگریسی وزارتیں بن گئیں تب اِن سب لوگوں پر سے مقدمے اور گرفتاری کے وارنٹ اٹھا لئے گئے۔ تبھی وہ باہر نکلے اور تبھی سرکاری کارکن ان کا پتہ لگا سکے۔ اِس سلیقۂ کار اور بہادری کے لئے وہ مستحقِ تحسین ہیں۔ مگر میرا اپنا یقین ہے کہ اگر چھپ چھپا کر کام نہ کیا ہوتا تو اِن میں سے کچھ لوگ ضرور مارے جاتے، پھانسی چڑھتے یا دوسری طرح کی سخت جارحیت کا شکار بنتے۔ مگر بے قصور عوام پر جتنا ظلم ہوا اُتنا نہ ہوتا اور تحریک بھی کہیں زیادہ آگے بڑھ گئی ہوتی۔ اور اُسے جلد دبایا بھی نہ جا سکتا۔ عوام کے سامنے بھی ایسے لوگ برابر موجود رہتے جن کو وہ اپنا لیڈر مانتے، جن کی باتوں پر وہ خوشی خوشی اپنا اثاثہ لٹاتے اور جان دیتے۔ چھپ چھپا کر کام کرنے کا یہ اثر ہوا کہ کام بہت نمایاں صورت میں نہ ہو سکا تھوڑے لوگوں کی کارروائیوں کا نتیجہ بہتیرے دوسرے بے قصور لوگوں کو بھگتنا پڑا۔ اِس لئے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر ریل اور تار توڑنے والے لوگ سامنے آکر کام کرتے اور اپنے کاموں کو قبول کر لیتے تو دوسرے لوگوں کی ہمت کہیں زیادہ بڑھ جاتی۔ ممکن ہے ایک کے بدلے سیکڑوں

دوسرے لوگ اُسی کام کے لئے تیار ہو جاتے اور سزا بھی اُنھیں لوگوں کو ملتی جو قبول کرتے بے قصور بہت کچھ بچ جاتے۔ بہر حال یہ تو عدمِ تشدد کے اُصول کی بات ہے۔ جو لوگ اُس میں یقین نہیں رکھتے اُن کو بھلا اس کی پابندی کیسے پسند ہو سکتی ہے۔ جہاں تک عوام کی ہمت بڑھی تھی وہ سرِ عام بغاوت کی وجہ سے ہی بڑھی تھی۔ یہ حکمتِ عملی قائم رہتی تو اور بھی بہت کچھ بڑھتی۔

قحطِ بنگال اور ہندوستان کی وحدت

جیل میں رہتے رہتے بنگال کے مہیب قحط کا حال ہمارے سننے میں آیا۔ ۱۹۴۳ء کی گرمیوں میں چاول اور خوراک کی چیزوں کے دام اتنے چڑھ گئے کہ لوگوں کے لئے غلّہ خریدنا دشوار ہوگیا۔ جب میں بچپن میں چھپرا اور پٹنہ میں پڑھتا تھا تو ایک بار قحط پڑا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ سرکار کی طرف سے لوگوں کو مدد دینے کے لئے جا بجا بڑے بڑے تالاب کھدوائے گئے تھے۔ میرے گاؤں سے کچھ دور پر ایک بڑا تالاب کھودا گیا تھا جا بجا غریبوں کے لئے پکا ہوا کھانا بھی تقسیم کیا جاتا تھا۔ اُس وقت تک اچھا چاول روپیہ کا پندرہ سیر بکا کرتا تھا۔ اس کے بعد سے گھٹ کر نو دس سیر کا ہوگیا۔ اِس کے بعد ایک بار اور کچھ گرانی ہوئی تو وہ اور بھی کچھ کچھ گھٹ کر روپئے میں پانچ سیر بکنے لگا۔ ۱۹۴۳ء میں معمولی طور سے چاول کا دام روپے کا سوا سیر یا ڈیڑھ سیر ہوگیا۔ جیل میں ہم لوگوں کو اخباروں سے کچھ خبر ملنے لگی۔ رفتہ رفتہ بنگال کی حالت اور بھی بگڑی۔ کچھ لوگوں کے وہاں بھوکے مرنے کی خبر آنے لگی۔ تھوڑے ہی دنوں میں یہ بات معلوم ہونے لگی کہ کلکتہ کی سڑکوں پر لاشیں ملتی ہیں۔ کچھ دن بعد اخباروں میں مردوں کی تصویریں بھی چھپنے لگیں۔ اِس

بارے میں سب سے پہلے اسٹیٹسمین اخبار نے کام شروع کیا۔ دوسرے ہندوستانی اخباروں میں بھی بہت سی تصویریں چھپیں۔ عوام کی طرف سے اِن لوگوں کو مدد پہنچانے کی کوشش ہونے لگی۔ میں شروع میں اخباروں میں اِن خبروں کو پڑھتا اور تصویریں بھی دیکھتا۔ مگر کچھ دنوں بعد حالت اتنی بھیانک ہوگئی کہ میرے لئے تصویروں کو دیکھنا اور خبریں پڑھنا بھی ناقابلِ برداشت ہوگیا۔ میں نے اخبار پڑھنا بند کر دیا۔ جیل میں بیٹھے بیٹھے کوئی کر ہی کیا سکتا ہے۔ پٹنہ میں شری پرپھل رنجن داس (مسٹر پی۔ آر۔ داس) نے مصیبت زدوں کی امداد کرنے کے لئے کچھ روپے جمع کرنے کی کوشش کی۔ اُنھوں نے ایک اپیل نکالی۔ میں نے سوچا کہ یہ کام ایسا ہے کہ جس میں اور کچھ نہیں تو اپنے خط کے ذریعے لوگوں کی کچھ مدد کر سکوں تو تھوڑی تسلّی ہوگی۔ میں نے ایک خط مسٹر داس کے نام لکھا۔ جس میں ان کی اپیل کی تائید کی۔ فصل تیار ہونے کے وقت عوام سے اناج کے دان کے لئے اپیل کر کے کچھ غلّہ جمع کرنے کا راستہ بھی سمجھایا کچھ دنوں بعد سرکار کا حکم آیا کہ میرا خط مسٹر داس کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ روک لیا گیا۔ اِس کی خبر کسی کو شائد آج تک نہ ہوگی۔

بنگال کی حالت اتنی خراب ہوئی کہ نہ معلوم کتنے آدمی مرے۔ عوام کے لیڈروں کی رائے ہے کہ پچاس لاکھ کے لگ بھگ لوگوں کو بیوقت ہی لقمۂ اجل بننا پڑتا۔ سرکاری اندازہ بھی شاید پندرہ بیس لاکھ کا ہے جو دردناک حالات گزرے، وہ ناقابلِ بیان ہیں۔ سبب کچھ بھی ہو۔ شروع میں سرکار کچھ نہیں کر سکی۔ سر ناظم الدین وزیرِ اعلیٰ تھے اور وزیرِ خوراک مسٹر سہروردی، گورنر سر ہربرٹ اور بڑے لاٹ تھے لارڈ لنلتھگو۔ مجھے تعجب تھا کہ اتنی بُری حالت میں بھی وہاں کے عوام چپ چاپ سب کچھ سہ رہے تھے! کم سے کم وزارت کیسے خود کام کر سکتی ہے اور اسمبلی کے ممبر ہی اُسے کیسے چلنے دیتے ہیں۔

مگر لڑائی کا زمانہ تھا۔ آرڈیننسوں کی حکومت تھی۔ مسلم لیگ کے ہاتھوں میں اختیار تھا کوئی کچھ کر نہ سکا۔ لارڈ لنلتھگو نے کانگریس کو دبانے میں تو کافی تیزی اور تندہی سے کام کیا تھا، مگر جب بنگال میں اتنے لوگ مرے جتنے اس عظیم جنگ میں دنیا کے سبھی ملکوں کو ملا کر بھی نہ مارے گئے ہوں گے، تو اُن سے اتنا بھی نہ ہو سکا کہ کم از کم ایک دن کے لئے بنگال تو چلے جاتے اُن کے چلے جانے پر جب لارڈ ویول گورنر جنرل (وائسرائے) ہو کر آئے، تو آتے ہی بنگال گئے۔ وہاں فوج کو اُنھوں نے حکم دیا کہ لوگوں کو مدد پہنچانے کا کام کرے۔ سر ہربرٹ بیمار پڑ گئے۔ اُن کی جگہ بہار کے گورنر وہاں بھیجے گئے۔ اُنھوں نے بھی حالات سنبھالنے میں مدد کی کسی طرح سے، کئی مہینوں کے بعد، حالت کچھ بدلی۔ لوگوں کا سڑکوں پر بے موت مرنا بند ہوا۔

زبانِ خلق پر یہ تھا کہ اِس مصیبت میں بہتیروں نے جن کا کام عوام کی حفاظت کرنا تھا اور جن کے ذمہ یہ کام دیا گیا تھا، بہت رقمیں کمائیں اور مالا مال ہو گئے۔ اِس مصیبت کے اسباب میں ایک خاص سبب یہ بھی کہا جاتا ہے کہ حکومت نے لڑائی کی وجہ سے دھان چاول لے لیا تھا اور اُن کی چھوٹی ناویں لے لی تھیں۔ دشمنوں کو کچھ نہ ملنے دینے کے لئے سمندری ساحل کے علاقوں کو بے وسیلہ اور بنجر بنا دینے کی جو حکمتِ عملی جاپانی حملہ کی وجہ سے برتی گئی تھی وہ اس قحط کے لئے کم ذمہ دار نہ تھی۔ اس وقت لارڈ ویول ہی فوجی لاٹ تھے، اس حکمت عملی کی جوابدہی اُن پر ہی تھی اِس لئے بڑے لاٹ ہو کر پہنچتے ہی اُنھوں نے اس پالیسی کی وجہ سے جو حالت پیدا ہوئی تھی اسے سنبھالنے میں فوج کے ذریعہ مدد کرنا ضروری مانا۔ اِسی سے حالت کچھ بہتر بھی ہوئی۔

بہار میں بھی اناج کی قیمت ویسے ہی بہت بڑھ گئی تھی۔ چاول تیس روپے من بکنے لگا تھا مگر بہار میں بنگال جیسی حالت نہیں ہوئی۔ یہاں بھوکے مرنے والوں کی خبر کم از کم اخباروں میں دیکھنے میں نہیں آئی۔ ایک بات اِس قحط سے واضح ہو گئی کہ اِس مصیبت میں سارے

ہندوستان کے لوگ بنگال کی مدد کے لئے دوڑ پڑے، جیسے بہار میں ہیبت ناک زلزلہ کے بعد فرق اتنا ہی تھا کہ اِس وقت جنگ کی وجہ سے لوگوں کے وسیلہ نہیں تھے۔ روپے ہونے پر بھی لوگوں کو سرکاری مدد کے بغیر غلّہ نہیں مل سکتا تھا۔ اگر کہیں دُور غلّہ ملتا بھی تو تو سرکاری اجازت یا مدد کے بغیر وہ بنگال پہنچایا نہیں جا سکتا تھا کیونکہ ریل، اسٹیمر وغیرہ رسل ورسائل کے سبھی وسائل پر پابندیاں تھیں اِس لئے خواہش ہوتے ہوئے بھی جتنی مدد کی ضرورت تھی اُتنی لوگ نہ پہنچا سکے۔ مزید براں یہ مصیبت بہت دور تک پھیلی ہوئی تھی اور بہت دنوں تک قائم رہی۔ زلزلہ تو چند لمحوں کا معاملہ تھا اُس کے بعد صرف اس کے اثر کو ہی دور کرنا تھا۔ یہاں تو مصیبت بھی مہینوں تک اپنا کام کرتی ہی اِس پر دوران جنگ کی پابندیاں اپنی کرامات دکھا رہی تھیں۔ ہندوستان ایک ہے، اُس کے عوام ایک ہیں۔ اِس کا ایک ناقابلِ تردید ثبوت اِس مصیبت نے دیا مگر اِس کا اثر اُن پر بھی پڑا جو اسے تقسیم کرنا چاہتے ہیں۔

جیل میں کتاب لکھنے کا کام

ایک بار جیل میں میں نے کچھ لکھا بھی۔ یوں تو ۱۹۳۰ء میں بھی میں نے کچھ لکھنے کی کوشش کی تھی مگر وہ پوری نہ ہو سکی۔ بعد میں جو کچھ لکھا بھی تھا وہ کھو گیا۔ میں نے پہلے سے پاکستان کے متعلق کچھ مطالعہ کیا تھا۔ وہاں جا کر خیال ہوا کہ اس مضمون کا خاص مطالعہ کروں۔ کچھ ایسی کتابیں جو پاکستان کی تائید میں لکھی گئی تھیں منگائی گئیں۔ اُن کے پڑھنے کے بعد خیال ہوا کہ اِس بات کو دیکھنا چاہیئے کہ کس بنیاد پر یہ مطالبہ کیا جاتا ہے اور وہ کہاں تک ٹھیک ہے اِس کے بعد یہ خیال ہوا کہ یہ بھی دیکھنا ضروری ہے کہ مسلم لیگ پاکستان کسے کہتی ہے اُس کا مطالبہ اگر کوئی مان لیتا ہے تو اُسے کیا دینا ہوگا اور مسلم لیگ کو کیا ملے گا؟ کیا پاکستان اپنے پاؤں پر کھڑا ہو سکے گا؟ آخر میں میں نے سوچا کہ اِس مضمون پر کچھ لکھنے کی گنجائش ہے۔ اگرچہ اس کا پتہ نہیں تھا کہ ہم لوگ کب جیل کے باہر جا سکیں گے اور جو کچھ میں لکھوں گا وہ کبھی چھپے گا یا نہیں۔ تو بھی اپنے خیالوں کو صاف صاف ایسی شکل میں قلم بند کر دینا جو دوسروں کی سمجھ میں آجائیں، ٹھیک جچا۔ میں نے طے کیا کہ کچھ لکھوں۔ مجھے ایسا معلوم ہوا کہ اگر اس بارے میں سبھی ملک کے سامنے، خاص کر مسلمانوں کے سامنے آجائیں تو جس طرح خاص مطالعہ کے بعد

اس کے چلنے میں مجھے شک ہوگیا ہے، اُسی طرح دوسرے بھی اسے ناقابل عمل سمجھ لیں گے اس لئے میں نے طے کیا کہ اُنہیں باتوں کو قلم بند کروں جن سے اس کا ناقابل عمل ہونا معلوم ہو جائے۔ پاکستان کو ناقابلِ عمل کرنے والا وہ حصہ لکھے جانے کے بعد اس کی بنیاد کے متعلق بھی کچھ لکھنا مناسب معلوم ہوا۔ یعنی ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو ریاستیں ہیں، اس لئے اس کی تقسیم کر کے دو آزاد ملک اور ریاستں قائم کر دینی چاہییں۔ اس طرح جیسے جیسے لکھتا گیا کتاب کا حجم بڑھتا گیا۔ کام بہت تیزی سے نہیں بڑھ رہا تھا۔ ایک تو صحت ایسی نہیں تھی کہ بہت محنت کر سکوں۔ جب بیمار پڑ جاتا تو مہینوں کچھ نہ پڑھ پاتا اور نہ لکھ پاتا۔ جب اچھا رہتا تو پڑھتا اور لکھتا۔ کچھ جلدی کرنے کی ضرورت بھی نہیں معلوم ہوتی تھی کیونکہ اس کی امید تو تھی نہیں کہ جیل میں رہتے رہتے کوئی کتاب شائع کرنے کی اجازت ملے گی اور ابھی چھوٹنے کا کوئی قرینہ بھی نظر نہیں آتا تھا۔ اس لئے آہستہ آہستہ تھوڑا تھوڑا کر کے لکھا۔

اس درمیان میں کچھ ساتھی جیل سے رہا ہو کر باہر نکلے۔ اُنہوں نے کسی اخبار والے سے کہہ دیا کہ میں پاکستان کے متعلق ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ یہ بات شائع ہوگئی سرکاری کارکن کبھی کبھی جیل میں آیا کرتے تھے کمشنر آئے اُنھوں نے پوچھا کہ آپ کی کتاب کہاں تک لکھی جا چکی ہے۔ میں نے کہا کہ قریب قریب پوری ہو چکی ہے۔ اُنھوں نے اسے دیکھنا چاہا۔ میں نے مسودہ اُن کے ہاتھ میں دے دیا۔ ایک تو میں کچھ باریک چھوٹے حرفوں میں لکھنے کا عادی ہوں۔ دوسرے کاغذ کی کمی کے سبب سے صفحوں کے دونوں طرف لکھا تھا چونکہ کتاب تھوڑی تھوڑی کر کے لکھی گئی تھی۔ جہاں کوئی نئی بات سامنے آگئی یا کسی نئی کتاب سے معلوم ہو گئی۔ اُسے حسب موقع چسپاں کر دیا۔ اس طرح جہاں تھوڑی بھی جگہ چھوڑی گئی تھی وہ بھی بالکل بھر گئی اور کہیں کہیں تو پڑھے جانے کی آسانی کے لئے

دوسرے رنگ کی روشنائی سے بھی کام لینا پڑا۔ اِس لئے کسی بھی دوسرے کے لئے مسودۂ کتاب پڑھنا خاصا مشکل تھا۔ کمشنر نے پوچھا کہ کیا کتاب چھپوانے کا ارادہ ہے؟ میں نے جواب دیا کہ ہاں اگر حکومت اجازت دیگی۔ وہ بولے جیسی اس مسودہ کی حالت ہے، ویسی حالت میں اُسے سرکار کا دیکھ سکنا بھی مشکل ہے۔ سرکار تو ٹائپ کئے ہوئے مسودہ کو ہی دیکھ سکے گی۔ اِس پر میں نے کہا کہ ٹائپ کرانے کا وسیلہ تو میرے پاس نہیں ہے، لیکن حکومت اگر اِس کی سہولت دے گی تو ٹائپ کرا لوں گا۔

اِس گفتگو کے بعد میں نے حکومت کو لکھا کہ ٹائپ کرانے کی سہولت دی جائے میرے لکھنے پر حکومت نے کانگریسی کارکن، جمشید پور لیبر یونین کے سکریٹری شری مائیکل جون کو، جو ٹائپ کرنا جانتے تھے ہزاری باغ جیل سے بانکی پور جیل میں بھیج دیا۔ اُنھوں نے بہت محنت کر کے جہاں تک میں لکھ چکا تھا۔ ٹائپ کر دیا۔ اتفاق سے یہ کام ۱۹۴۵ء میں ۱۴/جون کی شام کو ختم ہوا۔ اُسی دن رات کو معلوم ہو گیا کہ میں دوسرے روز ۱۵/جون کے سویرے چھوڑ دیا جاؤں گا۔ اب یہ سوال ہوا کہ دستی لکھے ہوئے اور ٹائپ کئے ہوئے مسودہ کا کیا ہوگا؟ کیا دونوں میرے ساتھ باہر آنے پائیں گے یا حکومت اُنھیں دیکھ لینے کے بعد ہی باہر جانے کی اجازت دے گی؟ جیل سپرنٹنڈنٹ بغیر سرکاری منظوری کے، باہر لے جانے کی اجازت اپنی ذمہ داری پر نہیں دینا چاہتے تھے۔ مگر حکومت سے پوچھ کر اُنھوں نے باہر لے جانے کی اجازت دے دی۔ اِس طرح جب میں باہر نکلا تو تیار مسودہ کتاب کے ساتھ لے کر نکلا۔ جیل سے باہر نکلنے کے بعد جب اگست ۱۹۴۵ء درستیِ صحت کے لئے پلانی (راجپوتانہ) گیا تب اِس میں کچھ اور باتوں کا اضافہ کیا۔ پلانی سے ممبئی جاتے ہوئے، ریل میں اس کا بیشتر حصہ دیکھ کر، متھرا بابو کی مدد سے مطبع کے

لئے تیار کر سکا۔ ممبئی پہنچتے تک کتاب پریس کے لئے تقریباً تیار ہوگئی۔ وہیں اس کا نام رکھا گیا۔ انڈیا ڈوائڈڈ (INDIA DIVIDED) کتاب چھپنے کے لئے پریس میں دے دی گئی۔ جنوری ۱۹۴۶ء کے شروع میں ہی کتاب چھپ کر شائع ہوگئی۔ ایک مہینہ کے اندر ہی پہلے ایڈیشن کے سبھی نسخے بک گئے۔ تین چار مہینے میں دوسری بار پھر شائع اور فروخت ہوئی۔

جیل میں میں نے ایک چیز اور لکھی۔ جب میں ۱۹۴۰ء میں درستیِ صحت کے لئے سیکر (جے پور راج) گیا تھا تو میں نے ایک دن اپنی سرگزشت لکھنے کا خیال کیا اور لکھنا بھی شروع کر دیا۔ کسی سے یہ بات کہی نہیں۔ متھرا بابو کو بھی جو دن رات ساتھ رہتے تھے اس کا پتہ کچھ دنوں تک نہیں لگا کہ میں کچھ لکھ رہا ہوں۔ میری عادت ہے کہ سویرے چار ساڑھے چار بجے جاگ جایا کرتا ہوں۔ اُسی وقت روزانہ اٹھ کر کچھ نہ کچھ لکھ لیتا اور دوسروں کے جاگنے سے پہلے ہی لکھنا ختم کر دیتا تھا۔ وہاں تھوڑا ہی لکھا جا سکا۔ وہاں سے واپسی پر پھر وقت ہی نہ ملا۔ دو برس بعد جب جیل میں صحت کچھ درست ہوئی، تو ساتھ کے لوگوں نے اصرار کیا کہ میں اُسے پورا کر دوں۔ میں نے جہاں تک لکھا تھا۔ وہ بھی ٹھیک یاد نہ تھا۔ ہاتھ سے لکھے ہوئے مسودے کو گھر سے منگانا اچھا نہیں معلوم ہوا، کیونکہ بغیر خفیہ پولیس کے پڑھے کوئی چیز مجھے مل نہیں سکتی تھی اور معلوم نہیں کہ پڑھنے کے بعد بھی اُسے اندر لانے کی اجازت دیتی یا نہیں۔ اِس لئے میں نے اندازہ سے ہی وہاں سے آگے کی باتیں لکھنی شروع کر دیں۔ جہاں تک میں سمجھتا تھا کہ سیکر میں کچھ لکھ چکا ہوں۔ آہستہ آہستہ وہ بھی بہت کچھ لکھا جا چکا۔ شاید ختم بھی ہو جاتا، مگر بعد میں انڈیا ڈوائڈڈ نامی کتاب میں ہی سارا وقت لگنے لگا۔ لہٰذا سرگزشت نویسی کو اٹھا رکھا۔

کبھی کبھی دل میں یہ خیال بھی آتا کہ اس سرگزشت نویسی کی ضرورت یا افادیت ہی کیا ہے ۔میں نے جو کچھ کیا ہے یا پایا ہے ۔ وہ دوسروں کے سایہ میں رہ کر ہی ۔ پہلے اپنے بھائی کے سایہ میں اور بعد میں مہاتما گاندھی کے سایہ میں ۔میری کوئی ایسی ہستی نہیں کہ میرا حال دوسروں کے لئے جاننا ضروری ہو یا اُس سے دوسرے کچھ سیکھ سکیں ہاں میں عوامی کاموں میں خاص کانگریس کے متعلق کاموں میں لگا رہا ہوں ۔ اگر اُن کے متعلق اپنی سرگزشت لکھ دوں ۔ تو شاید لوگوں کو کچھ بات معلوم ہو جائے ۔ مگر تاریخ کے اعتبار سے اِس سرگزشت کی کوئی قیمت نہیں کیونکہ میں نے طویل پبلک لائف میں بہت کچھ لکھا نہیں ہے ۔ اگر کچھ لکھا بھی ہے تو اُس کی نقل اپنے پاس محفوظ نہیں رکھی ۔اور لوگوں نے عوامی واقعات کے متعلق وقتی مسالہ جمع کرایا ہے ، میں نے یہ بھی نہیں کیا ۔کچھ لوگوں کی اہم خط و کتابت دوسروں کے ساتھ ہوئی ہے ۔میں نے عادتاً ایسا کچھ نہیں کیا ہے ۔ اور اگر کچھ ایسی خط و کتابت کی بھی ہے تو اُس کی بھی نقلیں میرے پاس نہیں ۔ کچھ لوگ روزنامچہ لکھا کرتے ہیں جس میں سبھی واقعات کی روزانہ تحریر ہوتی ہے ۔میں نے یہ مشق ہی نہیں کی کہ روزنامچہ لکھا کروں ۔اِس لئے اپنی یادداشت کے سوا اپنی سرگزشت لکھنے کا کوئی دوسرا وسیلہ اپنے پاس نہیں تھا ۔ تاریخی اعتبار سے صرف یادداشت پر منحصر سرگزشت کو بھی کوئی خاص توثیق نہیں ہو سکتی ۔ اِنہی وجہوں سے کبھی کبھی یہ خیال ہوتا کہ میرا سرگزشت لکھنا خودنمائی ہے اس سے دوسروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا ۔ پھر بھی جب ایک بار کام شروع کر دیا تو اُس کی تکمیل ہی ٹھیک جچی ۔ شائع کرنے یا نہ کرنے کی بات بعد میں دیکھی جائے گی ۔

اِس طرح رام گڑھ کانگریس کے وقت تک کی سرگزشت میں جیل میں لکھ سکا ۔ ایک

طرح پر یہ سرگزشت سچّی سرگزشت ہے، کیونکہ اِس میں صرف اُنہیں باتوں کا ذکر ہے جو لکھتے وقت ذہن میں آگئیں۔ اِس لئے بہت ممکن ہے کہ بہت سی اہم باتوں اور واقعات کا ذکر ہی نہ ہو۔ کہیں کہیں مکان و زمان کے تعین میں بھی غلطی ہو۔ کچھ باتوں کا جو غلط اثر دل پر رہ گیا ہے وہ اس میں آگیا ہو۔ مگر ایک بات میں کہہ سکتا ہوں۔ جان بوجھ کر کوئی غلط بات نہیں لکھی گئی ہے۔ دوستوں کا اصرار ہے کہ یہ سرگزشت شائع کی جائے۔ اُنھوں نے اِسے دوسروں کو دکھایا جو ایسی چیزیں پرکھنے کے ماہر ہیں اُن کی بھی رائے ہوئی کہ اِسے شائع کرنا ہی چاہیئے۔ خاص کر اس لئے کہ میں نے اِسے ہندی میں لکھا ہے۔ اِس لئے باقی حصّہ جیل سے باہر نکلنے کے بعد، ۱۹۴۶ء کی جولائی۔ اگست میں، پلائی میں بیٹھ کر لکھ رہا ہوں

میری رہائی اور کچھ افسوسناک اموات

جیل میں رہتے ہوئے ہی ایک اور خوفناک اور المناک مصیبت آئی۔ یہ بھی بہار پر ہی آئی۔ ملیریا کا زور ۱۹۴۴ء میں بڑی شدت سے ہوا۔ بہتیرے لوگ مرنے لگے اخباروں میں اِس کی خبر چھپنے لگی۔ اتفاق سے بابو سری کرشن سنہا، انوگرہ بابو اور دوسرے خاص خاص کانگریسی اُس وقت تک رہا ہو چکے تھے۔ اُنھوں نے عوام کی مدد کا کام شروع کیا۔ ڈاکٹروں نے ڈاکٹر ٹی این بنرجی کی سرکردگی میں اپنی کمیٹی بنا کر کارِ خدمت شروع کر دیا۔ زلزلہ کے وقت کچھ روپے بچ گئے تھے جنہیں اِس قسم کی آفات کے وقت عوام کی خدمت کے لئے ایک ٹرسٹ بنا کر رکھ چھوڑا تھا۔ جب کہیں سیلاب وغیرہ آتا تو تھوڑا بہت امدادی طور پر اُس میں سے خرچ ہوتا تھا۔ یہ خرچ کچھ زیادہ نہیں ہوتا تھا۔ جو روپے تھے اُن کے سود سے ہی یہ کام ہو جایا کرتا تھا۔ روپیوں کا بہت حصہ چرخہ سنگھ کو قرض دے دیا گیا تھا اُسی سے وقت پر سود کے روپے آجاتے جو بنک میں پڑے رہتے اور وقتاً فوقتاً خرچ کیے جاتے۔ اگست ۱۹۴۲ء میں چرخہ سنگھ کا کام بہار میں سرکار نے ایک طرح سے بند کر دیا تھا۔ بنک میں میرے نام کے سبھی کھاتے ضبط تھے۔ جن میں

ایک کھاتہ امدادی فنڈ کا بھی تھا۔ ملیریا کا حال پڑھ کر میں نے سرکار کو لکھا کہ ضبط شدہ روپیوں کو امداد کے لئے خرچ کرنے کی اجازت دی جائے اور پہلی رقم میں نے ڈاکٹروں کی کی کمیٹی کو دینے کے لئے مانگی۔ سرکار نے اسے منظور کر لیا۔ روپے اُن کو دے دیئے گئے۔ بعد میں الوگرہ بابو نے جب امدادی کمیٹی بنائی تو اُن کو بھی روپے خرچ کرنے کی اجازت سرکار نے دے دی۔ آخر میں تو جو بھی ٹرسٹ کی رقم قابل وصول چرخہ سنگھ کے ذمہ تھی سرکار نے امدادی کام کے لئے چرخہ سنگھ کے ضبط روپیوں میں سے سب رقم دے دی۔ مگر اتنا سب خرچ نہیں ہوا۔ روپیوں کا بیشتر حصہ اب بھی جمع ہے۔ مجھے اس سے اطمینان ہوا کہ اس بار بنگال کے زمانۂ قحط کی طرح جیل کے اندر سے کچھ امداد پہنچانے کی خواہش کو ناکام نہیں ہونے دیا۔ ۱۵ جون ۱۹۴۵ء کو میں چھوڑ دیا گیا

اِس بار گرفتاری کے وقت ہی ہم سمجھ چکے تھے کہ جیل یاترا لمبی ہوگی۔ اِس لئے اپنے دل کو تیار کر لیا تھا۔ جوں جوں تحریک بڑھی اور لمبی لمبی سزائیں لوگوں کو دی جانے لگیں، تو یہ خیال اور بھی مضبوط ہو گیا۔ ہر بار جیل یاترا میں کچھ لوگ جیلوں میں مر بھی جاتے ہیں۔ اس بار بھی ایسے لوگوں کی تعداد خاصی تھی۔ یہ جان کر ہم کو بہت رنج ہوا کہ رانچی ضلع کے ٹانا بھگت لوگوں میں سے بہتیرے جیلوں میں مرے مگر جیل کے اندر مرنے والے لوگوں کے مقابلہ میں باہر گولیوں سے مارے جانے والے لوگوں کی تعداد کہیں زیادہ تھی۔ جن لوگوں نے اِس طرح ملک کے مفاد کے لئے اپنی جان نچھاور کی۔ اُن میں بہت کم ایسے تھے جن کو میں جانتا تھا۔ اِس کا خاص سبب یہ تھا کہ خاص کانگریسی کارکن گرفتار کر کے جیلوں میں رکھ دیئے گئے تھے جو باہر رہ گئے وہ بہت مشہور لوگ نہیں تھے۔ مزید براں اِس لہر میں بہت سے نئے لوگ آ گئے تھے۔ جنھوں نے پہلے تو کبھی کانگریس کا کام نہیں کیا۔ مگر اِس بار

اِسے سوراج کے لئے گاندھی جی کی آخری لڑائی سمجھ کر آ ڈٹے تھے۔ یہ تو میں نے اپنے صوبے کے بارے میں کہا۔ صوبہ کے باہر کچھ ایسے خاص افراد کی رحلت ہوئی جن کی جگہ کبھی پُر نہیں کی جاسکتی۔ اِن میں سب سے پہلے، گرفتاری کے چند دنوں کے اندر ہی مرنے والے شری مہادیو بھائی دیسائی تھے۔ وہ گاندھی جی کے ساتھ ہی گرفتار ہو کر آغا خاں کے محل (پونا) میں اُن کے ساتھ ہی رکھے گئے تھے۔ وہاں اچانک ایک روز حرکتِ قلب بند ہوجانے سے چل بسے۔ اِس کا اثر محترم گاندھی جی کے دل پر بہت زیادہ ہوا، کیوں کہ وہ ان کے دست راست تھے۔ جب سے وہ مہاتما جی کی خدمت میں آئے تھے، تب سے اُنھوں نے اپنی زندگی کو گاندھی جی کی تعلیم اور اصولوں کے مطابق ڈھالنے کی مسلسل کوشش کی تھی۔ اِس میں بہت کامیابی بھی حاصل کی۔ ساتھ ہی اُن کی طرزِ تحریر بھی حیرت انگیز تھی۔ اُسے بھی اُنھوں نے گاندھی جی کے سبک سے ملایا تھا۔ محنت اتنی زیادہ کر سکتے تھے کہ شاید دو تین آدمی مل کر بھی اُن کے برابر کام نہیں کر سکتے تھے۔ کام بھی سب قسم کے، کپڑے اور کموڈ کو صاف کرنا، نازک سے نازک باتوں کو لے کر سفیر کا کام کرنا، اور خوب صورت سے خوب صورت مضامین لکھنے کا کام بھی، اُن کے لئے سب برابر تھے۔ سب کچھ یکساں سہولت اور تیزی کے ساتھ خوشی خوشی کر لیا کرتے تھے۔ فطرتاً اتنے صاحبِ دل اور سادہ تھے کہ شاید ہی کبھی کسی سے اُن کا جھگڑا ہوا ہو۔ میرا تعارف اُن سے پہلے پہل چمپارن میں ہوا تھا۔ جب مہاتما جی نے اُن کی اہلیہ شریمتی درگا بہن کے ساتھ ہی وہاں اپنی کھولی ہوئی ایک درسگاہ میں کام کرنے کے لئے بھیجا تھا۔ جو محبت اور نیک فہمی اُس وقت پیدا ہوئی وہ برابر قائم رہی۔ اُن کی اس طرح اچانک موت سے مجھے بھی بہت چوٹ لگی۔

دوسری موت شریمتی کستوربا گاندھی کی ہوئی جو فروری ۱۹۴۴ء میں ہوئی۔ وہ بھی

غاخاں کے محل میں مہاتما جی کے ساتھ تھیں۔ بہت دنوں تک بیمار رہ کر آخر میں چل بسیں۔ گاندھی جی کی شریک زندگی ہونے کی اُن کی خوش قسمتی اُن کی زندگی کے آخر تک قائم رہی۔ گاندھی جی کے آغوش میں ہی اُن کی رحلت ہوئی۔ ایسی خوش قسمت اور کون ہو سکتی۔ اُن کو سبھی لوگ با (ماں) کہا کرتے تھے۔ وہ سچ مچ سب کی ماں تھیں۔ وہ پہلے پہل ۱۹۱۷ء میں چمپارن پہنچیں۔ اُس وقت لوگوں کا اُن کے ساتھ پہلا تعارف ہوا۔ وہاں ان کے پہنچنے کے پہلے کھانا بنانے کے لئے ایک برہمن رکھا گیا تھا۔ اُن کے پہنچتے ہی گاندھی جی کی ہدایت ہوئی کہ اب برہمن کی ضرورت نہیں وہی سب کے لئے رسوئی بنالیں گی۔ ہم لوگوں کی تعداد بھی کافی تھی۔ شاید چودہ پندرہ آدمی تھے۔ ہم لوگوں کو یہ نامناسب معلوم ہوا کہ ہم سب کے کھانا پکانے کا بار اُن پر ڈالا جائے۔ ہم کو یہ بھی معلوم ہوا کہ جیسی دبلی پتلی اور کمزور وہ نظر آتی تھیں، اُن سے یہ کام ہو بھی نہیں سکے گا۔ مگر گاندھی جی ہمارے عذر کو سننے والے کب تھے۔ اُنھوں نے کہا کہ فکر نہ کرو وہ سب کر سکتی ہیں۔ اُنھیں ایسے کام کی مشق ہے دوسرے لوگ اُن کی کچھ مدد کر دیا کرتے تھے۔ خاص کر بھاری کڑھائی اور بٹلوئی وغیرہ اُتارنے میں۔ مگر بہت پریم سے وہ سب کے لئے رسوئی بناتیں۔ اس وقت جس محبت سے اُنھوں نے ہم کو پہلے پہل کھلایا تھا، جب تک وہ زندہ رہیں اور جب جب ہم سے ملاقات ہوئی اُنھوں نے ایسی ہی محبت سے ہم کو کھلایا۔ سابرمتی کے ستیاگرہ آشرم میں ہوں، خواہ مگن واڑی یا سیواگرام آشرم میں، یا کہیں بھی سفر میں ہی کیوں نہ ہوں باپو کے پاس پہنچنے پر اگر کہیں ساتھ رہنے کا موقع ملا تو ماں کی شفقت ہمیشہ اُن سے ملتی رہی۔ ان کے آخری دنوں کی رنج دہ کہانی گاندھی جی کے اُن خطوں میں پڑھی جا سکتی ہے جو اُنھوں نے سرکار کو لکھے تھے۔ وہ خط شری بن مالا پارکھ اور ڈاکٹر سشیلا نائر کے ذریعہ لکھی ہوئی "ہماری با" نام

کی کتاب میں چھپے ہیں ۔ وہ ہندو دیوی کی مثالی مورت، ہندوستانی تہذیب کا نشان اور پریم کی پُتلی تھیں۔ وہ سچ مچ 'با' تھیں، اور 'با' بنی رہیں۔ ایک بار گاندھی جی نے مجھ سے کہا تھا 'با' کو 'با' کہنے میں مجھے بھی بڑا آنند ملتا ہے۔ خاوند اور بیوی کا جو مروّجہ تعلق ہوا کرتا ہے، وہ تو دونوں نے اپنی مرضی سے چھوڑ دیا تھا۔ وہ سچ مچ اُن کی بھی 'با' بن گئی تھی ۔

ہم لوگوں کو جیل میں ہی مولانا ابوالکلام آزاد کی بیگم کی رحلت کی خبر ملی تھی۔ یہ جان کر اور بھی دکھ ہوا کہ آخر وقت میں مولانا سے اُن کی ملاقات نہیں ہونے دی گئی ۔ وہ پردہ میں رہا کرتی تھیں اس لیے اُن سے ہمارا تعارف نہیں تھا۔ مگر مولانا کے رنج کا میں اندازہ کرسکتا تھا۔ شری رنجیت پنڈت (مسٹر آر۔ ایس پنڈت) سے تو بہت ربط ضبط تھا اور اُن کی موت بھی بہت المناک واقعہ تھی۔ جیلوں میں سرکار کی حکمتِ عملی کچھ ایسی ہوا کرتی ہے کہ اُس کا سمجھنا کچھ مشکل ہوتا ہے قاعدہ تھا کہ صرف قریب کے متعلقین کے ساتھ خط و کتابت ہوسکتی ہے ۔ میرے پاس کبھی کبھی ایسے لوگوں کے خط آجایا کرتے تھے جن سے کسی طرح کا میرا تعلق نہیں مگر مولانا کے پاس اور بہن وجے لکشمی کے پاس میرے تعزیت کے تار نہیں جا سکے ۔

اپنے صوبے کے دوستوں میں سب سے رنج دہ مفارقت شری رام دیا لو سنگھ کی ہوئی ۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی اُن سے تعارف ہوا تھا، جو بعد میں گہرے ربط ضبط کی صورت میں ظاہر ہوا۔ اُن کی صحت کئی برسوں سے خراب تھی۔ اسی وجہ سے وہ تحریک میں حصہ لینے کے قابل نہ تھے۔ سرکار نے بھی یہی سمجھ کر اُن کو گرفتار نہیں کیا تھا۔ میری رہائی سے کچھ مہینے پہلے اُن کی بھی وفات ہو گئی ۔ جو دوستی تقریباً ۳۵-۳۶ برسوں

سے چلی آرہی تھی۔ اس کا باریک رشتہ ٹوٹ گیا۔ ہمارے صوبے کے وہ انمول رتن تھے۔ اُن کی جگہ خالی رہے گی۔ کانگریس کے باہر جن سے ہمارا بہت گہرا تعلق تھا، ایسے صاحبان تھے، جن سے کبھی پھر ہماری ملاقات نہیں ہوئی۔ ایک تو ویدراج برج بہاری چوبے تھے جو آیورویدکے جیّد عالم تھے اور جن کی شفقت مجھ پر برابر رہی۔

میری گرفتاری کے وقت وہی میرا علاج کر رہے تھے اور جب گرفتاری ہوئی اُس وقت وہ صداقت آشرم پہنچ گئے تھے۔ مجھے یہ کبھی نہیں بھول سکتا کہ میری گرفتاری سے وہ کتنے رنجیدہ اور فکرمند ہوئے۔ اُنھوں نے دوا وغیرہ ساتھ کر دی اور اپنی سادگی میں یہ بھی کہا کہ اگر آپ بُرا نہ مانیں تو میں گورنر سے جاکر ملوں اور آپ کے بارے میں اُن سے کہوں۔ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ گرفتاری کا حکم گورنر نے ہی دیا تھا اور گورنر کو بھی اِسے ملتوی رکھنے کا اختیار نہیں تھا۔ دوسرے سرگنیش دت سنگھ تھے۔ اُن سے کلکتہ میں پہلے پہل اُس وقت ملاقات ہوئی تھی جب میں طالب علم تھا۔ وہاں وہ وکالت کرتے تھے۔ اُسی وقت سے اُنھوں نے مجھ پر جو شفقت دکھائی شروع کی وہ آخر تک جوں کی توں قائم رہی۔ بعد میں سیاسی باتوں کو لے کر بہت اختلاف ہوا اور میں نے اُن کی کئی کارروائیوں کی خاصی سخت نکتہ چینی کی۔ مگر اُس محبت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ آخر وہ بہت بیمار رہنے لگے تھے۔ میں جب تک باہر تھا تب تک جب کبھی پٹنہ میں رہنے کا موقع ہوتا۔ جاکر برابر اُن سے ملا کرتا تھا وہ بہت دنوں تک وزیر رہے۔ اُس میں اُن کی کارروائیوں پر حاشیہ آرائی کرنے والے بہت ہوئے جن میں ایک میں بھی تھا۔ مگر میں نے یہ دیکھا کہ چاہے وزیر رہے تب اور چاہے اپنے دنوں میں جب وہ سارے کاروبار سے الگ ہو گئے تھے، وہ اِس کی فکر ہمیشہ کیا کرتے تھے کہ ہمارے جیسے عوامی کاموں میں لگے۔ لوگوں کی صحت ٹھیک رہے اس لئے

ہم لوگوں کا جیل جانا وہ پسند نہیں کرتے تھے ۔ جب کبھی انھیں جیل سے کسی کی بیماری کی خبر ملتی تو وہ اور بھی فکرمند ہو جایا کرتے تھے ۔ اپنے زمانۂ وزارت میں اپنی آمدنی کا بہت بڑا حصّہ مفادِ عامہ کے کاموں میں لگا دینے کا فیصلہ اُنھوں نے شروع میں ہی کر لیا تھا۔ اِس طرح سے کئی لاکھ کی رقم ٹرسٹ میں دے ڈالی ۔ یہ ہمارے لئے ایک نمونہ تھا جس کی تقلید کسی اور نے نہیں کی کانگریسی وزیروں کی تو تنخواہ ہی پانچ سو روپے کر دی گئی تھی۔ اُس میں بچانے کا موقع ہی کم تھا پھر بھی میں جانتا ہوں کہ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جنھوں نے پیسے پیسے کا حساب رکھا اور اُس میں سے بچا کر مفادِ عامہ کے کاموں میں لگایا تیسرے ساتھی جن سے پھر ملاقات ہونے والی نہیں تھی ۔ شری نرسو نارائن سنگھ تھے ان سے بھی طالب علمی کے زمانے سے ہی ملاقات تھی ۔ عوامی سوالات پر بہت اختلافِ رائے ہوتے ہوئے بھی ان سے برابر پریم بنا رہا ۔ اپنے گھر میں سب سے بڑی بھتیجی گر جا بھی میرے جیل میں رہتے رہتے ہی چل بسی ۔ اس کی بھی صحت بہت دنوں سے خراب رہا کرتی تھی۔ میرے ہوش سنبھالنے کے بعد میرے گھر میں وہی سب سے پہلے پیدا ہوئی تھی ۔ میں نے اُسی کو سب سے پہلے بچپن میں کھلایا تھا ۔ وہ بہت پریم رکھتی تھی ۔ جیل میں آ کر ملتی تھی۔ مگر کون جانتا تھا کہ یہ آخری ملاقات تھی ۔ وہ بڑی خوش قسمت تھی ۔ شوہر اور لڑکوں کو اپنے سامنے دیکھتے دیکھتے چلی گئی ۔ اپنے گھر میں رہتے رہتے اس نے جس طرح لوگوں کو سکھ پہنچایا تھا اُسے بھی لوگ یاد رکھیں گے ۔

عارضی حکومت کے قیام سے قبل

جیل میں وقت گزارنا بہتوں کے لئے بڑا کٹھن ہوتا ہے۔ اِس لئے اگر کچھ دل بہلاؤ کا سامان مل جائے تو اُسے بہت لوگ پسند کرتے ہیں۔ ہزاری باغ جیل میں ہمارے ساتھیوں نے ایک بلّی کے بچّے کو پال رکھا تھا۔ وہ لوگوں سے گھُل مل گیا تھا کہ بلاتکلف چارپائی پر جاکر سو رہا کرتا تھا۔ کھانے کے وقت گھومتا پھرتا آکر گود میں بیٹھ جاتا اُسے کھاتا۔ لکھنے پڑھنے کے وقت ہاتھ میں سے قلم پنسل چھین لینے میں بھی نہ ہچکتا۔ اپنی پیدائش سے ہی وہ کبھی جیل سے باہر نہیں گیا تھا۔ ہمیشہ بڑے اور جوان لوگوں کی صحبت میں ہی رہا تھا۔ اس نے آدمی کے بچّے کو کبھی دیکھا ہی نہ تھا۔ ہزاری باغ جیل میں ہمارے ساتھیوں میں سے ایک صاحب بیمار پڑے۔ اُن کے بال بچے اُن سے ملنے آئے۔ اِن چھوٹے بچوں کو دیکھتے ہی وہ اتنا ڈر گیا کہ کسی گود میں سے جہاں وہ اُس وقت بیٹھا تھا وہ کود کر بھاگا اور کہیں دور جاکر چھُپ رہا۔ اِن بچوں کے چلے جانے کے بعد بھی کچھ دیر تک واپس نہیں آیا۔

اِس بار بانکی پور جیل میں کچھ معمولی قیدیوں نے مینا چڑیا کے بچّے کو پال رکھا تھا۔

وہ آدمیوں کے ہاتھ پر کندھے پر اور سر پر بے خوفی سے بیٹھ جاتا۔ قیدی کام کرتے رہتے۔ وہ وہاں ڈٹا رہتا۔ اُس کا ہم لوگوں سے بھی تعارف ہوگیا وہ ہمارے کمرے میں بھی آنے آنے لگا۔ کچھ دنوں کے بعد وہ زیادہ تر وہیں رہنے لگا۔ چرخہ چلانے کے وقت سامنے بیٹھ جاتا اور نکلتے ہوئے دھاگے کو چونچ مار کر توڑ دیتا۔ رات کو مسہری پر بیٹھ جاتا اور وہیں رات بھر رہتا۔ سویرے اُڑ کر باہر جاتا اور گھوم پھر کر واپس آجاتا۔ ایک دن اُڑ کر کہیں گیا اور پھر واپس نہیں آیا۔ نہ معلوم کہیں اُڑ کر چلا گیا یا کسی چڑیا یا دوسرے جانور نے مار ڈالا۔ دوسری مینا بھی لوگوں نے پالنے کی کوشش کی مگر ہم نے حوصلہ نہیں دیا۔ اِس طرح لکھتے پڑھتے، چرخہ کاتتے، بیمار پڑتے لوگوں کے اور تحریک کے حالات سنتے، اور پُرانوں کی کتھا سنتے (جن میں بالمیکی رامائن، ادھیاتم رامائن، مہابھارت، شریمد بھگوت گیتا، چیتنیہ چرتر وغیرہ کتابیں خاص تھیں)۔ وقت گزرتے کچھ معلوم نہ ہوا تقریباً تین برس کے بعد ۱۵ جون کو میں رہا ہوا۔

ہم لوگوں کے رہا ہونے سے کچھ دنوں پہلے سے یہ چرچا بہت تھا کہ اب ورکنگ کمیٹی کے ممبر چھوڑ دیئے جائیں گے۔ احمد نگر قلعہ میں جو لوگ تھے اُن میں سے کچھ لوگ دوسرے مقامات پر بھیجے جاچکے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ یہ سب چھوڑنے کی تیاریاں ہیں۔ اِس بات کا اعلان ہوا کہ ۱۴ جون ۱۹۴۵ء کی شام کو لارڈ ویول اپنی کوئی اسکیم ملک کے سامنے رکھیں گے۔ یہ اسکیم ریڈیو کے ذریعہ سارے ملک کو اُسی رات کو بتائی جائے گی۔ ایسا ہی ہوا۔ اسکیم کے ساتھ یہ بھی اُنھوں نے ریڈیو پر کہا کہ ورکنگ کمیٹی کے ممبروں کو چھوڑنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ ۱۵ جون کی صبح سب چھوڑے جائیں گے۔ ریڈیو کی بات سُن کر کچھ لوگ تو اسی رات کو ہمارے چھوڑے

جانے کی امید سے جیل کے دروازے پر آئے۔ حکام کے یہ کہنے پر بھی کہ رات کو چھوڑنے کا حکم نہیں ہے، وہ کچھ دیر تک وہیں ٹھیرے رہے۔ ۱۵ رجون کو ایک بڑا مجمع اکٹھا ہوگیا۔ جیل میں اتنے دنوں تک رہنے کے بعد، وہاں سے نکلنے کے وقت من میں کتنے ہی جذبات اُمنڈنے لگے۔ ہم لوگ جس دن جیل میں گئے تھے، اُسی دن سے معمولی قیدیوں کو ہم لوگوں کے ساتھ نہ معلوم کس وجہ سے محبت سی ہو گئی تھی۔ ہم پر اُن کو بہت اعتماد ہوگیا۔ وہ ہم لوگوں کو جیل کے حکام سے بھی بڑا سمجھتے تھے۔ جب کوئی مصیبت ہوتی تو ہزار پہرہ رہنے پر بھی کسی نہ کسی طرح ہمارے پاس پہنچ جاتے ہمارے ہزار سمجھانے پر بھی کہ ہمیں کوئی اختیار نہیں ہے، وہ یہ بات ماننے کو تیار نہ ہوتے۔ میں اتنا اور بھی کہوں گا کہ جب تک اُس جیل میں ہم رہے اُن کے ساتھ حکام کا سلوک بھی اچھا ہی رہا۔ یوں تو جیل میں قیدیوں کے ساتھ سلوک سختی کا ہونا ہے نہ کہ پریم کا۔ تعزیر کا ہوتا ہے نہ کہ اصلاح کا مگر اُن میں جو پرانے تھے وہ کہا بھی کرتے تھے کہ بہت سے افسروں کا رُخ بہت کچھ بدل گیا تھا۔ اتفاق سے اس جیل کے حکّام بھی بیشتر اچھے ہی تھے وہ اُن لوگوں میں سے نہیں تھے جو سارے صوبہ میں اپنی کرتوتوں کی وجہ سے بدنام ہو چکے تھے۔ اِسی طرح اگرچہ معمولی قیدیوں کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق ہونا ضروری نہیں تھا پھر بھی ایک عجیب تعلق ہوگیا تھا۔ ہماری رہائی کی خبر سے نہ معلوم اُن کے دل میں خوشی ہوئی یا رنج۔ میں اتنا کہہ سکتا ہوں کہ بہتیروں کو اُمید ضروری تھی کہ وہ بھی کچھ دنوں میں چھوٹ جائیں گے۔ ہم نے اِس طرح کی امید اُنھیں کسی طرح سے دلائی نہ تھی مگر ان میں سے بہتوں کو ہماری رہائی کے بعد مایوسی ہوئی ہوگی۔

جیل سے باہر نکلتے ہی بمبئی جانا پڑا، کیونکہ وہاں ورکنگ کمیٹی کی نشست ہوئی

جس میں ویول اسکیم پر غور کرنا تھا۔ بمبئی میں باتیں تھوڑی ہی ہوئیں اور شملہ سے مہاتما گاندھیؔ اور صدر کانگریس مولانا ابوالکلام آزاد کا بلاوا آگیا۔ اُن کو وہاں جانا پڑا میں پٹنہ واپس آگیا۔ مگر یہاں دو چار دن بھی نہ ٹھہر سکا، کیونکہ شملہ میں میں بھی مدعو ہو گیا کہ وہیں ورکنگ کمیٹی کی نشست ہوگی۔ شملہ میں تقریباً دو ہفتہ تک رہنا پڑا۔ ہماری طرف سے لارڈ ویول کے ساتھ کبھی پنڈت جواہر لال نہرو اور کبھی مہاتما گاندھی کی باتیں ہوتیں مسلم لیگ کی طرف سے مسٹر جناح اور اُن کے ساتھی وائسرائے سے باتیں کرتے تھے مگر خاص کام تو وہاں ایک کانفرنس کا تھا جس میں کانگریس اور مسلم لیگ کے صدر کے سوا اُن صوبوں کے وزیرِ اعلیٰ بلائے گئے تھے۔ جہاں وزارت ٹوٹ گئی تھی۔ جیسا ان سبھی صوبوں میں ہوا تھا۔ جہاں کانگریسی وزارتیں تھیں۔ وہاں سے وہ اصحاب بلائے گئے جو وزارت ٹوٹنے کے وقت وزیرِ اعلیٰ تھے۔

اسکیم پر اور دوسری باتوں پر غور ہوا۔ ایسا معلوم ہوا کہ وائسرائے کی اگزکٹو کونسل کو ایک نہج سے قومی حکومت کا روپ دیا جائے گا۔ کانگریس کی طرف سے ہم نے اسکیم کو ایک طرح سے منظور کر لیا۔ نوبت کانگریس کی طرف سے نام دینے کی آئی۔ کانفرنس میں گیارہ صوبوں میں سے سات کے وزیرِ اعلیٰ کانگریسی تھے۔ باقی چار میں سے تین کی طرف سے لیگی وزیرِ اعلیٰ تھے۔ جن میں سے ایک آسام تھا۔ آسام میں کانگریس کے ہٹ جانے کے بعد وزارت میں ردو بدل ہوئی تھی۔ وہاں اُس زمانے میں اگرچہ وزارت لیگی نہیں تھی۔ مگر وزیرِ اعلیٰ سر سعد اللہ لیگی تھے۔ چوتھے صوبے پنجاب کے وزیرِ اعلیٰ سر خضر حیات خاں لیگ سے جھگڑ کر الگ ہو گئے تھے۔ اسکیم کی ایک شرط یہ تھی کہ وائسرائے کی کونسل میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد برابر ہوگی۔ اِن کے سوا دوسرے لوگ بھی

کچھ رہیں گے۔ جن میں ہریجنوں کے نمائندے بھی ہوں گے۔ اسکیم نے ایک طرح سے ہریجنوں کے نمایندوں کو ہندوؤں کے نمایندوں سے الگ مان لیا تھا۔ اور جو برابری ہندو مسلم نمائندوں میں دی گئی تھی وہ غیر ہریجن یعنی اونچی ذات کے لوگوں کے ساتھ ہی تھی۔

ابھی تک جنگ جاری تھی۔ ملک کی حالت کچھ اچھی نہیں تھی۔ ہم نے سوچا کہ اِس اسکیم کو قبول کر کے شاید اِس حالت کو درست کرنے میں ہم کچھ کامیاب ہو سکیں گے۔ ہم نے یہ کہا کہ کونسل وائسرائے اور کمانڈر انچیف کے علاوہ پندرہ آدمیوں کی ہو جس میں پانچ اونچی ذات کے ہندو، پانچ مسلمان، دو ہریجن اور تین میں سکھ، عیسائی، پارسی وغیرہ دوسرے فرقوں کے نمائندے ہوں۔ ہم نے ۱۵ نام بھی دیئے جن میں اور ناموں کے علاوہ پانچ مسلمانوں کے بھی نام تھے۔ ان میں سے تین مسلم لیگی، ایک کانگریسی مسلمان اور ایک لیگ کے باہر کے دوسرے مسلمان کا نام تھا۔ یہ بھی کہہ دیا گیا کہ مسلم لیگ اگر اپنی طرف سے دوسرے نام دینا چاہے تو دے سکتی ہے، اس میں ہم کو عذر نہیں ہوگا۔ مسٹر جناح نے یہ دعویٰ پیش کیا کہ مسلمانوں کے سبھی نمائندوں کے نام زد کرنے کا حق مسلم لیگ کو ہی ہونا چاہیئے۔ وہ دوسرے کسی مسلمان کا ہونا پسند نہیں کرے گی۔ لارڈ ویول کو اِس دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ کانگریسی مسلمان کو تو چھوڑ سکتے تھے مگر سر خضر حیات خاں کی پارٹی کو نہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ سر خضر حیات خاں نے اور اُن کے پہلے اس پارٹی کے لیڈر سر سکندر حیات نے لڑائی میں بہت مدد کی تھی، اِس لیئے اُن کو چھوڑنا پنجاب کے مسلمانوں کو سرکار کے خلاف کرنا ہوگا۔ ہم لوگوں کو یہ تو معلوم نہیں ہوا کہ وائسرائے کن لوگوں کو رکھنا چاہتے تھے، مگر ہم سمجھتے تھے کہ کانگریس اور لیگ کی طرف سے وہی لوگ لیئے جائیں گے جن کے نام یہ جماعتیں

دیں گی، چاہے دوسروں میں کچھ ردوبدل بھی ہو۔ ایسا قیاس کیا جاتا تھا کہ انھوں نے مسلمانوں میں چار نام لیگ کے اور ایک مسلمان پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کا لینا چاہا تھا، مگر مسٹر جناح اس پر رضامند نہیں ہوئے تھے۔ کانفرنس ٹوٹ گئی۔

کانفرنس کے ٹوٹنے پر مسٹر جناح نے ایک بیان دیا، جس میں انھوں نے لیگ کے دعوے بتائے۔ وہ وجہیں بھی بتائیں جن سے لیگ کو اسکیم نامنظور کرنی پڑی۔ خاص سبب یہ بیان کیا کہ مسلم لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے۔ اور اسی کو مسلمان ممبروں کے نامزد کرنے کا پورا اختیار ہونا چاہیے، چونکہ لارڈ ویول اِس بات کو نہیں مانتے، اِس لئے اسکیم منظور نہیں کی جاسکتی۔ دوسری اہم بات اُنھوں نے یہ کہی کہ اس تجویز کے مطابق پندرہ غیر سرکاری آدمیوں کی کونسل میں صرف پانچ ہی مسلمان ہونے والے تھے۔ اُن کے خلاف کانگریسی ہندو لوگ ہوتے اور دوسری اقلیتوں کے جو نمائندے ہوتے وہ ہمیشہ ہندوؤں کے ساتھ ہی جاتے، کیونکہ دوسرے فرقوں کے خیالات اور جذبات کانگریس کے ہی ساتھ تھے۔ اِس طرح کونسل میں مسلمان صرف ایک تہائی کی اقلیت میں رہ جاتے جو مسلم لیگ منظور نہیں کر سکتی۔ معرکہ کی باتیں اِس میں دو تھیں ایک تو یہ کہ آج تک سبھی اقلیتوں کی حفاظت کا بار مسٹر جناح اپنے اوپر لیا کرتے تھے کہا کرتے تھے کہ کانگریس صرف اونچی ذات کے ہندوؤں کی نمائندگی کرتی ہے، باقی سب کی حفاظت مسلم لیگ ہی کر سکتی ہے اور کرتی ہے۔ ایسا کہنا بے سبب تھا، کیونکہ بار بار دوسری اقلیتوں نے اپنی انجمنوں میں مسلم لیگ کی اور ہندوستان کی تقسیم یعنی پاکستان کی بات کی صاف صاف مخالفت کی تھی اور کانگریس کے ساتھ اپنی ہمدردی بتائی تھی۔ مگر وہ اِس طرح کی باتیں کرتے آرہے تھے۔ اِن اقلیتوں میں وہ ہریجنوں کو بھی گنایا

کرتے تھے اور خود کو اُن کا حمایتی بتایا کرتے تھے اب جب کونسل میں اونچی ذات ہندوؤں کی نمائندگی صرف ایک تہائی، مسلمانوں کی بھی ایک تہائی اور باقی تہائی میں دوسرے ہریجنوں اور دوسری اقلیتوں کے رکھنے کی بات ہوئی تو معاملہ طشت از بام ہوگیا۔ انھوں نے صاف صاف کہدیا کہ دوسرے سب کے سب کانگریس اور ہندوؤں کے ساتھ ہیں اور رہیں گے، وہ صرف مسلمانوں پر ہی بھروسہ رکھ سکتے تھے، اور مسلمانوں میں بھی صرف اُنھی مسلمانوں پر، جن کو مسلم لیگ نے یعنی انھوں نے خود نامزد کیا ہو۔ دوسری بات یہ صاف ہوگئی کہ وہ اِس پر رضامند نہیں ہیں کہ کونسل میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں برابری ہو۔ وہ یہ چاہتے تھے کہ ایک طرف صرف مسلمان اور دوسری طرف فرقہ اکثریت یعنی اونچی ذات کے ہندو۔ ہریجن اور دوسری سبھی اقلیتیں ہوں۔ اور مسلمانوں کی برابری یکجائی طور پر اُن سب کے ساتھ ہو۔ اِس کے ساتھ یہ بھی واضح تھا کہ مسلمانوں کے معنی سبھی مسلمانوں کے نہیں۔ صرف اُنہیں مسلمانوں کے ہیں جو لیگ میں شریک تھے۔

لیگی مسلمانوں کی اِس وقت یہ حالت تھی کہ اُن دو بڑے بڑے صوبوں میں، جہاں اُن کی آبادی زیادہ ہے۔ پنجاب اور بنگال میں۔ لیگی وزارتیں ٹوٹ چکی تھیں۔ پنجاب میں لیگ سے الگ ہوکر مسٹر جناح سے بھڑک کر سر خضر حیات نے الگ وزارت بنالی تھی۔ وہ بھی تب، جب سابق وزیراعلیٰ سر سکندر حیات خاں کے لڑکے سردار شوکت حیات خاں لیگ کے ساتھ ہوگئے تھے اور سر خضر حیات خاں کی زوروں سے مخالفت کر رہے تھے۔ بنگال کی وزارت ہار کر ٹوٹ گئی تھی۔ اگر اُس وقت مخالف پارٹی کو موقع دیا جاتا جیسا کہ انصاف اور آئینی ضابطہ کے مطابق ضروری تھا، تو وہاں غیر لیگی وزارت بن گئی ہوتی۔ مگر گورنر نے اس وقت کی حکمت کے مطابق مسلم لیگ

کو ناخوش کرنا نہیں چاہا۔ جب لیگی وزارت نہ چل سکی، تو بار بار کہنے پر بھی کوئی دوسری وزارت بنانے کا موقع کسی کو نہ دے کر، آئین کی دفعہ ۹۳ کے مطابق اختیارات اپنے ہاتھوں میں لے لئے۔ صوبہ سرحد میں کانگریسی وزارت کے ہٹ جانے کے کچھ دنوں بعد لیگی وزارت بن گئی تھی، مگر وہ اپنی کارروائیوں سے اتنی بدنام ہوگئی کہ ہم لوگوں کے رہا ہونے کے کچھ دنوں پہلے ہی کانگریسی ممبروں نے اسمبلی کے اجلاس میں حصہ لے کر اُسے توڑ ڈالا تھا، جس سے وہاں کانگریسی وزارت قائم ہو چکی تھی، ایک سندھ ہی ایسا صوبہ تھا، جہاں لیگی وزارت کام کر رہی تھی۔ اگرچہ وہاں بھی نیشنلسٹ مسلمانوں کے لیڈر الہ بخش کو وزیر کے عہدے سے ہٹانے میں گورنر کا صرف ہاتھ نہیں تھا، بلکہ اس کے لئے گورنر کو بہت سے غیر آئینی کام بھی کرنے پڑے تھے اور بعد میں الہ بخش قتل بھی کر ڈالے گئے تھے۔

یہ تو ان صوبوں کا حال ہوا جہاں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے۔ وہ تو پاکستان میں آسام کو بھی ملاتے ہیں مگر وہاں مسلمانوں کی آبادی ایک تہائی سے زیادہ نہیں ہے۔ کانگریسی وزارت کے ہٹ جانے کے کچھ دنوں بعد وہاں بھی لیگ کے سردار سر سعد اللہ نے وزارت بنائی تھی مگر وہ بھی اتنی بدنام ہو چکی تھی کہ اپنے آخری سانس گن رہی تھی۔ ایسی حالت میں یہ دعویٰ کرنا کہ لیگ ہی مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور اُسی کے نامزد کئے لوگ کونسل میں لئے جا سکتے ہیں اور اُن کی تعداد بھی اتنی ہونی چاہیئے کہ وہ اکیلے ہی اونچی ذات کے ہندوؤں اور ہریجنوں نیز تمام دوسری اقلیتوں کے نمائندوں کی اپنی تعداد کے اعتبار سے مخالفت کر سکیں۔ صرف مسلم لیگ اور مسٹر جناح کے لئے ہی ممکن تھا۔ اِس دعوے پر شملہ کانفرنس کو ناکامیاب بنا کر توڑ دینا

بھی برٹش سرکار کے لئے ہی ممکن تھا۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ ابھی جنگ جاری تھی اور انگلستان میں وزیراعظم کے عہدے پر مسٹر چرچل اور وزیر ہند کے عہدے پر مسٹر ایمری رونق افروز تھے۔

شملہ کانفرنس کے متعلق ایک دو باتیں اور کہہ دینا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ اوپر کہا جا چکا ہے کہ کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے اپنی طرف سے کونسل کے لئے نام بھی دے دئے تھے ان میں شری بھولا بھائی ڈیسائی کا نام نہیں تھا۔ وہ اُس وقت تک مرکزی اسمبلی میں کانگریس پارٹی کے لیڈر رہے تھے۔ اُنھوں نے اُس حیثیت سے کام بھی بہت اچھا کیا تھا۔ جب سے باردولی ستیہ گرہ کے وقت (۱۹۲۸ء میں) وہ کانگریس میں کُھلم کُھلا آئے تھے، تب سے جب جب موقع ہوا وہ جیل جانے سے جھجکے نہیں تھے۔ روپے پیسے سے بھی برابر مدد کرتے آئے تھے۔ اپنی قابلیت اور اپنے ایثار کی وجہ سے وہ برابر ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی رہے تھے۔ کانگریس کی طرف سے اُن کا نہ لیا جانا اُن کے لئے بہت تکلیف دہ ثابت ہوا۔ اگرچہ نام شائع نہیں ہوئے تھے۔ تب بھی بہتوں کو یہ بات معلوم ہو گئی تھی کہ اُن کا نام نہیں دیا گیا تھا۔ دوسرے لوگوں کو بھی خاص کر مرکزی اسمبلی کے ممبروں کو، یہ بات بہت کھٹکی تھی۔ اُن کے نام نہ دئے جانے کا سبب یہاں لکھنا ضروری نہیں ہے اور نہ مناسب ہی۔ میں اِس فیصلہ سے مطمئن نہیں تھا، دُکھی تھا۔ مگر کوئی اور راستہ نظر نہیں آیا۔ شری بھولا بھائی کا مجھ سے بہت پریم تھا۔ مجھ پر وہ اعتماد رکھتے تھے جس کا ذکر اُنھوں نے کئی دوستوں سے کیا تھا۔ کچھ دنوں بعد جب وہ اُس بیماری میں مبتلا تھے، جس کی وجہ سے اُن کی موت ہوئی، میں اُن سے بمبئی میں ملا۔ اُنھوں نے اپنا دکھ بہت درد بھرے لفظوں میں کہا۔ یہاں اتنا کہہ دینا ٹھیک ہو گا کہ اِس کے

تھوڑے دنوں کے بعد جب آزاد ہند فوج کے میجر جنرل شاہ نواز اور اُن کے ساتھیوں پر دلّی کے لال قلعہ میں بغاوت کا مقدمہ چلا اور شری بھولا بھائی کو اُن کی طرف سے پیروی کرنے کو کہا گیا تو اُنھوں نے خوشی سے اِس مشکل کام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اگرچہ اُن کی صحت اُن دنوں کچھ اچھی نہیں تھی۔ اِس مقدمہ کی سخت محنت ایک طرح ان کی موت کا سبب ہوئی۔ کیونکہ وہ مقدمہ کا کام کسی طرح ختم کر کے بیمار پڑ گئے اور پھر چارپائی سے اٹھ نہیں پائے۔ مقدمہ میں اُن کی اعلیٰ قابلیت اور حیرت انگیز قوت کا پتہ لگا۔ اُن کی بحث دنیا کے بڑے سے بڑے مقدموں کے بڑے سے بڑے وکیلوں کی بحث کا مقابلہ کرتی رہے گی۔ چارپائی پر پڑے شری بھولا بھائی کو ایک اطمینان رہا کہ اُن کے سبھی موکل بری ہو گئے۔ اُن کے مرنے سے ہندوستان کا ایک انمول رتن چلا گیا۔ اُن کی جگہ لینے والا کوئی دوسرا ابھی نظر نہیں آتا۔ مجھے اُن کے آخری دن ہمیشہ یاد رہیں گے۔ خاص کر وہ درد بھرے جذبات کہ اِتنی خدمت کے بعد بھی ورکنگ کمیٹی نے اُن کو کونسل کے قابل نہیں سمجھا۔ اُن کے دل میں عہدے کا لالچ نہیں تھا۔ اگر وہ کانگریس میں نہ آئے ہوتے تو وہ بے تردد ہی یہ عہدہ بہت پہلے پا سکتے تھے۔ اُن کو دکھ اِس بات کا تھا کہ ہم نے اُن کو ناقابل سمجھا۔

دوسری بات جس کا ذکر کرنا چاہتا ہوں، ذاتی ہے۔ ورکنگ کمیٹی کے سامنے نام منتخب کرنے کا جب ذکر آیا تو اُن میں میرا نام بھی آیا۔ میں اِس کے لئے بالکل تیار نہیں تھا۔ ایک تو میری صحت اس قابل نہیں تھی کہ میں اتنی محنت کر سکوں۔ دوسرے مجھے ایسے کام کا بالکل تجربہ نہیں تھا۔ ایسے دشوار وقت میں اِس بار کا لینا ٹھیک نہیں جچتا تھا۔ تیسرے میں سمجھتا تھا کہ باہر رہ کر جیسے میں اُس وقت تک کام کرتا آرہا تھا، ایسے ہی کام کرنا میری خصلت کے مطابق تھا۔ چوتھے دل میں کچھ اخلاقی کشمکش معلوم

ہوتی تھی ۔ میں نے اپنی دشواریوں کو محترم مہاتما جی کے پاس جا کر کہا۔ انھوں نے رائے دی کہ مجھے منظور کر لینا چاہیئے ۔ اِس کے بعد میرے لئے کہنے کی گنجائش نہیں رہ گئی ۔ مگر دل کو پوری تشفی نہیں ہوئی تھی ۔ اِس لئے جب شملہ میں بات چیت ختم ہو گئی تو مجھے ایسا معلوم ہوا کہ میرے سر سے بھی ایک بوجھ ٹل گیا ۔ ملک کے مفاد کے اعتبار سے اگرچہ اُس کا ٹوٹنا اچھا نہیں لگا۔ پھر بھی ذاتی اعتبار سے معلوم ہوا کہ اچھا ہی ہوا

مصیبت زدہ سیاسی قیدیوں کے لئے

فراہمی رقم

شملہ سے دلّی آیا یہاں بیمار پڑ گیا۔ طبیعت بمبئی جانے پر ہی کچھ خراب ہو گئی تھی۔ اِسی لئے بمبئی سے جلد پٹنہ چلا آیا مگر پٹنہ میں بھی نہ ٹھہر سکا۔ وہاں سے شملہ جانا پڑا۔ شملہ میں کسی طرح کام ختم کیا۔ ڈاکٹر بدھان چندر رائے نے، جو شملہ گئے ہوئے تھے، صلاح دی کہ کسی خشک مقام پر کچھ دنوں کے لئے چلا جانا اچھا ہو گا۔ میں اِس خیال سے دلّی میں ٹھہر گیا کہ وہاں سے پلانی جا کر کچھ دن آرام کر لوں۔ مگر دلّی میں زیادہ بیمار ہو جانے کی وجہ سے تقریباً دو ہفتہ ٹھہر جانا پڑا۔ وہاں سے اگست کے پہلی یا دوسری تاریخ کو پلانی گیا۔ جہاں ایک مہینہ سے کچھ زیادہ ٹھہرا۔ پلانی میں برلا بھائیوں کی طرف سے میرے ٹھہرنے کا اچھا انتظام تھا۔ وہاں بہن اور مرتنجے کی ماں کے ہمراہ بہت آرام سے رہا۔ مجھے آرام پہنچانے کا انتظام برلا بھائیوں کے منیجر شری ہرشچندر نے بہت خوبی سے کیا تھا۔ برلا کالج کے پرنسپل شری سکھدیو پانڈے جی اور دوسرے معلموں اور پروفیسروں کی صحبت بھی بہت اچھی رہی۔

پلانی سے ورکنگ کمیٹی اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی نشستوں کے لئے بمبئی جانا پڑا نشست پونہ میں ہوئی۔ بیٹھک کے بعد پٹنہ واپس گیا۔ بمبئی میں کتاب (اِنڈیا ڈِوائڈڈ) کی

چھپنے اور شائع ہونے کا انتظام کر لیا۔ شملہ میں ہی ہم لوگ سمجھ گئے تھے کہ صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کا نیا چناؤ جلد ہی ہوگا۔ میں سمجھتا تھا کہ اِن انتخابات سے پہلے تو نہیں مگر صوبائی انتخابات سے پہلے شائع ہوگی اور ہو بھی گئی

جب میں جیل میں تھا مجھے اُن لوگوں کی فکر ہوئی جن کو ۱۹۴۲ء کی تحریک کی وجہ سے طرح طرح کی مصیبتیں جھیلنی پڑی تھیں۔ خاص کر اُن لوگوں کے متعلق تشویش تھی جن پر سنگین مقدمے چل رہے تھے۔ جس کے نتیجے کے طور پر پھانسی اور طویل قید کی سزا ملتی تھی۔ مقدموں کی پیروی میں خرچ پڑتا تھا۔ جو لوگ باہر تھے اُنھوں نے حتی الوسع اس کا انتظام کیا تھا۔ دوسرے لوگوں میں بہت سے ایسے تھے جن کے قید ہو جانے پر اُن کے خاندان کو بہت تکلیف سہنی پڑ رہی تھی۔ بہتیرے تو ایسی صحت لے کر رہا ہوتے کہ اُن کا علاج کرانا ضروری ہوتا۔ باہر نکلنے پر جب کچھ اور باتیں معلوم ہوئیں تو میں نے طے کر لیا کہ اُن کی امداد کے کچھ روپیہ جمع کرنا چاہیئے۔ مگر بمبئی اور شملہ کی باتوں اور اُس کے بعد بیمار ہو جانے کی وجہ سے بمبئی سے واپسی تک میں کچھ زیادہ نہیں کر پایا تھا۔ بمبئی میں میں نے اِس بارے میں کچھ دوستوں سے باتیں کی تھیں۔ مگر وہاں کچھ حوصلہ افزا حالت نہیں تھی۔ وہاں کے لوگوں نے اس سے پہلے بہت رقم سے ملک کی امداد کی تھی۔ اب ایک خاص صوبہ کے لئے الگ چندہ کرنا مشکل تھا۔ ہاں اگر سارے ملک کے لئے کچھ کیا جاتا تو ہو سکتا مگر صرف ایک صوبہ کی بات لے کر میں اُن سے کیسے کچھ کہہ سکتا تھا۔ دوسرے لوگوں کا خیال اس طرف ابھی نہیں گیا تھا۔ اِس لئے میں نے سوچا کہ پہلے اپنے صوبہ میں کچھ کر لیا جائے تو پھر بمبئی اور کلکتہ جیسے بڑے مقامات پر کچھ کوشش کروں گا۔

میں نے پِلانی میں ہی رقم جمع کرنے کا کام شروع کر دیا تھا اگر یوں کہا جائے کہ

کام اتفاقاً ہی شروع ہوگیا تو زیادہ ٹھیک ہوگا۔ وہاں کے کالج کے پرنسپل شری سکھدیو پانڈے جی اور دوسروں سے باتوں ہی باتوں میں ذکر آگیا تھا۔ میں نے کچھ مانگا نہیں تھا۔ مگر ۹ راگست ۱۹۴۵ء کو کالج میں ایک جلسہ ہوا جس میں ۹ راگست کے متعلق کچھ کہنے کو بلایا گیا تھا۔ وہیں کالج کے پروفیسروں اور طلبار کی طرف سے ایک ہزار روپیوں کی تھیلی سیاسی مصیبت زدوں کی مدد کے لئے مجھے پیش کی گئی۔ پلانی سے روانہ ہونے سے پہلے میں شنجاوٹی کے کچھ مقامات پر گیا۔ جہاں کے لوگوں کا بڑا اصرار تھا۔ چڑادا۔ سورج گڑھ، فتح گڑھ وغیرہ کئی مقامات پر گیا۔ سبھی جگہ تھیلیاں پیش کی گئیں۔ اِس طرح وہاں سے چلنے سے پہلے پندرہ سولہ ہزار روپے فنڈ میں آگئے۔ پٹنہ واپس آکر میں نے سارے صوبہ میں دورہ کرنے کا پروگرام بنایا۔ مگر برسات ہونے سے اور میری خرابی صحت ہونے کی وجہ سے یہ طے ہوا کہ دس دن تک زیرادیئی جاکر مکمل آرام کروں اور پھر دسہرے کے دن سے دورہ پر نکلوں۔ زیرادیئی جاتے وقت کچھ ایسا تجربہ ہوا کہ جس سے میرے دل میں روپئے جمع ہونے کے متعلق جو تھوڑا شبہ تھا وہ دور ہوگیا۔

زیرادیئی پہنچتے پہنچتے لوگوں نے ایک اچھی رقم پیش کردی۔ زیرادیئی گیا تو تھا آرام کرنے کے لئے مگر بہت آرام نہ کرسکا۔ بہت لوگ ملاقات کرنے آتے اور اُن پر جو کچھ گزری تھی وہ کہہ سناتے، وہاں رہتے رہتے میں نے کچھ آس پاس کے لوگوں کے ایسے گھروں کو دیکھا جو ۱۹۴۲ء میں سرکاری کارکنوں کے ذریعہ جلادیئے گئے اور ایسے لوگوں کے خاندانوں سے ملاقات ہوئی جو گولیوں کے شکار ہوئے تھے۔ ان میں خاندان پرانے اقارب میں سے نریندر پور کے بابو کرشن کمار سنگھ جی تھے۔ جن کے بھتیجے کی موت پٹنہ سکریٹریٹ کے گولی چلنے کا واقعہ میں ہوئی تھی۔ جب بے رحمی سے گھر جلائے

گئے تھے دیکھ کر بہت دُکھ ہوتا اور اس کا اندازہ ملتا کہ تین برس پہلے جب واقعات گزرے تھے، تب لوگوں کی کیا حالت ہوئی ہوگی۔ زیرا دیئی کا بھی ایک آدمی گولی سے مارا گیا تھا۔ اس کے خاندان کے لوگوں کو امدادی طور پر کچھ دیا بھی۔ زیرادیئی رہتے رہتے روپے جمع کرنے کا کام بھی کچھ جاری رہا۔ جو لوگ ملاقات کرنے آتے اُن میں سے بہتیرے فنڈ میں کچھ دے جاتے اور تفصیل کے ساتھ لوگوں کی مصیبتوں کا حال سنا جاتے۔

ایک اور کام زیرا دیئی میں ہوا۔ جبل پور کے شری دوارکا پرشاد مشر نے ۱۹۴۰-۴۱ء انفرادی ستیہ گرہ کے وقت جیل میں کرشنائن ، لکھنا شروع کیا تھا۔ ایک بار مجھے واردھا سے پٹنہ لوٹتے وقت کچھ گھنٹوں کے لئے اُن کے ساتھ ٹھہرنے کا موقع ملا تھا تو اُنھوں نے میرے اصرار پر اُس کا کچھ حصہ مجھے سنایا تھا۔ مجھے وہ بہت پسند آیا۔ اُسے اُنھوں نے ۱۹۴۲-۴۵ء کی جیل یاترا میں پورا کیا تھا اور جیل سے میرے نکلنے پر بمبئی میں آل انڈیا کمیٹی کے وقت کہا تھا کہ چند روز میرے ساتھ رہ کر اُسے پڑھ کر سنانا چاہتے ہیں۔ میں نے اُنہیں زیرا دیئی میں بلا لیا۔ اُن کے بھائی اور وہ خود وہاں آ گئے تھے۔ کتاب کا ایک حصہ انھوں نے سنایا تھا۔ مجھ سے ایک چھوٹی تمہید لکھنے کا اصرار کیا جو میں نے وہیں لکھ دی۔ کتاب شری تلسی کرت رامائن کے طرز پر دوہوں اور چوپائیوں میں لکھی گئی ہے۔ جس طرح رامائن میں شری رام چندر جی کا چرتر بیان کیا گیا ہے اُسی طرح اِس میں شری کرشن جی کی زندگی اور واقعات کی عکّاسی ہے۔ کتاب بہت ہی دل کش اور خوب صورت انداز میں لکھی گئی ہے۔ سن کر بہت لطف آیا مشر جی سے ست سنگھ بہت اچھا رہا۔

زیرا دیئی سے میں سیدھے دورہ پر نکل گیا۔ تقریباً چھ سات ہفتوں تک دورہ کرتا رہا۔ لوگوں میں جوش بہت تھا۔ ۱۹۴۲ء کے جبر و تشدد کا کچھ بھی اثر دیکھنے میں نہیں آتا تھا۔ معلوم

ہوتا تھا جیسے ربڑ کی گیند جتنے زور سے پٹکی جاتی ہے وہ اُتنے ہی زور سے اوپر اٹھتی ہے۔ ویسے ہی سرکاری جارحیت سے لوگوں کا جوش اور بھی زیادہ ہوگیا۔ جلسوں میں روپیوں کی بارش ہوتی۔ جو کچھ لوگ تھیلی کے لئے جمع کر کے پہلے سے رکھتے اِس کے علاوہ جلسوں میں اچھی رقم جمع ہو جاتی۔ تقریروں سے لوگوں کا حوصلہ بڑھانے کے علاوہ آنے والے انتخابات کے سلسلہ میں بھی کچھ کہہ دیتا اور پھر روپیوں کے لئے اپیل کرتا۔ جتنا کوٹہ طے تھا اُس سے کم کسی ضلع نے نہیں دیا۔ ہم لوگوں نے سوچا تھا کہ تین لاکھ روپے صوبہ سے جمع کئے جائیں اور دو لاکھ روپے بمبئی کلکتہ جیسے بڑے بڑے مقامات سے مگر صوبہ کے اندر ہی ۵ لاکھ سے زیادہ روپے آگئے۔ باہر مانگنے کی ضرورت نہ رہی۔ ابھی دورہ پورا نہیں ہوا تھا۔ دو تین ضلعے ابھی باقی تھے کہ کٹھار میں پہنچکر میں بہت بیمار پڑ گیا۔ کچھ اچھا ہونے پر وہاں سے پٹنہ پہنچایا گیا۔ پٹنہ پہنچ کر بھی بہت دنوں تک بیمار رہا اور کلکتہ میں ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ میں بھی شریک نہ ہو سکا۔ جو ضلعے رہ گئے تھے اُن کا دورہ کئی مہینے بعد کر سکا۔ مگر وہ بات نہ رہی جو اُس وقت تھی۔ اُس وقت کا حوصلہ اور جوش حیرت انگیز تھا۔

اسمبلی کا انتخاب کچھ پارٹیوں کے کارنامے

مرکزی اسمبلی کا انتخاب پہلے ہوا۔ یہ جنوری ۱۹۴۶ء تک ختم ہوگیا۔ اِس کے بعد صوبائی اسمبلی کا انتخاب آیا۔ مرکزی اسمبلی کے لئے بہار میں جتنے غیر مسلم کھڑے کئے گئے تھے آسانی سے جیت گئے۔ بیشتر تو بلا مقابلہ چُنے گئے۔ ایک جگہ مخالفت ہوئی۔ مگر وہاں بھی مخالف کی ضمانت ضبط ہوگئی۔ مگر مسلم نشستوں کے لئے کانگریس کی طرف سے کھڑے کئے گئے امیدوار ہار گئے۔ سب جگہیں مسلم لیگ کو مل گئیں۔ یہ کیفیت صرف بہار میں ہی نہیں رہی تقریباً ملک بھر میں ایسا ہی ہوا۔ غیر مسلم جگہوں میں کانگریسی اور مسلم جگہوں میں لیگی چنے گئے۔

اب صوبائی انتخاب کے لئے تیاریاں ہوئیں۔ اُس میں بھی مسلم لیگ کے ساتھ مقابلہ ہوا۔ کانگریس تین مسلم جماعتوں کے ساتھ فی الحال مسلم لیگ کا مقابلہ کر رہی تھی۔ یہ تین جماعتیں تھیں، جمعیۃ علماء، جمعیۃ مومن اور انڈیپنڈنٹ (آزاد مسلم) پارٹی۔ ان میں انڈیپنڈنٹ پارٹی کی کوئی خاص اہمیت نہیں تھی اور مومن لوگوں کی تنظیم بہت منتشر تھی۔ امیدوار چننے میں بہت دیر ہوگئی۔ کیونکہ کئی جماعتوں کے ساتھ چلنا تھا طے ہوا کہ کچھ جگہ کے لئے کانگریسی، کچھ کے لئے جمعیۃ علماء کے اور کچھ کے لئے مومن امیدوار کھڑے کئے جائیں۔ سب سے زیادہ

جگہیں مومنوں کو دی گئیں۔ بڑی دھوم دھام سے مقابلہ ہوا۔ لیگ کی طرف سے ہر طرح کی زور زبردستی کی گئی اور خرچ بھی کافی کیا گیا۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ چالیس جگہوں میں سے چونتیس لیگ نے لے لیں۔ پانچ مومنوں کو ملیں اور ایک کانگریس کو۔ جمعیتہ علمار کا ایک امیدوار بھی کامیاب نہیں ہوا۔ جس جگہ کے بارے میں یہ کہا جاتا تھا کہ اُس علاقہ کے سبھی ووٹر جمعیتہ علمار کے مرید تھے، وہاں بھی جمعیتہ کے امیدوار ہار گئے۔ کانگریس کو سب سے بڑا دھکّا یہ لگا کہ پروفیسر عبدالباری ہار گئے۔ کانگریسی امیدواروں میں صرف ڈاکٹر محمود جیتے۔

غیر مسلم جگہوں میں کہیں کہیں کوئی خاص مقابلہ نہیں ہوا۔ صرف چھوٹا ناگپور میں رانچی اور سِنگھ بھوم ضلعوں میں زوردار مخالفت ہوئی۔ زمینداری کی نشستوں پر ہم نے کسی کو کھڑا ہی نہیں کیا تھا۔ چھوٹا ناگپور کے آدی واسی (قدیم باشندوں) کے درمیان کام کرنے والی آدی واسی مہاسبھا کا خاص پروگرام یہ تھا کہ چھوٹا ناگپور بہار سے الگ صوبہ بنا دیا جائے۔ اُس کے لیڈر شری جے پال سنگھ خود رانچی ضلع کے کھونٹی مقام سے کھڑے ہوئے۔ اور اور جگہوں میں سِنگھ بھوم، رانچی سنتھال پرگنہ وغیرہ میں۔ اِس سبھا کی طرف سے امیدوار کھڑے کئے گئے۔ کچھ جگہیں آدی واسیوں کے لئے، آئین کی رو سے محفوظ ہیں۔ جو دوسری غیر مسلم جگہیں ہیں، اُن پر بھی اُن کو کھڑا ہونے کا حق ہے۔ اُنھوں نے محفوظ جگہوں کے لئے، اور کچھ عام نشستوں کے لئے بھی امیدوار کھڑے کئے۔ کانگریس کی طرف سے بھی، سبھی عام جگہوں کے لئے اور آدی واسیوں کے لئے محفوظ نشستوں پر بھی امیدوار کھڑے کئے گئے۔ اُنھی جگہوں میں سخت مقابلہ ہوا۔ کہیں آدی واسیوں کے سوا مانگیر اور شاہ آباد کی کچھ جگہوں میں بھی، ریڈیکل ڈیموکریٹک پارٹی (مسٹر ایم این رائے کی پارٹی)، اور کمیونسٹ پارٹی کی طرف سے اُمیدوار کھڑے کئے گئے تھے۔

۱۹۴۲ء کی انقلابی تحریک کے زمانے میں مسٹر ایم این رائے اور اُن کی پارٹی نے کانگریس کی بڑی مذمت کی تھی۔ اُنھوں نے صرف اِسی ملک میں اِس تحریک کی مخالفت نہیں کی تھی بلکہ غیر ملکوں میں بھی، خاص کر امریکہ میں اُن کے آدمیوں نے جاکر کانگریس کی بہت جھوٹی اور غلط شکایتیں کی تھیں۔ سرکار بھی کانگریس کے دبا دینے اور اُسے چور چور کر دینے کی صلاح دی تھی۔ سرکار کو اُن کے مشورے کی ضرورت نہیں تھی، وہ تو خود ہی سب کچھ کر رہی تھی۔ مگر ان کے پروپیگنڈا سے اُسے اپنے تشدد کا چکّر چلانے میں سہارا ضرور ملا۔ جیل میں ہم لوگوں کے رہتے رہتے ہی مرکزی اسمبلی میں، ایک سوال کے جواب میں، سرکار کی طرف سے کہا گیا تھا کہ اُس پارٹی کو سرکار کی طرف سے تیرہ ہزار روپے ماہانہ کی مدد دی جا رہی ہے۔ اُس پارٹی کے لوگوں میں آپس میں بھی اس معاملہ میں جھگڑا ہو گیا اور ایک گروہ نے اِس خبر سے فایدہ اُٹھا کر دوسرے گروہ کو عوام کی نظروں میں گرانا چاہا۔ ہم لوگ جب باہر تھے تب ایسی باتیں سنا کرتے تھے۔ اُس پارٹی کے لوگ بہت خرچ کرتے بھی دیکھے گئے۔ مگر کوئی شخص وثوق سے کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ ۱۹۴۲ء کی تحریک کے زمانے میں اُن لوگوں میں کچھ اختلاف رائے ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ تحریک میں شریک ہونا پسند کرتے تھے۔ مگر مسٹر ایم این رائے اور دوسرے لوگ زوروں سے مخالفت کرنا چاہتے تھے۔ جیل میں ہم لوگوں کو اِس کا پتہ لگ گیا تھا۔ یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ وہ پارٹی سرکار کے روپے سے کام کر رہی ہے۔ اسمبلی میں تو سرکار نے ہی بھانڈا پھوڑ دیا۔ وہی پارٹی اپنے کو سچا دیش بھگت (محب وطن) بتاتی تھی اور کانگریس کو دیس بدیس میں گالیاں دیا کرتی تھی۔

کمیونسٹ لوگوں کا بھی حال کچھ عجیب تھا۔ لڑائی شروع ہونے سے چند دن پہلے روس اور جرمنی میں صلح ہو گئی۔ جب لڑائی شروع ہوئی تو ایک طرف سے جرمنی نے پولینڈ پر

چڑھائی کر دی اور دوسری طرف سے اُس کے کچھ حصہ پر روس نے قبضہ کر لیا۔ اِس طرح دونوں میں ملی بھگت ہو گئی۔ ہندوستان کے کمیونسٹ لوگ جو زیادہ تر روس کے اشارے پر ہی کام کیا کرتے ہیں۔ شروع میں برٹش کے خلاف ہی بولتے لکھتے رہے، جس کی وجہ سے اُن کی جماعت غیر قانونی قرار دے دی گئی تھی اور اُن کے خاص خاص افراد چھپ چھپا کر کام کر رہے تھے۔ جب تک روس اور جرمنی کے درمیان لڑائی نہیں چھڑی، ہندوستان کے کمیونسٹ جرمنی کے حمایتی اور برٹش کے مخالف بنے رہے۔ جب روس اور جرمنی میں لڑائی چھڑ گئی، تب سے انھوں نے اپنا رُخ بالکل بدل دیا۔ جیسے ہی برٹش اور روس ایک طرف ہو کر جرمنی سے لڑنے لگے، انھوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ یہ لڑائی عوام کی جنگ ہے اور برطانیہ کی مدد کرنا سب کا فرض ہے اِس طرح کانگریس کی تحریک کی مخالفت کرنا اُن کا فرض منصبی ہو گیا۔ انھوں نے مخالفت کی بھی۔ اِس وجہ سے کانگریسی لوگوں میں۔ خاص کر کانگریس کے اندر سوشلسٹ پارٹی میں۔ اِن دونوں پارٹیوں کے خلاف بہت زبردست جذبہ پیدا ہو گیا۔ جیل کے اندر تو اس کا کچھ ہی پتہ چلتا تھا۔ مگر باہر نکلنے پر جب سب باتوں کا پورا پتہ چلنے لگا تو یہ جذبہ اور بھی زبردست ہو گیا۔

ان پارٹیوں کی طرف سے کانگریس کے خلاف اُمیدوار کھڑے کئے گئے تھے۔ اِن کے جیتنے کا تو کوئی قرینہ تھا ہی نہیں۔ مگر ایک مڈبھیڑ کا موقع ضرور مل گیا۔ کمیونسٹوں کے ساتھ مڈبھیڑ ہوئی بھی۔ مجھے اِس بات کا افسوس رہا کہ کانگریسی لوگ اُن کے حملوں کو پُرامن طریقہ سے برداشت نہیں کر سکے۔ کمیونسٹوں کے ایک لیڈر کو بہت پیٹ بھی دیا۔ فضا بہت مکدّر ہو گئی ہمارے اصول کو بھی بہت دھکّا پہنچا۔ آخر اِن دونوں پارٹیوں کے لوگ خوب ہارے۔ بہار میں ایک مقام سے بھی اُن کا امیدوار نہیں چُنا گیا۔ کئی جگہوں میں تو اُن کی ضمانت بھی ضبط ہو گئی

آدی واسیوں کی مخالفت بھی تشدّد سے خالی نہ رہی۔ جب میں دورے پر نکلا تو رانچی

ضلع میں کئی آدمی میرے سامنے پیش کئے گئے جن کو آدی واسی سبھا کے لوگوں نے خوب پیٹا تھا۔ کچھ زخمیوں کو تو بہت دنوں تک ہسپتال میں رہنا پڑا۔ کھونٹی علاقہ میں اُن کی دھاندلی بہت زیادہ تھی۔ میں نے ان باتوں کی اطلاع حکومت کو دی، مگر وہاں کے افسروں کا رُخ ایسا تھا کہ سرکار نے ان باتوں کو کچھ دھیان نہیں دیا۔ ایک مقام پر پانچ آدی واسی مار ڈالے گئے اِس انتخابی تحریک میں مسلم لیگ اور آدی سبھا کا گٹھ جوڑ ہو گیا تھا۔ دونوں مل کر کام کر رہے تھے۔ آدمی واسی سبھا والے بھی 'پاکستان زندہ باد' کے نعرے لگایا کرتے تھے۔ مسلم لیگ کے لیڈروں نے بعد میں اُن پانچ موتوں کی تعداد بڑھا کر سو ڈیڑھ سو بنا دی اور سب کے لئے کانگریس کو قصوروار ٹھہرایا۔ کانگریسی لوگوں نے اس سے برابر انکار کیا۔

چناؤ کا نتیجہ یہ ہوا کہ شری جے پال سنگھ خود تو ہار گئے۔ مگر اُن کی پارٹی ٹکٹ کے تین آدمی چُنے گئے۔ دو سِنگھ بھوم ضلع سے اور ایک رانچی ضلع سے۔ سات محفوظ جگہوں میں سے اُن کی پارٹی کو دو جگہیں ملیں۔ ایک رانچی میں اور ایک سِنگھ بھوم میں اور عام نشستوں میں سے ایک نشست سِنگھ بھوم میں۔ پانچ محفوظ جگہیں اور دوسری سبھی جگہیں۔ جہاں پر اُنھوں نے مقابلہ کیا۔ کانگریس کے ہاتھ آئیں۔ عیسائیوں کے لئے جو محفوظ جگہ ہے، اُس سے جو ایک عیسائی آئے وہ بھی شاید اُن کی پارٹی کے تھے یا اُن کے مددگار۔

الکشن ختم ہونے پر وزارت بننی تھی۔ اگرچہ کانگریس کی طرف سے کوئی باضابطہ فیصلہ نہیں ہوا تھا کہ کانگریس وزارت بنانے میں شریک ہوگی مگر اب تو جنگ ختم ہو چکی تھی۔ کانگریس نے جنگ کی وجہ سے ہی وزارت چھوڑی تھی۔ اب یہ سبب نہیں رہا۔ ملک کی حالت بھی ایسی تھی کہ سبھی لوگ چاہتے تھے کہ کانگریس پھر وزارتیں قبول کر لے۔ اِس طرح کانگریسی لوگ اور کانگریس کے باہر کے لوگ سبھی سمجھ بیٹھے کہ کانگریسی وزارت بنے گی ہی۔ ایسا ہی ہوا بھی۔ صوبہ

سرحد، اُتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، آسام، اڑلیسہ، مدراس اور بمبئی میں کانگرس کی اکثریت تھی ۔ اُن میں وزارتیں بننے میں شبہ نہیں تھا۔ پنجاب میں کسی ایک پارٹی کی اکثریت نہیں تھی۔ مگر مسلم لیگ کے زیادہ ممبر چنے گئے تھے۔ وہاں کانگرس سکھ اور یونینسٹ پارٹی تینوں مل کر لیگ سے زیادہ تھے۔ اِس لئے وہاں اُن تینوں کی مشترکہ پارٹی بن گئی، اور وزارت اُن کی ہی بنی، لیگ کی نہیں۔ سندھ میں لیگ اور دوسری پارٹیوں کا تقریباً مقابلہ تھا۔ کہا جاتا تھا کہ لیگ کے ساتھ تین انگریز ممبروں کے مل جانے پر بھی دوسروں کی ایک یا دو رائیں زیادہ تھیں مگر سندھ کے گورنر نے لیگ کی ہی وزارت بنانے کی دعوت دی، وہاں لیگی وزارت بنی ۔صرف ایک بنگال میں ہی یوروپینوں کے ساتھ مل کر مسلم لیگ کی اکثریت تھی وہاں بھی لیگی وزارت بنی۔ باقی سبھی صوبوں میں کانگریسی وزارتیں بنیں۔ بہار میں چاروں پرانے وزیر شروع میں مقرر ہوئے۔ شری جگ لال چودھری دس برس کی سزا پاکر جیل میں تھے۔ اِس لئے چناؤ میں کھڑے نہیں ہوئے۔ بابو سری کرشن سنہا، انوگرہ بابو اور ڈاکٹر محمود اپنے تقرر ہوتے ہی اُن کو جیل سے نکال لائے اور چوتھی جگہ پر اُن کو مقرر کرادیا۔ کچھ دنوں کے بعد پانچ وزیر اور بھی مقرر کیئے گئے ۔

گئو سیوا سنگھ کا کام

مہاتما گاندھی بہت دنوں سے گئو سیوا (گائے کی خدمت) کے متعلق اپنے خیالات شائع کرتے آ رہے ہیں۔ سابرمتی آشرم میں اور سیوا گرام میں بھی گئو شالائیں چلتی آئی ہیں۔ سیٹھ جمنا لال بجاج کی دیکھ بھال میں، وار دھا کے پاس ہی نال واڑی میں، شری رادھا کرشن بجاج کئی برسوں سے گئو شالا چلا رہے ہیں۔ پارنیکر جی نے گاندھی جی کے خیالات کے مطابق گئو سیوا کا خاص مطالعہ اور عملی تجربہ حاصل کیا۔ اپنی وفات سے کچھ دن پہلے سیٹھ جمنا لال بجاج نے گئو سیوا کو اپنا ایک خاص میدانِ عمل بنا لیا تھا۔ اُنھوں نے وار دھا میں اس کے لئے نال واڑی کی گئو شالہ کو مرکز بنا کر ایک ادارہ قائم کر لیا تھا۔ اُس کے قیام کے وقت وہاں ایک کانفرنس ہوئی تھی، جس میں ماہرین خصوصی دور دور سے مدعو ہو کر آئے تھے۔ میں بھی حاضر تھا۔ میں تمام اقدامات کا کچھ کچھ مطالعہ کرتا آیا تھا۔ گئو شالہ کے ساتھ چمڑے کے کارخانے کے تعلق کو بھی سمجھتا تھا۔ اِس موضوع پر وقتاً فوقتاً کچھ مضمون بھی لکھے تھے۔ گئو شالاؤں کو، خاص کر دربھنگہ کی گئو شالا کو، اِس طرف راغب کرنے کی کوشش بھی کی تھی۔ اِتنا ہوتے ہوئے بھی میں سیوا سنگھ کا ممبر نہیں بنا تھا، اور نہ ایسے کسی ادارہ

کے ساتھ کوئی تعلق ہی قائم کیا تھا۔

۱۹۴۶ء کے شروع میں وار دھا سے شریمتی جانکی دیوی بجاج اور شری رادھا کرشن بجاج کا خط آیا کہ اِس بار کے گئو سیوا سمّیلن کا میں صدر بنوں۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ محترم باپو جی کی بھی خواہش ہے کہ میں یہ عہدہ قبول کروں۔ یوں تو شریمتی جانکی دیوی کا کہنا ہی کافی تھا۔ اس پر محترم گاندھی جی کی ہدایت! میں نے اسے قبول کرلیا۔ ٹھیک وقت پر وار دھا بھی پہنچ گیا۔ وہاں عہدہ کا بار سنبھالنے کے لئے اس موضوع پر کچھ خاص توجہ دینی پڑی۔ اس کانفرنس میں اچھے اچھے ماہر آئے۔ میں نے یہ سب باتیں دیکھ سن کر اور بہار سے گئے ہوئے دربھنگہ گئو شالا کے نمائندے سے باتیں کر کے یہ طے کرلیا کہ اس طرح کا کام بہار میں بھی کیا جائے اور اس کے لئے ایک صوبائی گئو سمّیلن کیا جائے۔ اِسی فیصلہ کے مطابق پٹنہ میں ایک کانفرنس ہوئی جس میں بہار کی سبھی گئو شالاؤں کے نمایندے اور دوسرے لوگ آئے۔ میں ہی صدر بنایا گیا۔ بھاگلپور کے رائے بہادر بنسی دھر ڈھانڈھنیا صدرِ استقبالیہ تھے۔

میں نے موضوع کا خاص مطالعہ کر کے ایک طویل تقریر لکھی۔ ماہرینِ خصوصی نے اور دوسروں نے اُسے بہت پسند کیا۔ کانفرنس نے طے کیا کہ صوبہ بھر کی گئو شالاؤں اور پنجرا پولوں کا ایک سنگھ قائم کیا جائے۔ اُس کے ساتھ سبھی گئو شالاؤں کا تعلق ہونا چاہیئے۔ سنگھ کا ایک مستقل دفتر بھی رہنا چاہیئے جس کی رجسٹری کرالی جائے اور اُس دفتر کی نگرانی میں نمونہ کے لئے ایک معیاری گئو شالہ کھولی جائے۔ اِنھیں فیصلوں کے مطابق دفتر کھل گیا صداقت آشرم میں ایک چھوٹی گئو شالہ بھی کھل گئی۔

میں گئو سیوا کی تبلیغ مذہبی نقطۂ نظر سے نہیں کرنا چاہتا۔ ہندوستان کی اقتصادی حالت کو دھیان میں رکھ کر ہی اس کی ضرورت اور اہمیت سمجھتا ہوں۔ اِسی طرح ہم اِس میں

اُن کی بھی مدد پا سکتے ہیں، جن میں اِس کے لئے ویسی مذہبی عقیدت نہیں ہے، جیسی ہندوؤں، سکھوں اور جینیوں میں پائی جاتی ہے۔ میں مانتا ہوں کہ یہی اقتصادی فائدہ اور ضرورت کا نظریہ کچھ کام کر سکتا ہے اور کامیاب بھی ہو سکتا ہے۔ محض مذہبی نظریہ مسلمانوں میں بددلی، اور ہندوؤں میں فرقہ وارانہ عیت اور ڈھونگ پیدا کر سکتا ہے۔ جس سے سچی گئو رکشا (حفاظت) اور گئو سیوا (خدمت) پیچھے رہ جاتی ہے اور دکھاوے کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔ اِس لئے میں نے اپنی تقریر میں بھی اقتصادی نظریہ سے ہی اس پر غور کیا۔ میں نے بتایا کہ زراعت پیشہ ملک میں گائے کی نوع اور نسل کی کتنی اہمیت ہے۔ کس طرح ہم اپنی اندھی عقیدت اور جہالت کی وجہ سے اُس کی خدمت کے بدلے اُس کو نقصان پہنچا رہے ہیں۔ دوسروں کی ہمدردی حاصل کرنے کے بدلے اُن کی بددلی اور مخالفت مول لے رہے ہیں۔ میرا عقیدہ ہے کہ ٹھیک طرح سے سائنٹیفک طریقہ سے اس موضوع کا مطالعہ اور تبلیغ ہو تو ہم بلاشبہ سب کی ہمدردی اور مدد پا سکتے ہیں۔

مثال کے لئے ایک موٹی سی بات لے لیجئے۔ سال بھر میں بقرعید ایک یا دو دن ہوا کرتی ہے۔ اُسی دن مسلمان جا بجا کچھ گایوں کی قربانی کیا کرتے ہیں۔ اس کے لئے بہت جگہوں پر خاصا خون خرابہ ہو جایا کرتا ہے۔ مگر ہندوؤں کی نظر اِس طرف نہیں جاتی کہ قصاب خانہ میں روزانہ ہزاروں گائیں ذبح کی جاتی ہیں۔ خاص کر لشکری چھاؤنیوں کے لئے اچھی اچھی گائیں ذبح ہوتی ہیں۔ جنگِ عظیم میں تو غیر ملکی فوجوں کے لئے ہندوستان کے نہ جانے کتنے مویشی ذبح کر دیئے گئے۔ مذہبی جذبہ سے متاثر ہو کر قربانی کرنے والوں کے ساتھ تو اتنی سختی اور بیٹ یا زبان کے لئے یا کچھ رقم کمانے کے لئے ذبح کرنے یا کرانے والوں کو کوئی کچھ پوچھتا بھی نہیں۔ بوڑھی، لنگڑی اور بیکار گایوں کی حفاظت کے لئے گئوشالاؤں میں کروڑوں روپے

صرف کئے جا رہے ہیں۔ مگر اِس طرف کسی کی توجہ نہیں جاتی کہ گائیں کس طرح منافع دینے والی مویشی بنادی جائیں کہ انھیں کسی ہندو یا غیر ہندو کو نہ تو بیچنے کی ضرورت رہے اور نہ قتل کرنے کی۔ آج تو گائے کے دودھ اور بچھڑے سے جو کچھ مل سکتا ہے۔ جو ذبح کرنے کے لئے اُسے خریدتا ہے۔ وہ اس کے گوشت چمڑے، ہڈی، چربی اور سینگ سے اُس سے زیادہ پیدا کر سکتا ہے جو اُسے پال کر اُس کے دودھ، بچھڑے وغیرہ سے پیدا کر سکے گا۔ اِنہی وجہوں سے گئو سیوا میں عقیدت رکھنے والے ہندو بھی ذبیحہ کے لئے گائے بیچ دیتے ہیں۔ اور ذبح کرنے والے اُسے خرید لیتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ گائے اگر سائنٹیفک ڈھنگ سے پالی پوسی جائے، اُس کے دودھ میں اضافہ کیا جائے۔ اُس کے گوبر پیشاب وغیرہ کا صحیح استعمال کیا جائے۔ اُس کے مرجانے پر اُس کے چمڑے، گوشت، چربی، پٹھے، ہڈی، سینگ وغیرہ کا صحیح استعمال کیا جائے تو گائے پالنا نقصان کے بدلے منافع دینے والا پیشہ ہو جائے۔

اِسی خیال سے اور مقصد کو سامنے رکھ کر کام کرنا ہے۔ صرف بہت دودھ دینے والی گائے جس کے بچھڑے ہل جوتنے اور گاڑی کھینچنے کے کام کے قابل نہ ہوں، ایسے ہی ملکوں میں کام دے سکتی ہیں جہاں بیلوں سے گوشت حاصل کرنے کے سوا دوسرا کام نہیں لیا جاتا۔ جہاں بچھڑے بھی صرف گوشت کے لئے پالے جاتے ہیں۔ جیسے ہندوستان میں خصی مگر ہندوستان میں جہاں لوگ گائے کا گوشت عام طور پر نہیں کھاتے، جہاں بیلوں سے اور بہت سے ضروری کام لئے جاتے ہیں، جہاں بیلوں کے بغیر کسانوں کا کام چل ہی نہیں سکتا۔ ہمیں ایسی گائیں چاہئیں جو کافی دودھ بھی دیں اور اچھے بچھڑے بھی یہ تو نسل پر توجہ دینے سے ہی ہو سکتا ہے۔ ہمارے ملک کے لوگ اس معاملہ پر کافی توجہ دیتے تھے۔ وہ ضرورت کے مطابق مویشی بھی فراہم کر لیتے تھے۔ آج بھی ہم دیکھ سکتے ہیں کہ ایک نسل کے جانور بہت

بوجھ ڈھو سکتے ہیں اور بہت محنت سے کام بھی کر سکتے ہیں۔ مگر وہ بہت تیز بھاگ نہیں سکتے۔ دوسری قسم کے جانور بہت تیز بھاگ سکتے ہیں مگر اتنا بوجھ نہیں ڈھو سکتے اور نہ اتنی زیادہ محنت ہی کر سکتے ہیں جتنی پہلی قسم کے۔ کچھ گائیں ایسی ہیں جو دودھ تو بہت دیتی ہیں مگر اُن کے بچھڑے اچھے نہیں ہوتے کچھ ایسی ہیں جن کے بچھڑے تو اچھے ہوتے ہیں مگر وہ زیادہ دودھ نہیں دیتیں۔ ہندوستان کا کسان ایک گائے دودھ کے لئے اور دوسری بچھڑے کے لئے نہیں رکھ سکتا۔ اُس کو تو ایک ہی گائے سے دونوں کام لینے ہیں۔ اِس لئے ہم کو ایسی نسلوں کی ہی حوصلہ افزائی کرنی ہوگی جو اِن دونوں مقاصد کی تکمیل میں معاون ہوں۔ اِس طرح کی گئوشالائیں ہو جائیں جو زیادہ دودھ دینے والی گائیں رکھیں۔ جن سے اچھے کام کے لائق بچھڑے بھی پیدا ہوں۔ اگر گئو سیوا کا ٹھیک انتظام کیا جائے تو گائے منافع دینے والی ہو جائے گی۔ اُس کا ذبیحہ خود بخود بند ہو جائے گا۔ ساتھ ہی جو گائیں بوڑھی اور کمزور پڑ جائیں گی اُن کی بھی حفاظت اچھی گایوں کے دئے ہوئے منافع سے اور اُن کے اپنے گوشت اور چمڑے وغیرہ کے دام سے ہو سکے گی۔ ایسی حالت میں ہی گئو رکشا اور گئو سیوا میں منافع اور ذبیحہ گاؤ میں نقصان ہوگا۔ تبھی سب لوگ چاہے وہ ہندو ہوں یا مسلمان، مذہبی جذبہ سے مشتعل ہوں یا غرضمندانہ جذبہ سے متحرک، گئو رکشا کے کام کو اپنے لئے مفید کام ماننے لگیں گے۔ تبھی گئو سیوا اور صحیح معنی میں گئو رکشا (گائے کی حفاظت) ہو سکے گی۔

بھارتیہ اِتہاس پریشد (انجمنِ تاریخِ ہند)

۱۹۴۲ء میں جیل جانے سے پہلے واردھا سے واپسی کے وقت اِتہاس پریشد کی نشست کے لیے میں کاشی میں اتر گیا تھا۔ اُس وقت تاریخ لکھنے کا کام کئی اصحاب کے سپرد کیا جاچکا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اکبر کے متعلق ایک جلد قریب قریب تیار ہے۔ ۱۹۴۲ء میں اکبر کی پیدائش کے چار سو برس پورے ہوتے تھے۔ ایسا خیال تھا کہ اکبر کی یوم پیدائش پر یہ جلد شائع ہو جائے۔ جیل جاتے وقت ایسا ہونے میں بہت رکاوٹیں آگئی تھیں۔ چھپائی اور کاغذ کی دقتیں تو تھیں ہی، بیماری کی وجہ سے کلکتہ مدراس وغیرہ شہروں سے لائبریریوں اور کتب خانوں کے سامان بھی جابجا محفوظ جگہوں کو منتقل کر دیئے گئے تھے۔ اِس وجہ سے امدادی کتابوں کی نایابی سے بھی تصنیف میں دشواری پیش آگئی تھی۔ تو بھی میں امید کرتا تھا۔ کہ کتاب شائع ہو سکے گی۔ مگر ایسا نہیں ہو سکا۔ میری گرفتاری کے کچھ دنوں بعد شری جے چندو دیا النکار بھی گرفتار کر کے نظر بند کر دیئے گئے، اس سے سب کام رُک گیا۔ میرے باہر نکلنے کے کچھ پہلے ہی سر جدو ناتھ سرکار اور متھرا بابو نے چاہا کہ تاریخ شائع کرنے کا کام پھر چلایا جائے۔ عالموں نے کچھ لکھ ڈالا ہی تھا۔ صرف اشاعت کی بات تھی۔

دو جلدیں تیار تھیں۔ بمبئی کے بھارتیہ ودیا مندر کے مہتمم شری کنہیا لال منشی سے کچھ بات چلی کہ اشاعت کا بار ودیا مندر لے لے۔ مگر آخر کچھ طے نہ ہو سکا۔ اِس لئے یہ انتظام کیا گیا کہ جو جلدیں جو تیار ہو گئی تھیں وہ شائع کر دی جائیں۔ ڈاکٹر رمیش چندر موز مدار اور ڈاکٹر الیٹکر کی لکھی ہوئی واکاٹک دور کے متعلق چھٹی جلد اور شری نیکنٹھ شاستری کی لکھی چوتھی جلد چھاپہ خانہ میں بھیج دی گئی تھی۔ جیل سے نکلتے ہی میں نے سوچا کہ اس کام میں دیر نہ ہونے دینا چاہیئے شملہ سے واپس ہوتے ہی میں کلکتہ گیا۔ وہاں سر جدو ناتھ سرکار اور ڈاکٹر موز مدار سے ملاقات کی۔ سب باتیں طے ہو گئیں۔ ایک بار اور اسی بارے میں چند گھنٹوں کے لئے کلکتہ میں ٹھہرا۔ چھٹی جلد شائع ہو گئی۔ چوتھی مطبع میں ہے۔

کچھ دنوں شری جے چند ودیا النکار جیل سے رہا ہوئے۔ میں سمجھا کہ اب کام تیزی سے آگے بڑھے گا مگر کچھ وجوہ سے سر جدو ناتھ سرکار ناراض ہو گئے۔ انھوں نے استعفٰا دے دیا۔ بہت کہنے پر بھی انھوں نے اُسے واپس نہیں لیا۔ اِس کام میں میں شری جے چند جی کی حوصلہ افزائی سے اپنے مرحوم دوست کاشی پرشاد جیسوال کی عقیدت مندانہ یاد کی وجہ سے آیا تھا۔ تاریخ میں دلچسپی رکھتے ہوئے بھی اور کاموں کا اتنا بوجھ تھا کہ اگر یہ باتیں نہ ہوتیں تو میں شاید اپنی رغبت سے یہ بوجھ نہ اٹھاتا۔

۱۹۴۶ء کا اعلان اور سرکاری اسکیم

مارچ ۱۹۴۶ء میں برٹش سرکار کی طرف سے اعلان ہوا کہ ہندوستان کے مسئلہ کو سلجھانے کے لئے وزیر ہند لارڈ پیتھک لارنس، سر اسٹیفورڈ کرپس اور مسٹر اے بی الگزینڈر، ہندوستان آئیں گے اور یہاں کے لیڈروں اور وائسرائے سے بات کریں گے۔ اس بات کا اعلان کرتے ہوئے وزیر مسٹر کلیمنٹ ایٹلی نے بھی کہا کہ اگرچہ اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کا انتظام کیا جائے پھر بھی کسی اقلیتی پارٹی کے ذریعہ ہندوستان کی سیاسی ترقی میں رکاوٹ نہیں ڈالنے دی جائے گی اور انگلستان اس بات کے لئے تیار ہے کہ ہندوستان آزاد ہو جائے۔ انگلستان یہ ضرور چاہتا ہے کہ ہندوستان اُس کے ساتھ رہے۔ مگر یہ فیصلہ کرنے کا اختیار کہ وہ ساتھ رہے گا یا ایک دم الگ ہو جائے گا ہندوستان کو ہی ہوگا۔ اس لئے اعلان بہت حد تک قابلِ اطمینان معلوم ہوا۔ تھوڑے ہی دنوں کے بعد وزارت کے تین رکن پہنچ گئے۔ وائسرائے سے اور دوسرے اعلیٰ سرکاری کارکنوں سے باتیں کرنے کے بعد انھوں نے الگ الگ پارٹیوں کے خاص افراد سے باتیں کرنا شروع کیں۔ کانگریس کے صدر مولانا آزاد اور مہاتما گاندھی سے بھی اُن کی باتیں ہوئیں۔ اِس طرح سب پارٹیوں کے

لوگوں سے باتیں کرتے بہت دن لگ گئے، تب انھوں نے صدر کانگریس اور صدر مسلم لیگ کو لکھا کہ وہ اپنے اپنے چار نمائندے دیں جن کے ساتھ بیٹھ کر وہ شملہ میں باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ دونوں پارٹیوں کے آٹھ آدمی اور وائسرائے کو ملا کر وہ چاروں بھی شملہ میں جمع ہوئے۔ کئی دنوں تک باتیں ہوتی رہیں مگر کچھ نتیجہ نہ نکلا۔ اِس پر انھوں نے کانفرنس ختم کر کے اعلان کیا کہ دلّی میں ملک کے سامنے اپنی اسکیم رکھیں گے۔ سب لوگ دلّی واپس آ گئے۔

دلّی واپس آکر اُن لوگوں نے ۱۶ مئی کا بیان نکالا جس میں انھوں نے اپنی اسکیم ملک کے سامنے رکھی۔

اسکیم کے تین خاص حصّے تھے۔ پہلے میں مدلّل اسباب کے ساتھ انھوں نے مسلم لیگ کے پاکستان کے مطالبہ کو ناقابلِ عمل بتایا اور کہا یہ نہیں ہو سکتا۔ اِس لئے ہندوستان کا آئین ایسا ہوگا کہ اس میں ہندوستان کے صوبوں کا ایک فیڈریشن کے اختیار میں تین صیغے ہوں گے۔ فوج اور بچاؤ، غیر ملکوں کے ساتھ تعلق رکھنے والے معاملے، ریل تار وغیرہ ان تینوں صیغوں کے لئے جتنے روپوں کی ضرورت ہو، اتنا وصول کرنے کا اختیار بھی ہوگا اور صیغوں میں صوبوں کو آزادی رہے گی۔ جو ایسے صیغے ہیں جن کا کہیں ذکر نہ ہو، اور جو بچ گئے ہوں، وہ سب صوبوں کے اختیار میں ہوں گے۔ دوسرے حصہ میں اُس آئین ساز کمیٹی کی اسکیم بتائی گئی جس کے ذمہ آئین بنانے کا کام ہوگا۔ تیسرے میں عارضی قومی حکومت قائم کرنے کی بات کہی۔

بیان میں یہ صاف کہہ دیا گیا تھا کہ ہندوستان کو اختیار ہوگا کہ اگر وہ چاہے تو برٹش سامراج سے خود کو الگ کر سکتا ہے۔ آئین ساز کمیٹی کی تشکیل اِس طریق پر ہوگی کہ سبھی صوبوں کی اسمبلیاں اپنے اپنے صوبے کی آبادی کے دس لاکھ افراد پر ایک کو چُن لیں گے اور یہ

لوگ اس آئین ساز کمیٹی کے ممبر ہوں گے۔ اِس انتخاب میں مسلمان ممبر اور پنجاب میں سکھ ممبر اپنے اپنے فرقہ کے نمایندے الگ ووٹ دے کر چُنیں گے۔ باقی سب لوگ یکجائی ووٹ دے کر ہی نمائندے چُنیں گے۔ دلّی، اجمیر، میرواڑہ کے نمائندے وہی لوگ سمجھے جائیں گے جو وہاں سے منتخب ہو کر اس وقت مرکزی اسمبلی میں بھیجے گئے ہیں اور کُرگ اور بلوچستان کے نمائندے الگ سے چُن لئے جائیں گے۔ یہ لوگ مل کر دیسی ریاستوں کے نمائندوں سے بات کر کے طے کرلیں گے کہ اُن کے کیسے اور کون نمائندے ہوں گے۔ اُن کی تعداد بھی دس لاکھ کی آبادی پر ایک تناسب سے ہوگی۔ اِس طرح برٹش ہند میں کل ۲۹۲ نمائندے ہوں گے جن میں دو سو دس غیر مسلم، ۷۸ مسلم اور چار سکھ ہوں گے۔ صوبے تین حصوں میں تقسیم ہوں گے۔ پہلے حصہ میں مدراس، بمبئی، اُتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش اور اڑیسہ ہوں گے دوسرے حصہ میں پنجاب، صوبہ سرحد (شمال مغربی)، سندھ اور بلوچستان، تیسرے حصہ میں بنگال اور آسام ہوں گے۔ برٹش ہندوستان کی آئین ساز اسمبلی کی ابتدائی نشست میں سبھی ممبر شریک ہوں گے۔ اِس نشست میں صدر وغیرہ عہدہ دار چن لئے جائیں گے، اور طریق کار کرلیا جائے گا۔ اِس کے بعد تینوں حصوں کے ممبر الگ الگ بیٹھیں گے۔ اُن میں سے ہر ایک اپنے حصہ میں شامل صوبوں کے لئے آئین تیار کرے گا۔ تب وہ اس بات کا فیصلہ کریں گے کہ اس حصہ کے لئے کسی مشترکہ آئین کی بھی ضرورت ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اُس کے کیا صیغے ہوں گے اور اُس کی کیا شکل ہوگی۔ آخر میں آئین ساز کمیٹی کی نشست پھر ہوگی، جس میں دیسی ریاستوں کے نمائندے بھی شریک ہوں گے اور آل انڈیا فیڈریشن (کل ہند وفاق)، کا آئین تیار کیا جائے گا۔ آئین تیار ہو جانے کے بعد جب اُس کے مطابق صوبوں کی اسمبلیوں کا چناؤ ہو جائے گا، تب ہر ایک صوبے کو حق ہوگا کہ وہ اگر چاہے

تو اپنی اسمبلی کے ووٹ سے، جس حصہ میں وہ شامل کیا گیا ہے۔ اُس میں شریک نہ رہ کر الگ ہو جائے۔ اقلیتی فرقوں کے حقوق کی حفاظت کے لئے ایک الگ کمیٹی بنائی جائے گی جس میں اُس کے نمائندے رہیں گے اور جو حفاظت کی تدبیریں اور طریقے بنائے گی، اُس کے فیصلوں پر آئین ساز کمیٹی غور کر کے آئین میں مناسب اہتمام رکھے گی، اگرچہ ۱۹۳۵ء کا آئین ابھی بدل نہیں جائے گا اور اُس کے مطابق وائسرائے کے ہاتھوں میں ہی آخری اختیارات رہیں گے۔ پھر بھی جہاں تک ہو سکے گا کونسل ہی کی رائے سے کام چلا جائے گا اور اُس میں حتی الامکان دست اندازی نہ ہوگی۔

اِس اسکیم میں کسی بھی پارٹی سب باتیں منظور نہیں کی گئیں۔ اور نہ سب یکبارگی نامنظور ہی کی گئیں تھیں۔ سب پارٹیوں کو کچھ نہ کچھ دے کر خوش کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ مسلم لیگ کا پاکستان کا مطالبہ نامنظور تو کیا گیا تھا، مگر اُس کے ساتھ ہی صوبوں کو اِس طرح تین رقبوں میں تقسیم کر دیا تھا کہ جن صوبوں کو لیگ پاکستان میں ملانا چاہتی تھی اُن کو دو حصوں میں رکھ دیا تھا اور باقی صوبوں کو الگ الگ ایک حصے میں۔ پاکستان کی نامنظوری سے لیگ ناخوش اور دوسرے لوگ مطمئن تھے، مگر اس طرح صوبوں کا تقسیم ہونا لیگ کو پسند تھا۔ اور وہ اِس تقسیم میں پاکستان کا ہیولیٰ دیکھنے لگی۔ دوسرے لوگ اس تقسیم کو ناپسند کرتے تھے اور اس میں جھگڑے کی اُس باریک جڑ کو دیکھتے تھے جو آگے چل کر رفتہ رفتہ گھر کرتی ہوئی شاید پھر پاکستان کی شکل اختیار کر لے گا۔ اِس بات سے یہ مخالفت اور بھی تیز ہوتی جاتی تھی کہ اِن دونوں مسلم حصوں میں پنجاب اور بنگال کے وہ رقبے بھی شریک رکھے گئے تھے، جن میں ہندوؤں کی بہت زیادہ آبادی تھی اور آسام کا صوبہ بھی اس میں شریک کیا گیا تھا، اگرچہ آسام میں مسلمانوں کی آبادی ایک تہائی سے زیادہ نہیں تھی اِس اسکیم پر غور کرنے کے لئے

کانگریس ورکنگ کمیٹی کی نشست کئی دنوں تک ہوتی رہی اِسی درمیان کیبنٹ مشن اور وائسرائے سے صدر کانگریس اور کبھی کچھ دوسرے ممبروں کی ملاقات بھی ہوتی رہی۔ ورکنگ کمیٹی نے اسکیم کی اُن خامیوں کی طرف توجہ مبذول کی جن کو وہ اہم سمجھتی تھی، اُس نے یہ رائے ظاہر کی کہ اُس کی رائے کے مطابق صوبے پابند نہیں ہیں کہ اُن حصوں میں وہ شامل ہوں، جن وہ جوڑ دیئے گئے تھے۔ یہ تو ظاہر تھا کہ آئین بن جانے کے بعد ہر ایک صوبے کو حق ہوگا کہ اپنی اسمبلی کی رائے سے وہ اُس حصے سے الگ ہو جائے مگر ورکنگ کمیٹی کا کہنا تھا کہ اِس کے علاوہ آئین بنانے کے لئے حصوں کی الگ نشست میں شریک نہ ہونے کا بھی ہر صوبہ کو اختیار ہے۔ صوبہ سرحد اور آسام دونوں ہی زبردستی اِن حصّوں میں شامل کئے جانے کے خلاف تھے اِس لئے اُن کو یہ حق ملنا چاہیئے کہ وہ شروع سے ہی اِن حصوں سے الگ رہ سکیں۔ ورکنگ کمیٹی کا کہنا تھا کہ ساری اسکیم کے پڑھنے سے یہی معنی نکلتے تھے۔

مشن نے اپنی رائے دی کہ اُس کا ارادہ ایسا نہیں تھا کہ شروع سے ہی صوبے شریک نہ ہوں۔ مگر آئین بننے کے بعد صوبوں کو الگ ہو جانے کا حق ضرور تھا۔

ورکنگ کمیٹی اپنی رائے پر قائم رہی اُس نے طے کیا کہ اپنی رائے کے مطابق وہ اسکیم کو عمل میں لائے گی۔ اُدھر مسلم لیگ نے اسکیم پر سخت تنقید کی اور کہا کہ پاکستان نامنظور کرنا خلافِ انصاف ہے مگر پھر بھی صوبوں کی تقسیم میں وہ پاکستان کا ہیولیٰ دیکھتی ہے اور اپنے حصولِ مقصد کے لئے وہ اسکیم کو منظور کرتی ہے۔

اِس کے بعد کچھ دنوں تک عارضی حکومت کے متعلق بات چیت جاری رہی۔ شروع میں وائسرائے کی رائے تھی کہ بارہ آدمیوں کی حکومت بنے، جن میں پانچ مسلمان، پانچ ہندو اور دو دوسرے ہوں۔ کانگریس کو یہ بات کسی طرح منظور نہیں تھی۔ ایک تو

ہندوؤں اور مسلمانوں کی تعداد برابر ہوتی تھی۔ اگرچہ آبادی کے اعتبار سے ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے تگنی ہے دوسرے شملہ کانفرنس کے وقت ۱۹۴۵ء کی جولائی میں لارڈ ویول کی اسکیم میں پانچ مسلمان اور ہریجن نمائندوں کے علاوہ پانچ ہندوؤں کو جگہ دی گئی تھی۔ اور دوسری اقلیتوں کے نمائندوں کی تعداد بھی دو سے زیادہ تھی۔ اِس طرح صرف ہندو مسلم کی ہی برابری کا سوال نہ تھا بلکہ لارڈ ویول کی تجویز سے یہ کہیں بڑا تھا۔ ویول کی تجویز کو بھی کانگریس نے لڑائی کا زمانہ ہونے کی وجہ سے کسی طرح منظور کر لیا تھا۔ اب تو زمانہ جنگ بھی نہیں تھا۔ اِس دباؤ سے کانگریس اُس وقت آزاد تھی اور وہ اسے کیسے منظور کرسکتی تھی۔ کانگریس کا خیال تھا کہ پندرہ ممبروں کی تعداد کی حکومت جب بنے گی تبھی اقلیتوں کے نمائندے تناسب طور پر لئے جاسکیں گے۔

وائسرائے نے بارہ کے بدلے تیرہ کی حکومت بنانے کی بات کہی جن میں پانچ مسلمان ایک ہریجن پانچ دوسرے ہندو اور دو اور اقلیتوں کے نمائندے ہوتے۔ کانگریس نے اِسے بھی نامنظور کر دیا۔ تب مشن اور وائسرائے نے بیان نکالا کہ کانگریس اور لیگ کی رائے سے حکومت بنانے کی کوشش ناکام ہوئی۔ اب وہ اپنی طرف سے تجویز رکھیں گے۔ تاریخ پندرہ جون ۱۹۴۶ء کو اُن کی تجویز کا اعلان ہوا جس میں انھوں نے چودہ آدمیوں کے نام دیے۔ جن کو وائسرائے نے حکومت میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ اِس میں پانچ لیگی مسلمان، پانچ کانگریسی، غیر ہریجن ہندو ایک کانگریسی ہریجن ایک سکھ ایک عیسائی اور ایک پارسی کے نام تھے۔ بات چیت کے دوران وائسرائے نے پنڈت جواہر لال جی سے جو کبھی کبھی وہاں آیا جایا کرتے تھے، نام پوچھتے تھے۔ اُنھوں نے کچھ نام بتائے بھی تھے۔ ہریجن اور دوسرے کانگریسی لوگوں کے ایک کے علاوہ وہی نام تھے

جو پنڈت جی نے بتائے تھے۔ عیسائی اور سکھ کے نام بھی ان کے بتائے ہوئے ہی تھے۔ مسلمانوں بھی چار نام وہی تھے جو پنڈت جی نے بتائے تھے۔ مگر ایک غیر لیگی مسلمان کے نام بدلے لیگی مسلمان کا نام اور ایک کانگریسی ہندو کے بدلے دوسرے کانگریسی ہندو کا نام اور ایک پارسی کا نیا نام وائسرائے نے دیا تھا۔

ہم اس بات پر غور کر ہی رہے تھے کہ یہ تجویز منظور کی جائے یا نہیں کہ اسی درمیان مسٹر جناح سے وائسرائے کی باتیں ہوئیں اور اُن کے کہنے پر وائسرائے نے اُن کی کئی باتیں مان لیں۔ جو اخباروں میں کسی نہ کسی طرح شائع ہو گئیں۔ اِس پر ہم لوگ چونک پڑے۔ مانگنے پر وائسرائے کے اپنے خط کے اس حصّہ کی نقل بھیجدی جس میں اُنھوں نے مسٹر جناح کے مطالبوں کو منظور کیا تھا۔ اِس میں اہمیت کی باتیں یہ تھیں کہ چودہ سے زیادہ تعداد نہیں ہو گی۔ اقلیتوں کی جو جگہیں خالی ہوں گی اُن کے تقرر میں لیگ کی رائے لی جائے گی۔ سرکار کوئی ایسا کام نہ کرے گی جس میں لیگ کی اکثریت شریک نہ ہو۔ اِس طرح حکومت کی تنظیم میں ہی نہیں بلکہ اُس کی روزانہ کارروائیوں میں بھی لیگ کی رائے کے بغیر کچھ نہ ہو سکے گا۔ جب ہمارے دیئے ہوئے غیر لیگی مسلمان کے نام کو بھی وائسرائے نے رد کر دیا اور یہ صاف ہو گیا کہ پانچ لیگی مسلمانوں کی تعداد میں کمی نہ ہو سکے گی تو ورکنگ کمیٹی یہ غور کرے گی کہ اپنی پانچ نشستوں میں سے ایک میں کسی نیشنلسٹ خیال کے مسلمان کا نام دے ہم ایسا سوچ ہی رہے تھے کہ وائسرائے کا خط مل گیا کہ مسلمان کا نام کانگریس نہ دے کیونکہ اس کی منظوری نہیں ہو سکے گی۔ ورکنگ کمیٹی اِس حالت کو کبھی منظور نہیں کر سکتی تھی کیونکہ اِس کے منظور کرنے یہ معنی ہوئے کہ کانگریس صرف ہندوؤں کی جماعت ہے اور صرف مسلم لیگ کو ہی مسلمانوں کی نمائندگی کا حق حاصل ہے۔ سب باتوں پر غور کر کے

ورکنگ کمیٹی نے عارضی حکومت بنانے کی ۱۶ جون ۱۹۴۶ء والی اسکیم کو نامنظور کر دیا۔ اب اس کے سامنے سوال یہ تھا کہ آئین ساز کمیٹی کے بارے میں کیا کیا جائے۔ اُس کے عیب اور خامیاں ہم بتا چکے تھے کہ اپنے مفہوم کے مطابق ہی ہم اُس سے کام لیں گے۔ اِس طرح اگرچہ اپنی رائے کے مطابق اُس سے کام نکالنے کی بات کہہ کر ہم ایک طرح سے منظور تو کر چکے تھے مگر واضح لفظوں میں دوٹوک فیصلہ کر کے صاف صاف کچھ نہیں کہا تھا۔ اِس لئے اُس پر ایک بار پھر غور کرنے کی ضرورت پڑی۔ کمیٹی میں دو ایک آدمیوں کو چھوڑ کر، جو اُس کو منظور نہیں کرنا چاہتے تھے، باقی سارے ممبران اُسے منظور کرنے کے حق میں تھے۔ خاص کر مہاتما گاندھی تو منظوری کی زوروں سے حمایت کر رہے تھے۔ اُسی زمانے میں ایک تار آسام سے آیا جس میں یہ کہا گیا تھا کہ بنگال میں آئین ساز کمیٹی کے انتخاب کے لئے جو ضابطہ بنایا گیا ہے اُس کے مطابق ہر ایک امیدوار کو یہ عہد کرنا پڑے گا کہ وہ کمیٹی کا ممبر ہونا اُس دفعہ کی رو سے منظور کرتا ہے۔ جس میں بہتیری دوسری باتوں کے ساتھ ساتھ صوبوں کے تینوں حصوں کا بھی ذکر ہے۔ اِس تار کے بھیجنے والے نے یہ معنی لگائے تھے کہ امیدواروں کو پہلے ہی سے اُن حصّوں کو مان لینے کا پیمان کرنا پڑے گا اور ہم سبھی ان حصّوں کی تقسیم کے مخالف تھے اِس لئے کچھ شبہ پیدا ہونے لگا۔ مگر ابھی کوئی رائے قائم نہیں ہوئی تھی۔ کیونکہ ابھی تک ضابطے پورے دیکھے نہیں گئے تھے۔ اگرچہ نمونہ کے طور پر حکومت ہند کی طرف سے صوبوں میں جو قواعد و ضوابط بھیجے گئے تھے اُن کی نقل سرکار نے ہمارے پاس بھیج دی تھی۔

اُس دِن کا کام ختم کرنے کا وقت ہو گیا تھا۔ اِس لئے دوسرے دن غور کرنے کے لئے بات ملتوی کر دی گئی۔ سوچا گیا کہ اِس درمیان ہم لوگ قواعد و ضوابط کو بھی اچھی

طرح دیکھ لیں گے۔ مہاتماجی کے دل میں اس تار کی وجہ سے وسوسہ پیدا ہوگیا۔ پرارتھنا کے وقت تقریر میں اُنھوں نے یہ بات کہہ دی۔ اِس کا نتیجہ یہ نکلتا تھا کہ کانگریس اس اسکیم کو بھی منظور نہیں کرے گی۔ دوسرے دن ہم لوگ ملے۔ ہم لوگوں کی رائے میں ضابطہ کے وہ معنی نہیں نکلتے تھے جو تار بھیجنے والے نے نکالے تھے۔ اِس درمیان مہاتماجی کی ملاقات کیبنٹ مشن کے ممبروں سے ہوئی۔ اُنھوں نے بھی کہا کہ اِس عہد کے معنی یہ نہیں ہیں لیکن اگر کسی طرح یہ معنی نکلتے ہوں اور مہاتماجی کو قواعد وضوابط کے الفاظ کی وجہ سے کوئی اصولی رکاوٹ معلوم ہوتی ہو تو اُس کے الفاظ کو بھی وہ بدلوا دیں گے اور واضح کر دیں گے۔ کیونکہ اُن کا یہ کبھی منشا تھا ہی نہیں۔

ضابطہ بدل بھی دیا گیا۔ ہم نے اِس لئے اس اسکیم کو منظور کر لیا۔ اِس طرح اب صورت حالات یہ ہوگئی کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے تاریخ ۱۶ر مئی ۱۹۴۶ء والی طویل مدت کی اسکیم کو منظور کر لیا۔ اگرچہ منظور کرنے میں اُس کی خامیوں کو نظر انداز نہیں کیا، اور نہ جو معنی وہ اسکیم کے لگاتی تھی، اُسے ہی چھوڑا۔ پھر بھی اس نے ۱۶ر جون ۱۹۴۶ء کی عارضی حکومت والی اسکیم کو نامنظور کر دیا۔ یہ فیصلہ ایک خط کے ذریعہ تجویز کی نقل ساتھ بھیجکر مشن اور وائسرائے کو بتا دیا گیا۔ اس طرف لیگ نے طویل مدت کی اسکیم کو پہلے ہی منظور کر لیا تھا اور عارضی حکومت کے قیام کے بارے میں کانگریس کے فیصلہ کا انتظار کر رہی تھی۔ اُسی دن وائسرائے سے مسٹر جناح کی ملاقات ہوئی جس دن کانگریس کا فیصلہ وہاں بھیجا گیا تھا۔ وائسرائے نے اُن کو ہمارا خط دکھا دیا۔ ۱۶ر جون کی اسکیم میں ایک بات یہ لکھی تھی کہ اگر کوئی پارٹی اس اسکیم کو نامنظور کر دے تو بھی وائسرائے عارضی حکومت قائم کرنے کی کوشش جاری رکھیں گے اور ایسی پارٹیوں کے نمائندوں کی عارضی حکومت بنائینگے جنھوں نے ۱۶ر مئی ۱۹۴۶ء

کی اسکیم کو منظور کر لیا ہو۔ اب حالت یہ تھی کہ کانگریس اور لیگ دونوں ہی نے ۱۶ ر مئی کی اسکیم کو منظور کر لیا تھا۔ کیونکہ ۱۶ جون کی اسکیم کو آٹھویں دفعہ کے مطابق، اِن دونوں پارٹیوں کے نمائندوں کو لے کر ہی وائسرائے عارضی حکومت بنا سکتے تھے، اور وہ ویسا ہی کرنا چاہتے ہیں یہ بات انھوں نے اُسی ملاقات میں مسٹر جناح سے کہہ بھی دی۔

لیگ والے تو اسی امید میں بیٹھے تھے کہ کانگریس نے اگر ۱۶ ر جون کی اسکیم نامنظور کر دی تو اب عارضی حکومت میں لیگ کا غلبہ رہے گا اور کانگریسی لوگوں کے اس سے باہر رہ جانے میں لیگ کے ہاتھوں میں ہی اختیار آجائے گا۔ ملاقات کے وقت تک ۱۶ ر جون والی اسکیم کو لیگ نے بھی منظور نہیں کیا تھا کیونکہ وہ کانگریس کے فیصلہ کا انتظار کر رہی تھی۔ وائسرائے کی یہ بات اُن کو کھٹکی۔ تب بھی اُنھوں نے اس رات کو یہ فیصلہ کیا کہ لیگ ۱۶ ر جون کی اسکیم کو منظور کرتی ہے۔ دوسرے دن مشن اور وائسرائے نے اعلان کر دیا کہ ۱۶ ر جون کی اسکیم کانگریس نے نامنظور کر دی۔ اِس لئے اُس کی آٹھویں دفعہ کے مطابق، اب کانگریس اور لیگ دونوں کے نمائندوں کو لے کر وائسرائے عارضی حکومت بنائیں گے مگر چونکہ مشن کو فوراً انگلستان واپس جانا ہے اور اُس کے بننے میں کچھ دیر ہو سکتی ہے تب تک صرف سرکاری افسروں کو لے کر ہی عارضی حکومت بنائی جائے گی۔ اِس فیصلہ کے مطابق مشن والے واپس چلے گئے۔ عارضی حکومت بنالی گئی۔

وائسرائے اور مشن کے اِس فیصلہ سے لیگ بہت ناراض ہوئی۔ اُس کے خاص افراد نے سخت بیانات دیئے۔ لیگ کونسل کا ایک اجلاس طلب کیا گیا۔ اُن لوگوں کا کہنا تھا کہ کانگریس نے ۱۶ ر مئی کی اسکیم کو منظور نہیں کیا ہے۔ اُس کی اتنی سخت تنقید کی ہے اور اُس کے معنی کی اتنی غلط تشریح کی ہے کہ وہ نامنظوری کے برابر ہے۔ اُس نے یہ بھی

اپنا ارادہ بتادیا کہ وہ صوبوں کی تقسیم کو نہیں مانتی جو اس اسکیم کی بنیادی بات ہے اور اُسے توڑنے کے ارادے سے ہی وہ آئین ساز اسمبلی میں جانا چاہتی ہے۔ اِسی درمیان میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس بمبئی میں ہوا، جس میں نئے الکشن میں منتخب صدر پنڈت جواہرلال نہرو نے صدارت کی۔ وہاں کانگریس سوشلسٹ پارٹی کی مخالفت کے باوجود کمیٹی نے ورکنگ کمیٹی کے فیصلہ کی تائید کردی۔ اُس کے بعد سبھی صوبوں میں اسمبلیوں میں آئین ساز کمیٹی کے ممبروں کو چُن لیا۔ اِس انتخاب میں کانگریس نے یہ پالیسی روا رکھی کہ کانگریس کے باہر کے بھی خاص لوگوں کو اُس نے منتخب کرایا۔ اِس کے ماسوا کچھ اور لوگ بھی چُنے گئے۔ مسلمانوں کے تقریباً سبھی صوبوں میں لیگی ممبر ہی اسمبلی میں تھے۔ اِس لئے عموماً لیگی نمائندے ہی چُنے گئے، کیونکہ مسلمان ہی مسلمان کو چُن سکتے تھے۔ صوبہ سرحد سے تین ہی مسلمان چُنے جا سکتے تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد اور خان عبدالغفار خاں منتخب ہوئے۔ اُتر پردیش میں رفیع احمد قدوائی صاحب، دلّی میں مسٹر آصف علی اور بنگال میں مسٹر فضل الحق لیگ کے باہر کے لوگوں میں منتخب ہو سکے۔ بہار میں کوئی نیشنلسٹ مسلمان نہیں چنا جا سکا۔ ڈاکٹر امبیدکر بنگال سے چُنے گئے۔ خاص کر کانگریسی لوگ اور دوسرے نامی ماہر آئین اور پُرانے محب وطن منتخب ہوئے۔ اِس طرح آئین ساز کمیٹی کے ممبر چُن لئے گئے۔ اِس انتخاب میں لیگ شریک رہی۔ اُس کے ممبروں نے اپنا نمائندوں کو چُنا۔ مسٹر جناح پنجاب سے منتخب ہوئے۔

انتخاب کے بعد لیگ کونسل کا اجلاس ہوا جس میں طے ہوا کہ لیگ ۱۶ مئی اور ۱۶ جون کی اسکیموں کو نامنظور کرتی ہے اور اپنے ان فیصلوں کو جن میں منظوری دی گئی تھی واپس لیتی ہے۔ اُس نے یہ بھی طے کیا کہ پاکستان قائم کرنے کے لئے وہ براہِ راست کارروائی عمل میں لائے گی۔ اُس نے تب تک کے لئے اپنے ممبروں کو ہدایت کی کہ برٹش

سرکار کے دیئے ہوئے خطابات واپس کردیں۔ اِس اجلاس میں گرماگرم تقریریں ہوئیں، جو کانگریس اور برٹش سرکار دونوں ہی کے خلاف تھیں۔ ایسا معلوم ہوا کہ وہ دونوں ہی سے ٹکرلیں گے۔ اِس کے بعد ہی کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ واردھا میں ہوئی۔ اُس نے پھر صاف لفظوں میں ۱۶ر مئی کی اسکیم منظور کرلی۔

اب وائسرائے کے سامنے یہ صورتِ حالات آئی کہ ایک طرف تو کانگریس نے ۱۶ر مئی والی اسکیم منظور کرلی تھیں اور ۱۶ر جون والی اسکیم نامنظور۔ دوسری طرف لیگ نے اپنی کونسل کے اجلاس میں دونوں اسکیموں کو نئے سرے سے نامنظور کردیا۔ اِس لئے ۱۶ر جون کی اسکیم کی آٹھویں دفعہ کے مطابق لیگ کو چھوڑ کر اب عارضی حکومت بنانا ضروری ہوگیا۔ وائسرائے نے پنڈت جواہر لال نہرو کو عارضی حکومت کے متعلق اپنی تجویز پیش کرنے کے لئے لکھا۔ پنڈت جی نے مسٹر جناح کو عبوری دور کی حکومت میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ مگر اُنھوں نے اِس سے انکار کردیا۔ تب پنڈت جی کے سامنے اِس کے سوا دوسرا کوئی چارہ نہ رہ گیا کہ لیگ کو چھوڑ کر ہی عبوری دور کی حکومت کے لئے نام سوچیں۔ وائسرائے سے ملاقات کے بعد اُنھوں نے نام سوچنے شروع کئے۔ اِس کام میں امداد حاصل کرنے کے لئے اُنھوں نے ورکنگ کمیٹی کی پارلیمنٹری سب کمیٹی کی مٹنگ دلّی میں کی۔ اس کے تین ممبر تھے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل، مولانا ابوالکلام آزاد اور میں۔

کلکتہ کا خونیں باب

ہم لوگ اس کام میں لگے ہوئے تھے کہ کلکتہ سے خبر آئی کہ وہاں خوفناک فرقہ وارانہ فساد شروع ہوگیا ہے۔ مسلم لیگ کی طرف سے اپنی نئی حکمتِ عملی کی تبلیغ کے لئے ۱۶۔اگست مقرر کی گئی تھی۔ اس دن ہر جگہ ہڑتال وغیرہ ہونے کی ہدایت تھی۔ اسی فیصلہ کے مطابق کلکتہ میں بھی ہڑتال وغیرہ ہونے کی بات تھی۔ بنگال اور سندھ میں لیگی وزارتیں کام کر رہی تھیں۔ اِن دونوں صوبوں کی وزارتوں نے اُس دن عام سرکاری تعطیل کردی۔ اِسی طرح سبھی دفتروں بینکوں وغیرہ کو جبراً بند کردیا۔ کانگریس تقریباً ۲۷، ۲۸ برسوں سے ہڑتال کے لئے دن مقرر کرتی آئی ہے۔ بہت ہڑتالیں پوری طرح کامیاب بھی رہی ہیں۔ مگر وہ چاہے سرکار کے خلاف رہی ہوں، چاہے سرکاری باگ ڈور اُن کے ہاتھ میں رہی ہو، اُس نے سرکاری اختیار سے اِس کام میں کبھی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ لیگ نے یہ پہلا موقع پاتے ہی اِس اختیار کا بیجا استعمال کیا۔ اس کی مخالفت سبھی لوگوں نے کی۔ یہ خاص طور پر کہا گیا کہ تعطیل ہو جانے سے بہتیرے لوگ بیکار رہیں گے، اور جلوس جلسہ اور ہڑتال میں اتنے بیکار لوگ ہمیشہ خطرہ پیدا کرسکتے ہیں۔ بنگال اسمبلی اور

بنگال کونسل میں یہ باتیں ہوئیں۔ مگر مسٹر سہروردی وزیر اعلیٰ نے ایک بھی نہ سنی، اُلٹے یہ کہا کہ امن قائم رکھنے کے لیئے ہی چھٹی دی گئی ہے اُس دن سویرے سے ہی دکانیں بند کروانے میں زبردستی شروع ہوگئی۔ اِس کے ساتھ لوٹ کھسوٹ اور خون خرابہ بھی جاری ہوگیا۔

حکومت نے ۱۶۔اگست سے ۱۷۔اگست کی دوپہر تک بلوہ روکنے کی کوئی خاص کارروائی نہیں کی۔ اِس درمیان ہزاروں آدمی قتل ہو گئے اور ہزاروں مکان لوٹے اور جلائے گئے۔ اِس کی روک تھام کی کوشش کی گئی۔ مگر فساد کے بہت بڑھ چکنے کے بعد چار دن تک خوب قتل اور زیادتیاں ہوتی رہیں۔

سنا جاتا ہے کہ چھ سات ہزار آدمیوں کا خون ہوا۔ سڑکوں پر دو تین دن تک لاشیں پڑی رہیں۔ تین ہزار سے زیادہ لاشیں جابجا سے ہٹائی گئیں۔ بہت سی لاشیں زمین دوز نالے میں ڈال دی گئیں، جن کی بدبو سے راستہ چلنا مشکل ہوگیا۔ اِسی طرح جلائے ہوئے مکانوں کے اندر اور ہُگلی ندی میں کتنی لاشیں ڈال دی گئیں۔ اِس کا اندازہ نہیں۔ سنا جاتا ہے کہ ہوڑہ کے پُل پر سے بہتیرے لوگ پھینک اور ڈھکیل کر گنگا میں ڈبو دیئے گئے۔ بچے، بوڑھے بیکس عورتیں، کسی پر ظالموں نے رحم نہیں کیا۔ سب ان کے اعمال بد کے شکار بنے۔

اِس طرح کا قتلِ عام کلکتہ میں کبھی نہیں ہوا تھا۔ شاید نادر شاہ کے دلی والے قتلِ عام کے سوا، ہندوستان میں اور کہیں ایسا نہیں ہوا۔ لیگ کے ایک خاص لیڈر سر فیروز خاں نون نے ایک بار کہا تھا کہ وہ ایسی حالت پیدا کردیں گے جیسی چنگیز خاں اور ہلاکو خاں نے بھی نہیں کی تھی۔ لیگ کی براہِ راست کارروائی کا کچھ نمونہ لوگوں کے سامنے آگیا۔ اُس دن اور جگہوں میں بھی جابجا کچھ ہوتا نظر آیا۔ مگر کہیں کوئی خاص بات نہیں ہوئی۔ چھوٹے موٹے

واقعات کلکتہ کے سامنے ہیچ ہیں۔ ڈھاکہ، بنارس، الہ آباد، رانی گنج، دلّی اور دوسرے کئی مقاموں میں کچھ ہوا۔ مگر وہاں کے سرکاری کارکنوں نے حالت سنبھال لی۔ مسٹر سہروردی بھی اس کام میں لگے اور سب سے قیامِ امن کی اپیل کی۔ کلکتہ کے بلوہ کے بارے میں اسٹیٹسمین جیسے انگریزی اخبار نے جو ہمیشہ لیگ کی حمایت کرتا رہا تھا زور زور سے بار بار لکھا کہ لیگی وزارت قیامِ امن میں اپنے کو نالائق ثابت کر چکی، اسے ہٹانا چاہیے اسی قسم کی باتیں انگلستان کے بہتیرے اخباروں نے لکھیں جن میں ٹائمز بھی تھا۔ دیسی اخباروں کی نوبات ہی کیا ہے۔ مگر اتنے پر بھی لیگ والوں کے کان پر جوں تک نہ رینگی ۳۹-۱۹۳۷ء کی کانگریسی وزارتوں کے خلاف انھوں نے بلاوجہ اتنا واویلا مچایا تھا۔ وہی لوگ اس لاثانی خونیں باب اور بدترین مظالم پر جس کے کرانے میں اگر ان کا ہاتھ صاف نہیں تو کم سے کم جس پر چشم پوشی انھوں نے ضرور کی، بالکل چُپ تھے۔ مسٹر جناح نے صرف اتنا ہی کہا کہ جس کسی نے بلوہ کیا اُس کو سزا ملنی چاہیے اور چونکہ اُن کو اس کی پوری رپورٹ نہیں ملی اس لئے وہ نہیں کہہ سکتے کہ اس میں کس کا قصور ہے۔ نیز اُن کو یقین ہے کہ لیگی لوگ لیگ کے حکم کے خلاف نہ گئے ہوں گے۔ اگر کوئی گیا ہوگا تو صوبائی مسلم لیگ اُس کے خلاف تادیبی کارروائی کرے گی۔ اس کے خلاف اخبار ڈان نے تو جو کچھ ہوا اُسے بہت تھوڑا بتایا اور دیر کر کے خبریں چھاپنے کے علاوہ کئی روز تک اس موضوع پر کچھ لکھا ہی نہیں اس حادثہ سے سارے ملک میں کھلبلی مچ گئی اور گھبراہٹ پیدا ہو گئی۔ یہ بھی سننے میں آیا کہ شروع میں تو ہندو ہی مارے گئے مگر بعد میں جب کسی طرح کی مدد اُن کو سرکار کی طرف سے نہیں ملی تو انھوں نے بھی حفاظتِ خود اختیاری کی اور بعد میں تو جتنے مرے ان میں شائد زیادہ تعداد مسلمانوں کی ہی ہوگی، بہر حال چاہے ہندو زیادہ مرے ہوں یا مسلمان

اِس میں شک نہیں کہ مرنے والوں میں سب سے زیادہ بے قصور لوگ تھے، جو بلوہ میں شریک تو نہیں ہوئے۔ مگر اُس کے شکار بن گئے۔ جائداد تو کروڑوں کی برباد ہوئی۔ زیادہ تر تو ہندوؤں کا ہی مال برباد ہوا اور لُٹا بھی۔

عارضی حکومت سے پہلے

اِدھر عبوری دور کی قومی حکومت کی گفتگو جاری تھی، اُدھر اس طرح کا خون خرابہ ہو رہا تھا۔ وائسرائے اور پنڈت جواہر لال نہرو نے طے کر لیا کہ اِس وجہ سے اس کام میں رکاوٹ نہیں پڑنی چاہیئے۔ ہم لوگوں سے مشورہ کر کے پنڈت جی نے وائسرائے کو عارضی حکومت کے لئے نام دے دیئے، ان ناموں میں میرا نام بھی تھا۔ آج سے ایک ہفتہ بعد ستمبر کے شروع سے، یہ نامزد لوگ حکومت کا کام سنبھالنے لگ جائیں گے۔ آج تو یہ کوالف لکھ کر ختم کرنا چاہتا ہوں۔

یوں تو شملہ میں بھی میرا نام دیا گیا تھا۔ جیسا اوپر کہہ آیا ہوں۔ میں بہت پس و پیش میں تھا۔ آخر محترم باپو جی کے کہنے پر میں نے اُسے منظور کیا تھا۔ مجھے ایک اخلاقی رکاوٹ بہت ستا رہی تھی۔ وہ یہ کہ اُس وقت جنگ جاری تھی۔ حکومت کا بار لینے کے معنی اُس جنگ میں مدد دینے کے بھی ہوتے تھے۔ شملہ کانفرنس کے ٹوٹنے کے تھوڑے ہی دنوں بعد وہ لڑائی ختم ہو گئی۔ اِس لئے جب کیبنٹ مشن اور وائسرائے سے اِس بار گفتگو شروع ہوئی تو وہ اخلاقی رکاوٹ اِس صورت میں نہ رہی، اور پہلے بھی پنڈت جواہر لال نہرو نے میرا نام

دے دیا تھا۔ اِس طرح ۱۶ر جون کی اسکیم میں میرا نام بھی تھا۔ مگر اُس کی نامنظوری کے بعد وہ بات ٹل گئی تھی۔ اِس درمیان جب پھر یہ بات چلی تو پہلے یہ بھی سوچا گیا کہ عبوری دور کی حکومت میں پنڈت جی کے شریک ہو جانے کے بعد میں ہی میرٹھ کانگریس کی صدارت کے لئے خالی رکھا جاؤں گا۔ کچھ نے یہ بھی سوچا کہ آئین ساز کمیٹی کا صدر میں بنایا جاؤں۔ مجھے اِس عارضی حکومت میں جگہ نہ دی جائے۔ مجھے اِس معاملہ میں کسی سے کچھ کہنا نہیں تھا جو کچھ بھی طے ہوتا، مجھے منظور تھا۔ لیکن اگر میری اپنی پسند کی بات پوچھی جائے تو اُن دونوں کو عارضی حکومت کی ممبری سے زیادہ پسند کرتا مگر یہ بات میری پسند پر منحصر نہیں تھی۔ لوگوں نے سب باتوں پر غور کر کے یہی عہدہ دینا مناسب سمجھا۔ میرا نام بھی دیا گیا۔ یہ سب فیصلہ دلّی میں میرے سامنے ہی کیا گیا۔ میں آرام کرنے کے لئے پلانی چلا آیا تھا۔ وہاں سے ایک دن کے لئے جے پور گیا۔ جے پور میں ہی دعوتی تار ملا۔ وہاں سے دلّی چلا گیا۔ ہمارے درمیان جب نام طے ہو گئے تو میں پلانی چلا آیا۔ میں سمجھتا تھا کہ شاید اگست کے آخر تک یہاں رہ سکوں گا، کیونکہ اِس سے پہلے عبوری دور کی حکومت میں کام سنبھالنے کا وقت نہیں ہوگا مگر یہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ۲۷ر اگست ۱۹۴۶ء کو ہی ورکنگ کمیٹی کی نشست دلّی میں ہونے والی ہے جس میں محترم مہاتما جی بھی آرہے ہیں۔ اِس لئے اب وہاں ۲۷ اگست تک ہی پہنچ جانا ضروری ہے۔

پچھلے ۲۶ برسوں میں دن رات کانگریس کے کام میں لگا رہا ہوں۔ گھر پر بیمار ہو کر ہی گیا ہوں۔ وہاں کے کام میں بھائی کے مرنے کے بعد ہی کچھ تھوڑا وقت کچھ دنوں تک دینا پڑا تھا۔ نہیں تو گھر کے کام سے بھی یکبارگی علیحدگی رہی ہے۔ اپنے رہنے کے لئے کہیں کوئی الگ انتظام نہیں کیا۔ آشرم میں رہا یا جب کہیں گیا تو دوستوں کے

ساتھ۔ پٹنہ میں مرتنجے کے ڈیرے پر دو چار ہی روز رہا ہوں۔ اِس طرح ایک ہی قسم کی زندگی رہی ہے۔ کبھی کسی دفتر میں بیٹھ کر کام نہیں کیا۔ کچھ دنوں تک پٹنہ میونسپلٹی کے چیرمین کی حیثیت سے دفتر کا کام کیا مگر وہ تجربہ اتنا کم اور تھوڑے دنوں کا تھا کہ وہ قابلِ شمار نہیں کانگریس کے دفتر کا کام سنبھالنا پڑا ہے مگر وہاں بھی دفتر سے زیادہ تعلقاتِ عامہ کا ہی کام کیا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ کام بالکل دوسری قسم کا ہے۔ اب ایک نئی قسم کی زندگی میں داخل ہونا ہے۔

اِس کے بعد جو پیچیدہ مسائل سامنے پیش ہیں اُن کا حل کس طرح کیا جائے گا؟ معلوم نہیں مجھے کون صیغہ ملے گا نئے لوگوں کا ساتھ ہوگا۔ جن میں بہت سے ایسے ہوں گے جنھوں نے یا جنکے ساتھیوں نے ہم کو یا ہمارے ساتھیوں کو جیلوں میں بند رکھا ہمارے آدمیوں کے ساتھ طرح طرح کی سختیاں کیں مگر میرے دل میں کسی کے لئے دوسرا جذبہ نہیں ہے اور میں مانتا ہوں کہ میں سب کو ملا کر اپنا کام کر سکوں گا۔ لیکن حکومت کے باہر بھی زبردست دشواریوں کا سامنا کرنا ہے۔ نہ معلوم لیگ کیا کیا کرے گی اور عوام کا رُخ کیا رہے گا۔ اگر ہم نے سچائی کے ساتھ اور غیر جانبدار ہو کر سب کی خدمت کی تو نتیجہ اچھا ہوگا۔ اپنا ارادہ ایسا ہی ہے۔ آگے خدا کے ہاتھ ہے۔

پلانی

۲۴۔ اگست ۱۹۴۶ء

ضمیمہ

میں نے سرگزشت لکھنی کب شروع کی اور یہ کیسے لکھی گئی۔ اِس کا ذکر کتاب کے ۵۲ اویں باب میں کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں یہ بھی ذکر ہے کہ عارضی حکومت کے بننے تک کا ہی حال اِس میں لکھا گیا ہے۔ آج سے تقریباً چار مہینے قبل میں نے کتاب کو مکمل کیا تھا۔ اِسی درمیان بہت سی باتیں ہو گئیں، جن کی اہمیت اور جن کو اس ضمیمہ کی صورت میں دے دینا اچھا معلوم ہوتا ہے۔

تاریخ ۲ ستمبر ۱۹۴۶ء کو عارضی، قومی حکومت بنی۔ اُس میں بارہ وزیر بنائے گئے جن کے نام تھے۔ پنڈت جواہر لال نہرو، سردار ولبھ بھائی پٹیل، شری سرت چندر بوس چکرورتی راج گوپال اچاری، مسٹر آصف علی، ڈاکٹر متھائی، شری جگجیون رام، سر شفاعت احمد خاں، سردار بلدیو سنگھ، مسٹر بھابا، جناب علی ظہیر اور میں۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل، شری جگ جیون رام اور میں اُس وقت برلا مندر میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ وہاں کے لوگوں نے تہنیتی مراسم کے ساتھ ہم لوگوں کو روانہ کیا۔ وہاں سے ہم لوگ محترم گاندھی جی کے پاس گئے اور دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ گاندھی جی کی دعائیں

لے کر وائسرائے کے پاس اپنا کام سنبھالنے کے لئے گئے۔

خوراک اور زراعت کے محکمے میرے سپرد کیے گئے۔ سارے ملک میں غلّہ کی زبردست قلت تھی۔ خاص کر دکھن کے ان حصّوں میں جہاں لے لوگ چاول ہی کھایا کرتے ہیں ۱۹۴۵ء میں بارش بہت کم ہوئی اور دھان کی فصل بہت جگہوں میں خاص کر دکھنی علاقہ میں خراب ہوگئی۔ سردیوں میں بھی پانی نہیں برسا۔ اِس لئے ربیع کی فصل بھی کم ہوئی۔ پہلے ہی زمانہ جنگ میں غلّہ کی بہت کمی ہوگئی تھی، کیونکہ برما سے چاول آنا بند ہوگیا تھا۔ ہندوستان کے کچھ حصّوں میں وہاں کے لوگوں کے کھانے کے لئے کافی غلّہ نہیں ہوتا ہے۔ یہ کمی برما کے چاول سے پوری ہوتی ہے۔ جب اس کی درآمد بند ہوگئی۔ تو بڑی دشواری کا سامنا ہوا۔ بنگال کے خوفناک قحط کے اسباب میں ایک یہ بھی تھا۔ ۱۹۴۶ء کی ابتدا سے اِس کا خطرہ تھا کہ اِس سال غلّہ کی بہت کمی رہے گی اور کہیں قحط نہ پڑ جائے۔ اِس لئے حکومت ہند نے غیر ملکوں سے غلّہ درآمد کرنے کا انتظام سوچا۔ آج کل دنیا میں غلّہ کی قلت ہے۔ اس لئے ایک بین الاقوامی انجمن بنائی گئی ہے۔ جو سبھی ملکوں سے جہاں کچھ غلّہ مل سکتا ہے پتہ لگا کر اُن ملکوں میں اُسے پہنچانے کا انتظام کرتی ہے جہاں کمی ہے۔ اِس انجمن میں ہندوستان بھی شریک ہے۔ چنانچہ ہندوستان کی طرف سے اُس سے غلّہ مانگا گیا۔

غیر ملکوں میں اور خاص کر امریکہ میں یہاں کا حال پہنچا۔ یہاں کے سابق صدر ہوور سبھی ملکوں میں غلّہ کی حالت دیکھتے دیکھتے ہندوستان بھی پہنچے۔ یہاں کی بُری حالت کا اُن پر بہت اثر پڑا۔ اُنھوں نے مدد دینے کا مشورہ دیا۔ اِس کے بعد ہی کچھ لوگ امریکہ سے غیر سرکاری طور پر یہاں کی حالت دیکھنے آئے۔ اُن کے صدر تھے زراعت کے

ماہرِ خصوصی ڈاکٹر شلٹر! اُنہیں بھی یہاں کی بدحالی پر بہت رحم آیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اِس بین الاقوامی جماعت نے ہندوستان کے لئے غلّہ دیا، مگر ہم جتنا چاہتے تھے، اُتنا نہیں، اُس سے بہت کم۔ اِس کا سبب یہ تھا کہ اُن کے پاس اس سے زیادہ دینے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ کیونکہ اُنہیں دوسرے ملکوں کو بھی دیکھنا تھا۔ جب میں نے اِس کام کو سنبھالا، حالت بہت نازک تھی اور ڈر معلوم ہوتا تھا کہ کسی نہ کسی دن لوگ غلّہ کے بغیر مرنے لگ جائیں گے۔ دیس بدیس سے جو کچھ مل سکتا تھا اُسے ملک کے مختلف حصّوں میں ضرورت کے مطابق بانٹا جا رہا تھا۔ آتے ہی میں نے دیکھا کہ محترم گاندھی جی نے جو کچھ پہلے کہا تھا، وہی ٹھیک ہے۔ اُنھوں نے کہا تھا کہ دوسرے ملکوں پر ہم بھروسہ نہیں کر سکتے، کیونکہ وہاں سے غلہ لانے میں ہمیں دشواریاں پیش آسکتی ہیں۔ ہمارے لئے اپنے ملک اور اپنے لوگوں پر ہی بھروسہ کرنا ٹھیک ہے۔ میں نے فوراً حالت کو سمجھ کر اس بات کی اپیل کی کہ جس سے جیسا بن پڑے، زیادہ غلّہ پیدا کرنے کے لئے کرے۔ جتنا کم غلّہ خرچ کر سکے، کرے اور جتنا بچا کر دوسروں کے لیے دے سکے۔ دے۔

غیر ملکوں سے جو کچھ آسکتا تھا، اُس پر زور لگایا گیا اور ملک میں جو کچھ مل سکتا تھا اور اناج کے خرچ میں جتنی کمی ہو سکتی تھی، کی گئی۔ فکر دن رات لگی رہتی یہ بات صرف میرے ہی ساتھ نہیں تھی۔ ہمارے صیغہ کے سبھی کارکن مجھ سے بھی زیادہ فکرمند رہتے تھے۔ کیونکہ ابھی تک بھکمری سے بچانے کا بار تو اُنہی پر تھا۔ میں تو ابھی آیا تھا۔ مجھے اِس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ میرے صیغوں میں میرے اور کارکنوں کے درمیان کسی قسم کا اختلاف رائے نہیں ہوا اور سبھی مل جل کر حتی المقدور ملک کو مصیبت سے بچانے کے کام میں لگے رہے۔ اُدھر لوگوں نے بڑی ہمت اور صبر سے مصیبت کا سامنا کیا۔

تھوڑے ہی دنوں کے تجربے نے میرا یقین اور بھی پختہ کردیا ہے کہ ہندوستان جیسے زراعت پیشہ ملک کو اپنی خوراک خود پیدا کرنی چاہیے، اِس لئے غیر ملکوں پر بھروسہ کرنا ٹھیک نہیں۔ یہ کوئی آسان مسئلہ نہیں۔ ہماری آبادی بڑھتی جارہی ہے۔ قابلِ زراعت زمین اب بہت نہیں بچی ہے۔ بہت کچھ زیرِ کاشت آچکی ہے۔ پہلے بھی پانچ چھ کروڑ من چاول باہر سے منگانا پڑتا تھا۔ اب آبادی بڑھ جانے سے زیادہ غلہ کی ضرورت ہوگئی ہے اور یہ ضرورت بڑھتی ہی جائے گی۔ اِس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کرنا زرعی صیغہ کا کام ہے۔ پھر بھی یہ ظاہر ہے کہ ہمارے لوگوں کو جو غذا ملتی ہے وہ ایسی نہیں ہوتی کہ اُس سے اُن کی صحت ترقی کرے۔ اُس میں بہت طرح کی کمی ہے جسے پورا کرنا چاہیئے۔ میری دلچسپی اِن معاملوں میں کافی ہے، اور اِس کوشش میں دن رات لگا دینا چاہتا ہوں کہ یہ کیسے کیا جائے۔ سرکار تو صرف کچھ رہنمائی کرسکتی، مشورہ دے سکتی ہے۔ تھوڑی بہت مدد کرسکتی ہے۔ مگر کام تو عوام کا ہے۔ ہمارے عوام بیشتر زراعت پیشہ ہیں۔ اُنھیں کو یہ بار سنبھالنا ہے۔

لارڈ ویول اِس بات کے لئے برابر کوشاں تھے کہ مسلم لیگ کسی طرح عارضی قومی حکومت اور آئین ساز انجمن میں شریک ہوجائے۔ ہمارے تقرر کے تھوڑے دن بعد اُنھوں نے مسٹر جناح سے خط و کتابت شروع کی اور ایک موقع ایسا آیا جب پنڈت جواہر لال نہرو کو اُن سے گفتگو کرنی پڑی۔ بھوپال کے نواب صاحب بھی بیچ میں پڑے اور اِس بات کی کوشش کی گئی کہ کانگریس اور مسٹر جناح کے درمیان سمجھوتہ ہوجائے مگر یہ کوشش کامیاب نہیں ہوئی۔ آخر مسٹر جناح نے فیصلہ کیا کہ وائسرائے کے مشورہ سے، کانگریس کے مشورہ کے بغیر ہی اپنے آدمیوں کو عبوری دور کی حکومت میں بھیجیں گے۔ ہم نے تین جگہیں خالی کردیں

اور مسلم لیگ کے پانچ ممبروں کا تقرر ہوگیا۔ اس تقرر کے متعلق کچھ لکھنا غیر مناسب نہ ہوگا ۱۶ رجون ۱۹۴۶ء کے بیان میں کیبنٹ مشن اور وائسرائے نے کہا تھا کہ وہی لوگ اِس عبوری دور کی حکومت میں شریک ہوسکیں گے جنھوں نے ۱۶ مئی والے بیان کو منظور کرلیا اور چونکہ اُس وقت لیگ اور کانگریس دونوں نے ہی اِسے مان لیا تھا۔ دونوں کے ممبروں کو لے کر ہی وہ عارضی حکومت بنائی جاسکتی تھی۔ اس وقت کانگریس اس میں شریک ہونے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اِس لئے اُس وقت یہ حکومت نہیں بنی۔ لہٰذا ناراض ہوکر لیگ کونسل نے طے کیا کہ وہ اب ۱۶ ارمئی اور ۱۶ رجون کے دونوں بیانوں کی منظوری کے متعلق اپنی قراردادوں کو واپس لیتی ہے۔

اکتوبر میں جب لارڈ ویول نے لیگ کے ممبروں کو مقرر کرنا چاہا تو سوال یہ ہوا کہ لیگ نے ۱۶ مئی والے بیان کو منظور کرلیا ہے یا نہیں۔ اُس کے منظور کرلینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ آئین ساز انجمن میں شریک ہوگی اور اُس کی کارروائی کو پورا کرے گی۔ ہم لوگوں کے پوچھنے پر لارڈ ویول نے ہمیں یقین دلایا کہ اُنھوں نے مسلم لیگ کو بتا دیا ہے کہ اِس عارضی حکومت میں شریک ہونے کے معنی ہی یہ ہیں کہ لیگ ۱۶ مئی والے بیان کو منظور کرتی ہے

دوسری بات یہ تھی کہ اِس عبوری دور کی حکومت میں شریک ہونے سے پہلے ہم نے طے کرلیا تھا کہ ہم سب کیبنٹ کی طرح ایک ساتھ مل جل کر کام کریں۔ اِس کے یہ معنی تھے کہ ہم سب کی ذمہ داری مشترک ہوگی۔ یعنی ہر ایک وزیر کی کارروائی کے لئے ساری کابینہ جواب دہ ہوگی اور اگر ایک کو ہٹنا پڑے یا ہٹایا جائے تو سب ہٹ جائیں گے اِس طرح ہر ایک وزیر اپنی مرضی اور خواہش کے مطابق کام نہ کرکے سب ساتھ مل کر کام کریں گے اور اُن کو ایک دوسرے کے خلاف توڑا نہ جاسکے گا۔ ہم نے اِسی قرینہ

سے کام بھی شروع کیا۔ ہم سمجھتے تھے کہ سرکاری دستور میں ایک نمایاں فرق ثابت ہوگا کیونکہ اِس طرح وائسرائے کو مداخلت کرنے کا موقع بہت کم رہ جائے گا۔ بات یہ ہے کہ کسی ایک کے معاملہ میں دست اندازی کے معنی سب کے ساتھ دست اندازی کے ہو جاتے ہیں اور ساری کابینہ ٹوٹ سکتی ہے۔

پہلے کی اگزکٹو کونسل کے لوگ الگ الگ مقرر کیے جاتے تھے اور ایک دوسرے کے ساتھ اُن کا رابطہ وائسرائے کی معرفت ہی ہوتا تھا۔ ایک کے ہٹنے سے دوسرے پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا۔ ہمارے تقرر کے بعد دفتروں کے کاموں اور کاغذوں میں وزارت اور اُس کے ممبروں کو اگزکٹو کونسلر اور کونسل کا ممبر نہ کہہ کر کیبنٹ اور کیبنٹ ممبر کا ہی نام استعمال ہونے لگا۔ سبھی کاغذوں میں جہاں کونسل کا نام تھا کاٹ کر کیبنٹ بنا دیا گیا ہماری اپنی کارروائی بھی اِسی کے مطابق ہونے لگی۔ ہم وزرا روزانہ شام کے پانچ بجے غیر رسمی طور پر ملتے تھے اور سبھی اہم معاملات پر چاہے وہ کسی بھی صیغے کے کیوں نہ ہوں باتیں کر لیتے تھے اور سب کی رائے سے فیصلے بھی لیا کرتے تھے۔ جب مسلم لیگ کے لوگوں کے آنے کی بات چلی تو ہم نے امید کی کہ وہی طریقہ رہے گا، مگر ایسا ہوا نہیں۔

لیگ نے آتے ہی اِن دونوں باتوں سے انکار کر دیا۔ کہا گیا کہ اُس کی طرف سے ایسا کوئی وعدہ نہیں کیا گیا ہے کہ ۱۶ مئی کے بیان کی نامنظوری کو وہ رد کرے گی اور اُس نے یہ منظور نہیں کیا ہے کہ عبوری دور کی حکومت کیبنٹ کی طرح کام کرے گی۔ وہ ایسا مانتے ہیں کہ جیسے پہلے کی اگزکٹو کام کیا کرتی تھی۔ اُسی طرح اب بھی کام کرے گی۔ جواہر لال جی کے مدعو کرنے پر کہ وہ ہماری شام والی غیر رسمی کیبنٹ میٹنگ میں شریک ہوں۔ اُنھوں نے انکار کر دیا۔ اب وہ لوگ اور ہم لوگ وائسرائے کی موجودگی میں جب

کبھی کیبنٹ کی باضابطہ میٹنگ ہوتی تھی تبھی مل سکتے تھے اور جو معاملے وہاں پیش ہوتے تھے اُن کے متعلق جو کچھ کہنا سننا ہوتا تھا، وہیں کہہ سکتے تھے۔

اِدھر اس عارضی حکومت کا کام اِس طرح چل رہا تھا۔ اُدھر کلکتہ کے خونیں باب کے بعد سارے ملک میں بڑی کھلبلی مچ رہی تھی۔ بمبئی، الہ آباد، ڈھاکہ وغیرہ بیشمار مقامات میں لوگوں کو چھرے مارے جارہے تھے۔ بہار کے بہت لوگ کلکتہ میں رہا کرتے ہیں۔ اُن میں سے بہت سے کلکتہ کے خون خرابہ میں مارے گئے تھے اور دوسری طرح سے ستائے گئے تھے۔ جو بھاگ کر واپس آئے، اُنھوں نے اپنے اور دوسروں کے دُکھڑے سُنائے۔ اِس کا اثر بہار کے لوگوں پر بہت پڑا۔ مظفر پور ضلع کے بینی باد گاؤں میں خبر اُڑی کہ وہاں کوئی ایک ہندو عورت کو زبردستی کلکتہ سے لے آیا ہے۔ ہندوؤں کا ایک مجمع اس گاؤں میں گیا اور کئی مسلمانوں کو مار ڈالا اور کتنوں ہی کے گھر جلا دیئے۔ خبر ملنے پر وہاں کے لوگوں کے ساتھ حکومت نے سختی کی اور بہتیرے گرفتار کر لئے گئے اور مجموعی جرمانہ کیا گیا۔ اس واقعہ کی خبر پھیلنے پر مسلمانوں میں بے چینی پیدا ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد زوروں سے خبر آئی کہ نواکھالی اور تریپورہ ضلعوں میں، جہاں مسلمانوں کی بہت آبادی ہے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں پر حملہ شروع کر دیا۔ بہت سے ہندو مارے گئے اور گاؤں کے گاؤں جہاں ہندو رہتے تھے۔ جلا دئے گئے اور ہزاروں کی تعداد میں ہندو زبردستی مسلمان بنا لئے گئے۔ بہتیری عورتوں کے ساتھ زبردستی شادی کر لی گئی اور بہت بھگا یا چرا کر کہیں سے کہیں کر دی گئیں۔ یہ واقعات دو ضلعوں کے کئی مقامات پر پھیلے ہوئے تھے۔ پہلے تو ٹھیک پتہ نہیں چلا کہ واقعات کتنے وسیع پیمانہ پر ہیں۔ ہزاروں کی تعداد میں ہندو اپنا گھر بار چھوڑ کر یا سب کچھ برباد ہونے یا لُٹ جانے یا جلا دئے جانے کے بعد بھاگ کر شہروں میں اور دوسرے

مقامات پر پناہ لینے آئے۔ اُن علاقوں میں کسی بھی ہندو کے لئے جانا مشکل تھا، کیونکہ علاقہ بھر کا محاصرہ کرلیا گیا تھا۔ وہاں کی حکومت کی شکایت ہونے لگی کہ اُس نے بلوائیوں کو روکنے کا کوئی موزوں موقع انتظام نہیں کیا اور جیسے کلکتہ میں بلوائیوں کو چھوڑ دیا گیا تھا، ویسے ہی وہاں بھی انھیں من مانی کرنے کے لئے چھوٹ دے دی گئی۔ یہ خونیں باب کئی دنوں تک کھُلا رہا۔ وہاں کے اور کلکتہ کے خونیں باب میں ایک بہت بڑا فرق یہ تھا کہ کلکتہ میں ہندوؤں کی آبادی بہت زیادہ ہے لیکن نواکھالی اور تریپورہ میں مسلمانوں کی زبردست اکثریت ہے۔ اِس لئے کلکتہ میں تو شروع میں ہندو خوب پٹے۔ مگر بعد میں انھوں نے اپنی حفاظت روروں سے کی۔ نواکھالی اور تریپورہ میں ایسا نہیں ہوسکا کیونکہ وہاں ہندو بہت کم اور کمزور تھے۔ اِن واقعات کی خبر ملک بھر میں پھیل گئی اور چاروں طرف ہندوؤں میں بڑی برہمی پیدا ہوگئی۔

اِن واقعات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوؤں میں جذبۂ انتقام سرائت کرگیا۔ اُدھر مسلم لیگ کے لیڈر اور اخبار روز بروز زہر اُگلا کرتے تھے اور ہندوؤں کو جنگ کے لئے للکار رہے تھے۔ جواہر لال جی شمالی مغربی سرحدی صوبہ میں وزیرِ حکومت کی حیثیت سے سفر کرنے لگے وہاں کے سرکاری پولٹیکل ڈیپارٹمنٹ کے کارکن براہ راست وائسرائے کی ماتحتی میں کام کرتے تھے۔ کچھ حصّوں میں غلط پروپیگنڈا کر کے لوگوں کو اُبھارا گیا تھا اور کچھ لوگوں نے پنڈت جی اور بادشاہ خاں کے ساتھ صرف بدتمیزی ہی نہیں کی بلکہ اور طرح کی زیادتیاں بھی کیں۔ ایک جگہ تو اتنا زبردست حملہ ہوا کہ جوں توں کر کے اِن لوگوں کی جان بچی اور بادشاہ خاں کے ہاتھ میں اتنی چوٹ آئی کہ ہڈی ٹوٹ جانے کی وجہ سے مہینوں تک پٹی باندھے رکھنے کی ضرورت ہوگئی۔ مگر باوجود ان سب واقعات بد کے پنڈت جی کا دورہ بہت

کامیاب رہا اور وہاں کے لوگوں نے اُن کا بہت استقبال کیا۔ محبت اور جوش کا مظاہرہ کیا۔ اِس بات کا بھی اثر ملک کے ہندوؤں پر بہت پڑا۔ ان کو ایسا محسوس ہوا کہ مسلم لیگ انگریزوں کے ساتھ مل کر ہندوؤں کو دبانا چاہتی ہے اور دباتی جا رہی ہے۔

بہار میں زبردست بلوہ شروع ہو گیا۔ کئی جگہوں کے چھوٹے موٹے واقعات کو لے کر ہندو بڑی تعداد میں مسلمانوں کے گاؤں پر حملہ کرنے لگے۔ پٹنہ ضلع کے کئی تھانوں کے کتنے ہی مسلمان مارے گئے۔ کتنوں ہی کے گھر جلائے گئے اور کتنوں کے ساتھ بیدردی کا سلوک کیا گیا۔ یہ آگ منگیر اور گیا ضلعوں کے کئی تھانوں تک پہنچ گئی۔ چھپرا میں تو اس کی ابتدا ہی ہوئی تھی۔ وہاں پہلے شہر میں اور بعد ازاں گاؤں میں بہتیرے مسلمان مارے گئے۔ دلّی میں اِن واقعاتِ بد کی خبر ملی۔ پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار ولبھ بھائی پٹیل جو بنگال کی حالت دیکھنے کلکتہ گئے تھے، واپسی پر پٹنہ میں رک گئے۔ اُن کے ساتھ مسٹر لیاقت علی خاں اور سردار عبدالرب نشتر بھی گئے۔ یہ لوگ بھی رک گئے۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل اور مسٹر لیاقت علی خاں تو دلّی کے کام سے واپس آ گئے مگر پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار عبدالرب نشتر پٹنہ میں ٹھہر گئے۔ میں بھی ہوائی جہاز سے وہاں پہنچا۔ ہماری صوبائی وزارت کے لوگ زوروں سے دوڑ دھوپ کر رہے تھے اور پولیس حتی الامکان بلوہ روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ فوج کی مدد بھی طلب کی تھی، جو کچھ دیر کے بعد پہنچی۔ پنڈت جواہر لال اور میں دونوں دوڑ دھوپ کرنے لگے اُدھر جب گاندھی جی کو خبر ملی تو اُنھوں نے اعلان کیا کہ اگر بہار میں بلوہ نہ رُکا تو وہ بھوک ہڑتال کر کے جان دے دیں گے۔ اُس زمانے میں گاندھی جی اس لئے نواکھالی گئے ہوئے تھے کہ پھر سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نیک فہمی پیدا کریں۔ اِس لئے اُنھوں نے یہ اعلان کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہار میں بلوہ اک دم سے

رُک گیا مگر جو کچھ ہو چکا تھا وہ بھی بہت زیادہ اور خوفناک تھا۔ کتنے ہلاک ہوئے۔ اِس کا ٹھیک پتہ ابھی تک نہیں لگا، مگر اِس میں کوئی شبہ نہیں کہ اُن کی تعداد ہزاروں میں ہے۔ مسلم لیگ کے لوگوں نے بہت بڑھا چڑھا کر تعداد بتائی اور مسٹر جناح نے تیس ہزار کی تعداد کا اعلان کیا۔ یہ تو بالکل غلط ہے۔ مگر میرے اندازہ کے بموجب اس کے دسویں حصّہ کو مان لیا جانا غلط نہ ہوگا۔ تعداد کچھ بھی ہو مگر اِس میں شک کہ بہت ظلم اور بے رحمی کی گئی جس کے لئے سب کو شرمندہ ہونا چاہیئے۔ آپس کے میل کی کوششوں کو بہت بڑا دھکّا لگا۔ اِسی طرح کا خوفناک حادثہ ضلع میرٹھ کے گڈھ مکٹیشر کے میلے کے وقت ہوگیا وہاں بھی بہتیرے مسلمان مارے گئے اور بعد میں مسلمانوں نے ہندوؤں سے اُن کا کچھ انتقام لیا۔ صوبہ سرحد میں ہزارہ ضلع میں کچھ قبیلوں کے لشکر نے ہندوؤں پر حملے کئے۔

اِس بار میرٹھ میں ہی کانگریس کا اجلاس ہونے کی بات تھی۔ جب گڈھ مکٹیشر کا حادثہ ہوا تو ایسا شک ہونے لگا کہ وہاں کانگریس نہیں ہو سکے گی۔ مگر حالت سنبھل گئی اور کانگریس کا سشن ہوا، مگر جو دھوم دھام ہونے کی تھی وہ نہیں ہوئی۔ کانگریس کے ساتھ ہونے والی نمائش اور بے شمار دوسری انجمنوں کے جلسے نہیں ہوئے۔ کانگریس میں بھی وزیٹروں کے آنے کو روک دیا گیا اور صرف ڈیلی گیٹوں کو ہی جانے دیا گیا۔ پھر بھی جشن تو ہو ہی گیا۔ آچاریہ کرپلانی کی صدارت میں کامیابی سے کانگریس کا اجلاس ختم ہوا۔ دو اہم ریزولیشن پاس ہوئے۔ ایک میں ہندوستان میں جمہوریت قائم کرنے کی بات کہی گئی اور دوسرے میں آئین ساز انجمن کو آئین کے متعلق ہدایت کی گئی۔

ہم دلّی سے ہی میرٹھ گئے تھے۔ وہاں سے واپسی پر معلوم ہوا کہ انگلستان کی وزارت نے کانگریس کے لیڈر پنڈت جواہر لال نہرو اور سردار ولبھ بھائی پٹیل کو، سکھوں

کے لیڈر سردار بلدیو سنگھ کو اور لیگ کے لیڈر مسٹر جناح اور مسٹر لیاقت علی خاں کو بلایا ہے ہم لوگوں کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ بلاوا کیوں ہے کیونکہ ہم نے تو ۱۶ ر مئی والے بیان کو مان کر کام شروع کر ہی دیا تھا۔ صرف لیگ نے اپنے اُس فیصلہ کو نہیں بدلا تھا، جس کی رو سے اُس نے نامنظور کیا تھا۔ اب مجلسِ آئین ساز کی نشست کا وقت قریب آگیا تھا کیونکہ وہ ۹ ر دسمبر سے ہونے والی تھی اور یہ بات ۲۷ ر نومبر کو پیش ہوئی تھی۔ ہم لوگوں نے تو پہلے یہ کہا تھا کہ ہم لوگ سمجھتے ہیں ہمارے وہاں جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے، کیونکہ ہمارا جو اختلافِ رائے انگلستان کی وزارت کے ساتھ ۱۶ مئی کے بیان کی تاویل کے متعلق تھا وہ اُنھیں معلوم ہی تھا اور وہاں جانے سے اُس کوئی فرق پڑنے والا نہیں تھا، مگر پھر بھی انھوں نے بلایا تو جانا چاہیئے۔ وزیر اعظم مسٹر اٹیلی کا تار آیا کہ ضرور آجایئے۔ لیگ نے تو جانے کا فیصلہ کر لیا، مگر جب مسٹر جناح کو معلوم ہوا کہ کانگریس کو کچھ یقین دلایا گیا ہے تو اُنہوں نے جانے سے انکار کر دیا۔ وہ اُس زمانے میں کراچی میں تھے۔ والسرائے وہاں پہنچے اور دونوں میں کچھ باتیں ہوئیں اور وہ بھی جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ اِس طرح پنڈت جواہر لال نہرو، سردار بلدیو سنگھ، مسٹر جناح اور مسٹر لیاقت علی خاں والسرائے کے ساتھ انگلستان گئے۔

کیبنٹ مشن اور والسرائے نے بار بار یقین دلایا تھا کہ ۱۶ ر مئی کے بیان میں کوئی ترمیم یا اضافہ نہیں کیا جائے گا، مگر اِس بار انھوں نے اس میں ترمیم اور اضافہ دونوں ہی کئے اور اگرچہ یہ کہا گیا کہ صرف اس بیان کا مطلب واضح کیا گیا اور اس میں کچھ بھی اضافہ نہیں کیا ہے، مگر پھر بھی اِس میں شک نہیں کہ کچھ نئی باتیں کہی گئیں اور کچھ پہلے کہی ہوئی باتوں میں چھوڑا گیا۔ لندن میں جو گفتگو ہوئی اس کا نتیجہ ۶ ر دسمبر ۱۹۴۶ء کا بیان

ہے، جس کے متعلق مندرجہ بالا ترمیم اور اضافہ کی باتیں کہی گئیں۔ اِس بارے میں غور کر کے اپنی رائے ظاہر کرنے کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا ایک خاص اجلاس طلب کیا گیا۔

۹ ر دسمبر کو مجلسِ آئین ساز کا اجلاس شروع ہونے کا فیصلہ کر دیا گیا تھا۔ اور اُس کے ممبروں کے پاس دعوت نامہ بھیجے گئے تھے، اِس لئے وہ اجلاس ہوا۔ اس کے لئے مرکزی اسمبلی کی گول عمارت میں ایک حصہ جس میں لائیریری تھی، خاص طور سے بہت اچھی طرح سجا کر تیار کیا گیا تھا۔ بالخصوص اُس میں ایسا انتظام کیا گیا تھا کہ ممبروں کی آواز کی گونج، جو ایسی عمارتوں میں قدرتی ہے، نہ ہونے پائے۔ اس کے لئے بہت طرح کے سائنٹفک انتظامات کئے گئے۔ ممبروں کو دلّی کی سردی سے بچانے کے لئے جگہ کو گرم رکھنے کا بھی انتظام کیا تھا وہاں ۹ دسمبر سے مجلسِ آئین ساز کا کام شروع ہوا۔ اِس کے متعلق پہلا سوال یہ اٹھا تھا کہ جب تک مستقل صدر کا انتخاب نہ ہو جائے تب تک اُس کی کارروائی کون چلائے۔ طے ہوا کہ ممبروں میں جو سب سے زیادہ سِن رسیدہ ہو وہی عارضی صدر رہے۔ ہمارے بہار کے ڈاکٹر سچدانند ہی سب سے بزرگ نکلے۔ ان کی عمر اور سرہری سنگھ گوڑ اور شری سری پرکاشم کی عمر میں تھوڑا فرق تھا۔ مگر وہ سب سے بڑے نکلے۔ اِس لئے انھوں نے ہی کرسیِ صدارت کو رونق بخشی اور دو تین روز تک، جب تک مستقل صدر کا انتخاب نہیں ہوا بڑی خوبی کے ساتھ کام چلایا۔

اب یہ سوال اٹھا کہ مستقل صدر کسے مقرر کیا جائے۔ اوپر کہہ چکا ہوں کہ عارضی حکومت کے تقرر سے پہلے ہم لوگوں میں غور ہوا تھا کہ مجھے اِس کام کے لئے محفوظ رکھا جائے اور اِس عبوری دور کی حکومت میں مجھے نہ بھیجا جائے، مگر آخر یہ خیال بدل دیا گیا

اور مجھے وہاں مقرّر کرا یا گیا۔ انگلستان جانے سے پہلے ہم لوگوں نے پنڈت جواہر لال نہرو سے باتیں کی تھیں اور سوچا گیا تھا کہ کانگریس کے باہر کے ہی کسی فرد کا تقرر ٹھیک ٹھیک ہوگا۔ سری گوپال سوامی آئینگر کا نام بھی سامنے آیا تھا۔ وہ قابل اور تجربہ کار فرد تھے اور اس معاملہ میں انھوں نے گہری دلچسپی لی تھی۔ وہ کانگریس کے نہیں تھے مگر انتخاب میں کانگریسی ممبروں نے اُن کی مدد کی تھی۔ جب مجلسِ آئین ساز کے اجلاس کے لئے لوگ آنے لگے تو ممبروں کا خیال ہوا کہ بہت لوگوں کا خیال ہوا کہ یہ عہدہ مجھے دیا جائے۔ اُنھوں نے آپس میں باتیں کیں اور معلوم ہوا کہ بہت لوگوں کی یہی خواہش تھی۔ مجھے پہلے اِس کا پتہ نہیں تھا مگر لوگ ایک ایک کر کے میرے پاس پہنچنے لگے اور زور دینے لگے کہ میں اس عہدہ کو قبول کروں۔ میرے سامنے بڑی دشواری یہ تھی کئی محکموں کا کام میرے ذمہ تھا اور وہ میرے لئے کافی تھا۔ اُس پر یہ کام بہت بھاری ہو جائے گا۔ اس خیال سے پہلے پہل میں نے انکار کر دیا۔ ورکنگ کمیٹی میں یہ بات پیش ہوئی اور میں نے کمیٹی میں یہ سوال پیش کیا کہ اگر مجھے یہ عہدہ لینا پڑے تو وزارت کے عہدے سے مجھے سبکدوش کر دیا جائے۔ آخر مجبور ہو کر اور ڈرتے ڈرتے میں نے اس بار کو بھی لینا منظور کیا میرا نام پیش ہوا اور میں اتفاقِ رائے سے چُنا گیا۔

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ ۶ دسمبر کے یہاں پر غور کرنے کے لئے آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی نشست طلب کی گئی۔ وہ ۵۔ ۶ جنوری ۱۹۴۷ء کو ہوئی اور اُس میں طے ہوا کہ ۱۶ مئی والے بیان کا جو مطلب ۶ دسمبر کے بیان میں لگایا گیا ہے، اُسی کے مطابق کام کیا جائے۔ ہاں کسی صوبہ یا علاقہ کے ساتھ زور زبردستی ہم برداشت نہیں کریں گے اور جب کبھی ایسا ہوتا نظر آئے گا تو ہم اُس کی مخالفت میں جو مناسب

معلوم ہوگا کریں گے۔

ادھر تو مجلسِ آئین ساز کا اجلاس ہونے لگا، اُدھر میں نے ہندو یونیورسٹی بنارس میں کانووکیشن ایڈریس دینے کا وعدہ پہلے سے ہی کر رکھا تھا، اس کے لئے مجھے وہاں جانا پڑا۔ ہوائی جہاز سے پنڈت جواہر لال جی کے ساتھ وہاں گیا۔ اُن کو ڈاکٹر کی ڈگری دی گئی اور میں نے کانووکیشن ایڈریس دیا۔

اس بار کے یونیورسٹی کے کانووکیشن کی بڑی عظمت اور اہمیت تھی۔ ہندو یونیورسٹی کے جنم داتا، کرتا دھرتا پنڈت مدن موہن مالوی جی کی رحلت ہو گئی ایک بڑا صاحبِ عمل یوگی دنیا سے چلا گیا۔ یونیورسٹی تو مدّتِ مدید تک اُن کی یادگار بنی رہے گی۔ مگر حصولِ سوراج میں بھی ان کا حصہ اتنا ہی عظیم تھا۔ وہ تین بار کانگریس کے صدر ہوئے اور اختلافِ رائے ہوتے ہوئے بھی انھوں نے کانگریس کو نہیں چھوڑا۔ جب جب کانگریس میں مشکل پیش آئی تو انھوں نے انتہائی جوش کے اس کی امداد کی۔

ہندو مہا سبھا کے تو مالوی جی ایک طرح سے خالق اور روحِ رواں تھے۔ مذہبی ترقی کے لئے انھوں نے ہندوؤں کی جو خدمت کی وہ ناقابلِ بیان ہے۔ سبھی خادمانِ وطن کے ساتھ محبت اور شفقت کا جذبہ ان کے لئے فطری تھا۔ اُن کے اُٹھ جانے سے ایک طرح سے ملک سونا ہو گیا۔ اُن کے آخری دن کچھ مصیبتوں کی وجہ سے المناک ہو گئے تھے سب سے بڑے صاحبزادے پنڈت راما کانت مالوی کے انتقال سے انھیں دھکّا لگنا قدرتی تھا مگر آخر تک وہ ملک کو نہیں بھولے اور موجودہ حالت سے فکر مند بھی تھے اور خوش بھی۔ اُن کی زندگی سے ہمیں بہت کچھ سیکھنا ہے اور وہ ہمارے سامنے رہنمائی کا کام کرتا رہے گا۔

اسی قسم کا ایک زبردست نقصان بہار میں بابو برج کشور پرشاد کی موت سے ہوا۔ اِدھر خرابیِ صحت کی وجہ سے کئی برسوں سے وہ عوامی کاموں میں حصہ لینے سے بالکل معذور ہو گئے تھے اور ملک اور صوبہ کو ان کی خدمات سے محروم ہو جانا پڑا تھا۔ مگر جو خدمات وہ پہلے کر چکے تھے ان کو یاد کر کے کوئی بھی ہندوستانی اور خاص کر بہاری، اس نقصان سے دُکھی ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میرے لئے تو بڑی چوٹ ہے۔ وہ ذکاوت وہ زبردست استقلال اور تیز دور اندیشی وہ عظیم قوت ایثار اور بے لوثی اور شہرت سے بچنے کا بے مثل تہیہ، وہ بے خوفی کہاں دیکھنے کو ملے گی۔ جب ہم بہار کے لوگ پبلک لائف صرف تفریحِ طبع کا ذریعہ سمجھ کر اس میں کچھ تھوڑا وقت لگا دینا ہی کافی سمجھتے تھے۔ اُنھوں نے ہمارے سامنے اٹوٹ خدمت کی بات رکھی اور ہم میں سے بہتیروں کو اس جدوجہد میں مجاہد بنایا۔ ہم میں جب کبھی کمزوری آئی تو انھوں نے اپنے اٹل ارادے سے ہم کو متاثر کیا، اور جدوجہد میں ڈھیلا پن لانے سے بچایا۔ کسانوں کی خدمت کی ابتدا اُنھوں نے اس وقت کی جب نیل والے گوروں کا بول بالا تھا اور اُن کے خلاف آواز اٹھانا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ جب میں نے انٹرنس کا امتحان پاس کیا تبھی سے اُن کا پریم میرے ساتھ ہو گیا تھا اور میری زندگی کی کٹھن گھڑیوں میں وہ برابر امداد کرتے رہے۔ اِس تعلق نے اِدھر ان کی لڑکی کے ساتھ مرتنجے کی شادی کی وجہ سے کچھ اور بھی شکل اختیار کر لی تھی۔ مگر پبلک لائف پر اُس کا کوئی اثر نہیں تھا۔ بھائی کی وفات کے بعد ایک طرح سے میرے گھر کے کاروبار میں بھی مدد دینے لگے تھے۔ اور دیتے رہتے، اگر وہ خرابیِ صحت کی وجہ سے بے عمل نہ ہو جاتے اِس لئے ان کی رحلت کی خبر سُن کر میں دلی میں بہت دُکھی ہوا۔ مگر مہاتما جی نے جو تعزیت کا تار اُن کے لڑکوں کو بھیجا تھا وہ میرے لئے بھی معاون ہوا۔ اُنھوں نے لکھا تھا کہ اُن

کے جسم کی جو حالت بُری ہو گئی تھی، اُس میں اُن کی وفات باعثِ خوشی ہونی چاہیئے نہ کہ باعثِ رنج اور روح تو لافانی ہے ہی۔ اس کے لئے فکر کرنا بیکار ہے۔ بات ٹھیک ہے اور جیسی تکلیف ان کو دیکھ کر ہوا کرتی تھی۔ اب وہ نہیں ہو گی۔ خدا اُن کے لڑکوں کی مدد کرے۔

اُن کی تعزیتی رسم کے موقع پر مرتنجے کی اہلیہ ودیاوتی در بھنگہ گئی جہاں اُس کے بھائی اور ماں ہیں اور جہاں بابوجی کی وفات ہوئی تھی۔ مرتنجے بھی گئے تھے مگر شرادھ (تعزیتی مراسم) کے بعد اُسے وہاں چھوڑ کر پٹنہ چلے آئے۔ چند دنوں کے بعد نہ معلوم اُس کو کیا ہو گیا اور وہ یکایک ایک دو دن کی بیماری ہی چل بسی۔ مرتنجے بیماری کی خبر پاتے ہی پٹنہ سے در بھنگہ کے لئے روانہ ہوئے مگر اُنھیں راستہ میں ہی اُس کی وفات کی خبر مل گئی۔ میں بہار سے ہندو مسلم فساد کی خبر پاکر پٹنہ جا رہا تھا اور روانہ ہوتے وقت یہ خبر ملی۔ میں وہاں چلا گیا۔ بچوں کو بلکتا دیکھا اور عورتوں کا رونا پیٹنا سُنا۔ مرتنجے اس وقت در بھنگہ گئے ہوئے تھے۔ دو دنوں کے بعد وہاں سے داہ کر دیا (مردے کو جلانے کی رسم) کر کے لوٹے۔ میں پٹنہ ضلع کے گاؤں میں ہندو مسلم فساد روکنے کے کام میں لگا رہا جہاں اتنے لوگ مارے گئے تھے اور اتنے گھروں میں ماتم اور کہرام مچا تھا۔ وہاں اپنا رنج ایک طرح سے شرما کر دب سا گیا۔ میں پٹنہ میں بہت دوڑ دھوپ کی وجہ سے بیمار پڑ گیا۔ اِس لئے چند دنوں تک ٹھہر جانا پڑا۔ اِسی درمیان شرادھ کا کام بھی ختم ہوا۔

ایک دو مہینے کے اندر یہ دوسرا صدمہ تھا۔ رانچی میں بہت دنوں تک مصیبت سہہ کر بچہ پرکاش چل بسا۔ جب بیماری بہت بڑھی تو مجھے ٹیلیفون سے دلّی میں خبر دی گئی۔ میں جانے کی تیاری کر ہی رہا تھا کہ اُس کی رحلت کی خبر گئی۔ یہ بہت بڑی چوٹ تھی۔ اُس کا بڑا بھائی موہن بارہ برس پہلے چلا گیا تھا۔ وہ زخم ابھی تک ہرا ہے اور

جب یاد آتی ہے تو آنسو آجاتے ہیں۔ اب یہ دوسری چوٹ بیرحم زمانہ نے لگائی مگر کیا کیا جائے۔ جناردن اور چندر مکھی اور بھائی کی بیوی کی حالت کیا کہوں۔ اِن بچّوں کو جانا ہی ہوتا ہے تو آتے ہی کیوں ہیں۔ قدرت کا کھیل سمجھ میں نہیں آتا۔ ایک طرف مصیبت پر مصیبت دوسری طرف ایک کام پر دوسرے کام کا بوجھ بڑھ جانا۔ اتنا بھی وقت نہیں ملتا کہ دکھی خاندان کے ساتھ وقت گزاروں مگر میں جانتا ہوں کہ اس میں بھی خدا کا ہی ہاتھ ہے۔

مختار ہے جس طرح بنا ہے

دلّی کی زندگی کئی معنوں میں نئی زندگی ہے۔ دفتر کا کام کرنے کا پہلے پہل موقع ہوا ہے۔ سنا ہے کہ لوگ میرے کام سے مطمئن ہیں۔ ابھی تک ملک غلّہ کی قلّت کی جس مصیبت میں پڑا رہا ہے اس سے رہائی تو نہیں مگر حالت کچھ بہتر ضرور ہوئی ہے۔ دکھن میں چاول کی وجہ سے خطرہ بڑھتا جا رہا ہے میں نہیں جانتا کہ میں نے خاص کام کیا ہے جس کے لئے مجھے مبارکباد یا شہرت ملنی چاہیئے مگر لوگ مطمئن ہیں اور بہت سے مانتے ہیں کہ میں نے حالت کو سنبھالا ہے اگر کارکن اور عوام ساتھ نہ دیتے تو کوئی بھی کچھ نہیں کر سکتا تھا میں تو کر ہی کیا سکتا تھا۔ یہاں کی زندگی میرے لئے ایک نیا تجربہ ہے۔ مکان بہت بڑا ہے مگر اُس میں جگہ بہت کم ہے، کیونکہ کمرے بڑے بڑے ہیں مگر تعداد میں کم۔ احاطہ بہت بڑا ہے اور پھولوں سے مُزین ہے۔ سبزی بوئی گئی ہے اور اپنی اگائی ہوئی سبزی ہم لوگ استعمال کرتے ہیں مگر خرچ کافی پڑتا ہے۔ جب سے آیا ہوں اتنا مشغول رہتا ہوں کہ دوستوں سے ملنے جلنے کا بھی وقت نہیں ملتا۔ کہیں آنا جانا تو

بہت مشکل سے ہو سکتا ہے اب تو اور بھی دشواری بڑھ گئی ہے مگر بفضلہ صحت کام دے رہی ہے اور ابھی تک کبھی ایسی حالت نہیں ہوئی ہے کہ کام روکنا پڑے۔ اگر صحت نے ساتھ دیا، جیسا ابھی تک ہے، تو انشاءاللہ آئین ساز مجلس کی صدارت کا کام بھی کسی طرح چلائے جاؤں گا۔

دلّی

۸ر جنوری ۱۹۴۷ء